رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۱۲ ٹیلیفون نمبر ۳۵۲۵

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

پطرس نمبر

۷۵، ۷۶

ستمبر سنہ ۱۹۵۹ء

مرتب

محمد طفیل

۲۹۰۰۲

سالانہ چندہ
بیس روپے

فی پرچہ
سات روپے

ادارہ فروغ اردو ــــ لاہور

کوئی مضمون بلا اجازت شائع نہ کیا جائے

فہرس

۱ — طلوع — م۔ طفیل ۵

شخصیت

۲ — احمد بخاری — ہیمرشولڈ ، ۴
۳ — عالمی شہری — نیویارک ٹائمز ، ۲۴
۴ — بھلے مانس بنو — نیویارکر ، ۲۵
۵ — پروفیسر بخاری کے آخری لمحات — مارلی ہیمن ، ۲۷
۶ — ہر نغمہ جس کا حسن تمنائے گوش تھا — محمد عبداللہ قریشی ، ۲۹

۷ — بھائی بھائی — سید ذوالفقار علی بخاری ، ۳۳
۸ — آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے — سر ظفراللہ خاں ، ۳۶
۹ — میرا نام بخاری ہے — بی۔ اے ہاشمی ، ۳۸
۱۰ — گورستانِ ادب کا فقیر — مولانا عبدالمجید سالک ، ۴۲
۱۱ — کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور — رشید احمد صدیقی ، ۴۶
۱۲ — .... کہ گوہرِ مقصود گفتگو ست — فیض احمد فیض ، ۵۵
۱۳ — ہنستے ہنستے — عصمت چغتائی ، ۶۱
۱۴ — چند پرانی یادیں — غلام رسول مہر ، ۱۰۴
۱۵ — پطرس بخاری مرحوم — صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ۷۹
۱۶ — اے۔ ایس۔ بی — شوکت تھانوی ، ۶۹
۱۷ — پیر و مرشد — کنہیا لال کپور ، ۷۳
۱۸ — میرا شہرۂ آفاق استاد — ڈاکٹر حمید الدین ، ۱۰۸
۱۹ — یو۔ این۔ او میں پروفیسر بخاری سے ایک ملاقات — ڈاکٹر عبداللہ چغتائی ، ۱۱۲
۲۰ — ضابطہ بے ضابطہ — حضرت رحمانی ، ۸۹
۲۱ — پطرس — حکیم یوسف حسن ، ۹۶
۲۲ — جس کی باتوں میں گلوں کی خوشبو — آغا بابر ، ۹۸
۲۳ — جنابِ پطرس — محمد طفیل ، ۱۱۶

فن

۱ — پطرس بحیثیت مزاح نگار — ڈاکٹر احسن فاروقی ، ۱۲۶
۲ — مضامین پطرس کا مطالعہ — تمکین کاظمی ، ۱۳۳
۳ — پطرس کی تحریف نگاری — ڈاکٹر وزیر آغا ، ۱۵۷
۴ — پطرس کے مضامین — اثر لکھنوی ، ۱۶۲

تخلیقاتِ پطرس

منظومات

۱ — نقشِ گم گشتگی ۱۶۴
۲ — ہم اُن کا مے گو مہرِ دل از تو دارم حرزِ جانم شد ۱۶۵
۳ — فرمودۂ پطرس ۱۶۶
۴ — دو کوہا ہے ۱۶۷
۵ — میکدے میں ۱۶۸
۶ — دو شعر ۱۶۹
۷ — دلی کی سیر ۱۷۰

افسانے، ڈرامے، ناولٹ

۱ — ناچتا نیم ۱۷۱
۲ — کڑکی جورو ۱۸۵
۳ — صید و صیاد ۱۹۱
۴ — عشق کی خودکشی ۲۰۳
۵ — تائیس ۲۰۷
۶ — سیب کا درخت ۲۲۹
۷ — ویشی صاحب اور میں ۵۸۰

مزاحیہ مضامین

۱ — اخبار میں ضرورت ہے ۲۹۸
۲ — دوست کے نام ۳۰۱
۳ — بچے ۳۰۶
۴ — اب اور تب ۳۰۸

فنی مضامین

۱ — مضحک اشیاء کے متعلق چند عام اصول ۳۱۰
۲ — پاکستان میں تعلیم کا مستقبل ۳۱۶
۳ — ایڈیٹنگ کا فن ۳۲۲
۴ — انگلستان کے جدید تھیٹر ۳۳۴
۵ — قدیم یونانی حکما اور ان کے خیالات ۵۶۵

تنقیدی مضامین

۱ — ہمارے زمانے کا اردو ادیب ۳۴۴
۲ — اقبال ۵۷۷
۳ — کچھ عصمت چغتائی کے بارے میں ۳۵۱
۴ — ہیروئن ۵۵۱
۵ — ہیبت ناک افسانے ۳۶۱

نیاز مندان لاہور کا سلسلہ

۱ — یو۔پی کے تنقید نگاروں کی خدمت میں ۳۳۱
۲ — انور علی مخلص صاحب اور ہم نیاز مند ۵۲۵
۳ — غنچۂ تبسم کے دیباچوں پر ایک نظر ۵۲۴

ادبِ لطیف

۱ — وارفتگیٔ جذبات ۳۶۶
۲ — تنزل ۳۶۸
۳ — آئینۂ دل ۳۶۹
۴ — آسمان ۳۷۱
۵ — ایک رات ۳۷۲
۶ — چینہ بر ستارہ ۶۰۲

دیباچے

۱ — ایک غیر مطبوعہ کتاب کا دیباچہ ۳۷۴
۲ — چھپا اور دوسرے افسانے ۳۷۶
۳ — نغمہ زار ۳۷۸
۴ — جھولے ۳۷۹
۵ — ایران میں اجنبی ۳۸۰
۶ — پچھی چوری ۳۸۷

سفرنامے

۱ — سفرنامے ۳۹۲
۲ — میکسیکو کے کوچہ و بازار ۴۰۶

بچوں اور عورتوں کے لیے

۱ — رونا دھونا ۶۰۰
۲ — کاغذی روپیہ ۵۹۷
۳ — نوع انسان کی کہانی ۲۸۰
۴ — بچے کا پہلا سال ۲۸۴
۵ — دیہات میں بوائے اسکاؤٹ ۲۹۰

خطوط

بنام —— ، عبدالمجید سالک، ۴۰۹ غلام رسول مہر، ۴۲۳
عبدالرحمٰن چغتائی، ۴۲۹ غلام مصطفیٰ تبسم، ۴۵۲ سید ہاشم رضا، ۴۵۵
بیگم آمنہ مجید ملک، ۴۵۶ بیگم فیض احمد فیض کو ۴۵۰ عزیزہ فیصل، ۴۵۹
امتیاز علی تاج ۴۶۲ ہاجرہ مسرور، احمد ندیم قاسمی،
بیگم یوسف حسن، ۴۶۷ حکیم الرحمٰن، ۴۶۸ حامد علی خاں، ۴۶۹
عبدالقدیر رشک، ۴۷۰

پطرس کے مضامین

(مکمل کتاب)

۱ — اظہار عقیدت ۴۷۳
۲ — دیباچہ ۴۷۴
۳ — ہاسٹل میں پڑھنا ۴۷۵
۴ — سویرے جو کل آنکھ میری کھلی ۴۸۴
۵ — کتے ۴۹۰
۶ — اردو کی آخری کتاب ۴۹۳
۷ — میں ایک میاں ہوں ۴۹۵
۸ — مرید پور کا پیر ۵۰۱
۹ — انجام بخیر ۵۰۸
۱۰ — سینما کا عشق ۵۱۳
۱۱ — میبل اور میں ۵۱۷
۱۲ — مرحوم کی یاد ۵۲۰
۱۳ — لاہور کا جغرافیہ ۵۲۱

تقاریر

۱ — مسئلہ تیونس ۶۰۳
۲ — ماڈل جنرل اسمبلی ۶۲۷

پیغامات

خلیفہ عبدالحکیم حفیظ جالندھری خواجہ منظور حسین عابد علی عابد

محمد طفیل ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نقوش پریس لاہور میں چھپوا کر ادارہ فروغ اردو ایبک روڈ (انارکلی) لاہور سے شائع کیا

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

لاہور ۲۰ جنوری ۵۳ء

احمد بخاری

AHMED BOKHARI

DAG HAMMARSKJOLD

I first met Ahmed Bokhari soon after taking over my functions as Secretary-General. He was then Head of the Pakistan Delegation to the United Nations, famous for his wit and eloquence, but also respected as an extremely effective spokesman for his country. Our first discussion added something essential but not quite unexpected to his profile as it was known to the outside world. I remember how on that occasion he demonstrated his interest in the English metaphysical poets rather than in the more worldly affairs of the United Nations.

A year or so later, when I was looking for a senior representative in the Secretariat for the Islamic world, my thoughts naturally turned to Bokhari. I was happy to see him willing to join our staff. His first strictly personal assignment was a somewhat unexpected one. In January 1955 he accompanied me to Peking, where I had to negotiate about the release of a group of United States fliers. He was, of course, a wise and subtle counsellor but, outside the professional duties, he derived great satisfaction from this first contact with East-Asian civilization with its parallels to the West-Asian culture in which he was steeped.

On later trips to the Middle East I had, a couple of times, the privilege of his guidance. It was especially on those trips that I got to appreciate how deeply the experiences of his youth, and in particular the traditions of his family, had influenced his personality. As all his friends know, he combined great natural warmth and simplicity with considerable shyness. Back of this blend of qualities was a profoundly aristocratic attitude. There was much natural pride reflected also in such an ironical statement of his, as this one which he made to me a couple of times: "I was brought up camelback".

I have stressed here his attachment to his own background. Others will undoubtedly write about his learning and his deep insight in Western traditions. He was, indeed, a master of the English language as of the languages of his own region, and he was a critic of Western literature of an unusual *esprit de finesse*.

It may be natural for me to sum up what I have said about the qualities of Ahmed Bokhari in a word about how those qualities were reflected in his work as a diplomat. I can do that by a quotation from Jacques Barzun, who says in his recent book " The House of Intellect " :

" Diplomacy . . . requires an awareness of others' minds which is one of the chief attributes of the prose writer, second only to his capacity for meeting argument with finesse and clear reason. A self-centered diplomat, an incoherent diplomat, are contradictions in terms".

Ahmed Bokhari was, indeed, a diplomat meeting the requirements which this quotation sets out.

25 June, 1959

احمد بخاری

ہیمر شولڈ (سیکرٹری جنرل اقوام متحدہ)

احمد بخاری سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب مجھے سکرٹری جنرل کا عہدہ سنبھالے کوئی زیادہ مدت نہیں گزری تھی۔ اس وقت وہ اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کے رئیس تھے اور اپنی حاضر جوابی اور شگفتہ بیانی کی بدولت عظیم شہرت کے مالک تھے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے ملک کے بدرجہ غایت موثر اور باوقار ترجمان ہونے کے اعتبار سے بڑے احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ہماری پہلی گفتگو نے ان جذبات و احساسات میں کسی قدر اضافہ ضرور کیا۔ لیکن یہ اضافہ ان کی اس خیالی تصویر سے چنداں مختلف نہ تھا جس کے لئے وہ باہر کی دنیا میں معروف تھے۔ مجھے یاد ہے کہ کس طرح اس موقعہ پر انہوں نے اقوام متحدہ کے عالمی مسائل سے زیادہ انگریزی زبان کے ماورائی شعرا کے بارے میں اپنی دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔

کم و بیش ایک سال کے بعد جب مجھے اس ادارے کے لئے عالم اسلام کے ایک اعلیٰ نمائندے کی جستجو ہوئی تو قدرتی طور پر میرا ذہن بخاری کی طرف متوجہ ہوا اور مجھے یہ معلوم کر کے مزید مسرت ہوئی کہ وہ ہمارے عملے میں شرکت کے لئے رضامند ہیں۔ یوں پہلے پہل ان کی خود سپردگی کسی قدر اچنبے کی بات تھی۔

جنوری ۱۹۵۵ء میں وہ میرے ہمراہ پیکنگ گئے جہاں مجھے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ہوا بازوں کی ایک جماعت کو رہا کرانے کے لئے بات چیت کرنی تھی۔ کچھ شک نہیں کہ وہ بڑے ہوشمند اور زیرک مشیر تھے۔ لیکن اپنے فرائض منصبی کی بجا آوری کے ساتھ جس بات پر انہیں زیادہ تسکین حاصل ہوئی وہ یہ تھی کہ انہیں مشرق ایشیا کی تہذیب سے رابطہ پیدا کرنے کا اولین موقع ہاتھ آیا تھا۔ یہ تہذیب مغربی ایشیا کی ثقافت کے متوازی اوصاف رکھتی تھی کہ جس رنگ میں وہ خود رنگے ہوئے تھے۔

اس کے بعد مشرق وسطیٰ کے دوروں میں مجھے چند موقعوں پر ان کی رہنمائی سے استفادہ کا شرف حاصل ہوا۔ انہی سفروں کے دوران، میں نے ان کی قدر و قیمت کا اندازہ لگا کر یہ محسوس کیا کہ انکی شخصیت پر انکے عہد شباب کے تجربوں اور خاص کر انکی خاندانی روایات کی کتنی گہری چھاپ ہے۔ ان کے تمام رفقا اور احباب جانتے ہیں کہ انکی قدرتی گرم جوشی اور سادگی میں حیاداری کس قدر رچی بسی ہوئی تھی۔ ان مرکب اوصاف کے پیچھے ان کے عمیق شریفانہ اطوار کار فرما تھے۔ دراصل وہ ایک احساس فخر بھی رکھتے تھے۔ جس کا اظہار انہوں نے میرے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے دو موقعوں پر کیا۔ ان میں سے ایک ان طنزیہ الفاظ سے بھی مترشح ہے کہ "میری پرورش و تربیت اونٹ کے کوہان پر ہوئی"

میں نے اس جگہ روایات کے اس پس منظر پر خاص زور دیا ہے جس سے انہیں واقعی دل بستگی تھی۔ دوسرے اصحاب بلا شبہ انکی علمی فضیلت اور مغربی اقدار پر انکی بصیرت کا ذکر کریں گے۔ فی الواقعہ انہیں انگریزی زبان اور اپنے علاقے کی زبانوں پر زبردست قدرت حاصل تھی اور وہ غیر معمولی طور پر مغربی ادب کے بھی بلند پایہ نقاد تھے۔

قدرتی طور پر میرے لئے لازم ہے کہ احمد بخاری کے اوصاف و کمال کے بارے میں جو کچھ میں نے کہا ہے اسے چند لفظوں میں سمیٹ کر یہ بیان کروں کہ ان کی یہ خصوصیات ایک سیاسی سفیر کی حیثیت میں کس طرح ظاہر ہوتیں اور اپنا اثر ڈالتی تھیں۔ یہ کام میں جیقس برزون (Jacques Barzun) کی تازہ تصنیف دی ہاؤس آف انٹی لیکٹ کا ایک اقتباس پیش کر کے بخوبی انجام دے سکتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں۔ "حکمت عملی (سفارت) کا تقاضہ ہے کہ دوسروں کے افکار و اذہان سے آگاہی حاصل ہو یہ انشا پرداز کا بھی ایک امتیازی وصف ہے مگر اس سے دوسرے درجے پر کہ وہ دوسروں کے دلائل کا جواب کس ہوشمندی اور واضح استدلال کے ساتھ دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایک 'حاضر دماغ' سفیر اور ایک 'پریشان خیال' سفیر اصطلاح میں ایک دوسرے کی ضد ہیں"

احمد بخاری حقیقت میں ان اوصاف پر پورے اترنے والے سفیر تھے جو مندرجہ بالا اقتباس میں بیان کئے گئے ہیں۔

۲۵ جون، ۱۹۵۹ء

مخزونہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

طلوع

محمد طفیل

خبر آئی۔ بخاری صاحب کا انتقال ہوگیا۔ جی ڈوب سا گیا۔ ذہن ماضی کی طرف پلٹا۔ کوئی مجھ سے مخاطب تھا:۔

مشفقی و مکرمی، سلام مسنون!

ارادہ تھا کہ چند دن کے لیے لاہور ضرور آؤں گا۔ اور منجملہ اور احباب کے آپ سے بھی تجدید نیاز کروں گا۔ لیکن افسوس کہ بوجوہ یہ تمنا پوری نہ ہو سکی۔ آج شام واپس یورپ جا رہا ہوں۔ اور وہاں سے امریکہ، انشا اللہ!

آپ کے کرم اور بخشش سے آپ کا رسالہ اکثر مل جایا کرتا تھا۔ اور امید ہے کہ آپ کا یہ فیض اب بھی جاری رہے گا۔ البتہ میرا پتہ اب پاکستان مشن نیویارک نہیں بلکہ یونائیٹڈ نیشنز نیویارک ہے۔ سب سے بہتر تو یہ ہو کہ آپ مجھے معرفت مرکز اطلاعات اقوام متحدہ کراچی کے پتے سے بھجوا دیا کریں۔ محصول میں بھی بچت رہے گی۔ کراچی کا مرکز اطلاعات آگے بھیجنے کا خود ہی انتظام کر دے گا۔

آپ کی مہربانیوں کا بے حد شکریہ اور کیا عرض کروں۔ یار زندہ صحبت باقی۔

خاکسار

احمد شاہ بخاری

میرے نام بخاری صاحب کا یہ پہلا خط تھا۔ جو اچانک چلا آیا تھا۔

معاً ذہن پھرکی کی طرح گھومنے لگا ـــ بڑے آدمی کا انتقال ـــ بڑے ادیب کا انتقال ـــ بڑے عالم کا انتقال۔ بڑے مفکر کا انتقال ـــ بڑے مخلص کا انتقال ـــ بڑے جیالے کا انتقال۔

"شیطان نے بہکایا ـــ اٹھو اور خراج عقیدت پیش کرو۔ پطرس نمبر نکالو۔

فوراً ذہن نے تردید کر دی۔ یہ کام نہ کرنا۔ لوگ سو سو باتیں بنائیں گے۔ جتنے ذہن اتنے نتیجے۔ کوئی کہے گا اچھا کام کیا۔ کوئی

لکھے گا۔ یہ تو اسی دن کے انتظار میں تھا۔

بالآخر دل و دماغ نے یہ فیصلہ کیا — اگر تجھے پطرس سے عقیدت ہی ہے تو چپکے سے رو لے اور بس۔

یہ فیصلہ ہوا ہی تھا کہ بخاری صاحب کا دوسرا خط میرے سامنے آیا۔ خط کیا خود پطرس نے مجھ سے باتیں کیں :۔

مشفقی و مکرمی۔ سلام مسنون!

آپ کا گرامی نامہ۔ پڑھتا گیا خوش ہوتا گیا۔ مگر خط کی آخری تین چار سطریں میرے لیے بہت بڑا سوالیہ نشان بن گئیں۔ ہاں کرتا ہوں تو یہ ڈر ہے کہ میری تحریر کی کسی جنبش سے اگر آپ کی دل آزاری ہوئی تو مجھے کتنے نفل کا ثواب ملے گا۔ انکار کرتا ہوں تو نہ یہ خوش مذاقی کی ذیل میں آتا ہے اور نہ شرافت کی ذیل میں۔ اگر آپ دل کو کڑا کریں اور میں جو کچھ آپ کی کتاب پر لکھ دوں اُسے قبول کر لیں تو بیشک پروف بھیج دیں۔ میں بخوشی مقدمہ لکھ دوں گا۔

ویسے مقدمہ نویسی میرے لیے ہمیشہ آزمائش کا وقت ثابت ہوئی ہے۔ میں اس سے اس طرح بھاگتا ہوں جس طرح عورت بچہ جننے سے۔ مگر کبھی احباب کے کام سے متاثر ہو کر مقدمہ لکھا۔ کبھی احباب کی دوستی کے ڈر سے۔ آپ کس خانے میں جائیں گے۔ یہ کتاب پڑھنے کے بعد معلوم ہوگا ویسے میں نے آپ کے دو تین مضمون اس سے پہلے پڑھے ہیں۔ اس لیے جرأت کر کے لکھ رہا ہوں کہ شاید آپ بدمزہ نہ ہوں۔

میرا یہاں قیام دس پندرہ روز کا ہے۔ اس لیے جتنی جلدی ممکن ہو۔ پروف بھیج دیجئے۔ ورنہ پھر فرصت کے دن نصیب نہ ہوں گے۔

لاہور کے احباب کو میرا سلام کہہ دیجئے گا۔

خاکسار
بخاری

جس دن بخاری صاحب کا یہ خط ملا تھا۔ دل ناچ اٹھا تھا۔ اترا اترا کے میں نے یہ خط اپنے کئی دوستوں کو سنایا تھا۔ مسرتوں کی برات کے ساتھ جلدی جلدی ”صاحب“ کے پروف تیار کر ڈالے۔ رجسٹری کر کے بھجوائے۔ مگر پروف بھیجنے کے دوسرے دن بخاری صاحب کا ایک اور خط ملا۔ جو بڑا مختصر تھا۔ لکھا تھا :۔

مشفقی و مکرمی، سلام مسنون

آپ کے پروف اب تک نہ ملے۔ مگر میرے جانے کا وقت آگیا۔ میں آج ہی ایک لمبے دورے پر جا رہا ہوں۔ نہ جانے امریکہ کب پہنچوں۔

مجھے اس کا افسوس رہے گا کہ میں آپ کی کتاب پر کچھ نہ لکھ سکا۔

خاکسار
بخاری

یہ تینوں خط میرے ذہن پر سوار ہو گئے۔ سوار ہوتے چلے گئے۔

پطرس سے میرا کوئی یارانہ تھا۔ نہ ہی خط و کتابت تھی۔ رتبہ ایک نہ تھا۔ ایک عالم فاضل دوسرا جاہل مطلق۔ ایک بین الاقوامی شہرت کا مالک، ایک کنویں کا مینڈک۔ کوئی خوبی، کوئی خرابی میرے اندر ایسی نہ تھی جو پطرس کے دل میں جگہ بناتی۔

خیالات اُمڈتے رہے۔ کئی پلٹے کھائے —— پطرس نے یوں خط لکھنے میں پہل کی تھی کیوں میری باتیں مانی تھیں۔ یہ جتنا سوچتا اتنی ہی پطرس کی عظمت میرے دل میں بڑھتی۔

پطرس کی عظمت کے چکر ہی میں لگا تھا کہ ایک بار ذہن پھر پٹڑی سے اُترا۔

سنو میاں! لوگوں کی پروا نہ کرو۔ پطرس نمبر ضرور چھاپو۔ یوں ڈرتے رہے تو زندگی بھر سلیقے کا کام نہ کر سکو گے۔

خیالات میں تصادم رہا۔ کبھی یوں، کبھی ووں۔

بالآخر جی کڑا کر کے، کچھ نیم دلی کے ساتھ، میں نے پطرس کے دوستوں کی فہرست بنائی۔ خط و کتابت کی۔ اس سلسلے میں میری جتنی مراسلت ہوئی، وہ سب یہاں درج کرتا ہوں۔ سوائے ان باتوں کے جو ذاتی ہیں، اور اخفائی ہیں۔ میرے خطوں کا مضمون یہ تھا۔ پطرس پہ لکھیے اور ہمیں بتلائیے کہ وہ بہ حیثیت انسان کیسے تھے اور بہ حیثیت ادیب کیا مقام رکھتے تھے۔

بڑے بڑے ادیبوں کے میرے نام ہزاروں خط آئے ہوں گے۔ جن میں سے کچھ ضائع ہو گئے۔ کچھ کو دیمک چاٹ گئی۔ کچھ ہیں۔ مگر مجھے ان کی اشاعت کا کبھی خیال نہ آیا۔ ان خطوں کو اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ ان سے پطرس کی شخصیت کچھ اور نکھرے گی —— اور پھر معلومات!

یہ خط تبصرے کے بغیر ہی ملاحظہ فرمائیں۔ میرے لیے ابھی اس نمبر کی ترتیب و تدوین کا بہت سا کام باقی ہے۔ ذرا سمیٹ لوں۔ اگر کہیں لکھنے کی ضرورت پڑی تو کچھ عرض کر دوں گا۔ ورنہ ضرورت ہی کیا۔

مکرمی طفیل صاحب، تسلیم

آپ کے ارشاد کی تعمیل میں بخاری مرحوم کے چند خطوط ارسالِ خدمت ہیں۔ میرے نام اُن کے بیشتر خطوط ایسے ہیں جنھیں بہت زیادہ ذاتی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اُن میں سے مقابلۃً زیادہ دلچسپ اور مجھے زیادہ عزیز وہ خطوط ہیں جو مجھ میں اُن میں کوئی کشیدگی پیدا ہو جانے کے بعد اُنھوں نے مجھے لکھے۔ لیکن اُن میں بعض دوسرے دوستوں کا تذکرہ اور اُن کے طرزِ عمل پر بے تکلفانہ اس قسم کی رائے زنی ہے جسے کسی رسالے میں چھپا ہوا دیکھنا شاید انھیں مرغوب نہ ہو۔ اس لیے انھیں شائع کرنے کے لیے دینا مجھے قرینِ مصلحت معلوم نہیں ہوتا۔ پھر کئی خطوط میں جابجا اس قسم کے حوالے اور اشارے ہیں کہ جب تک اُن کی مکمل تشریح نہ کی جائے کسی کے پلّے کچھ نہیں پڑ سکتا۔ اور اُن حوالوں اور اشاروں کی تشریح لکھنا آسان کام نہیں۔ اس لیے تعمیلِ ارشاد میں چند ایسے خط بھیجنے کے سوا چارہ نہیں جو مکمل کے مکمل یا بہت تھوڑی سی قطع و برید کے بعد عام دلچسپی کے قرار دیے جا سکتے ہیں۔ افسوس کہ ایسے خطوط بھی زیادہ احتیاط سے نہ رکھے۔ اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں۔ جو اس وقت مل سکے، ارسالِ خدمت ہیں۔

ان خطوط کے ساتھ چند ایسے مضامین بھی بھیج رہا ہوں۔ جو ادبی رسائل پڑھنے والوں کی نظر سے شاید نہ گزرے ہوں۔ اس قسم کے کئی مضامین یوں لکھے گئے تھے کہ بخاری صاحب حسبِ معمول مجھے اپنے ساتھ کہیں باہر لے جانے کے لیے آئے۔ دیکھا کہ خاکا کاتب انتظار میں بیٹھا ہے۔ اور میں اُس کے لیے مضمون لکھنے کے تردد میں دفتر سے نہیں اُٹھا۔ میری امداد کے لیے سمجھیے یا جلد از جلد اپنے ساتھ لے چلنے کے خیال سے انھوں نے مجھے تیار ہونے کے لیے گھر میں بھیج دیا۔ اور میری بجائے خود مضمون لکھنے بیٹھ گئے۔ میں شیو غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر اور کپڑے بدل کر واپس آیا تو تیار مضمون میرے حوالے کر دیا۔ ایسے مضامین جو قلم برداشتہ لکھے تھے۔ اور ایک ایسے مضامین ہی کیا۔ جو مضمون بھی لکھنے بیٹھ جاتے۔ اُسے عموماً ایک ہی نشست میں ختم کر کے اُٹھتے تھے۔ عبارت کاٹتے چھانٹتے بھی نہ تھے۔ البتہ لکھنے کے بعد مضمون پڑھوا کر سنتے ضرور تھے۔ اگر اس میں کہیں کوئی لفظ بدلنے کی ضرورت محسوس ہوتی تو کبھی نہ بھولتے۔ مضمون سننے کے بعد وہ لفظ بدل دیتے۔ مگر ایسی تبدیلیاں اتنی کم ہوتی تھیں کہ مسودہ نقل کرنے کی ضرورت کبھی محسوس نہ ہوتی تھی۔

تہذیبِ نسواں اور پھول میں نہ جانے اُن کے کتنے مضامین اسی طور چھپ گئے۔ بعض تو پطرس کے نام سے مضمون زیادہ خاطر خواہ نہ ہو سکا۔ تو کسی اور فرضی نام سے۔ "رونا رلانا" اسی قسم کے مضامین میں سے ایک ہے۔ نظم "دلی کی سیر" انھوں نے پھول کے کسی سالگرہ نمبر کے لیے لکھی تھی۔ اخبار میں نظموں کی کمی تھی انھیں اسی قسم کی کوئی انگریزی نظم یاد آئی۔ اُسے ذہن میں رکھ کر ذرا سی دیر میں یہ نظم کہہ ڈالی تھی۔

"کاغذی روپیہ" کا مضمون بچوں کے لیے اقتصادیات کی ایک کتاب کا باب ہے۔ یہ کتاب انھوں نے مجھے بتائے بغیر دارالاشاعت پنجاب لاہور کو عنایت فرمانے کے لیے لکھنی شروع کی تھی۔ ایک روز اس کے دو تین باب لے کر میرے پاس آئے۔ اور کہنے لگے ارادہ تھا کہ کتاب ختم کر کے چھاپنے کے لیے تمھیں دوں گا۔ مگر بعض دوسری اہم مصروفیتیں نظر آتی ہیں۔ نہ معلوم ان سے کب فراغت ہو۔ اور جب فراغت ہو تو کتاب ختم کرنے کا جوش باقی رہے یا نہ رہے۔ یہ چند باب GETTING OUR LIVING کو سامنے رکھ کر از سرِ نو لکھے گئے ہیں کتاب اب خود مکمل کر لو۔ یہ کتاب میں اب تک مکمل نہیں کر سکا شاید یہ کہنا زیادہ صحیح ہو کہ اسے مکمل کرنے کی ضرورت اب تک محسوس نہیں ہوئی۔ اب پہلی فرصت میں اسے مکمل کر ڈالنا چاہتا ہوں۔

میرے دارالاشاعت پنجاب کے اکثر مشاغل میں وہ مخلصانہ ہمدردی کے ساتھ میرے شریک رہتے تھے۔ ایک بار مجھے تہذیب نسواں۔ پھول اور دارالاشاعت پنجاب کی مطبوعات کے پوسٹر تیار کرتے دیکھا۔ تو اگلے روز خود تین پوسٹروں کا مضمون تیار کر کے لے آئے۔ اُن کی عبارت بھی ارسالِ خدمت ہے۔ شاید آپ کے قارئین کے لیے دلچسپی کا موجب ہو۔ مثلاً —— "عورتوں اور بچوں کے لیے مردوں اور عورتوں کے لیے

بوڑھوں اور بچوں کے لیے

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
سب کے لیے

بہترین کتابوں کا ذخیرہ
ادارہ اشاعت پنجاب لاہور
۱۹ ۔ ریلوے روڈ لاہور
تصنیف یا ترجمہ مصنف نکو کند بیاں
ظاہری نفاست کے ہم ذمہ دار ہیں
اور باقی چیزیں خود "بگوید"

باقی بخاری پر مضمون لکھنے کے لیے صحت فی الحال کسی طرح مائل نہیں ہوتی۔ اُن سے میرے تعلقات ۱۹۱۸ء میں شروع ہوئے تھے۔ جس وقت وہ نئے نئے پشاور سے گورنمنٹ کالج لاہور میں آئے تھے۔ اُس زمانے میں اُن کی شخصیت کی رعنائی بقول بتول مرحوم کے اُن کی بدوضعی سے تعلق رکھتی تھی۔ ۱۹۳۵ء تک بہت کم دن ایسے گزرے ہوں گے کہ وہ اور میں ہم دونوں نے سہ پہر سے رات تک کا وقت اکٹھے نہ گزارا ہو۔ البتہ ۱۹۳۵ء کے بعد جب وہ آل انڈیا ریڈیو میں دلی چلے گئے تو ملاقات کی صورت کچھ اور ہو گئی لیکن تقریباً سترہ اٹھارہ سال کا زمانہ جو لاہور میں اکٹھا گزرا۔ اُس کی مفصل داستان بیان کرنا کچھ آسان نہیں۔ گھومنا پھرنا۔ کھانا پینا۔ دلچسپیاں۔ تفریحیں۔ ملاقاتیں سب کچھ تھا۔ مختلف مشاغل کے دور آئے اور گزر گئے۔ کئی جنون سر پر سوار ہوئے اور رخصت ہو گئے۔ وقت اور واقعات نے عجیب عجیب تماشے دکھائے۔ اتنے لمبے ساتھ میں سے چند باتیں چن کر لکھنا دوستی کی داستان سے بے انصافی معلوم ہوتی ہے۔ سوچتا بھی ہوں تو خیال ساتھ نہیں دیتا۔ کچھ سوجھتا ہے تو لکھنے میں تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ دل البتہ یہ ضرور کہتا ہے کہ کوئی وقت ایسا آئے گا کہ اپنے اور بخاری کے تعلقات پر کچھ لکھنے بیٹھوں گا تو بھولے بسرے واقعات آپ سے آپ زندہ ہو کر سامنے آ جائیں گے۔ اُن محفلوں اور صحبتوں کی دھندلی سی تصویر کھینچ سکوں گا جن کی جان بخاری تھے اور تناسب کو مدنظر رکھتے ہوئے مرحوم کی سیرت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کا دشوار کام اس حد تک سرانجام دے لوں گا کہ جو لوگ اُنھیں نہ جانتے تھے انھیں عہد حاضر کی اس عدیم المثال شخصیت کی دلکشی اور رعنائی اور طباعی کا تھوڑا سا اندازہ ضرور ہو جائے گا۔

خاکسار
سید امتیاز علی تاج
(سید امتیاز علی تاج)

ہیگ ۔ ۱۵ ؍ جون ۱۹۵۹ء

مکرمی ۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

حقیقت یہ ہے کہ بخاری کی ذہنی پرواز مجھ جیسے "زمین پیماؤں" کی نظروں سے بہت بلند تھی۔ میں اس موضوع پر کچھ لکھنے کا اہل نہیں لیکن تعمیلِ ارشاد میں چند سطریں گزارش خدمت ہیں۔ ممکن ہے آپ انھیں قابلِ التفات پائیں۔

بخاری کے خط تو میرے نام بہت سے آئے خصوصاً اس زمانہ میں جب وہ اقوام متحدہ میں پاکستان کے نمائندہ تھے لیکن میں جواب دینے کے بعد خط تلف کر دیتا ہوں اس لیے افسوس ہے اب میرے پاس ان کا کوئی خط محفوظ نہیں۔ والسلام

خاکسار
ظفر اللہ خان
(سر ظفر اللہ خاں)

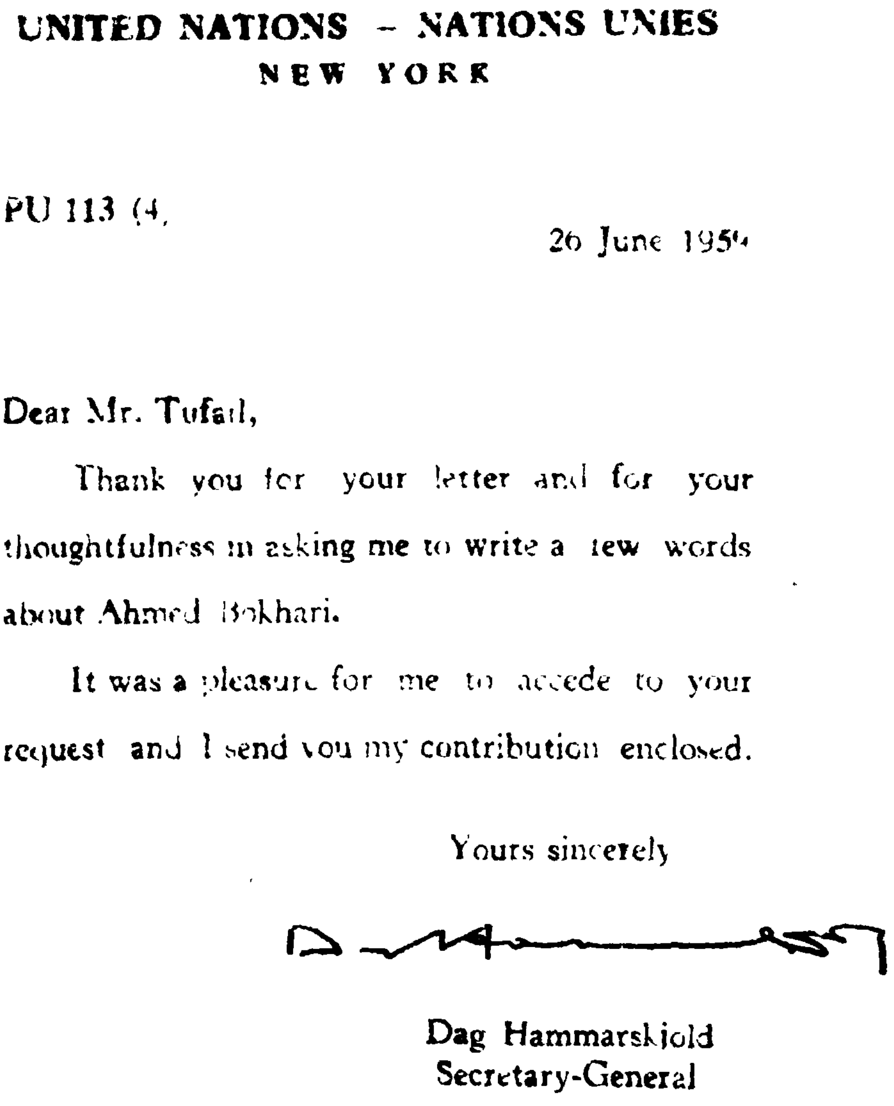

UNITED NATIONS - NATIONS UNIES
NEW YORK

PU 113 (4)

26 June 1959

Dear Mr. Tufail,

Thank you for your letter and for your thoughtfulness in asking me to write a few words about Ahmed Bokhari.

It was a pleasure for me to accede to your request and I send you my contribution enclosed.

Yours sincerely

Dag Hammarskjold
Secretary-General

PAKISTAN MISSION TO THE UNITED NATIONS
PAKISTAN HOUSE
12 EAST 65th STREET
NEW YORK 21, N. Y.

AD 64-59 16 June 1959

Dear Sir :

Your letter of 13th May, 1959 addressed to the Ambassador of Pakistan in Washington, D.C. has been forwarded to us for disposal.

We have sent you by separate post copies of Professor Bokhari's speeches listed below :-

1) The Tunisian Question
2) Speech on South Africa, delivered before the Ad Hoc Political Committee of the U. N. General Assembly on November 13, 1952.
3) Keynote address delivered to the model General Assembly held at Barnard College on April 7, 1952.

Very truly yours,

Riaz Piracha
First Secretary

برادرم طفیل صاحب۔ السلام علیکم

آپ کا ۲۴ اپریل کا خط عمان ہوتا ہوا نیویارک میں ملا۔ میرا کام عمان میں ۱۵ اپریل کو ختم ہو گیا تھا۔ وہاں سے براہ لندن اپریل کے آخر میں نیویارک اپنے مستقر پر واپس آ گیا۔ لندن انڈیا آفس لائبریری میں اس مرتبہ متعدد کوششوں کے بعد مولانا آزاد کے سنٹرل ایشیا اور روس کے سفر کے حالات مفصل مل گئے۔ اب ان کا یہ سیاسی مشن ایک مستقل مقالہ بن سکتا ہے۔ میں نے اس پر کام شروع کر دیا ہے۔ اور انشاء اللہ اگست تک اسے مکمل کر لوں گا۔

پروفیسر بخاری کی تقریریں پاکستانی نمائندے کی حیثیت سے ۵۴ء میں ختم ہو گئی تھیں۔ اس کے بعد یہ اقوام متحدہ کے انڈر سکرٹری ہو گئے تھے۔ اور جو انھوں نے کہا وہ محکمے کے لیے کہا۔ البتہ ان کی ایک تقریر جو سان فرانسسکو میں ہوئی تھی لاجواب تھی۔ میں اس کی نقل آپ کے لیے حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اگر صرف یہی شائع ہو جائے تو سب سے عمدہ رہے گی۔ جو تقریریں انھوں نے پاکستانی نمائندے کی حیثیت سے کیں انھیں بھی جمع کر رہا ہوں۔ مگر اس میں ذرا دیر لگے گی۔

بہرحال پطرس نمبر کے لیے یہ مواد اچھا ہے۔ نیویارک ٹائمز نے ان کی وفات پر جو افتتاحیہ لکھا تھا اسے ضرور شائع کیجیے۔ اس کی نقل USIS کے لاہور کے دفتر سے مل سکتی ہے۔ مرحوم کا سامان سنا ہے کہ واپس پاکستان چلا گیا۔ آپ ان کے صاحبزادے یا ان کی بیوی سے مل کر دریافت کیجیے کہ سامان میں تقریروں کے مسودے آئے ہیں یا نہیں۔ یہ مسودے بہت حفاظت سے رکھتے تھے۔ اور ان کی اپنی تصاویر کا البم نہایت مکمل تھا۔ اس سے بھی آپ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

سنا ہے کہ یہ اپنی سوانح عمری بھی لکھ رہے تھے۔ خدا جانے اس کا مسودہ سامان کے ساتھ گیا ہے یا نہیں اس کے متعلق ضرور دریافت کیجیے۔ اور پھر مرحوم کے ذاتی خطوط بے شمار ہیں۔ ان کا آخری خط جو مرنے سے ایک ہفتہ قبل انھوں نے مجھے لکھا تھا۔ میں آپ کو دے سکتا ہوں۔ آپ نے غالباً ماہِ نو کے جنوری ۱۹۵۹ء نمبر میں پطرس پر میرا مضمون پڑھا ہوگا اس میں بھی میں نے اس خط کا ذکر کیا ہے۔

خاکسار

(آغا محمد اشرف)

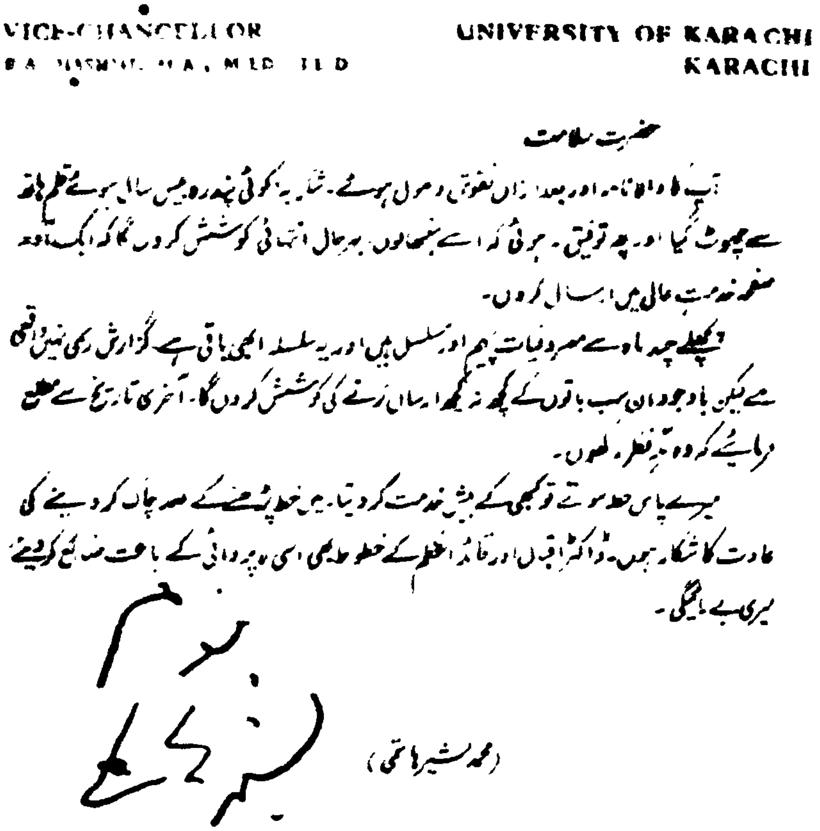

VICE-CHANCELLOR
B A HASHMI, M A, M ED, ED D

UNIVERSITY OF KARACHI
KARACHI

حضرت سلامت

آپ کا والا نامہ اور بعد ازاں نقوش وصول ہوئے۔ شاید کوئی پندرہ بیس سال ہوئے قلم ہاتھ سے چھوٹ گیا اور پھر توفیق ہی نہ ہوئی کہ اسے سنبھالوں۔ بہر حال انتہائی کوشش کروں گا کہ ایک آدھ صفحہ خدمت عالی میں ارسال کروں۔

پچھلے چند ماہ سے مصروفیات پیہم اور مسلسل ہیں اور یہ سلسلہ ابھی باقی ہے گزارش کی نہیں وقفہ ہے لیکن باوجود ان سب باتوں کے کچھ نہ کچھ ارسال کرنے کی کوشش کروں گا۔ آخری تاریخ سے مطلع فرمائیے کہ وہ پیش نظر رکھوں۔

میرے پاس خط ہوتے تو کبھی کے پیش خدمت کر دیتا۔ میں خط پڑھنے کے بعد چاک کر دینے کی عادت کا شکار ہوں۔ ڈاکٹر اقبال اور قائد اعظم کے خطوط بھی اسی بے پروائی کے باعث ضائع کر دیئے میری بے مائگی۔

(محمد بشیر ہاشمی)

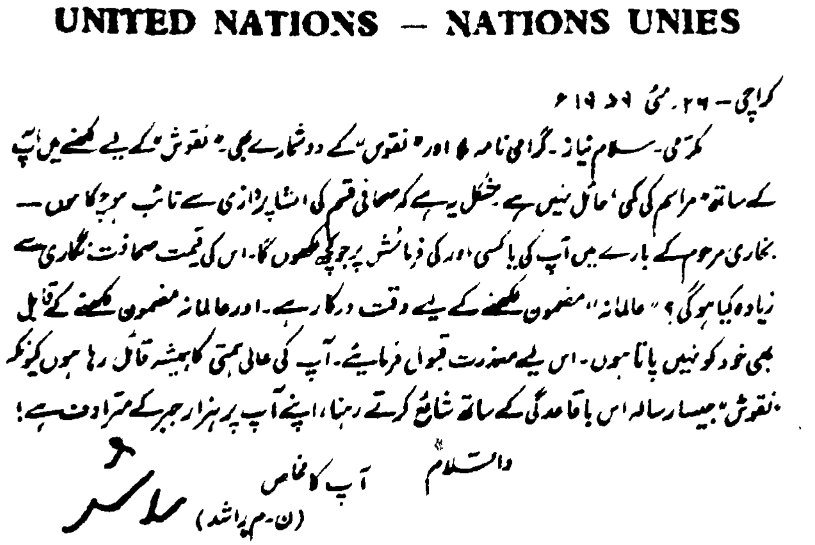

UNITED NATIONS — NATIONS UNIES

کراچی - ۲۶ - مئی ۱۹۵۹ء

مکرمی۔ سلام نیاز۔ گرامی نامہ ملا اور "نقوش" کے دو شمارے بھی۔ "نقوش" کے لیے لکھنے میں آپ کے ساتھ "مراسم کی کمی" حائل نہیں ہے۔ مشکل یہ ہے کہ صحافی قسم کی انشاپردازی سے تائب ہو چکا ہوں — بخاری مرحوم کے بارے میں آپ کی یا کسی اور کی فرمائش پر جو کچھ لکھوں گا۔ اس کی قیمت صحافت نگاری سے زیادہ کیا ہوگی؟ "عالمانہ" مضمون لکھنے کے لیے وقت درکار ہے۔ اور عالمانہ مضمون لکھنے کے قابل بھی خود کو نہیں پاتا ہوں۔ اس لیے معذرت قبول فرمائیے۔ آپ کی عالی ہمتی کا ہمیشہ قائل رہا ہوں کیونکہ "نقوش" جیسا رسالہ اس باقاعدگی کے ساتھ شائع کرتے رہنا، اپنے آپ پر ہزار جبر کے مترادف ہے!

والسلام

آپ کا مخلص

(ن۔م۔ راشد)

طفیل صاحب، تسلیم

یہ قطعی زیادتی ہے کہ آپ مجھ سے زبردستی مضمون لکھوا ہی لیتے ہیں۔ میں پطرس کو بہت ہی کم جانتی تھی۔ مگر اس پر بھی آپ نے پطرس پر لکھنے کے کیا کیا جواز نکالے۔ میرے پاس جو کچھ تھا بلا سوچے سمجھے لکھ دیا ہے۔ آپ جانیں۔

شاہد عرصے سے کہہ رہے ہیں کہ آج تک نقوش کے جتنے نمبر نکلے ہیں۔ یہ طفیل صاحب سے منگواؤ۔ مجھے یہ فرمائش کرتے، تکلف سا ہوتا ہے۔ جس پر شاہد کو اور بھی جلن ہوتی ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا شاہد کی اس ہٹ دھرمی کے بارے میں؟

اچھا ایک مہربانی کیجئے کہ نقوش کا ایک پرچہ مندرجہ ذیل پتہ پر بھیج دیں۔ میری جانب سے،

(عصمت چغتائی) خاکسار عصمت ۔

کراچی

۸۔ جون ۵۹ء

عزیزم طفیل صاحب

پطرس پر ابھی میں نے مضمون مکمل نہیں کیا۔ اور آپ ہیں کہ حسب معمول ہوا کے گھوڑے پر سوار ہیں، اور اپنے تاکیدی خطوط سے حواس مختل کیے دیتے ہیں۔ بقیہ مضمون آپ کو ۲۵-۳۰ جون سے پہلے نہیں مل سکتا۔ پچھلے ایک مہینے سے میری صحت اچھی نہیں۔ ڈاکٹر نے مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے۔ مگر مرحوم سے جو عقیدت مجھے عمر بھر رہی ہے، وہ مجھے مضمون لکھنے پر مجبور کر رہی ہے ورنہ ان دنوں میں کہاں اور لکھنا کہاں، لہذا صبر کیجیے، یا پھر جی کڑا کر کے اپنی سکیم سے نکال دیجیے،

آپ کا

(غلام عباس) عباس

کراچی

۱۸ جولائی ۵۹ء

محترمی۔ تسلیم

۱۔ مجھے افسوس ہے کہ مرزا محمد سعید صاحب سے پطرس کے متعلق مضمون حاصل کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ بہت ضعیف ہیں اور ان سے اصرار کرنا اچھا بھی نہیں لگتا۔ ان کے پاس پطرس کے خط بھی محفوظ نہیں ہیں۔ آمنہ مجید ملک کے نام یہ خط بھیج رہی ہوں۔ اگر پطرس نمبر کی ترتیب

مکمل نہ ہو گئی ہو تو شامل کر لیجئے۔

۲- پطرس نے میرے والد کے انتقال کے موقع پر انگریزی میں ایک مضمون ان کے متعلق دہلی کے انگریزی اخبار Statesman میں لکھا تھا۔ وہ مضمون انگریزی میں ان کی بہترین تحریروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اگر آپ کوشش کر کے کہیں سے وہ حاصل کریں تو اس کا ترجمہ چھاپ سکتے ہیں۔ اس کے لیے دلی خط لکھنا پڑے گا کہ states man والے ۴۳ء کے فائل نکال کر اس میں سے وہ مضمون تلاش کریں۔ مجھے اس کی تاریخ اشاعت یاد نہیں۔ سٹیٹسمین کے نمائندے جو کراچی میں رہتے ہیں آجکل یہاں موجود نہیں ورنہ میں ان سے کہتی۔

پطرس نمبر کب تک نکلے گا؟ امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ والسلام

مخلص

قرۃ العین

(قرۃ العین حیدر)

کراچی

۲۶ مئی ۱۹۵۹ء

محترمی، سلام مسنون، حسب فرمائش بخاری مرحوم کا خط ملفوف ہے جس ملاقات کا انھوں نے ذکر کیا ہے وہ میری ان سے پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ جب میں نے دیارِ غیر میں ان کی موت کی خبر سنی تو سناٹے میں آگیا، ایسے دانائے راز اور زندہ دل صدیوں میں ایک دو ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اللہ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

مستدعی ہوں کہ یہ خط مجھے واپس بھیج دیا جائے، خدا کرے آپ کا مزاج بخیر ہو۔

مخلص

ہاشم رضا

(سید ہاشم رضا)

باسمہ سبحانہ

برادرِ مکرم، تکلیف فرمائی کے لیے شکریہ، میں نے گزشتہ دس روز میں دو دفعہ آپ کے ادارہ فروغِ اردو کی زیارت کی۔ آپ نہ ملے اور مایوس پھر آیا۔

پطرس کے متعلق میری معلومات زیادہ نہیں۔ اگرچہ ابتدا ہی سے خاص تعلق رہا۔ فی الحال وعدہ نہیں کرتا۔ ذرا فوری کاموں سے فارغ ہو جاؤں تو سوچوں گا۔

ہاں بھائی، غالباً مولوی عبداللہ قریشی نے ایک مرتبہ ذکر کیا تھا کہ آپ کے بچے کو کچھ تکلیف ہو گئی تھی۔ میرے جانے کا مقصد یہی تھا کہ اس کے متعلق پوچھوں۔

ملاقات کو بہت دن ہو گئے۔ یہ دعوت تکلف نہیں محض اظہارِ آرزو ہے۔

آپ کا

مہر

(غلام رسول مہر)

ذکاء اللہ روڈ - یونیورسٹی علی گڑھ
۶ جولائی ۵۹ء

مکرمی تسلیم

نقوش کے پطرس نمبر کے لیے مضمون کا تقاضا موصول ہوا تھا۔ جو کچھ بن پڑا لکھ ڈالا ہے۔ دو چار دن میں مکمل کر کے ٹائپسٹ کو دے دوں گا۔ اس میں شاید آٹھ دس دن اور لگ جائیں۔ اندازہ ہے کہ یہ مضمون کم و بیش ۸ — ۱۰ صفحے آپ کے رسالے کے لے لے گا۔

امید ہے آئندہ آپ مضمون کے لیے اس طرح اصرار نہ فرمایا کریں گے مضمون وغیرہ لکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ یہی صورت حال کیا کم تکلیف دہ ہے کہ دوستوں اور عزیزوں کی فرمائش نہ پوری کرنے پر اپنے اوپر نفرین کرنے کا فرض بھی ادا کرنا پڑے۔

یہ نمبر بھی (طنز و مزاح نمبر) اپنے پیشروؤں کی طرح حسب توقع خاطر خواہ ہوا۔ خاص نمبر شائع کرنے میں آج شاید آپ کا کوئی ہمسر نہیں۔ آپ یقیناً اپنے کارناموں پر فخر کر سکتے ہیں اور ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔

امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔

خیر طلب
(رشید احمد صدیقی)

کشمیری محلہ۔ لکھنؤ
۴ جون ۵۹ء

پیارے طفیل۔ تمہارے حکم کی تعمیل میں پطرس کے مضامین پر ایک مختصر سا تبصرہ حاضر ہے۔ ایک اور مضمون میر پر ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کے جواب میں بھی تیار ہے۔ اگر تم چھاپنا گوارا کرو تو وہ بھی بھیج دوں۔ مگر طویل اور ڈاکٹر صاحب کے خیالات کے متعلق میری تردید میں ہے۔

میں بہت بیمار رہتا ہوں اور موت کا منتظر۔ خدا تم کو سلامت اور شاد کام رکھے۔ والسلام

تمہارا اثر
(اثر لکھنوی)

برادرم، تسلیم وغیرہ

آپ کے خط کا جواب دینا ضروری تھا۔ آپ کے احکام کی تعمیل بھی ضروری تھی۔ میں سید ذوالفقار بخاری کے پاس گیا۔ ان سے وعدہ لیا۔ اور وعدے کے علاوہ ایک تصویر بھی حاصل کر لی۔

آپ غالباً مایوس ہو چکے ہوں گے اور میری اس خاموشی کو طرح طرح کے معنی پہنا رہے ہوں گے، مگر میں بڑے بخاری پہ ان کے شایان شان چیز لکھ رہا ہوں۔ جو آپ کو امروز فردا میں مل جائے گی۔

طفیل! خدا کی قسم اب اس سرد جنگ سے جی گھبرا گیا ہے۔ جو میرے اور تمہارے درمیان جاری ہے

اس مفلوج و نیم جاں جسم کی رفتار کے تحت عادی ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔ [illegible] ہے تو شوکت تھانوی نے
کو لہذا ختم کر دو۔ مودودی [illegible] سے ملے تو
[illegible] صاحب کا مضمون [illegible] کا مضمون طالب علموں کا [illegible]

باہمہ
شوکت تھانوی
شوکت

بھائی طفیل صاحب!

حسب وعدہ پطرس نمبر کے لیے مضمون حاضر ہے۔ عنوان ہے "پیر و مرشد"۔ مرحوم کی یاد میں یہ اس لیے نہ رکھا کہ یہ مرحوم کے ایک ذاتی مضمون کا عنوان ہے۔ نقوش پر سینکڑوں مضامین لکھے جائیں گے لیکن اس مضمون میں آپ کو چند نئی باتیں اور واقعات ملیں گے۔ تفصیل ارسال حسب معمول دیر سے کر رہا ہوں۔ امید ہے حسب سابق آپ فراخدلی سے معاف کر دیں گے۔

نقوش کا طنز و مزاح نمبر بہت پسند آیا۔ کارٹون اس نمبر کی جان کہے جا سکتے ہیں۔ مجھے یہ کارٹون اتنا پسند آیا۔ کہ ہر واقف ناواقف کو دکھاتا پھرتا ہوں۔ میری طرف سے کارٹونسٹ کو مبارکباد دیجئے۔ اور اس کا نام اور پتہ بھی تحریر فرمائیے۔ بخدا یہ شخص لائق قدر فن کار ہے۔

مضمون کی رسید سے مطلع فرمائیے گا۔ خطوط کا جواب نہ دینا یا بہت دیر سے دینا میری پرانی عادت یا خباثت ہے۔ مجھے آپ کے خط مل گئے تھے۔ طویل اور مجرمانہ خاموشی کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

"آج کل" دہلی میں میرا ایک مضمون "پطرس" پر چھپا تھا۔ افسوس کہ وہ میرے پاس نہیں۔ لاہور ہی رہ گیا تھا۔ اگر کسی لائبریری سے (جہاں کہ "آجکل" کی پرانی فائلیں ہوں) پتہ کریں تو شاید مل جائے ویسے عرش ملسیانی حال چیف ایڈیٹر "آجکل" آپ کے مداحوں میں سے ہیں۔ اگر انھیں لکھیں۔ تو پرانی فائل میں سے یہ مضمون نقل کروا کر آپ کو بھیج سکتے ہیں مضمون بُرا نہیں تھا۔ پطرس نے اسے خود سراہا تھا۔

کنھیا لال کپور (کنھیا لال کپور)

۶/۴ بلاک II سی۔ ناظم آباد۔ کراچی
۲۴۔ مئی ۵۹ء

بھائی طفیل صاحب۔ السلام علیکم

مئی کا نقوش ملنے کے بعد۔ آپ کو کئی خط لکھے۔ مگر یقیناً ان میں سے کوئی بھی آپ کو نہ ملا ہوگا کیونکہ ان میں سے کوئی بھی یہاں سے روانہ نہ ہو سکا۔

خیر وہ سب خط آپ کو ایک ساتھ بھیجے دے رہا ہوں:۔

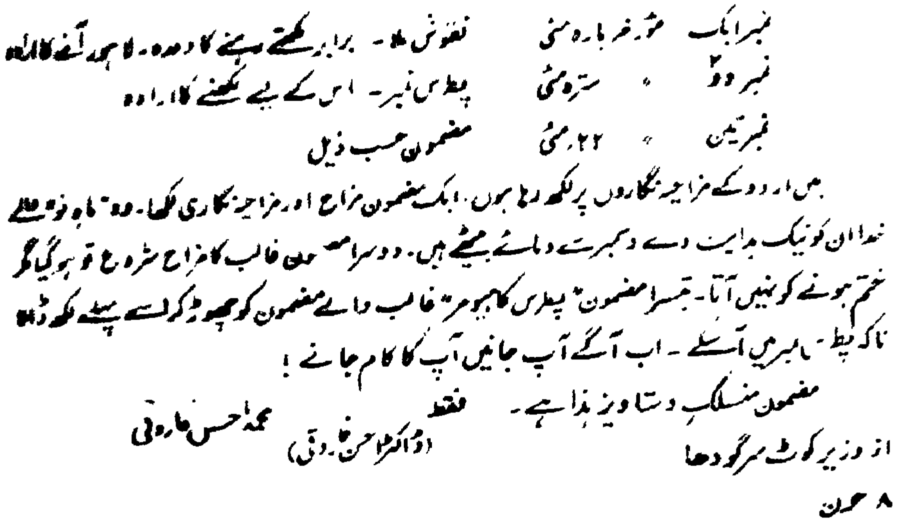

نمبر ایک   مؤرخہ بارہ مئی   نقوش ملا۔ برابر لکھتے رہنے کا وعدہ۔ لاہور آنے کا ارادہ
نمبر دو   ؍؍   سترہ مئی   پطرس نمبر۔ اس کے لیے لکھنے کا ارادہ
نمبر تین   ؍؍   ۲۲ مئی   مضمون حسب ذیل

میں اردو کے مزاحیہ نگاروں پر لکھ رہا ہوں۔ ایک مضمون مزاح اور مزاحیہ نگاری لکھا۔ وہ "ماہ نو" والے خدا ان کو نیک ہدایت دے دسمبر سے دبائے بیٹھے ہیں۔ دوسرا مضمون غالب کا مزاح شروع تو ہو گیا مگر ختم ہونے کو نہیں آتا۔ تیسرا مضمون "پطرس کا ہیومر" غالب والے مضمون کو چھوڑ کر اسے پہلے لکھ ڈالا تاکہ پطرس نمبر میں آسکے۔ اب آگے آپ جانیں آپ کا کام جانے!

مضمون منسلک دستاویز ہذا ہے۔   فقط

محمد احسن فاروقی
(ڈاکٹر احسن فاروقی)

از وزیر کوٹ سرگودھا
۸ جون

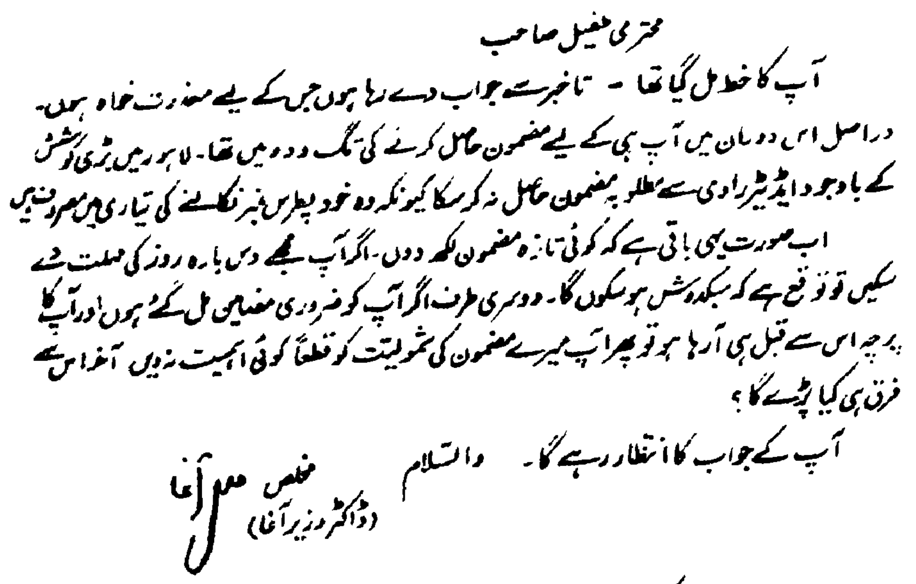

محترمی طفیل صاحب

آپ کا خط مل گیا تھا۔ تاخیر سے جواب دے رہا ہوں جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ دراصل اس دوران میں آپ ہی کے لیے مضمون حاصل کرنے کی تگ و دو میں تھا۔ لاہور میں بڑی کوشش کے باوجود ایڈیٹر راوی سے مطلوبہ مضمون حاصل نہ کر سکا کیونکہ وہ خود پطرس نمبر نکالنے کی تیاری میں مصروف ہیں۔

اب صورت یہی باقی ہے کہ کوئی تازہ مضمون لکھ دوں۔ اگر آپ مجھے دس بارہ روز کی مہلت دے سکیں تو توقع ہے کہ سبکدوش ہو سکوں گا۔ دوسری طرف اگر آپ کو ضروری مضامین مل گئے ہوں اور آپ کا پرچہ اس سے قبل ہی آرہا ہو تو پھر آپ میرے مضمون کی شمولیت کو قطعاً کوئی اہمیت نہ دیں۔ آخر اس سے فرق ہی کیا پڑے گا؟

آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔   والسلام

مخلص
وزیر آغا
(ڈاکٹر وزیر آغا)

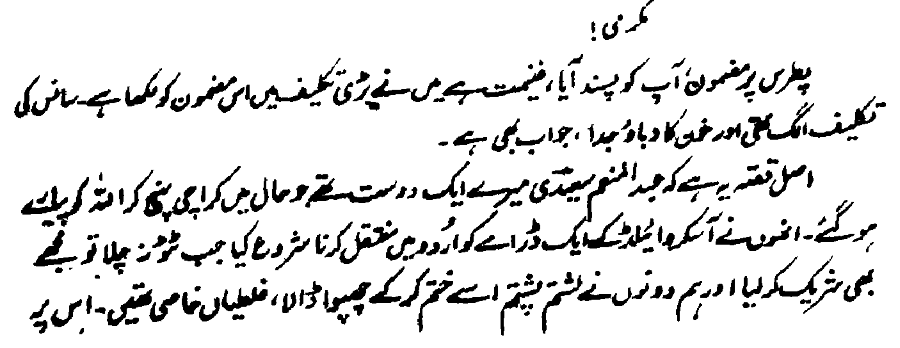

مکرمی!

پطرس پر مضمون آپ کو پسند آیا، غنیمت ہے۔ میں نے بڑی تکلیف میں اس مضمون کو لکھا ہے۔ سانس کی تکلیف الگ تھی اور خون کا دباؤ جدا، جواب بھی ہے۔

اصل قصہ یہ ہے کہ عبدالمنعم سعیدی میرے ایک دوست تھے جو حال میں کراچی پہنچ کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انھوں نے آسکر وائیلڈ کے ایک ڈرامے کو اردو میں منتقل کرنا شروع کیا جب ٹٹو نہ چلا تو مجھے بھی شریک کر لیا اور ہم دونوں نے لشتم پشتم اسے ختم کر کے چھپوا ڈالا، غلطیاں خاصی تھیں۔ اس پر

محمد دین تاثیر نے ایک سخت تنقید کی جو مخزن (جسے حفیظ نکالتے تھے) میں چھپی۔ میں نے اس کا جواب لکھا تو پنجاب کے پرچوں نے تاثیر کے خلاف ہونے کی وجہ سے شائع کرنے سے انکار کر دیا۔ انھیں دنوں یو پی سے ایک نیا پرچہ نکلا تھا اس میں یہ جواب میں نے چھپوا دیا جو جواب کم اور سب و شتم زیادہ تھا۔ اس پر محمد دین چپ رہے۔ انھیں دنوں میرے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ غنچۂ تبسم شائع ہونے لگا تو میں نے اس مضمون کو بھی اس مجموعہ میں شریک کر دیا اور عبدالمنعم سعیدی نے اس کتاب کے مقدمے میں بعض چوٹیں بعض لوگوں پر کیں۔ اتفاق سے انھیں دنوں میری خط و کتابت پطرس سے ہوئی تو انھوں نے اس قصے کو چھیڑا۔ میں نے اعتراف کر لیا کہ غلطیاں واقعی خامی ہیں اور اگر ان غلطیوں کی فہرست وہ بنا دیں تو میں آئندہ اس میں ترمیم کروں گا۔ چنانچہ پطرس نے بڑی مہربانی سے اصل ڈرامے سے اس کا مقابلہ کر کے ایک ضخیم فہرست ان غلطیوں کی بنا دی اور مشورہ دیا کہ اب اس کا دوسرا اڈیشن نکالنے کے بجائے اسے نام اور ذرا سے کردار بدل کر "اُردا دو"۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا ہے۔

غنچۂ تبسم پر مقدمہ، تعارف، وغیرہ کئی ایسی چیزیں تھیں انھیں دیکھ کر ڈاکٹر تاثیر نے مع دیگر چند احباب کو ساتھ لے کر غنچۂ تبسم پر ایک مضمون لکھا جو اس کی مخالفت میں تھا۔ یہ مضمون نیرنگ خیال میں "نیاز مندانِ لاہور" کے نام سے طبع ہوا۔ میرا خیال یہی تھا کہ پطرس اور سالک بھی اس میں شریک ہیں مگر پطرس نے مجھے لکھا کہ میں اس مضمون سے واقف ضرور ہوں اور اس کی تحریر کی اطلاع مجھے ضرور تھی مگر اُس کے لکھنے میں شریک نہیں ہوں۔'

یہ ایک ہی مضمون میرے اور غنچۂ تبسم کے خلاف "نیاز مندانِ لاہور" کے نام سے چھپا ہے۔ اب نہ تو یہ مضمون ہی میرے پاس ہے اور نہ اس کا سنہ ہی یاد ہے چونکہ اس کا جواب لکھ کر میں نے نیرنگ خیال میں چھپوانا چاہا اور نیرنگ خیال نے اس کے چھاپنے سے انکار کر دیا اس لیے میں نے نیرنگ خیال میں لکھنا انتقاماً چھوڑ دیا۔

احمد جمال پاشا نے حال ہی میں پطرس پر ایک مضمون قومی زبان کراچی میں لکھا ہے جس میں انھوں نے غنچۂ تبسم کے خلاف نیاز مندانِ لاہور والے مضمون کو پطرس کا بتایا ہے، چونکہ خود پطرس نے مجھے لکھا تھا کہ اس سازش میں وہ شریک نہیں ہیں اس لیے میں نے اس مضمون کو پطرس کے مضامین میں شمار نہیں کیا۔

آپ کا

تمکین کاظمی

(تمکین کاظمی)

مکرمی طفیل صاحب! سلام مسنون

میں سرکار کو یہ خط لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ نقوش برسوں سے خاص نمبر نکال رہا ہے۔ اور خاص نمبر نکالنے میں بڑے بڑے رسالوں پر سبقت لے گیا ہے۔ اگر ممکن ہو سکے تو ایک نمبر میری تجویز پر ترتیب دیا جائے اور وہ نظم نمبر ہو اور اس میں ساری دنیا کی بہترین نظمیں ہوں۔

میں پطرس نمبر کا ٹائیٹل ضرور بنا دوں گا۔ آپ سے بھی تعلق خاطر ہے اور پطرس سے بھی زندگی بھر کا ساتھ تھا۔ ہو سکا تو مضمون[1] بھی لکھ دوں گا۔ مگر ادھر میری کچھ دنوں سے طبیعت بڑی خراب ہے۔

آپ کی نوازش کا شکریہ —— کہ آپ ہر موقع پر مجھے بھی یاد رکھتے ہیں اور ہمارے لیے آپ کے رسالے ادبی سرمایہ ہیں جو ہم حاصل کرتے ہیں۔

آپ کا
چغتائی
(عبدالرحمٰن چغتائی)

خطوط پڑھ لیے آپ نے، اچھا ہوا۔ نہ چھپنے سے ان کا چھپنا بہتر ہی ہوا ہوگا۔ وہ باتیں جو ان کی عدم اشاعت کے باعث معلوم نہ ہوتیں اب آپ کو معلوم ہو گئیں۔ اگر آپ نے ان خطوط کی اشاعت سے کچھ پایا ہے تو میں سرخرو، ورنہ مجرم تو ہوں ہی، یہ اعزاز مجھ سے کون چھین سکتا ہے۔

مرحوم کے کئی قریبی دوست لاہور میں تھے۔ ان سے خط و کتابت نہیں ہوئی۔ باتیں ہوئی ہیں۔ ایک دو تحریریں خط کی صورت میں مل گئیں۔ وہ پیش کر دی گئی ہیں۔ ان حضرات سے جو جو باتیں ہوئیں۔ وہ اس نمبر کی صورت میں آپ کے سامنے ہیں۔ مشوروں کی صورت میں، تحریر کی صورت میں تکمیل کی صورت میں۔

اس پرچے کی ابتدا پطرس پر شخصی نوعیت کے مضامین سے ہوتی ہے۔ ان مضامین پر الگ الگ لکھنا طوالت کا باعث ہوگا۔ ویسے اس حصہ میں کوئی بھی مضمون ایسا نہیں۔ جو محض مضمون ہو اور کچھ نہ ہو۔ ان میں سے ہر مضمون میں پطرس سے ملاقات ہوتی ہے —— مرحوم کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں —— اور یہ بھی کہ مرحوم احباب سے ہمکلام ہیں اور احباب مرحوم سے —— اس سے زیادہ مضمون اپنا کرشمہ کیا دکھا سکتے تھے۔

اس کے بعد پطرس کے فن پر چار ہلکے پھلکے مضمون ہیں۔ اس حصہ کو ہم نے جان بوجھ کر بھاری بھرکم نہیں بنایا۔ اس لیے کہ مرحوم کے فن پر اب تک بہت کچھ لکھا گیا ہے بہت کچھ لکھا جائے گا۔ اصل میں ہم چاہتے ہی نہ تھے کہ جو کام آئندہ ہو سکتا ہو۔ اُسے بھی آج کرکے اپنے کام کو اور بڑھا لیں۔ ہم نے اپنے ذمہ وہ کام لیا۔ جو آئندہ چل کر مشکل ہو جاتا۔ پھر بھی مرحوم کے فنی محاسن پر یہ مضامین کارآمد ہیں اور اس نمبر میں ان کی اسی حد تک ضرورت تھی۔

یہاں تک تو جو کچھ پیش کیا گیا۔ وہ یا تو مرحوم کی شخصیت پر تھا یا فن پر۔ اب مرحوم کے فن پاروں کا آغاز ہوتا ہے۔ ابتدا

---

[1] (چغتائی صاحب اپنی علالت کی وجہ سے مضمون نہیں لکھ سکے۔ مگر انھوں نے پطرس کی شخصیت اور فن کو اپنے لازوال خطوط کے ذریعہ ظاہر کر دیا ہے۔ نقوش کا سرورق چغتائی صاحب ہی کی اعجاز کاریوں کا شاہکار ہے۔)

مرحوم کی منظوم تخلیقات سے ہوتی۔ مرحوم نے اردو میں بھی شعر کہے، فارسی میں بھی۔ کہا بہت کچھ، مگر شاعری کو کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ یہی وجہ کہ کہا، اور ضائع کر دیا۔ بعض شعری کارنامے صرف تفریحِ طبع کا سامان تھے اور بس۔ چند ایک چیزیں جو محفوظ ہو گئیں۔ وہ پیش کر دی گئی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ مرحوم اردو سے زیادہ اچھے فارسی میں شعر کہتے تھے۔ بیدل شاہجہانپوری مدیر مخزن نے ۱۹۲ء میں لکھا تھا:۔

> ایک عزیز زبانِ خوش نوا کا ہم صفیرانِ عجم ہونا اور اچنبھا۔ سمجھا جاتا اگر آئینہ حیرت ہے تو یہ نظر قطعاً مستحق ہے کہ معجزۂ ادب کہی جائے۔ سید احمد شاہ بخاری میرے جذباتِ دوستی کی آرزو اور اعترافِ قابلیت کا ایمان ہیں۔ اس لیے بجائے حقیقت نمائی کے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خود اربابِ کیف کے ذوقِ سلیم کو دوبارہ اس شعر کے تاثرِ لطیف سے متوجہ کروں ؎

نشانِ سجدہ کام اہلِ نظر را آستاں باشد
کہ زیرِ سجدہ ہائے شوق می آں آستاں گم شد

منظومات کے بعد وہ تمام مضامین پیش خدمت ہیں۔ جو مرحوم کا زندگی بھر کا سرمایہ ہیں۔ انھیں یکجا اور اکٹھا کرنا بے حد مشکل کام تھا۔ اس لیے کہ آج کسی بھی لائبریری میں، اچھے اچھے رسالوں کی بھی جلدیں محفوظ نہیں۔ ہم نے پہلے تو لائبریریوں سے مواد حاصل کیا۔ مگر وہ بسلسلۂ پطرس ایسا وقیع نہ تھا جو آپ حضرات کے سامنے پیش کر سکتے۔ چنانچہ ذاتی لائبریریوں کی خاک چھانی بھی، پھانکی بھی، لاہور میں بھی، لاہور سے باہر بھی۔ اس کام کے سلسلے میں سیلاب سے بھی واسطہ پڑا۔ کہیں اٹکے، کہیں بھیگے، کہیں پھسلے، کہیں تیرے۔ غرض جیسے بھی بن پڑا یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ ہم مرحوم کی اس سے بڑی کوئی خدمت نہیں کر سکتے تھے۔ ہم نے ان کے تقریباً سارے کام کو یکجا کر دیا ہے۔ ورنہ قارئین کے ذہن میں تو مرحوم کی بس ایک چھوٹی سی کتاب تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ ساری چیزیں مرحوم کے تسلیم شدہ معیار کے مطابق نہیں ہیں۔ مگر ان سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ یہ صرف مزاح نگار نہ تھے۔ بلکہ ادب کے ہر موضوع پر نہ صرف لکھ سکتے تھے بلکہ اس میں ڈوبے ہوئے تھے۔

بعض کتابیں ایسی بھی ہیں، جن کا ترجمہ تو مرحوم ہی نے کیا تھا۔ مگر وہ ان کے نام سے نہیں چھپی تھیں۔ جن میں "تعلیم خصوصاً اوائلِ طفلی میں" اور "نوعِ انسان کی کہانی" اور دیہات میں برائے اسکاؤٹ کا کام" ہیں۔ ایسے کاموں کا سراغ لگانا آسان کام نہ تھا۔ مگر ہم نے یہ کام بھی کیا۔ یہ کتابیں بچوں کے لیے ٹیکسٹ بک کمیٹی پنجاب نے ترجمہ کرائی تھیں۔ ان کا ریکارڈ موجود ہے۔ اس نمبر میں ان کتابوں میں سے بھی چند ٹکڑے دے دئے گئے ہیں۔

مرحوم کے تنقیدی اور فنی مضامین بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ خواہ وہ دیباچوں کی صورت میں ہوں۔ خواہ مضامین کی صورت میں۔ نتیجہ خیز باتیں کرنے میں، فن کی باریکیوں اور اس کی تہ تک پہنچنے میں، جیسی نظر ان کی تھی کم کسی کو نصیب ہوئی۔ زیرِ نظر شمارہ میں دیکھیے، تو کیا کچھ ہے اور کتنے پائے کا ہے۔

ڈرامہ سے بھی مرحوم کا چولی دامن کا ساتھ رہا۔ اچھے ڈراموں کے ترجمے کیے۔ ڈرامے ڈائریکٹ کیے۔ ڈراموں میں کام کیا۔ اور خوب خوب داد حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج لاہور کی ڈرامیٹک کلب کے نکھار میں ان کا بڑا ہاتھ رہا۔ چند ڈرامے اس نمبر کی بھی زینت ہیں۔ یہ ڈرامے کاغذ پر بھی خوب ہیں۔ جب یہ سٹیج ہوئے ہوں گے اور خود بخاری صاحب اسٹیج پر موجود ہوں گے۔ نہ جانے اس وقت

کیا قیامت برپا ہوئی ہوگی۔

اس پرچے میں ایک جھگڑے کی بات بھی ہے۔ وہ ہے نیاز مندانِ لاہور کا سلسلہ، پہلی بات تو اس میں جھگڑے کی یہ ہے کہ بعض حضرات ان تحریروں کو صرف بخاری صاحب کی ماننے کے لیے تیار نہیں۔ میں ایک اور جگہ بھی عرض کر چکا ہوں کہ یہ ٹھیک ہے کہ صلاح مشورے کی حد تک، سالک صاحب، تاثیر صاحب اور امتیاز صاحب شریک رہے مگر انہیں لکھا پطرس ہی نے۔ چند ایک اسی نوع کی چیزیں ڈاکٹر تاثیر نے بھی لکھی تھیں۔ مگر ہم نے انھیں پیش نہیں کیا۔ ہم جو تین مضمون پیش کر رہے ہیں۔ یہ یقیناً پطرس ہی کے ہیں۔ تفصیل میں کیا جائیں۔ ایک کا تو اصل مسودہ موجود ہے۔ دوسرے حکیم یوسف حسن ایڈیٹر "نیرنگِ خیال" اس کی شہادت دیتے ہیں (بھلا ایڈیٹر کو مضمون نگار کا پتہ نہ ہو) پھر مرحوم کے قریبی دوست بھی میری ہی بات کی تصدیق کرتے ہیں۔ مثلاً سالک صاحب، تاج صاحب

"غنچۂ تبسم" کے مصنف نے ایک بات پطرس کے حوالے سے کہی ہے کہ وہ "مضمون میرا لکھا ہوا نہیں"۔ میرے نزدیک یہ حوالہ قصے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اس مضمون پر ایڈیٹر کا یہ نوٹ بھی تھا:۔

"جس ذریعہ سے ہمیں یہ مضمون ملا ہے۔ اس سے اور مضمون کی گرانقدری سے ہمیں چار احباب پر شک ہو سکتا ہے۔ پروفیسر بخاری، سید امتیاز علی تاج، پروفیسر تاثیر اور قبلہ سالک صاحب۔ ان چار پر اس لیے کہ ایسا وقیع مضمون لکھنے والے "نیاز مند" یہی اربعہ عناصر ہو سکتے ہیں۔ الگ الگ شک کے وجوہ یہ ہیں: (۱) تاثیر صاحب اس سے قبل تمکین کاظمی صاحب کے وائلڈ کے ڈرامہ کے ترجمہ پر لکھ چکے ہیں جس کا آج تک جواب نہیں دیا جا سکا (۲) سلاست اور روانی تاج کی سی ہے (۳) ادبی تنقید اور زباندانی حضرت سالک کی آئینہ دار ہیں (۴) شوخیٔ کلام اور انداز بیان سید احمد شاہ بخاری کی چغلی کھا رہے ہیں۔ بلکہ کئی فقرے تو مضامینِ پطرس ہی سے لیے گئے معلوم ہوتے ہیں۔ مضمون کی ہم آہنگی اور نگارش کی یگانگت سے ظاہر ہوتا ہے کہ چاروں کا کام نہیں، ایک ہی قلم کی تراوش ہے۔ حقیقت کچھ ہو جملے شکوک ان چاروں کو گھیرے ہوئے ہیں۔ بخاری صاحب کو زیادہ، امتیاز، سالک اور تاثیر کو کم"۔

ایڈیٹر لفظی پینتروں کے ساتھ واضح اشارے تو کرتے ہیں کہ یہ مضمون پطرس ہی کا لکھا ہوا ہے۔ اس پر بھی کسی کو شک ہو تو کیا کیا جائے۔

میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کہ یہ مضمون لکھ کر بخاری صاحب نے اچھا کیا تھا یا بُرا۔ مجھے تو ان کے بارے میں یہ عرض کرنا ہے کہ کم از کم یہ تینوں مضمون پطرس ہی کے ہیں۔ بس! — زیادہ وضاحت میں گیا یا اپنی رائے کو دخل دیا تو گتھم گتھا ہونے کے بڑے امکانات ہیں۔

مرحوم اعلیٰ پایہ کے مقرر بھی تھے۔ بلاشبہ ان کی تقریروں کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے:۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

یہاں بخاری صاحب کی دو ایک تقریریں پیش کی جا رہی ہیں تاکہ ان کی لسانی خوبیوں کا بھی اندازہ ہو سکے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ یو۔ این۔ او میں تقریر کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ ساری دنیا گوش برآواز ہوتی ہے۔ جن کے سامنے کچھ کہنا ہوتا ہے۔ وہ مانے ہوئے مدبر ہوتے ہیں۔ ایسے گھاگ قسم کے لوگوں کے سامنے اپنی بات کہنا اور پھر منوانا خالہ جی کا گھر نہیں۔ اپنی ایک تقریر کے بارے (جو ہم بھی پیش کر رہے ہیں) مرحوم ہی نے ایک خط میں لکھا تھا:۔

> "پھر یہ آیا مسئلہ تونس میں مستغرق رہا۔ خدا نے اس بارے میں مجھے ایسا سرخرو کیا کہ ناشکری کا کوئی بھی توجیہ باقی نہ رہا۔ امریکہ کے اخباروں نے وہ مجھے سر پر اٹھایا کہ شاید ہی یو این او میں کسی کو نصیب ہو۔ ابھی تک تعریفی خطوط کا تانتا لگا ہوا ہے۔ اور ریڈیو اور ٹیلی وژن والے ہر وقت میرے تعاقب میں رہتے ہیں۔"

اس نمبر میں مرحوم کی اکلوتی مگر معرکۃ الآرا کتاب "پطرس کے مضامین" بھی شامل کر دی گئی ہے۔ بظاہر اس کا شامل کرنا عجیب سا لگتا ہے مگر ہم نے اس نمبر کو مرحوم کے تمام تر کارناموں سے مزین کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس لیے اس کی بھی اشاعت ناگزیر تھی۔ دوسری بڑی وجہ یہ کہ منتشر مضامین کو یکجا کرنے کے بعد ہمیں یہ خیال گذرا کہ ان مضامین سے مرحوم کی اتنی عظمت کا احساس نہیں ہوتا۔ جتنا کہ پہلے سے موجود ہے (اس لیے کہ اس میں تو نام کو بھی کچھ موجود ہے) اسی خوف سے کہ کوئی مرحوم کے انہی منتشر مضامین کو سامنے رکھ کر غلط رائے قائم نہ کر بیٹھے۔ اس کتاب کو شامل کیا گیا۔ تیسری بات یہ تھی کہ مرحوم کا سکہ مزاح نگاری کے سلسلے میں رائج ہے۔ منتشر مضامین میں مزاحیہ انداز کی چیزیں کم تھیں[1]

پطرس کے خطوط اتنی تعداد میں پہلی مرتبہ منظر عام پر آئے ہیں۔ یہ خطوط کیسے ہیں؟ ادب میں کیا مقام رکھیں گے؟ میری ناقص رائے میں اس کا فیصلہ بھی اس سے مختلف نہ ہوگا۔ جو مزاح نگاروں کے دربار میں "پطرس کے مضامین" کو حاصل ہے۔ یہ خوش گفتاری کے تمام آداب کے ساتھ بولتے ہیں۔ اپنا بنا لیتے ہیں۔ پڑھنے لگو تو ڈوب جائیے گا۔ سرشاری کی کیفیت پائیے گا۔ پھر نئی ترکیبیں سامنے آتی ہیں۔ نئے استعارے سامنے تیرتے ہیں۔ جو موہ لیتے ہیں۔ اتر جاتے ہیں — ابوالکلام اور نیاز فتحپوری کی طرح پطرس فرضی خطوط کے انداز میں مضمون نہیں لکھتے۔ بلکہ ان کا واقعی کوئی مخاطب ہوتا ہے اور یہ واقعی خط ہوتے ہیں جب کوئی ابوالکلام اور نیاز فتحپوری کے مضمونوں کو (بلا شبہ بلند پایہ ہیں) خطوط سمجھ کے پڑھتا ہے تو بڑا ظلم کرتا ہے۔ غالب بھی بعض خطوط یہ سمجھ کے لکھتے تھے کہ یہ چھپیں گے۔ جیسا کہ نواب امیرالدین احمد خاں نے غالب سے کہا۔ آپ کے خط چھپتے ہیں۔ ایک خط میرے نام بھی لکھ دیجئے تاکہ وہ بھی چھپ جائے۔ چنانچہ غالب نے خط لکھا اور وہ چھپا — اس کے برعکس یہ خط، خط ہی ہیں — غالب کے بعد اتنے دلکش خط اور کتنے ادیبوں نے لکھے؟ آپ سوچیں۔ میں ایک دو سطریں اور لکھ لوں۔

ہیمرشولڈ نے کہا ——— "سیاست دان میں جو خوبیاں ہونی چاہئیں۔ وہ احمد شاہ بخاری میں موجود تھیں۔

بشیر احمد ہاشمی نے کہا ——— بخاری صاحب محفل سازی اور محفل آرائی میں فرد تھے۔

رشید احمد صدیقی نے کہا ——— پطرس نے اردو میں سب سے کم سرمایہ چھوڑا۔ مگر کتنا اونچا مقام پایا۔

عبدالمجید سالک نے کہا ——— احمد شاہ بخاری کی موت علم و ادب اور خلوص و محبت کی موت ہے۔

امتیاز علی تاج نے کہا ——— پطرس کی ڈرامے پر بڑی نظر تھی۔ کسی ڈرامے میں خود کام کیا تو اپنی ایکٹنگ کا بھی لوہا منوایا۔

صوفی تبسم نے کہا ——— بخاری کی حیثیت صرف استاد کی نہ تھی بلکہ وہ طالب علموں کے مشفق رہنما اور دوست تھے۔

عصمت چغتائی نے کہا ——— نہ جانے کیوں پطرس بھا گئے اور ایک جان چھوڑ، ہزار جان سے ان پر عاشق ہو گئے۔

فیض احمد فیض نے کہا ——— بخاری صاحب عالم بھی تھے، ادیب بھی، استاد بھی، ہم جلیس بھی، بذلہ سنج بھی، خوش گفتار بھی، سخت گیر منتظم بھی، بے فکر بانکے بھی اور آخر میں مدبر اور صاحب سیاست بھی۔

---

[1] یوں بھرپور قسم کا نمبر پیش کرنے کے سلسلے میں ادارہ نقوش مولانا عبدالمجید سالک کا شکر گزار ہے کہ انھوں نے بعض شرائط کے ساتھ ہمیں بیگم پطرس سے مضامین کی اشاعت کی اجازت دلوا دی۔ اگر ہمیں مولانا سالک اور بیگم پطرس کا تعاون حاصل نہ ہوتا۔ تو یہ نمبر چھپ ہی نہیں سکتا تھا — ادارہ محترمہ بیگم صاحبہ کا بے حد ممنون ہے۔

عالمی شہری

جب سے کپلنگ نے "مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب" کا گیت گایا ہے اسی دن سے ہم مختلف اور متصادم معاشروں کے تعلقات کے بارے میں زیادہ سوچ بچار کر رہے ہیں۔ ہمیشہ ہم اس فکر میں رہتے ہیں کہ کوئی ایسا مرکب مل جائے جو ہر ایک کی بہترین خوبیوں کو محفوظ کر سکے۔

کبھی کبھی ہمیں کسی ایسی ہستی کی موجودگی کا یقین ہو جاتا ہے جو ہمارے تخیلات کو عمل کی دنیا میں لے آتی ہے۔ ابھی ابھی ہمیں پاکستان کے سفیر پروفیسر احمد شاہ بخاری کی بے وقت موت کی شکل میں ایسی ہی ایک شخصیت کے ضیاع کا سامنا ہوا ہے جنہوں نے اقوام متحدہ میں رئیس شعبۂ اطلاعات کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ وہ صحیح معنوں میں عالمی شہری تھے۔

پروفیسر بخاری کا تعلیمی پس منظر مشرق اور مغرب ـــــ پنجاب یونیورسٹی اور کیمبرج ـــــ دونوں کو آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ وہ دنیا کے دونوں حصوں کی زبانوں کے قادر الکلام شاعر تھے۔ انہوں نے مشرق اور مغرب دونوں کی زبانوں اور محاوروں کا راگ الاپا۔ وہ مشرق اور مغرب دونوں کے نزدیک عالم تھے۔

لیکن مشرق اور مغرب کا یہ ملاپ اس سے بھی زیادہ گہرا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک مثالی انسان تھے۔ ـــــ حاضر جواب، شائستہ، دانش مند، زندہ دل، اور گرم جوش۔ وہ خود پسندی کی نمائش سے پاک تھے، انہیں زندگی سے اُنس تھا۔ وہ اس دنیا میں بسنے والے لوگوں سے ان کی قومیت رنگ، نسل، مذہب، یا پیشے کا خیال کئے بغیر محبت کرتے تھے۔ ان کی روح ان کے ذہن کی طرح تنگ سرحدوں کی قائل نہ تھی۔

ہزاروں امریکی جنہیں ان سے ذاتی شناسائی کا شرف حاصل ہے ان کی موت کو اپنا ذاتی رنج محسوس کر رہے ہیں سب سے بڑھ کر اس لئے کہ وہ دوست تھے۔ لیکن یہ نقصان ذاتی نہیں بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہے۔ دنیا ایک ایسے شخص کے اٹھ جانے سے مفلس تر ہو گئی ہے جو ہمیں بہتر طریق سے یہ دکھاتا تھا کہ آسودہ مستقبل کے لئے کون کون سی اچھی باتیں ممکن ہیں۔

(ترجمہ)   (نیویارک ٹائمز مورخہ ۷ دسمبر ۱۹۵۸ء کا اداریہ)

پروفیسر بخاری — آخری لمحات

مارلی ہیمین

"وہ آخری لمحے تک زندہ رہے" ان کے ڈاکٹر کا قول ہے "وہ کام کرتے ہوئے مرے"۔ اقوام متحدہ میں ان کے ایک رفیق کا کہنا ہے کہ دونوں حضرات پروفیسر احمد شاہ بخاری سے بہت قریبی تعلق رکھتے تھے ان کے ڈاکٹر ان کے دوست بن گئے تھے۔ اور انہوں نے بخاری کے سفر زندگی کی رفتار کو حتی المقدور کم کرنا چاہا تھا۔ مگر پروفیسر صاحب (جیسا کہ لوگ انہیں محبت سے کہتے تھے) یہ نہیں چاہتے تھے کہ اپنے معذور ہونے کا اعلان کر دیں۔ گو وہ چند سال سے اچھے خاصے بیمار رہتے تھے۔ ان پر دل کا پہلا دورہ ۱۰ اگست ۱۹۵۳ء کو پڑا۔ پروفیسر بخاری کو اس کا تو شدید احساس تھا کہ وہ جب ہسپتال میں طبی مشورے کے لئے گئے تو انہوں نے اپنا نام "مسٹر پاٹرن" لکھوایا۔ اس دورے کی وجہ سے وہ کمزور ہو گئے تھے لیکن انہوں نے اقوام متحدہ کے انڈر سیکرٹری کا کام شروع کرنے سے احتراز نہ کیا۔ بلکہ چارج لینے سے قبل ہی مسٹر ڈیگ ہیمرشیلڈ کے ساتھ چین کے تاریخی دورے میں کام شروع کر دیا۔

وہ بڑی مصروف زندگی بسر کرتے تھے۔ انہیں کسی چیز کا خوف نہ تھا لیکن جب کبھی ان پر دل کا دورہ پڑتا تھا وہ بے ہوش ہو جاتے تھے تو انہیں آکسیجن میں رکھا جاتا تھا۔ وہ کچھ دن آرام کر کے پھر اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ اور پھر اس طرح مصروف نظر آتے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ گذشتہ چند سال سے ان کی صحت بری طرح گرنے لگی تھی۔ دل کے دورے جلد جلد پڑنے لگے تھے۔ ان کی صحت جلد گرنے کے کئی وجوہ تھے۔ ان کو زندگی سے انتہائی والہانہ محبت تھی۔ پھر وہ ریشہ دوانیاں جو ان کے خلاف ہوتی رہیں۔ جب کوئی تیز اور ذہین آدمی کسی بین الاقوامی ادارے میں اونچی جگہ حاصل کر لیتا ہے تو اس کی باتیں ہوتی ہی رہتی ہیں۔

جب مسٹر ہیمرشولڈ کی مدت عہدہ کے پانچ سال ختم ہو گئے۔ اور ان کے نائبین کے استعفے دینے کی بات ہوئی تو رسم کے مطابق سب کو ایک سال کی توسیع دے دی گئی۔ یہ مدت توسیع اپریل ۱۹۵۹ء میں ختم ہو رہی تھی۔ اور اس کے بعد پروفیسر بخاری کو لیبیا یونیورسٹی میں تعلیمی ذمہ داریاں سنبھالنے والے تھے۔ پچھلے مہینے وہ بہت پریشان ہوئے۔ جب کہ اسمبلی کی ایک کمیٹی نے شعبہ اطلاعات کے بارے میں تحقیقات شروع کی۔ وہ چونکہ حد درجے کے حساس تھے اس لئے اس تحقیقات کے متعلق یہ سمجھتے تھے کہ اس طرح سے ان پر تنقید کی جا رہی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ اسمبلی کئی سال سے شعبہ اطلاعات کے مصارف کم کرنے کی فکر میں تھی۔ اور اس کمیٹی کی تحقیقات اس سلسلے کی کئی سال کی جد و جہد کا آخری مرحلہ تھی۔ نومبر میں جب اس پانچویں کمیٹی کی بحث ہوئی تو ان لوگوں کو کامیابی ہوئی جو نام نہاد ماہرین کی سفارشات کی مخالفت کر رہے تھے۔ اور یہ طے پایا کہ یہ کام صدر دفتر کے ذمہ کر دیا جائے۔ اس کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اقوام متحدہ کے شعبہ اطلاعات کو محض پروپیگنڈا بیورو بنا دینے کی نامہ نگاروں نے سخت مخالفت کی اور خود مسٹر ڈیگ ہیمرشیلڈ کو بھی اس پر شدید اعتراض تھا۔

عالمی شہری

جب سے کپلنگ نے "مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب" کا گیت گایا ہے اسی دن سے ہم مختلف اور متصادم معاشروں کے تعلقات کے بارے میں زیادہ سوچ بچار کر رہے ہیں۔ ہمیشہ ہم اس فکر میں رہتے ہیں کہ کوئی ایسا مرکب مل جائے جو ہر ایک کی بہترین خوبیوں کو محفوظ کر لے۔

کبھی کبھی ہمیں کسی ایسی ہستی کی موجودگی کا یقین ہو جاتا ہے جو ہمارے تخیلات کو عمل کی دنیا میں لے آتی ہے۔ ابھی ابھی ہمیں پاکستان کے سفیر پروفیسر احمد شاہ بخاری کی بے وقت موت کی شکل میں ایسی ہی ایک شخصیت کے ضیاع کا سامنا ہوا ہے جنہوں نے اقوام متحدہ میں رئیس شعبۂ اطلاعات کی حیثیت سے خدمات انجام دیں وہ صحیح معنوں میں عالمی شہری تھے۔

پروفیسر بخاری کا تعلیمی پس منظر مشرق اور مغرب ـــــ پنجاب یونیورسٹی اور کیمبرج ـــــ دونوں کو آغوش میں لئے ہوئے ہے وہ دنیا کے دونوں حصوں کی زبانوں کے نقاد اور باکمال شاعر تھے۔ انہوں نے مشرق اور مغرب دونوں کی زبانوں اور محاوروں کا راگ الاپا۔ وہ مشرق اور مغرب دونوں کے نزدیک عالم تھے۔

لیکن مشرق اور مغرب کا یہ ملاپ اس سے بھی زیادہ گہرا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک عظیم انسان تھے ـــــ حاضر جواب، شائستہ، دانش مند، زندہ دل، اور گرم جوش۔ وہ خود پسندی کی نمائش سے پاک تھے، انہیں زندگی سے اُنس تھا۔ وہ اس دنیا میں بسنے والے لوگوں سے ان کی قومیت، رنگ، نسل، مذہب، یا پیشے کا خیال کئے بغیر محبت کرتے تھے۔ ان کی روح ان کے ذہن کی طرح تنگ سرحدوں کی قائل نہ تھی۔

ہزاروں امریکی جنہیں ان سے ذاتی شناسائی کا شرف حاصل ہے ان کی موت کو اپنا ذاتی رنج محسوس کر رہے ہیں سب سے بڑھ کر اس لئے کہ وہ دوست تھے۔ لیکن یہ نقصان ذاتی نہیں بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہے۔ دنیا ایک ایسے شخص کے اٹھ جانے سے مفلس تر ہو گئی ہے جو ہمیں بہتر طریق سے یہ دکھاتا تھا کہ آسودہ مستقبل کے لئے کون کون سی اچھی باتیں ممکن ہیں۔

(ترجمہ)

(نیویارک ٹائمز مورخہ ۷ دسمبر ۱۹۵۸ء کا اداریہ)

پروفیسر بخاری — آخری لمحات

مارگی ہیمین

"وہ آخری لمحے تک زندہ رہے" ان کے ڈاکٹر کا قول ہے۔ "وہ کام کرتے ہوئے مرے۔" اقوام متحدہ میں ان کے ایک رفیق کار کا کہنا ہے کہ دونوں حضرات پروفیسر احمد شاہ بخاری سے بہت قریبی تعلق رکھتے تھے ان کے ڈاکٹر ان کے دوست بن گئے تھے۔ اور انہوں نے بخاری کے سفر زندگی کی رفتار کو حتی المقدور کم کرنا چاہا تھا۔ مگر پروفیسر صاحب (جیسا کہ لوگ انہیں محبت سے کہتے تھے) یہ نہیں چاہتے تھے کہ اپنے معذور ہونے کا اعلان کر دیں۔ گو وہ چند سال سے اچھے خاصے بیمار رہتے تھے۔ ان پر دل کا پہلا دورہ ۱۹ اگست ۱۹۵۳ء کو پڑا۔ پروفیسر بخاری کو اس کا اتنا شدید احساس تھا کہ وہ جب ہسپتال میں طبی مشورے کے لیے گئے تو انہوں نے اپنا نام "مسٹر براؤن" لکھوایا۔ اس دورے کی وجہ سے وہ کمزور ہو گئے تھے لیکن انہوں نے اقوام متحدہ کے انڈر سیکرٹری کا کام شروع کرنے سے احتراز نہ کیا۔ بلکہ چارج لینے سے قبل ہی مسٹر ڈیگ ہیمر شیلڈ کے ساتھ چین کے تاریخی دورے میں کام شروع کر دیا۔

وہ بڑی مصروف زندگی بسر کرتے تھے۔ انہیں کسی چیز کا خوف نہ تھا لیکن جب تھکتے تو ان پر دل کا دورہ پڑتا تھا۔ وہ بے ہوش ہو جاتے تھے تو انہیں آکسیجن میں رکھا جاتا تھا۔ وہ کچھ دن آرام کرکے پھر اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ اور پھر اس طرح مصروف نظر آتے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ گذشتہ چند سال سے ان کی صحت بری طرح گرنے لگی تھی۔ دل کے دورے جلد جلد پڑنے لگے تھے۔ ان کی موت جلد آ جانے کے کئی وجوہ تھے۔ ان کو زندگی سے انتہائی والہانہ محبت تھی۔ پھر وہ ریشہ دوانیاں جو ان کے خلاف ہوتی رہیں۔ جب کوئی تیز اور ذہین آدمی کسی بین الاقوامی ادارے میں اعلیٰ جگہ حاصل کر لیتا ہے تو اس کی باتیں ہوتی ہی رہتی ہیں۔

جب مسٹر ہیمر شولڈ کی مدت عہدہ کے پانچ سال ختم ہو گئے۔ اور ان کے نائبین کے استعفے دینے کی بات ہوئی تو رسم کے مطابق سب کو ایک سال کی توسیع دے دی گئی۔ یہ مدت توسیع اپریل ۱۹۵۹ء میں ختم ہو رہی تھی۔ اور اس کے بعد پروفیسر بخاری کولمبیا یونیورسٹی میں تعلیمی ذمہ داریاں سنبھالنے والے تھے پچھلے مہینے وہ بہت پریشان ہوئے۔ جب کہ اسمبلی کی ایک کمیٹی نے شعبہ اطلاعات کے بارے میں تحقیقات شروع کی۔ وہ چونکہ حد درجے کے حساس تھے اس لئے اس تحقیقات کے متعلق یہ سمجھتے تھے کہ اس طرح سے ان پر تنقید کی جا رہی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ اسمبلی کئی سال سے شعبہ اطلاعات کے مصارف کم کرنے کی فکر میں تھی۔ اور اس کمیٹی کی تحقیقات اس کئی سال کی جد و جہد کا آخری مرحلہ تھی۔ نومبر میں جب اس پانچویں کمیٹی کی بحث ہوئی تو ان لوگوں کو کامیابی ہوئی جو نام نہاد ماہرین کی سفارشات کی مخالفت کر رہے تھے۔ اور یہ طے پایا کہ یہ کام صدر دفتر کے ذمہ کر دیا جائے۔ اس کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اقوام متحدہ کے شعبہ اطلاعات کو محض پروپیگنڈا بیورو بنا دینے کی نامہ نگاروں نے سخت مخالفت کی اور خود مسٹر ڈیگ ہیمر شیلڈ کو بھی اس پر شدید اعتراض تھا۔

موت کی باتیں

بحث کا جو نتیجہ نکلا اس سے گو پروفیسر بخاری مطمئن ہو گئے مگر اس بحث و مباحثہ کے دوران ان پر جو بار پڑا اس سے ان کی وفات کا وقت قریب تر آگیا۔ اگر یہ صورت حال پیدا نہ ہوتی تو شاید وہ مزید چھ ماہ سے دو سال تک زندہ رہ سکتے تھے لیکن جو کچھ ہوا یہ وہ ہونا ہی تھا بالآخر وہ دن دنیا میں نہ رہتے وہ اپنے ڈاکٹر سے اس تلخ ترین حقیقت (موت) کے بارے میں اکثر یہ سوال کیا کرتے تھے: ”بتائیے خدارا بتلائیے موت کب تک آئے گی؟“

گزشتہ اپریل میں نامہ نگاروں نے مسٹر ہیمر شولڈ کے اعزاز میں جو لنچ دیا تھا اس میں پروفیسر بخاری بیمار ہو گئے ڈاکٹر نے انہیں کچھ ٹھیک ٹھاک کر دیا۔ انہیں انجکشن لگایا گیا جس سے ان کا بلڈ پریشر کم ہو گیا۔ اور وہ صاحب فراش ہو گئے۔ انتقال سے ایک دن قبل پھر ان کو انجکشن لگایا گیا۔ انہیں معلوم تھا کہ چلنے پھرنے اور اٹھنے سے انہیں نقصان ہوگا مگر وہ اٹھ بیٹھے اور آخر جو ہونا تھا وہ ہوا۔ وہ بے ہوش ہو گئے۔ اور انہیں آکسیجن میں رکھ کر گھر پہنچایا گیا ڈاکٹروں نے جو کر سکتے تھے کیا، شام کو انہیں کچھ افاقہ معلوم ہو۔

ڈاکٹر کو بھی بخاری کی طرح شیکسپیئر سے بڑی محبت تھی۔ اس شام کو ڈاکٹر نے ان سے پوچھا۔ کیا میں رات آپ کے ساتھ بسر کر سکتا ہوں۔ پروفیسر بخاری نے کہا ”نہیں۔ نرس موجود ہے آپ زحمت نہ کریں“ اور پھر ڈاکٹر کے جاتے ہوئے مسکراتے ہوئے کہا ”خدا حافظ، شہزادہ شب بخیر!“

صبح ہوتے ½۵ بجے نرس نے ڈاکٹر کو اطلاع دی کہ مریض کی حالت تشویش ناک ہے۔ سوا چھ بجے وہ اس دنیا سے سدھار چکے تھے۔ انہوں نے موت کا کرب تک محسوس نہ کیا۔ جمعہ کو اقوام متحدہ کی جتنی کمیٹیوں کے جلسے ہوئے سب میں انہیں خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ اور اسمبلی کے اجلاس میں بھی ان کا سوگ منایا گیا۔ سپیشل کمیٹی میں جب انہیں خراج عقیدت پیش کیا جا چکا اور آغا شاہی اس کا جواب دینے کے لئے اٹھے تو ان کی آواز کانپ رہی تھی۔ پرنس علی خاں نے اسمبلی کے بھرے اجلاس میں کہا ”ان کے اٹھ جانے سے اقوام متحدہ کے برآمدے سنسان نظر آئیں گے۔“

اقوام متحدہ کے شعبہ اطلاعات میں جو لوگ ان کے ساتھ کام کرتے تھے وہ ان سے بے پناہ محبت کرتے تھے اب یہ لوگ بہت افسردہ نظر آتے تھے نامہ نگاروں کو جو انہیں ایک مندوب کی حیثیت سے جانتے تھے (اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ پاکستان کے بہترین مندوب تھے اور پاکستان کو عرصے تک ایسا مندوب مشکل سے ملے گا) اب یہ احساس ہوگا کہ ان کے ہلکے پھلکے مزاحیہ جملوں میں کس قیامت کی ذہانت پوشیدہ ہوتی تھی۔

نامہ نگاروں نے انہیں شمالی افریقہ کی آزادی کے لئے نسلی امتیاز کو ختم کرنے کے لئے بڑے سے بڑے سیاست دانوں سے سوال و جواب کرتے دیکھا ہے اور وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ کبھی ان مباحثوں میں زیر نہ ہوئے تھے۔

ہر دم مسکراتی اور پُر مذاق شخصیت کے پس پردہ ایک سنجیدہ بخاری بھی تھے۔ وہ مزاح کی نقاب اتار کر ضرورت کے وقت انتہائی سنجیدہ بات کر سکتے تھے اور کرتے تھے لیکن مزاح کی نقاب وہ تحفظ کے طور پر اکثر و بیشتر ڈالے رہتے تھے۔

بھلے مانس بنو

نیویارکر

ہم نے سُن گُن پائی کہ اقوام متحدہ میں پاکستان کے مستقل نمائندے پروفیسر احمد شاہ بخاری ہیں جو عام طور پر عرب، ایشیائی بلاک کے قابل ترین ترجمان سمجھے جاتے ہیں اور وہ پاک و ہند کے سرکردہ مزاح نویس بھی ہیں۔ مستقل نمائندوں اور مزاح نویسوں میں مجموعی طور پر ایک سی دلچسپی رکھنے کے باعث ہم نے پروفیسر بخاری کی تصانیف حاصل کرنی چاہیں لیکن ہمیں معلوم ہوا کہ ان میں سے کسی کا ترجمہ انگریزی میں نہیں ہوا۔ ہم نے یہ ٹھان کر کہ ان کا کچھ اندازہ کریں گے خود پروفیسر صاحب کو ٹیلی فون کیا اور ہمیں اقوام متحدہ کی عمارت میں لنچ پر حاضر ہونے کی دعوت مل گئی۔

بہرکیف پروفیسر صاحب ان چند خوش دل، بامروت اور ذی علم مستقل نمائندوں یا مزاحیہ نویسوں میں سے ایک ہیں جن سے ہم مدت کے بعد ملے ہیں۔ انہوں نے دریائے ایسٹ سے توجہ ہٹا کر کھانے کی میز کی طرف ہماری رہنمائی کی۔ مچھلی، گوشت، دودھ، ٹوسٹ منگوایا اور کہا: "پاکستان کی آزادی کے بعد ۱۹۴۸ء تک وہ ایک استاد، مترجم اور مصنف تھے، سیاسی سفیر نہ تھے۔ ۴۷-۱۹۴۰ء سے وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے صدر (پرنسپل) تھے۔ تیس برس وہ اس کالج میں ادبیات کے پروفیسر رہے۔ انہوں نے اس درس گاہ کے تجرباتی تھیٹر کے لیے دوسری چیزوں کے علاوہ شیکسپیئر اور شا کے بہت سے ڈراموں کا اردو میں ترجمہ کر کے دیے جن میں ابسن[1] کا ڈرامہ "گڑیا کا گھر" اور المر رائس[2] کا ڈرامہ "جمع کرنے والی مشین" بھی ہیں۔" پروفیسر نے ہمیں بتایا کہ

"ہارون الرشید کے زرّیں دور کے بعد گذشتہ چالیس سال کا زمانہ اسلامی دنیا میں تراجم کے لیے بڑا سازگار رہا ہے۔ پہلے زمانے میں مسلمان ہر اس چیز کا ترجمہ کر لیتے تھے جو فلسفہ اور سائنس میں ان کے ہاتھ لگتی تھی۔ اب ادب کے تراجم پر زور صرف ہو رہا ہے۔ تمہیں شیکسپیئر کو اردو میں سننا چاہیے۔ لاہور کی مقامی بولی میں "پینڈا" نہایت ظریفانہ لفظ ہے۔ شیکسپیئر کی حیرت انگیز خوبی یہ ہے کہ ترجمہ خواہ کتنا ہی برا کیوں نہ ہو ڈرامے سے تو کچھ نہ کچھ لطف حاصل ہو ہی جاتا ہے۔"

تیز نیلی آنکھوں والے پروفیسر بخاری نے جو ٹوئیڈ کا سوٹ پہنے اور نیلے رنگ کی ٹائی لگائے ہوئے تھے برطانیہ اور امریکہ کی غیر افسانوی کتابوں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔ اردو کا ایک مزاحیہ رسالہ بھی مرتب کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے انگریزی اور اردو میں ادبی تنقیدیں بھی لکھی ہیں۔ مزاح نگار کی حیثیت سے ان کی شہرت تین یا چار سو مختصر افسانوں پر پھیلی ہوئی ہے جو انہوں نے پطرس کے قلمی نام سے لکھے تھے۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ "ان افسانوں کی مقبولیت کی بعض وجوہ یہ ہیں کہ وہ غلط ہیں۔ نقادوں نے ان کے بارے میں کہا ہے کہ یہ افسانے اگرچہ مزاحیہ ہیں لیکن انہیں بے دھڑک گھروں میں لے جایا سکتا ہے۔"

---

[1] ABSON'S "A DOLL'S HOUSE

[2] ELMER RICE'S "THE ADDING MACHINE"

• پطرس کو پاکستان میں شگفتہ ترین شخص مانا جاتا ہے۔ ان کے چند افسانوں کا ترجمہ انگریزی میں ہو چکا ہے جنہوں نے اہل برطانیہ کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ برطانیہ والے لکھتے ہیں کہ انہیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ایک مشرقی مزاحیہ نگار ایسا بھی ہے جو "غزالی" آنکھوں اور ناموافق حالات کو اپنی تحریروں کا مرکز نہیں بناتا۔ ہم نے پوچھا "آخر پطرس اپنی آمد کا مرکز کس چیز کو بناتا ہے؟" پروفیسر بخاری نے جواب دیا "میری کہانیوں کا شمالی کردار ہمیشہ ایک معمولی آدمی ہوتا ہے جس میں بہت سی کمزوریاں، در کوتاہیاں ہوں۔ حادثات اسے ایسے ناموافق ماحول میں پھینک دیتے ہیں جسے وہ پسند نہ کرتا ہو۔ وہ ہمیشہ بڑا سیاستدان اور عظیم ادیب بننے کے خواب دیکھتا ہو۔ ایک کہانی میں وہ خطرناک سرغنہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور بالآخر ناکام رہنے کے نتیجے میں بہتر آدمی بن جاتا ہے میں نے اپنی تحریروں میں واحد متکلم اور جمع متکلم کا صیغہ استعمال کیا ہے تاکہ طنز کا نشانہ خود بیان کرنے والا بنے۔ پاکستانی اس بات کو بہت پسند کرتے ہیں۔ میرا اصول یہ ہے کہ

"بھلے مانس بنو"

پروفیسر بخاری ۱۸۹۸ء میں پشاور میں پیدا ہوئے۔ اس صدی کے ابتدائی بیس اور تیس برسوں کے درمیان چھ سال انہوں نے کیمبرج میں تعلیم پائی۔ دوسری عالمی جنگ کے وقت وہ آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل تھے۔ ان کی سفارتی زندگی کا آغاز ۱۹۴۸ء میں اس وقت ہوا جب وہ بین الاقوامی فری کونسی براڈکاسٹنگ کانفرنس" منعقدہ میکسیکو میں پاکستانی وفد کے رئیس کی حیثیت میں شریک ہوئے۔ ۱۹۵۰ء سے وہ اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کے رئیس چلے آ رہے ہیں۔ وہ لسانیات کے بہت بڑے ماہر ہیں۔ ایک دفعہ انہوں نے کوکنی (COCKNEY) کے اختلافی لب و لہجہ میں مہارت حاصل کرنے کے لئے چھ مہینے صرف کئے تھے۔ انہوں نے بڑی گرم جوشی سے ہمیں بتایا "آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ کوکنی زبان اپنی گرامر اور حروف علت کا مخصوص نظام رکھتی ہے۔" ہم امیدوار بن کر انتظار کرنے لگے۔ لیکن انہوں نے کہا "اب میں کوکنی لب و لہجہ کی نقل اتارنے کی جرات نہیں کروں گا۔ میرا خیال ہے کہ میں پھر شاہی انگریزی کی طرف لوٹ آیا ہوں۔ اور برلن کی جون سے نکل چکا ہوں۔"

ہم نے دریافت کیا کہ آپ سفارتی فرائض اور مزاح نویسی کو کس طرح یکجا کرتے ہیں؟ پروفیسر نے جواب دیا کہ "مزاحیہ نویسی میں میری پیداوار بہت کم ہو گئی ہے ایک مشکل یہ ہے کہ وقت نہیں ملتا۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ سفارتی کاروبار میں آپ بعض چیزوں پر ہنس تو سکتے ہیں لیکن محظوظ ہونے کی مقدار روایات نے مقرر کر دی ہے۔"

"مجھے نیویارک سے پیار ہے۔ میں بڑے شہر کا باشندہ ہوں تاہم ابھی مجھے ملامت کی جاتی ہے کہ میں چلنے میں بہت سست ہوں۔ دوا دن کے ذخیرے مجھے بہت دلچسپ نظر آتے ہیں۔ جب میں پہلے پہل یہاں آیا تو میں نے ایک سینڈوچ (دھوسے) کی فرمائش کی۔ سٹال والے نے پوچھا "سفید یا رائی ڈبل روٹی میں؟" اس کی بات سمجھنے میں مجھے کچھ وقت لگا۔ وہ ایسی ہے تمہاری زبان، چک کا مطلب ہے بل۔ باقی کیا رہا؟ میں اپنے شاگردوں کو لاہور میں امریکہ کے متعلق طویل خط لکھا کرتا تھا۔ تاکہ وہ مجمعوں کے سامنے پڑھ کر سنائے جائیں۔ ایک خط میں میں نے لکھا کہ یہاں کے کونے کونے پر ایک ڈرگ سٹور موجود ہے۔ انہوں نے جواب میں بڑے خطرے اور تعجب کا اظہار کیا۔ مجھے اگلے خط میں اس کی تشریح کرنی پڑی کہ یہ ڈرگ سٹور زہریلی اور نشہ آور چیزیں نہیں بیچتے، جب معلومات اور واقفیت بڑھ جائے گی تو ممکن ہے کہ پطرس امریکہ کے بارے میں کچھ لکھے۔"

(ترجمہ) ۱۰ ستمبر ۱۹۵۴ء

ہر نغمہ جس کا حسنِ تمنائے گوش تھا

محمد عبداللہ قریشی

پروفیسر سید احمد شاہ بخاری پاکستان کے نہایت ذہین، نہایت روشن دماغ، بے حد ہنس مکھ، خوش پوشاک، خوش گفتار، مشہور ماہرِ تعلیم، انگریزی اور اُردو کے صاحبِ طرز ادیب، منفرد مزاح نگار اور کامیاب سفیر تھے۔ ان کے بزرگ کشمیر سے ہجرت کرکے آئے تھے۔ مشہور مبلغ اسلام خواجہ کمال الدین مرحوم نے جب پشاور میں وکالت شروع کی تو بخاری کے والد سید اسد اللہ شاہ ان کے منشی تھے۔ وہیں یکم اکتوبر ۱۸۹۸ء کو سید احمد شاہ پیدا ہوئے۔ سید محمد شاہ رفعت مرحوم ان کے بڑے بھائی تھے اور سید ذوالفقار شاہ بخاری چھوٹے بھائی ہیں جو حال ہی میں ریڈیو پاکستان کے ڈائرکٹر جنرل کے عہدۂ جلیلہ سے ریٹائر ہوئے ہیں۔

ابتدائی تعلیم پشاور میں حاصل کرنے کے بعد سید احمد شاہ بخاری نے گورنمنٹ کالج لاہور میں اعلیٰ تعلیم پائی۔ وہ پنجاب یونیورسٹی کے نہایت ہونہار طالب علموں میں شمار ہوتے تھے۔ انھوں نے انگریزی کا یہ امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔

طالب علمی کے زمانے ہی میں انھیں شعر و ادب سے گہری دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ وہ گورنمنٹ کالج میگزین ''راوی'' کے ایڈیٹر رہے۔ انھوں نے اپنے استاد واٹکنس سے عقیدت کی بنا پر اپنا قلمی نام پیٹر واٹکنس اختیار کیا اور اسی نام سے انگریزی کے روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور میں کئی مضامین لکھے جنھیں معاوضے کے قابل سمجھا گیا۔ مختلف اُردو رسائل میں بھی بہت سے مضامین لکھے جو ادب، فلسفہ، طنز و مزاح اور فنونِ لطیفہ کے موضوعات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اردو میں وہ صرف پطرس کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ ''مضامینِ پطرس'' اسی عہد کی یادگار ہیں۔

تکمیلِ تعلیم کے بعد انھوں نے انگلستان کا رُخ کیا جہاں امانوئیل کالج کیمبرج میں داخلہ لے کر انگریزی ادب کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ وہاں کے اساتذہ کی رائے تھی کہ ''بخاری کا علم اس قدر فراخ اور وسیع و بسیط ہے کہ ایک انگریز کے لیے بھی اتنا علم اک عمر میں رکھنا کم و بیش ناممکن ہے۔''

وطن واپس آنے کے بعد وہ پہلے سنٹرل ٹریننگ کالج پھر گورنمنٹ کالج میں انگریزی ادبیات کے پروفیسر ہوگئے۔ ان کی توجہ سے گورنمنٹ کالج کی تہذیبی، ثقافتی اور ادبی سرگرمیوں کی رفتار میں بہت ترقی ہوئی۔ انھوں نے مباحثوں میں حصہ لیا، مذاکموں میں جان ڈالی، ڈراموں میں اداکاری اور ہدایت کاری کے جوہر دکھائے۔ اپنے دوست سید امتیاز علی تاج کے ساتھ مل کر کئی انگریزی ڈراموں کے اُردو ترجمے کیے جن میں برنارڈ شا کا کھیل ''آرمس اینڈ دی مین''، ہوٹرز کا کھیل ''دی مین ہو ہابٹ دی پوپمیک''، چیکوسلاویکی مصنف کیرل چاپیک کا ڈراما ''آر یو آر'' اور ایک ایکٹ کی نقل ''باکس اینڈ کاکس'' وغیرہ شامل ہیں۔

خالص تعلیمی کاموں میں بھی کسی سے پیچھے نہ رہے۔ ۱۹۲۴ء میں پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی نے مبلغ دس ہزار روپے کی رقم مخصوص کر کے یہ اسکیم منظور کی کہ انگریزی کی بعض معلوماتی کتابیں جن سے لڑکوں اور لڑکیوں کو خاص دلچسپی ہو، مروجہ دیسی زبانوں میں ترجمہ کرائی جائیں تاکہ اُردو ادب کی حوصلہ افزائی ہو۔ اس کے بعد کمیٹی ہر سال اس مقصد کے لیے روپیہ منظور کرتی رہی۔ ابتدا میں ڈاکٹر آر۔ ایچ وائٹ ہاؤس اور پروفیسر بخاری اس کے ایڈیٹر اور ایسوسی ایٹ ایڈیٹر مقرر کیے گئے۔ اکتوبر ۱۹۲۷ء میں ڈاکٹر وائٹ ہاؤس طویل رخصت پر چلے گئے اور جے۔ ای پارکنسن صاحب ان کی جگہ ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ ایک دفعہ پروفیسر بخاری نے بھی رخصت لی مگر ان کی جگہ کوئی دوسرا آدمی نامزد نہ کیا گیا۔ فروری ۱۹۳۱ء میں جب پارکنسن صاحب بھی ولایت تشریف لے گئے تو کمیٹی نے ایک ایڈیٹوریل بورڈ بنا دیا جو مسٹر جی۔ سی چیٹرجی، اے۔ ایس بخاری اور لالہ ونگ بہاری لال پر مشتمل تھا۔ یہ "پنجاب ایڈوائزری بورڈ فار بکس" کہلاتا تھا اور اس کا کام یہ تھا کہ ترجمے کے لیے کتابیں منتخب کر کے قابل اساتذہ سے انھیں اُردو، ہندی اور پنجابی میں منتقل کرائے اور خود نظر ثانی کر کے انھیں شائع کرنے کا اہتمام کرے۔ چنانچہ مختلف موضوعات پر بیسیوں مفید اور دلچسپ کتابیں شائع ہوئیں اور محکمے کی طرف سے سکولوں میں بطور پیش کش بھیجی گئیں۔ ظاہر ہے کہ اُردو کی تمام کتابیں نظر ثانی کے لیے بخاری کے حصے میں آئی ہوں گی۔

۱۹۳۱-۳۲ء میں بخاری کو پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے سیکرٹری کا عہدہ پیش کیا گیا چنانچہ اپنے فرائض منصبی کے علاوہ چار پانچ سال تک اس خدمت کو بھی باحسن الوجوہ انجام دیتے رہے۔ سیکرٹری کی حیثیت سے آپ نے مندرجہ ذیل سالانہ رپورٹیں مرتب کیں جن سے کمیٹی کی کارگزاریوں کا پتہ چلتا ہے:۔

سال ۱۹۳۱-۳۲ء	حجم ۱۵۲ صفحات	تاریخ اشاعت ۱۳ر جون ۱۹۳۲ء
سال ۱۹۳۲-۳۳ء	حجم ۱۱۶ صفحات	تاریخ اشاعت ۱۵ر جون ۱۹۳۳ء
سال ۱۹۳۳-۳۴ء	〃 ۱۵۴ 〃	〃 〃 ۱۵ر جون ۱۹۳۴ء
۱۹۳۴-۳۵ء	〃 ۸۵ 〃	〃 〃 ۲۶ر مئی ۱۹۳۵ء

پطرس بخاری نے اس عرصہ میں دو تین ضخیم انگریزی کتابیں خود بھی ترجمہ کیں۔ ان میں ایک تو برٹرنڈ رسل کی تصنیف تھی جس کا ترجمہ "تعلیم خصوصاً ایام طفلی میں" کے نام سے ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔ یہ ۴۰۷ صفحات کی کتاب ہے جس میں تعلیمی نصب العین، تربیت سیرت اور عام اصولِ تعلیم پر بحث کی گئی ہے۔

دوسری کتاب ہنڈرک فان لون کی سٹوری آف مین کائنڈ تھی جس کا ترجمہ "نوع انسان کی کہانی" کے نام سے ۱۹۳۹ء میں طبع ہوا۔ یہ ۵۲۰ صفحات کی کتاب ہے اور اپنے موضوع کے لحاظ سے بے حد اہم ہے۔ ترجمہ منہ سے بولتا ہے کہ پطرس کا کیا ہوا ہے۔

تیسری کتاب ایف۔ ایل برین صاحب کی تھی۔ انڈین سول سروس کے اس انگریز حاکم نے "دیہات سدھار"، "سقراط ہندوستان کے گاؤں میں"، "ہندوستان کے گاؤں کی اصلاح" وغیرہ کئی مفید کتابیں انگریزی میں لکھی تھیں جو بے حد مقبول ہوئی تھیں ان کی ایک کتاب کا ترجمہ بخاری نے غلام عباس کی مدد سے کیا جو "دیہات میں بوائے سکاؤٹ کا کام" کے نام سے ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا۔ دو سو صفحات کی اس کتاب میں دیہاتی سکاؤٹوں کے ذہن نشین کرایا گیا ہے کہ وہ اپنے گھروں اور اپنے گاؤں کی بہتری کے لیے کیا کچھ کر سکتے ہیں۔

بخاری انگریزی کی روح میں ڈوب کر اردو کی بلند سطح پر ابھرتے اور اس بے تکلفی سے ترجمہ کرتے تھے کہ اصل کا دھوکا ہونے لگتا تھا اور ترجمہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔

۱۹۳۷ء میں آل انڈیا ریڈیو کا محکمہ قائم ہوا تو مسٹر فیلڈن کنٹرولر نے بخاری کی خدمات مستعار لے کر انھیں اپنا نائب منتخب کیا۔ وہ سات برس تک ریڈیو سے منسلک رہے اور ۱۹۴۲ء میں کنٹرولر جنرل مقرر ہو گئے۔ اس عہدے کی بدولت ان کو متعدد کانفرنسوں میں شرکت کا موقع ملا ساتھ ہی دوسری جنگِ عظیم کے دوران دولتِ برطانیہ کا پروپیگنڈا کرنے کے لیے جو مہم چلائی گئی تھی اس میں بھی ان کی ضرورت محسوس کی گئی چنانچہ حکومت وقتاً فوقتاً ان کے مفید مشوروں سے فائدہ اٹھاتی رہی۔ اس سلسلے میں ان کو حکومتِ ہند کی طرف سے افغانستان بھی بھیجا گیا جہاں انھوں نے نمایاں خدمت انجام دیں۔

قیامِ پاکستان سے کچھ قبل وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ اس حیثیت میں انھوں نے نہ صرف کالج کو فسادات کے دنوں میں محفوظ رکھنے میں اپنے غیر معمولی تدبر کا ثبوت دیا بلکہ گورنر مغربی پنجاب کے ایما سے حکومت کے مہیا کردہ مستند مواد کی بنا پر مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قتلِ عام، کشمیر میں ڈوگروں کے مظالم، راشٹریہ سیوا سنگھ کی تخریبی سرگرمیوں اور سکھوں کی سازشوں اور سفاکیوں کے بارے میں چند رپورٹیں بھی مرتب کیں جو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں محکمہ اطلاعات کی طرف سے شائع ہوئیں۔ یہ ایسی قیمتی دستاویزات ہیں کہ اس عہد کی تاریخ لکھنے والا کوئی مورخ ان سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔

گورنمنٹ کالج ہی سے وہ لندن بھیجے گئے جہاں پاکستانی نمائندے کی حیثیت میں انھوں نے ان مذاکرات میں حصہ لیا جن کا تعلق انڈیا آفس کی املاک کی تقسیم سے تھا۔

۱۹۴۸ء میں میکسیکو کے مقام پر ریڈیو کے بارے میں بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی۔ بخاری نے اس میں بھی پاکستان کی نمائندگی کی اور ایک نہایت مفید رپورٹ لکھی۔ ۱۹۴۹ء میں اقوامِ متحدہ کی انسانی حقوق کی کمیٹی میں آپ نے دولتِ پاکستان کی طرف سے شرکت کی۔ ۱۹۵۰ء میں جب خان لیاقت علی خاں مرحوم نے وزیرِ اعظم پاکستان کی حیثیت سے ریاستہائے متحدہ امریکہ کا دورہ کیا تو ہر شخص نے بخاری کی لیاقت کا لوہا مانا۔ بخاری اس تاریخی دورے میں ہر جگہ ان کے ہمراہ رہے۔ اس تمام عرصہ میں آپ نے روزانہ اکیس گھنٹے نہایت جانفشانی سے کام کر کے پاکستان کی عزت میں اضافہ کیا۔ اس سے اعصاب پر اتنا بوجھ پڑا کہ صحت خراب رہنے لگی مگر آپ کی خدمات کو اتنا سراہا گیا کہ اقوامِ متحدہ میں پاکستان کا مستقل مندوب نامزد کیا گیا۔ اس عہدے پر وہ ۱۹۵۴ء تک فائز رہے۔ اس جگہ ان کی شخصیت کا یہ پہلو سامنے آیا کہ وہ ایک باوقار مقرر اور سلجھے ہوئے سیاست دان بھی ہیں۔ ایک مرتبہ آپ نے اس کی مجلسِ شوریٰ کی صدارت بھی کی اور خوب نام پیدا کیا۔

حفاظتی کونسل کی مجالس میں بخاری کی شگفتہ اور متوازن تقریریں اتنی پسند کی جاتی تھیں کہ دنیا گوش بر آواز ہو کر سنتی تھی۔ ان کی باتوں میں گلوں کی خوشبو تھی۔ ہر نغمہ حسنِ نغمۂ گوش تھا۔ تقریروں کے بعض حصے تو شیکسپیئر اور دوسرے بلند پایہ انگریزی ادیبوں کے حوالوں اور لطیف طنز و مزاح سے مزین ہونے کی وجہ سے ادب پارے ہوتے تھے۔ پاکستان کے مسائل کو جس خوش اسلوبی اور سلیقے سے آپ نے پیش کیا کہ وہ ہمیشہ یادگار رہے گا۔ تونس کے بارے میں انھوں نے ایک سچے اور مخلص مسلمان کا کردار جس انداز میں پیش کیا اس سے تمام دنیا کے مسلمان انھیں انتہائی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

۱۹۵۵ء میں بخاری کی صلاحیتوں کے پیشِ نظر اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل مسٹر ڈاگ ہیمرشولڈ کی خواہش پر آپ کو اقوامِ متحدہ کے شعبۂ اطلاعات کا ڈپٹی سیکرٹری جنرل منتخب کیا گیا۔ آپ پہلے ایشیائی ہیں جو اس عہدے پر فائز ہوئے۔ وہ اس عہدے سے اپریل ۱۹۵۹ء کے آخر میں سبکدوش ہونے والے تھے۔ انھوں نے کولمبیا یونیورسٹی میں ادبیاتِ انگریزی کے پروفیسر کی حیثیت سے کام کرنے کی پیشکش قبول بھی کر لی تھی مگر عمر نے وفا نہ کی۔ ۵ دسمبر ۱۹۵۸ء کی صبح کو نیویارک میں آپ کی حرکتِ قلب بند ہو گئی۔ نغمۂ حیات سمٹ گیا اور یہ قیمتی وجود اجنبی دیار میں پیوندِ خاک ہو گیا۔

ہمیشہ جو رہا سرگرمِ جنگِ زندگانی میں
وہیں آرام گاہِ آخری ہے اس سپاہی کی

“ پروفیسر بخاری کی زندگی ایک مجاہد کی زندگی تھی اور ان کی موت شہادت کی موت۔ انھوں نے ملک و ملت کی خاطر ہر محاذ پر جنگ کی اور اس عزیز وطن کی خدمت میں جان دی جہاں انھوں نے اپنا شباب رنگین کیا اور جوانی چھوڑی تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ سیاست کے لیے تو دنیا

کا ہر ملک خوب ہے لیکن کوئی بیمار ہو تو اپنے وطن ہی اور دفن ہو تو اپنی ہی مٹی میں۔ کیونکہ "انسان کو ہر وقت یہ توقع رہتی ہے کہ اس کے مرجانے پر کچھ غلغلہ ہوگا، کوئی تھامے گا، کوئی اٹھائے گا، کوئی روئے گا، کوئی چلائے گا" مگر ان کی یہ توقعات پوری نہ ہوئیں ؎

دامن کو منہ پہ ڈال کے رویا نہیں کوئی　　دنیا سے وہ اٹھے بھی تو کس بے کسی کے ساتھ

پروفیسر بخاری کی وفات سے نہ صرف پاکستان کو زبردست ملی نقصان پہنچا بلکہ اقوام متحدہ کی سیاسی اور علمی محفلیں بھی سونی ہو گئیں چنانچہ جنرل اسمبلی نے قرارداد تعزیت میں ان کے سانحہ ارتحال پر افسوس کا اظہار کیا اور ہر ملک کے نمائندے نے شاندار الفاظ میں ان کی علمی، ادبی اور سیاسی خدمات کا اعتراف کیا۔ ایرانی نمائندے نے کہا کہ بخاری کی ذات نہ صرف اپنے ملک کے لیے باعث ناز تھی بلکہ عالم اسلام کے لیے بھی سرمایۂ افتخار تھی۔ وہ فارسی خوب جانتے اور بولتے تھے۔ فارسی میں شعر کہتے اور فارسی کے قدیم و جدید ادب سے بخوبی واقف تھے۔

ایک ممتاز عرب خلیل عیسیٰ نے نماز جنازہ پڑھائی اور اپنے گہرے جذبات رنج و الم کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا ؎

اقول وقد فاضت لعینی عبرة　　الارض تبقى والاخلاء تذهب

یعنی میری آنکھیں اشکوں سے تر ہیں اور میں یہ کہہ رہا ہوں کہ زمین تو وہیں کی وہیں ہے لیکن احباب رخصت ہوتے جا رہے ہیں۔

پروفیسر احمد شاہ بخاری کی ذات میں مشرق و مغرب کی خوبیاں جمع تھیں۔ یہی ان کی شخصیت کا سب سے بڑا کمال تھا۔ مسٹر ہیمرشولڈ سیکرٹری جنرل مجلس اقوام متحدہ نے ان کی رحلت پر جو اعلامیہ شائع کیا اس میں آپ کی خدمات اور صلاحیتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"پروفیسر بخاری مشرق و مغرب کی میراث کے مالک تھے۔ یہی وہ نمایاں خصوصیت ہے جس کی بدولت ہم بین الاقوامی مسائل حل کر سکتے ہیں کیونکہ وسعت نظر و فکر کے بغیر یہ مشکل کام حل نہیں ہو سکتا۔ نئی دنیا میں وحدت پیدا کرنے کے لیے لازم ہے کہ ہر رنگ میراث اور روایات پر کامل نظر ہو۔ جدید نسل کا فرض ہے کہ وہ اپنے اندر وہی فضائل و مکارم پیدا کرے جو بخاری کی شخصیت میں آشکار تھے۔"

پروفیسر بخاری کی دنیا محدود نہ تھی۔ ان کا مزاج مشرقی، ذہن مغربی اور طرز فکر عالمگیر تھا۔ انھوں نے علمی اور ادبی یادگاریں زیادہ نہ چھوڑیں جو کچھ لکھا خوب سوچ سمجھ کر لکھا۔ ان کی ہر تخلیق ایک کارنامہ ہے۔ آخری زمانے میں فرینکلن پبلیکیشنز والوں نے تالیف و ترجمے کے کام میں ان کا تعاون حاصل کرنا چاہا۔ بخاری نے سنکلیئر لیوئس کے ناول "ایرو سمتھ" کے ترجمہ کا ذمہ لے بھی لیا مگر اپنی بے انتہا مصروفیتوں کے باعث اسے مکمل نہ کر سکے۔

اس کے بعد ان کی طرف سے بخاری کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ امریکی مصنف مرو کے سلسلہ کتب "دس آئی بلیو" کی طرز پر اردو میں ایک کتاب مرتب کر دیں۔ بخاری نے اس سلسلے کی کتابوں سے مجوزہ کتاب کے لیے چند ایسے مضامین انتخاب کیے جو پاکستان کے پڑھنے والوں کے لیے موزوں ہو سکتے تھے۔ ان منتخبہ انگریزی مضامین کا اردو ترجمہ کرایا گیا اور کچھ نئے مضامین پاکستانیوں سے لکھوائے گئے کہ انھوں نے اپنے تجربات اور مشاہدات کی بنا پر زندگی سے کیا سبق حاصل کیے۔ بخاری نے ترجموں نیز دیگر مضامین پر بڑے غور سے نظر ثانی کی اور کتاب کا مختصر دیباچہ بھی لکھا۔ یہ مسودہ عین اس روز لاہور پہنچا جس کی شام کو ریڈیو پاکستان نے بخاری کی وفات کی خبر نشر کی ؎

وصل اس کا خدا نصیب کرے
میر جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

چار یار

(۱) تاج (۲) پطرس (۳) تبسم (۴) فیض

بڑے بخاری

چھوٹے بخاری

بھائی بھائی

سید ذوالفقار علی بخاری

سید ذوالفقار علی بخاری اپنے برادر محترم سید احمد شاہ بخاری پطرس مرحوم کی موت کے بعد ان تمام یادوں کو جو ان سے وابستہ ہیں "بھائی بھائی" کے نام سے ایک کتابی صورت میں یکجا کر رہے ہیں اور اس طرح اپنے اس سراپا زندگی بھائی کو موت کے بے رحم ہاتھوں سے چھین کر اپنے لیے زندہ رکھنا چاہتے ہیں جس کی موت کا یقین کر لینے کے بعد زندگی کا اعتبار اور بھی اٹھ جاتا ہے۔

سید ذوالفقار علی بخاری کی اس کتاب کا ابھی چھپنی ہے کہ اسی دور کے چند اقتباس ہم نے اس لیے حاصل کر لیے ہیں کہ پڑھنے والوں کو یہ اندازہ ہو سکے کہ سب کا پطرس خود اپنے بھائی کے لیے کیا تھا۔

میں جناب غلام عباس کا ممنون ہوں کہ ان کی وساطت سے مجھ کو یہ اقتباس نقوش کے لیے حاصل ہو سکے اور طفیل صاحب سے سرخروئی ہوئی۔

(شوکت تھانوی)

بھائی جان سکول میں پڑھتے تھے اور میں ابھی سکول میں داخل بھی نہیں ہوا تھا۔ والد گھر آئے تو بہت خوش تھے۔ میری والدہ سے کہا "لو مبارک ہو۔ کل پیر احمد شاہ کو سکول میں انعام ملے گا۔"

"بھائی گھر آئے تو میں نے کہا لالہ سکول میں مار پڑتی ہے یا انعام ملتا ہے؟"

"پھر رات بھر ہم دونوں بھائی جاگتے رہے۔ وہ مجھے سکول کے قصے سناتے رہے اور میں سنتا رہا۔ مجھ سے کہنے لگے "تم بڑے ہوتے تو میں تم کو کل ساتھ لے جاتا۔"

میں رو پڑا۔ انھوں نے مجھے اٹھا کر پیار کیا اور کہا "اچھا دیکھو کل میں تمہاری شلوار پہن کر انعام لینے جاؤں گا۔"

میں یہ سن کر بہت خوش ہوا اور ہنسی خوشی سو گیا۔ اگلے دن وہ میری شلوار پہن کر انعام لینے کے لیے گئے۔ ان کو کچھ کتابیں انعام میں ملی تھیں۔ جن پر سرخ رنگ کا دفتری فیتہ بندھا ہوا تھا۔ کئی دن تک وہ فیتہ میرے پاس رہا اور میں محلے کے لڑکوں کو دکھاتا رہا۔

میں سکول میں داخل ہو گیا۔ بھائی جان کے ساتھ سکول جانے لگا۔ میرے ہاتھ پاؤں کچھ ڈھیلے تھے۔ کبھی بغل میں سے بستہ سرک جائے کبھی تختی پھسل جائے۔ کبھی میں گر پڑوں۔ چنانچہ بھائی میرا بستہ خود اٹھاتے اور انگلی پکڑ کر مجھے ساتھ چلاتے۔

جب میں نے سڑک پر جم کر پاؤں رکھنا سیکھ لیا تو بھائی جان نے اپنا بوجھ مجھ پر لادنا شروع کر دیا۔ اب ان کا بستہ میں اٹھا کر لے جاتا تھا۔ کبھی ان کو سکول جاتے ہوئے کچھ اور لڑکے مل جاتے تو یہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے مجھے پیچھے چھوڑ کر آگے نکل جاتے۔ میں بعد بڑبڑاتا اور روتے روتے سکول پہنچتا۔

سکول میں سالانہ جلسہ ہوا۔ اس وقت ہمارے صوبہ کے چیف کمشنر سر جارج روس کیپل تھے اور وہی جلسے کے صدر تھے۔ شہر کے تمام رؤسا اور حکام جلسے میں شریک تھے۔ ہمارے والد بھی تشریف رکھتے تھے۔ سکول کے کئی لڑکوں نے نظمیں پڑھیں۔ بھائی جان نے بھی انگریزی میں ایک نظم پڑھی۔ ان کی خواندگی کی بہت داد دی گئی۔ سر جارج روس کیپل بھی بہت خوش ہوئے۔

جلسہ ختم ہو گیا اور لوگ ٹولیوں میں کھڑے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے یا ایک دوسرے کو الوداع کہہ رہے تھے۔ بھائی جان اور میں والد کے پاس کھڑے تھے۔ لوگ والد کو مبارکباد دے رہے تھے اور بھائی جان کو پیار کر رہے تھے کہ اتنے میں بھائی جان کی ڈھنڈیا پڑی۔ ہمارے ایک ماسٹر صاحب بھاگتے ہوئے آئے اور کہا چلو پیر احمد لاٹ صاحب بلا رہے ہیں۔"

میں بھائی جان کو لیے ہوئے جلدی جلدی وہیں مجمعے میں پہنچا جس کے بیچ میں سر جارج روس کیپل کھڑے تھے۔ والد آہستہ آہستہ پیچھے پیچھے آنے لگے۔ جب سر جارج روس کیپل نے بھائی جان کو دیکھا تو آگے بڑھے اور بھائی جان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انگریزی میں کہا۔ تم نے نظم بہت اچھی طرح پڑھی۔ تمہارا لہجہ بھی اچھا ہے اور تلفظ بھی۔ شاباش"۔

اتنے میں والد بھی مجمع میں پہنچ گئے۔ سر جارج روس کیپل نے میرے والد سے مصافحہ کیا اور بھائی جان کے متعلق تعریفی جملے پشتو میں کہے۔ والد نے کہا "صاحب جو لفظ کہہ رہے ہو یہیں لکھ دو تا کہ یہ لڑکا تمام عمر تمہارے کہے کی لاج رکھے"۔

سر جارج نے بھائی کی بغل سے انعام کی کتابوں کے بنڈل میں سے ایک کتاب کی جلد کے اندر کی طرف پنسل سے یہ الفاظ لکھے۔

"کاش میں پشتو اتنی اچھی طرح بولنے لگوں جتنی اچھی طرح چھوٹا پیر۔ پیر احمد شاہ انگریزی بولتا ہے"۔

یہ سند بہت مدت تک والد نے سنبھال کر رکھی تھی۔ اگلے دن صوبہ سرحد کے واحد اخبار افغان میں اس سند کی کہانی شائع ہوئی۔ عنوان تھا۔

"چھوٹا پیر ——— پیر احمد شاہ"

بھائی بڑے ہوتے گئے اور ہر سال سکول میں انعام پاتے رہے ——— میں بھی پانچویں سوار کی طرح ان کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ ہمارے ایک بڑے بھائی تھے۔ پیر محمد شاہ اللہ انہیں غریق رحمت کرے بہت تیز مزاج بزرگ تھے۔ ہم دونوں کو ان سے بہت ڈر لگتا تھا۔ لیکن کئی باتوں میں ہم ان کی پیروی بھی کرتے تھے۔ مثلاً ان کو انگریزی ڈھب کے کپڑے پہننے کا بہت شوق تھا۔ ہم کو بھی یہ شوق لاحق ہوا۔ وہ شعر کہتے تھے اس لیے والد کے منظور نظر تھے۔ ہم دونوں نے بھی شعر کی طرف توجہ کی۔ جب ہماری شعر گوئی کی خبر بڑے بھائی تک پہنچی تو وہ بہت ناراض ہوئے اور والد نے بھی اس بات کو نہ سراہا کہ ہم سکول کا کام

چھوڑ کر شعر و شاعری میں پڑ جائیں۔ خود والد شعر کہتے تھے۔ لیکن بچوں میں سے کسی اور کا شعر و شاعری کی طرف متوجہ ہونا شروع شروع میں انھیں پسند نہ آتا تھا۔ بھائی شعر کہتے مگر انھیں فضول سمجھ کر پھاڑ دیتے۔ میں شعر کہتا اور غزل بھی کہتا تو لوگوں کو سناتا۔ میں نے بہت سے تخلص رکھے ماتڑ۔ ذوالفقار۔ واجد ان گمراں میں سے کوئی۔ مجھے پسند آیا نہ میرے بھائی کو۔ ایک دن جب اس تخلص کا جھگڑا درپیش تھا تو کہنے لگے تخلص کیوں ضروری ہے۔ میں نے کہا مقطع کے لئے۔ پھر کہا مقطع کیوں ضروری ہے، میں نے کہا تاکہ معلوم ہو کہ غزل کس کی ہے اور کہا باقی شعر میں چپ ہو گیا۔ اور تخلص رکھنے کا خیال دل سے نکال دیا۔

– – –

الف۔ اے پاس کرنے کے بعد بھائی جان گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہو گئے اور ان کے خط آنے لگے۔ ایک خط میں بھائی نے مجھے لکھا کہ میں نے یہاں راجا غضنفر علی خان اور پنڈت اوتار لال بقایا کو دوست بنایا ہے۔ راجا غضنفر علیخاں تو بہت بے سُرے ہیں لیکن پنڈت اوتار لال بہت خوب گاتے ہیں اور باجا بھی بجاتے ہیں۔ میں نے بانسری بجانی سیکھ لی ہے اور ان کے باجے کے ساتھ بانسری بجاتا ہوں۔ بھائی نے مجھے تاکید کی کہ اس بات کو صرف اپنے تک رکھوں۔

آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے

سر ظفر اللہ خاں

احمد شاہ بخاری سے میری پہلی ملاقات ۱۹۱۹ء کے آخری ایام میں ہوئی جب وہ (لاہور میں) کالج کے طالب علم تھے۔ میری ان کی رفاقت چالیس سال سے زیادہ عرصہ تک جاری رہی۔ ابتدائی دور ہی میں ان کے جگمگاتے اوصاف ہر اس شخص کا دل موہ لیتے تھے جسے ان کے ساتھ واسطہ پڑتا تھا۔ انگریزی زبان پر انہیں غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ ان کی یہ امتیازی خصوصیت کیمبرج اور بالآخر امریکہ میں بھی برابر قائم رہی۔

بخاری ہر اس صحبت یا اجتماع کی روح رواں ہوتے تھے۔ جس میں انہیں شامل ہونے کا موقع ملتا تھا۔ وہ بڑے تیز فہم اور حاضر جواب تھے ان کی شخصیت گوناگوں صفات حسنہ کی حامل تھی۔ انگریزی زبان پر قدرت، ہر دور کے انگریزی ادب سے قریبی واقفیت، ملٹن اور شیکسپیئر کی تصانیف سے گہری شیفتگی یہ ایسی خصوصیات ہیں جو بخاری کی شخصیت میں متوازن طور پر جمع ہو گئی تھیں۔ اور ان کی گفتگو، حاضر جوابی، مکالمے اور مباحثے کے دوران پھلجھڑیاں بن کر اپنے اظہار کی راہیں تلاش کر لیتی تھیں۔ اسی طرح اردو میں بے تکلف اظہار اور اس کی آمد برابر کا وصف سمجھی جا سکتی ہے۔ یہ بات عام طور پر معلوم نہیں، لیکن بخاری بانسری بجانے میں بھی قابلِ تعریف مہارت رکھتے تھے۔

وہ مغربی پاکستان کی قدیم ترین تعلیمی درس گاہ گورنمنٹ کالج لاہور میں پہلے انگریزی کے پروفیسر اور بعد میں پرنسپل مقرر کئے گئے۔ یہ بات انگریزی زبان اور ادب میں ان کے بلند مقام کی آئینہ دار ہے۔ مگر یہ ان کے ایک جوہر کی قدر دانی تھی۔ انہوں نے سفارت کے میدان میں اس کے بار امتیازی مراتب کے حصول کا سلسلہ جاری رکھا اور بالآخر بین الاقوامی تنظیم میں داخل ہو کر اپنی زندگی کے سفر کا اعلیٰ ترین مقام پا لیا۔ زندگی کی دوڑ میں جو یکساں طور پر درخشاں تھی وہ جہاں رکے اور جس رتبے پر فائز ہوئے وہاں ہر شخص نے انہیں صف اول کے لوگوں میں شمار کیا۔

بخاری زندگی کے ابتدائی دور ہی میں صحت کی تشویش ناک خرابی کا شکار ہو گئے تھے۔ اور عمر بھر یہ روگ پالتے رہے۔ جب وہ آل انڈیا ریڈیو میں مسٹر فیلڈن کے ساتھ کام کر رہے تھے تو حیاتی لحاظ سے بہت آزردہ اور دل شکستہ رہتے تھے۔ انہیں خرابیٔ صحت کی شدید کیفیت کا مقابلہ بھی درپیش تھا جس نے بعد ازاں کم و بیش دائمی مرض کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ ان ایام میں انہوں نے اس مرض کے پے در پے تکلیف دہ حملوں کا مقابلہ بڑی ہمت اور پامردی سے کیا۔ اور اپنی جسمانی تکالیف کو اپنے فرائض کی بجا آوری میں حائل نہ ہونے دیا۔ بعد میں جب وہ مسٹر فیلڈن کی جگہ آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل بنائے گئے۔ تو انہوں نے اطمینان کا سانس لیا اس بات نے انہیں اس قابل بنا دیا کہ وہ اپنی تکلیف دہ بیماری کا مقابلہ کسی قدر کامیابی کے ساتھ کر سکیں۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ ۱۹۵۳ء میں ان پر بیماری کا جو ناگہانی حملہ ہوا اسے ان کی مستقل رنجوری سے کوئی علاقہ تھا یا نہیں تاہم یہ حملہ شدید تھا

جس کی وجہ سے انہیں کئی ہفتے ہسپتال میں رہنا پڑا۔ اس صدمے سے وہ بچ گئے تو ہم سب نے اپنے آپ کو مبارک باد کا مستحق گردانا کہ وہ اپنی دلچسپی کے مختلف میدانوں میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکیں گے۔ ہم پُر امید ہو گئے کہ مناسب احتیاط سے وہ اپنی فیض رساں اور لطف اندوز زندگی کے کئی مزید سال ہمارے درمیان بسر کر سکیں گے۔

جتنا عرصہ انہوں نے اقوام متحدہ میں پاکستان کے مستقل نمائندے کی حیثیت سے کام کیا ہمیں ان سے بہت قریب رہنے کا موقع ملتا رہا۔ انہی دنوں مجھے بخاری کی ذہانت و تدبر کے بعض ایسے اوصاف کو بہ نظر غائر دیکھنے کا موقع ملا جو پہلے چنداں واضح اور روشن نہ تھے۔

اس اطلاع نے کہ بخاری خون کے دباؤ سے صاحبِ فراش ہو گئے مجھے اچانک صدمہ پہنچایا لیکن جب میں نے خود پہنچ کر دیکھا کہ ان کی حالت بہتر ہو رہی ہے تو دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا اگرچہ انہیں تندرست ہونے کے لئے کئی ہفتے انتظار کرنا پڑا۔

چند ماہ بعد وہ اقوام متحدہ کے اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل مقرر ہوئے۔ اس بات نے ان کے لئے موقع مہیا کیا کہ وہ اپنی قابلیت اور استعداد احسن طریقے پر پوری وسعت کے ساتھ بروئے کار لائیں۔ اقوام متحدہ میں انہوں نے جو خدمات سرانجام دیں وہ سب کو معلوم ہیں۔ ابھی انہوں نے اقوام متحدہ میں اپنے فرائض انجام دینے شروع نہیں کئے تھے کہ مجھے اپنے موجودہ منصب کے لئے منتخب کر لیا گیا۔ اس کے بعد مجھے بخاری سے ملنے کے مواقع بہت کم میسر آئے۔ البتہ جب کبھی میں نیویارک جاتا تھا تو ان سے رابطہ پیدا کرنے کی کوئی نہ کوئی صورت نکال لیتا تھا۔ میرے دل میں یہ خطرہ پیدا ہونے لگا تھا کہ بخاری کے قوائے جسمانی پر جو بوجھ پڑ رہا ہے وہ بہت بھاری ہے اور آخرکار ان کے دل پر اثر ڈال کر رہے گا۔ ایک اور بات جس نے میرے اس احساسِ خطر کو تیز تر کیا یہ تھی کہ بخاری تنہائی محسوس کرنے لگے تھے۔ اور اس حال میں ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات سے حد درجہ متاثر، فکرمند اور غمگین ہو جاتے تھے جنہیں عام حالات میں نظر انداز کر دیتے تھے۔ ان کی طبیعت کا یہ رخ سنبھالا ثابت ہونے کی بجائے ان کی گرتی ہوئی صحت کی ایک علامت بن گیا۔

اچانک ان کے انتقال کی اطلاع، جو مجھے لندن کے اخبار "ٹائمز" کی وساطت سے ملی، میرے لئے صدمۂ عظیم تھی۔ اس صدمے کے اثر سے میں کچھ وقت گزرنے کے بعد ہی سنبھل سکا۔ مجھے یاد ہے کہ اس روز عدالت کے پرائیویٹ اجلاس میں، میں اپنے پیڈ پر کچھ لکھتا رہا، یہ میری عادت کے سراسر خلاف بات تھی۔ جب صفحہ کا جو کچھ میں نے لکھا تھا اسے دیکھا وہاں یہ شعر نظر آیا ؎

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے
آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

یہ بخاری کے نمایاں ذہنی و فکری اوصاف کے لئے میرا لاشعوری خراجِ تحسین تھا۔ اور اس نقصان پر احساسِ رنج و الم کا اظہار، جسے ہم اس لئے زیادہ محسوس کر رہے ہیں کہ انہیں تربیتی برسوں سے لے کر بلندیوں پر پہنچنے کے وقت سے جانتے چلے آئے ہیں۔

خدا ان کی روح کو آسودگی نصیب کرے۔

(ترجمہ)

میرا نام بخاری ہے

بی۔ اے۔ ہاشمی

کسی نے دروازے پر دستک دی۔

"آجایئے۔"

"السلام علیکم . . . . امتیاز ہیں؟"

"وہ آپ کے سامنے ہے دیکھ لیجئے۔"

نمایاں طور پر مسکراتے ہوئے "میرا نام بخاری ہے امتیاز نے کہا تھا وہ آپ کے پاس آئیں گے تو ابھی نہیں پہنچے۔ ناگوار خاطر نہ ہو تو میں یہاں بیٹھ کر ان کا انتظار کروں۔"

"بسم اللہ۔"

یوں میری اور بخاری صاحب کی ۱۹۲۰ء میں پہلی ملاقات ہوئی۔

بخاری صاحب بیٹھ گئے۔ ادھر ادھر کی رسمی باتیں کرتے رہے پھر دلی شہر گفتگو کا موضوع بن گیا۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک دلی کے آثار قدیمہ سے لے کر کارخانہ داروں کے طور طریق اور رہن سہن کی باتیں ہوتی رہیں۔ سورج ڈھل گیا۔ مغرب کی اذانیں ہونے لگیں۔ بخاری صاحب بولے۔ دیکھئے امتیاز نہیں آئے میں نے آپ کا وقت ضائع کیا۔ زبان پر یہ لفظ تھے لیکن چہرے پر شادابی کہ اچھا کیا تیرا وقت ضائع کیا۔ پھر بولے آپ شام کو ٹہلنے نہیں جاتے۔ میں نے کہا۔ التزاماً اس کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں۔ جی چاہے تو چلئے۔ یوں بخاری صاحب اور میں ٹہلنے نکلے جو پھر مہینوں لیکن بے قاعدگی سے جاری رہا۔ آٹھ بجے کے لگ بھگ واپس آئے تو پھر میرے کمرے میں۔ ملازم نے کہا میاں کھانا لے آؤں۔ میں نے کہا ہاں۔ اپنی کرسی پر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے فضا کو مخاطب بنا کر بخاری صاحب بولے اب چلنا چاہئے۔ میں نے عرض کیا دال روٹی یہیں کھا لیجئے۔ انڈوں اور دہی کے اضافے کے بعد کھانا آیا۔ ہم دونوں نے معمولی اور مختصر کھانے کو آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت میں ختم کیا۔ ساڑھے نو کے قریب بخاری صاحب بولے۔ اچھا بھائی میں چلا۔ میں گورنمنٹ کالج کے ہوسٹل کواڈرینگل میں رہتا ہوں۔ میں بھی ہمراہی کے لیے ان کے ساتھ ہو لیا۔ اور نیلے گنبد کے چوک سے واپس آگیا۔

اس دن کے بعد کم و بیش بلا ناغہ شام کی ملاقاتوں کا سلسلہ کئی مہینوں تک جاری رہا۔

ہمارے ایک مشترکہ دوست کو بخاری صاحب کا اس باقاعدگی سے میرے پاس تشریف لانا کچھ گراں گذرا۔ ایک دن وہ بولے کہ دیکھو بخاری! باوجود دیرینہ رسم کے تم میرے پاس نہیں آتے اور ہاشمی کے پاس روز آتے ہو۔ بخاری صاحب نے جواب دیا ملک صاحب یہ دل لگی کے سودے

ہیں۔ آپ اگر چاہتے ہیں کہ آپ کی خدمت میں روزانہ حاضر ہوں تو میرے لئے کوئی ٹیوشن [illegible] مقرر کر دیجئے۔ سو روپیہ مہینہ پر روزانہ ایک گھنٹہ کے لئے مقررہ وقت پر حاضر ہو جایا کروں گا۔ البتہ اتوار چھٹی کے دن نہیں۔

بخاری صاحب بڑی ہموار طبیعت کے آدمی تھے۔ اکثر تقریبوں میں شامل رہتے تھے۔ تاہم وہ چھوٹی چھوٹی ناگواریوں کو دوسروں کا مذاق اڑانے کا خمیازہ سمجھ کر ایسا کرتے تھے لیکن جب زخم ہونے تو بہت کم جلنے [illegible]

بیدل صاحب اس زمانہ میں نارمن سے [illegible] مسلم ہوٹل میں رہتے تھے۔ ان کے پاس کبھی کبھی اتفاقاً بخاری اور چند اور دوست ملنے جایا کرتے تھے۔ ایک دن بیدل صاحب نے از راہ شفقت دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا۔ کھانا شروع ہوا تو بیدل صاحب کو خیال آیا کہ بخاری صاحب کو دہی سے بہت رغبت ہے۔ بولے آپ لوگ دہی کھاتے ہیں۔ ایک زبان ہو کر سب نے عرض کیا۔ جی ہاں۔ بیدل صاحب نے آواز دی۔ ارے لڑکے ایک آنے کا دہی لے آ۔ سستا زمانہ تھا لیکن ایک آنے کا دہی تو بس تبرک ہی ایک آنے کا ہوتا تھا۔ بخاری صاحب بولے۔ بیدل صاحب یہ دہی کیا منہ کے لئے منگایا ہے۔ بیدل صاحب نازک مزاج تھے برہم ہو گئے۔ بخاری صاحب نے بھی خلاف معمول برہمی کا جواب برہمی سے دیا۔ بہرحال بات آئی گئی ہوئی لیکن لوگ مدتوں [illegible] ہوتے رہے۔

بخاری صاحب عام طور پر ہمیشہ محفل کی توجہ کا مرکز خود ہی رہنا چاہتے تھے۔ کبھی علم میں شگفتگی کی چاشنی اور کبھی شگفتگی میں علم کی تاک لفظوں کے الٹ پھیر، بات کی برجستگی سے ذہانت اور جب بہت معصوم روئی سے وہ ہر بات اور ہر حرکت میں ایک نئی جدت پیدا کرتے تھے۔ محفل کی نگاہیں اور کان ان کے لئے وقف ہو جاتے تھے۔

ایکٹر اور تمثیل کار ایک معنوں میں خوش نصیب ہوتے ہیں۔ وہ اپنی پسند کے مطابق اپنے پارٹ تجویز کرتے ہیں۔ کبھی تخت شاہی اور کبھی کاسۂ گدائی، کبھی ہر وقت خوش باشی اور خوش وقتی اور کبھی پیہم مصائب و آلام۔ لیکن زندگی کا رنگ نرالا ہے۔ اس میں اپنی پسند اور انتخاب کو زیادہ دخل نہیں ہوتا۔ اس میں رنج اور خوشی توام ہیں۔ تاہم ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی زندگی کو تمثیل کاری بنا لے۔ مقصود صرف یہ ہو جائے کہ زندگی کا صرف ایک ہی رخ پیش کرے جو اوروں کی خوشی اور اپنی بالیدگی کا باعث ہو۔ بخاری صاحب کی زندگی کا فلسفہ اور شیوہ یہی تھا۔ تاہم ان کے نیازمندوں میں ہم میں ایسے شخص بھی ہیں جن کے سامنے وہ دکھ سے رو دئے ہوں یا خوشی سے ہنس پڑے ہوں۔ شاذ و نادر ہی سہی لیکن ایسا بھی ہوا ہے کہ یہ چہکنے والا بخاری اور ہر بات میں امرت گھولنے والا بخاری اپنے کسی نیازمند کے پاس آدھ آدھ گھنٹہ خاموش بیٹھا رہا ہے۔ ایسے موقعوں پر اس کا دل اس کی زبان سے زیادہ طاقت اور ندرت سے اپنی کہتا تھا اور دوسروں کی سنتا تھا۔ یہ لمحے اس کے نیازمند کو نہیں بھول سکتے اور خواہ کوئی خود کو کتنا ہی زبان آور اور قلم کا دھنی کہے، بیان نہیں کئے جا سکتے۔

محبت کے فسانے دیدہ و دل کی امانت ہیں
خیانت ہے زباں کو محرم اسرار کر لینا

بخاری صاحب احسان فراموش نہیں تھے لیکن احسان مندی کے اعلان کے بھی قائل نہ تھے۔ ان کی رائے میں اظہار احسان مندی محسن کو خفیف اور خود کو بھکاری بنا دینے کے مترادف تھا۔ محکمہ تعلیم اور پھر آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کے زمانے میں وہ ہمیشہ [illegible] لڑتے رہے لیکن یہ کبھی ظاہر نہیں کیا کہ وہ عمر یا زید سے برسرپیکار ہیں۔ ایک بار ریڈیو کی ملازمت کے دوران میں دشمن نے نرغہ کیا۔ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ایک مسلمان ممبر نے بے طلب درخواست پانسہ بخاری صاحب کے حق میں پلٹ دیا اور یوں بخاری صاحب نے تشویش سے نجات پائی لیکن اس کے بعد بخاری صاحب ان

صاحب کے سامنے بیٹھنے سے بچتے رہتے ہیں۔ جب وقفے سے آگاہ ہوا تو ایک دن میں نے بخاری صاحب سے کہا: دیکھو انہوں نے تمہاری یہ مدد کی اور تم قول جو تم دے جاتے ہو ان کے سامنے جا کر سلام دعا بھی نہیں کرتے۔ وہ تمہارے شکریہ کے محتاج نہیں لیکن تمہاری شرافت کا تو یہی تقاضا ہونا چاہئے کہ تم شکرگزار ہو۔ بولے: سنو بھائی۔ پرانے زمانے کے بزرگ ہیں۔ جو کچھ انہوں نے کرم فرمایا تھا ان کے احساس، خوش کاری اور شستہ مندی کو میں شکریہ کے چند جملے کہہ کر کیوں گھٹاؤں۔

دوران ملازمت میں ہر ملازم کی طرح بخاری صاحب کو بھی اکثر اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے مختلف راہیں اختیار کرنی پڑتی تھیں۔ گورنمنٹ کالج میں شعبہ انگریزی کے چیئرمین کی جگہ خالی ہوئی۔ بخاری صاحب کو نظر انداز کرکے ایک فرنگی کو چیئرمین بنا دیا گیا۔ بخاری صاحب نے پرنسپل سے تحریری احتجاج کیا۔ اس نے اپنے فیصلے کو بحال رکھتے ہوئے بخاری صاحب کی درخواست ڈائریکٹر تعلیمات کے پاس بھیج دی۔ ڈائریکٹر نے بھی پرنسپل کے فیصلے کو بدلنے سے انکار کر دیا۔ بخاری صاحب نچلے نہ بیٹھے اور درخواست صوبے کے گورنر کو محکمانہ ذریعے سے ارسال کر دی۔ گورنر نے روبرو بخاری کو بلایا اور کہا کہ گورنمنٹ کالج میں تو انگریزی کا چیئرمین انگریز ہی کو ہونا چاہیے۔ بخاری صاحب نے جواب دیا، حضور کا ارشاد بجا لیکن اگر گورنمنٹ کالج میں شعبہ انگریزی کا چیئرمین انگریز ہی کو ہونا چاہئے تو اس انگریز کے پاس انگریزی کی فرسٹ کلاس ڈگری بھی ہونا چاہیے۔ بخاری صاحب کی ڈگری فرسٹ کلاس تھی اور دوسرے شخص کے پاس سیکنڈ کلاس ڈگری تھی۔ فرنگی گورنر نے تالی بجا کر کہا کہ ملاقات نعرہ تحسین کے بعد ختم کی جاتی ہے اور بخاری صاحب شعبہ انگریزی کے چیئرمین ہوگئے۔

ریڈیو کی ملازمت کے دوران میں جب وہ ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کے ایک دو سال اچھے خاصے بدمزہ سے گزرے لیکن انہوں نے کبھی اپنی پریشانی کا حال بیان نہیں کیا۔ اپنے تمام حربے استعمال کرتے رہے اور آخرکار تمام دشواریوں پر فتح پائی۔ ان کے ایک معرکے کا قصہ سنیے —

میں لاہور سے دلی گیا ہوا تھا۔ صرف ایک آدھ روز کے لئے۔ بغیر اطلاع بخاری صاحب سے ملنے ان کے دفتر پہنچا۔ گاڑی سے اترا ہی تھا کہ محکمے کے فرنگی افسر اعلیٰ سے آمنا سامنا ہوگیا۔ ان کی اور میری بے تکلف ملاقات تھی۔ وہ سمجھے کہ میں ان سے ملنے کو آیا ہوں۔ نہایت گرمجوشی سے ملے۔ تھوڑی سی گفتگو کے بعد جب انہوں نے اپنے کمرے میں چلنے کو کہا تو میں نے بتایا کہ میرا مقصود اس وقت بخاری صاحب ہیں۔ یہ بات انہیں چبھی لیکن خلش دور کرنے کے لئے اس نے سلسلہ گفتگو دراز کر دیا۔ اچھے خاصے پندرہ منٹ کھڑے کھڑے اور باتیں کرتے گزر گئے تو بولا چلو میں تمہیں بخاری کے کمرے میں پہنچا دوں۔ بخاری صاحب کے کمرے میں پہنچے۔ میرے اچانک پہنچنے پر متعجب اور خوش ہوئے۔ فوراً غالب کا مصرع پڑھا۔

آئے خدا کرے یہاں پر نہ کرے خدا کہ یوں

مجھے بخاری صاحب کے کمرے میں پہنچا کر فرنگی رخصت ہوگیا۔ ہم دونوں باتوں میں مشغول ہوگئے۔ لیکن چند منٹ ہی گزرے ہونگے کہ وہ صاحب پھر آ گئے۔ کاروباری بات کی وجہ سے معافی مانگتے ہوئے بخاری صاحب سے مخاطب ہوئے کہ ایک ضروری دورے پر وہ اگلے ہفتے خود مدراس جائیں گے اور اس لئے بخاری صاحب کے پیش نظر جو بھی پروگرام ہو وہ منسوخ کر دیا جائے۔ چونکہ بخاری صاحب کو دفتر میں موجود رہنا ہوگا۔ نہایت خوش ہو کر بخاری صاحب بولے۔ آپ ضرور مدراس جائیے شکر کا مقام ہے کہ میں گرمی کے زمانے میں ریل میں بیٹھ کر ریگستان کی خاک پھانکنے سے بچ گیا۔ دلی کا خوشگوار موسم، دفتر کا دل پسند کمرہ، میں نہایت خوشی سے دفتر میں رہوں گا۔

وہ فرنگی افسر اعلیٰ بخاری صاحب کو میرے آگے ہلکا بنانے آیا تھا لیکن خود سبک ہو کر واپس ہوگیا مگر خراشیدہ ماہت قصد خراش۔

دس منٹ کے بعد پھر آیا اور بولا بخاری صاحب سے مجھ کو ملاقات دیکھتے ہوئے خیال آیا کہ اگلے ہفتے یہ دو معاملات کے سلسلے میں دلی میں موجودگی ضروری ہوگی۔ اس لئے اب تم ہی مدد سے پرسوں چلے جاؤ۔ بخاری صاحب اچھل پڑے۔ تالیاں بجانے لگے "اللہ، وہ لڑکے جیسے جھومتے ہوئے درخت۔ وہ نیلا سمندر، وہ خاموش فضائیں، وہ فلاں، وہ فلاں سے ملاقات یقیناً وہ صورت مدتوں یاد رہے گی" اس شخص نے بھونچکا ہو کر بخاری صاحب کا منہ دیکھا اور کچھ کہے بغیر کھسیانی ہنسی ہنستے چلا گیا۔

میں اس ڈرامے کا تماشائی تھا۔ بخاری صاحب بولے بھائی اگر یہ سال بھر رہ گیا تو یہاں سے پاگل ہو کے جائے گا۔

تقسیم ملک سے سال کے بارہ مہینے ہوتے ہیں لیکن آل انڈیا ریڈیو کا ڈائریکٹر چند ماہ کے بعد ملازمت سے سبکدوش ہو کر ہندوستان سے رخصت ہوگیا۔ اور بخاری صاحب آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔

بخاری صاحب آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل ہو گئے لیکن یہ زمانہ بخاری صاحب کے دوستوں اور بخاری صاحب کے لئے خود ایک آزمائش کا دور تھا۔ آل انڈیا ریڈیو ایک نیا اور سب سے پھیلنے اور بڑھنے والا محکمہ تھا۔ روز نئی نئی نوکریاں نکلتی تھیں اور ہر نوجوان اس محکمہ میں نوکری کا خواہش مند تھا۔

بخاری صاحب کے دوستوں نے بے شمار تعلقات میں سفارشی خطوط لکھنے شروع کئے اور اپنے اپنے امیدواروں کی ناکامی پر ابتدا میں خفیف سی خفگی اور بعد ازاں رنجش کا اظہار شروع کر دیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ میں نے کبھی کسی کی سفارش بخاری صاحب سے نہ کی لیکن ایک روز گفتگو کرتے ہوئے میں نے ان سے عرض کیا کہ مرد خدا فلاں دوست نے جو ہمارا محترم اور محسن ہے اپنے بیٹے کے لئے تمہیں لکھا اور تم آئیں بائیں شائیں کر گئے۔ یہ کیا طور ہے صاف لکھ دیتے کہ اس کو ملازمت دینا ممکن نہیں لیکن لیت و لعل میں ڈال دینا قطعی غلط ہے۔ بخاری صاحب نے جواب کی تمہید میں سرکاری قسم کی توجیہات پیش کیں جن سے ہر سرکاری ملازم واقف ہوتا ہے۔ پھر کہا کہ بھائی ہر ایک خواہش مند کو نوکری کہاں سے دوں۔ البتہ میں اس کی کوتاہی کو اور ذرائع سے پورا کر دیتا ہوں۔ مثلاً کوئی فلاں صاحب کا خط لائے تو میں کہہ دوں گا، دفتر میں خط لائیے۔ اور فلاں صاحب کا خط ہو تو کھول کر پڑھتا ہوا برآمدے میں آکر عرض گزاروں سے ملاقات کر لوں گا۔ غرضیکہ اسی طرح کسی سے دفتر کے کمرے میں اور کسی سے ڈرائنگ روم میں ملتا ہوں۔ بہت محترم اور عزیز دوستوں کے سفارشیوں کو گھر پر ٹھہرا بھی لیتا ہوں۔ موٹر میں صفدر جنگ اور ہمایوں کے مقبرے کی سیر بھی کرا دیتا ہوں۔ نہایت لذیذ گفتگو کے بعد بولے کہ بھائی سفارشی خطوط کی پذیرائی اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا ہوں۔

بخاری صاحب نے شعر و نثر میں بہت ہی کم لکھا ہے۔ شعر میں ایک نظم جس کا عنوان میں بھول رہا ہوں اور جو شاید کبھی چھپی بھی نہیں، دو تین غزلیں اور چند متفرق شعر۔ نثر میں پطرس کے مضامین کے علاوہ ایک کہانی عشق کی خودکشی، دو چند متفرق مضامین جو مخزن میں چھپے اور گالزوردی کا ایک ترجمہ سیب کا درخت۔ مجھے یاد نہیں کہ انگریزی میں ایک دو مضمون کے علاوہ جو پاکستان ٹائمز میں چھپے اور کوئی چیز بخاری صاحب نے لکھی ہو۔ اس سرمایۂ ادب کی سب سے بڑی خوبی اور خصوصیت اس کا انوکھا پن ہے .... وہ پچیس تیس بلکہ چالیس پچاس شعر کہتے۔ دو ایک دوستوں کو ایک ایک کر کے کبھی ایک کبھی دوسرا شعر سناتے۔ تنقید سے مستفیض ہوتے جو شعر معیار پر پورا اترتا اسے رکھتے اور باقی اس طرح بھول جاتے، جیسے کبھی لکھے ہی نہ تھے۔

میرا مقصد یہ نہیں کہ بخاری صاحب پر بحیثیت ادیب یا نقاد کچھ عرض کروں۔ مجھ سے بہتر بہت سے حضرات ہیں جو مبسوط مضامین تحریر فرمائیں گے۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ بخاری صاحب کو قدرت نے یہ دولت فراوانی سے عطا فرمائی تھی کہ وہ چھپے ہوئے کونوں میں اپنی ذہانت کی لہ

روشنی ڈال دیں اور سارے گوشوں کو منور کر دیں کہ دیکھنے والوں کی نگاہیں خیرہ ہو جائیں۔

بخاری صاحب محفل سازی اور محفل آرائی میں فرد تھے۔ اعلان آزادی کے بعد گورنمنٹ کالج میں پرنسپل مقرر ہوئے تو پھر طالب علمی کے زمانے کی سی صحبتیں، محفلیں گرم کرنے کی سوجھی۔ میں اس زمانے میں ٹریننگ کالج میں تھا اور اس سے پہلے طرح ان کے بہت قریب۔ سال ڈیڑھ سال ایسا گذرا کہ میں دائم و دل دادہ اندروں کی ہم دونوں کو بہت سی آسانیاں میسر تھیں، اس لیے بلا لحاظ وقت یا قید لباس جب جی میں آیا ایک دوسرے کے پاس پہنچ گئے۔ شام کے بعد اور رات گئے تک کی صحبتوں میں میں شریک نہ ہو سکتا تھا۔ میں ہمیشہ سے اس معاملے میں کچا ہوں۔ اس لیے اس وقت بخاری صاحب ہوں میں مجھ سے زیادہ مہر و دستوں پر پرورش کیا کرتے تھے جبکہ ملاقاتوں کو یقینی بنانے کے لیے انہوں نے ہر دس پندرہ دن کے بعد اپنے گھر پر ان کے لیے کی دعوتوں کا سلسلہ شروع کیا جو کئی مہینے چلتا رہا۔ دعوتوں میں ان کے پانچ چھ نیاز مند شریک ہوتے تھے۔ ان موقعوں پر وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ میرے دوستوں کا خون سفید ہے۔ ملنے کو بلاؤ تو ملاقات ہو جاتی ہے ورنہ ادھر کا کبھی رخ بھی نہیں کرتے۔ دس بارہ برس گذر گئے لیکن سے

کسے کہ محرم باد صبا است میداند
کہ با وجود خزاں بوئے یاسمن باقی است

یہ قصے کہاں تک لکھے جاؤں۔ اگر اس زمانے میں تنہائی عدیم الفرصتی نہ ہوتی تو بھی یہ داستان اتنی طویل ہے کہ اس کا لکھنا میرے بس کی بات نہیں

ایک بار میں نے بخاری صاحب سے کہا کہ میرے نزدیک "کلچرڈ" آدمی کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ وہ تنہائی سے نہ گھبرائے اور آپ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنہائی سے خوف زدہ رہتے ہیں یعنی میرے نزدیک آپ کلچرڈ آدمی نہیں ہیں یا میری "کلچرڈ" ہونے کی تعریف غلط ہے۔ باوجود میرے کچھ کہنے کے کوئی جواب نہ دیا۔ چہرے پر افسردگی نمایاں ہو گئی۔ میرا گمان ہے کہ بخاری صاحب کے تحت الشعور میں ان کی زندگی کے کم از کم آخری دس پندرہ سالوں میں دل کے مرض کا ڈر کا ساتھ رہتا تھا۔ ضبط نے کبھی انہیں اجازت نہ دی کہ وہ اس کو ظاہر کریں۔ لیکن وہ ہمیشہ انجام مرض سے خائف رہے۔

اس دن کے بعد میں نے اس قسم کی کوئی بات بخاری صاحب سے نہ کی۔

گورستانِ ادب کا فقیر

عبدالمجید سالک

مسلم ٹاؤن لاہور

مکرمی۔ السلام علیکم

آپ نے دو تین خط بھیجے لیکن میں کسی ایک کا بھی جواب نہ لکھ سکا۔ حالانکہ یہ کوتاہی میری وضع کے خلاف ہے۔ بخاری کا مرنا، میری محفلِ احباب کا قطعی طور پر اجڑ جانا ہے۔ زندگی بالکل بےمزہ و بےرنگ ہو کر رہ گئی۔

آپ کو غالباً معلوم نہیں، میں کوئی سال بھر سے عوارضِ قلب میں مبتلا ہوں۔ لکھنا پڑھنا چھوٹ چکا ہے۔ مر کھپ کر ایک آدھ نثری تحریر ہفتہ میں لکھ لیتا ہوں اور بس۔ آج کل بلڈ پریشر میں مبتلا ہوں۔ ڈاکٹر محمد یوسف مہینوں سے علاج کر رہے ہیں۔ آپ مجھ سے مضمون کی فرمائش کرتے ہیں تو بےحد شرمندہ ہوتا ہوں۔ کچھ کہہ نہیں سکتا کہ تعمیلِ حکم کر سکوں گا۔ اگر ممکن ہوا تو شاید کچھ لکھ دوں۔ نہ ہوا تو معذور جان کر معاف فرما دیجئے گا۔

عبدالمجید سالک

مولانا عبدالمجید سالک کا یہ خط مجھے ۱۳ر دسمبر ۵۹ء کو ملا تھا۔ مگر اس عرصے میں مولانا موصوف کی صحت اور بگڑ گئی، اتنی بگڑی کہ ہم لوگ دم سادھ کے رہ گئے۔ مضمون لکھوانا تو درکنار ہمیں اپنی زندگی ان کے حساب میں جمع کرانا پڑی۔ تب کہیں انہیں دوبارہ زندگی نصیب ہوئی۔

ابھی دو چار روز کی بات ہے کہ میں پھر ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ خیال تھا کہ اگر ان کی صحت اچھی ہوئی تو پھر پطرس پر لکھنے کے لیے کچھ عرض کروں گا۔ انہیں دیکھا تو کچھ کہا نہ گیا۔ دل کی دل ہی میں لے کے واپس آ گیا۔

بخاری صاحب کے جتنے گہرے تعلقات مولانا عبدالمجید سالک سے تھے۔ اتنے اور کسی سے نہ تھے۔ دین تھے تو یہ، دنیا تھے تو یہ، دوست تھے تو یہ، بھائی تھے تو یہ، مشیر تھے تو یہ، استاد تھے تو یہ، گویا سب کچھ بخاری صاحب کے لیے سالک صاحب ہی تھے۔

بیماری نے انہیں اس حد تک نڈھال کر دیا ہے کہ باوجود انتہائی کوشش کے وہ پطرس کے لیے کچھ نہیں لکھ سکے حالانکہ اتنا کچھ لکھنا چاہتے ہیں کہ آپ پڑھ پڑھ کر خوش ہوں اور یہ لکھ لکھ کر۔

مجبوری کے عالم میں مولانا موصوف کی دو چھوٹی چھوٹی تحریریں پیش کر رہے ہیں۔ ایک تو بخاری کی وفات پر ریڈیو پاکستان کا پیغام ہے دوسری ایک اور مطبوعہ تحریر جس میں پطرس بھی ہے اور مجید بھی

(محمد طفیل)

①

احمد شاہ بخاری کی موت پاکستان میں علم و ادب اور خلوص و محبت کی موت ہے اس کے دوست اشکبار ہیں اور پورا ملک ناقابلِ تلافی نقصان پر ششدر و مبہوت ہو رہا ہے۔ اس بے نظیر قابلیت کے افراد ہمارے ملک میں نایاب ہیں جو زندگی کی ہر مصروفیت میں اپنے اپنے ہم عصروں سے نمایاں طور پر ممتاز نظر آئیں۔ بخاری گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر کی حیثیت سے، آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت سے، پھر اپنے کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے، اس کے بعد اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کے رئیس کی حیثیت سے۔ جہاں کہیں بھی رہے سربلند و ممتاز اور نمایاں رہے۔ وہ ادب و انشا، طنز و مزاح اور تنقید عالیہ میں دور دور تک اپنی مثال نہ رکھتے تھے۔ صرف پاکستان ہی میں نہیں، بلکہ پورے برصغیر میں بخاری کے بیسیوں شاگرد اپنی اپنی حکومتوں کے اعلیٰ عہدوں پر ممتاز ہیں۔ اور بہترین خدمات بجا لا کر اپنے عالی قدر استاد کا نام روشن کر رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بخاری نے ادب و انشا میں بہت قلیل سرمایہ چھوڑا ہے۔ لیکن اس کے قلم سے جو چند تنقیدی مضامین اور جو ایک دو کتابیں نکلیں وہ ہمیشہ ہمارے ادیبوں اور نقادوں کو صحیح الخیالی اور بالغ نظری کا سبق دیتی رہیں گی۔ اور پاکستان ہمیشہ اپنے اس عدیم المثال اور عالی دماغ فرزند پر ناز کرتا رہے گا۔

②

جن دنوں میں کراچی میں مقیم تھا۔ بخاری مرحوم پاکستان آئے تو چند روز کراچی میں فروکش رہے۔ ایک دن مجھ سے پوچھنے لگے کہ کہئے کوئی نیا دوست بھی بنایا۔ میں نے کہا کیسی باتیں کرتے ہو۔ کبھی دوست بھی بنائے جاتے ہیں اور خصوصاً اس عمر میں؟ دوست تو نوجوانی میں میسر آتے ہیں۔ اور خود بخود بن جاتے ہیں۔ البتہ بعض مخلص نوجوان زندگی کے ہر حصے میں ملتے ہیں جن کے خلوص پر جان قربان کر دینے کو جی چاہتا ہے۔ مثلاً تم نے مجید لاہوری کا نام سنا ہوگا، کراچی میں یہ شخص میرا انتہا رفیق اور دوست ہے۔ اسے عالم اور ادیب ہونے کا دعوےٰ نہیں۔ لیکن طبیعت کی جودت کی وجہ سے اچھے اچھے عالم اور ادیب اس کی قدر کرتے ہیں۔ کہنے لگے تو پھر ہم سے اس کی ملاقات ضرور کرا دیجئے۔

ایک دن میں مجید کو لے کر برسٹل ہوٹل کے پاس بخاری کے ہاں گیا۔ "جنگ" کا "حرف و حکایت" تو پڑھتے ہی تھے۔ اب اس کے مصنف کو دیکھا تو بے حد نہال ہوئے اور جب باتیں سنیں تو اور بھی زیادہ فریفتہ ہوئے۔ مجید کی بھولی بھالی صورت، اس کے بے ضرر تفنن اور مخلصانہ سادگی کی وجہ سے پہلی ہی ملاقات میں اس سے یوں پیار کرنے لگے۔ جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ مجید کی نظمیں سنیں تو اور بھی لٹو ہوئے۔ اس کے بعد قرار پایا کہ ہر روز رات کے وقت کھانے کے بعد سالک کے مکان پر "خلوتِ اُنس" برپا ہوا کرے۔ جس میں بخاری اور مجید کے سوا کوئی نہ ہو۔ چنانچہ عقب ریڈیو سٹیشن والے مکان میں یہ نشست باقاعدہ منعقد ہونے لگی۔ خشک پھل کی پلیٹیں تپائیوں پر پڑی ہوتیں۔ چلغوزوں کا انبار موجود ہوتا اور نمکین اور گرما گرم کشمیری چائے کے بھرے ہوئے تھرمس تیار رہتے۔ بخاری، مجید اور میں چائے کی چسکیاں لیتے، چلغوزے کھاتے اور غزلیں پڑھتے۔ یہ صحبت بعض اوقات دو دو بجے رات کو ختم ہوتی۔

ان صحبتوں میں مجید کراچی کی سیاسیات، پاکستان کے بعض اکابر کی خصوصیات اور بعض ادبی، مجلسی اور اقتصادی (یعنی تجارتی) شخصیتوں

کے بیٹھے اپنے مخصوص انداز میں ہنستا۔ بخاری بے حد شگفتہ ہوتے۔ وہ ان ہم خوردہ اور امریکہ کے واقعات کی جگالی کرتے اور یوں یادوں سے اپنے خیال پر وہ زندگی کی ویرانیوں کو لالہ زار بناتے اور پھر جب رات بوڑھی ہونے لگتی تو بخاری مجید کو اپنی موٹر کار میں بٹھا کر ان کے گھر پہنچاتے اور ہم اپنے گھر جاتے۔

جب تک مجید زندہ رہے بخاری پروانہ و شیفتہ رہے اور بخاری ہی نیویارک سے جب کبھی خط لکھتے تھے مجید کا حال ضرور پوچھتے اور "نمکدان" بھیجنے کا تقاضا کرتے چنانچہ ہم "نمکدان" کے پرچے جمع کر کے وزارت خارجہ کو بھیجتے "ڈپلومیٹک بیگ" میں بخاری کو ارسال کر دیتے۔

مجید کے انتقال پر بخاری اس قدر غمزدہ ہوئے کہ ان کا تعزیتی خط جو میرے نام آیا خون روتا ہوا معلوم ہوتا تھا

ابھی حسرت و مجید کا ماتم ختم نہ ہونے پایا تھا کہ ہم لوگوں کو بخاری جیسے عظیم الشان دوست اور عظیم الشان انسان کے فقدان پر سینہ کوبی کرنی پڑی۔ میں تو محسوس کرتا ہوں کہ گویا گورستانِ ادب کا فقیر ہوں جنازے دھڑا دھڑ آ رہے ہیں یہاں تک کہ میں دفن کرتے کرتے تھک گیا ہوں چاروں طرف نظر ڈالتا ہوں تو تنہائی کاٹنے کو دوڑتی ہے۔

زندگی کی شاہراہ تو حوادث کے آفتاب کی تمازت سے تپ رہی ہے۔ آہ! اے موت کی سایادار سرزمین! تو کہاں ہے کہ راہِ حیات کے مسافر تیری ٹھنڈی چھاؤں میں آرام پا سکیں۔ وہ ان گزرے ہوؤں سے جا ملیں۔ جو اپنی خوش نصیبی کی وجہ سے اس تیرہ و زندان سے نجات پا کر جا چکے ہیں ؎

یارانِ موافق ہمہ از دست شدند   از دستِ اجل یکاں یکاں پست شدند
بودند تنک شراب در مجلسِ عمر   یک دور ز ما پیشترک مست شدند

"کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور"

رشید احمد صدیقی

پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس) دفعتہً ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔ ان کی باتوں اور تحریروں سے بے شمار لوگوں کے دل خوش ہوئے اور ہوتے رہیں گے۔ اللہ تعالےٰ نے ان سے اتنی بڑی خدمت لی تو یقیناً ان کو اپنی بے کراں نوازشوں سے سرفراز بھی فرمایا ہوگا۔

اگر ہم ذہن میں کسی ایسی محفل کا نقشہ جمائیں جہاں تمام ملکوں کے مشاہیر اپنے اپنے شعر و ادب کا تعارف کرانے کے لیے جمع ہوں تو اردو کی طرف سے ہم بہ اتفاق آرا کس کو اپنا نمائندہ انتخاب کریں گے؟ یقیناً بخاری کو۔ بخاری نے اس قسم کے انتخاب کے معیار کو اتنا اونچا کر دیا ہے کہ نمائندوں کا حلقہ مختصر ہوتے ہوتے معدوم ہونے لگتا ہے۔ یہ بات کس وثوق سے ایسے شخص کے بارے میں کہہ رہا ہوں جس نے اردو میں سب سے کم سرمایہ چھوڑا ہے لیکن کتنا اونچا مقام پایا۔

تاریخ اور تفصیل میں کون پڑے اتنا البتہ یاد ہے کہ سب سے پہلے "راوی" میں پطرس کا مضمون "کتے" پڑھا تو ایسا محسوس ہوا جیسے لکھنے والے نے اس مضمون سے جو درجہ حاصل کر لیا وہ بہتوں کو تمام عمر نصیب نہ ہوگا۔ ظرافت نگاری میں پطرس کا ہمسر ان کے ہم عصروں میں کوئی نہیں۔ طنز و ظرافت آسانی سے ہاتھ آ جانے والے لیکن پُر پیچ اور خطرناک آلے ہیں۔ ہنسی، دل لگی یا طعن تشنیع کسے نہیں آتی۔ لیکن بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ کب ہنسنا چاہیے، کس پر ہنسنا چاہیے، کتنا ہنسنا چاہیے اور سب سے مشکل یہ کہ کیسے ہنسنا چاہیے۔ انسان ہنسنے والا جانور کہا جاتا ہے اور یہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ بعض لوگ اس طرح ہنستے ہیں ممکن ہے اسی سبب سے بقیہ جانوروں نے ہنسنا چھوڑ دیا ہو۔ بخاری ان رموز سے واقف تھے۔

جو بات ظرافت کے بارے میں کہی گئی ہے وہی طنز پر بھی صادق آتی ہے۔ دونوں کی بدنصیبی یہ رہی ہے کہ سہل الحصول ہونے کے سبب سے ہم ان ذمہ داریوں کا خیال نہیں کرتے جو ان کی طرف سے ہم پر عائد ہوتی ہیں اور اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ سستی طنز و ظرافت بہت مہنگی پڑتی ہے یعنی احتیاط سے کام نہ لیا جائے تو طنز و ظرافت سے کام لینے والا خود طنز و ظرافت کا شکار ہو جاتا ہے۔ ہم میں سے اکثر اس کا شکار ہیں۔ صرف محسوس نہیں کرتے۔

طنز کی محرک برہمی یا بیزاری ہوتی ہے۔ ظرافت کی تفریح و تفنن۔ ان کا رشتہ نفسِ واقعہ سے بھی ہے اور فن کار کے ردِّ عمل سے بھی۔ ایک ہی واقعہ ایک شخص کو ایک طرح سے متاثر کرتا ہے اور دوسرے کو دوسری طرح۔ ایک اس سے برہمی یا بیزاری کا اظہار کرے گا دوسرا اس کے مضحک یا تفریحی پہلو کو ابھارے گا۔ اس کے بعد یہ دیکھتے ہیں کہ جس فن کار کا جیسا ردِّ عمل ہوا ہے اس کا اظہار اس نے کس طرح کیا ہے یعنی فن کار کی شخصیت کس پایہ کی ہے اور فن پر اس کی گرفت کیسی ہے۔ نادانستہ طور پر یہ بحث اس منزل پر آ گئی جہاں شخصیت اور فن کے رشتے سے بحث کرنا ضروری ہو جاتا

ہے۔ لیکن یہاں صرف اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ فن کو شخصیت سے توانائی ملتی ہے۔ فن کی غلامی شخصیت کی ناپختگی کی دلیل ہے۔ فن ٹیکنیکل اور میکینکل ہوتا ہے اور شخصیت عطیہ الٰہی ہے جو ریاضت اور انتظار سے جلا پاتی ہے۔

آج کل طنز و ظرافت میں جس چیز کی کمی خاص طور پر محسوس ہوتی ہے وہ شخصیت ہے۔ سبب یہ ہے کہ ہمارے بیشتر لکھنے والے بندھے ٹکے موضوعات کے اسیر ہو گئے ہیں۔ جن پر طنز و ظرافت کا عمل کوشش کئے بغیر بھی کارگر ہو جاتا ہے مثلاً بیوی، ابا، مولوی، والدین، قرض، مہنگائی، چور بازاری، نفع خوری، اقربا پروری، لڑکے لڑکیوں کی بے راہ روی وغیرہ۔ ان سب پر طبع آزمائی کی تھوڑی بہت داد بھی مل جاتی ہے جیسے کسی گھٹیا درجے کے شاعر کو اس سے زیادہ گھٹیا درجے کے شعر پر اسی طرح کے حاضرین داد دیتے ہیں۔ مضحک کو مضحک دکھلانے بتانے کا کوئی نتیجہ نہیں۔ یہ سستا اور فضول کاروبار ہے۔ شخصیت کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ معمولی کو غیر معمولی بنا دے یعنی طنز و ظرافت کے پہلو وہاں دیکھ لے جہاں کسی دوسرے کا ذہن آسانی سے نہ پہنچ سکتا ہو۔ طنز و ظرافت کے یہی نمونے فن کار کی شخصیت کی کشید ہوتے ہیں۔ وہ اچھے رس اور اچھے ذہنوں میں جگہ پاتے ہیں۔

بخاری کی ظرافت بندھے ٹکے تفریحی موضوعات، روایتی کرداروں اور لفظی ہیر پھیر سے بے نیاز ہوتی ہے۔ ہر جگہ ہر بات میں انہوں نے خوش طبعی اور زندہ دلی کا پہلو نکالا ہے جیسے "صحرا کو مسکرا کے گلستاں بنا دیا" ہو۔ بخاری کی ظرافت عام طور سے مفرد ہوتی ہے مرکب نہیں۔ بعض اطبا بڑے سے بڑے امراض کا بھی علاج جڑی بوٹیوں سے کرتے ہیں۔ بعض دوسرے معمولی امراض کے لئے بھی مرکب دوائیں مثلاً معجون، گولیاں، کشتہ جات تجویز کرتے ہیں۔ علاج دونوں مستند ہیں۔ لیکن اول الذکر زیادہ مشکل اس لئے زیادہ قابل تعریف ہے۔ بخاری ظرافت کو ظرافت ہی کے سہارے قائم رکھتے ہیں۔ اور اس سے ہر مقصد حاصل اور ہر مشکل حل کر لیتے ہیں ان کی ظرافت کی تعبیر آتش کے اس شعر سے کی جا سکتی ہے۔

آیا تھا بلبلوں کی تدبیر میں گلوں نے
ہنس ہنس کے مار ڈالا صیاد کو چمن میں

ہنس ہنس کے مار ڈالنے کا گر، بخاری کو خوب آتا تھا۔ ظرافت اور ظرافت نگاری کی یہ معراج ہے۔

بخاری کی ظرافت نگاری کی مثال داغ کی غزل اور مرزا شوق کی مثنوی سے دے سکتے ہیں جس طرح ان بے نظیر فن کاروں نے ماجرائے حسن و عشق کو قضیۂ زمین برسرِ زمین ہی رکھا ہے مزرعِ آخرت بنانے کی کوشش نہیں کی اسی طرح بخاری نے ظرافت کو زمینی و زمانی ہی رکھا ماورائی و لامکانی بنانے کی فکر میں نہیں پڑے۔ مزے کی باتیں مزے سے کہتے ہیں۔ اور جلد کہہ دیتے ہیں۔ انتظار کرنے اور سوچ میں پڑنے کی زحمت میں کسی کو مبتلا نہیں کرتے۔ یہی سبب ہے کہ وہ پڑھنے والوں کا اعتماد بہت جلد حاصل کر لیتے ہیں۔ ترشے ہوئے فقروں اور لسانیاتی انداز سے عامی اور عالم دونوں کو مسرور کرنے اور مسخر رکھنے کا سلیقہ جتنا بخاری کو تھا کسی اور کے ہاں کم نظر آتا ہے۔

بعض مشاہیر کو کبھی کبھی اس شوق میں بھی مبتلا دیکھا گیا ہے کہ وہ بدیہہ گو، بذلہ سنج اور داستان طراز بھی سمجھے جائیں اس کی آسان ترکیب یہ نکالی ہے کہ بے شمار لطیفے ازبر کر لئے جائیں جن کو موقع بے موقع (کبھی ایسے بھونڈے طریقے سے جیسے بعض شعرا اپنا کلام سنانے کے لئے کسی شریف آدمی کو دفعتاً گھیر لیتے ہیں) سناتے رہیں گے۔ وہ یہ نہیں جانتے ظرافت کا مدار ذوق پر ہے حافظے پر نہیں۔

بخاری فقروں اور لطیفوں کی تجارت نہیں کرتے تھے۔ وہ خود ہر طرح کی متاع ہر جگہ پیدا کر لیا کرتے تھے تجارت کے لئے نہیں تواضع کے لئے۔ وہ اپنی تحریر و تقریر میں لطیفوں اور چٹکلوں کے پیوند نہیں لگاتے تھے بلکہ طباعی اور زندہ دلی ان کی رگ و پے میں ساری تھی۔ اور طرح طرح سے جلوے دکھاتی تھی۔ وہ لطیفہ طراز تھے لطیفہ خواں نہ تھے۔ ممکن ہے بخاری سے کبھی کسی کو تکلیف بھی پہنچی ہو لیکن اتنا یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ان سے

ایک ہی لطیفہ دوسری بار یا کئی بار سننے کی لذت شاید ہی کسی شخص کو ہوئی ہو

غالباً ۱۹۴۵ء میں پی۔ ای۔ این کا سالانہ اجلاس جے پور میں منعقد ہوا تھا۔ ای۔ ایم۔ فاسٹر، سروجنی نائیڈو، جواہر لال نہرو، مادام گرشانی، صوفیا وادیا، مرزا اسمٰعیل، ملک راج آنند، بخاری، اور کتنے اور مشاہیر علم و ادب ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کے شریک جلسہ تھے۔ موسم خوشگوار، جے پور کا تاریخی خوب صورت اور ستھرا شہر، ریاست کی روایتی مہمان نوازی، مرزا اسمٰعیل کا انتظام جو اس زمانے میں ریاست کے وزیر اعظم تھے۔ پی۔ ای۔ این کا ایسا شاندار اجلاس ہندوستان میں شاید ہی اس سے پہلے یا اس کے بعد منعقد ہوا ہو۔ تین دن تک کیسی کیسی کمال کی تقریریں ہوئیں۔ بلند پایہ مقالے پڑھے گئے۔ علمی مذاکرے رہے۔ بے تکلف ملاقاتیں اور پر تکلف دعوتیں ہوئیں۔

بخاری کی علمی شہرت، بے اختیار متوجہ کرنے والی شخصیت، حسین و ذہین خدوخال، اجلا اور ستھرا لباس، بے تصنع خرام و قیام، ہر شخص سے اس کے مناسب حال گفتگو ہنسی کی بھی پتے کی بھی، ہر شخص کی نگاہیں پڑتی تھیں۔ لیکن ان کا اپنا انداز یہ تھا کہ شاید ہی حلقوں میں یونہی کبھی گھومتے پھرتے نظر آجاتے جیسے ان پر کرم کرنے نکل آئے ہوں ورنہ بیشتر عام لوگوں اور اپنے ساتھیوں کے حلقے میں مگن رہتے تھے۔ بخاری ایسے یوسف تھے جو کبھی بے کارواں نہیں رہتے۔ مقالہ پڑھا تو مجمع پر چھا گئے۔ اردو اور ہندوستان کی دیگر زبانوں کے ادیبوں کے ایک بنیادی مسئلہ کو پہلی بار نہایت وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا تھا۔ بحث تفصیل سے یاد نہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہندوستانی ادیب مادری زبان اور انگریزی کے درمیان معلق ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ ذولسانی کشمکش ان کے فکر و نظر کو فطری رنگ میں جلوہ گر ہونے نہیں دیتی۔ وہ اپنی زبان کی پرداخت اور اس کے حسن کے صحیح احساس سے محروم ہوتے جا رہے ہیں، دوسری طرف انگریزی ادب کے اصلی خدوخال اور مزاج کو اپنانے کے لئے جس ریاضت و بصیرت کی ضرورت ہے اس کے نہ خوگر ہیں نہ اس سے پوری طرح آشنا۔ نتیجہ ظاہر ہے وہ کلاسیکی ادب کی اساسی قدروں کا صحیح عرفان نہیں رکھتے۔ اس لئے جدید ادب کے افکار کو پرکھنے کی صلاحیت سے بیگانہ ہیں۔ ان کا پورا زور ماضی کو سمجھے بغیر اس سے رشتہ توڑنے اور بغیر پرکھے جدید سے رشتہ جوڑنے پر صرف ہو رہا ہے۔ بخاری کے ان خیالات کو کانفرنس میں بڑی اہمیت دی گئی۔ اور سب کو اس کا احساس ہوا کہ کتنے اہم موضوع پر کتنی فکر انگیز بات، کس وضاحت سے، کتنے بڑے مبصر نے کہی۔

آل انڈیا ریڈیو کا محکمہ دہلی میں قائم ہوا تو اس کے عملے کا تقرر ایک بورڈ نے کیا جس میں مسٹر فیلڈن ڈائریکٹر جنرل، بخاری، ڈاکٹر کریم حیدر لودی، اور کچھ اور لوگ تھے۔ جن میں ایک میں بھی تھا۔ مسٹر فیلڈن تھے اس بورڈ کی سفارش پر ذوالفقار بخاری، آغا اشرف، مجاز مرحوم اور بعض دوسرے لوگوں کا مختلف آسامیوں پر تقرر ہوا تھا۔ فیلڈن بڑے ذی استعداد، جری اور آزاد خیال تھے۔ ریڈیو کا کاروبار سنبھالنے ولایت سے نئے نئے آئے تھے۔ حکومت ہند کے اعلیٰ انگریز عہدہ داروں تک کی پروا نہ کرتے تھے لیکن بخاری کا کلمہ پڑھتے تھے۔ اور ان کے اشاروں تک کا احترام کرتے تھے۔

جیسا کہ قاعدہ ہے امیدواروں سے ہر ممبر اپنے اپنے مضامین کے بارے میں تھوڑی بہت گفتگو کر کے رائے قائم کرتا۔ ڈاکٹر کریم حیدر پبلک سروس کمیشن کی طرف سے آئے تھے ان کے سوالات کبھی کبھی مبہم ہوتے اور مشکل بھی۔ اس پر ان کا بھاری بھرکم جثہ، اونچی آواز، کڑے تیور، امیدوار پر ہیبت سی طاری ہو جاتی۔ تھوڑی بہت ان امیدواروں پر بھی جو بعض امیدواروں کی موافقت پر مائل ہوتے۔

ڈاکٹر حیدر کے بعد میری نشست تھی۔ لنچ کے بعد بورڈ کے ممبر اکٹھا ہوئے تو انٹرویو کا کام شروع کرنے سے پہلے فیلڈن نے ان امیدواروں پر تبادلۂ خیال کیا جو بورڈ کے سامنے آچکے تھے۔ گفتگو ختم ہونے پر آئی تو فیلڈن نے ڈاکٹر حیدر کو مخاطب کر کے کہا، ڈاکٹر حیدر دیکھو اگر تم نے آئندہ امیدواروں کو ڈرانے دھمکانے کا ارادہ کیا تو میں بے تامل تم کو گولی مار دوں گا۔

ڈاکٹر حیدر نے منہ پر ہاتھ رکھ کر بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔ دونوں پاؤں اٹھا کر کرسی پر پیچھے کی طرف لیٹ سے گئے پھر معانقہ کے لئے

فیلڈن کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ ڈاکٹر حمید کے دادا ہونے کا یہی انداز تھا۔ اتنے میں بخاری نے آواز دی۔ صدیقی صاحب! وہ ذرا بیٹھو، فیلڈن کے لتاڑنے پر [illegible] نہیں کیا جا سکتا۔ اب فیلڈن کا بھی وہی حال تھا جو پروفیسر حمید کا تھا۔

بڑے سے بڑے ذہنوں سے کھیلنے اور محفل پر چھا جانے میں بخاری کا جواب نہ تھا۔ خواہ وہ محفل علم و دانش کے ماہرین کی ہو، خواہ بے تکلف احباب اور بے فکروں کی، خواہ سیاسی ستاروں کی۔ بات کوئی ہو، موقع کیسا ہی ہو، بخاری نہ مشتعل ہوتے تھے نہ مایوس نہ منتشر۔ ظرافت اور تفنن کی فضا برابر قائم رکھتے تھے۔ کبھی برجستہ فقروں سے، کبھی اپنے مخصوص قہقہوں سے۔ لیکن اس دوران میں مقصد ذہن سے کبھی غائب نہ ہوتے اور جہاں تہاں ایسے نکتے پیدا کرتے، جتنے کہ حریف کو قائل ہونا پڑتا کہ بخاری سے مفر نہیں۔ مسئلہ زیر بحث کتنا ہی نازک اور پیچیدہ کیوں نہ ہو بخاری اپنی بات بہت کچھ منوا لیتے تھے، کبھی ایک زیرک وکیل کی طرح، کبھی ایک آزمودہ جنرل کی مانند۔ حریفوں کو پسپا ہوتے ہی دیکھا، اکثر لاجواب ہوا، کہیں ہنسی خوشی اور کہیں بے سوچے سمجھے ہی۔

یہ سماں ایک بار آل انڈیا ریڈیو دلی میں دیکھا جب بخاری، جو کہ ڈائریکٹر جنرل اور ...... منسٹر انچارج تھے۔ جن کے بارے میں سب کو معلوم تھا کہ بخاری کے عاشقِ زار نہ تھے۔ اردو ہندی کا جھگڑا بہت بڑھ گیا تھا۔ آئے دن وزارت سے عتاب نامے اور ملک کے گوشے گوشے سے طرح طرح کے وفد نازل ہوتے رہتے۔ بخاری کو ان دونوں سے نپٹنا پڑتا مگر وہ مطلق فکرمند نہیں ہوتے تھے۔ وزارت کے عتاب ناموں کو تو "نامۂ الفت" کہا کرتے تھے۔ اور وفود کے بارے میں ان کی رائے تھی کہ ان کی نفسیات وہی تھی جس کا ذکر غالب نے اپنے اس مصرعے میں کیا ہے۔

مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

ایسے وفود کا خیر مقدم وہ اس طرح کرتے جیسے اپنے بے تکلف دوستوں یا عزیز طالب علموں کو چائے پر مدعو کیا ہو۔ ایک مرتبہ ایسا ہی ایک وفد باریاب ہوا۔ بخاری نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ، موقع کی اہمیت کا احساس کرتے اور دلاتے ہوئے ایک مختصر لیکن لاجواب انگریزی تقریر میں مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور تقریر کو ختم کیا چند خوشنما توصیفی فقروں پر جس کے مخاطب وہ بجھے دل لیکن غبی اراکین تھے۔ جن کو متعارف ہوتے وقت، انہوں نے اپنی بلا کی ذہانت سے بھانپ لیا تھا۔ بخاری کی شیریں بیانی سے وفد اتنا ڈھیلا ہو گیا۔ اور ممبروں کے وہ کلے اور کڑوے تیور مضمحل ہو گئے۔ جن کے ساتھ وہ مخاطب کے پرخچے اڑانے آئے تھے۔ جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی تھی۔ اس کو ان سوراؤں نے پورا کر دیا جن پر بخاری کا جادو پہلے سے چل چکا تھا اور مباحثے کے دوران میں بخاری کی ناقابلِ بیان ناقابلِ گرفت شہ پا کر جس کے وہ امام وقت تھے اپنے ساتھیوں ہی سے بہکنے اور رد و قدح کرنے لگے تھے۔

یہاں پہنچ کر بخاری نے پینترا بدل دیا اور سرِ تن ان ممبروں کی تکریم و توضیح پر مائل ہو گئے۔ جو یقیناً قابلِ لحاظ تھے لیکن اب تک ان کو نظر انداز کر رکھا تھا ان سے ملنے اور بات کرنے کا انداز بالکل مختلف تھا۔ بڑے عالمانہ اور ماہرانہ سطح سے گفتگو شروع کی۔ اردو ہندی کے مسئلے پر تمام کتابی، اخباری، دفتری معلومات اور طرح طرح کے شمار و اعداد اور ان سے اخذ ہوئے نتائج بخاری کے حافظے میں اور زبان پر تھے۔ ان کے نصف معلومات تک بھی وفد کے ممبروں کی رسائی نہ تھی۔ پھر ان کا سریع الانتقال، اکثر شمر کار اور ناقابلِ تسخیر ذہن اور بات منوانے کے طرح طرح کے انداز۔ بخاری کو کوئی نیچا نہیں دکھا سکتا تھا۔ جنگ میں ہر طرح کے کھیل کھلنے سے "لیس" ہو کر آنے میں بخاری کے ہمسر کچھ ہی لوگ دیکھے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ بیاہ ماکین بھی مزید علم "آگئے" اور بخاری نے "علیٰ قدر مراتب" کسی سے ہاتھ ملا کر، کسی کو گلے لگا کر، کسی کی شان میں دو چار نہایت مبالغہ آمیز فقرے کہہ کر جو سننے ہی میں مغالطہ انگیز بھی ہوتے، وفد کو ہنسی خوشی رخصت کر دیا۔ "علیٰ قدر مراتب" کا ان کا اصول اور دوسرے کا المیہ یہ تھا کہ جس کو جتنا بھی معزز سمجھتے اتنا ہی زیادہ اس سے "سوکن التفات" ہوتے۔ اس سے حساب لگایا جا سکتا ہے کہ جس سے انہوں نے معانقہ کیا ہوگا

اس کا ان کے ہاں کیا درجہ رہا ہوگا۔

اس سبب سے بخاری ہی کام لے سکتے تھے۔ ان سے ذرا بھی کم درجے کا آدمی اس حربے کا خود شکار ہو جائے گا۔ یہ اس لئے کہ بخاری کے ترکش میں جتنے اور جس جس طرح کے تیر تھے موقع آجانے پر انتخاب جس تیزی اور یقین سے کرتے اور جس صفائی سے چلاتے وہ کسی اور کے بس کی بات نہ تھی۔ ویسے تیر ہر ترکش میں نہیں ہوتے۔

آل انڈیا ریڈیو کی ڈائریکٹر جنرل شپ کے زمانے میں ایک ہندوستانی ڈکشنری کی تالیف میں مصروف ہو گئے تھے جس میں ملک کے بعض مخلص اور مستند اہلِ قلم ان کے شریکِ کار تھے۔ یہ کام ان ہی کی نگرانی میں ہوتا تھا اس میں ان انگریزی الفاظ و اصطلاحات کے ہندوستانی مترادفات دیئے گئے تھے۔ جو ریڈیو اور اخبارات وغیرہ میں رائج تھے یہ کام اس زمانے میں جتنا ضروری تھا اتنا ہی نازک اور مشکل تھا اس لئے "ہندوستانی" کا لفظ یا تصور (جسے ہندی اردو کا سنگم کہتے تھے) اردو اور ہندی دونوں کے طرفداروں کے یہاں نامقبول تھا۔ ڈکشنری کی کئی ضخیم جلدیں تھیں جو ٹائپ میں چھاپ لی گئی تھیں۔ اور نظرِ ثانی کے لئے مختلف اصحاب کے پاس بھیجی جایا کرتی تھیں۔ تمام مترادفات اس ترتیب اور وضاحت سے علیحدہ علیحدہ خانوں میں دی گئی تھیں کہ متلاشی کو انتخاب میں دقت کا سامنا نہیں ہوتا تھا۔ تقسیم ملک کے بعد معلوم نہیں اس لغت کا کیا حشر ہوا۔ مکمل ہو جاتی تو ہندوستان اور پاکستان دونوں کے محکمۂ نشر و اشاعت کے لئے بہت کار آمد اور بھلے مانسوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں بہت مفید ہوتی۔

انگریزی شعر و ادب پر ان کو جتنا غیر معمولی عبور تھا۔ ہم سب جانتے ہیں لیکن ان کے ذوق و ذہانت کا پورا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم ان کے اردو مضامین میں انگریزی کی وہ جاندار، گوارا، ٹھہری ہوئی اور خوش آئند فضا محسوس کرتے ہیں۔ جو کسی اور کے یہاں نہیں ملتی۔ ان کے توسل سے انگریزی کی جھلک اردو میں دیکھ کر ان کی اردو شناسی اور انگریزی دانی کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں خود اس کا کچھ زیادہ قائل نہیں ہوں کہ غیر زبان کا اردو میں ترجمہ اس طور پر کیا جائے کہ غیر زبان کی جنس کا پتہ نہ لگے۔

انگریزی موضوعات، مفاہیم اور اسالیب کو اردو میں منتقل کرنے کا کام اوروں نے بھی کیا ہے اور کرتے رہتے ہیں لیکن اس فرق کے ساتھ کہ دوسرے ایسا کرنے میں اکثر ترجمے، تفسیر یا مفہوم ادا کر دینے پر اکتفا کر لیتے ہیں کبھی کبھی اور کچھ طور سے یا انگریزی کے مطالب کو اردو کے روائتی شاعرانہ الفاظ یا انداز میں اس درجہ شرابور کر کے پیش کریں گے کہ نہ انگریزی ذہن کا صحیح طور پر اندازہ ہوگا نہ انگریزی زبان کا نہ انگریزی اسالیب کا اور نہ انگریزی فضا کا۔ بخاری کی اردو کو میں ٹکسالی نہیں کہتا لیکن انگریزی کے پرتو سے ان کی اردو اس طرح جگمگاتی ہے جیسے

پرتوے آفتاب سے ذرّے میں جان ہے

مذہبی اور قانونی کتابوں کا ترجمہ سب سے مشکل ہوتا ہے اس کے بعد میرے نزدیک یورپین زبانوں کے ڈراموں کا ترجمہ مشکل ہے جہاں فن، بیان و زبان اور نفسیاتی کیفیات کی بڑی نازک اور ناقابلِ گرفت واردات کا سامنا ہوتا ہے جس طرح سیسموگراف (زلزلہ پیما) زمین کے چھوٹے بڑے ارتعاش مرتسم کر لیتا ہے اسی طرح اچھا ڈراما سوسائٹی اور زندگی کے ارتعاشات کی نشان دہی کرتا ہے۔ بخاری نے انگریزی کے بعض مشہور ڈراموں کا جس خوبی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ انگریزی زبان اور انگریزی سوسائٹی کے مزاج اور ڈرامے کی فنی نزاکتوں سے پورے طور پر واقف ہونے کے علاوہ اردو کو نئے رنگ و آہنگ سے آشنا کرنے کی کتنی غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے۔ اردو کا کوئی معمولی واقف کار اس غیر معمولی فریضے سے عہدہ برا نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کی ظرافت نگاری اور انگریزی ڈراموں کے تراجم دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے بخاری نے اردو کی ایک نئی جنس اور ایک نئی توانائی کا انکشاف کیا ہو۔

جہاں تک مجھے علم ہے بخاری نے تنقیدی مضامین کم لکھے ہیں لیکن اردو کے ادبی تنقید نگاروں میں ان کا پایہ مسلم ہے اور یہ اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ بخاری نے بہت کم ادبی سرمایہ چھوڑا ہے لیکن بہتوں سے اونچا مقام پایا ہے۔ گزشتہ ۲۰۔۲۵ سال میں اردو تنقید پر کافی توجہ کی گئی ہے۔ اب تو ادبی مذاکروں یا مجادلوں میں اس کا نام سرفہرست آتا ہے۔ غزل کے بعد تنقید کے فن شریف پر ہمارے قبیلۂ شعر و ادب نے سب سے زیادہ طبع آزمائی کی ہے لیکن بحیثیت مجموعی کچھ اس طرح کا احساس ہوتا ہے جیسے تنقید نگار تنقید کے مقاصد کو نظر انداز کر کے اپنے مقاصد پیش نظر رکھتے ہوں اور تنقید نہیں تبلیغ کرتے ہوں۔

اردو میں جدید تنقید کا بیشتر سرمایہ مغربی ہے لیکن اسے جس شکل میں پیش کیا گیا ہے اس میں مغربی تنقید کی اتنی توضیح نہیں ملتی جتنا اس کا ترجمہ۔ ہمارے بعض تنقید نگاروں کو یہ بھی معلوم کرنے کی فکر نہیں ہوتی کہ مغربی تنقید کے کس اصول سے اردو کے کس صنف ادب کو پرکھیں۔ نیز مغرب میں جن اصناف ادب پر تنقید ملتی ہے ادب کی وہ صنفیں اردو میں ہیں بھی یا نہیں یا اردو میں جو صنف ادب ملتی ہے اس کے لیے مغرب نے کوئی اصول تنقید وضع بھی کیا ہے یا نہیں، ادب کہیں کا ہو کسی طرح کا ہو، تنقید مغربی ہو گی۔ کیا کہا جائے سوائے اس کے کہ: تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو۔

یہ بحث فرسودہ بھی ہے، تلخ بھی، شاید بے نتیجہ بھی۔ صرف اتنا کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ بخاری اس حلقے میں شامل نہیں ہیں۔ ان کی تنقید وسیع ترین مفہوم میں خالص ادبی ہوتی تھیں۔ انہوں نے جس مسئلہ پر یا شخص پر لکھا ہے اس کو اپنے نقطۂ نظر کا تابع نہیں کیا ہے بلکہ اس کے تمام پہلوؤں کا گہرا مطالعہ کر کے وہ نقطۂ نظر دریافت کرنے کی کوشش کی ہے جو اس مسئلے یا شخص میں خوابیدہ یا بیدار موجود ہے۔ ادبی پارکھ کی ایک بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ کسی ادبی تخلیق یا شخصیت پر قلم اٹھائے تو اس کا احاطہ اس طور پر کرے کہ جزو اور کل دونوں گرفت میں آ جائیں نہ یہ کہ جزو سے کل کی نشاندہی کرے اور کبھی کل سے جزو کو روشناس کرائے تصوف میں یہ روا ہے تنقید میں نہیں۔ ایسی تنقید یا پرکھ کے لیے ادب کی وسیع معلومات اور تنقید کے فنی اصول سے گہری واقفیت کے علاوہ ایک بڑی شرط یہ ہے کہ تنقید نگار کی نظر میں وسعت اور دل میں کشادگی ہو۔

بخاری کی تنقید کا بڑا اچھا نمونہ ان کا مضمون "کچھ عصمت چغتائی کے بارے میں" ہے عصمت چغتائی کی تحریریں منظر عام پر آئیں تو ادبی اور غیر ادبی دونوں حلقوں میں "ایک شور طوفان خیز" اٹھا اور ان تحریروں کی ادبی قدر و قیمت کے بارے میں سخت اختلاف آرا ہوا۔ یہ اختلاف شدت پر تھا کہ بخاری کا یہ مضمون شائع ہوا۔ بخاری نے ایسا بے لاگ تجزیہ، اتنی گہری بصیرت کے ساتھ، اس سنجیدگی سے کیا تھا کہ موافق اور مخالف دونوں دم بخود رہ گئے۔ البتہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ خود عصمت چغتائی کے نقطۂ نظر پر اس کا کیا اثر پڑا۔

بخاری کا مزاج مغربی نہ تھا، ذہن تھا۔ ان میں اور ان کے بیشتر ساتھیوں میں اردو شعر و ادب کا ذوق، مشرقی تہذیب کا رکھ رکھاؤ اور طبائع کے اختلاف کے باوجود اپنی قدروں کی بڑی پاسداری ملتی ہے۔ جب تک پطرس لاہور میں انگریزی کے پروفیسر رہے۔ ان کا اور ان کے رفقا کا اردو شعر و ادب کی سمت و رفتار پر برابر اچھا اثر پڑتا رہا۔ اس زمانے میں "نیاز مندان لاہور" کی آواز ایسی نہ تھی جس کو نظر انداز کرنا آسان ہوتا۔ نیاز مندوں کے جلسے میں بخاری کا انداز قدرے بے تکلف پہچانا جا سکتا تھا نیز بیش بہا غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے بخاری لاہور کے تعلیم یافتہ، ذہین، ہونہار نوجوان طبقے کے سرخیل تھے۔ ایسے پایے کی ذہانتوں کا اتنا اچھا اور بڑا اجتماع اس زمانے میں شاید ہی کہیں اور دیکھنے میں آیا ہو۔ بخاری نہ ہوتے تو شاید ایسی مختلف النوع و بے مثل ذہانتوں کا ایک مرکز پر جمع ہونا ممکن نہ ہوتا۔ کبھی کبھی یہ بات بھی ذہن میں آتی ہے کہ اگر بخاری ان رفیقوں کے ساتھ لاہور میں اسی طرح پاؤں توڑ کر بیٹھ گئے ہوتے جیسے سر سید اور ان کے رفقا علی گڑھ میں، تو اردو کی نئی فتوحات کا کیا عالم ہوتا۔

یہ خیال اس لیے ذہن میں آیا کہ تقسیم ملک کے بعد بخاری انگریزی کی پروفیسری پر لاہور واپس آ گئے تو اردو کو نئے حالات اور تقاضوں

سے ہم آہنگ کرنے، وہ قومی مزاج کے مطابق اس کی تعلیم و ترقی کا ایک منصوبہ ان کے ذہن میں تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ بخاری خود، ڈاکٹر تاثیر اور خواجہ منظور حسین اور بعض دوسرے رفقاء یونیورسٹی میں اردو کی سطح تعلیم کا کام اپنے ہاتھ میں لینے پر آمادہ ہو گئے تھے کتنی حوصلہ افزا، دور رس اور گراں قدر یہ سکیم تھی، جو بروئے کار آجاتی تو کیا عجب ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی مرحوم کا نعم البدل ثابت ہوتی۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا، بخاری کا دامن سیاسی کاموں نے بیرونِ ملک کھینچا اور ساتھیوں میں شاید کوئی ایسا نہ تھا جو اس منصوبے کی مشکلات اور نزاکتوں سے عہدہ برآ ہونے کا حوصلہ رکھتا اور ساتھ ہی نوجوانوں کی قیادت کر سکتا۔

سوال یہ ہے کہ جہاں ذہنی صلاحیتوں کے اس کثرت سے آثار موجود ہوں، علمی، قومی، تہذیبی کارناموں کی روایت کی فراوانی ہو اور قوم و ملک کی نئی تشکیل و تنظیم کے لئے دعوتِ کار اور کارزار بھی کچھ کم نہ ہو، وہاں یہ بے عملی و بے حوصلگی کیسی۔ اس اجتماع کے افراد نے اپنے اپنے طور پر جو کچھ اور جتنا کچھ کیا ہو اس سے انکار نہیں لیکن ایسی اور اتنی غیر معمولی قابلیتوں کا کوئی عہد آفریں کارنامہ سامنے نہ آیا، یہ بھی اپنی جگہ ایک المیہ نہیں تو مسئلہ فکریہ ضرور ہے۔

مغلیہ سلطنت کے زوال پر اس فضل و کمال کا جیسا نادر روزگار اجتماع دہلی میں ہو گیا تھا، اس کی مثال مسلمانوں کے عہد کے ہندوستان میں کہیں اور کم نظر آتی ہے جس کے بارے میں حالی نے کہا تھا:

تھے ہنرمند اتنے تجھ میں جتنے گردوں پر نجوم

غدر میں یہ ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر گئے ان میں سے سرسید نے اپنے رفقاء کرام کے ساتھ علی گڑھ میں ایک جدید شاہ جہاں آباد کی بنیاد رکھی اور علی گڑھ تحریک کے نام سے مسلمانوں کی حیاتِ نو کی طرح ڈالی۔

اس کے بعد اور پہلی جنگِ عظیم کے آس پاس کے زمانے میں علوم و فنون کے کتنے اور کیسے کیسے جامع کمالات، ہونہار نوجوان لاہور میں نظر آتے ہیں جن میں "جوانانِ سعادت مند" کے "پیر دانا" سر شیخ عبدالقادر، مولانا ظفر علی خاں اور ڈاکٹر سر اقبال سب سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ اگر بعض وجوہ کی بنا پر موخر الذکر دو کو علیحدہ کر دیں تو سر شیخ عبدالقادر یقیناً ان لوگوں میں سے تھے جو پنجاب کے سرسید ہو سکتے تھے۔ جہاں تک ان کی بزرگی، شفقت اور سرپرستی کا تعلق ہے انہوں نے لاہور کے ہونہار نوجوانوں کے لئے کم سے کم اتنا ضرور کیا جو وہاں کے کسی اور سے نہ ہو سکا۔

شیخ صاحب کے بعد سب سے زیادہ اس کی توقع بخاری سے تھی جو ان مرکز گریز اعلیٰ صلاحیتوں کو اپنے گرد جمع رکھ سکتے تھے ایک حد تک انہوں نے رکھا بھی لیکن یہ شخصی تعلقات کی بنا پر تھا کسی عظیم مقصد یا منظم اسکیم کے ماتحت جیسی کہ مثلاً علی گڑھ تحریک تھی، نہ تھا اور جس کے بغیر دور رس اور دیرپا نتائج نہیں پیدا ہو سکتے۔ آج بخاری کی یاد میں یہ بات ذہن میں آئی لیکن بے وقت نہیں آئی اب بھی اس کا امکان ہے کہ لاہور کے بچے کھچے احباب ہونہار نوجوانوں کو اپنے سایۂ شفقت میں لے کر اس کام کو آگے بڑھائیں۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ایک نئے، صحت مند، علمی، ادبی اور تہذیبی محاذ کی پاکستان کو بڑی ضرورت ہے۔

ہر سوسائٹی میں نوجوان بڑا غیر متیقن، بڑا خطرناک لیکن اتنا ہی قیمتی عنصر ہوتا ہے، پاکستان کے نوجوان کو مناسب اور بروقت رہبری نہ ملی تو یہ زیادہ دنوں تک بے کار نہیں رہ سکتا، کسی اور سے ناتا جوڑے گا۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ نوجوان کا فلاں یا فلاں مذہب ہے۔ در اصل وہ اپنے شباب کی وارداتوں (حوصلہ اور ہوس) کا شکار ہوتا ہے۔ مذہب تو اس کو صحیح اور صالح راستے پر لگانے والے دیتے ہیں۔

اسی علاقہ ("نیاز مندانِ لاہور" یا "نامورانِ لاہور") سے اس زمانے میں ایک بحث یہ اٹھائی گئی کہ پنجاب میں جو یہ "میں نے جانا ہے" یا اس طرح کے اور فقرے بولے جاتے ہیں ان کو غلط کیوں قرار دیا جائے۔ پنجاب کے لوگ اردو سے کچھ کم واقف نہیں ہیں۔ اردو کی خدمت میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ نثر اور نظم کی محفل میں ان کا درجہ کسی سے کم تر نہیں رہا۔ اردو کا مستقبل بھی پنجاب ہی میں زیادہ روشن نظر آتا ہے فارسی عربی کے علاوہ متعدد

کی بولیوں اور محاوروں سے بھی انہوں نے دوسروں کی طرح استفادہ کیا ہے وغیرہ۔ اس لئے ان کی زبان پر یہ فقرہ جس شکل میں آتا ہے اس کو صحیح کیوں نہ مانا جائے۔

کچھ دنوں یہ مسئلہ زیر بحث رہا لیکن جلدی ختم ہو گیا اور بات جیسے آئی گئی ہوئی۔ اس موضوع پر ان سے اکثر گفتگو آئی۔ اتنی علمی و ادبی نہیں جتنی تفریحی۔ یو پی کی زبان، اشخاص یا شاعروں پر بخاری کو طبع آزمائی کا شوق ہوتا تو بے تکلف رائے کا رخ میری طرف کر دیتے۔ ایک بار بڑے مزے سے اور بہت زور دے کر کہنے لگے "پنجاب اس طرح کے فقرے اسی طرح بولے گا آپ کے ...... (نام حذف کرتا ہوں) جو چاہیں کہیں۔ یہ جملہ غلط کیوں ہو؟" میں نے کہا "ہاں کیوں ہو!" کچھ مسکرائے، کچھ نرم پڑے لیکن اندازِ برہمی قائم رکھتے ہوئے بولے: "بتائیے نا، آپ تو صرف دکھ میں مبتلا رہتے ہوں گے۔ اس میں قباحت کیا ہے؟" میں نے کہا: "میں صرف دکھ سے قطعاً معصوم ہوں۔ آپ بھی ہوں تو ایسا کوئی سانحہ نہ ہوگا۔ لیکن مجھ ایسے ان باتوں کو، میں تو چاہوں گا کہ یہ فقرے اسی طرح بولے جائیں۔ اس میں ہمارا عیب ہوں ایک خوبی بے مثل ہے" بولے: "یعنی چہ؟" عرض کیا "اس سے آدمی پہچان لیا جاتا ہے۔" بے اختیار قہقہہ لگا کر کھڑے ہو گئے، بولے "صدیقی صاحب میرے ساتھ چلئے، میں اس فقرے پر آپ کے اعزاز میں کھڑے کھڑے، پنجاب میں فرسٹ کلاس جلسہ کرا سکتا ہوں۔"

بخاری خطوط بڑے اچھے لکھتے تھے۔ ان کے کتنے اور کیسے دل آویز خد و خال ان خطوط میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اچھے خطوط وہی لکھ سکتا ہے جس کو مکتوب الیہ سے اخلاص اور اپنے پر اعتماد ہو۔ محبت کی سب سے معتبر علامت یہ ہے کہ عاشق اپنے راز محبوب پر فاش کرنے لگے۔ اچھے خطوط لکھنے کے لئے یہ رشتہ اتنا ضروری نہیں ہے جتنا اصول ضروری ہے۔ خط لکھنا وہ فن ہے جہاں تکلف یا تصنع لکھنے والے کو لے ڈوبتا ہے۔ SAFETY FIRST. یا SELF FIRST کے بندے کبھی اچھے خط لکھنے والے نہیں ہو سکتے۔ ایمرسن نے کہا گھر پاک اور کہا " کا اطلاق خط نگاری کے فن پر بھی ہوتا ہے۔

امریکہ یا کہیں اور سے دوستوں کے نام جو خطوط انہوں نے وقتاً فوقتاً لکھے اور اردو کے رسالوں میں شائع ہوئے ان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی معلومات کتنی وسیع اور جامع، مشاہدہ کتنا تیز، ذہن کتنا زرخیز، تاثرات کتنے گہرے، تخیل کتنا نادرہ کار اور بات کہنے کے انداز میں کتنی شوخی، شیرینی اور تازگی تھی وہ اپنی نجی تحریروں میں کبھی کبھی اپنے سے بھی زیادہ دل کش معلوم ہونے لگتے تھے۔ یہ فن اور شخصیت دونوں کا اعجاز ہے۔

بخاری کو اچھے سوٹ پہننے کا بڑا شوق تھا۔ ایک زمانے میں جب آل انڈیا ریڈیو کا پہلا دفتر علی پور روڈ پر تھا اور وہ اسٹیشن ڈائریکٹر یا اس سے اونچے کسی منصب پر تھے ان کا درزی کشمیری دروازے کے آس پاس کہیں رہتا تھا۔ دکان اور مرجوعہ دیکھتے ہوئے کچھ ایسا ماہر فن نہیں معلوم ہوتا تھا لیکن بخاری اس کے فریفتہ تھے۔ اس کے پاس کبھی ناپ دینے کے لئے، کبھی سوٹ میں ترمیم و اصلاح کی غرض سے، اس پابندی اور شغف سے آتے تھے جیسے بعض مصنفین اپنی کتاب کا مسودہ دیکھنے دکھانے، کاتب کے گھر یا پریس کا چکر لگاتے رہتے ہیں۔ اس مہم پر ایک بار میں بھی ساتھ تھا۔ دکان پر پہنچے تو وہ فلانی پر درزی سے کچھ دیر معروف و مصروف گفتگو رہے۔ کپڑے کی قطع برید، استر، سلائی، کاج، بٹن کے بارے میں ایسے ایسے نکتے درزی کے ذہن نشین کرانے لگے کہ میں ایسے بھی کہ میں حیران رہ گیا کہ اچھا خاصا آدمی کس چکر میں مبتلا ہے۔ شاید اس بات کو سمجھ گئے۔ دفعتاً بولے: "کیوں صدیقی صاحب آپ کو سوٹ سے بھی دل چسپی ہے؟" عرض کیا "کیوں نہیں، لیکن مردوں کے نہیں، عورتوں کے سوٹ سے!"

بخاری ہنس پڑے لیکن فقرے کی داد درزی سے دلوائی، یہ کہہ کر کہ صاحب کو سلام کرو، صاحب عورتوں کا سوٹ پسند کرتے ہیں۔ سلام تو اس نے کیا لیکن جیسے اسے اس کا یقین نہ ہو کہ اس پسند کا اظہار میں نے سوٹ میں ملبوس کسی خاتون سے کرنے کی کبھی جرات کی ہوگی۔ [illegible] تعظیم [illegible]

سے کچھ پہلے مرکز میں کانگریس اور مسلم لیگ کی مخلوط وزارت بنی تو ایک دفعہ دفتر میں ملاقات ہوئی۔ سر سے پاؤں تک کسی اعلیٰ نسل کے کھدر کے سوٹ میں ملبوس تھے دیکھ کر ہم دونوں بیک وقت مسکرائے لیکن سچ یہ تھا کہ بخاری کا مسکرانا میرے مسکرانے پر بھاری پڑ رہا تھا۔

ایک بار میں نے خط لکھا کچھ روپے بھیج دیجئے کارِ خیر کے لئے درکار ہیں۔ خط ملتے ہی روپے بھیج دیئے توقع سے زائد۔ میں نے شکریہ کے خط میں لکھا بخاری صاحب میری طرح بچپن میں آپ نے بھی پنجابی قسم کی کتاب میں کہیں نہ کہیں ضرور پڑھا ہوگا کہ ایک مسافر کھانا کھا رہا تھا اتفاق سے کوئی کتا بھوک سے نڈھال پہنچ گیا مسافر نے ایک ہڈی اس کے آگے پھینک دی کچھ دنوں بعد کسی نے مسافر کو خواب میں دیکھا جس نے بتایا کہ مرنے کے بعد قبر میں عذاب کے فرشتے نازل ہوئے اور گرز مارنا چاہتے تھے کہ وہی ہڈی سامنے آجاتی اور فرشتے کچھ نہ کر پاتے۔ چنانچہ عذاب واپس لیا گیا۔ مجھے یقین ہے جو رقم آپ نے اس کارِ خیر میں بھیجی ہے وہ آپ کے اب تک کے گناہوں کے لئے ایسی ہی ثابت ہوگی۔ بخاری نے لکھا مزے کا شکریہ لیکن اس کا بھی تو اندیشہ ہے کہ ہم آپ جب آخرت میں پہنچیں تو "شرح مبادلہ زر" اتنا خاطر خواہ نہ رہے ——— تفصیل یا یقین سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن اتنا محسوس اکثر کیا کہ اس حلقے کے افراد جتنے بخاری کے شیدائی تھے بخاری ان کے نہ تھے وہ یقیناً ان کو بہت عزیز رکھتے تھے لیکن مقررہ خانوں میں۔ ان پر کسی طرح کی ارضی یا سماوی آفت نازل ہو جاتی ہو گی تو مجھے یقین ہے بخاری ان کی مدد کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے ہوں گے۔ روپے پیسے سے، دوڑ دھوپ سے، تحریر و تقریر سے لیکن شاید وہ یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ ذہانت، علمیت، اقتدار اور شہرت کے میدان میں جہاں وہ لاشریک رہتے ان کا کوئی ساجھی یا کوئی اور شرک کا مرتکب ہو، بخاری بڑے بت شکن تھے جینیس کا تقاضا بھی یہی ہے لیکن جہاں وہ خداؤں میں صرف مسلمانوں کے خدا کے قائل تھے وہاں بتوں میں صرف اپنے بت کے ——— اقوام متحدہ کے دفتر میں بخاری شبانہ روز اپنے فرائض جس جانفشانی اور قابلیت سے انجام دیتے تھے وہاں کے چھوٹے بڑے اہل کار کو جس طرح اپنا قائل اور گرویدہ رکھتے تھے اور یارانِ باصفا سے ملنا ہو جاتا تھا تو جس محبت اور بے تکلفی سے پیش آتے تھے اس کا حال ملاقاتیوں سے معلوم ہوتا رہتا تھا جو ان کی زیرکی اور ذکاوت کے واقعات اس مزے سے بیان کرتے تھے جیسے کوئی افسانہ سنا رہے ہوں۔ کچھ عرصے سے ان کی صحت تیزی سے گرتی جا رہی تھی جس کے سبب سے خاموش اور دل گرفتہ رہنے لگے تھے اس کے باوجود جیسے کبھی کبھی "بادِ شمال" کا گزر ہو جاتا اور افسردہ کلیاں چٹکنے مسکرانے لگتیں۔ کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر دوستوں کو جمع کر کے سیر کو نکل جاتے ان کے ساتھ کھانا کھاتے اور ہنس بول کر وقت گزار لیتے جو ان کا ہمیشہ سے محبوب مشغلہ تھا ——— پی ای این کی جے پور کانفرنس کے بعد فاسٹر علی گڑھ آئے تھے فاسٹر بالطبع کم سخن ہیں۔ چہرے سے علم کا وقار اور عارف کی گہری سوچ نمایاں رہتی ہے چائے پر ایک شام اچھا خاصا اجتماع ہو گیا۔ کہنے لگے ہندوستان آتا ہوں تو ایک بات کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ کتنے اچھے اور ذہین لوگ جن کو یونیورسٹیوں میں ہونا چاہیئے یا ادب کی خدمت کرنا چاہیئے کتنی غلط جگہوں پر پائے جاتے ہیں۔ بات کچھ آگے بڑھی تو بولے تم لوگ بخاری کو (جو اس زمانے میں ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل تھے) اپنی یونیورسٹی میں کیوں نہیں مقید کر لیتے۔ موقع ملتا تو میں ان کو کیمبرج میں گرفتار کر لیتا پھر دبی زبان اور غمگین مسکراہٹ سے یہ بھی کہا کہ وہ وہاں سے دیوار پھاند کر نکل جاتے تو میں کیا کر لیتا۔

آج یہ گفتگو یاد آرہی ہے کہ بخاری نے اپنا آخری پروگرام یہ بنایا تھا کہ اقوام متحدہ کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر امریکہ کی کسی یونیورسٹی سے منسلک ہو جائیں گے لیکن اسے کیا کہیئے کہ کسی یونیورسٹی کی دیوار میں مقید ہونے اور پھاندنے سے پہلے ہی وہ زندانِ حیات ہی کی دیوار پھاند گئے۔

• پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس) ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے ان کی باتوں اور تحریروں سے بے شمار لوگوں کے دل خوش ہوتے اور ہوتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے اتنی بڑی خدمت لی تو یقیناً ان کو اپنی بے کراں نوازشوں سے سرفراز بھی فرمایا ہوگا۔"

…. کہ گوہرِ مقصود گفتگوست

فیض احمد فیض

دوستی تو وہی اور سعدی کا کام ہے یارو، محبت تو یہی کہنے کی بات ہے، دیکھو تو ہر روز تم میں سے ہر ایک کو ٹیلیفون کرتا ہوں، ہر ایک کے گھر پہنچتا ہوں، اپنے گھر لاتا ہوں، کھلاتا ہوں، پلاتا ہوں، سیر کراتا ہوں، ہنساتا ہوں، شعر سناتا ہوں، پھر رات گئے باری باری سے سب کو گھر پہنچاتا ہوں، سب بیویوں کی بددعائیں میرے حساب میں لکھی جاتی ہیں، آدھی تنخواہ پٹرول میں اڑ جاتی ہے یعنی اوّل نقصانِ مایہ، مایہ نہیں مائع یعنی پٹرول دوم شماتتِ ہمسائی، ارے یار یہ شماتت کیا لفظ ہے، ش۔ ما۔ تت کچھ پنجابی گالی معلوم ہوتا ہے نہیں؟ .... قہقہہ۔

”کچھ تو خدا کا خوف کرو دوستو، کسی کم بخت کو توفیق نہیں کہ کبھی خود ہی اٹھ کر چلا آئے، میں کوئی ٹیکسی ڈرائیور ہوں؟ شوفر ہوں؟ میراثی ہوں؟ مجھے تنخواہ دیتے ہیں آپ؟ یا آپ میری معشوقائیں ہیں، برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن ہے آپ کا؟ یا آپ کے ذہنِ مبارک سے حکمت و معرفت کے وہ لعل و گہر برستے ہیں کہ اس ہیچمدان کا دامن گنج ہائے گراں مایہ، اوئے مایہ، پٹرول والا مائع نہیں۔ دوسرا، عثمان نوٹ کرو، بلکہ تیسرا پنجابی والا، نون غنہ کے ساتھ، اوئے سمجھ آئی جے؟ (عثمان نوٹ کرو کی تلمیح کسی معتبر بزرگ کی جانب تھی جسے بخاری صاحب نہ جانے کب ملے تھے، روایت یہ تھی کہ ان بزرگ کے فرزندِ اکبر عثمان بھی سفید ریش اور کبر سنی کی منزل میں تھے لیکن بڑے میاں انھیں وہی طفلِ مکتب گردانتے اور انھیں اسی ڈھب سے خطاب کرتے، چنانچہ اگر محفل میں کسی نے کہا کہ میر صاحب وہ ڈپٹی کلکٹر آپ کا پوچھ رہے تھے تو میر صاحب کڑک کر بولے ”ڈپٹی تلفظ ڈیپیوٹی ہے، عثمان نوٹ کرو! سمجھ آئی جے“ کا قصہ میں نے انھیں سنایا تھا اور مجھے خورشید انور نے، بھاٹی اسلامیہ ہائی اسکول میں کوئی ماسٹر صاحب تھے جو تختہ سیاہ پر ریاضی کا کوئی مسئلہ حل کرنے کے بعد قریب قریب ہمیشہ اپنے طلبا سے پوچھتے ”اوئے سمجھ آئی جے“ اور لڑکے ہمیشہ جواب میں کہتے ”نہیں جی“ اس پر ماسٹر صاحب لڑکوں کو ایک موٹی سی گالی دیتے اور کہتے ”نہیں سمجھ آئی تو جاؤ فلاں کی فلاں میں“ بخاری صاحب سن کر لوٹ پوٹ ہو گئے، کہنے لگے ”یار اگر اسے یہی کہنا تھا تو پوچھتا ہی کیوں تھا؟“ اس کے بعد عثمان نوٹ کرو کے ساتھ ”سمجھ آئی جے“ بھی ان کی محفل کے روزمرہ میں شامل ہو گیا)

اُن کی فریاد ابھی جاری تھی۔

”دیکھو یارو اگر کل ہی تم میں سے کسی کو ٹیلیفون کروں کہ بھائی جان مجھے ہیضہ ہو گیا ہے، پلیگ کی گلٹی نکل آئی ہے، ڈاکٹر جواب دے

گئے ہیں، لبوں پہ دم ہے، علاوہ اگر منہ دیکھ جاؤ تو سو فیصدی یہی جواب ملے گا کہ موٹر میں آکر لے جاؤ .....؟

"ہمارے پاس موٹر جو نہیں ہے" تاثیر صاحب نے آہستہ سے کہا۔

"جی ہاں اور آپ ہر روز کالج تو میری ہی موٹر پر تشریف لے جاتے ہیں، اور دن بھر جہاں جہاں بھی آپ حضرات جھک مارا کرتے ہیں۔ اس پھانکڑی کے ساتھ تو جاتے ہیں، بات یہ ہے کہ تم سب نہایت بڑے دوست ہو، کاہل بے قاعدہ بے سلیقہ، اگر میں اس شہر میں نہ ہوں تو تم مہینوں ایک دوسرے کی صورت بھی نہ دیکھو۔"

اور یہی ہوا بھی۔ ع "ان کے اٹھتے ہی دگرگوں رنگ محفل ہو گیا" ادھر بخاری صاحب لندن اور میکسیکو روانہ ہوئے ادھر یہ بساط الٹ گئی، ان کی محفل شبینہ کا شیرازہ ایسا بکھرا کہ پھر کبھی یکجا نہ ہو سکا۔ ۱۹۴۹ء میں وہ مختصر سے عرصے کے لئے لاہور لوٹے تو یاروں کی صورت احوال سے بہت رنجیدہ ہوئے، کہنے لگے "یارو تم لوگوں نے سب چوپٹ کر دیا ہے، اب ہم جاتے ہیں" اور ماہ کے بعد ایسے گئے کہ اپنی مٹی بھی پردیس ہی کو سونپ دی۔

بخاری صاحب کی شخصیت کا ہلکا سا نقش بھی قلم کی گرفت میں کب آتا ہے۔ یہ کام تو انہیں کے کرنے کا تھا، ہاں انہیں یاد کرنے بیٹھا ہوں تو یہی تن دہی، مستعدی، باقاعدہ اور سلیقہ طرح طرح سے یاد آتے ہیں، خوش وقتی کے لئے احباب کی محفل کا اہتمام تو شاید ایسی بڑی بات نہیں۔ اگرچہ ہم میں سے بیشتر اتنا بھی نہیں کرتے اور بخاری صاحب اپنی تن دہی سے تو کوئی بھی نہیں کرتا لیکن وہ تو جو کچھ کرتے تھے ایسے ہی ڈوب کر کرتے تھے، دفتر ہو یا گھر، تحریر ہو یا گفتگو، دقیق علمی بحث ہو یا فقرہ بازی،

مغنی نے غزل شروع کی۔

بجوانی دو چشمت چشمہ بلا نشستہ
چو قبیلہ گرد لیلیٰ ہمہ جابجا نشستہ

تو اسی مطلع پر سحر ہو گئی، قوال اس شعر پر پہنچے،

"صد چاک شدہ سینہ و صد پارہ شدہ دل
دیں بے خبراں جامہ دریدن نگزارند"

تو گھنٹوں وارفتگی کا عالم رہا۔ کوئی شعر، کوئی مصرع، کوئی ترکیب، کسی محراب کا خم، کسی کتبے کا خط، کسی خوانچے والے کی آواز، کوئی محاورہ، کوئی گالی جہاں بھی دل کو وجد و اہتزاز کا ذرا سا اشارہ ملا۔ اپنی واردات میں سبھی کو شریک کر لیا۔

دہلی کی جلتی ہوئی دوپہر میں کبھی جھک کر گھٹا آ گئی تو جنگ عظیم، ہٹلر اور مسولینی، آل انڈیا ریڈیو، دولت مشترکہ، انگلشیا اور ایسے سبھی دفاتر یک لخت بے معنی ہو گئے۔ دوستوں کے افسروں کو ٹیلیفون ہو گئے کہ ڈائرکٹر جنرل آل انڈیا ریڈیو فلاں فلاں صاحب سے بہت اہم گفتگو کرنا چاہتے ہیں، ہم لوگ بھاگم بھاگ پہنچے، بخاری صاحب دفتر میں دربار لگائے بیٹھے ہیں، آغا حمید، سید رشید احمد، غلام عباس، یا ایک آدھ اور، تاثیر پہنچے، مجید ملک آئے، میں گیا، بخاری صاحب کی مخصوص طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"آئیے بیٹھیے۔ آپ کانفرنس کرنے آئے ہیں؟ تو کرو۔" اور سب پر اسکول سے بھاگے ہوئے بچوں کی سی کیفیت طاری ہو گئی، دن بھر قطب میں گزارا، شام کو جامع مسجد کی دیوار تلے کباب کھائے، ایک قطعی غیر معروف محلے میں پان خریدے، آدھی رات تک انڈیا گیٹ کے سامنے بیٹھ کر بیت بازی کی، پھر کناٹ پلیس کے جس قہوہ خانہ کا در کھلا پایا وہاں سے ملک شیک پیا، اور یہیں کناٹ پلیس کے میدان میں غالب اور نظیر

حافظ اور سعدی، اقبال اور گوئٹے، ورڈز ورتھ [illegible] سے خاص مناسبت [illegible] ہی تھے۔ یہ یادداشت [illegible] جب نکلے شہر سے گھر [illegible] چلتے چاتے پتہ [illegible] بخاری صاحب بولے [illegible] اور لکھو [illegible] ہے [illegible] چاہیے، عثمان نوٹ کرو!

خبر پہنچی [illegible] رات [illegible] تھے۔ [illegible] میرے ہاں محفل جمی ہوئی تھی [illegible] صوفی تبسم، عابد علی [illegible] دونوں اپنا عجب [illegible] گھنٹی بجی۔ ہمارے رپورٹر میاں شفیع ٹیلیفون پر تھے [illegible] ٹیلیفون [illegible] قائد اعظم فوت ہو گئے ہیں، آپ تحقیق کر لیجئے [illegible] بخاری صاحب نے کہا ہم بھی چھپتے ہیں [illegible] پاکستان ٹائمز [illegible] کے صفحے بہرحال تیار کر لئے جائیں۔ لیکن [illegible] رات میں کسی وقت کوئی اطلاع پہنچ جائے۔ میں [illegible] بیٹھے، بخاری صاحب مرحوم کے سوانح حیات مرتب کرنے لگے، صوفی صاحب قطعہ تاریخ کی فکر کرنے لگے، تاثیر مرحوم اور حسرت مرحوم [illegible] کی ترتیب میں مصروف ہو گئے [illegible] کام کیا، تین بجے کے قریب خبر کی تصدیق ہوئی، اور جب ہم دفتر سے نکلے تو پو پھٹ چکی تھی [illegible] بارہ بج گئے [illegible] سے روانہ ہو چکے تھے، بخاری صاحب کو صحافت یا خاص [illegible] لیکن انہوں نے [illegible] پاکستان ٹائمز کے دفتر اور چھاپے خانے میں بسر کیں، گاندھی جی کے قتل کی رات، [illegible] کی رات [illegible] اگست کی [illegible] رات اسے شاید یہ بتا دینے میں بھی مضائقہ نہیں کہ اس زمانے کے پاکستان ٹائمز کے [illegible] اداریے اور مختلف ناموں سے بہت سے مراسلے بخاری صاحب ہی کے قلم سے ہیں۔ مراسلوں کے کام میں ایک پرلطف بحث مجھے خاص طور سے یاد ہے جو [illegible] اور اصل ان حقیقی یا ذہنی بزرگ کے سر ہے جو مولوی تیمچی کے نام سے مشہور تھے اور بقول خلق ہر بے نقاب خاتون کی چٹیا پر دست درازی کی فکر میں رہتے تھے! ایسے دو چار واقعات سننے میں آئے تو بخاری صاحب نے مولوی صاحب کی خدمت اور بے نقاب خواتین کی حمایت میں ایک بہت پرزور مراسلہ MERE WOMAN کے نام سے لکھا، اس پر آزادئ نسواں کے حامیوں اور مخالفین میں بہت زوروں کی بحث چلی اور جب تک چلتی رہی بخاری صاحب ان میں سے بیشتر خطوط کی تصحیح و ترتیب پاکستان ٹائمز کے دفتر میں بیٹھ کر خود کرتے رہے۔

انہیں بچوں سے خاص رغبت نہ تھی ("چھوڑ دیار، عورتوں کا محکمہ ہے")، لیکن وہ قریب قریب ہر چھٹی کے دن ہمارے اور تاثیر صاحب کے بچوں سے "ملاح" میں آنکھ مچولی کھیلتے، ان کے لئے نئے نئے کھیل ایجاد کرتے، گیت گاتے اور کہانیاں سناتے۔

وہ بوڑھوں سے اور بھی زیادہ تنفر رہتے۔ لیکن انہی دنوں لندن سے میری بیوی کے والدین ہمارے ہاں وارد ہوئے تو بخاری صاحب نے ایک ہی ملاقات میں انہیں بھی رام کر لیا، یہ بچارے اگلے وقتوں کے سیدھے سادے سفید پوش انگریز لوگ جنہیں بخاری صاحب کے ذہنی مشاغل سے دور دور علاقہ نہ تھا۔ اس شام بخاری صاحب پہنچے تو میں اور میری بیوی دونوں یہ سمجھے کہ آج ان کا رنگ نہ جمے گا اور بات رسمی تکلفات سے آگے نہ بڑھ سکے گی۔ خیر تعارف اور دو چار ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں، پھر بخاری صاحب اچانک بولے "مسٹر جارج آپ کو پہلی جنگ عظیم کے بعد کا کوئی گانا یاد ہے؟ مثلاً فلاں اور کوئی پرانا انگریزی گیت گنگنانے لگے، ہماری خوشدامن کو گانے سے شغف تھا، فوراً کھل گئیں اور پھر دو گانوں کا ایسا تانتا بندھا کہ کسی

کوزماؤ دکان کی رسد صرف رہی یا نہ۔ دونوں موسیقار ہنسنے لگے، یہ ایکٹ ختم ہوا تو بخاری صاحب ان سے یوں مخاطب ہوئے "مسز جارج ہم [illegible]، چلئے ہم دونوں چلیں؟"

"کہاں لے جاتے ہو میرے بڈھے کو" مسز جارج پکاریں۔

"ہم عیش کرنے جا رہے ہیں مسز جارج، GOING TO PAINT THE TOWN RED" اور رات کے تین بجے تک انھیں لاہور کے ریسٹورانوں میں گھماتے اور اینگلو انڈین لڑکیوں کا رقص دکھاتے رہے۔

لیکن ان سب اداؤں کے باوجود ناآشنا لوگ بخاری صاحب کو بہت ہی کم آمیز، بڑا مؤدب سمجھتے تھے اور یہ تاثر چنداں غلط بھی نہ تھا۔ عمر بھر کی بے تکلفی کے باوجود ہم میں سے بھی کسی کا یہ حوصلہ نہ تھا کہ ان کے اوقات میں مداخلت کرے یا ان کی فرمائش کے بغیر ان کی کسی مصروفیت میں ہاتھ بٹائے۔ بعض لوگ تو یہاں تک کہتے تھے کہ بخاری صاحب لباس بدلتے ہیں تو ساتھ ہی شخصیت بھی بدل لیتے ہیں۔ دفتر میں اور، گھر میں اور، محفل میں اور۔ اصل میں یوں نہ تھا بلکہ ان کے ہر بات ہی نپے تلے قاعدے اور سلیقے کا اظہار تھا۔ ایک بار ایک بہت ہی باتکلف لیکن کچھ عجیب و غریب سے حضرت میرے گھر پر تشریف لائے۔ میں بخاری صاحب کے ہاں جانے کی فکر میں تھا۔ کہنے لگے "مجھے ان سے ملنے کا بہت اشتیاق ہے، مجھے بھی لے چلو؟" میں نے کہا چلئے۔ بخاری صاحب کی پیشانی پر انھیں دیکھتے ہی ہلکی سی شکن نمودار ہوئی۔ یہ صاحب پہلے تو گم سم بیٹھے رہے، پھر ایک آدھ یونہی سی بات کی۔ بخاری صاحب اٹھ کھڑے ہوئے کہنے لگے "صاحب اس وقت بدقسمتی سے میں مصروف ہوں، معافی چاہتا ہوں، ان شاء اللہ پھر کبھی ملاقات ہوگی۔" ہم چلنے لگے تو چپکے سے پوچھا "اس کے بعد کیا پروگرام ہے؟" میں نے کہا دفتر جاؤں گا۔ میں اپنے ساتھی سے رخصت ہو کر دفتر پہنچا تو تھوڑی دیر میں بخاری صاحب بھی آ گئے۔ پوچھا یہ کون تھے؟ میں نے بتایا کہ فلاں فلاں صاحب ہیں، بہت بھلے آدمی ہیں۔ کہنے لگے، تکلف میں تضیعِ اوقات تک تو خیر جائز ہے لیکن تکلف میں بور ہونا کسی صورت بھی جائز نہیں۔ وہ امرتا شیرگل تھیں یا رب! کیا غضب کی عورت تھی! ایک دفعہ اس کے اعزاز میں ہمیں فلیٹیز میں ایک بہت بڑی دعوت تھی، بڑا بڑا خان بہادر اور رائے بہادر بیٹھا تھا، امرتا کے بیٹھتے ہی آس پاس کے لوگوں سے کچھ دیر گفتگو کی اور کھانا شروع بھی نہ ہوا تھا کہ اٹھ کھڑی ہوئیں "میں بور ہو گئی، میں جاتی ہوں؟" میزبان اور مہمان دیکھتے ہی رہ گئے اور وہ کھٹ کھٹ یہ جا وہ جا! اخلاقی جرأت اسے کہتے ہیں، مجھے آج تک اس واقعے سے رشک آتا ہے۔

یہ تو ایک قاعدہ تھا، دوسرا قاعدہ یہ تھا کہ کام کے وقت ڈٹ کر قاعدے سے کام کرو تاکہ کام کے بعد ڈٹ کر بے قاعدگی کر سکو۔

اور قاعدے کی صورت یہ تھی کہ آل انڈیا ریڈیو کی پہاڑ سی عمارت اور ہندوستان بھر میں بکھرا ہوا چوبیسیوں کا سا عملہ لیکن اور دفتری کام کے علاوہ اس عمارت کی ہر کھڑکی کے ہر شیشے، ہر دروازے کے ہر قبضے، ہر کمرے کے ہر کونے کی صفائی اور اس عملے کے ہر فرد کی ہر سرکاری و غیر سرکاری حرکت پر ان کی نظر رہتی تھی۔ اور یہ تو خیر ممکن ہی نہ تھا کہ مستقل ہنگامہ آرائی، کوچہ گردی اور رتجگوں کے باوجود ان کی گاڑی ہر صبح نو بجنے سے پانچ منٹ قبل دفتر کی عمارت میں داخل نہ ہو۔

لیکن اس ساری قاعدے بازی میں ساتھ ہی ساتھ ان کی خوش طبعی اور اُپج بھی کسمساتی رہتی تھی، ایک دفعہ میں نے دیکھا کہ کمرے میں آتشدان کے سامنے بہت سی فائلیں لئے بیٹھے ہیں اور فائلوں میں سے کاغذات نکال کر آگ میں جھونکتے جا رہے ہیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"دیکھو اس کو انگریزی زبان میں کہتے ہیں QUICK DISPOSAL بات یہ ہے کہ ان سب فائلوں میں محض خرافات بھری ہے اور اس خرافات سے چھٹکارا پانے کی واحد صورت یہی ہے کہ اس کا نام و نشان صفحۂ دفتر سرکارِ عالی مدار سے محو کر دیا؟" یہ دوسری بات ہے کہ اس نوع کی خرافات وہ خود ہی ایجاد بھی کرتے رہتے تھے۔ ہماری طالب علمی کے زمانے میں وہ گورنمنٹ کالج میں انگریزی کے استاد بھی تھے اور

پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے سیکرٹری بھی۔ ایک دن ہم دونوں دوست کسی کام سے ٹیکسٹ بک کمیٹی کے دفتر گئے، بخاری صاحب نے دیکھا تو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ کہنے لگے تمہیں معلوم ہے اس دفتر میں کیا کام ہوتا ہے؟ یہ دیکھو۔ اور [illegible] ایک موٹی فائل نکالی جس کے سرورق پر لکھا تھا "OFFICE CAT" یعنی دفتر کی بلی [illegible] ہم نے پوچھا "یہ کیا قصہ ہے؟" کہنے لگے "ایک دن میرے کمرے میں بلی آ گئی مجھے اچھی لگی میں نے کسی سے کہا اسے [illegible] دودھ [illegible] روز آنے لگی اور اسے دودھ بھی ملنے لگا۔ مہینے کے آخر میں سپرنٹنڈنٹ صاحب نے دفتر کے اخراجات کا بل مجھے بھیجا تو اس کے ساتھ ایک تحریری سوال یہ بھی تھا کہ بلی کے دودھ پر جو دو روپے صرف ہوئے ہیں وہ کس مد میں [illegible] میں نے لکھ بھیجا Contingency یعنی متفرق خرچ میں ڈال دو۔ کچھ دنوں کے بعد اکاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر نے بل لوٹا دیا اور یہ تحریری فہمائش کی کہ Contingency کی مد تو دفتر کے سامان [illegible] کے لئے مخصوص ہے بلی جاندار ہے اور اس کے اخراجات Contingency میں شامل نہیں کئے جا سکتے۔ اس پر سپرنٹنڈنٹ صاحب نے مجھ سے مزید تحریری جواب طلب کیا۔ میں نے لکھا کہ اگر جاندار اور غیر جاندار کا فرق ہے تو یہ خرچ establishment یعنی عملے کی مد میں ڈال دو۔ [illegible] اکاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر [illegible] دنوں میں لوٹ آیا اب کے ایک طویل مراسلے میں یہ استفسارات تھے کہ اگر یہ خرچ عملے کی مد میں جانے کا ہے تو واضح کیا جائے کہ اس رقم کو تنخواہ تصور کیا جائے یا کہ الاؤنس؟ اگر تنخواہ ہے تو بموجب قاعدہ نمبر فلاں فلاں دفتر کی پیشگی منظوری درکار ہے اور اگر یہ الاؤنس ہے تو بموجب قاعدہ فلاں فلاں، فلاں افسر سے اس کی تصدیق لازمی ہے .... چنانچہ یہ فائل کچھ مہینے سے چل رہی ہے اور اس میں ایسے ایسے مراسلے [illegible] ہیں جن کا اندازہ نہیں ...... پھر ایک اور فائل نکالی، سرورق پر یہ عبارت درج تھی، خط و کتابت مابین پروفیسر اے ایس بخاری سیکرٹری ٹیکسٹ بک کمیٹی، پروفیسر اے ایس بخاری شعبہ انگریزی گورنمنٹ کالج لاہور۔ کہنے لگے "سنو۔ یہ پہلا خط ہے از جانب پروفیسر اے ایس بخاری سیکرٹری ٹیکسٹ بک کمیٹی بنام پروفیسر اے ایس بخاری شعبہ انگریزی گورنمنٹ کالج لاہور۔

جناب والا!

آپ کی یاد دہانی کے لئے معروض ہے کہ گزشتہ ماہ آپ کو پانچ کتابیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے، ریویو کی غرض سے ارسال کی گئی تھیں لیکن ریویو ابھی تک موصول نہیں ہوئے، مہربانی سے جلد توجہ فرمائیے۔

آپ کا نیاز مند: اے ایس بخاری

اس کے بعد یاد دہانی کے دو خط اور ہیں۔ اور تیسرا خط یہ ہے۔

از جانب پروفیسر اے ایس بخاری، سیکرٹری ٹیکسٹ بک کمیٹی لاہور بنام پروفیسر اے ایس بخاری شعبہ انگریزی گورنمنٹ کالج۔ لاہور

جناب والا!

بحوالہ خط نمبر فلاں فلاں، آپکو ٹیکسٹ بک کمیٹی کی طرف سے جو پانچ کتابیں ارسال کی گئی تھیں (تفصیل درج ذیل ہے) ان میں سے تین کے ریویو وصول ہو گئے ہیں جس کیلئے کمیٹی آپ کی ممنون ہے، لیکن کمیٹی توجہ دلانا چاہتی ہے کہ انتہائی اصرار کے باوجود آپ نے دو کتابوں (یعنی فلاں اور فلاں کتاب) کے بارے میں ابھی تک اپنی رائے تحریر نہیں فرمائی، کمیٹی اس تاخیر کی وجہ سمجھنے سے قاصر ہے، آپکو تنبیہہ کی جاتی ہے اگر فلاں تاریخ تک آپکی رائے موصول نہ ہوئی تو آپکا نام ریویو کرنے والوں کی فہرست میں سے خارج کر دیا جائیگا۔

آپکا نیاز مند: اے ایس بخاری

اور اس کا جواب یہ ہے، منجانب اے ایس بخاری وغیرہ بنام اے ایس بخاری وغیرہ

جناب والا: بحوالہ خط نمبر فلاں فلاں، بقیہ ریویو ملفوف ہیں۔ میں یہ گوش گزار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آپ کے خط کا آخری پیراگراف انتہائی

قابل اعتراض ہے۔ سینیئر (SENIOR) افسروں سے خطاب کا یہ انداز قطعی غیر موزوں ہے۔

آپ کا نیازمند: اے ایس بخاری

پھر بخاری صاحب نے فائلیں اور کاغذات سمیٹے اور بولے "اچھا اب تم فوراً رفو چکر ہو جاؤ، مجھے بہت کام ہے۔"

لیکن یہ سب کچھ تو صرف بخاری صاحب کی باتیں ہیں بخاری تو نہیں ہیں، وہ حاضر جواب تھے ادیب بھی، استاد بھی، ہم جلیس بھی، بذلہ سنج بھی، خوش تحریر بھی، سخت گیر منتظم بھی، بے فکر بانکے بھی اور آخر میں مدبر اور صاحب سیاست بھی، لیکن یہ سب صفات گنوا دینے سے بھی کیا ہوتا ہے، ان کی زندگی کا بنیادی پہلو تو یہ ہے کہ اس کا کوئی بھی لمحہ بے مقصد اور بے صرف نہیں گزرا اور ان میں سے بیشتر لمحات موجودات کے ہر مظہر سے خوبی اور حسن اور احساسات کے اخذ و استفادہ میں گزرے اور وہ قلب و نظر کی اس دولت کو عمر بھر محفلوں، دانشکدوں، ایوانوں اور گزرگاہوں میں یوں بکھیرتے رہے کہ اپنے نام کی یادگار کے لیے اس کا عشر عشیر بھی نہ بچا سکے۔ اس دور کی کوئی ایسی شخصیت معلوم نہیں جس نے اتنے بہت سے لوگوں کے لیے اس قدر لطف و مسرت دریافت اور تخلیق کی ہو۔ وہ سب لوگ جن کے لیے دوسرے اہل کمال گفتار و تحریر کی کیسی بھی نعمتیں مہیا کریں۔ یہی فریاد کریں گے کہ

"عشوۂ زاں لب شیریں شکر باز بیارد"

ہنستے ہنستے

عصمت چغتائی

ہنستے ہنستے بے دم ہو کر تخت سے پیچھے ڈھلک گئی۔

[illegible] میں نے آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو پونچھ ڈالے۔ ہمارے پیٹ میں درد ہونے لگا تھا۔ سانس پھول گئی تھی۔ ہنسی حلق میں پھنس گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اگر ہنسی کا یہ دورہ نہ رکا تو تھوڑی دیر میں جسم کا بند بند ڈھیلا ہو جائے گا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب بات بات پر ہنسی آتی تھی۔ [illegible] ہنسی چھوٹ نکلی [illegible] اور قہقہوں کا طوفان ٹوٹ پڑا۔ اور جو کہیں کسی نے پوچھ لیا کہ بھئی کیوں ہنس رہی ہو تو بس [illegible] کے اندر بھی تیز ہو جاتا۔ ہنسی آسیب کی طرح سوار ہو جاتی۔ ہنس ہنس کر شل ہو جاتے۔ [illegible]

کسی صورت اتفاق [illegible] ہم ناک پونچھتے پیٹ پکڑے [illegible] اپنے مخصوص [illegible] سے ہنسنے لگتے۔

عظیم بھائی کی کتابوں میں سے مضامین پڑھ پڑھ کر [illegible] قسم کی [illegible] بردبار اور غمگین آپا کی [illegible] پڑھ رہے تھے۔ ہمیں [illegible] یاد ہو گئے تھے جو [illegible] ہنسی آتی ہے اب وہی مضامین پڑھتی ہوں تو اتنی ہنسی نہیں آتی۔

اس وقت تک عظیم بھائی نے مزاح نگاری شروع نہیں کی تھی یا شاید ہم نے ان کے مضامین نہیں پڑھے تھے۔ ملا رموزی کے مضامین پر اتنی ہنسی نہیں آتی تھی جیسی کبھی آیا کرتی تھی۔ کچھ پھیکے سے لگنے لگے تھے۔ نہ جانے کیوں ہم پطرس پر جا گرے اور ایک جان چھوڑ ہزار جان سے ان پر عاشق ہو گئے۔ نہ جانے کیوں تخیل میں وہ ہمیں ہم عمر سے نظر آتے تھے اور یقین تھا کہ اگر ان سے ملاقات ہو جائے تو ہم ضرور انہیں [illegible] کی [illegible] پر چڑھا لے جائیں جو کنوئیں کے پاس نیم کی اونچی شاخوں پر شمیم اور چنو نے باندھ رکھی تھی۔

پطرس کی باتیں ـــ جی ہاں انہیں باتیں ہی کہوں گی کیونکہ ان کی تحریریں بے ساختہ بولتی تھیں۔ ان میں بڑی یگانگت اور قربت محسوس ہوتی تھی۔ ہمارے گھر کے زندہ ماحول میں بڑی بے تکلفی سے کھپتی تھیں۔ چھوٹے بڑے سب ہی انہیں پسند کرنے لگے۔

عظیم بھائی نے "قعر صحرا" لکھی تو ہم نے جی جان سے پڑھی مگر "قرآن وغیرہ" "حدیث وغیرہ" بڑی بور معلوم ہوئیں۔ خشک مردہ کتابیں

ان کے کچھ مضامین اقتصادیات پر " ریاست " میں نکلتے تھے وہ بھی ہمیں قطعی کھردرے معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے جب ہمیں پطرس کے مضامین اس رغبت سے پڑھتے دیکھا تو کچھ کبیدہ سے ہو گئے۔

تلخ نثر پڑھ کر ہنسنے کا دور گذر چکا تھا۔ سخت روکھے انسانوں سے کبھی شدید دلچسپی نہ رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ہمیں پطرس بے طرح پسند آگئے۔ " میں ایک میاں ہوں " ہمارے گھر میں بالکل کیری کی چٹنی کی طرح چٹخارے لے کر پڑھا گیا اماں تک نے پڑھ ڈالا۔ اور جب اپنی پلنگڑی پر بیٹھ کر وہ ہنسیں تو پاندان کی کلھیاں پھدک پھدک کر آپس میں ٹکرانے لگیں۔ میں تنقید نگار نہیں نہ میں کوئی بات وثوق سے کہہ سکتی ہوں مگر میرا اپنا ذاتی خیال ہے کہ " میں ایک میاں ہوں " کے بعد سے پطرس کا رنگ دوسرے مزاح نگاروں میں جھلکنے لگا۔ عظیم بھائی نے تو اپنی ایک کہانی میں اعتراف بھی کیا ہے۔ فرحت اللہ بیگ اور شوکت تھانوی کے ہاں بھی وہی رنگ جھلکنے لگا۔ میں مزاح نگاری کی تاریخ نہیں لکھ رہی ہوں کیونکہ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ ان میں سے پہلے اس انداز میں کس نے لکھنا شروع کیا۔ مجھے آج تک نہیں معلوم کہ ان میں سے کون کس سے متاثر ہوا اور کس نے کس کی پیروی کی مگر میرے مطالعے کی تاریخ میں پہلا نام پطرس کا آتا ہے۔ میں پطرس کو اپنی جانب سے کوئی مقام نہیں دینا چاہ رہی ہوں۔ مجھے تو بس یہ کہنا ہے کہ ایک عمر میں پطرس کی تحریریں دل کو ایسی ہی لگتیں کہ ہم نے ایک دن جوش میں آکر پطرس کو خط لکھ مارا۔ ابّا میاں کے بکس سے لفافہ اور ٹکٹ چرایا اور معرفت ـــ " تہذیب نسواں " ـــ خط بھیج کر جواب کا انتظار کرنے لگے۔

یا اللہ تیری ہر بات میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ اسی پر تو میں خدا کے وجود کی قائل ہوں۔ وہ خط قبلہ ممتاز علی صاحب نے کھول لیا اور مع لفافہ کے ابّا کو جنہیں انہوں نے منہ بولی بیٹی بنایا تھا بھیج دیا۔ بلی مظلوم سی ایک چوہیا پکڑ لیتی ہے اور کم بخت اس سے مذاق کرتی ہے کبھی دانت مار دیا۔ کبھی گدگدا دیا کبھی پنجہ سے لڑھکا دیا۔ اس خط کے آنے کے بعد کئی روز ہماری گت اسی طرح بنتی رہی ہمارا خط اونچی آواز سے ابّا کے سامنے پڑھا گیا ہر فل سٹاپ پر سر پر چپتیں پڑتی جاتیں۔ خط میں ہم نے انہیں مسخرا لونڈا سمجھ کر نہایت بے تکلفی فرمانے کی کوشش کی تھی۔ اب تک اس خط کا ایک ایک حرف دماغ پر داغا ہوا ہے برسوں خیال ہی سے پسینے چھوٹ جایا کرتے تھے۔ خط ہمیں تنبیہ دینے کے لئے بار بار پڑھا جاتا تھا۔ ہم نے نہایت بے تکلفی سے اپنی دانست میں بالکل پطرس کے رنگ میں لکھا تھا۔ سب سے بھیانک جملہ تھا۔

" ابے پطرس! کیا تو گھاس کھا گیا ہے ؟ "

" عوام " اس جملے سے ہماری دھجیاں بکھیرتے تھے۔ ہر شخص کو اجازت تھی کہ بے تکلف ہمارے سر پر چپت جڑ دے۔ ظاہر ہے کہ اس صلائے عام پر ہر خستہ دل نے لبیک کہا۔ ہم حضرت ممتاز علی صاحب اور پطرس کی جان کو کوستے تھے۔ ہم مجرم جو تھے صرف اس لئے نہیں کہ پطرس سے یارانہ گانٹھنے کی کوشش کی تھی۔ بلکہ اس لئے بھی کہ ہم نے اس لفافے پر جو ٹکٹ لگایا تھا اس پر " سروس " لکھا تھا جو صرف سرکاری ڈاک کے استعمال کے لئے ہوتا تھا۔ آٹھ آنے جرمانہ الگ ٹھکا۔ سچ پوچھئے تو اس سانحہ کے بعد پطرس ہماری چڑھ بن گئے۔ ہماری جملہ شیطانیوں کی فہرست بناتے وقت ہمیشہ اس واقعہ کو تکلیف دہ حد تک اہمیت دی جاتی۔

بعض اوقات ایک چھوٹی سی بات کا دل پر کتنے دن نقش رہتا ہے۔ برسوں گذر گئے۔ لوگ بھول بھال گئے۔ مگر شاید دماغ نے ایک ننھی سی گانٹھ باندھ لی۔ بمبئی میں کتنے سال کم گذرا ہوگا کہ ایک دن ریڈیو اسٹیشن سے کسی صاحب نے فون کیا کہ بخاری صاحب آج کل بمبئی آئے ہوئے ہیں اور مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ پہلا خیال یہ آیا کہ کوئی بہانہ کر دوں۔ کہہ دوں کہ بیمار ہوں، پھر سوچا یہ کیا حماقت ہے۔ پطرس آئے ہیں یعنی سچ مچ پطرس آئے ہیں اور میں ان سے ملتے جان چرا رہی ہوں یعنی ان کو کیا پتہ کہ ایک دن ان کی بدولت میرے چپتیں پڑ چکی ہیں۔ وہ مجھے قطعی قابل ملاقات سمجھتے ہیں۔ جب ہی تو

بقیہ۔ خیر یہ تو وعدہ رہا۔

مگر میں نے شاہد سے کوئی ذکر نہیں کیا۔ انہوں نے چاہا کہ شاہد کو بھی ساتھ لیں میں نے بہانہ کر دیا کہ انہیں قطعی فرصت نہیں۔ یہی میری نیم کے نیچے پڑے ہوئے سمجھنے والی ذہنیت! یہ ڈر کم بخت کاہے کا تھا۔ خیر رہنے دیجئے آگے چل کر بتاؤں گی۔

مجھے ضرورت سے زیادہ ذہین اور حاضر جواب لوگوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ ان کی شخصیت مجھے اپنی جانب کھینچتی بھی ہے اور دور بھی دھکیلتی ہے۔ اور پھر پطرس کا مجھ پر پہلے ہی رعب بیٹھا ہوا تھا خواہ مخواہ ان سے مل کر احساس کمتری دوچند ہو جاتا ہے۔ ذہنی کوفت ہوئی، نہیں جاتی ہوں تو نہ جانے پھر کتنا پچھتانا پڑے۔ جاتی ہوں تو اللہ! نہ جانے کیسی چوٹیں کریں گے۔ ضرور میں بدتمیزی برت جاؤں گی۔ تھی جو جملہ بازی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ شاہد کے سامنے میرا پول کھل جائے۔ وہ ذرا فخر سے کہدیں گے کہ پطرس نے محترمہ کو وہ چھکّا دیا کہ بولتی بند ہو گئی۔

رات بھر میں نے ان تمام جملوں کے جواب سوچے جو وہ کہیں گے اور میں منہ توڑ جواب دوں گی۔ بدقسمتی سے میری ساری محنت رائیگاں گئی۔ پطرس نے وہ سوال ہی نہ کئے۔ اُف میری حماقت! میں نے اپنے پروفیسر سے کبھی ہار نہ مانی۔ میرے استاد میری منہ زوری سے چونکتے رہتے تھے۔ میری کئی استانیاں کلاس میں آنسو بھر لاتیں۔ یہ میرا خاندانی ورثہ ہے اور مجھے اس پر ناز تھا۔ مگر اس دن احساس کمتری بُری طرح بھوت بن کر گلا دبوچنے لگا۔ میں نے پطرس کی زندگی میں کبھی کسی سے ان احساسات کا ذکر نہ کیا۔ کوئی گلے پہ چھری رکھ دیتا تب بھی نہ کرتی۔ کسی نے بچپن میں مجھے ہوّا بن کے ڈرانے کی کوشش کی۔ تو میں نے اس ہوّے کی پنڈلی کی بوٹی اتار لی تھی اور بجائے ڈرنے کے ڈرانے والے کی چیخیں نکل گئی تھیں۔ مگر پطرس کے ہوّے نے مجھے ہولا تو کرشل کر دیا۔ میں نے اپنے لباس کے بارے میں کبھی غور نہیں کیا مگر اس دن میں نے بڑے سوچ بچار کے بعد ایسی سادہ سی ساڑھی نکالی جس کا ذہن پر کوئی دھندلا سا نقش بھی نہ رہ جائے تاکہ کوئی حوالہ نہ دیا جا سکے۔ ہر شے مبہم ہو جائے۔ پطرس کے سامنے دال گلنے کی نہیں۔ صرف غائب ہو جانے والی ٹوپی پہنے ہی میں عافیت ہے۔

جب ریڈیو اسٹیشن جانے لگی تو دل سے دعا نکلی کاش پطرس بیمار پڑ گئے ہوں یا میرے ہی پیٹ میں درد اٹھ آئے۔ ہسپتال سے فون کروا دوں کہ آخری وقت ہے۔ لعنت ہے عصمت کی بچی تجھ پر، پھر تو وہ ضرور ہسپتال عیادت کو آ پہنچیں گے۔ شاید اب تو مرنے میں بھی رہائی نہیں کاندھا دینے تو وہ آ ہی پہنچیں گے۔ پھر میرے چغتائی خون نے للکارا میرے سر پر دادا نے کھوپڑیوں کا مینار چنوا کر اس پر بیٹھ کر خاصہ تناول فرمایا تھا۔ اور میں ایک حقیر بشر کی دہشت میں فنا ہوئی جا رہی ہوں۔ ایسا بھی کیا ہے۔ ٹانگ کھینچیں گے تو اپنی بدزبانی پر اتر آؤں گی مزاج ٹھکانے آ جائیں گے شاہ صاحب کے۔

لیجئے بسم اللہ ہی غلط ہوئی۔ ریڈیو اسٹیشن کے دفتر میں پہونچی تو کاغذوں پر سر جھکائے بیٹھے تھے۔

”آداب عرض!“

”گڈ مارننگ“ جواب ملا

”اف بدھو“ میں نے سوچا اب فراٹے کی انگلش کا رعب ڈالیں گے۔ وہ کاغذوں پر جھکے تھے۔ میں نے غور سے معائنہ شروع کر دیا۔ ”صورت تو کچھ زیادہ توپ نہیں“ میں نے سوچا۔ سیدھی سادی سانولی سلونی سی شکل ہے مگر تصویر سے نہیں ملتی۔ تعجب مختلف!

”کتنے دن قیام رہے گا“ میں نے انہیں کاغذوں میں لوٹ پوٹ دیکھ کر پوچھا۔ سوچا میں پہلے بولنا شروع کروں تو پہلا وار میرا رہے گا۔ مگر دل ڈوبنے لگا کہ پہلا وار نہایت پھسپھسا رہا۔ ضرور اس جملے کی دھجیاں اڑیں گی۔

”جی“ وہ کاغذوں میں سے ابھرے ”میرا تبادلہ بمبئی کا ہو گیا ہے۔“

یہ پطرس صاحب کسی میٹنگ کے سلسلے میں بمبئی آئے ہیں۔ بہت جلد جانے والے ہیں۔ یہ آخر مجھ سے مجھے کیوں ملوا رہی؟ اس میں بھی چال ہوگی۔ وہ اس سے قبل کوئی اور سوال جواب کرتی، فرمانے لگے

"چلیے!"

"خاصے بوڑھے" میں نے غور سے تاڑ کر پیچھے چلتے ہوئے سوچا۔ یہ دانت کیوں بار بار کوستا ہے؟ سامنے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں ہم سے چلے گئے۔ سامنے میز پر ایک دو چھوٹے کاغذات کے ڈھیر کے سامنے ایک غضب کی سی صورت کا گورا چٹا پٹھان بیٹھا ہوا تھا۔ طوطے جیسی لمبی ناک، بھاری بھاری آنکھیں

"آئیے آئیے ...... معاف کیجیے گا میری میٹنگ ذرا لمبی کھنچ گئی۔"

"اللہ" میں نے سانولے سلونے پٹھان کے بیٹھنے کے بعد کہا۔ "میں سمجھی تھی آپ وہ ہیں۔"

"کیا؟ ...... میں وہ ہوں ...... آپ میری ہتک کر رہی ہیں؟" وہ بالکل ٹھٹکے۔ "وہ ممتحن ہیں اور میں قطعی وہ نہیں ہوں۔" ایک جھٹکے سے سارا اعصابی بوجھ سبک سے اڑ گیا۔ ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں ایک دم مجھے نیند سی آنے لگی۔ یا خدا! حق میں نے اس شخص کی اپنی جان پر اتنی ہیبت سوار کر لی ایسا معلوم ہوا جیسے انہیں برسوں سے جانتی ہوں۔ یہ غضب تو قطعی نافقرہ نکلا۔ پھر جو باتوں کا سلسلہ چلا ہے تو میرا سارا ریہرسل بے کار ہو گیا۔ سارے تماشے بھونے جلے اڑن چھو ہو گئے۔ تاج محل ہوٹل پہنچتے پہنچتے دو چار مسائل پر اختلافات بھی ہو گیا۔ میرے خیال میں پطرس کی خاصیت یہی تھی کہ ان سے ملتے ہی برسوں کی ملاقات کا احساس ہونے لگتا تھا۔ یہ معلوم کر کے حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی کہ انہوں نے اس زمانے کے لکھنے والوں کا ایک ایک لفظ بڑی دلچسپی سے پڑھا تھا اور یاد رکھا تھا۔ انہیں جملے کے جملے ازبر تھے۔ شعر تو میں نے بہت لوگوں کو یاد رکھتے سنا ہے مگر نثر صرف پطرس کی زبان سے اس طرح سنی۔

"میرے کمرے میں چلنے پر کوئی اعتراض؟" بڑی بے تکلفی سے پوچھا۔

"کیوں؟"

"ٹھیک۔ آئیے۔"

یہ اطلاع مجھے بعد میں ملی کہ پطرس نہایت لوفر انسان ہیں۔ اس وقت مجھے بھی اندازہ نہیں تھا کہ میری ڈھیٹ کہانیوں کی وجہ سے لوگ مجھے بھی بڑی نٹ کھٹ سمجھتے ہیں

میں نہایت بے تکلفی سے آرام کرسی پر دراز لیمونیڈ پیتی رہی۔ وہ پلنگ پر بیٹھے ٹھنڈی ٹھنڈی بیئر کی چسکیاں لیتے رہے اور دو قینچیاں اپنی پوری رفتار سے چلتی رہیں۔ باتوں کے طوفان میں بار بار یہ محسوس کر کے سخت کوفت ہوتی رہی کہ پطرس کا مطالعہ اور مشاہدہ اتنا وسیع ہے کہ برسوں کھرل گھونٹوں برابر کی بحث نہ ہو سکے گی اس لیے کیوں نہ قنوطیت پر اتر آؤں اور اپنی خاندانی کج بحثی کام میں لاؤں کہ بڑے بڑے سورماؤں پر آزمایا ہوا نسخہ ہے جہالت اور کم مائیگی کے لیے بہترین ڈھال۔

مگر بہت جلد معلوم ہو گیا کہ غنیم نہایت چوکس ہے۔ مجھ سے کئی سال پرانا اور اکھاڑے کا گھاگ ہے۔ تیری ٹک بڑی چابک دستی سے واپس لوٹا دیتا ہے۔ اس میدان میں بھی کھلی مات سے بہتر ہے کہ بزرگ مان کر ہتھیار ڈال دوں۔ شاگرد بن کر مسکین صورت سے سوالات کروں اور یہ لیکچر جھاڑ کر حلق خشک کریں۔ موقع پاؤں تو ڈنک مار دوں۔ مگر توبہ کیجیے! پطرس گھسے میں آنے والے آسامی نہ تھے۔ میرے ہر ذہین اور دقیق سوال میں نہایت بھونڈے پن سے "ہٹائیے بھی یہ بونگی باتیں" کہہ کر میرا خوب جی جلایا۔

میں نے بھی چڑ کر ان کی ہر بات کو الٹ کر بحث شروع کر دی۔ انہوں نے میرے ہر پسندیدہ شاعر کو اور ادیب کو جاہل اور الو کہا۔ میں

نے بھی بلبلا کر نہایت تہذیب اور سلیقے سے انہیں احمق کہہ دیا جس پر وہ بے تحاشہ ہنسے میں نے پھر چھیڑ کر ان کا ساتھ دیا گو جی یہ چاہ رہا تھا سرہانے رکھا ہوا لیمپ اسٹینڈ ان کے سر پر گر پڑے اور میں ہنستی رہوں۔

"اسے اٹھوا دیا گیا" گھڑی دیکھ کر وہ جلدی جلدی اپنا گلاس ختم کرنے لگے پھر بھاری بھاری آنکھوں سے میری طرف ایسے دیکھا جیسے میں بالکل کوڑھ مغز ہوں اور پھر بے اختیار ہنسنے لگے۔ بالکل بے وجہ بدذات کھانی چیز کی طرح۔ ایک دفعہ اس نے چڑانے پر میں نے گال پر ایسا نوچا تھا کہ چربی نکل آئی تھی۔

"جلدی چلنا چاہیے ورنہ کھانا نہیں ملے گا۔" مطلع صاف ہو گیا اور ہم نہایت اطمینان سے ڈائننگ ہال میں جا کر مینو پڑھنے لگے۔ "اف یہ فرنچ کھانوں کے نام مجھے بڑے گندے لگتے ہیں۔" میں نے پھر جلانے کی کوشش کی: "سب کھانے سارڈین کی طرح بدبودار اور لس سے معلوم ہوتے ہیں۔" اس کے بعد مچھلیوں، گھونگوں اور سیپیوں پر بحث ہونے لگی اب انہوں نے ایک دوسرا طریقہ نکالا ہر بات پر اتفاق کرنے لگے جس پر کوفت دوگنی ہو گئی اور میں اس نتیجے پر پہونچی کہ پطرس اتر جائیں تو ڈھن جانے میں ہی عافیت ہے۔ میں نے چاہا ان کی تحریروں کے بارے میں بات کروں مگر اس عرصے میں ہمارے تعلقات اتنے کشیدہ ہو گئے تھے کہ وہ بھڑک گئے اور یہ بجا بھی تھا اس وقت میں ان کی کہانیوں کی تعریف کر کے ان کے چہرے پر آنے والی جھینپوں پر مسکرا کر بھی ٹھنڈا کرنا چاہ رہی تھی۔ مگر وہ فوراً ادب کی محفل سے چھلانگ مار کر کھانے پر آ گئے۔ "کافی بدمزہ کھانا تھا۔ شوربا کچا تھا جیسے چرواہا چبا رہے ہوں" اشارے سے بیرے کو بلا کر بڑی لجاجت سے بولے۔

"دوست یہ بکرا تو سینگ مار رہا ہے کوئی مرا ہوا جانور نہیں پکا سکتے تھے آپ۔" بیرا بے چارہ کھسیانا ہو کر ہنس دیا۔ اور جب وہ پلیٹیں اٹھا کر چلا گیا تو ایک دم سے بولے۔

"تم نے ٹکشن کو پطرس کیوں سمجھا اگر گدھے کو پطرس سمجھ لیا ہوتا تو مجھے قطعی شکایت نہ ہوتی۔" مجھے سستاتا دیکھ کر بیرے سے پہلے جلدی سے بولے "شاید گدھے کو شکایت ہوتی۔" میں نے اتنی زور سے ٹھٹھا مارا کہ ہال میں مہذب لوگ بڑبڑ کرتے کرتے ایک دم چونک کر دیکھنے لگے۔ پطرس نے تادیبی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں

"درمیانہ درجہ کی، چار دیواریوں میں پلی ہوئی لڑکی تاج محل ہوٹل کے آداب سے کیسے واقف ہو سکتی ہے۔" ان کا خیال ٹھیک تھا۔ اس سے پہلے میں نے صرف ایک دفعہ تاج میں چائے پی تھی۔ اس وقت تک یہ پہلا اتنا شاندار ہوٹل جسے صرف دیکھنے کے لیے گئی تھی۔ تکلفات، سجاوٹ اور صفائی کو ہمارے گھر میں نہایت تحقیر کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ ہمارے گھر میں کھانے کی میز تو تھی اور جب نہایت غیر دلچسپ قسم کے مہمان آتے تھے تب اس پر سے سلائی کی مشین، اچار کی برنیاں اور بچہ کا گڈولنا اتار کر تخت کے نیچے دوسرے کاٹھ کباڑ کے ساتھ چھپا دیا جاتا تھا۔ خاص مہمانوں کی چادر بچھا کر چینی کی پلیٹیں سجا دی جاتی تھیں۔ آپا بڑے چاؤ میں آ کر نیپکن کے پھول بنا کر گلاسوں میں سنوار دیتیں۔ ہم لوگ ان احمقانہ بناوٹ اور بے کار کی زحمت کو نہایت تحقیر سے ہنستے اور انہیں چڑانے کو گلاس میں سے نیپکن نکالے بغیر پانی بھر لیتے۔ آپا مہمانوں کے سامنے ہمارے جنگلی پن کی وجہ سے شرمندہ ہوتیں تو بڑا لطف آتا۔ ہم لوگ تو ملتے یا تام چینی کی رکابیوں میں کھانا لے کر بان کی چارپائی پر سینی رکھ کر بیٹھ جاتے۔ ذرا پلنگ کی ادوائن ڈھیلی ہوتی تو بڑا مزہ آتا کوئی موٹا آدمی بیٹھ جاتا تو سارا شوربہ گود میں رس آتا۔ بان کی ڈھیلی چارپائی پر بیٹھ کر پتلے شوربے کا سالن کھانا بھی ایک فن ہے۔ جس میں ہمارا گھرانا ماہر تھا۔

تاج محل ہوٹل میں کانٹے چھری سے کھانا کھاتے وقت میرے کندھے انجانے بوجھ سے تھک گئے۔ اور جمالیات کو سخت ٹھیس لگی اور

مجھے ذرا احساسِ برتری ہونے لگا کم از کم اس میدان میں تو مجھے فوقیت حاصل تھی۔ پطرس کو روزمرہ کی طرح محاورات کا کیا پتا ہوگا۔ انہوں نے شاید کبھی کاٹ پر بیٹھ کر آلو گوشت نہیں کھایا ہوگا۔ خاص کر جب کہ اس میں پڑوسی کے باغ سے چرا کر نیبو نچوڑا گیا ہو۔ ان کے سامنے بیرے نے پلیٹوں میں نہ جانے کیا لا کر رکھ دیا۔ باتوں میں خیال ہی نہ رہا۔ پھر سے سوال دعا و طریقے پر کرشن چندر، بیدی اور منٹو پر بحث ہونے لگی۔ ان کا خیال تھا میں تکلف میں ان کی تعریف کرتی ہوں تاکہ لوگ مجھے بڑا دریا دل سمجھیں اور میں کہتی تھی میں خدا کی بھی جھوٹی تعریف نہیں کروں گی۔ ان کی کہانیاں میں نے تنقید نگار یا ایک کہانی نگار کی حیثیت سے نہیں ایک انسان کی حیثیت سے دل بہلانے کو پڑھی ہیں۔ کچھ بُری بھی لگی ہیں اور کچھ نشتر بن کر دل میں ترازو ہو گئی ہیں۔

"یہ جذباتیت ہے" انہوں نے رکھائی سے کہا۔

"جذباتیت کیا ہوتی ہے؟" میں نے بھونڈے پن سے کہا وہ سمجھے میں بن رہی ہوں۔ حالانکہ یہ سولہ سال پہلے کی بات ہے اور واقعی میری سمجھ میں بہت سی باتیں نہیں آتی تھیں۔ میں نے بہت سی باتوں کے نامعقول جواب دیے تھے۔ ان کی علمی بزرگی کی قائل ہوتے ہوئے بھی تسلیم نہیں کیا تھا میں نے ان سے یہ بھی نہیں کہا کہ میں کب سے اور کتنی ان کی مختصر سی تحریروں کی مداح ہوں۔ میں نے بہت کم ان کی تعریف میں کہا جو کہا وہ نہایت بے تکی سے سنی ان سنی کہہ گئے۔ ان کی اپنی تخلیقات ان کے لئے اتنی اہم نہیں تھیں۔ کم سے کم مجھے آج یہی اندازہ ہوا کہ وہ خود پرست نہیں۔

وہ ٹھنڈے پن سے کھیلتے گذر گئے

"آپ ڈرامے کیوں لکھتی ہیں؟" انہیں اچانک بم گرانے میں بڑا مزہ آتا تھا۔

"یوں ہی" میں نے لنگڑا سا جواب دیا۔

"میری رائے میں تو آپ ڈرامے لکھنا چھوڑ دیجئے۔ بڑے اسٹ لائنگ ہوتے ہیں کوئی ایکٹ چھوٹا کوئی لمبا۔ سلیقہ سے کتر بیونت کرنے کے بجائے آپ انہیں ہاتھوں سے ٹھونستی ہیں۔" ان کی بوجھل عقابی آنکھوں میں ایذا رسانی کی لذت کا نشہ بھر آیا۔

جی چاہا میز کا سارا کوڑا کرکٹ ان کے اوپر لوٹ دوں اور یہ پلیٹ کے مزے کی پڈنگ ان کے شاندار سوٹ پر لسڑ جائے۔ مگر میں نے جلدی سے بھڑکتے ہوئے رہوار کی لگامیں کھینچ لیں اور ایک گلاس ٹھنڈا پانی اتار کر نہایت نرمی سے کہا۔ "اچھا...... اب نہیں لکھوں گی۔" انہیں ناامیدی سی ہوئی کہ میں نے بحث کیوں کاٹ دی۔

"مکالموں میں آپ کے کافی جان ہوتی ہے" "ارنو" میں نے سوچا۔ یہ میرے مکالمے کتوڑی ہوتے ہیں گھر میں سب ایسے ہی بولتے ہیں میں دوسری زبان کہاں سے لاؤں۔

"برنارڈ شا سے متاثر ہیں؟"

"بے حد" میں نے ایک ڈرامہ میں برنارڈ شا کے یہاں سے پورا کا پورا سین اٹھا لیا ہے کیونکہ مجھے وہ سین بہت پسند آیا تھا۔ اس کا حوالہ بھی نہیں دیا۔ مجھے اپنی آنے والی ذمہ داریوں کا اس وقت تک اندازہ نہیں تھا یہ خبر نہ تھی کہ ایک دن "جواب داری" کرنا ہوگی۔ اصل میں میں نے وہ سین ایک فلمی کہانی کے لئے اڑایا تھا۔"

میں نے سوچا اس سے پہلے میری ٹانگ کھینچیں خود ہی کیوں نہ سر کھول لوں۔ "آپ بھی کے جیروم جیروم ادبی۔ تم بلا اس سے متاثر ہوئے ہوں گے۔" میں نے کہہ تو دیا لیکن اب سوچتی ہوں کہ صرف ایک بات مشترک تھی یعنی دونوں مزاح نگار تھے۔ شاید چڑ کر کہہ دیا ہوگا وہ نہایت ہوشیاری سے ٹال گئے اور اشارے سے بیرے کو بلایا۔ بڑی پریشان صورت بنا کر چاروں طرف دیکھا۔

"معاف کیجئے گا۔" بڑے ادب سے مجھ سے معذرت چاہی پھر سرگوشی میں پطرس سے کچھ کہا۔ وہ ہنسے، زور زور سے سر ہلانے لگا۔

"صاحب! آپ اطمینان رکھو۔ کوئی بات نہیں۔" پطرس نے ہمت بڑھائی۔

"نہیں اگر کوئی اعتراض ہو تو ......" پھر سہم کر چاروں طرف دیکھا

"آپ بڑا صاحب"

"منیجر تو کچھ ...."

"نہیں صاحب منیجر تو کون بولے گا ...... ہم کو بولو ...."

پطرس نے بڑی شکر گزار نظروں سے مجھے دیکھا پھر بالکل اس کے پاس ہونٹ لے جا کر بولے

"ہاں"

"کالی؟" بیرا چکرایا۔

"ہاں! اور نمکین بسکٹ بھی۔" بیرا مجسم سوال سا کبھی مجھے اور کبھی انہیں دیکھنے لگا۔

"کسی کو کانوں کان پتہ نہ چلے ...... شاباش۔"

"نہیں صاحب اطمینان رکھو۔" بھونچکا سا بیرا کافی لینے چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے حیرت زدہ ہو کر پلٹ کر دیکھا جیسے کہتا ہو: "دماغ تو سلامت ہے حضور کا؟" پطرس نے نہایت معنی خیز انداز میں آنکھ ماری بے چارہ گھگیا کر ہنسنے لگا۔

اور مجھے معلوم ہوا پطرس مزاح نگاری نہیں ان کی زندگی میں شرارت اور چلبلا پن ہے۔ ان کی زبان میں چٹخارے ہیں اور برتاؤ میں چلبلا پن ان کے طنز میں تیکھا پن ہے۔ انہوں نے زندگی کا تنگ و تاریک رخ نہیں دیکھا۔ وہ الجھنوں کا شکار نہیں تھے۔ آزاد زندگی کے قائل تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ نئے لکھنے والوں کی تلخی اور جھنجھلاہٹ سے کبیدہ ہو جاتے تھے۔

جسم فروشی اور حرامی بچوں کے سوال کو وہ کچھ زیادہ مہذب نہیں سمجھتے تھے۔ ان دنوں میں کسی سے بھی ملتی تھی۔ "لحاف" کا ذکر چھڑ جاتا تھا میری چڑھ سی ہو گئی۔ پطرس نے لحاف ہی نہیں اور بھی جنسی الجھنوں پر کوئی بحث نہ کی۔

"میں اپنی کہانیوں کا انگریزی میں ترجمہ کرانا چاہتی ہوں۔" میں نے انہیں زمانہ سازیت کے موڈ میں پا کر کہا۔

"کیوں؟" وہ بڑے کھرے پن سے بولے۔ "آپ کی کہانیاں ترجمہ نہ ہوں گی تو کیا انگریزی ادب غریب رہ جائے گا یا شاید آپ کا خیال ہے۔ انگریزی کا جامہ پہن کے تحریر زیادہ بلند ہو جائے گی۔"

پھر جی جلا۔ ایک دم سے یہ انسان اتنا خشک کیوں ہو جاتا ہے۔ "نہیں، یہ بات تو نہیں اصل میں انگریزی میں چھپنے سے پیسے زیادہ ملتے ہیں احمد علی نے ایک کہانی کے مجھے چار پونڈ دلائے تھے۔"

کچھ حجاب سے ہو گئے اور مسکرانے لگے۔ "فکر نہ کیجئے ایک دن لوگ خود ہی اس طرف توجہ دیں گے۔" پھر میں نے فکر نہ کی۔

ایک ایک لمحہ پر لطف گزرا۔ گھنٹوں باتیں کرنے کے بعد بھی ابھی ذہن میں بہت کچھ تھا وہ مجھے چرچ گیٹ اسٹیشن تک چھوڑ گئے۔ میاں وہیں ملازمت تھی۔ اس کے بعد انہوں نے میرے بارے میں ایک مضمون لکھا۔ جو میں نے نہیں پڑھا لوگوں سے ذکر سنے تھے۔ ایک بار دلی جانا ہوا تو دعوت میں بلایا وہاں فیض بھی تھے۔ مگر بڑی چپ چاپ سی محفل تھی جس کا میرے دماغ پر دھندلا سا بھی عکس نہیں۔ کچھ سیاست کی باتیں زیادہ ہو گئیں جو میرے پلّے

نہیں پڑیں۔

سال بھر بعد میں نے نوکری سے استعفا دے دیا۔ شاہد کی نوکری بھی کچھ ڈھل مل سی لگ رہی تھی۔ میں نے پھر نوکری کا ارادہ کیا۔ نہ جانے کیا دل میں سمائی پطرس کو لکھ مارا کہ نوکری چاہیے کہیں بھی ملے۔ چار پانچ سو سے کم میں گزر نہیں ہو گی۔ ہفتہ بھر کے اندر چھ سو روپے کی نوکری مع تقرر کے خط کے مل گئی۔ اس عرصہ میں مجھے ایک فلم کا کام مل گیا تھا اور شاہد کو بھی ڈائرکشن مل گیا۔ میں نے پطرس کو بڑی شرمندگی کا خط لکھا۔ معافی مانگی۔

پھر ملک تقسیم ہو گیا۔ جاگیریں بٹیں، زبان بٹی، ادب بٹا اور ادیبوں کا بھی بٹوارا ہو گیا۔ آدھا کنبہ یہاں آدھا وہاں چلا گیا۔ پطرس ادب کی دنیا سے سیاست کے آسمان پر پہونچ گئے۔

مگر نقوش میں ان کا ایک خط پڑھ کر نہ جانے کیوں محسوس ہوا...... پطرس دور جا کر بھی پاس ہی کھڑے ہیں۔ آج ہی میں نے مضامین پطرس خریدی ہے پڑھ رہی ہوں۔ پڑھ کر پلنگ سے نیچے گرنے کی نوبت تو نہیں آئی مگر میرے دل و دماغ کی تکان سی اتر رہی ہے وہ قلم جو تھکے ہوئے دماغوں کو ایک لمحے کے لئے بھی مہلت بخش دے خاموش ہو چکا مگر وہ میرے تخیل میں وہ بھاری بھاری غلافی آنکھیں آج بھی بے ساختہ مسکرا رہی ہیں۔

اے۔ ایس۔ بی

شوکت تھانوی

"زیڈ۔ اے۔ بی کے بڑے بھائی کو ہم لوگ اے۔ ایس۔ بی کہا کرتے تھے، ورنہ محض بخاری صاحب کہنے میں سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کون سے بخاری صاحب، بڑے یا چھوٹے؟ اور پورا نام لینے میں یعنی احمد شاہ بخاری اور ذوالفقار علی بخاری کہنے میں کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اتنی سی تو ہے اتنے بڑے بڑے نام لے کر اس کی خواہ مخواہ فضول خرچی کیوں کی جائے لہٰذا ریڈیو والے عموماً ان دونوں بھائیوں کو اے۔ ایس۔ بی اور زیڈ۔ اے۔ بی کہنے میں کفایت شعاری کے زریں اصول پر عمل کیا کرتے تھے ـــــ لیکن یہ میں نے بیچ ہی میں ریڈیو کی بات کہاں شروع کر دی۔ ریڈیو سے تو میرا تعلق اس وقت پیدا ہوا ہے جب آل انڈیا ریڈیو کا لکھنؤ اسٹیشن قائم کیا گیا ہے اور میں اے۔ ایس۔ بی سے بحیثیت پطرس کے اس سے پہلے ہی مل چکا تھا یعنی اس وقت جب میں لکھنؤ سے بحیثیت "ناکر" تقریباً ہر ہفتہ آل انڈیا ریڈیو دہلی جایا کرتا تھا۔ اور تاک میں بیٹھا تھا کہ پطرس بخاری سے ملاقات ہوتے ہی ان کو بھی اسی طرح پھانس لوں گا جس طرح مولانا نیاز فتحپوری، عظیم بیگ چغتائی، فرحت اللہ بیگ، اور رشید احمد صدیقی کو پھانس چکا ہوں۔ اپنے ایک مجموعہ مضامین پر مولانا نیاز فتحپوری سے مقدمہ لکھوا چکا تھا۔ اس مجموعے کا نام بحرِ تبسم تھا۔ دوسرے مجموعہ سیلابِ تبسم پر مرزا عظیم بیگ چغتائی سے مقدمہ لکھوایا تھا۔ تیسرے مجموعہ طوفانِ تبسم پر مرزا فرحت اللہ بیگ نے مقدمہ لکھا تھا۔ چوتھے مجموعہ دنیائے تبسم پر رشید احمد صدیقی کا مقدمہ تھا۔ اور اب ایک اور مجموعہ پر مقدمہ لکھنے کو پطرس بخاری پر تکیہ باندھ چکا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ جو اپنی تقریر نشر کرنے دہلی گیا تو اس نئے مجموعے سے مسلح ہو کر گیا اور بخاری صاحب کو ان کے دفتر میں جا لیا۔ بڑے خلوص سے ملے بلکہ مجھ کو کچھ شبہ سا ہونے لگا کہ میں ان سے پہلی مرتبہ نہیں مل رہا ہوں یعنی میں ان سے مرعوب ہونا چاہتا تھا اور وہ اس کا موقع ہی نہ دیتے تھے۔ ہر چند کہ وہ اس وقت ڈپٹی کنٹرولر براڈکاسٹنگ کی کرسی پر بیٹھے تھے، مگر مجھ کو اس سے کیا۔ میں تو ایک عظیم مزاح نگار کے سامنے ان کے ایک عقیدت مند کی حیثیت سے حاضر تھا۔ اور ان کی عظمت کا احساس مجھ پر طاری تھا۔ جس کو وہ اپنے انتہائی یگانگت اور مساوات کے برتاؤ سے غیر محسوس بنائے دیتے تھے۔ آخر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں حرفِ مطلب زبان پر لایا اور بخاری صاحب سے اپنے نئے مجموعہ مضامین پر مقدمہ لکھنے کی درخواست کی تو بڑی خندہ پیشانی سے بولے

"یہ کیا مقدمہ بازی لے بیٹھے آپ؟"

میں نے عرض کیا: "جی ہاں یہ چھوٹا منہ بڑی بات تو ضرور ہے مگر میں آپ سے وعدہ لیے بغیر ٹلنے والا نہیں ہوں۔"

مجھ کو ہنستی ہوئی آنکھوں سے گھورا۔ پھر سر پر ہاتھ پھیرا اور گویا عاجز آ کر مسکراتے ہوئے بولے: "اگر آپ اپنے مقدمہ نگاروں کی ٹیم ہی مکمل کرنا چاہتے ہیں تو بہتر ہے لکھ دوں گا مقدمہ۔"

یہ وعدہ لے کر میں بڑے فاتحانہ انداز سے واپس آیا مگر اس ملاقات کے بعد ہی حالات کچھ کے کچھ ہو گئے۔ آل انڈیا ریڈیو نے لکھنؤ میں بھی

پٹنا اسٹیشن کھول دیا اور اس اسٹیشن کے ڈائریکٹر جگل کشور مہرا اور پروگرام ڈائریکٹر ملک حبیب احمد نے اپنے محکمہ کو نہ جانے کیا پٹی پڑھائی کہ مجھ کو ابھی صحافت چھوڑ کر ریڈیو سے وابستہ ہو جانا پڑا اور اس کے چند ہی دن بعد میرا وہ مسودہ جو میں بخاری صاحب کے پاس چھوڑ آیا تھا مجھ کو ان کے اس خط کے ساتھ واپس مل گیا کہ "اب جبکہ آپ کو ریڈیو میں ایک منصب حاصل ہو چکا ہے عافیت کا تقاضا یہی ہے کہ آپ مجھ سے مقدمہ نہ لکھوائیں اور میں مقدمہ نہ لکھوں" بات بھی ٹھیک تھی لہٰذا یہ ارمان دل کا دل ہی میں رہ گیا اور بقول بخاری صاحب کے میرے مقدمہ نگاروں کی ٹیم مکمل نہ ہو سکی۔ اب بخاری صاحب محکمے کے افسر اعلیٰ تھے اور میں محکمہ کا ایک ادنیٰ کارپرداز۔ لہٰذا جب کبھی وہ لکھنؤ کے اسٹیشن کے معائنہ کے لئے تشریف لے آتے تو میں نے ان سے واقف کرانے کی کوشش کی مگر انہوں نے عمداً گھیر گھار کر اس کوشش کو ناکام بنا دیا یہ ان کی عالی ظرفی تھی کہ وہ اس توجہ سے کام لیتے رہے گویا اپنے عہدہ کا دھیان تھا اور میں ان حدود سے آگے نہ بڑھتا تھا۔ کچھ دن کے تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ بخاری صاحب کے جس سلوک کو میں اپنے ساتھ خصوصیت سمجھتا تھا وہ ہر ایک کے لئے عام تھا۔ ان کا طریقہ ہی یہ تھا کہ سرکاری اور محکمہ جاتی کام کے وقت وہ نہایت بھاری بھرکم قسم کے سڑے ہوئے افسر بنے رہتے تھے اور کام ختم ہوتے ہی نجی صحبتوں میں ان ہی سب کے بے تکلف دوست بن جایا کرتے تھے جن پر ابھی تھوڑی دیر پہلے ان کا رعب قائم رہ چکا تھا۔ لطیفے سنا رہے ہیں لطیفے سننے کی فرمائش کر رہے ہیں۔ بات سے بات پیدا کر رہے ہیں ہنس رہے ہیں اور ہنسا رہے ہیں۔ ایک دن اسی قسم کی نجی صحبت میں ہنس بول رہے تھے کہ ایک بھولی بسری بات یاد آ کے بیٹھے بیٹھے میرے قریب آ کر سرگوشی کے انداز میں بولے۔

"مجھ کو بری کرنے کے بعد آپ نے وہ مقدمہ کس پر دائر کیا؟"

میں نے کہا: "کسی پر نہیں۔ وہ مجموعہ بغیر مقدمہ کے چھپ گیا۔"

کہنے لگے: "اور میری یہ سزا بحال رہی کہ میں اسے نہ پڑھ سکوں۔"

میں کتاب پیش نہ کرنے پر ابھی پوری طرح نادم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ بڑی معصومیت کے ساتھ پوچھا: "آخر لوگ مقدمے لکھواتے ہی کیوں ہیں۔ مجھے تو یہ حرکت کچھ ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے کوئی کسی کی انگلی پکڑ کر ٹہل رہا ہو بلکہ انگلی پکڑا کر سیر دیکھنے گیا ہو۔"

میں نے اقرار کیا کہ "جی ہاں میں اس حماقت کو سمجھ چکا ہوں اور اب اس مقدمہ بازی کے چکر میں نہ پھنسوں گا۔"

بڑی سنجیدگی سے بولے: "اللہ تعالیٰ آپ کو استقامت دے۔"

کچھ ہی دن بعد مجھ کو لاہور سے پنچولی آرٹ پکچرس والوں نے طلب کر لیا اور میں نے ریڈیو سے علیحدگی کے وقت بخاری صاحب کو ایک الوداعی خط لکھا جس کا جواب مجھ کو فوراً مل گیا کہ:۔

"امتیاز (سید امتیاز علی تاج) کے بعد آپ کو بھی پنچولی اسٹوڈیو کی ہی آئی۔ خداوند کریم آپ کو صحت کلی عطا فرمائے۔ آپ جا رہے ہیں خدا حافظ۔ ریڈیو کے دروازے ہر وقت آپ کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ دروازہ صرف جانے کے لئے نہیں آنے کے لئے بھی ہوتا ہے۔"

اور جب پنچولی آرٹ پکچرس سے گزیٹڈ افسر بننے کے شوق میں سونگ پبلسٹی آفیسر ہو کر میں پھر لکھنؤ آ گیا تو بخاری صاحب ڈپٹی کنٹرولر نہیں بلکہ کنٹرولر براڈکاسٹنگ کی حیثیت سے لکھنؤ کے دورے پر آئے اور مجھے خاص طور پر ملنے کے لئے بلا بھیجا۔ میں نے اپنی تازہ کتاب شیش محل پیش کی اور جب دوسرے دن ریڈیو والوں نے ان کے ساتھ ہی مجھ کو بھی لنچ پر مدعو کیا تو میری صورت دیکھتے ہی بولے:۔

"ساری رات شیش محل کی سیر کی ہے نشہ ابھی تک باقی ہے۔ کیسے کیسے بھرپور معرکے

> ہی جا بجا — ہزاروں سلام پہنچیں اس خاتونِ مشرق کو جو احسان کے بچوں کی ماں تک ہے۔
> احسان کی رفیقۂ حیات ہونا گزیر گفتار — اور وہ افسر بیربل کے لئے کیا کہا جائے کہ بچپن سے
> ان کو دیکھ رہے ہیں مگر اب بھی آپ ہمارے بارے نظر آتے ہیں معلوم نہیں یہ لوگ فریجیڈیئر
> میں بیٹھ کر عمر ایک جگہ قائم رکھتے ہیں یا مصری ممی کا لانے والا مسالا اپنے زندہ جسم پر لگاتے
> ہیں۔

اور مجھ کو اس تبصرے سے زیادہ خوشی اس کتاب کی رائلٹی وصول کرتے وقت بھی نہ ہوئی تھی اتنے بڑے مزاح نگار کی یہ سند میرے لکھنے کے لئے بہت کافی تھی۔

سونگ پبلسٹی کے محکمہ میں چار پانچ سال تک گانے بجانے کی گزیٹڈ افسری کرکے میں پھر اپنی اوقات پر آ گیا۔ اور پھر آرٹ پکچرس سے پھر وابستہ ہو گیا مگر ۱۹۴۷ء ہی میں جب قیام پاکستان کے بعد بخاری صاحب بمبئی سدھارے اور ریڈیو پاکستان کی داغ بیل پڑی تو ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل جو نے بخاری یعنی سید ذوالفقار علی بخاری نے مجھ کو پروانۂ تقرر دیتے ہوئے کہا کہ "یہ فیصلہ آپ خود کیجئے کہ یہاں آپ کیا کریں گے اپنے لئے کام خود پیدا کیجئے۔" چنانچہ میں اپنے لئے کام پیدا کرنے میں اس طرح مصروف ہو گیا کہ اپنے کو بحیثیت قاضی جی کے پیدا کرنا شروع کر دیا۔ اے ایس بی ڈائریکٹر جنرل آل انڈیا ریڈیو کے عہدے سے اپنے آپ کو سبکدوش کرکے گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل کی حیثیت سے دلی سے لاہور آ چکے تھے۔ اور اب ان کے بنگلے پر شام کی نشستیں ہوا کرتی تھیں جن میں ڈاکٹر تاثیر، مولانا سالک، صوفی تبسم مع اپنے حقے کے، جگل کشور مہرا جو مشرف بہ پاکستان ہو چکنے کے بعد مشرف بہ اسلام ہونے کے ارادے کر رہے تھے۔ سید رشید احمد، مولانا چراغ حسن حسرت، اور سید امتیاز علی تاج کے اجتماع رہتے تھے جو نہیں آتا تھا اس کو بخاری صاحب خود جا کر پکڑ لاتے تھے جو آ جاتے تھے ان کو رات گئے بلکہ کبھی کبھی صبح ہونے سے قبل اپنی کار پر گھر چھوڑنے جاتے تھے اور یہ نصیحت کرتے جاتے تھے کہ رات کو خواہ کبھی رہو مگر صبح اپنے بستر ہی سے اٹھو۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ رات کو تین بجے آئس کریم کھانے کا دورہ پڑا اور کوشش کی گئی کہ پچھلے پہر آئس کریم والوں کو جگا کر بھی ہم اسی وقت چلا جائے اور حیرت ہے کہ اس وقت بھی ان کو کہیں نہ کہیں آئس کریم مل ہی گئی اور آئس کریم والے بچے جانے ڈھونڈ ہی لئے کہیں نہ کہیں سے۔

ریڈیو پاکستان لاہور کے اسٹیشن ڈائریکٹر جگل کشور مہرا پاکستان کے زندہ باد ہونے کے بعد خود بھی مردہ باد ہو کر رہ سکتے تھے کہ بھارت چلے جاتے، اردو اور لاہور کی محبت میں رہ آ پڑے پاکستان میں گھر بنانے کیوں ان کو پتا تھا جگل کشور مہرا ہوتا پاکستان میں کچھ چند سال گزارنا دشوار ہے ہر چند کہ بخاری نے ان کو سمجھایا دوسرے دوستوں نے بھی اس جلد بازی سے روکا مگر ہوا یہی کہ ایک دن چند مخصوص احباب کی موجودگی میں بخاری صاحب کے گورنمنٹ کالج والے بنگلے ہی میں مولانا غلام مرشد کے دستِ حق پرست پر مشرف بہ اسلام ہو کر شہادت پڑھے اور مولانا غلام مرشد سے اس کا تفصیل بلکہ تفصیل سے بھی کچھ زیادہ ترجمہ سمجھ کر گئے اور عین اس وقت جب وہ جگل کشور سے یک ایک احمد سلمان بن چکے تھے اسی جگہ ان کی ترقی کے احکام موصول ہوئے کہ وہ ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان مقرر کر دئے گئے۔ اس کے بعد ہی دوسرا شرعی اجتماع خود احمد سلمان صاحب کی کوٹھی پر اس وقت ہوا جب ان کے نکاح کا مرحلہ در پیش تھا۔ اور محمود نظامی صاحب کے ذمہ تھا قاضی کو بلانا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک جو اما منٹ ادھوانا کو نہ جانے کہاں سے پکڑ لائے۔ بخاری صاحب نے ان مولانا کو بڑے غور سے دیکھا اور میرے کان میں کہا کہ "نکاح کے لئے قاضی اور چھوہارے دو چیزیں ضروری ہوتی ہیں نظامی ان دونوں چیزوں کو ملا کے لے آیا ہے۔" اس تقریب میں سید ذوالفقار علی بخاری دولہا کے ولی بنے اور میں دلہن کا ولی۔ ہم دونوں مہر کے تعین پر تھوڑا بہت جھگڑ کر آخر تصفیہ تک

پہنچ ہی گئے۔ بخاری صاحب صرف تماشائی بنے بیٹھے رہے۔ چھوٹے بخاری وکیل بنے، گواہ میں بنا اور دوسرے گواہ محمود نظامی صاحب اور جب دلہن سے پوچھ کر سب لوگ قاضی صاحب کے پاس گئے تو کچھ نہ پوچھئے کہ ان کو محض یہ سمجھانے میں کتنے لمحے لگے ہیں کہ دلہن کا نام سلمان نہیں بلکہ نفیسہ ہے اور دولہا کا نام اکمل نہیں بلکہ سلمان ہے اس کے بعد بھی یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ قاضی صاحب نے ان دونوں میں سے کس کو دولہا اور کس کو دلہن سمجھ کر نکاح پڑھایا ہے بہرحال یہ طے ہے کہ نکاح ان ہی دونوں کا ہوا تھا۔ درحقیقت یہ بات ان ہی دونوں پر چھوڑ دی گئی تھی کہ اپنا دولہا دلہن ہونا خود آپس میں طے کرتے رہیں۔ البتہ جو خطبہ بعد میں پڑھا ہے اس کے متعلق بخاری صاحب کا بیان یہ تھا کہ یہ خطبہ نکاح کا نہیں بلکہ جمعہ کا تھا۔ اس خطبے کے بعد بخاری صاحب نے دور سے ایک چھوہارا ان مولوی صاحب کو دکھاتے ہوئے کہا: "مولانا چھوہارا" اور مولانا نے اپنا پوپلا منہ چلاتے ہوئے کہا: "جی بسم اللہ" بخاری صاحب نے "تبارک اللہ" کہہ کر وہ چھوہارا کھا گئے۔

اس کے بعد ہی یہ شیرازہ منتشر ہوگیا۔ ریڈیو پاکستان کا ہیڈ کوارٹر کراچی چلا گیا۔ چھوٹے بخاری صاحب معہ رشید احمد صاحب اور احمد سلمان صاحب کے کراچی چلے گئے۔ بڑے بخاری صاحب یو این او میں جا پہنچے میں لاہور ہی میں رہ گیا اس سناٹے میں اپنے کو الجھانے کے لئے۔ کئی سال بعد کراچی میں اپوا کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد ہوا۔ بخاری صاحب ان دنوں امریکہ سے کراچی آئے ہوئے تھے۔ لہٰذا میں نے اس مشاعرے کی دعوت کو فوراً قبول کر لیا کہ کراچی میں بخاری صاحب سے ملاقاتیں رہیں گی۔ سلمان صاحب بھی وہیں ہیں۔ رشید صاحب اور چھوٹے بخاری صاحب بھی وہیں ہیں۔ ایک مرتبہ پھر پچھلی صحبتیں گرم ہو جائیں گی۔ اور کراچی پہنچ کر جب یہ معلوم ہوا کہ اس مشاعرے کی صدارت بھی بخاری صاحب ہی کر رہے ہیں تو اور بھی خوشی ہوئی۔ مشاعرے میں پہنچنے میں قدرے دیر ہوگئی۔ چنانچہ جب میں پہنچا ہوں تو بخاری صاحب فی البدیہہ صدارتی خطبہ ارشاد فرما رہے تھے اور ذکر کچھ میرا ہی تھا کہ: "اس مشاعرے میں شرکت کے لئے شوکت تھانوی بھی آئے ہوئے ہیں جن سے میں یہ پوچھ پوچھ کر تھک چکا ہوں کہ آخر وہ کس تھانے یا کس تھان سے تعلق رکھتے ہیں مگر یہ ان کا کوئی ایسا گہرا راز ہے کہ وہ کسی طرح اسے کھولنا گوارا نہیں کرتے۔" ——— اس مشاعرے کے بعد دوسرے یا تیسرے دن بخاری صاحب نے اپنے گھر پر چند نیازمندوں کو پنچ دیا۔ اس میں شرکت کے لئے جب میں پہنچا تو بخاری صاحب محض ایک نکر پہنے باقی مہاتما گاندھی بنے دھوپ میں بیٹھے تھے ان کو دیکھ کر دل کو ایک دھچکا سا پہنچا ہڈیوں کا ایک نحیف و نزار ڈھانچہ تھا ان کے قلب کے دورے کی اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی آج ان کا یہ لاغر جسم دیکھ کر بیساختہ دل سے ان کی صحت اور درازیٔ عمر کی دعائیں نکلنے لگیں مگر بخاری صاحب نے اپنے لطائف و ظرافت سے بہت جلد اس اضمحلال کو ختم کر دیا۔ البتہ کھانے کی میز پر جب کھانا کھا چکنے کے بعد میں نے ایک ڈش سے جیلی اپنی پلیٹ میں نکالی ہے تو بخاری صاحب دوڑ پڑے: "یہ نہ لینا کمبخت ورنہ مر جاؤں گا میں" معلوم ہوا کہ وہ صرف "ناشپاتی" کے ابلے ہوئے چند ٹکڑے اور یہ جیلی ہی کھا سکتے ہیں یہی ان کی غذا ہے اور یہی غذائیت سے بے نیاز غذا کھا کھا کر وہ جی رہے ہیں۔ کچھ نہ پوچھئے کہ کتنا ترس آیا ہے ان پر کئی مرتبہ ارادہ ہوا کہ ان سے کہوں کہ اب آپ امریکہ نہ جائیں مگر میں ان پر وہ خطرہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا جو خود محسوس کر رہا تھا۔ آخر پچھلے سال جب میں ریڈیو پاکستان سے سبکدوش ہو کر پھر صحافت میں آگیا اور روزنامہ جنگ کی ادارت کے سلسلہ میں مستقلاً کراچی کا ہو گیا اور آخری مرتبہ بخاری صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے ہمت کر کے ان سے کہہ ہی دیا کہ اب آپ کراچی سے نہ جائیے۔ اور اس کا جواب بھی سن لیا کہ: "اگر آپ اس کی ضمانت دیں کہ میں کراچی میں رہ کر نہ مروں گا تو میں امریکہ جانے کا ارادہ ملتوی کرنے کو تیار ہوں۔" چنانچہ وہ پھر امریکہ گئے اور اب کبھی امریکہ سے واپس نہ آئیں گے اب کراچی میں کوئی ان کا انتظار نہ کرے گا اب کوئی ان سے اصرار نہ کرے گا کہ امریکہ نہ جائیے ———

پیر و مرشد

کنہیا لال کپور

پطرس میرے استاد تھے۔ ان سے پہلی ملاقات تب ہوئی۔ جب گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے انگلش میں داخلہ لینے کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انٹرویو بورڈ تین اراکین پر مشتمل تھا۔ پروفیسر ڈکنسن (صدر شعبہ انگریزی)، پروفیسر مدن گوپال سنگھ اور پروفیسر اے ایس بخاری۔ گھر سے خوب تیار ہو کر گئے تھے کہ سوالات کا کرارا جواب دے کر بورڈ کو مرعوب کرنے کی کوشش کریں گے۔ بخاری صاحب سے جیسے سوال کئے گئے پسینے چھوٹنے لگے جونہی کمرے میں داخل ہو کر آداب بجا لائے انہوں نے ناک پر ایک سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا "آپ ہمیشہ اتنے ہی لمبے ہوتے ہیں یا آج خاص اہتمام کر کے آئے ہیں؟" لاجواب ہو کر ان کے منہ کی طرف دیکھنے لگے

"آپ شاعر ہیں؟"

"جی نہیں"

"دیکھنے میں تو آپ مجنوں لاہوری نظر آتے ہیں"

پروفیسر مدن گوپال سنگھ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا "بہ خدا ان کی شکل خطرناک حد تک مجنوں گورکھپوری سے ملتی ہے" پھر میری جانب متوجہ ہوئے "آپ کبھی مجنوں گورکھپوری سے ملے ہیں؟"

"جی نہیں"

"ضرور ملئے۔ وہ آپ کے ہم قافیہ ہیں"

پھر پوچھا "یہ آپ کے سرٹیفکیٹ میں لکھا ہے کہ آپ کتابی کیڑے ہیں۔ جانتے ہو کتابی کیڑا کسے کہتے ہیں؟"

"جی ہاں۔ جو شخص ہر وقت مطالعہ میں منہمک رہتا ہے"

"کتابی کیڑا وہ ہوتا ہے جو کتاب کی بجائے قاری کو کھا جاتا ہے"

پروفیسر ڈکنسن نے بخاری صاحب سے دریافت کیا "ان کے بی اے میں کتنے نمبر آئے تھے؟"

انہوں نے میرا ایک سرٹیفکیٹ پڑھتے ہوئے جواب دیا "۳۲۹۔ فرسٹ ڈویژن"

"تو پھر کیا خیال ہے؟" پروفیسر مدن گوپال سنگھ نے پوچھا۔

بخاری صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا "داخل کرنا ہی پڑے گا۔ جو کام ہم سے عمر بھر نہ ہو سکا، وہ انہوں نے کر دیا۔"

پروفیسر ڈکنسن نے چونک کر پوچھا "کون سا ہم بخاری صاحب ؟"
سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے فرمایا "یہی بی اے میں فرسٹ ڈویژن لیے گا!"

دوسرے دن کلاس روم میں گئے۔ بخاری صاحب کا ان دنوں عالم شباب تھا۔ پینتیس سال کے قریب عمر ہوگی۔ دراز قد، گھنی بھنویں، سرخ و سفید رنگت۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ لمبوترا چہرہ۔ شکل و شباہت کے اعتبار سے وہ افغانی یا ایرانی دکھائی دیتے تھے۔ ریشمی گاؤن (GOWN) پہن کر کلاس روم میں آتے تھے۔ حاضری سے بغیر لیکچر شروع کیا کرتے۔ عموماً لیکچر سے پہلے اپنے عزیز شاگردوں سے دو ایک چٹکیاں ضرور لیا کرتے تھے۔ بلراج ساہنی (مشہور ہندوستانی اداکار) ان کا عزیز ترین شاگرد تھا۔ اکثر ایک آدھ فقرہ اس پر کستے تھے "کیا بات ہے ساہنی! آج کچھ کھوئے کھوئے نظر آتے ہو۔ جانتے ہو جب کوئی نوجوان اداس رہتا ہے تو اس کی اداسی کی صرف دو وجہیں ہوتی ہیں۔ یا وہ عشق فرمانے کی حماقت کر رہا ہے یا اُس کا بٹوہ خالی ہے۔"

لیکچر کسی کتاب یا نوٹس (NOTES) کی مدد کے بغیر دیتے تھے۔ انگریزی کا تلفظ ایسا تھا کہ انگریزوں کو رشک آتا تھا۔ فرسودہ یا روائتی انداز بیان سے چڑ تھی۔ غلطی سے بھی کوئی عامیانہ فقرہ ان کی زبان سے نہیں نکلتا تھا۔ "ڈرامہ" پڑھانے میں خاص کمال حاصل تھا۔ "ہیملٹ" HAMLET پڑھا رہے ہیں تو چہرے پر وہی تاثرات پیدا کر لیں گے جو موقع محل کی عکاسی کرتے ہوں۔ کنگ لیر (KING LEAR) پڑھاتے تو معلوم ہوتا کہ طوفان میں گھرا ہوا بوڑھا شیر غرا رہا ہے۔ شیکسپیئر کے مشہور کرداروں کی تقریریں زبانی یاد تھیں۔ انہیں اس خوبی سے ادا کرتے کہ سامعین کو پھریری سی آجاتی۔

حافظہ غضب کا پایا تھا۔ اگر جب کوئی نئی کتاب پڑھتے تو دوسرے دن کلاس روم میں اس کا خلاصہ اتنی صحت کے ساتھ بیان کرتے کہ لیکچر سننے کے بعد محسوس ہوتا کتاب انہوں نے نہیں ہم نے پڑھی ہے۔

ایک بار فرانسیسی فلسفی برگساں کی کتاب "LAUGHTER" (مزاح) کی وضاحت فرماتے وقت انہوں نے فلسفۂ مزاح سے متعلق بہت دلچسپ باتیں بتائیں۔ فرمایا "انسان ہی صرف ہنسنے والا جانور ہے۔"

میں نے کہا "جناب بندر بھی ہنستا ہے۔"

ہنس کر فرمایا "کیونکہ وہ انسان کا جدامجد ہے۔"

بیان کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا "ہنسنے کے لئے عقل کا ہونا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیوقوف کو لطیفہ سنانا تضیع اوقات ہے۔ اگر ایک آدمی کیلے کے چھلکے سے پھسل پڑے تو دوسرے اس پر ہنستے ہیں لیکن اگر ایک بھینس کیلے کے چھلکے سے پھسل کر کیچڑ میں گر پڑے تو باقی بھینسیں اس پر کبھی نہیں ہنسیں گی۔ کیونکہ بھینس کے پاس عقل نہیں ہوتی تبھی تو یہ محاورہ ایجاد ہوا "عقل بڑی یا بھینس"...... ہمدردی یا ترحم کا جذبہ ہنسی کے لئے زہر قاتل کا درجہ رکھتا ہے۔ اگر کوئی شخص سائیکل چلاتے وقت گر پڑے تو آپ اس پر ہنسیں گے لیکن اگر اسے سخت چوٹ آئی ہو تو آپ کبھی نہیں ہنس سکیں گے۔ اگر ایک ریلوے گارڈ گاڑی چلنے سے پہلے ہر مسافر کو سخت سست کہے۔ کھڑکی میں سے باہر جھانکنے والے ہر بچے کو سرزنش کرے ہر بوڑھے کو فہمائش کرے کہ اسے ڈبے میں فوراً داخل ہو جانا چاہیئے۔ اور خود چلتی گاڑی میں سوار ہوتے وقت گر پڑے تو تمام مسافر قہقہے لگا کر اس کی بے بسی کا مذاق اڑائیں گے کیونکہ ان میں سے کسی کو اس کے ساتھ ہمدردی نہیں ہوگی۔

ایک ہی چیز المیہ اور طربیہ ہو سکتی ہے سوال صرف ہمدردی کا ہے۔ فرض کیجئے بھرے میلے میں کوئی شخص یہ اعلان کرے کہ میری بیوی کھو گئی ہے تو لوگ اس پر ضرور ہنسیں گے۔ یہ بات دوسروں کے نقطۂ نگاہ سے طربیہ اور خود اس شخص کے نقطۂ نظر سے المیہ ہے..... مزاح بالکل اسی

طرح تیار کیا جا سکتا ہے۔ جیسے صابن یا خوشبودار تیل۔ قارئین بھی یہ کہ دونوں چیزوں میں مطابقت پیدا کر دیکھئے، مثال کے طور پر یہ کہنے کی بجائے کہ ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں۔ یہ کہئے کہ ہم طرفدار ہیں غالب کے سخن فہم نہیں۔ مزاح پیدا ہو جائے گا۔

بخاری صاحب اچھے تقریر کرنے کے فن میں امام کا درجہ رکھتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ادبی مجلس میں کرسیٔ صدارت اور سر عبدالقادر لازم و ملزوم تھے۔ یونیورسٹی ہال میں ایک ادبی مباحثہ ہو رہا تھا۔ موضوع زیر بحث تھا THE PROPER STUDY OF MANKIND IS WOMAN. (صنف نازک ہی مطالعہ کا صحیح موضوع ہے) جب پروفیسر دیوان چند شرما، خلیفہ شجاع الدین، تقاریر کر چکے تو سر عبدالقادر نے بخاری صاحب کو اسٹیج پر تشریف لانے کو کہا۔ سامعین ہمہ تن گوش ہو گئے، انہیں بجا طور پر توقع تھی اب جنسی مذاق کے فوارے چھوٹیں گے۔ بخاری صاحب جھجکتے جھجکتے اسٹیج پر آئے۔ صاحب صدر کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ سامعین پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی اور فرمایا۔ "صاحب صدر! میں بدقسمتی سے پروفیسر واقع ہوا ہوں۔ جس کالج میں پڑھاتا ہوں وہاں مخلوط تعلیم کا رواج ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ کلاس روم میں طلباء کی توجہ کا مرکز صنف نازک ہی ہوتی ہے۔ کوشش کے باوجود میں طلبہ کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتا۔ بسا اوقات مجھے صنف نازک پر رشک سے تکلیف دہ حالات ظاہر ہے طلباء یہ نکتہ بخوبی سمجھتے ہیں کہ صنف نازک ہی مطالعہ کا اصل موضوع ہے . . . صاحب صدر! صنف نازک کے مطالعہ کے بغیر، کس کا مطالعہ ممکن ہے۔ کیا آپ MAGNETISM (مقناطیسیت) کا مطالعہ صنف نازک کے بغیر مکمل سمجھیں گے۔ جب کہ آپ جانتے ہیں کہ عورت سے زیادہ پرکشش ہستی خداوند تعالیٰ نے پیدا نہیں کی۔ کیا آپ HEAT (حرارت) کا مطالعہ کرنے میں عورت کو نظر انداز کر سکتے ہیں جب آپ جانتے ہیں کہ محفلوں کی گرمی عورت کی موجودگی کی مرہون منت ہے کیا آپ ELECTRICITY (برقیات) کا مطالعہ کرتے وقت عورت کو نظر انداز کر سکتے ہیں جب آپ کو معلوم ہے کہ حوا کی بیٹیاں بادل کے بغیر بجلیاں گرا سکتی ہیں . . . . صاحب صدر! صنف نازک آرٹ کے مطالعہ کے لئے ناگزیر ہے۔ اگر لیونارڈو دا ونچی اور مائیکل اینجلو نے عورت کے خدوخال کو قریب سے نہ دیکھا ہوتا تو کیا وہ ان لافانی تصاویر اور مجسموں کی تخلیق کر سکتے جن کا شمار عجائبات عالم میں ہوتا ہے کیا کالی داس، شکنتلا، شیکسپیئر، روزالنڈ (ROSALIND) اور دانتے بیٹریس (BEATRICE) کا تصور بھی ذہن میں لا سکتے۔ اگر انہوں نے صنف نازک کے مطالعے میں شب و روز نہ گزارے ہوتے . . . . . صاحب صدر! صنف نازک نے موسیقاروں سے نغمے، شاعروں سے مثنویاں اور غزلیں، اور رقاصوں سے کتھک اور کتھا کلی کی تخلیق کرائی۔ اگر آج فنون لطیفہ ختم ہو رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم مطالعہ کے اصل موضوع سے بھٹک گئے ہیں۔ ہم ان چیزوں کا مطالعہ کر رہے ہیں جن سے بجلی کے پنکھے، بسکٹ اور دیسی گھی، وہ کیٹرپلر تو معرض وجود میں آ سکتے ہیں لیکن "میگھ دوت" "وینس" "اندھی پر رقص" کی توقع کرنا بے کار ہے۔"

مرحوم تقریر نہیں سحر کیا کرتے تھے۔ ان کی ساحری کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے۔ ۱۹۳۲ء میں انہوں نے اپنے ایک عزیز شاگرد پروفیسر ایل مہتہ کے اصرار پر ڈی اے وی کالج لاہور میں گالزوردی کے ناول A MAN OF PROPERTY پر لیکچر دیا۔ پروفیسر مہتہ ان دنوں ڈی اے وی کالج میں ملازم تھے۔ مارچ کا مہینہ تھا مطلع ابر آلود تھا۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ لاہور کے کالجوں کے سینکڑوں طلباء و طالبات لیکچر سننے کے لئے ڈی اے وی کالج کے سائنس تھیٹر میں اکٹھے ہوئے۔ بخاری صاحب نے لیکچر کی تمہید اس فقرے سے کی۔ "خواتین و حضرات! ڈی اے وی کالج میں میرا پہلا اور آخری لیکچر ہے وجہ یہ کہ اس کالج کے طلباء کا انگریزی کا تلفظ اتنا عجیب واقع ہوا ہے کہ جب وہ مجھے انگریزی میں بولتے ہوئے سنیں گے۔ تو یہ سمجھیں گے میں انگریزی کی بجائے فرانسیسی یا جرمن میں تقریر کر رہا ہوں"۔ مرحوم کو انگریزی فکشن (ناول) پر حیرت انگیز عبور حاصل تھا۔ جب وہ گالزوردی کے ناول کی وضاحت کر رہے تھے تو معلوم ہوتا تھا خود مصنف اپنی تخلیق کا تجزیہ کر رہا ہے۔ طلباء ان کے لیکچر کے NOTES لے رہے تھے۔ بخاری صاحب

کی فصاحت اور بلاغت کا یہ عالم تھا کہ وہ ایک خوب صورت فقرے کے بعد دوسرا وضع کرتے تھے، اور طلبا تذبذب میں پڑ جاتے کہ کون سا فقرہ نوٹ کریں اور کون سا نظر انداز کریں۔ یکلخت ابر و بارش تیز ہو گئی۔ بجلی ایک دم جو زور سے کڑکی تو کمرے کی تمام بتیاں گل ہو گئیں۔ بخاری صاحب نے سلسلہ تقریر منقطع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ گھپ اندھیرے میں اپنے اسی شگفتہ انداز میں تقریر کرتے رہے اور طلبا اندھیرے میں ان کے فقرے نوٹ کرنے کی کوشش میں محو رہے۔ کہیں سے شور و غل، چیخ و پکار کی آواز نہیں آئی۔ کمرے میں مکمل سناٹا تھا۔ کوئی دس پندرہ منٹ کے بعد بتیاں پھر روشن ہوئیں۔ بخاری صاحب نے ایک خفیف مسکراہٹ کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا اور تقریر جاری رکھی۔ اس تقریر کے سننے کے بعد اکثر طلبا کا یہ ردِ عمل تھا کہ جو باتیں ان کے اپنے پروفیسر دو سال میں نہیں بتا سکے وہ بخاری صاحب نے ایک گھنٹے کے دوران میں بتا دیں۔ اسی تقریر سے متعلق مجھے ان کا ایک فقرہ یاد ہے۔ فرمایا "مشہور انگریز نقاد ڈاکٹر بیکر (BAKER) نے انگریزی ناول پر آٹھ جلدیں لکھی ہیں جن کا مجموعی وزن کوئی چار سیر ہوگا۔ ایک اور انگریز نقاد جے بی پریسٹلے (J. B. PRIESTLY) نے ناول پر ایک کتابچہ لکھا جس کا وزن چار تولے ہوگا۔ میری رائے میں اگر بیکر کی تمام جلدیں ایک پلڑے میں رکھ دی جائیں اور پریسٹلے کا کتابچہ دوسرے میں تو یقیناً پریسٹلے کا پلڑا بھاری رہے گا۔"

سناتن دہرم کالج میں ایک ادبی مباحثہ ہوا۔ بخاری صاحب وہاں صاحبِ صدر کی حیثیت سے موجود تھے۔ موضوع زیر بحث تھا۔۔ FRAITLY, THY NAME IS WOMAN (عورت تمہارا دوسرا نام کمزوری ہے) لاہور کے بہترین مقرر اس مباحثے میں حصہ لے رہے تھے۔ ان میں سے اکثر یورپ کی سیر کر چکے تھے۔ انہوں نے اپنی تقاریر میں یورپین عورتوں کو خاص طور پر آڑے ہاتھوں لیا۔ کچھ نے ہندوستان کی تاریخ سے مثالیں دے کر ثابت کیا کہ عورت نے ہر گام پر مرد کو دھوکا دیا ہے۔ سکھ مہارانی "جنداں" کا ذکر کیا گیا۔ حوا کی کمزوری کی طرف بھی بار بار اشارے کئے گئے۔ بحث کے اختتام پر بخاری صاحب نے فرمایا "میں نے مقررین کے دلائل بڑے غور سے سنے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کے دلائل صحیح اور نتائج غلط ہیں۔ اگر یہ ٹھیک ہے کہ عورت مرد کو ہمیشہ گمراہ کرتی رہی ہے تو میرے خیال میں یہ مرد کی کمزوری اور عورت کی شہ زوری ہے .... حالانکہ میں نے بھی یورپ کی سیر کی ہے لیکن عورتوں سے متعلق میرا تجربہ اتنا وسیع نہیں جتنا میرے چند دوستوں کا جنہوں نے یورپین عورتوں کی کمزوری کا بیان چٹخارے لے لے کر کیا...... کہا گیا کہ یورپ میں عورت شکاری اور مرد شکار ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہمیں ہر شیر اور عقاب کو کمزور سمجھنا چاہیئے۔ دراصل بات یہ ہے خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد۔ نہ ہر عورت کانچ کی چوڑی ہے اور نہ ہر مرد فولاد کا پنجہ۔

بخاری صاحب اپنے طلبا میں تنقیدی شعور پیدا کرنے میں ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ رٹے رٹائے فقروں سے انہیں بہت نفرت تھی۔ ادھر کسی طالب علم نے کسی مشہور نقاد کے قول کا حوالہ دیا ادھر جھٹ انہوں نے پھبتی کسی "منصور کے پردے میں خدا بول رہا ہے۔ اجی حضرت یہ فرمان تو اے سی بریڈلے (A. C. BRADLEY) کا ہے۔ خاکسار بریڈلے کی نہیں آپ کی رائے دریافت کرنا چاہتا ہے" جب ہمارا پہلا سہ ماہی امتحان ہوا تو میں نے اپنے پرچے میں متعدد مشہور نقادوں کے فقرے نقل کر دئے۔ بخاری صاحب نے مجھے "صفر" نمبر عطا کرتے ہوئے پرچے کے ٹائیٹل پیج (TITLE PAGE) پر لکھا "آپ کا سارا پرچہ واوین میں ہونا چاہیئے۔ آپ نے جگہ جگہ ایف ایل لوکس (F.L. LUCAS) اور پروفیسر کلرکوچ کے اقوال نقل کر دئے ہیں۔ یہ دونوں کیمبرج میں میرے استاد تھے۔ یقیناً میں اس قابل نہیں کہ اپنے استادوں کا ممتحن بن سکوں۔ مجھے تو آپ کا امتحان لینا ہے۔"

کلاس روم میں کبھی کبھی جان بوجھ کر الٹی بات کہہ دیتے۔ ساری کلاس پنجے جھاڑ کر ان کے پیچھے پڑ جاتی۔ وہ ہر ایک معترض کو ایسا دندان شکن جواب دیتے کہ بیچارہ بغلیں جھانکنے لگتا۔ سارا پیریڈ بحث مباحثہ میں گزر گیا۔ سب کو قائل کرنے کے بعد فرماتے "یہ بات میں نے صرف اشتعال دلانے

کھٹکنے لگی تھی۔ ہندستان میں کان کا ڈنکا کھٹکنے سے پیشتر بہت بڑا فن کا ہے" SEMINAR کے پیریڈ میں جہاں طلبا کی تعداد تھوڑی ہوتی تھی، وہ ہر ایک طالب علم پر جرح کیا کرتے تھے۔ ایسی کڑی جرح کہ طلبا کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگتیں۔ خون خشک ہو جاتا۔ ایک دفعہ مجھ سے پوچھا۔ "آپ نے اپنے جواب مضمون میں لکھا ہے کہ ٹینی سن (TENNYSON) کے کلام میں موسیقی کا عنصر بدرجۂ اتم موجود ہے۔ موسیقی سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

"موسیقی سے میرا مطلب یہ ہے کہ ٹینی سن کا کلام پڑھتے وقت ایک دلکش لے یا تال کا احساس ہوتا ہے۔"

"لے یا تال کیا چیز ہے؟"

"آواز کا اتار چڑھاؤ۔"

"ٹینی سن کے کسی مصرعے کا حوالہ دے کر بتائیے۔"

میں نے گھبراہٹ کے عالم میں یونہی ایک مصرع پڑھ دیا۔ "ریلنٹ لیس"۔ "یہ تو اتنا کرخت ہے کہ اس کے مقابلے میں کوے کی آواز زیادہ سریلی معلوم ہوگی۔ کہیں یہ بات تو نہیں کہ آپ موسیقی اور شور و غل کو ہم معنی سمجھتے ہیں۔"

سیمینار (SEMINAR) میں اکثر ہندوستانیوں کی عادات پر دلچسپ تبصرہ کیا کرتے تھے۔ "ہم ہندوستانی بھی تین لوک سے نیارے ہیں۔ انگلینڈ میں اگر کسی کے گھر موت واقع ہو جائے تو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ یہاں کسی کا دور دراز کا رشتہ دار اللہ کو پیارا ہو جائے تو ساری رات دہاڑیں مار مار کر ہمسایوں کے علاوہ کل محلہ والوں کی نیند حرام کر دیتے ہیں۔"

"شور و غل کا ہماری زندگی میں کتنا دخل ہے۔ انگلینڈ اور فرانس میں سڑک پر چلتے ہوئے لوگ اتنی دھیمی آواز میں باتیں کرتے ہیں گویا کانا پھوسی کر رہے ہوں۔ ہم ہندوستانی 'مدہم' کی بجائے 'پنجم' میں باتیں کرنے کے عادی ہیں، بلکہ ہم بولتے نہیں چلاتے ہیں۔"

"ہم ہندوستانی جب تقریر کرتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے گھر والوں سے لڑ کر آئے ہیں اور سامعین پر اپنا غصہ اتار رہے ہیں۔ ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ ماتمی قرارداد بھی ہم اس انداز میں پیش کرتے ہیں جیسے ہمسایہ ملک سے اعلان جنگ کر رہے ہوں۔"

"مبالغہ آمیزی ہماری طبیعت کا شعار بن چکی ہے۔ یہاں ہر کانفرنس 'آل انڈیا' یا 'بین الاقوامی' ہوتی ہے چاہے شرکت کرنے والوں کی تعداد ایک درجن کیوں نہ ہو...... چند دن ہوئے میں نے موچی دروازے کے اندر ایک دکان دیکھی جس میں ایک ٹوٹا ہوا ہارمونیم اور خستہ حال طبلہ پڑا تھا۔ سائن بورڈ پر لکھا تھا "انٹرنیشنل اکیڈمی آف میوزک اینڈ ڈانسنگ۔"

"ہندوستانی موسیقی میں سوز ہے جوش نہیں۔ کیمبرج میں ایک بار میں نے اپنے استاد کو گراموفون پر اچھے گانوں کے چھ سات ریکارڈ سنوائے۔ اس کے بعد ان کی ہندوستانی موسیقی کے بارے میں رائے دریافت کی۔ نہایت سنجیدگی سے کہنے لگے "بور کرنے کے لیے ایک ہی ریکارڈ کافی تھا۔ آپ نے چھ سات سنوانے کا خواہ مخواہ تکلف کیا۔"

بخاری صاحب سے آخری ملاقات جون ۱۹۴۷ء میں ہوئی۔ تب وہ آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر کے عہدے سے سبکدوش ہو کر گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہو چکے تھے۔ بڑے تپاک سے ملے فرمانے لگے: "آپ ڈی اے وی کالج میں یونہی وقت ضائع کر رہے ہیں۔ غیر ادبی ماحول میں رہنا ذہنی خودکشی کے مترادف ہے۔ میں جلد ہی آپ کو گورنمنٹ کالج میں لانے کی کوشش کروں گا۔" ان دنوں تحریک پاکستان اپنے شباب پر تھی۔ کسی پروفیسر نے کہا "اگر پاکستان بن گیا تو ہم کپور کو ہندوستان میں نہیں جانے دیں گے۔ البتہ انہیں مشرف بہ اسلام ہونا پڑے گا۔" بخاری صاحب نے چونک کر

فرمایا "حضرت پہلے ہم اور آپ تو مشرف بہ اسلام ہولیں۔ اس غریب کی باری تو بعد میں آئے گی تا خیر ہم اور آپ میں کون سی مسلمانی رہ گئی ہے"

آل انڈیا ریڈیو کا تذکرہ چھڑا کہنے لگے۔ ایک بار میرے متعلق پارلیمنٹ میں کہا گیا کہ میں دوست پرور ہوں۔ آل انڈیا ریڈیو میں میں نے اپنے دوست اور شاگرد اکٹھے کر رکھے ہیں۔ میں نے اخبارات میں ایک بیان دیا جس میں کہا یہ الزام سو فی صد درست ہے مگر اب اس کا کیا کیا جائے کہ بدقسمتی سے میرے تمام شاگرد اور احباب قابل ترین شخص واقع ہوئے ہیں۔ اور قابل دوست یا شاگرد جاہل دشمن سے ہمیشہ اچھا ہوتا ہے؟

بخاری صاحب ساٹھ اکسٹھ برس کی عمر میں ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔ ان کا مقبرہ دیارِ غیر میں بنا۔ ہندوستان اور پاکستان سے ان کے دوست اور شاگرد اور عقیدت مند اس پر آنسو بہانے یا شمع جلانے کی سعادت بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ لیکن علم و ذہانت کی شمعیں جو وہ خود جلا گئے۔ ان کی روشنی ابدی ہے۔ ان کی دین صرف 'مضامین پطرس' نہیں۔ ان کی اصل دین ان کے وہ مایہ ناز شاگرد ہیں۔ جنہوں نے ادب اور فن میں نئی راہیں نکالیں۔ اور جنہیں اپنے 'پیر و مرشد" پر زندگی کے آخری سانس تک فخر رہے گا۔

پطرس بخاری مرحوم

۱۳۷۸ھ

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم

بخاری صاحب کی زندگی کی دلچسپیوں کا دائرہ بہت وسیع تھا مگر کیا بات ہے کہ ان کی بعض دلچسپیوں کے سلسلے کہیں نہ کہیں لاہور ہی سے نکلتے تھے۔ تو مبالغہ نہ ہوگا بقول ان کے ان کے دل میں تنہا ایک ملک یا شہر ہی کی یاد نہیں بلکہ بیک وقت کئی چیزوں کی یاد سمائی ہوئی تھی وہ ان سب کو سینے سے لگائے رکھتے اور کسی ایک وقت بھی دل سے الگ نہ ہونے دیتے۔ یہ ان کے وسیع القلب ہونے کی دلیل تھی۔

اس وسعت کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت میں ایک لچک سی تھی وہ جہاں بھی ہوتے جبلی اور فطری طور پر اپنے آپ کو اس ماحول میں سمو لیتے یا یوں کہیے کہ اس ماحول کو اپنا لیتے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ایک بات ان کے دل سے ہمیشہ چپکی رہی اور اس کی گرفت کبھی ڈھیلی نہ پڑتی وہ لاہور شہر کی یاد تھی اور اس شہر کا وہ بلند اور نمایاں منارہ جسے دنیا گورنمنٹ کالج کے نام سے پکارتی ہے

بخاری مرحوم اس کالج کے طالب علم بھی رہے تھے۔ ان کی اعلیٰ تعلیم کا آغاز بھی یہیں سے ہوا تھا ان کی علمی اور ادبی زندگی یہیں پروان چڑھی تھی وہ یہیں استاد بھی رہے اور رئیس درس گاہ بھی۔

ایک وقت ایسا آیا کہ انہیں اس ادارے کو چھوڑ کر باہر جانا پڑا۔ ان کے قدم دنیا بھر میں گھومے ان کے فکر و ذہن نے بڑی بڑی پروازیں دکھائیں لیکن اس کالج کے خیال سے کبھی غافل نہ رہے۔

ریڈیو کے محکمہ میں تقریباً دس سال گزارنے کے بعد ۱۹۴۷ء کے اوائل میں دوبارہ کالج میں پرنسپل کی حیثیت سے وارد ہوئے تو یوں محسوس ہوا جیسے وہ ایک دن کے لئے بھی اس سے الگ نہیں ہوئے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب ان کا سامان ٹرک سے اتارا جا رہا تھا تو وہ میرے ساتھ کالج کے وسیع صحنوں اور سرسبز میدانوں میں گشت لگا رہے تھے۔ اور ان کی آنکھوں کی چمک اور لبوں کا تبسم صاف صاف بتا رہا تھا کہ انہیں اس قدیم ماحول میں اپنے آپ کو دیکھ کر کتنی مسرت ہو رہی ہے۔ ان کے ذہن میں کالج کی عظیم الشان عمارت کا گوشہ گوشہ بدستور تازہ تھا وہ اس میں سے یوں گزر رہے تھے جیسے کوئی اپنے پرانے گھر میں پھر رہا ہو۔ وہ جہاں کوئی نئی چیز بھی دیکھتے تو انہیں اس میں اجنبی پن محسوس نہ ہوتا۔ جہاں کوئی چیز اپنی اصلی جگہ سے ہلی ہوئی پاتے کہتے ’ہیں! یہ کیا ہوا؟‘ بہر حال وہ اس کے چپے کے ذرے ذرے سے آشنا تھے۔ کیونکہ ادھر مدتوں آتے رہے تھے۔

ان کے کالج میں آنے کے فوراً بعد حالات بگڑ گئے۔ لاہور میں مسلمانوں اور ہندوؤں اور سکھوں کے باہمی تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ فرقہ وارانہ فساد شروع ہوئے لیکن بخاری صاحب مرحوم نے کالج کی فضا کو بڑی خوش اسلوبی سے محفوظ رکھا۔

پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد حالات ابھی مخدوش تھے۔ مقامی طلباء اور اساتذہ کی جمعیتیں اکھڑی اکھڑی تھیں۔ اور باہر سے

وارد ہونے والے اصحاب سخت پریشانی کے عالم میں تھے۔ اس ابتری کی حالت میں انہوں نے کالج کو سنبھالا اور اس احتیاط اور محبت سے سنبھالا کہ اس کی روایات اور شان میں فرق نہ آیا۔

مجھے خوب یاد ہے کالج میں فرسٹ ایئر کے داخلے کے دن قریب آ رہے تھے۔ اخبارات میں داخلے کا اعلان ہو چکا تھا۔ داخلے کے فارم تقسیم ہو رہے تھے۔ داخل ہونے والے بچوں کی ہر طرف چہل پہل تھی۔ بخاری صاحب کے قدم غیر معمولی طور پر تیزی سے ہر طرف اٹھ رہے تھے۔ کبھی وہ نو وارد امیدواروں کو دیکھتے۔ کبھی دفتر کے کلرکوں پر نظر ڈالتے، کبھی دوسرے کالجوں میں پہنچ کر وہاں کی فضا کو بھانپتے۔ ان کے دماغ میں ایک خلجان تھا وہ یہ کہ کیا گورنمنٹ کالج میں آنے والے طلبا اسی قدیم معیار کے ہوں گے؟ کیا اس کی شان حسب معمول بلند رہے گی؟ کیا اس کی روایات میں فرق تو نہیں آئے گا؟

جب درخواستیں گزارنے کا آخری دن آیا تو وہ صبح سے بے چین رہے۔ ہر پندرہ بیس منٹ کے بعد ہیڈ کلرک سے امیدواروں کی تعداد اور ان کی استعداد کے بارے میں پوچھتے۔ جب شام کو پانچ بجے انہیں معلوم ہوا کہ فرسٹ ڈویژن میں پاس ہونے والے امیدواروں کی تعداد تقریباً ڈھائی سو تک پہنچ چکی ہے تو وہ خوشی سے اچھل پڑے اور بے ساختہ کہنے لگے ——— صوفی! ہمارے بچوں میں بڑی جان ہے! اس کالج کو زندہ رکھیں گے۔

داخلے میں انہوں نے کیا کیا کچھ کیا؟ یہ وہی لوگ جانتے ہیں جو ان کے شریک کار رہے۔ اللہ جانے انہوں نے کتنے بلکتے ہوئے بچوں کے آنسو پونچھے، کتنے ناچار اور مایوس انسانوں کی ڈھارس بندھائی۔ اس عالیشان عمارت میں قدم رکھتے ہوئے جھجکتے اور ڈگمگاتے قدموں کو سہارا دیا۔ اور اس کام کے لئے انہیں محکمہ تعلیم، افسران بالا، وزراء کے آستانوں غرض جہاں جہاں بھی جانا پڑا گئے اور امداد لے کر آئے۔ ایسے مخدوش حالات میں انہوں نے کالج کے لئے وہ کچھ کیا کہ شاید کوئی دوسرا نہ کرسکتا۔

ایک دن چند بے تکلف احباب کی صحبت میں بیٹھے ہوئے کہنے لگے۔ دوستو! تمہیں معلوم ہے گورنمنٹ کالج کا فارغ التحصیل طالب علم جہاں کہیں بھی ہو سب میں ممتاز ہوتا ہے۔ اس کی حرکات و سکنات، اس کا لب و لہجہ فوراً بتا دیتا ہے کہ یہ کہاں سے آیا ہے۔ یہ سب کچھ ہمارے ماحول اور ہمارے معیار کی بدولت ہے۔ اب اردو ایم اے کی کلاس شروع ہونے والی ہے میں سوچتا ہوں اور ڈرتا ہوں کہ اگر ہم نے انگریزی ایم اے کلاس کی طرح اسے بھی نہ سنبھالا تو معاملہ بگڑ جائے گا۔ اور ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصے کے بعد اس کی حیثیت ادیب فاضل اور منشی فاضل کی سی نہ رہ جائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی اردو کی ایم اے کلاس کو یونیورسٹی سے الگ تھلگ چلایا اور اس میں بڑی سرگرمی اور تندہی سے کام کیا۔ اگر وہ امریکہ نہ چلے جاتے تو اس کے لئے کیا کچھ نہ کرتے۔

کالج کے علاوہ یونیورسٹی میں بھی ان کی سرگرمیاں بدستور جاری رہیں اور اگر انہیں یہاں ٹھہرنے اور کام کرنے کا موقع ملتا تو یہ ادارے اللہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتے۔ لیکن حکومت ان سے اور خدمت لینا چاہتی تھی۔ انہیں بار بار باہر جانا پڑتا لیکن اس غیر حاضری میں بھی ان کا دل کالج کی یاد سے خالی نہ ہوتا۔ چند مہینوں کے بعد جب وہ لوٹ کر آتے تو گھر پہنچنے سے پہلے کالج کے سامنے موٹر کھڑا کر کے ادھر ادھر نظر ڈالتے اور ایک خوشی کی لہر ان کے چہرے پر دوڑ جاتی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ اس جگہ کے ایک ایک ذرے سے لپٹ رہے ہیں۔

گورنمنٹ کالج میں ان کی حیثیت محض ایک معلم، استاد یا پرنسپل کی نہیں تھی۔ وہ طالب علموں کو صرف پڑھاتے نہیں تھے، وہ زندگی میں ان کے مشفق رہنما اور دوست بھی تھے۔ طالب علموں کی ذہنی استعدادوں کو ٹٹولنا، انہیں ابھارنا، ان کی صنعتوں کو صحیح راہ پر چلانا، ان کی زندگی کو سنوارنا، ان کا ایک اہم فریضۂ حیات تھا۔ اور ایک دلچسپ مشغلہ۔ اس کے لئے وہ نئے نئے تعلیمی، ادبی، تفریحی حیلے سوچتے رہتے۔ مشاعرے، ڈرامے، مناظرے

ادبی مجلسیں قائم کرتے اور اس طرح طالب علموں کو مصروف رکھتے۔

کالج کے مشاعروں میں وہ نہ صرف سماعت کرتے بلکہ داد سخن بھی دیتے اور خود بھی شعر سناتے۔ [illegible] میں ان کی علمی شہرت نے اس فن کو اس سرزمین میں ایک خاص معیار عطا کیا تھا۔ وہ [illegible] خود [illegible] اور اداکاروں کے ساتھ ساتھ ہدایت کاری بھی کرتے۔ انہوں نے کالج میں ادبی سوسائٹیوں کے ہوتے ہوئے ایک الگ "اردو مجلس" قائم کی جس کے جلسے اکثر بخاری صاحب کے مکان پر ہوتے تھے۔ جس میں شریک ہونے والے کچھ احباب اور کچھ مخصوص طالب علم ہوتے تھے۔ ان مجلسوں میں علمی و ادبی مضامین پڑھے جاتے اور ایک نہایت بے تکلف فضا میں ان پر بے لاگ تنقید بھی کی جاتی۔ تنقید کا مقصد تخریب نہیں بلکہ تہذیب ہوتی تھی۔ اس مجلس میں شریک ہونے والے اول اول صرف وہ نوجوان تھے جو آج اپنی علمی و ادبی حیثیت سے اپنے دیس کو چار چاند لگائے ہوئے ہیں۔ میری مراد آغا حمید، [illegible]، فیض، حفیظ ہوشیارپوری، ن م راشد جیسی شخصیتوں سے ہے۔

پطرس بخاری صاحب مرحوم غیر معمولی طور پر گورنمنٹ کالج سے وابستہ تھے۔ انہوں نے اس ادارے کی یاد کو زندگی بھر سینے سے لگائے رکھا اور جہاں بھی رہے اسے فراموش نہ کیا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ خود کالج کی سرزمین بھی ان کی یاد سے خالی نہیں۔ آج جگہ جگہ ان کی محبت کے آثار نظر آتے ہیں اور ان کے ہاتھوں سے نکلے ہوئے شاگردوں کے دل اس محبت کی یاد تازہ کرتے رہتے ہیں۔

اس کالج کی فضا میں جن استادوں کی یادیں اور آوازیں گونجتی رہی ہیں ان میں بخاری کی آواز "نوائے زمزمہ" کی حیثیت رکھتی ہے۔

۱۹۴۰ء کی بات ہے۔ شام کا وقت تھا۔ پروفیسر بخاری لان میں بیٹھے کالج کی باتیں کر رہے تھے۔ میں نے کالج کی تدریسی و ادبی سرگرمیوں کے سلسلے میں کچھ تجویزیں پیش کیں۔ ہنس کر بولے۔ "صوفی! یہ تو شعر ہوئے۔ تم نے ناسخ اور میر سے سن کر داد دی؟"

میں چپ ہو گیا۔

کچھ وقفے کے بعد بولے: "سنو! تم استاد ہو، اور میں کالج کا پرنسپل۔ ہمارا کام اس درس گاہ کے نظم و نسق کو صحیح طور پر آگے بڑھانا ہے۔ میرے نزدیک وہ تجویز جو عملی صورت میں نہیں آتی خواہ وہ آسمان ہی سے کیوں نہ نازل ہوئی ہو محض ذہنی عیاشی ہے اور میں ذہنی عیاشیوں میں شعروں اور دوستانہ خوش گپیوں کو ہمیشہ ترجیح دیتا ہوں۔"

میں نے مرزا بیدل کی ایک غزل جو اسی روز پڑھی تھی سنانی شروع کر دی۔

رات کچھ بے چینی سی رہی۔ ایک مدت سے کالج میں اردو کی تدریس شبانہ جاری کرنے کا ارادہ تھا۔ صبح ہوتے ہی میں نے "ادیب فاضل کلاس" کی تدریس کا ایک مکمل "پیش نامہ" مرتب کر لیا۔ اور اس کی تین نقلیں بھی تیار کر دیں۔ شام کو یہ مسل بغل میں دبائے بخاری صاحب کے مکان پر پہنچا۔

انہوں نے پوچھا: "ضلع کچہری سے آئے ہو؟"

میں نے کہا: "نہیں، گھر سے آیا ہوں۔"

"تو یہ پلندہ کیسا ہے؟"

"میرے ذاتی کاغذات ہیں۔"

"ٹھیک، بیٹھو۔"

ان دنوں پرنسپل کے مکان میں سرکاری کاغذات کا داخلہ ممنوع تھا! ایک گھنٹہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میں نے جھجکتے جھجکتے اپنا تجویزی کلام سنانا شروع کیا۔

میں نے کہا: "عام شائقین کے لئے اردو کی محفلیں تو ہیں ۔ کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں۔ ارادہ ہے کالج میں ادیب فاضل کی ایک کلاس شام کو جاری کی جائے۔ اس کلاس کے لئے نظم و نسق، ترتیب و تدوین اور درس و تدریس کا کفیل کوئی ہو۔"

حسب معمول کہنے لگے: "یہ طرحی اشعار ہیں؟"

میں نے کہا: "جی ہاں۔ مطلع سنا چکا ہوں۔ پوری غزل یہ ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے کاغذات کا پلندا ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ اسے پڑھتے جاتے تھے اور ان کا چہرہ خوشی اور مسرت سے تمتماتا جاتا تھا درمیان میں کہیں کہیں وہ کچھ سوال بھی پوچھتے جاتے میں جواب دیتا اور کہتا: "آپ سارا مسودہ پڑھ لیں آپ کو معلوم ہو جائے گا۔"

کاغذات ختم ہوئے تو بولے۔

"ہوں، گویا میں بھی پڑھاؤں گا۔"

"میں نے کہا: "آپ فقط پرنسپل ہی نہیں۔ استاد بھی ہیں۔"

"کیوں نہیں؟"

اس کے بعد انہوں نے ایک سگرٹ سلگایا۔ جس کا دھواں تھوڑی ہی دیر میں برآمدے کے ہر گوشے میں لہرا رہا تھا۔

شام کا کھانا کھانے کے بعد وہ موٹر کار میں بیٹھ کر شہر میں گھومنے لگے جہاں جاتے اسی غزل کی تلاوت ہوتی اور پڑھنے کے ساتھ ہی اس طرح داد بھی دیتے کہ دوسروں کے منہ سے بے ساختہ واہ نکل جاتی۔ اہل فکر حضرات اور مشفق احباب سب نے اسے سراہا۔ اس تبلیغی اعلان اور نشری پرچار میں آدھی رات گزر گئی۔

صبح کو یہ بات لاہور کی گلی گلی، کوچے کوچے میں گشت لگا رہی تھی۔ ایک ہفتہ کے اندر تمام ضروری مراحل طے ہو گئے۔ محکمانہ اجازت، اشتہار و اطلاعات اور درخواستوں کی طلبی، امیدواروں کی پیشی، داخلہ اور پڑھائی۔

پروفیسر بخاری اپنے روزمرہ مشاغل میں خواہ وہ فرائض منصبی سے تعلق رکھتے ہوں یا نجی ہوں ایسے ہی مستعدی سے کام لیتے تھے۔ زندگی میں ان کی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہی ہے۔

قدرت نے انہیں غیر معمولی ذہانت عطا کی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی معاملہ فہمی اور جزرسی اس ذہانت کو اور بھی چمکاتی تھی۔ وہ کسی کام میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اس کے تمام امکانی پہلوؤں کو بھانپ لیتے تھے اس کے حسن و قبیح اور دور رس نتائج کو دیکھتے تھے بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قوت عمل بڑی تیزی سے کام کرتی تھی اور وہ کسی خیال کے آتے ہی اسے فی الفور عملی جامہ پہنا دینے کے عادی تھے لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ معمولی اقدام کے لئے بھی کئی دن تک غور کرتے رہتے تھے۔ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے سوچتے تھے۔ دوسروں سے مشورہ بھی لیتے تھے اور اس مشورہ طلبی میں ایسے حسن تدبر سے کام لیتے تھے کہ بات بھی سلجھ جائے اور کسی کو اصل راز کا پتہ بھی نہ چلے۔ جب ذہنی جائزہ لینے کے بعد انہیں پورا اطمینان ہو جاتا تھا تب وہ قدم اٹھاتے تھے اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس کام کی تکمیل کے درپے ہو جاتے تھے۔

کاموں کی تکمیل کے لئے دوسروں سے مدد لینے میں انہیں خاص ملکہ حاصل تھا وہ اپنے عملی اقدام کا چرچا بڑی خوش اسلوبی سے کرتے تھے دوستوں کی ہمدردی اور رفیقانِ کار کی اعانت ہمیشہ ان کا ہاتھ بٹاتی تھی پھر ان کے کام کرنے کا طریقہ بھی اتنا خوش آئند ہوتا تھا کہ دیکھنے والوں میں بھی تکمیل کار کا ایک غیر معمولی ولولہ پیدا ہو جاتا تھا اور وہ خود ان کے شریک کار بن جاتے تھے اور اس شرکت میں ایک راحت محسوس کرتے تھے۔

بخاری کا دستور تھا کہ کسی کام کی صحیح تکمیل کے لیے انسان پر محنت شاق نہیں۔ بلکہ جیسا ہونا چاہیے۔ چنانچہ وہ جب بھی کسی کام میں ہاتھ ڈالتے تو پورے ذوق و شوق سے کرتے۔ گویا انہیں اس کام کا چسکا ہے ان کا یہ ذوق و شوق ایک مسرت اور آسانی پیدا کرتا۔ اس میں ایک قدرتی روانی در آ جاتا اور ان کی تکمیل ایک فطری تقاضے کی تکمیل معلوم ہوتی تھی۔

بخاری جس کام کو کرتے، ایسی سرگرمی، ایسے انہماک اور شغف سے کرتے، کہ معلوم ہوتا یہی ان کا فطری شغل ہے وہ قدرت نے انہیں اسی کام کے لیے بنایا ہے لیکن وہ تمام کاروبارِ زیست کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھتے۔ ان کے نزدیک ہر کام کے لیے ایک پیشہ ورانہ مہارت درکار تھی۔ جب تک کوئی مشغلہ فن نہیں بن جاتا اپنی صحیح حیثیت کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔ انسان کام کرے تو حسنِ کار کو کام میں لائے، نہیں تو بیکار ہے۔

بخاری نے ایک بے چین طبیعت پائی تھی۔ ان کا دماغ ان کے جسم سے اور ان کا جسم ان کے دماغ سے زیادہ تیز کام کرتا۔ نقصان سے ذہنی اطوار اور عملی رفتار ہمیشہ ہم آہنگ رہتے۔ اس لیے انتہائی مصروفیتوں میں بھی ان کی طبیعت پر کوئی ناگوار بوجھ نہیں پڑتا بلکہ ہر تکمیل پر ان سے کوئی خاص لذت اندوزی کا سامان مہیا کی تھیں وہ کسی شے کو معمولی حالت میں۔ یکتا گوارا نہیں کرتے تھے ان کی طبیعت کی اپج میں ہر روز کوئی نہ کوئی تغیر چاہتی تھی اگر یہ تغیر واقع نہ ہو تو ہر شغل اپنی دلچسپی کھو دیتا ہے اور اس کی یکسانیت اسے بے کیف بنا دیتی ہے۔ بخاری کو یہ یکسانیت کسی طرح بھی گوارا نہیں تھی۔ سمجھتے تھے کہ ایسی یکسانیت سے نہ صرف کام کی رفتار ڈھیلی پڑ جاتی ہے بلکہ کام کرنے والے کی طبیعت کو بھی زنگ لگ جاتا ہے۔ گورنمنٹ کالج میں مجلس کا قیام، محکمہ تعلیم میں منتخب کتابوں کے تراجم، ریڈیو کے نئے نئے نشری پروگرام سب کے سب اسی اپج کا نتیجہ تھے۔

بخاری کی تیز رفتاری کا ایک واقعہ مجھے اب تک یاد ہے۔ مجلس کے ہفتہ وار اجلاس پہلے پہل انہی کے مکان پر ہوا کرتے تھے۔ ایک شام جب مجلس کی کارروائی شروع ہونے والی تھی۔ وہ ساتھ کے کمرے سے نکل آئے۔ آستینیں چڑھی ہوئی، ہاتھ گرد آلود کہتے ہوئے آج میں سخت مصروف ہوں۔ آپ میرا انتظار نہ کریں میں شریکِ محفل نہ ہو سکوں گا۔ بات ختم ہوئی۔ دوسرے روز معلوم ہوا کہ آپ نے رات بھر میں ٹیکسٹ بک کمیٹی پنجاب کی پچیس سالہ کارگزاریوں کی ایک رپورٹ مرتب کر لی۔ اس رپورٹ کی ترتیب میں انہیں سینکڑوں مسلوں کو کھنگالنا پڑا۔ متفرق اوراق سے ضروری مواد کا انتخاب اور اس کی تدوین و تہذیب کوئی آسان کام نہ تھا۔ دفتری کارروائی کی جاتی تو شاید مہینے لگ جاتے لیکن یہ کٹھن کام ان کے تنہا ہاتھوں نے ایک رات میں سرانجام دیا۔

یہاں ایک لطیفہ بھی سن لیجئے۔ صبح سویرے بخاری صاحب یہ رپورٹ لے کر دفتر پہنچے۔ ان کا خیال تھا افسرانِ بالا ان کی اس خدمتگذاری اور تیز کاری پر خوش ہوں گے۔ لیکن وہاں اس وقت کرسیٔ منصب پر ایک ایسے صاحب براجمان تھے جن کی قابلیت محض کہنہ سالی تھی۔ انہوں نے بڑی تمکنت اور رعونت سے رپورٹ کو ہاتھوں میں لیا۔ اوراق کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر نہایت بے پروائی انداز میں بولے۔ "یہ کیا لکھا ہے .... خیر کوئی بات نہیں میں درست کر لوں گا۔" یہ کہہ کر انہوں نے رپورٹ کاغذات کی ٹوکری میں ڈال دی۔ بخاری نے یہ سب کچھ دیکھا اور سنا۔ کوئی صاحبِ ذوق یہ نقد کرتا تو کوئی بات بھی تھی۔ ایک نااہل کا اس افسرانہ لہجے میں گفتگو کرنا نہایت ناگوار گزرا۔ انہوں نے لپک کر رپورٹ اٹھائی اور پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دی۔

"بس بس یہ کیا حماقت کر رہے ہو؟"

"اگر یہ رپورٹ اچھی نہیں تو اس کا رکھنا بے کار ہے۔"

بخاری یہ کہہ کر کمرے سے باہر چلے گئے تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ افسر کے کمرے میں دفتر کے چپڑاسیوں کا ایک پورا دستہ بکھرے رپورٹ کے پھٹے ہوئے کاغذات کے ٹکڑے جوڑ رہا ہے۔

صلہ کاری کی تمنا نہیں ہوتی۔ لیکن جب کوئی کام کسی لالچ کے بغیر یا حصول نام و نمود سے بے نیاز ہو کر کیا جائے اور وہ بھی دوسروں کی خاطر کیا جائے اور پھر اس کام کو یوں ٹھکرایا جائے تو انسان کے دل کو ضرور ٹھیس لگتی ہے۔ نااہل ہاتھوں نے جو چرکے لگائے تھے معلوم نہیں کہاں تک ان بچے ہوئے کاغذوں پر پیسوں نے مرہم کا کام کیا۔ یہ بخاری صاحب کا دل ہی بتا سکتا ہے۔ میں تو یہی کہہ سکتا ہوں کہ ان کی چابکدستی دوسری طرح اپنا جوہر دکھا کے رہی۔

ایک مرتبہ ان کے رفیقوں میں سے ایک صاحب یونیورسٹی کے کسی رکن کی غلط کاریوں پر چیں بہ جبیں ہو رہے تھے۔ بخاری صاحب کہنے لگے "بھائی صاحب! میری دو باتیں یاد رکھو۔ زندگی میں الجھنا ہو تو کسی بڑے مسئلے پر الجھنا چاہیے۔ اور اپنے سے بڑے آدمی کے ساتھ الجھنا چاہیے۔ ورنہ مزا نہیں آتا۔ انسان کی قوتیں اور کوششیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ کمزور آدمی کو دبانے میں کوئی شان نہیں بڑے آدمی سے تصادم ہو تو انسان کی استعداد کار اور بھی چمکتی ہے۔ مجھے دیکھو! میں نے ریڈیو کی ملازمت کے دوران میں ہمیشہ بڑے آدمیوں سے ٹکر لی ہے۔ اور اللہ کے فضل و کرم سے کامیاب رہا ہوں۔"

بظاہر ٹکراؤ ایک ناگوار سی شے ہے۔ اور کاموں کی تکمیل میں ایک رکاوٹ سا نظر آتا ہے۔ لیکن جب اس کی بنیاد کسی بڑے اصول پر ہو اور ٹکرانے والے اہل لوگ ہوں۔ تو اس سے مفید نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ بخاری کی طبیعت کا خاصہ تھا کہ وہ ہمیشہ ایسی رکاوٹوں سے خوش ہوتے تھے۔ رکاوٹوں سے ان کی طبعی صلاحیتیں اور استعدادیں اور بھی ابھرتی تھیں ان کا بڑا کمال یہ تھا کہ وہ ان رکاوٹوں سے عہدہ برآ ہوتے وقت کبھی تھکن یا تلخی محسوس نہیں کرتے تھے اور تو اور خود ان سے ٹکرانے والا جب ان سے شکست کھاتا تھا۔ تو اسے اپنی شکست کا اتنا احساس نہیں ہوتا تھا جتنا ان کی عظمت اور برتری کا۔

ریڈیو کے محکمے میں ان کا بالتدریج آگے بڑھنا اور آگے بڑھ کر محکمے پر چھا جانا ایک ایسا ہی کارنامہ ہے۔ انہوں نے دس سال کے عرصے میں ریڈیو کو جو وسعت اور شہرت دی وہ ان کی ذہانت اور مستعدی کی بیّن دلیل ہے۔ جنگ عظیم کے دوران میں ریڈیو پروگرام اور بالخصوص خبروں کی نشر و اشاعت کا کام بہت کٹھن تھا۔ اس بارے میں انگریز حکام اور ان کی پالیسی بارہا ان کے آڑے آئی لیکن انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے ایک طرف ان کے تصرفات کی روک تھام کی۔ اور دوسری طرف اپنی پالیسی کے پیش نظر ریڈیو کے وقار کو برقرار رکھا۔ خبروں کا اہتمام ریڈیو کے پروگرام کا سب سے اہم کام ہے۔ اس کی اہمیت کو غالباً ریڈیو کے محکمے کے کارکنوں کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اسے موزوں بنانے بلکہ ایک نئی شکل و صورت دینے میں بخاری صاحب کا زبردست ہاتھ تھا اس میں ان کی شخصیت کا پورا پورا عکس نظر آتا ہے۔

انہیں نئی نئی تجویزیں سوجھتی تھیں ایک مرتبہ حسب معمول انہوں نے حکومت کو لکھا کہ ریڈیو پروگرام میں بہت سی چیزیں مستقل اہمیت رکھتی ہیں۔ اگر انہیں شائع کر کے محفوظ کر لیا جائے تو ایک ادبی خدمت بھی ہو گی چونکہ جنگ کا زمانہ تھا انہوں نے ایک دلیل یہ بھی دی کہ بعض پروگراموں میں جنگی پرچار کے عنصر پوشیدہ ہوتے ہیں۔ چھپ جانے کی صورت میں وہ بھی کارآمد ثابت ہوں گے۔ اس تجویز کا جواب کوئی آٹھ مہینے کے بعد موصول ہوا۔ تجویز رد کرنے میں جہاں بہت سے دلائل تھے۔ وہاں ایک دلیل یہ تھی کہ جنگ اب جلد ختم ہونے والی ہے لہٰذا ایسے مواد کا چھپنا بے موقع ہے بخاری نے اس دلیل کو پڑھ کر لکھا "ہاں درست، لیکن اگر ہماری حکومت اسی رفتار سے کام کرتی رہی تو امن کا دور بھی جلد ختم ہو جائے گا۔"

پطرس کے مضامین بخاری صاحب کی مزاحیہ طبیعت کے آئینہ دار ہیں۔ مزاح نگاری بظاہر بڑی ہلکی پھلکی شے ہے لیکن طنز نگاری کی طرح ایک لطیف شے کو پیدا کرنے کے لئے ایک بڑی شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک کسی شخص میں غیر معمولی ذہانت، اعلیٰ مشاہدہ کی عادت اور

شگفتہ طرزِ بیان کی قوت نہ ہو وہ کامیاب مزاح نگار نہیں ہو سکتا۔ انسانی اعمال میں بعض حرکات بڑی مضحکہ خیز ہوتی ہیں لیکن ہر انسان کی آنکھ انہیں نمایاں طور پر نہیں دیکھتی۔ ایک مشاہدہ کار انسان انہیں بروئے کار لاتا ہے اور ان کا اظہار لطیف اور شگفتہ انداز میں، اس طرح کرتا ہے کہ وہ حرکت خود سے ابھر کر آ جاتی ہیں اور ہم ان انسانی لغزشوں کو دیکھ کر مسکرا دیتے ہیں۔ بخاری کی نظر بڑی وسیع اور گہری تھی اور پیرایۂ بیان پر قدرت حاصل تھی۔ اس لئے وہ بے ساختہ ان حرکات کو دیکھ لیتے اور چٹکیاں لیتے رہتے تھے۔

مذکورہ بالا ریڈیو سیل کا افتتاح میں پڑھا تا روزہ کا معمول ہے کوئی اور ہوتا تو اسے دفتری سرخ فیتے کے سلسلے کی ایک کڑی سمجھ کر ٹال دیتا، لیکن بخاری کی نظر افتتاح کے تمام پہلوؤں پر پڑی تھی۔

شاعروں کی بے طرحی سے کون واقف نہیں اور شہروں کی گندی حالت کو کون نہیں جانتا لیکن "کتے" اور "لاہور کا جغرافیہ" بخاری ہی لکھ سکتے تھے۔

بخاری کا مزاحیہ انداز ان کی تحریروں تک ہی محدود نہیں ان کی تقریریں بھی مزاح سے مزین ہوتی تھیں وہ بڑے سے بڑے اہم اور سنجیدہ مسائل پر بحث کرتے ہوئے اس حربے کو کام میں لاتے تھے۔ احباب کی صحبتوں اور عام موقعوں پر بھی اسے بے ساختہ استعمال کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مجمع میں ان کی گفتگو لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتی تھی اور لوگ پہروں ان کے پاس بیٹھنے سے نہیں اکتاتے تھے۔

لیکن اس سے یہ اندازہ نہیں لگانا چاہئے کہ بخاری کی ذات میں جو کشش تھی وہ محض ان کی مزاح گوئی کی وجہ سے تھی۔ بے شک ان کا مزاح ملنے والوں کے دل میں ایک شگفتگی پیدا کرتا تھا لیکن انہیں قریب سے دیکھنے والے جانتے ہیں کہ ان میں خلوص بھی تھا وہ اپنے عزیزوں، دوستوں اور عام لوگوں سے بڑے رکھ رکھاؤ سے ملتے تھے۔ اس رکھ رکھاؤ میں دوست داری بھی ہوتی تھی۔ اور سلیقہ بھی۔ عام ملاقاتوں میں جہاں انسانی منافقت کام کرتی ہے وہ اس آراستگی سے بات کرتے تھے کہ طبیعت کو خوش گوار معلوم ہوتی تھی وہ چھیڑ چھاڑ کے خوگر تھے لیکن اس چھیڑ چھاڑ سے ان کی مراد کسی کی دل آزاری نہیں بلکہ اس سے لگاؤ کا اظہار ہوتا تھا۔

بخاری صاحب کو اپنے ان کرشموں کا پورا پورا احساس ہوتا تھا بلکہ وہ دوسروں پر اکثر ایک خاص تفوق محسوس بھی کرتے تھے اور اس تفوق سے دوسروں کو اپنے مطابق چلاتے بھی رہتے تھے جہاں کہیں ان کی طاقت لسانی کارگر نہیں ہوتی تھی اپنی مزاحیہ گفتگو کو چھوڑ کر کوئی ایسی حرکت بھی کر سکتے تھے جو دوسروں کو چپ کرا سکے یا انہیں شکست دے سکے۔ ۱۹۴۷ء کے اواخر میں جب قومی زبان کا مسئلہ پیش ہوا تو بنگال کے ایک صاحب اقتدار بزرگ نے بنگالی زبان کی حمایت میں بڑی پُرزور تقریر کی۔ بخاری نے اپنی بذلہ سنجیوں سے انہیں بہت کچھ مرعوب کرنا چاہا لیکن خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی دوسرے روز وہ بزرگ اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں کچھ اعداد و شمار پیش کرنے والے تھے۔ بخاری صاحب کو ایسے مسودے کے مؤثر ہونے کا اندیشہ تھا آپ ان کے پاس ہی بیٹھے تھے۔ اچانک آپ کی نظر ایک کاغذ پر پڑی، تاڑ گئے، ہو نہ ہو یہ اعداد و شمار کا پلندا ہے۔ انہوں نے چپکے سے وہ پلندہ نکال لیا جب وہ بزرگ پُرجوش خیالات کا اظہار کرنے کے بعد اعداد و شمار پر آئے۔ اور کاغذوں پر ہاتھ ڈالا تو غائب تھے۔ پریشانی میں جیبوں کو ٹٹولتے رہے اور یہ معصوم صورت بنائے ان سے ہمدردانہ استفسار کرتے چلے گئے۔ ان کی بدحواسی پر محفل میں ایک کہرام سا مچا۔ جب محفل کا رنگ بگڑ گیا تو بخاری نے اچانک جھک کر میز کے نیچے سے وہی پلندا اٹھا کر انہیں دکھایا اور بھولے انداز میں کہا۔

"آپ یہ تو نہیں تلاش کر رہے ؟"

اس پر ایک زور کا قہقہہ لگا اور ساری بات ہنسی مذاق کی نذر ہو گئی۔

دوستداری، بخاری صاحب کا شیوہ ہی نہیں مسلک بھی تھا۔ اگرچہ اس دوست داری میں گرم جوشی اور وفورِ جذبات کا اظہار بہت کم ہوتا تھا۔ وہ آہوں اور آنسوؤں سے زیادہ جذبات محبت کے اعتدال اور اخفا کے قائل تھے۔ اس بارے میں ان کا گرم جوش دل مغرب کی خنک فضاؤں میں بس لیا بسا تھا اور اپنی آگ کو دبائے رکھتا تھا۔

بظاہر دیکھئے تو بخاری صاحب پورے "صاحب لوگ" تھے۔ ان کی وضع قطع، ان کا لباس، ان کے اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے، کھانے پینے، باتیں کرنے سے یورپی انداز ٹپکتے تھے۔ وہ مشرقی طرز بود و باش پر اکثر پھبتیاں کستے رہتے تھے۔ ان کے ساتھ بازار میں گھومنے جائیے تو معلوم ہوتا تھا انہیں یہاں کی کوئی حرکت پسند نہیں۔

"وہ دیکھو، تہ بند کے ساتھ انگریزی قمیص۔"

"سبحان اللہ چپل کے ساتھ پتلون۔"

"ٹائی اور شلوار کیا کہنے"

"یہ شخص بازار میں کھڑا کباب کھا رہا ہے"

"یہ دیکھئے اس نے بائیسکل بازار میں بیچ شارع کے گھما دی۔"

"اور یہ چار آدمی صف باندھے چلے جا رہے ہیں میں موٹر کہاں سے گزاروں۔"

یہ فقرے مسلسل آپ کے کان میں پڑیں گے اور آپ انہیں سنتے سنتے اپنے ملک بلکہ اپنے آپ سے بیزار ہو جائیں گے۔ آپ کو اپنی کم سوادی کا احساس ہونے لگے گا۔ جو خامی آپ میں نہیں وہ بھی نظر آئے گی۔

لیکن اس سے آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ بخاری صاحب مغربی طرز زندگی کے قالب سے نکلے ہوئے ایک مجسمہ تھے اور ان میں کوئی روح نہیں تھی۔ ان کی صورت شکل مغربی اور مزاج مشرقی تھا۔ ان کی ذات مغرب و مشرق کا تضاد نہیں بلکہ ایک لطیف امتزاج پیش کرتی تھی۔

ان کی مشرقی مزاجی کو دیکھنا ہو تو انہیں گھر کی چار دیواری میں دیکھئے جہاں ہر شے مغربی انداز میں جلوہ گر ہے لیکن جہاں زندگی کی حرکات ٹھیٹھ مشرقی فضا میں سانس لیتی دکھائی دیتی ہیں۔ وہی بے پروا، لاابالیانہ پن، وہی بے تکلف گفتگو، وہی خلوص آمیز میل ملاپ۔ یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے لندن یا نیویارک کے کسی مکان میں دلی کے بلی ماروں کے محلے والے اچانک آ بسے ہوں۔ اور وہ ماحول کے لئے اجنبی اور ماحول ان کے لئے اجنبی ہو۔

کوئی یہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ دن بھر اتنی باقاعدگی اور مستعدی سے مشین کی طرح مسلسل کام کرنے والا رات کو کیونکر جاگتا ہوگا لیکن بخاری صاحب کی شب بیداری کو ان کے ساتھ راتیں گزارنے والے ہی جانتے ہیں۔ رات کے دس گیارہ بجے کے بعد گھر سے گھومنے کے لئے نکلنا ان کا روزمرہ کا شیوہ بلکہ معمول تھا، کوئی مقصد، کوئی منزل مقصود نہیں محض گھومنا اور گھومتے گھومتے کسی سنسان سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر گھنٹوں گپیں ہانکنا، یہ تھی ان کی تفریح جس میں ان کے تمام ہم قدم دوست برابر کے شریک ہوتے تھے۔ مجال نہیں کہ کوئی شب خیز اس ثواب سے محروم رہ جائے۔ بیدل کے دقیق اشعار، شیکسپئر کے ڈرامے، ایلیٹ کی مجرد نگاری، منٹو کے افسانے انہی خوش گپیوں کے تحت میں آ جاتے تھے۔

راتوں کی یہ بیداری ان کے روزانہ کاموں میں مخل نہیں ہوتی تھی۔ جس طرح دوستوں کو ایک ایک کرکے جمع کیا تھا اسی طرح ایک ایک کو گھر پر چھوڑنے کے بعد وہ بستر پر آکر لیٹتے تھے اور ایک آدھ گھنٹہ آرام کرنے کے بعد حسب معمول اٹھ کر روزمرہ مشاغل میں کھو جاتے تھے اور اسی معمول پر

وہ محنت کا رپورٹ نے اور فرائض [illegible] نہیں [illegible] ہوتے [illegible] اپنے کام [illegible] ایک [illegible] شعر کی ترتیب رکھتے تھے کسی طرح کی بے قاعدگی [illegible] نہیں سکتے تھے۔

بیمار ہوا اور رات جو کھانسنے کے بعد تقریباً پانچ بجے صبح کو [illegible] پوچھا [illegible] کہاں ہے؟"

[illegible] یونیورسٹی [illegible] ؟

[illegible] نہیں [illegible] پوچھا تھا۔

ان کا عقیدہ [illegible] تھا [illegible] منصبی سے [illegible] فرائض کی بجا آوری [illegible] سمجھتے تھے۔

ریڈیو کے زمانے میں [illegible] انہوں نے بڑی محنت سے [illegible] اور منتخب [illegible] ان کے حوالے کیا [illegible] آپ [illegible]

دفتر کے بعد بخاری صاحب [illegible] کے مکان پر بیٹھے [illegible] احباب کے ساتھ [illegible] رہتے تھے

پروفیسر بخاری کی ذات ایسی جامع صفات تھی کہ ان کی وفات پر یوں احساس ہوتا ہے کہ [illegible] شخصیتیں [illegible] ان کے رخصت ہونے سے دنیا ایک معاملہ فہم، ہوش مند [illegible] سے محروم ہو گئی علم و دانش کی درس گاہوں سے [illegible] خوش فکر، خوش نگار انشا پرداز [illegible] کا ماتم کر رہے

یہ سب کچھ ہے لیکن ان کی موت ان کے دوستوں کے لئے ایک بہت بڑا حادثہ ہے [illegible] کی ذاتی [illegible] ہو گئی وہ ایک مخلص شفیق دوست کو کھو بیٹھے ہیں۔ ایسے مہربان دوست دنیا میں کم پیدا ہوتے ہیں۔

بخاری صاحب میرے محترم استاد بھی تھے۔ رفیق کار بھی اور پیارے دوست بھی۔ میرا ان کا تعارف ۱۹۲۸ء میں ہوا اور اس کے بعد تیس سال کے عرصے میں ان کا احترام، ان کی [illegible] رہنمائی اور خلوص دوستی ایک عجیب امتزاج کے ساتھ دل کو لبھاتی اور گرماتی رہی۔ ان کی خوش ذوقی، ان کی بذلہ گوئی، ان کے قہقہے جہاں دوستوں کی محفلوں کو جگمگاتے وہاں ان کی پرسکون خاموش گرم جوشی اور محبت اور شفقت کی تڑپ احباب کے دکھی دلوں کی آہوں اور آنسوؤں کا ساتھ بھی دیتی۔

آخری بار جب وہ امریکہ سے لاہور آئے اور چند روز یہاں ٹھہرے تو ایک بار پھر یہ محفلیں جاگ اٹھیں اور زندگی کی بہت سی یادیں پھر تازہ ہو گئیں۔ اس بات کو تقریباً ایک سال گذر چکا ہے لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ ابھی وہ کل ہمارے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ کتنا تازہ تھا ان کا پیار اور کتنی تیز تھی ان کی یاد۔ ان کی ایک نظر زندگی کے بہت سے گوشوں کو ٹٹولتی اور ایک بات کئی ایک سوئے ہوئے جذبات کو جگاتی تھی۔ ان کے پاس بیٹھنے سے دل کی گم شدہ دنیائیں از سر نو آباد ہو جاتیں۔ اور زندگی پیچھے [illegible] کے مٹے ہوئے نقش ابھارتی چلی جاتی۔

ان کی کونسی بات ہے جو رہ رہ کر نہیں ستاتی لیکن وہ جب کبھی کچھ عرصہ ملک سے باہر رہ کر لاہور میں آتے تو یہی کہتے۔ دوستو! غربت میں تمہاری یاد بہت ستاتی ہے اور اس یاد کے ساتھ ساتھ وطن کی محبت، اس کا احترام طوفانی جذبات بن کر رگوں میں دوڑنے لگتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے انسان کا ہر قدم منزل دوست کی طرف اٹھ رہا ہے جیسے کوئی عاشق اپنے محبوب کی طرف والہانہ انداز میں لپک لپک کر جا رہا ہو۔ تم لوگ

یہاں بیٹھ کر اس بات کا اندازہ نہیں کرسکتے۔ اس کو میرا دل ہی جانتا ہے۔

مجھ سے بخاری کی جدائی کا حال نہ پوچھئے۔ ان کی محبت، ان کا مسلسل خلوص، یہ احسان احساس احسان کا احساس ہمیشہ تیز و تازہ رہتا اور خیال ہوتا کہ زندگی تو کیا اپنی موت بھی اسی کے آنسوؤں کا سہارا لے گی لیکن کیا خبر تھی کہ اِن آنکھوں کو اُن کے فراق میں آنسو بہانے پڑیں گے۔

کتنی جدائیوں کے کھائے ہیں زخم دل پر
کتنی محبتوں کے ماتم کئے ہیں ہم نے

ضابطہ بے ضابطہ

عشرت رحمانی

> مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں،
> تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

بات ۱۹۴۳ء کی ہے۔ دہلی میں آل انڈیا ریڈیو کا قیام عمل میں آ چکا تھا۔ محکمہ کے کنٹرولر ذہین و طباع انگریز مسٹر لائنیل فیلڈن، اسٹیشن ڈائرکٹر مسٹر اسٹیپلٹن اور پروگرام ڈائرکٹر سید ذوالفقار علی بخاری (ریڈیو پاکستان کے سابق ڈائرکٹر جنرل) تھے۔ ان کے علاوہ آغا محمد اشرف (نبیرۂ آزاد) اور سجاد سرور نیازی جیسے اہلِ فن حضرات بھی عملے کے رکن تھے۔ مسٹر فیلڈن خود ایک ماہر اہلِ قلم ہونے کے ساتھ نشریات کے رموز سے بھی کماحقہ واقف تھے جو اسبابِ ہنر انہوں نے جمع کیے تھے ان کے لیے ایسے سرگروہ کی تلاش تھی جو ان کی صحیح قیادت کی اہلیت رکھتا ہو اور ملک کے لیے نشریات کا موزوں لائحۂ عمل مرتب کر کے ان کو مناسب طریقہ پر چلا سکے۔ چنانچہ مسٹر فیلڈن نے برصغیر کی تمام یونیورسٹیوں کو مراسلے بھیجے کہ وہ اپنے اداروں سے ایسے فائق اہلِ علم و ہنر چن کر اس کام کے لیے بھیجیں جن کے تعاون سے وہ اپنے دست و بازو مضبوط کر کے باضابطہ کام چلا سکیں۔ چنانچہ کئی اداروں کے اربابِ اقتدار نے چند اہم شخصیتوں کو منتخب کر کے مسٹر فیلڈن سے ملاقات کے لیے بھیج دیا۔ ان میں دو نام خاص تھے۔ ایک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پروفیسر رشید احمد صدیقی اور دوسرے گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر سید احمد شاہ بخاری پطرس۔ یہ حسنِ اتفاق تھا یا حسنِ انتخاب کہ یہ دونوں حضرات اردو کے مشہور مزاح نگار اور بلند پایہ ادیب بھی تھے اور ادب انگریزی کے پروفیسر بھی۔

فیلڈن صاحب نے تمام منتخب حضرات کا ملاقات کے دوران میں ضابطہ بے ضابطہ جائزہ لیا اور سید احمد شاہ بخاری کو اپنا دستِ راست منتخب کر لیا۔ مسٹر فیلڈن نے برصغیر کے قیام کے دوران میں آغا محمد اشرف سے اردو پڑھی تھی لیکن یہ استعداد معمولی تھی۔ وہ بخاری صاحب کی اردو ادیب کی حیثیت سے بے مثال خوبیوں کا اندازہ تو نہ کر سکتے تھے لیکن ابتدائی ملاقات میں ان کی شخصیت و کمال کا بخوبی جائزہ لے کر اس حقیقت کے معترف ہو چکے تھے کہ پطرس بخاری انگریزی زبان و ادب کی مہارت میں اس برصغیر میں منفرد حیثیت کے مالک ہیں۔ اور اپنی طباعی، غیر معمولی ذہانت اور مختلف علوم و فنون میں واقفیت رکھنے کے سبب ان کی متنوع شخصیت گوناگوں کمالات کی حامل ہے اور اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی۔ باخبر حضرات اس حقیقت سے اچھی طرح آشنا تھے اور ہیں کہ پطرس بخاری کی شگفتہ مزاجی، بزلہ سنجی اور ہمہ گیر لیاقت و ذہانت ہر اعلیٰ و ادنیٰ محفل میں ان کی ذات کو ممتاز بنائے رہتی اور بڑی سے بڑی مجلس میں ان کی صفات غالب و نمایاں نظر آتیں۔ بیک وقت ان کو متعدد زبانوں اردو، انگریزی، فارسی، پشتو اور

وابستگی وغیرہ پر قدرت حاصل تھی۔ چونکہ میرے پیش نظر بخاری صاحب کے ادبی و لسانی کمالات سے بحث کرنا نہیں بلکہ ان کی باضابطہ شخصیت کی چند یادوں سے متعلق تذکرہ مقصود ہے اس لئے ان تفصیلات سے گریز مناسب ہوگا۔ مختصر یہ ہے کہ آل انڈیا ریڈیو لاہور کے اسٹیشن پر پروفیسر سید احمد شاہ بخاری کے ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہوتے ہی دونوں کی علمی و ادبی مجالس میں پطرس کے چرچے ہونے لگے۔

یاد رہے اگرچہ یہ تھا کہ پطرس بخاری نے محکمہ میں اپنی قابلیت کا سکہ جما لیا لیکن اس وقت ریڈیو اسٹیشن پر دو بخاری تھے۔ ان دونوں نے اپنے اپنے انداز فکر کے لحاظ سے اس برصغیر میں نشریات کی تاریخ کی تدوین کا آغاز کیا اور متحدہ طور پر مستحکم تنظیم کی بنا ڈالی۔ اب نشریات کی دو شخصیتیں بڑے بخاری اور چھوٹے بخاری کے نام سے مشہور ہو گئیں۔ کچھ عرصہ بڑے بخاری اسٹیشن ڈائریکٹر اور چھوٹے بخاری اسسٹنٹ ڈائریکٹر رہے۔ پھر بڑے بخاری ڈپٹی کنٹرولر مقرر ہو گئے اور چھوٹے بخاری اسٹیشن ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ فیلڈن صاحب کنٹرولر رہے۔ انہوں نے بڑے بخاری صاحب کو ان کی ذہانت و قابلیت کے بھروسے پر محکمے کے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا۔

ڈپٹی کنٹرولر بخاری نے برصغیر میں نشریات کا جال بچھانا شروع کیا۔ نئے نئے اسٹیشن کھولے۔ ضروری قواعد منضبط کئے اور گوشے گوشے سے نامور شخصیتوں کو کھینچ کر کسی نہ کسی حیثیت سے محکمہ نشریات میں لا شامل کیا۔ تعلیمی اور ادبی حلقوں سے متعدد نامور حضرات آ کر مختلف اسٹیشنوں پر جمع ہو گئے۔ پروفیسر رشید احمد (حال ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان) سومناتھ چب (حال سیکرٹری ٹرانسپورٹ ڈیپارٹمنٹ ہند) ن۔ م۔ راشد (حال ڈپٹی ڈائریکٹر اقوام متحدہ امریکہ متعینہ کراچی) محمود نظامی (حال ڈائریکٹر محکمہ تعلقات عامہ مغربی پنجاب) سلطان گوہر (حال کنٹرولر محکمہ درآمد و برآمد حکومت پاکستان) اعجاز بٹالوی (بیرسٹر) سید انصار ناصری (حال ریجنل ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان) ملک حبیب احمد (حال پبلک ریلیشنز آفیسر این ڈبلیو آر) رفیع پیرزادہ (مشہور بھارتی ادیب و فلم نگار) سعادت حسن منٹو مرحوم۔ راجندر سنگھ بیدی۔ خورشید انور (حال فلم ڈائریکٹر) مسعود پرویز (فلم ڈائریکٹر) فیروز نظامی (ڈائریکٹر) راقم الحروف اور متعدد اصحاب تھے جو بڑے بخاری صاحب کے عہد میں ان کے ایما سے یا تحریک پر نشریات میں داخل ہوئے۔ ان میں بعض حضرات نے بعد میں اپنے لئے کوئی نہ کوئی نیا میدان تلاش کر لیا اور بعض اب تک ریڈیو پاکستان میں موجود ہیں لیکن بخاری صاحب کی نظر انتخاب نے لوگوں کو قابل اعتماد تصور کیا تھا وہ اب خواہ کسی میدان میں بھی ہوں سر میدان ہی نظر آتے ہیں۔

ڈپٹی کنٹرولر ہونے کے زمانے میں بخاری صاحب فیلڈن صاحب ہی کی نظر میں نہیں بلکہ اعلیٰ انگریز حکام اور تمام اعلیٰ کی نگاہ میں بھی معتمد الیہ تصور کئے جانے لگے۔ ان کا ضابطہ تحریر و تقریر ہر دو حیثیت سے ناقابل تسخیر تھا۔ جو تجویز یا تحریک ہوتی معقول اور مدلل۔ جوابات کرارے اور مناسب۔ اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ افسران بالا سے منوا کر نہ چھوڑتے۔

بخاری صاحب کی بے ضابطہ شخصیت کے رموز و نکات اور ادبی کمالات سے تو ہر عام و خاص بخوبی واقف ہے اور پطرس کی حیثیت جاننے والے ان کے طنز و مزاح کی بے مثال خوبیوں کے دل سے مداح ہیں۔ لیکن ایک باضابطہ سرکاری افسر اعلیٰ کی حیثیت سے صرف وہی لوگ ان کی مختصر سی شخصیت سے آگاہ ہیں جنہوں نے ان کے ماتحت براہ راست یا بالواسطہ محکمہ نشریات میں کام کیا ہے۔ بخاری صاحب ڈپٹی کنٹرولر ہی تھے کہ میں ان کے ایما سے اسی محکمہ میں پروگرام اسسٹنٹ کی حیثیت سے داخل ہوا۔ یہ ۱۹۳۹ء کا زمانہ تھا اور میں اس وقت دہلی کے ایک اعلیٰ تعلیمی ادارے سے منسلک تھا۔ میرے ڈرامے اور تقریریں دہلی کے ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوا کرتی تھیں۔ دہلی میں رہتے سات آٹھ سال گزر چکے تھے۔ میں اور چھوٹے بخاری دہلی کے احباب کے قدیم رکن تھے۔ بڑے بخاری صاحب سے مجھے نیازمندی کا شرف حاصل تھا۔ ایک مجلس میں نشریات پر بات ہو رہی تھی۔ بحث کے دوران بڑے بخاری صاحب نے بڑی شفقت سے حاضرین میں سے چند اصحاب کو مخاطب کر کے مشورہ دیا بلکہ ڈانٹا کہ آپ لوگوں کو ریڈیو کے محکمے میں باضابطہ

۹

مولانا کو کہنا چاہیے تاکہ آپ اپنے حالات کے مطابق کو مفید اور رنگین [illegible] کی ادبی دلچسپیوں کا [illegible] آپ [illegible] ہو سکتے ہیں ایک شعر ایسا لا دیجیے کہ فرمایا" ـــ صاحب لکھنؤ سے کہتے سنے گئے [illegible] جو [illegible] اسسٹنٹ کی حیثیت سے یہاں [illegible] میں ان کے [illegible] کرتے تھے۔ میرے خیال میں وہ اس جگہ کے لیے [illegible] نہیں ضابطے کی پابندی [illegible] نہیں [illegible] صاحب سے واقف تھا۔ بخاری صاحب نے میری طرف دیکھ کر دیا۔ کیا خیال ہے؟ [illegible] بخاری صاحب [illegible] پہلے کہا کہ ارشاد ہے؟ بخاری صاحب نے مخصوص انداز سے زیر لب تبسم فرمایا [illegible] صاحب کے [illegible] آپ کا [illegible] انہیں [illegible] کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کی [illegible] اپنے [illegible] حاصل کرنے کا [illegible] ہے [illegible] آپ سے [illegible] ہوں اگر آپ کا خیال ہے تو درخواست دے دیجیے۔ موجود تھا [illegible] جواب [illegible] بخاری صاحب نے میرے [illegible] سوچ سمجھ کر [illegible] جلدی [illegible] انتخاب [illegible] ہوتے [illegible] صاحب بعد میں [illegible] شامل نہیں ہوتا سفارشوں [illegible] ملتی [illegible] دوسری باتیں ہوتی رہیں۔ مجلس برخاست ہوئی۔ چلتے ہوئے بخاری صاحب نے مجھ سے فرمایا: [illegible] میں نے عرض کیا [illegible] ہوں [illegible] صرف یہ سوچ کر اگر انتخاب میں آ گئے اور داخل دفتر ہو گئے تو [illegible] ملتی ہے [illegible] ٹھیک نہیں [illegible]۔

میں نے چند احباب و اعزا سے مشورہ کیا۔ درخواست بھی دی۔ منتخب بھی ہو گیا۔ پروگرام اسسٹنٹ کے عہدہ پر تقرر ہوا اور لکھنؤ اسٹیشن پر کی تعیناتی ہوئی میرے لیے دلی چھوڑنا سخت تکلیف دہ تھا۔ [illegible] کی چوکھٹ ـــ [illegible] شاعروں ادیبوں سے بڑھ کر [illegible] دوستوں کی جدائی بڑی شاق تھی۔ احباب کی رائے ہوئی کہ بخاری صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر لکھنؤ کی تعیناتی کی جگہ دلی اسٹیشن کی تقرری منظور کراؤں۔ یہ معاملہ قطعی بخاری صاحب کے اختیار کا تھا۔ میں نے ٹیلی فون کے ذریعے بخاری صاحب سے دفتری ملاقات کی اجازت لی۔ اب میں ڈپٹی کنٹرولر نشریات کے دفتر میں ایک پروگرام اسسٹنٹ کی حیثیت سے داخل ہوا تھا۔ لیکن بخاری صاحب نے میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی حسب سابق تپاک سے ہاتھ ملایا اور بیٹھ کر چند ضابطے کی ہدایات شروع کر دیں کیونکہ میں اس محکمہ میں نووارد تھا اور وہ ایک مخلص مہربان افسر اعلیٰ۔

بعد ازاں میں نے اصل معاملہ پیش کیا۔ اور اپنی لکھنؤ کی تقرری کے احکام کی تبدیلی اور دلی میں رہنے کی خواہش ظاہر کی۔ بخاری صاحب نے نہایت سنجیدگی سے کہا: "عشرت صاحب! آپ کا تقرر لکھنؤ کے لیے محض اتفاقیہ نہیں بلکہ دانستہ ہے۔ آپ عرصہ دراز سے دلی میں مقیم ہیں۔ آپ کے تعلقات یہاں کے ادبی اور تعلیمی حلقوں میں وسیع ہیں۔ آپ کا تقرر دلی ریڈیو کے کسی شعبہ میں ہو تو آپ کی جان ضیق میں ہو جائے گی۔ لوگ آپ کو شک و شبہ کی نظروں سے دیکھنے لگیں گے۔ آپ پر کسی حلقے کی بے جا طرفداری اور کسی کی بے جا مخالفت کے الزام لگائے جائیں گے جس محکمہ کا پبلک سے قریبی واسطہ ہو وہ عوام و خواص ہر طبقہ کی نظروں میں رہتا ہے۔ ریڈیو کے محکمے کا بھی یہی حال ہے اس لیے ریڈیو اسٹیشن کے ذمہ دار اور کسی حد تک بھی با اختیار اہلکار کا اپنے اسٹیشن (مقام) پر تعینات ہونا خود اس کے اور محکمہ دونوں کے حق میں مفید نہیں۔ آپ خاص مکتب خیال سے تعلق رکھتے ہیں۔ خود ادیب ہیں شاعر ہیں۔ آپ کے دوست بھی ادیب اور شاعر ہیں اور دشمن بھی۔ ان میں سے بعض آپ کے ہم خیال ہوں گے۔ اور بعض مخالف۔ آپ کس کس کو خوش رکھ سکیں گے۔ اپنے متعلقہ شعبہ میں آپ سارے شہر کے ادیبوں اور شاعروں کو پروگرام نہیں دے سکیں گے اس لیے بہت جلد مطعون ہو جائیں گے اور قاعدہ ضابطہ ہر طرح سے آپ کی کڑی نگرانی ہونے لگے گی۔ اور نتیجہ آپ کے حق میں مضر ہو گا۔"

بخاری صاحب کی یہ مشفقانہ نصیحت اور مجرب گر دل کو لگے۔ لیکن دلی کی مفارقت کا خیال ستا رہا تھا۔ میں نے پھر بھی عرض کیا: "آپ

نے جو کچھ فرمایا بجا ہے لیکن میں چاہتا تھا کہ ابھی کچھ عرصہ دہلی میں اور رہ لیتا اس کے بعد کہیں بھی بھیج دیا جاتا۔"

بخاری صاحب ذرا سر اونچا کر کے گردن ہلاتے ہوئے حسبِ عادت مسکرائے اور بولے: "آپ کہہ رہے ہیں میں ٹالنے کے لئے آپ کو بہلا رہا ہوں۔ بات معمولی ہے آپ کو کچھ عرصہ کے لئے نہیں مستقلاً دہلی میں رکھا جا سکتا ہے مگر بات اب کی ہے ابھی آپ کا قیام دہلی میں آپ کے لئے مناسب نہیں۔ ابتدائی ایام میں دہلی کی ادبی مجالس راس نہ آئیں گی ان سے دور رہ کر ہی کام کرنے کا موقع ملے گا اور پھر یہ جدائی عارضی ہے۔ 'یار زندہ صحبت باقی' اطمینان سے روانہ ہو جائیے اور لکھنؤ پہنچ کر کام میں دل لگائیے۔ اچھا! خدا حافظ!" اور کرسی سے اٹھتے ہوئے ہاتھ بڑھا دیا۔ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ بڑھاتے ہوئے بخاری صاحب کے سنجیدہ و متبسم چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے بعد سلام رخصت ہوا۔ میرے مخلص احباب میں سے ایک محترم بزرگ اکبر حیدری مرحوم تھے، میں نے ان سے بخاری کی گفتگو کا حال بتایا انہوں نے بخاری صاحب کی رائے کی حرف بحرف تائید کی اور کہا: "بخاری صاحب نے نہایت معقول فیصلہ کیا ہے۔ دہلی کے ادبی حلقوں میں اس قسم کی چہ میگوئیاں ابھی سے شروع ہو گئی ہیں۔ بعض ادیب احباب کو پروگراموں کی امید ہے بعض اس انتظار میں ہیں کہ اگر تم دہلی اسٹیشن پر تعینات ہو جاؤ تو تمہارے خلاف بے جا شکایتوں کا محاذ کھڑا کر دیں۔ بات ختم ہوئی۔ میں لکھنؤ چلا گیا اور بس!

جیسا کہ بخاری صاحب نے فرمایا تھا۔ یہ واقعی معمولی بات تھی اور ایک ادنیٰ ماتحت کے ساتھ (جو اس محکمہ میں ہنوز قدم رکھنے پایا تھا) اس قدر تفصیلی گفتگو کی چنداں ضرورت بھی نہ تھی۔ وہ حسبِ ضابطہ یہ کہہ کر بات ختم کر سکتے تھے کہ جس اسٹیشن پر تعیناتی ہوئی ہے وہی مناسب ہے اس حکم میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ لیکن بخاری صاحب کا ضابطہ اس کا خوگر نہ تھا انہوں نے ابتدا ہی سے مجھے اپنی ناصحانہ گفتگو سے اس محکمہ میں کام کرنے کے ضوابط اور نشیب و فراز سمجھا دیئے جن سے میں نے بہت سیکھا اور اپنی ملازمت کے دوران ان پر کاربند رہ کر اپنی ذات اور محکمہ کے لئے مفید ثابت ہوتا رہا۔ نیز انہوں نے حاکمانہ انداز اختیار کر کے سرسری طور پر میری درخواست رد کرنے کے بجائے بے ضابطہ طور پر ضابطہ کو اس خلوص اور محبت سے سمجھایا کہ میں قائل ہونے کے ساتھ ہی مطمئن واپس آیا۔

اس واقعہ کی عمومیت یہاں تفصیل طلب تھی۔ تاکہ بخاری صاحب کے ضابطہ کی خصوصیت واضح ہو سکے۔ ایک اعلیٰ افسر ہونے کی حیثیت سے انہوں نے محکمہ کے نظم و نسق کو اسی طرح منضبط کیا تھا ان کے ہر قول و فعل اور فیصلہ میں ہمیشہ خود اعتمادی کی "نکتہ رسی"، دور اندیشی اور قطعیت ہوا کرتی اور لطف یہ کہ کسی کے خلاف فیصلہ کی صورت میں اس کی دل آزاری کا اظہار تک نہ ہوتا۔ وہ ضابطہ کے ہر معاملہ میں معمولی بات کو خاص اہمیت دیئے بغیر نمٹا لیتے اور اہم بات کو عام انداز میں اس طرح طے کر ڈالتے جیسے نہایت معمولی ہو۔ یہ وہ دور تھا جب کہ ایک پروگرام اسسٹنٹ کا دائرہ اختیار بھی خاصہ وقیع و وسیع ہوتا۔ اسٹیشن ڈائریکٹر اور پروگرام ڈائریکٹر کے فیصلوں کی بنیاد زیادہ تر پروگرام اسسٹنٹ کی تجویز و رائے پر ہوا کرتی تھی۔ کانگریس و مسلم لیگ اور ہندو مسلم مناقشات کا زمانہ تھا۔ مسلم لیگ کے پیشِ نظر مسلمانوں کا مفاد اور ان کی آزادی کا حصول تھا۔ کانگریس ہندو گردی پر اڑی ہوئی تھی۔ محکمہ ریڈیو لاہور ہی نہیں سارے صوبہ کی سیاسیات کا مرکز تھا۔ ایک بار ایک بڑے ہندو مہاشے کی تقریر نشر ہونا تھی۔ میں نے تقریر کا مسودہ پڑھ کر مہاشے جی سے چند تبدیلیوں کے لئے کہا کیونکہ وہ باتیں پالیسی کے خلاف اور مناقشات کو بڑھانے والی تھیں۔ مہاشے جی نہ مانے۔ معاملہ اسٹیشن ڈائریکٹر تک پہنچا انہوں نے میری تجویز کے مطابق فیصلہ کیا۔ مہاشے جی بگڑ کر چلے گئے اور تقریر نشر کرنے سے انکار کر دیا۔ دوسرے روز مہاشے جی کی خفگی اور ریڈیو اسٹیشن کی کارروائی ضابطہ تمام اخباروں کی سرخیاں بن گئیں۔ ریڈیو کو موردِ الزام قرار دے کر خوب لے دے کی گئی۔ کانگریسی اخبارات نے ریڈیو کے محکمہ اور مرکزی حکومت کو ہلا ڈالنے کا اعلان کر دیا۔ میری موقوفی کا مطالبہ کیا گیا۔

غیر معمولی ہنگامہ تھا۔ ڈائریکٹر جنرل (بخاری صاحب) کو دہلی سے بنفسِ نفیس تحقیقات کے لئے آنا پڑا۔ بخاری صاحب نے تقریر

مسودہ پڑھا، صورت حال کا جائزہ لیا۔ اور پھر خود مہاشے جی سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے۔ کوئی گھنٹہ بھر بعد بخاری صاحب ریڈیو اسٹیشن واپس آئے مہاشے جی ان کے ہمراہ تھے۔ بخاری صاحب مسکرا رہے تھے اور مہاشے جی خاموش تھے۔ اسٹیشن ڈائریکٹر کے کمرے میں میری طلبی ہوئی۔ سامنے پہنچتے ہی مہاشے جی نے بڑی خندہ پیشانی سے ہاتھ ملایا اور بولے: "میری غلط فہمی ہی تھی مگر آپ کا انداز ناخوشگوار تھا۔" بخاری صاحب نے مسکراتے ہوئے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولے: "آپ بزرگ ہیں۔ لیکن ان لوگوں کی مجبوریاں احتیاط کی متقاضی ہیں۔" معلوم نہیں بخاری صاحب کی حکمت عملی، شگفتہ بیانی نے مہاشے جی پر کیا جادو کیا کہ وہ اپنی ساری منطق بھول کر اسی رات مجوزہ تقریر نشر کرنے پر آمادہ ہو گئے اور انہوں نے خود ہی اخبارات کے منہ بند کر دیے اور ہماری دوستی کا دم بھرنے لگے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بخاری صاحب کے علم و فضل اور حسن گفتار و کردار کی خوبی تھی جس نے آل انڈیا ریڈیو کے محکمہ کو ایسے طوفانی زمانے میں فرقہ وارانہ تفرقوں سے محفوظ رکھا۔ عملے کے ادنیٰ و اعلیٰ اراکین میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی سب فرقوں کے خواتین و حضرات شامل تھے۔ لیکن باستثنائے چند ہر اسٹیشن پر اتحاد و یگانگت کے روابط قائم تھے۔ ہندو مہاسبھا نے بارہا اس قسم کی تفرقہ اندازی کی کوشش کی۔ خصوصاً اردو زبان کو مٹا کر ہندی رائج کرنے کی بڑی جدوجہد کی۔ مگر مہاسبھائی جوڑ توڑ بخاری صاحب کے تدبر و حکمت نے توڑ پھوڑ کر رکھ دیے۔ نام بدل گیا ہندوستانی ہوا مگر زبان کی سلاست اور چاشنی بدلنے نہ پایا۔ اور جب ایک وقت آیا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے "زبان" اور مسلمان دونوں کے گلے پر چھری چلائیں تو انہوں نے کھلم کھلا انکار کر کے اس عہدۂ جلیلہ سے سبکدوشی اختیار کر لی۔

جب کانگریس کی حکومت برصغیر پاک و ہند میں قائم ہوئی۔ اس وقت سردار پٹیل جو کٹر مہاسبھائی ذہنیت کے مالک تھے محکمہ اطلاعات و نشریات کے وزیر مقرر ہوئے۔ مسٹر پٹیل نے اس وزارت پر متمکن ہوتے ہی محکمہ نشریات میں ہندوگردی کا آغاز کر دیا۔ زبان ہندی، پروگراموں کی ترتیب ہندی اور موسیقی کے لیے احکام نافذ کیے گئے کہ تمام پیشہ ور موسیقار خواتین گانے کے پروگراموں سے یک قلم خارج کر دی جائیں۔ ظاہر ہے کہ شوقیہ گانے والی خواتین سے مراد صرف غیر مسلم خواتین تھیں۔ بیک وقت مسلم دشمنی اور ہندو نوازی کی پالیسی مرتب ہو گئی۔ اردو زبان کی جگہ کھلم کھلا ہندی کا رواج عام ہوا۔ ڈائریکٹر جنرل (مسٹر بخاری) نے پہلے تو وزیر پٹیل کو سمجھایا بجھایا کہ اس انداز سے پروگرام بے جان ہو جائیں گے۔ ہمیں زبان اور آرٹسٹ دونوں کے مسئلہ کو مناسب اور موزوں طریقے سے حل کرنا چاہیے اور ایک متوازن و خوشگوار تناسب قائم رکھنا چاہیے۔ لیکن مسٹر پٹیل کا منشا ہی کچھ اور تھا وہاں تناسب کی جگہ تناسخ کا مسئلہ زیر نظر تھا۔ چنانچہ ذی ہوش، صاحب خرد و حوصلہ مند بخاری نے اس بے بسی اور بے اختیاری کے تحت اس اعلیٰ عہدے کو قبول کرنا اپنی کسر شان اور موجودہ پالیسی کو اختیار کرنا اپنی دیانت و بسالت کے منافی تصور کیا۔ بخاری صاحب گورنمنٹ کالج لاہور واپس آئے اور آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل ایک ہندو مہاشے (مجوزہ اسکیم کے مطابق) مقرر ہو گئے۔ بخاری صاحب نے اپنے اصول اور ایمان و ایقان کی قربانی گوارا کی نہ جاہ و منصب کی طلب میں سر تسلیم خم کیا۔

بخاری صاحب ضابطہ و قاعدے کے سختی سے پابند ہونے کے باوجود ہر معاملے کو چٹکی بجاتے باتوں باتوں میں طے کر دیتے تھے۔ مشکل سے مشکل مسئلے کو نہایت خندہ پیشانی سے بآسانی حل کرنا ان کے ضابطے کا خاصہ تھا۔ ان کی ضابطے کی زندگی کے بے شمار واقعات و لطائف مشہور ہیں جن کا بیان اس مختصر مضمون میں دشوار ہے۔ وہ اپنے تمام ماتحت اہلکاروں سے ایک اعلیٰ افسر سے زیادہ ایک ناصح مشفق کا سلوک اختیار کرتے۔ ہر شخص کی ذہنی صلاحیت اور قابلیت کو بخوبی پرکھ لیتے۔ اس کے ساتھ اسی انداز سے ہم کلام ہوتے اور اس کے عین مطابق برتاؤ کرتے۔ شگفتہ بیانی ان کا خاص کمال تھا۔ اور ہر شخص کے ساتھ گفتگو کے دوران میں اس کا دل موہ لینا اور بڑی سے بڑی شخصیت پر چھا جانا ان کا ادنیٰ کرشمہ تھا۔ ان کے حلقۂ احباب

میں سیاسی لیڈر، سرکاری افسرانِ اعلیٰ، پروفیسر، عالم فاضل اور ادیب و شاعر سب ہی تھے لیکن سب ہی کو ان کی لیاقت اور حسنِ گفتار کا معترف پایا۔ ان احباب میں سے اکثر ان سے ضابطے کے کاموں میں سفارشیں بھی کرتے لیکن وہ تمام معاملات میں وہی فیصلہ کرتے جو حق و دیانت کے مطابق ہوتا۔ لطف یہ ہے کہ خلافِ فیصلہ کی صورت میں بھی کسی کو شکایت کا موقع نہ دیتے۔ اور بڑے اطمینان و سکون سے اس طرح سمجھا کر ٹال دیتے کہ صاحبِ معاملہ مطمئن ہونے پر مجبور ہو جاتا۔

بخاری صاحب کا حاکمانہ برتاؤ اپنے ماتحت افسران ہی کے ساتھ مشفقانہ نہیں تھا بلکہ تمام درجوں کے ملازمین کے ساتھ بھی پسندیدہ تھا۔ ہر اہل کار ان کے حسنِ سلوک اور اخلاقِ حمیدہ کا گرویدہ اور معترف تھا۔ ماتحت عملے میں جو ادیب، شاعر اور ان کے دوست احباب شامل تھے ان کے ساتھ دفتر میں نہایت باضابطہ اور باقاعدہ ڈائریکٹر جنرل نظر آتے لیکن نجی صحبتوں میں اسی انداز کی بے تکلفی برتتے جس حیثیت کے تعلقات ہوتے۔ ضابطے کی پابندی کا یہ حال تھا کہ ایک بار اسٹوڈیو کے محافظ نے ان کو حسبِ ضابطہ بغیر پرمٹ دروازے کے اندر داخل ہونے سے روک دیا۔ نئی دہلی پارلیمنٹ اسٹریٹ کے براڈکاسٹنگ ہاؤس میں بالائی منزل پر ڈائریکٹوریٹ جنرل کے دفاتر تھے۔ اور زیریں منزل میں دہلی اسٹیشن کے دفاتر اور اسٹوڈیوز واقع تھے۔ واقعہ یوں ہوا کہ ایک دن بخاری صاحب اپنے دفتر سے اٹھ کر بغرضِ معائنہ اسٹوڈیوز کی عمارت میں جانے لگے۔ اسٹوڈیوز کے دروازے پر محافظ موجود تھا جس کا پہلا فرض یہ تھا کہ وہ اندر جانے والے ہر شخص کو روکے اور داخلے کا پرمٹ دیکھ کر دروازہ کھولے ورنہ باہر ہی روک دے۔ بخاری صاحب کا حکم تھا کہ اس ضابطے کی سختی سے پابندی کی جائے۔ اور وہ خود پرمٹ کارڈ اپنے لیے بھی ساتھ رکھتے تھے۔ اس وقت اتفاق سے پرمٹ ساتھ لے جانا بھول گئے۔ محافظ نے حسبِ ضابطہ ادب سے سلام کیا۔ اور عرض کیا: "حضور پرمٹ!" ڈائریکٹر جنرل بخاری نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ پرمٹ کارڈ نہ پایا۔ خاموشی سے مسکرائے اور واپس اپنے دفتر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد چپراسی آیا اور محافظ کی طلبی کا حکم سنایا۔ "ڈائریکٹر جنرل کو اس طرح بے باکی سے روک دیا۔ اب خیریت نہیں۔" محافظ بے چارہ تھر تھر کانپنے لگا۔ باضابطہ پیشی ہوئی۔ اور محافظ جو ڈرتا کانپتا حاضر ہوا تھا خوش خوش اکڑتا ہوا اپنی ڈیوٹی پر واپس گیا۔ ڈائریکٹر جنرل نے اس کی فرض شناسی اور مستعدی کی تعریف کر کے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ اور کئی روز تک اس محافظ کے چرچے براڈکاسٹنگ ہاؤس میں ہوتے رہے۔

عام طور پر حکومتِ انگریزی کے زمانہ میں جب افسرانِ بالا اپنے ماتحت دفاتر میں معائنہ کی غرض سے جاتے تو عملے کی جانب سے شاندار ضیافتیں ہوا کرتیں لیکن بخاری صاحب جب کسی شہر میں ریڈیو اسٹیشن کے معائنہ کو جاتے اور دستور کے مطابق ان کو اسٹاف کی جانب سے دعوت دی جاتی تو وہ منظور کرنے کے بعد یہ شرط کرتے کہ دعوت کے مصارف ان کے ذمے ہوں گے وہ صاف طور پر کہہ دیتے کہ آپ لوگوں کا مقصد مجھ سے ملاقات کرنا ہے مجھے آپ سب کے ساتھ مل بیٹھنے سے مسرت ہوگی لیکن آپ کو جو خوشی ہوگی اس کی قیمت آپ کی جیبوں سے ادا کرانے کا بارِ خاطر نہیں بننا چاہیے۔ وہ ان دعوتوں میں تمام اہل کاروں سے نہایت بے تکلفی اور خندہ پیشانی سے ملتے اور بے ضابطہ طور پر ان کی مشکلات کا حال دریافت کر کے ان کے حل بتلاتے رہتے۔ آل انڈیا ریڈیو کی تعمیر و تنظیم بخاری صاحب کی دانش و تدبر کی رہینِ منت تھی۔ نئی دہلی کے براڈکاسٹنگ ہاؤس کی تعمیر، پروگراموں کی ترتیب، برصغیر کے تمام بڑے بڑے شہروں میں نشری مرکزوں کا قیام اور ان کا استحکام انہی کے ہاتھوں انجام پایا۔ ہندوستان میں نشریات کی توسیع کا جو کام ۱۹۴۷ء اور اس کے بعد عمل میں آیا اس کا خاکہ بخاری صاحب نے کئی سال قبل مکمل کر لیا تھا یعنی چپہ چپہ پر نشریات کا ہمہ گیر جال بچھانے کا دستور العمل انہوں نے تیار کر دیا تھا جس پر بعد میں عمل درآمد ہوا۔ اس عالی دماغ اہلِ علم و بصیرت نے نشری دنیا میں اپنے تدبر و حکمت اور فنی و انتظامی صلاحیتوں کے غیر معمولی جوہر دکھائے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہند و پاکستان کے درمیان محکمہ نشریات کے سامان کی تقسیم کے سلسلے میں جو کمیٹی

بنائی گئی۔ اس کے صدر و مشیر اعلیٰ بخاری صاحب ہوئے۔ اس طرح ریڈیو پاکستان کی بنیاد بھی انہیں کے لائق ہاتھوں سے پڑی اور ان کے دست راست برادر عزیز سید ذوالفقار علی بخاری ڈائرکٹر جنرل مقرر ہوئے (جو حال ہی میں ریٹائر ہوئے ہیں)

پطرس بخاری نے اقوام متحدہ میں پاکستان کے مستقل نمائندے کی حیثیت سے اہم خدمات انجام دیں اور ملک و قوم کا پرچم بلند کیا۔ اقوام متحدہ کے محکمۂ نشریات اور اطلاعات کے شعبوں کی تنظیم کی مہم بھی بخاری صاحب نے انجام دی۔ خصوصاً اقوام متحدہ سے اردو نشریات کے سلسلے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔

بخاری صاحب کی نغز گوئی، بیدار مغزی، اور شگفتہ بیانی اقوام عالم کے سربر آوردہ نمائندگان میں ضرب المثل ہو چکی ہے اور انہوں نے اپنے حسن گفتار اور دانش و حکمت کا دنیا بھر سے لوہا منوالیا۔ لیکن اس بین الاقوامی شہرت اور عز و افتخار کے مالک ہونے کے باوجود ان کا دل وطن اور احباب وطن کے لئے ہمیشہ بے چین رہا۔ افسوس کہ ان کی آخری حسرت بر نہ آئی۔ اور وہ سرزمین وطن و یاران وطن سے دور دیار غیر میں ہمیشہ کے لئے سو گئے۔ یاران وطن ان کے دیدار سے محروم رہے اور انہوں نے بین الاقوامی شہرت کے دامن میں دائمی آرام گاہ بنائی۔ ہم ان کے نام کام اور گفتار و کردار کی یادگار پر عقیدت کے پھول چڑھاتے رہیں گے۔ ع

بضاعت سخن آخر شد و سخن باقیست

پطرس

حکیم یوسف حسن

جینئس بننے یا کہلانے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ کسی کی پشت پر بہت سی تصنیفات لدی ہوں یا اس کے سینے پر بہت سی تعلیمی ڈگریوں کے طلائی تمغے جھلملا رہے ہوں۔ جینئس پیدائشی ہوتا ہے اکتسابی نہیں ہوتا اس کی غیر معمولی ذہانت ہی اسے اس رتبہ پر پہنچا دیتی ہے۔

اس ربع صدی کے نامور اور ذہین ادبا پر ایک نظر ڈالی جائے تو زیادہ سے زیادہ ایک درجن ناموں پر نگاہ رکتی ہے اور اس نظریہ کے ثبوت میں کہ غیر معمولی ذہانت کا ڈگریوں سے کوئی تعلق نہیں ہمیں تاثیر و پطرس کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے۔

تاثیر میرا دوست، میرا ساتھی اور نیرنگ خیال کا مدیر معاون تھا اس لحاظ سے تاثیر مرحوم کے مجھ پر بہت سے حق حقوق ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب تاثیر کیمبرج میں داخلے کے لئے پہنچے تو انہوں نے بی اے میں داخلہ لیا۔ اور پطرس نے بھی بی اے ہی میں داخلہ لیا۔ لیکن تاثیر نے انگریزی ادب کے متعلق اتنا کچھ پڑھا ہوا تھا کہ اگر میں کہہ دوں کہ وہ کئی لائبریریوں کو نگل چکا تھا تو اسے مبالغہ نہ سمجھا جائے۔ کیمبرج کے پروفیسروں سے تبادلہ خیال ہوتا رہتا تھا۔ وہ تاثیر کی عظیم واقفیت سے بے حد متاثر ہوئے اور انہوں نے اسے براہ راست ایم اے میں داخلے کی اجازت دے دی اور پھر ایم اے میں اس کی قابلیت کے جوہر جو کھلے تو کیمبرج کے مروجہ دستور کے علی الرغم انہیں پی ایچ ڈی میں بیٹھنے کی اجازت کیمبرج کونسل کے ایک اسپیشل اجلاس میں دے دی گئی۔ تاثیر کو پی ایچ ڈی کے لئے قرون وسطیٰ کی انگریزی نظم میں تصوف کے رجحانات پر تحقیقی مقالہ تیار کرنا تھا۔ عنوان ہی سے اس کی سنگلاخی ظاہر ہے مگر تاثیر نے کیمبرج سے پی ایچ ڈی نمایاں حیثیت سے حاصل کر لی۔ شاید تاثیر پہلے ہندوستانی تھے جنہیں یہ فضیلت حاصل ہوئی تھی۔ تاثیر مرحوم نے اس واقعہ کی تفصیل اپنے ایک خط میں دی ہے۔ جو نیرنگ خیال میں شائع ہو چکا ہے۔

پطرس جب بی اے (کیمبرج) بن کر آئے تو ان سے ملاقات ہوئی۔ تاثیر کے متعلق پوچھا تو انہوں نے بے ساختہ کہا۔ حکیم صاحب! تاثیر وہاں پڑھنے تھوڑا گیا ہے وہ تو پروفیسری کر رہا ہے۔

تاثیر اور پطرس کی کیمبرج کی ڈگریوں میں عظیم تفاوت ہے۔ تاثیر کا انگریزی ادب پر عبور محیر العقول ہے لیکن جہاں تک فطری ذہانت کا تعلق ہے پطرس کا مقام بہت آگے ہے تاثیر اور پطرس کی انگریزی اور اردو کا بغور مطالعہ کیا جائے تو پطرس میں جو رنگینی، لطافت اور نمک پائی جاتی ہے وہ تاثیر میں موجود نہیں۔

تاثیر نے بھی مزاحیہ رنگ میں چند مضامین نیرنگ خیال میں لکھے تھے جو ادب میں اچھا مقام رکھتے ہیں لیکن ہم انہیں پطرس کے مزاحیہ مضامین کے ساتھ نہیں رکھ سکتے۔

پطرس کا ادبی کارنامہ صرف پطرس کے مضامین ہیں۔ اس ننھی سی کتاب کے متعلق یہ کہیں شیخ سعدی نے فرمایا تھا کہ:

ہر چہ بقامت کہتر بقیمت بہتر

اس کے مصداق یہ چند مضامین ہی پطرس کی عالمگیر شہرت اور ناموری کا باعث بن گئے۔ گو یہ مبالغہ ہے کہ ہند و پاکستان کی تمام مزاحیہ کتابوں کو ترازو کے ایک پلڑے میں ڈال دیا جائے اور پطرس کے مضامین دوسرے پلڑے میں رکھے جائیں۔ تو پطرس کے مضامین بھاری رہیں گے

پطرس کے مضامین کے بعض حصے نیرنگِ خیال میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اور پطرس کی یہ مزاحیہ تصنیف تو یقیناً پڑھنے والوں کی نظر سے گذری ہوگی۔ لیکن پطرس نے ان مزاحیہ مضامین کے علاوہ اور بھی بہت کچھ لکھا ہے جس کا مجموعہ نقوش کے اس نمبر میں آپ کے ملاحظہ سے گذرے گا۔ اور جس سے معلوم ہوگا کہ پطرس نے ادب اور زندگی کے ہر شعبہ میں بہت سی کارآمد باتیں لکھی ہیں۔

پطرس کی شہرت ان مضامین سے بھی ہوئی تھی۔ جو نیازمندانِ لاہور کی طرف سے نیرنگِ خیال اور کاروان میں شائع ہوتے تھے۔ ان مضامین میں طنز و مزاح کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ نیازمندانِ لاہور کون تھے؟ یہ سوال اکثر لوگوں کو پریشان کرتا رہا۔ نیازمندانِ لاہور سے مراد تین اصحاب تھے۔ پطرس، تاثیر اور سالک۔ جو مضمون بھی شائع ہوتا تھا اس پر تینوں متفق ہوتے تھے۔ اصل میں ہوتا یوں تھا کہ دفتر نیرنگِ خیال میں تبادلہ کے رسائل اور ریویو کے لئے کتابیں موصول ہوتی تھیں۔ جب ان میں کوئی چیز ایسی ہوتی جس پر بحیثیت پنجابی ہونے کے ہمیں توجہ کی ضرورت ہوتی تو میں وہ مواد تاثیر کے سپرد کر دیتا کہ اس کتاب یا اس رسالے کے فلاں مضمون پر نشتر زنی کی ضرورت ہے۔ تاثیر صاحب وہ مواد مع اپنے خیالات و تحقیق کے ساتھ پطرس صاحب تک پہنچا دیتے۔ اور پطرس صاحب اس پر ایک مضمون قلم بند فرماتے جس پر آخری ہاتھ جناب عبدالمجید صاحب سالک لگاتے تھے۔ اور پھر وہ مضمون نیرنگِ خیال میں شائع ہو جاتا۔ ان مضامین کی ان دنوں یوپی اور اہلِ زبان میں بڑی دھوم تھی۔ ان میں مزاح سے زیادہ طنز اور تنقید ہے۔

پطرس صاحب زندہ مزاج تھے۔ احباب کے ساتھ جس مجلس میں بھی وہ بیٹھتے۔ ان کے درخشاں اور شگفتہ چہرے سے مزاح کی پھوار پڑتی تھی۔ ان کے منہ سے مزاح بھرے فقرے اور الفاظ اس طرح سلیس ادا ہوتے تھے کہ تمام مجلس لوٹن کبوتر بنی رہتی تھی۔ اس مزاح میں عامیانہ اور گھٹیا انداز میں کوئی بات نہ ہوتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ گھنٹوں بیٹھے پطرس کی باتیں سنتے رہیں۔

جب پطرس صاحب آل انڈیا ریڈیو میں ڈائریکٹر جنرل تھے۔ تو ریڈیو کی بعض پالیسیوں کے متعلق میں نے نیرنگِ خیال میں سختی سے نکتہ چینی کی۔ یہ سلسلہ کوئی دو مہینے چلا ہوگا کہ پطرس کا ایک خط مجھے ملا جس میں اس قسم کے الفاظ تحریر تھے "میرے خلاف سب کچھ لکھیں تو میں برداشت کروں گا لیکن میرے خلاف نیرنگِ خیال میں کچھ لکھا جائے تو میں اسے برداشت نہ کر سکوں گا۔" خط کے پہنچتے ہی میں نے یہ سلسلہ نیرنگِ خیال میں فوراً روک دیا۔

ایک دفعہ ہمارے دوستوں نے نیرنگِ خیال کو نیچا دکھانے کے لئے "مخزن" کا سہارا لیا۔ تاثیر مع اپنے "عملہ" کے مخزن کے دفتر میں جا پہنچے صبح سے شام تک یہ عملہ مخزن کو بڑھانے اور مقبول بنانے میں مصروف نظر آتا تھا۔ پطرس، سالک اور امتیاز کو بھی اپنے ڈھب پر لانے کی انہوں نے کوشش کی اور ان کے بعض مضامین جو نیرنگِ خیال کو ملتے تھے۔ انہوں نے راستے ہی میں اچک لئے۔ اس معرکہ میں پطرس صاحب نے صاف صاف کہہ دیا تھا، کہ "چوہے بلی کے گلے میں گھنٹی تو باندھیں گے لیکن اس کی میاؤں کا کیا علاج کریں گے۔ تمہارے طائفہ کے پاس سب کچھ ہے لیکن حکیم صاحب کی سوجھ بوجھ کہاں سے لاؤ گے؟" چنانچہ اس جماعت کی یہ تمام کوشش پوری طرح ناکام ہو گئی۔

پطرس نیرنگِ خیال کے دورِ اوّل کے لکھنے والوں میں سب سے نمایاں شخصیت تھے۔ بلکہ مجموعی طور پر انہوں نے دوسروں سے کچھ زیادہ ہی لکھا ہے۔ ان تحریروں میں ڈراما، فلم، افسانہ، ادبِ لطیف، تنقید، طنز و مزاح سبھی کچھ شامل ہے،

جس کی باتوں میں گلوں کی خوشبو

آغا بابر

جس قلم سے آج یہ چند منتشر خیالات خراجِ عقیدت کے طور پر پروفیسر بخاری مرحوم کی نذر کر رہا ہوں، یہ قلم چلانا انہوں نے ہی سکھایا تھا۔ وہ میرے استاد تھے، مشفق تھے۔ زندگی کی جنگ لڑنے کا اعتماد، زمانے سے نہ ہارنے کا جذبہ، سب کچھ انہیں کی تہذیب و تربیت کا نتیجہ تھا۔ ان کی ناگہانی موت سے خیالات اس طرح پریشان ہیں کہ کیا لکھوں کیا نہ لکھوں۔ رشتہ ترتیب قلم سے ٹوٹ گیا ہے۔ جیسے جیسے دماغ میں جو کچھ آ رہا ہے جس ترتیب سے آ رہا ہے اسی طرح پیش کر رہا ہوں ۔

خط مسلسل است پریشاں چو زلفِ یار
عیبم مکن کہ در شبِ ہجراں نوشتہ ام

گورنمنٹ کالج لاہور ہندوستان میں سب سے بڑی اور سب سے پرانی درس گاہ تھی۔ اس کی تعلیم کا ڈھنگ، علمی و ادبی صحبتیں اور پروفیسروں کی قابلیت کا شہرہ دور دور تھا۔ لڑکے اس درس گاہ سے ہو کر نکلتے۔ انہیں بھی فخر ہوتا اور پروفیسروں کو بھی۔ جب میں فرسٹ ایر میں یہاں داخل ہوا تو پروفیسر بخاری انٹرویو بورڈ میں تھے بلکہ بورڈ میں انہیں کی رائے چلتی تھی۔ گردن پر آپریشن ہونے کی وجہ سے ایک گڑھا سا پڑتا تھا۔ جس کی وجہ سے نسیں کھنچی رہتیں۔ شکل و صورت ایرانیوں کی سی تھی۔ ان دنوں مسٹر گیرٹ پرنسپل تھے۔ پروفیسر بخاری کی وضع قطع، باتیں کرنے کا ڈھنگ، لباس اور اطوار سے یورپی انداز ٹپکتا۔ کسی پروفیسر کی کیا مجال کہ گیرٹ کے کمرے میں سگریٹ پیتے ہوئے گھس جائے۔ مگر پروفیسر بخاری جب پرنسپل کے کمرے میں جاتے تو ہم کی ہول (KEY HOLE) میں سے دیکھتے۔ گیرٹ کے سامنے وہ کھڑے سگریٹ پیتے۔ دھواں نتھنوں سے نکلتا۔ کبھی کش لیتے تو دھواں منہ سے نکلتا، نتھنوں سے۔ باتیں رہتے ہی دھواں غائب۔ اتنی دیر میں دھواں نتھنوں سے نکلتا پھر منہ سے۔ یہ تماشا کس نے دیکھا تھا۔ گورنمنٹ کالج کے چرچل کے پروفیسر کا یہ انداز اپنے اندر عجیب وقار، حسن، اور کشش لیے ہوئے تھا۔ پروفیسر بخاری بی۔ اے کو ڈراما پڑھاتے تھے۔ میری بڑی خواہش تھی کہ میں ان کی باتیں سنوں، ان کی صحبت میں بیٹھوں۔

اردو مجلس کے وہ صدر تھے۔ اجلاس ان کے مکان پر ہوتے تھے۔ وہ ان دنوں میکلوڈ روڈ پر عطر چند کپور بلڈنگ میں رہتے تھے۔ پہلی دفعہ مجھے وہیں پروفیسر بخاری کی باتیں سننے کا اتفاق ہوا۔ فلیٹ کے برآمدے کی آرائش اور ڈرائنگ روم کی سجاوٹ ہر شے میں مغربی انداز جلوہ گر تھا۔ اس مغربی احول میں اردو مجلس کی میٹنگ، پھر گفتگو کا انداز انتہائی بے تکلف، سب کے ساتھ خلوص آمیز میل ملاپ۔ اس مجلس میں سید امتیاز علی تاج اور سالک صاحب بھی تھے۔ ان سے بخاری کی گفتگو کرتے تو بات بات کے نکڑ سے عجیب پھلجھڑیاں اور شرارے پھوٹتے۔ تین گھنٹے کی مجلس ہی، مگر وقت گزرنے کا پتہ

ان کی ذات میں مشرق و مغرب کا جو حسین امتزاج ہوا تھا، پہلی صحبت ہی میں آدمی اس سے متاثر ہوتا۔ کمال تو یہ تھا کہ وہ بڑے بڑے اہم اور سنجیدہ مسئلے پر بحث کرتے ہوئے کس طرح [illegible] ہنستے ہنساتے [illegible] جاتے تھے۔ [illegible] ساری محفل کو گرما دیتی۔ ان کی شخصیت میں ایک ایسی گرفت تھی [illegible] ہنسی ہنسی میں [illegible] کی تہذیب [illegible] وکیل تھے۔ گھر پر [illegible] جس کی کھیتی کو سینچ رہے تھے۔ راشد اور فیض کو جدید شاعری کے گل بوٹے [illegible] شاعر [illegible] سے دلی میں جو ایٹ دی پوپومیک (THE MAN WHO ATE THE POPOMACK) کا ریہرسل ہو رہے ہیں۔ انگریزی مباحثوں میں حصہ لے رہے ہیں، ادب اور فلسفہ پر لیکچر تیار کر رہے ہیں۔ پھر آئنسٹائن پڑھی ہوئی ہیں [illegible] ڈرامے کی [illegible] ایک ایک لمحے سے [illegible] کا اس طرح رس نچوڑ رہے ہیں کہ وقت اپنی تہی دامنی پر نادم ہے۔ ان کے کام کرنے کا طریقہ اتنا خوش آیند ہوتا کہ دیکھنے والوں میں بھی تکمیل کار کا ایک ولولہ جاگ اٹھتا۔ جو لوگ ڈرامے کا ریہرسل دیکھنے آتے [illegible] وہ لڑکوں کو یونیورسٹی ڈی بیٹ کے لئے تیار کرتے تو لڑکوں کا بھی جی چاہتا کہ وہ اس ڈی بیٹ کو زندگی کا مسلک بنالیں۔ یہ بخاری صاحب کے خلوص کے کرشمے تھے۔

صوفی تبسم اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ:-

> "بخاری کا مقولہ ہے کہ کسی کام کی صحیح تکمیل کے لئے انسان میں محض شوق نہیں بلکہ چسکا ہونا چاہئے چنانچہ وہ جب بھی کسی کام کو کرتے ہیں تو ایسے ذوق و شوق سے کرتے ہیں گویا انہیں اس کام کا چسکا ہے۔"

ان کا اپنے شاگردوں سے بڑا مشفقانہ برتاؤ ہوتا تھا، کلاس میں بھی اور کلاس سے باہر بھی۔ اس کے باوجود ان سے ڈر بھی لگتا۔ وہ اس لئے کہ جہاں کوئی اصول کی بات آ جاتی، وہ معاف نہ کرتے، ڈانٹ پڑ جاتی۔ میں نے بی اے میں ان سے ڈرامہ پڑھا۔ شیکسپیئر کے وہ عاشق تھے۔

"ہملٹ" ہمارے نصاب میں تھا۔ جہاں پولونیس لی آرٹیز کو تقریر کرتے ہوئے عقل و دانش کی باتیں سمجھاتا ہے جو انسانی زندگی اور دنیوی تجربوں کا نچوڑ ہیں۔ اس مقام پر شیکسپیئر نے جو باتیں سمجھائی ہیں ان کے متعلق پروفیسر بخاری ہمیں نوٹس لکھوانا چاہتے تھے۔ ہم نے اپنا اپنا قلم سنبھالا۔ اصغر (اب کمانڈر [illegible] راولپنڈی) میرے دائیں بیٹھا تھا۔ اس نے موٹا سا پیلے رنگ کا قلم نکالا۔ نوٹ بک پر اس روز کی تاریخ لکھی اور میری نوٹ بک کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اپنے قلم سے تاریخ لکھنی چاہی تو قلم نے لکھنے سے انکار کر دیا۔ میں نے اصغر کی طرف دیکھا پھر قلم کو انگلی سے ذرا ٹھونک کر لکھنا چاہا۔ قلم نے نہ لکھا۔ میں نے اصغر کو زور سے کہنی ماری اور کہا:-

"ادھر مت دیکھو میرے قلم کو نظر لگ رہی ہے۔"

پروفیسر بخاری نے مسکرا کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

ہم اگلی بنچوں پر بیٹھا کرتے تھے۔ دو سال ہوئے میں نے اپنے افسانوں کا تازہ مجموعہ "لب گویا" ن۔م۔ راشد کے ہاتھ بخاری صاحب کو نیویارک بھیجا۔ میں نے اس پر لکھا —— "اپنے نالائق شاگرد کی طرف سے یہ کتاب۔ قبول فرمائیے جو اگلی بنچوں پر اس لئے بیٹھا کرتا تھا کہ آپ پچھلی بنچوں پر بیٹھنے والوں سے سوال پوچھا کرتے تھے" —— بخاری صاحب مسکرا کر کتاب دیکھنے لگے اور اگلے روز نئے سال کا کارڈ مجھے روانہ کیا جو اس وقت میرے سامنے موجود ہے۔ ہملٹ کا وہ نسخہ بھی جو پروفیسر بخاری ہمیں پڑھایا کرتے تھے میرے پاس موجود ہے حقیقت میں تو ہمارے پاس

ان کے وہ تحفے ہیں جن کو ہم نے زندگی بھر اپنائے رکھا ہے۔ یہ تحفے کا رنگ جو ہم طالب علمی کے زمانے سے پال رہے ہیں انہیں کی بخشش ہے۔ ڈرامے کا شوق بلکہ چسکا انہیں کا دیا ہوا ہے۔ جذبات کی یہ آنچ جس نے استخوان تک کو جلا دیا ہے اور ابھی "آرزوئے سوختن باقیست" انہیں کا کرشمہ ہے انہوں نے ن۔ م۔ راشد کی حوصلہ افزائی کی، فیض کی کمر ٹھونکی۔ آغا عبد الحمید (سی ایس پی)، بشیر قریشی (سی ایس پی)، علی صفدر (سی ایس پی)، رشید احمد (ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل، ریڈیو پاکستان) اور منظور علی خاں (سابق ایڈیٹر پاکستان ٹائمز) پروفیسر بخاری کے وہ شاگرد ہیں جن کی علمی استعداد اور ادبی تہذیب؛ تربیت بخاری صاحب کی شخصیت کا پرتو ہیں۔ وہ روشنی کا چراغ جس سے ہزاروں چراغ جلے، سینکڑوں نے اکتساب نور کیا آج اپنی زندگی ختم کر چکا ــــ

پرانے واقعات تازہ ہو کر ذہن پر وارد ہو رہے ہیں جن سے اپنے استاد کی تعظیم و تکریم میں اضافہ ہو رہا ہے اور اس عظیم انسان کا وقار، فضیلت بڑھ رہا ہے مرحوم کی شخصیت کا ایک پیارا پہلو یاد آیا ــــ

اصغر حسین قلعہ گوجر سنگھ میں رہتا تھا۔ پروفیسر صوفی تبسم نے کہا "تم میکلوڈ روڈ سے گزرتے ہوئے بخاری صاحب کے ہاں چلے جانا اور ان سے کہنا کہ آج شام کو چھ بجے اردو مجلس کی میٹنگ ان کے مکان پر ہو گی۔"

اصغر نے عزیز چند کپور بلڈنگ کے ساتھ بائیسکل رکھا۔ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا۔ دروازہ اندر سے بند۔ بجلی کی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ کوئی جواب نہ آیا۔ اس نے انگلی رکھ کر بٹن کو زیادہ زور سے دبایا۔ پھر بھی کوئی جواب نہ آیا۔ اب وہ انگلی رکھ کر دباتا ہی چلا گیا۔

بخاری صاحب ڈریسنگ گاؤن پہنے ہوئے آئے۔ دروازہ کھول کر بولے: "جو گھنٹی کے بٹن کے اوپر لکھا ہے تم نے پڑھا؟"

وہاں لکھا ہوا تھا "BE BRIEF AND PATIENT"

اصغر کچھ نہ بولا۔ انہوں نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا "NO MISTAKE IN FUTURE" اور چلے گئے۔ اصغر حیران کہ اچھا پیغام دینے آئے کہ الٹی ڈانٹ کھائی اور اس مرد خدا نے پوچھا تک نہیں کہ کیوں آئے کیا بات ہے؟

اصغر نے گھنٹی کو زور سے بجایا، سیڑھیاں اترا۔ بائیسکل لیا اور بھاگ گیا۔ اگلے دن پروفیسر بخاری کے پیریڈ میں اصغر کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ حاضری لے رہے تھے جب نمبر ۵۶ بولا تو رک گئے۔ اصغر کا برا حال۔ بخاری نے رجسٹر سے نظر اٹھائی۔ اصغر کی طرف دیکھا۔ ذرا سا ڈرامائی وقفہ دے کر بولے ـــ "I LIKED IT!"

اور حاضری لینے لگے

اسی زمانے کی بات ہے۔ یونیورسٹی سے کہہ سن کر پروفیسر بخاری نے کالجوں میں پراکٹوریل سسٹم رائج کرایا۔ طلبا کو شناختی کارڈ رکھنے کا حکم دیا گیا۔ نو بجے سے اوپر بغیر اجازت نامہ کے طالب علم گھر سے باہر نہیں رہ سکتا تھا۔

میں ایک دن پکڑا گیا

میں اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کے ساتھ ایک کھانے پر مدعو تھا۔ انہوں نے مجھے گنڈیریاں لینے بھیج دیا۔ میں گوالمنڈی کے چوک میں گنڈیریاں تلوا رہا تھا کہ ایک کار آ کر رکی۔ بخاری صاحب بولے۔ "اجازت نامہ؟"

میں نے کہا "میں تو ـــ"

بولے "کل صبح" اور چلے گئے۔

میں نے عاشق صاحب سے اجازت نامہ لیا کہ میری اجازت سے باہر گیا تھا، مگر بخاری صاحب نے دس روپے جرمانہ کر دیا۔ بولے "اس

وقت تمہارے پاس اجازت نامہ کیوں نہیں تھا؟ تم نے اصول توڑا ہے"۔

آج جب ہم اپنے بچوں سے اصول برتتے ہیں تو انہیں کیا معلوم کہ اس پر ہمارے پروفیسر کی تربیت بول رہی ہے ہم نے جو کچھ اپنے استاد سے سیکھا آگے [illegible] دے رہے ہیں۔

گزشتہ جنوری میں وہ ڈھائی برس کے بعد رخصت لے کر امریکہ سے پاکستان آئے۔ راولپنڈی میں اپنے بڑے لڑکے ہارون کے پاس چند دن رہے۔ میں ملنے گیا۔ وہی پرانی گرم جوشی اور بزرگانہ شفقت، پوچھنے لگے "سنا ہے تم نے پنڈی میں ڈرامے سٹیج کئے ہیں"۔

میں نے کہا "آپ کی لگائی ہوئی آگ ابھی تک نہیں بجھی" یہ سن کر مسکرائے۔

میں نے کہا "پنڈی تھیٹر گروپ آپ کو چائے کی پیالی پلانے کا خواہشمند ہے"

بولے "میں ان تکلفات (FORMALITIES) سے بڑا تنگ آ گیا ہوں۔ تم بلاؤ تو آ جاؤں گا۔ کراچی اور لاہور میں میں نے کسی ادارے کی دعوت قبول نہیں کی"

میں نے کہا "پنڈی تھیٹر کو کوئی پیغام ہی دے دیں"۔

بولے "پیغام تو بڑے آدمی دیا کرتے ہیں"۔

راولپنڈی میں انہوں نے اپنے شاگردوں اور مداحوں کے ساتھ ایک شام بسر کی۔ عابد علی کے ہاں تین گھنٹے محفل جمی، وہ گفتگو کے بادشاہ کو ہم نے پھر بلندیوں پر اڑتے دیکھا۔ دل خوش ہوا کہ دل کے دورے نے ابھی تک اس عظیم شخصیت کا کچھ نہیں بگاڑا۔ وقت سے زندگی کا پورا رس نچوڑنے والا یہ انسان ابھی زندہ رہے گا۔

وہ اپنے قیام کے دوران اپنے شاگردوں اور دوستوں سے پہلا سوال یہی کرتے رہے "کیا تم مطمئن ہو؟"

اس سوال کو اولیت دینے کی وجہ پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ پاکستان کا ہر شخص شاکی نظر آتا ہے۔ میں یہاں ایک عام فرسٹریشن دیکھ رہا ہوں بے دلی، بے اطمینانی اور محرومی کا احساس چاروں طرف دکھائی دے رہا ہے۔ لوگوں کی اپنی ذات میں دلچسپی انتہائی طور پر بڑھ گئی ہے سب قوموں میں میں نے یہ دیکھا ہے کہ ان کی قوم کا کوئی فرد امریکہ میں آئے تو وہ اس کی بے حد تعریف کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں یہ ہمارے ملک کا ممتاز اور قابل ترین فرد ہے۔ واحد پاکستانی ایسا شخص ہے جسے میں نے کبھی اپنے ملک کے فرد کی تعریف کرتے نہیں سنا۔ وہ تو دراصل یہ کہنا چاہتا ہے کہ سب سے ممتاز اور قابل ترین فرد تو میں ہوں: یہ تو بس ایسوں میں سے ہی ہے۔ اگر کسی کو کوئی اچھا عہدہ مل جائے۔ کسی منصب پر کوئی جا پہنچے اور کسی پاکستانی سے کہا جائے۔ "کیوں بھئی۔ وہ اچھے عہدے پر جا پہنچا؟" تو پتہ ہے وہ کیا جواب دیتا ہے ـــ "ادھ چھوڑو جی ـــ یہاں پھرا کرتا تھا!" پھر میری طرف دیکھ کر بولے ـــ "کوئی اگر یہ کہے کہ رفیع پیر نے بڑا اچھا ڈرامہ سٹیج کیا تو کہیں گے۔ "ادھ چھوڑو جی ـــ کل ایتھے رلا پھردا سی"۔

اس چھوڑو جی میں ہماری کم ہمتی، محرومیوں اور نااہلیتوں کی سب سے بڑی جھلک موجود ہے۔ پاکستان چھوٹا سا ملک ہے آخر یہاں ہی کے لوگ اپنے عہدوں پر متمکن ہوں گے مگر اس پر کوئی دھیان نہیں دیتا۔ پاکستانی خود کچھ کرنے کے لئے تیار نہیں۔ دوسرا اگر کچھ کر دکھائے اسے نیک نامی حاصل ہو جائے تو عام ردعمل یہی ہوتا ہے "ادھ چھوڑو جی"۔

کہنے لگے امریکہ میں ایک بین الاقوامی تقریب پر چودھری سر ظفر اللہ خان کسی سے تبصرے کا ذکر کر رہے تھے۔ کسی غیر ملکی نے پوچھ [illegible] میں کیا فرق ہوتا ہے۔ کہنے لگے "چلو بخاری سے پوچھیں وہ آل انڈیا ریڈیو کا ڈائریکٹر جنرل رہ چکا ہے"۔

میں نے کہا "آل انڈیا ریڈیو کا ڈائریکٹر جنرل رہنا تنبورے اور تانپورے پر کوئی اختیاری نہیں ہو سکتا۔ آپ کی عمر کتنی ہوگی؟"
بولے "پینسٹھ سال"

میں نے کہا "جناب آپ نے پینسٹھ سال تانپورے اور تنبورے کا فرق معلوم کئے بغیر گزار دیئے میں دو چار سال اور بھی گزار دیجئے۔"

پروفیسر صوفی تبسم کا کہنا ہے کہ ایک مرتبہ پروفیسر بخاری کے رفیقوں میں سے ایک یونیورسٹی کے کسی رکن کی غلط کاریوں پر چیں بہ جبیں ہو رہے تھے۔ بخاری کہنے لگے "بھائی صاحب میری دو باتیں یاد رکھو۔ زندگی میں کسی سے الجھنا ہو تو کسی بڑے مسئلے پر الجھنا چاہئے اور اپنے سے بڑے آدمی کے ساتھ الجھنا چاہئے ورنہ مزا نہیں آتا۔ انسان کی قوتیں اور کوششیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ کمزور آدمی کو دبانے میں کوئی شان نہیں۔ بڑے آدمی سے تصادم ہو تو انسان کی استعداد کار اور بھی چمکتی ہے۔ مجھے دیکھو میں نے ریڈیو کی ملازمت کے دوران ہمیشہ بڑے آدمیوں سے ٹکر لی ہے اور خدا کے فضل و کرم سے کامیاب رہا ہوں۔"

جب علامہ اقبال کے کلام کے سلسلے میں یوپی کے بعض اہل قلم کی طرف سے اعتراضات اٹھائے گئے تو "زندہ دلان پنجاب" نے ان سے جو جنگ لڑی تھی بخاری اس میں پیش پیش تھے۔

ٹکراؤ سے پر استعداد کار کا حرکت میں آنا، یہ بات ان کے ڈرامے سے غایت درجہ شغف رکھنے کا ایک طبعی باعث قرار دی جا سکتی ہے اس طرح الجھنے اور ٹکرانے میں جو رکاوٹیں پیدا ہوتیں ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے وہ کبھی تھکن محسوس نہ کرتے۔ میں نے انہیں ۱۹۳۵ء میں ہملٹ کا پارٹ ادا کرتے دیکھا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پروفیسر بخاری واقعی پرنس ہملٹ ہے۔ ڈرامائی ٹکراؤ، واقعاتی الجھاؤ، کرداری رکاوٹیں ہملٹ کا راستہ روکے کھڑی تھیں۔ اور وہ کس کس طرح ان سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ ہملٹ کے کردار کی جیتی جاگتی تصویر ہمارے سامنے آ گئی تھی۔

نیویارک کے جس ڈاکٹر کے وہ زیر علاج رہے وہ بھی شیکسپیئر کا بڑا دلدادہ تھا۔ مریض اور ڈاکٹر دیر تک اسی موضوع پر باتیں کرتے رہتے۔ عارضۂ قلب میں مبتلا ہونے کے بعد پروفیسر بخاری جب بھی ڈاکٹر سے طبی مشورہ کرتے تو مسکرا کر پرمعنی انداز میں ضرور پوچھتے "کب ڈاکٹر؟ بتاؤ تو سہی کب؟"

نیویارک میں ملک ملک کے چوٹی کے اخباری نمائندے مقیم ہیں۔ وہ بخاری کی صحبت میں بیٹھنے کو بہت بڑا پُرمسرت اعزاز سمجھتے۔ ہر شخص ان کا مداح تھا۔ پروفیسر بخاری نے ایک بے چین اور مضطرب طبیعت پائی تھی۔ اس سیماب صفت انسان کا دماغ اس کے جسم سے اور اس کا جسم اس کے دماغ سے زیادہ تیز کام کرتا۔

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

موت کا فرشتہ دہلیز پر آکر بیٹھ گیا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا "اگر تم چاہو تو میں حاضر ہوں۔ رات تمہارے پاس ٹھہرتا ہوں۔ صبح چلا جاؤں گا۔"
پروفیسر بخاری نے کہا "نہیں، نرس جو میرے پاس موجود ہے۔"
ڈاکٹر نے مذاق سے کہا "اچھا سویٹ پرنس شب بخیر۔"
مگر یہ رات اس کی آخری رات تھی۔ موت کے فرشتے نے دہلیز لانگ لی۔

بچے باپوں سے پوچھتے ہیں آج کون مر گیا آپ اداس جو ہیں کون بتائے نئی پود کو کہ آج وہ مر گیا جس نے کہا تھا "بچوں کا بہلانا سہل ہے

بڑوں کا بہلانا سمجھتے تھے۔

پروفیسر بخاری کی شخصیت کی [illegible] بہت پیاری [illegible] درمیان [illegible] اور چیز بنے رہے۔ مگر اپنی فصاحت و ذہانت [illegible] سے تنگ [illegible] کی سوچ [illegible] ترتیب میں [illegible] کے ساتھ پھلجھڑیاں سی بہا [illegible] قدرہ [illegible] میں [illegible] ہوتی ہوتا [illegible] زندگی کی پابندی اور شگفتگی بڑی [illegible] بہت [illegible] بن [illegible] گئے۔

بخاری کی باتیں [illegible] حقیقت [illegible] زندگی [illegible] پاکستان کا شہری [illegible] ہیں۔ [illegible] کی لطافت [illegible] ان [illegible] میں چھپے ہوئے ہیں۔ شہزادہ علی خان نے [illegible] میت پر [illegible] مرتے [illegible] میں — ہمارے ان آنکھوں میں کون [illegible] سے [illegible] ان دل کا [illegible] میں

[illegible] تو ہمیشہ [illegible] رہتے
ہمیں منزل عشق کوں [illegible]

چند پرانی یادیں

غلام رسول مہر

میں نے بخاری صاحب کو پہلی مرتبہ نومبر ۱۹۲۱ء میں دیکھا تھا۔ ترکِ موالات یا لاتعاون کی تحریک اوجِ شباب پر تھی اور اس کے اوجِ شباب کی کیفیت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ لفظوں میں اس کا صحیح نقشہ پیش کرنا مشکل ہے۔ بس اتنا سمجھ لیجیے کہ صاف نظر آرہا تھا حکومتِ برطانیہ کے قصرِ اقتدار میں ایک خوفناک زلزلہ آگیا ہے اور یہ قصر تھوڑی ہی دیر میں زمیں بوس ہو جائے گا۔

سالک صاحب "زمیندار" کے مدیر کی حیثیت میں گرفتار ہو چکے تھے۔ مقدمہ چل رہا تھا اور اس کا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ شجاعت اللہ خاں مرحوم "زمیندار" کے منیجر تھے اور انتظام کے علاوہ تحریر کا زیادہ تر کام بھی وہی انجام دیتے تھے۔ انھی کی تحریک پر سید عبدالقادر شاہ مرحوم نے مجھے ادارۂ تحریر کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے بلایا تھا۔ مرتضیٰ احمد خاں میکش مرحوم بھی اس وقت "زمیندار" ہی سے وابستہ تھے۔ خبروں اور مختلف مضمونوں کا ترجمہ ان کے ذمے تھا۔

"زمیندار" کا دفتر دہلی دروازے کے باہر اس بڑی عمارت میں تھا جو جہازی بلڈنگ کے نام سے مشہور تھی۔ ایک روز شام کے وقت دو گورے چٹے جوان نہایت عمدہ سوٹ پہنے ہوئے آئے۔ بادی النظر میں صاحب لوگ معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے کھڑے کھڑے شجاعت اللہ خاں سے باتیں کیں۔ غالباً اس روز سالک کے مقدمے کی پیشی ہوئی تھی۔ اسی کی کیفیت پوچھتے رہے اور چلے گئے۔ شجاعت اللہ خاں نے مجھے بعد میں بتایا کہ ان میں سے ایک احمد شاہ بخاری تھے اور دوسرے سید امتیاز علی تاج۔ میں ان دونوں سے ناواقف تھا اور محض نام سن کر میری معلومات میں کیا اضافہ ہو سکتا تھا۔ میں نے ان کے متعلق کچھ پوچھنا بھی ضروری نہ سمجھا، البتہ اس بات پر تعجب ہوا کہ قومی تحریک کے نہایت اہم مرحلے پر بھی بعض مسلمان انگریزوں کی سی وضع قطع قائم رکھنے میں کوئی گرانی محسوس نہیں کرتے۔

چند روز بعد میں گھر واپس چلا گیا اور "زمیندار" کے ساتھ تعلق قائم نہ رکھ سکا۔ اس لیے کہ میرے اقربا خصوصاً والدہ مرحومہ کو یہ تعلق منظور نہ تھا۔ دو تین مہینے کے بعد شجاعت اللہ خاں اور مرتضیٰ احمد خاں میکش خود میرے گاؤں پہنچے جو جالندھر شہر سے چار پانچ میل کے فاصلے پر تھا اور اقربا کو راضی کرکے مجھے دوبارہ "زمیندار" میں لے آئے۔ اس وقت سے مستقل طور پر میری اخبار نویسی کی ابتدا ہوئی۔ سالک صاحب کو ایک سال قید کی سزا ہو چکی تھی اور وہ لاہور سے میانوالی جیل میں منتقل ہو چکے تھے۔ بخاری

اور امتیاز وقتاً فوقتاً سالک صاحب کی صحت و عافیت دریافت کرنے کی غرض سے "زمیندار" کے دفتر میں آتے رہتے تھے۔ اس زمانے میں ان سے شناسائی ہوئی اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ سالک صاحب کے نہایت عزیز دوست ہیں۔

۱۹۳۱ء کے اواخر میں سالک صاحب رہا ہو کر آ گئے اور ان سے وہ برادرانہ تعلق استوار ہوا جسے زندگی کا ایک عزیز ترین سرمایہ سمجھتا ہوں۔ ان کی وجہ سے بخاری اور امتیاز کے ساتھ بھی ایک خصوصی علاقہ پیدا ہو گیا۔ بخاری صاحب اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور اس علاقہ میں آخری وقت تک کوئی خلل نہ آیا۔ امتیاز صاحب کو خدا تا دیر سلامت رکھے، ان کے ساتھ یہ علاقہ آج بھی اسی طرح قائم ہے جس طرح آج سے تیس پینتیس سال پیشتر قائم تھا۔

پھر بخاری صاحب سے زیادہ مفصل ملاقاتیں اس زمانے میں ہوتی رہیں جب منشی نعمت اللہ صاحب مرحوم دہلی مسلم ہوٹل چلا رہے تھے اور بخاری صاحب نے اسی ہوٹل میں اپنے لیے ایک یا دو کمرے لے لیے تھے۔ یہ ہوٹل اسی جگہ تھا جہاں اب اس نام کا ہوٹل موجود ہے لیکن اس کی عمارت بالکل بدل گئی ہے۔

بخاری صاحب کی باتیں اس زمانے میں بھی سب سے نرالی ہوتی تھیں۔ ہم لوگوں کے دل و دماغ کا ریشہ ریشہ عدم تعاون اور آزادی کے جوش سے معمور تھا۔ بخاری صاحب گورنمنٹ کالج میں پروفیسر تھے۔ ایک روز انھوں نے خاص احساس ذمہ داری کے ساتھ فرمایا کہ آزادی کے لیے جو کچھ ہو سکتا ہے ضرور کرنا چاہیے مگر یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھیے کہ جس قوم کا لباس ایک نہیں، جس کے کھانے کے اوقات مقرر نہیں، جس میں یکسانی اور یکجہتی کا کوئی بھی پہلو نظر نہیں آتا، وہ آزادی سے کیا فائدہ اٹھائے گی؟ کوشش کرو کہ اس سرزمین میں بسنے والے لوگ واقعی ایک ایسی قوم بن جائیں جو ایک نظام زندگی کی پابند ہو۔

اس وقت یہ سن کر احساس ہوا کہ بخاری صاحب کا دل آزادی کے جذبے سے بالکل خالی ہے لیکن جب بنیادی حقائق کے صحیح اندازے کا شعور پیدا ہوا تو پتہ چلا کہ یہ ارشاد ان کے طریق نظر کی ایک روشن دستاویز تھا۔

اسی طرح مجھ سے انھوں نے بارہا کہا کہ آپ اخبار میں ایک چوکھٹا مستقل طور پر لگاتے رہیں جس کے اندر جلی حروف میں یہ عبارت مرقوم ہو کہ "بائیں ہاتھ چلو"۔ روزانہ یہ چوکھٹا چھپتا رہے گا تو یقین ہے کہ ہزاروں آدمیوں کو بائیں ہاتھ چلنے کی اہمیت کا احساس ہوتا جائے گا۔

میں خود ماضی پر نظر بازگشت ڈالتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ سیاسیات پر خدا جانے کتنے ہزار صفحے لکھ ڈالے۔ اپنے نقطۂ نگاہ کی توضیح کے لیے دلائل و شواہد کے سینکڑوں ہزاروں طومار مرتب کر دیے لیکن منظم قومی زندگی کے مبادی کو حقیر سمجھ کر نظر انداز کیے رکھا اور آج بھی جبکہ آزادی پر بارہ سال گزر چکے ہیں، قوم ان مبادی سے اسی طرح ناآشنا ہے جس طرح تیس پینتیس سال پیشتر ناآشنا تھی۔

بخاری صاحب ابتدائی دور میں بھی بعض نہایت ممتاز خصوصیتوں کے مالک تھے مثلاً :-

۱۔ جو کچھ لکھتے یا بولتے تھے اس میں تکلف بالکل نہ ہوتا تھا، تاہم ان کی ہر بات میں کوئی نہ کوئی نادر خوبی ضرور ہوتی تھی۔ پھر وہ

فطری صلاحیت مزاج کی بنا پر اس میں خاص دل آویزی پیدا کر دیتے تھے ۔

۲ - میں نے انھیں کبھی بھی مذہب کے متعلق بحث و مناظرہ میں حصہ لیتے نہ دیکھا ۔ جو موضوع زیرِ بحث آتا اس کے متعلق ایک دو سیدھی سی باتیں اپنے انداز میں کہہ دیتے جیسے کوئی بے تعلق سا آدمی کسی بات کا اظہار کر دیتا ہے اور دوسرے معاملے پر گفتگو شروع کر دیتے ۔

۳ - کسی کی کم علمی یا ذہنیت کی فرومایگی کا مذاق انھوں نے کبھی نہ اڑایا ۔ ساتھ ہی وہ کبھی کسی بہت بڑے آدمی سے بھی مرعوب نہ ہوتے ۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ ایک مشہور لیڈر سے ملاقات ہوئی جس نے مسئلہ تعلیم کے متعلق بڑی عامیانہ سی باتیں شروع کر دیں جو عموماً جلسوں میں کہی جاتی ہیں ۔ بخاری صاحب دو چار منٹ سنتے رہے پھر بولے کہ صاحب اسے تو چھوڑیے اور کوئی دوسری بات کیجیے ۔

ایک تعجب انگیز معاملہ یہ ہے کہ کم از کم مجھے ان کی خداداد صلاحیتوں کا پورا اندازہ کبھی نہ ہو سکا ۔ علم و فضل اور مشغولیت کے اعتبار سے وہ تعلیمی دائرے کے ایک بلند پایہ فرد تھے ۔ اسی دائرے کے لیے انھوں نے یہاں اور ولایت میں تعلیم و تربیت پائی تھی لیکن جب انھیں آل انڈیا ریڈیو میں لیا گیا تو بہت ہی کم مدت میں ہر متعلقہ آدمی کو احساس ہو گیا کہ بخاری صاحب بے شک و شبہ ایک غیر معمولی شخصیت کے مالک ہیں اور ان کے کمالات کا حصر مشکل ہے ۔ چنانچہ ان کی نگرانی میں آل انڈیا ریڈیو نے جس سرعت سے ترقی کی اس کی نظیر ان سے پیشتر یا ان سے بعد کے دور میں شاید ہی مل سکے ۔

پھر قومی یا بین الاقوامی سیاسیات سے انھیں کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا تاہم جب پاکستان کی طرف سے انجمن اقوامِ متحدہ میں نمائندگی کا منصب انھیں سونپا گیا تو وہ تھوڑی ہی مدت میں نہ صرف اسلامی اور مشرقی ممالک کے نمائندوں کی صف میں ممتاز ترین حیثیت اختیار کر گئے بلکہ بین الاقوامی دائرے کے لیے بھی ہر شخص کے دل میں ان کے لیے انتہائی احترام پیدا ہو گیا ۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں لیکن مختصر بخاری صاحب ہی تھے جنھوں نے ایک طرف بہترین قومی اور اسلامی مصلحتوں کی نگہداشت کا حق ادا کیا اور دوسری طرف اہلِ وطن کے سامنے انھوں نے بار بار وہ مسلک واشگاف طریق پر پیش کر دیا جو بین الاقوامی دائرے میں کامیابی و فائز المرامی کا واحد ذریعہ تھا ۔

اسی بالغ نظری ، اسی حقیقت شناسی ، اسی واقعیت دوستی اور فکر و نظر میں اسی توازن کی بنا پر انھیں انجمن اقوامِ متحدہ میں وہ مقام حاصل ہوا جو غالباً مشرقی ممالک کے کسی فرد کو میسر نہ آسکا ۔ انجمن اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری* جنرل کو ان کی رائے اور مشورے پر جتنا اعتماد تھا اس کے متعلق کچھ عرض کرنا تحصیلِ حاصل ہے ۔

اگر بخاری صاحب کو حیاتِ مستعار کی مزید مہلت ملتی تو کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ فضائل و مکارم کی کن بلندیوں پر پہنچتے ۔ کمال یہ ہے کہ ان کے دل میں سب کے لیے محبت اور الفت موجزن تھی ۔ عداوت کسی سے نہ تھی ۔ وہ ایک نادر الوجود انسان تھے اور عمل و سرگرمی کے جس حلقے میں پہنچے انھوں نے ایک سچے اور مخلص مسلمان کا کردار پیش کیا ۔ اسی وجہ سے سب لوگ انھیں انتہائی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے ۔ وہ اصلاً علمی آدمی تھے ۔ آل انڈیا ریڈیو میں پہنچے تو وہاں بھی اپنی علمی خصوصیات کو بہتر سے بہتر انداز میں نمایاں کیا

اور انجمن اقوام متحدہ کی [illegible] بھی ان کی علمی خصوصیات کی حد درجہ [illegible] سے متاثر ہوئی [illegible] کو نصیب ہو سکے۔

بخاری صاحب کی ذات [illegible] اسی اشاعت میں ان کے چند خطوط شائع ہو رہے ہیں جن کے ملاحظے سے واضح ہوگا [illegible] چاہتے تھے کہ پنجاب کے محکمہ تعلیم میں ان کی ترقی [illegible] وقت [illegible] کر لیا تھا جن لوگوں کی [illegible] عمل کرتے ہیں۔ اس وقت تک ترقی نہ ملنی چاہیے جب تک [illegible] کے خلاف ہوگا جو محکمے سے باہر نہیں [illegible] بخاری صاحب کی غیر معمولی قابلیت کے پیش نظر حکومت نے ان [illegible] مستثنیٰ قرار دے دیا تھا۔

جس وقت ان کا معاملہ وزارت پنجاب میں پیش ہونے والا تھا [illegible] صورت پیدا ہو گئی جس کی تفصیل خطوط کے ساتھ پیش کر دی گئی ہے۔ بخاری صاحب [illegible] کہ مجھے لکھا میں مسٹر [illegible] کے معاملے کو اپنے معاملے پر بھی ترجیح دیتا ہوں۔

دوستوں کے لیے ان کے جذبۂ ایثار کی اور مثالیں بھی میرے پیش نظر ہیں لیکن میں [illegible] اس مضمون کو اب زیادہ طول نہیں دینا چاہتا۔

یہ چند چیزیں بے اختیار زبانِ قلم پر آگئیں۔ بخاری صاحب کے متعلق لکھنے کے اصل حقدار سالک اور تاثیر ہیں جنھیں مرحوم کے ساتھ مجھ سے بدرجہا زیادہ گہرا علاقہ تھا اور ان کی معلومات بھی مجھ سے بہت زیادہ ہیں۔ میں اس بارے میں ان دونوں سے کہیں پیچھے ہوں لیکن طفیل صاحب کا شکر گزار ہوں کہ ایک عزیز اور محترم دوست کی یادگار میں خاص نمبر مرتب کرتے وقت مجھے بھی دعوت شرکت دے دی۔ اس طرح دوسروں کے شاداب و دل آویز گلدستوں کے ساتھ مجھے بھی چند پنکھڑیاں شامل کر دینے کی سعادت نصیب ہوئی۔

مرحوم افراد کے متعلق ذکر کا ایک عام شیوہ یہ ہے کہ جو جگہ انھوں نے خالی کی وہ پُر نہ ہو سکے گی لیکن بخاری صاحب یقیناً ان معدودے افراد میں سے تھے جن کی جگہ پُر کرنے کے لیے متعدد اور گوناگوں خصوصیتوں کا جامع شخص درکار ہے۔ افسوس کہ زمانے کی [illegible] کو دیکھتے ہوئے ان خصوصیتوں کا جمع ہونا مشکل ہے۔ مشرقی و مغربی علوم میں غیر معمولی مہارت، فکر و نظر میں غیر معمولی توازن، رائے اور ذوق میں غیر معمولی اعتدال، پھر اخلاق و عادات میں مشرقی شرافت اور مغربی محاسن کا غیر معمولی امتزاج، یہ چیزیں فرداً فرداً بھی شاذ ہی نظر آتی ہیں۔ ان کی جامعیت کے نظارے کے لیے آنکھیں بظاہر ترستی ہی رہیں گی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔

میرا شہرۂ آفاق اُستاد

ڈاکٹر حمید الدین

میں سمجھتا ہوں کہ مجھے سینکڑوں نہیں تو بیسیوں ایسے احباب سے معذرت طلب کرنی چاہیئے جو مجھ سے کہیں زیادہ پروفیسر بخاری سے واقفیت کا دم بھرتے ہیں۔ میں پروفیسر بخاری کی روح سے بھی معذرت خواہ ہوں۔ کیونکہ ہو سکتا ہے میں اپنے بیان میں بعض ایسی باتیں کہہ جاؤں جو موصوف کی شخصیت کے بارے میں سو فیصدی درست نہ ہوں۔

جب مجھے پروفیسر بخاری کا خیال آتا ہے۔ تو میرا ذہن دوسری دہائی کے آخری برسوں اور تیسری دہائی کے آغاز کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ اُن دنوں میں گورنمنٹ کالج لاہور میں بی۔ اے کا طالب علم تھا۔ اور وہ کیمبرج سے تازہ تازہ واپس آئے تھے۔ جہاں انھوں نے انگریزی ادب میں وہ امتیاز حاصل کیا تھا۔ جو اُن سے پہلے کسی ہندوستانی کو نصیب نہ ہوا تھا۔ کیمبرج میں کئی ہندوستانیوں نے داخلہ لیا۔ مگر دو تین کے سوا کسی کو ان جیسی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

دراز قد، خوبرو، عالمانہ پیشانی، تیز دلکش آنکھیں۔ رکھنے کے باعث پروفیسر بخاری دور دور سے بھی دیگر پروفیسروں سے الگ پہچانے جاتے اور ممتاز نظر آتے تھے۔ پروفیسروں کی اس جماعت میں دبلے پتلے، لمبے تڑنگے مونچھوں والے پروفیسر لینگ ہارن، مدن گوپال سنگھ جیسے منحنی اور پروفیسر فرحت جیسے سراپا حرکت لوگ شامل تھے۔ اس سے پہلے پروفیسر مرزا سعید شاید کسی ڈگری کالج کے پرنسپل ہو کر باہر جا چکے تھے۔ اور ایک دو سال بعد پروفیسر ڈکنسن بھی علی گڑھ سے یہاں آگئے تھے۔

مجھے پروفیسر بخاری سے پہلی بار واسطہ اس وقت پڑا جب میں تیسرے یا چوتھے سال میں تھا۔ وہ ہمیں مختصر افسانہ پڑھاتے تھے۔ ہماری جماعت اُس کمرے میں بیٹھتی تھی۔ جسے آجکل پرنسپل اور کالج کے دفاتر میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ یہ جماعت صبح کے وقت ہوتی تھی۔ وہ ہمیں سٹیونسن کی مارخائیم پڑھا رہے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان کے پہلے لیکچر کے بعد ہمارے تاثرات کچھ زیادہ اچھے نہ تھے۔ اُن کے پڑھانے کا طریقہ خاص طور پر مختصر افسانہ اس طریقے سے مختلف تھا جس کے ہم عادی تھے۔ انھوں نے دو تین لیکچر دیئے جس کا مطلب یہ تھا کہ پورا ایک ہفتہ زیادہ تر یہ بتانے پر صرف کیا کہ انھوں نے لندن میں ایک عام آدمی کو کس حال میں دیکھا۔ انھوں نے مصنف اور اس کی کہانی کے متعلق ہمیں کچھ نہ بتایا۔ اگرچہ بعد میں ایسا ہوا کہ لندن کے عام آدمی کے بارے میں انھوں نے جو کچھ بتایا تھا۔ اُس کا ڈانڈا مارخائیم سے خود بخود مل گیا۔ اور ہم اس فیصلے پر پہنچے کہ پروفیسر بخاری دوسروں سے خواہ کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں خوامخواہ ہمارا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اگر کوئی ان سے سوال پوچھتا یا اُن پر نکتہ چینی کرتا تو وہ اس سے زیادہ بڑھ چڑھ کر باتیں کر سکتے تھے۔

اس کے بعد پروفیسر بخاری کی ذات کا جائزہ ہمارا موضوع بن گیا۔ ہم مدت سے سادے انداز میں اُن کے نیاز مندوں کے ظاہری اثرات معلوم کرنا چاہتے تھے مگر مجھے اعتراف کرنا چاہیے کہ ہم اُن کی ظاہری دلچسپیوں سے اس طرح [illegible] لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اُن کے جیکٹ کے سخت کالر کے ساتھ ایک خوش پوش آدمی کا نشان ہے۔ اُن میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جسے ہم کہہ سکیں کہ وہ [illegible] شعوری طور پر مرعوب کرنے کے لیے استعمال کی گئی ہے۔ اُن سردیوں میں وہ روزانہ ہلکے بادامی رنگ کے ٹوئیڈ کی جیکٹ اور شاید [illegible] پہنتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کا کوٹ [illegible] نہایت صفائی سے استری کیا ہوا ہوتا تھا۔ [illegible] انتخاب میں بھی ان میں [illegible] نازک مزاجی کا ثبوت ملتا ہے۔ معمولی کپڑے پہننے کی کمزوری تو اُن میں شروع سے آخر تک باقی رہی۔ [illegible] سمجھتے تھے۔ البتہ اچھی نکٹائی لگانے کا شوق ہمیشہ رہا۔

اس طرح قریب سے جانچ پڑتال کرنے کے باوجود ہم اُن کی وضع قطع سے اس سے کچھ زیادہ نہیں جان سکے۔ ہم جہاں تھے وہیں سے آگے بھی نہ جا سکے۔ ہم یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ اُن میں ایسی کون سی بات تھی جس کی وجہ سے [illegible] پروفیسر [illegible] نہیں مانا تھا۔ گورنمنٹ کالج میں کوئی اُستاد ایسا نہ تھا جو دوسرے سے پانچویں سال کے طلبہ کی شرارتوں کا تختۂ مشق نہ رہا ہو۔ [illegible] کی طرح [illegible] انگریزی استاد [illegible] نو وارد [illegible] کو کم آتی تھی۔ در اصل ایسا استاد جتنا زیادہ بولتا اور جتنا زیادہ رعب جمانے کی کوشش کرتا اتنا ہی زیادہ وہ بے نقاب ہو جاتا تھا۔ لیکن پروفیسر بخاری ہمیشہ تمام شرارتوں سے بچے رہے۔

جذبۂ خلوص ہی ایک ایسی خوبی ہے جس کی بنا پر [illegible] استادوں کی قدر کرتے ہیں۔ پروفیسر بخاری میں ایک استاد کی حیثیت سے یہ وصف نمایاں تھا۔ اُن کے شاگرد شروع ہی سے جان گئے تھے کہ پروفیسر بخاری کی حیثیت ایک اُستاد سے کہیں زیادہ [illegible] صورت میں ہیں۔

پروفیسر بخاری کے نزدیک ادب پڑھانے کا مطلب صرف یہی نہیں تھا کہ مشکل الفاظ کے معنی بتا دیئے یا محاوروں کی تشریح کر دی یا کسی شاہکار کی ہیئت اور ساخت کا تجزیہ کر دیا یا کسی عظیم مصنف کے فن، ٹیکنیک اور پُرکاری پر روشنی ڈال دی۔ یہ سب کچھ کرنے کے علاوہ بہت کچھ اور بھی تھا۔ در اصل وہ اپنے آپ کو کسی شاہکار میں کھو دیتے تھے۔ پھر یہ حقیقی زندگی اس کے سانچے میں ڈھال کر دیا کرتے تھے کہ [illegible] کا احساس [illegible]۔ [illegible] کہ طلبہ میں [illegible] بھی شخصیت کی ہر سطح میں [illegible] اور جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں اس کام کے پہلے حصے میں کامیابی حاصل کرنا کوئی زیادہ مشکل نہیں۔ البتہ اس کا دوسرا حصہ خاصا مشکل ہے۔ کیونکہ صرف وہی معلم اس خواب کو پورا ہوتے دیکھ سکتا ہے جو ادب کو ایک فنی پیشے یا مشغلے کے طور پر نہیں بلکہ زندگی کی رہبر راہ کے طور پر اختیار کرتا ہے۔

بہت جلد پروفیسر بخاری کی جماعتوں کی شکل کچھ سے کچھ ہو گئی۔ ان کا ترجیحی کام ایک اُستاد کے بے کیف لیکچروں اور طلبہ کے نوٹ لینے کا نام نہ تھا۔ ان میں گرماگرم بحثیں ہوتی تھیں۔ ہر طالب علم کسی نظم یا ڈرامے کے ٹکڑے کی ٹیکنیک کے بارے میں اپنی رائے پیش کرتا تھا۔ یہ سوقیانہ ہے۔ یہ ارفع ہے، اس میں یہ خوبی ہے، یہ عیب ہے۔ پروفیسر بخاری خود بحث کا آغاز کرتے بلکہ اسے چلانے کے لیے خود بھی حصہ لیتے۔ عموماً ایسا ہوتا کہ وہ تنقید کے حق میں دلیلیں دیتے ہوئے [illegible] لیکن بہت جلد معلوم ہو جاتا کہ وہ کلیتہً اس کے حق میں نہیں بلکہ جزوی طور پر اس سے متفق ہیں۔ ایسی بحثوں کا ایک پہلو نہایت قابل تعریف ہوتا۔ وہ یہ کہ کوئی شخص محض منطق کے زور پر اپنی بات قائل نہیں کر سکتا تھا۔ اپنی بات منوانے کے لیے لازمی طور پر زیر بحث مصنف کی تخلیق ہی کے دامن میں پناہ ڈھونڈنی پڑتی تھی۔ اس کی دلیل بظاہر کتنی ہی وزنی کیوں نہ ہو، اس وقت تک قابل قبول نہ سمجھی جاتی تھی جب تک وہ یہ ثابت نہ کرے کہ اس نے اصل کتاب کو عقلمندی سے سمجھ سوچ کر پڑھا ہے۔ اس طرح پروفیسر بخاری کی نظروں میں مقبول ہونے کے لیے ایک طالب علم کو اپنے میدانِ مطالعہ میں چاروں چول چوکس رہنا پڑتا تھا۔

اپنے طلبہ میں ادب کا ذوق پیدا کرنے کا جذبہ پروفیسر بخاری میں عشق کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ اس سے نہ وہ بوجھ محسوس کرتے تھے نہ اُن کے اپنے مشاغل

میں کمی واقع ہوتی تھی۔ بلکہ نشستوں میں مشاعرے کا اہتمام بھی [illegible]۔ جیسے طبیعت تھی ان تمام فنون کے مطالعے کے لئے بھی ہنر کا کام دیتا تھا جن کے بغیر مطالعہ [illegible] پڑھتے تھے۔ [illegible] مشاعرہ، مذاکرہ اور کالج میگزین سے لگاؤ [illegible] ان کی [illegible] ادب اور زبان سے گہری شیفتگی تھی۔ ان کے دوست جانتے ہیں کہ ان کی بذلہ سنجی اور اسلوب بیان کے حسن سے [illegible] ان کی شخصیت کے چھپے ہوئے جوہر کھل کر آتے۔ اور اہم ترین نتائج کا پیش خیمہ ثابت ہوتی۔ زبانی گفتگو [illegible] ایک نظام ہے۔ مگر ان کی تلاش، ایک زندہ تحریک تھی۔ وہ اسے ایک ایسا جال تصور کرتے تھے جس کے ذریعے ہم اپنے [illegible] زندگی کے [illegible] نقاط [illegible] تعلقات کو گرفتار کر سکیں۔

وہ نادرہ اور خوبصورت [illegible] سے محبت کرتے تھے [illegible] ہر لمحہ اور ہر حالت میں [illegible] کے قائل تھے۔ [illegible] زبان کی بذلہ سنجی، مزاح، طنز، [illegible] سب سے زیادہ [illegible] بخاری ان چند بہت خوش بیانوں میں سے ایک تھے جن سے مجھے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اسی سحر آفرینی کے باعث ان کا حلقۂ احباب وسیع ہوتا گیا اور سب ہی مداحین [illegible] ان کے نزدیک تا ہر قیمت پر چند لمحے ان کے ساتھ گزارنے پر بخوشی آمادہ ہو جاتا۔ وہ ایک ایسے دانشور تھے جن کی طنز و ظرافت سے ان کے ملاقاتی اپنی علمی استعداد اور فہم و فراست کے مطابق حظ حاصل کرتے تھے کہ کند ذہن آدمی ہنسی کی بات سے بھی لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ ان کا مزاح ہمدردانہ ہوتا تھا۔ وہ دوسروں کے ساتھ قہقہے نہیں لگاتے تھے۔ ان کا تمسخر نہیں اڑاتے تھے۔ بلکہ ان کی کلفت و پریشانی ہنسی میں اڑا دیتے تھے۔ ان کی طنز ان کی ادراکی قوت کی پیداوار ہوتی تھی۔ وہ اونچے سے اونچے آدمی کی کمزوری بھی اس طرح بے نقاب کرتے تھے۔ جس طرح بڑے سے بڑے اکڑباز اور طرح دار کی۔ زندگی کا سارا تانا بانا ان کے لئے میدان کارزار تھا اور ان کی ذہانت ان کی شمشیر، وہ کسی کو نہ بخشتے تھے اور کسی سے یہ توقع نہ رکھتے تھے کہ انھیں معاف کرے۔

پروفیسر بخاری نے جتنے سال گورنمنٹ کالج لاہور میں طلبہ اور طالبات کو پڑھانے میں صرف کئے ہیں ان کا جائزہ لینے کے بعد آدمی کہہ سکتا ہے کہ اپنی قابلیتوں کو بروئے کار لانے اور شاگردوں میں ذہنی اوصاف اور رجحانات پیدا کرنے کے لئے کالج اور کلاس روم بے پناہ امکانات رکھنے کے باوجود ان کے لئے محدود جولاں گاہ تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ ان کے ارد گرد ارباب فضل و ہنر کافی تعداد میں موجود ہیں۔ انھیں صرف منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے یہ کام اپنے ذمہ لیا۔ مجلس اردو اسی کی ایک شکل ہے۔

یہ سوسائٹی کالج کے ذہین نوجوانوں اور پروفیسر بخاری کے زیادہ تجربہ کار احباب کے لئے قائم کی گئی تھی۔ ہر وہ شخص جو طبع زاد افسانہ، ڈرامہ، تنقیدی مضمون یا نظم لکھ سکتا تھا، اس مجلس میں بار پا سکتا تھا۔ اسے خوش آمدید کہا جاتا تھا اور اسے اجازت ہوتی تھی کہ وہ اس شام کو پڑھی جانے والی ہر ادبی کاوش پر تنقید کرے خواہ وہ کتنی ہی کڑی کیوں نہ ہو۔ تنقید کا معیار اتنا بلند رکھا جاتا تھا کہ اس میں اردو، فارسی اور عربی کے قدیم اصول تنقید کے علاوہ مغرب کا جدید انداز تبصرہ بھی شامل ہوتا تھا۔

پروفیسر بخاری نے مجلس اردو کو بہت جلد ایک ایسی پرکشش جماعت بنا دیا کہ ہر ہونہار نوجوان جو لاہور کی ادبی مجالس کی روح رواں تھا، یہ محسوس کرنے لگا کہ اسے مجلس اردو یا اس کی حریف بزم فروغ اردو میں سے کسی ایک میں شامل ہوئے بغیر چارہ نہیں۔ بزم فروغ اردو ڈاکٹر ایم۔ ڈی۔ تاثیر جیسے مشہور شاعر اور فاضل کی نگرانی میں اپنی سرگرمیاں اسلامیہ کالج لاہور میں جاری کئے ہوئے تھی بالکل اسی طرح جس طرح پروفیسر بخاری گورنمنٹ کالج لاہور میں مجلس اردو چلا رہے تھے۔

جن اصحاب کو معلوم ہے کہ بخاری اور تاثیر نے اپنے نوجوان ادیب دوستوں کے لئے ان مجالس کے ذریعے کیا کچھ کیا، وہ یہ کہنے میں کبھی دریغ نہ کریں گے کہ ان جماعتوں نے اور کچھ نہیں تو اتنا ضرور کیا کہ ہمارے عہد اور خطے کی ادبی تربیت کی تاریخ میں ان دونوں عظیم استادوں کا نام محفوظ

۱۰

دنیا جن پر ہمیشہ فخر کریں گے ۔

موت نے تو [illegible] ہم سب سے کئی [illegible] کر [illegible] سے محروم کر دیا۔ اگر آپ ان کی [illegible] زمانے پوچھیں تو وہ آپ کو بتائیں گے کہ [illegible] بخاری [illegible] اس دنیا میں لوٹ آئیں اتنا ہی بہتر ہے ۔

وہ یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ ہمارے اساتذہ [illegible] ۔ مجھے [illegible] بخاری [illegible] ستائش مذمت کرنے کے باوجود [illegible] کی ضرورت [illegible] سے [illegible] ختم کرنے سے پہلے مجھے ایک [illegible] بات کا ذکر کرنے کی اجازت دیجئے۔ [illegible] انگریزی ادب کے [illegible] کی حیثیت سے پطرس بخاری کا نام صرف انگریزی تک محدود نہ تھا بلکہ حقیقت یہ تھی [illegible] کے لئے بھی ان کا [illegible] پڑھا ہوا تھا جتنا انگریزی ادب کے لئے ۔

اگر کسی صاحب کو لطف [illegible] بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہو تو وہ آپ کو بتائیں گے کہ ان کے گھر [illegible] چار [illegible] جلدوں کو وہی شرف حاصل تھا جو [illegible] کی [illegible] انگلش کی پانچ جلدوں کو۔ اور [illegible] انھیں [illegible] شیکسپیئر کی تصانیف۔ وہ پشتو، پنجابی اور اردو میں بھی اتنے ہی خوش گفتار تھے جتنے انگریزی میں۔ ان تمام زبانوں پر ان کا علم یکساں وسیع تھا ۔

(ترجمہ)

اقوام متحدہ میں پروفیسر بخاری سے ملاقات

ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی

مغربی اور مشرقی فن میں اصولی فرق میرے نزدیک ایک یہ بھی ہے کہ مغربی فن کی تصویر کو دور سے دیکھنے سے جو اس کی خوبیاں نظر آتی ہیں، وہ نزدیک سے دیکھتے دکھائی دیتے ہیں۔ یعنی اس کی صحیح نمائش دور سے ہی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس مشرقی فن کی تصویر کے صحیح خط و خال اور خوبیاں اس کو جس قدر بھی قریب سے دیکھا جائے گا زیادہ نظر آئیں گی۔ دور سے ایک مبہم اور یکساں رنگ کی دھندلی سی سطح معلوم ہوگی۔ چنانچہ ہم مرحوم احمد شاہ بخاری کو جب کبھی دور سے دیکھتے تو صحیح معنوں میں کسی یورپی یونیورسٹی کے ایک سجے سجائے مکمل پروفیسر نظر آتے۔ مگر جب کبھی ان کے پاس بیٹھ کر گفتگو سننے کا موقع ملتا تو ان کے برجستہ مسکراہٹ لئے ہوئے مادری زبان میں بے ساختہ جملے ظاہر کرتے کہ ان کا نہایت مکمل ظاہری مغربی لباس ان کی مشرقیت پر ایک ملمع ہے۔ اور ان کی مشرقیت کے جوہر آہستہ آہستہ گفتگو کے مدارج طے کرتے کرتے واضح ہوتے چلے جاتے بلکہ ان کی تمام انگریزی اور انگریزیت ان کی مشرقیت کے تابع نظر آنے لگتی۔

میں مرحوم کو ایک طرح دور سے اسی زمانے سے جانتا تھا۔ جب کہ وہ ہنوز طالب علمی کے ابتدائی مدارج لاہور میں طے کر رہے تھے کیونکہ وہ ہمارے محلے کے قریب ہی تکیہ سادھواں میں ڈاکٹر محمد دین تاثیر مرحوم کے بڑے لڑکے محمد امین مرحوم کے ہم زلف تھے جن کے ہاں وہ اکثر رہائش رکھتے، اور محمد امین کے بھائی ڈاکٹر محمد سعید سعدی) سے بخاری کی خاصی بے تکلفی تھی۔ ان کی اور مولوی بشیرالدین مرحوم (بن مولوی احمد دین وکیل مرحوم) کی وجہ سے کبھی کبھی ان کی گفتگو میں مجھے بھی شرکت کا موقع ملتا جس کے بعد وہ ایم اے کا امتحان انگریزی ادب کا پاس کر کے اپنی خاص طبع روشن اور بعض اچھوتی تحریروں کی وجہ سے لاہور کی زندگی میں نمایاں طور پر رچ پچ گئے۔ یوں کہئے کہ علمی محفل میں وہ جزو لاینفک تصور ہونے لگے۔

میں نے ان کو اس وقت سے زیادہ دیکھا ہے جب وہ لاہور میں سنٹرل ٹریننگ کالج میں مسٹر وائٹ پرنسپل کے ماتحت ایک معلم، پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے معتمد اور گورنمنٹ کالج لاہور میں بحیثیت استاد زبان انگریزی متعین تھے مگر ان کی شہرت آل انڈیا ریڈیو کے ذریعے زیادہ وسیع ہوئی جہاں وہ کئی سال تک ناظم اعلیٰ رہے۔

ابھی پاکستان بننے کے آثار نمودار ہو رہے تھے کہ اکتوبر ۱۹۴۶ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب مدظلہ العالی نے جامعہ ملیہ دہلی کی جوبلی منائی۔ جس میں دور دور سے علمی حضرات نے شرکت کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مرکز میں ایک عبوری حکومت قائم ہو چکی تھی۔ راقم کو بھی دکن کالج پونہ سے اسی ضمن میں نمائش کی ترتیب کے لئے مدعو کیا گیا تھا۔ یہ ایک بہت پُررونق علمی میلہ تھا جس میں ہر طرح کے پڑھے لکھے حضرات نے حصہ لیا۔ جب میں نے بالکل غیر متوقع طور پر یہاں ڈاکٹر تاثیر اور بخاری کو دیکھا اور ان سے قریب دس سال بعد ملنے کا اتفاق ہوا تو وہ مجھے فوراً اپنے الگ کیمپ میں لے گئے، جس میں وہ

دونوں نرگس تھے۔ اس وقت وہ دونوں حکومت ہند کے شعبۂ نشر و اشاعت میں تھے۔ دونوں علوم جدیدہ اور قدیمہ سے بہرہ ور، نہایت روشن ضمیر اور بڑے پایہ کے تنقید نگار تھے مگر مجھے یہاں غیر معمولی بات یہ نظر آئی کہ یہ دونوں کس درجہ شیر و شکر یعنی ایک ہی جام میں پیتے ہوئے تھے۔ ان کو ایک ہی کیمپ میں نہایت محبت و خلوص سے اپنے فرائض انجام دیتے دیکھ کر یقین ہو گیا کہ رتی موم کی ناک ثابت کمال سچی ہے خواہ جس قدر بھی متضاد عنصر ہو ایک جا پُرامن والی پر جمع ہو سکتا ہے۔

مجھے وہ سال ہرگز نہیں بھولتا جب ایک روز بعد دوپہر ایک ہی پلیٹ فارم پر محمد علی جناح قائد اعظم، جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، لیاقت علی خاں، راج گوپال اچاریہ، ولبھ بھائی پٹیل، راجہ غضنفر علی وغیرہ کو دیکھا تھا اور بخاری اپنے شعبے کے مقررین کے بعض جملوں پر خوب داد دیتے تھے۔ ایک روز یہاں مرحوم سر شیخ عبدالقادر نے کنور کمیشن اینڈ بس ہی دیا تھا جو پہلے چھپ چکا تھا۔ اس کی ان چند فی زمانہ دوستوں نے نہایت موقع سے بے لوث تعریف کی اور ڈائرکٹر ذاکر صاحب کو داد دی کہ انہوں نے اس طرح پروگرام مرتب کیا۔ غرضیکہ اس ہوٹل کی عملی کارروائی جس قدر بھی بڑی میں اور ریڈیو پر نشر کیا گیا وہ تاثیر اور بخاری کا حصہ تھا جس کا لوگوں کو کم علم ہے۔

جب پاکستان قائم ہوا تو بخاری نامور تشریف لائے اس کے بعد ان کے دور میں جس طرح کی ہوئی لائبریریوں کو یکجا کیا گیا کچھ پریشان کن چشم دید حالات جو مہاجرین کے ساتھ پیش آئے ہیں وہ تمام کے ہیں مگر عوام کو زیادہ تر یہ علم ہے کہ وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل ہو گئے۔ ۱۹۴۸ء میں وہ انڈیا آفس لائبریری کی تقسیم کے ضمن میں لندن گئے جس کے بعد ۱۹۵۰ء میں وہ اقوام متحدہ میں پاکستان کے نمائندہ بنائے گئے جہاں اپنی ذاتی قابلیت سے انہوں نے دنیا کے قابل ترین حضرات کو اس قدر مرعوب اور مطمئن کیا کہ ان کو آخر میں ۱۹۵۴ء سے شعبہ اطلاعات میں ڈپٹی سیکرٹری جنرل مقرر کیا گیا اس جگہ مرتے دم تک (۵ دسمبر ۱۹۵۸ء) نہایت معزز طریق پر فائز رہے اور اسی ادارہ اقوام متحدہ میں راقم نے ۲۴ اپریل ۱۹۵۷ء کو ان سے آخری ملاقات کی تھی۔ جس کی مختصر سی کیفیت جو مجھے یاد ہے ذیل میں پیش کرتا ہوں۔

اقوام متحدہ کا ادارہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے عظیم ترین شہر نیویارک کے مشرقی جانب دریائے ایسٹ کے کنارے ۴۲ - ۴۸ سٹریٹ پر اوّل ایونیو میں واقع ہے۔ اس کے شمالی طرف سے داخل ہوتے ہی بہت بڑے ہال میں نمایاں ترین کو ایک وجاہت خاتون سے سابقہ پڑتا ہے جس سے باقاعدہ تمام ہدایات حاصل ہو جاتی ہیں اور کوئی دیر نہیں لگتی۔ اسمبلی کے ہال پر گنبد ہے جس میں کل نشستیں ۲۱۵۰ ہیں جو مندوبین، ناظرین، اخباری نمائندوں اور پبلک پر مشتمل ہیں۔ اس کے جنوب کی طرف اصل سیکرٹریٹ ۳۹ منزلہ عمارت تمام آبی رنگ کی اینٹوں کی کھڑی ہے جس میں بخاری صاحب غالباً دسویں منزل پر کمرہ نمبر ۱۰۲۷ میں بیٹھتے تھے اگر صحیح اندازہ لگایا جائے تو اس عظیم الشان ادارہ کی عمارات کا سلسلہ قریب قریب ۵۰۰ فٹ لمبائی سے کم نہیں ہے۔ زائرین اس پرشکوہ عمارت کے اوّل ہال ملاقات میں ایک بلند نمایاں چبوترے پر یونانی دیوتا غالباً جیوپٹر کا قد آدم مجسمہ سیاہ دھات کا بنا ہوا مادر زاد برہنہ کھڑا ہوا مشاہدہ کرتے ہیں جو بادی النظر میں کمال بے حیائی کا منظر پیش کرتا ہے۔

میں یہاں دو تین بار گیا۔ اسمبلی کی نشست نمبر ۲ میں کچھ وقت بیٹھا اور کارروائی دیکھی۔ رسالے بھی خریدے اور سیکرٹریٹ کے ملاقات کے ہال میں آ کر بخاری صاحب سے ملاقات کی کوشش کی مگر انہوں نے فون پر کارکن خاتون کے ذریعے ۲۴ اپریل کی تاریخ ایک بجے کا وقت طے کیا۔ چنانچہ اس تاریخ کو میں صبح صبح گھر سے نکلا اور گھومتے گھومتے ادارہ اقوام متحدہ پہنچا۔ بخاری صاحب سے ملنے کی خواہش کی تو خاتون نے ان سے فون پر اجازت حاصل کر کے مجھے ایک مطبوعہ چٹ پر وہاں کے دستور کے مطابق تاریخ، میرا نام، جس سے ملنا ہے اس کا نام (پروفیسر بخاری) اور کمرہ نمبر وغیرہ لکھ کر میرے حوالے کی اور اشارہ کیا کہ وہاں لفٹ کے آگے کھڑے ہو جائیے ابھی کمرہ کھلے گا اور آپ اوپر چلے جانا۔ چنانچہ جب میں اوپر پہنچا تو مجھے فوراً ان

تک ایک اور خاتون مہمان کی مدارات کی گئی۔ بخاری مجھے دیکھ کر کہنے لگے میں گیارہ بجے سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں کیونکہ یہی وقت میں نے دیا تھا۔ محض اتفاقاً انتظار کرتا رہا ورنہ چلا گیا ہوتا۔ میں نے معذرت کی کہ مجھے یہی وقت دیا گیا تھا مگر انہوں نے مجھے اپنی میز کی ڈائری دکھائی جس پر گیارہ بجے کا وقت لکھا تھا خیر یہ مغالطہ تھا جو غالباً سمجھنے میں یا سننے میں ہوا۔ بہرحال میں نے بہت معذرت کے بعد خیریت پوچھی۔

آپ نے اوّل امریکہ میں آنے کی وجہ دریافت فرمائی۔ میں نے کہا میں لیڈر پروگرام کے تحت یہاں آیا ہوں اور آپ سے ملے بغیر چلے جانا کوئی اچھا معلوم نہیں ہوتا تھا جس پر آپ نے فرمایا کہ میں بھی اسی لئے گیارہ بجے سے اس وقت تک (ایک بجے) بیٹھا رہا کہ ملاقات ضرور کرنی ہے حالانکہ مجھے دوسرا اہم کام بھی اس وقت تھا۔ آپ نے لاہور کے احباب مولانا سالک، مسٹر فیض اور بعض دیگر احباب کی خیریت دریافت فرمائی۔ میں نے کہا کہ لاہور سے نیا علمی رسالہ لیل و نہار فیض صاحب نے جاری کیا ہے جو ہفتہ میں ایک بار طبع ہوتا ہے آپ کے پاس ضرور آیا ہوگا۔ فرمانے لگے اگر آیا بھی ہوگا تو کہیں نہر سویز پر اٹکا ہوگا (جو اصل ۱۹۵۶ء کے واقعات سویز کی طرف ایک اشارہ تھا)۔ میں مسکرایا پھر میں نے کہا آپ لوگوں نے ہی تو راستہ بند کرائی تھی ورنہ دنیا میں کیا سے کیا ہو جاتا جس پر انہوں نے چند جملوں میں وہ تمام واقعہ سنایا کہ کس طرح مسٹر ڈاگ ہیمرشولڈ نے اپنے دفتر میں بیٹھے بیٹھے فیصلہ کیا کہ یہ ہنگامہ بہر صورت بند ہونا چاہئے اور کس طرح انہوں نے دنیا کے اخبار نویسوں کو نیچے پریس برانچ میں جمع کیا پھر یہاں سے لفٹ میں نیچے گئے تمام کمرہ بھر چکا تھا اور ابھی تک کسی شخص کو علم نہیں تھا کہ کیا ہونے والا ہے جب انہوں نے ترکِ جنگ کا اعلان کیا تو دنیا حیران رہ گئی۔

اس کے بعد فرمایا کہ آج رات پاکستان ہاؤس میں ایک لیکچر اقبال پر ہے۔ میں نے کہا میں ضرور سننے آؤں گا۔ ویسے لیکچر تو آپ نے خوب عمدگی سے لکھ لیا ہوگا فرمانے لگے کچھ کیا ہی ہے۔ جس پر میں نے کہا کہ حال ہی میں میں نے یونیسکو کے مجلّہ کوریر COURIER میں ایک مضمون بعنوان "دنیا کے بہت زیادہ ترجمہ شدہ مصنفین ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۵ء" فروری ۱۹۵۰ء کے شمارے میں دیکھا ہے جس میں اقبال کو بھی شامل ہونا چاہئے تھا کیونکہ اگر آج ہم صحیح جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ اقبال کا کلام چین و جاپان کے سوا تقریباً تقریباً سب ملکوں نے اپنے ہاں ترجمہ کیا ہے۔ میرے خیال میں یہاں بین الاقوامی شہر نیویارک میں سامعین و حاضرین جلسہ کو بتانا چاہئے اگر آپ کے مضمون میں اس امر کی طرف اشارہ نہیں ہے تو ضرور آنا چاہئے چنانچہ انہوں نے اس مشورہ کو مفید خیال کیا اور کچھ نوٹ بھی کیا فرمانے لگے کہ لاہور کے ماجرے سنائیے یعنی لاہور کی زندگی کا کیا حال ہے؟ جس پر میں نے مسکرا کر کہا۔ آپ کو لاہور کی اس قسم کی گہما گہمی کا بڑا خیال رہتا ہے تو مسکرا کر فرمانے لگے کہ یہی تو ایک شہر ہے جو ہماری تمام جدوجہد کا آئینہ ہے۔ میں نے کہا تو بقول آپ کے لاہور سب شہروں سے افضل ہے۔ جس شہر میں علامہ اقبال دنیا کا بہترین شاعر و فلسفی، گاما پہلوان رستمِ زماں، آغا حشر کاشمیری بہترین اردو ڈرامہ نویس، عبدالرحمٰن چغتائی بہترین مشرقی مصور، حاجی دین محمد کاتب، مولانا ظفر علی خاں جیسا اخبار نویس اور پطرس جیسا مزاح نگار ہو اس کی خوش نصیبی کی تو قسم کھانی چاہئے۔ دراصل میں نے ان کے کبھی کے کہے ہوئے ان جملوں کا اعادہ کیا ہے کہ یہ ان کا تصور ایمان کی حد تک تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ پنجاب کو زندگی کا آئینہ تصور کرتے تھے۔ بات کاٹ کر فرمانے لگے کہ چغتائی کی تصویریں بھی یہاں دیکھی ہیں؟ میں نے کہا ہاں دیکھی ہیں۔

دراصل پچھلے ہال میں ایک نمائش کا حصہ ہے جس میں تین تصاویر عبدالرحمٰن چغتائی کی لگی ہوئی ہیں جن کو غالباً اسی سال پاکستان گورنمنٹ نے اقوام متحدہ کو ہدیہ کیا تھا اور اس میں بھی بخاری صاحب کا انتخاب اور جدوجہد شامل ہے ورنہ یہ کام نہ ہوتا واقعی یہ بہت اچھا ہوا ہے۔ کئی ہزار کی تعداد میں ناظرین روزانہ دیکھتے ہیں۔

میں نے تجویز کیا کہ بعض لوگوں کو یہ گمان ہے کہ کسی قدیم مصور کی تصاویر ہیں اس کو رفع کرنے کے لئے ان پر مصور کے نام کے آگے محض تاریخ پیدائش لکھ کر چھوڑ دینا چاہئے۔ تاکہ معلوم ہو کہ آرٹسٹ زندہ ہے اور آج کل یہ طرزِ مصوری اس ملک کی خصوصیت ہے جسے آپ نے قبول فرمایا۔

یہ علم نہیں کہ اس پر عمل ہوا یا نہیں۔ ابھی تک کسی دوسرے ملک کے آرٹسٹ کو یہ موقع نہیں ملا تھا۔

پھر آپ نے دریافت فرمایا کہ بتاؤ اس اقوام متحدہ کو کیا پایا جس پر میں نے مسکرا کر بلا توقف جواب میں پنجابی کا محاورہ "گھر سے [illegible]" پیش کیا یعنی یہاں جو آدمی اول مرتبہ شمالی دروازے سے ملاقات کے ہال میں داخل ہوتا ہے تو اس کی نظر فوراً مشرقی جانب [illegible] یا دو نام کے یونانی دیوتا جیوپیٹر کے قد آدم بلند نشست مجسمہ پر پڑتی ہے جو وہ متحیر ہوتا ہے، ایسے شائستہ عالمی ادارہ میں اس درجہ کی عریانی اس کے لئے ایک معمہ بن جاتی ہے خواہ اس مجسمہ میں بہت وسیع الخیال فلسفہ اور حقیقت ہی کیوں نہ ہو۔ جب وہ ذرا اور اس تمام ادارے کی سیر کرتا ہے اور آخر پر پھر ایک بار اس جیوپیٹر کے بت پر نظر کرتا ہے تو اس کا ذہن اس طرف مزید منتقل ہوتا ہے کہ یہ مقام بطور تفریح گاہ تمام دنیا کی زندہ اقوام کے خانہ دل کا مختلف رنگوں اور لباسوں میں ایک عجائب گھر یا چڑیا گھر ضرور ہے مگر اس ادارے سے اقوام کی داد رسی ہرگز متوقع نہیں کیونکہ یہ شکایت جو یہاں کا علامتی نشان Symbol قرار دیا گیا ہے۔ اس امر کی دلیل ہے کہ یہاں کچھ نہیں رکھا: جامہ ندارم، امن از کجا آرم۔ بخاری صاحب نے اس مزاح کو سن کر حسب عادت ایک قہقہہ لگایا اور ارشاد فرمایا کہ اب رات کو پاکستان ہاؤس میں اقبال کے لیکچر پر ملاقات ہوگی۔

چنانچہ ہم اپنے ہوٹل وڈشاک نیو یارک ٹائمز چوک سے پروفیسر حسینی، محمد حبیب گرانی ڈھاکہ یونیورسٹی اور ایک اور صاحب جو کراچی سے تھے مل کر نکلے اور قریب نو بجے وہاں پہنچ گئے۔ لیکچر ہمارے جانے کے بعد شروع ہوا تمام پاکستان ہاؤس بھرا ہوا تھا۔ یہ کافی وسیع عمارت تھی۔ اس جلسہ کی صدارت ڈاکٹر جلال عبدہ ایران کے مستقل نمائندہ اقوام متحدہ نے کی تھی۔ ابتدا میں انہوں نے بخاری مرحوم کی علمی قابلیت کی نہایت تعریف کرتے ہوئے تعارف کرایا اور اعزاز صدارت کا شکریہ ادا کیا۔ بخاری صاحب نے اپنا مقالہ قریب ۵۴ منٹ میں ختم کیا اور لوگوں نے دل کھول کر داد دی۔ موضوع یہ تھا کہ اقبال نے شاعری کو اپنے افکار کے اظہار کے لئے ایک موزوں ذریعہ قرار دے کر کیا کیا علمی خدمات انجام دیں۔ بعد میں اس پر کوئی سوال جواب نہیں ہوئے صدر ڈاکٹر جلال عبدہ نے فارسی شاعری میں اقبال کے مقام پر کچھ مزید روشنی ڈالی۔ جلسہ کے اختتام پر میں نے پروفیسر بخاری کی معرفت ڈاکٹر جلال عبدہ سے تعارف حاصل کیا۔

دو روز بعد میں نے ایران کے دفتر ایمپائر بلڈنگ کی باسٹھویں منزل پر جا کر ان سے ایک تعارف نامہ بنام ڈاکٹر سید مصطفوی ناظم محکمہ آثار قدیمہ ایران حاصل کرنے کی کوشش کی۔ یہ تعارف نامہ انہوں نے بطیب خاطر فارسی زبان میں لکھ کر عنایت کیا۔ نیو یارک میں ایمپائر بلڈنگ یکصد منزل سے زیادہ کی ہے اور بلند ترین عمارت ہے حسن اتفاق سے جب میں ان کے کمرہ میں بیٹھا ان سے باتیں کر رہا تھا تو ہوائی جہاز گزرا میں نے ظرافتاً کہا کہ دیکھو ہوائی جہاز آپ سے نیچے اڑ رہا ہے یہ محض اس عمارت کی بلندی کی خصوصیت کی طرف ایک اشارہ تھا۔

میں نے امریکہ سے روانہ ہوتے وقت جون کے نصف میں بخاری سے پھر ملنے کا ارادہ کیا مگر وہ ۱۳ تاریخ کو جنیوا جا چکے تھے اس کا علم مجھے ان کے مددگار آغا اشرف سے ہوا۔

میں اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتا کہ پروفیسر بخاری مرحوم کے علمی کارناموں پر کوئی تبصرہ کروں مگر یہ ضرور عرض کروں گا کہ ان کا ایک خاص انداز تھا یعنی روزانہ کے حالات اور تجربات زندگی ان کو موضوع بخشتے تھے اور وہ اپنی تحریر کو اس قدر نفسیاتی طور پر ڈھالتے جاتے تھے کہ ہر مطالعہ کرنے والا اس پر خود گھومتا نظر آتا تھا اور اس سے اس قدر لطف اندوز ہوتا تھا کہ ختم کرنے کے بعد محسوس کرتا تھا کہ وہ واقعی اسی ماحول میں چلا گیا ہے چنانچہ ۱۹۵۷ء میں جب میں طہران پہنچا اور ایک شب مسٹر رحمان پاکستان کے ادارہ سفارت کے ہاں دعوت پر ایک اور سیکرٹری مسٹر صدیقی سے مذاکرہ ہوا تو بخاری کا ذکر آگیا پھر کیا تھا ان کے بعض خاص خاص موضوعات پر بھی گفتگو ہوئی۔ معلوم ہوا کہ ان کو بخاری کا مضمون "بائیسکل" ایک طرح زبانی یاد ہے انہوں نے اس مضمون کے بعض حصے اس طرح سنائے کہ تمام محفل پر لطف ہو گئی جو آج تک نہیں بھولتی۔

جنابِ پطرس

محمد طفیل

پطرس نے جب بھی لکھا، لفظوں کے تاج محل بنا دیئے۔

پطرس کو جب بھی کسی دوست نے پکارا، لبیک کی آواز آئی۔

پطرس جس بھی راہ سے گذرے، اپنے نقش چھوڑ گئے، اپنے جھنڈے گاڑ گئے۔

بخاری صاحب سے میری یاد اللہ اگرچہ زیادہ پرانی نہیں، نئی بھی نہیں، اس لئے کہ مرحوم کو میں نے ہر رنگ میں دیکھا نہیں، سنا تو ہے۔ اگر ملنے جانے کی حد تک، میں ان کی خدمت میں نووارد ہوں تو سننے سنانے کی حد تک بیگانہ نہیں۔

جب یہ طالب علم تھے تو انہوں نے "پطرس کے مضامین" لکھی۔ (غالباً ۱۹۲۸ء) جب میں طالب علم تھا، تو میں نے یہ کتاب پڑھی۔ بظاہر ان کا لکھنا اور میرا پڑھنا زمانۂ طالب علمی کی داستان ہے۔ مگر حقیقت کچھ اور بھی ہے۔ جب میں بچہ تھا، اس وقت بھی میں نے اسے پڑھا۔ اب جبکہ بچوں کا باپ ہوں تو بھی یہ چھوٹی سی کتاب میرا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ ہر وقت اکساتی رہتی ہے۔ "مجھے پڑھو، مجھ سے سیکھو"۔ پہلے جو فقرے مجھے ہنسنے ہنسانے پر آمادہ کرتے تھے۔ آج غور و فکر پر مجبور کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ بوڑھا ہوں گا تو نہ جانے، یہ کتاب کیا کیا سلوک نہ کرے۔

پطرس کے بارے میں لکھنا، آسان نہیں۔ ان جیسا ایک فقرہ لکھنا، قیامت ہی قیامت۔ میرا خیال ہے جس نے پطرس جیسا ایک بھی فقرہ لکھ لیا وہ اور کچھ ہو یا نہ ہو، وہ کم بخت ادیب ضرور ہے۔

جس شخص نے اپنی زندگی میں، جو کچھ بھی لکھا ہو۔ اس کے ایک ایک لفظ پر غور کر کے لکھا ہو۔ اب کوئی اس کے بارے میں، بغیر غور کئے لکھ دے تو یہ زیادتی ہے یا نہیں۔ سچ جانیئے غور کرتا ہوں تو میرے بھی پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ قلم رک جاتا ہے۔ بات آگے نہیں بڑھتی۔ مجبوراً طے کرنا پڑا۔ لکھوں پہلے، غور بعد میں کروں۔

مرحوم کے جتنے بھی قریبی دوست تھے۔ معلوم ہوتا ہے وہ سب غور ہی کی زد میں آئے ہوئے ہیں۔ ورنہ کچھ نہ کچھ تو لکھ ہی لیتے۔ اب جس سے عرض کرتا ہوں ـــــ بھائی! اپنے یار پطرس پر کچھ لکھئے، تو ان میں سے ہر ایک یہی جواب دیتا ہے۔ غور کر رہا ہوں ـــــ کچھ عرصے کے بعد دوبارہ عرض کیا، غور کر لیا ہو تو کچھ لکھ ڈالئے، پھر جواب ملا۔ جتنا غور کرتا ہوں۔ اتنا ہی لکھنا مشکل ہو رہا ہے۔

یہ جواب مرحوم کے ایک دوست کا نہیں۔ تقریباً سبھی کا ہے۔ نہ جانے یہ قصور پطرس کے قابو میں نہ آنے والی شخصیت کا ہے یا مرحوم کے دوستوں کا، اس کا فیصلہ مجھ سے نہ کرائیے۔ اس لئے کہ مجھے آئندہ بھی پرچہ چھاپنا ہے۔

میرا عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مجبوراً مجھی کو مرحوم کا قریبی دوست بننا پڑا ہے۔ حالانکہ اس بندۂ پُرتقصیر نے مرحوم کو صرف ایک بار دیکھا

تھا۔ ان سے خط و کتابت ضرور تھی۔ وہ بھی مختصر۔ ذہن نشیں تھا میرے نام کے تھے اور بس۔

میں نے پچھلے دنوں رشید احمد صدیقی کا مضمون "مولانا ابوالکلام" پڑھا۔ اس میں کچھ خط مولانا آزاد سے میری صرف چند منٹ کی ایک ملاقات ہے۔ اور دو خط مولانا کے میرے نام آئے تھے۔ یہ پڑھ کر یہی اُدھر بس ذہن میں سوچا پطرس سے میرا رشتہ اس سے زیادہ کا ہے اس لئے میں کیوں چپ رہوں۔ رشید... گوش گزار کرنی چاہئے۔

پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مرحوم ایک ایک لفظ کو کئی طرح سے پرکھتے۔ سمجھتے تھے۔ تب کہیں جا کر کوئی خوبصورت لفظ ان کے قلم کی زینت بنتا تھا۔ بعض اوقات یہ بھی ہوا۔ امتیاز علی تاج، عبدالمجید سالک، صوفی تبسم، ... ندوی کی محفل جمی ہے۔ گپ شپ ہو رہی ہے۔ لطیفے تصنیف کئے جا رہے ہیں۔ مگر ان کے دماغ میں کوئی لفظ گھوم رہا ہے۔ سب کے لئے بہ آن پریشان ہے۔ بے چین رہ نہ گیا۔ سوال کر دیا۔ چند اہل جو کہ کیا یہ جملہ فقرہ یوں ہے اور ... یہ لفظ اس جگہ اس مفہوم میں ... نہ لگے گا۔

کسی نے کہا یہ، کسی نے کہا وہ۔ انہوں نے کہا۔ سب غلط۔ کبھی پورے فقرے کی ساخت پر غور کرو۔ مضمون کے مطالب پر نظر رکھو۔ یہ دیکھو کہ مزاج کو جانچو۔ پھر بتاؤ، میرے لفظ سے زیادہ موزوں کوئی لفظ اور ہے؟

مرحوم انگریزی اتنی جانتے تھے، جتنی ہم سب باتیں ... جانتے ہیں۔ اور جتنی جانتے تھے۔ اتنی اردو کے سارے پروفیسر مل کر بھی نہیں جانتے۔ اگر کسی پروفیسر کو میرا یہ تبصرہ بُرا لگے تو وہ مرحوم جیسا ایک جملہ لکھ کر دکھائے۔

۱۹۲۸ء کے آس پاس اہلِ پنجاب اور یو۔ پی والوں کے درمیان چلی اور خوب چلی۔ اُدھر سے بھی بڑے بڑے بقراط سامنے آئے۔ اِدھر سے بھی۔ اُدھر والوں کو میں نہیں چھیڑتا۔ اِدھر والوں کی بات کرتا ہوں۔

اُس وقت یو۔ پی کے کئی رسائل نے پنجابی اہلِ قلم کو مطعون گردانا۔ مگر ان میں تہذیب ذرا کم تھی گروہ بندی زیادہ تھی۔ اُدھر والوں کا سارا زور زبان کی اغلاط پر تھا۔ اِدھر والوں میں صلاح مشورے کی حد تک عبدالمجید سالک، ڈاکٹر تاثیر، امتیاز علی تاج تھے۔ مگر جو کچھ لکھنا تھا۔ وہ لکھتے پطرس ہی تھے[1]۔ بڑے بڑے تیز فقرے اُدھر سے بھی کسے، اِدھر سے بھی اٹھائے گئے۔ نیاز مندانِ لاہور کے قلمی نام سے پطرس نے لکھا:—

> "اردو کے تین مرکز ہیں۔ یو۔ پی۔ حیدر آباد دکن اور لاہور۔ لیکن اہلِ بینش بھی یہ بات کبھی کبھی بھول جاتے ہیں کہ یو۔ پی میں یہ زبان خود رو ہے۔ حیدر آباد میں یہ زبان ایک والیٔ ملک کے سایۂ عاطفت میں پل رہی ہے اور صرف پنجاب ہی ایک ایسا علاقہ ہے۔ جہاں اس کی نشوونما محض خونِ عشاق کی رہینِ منت ہے۔ جس جگہ یہ زبان خود رو ہے۔ وہاں خود بین بھی ہے۔ جہاں اتالیقِ شاہی سے تعلیم پا رہی ہے وہاں عوام سے کچھ کھنچی کھنچی سی رہتی ہے لیکن پنجاب میں اس زبان کی حالت ایک نوعمر تنومند نوجوان کی ہے جس کا خون گرم ہے اور جس کے اعضاء میں لچک ہے جو چھلانگیں مارتا جاتا ہے اور اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ اس کا ہر قدم پگڈنڈی پر پڑتا ہے یا نہیں۔ اسے صحت کا اتنا ہی شعور ہے جتنا کسی اور قدرتی نشوونما کو ہوتا ہے:

---

[1] ایک آدھ مضمون تاثیر نے بھی لکھے تھے۔ جو کہ از نیاز مندانِ لاہور یا ادب آموز کے نام سے چھپے تھے۔

بلکہ اس سے بھی تیز فقرے :—

> "یو پی کے چشمے خشک ہو چکے۔ پیاس بجھانے کے لئے اب وہاں جانا بے سود ہے۔ اب پنجاب کی رہبری بجز اس کی اپنی قوتِ نامیہ کے کوئی چیز نہیں کر سکتی۔ یو پی میں اردو ادب ایک سسکتا ہوا سانپ ہے۔ جو کبھی کبھی ایک خفیف سی پھنکار مارتا ہے اور بس، اب یو پی صرف اعتراض کر سکتا ہے۔ رہنمائی نہیں کر سکتا اور نہیں جانتا کہ اس کا چڑچڑا پن اس کا مربیانہ انداز، اس کی طفلانہ تنقید یہ سب انحطاط کی نشانیاں ہیں۔"

پطرس کے یہ فقرے تیکھے ضرور ہیں۔ گر دلآزاری کا سلسلہ دونوں طرف تھا۔ بری بات تھی تو دونوں طرف، اچھی تھی تو دونوں طرف، مگر میں جو بات یہاں عرض کرنی چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ مرحوم کو زندگی کے ہر مرحلہ پر سرداری کا چسکا رہا۔ جب اہلِ پنجاب ہی کے لتے لئے جا رہے تھے تو یہ کیسے چپ بیٹھتے وہ جس بزم میں بیٹھتے تھے۔ چاہتے تھے۔ میری باتیں، میرے جملے، حاصلِ بزم رہیں۔ بزمِ ادب میں بھی انہوں نے اونچی ہی کرسی پر بیٹھنا چاہا۔ بزمِ سیاست میں بھی آئے تو ساری دنیا نے ان کی طرف مڑ مڑ کے دیکھا۔ میرا ایمان ہے اگر وہ یوں سرفراز نہ رہتے تو یقیناً خودکشی کر لیتے۔ ان کے مذہب میں، کسی بھی مرحلہ پر شکست، موت کے مترادف تھی۔

مرحوم یہ فقرے وار بھی ہنس کے تھے۔ خود بھی ہنستے تھے۔ مطالعہ بھی ان کا خوب تھا۔ حافظہ بھی خوب، جو ان کے مطالعہ کی زد پر آگیا وہ چت، جو ان کی ذہنی پیچ کی زد پر آگیا وہ چت، غالباً قدرت نے انہیں بھیجا ہی اس لئے تھا کہ وہ لوگوں کے دلوں کو بھی فتح کریں، دماغوں کو بھی۔

حصولِ تعلیم کے لئے جب یہ لندن گئے تو انہوں نے تاج صاحب کو کیا عمدہ لکھا تھا:—

> "حضرت یہ کیمبرج یونیورسٹی ہے۔ یہاں کا ہر فرسودہ پتھر تاریخ انگلیس کی ایک خاموش فصل ہے۔ یہ وہ دار العلوم ہے جہاں ہم سے کہیں پہلے جان ہارورڈ (جس نے امریکہ میں ہارورڈ یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی) آلیور کرام ویل (CROMWELL) سٹرن (STERNE) کولرج، سیموئیل بٹلر، بیکن، ٹینی سن، تھیکرے، میکالے، نیوٹن، بل ورلٹن، پیپے، لارڈ چیسٹر فیلڈ، مارلو، ولیم پٹ، گرے، اور ملٹن کسبِ فیض کر چکے ہیں۔ اور جہاں اس وقت انگلستان کی آئندہ نسل کے کئی مشاہیر تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اس بہارستان میں ہندوستان کا ایک مرجھایا ہوا بے رنگ و بو پھول کیا حقیقت رکھتا ہے۔ غریب ماں باپ کا بیٹا، ایک غلام قوم کا فرد، نسیم اور مرزا شوق کی مثنویوں کا پڑھنے والا، فسانۂ آزاد کا دلدادہ، طبلے اور سارنگی کا شوقین، زینیا اور گل منشاں کا خریدار، ایشیا کے عشقیہ افسانوں میں رچا ہوا، مغلیہ عیش و عشرت کا خواہش مند، اتحادِ اسلامی کے خواب دیکھنے والا، میں بھلا کیا حقیقت رکھتا ہوں۔"

بخاری صاحب جب کیمبرج پہونچے تو ان کے سامنے یونیورسٹی کا سارا ماضی تھا۔ چھوٹی بڑی کئی ادبی چٹانیں، انہیں خوف زدہ کرنے کے لئے کیمبرج کے صفحات پر موجود تھیں۔ انہیں اپنی کم مائیگی کا احساس تھا۔ مگر مرعوب نہ تھے وہ سارے نام گو اپنے مقام پر ہیں مگر اس احساس کے ساتھ کہ کبھی میرا بھی نام ان لوگوں کے ساتھ لیا جائے گا۔ مرعوب ہونا تو یہ شروع ہی سے جانتے نہ تھے۔ بلکہ مرعوب کرنا ان کا فن رہا۔ یہی وجہ ہے کہ غریب ماں باپ کے بیٹے نے

پیشتر آپ کا اپنانے شعر سننے میں بڑا زور رہا۔ پنجابی زور رہا۔ ریاضت وہ بھی اس حد تک، اُس کے بس کی بات ہے ۔۔۔ آج کل (اور اُس وقت بھی) لڑکے لندن، پیرس سے جاتے ہیں تاکہ ڈاکٹریٹ کر آئیں۔ پڑھ کر کہاں جاتے ہیں۔ مگر پطرس نے وہاں جا کر نہ صرف پڑھا بلکہ استادوں کو پڑھایا بھی۔ قسمت اگر پطرس کو سکے جمانے کا موقع دیتی تو پھر ساری دنیا دیکھ لیتی کہ پطرس کا مقام، دنیا کے مُصنفوں میں بھی کسی سے پیچھے نہیں۔

بخاری صاحب جب کوئی مضمون لکھنے بیٹھتے تو وہ کامل سکون اور سکوت چاہتے تھے۔ بالکل الگ تھلگ وہ تنہا۔ جب کچھ لکھ لیتے تو پھر کچھ نہ پوچھئے۔ فوراً اپنی موٹر نکالتے اور بھاگتے اپنے کسی ذہین دوست کے پاس۔ آکر اسے جو کچھ لکھا ہوتا سناتے۔ جب تک وہ اپنا لکھا ہوا مضمون، اپنے سارے دوستوں کو سنا نہیں لیتے تھے، انہیں چین نہیں آتا تھا۔ بےکل رہتے تھے۔

یہی حال، ان کا دوستوں کی تخلیقات کے بارے میں تھا۔ وہ ہر دوست سے اصرار کرتے تھے کہ سناؤ بھئی کوئی چیز لکھی؟ کچھ لکھا ہو تو سناؤ۔ جب وہ بے چارہ سناتا تو پھر اس میں عیب ہی عیب نکالتے۔

امتیاز علی تاج نے مجھے بتایا: میں نے جب بھی پطرس کو کوئی چیز سنائی، اُس نے ہر جگہ انگلی رکھ دی۔ چنانچہ میں مرحوم کی اس "حرکت" پر پریشان رہنے لگا اور یہ طے کر لیا کہ اب انہیں کوئی چیز نہیں سناؤں گا۔ چنانچہ ایک دن، میں اپنے کسی دوست کو اپنا کوئی مضمون سنا رہا تھا تو یہ دھم سے آنکلے۔ میں نے انہیں دیکھ کر مضمون تہ کر کے رکھ دیا۔ پطرس نے تاڑ لیا۔ کہنے لگے۔ "اب مضمون کیوں نہیں سناتے؟"

تاج صاحب نے کہا: "آپ کو کوئی کافر سنائے۔ آپ تو ہر چیز میں سو سو کیڑے ڈالتے ہیں۔ اس لئے میں نے طے کر لیا ہے کہ آئندہ آپ کو کوئی چیز نہیں سناؤں گا۔"

تاج صاحب کہتے ہیں۔ پطرس میرے اس جواب پر بڑے متأثر ہوئے اور بڑے پیار سے کہا۔ "تاج تو نے مجھے غلط سمجھا ہے۔ میں جب بھی تمہاری کوئی چیز سنتا ہوں تو میرے پیشِ نظر دنیا کے تمام بڑے بڑے ادیب ہوتے ہیں۔ میں تمہیں ان کے معیار پر پرکھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تمہارا نام ان کے ساتھ لیا جائے اور تم ہو کہ مجھ سے ناراض ہو۔"

یہ تھی پطرس کی نقادانہ شان اور دوستوں کے فن کے بارے میں خلوص، اب کوئی مانے یا نہ مانے۔ آج پنجاب کے جتنے بڑے شاعر اور ادیب ہیں۔ تقریباً ان سب کے فن کے نکھار میں پطرس کا بڑا ہاتھ ہے۔ یقین نہ ہو تو میری بات کی تصدیق سالک، تاج، عابد، صوفی، راشد اور فیض سے کر لیجئے۔

ارے بھئی پطرس تو وہ بلا تھی جو علامہ اقبال تک سے بھڑ جایا کرتی تھی۔ ایک دفعہ اقبال اور پطرس کی برگساں کے فلسفے پر بات چل نکلی۔ باتیں ہوئیں۔ دلیلیں دیں اور لیں۔ کوئی بھی قائل نہ ہوا۔ بالآخر اقبال چپ ہو گئے۔ جب پطرس چلے گئے تو اقبال نے ایک نظم پطرس کے بارے میں کہی جس کا عنوان "ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام" تھا۔ نظم یہ ہے:۔

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا ۔۔ زناریِ برگساں نہ ہوتا
ہیگل کا صدف گہر سے خالی ۔۔ ہے اس کا طلسم سب خیالی
محکم کیسے ہو زندگانی ۔۔ کس طرح خودی ہو لازمانی؟
آدم کو ثبات کی طلب ہے ۔۔ دستورِ حیات کی طلب ہے
دنیا کی عشا ہو جس سے اشراق ۔۔ مومن کی اذاں ندائے آفاق
میں اصل کا خاص سومناتی ۔۔ آبا مرے لاتی و مناتی

تُو سیّد ہاشمی کی اولاد
مری کفِ خاک برہمن زاد
ہے فلسفہ میرے آب و گل میں
پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں
اقبال اگرچہ بے ہنر ہے
اس کی رگ رگ سے باخبر ہے
شعلہ ہے ترے جنوں کا بے سوز
سن مجھ سے یہ نکتۂ دل افروز
انجامِ خرد ہے بے حضوری
ہے فلسفۂ زندگی سے دوری
افکار کے نغمہ ہائے بے صوت
ہیں ذوقِ عمل کے واسطے موت
دیں مسلکِ زندگی کی تقویم
دیں سرِّ محمدؐ و براہیمؑ
"دل در سخنِ محمدی بند
اے پورِ علیؑ ز بوعلی چند
چوں دیدۂ راہ بیں نداری
قائد قرشی از بہ بخاری"

غور کیجئے اقبال پطرس کے بارے میں نظم کہتے ہیں۔ اقبال اُس وقت اپنے عروج کی آخری بلندیوں پر تھے اور پطرس بلندیوں کی طرف تک رہے تھے مگر حوصلہ دیکھئے، پہاڑ سے ٹکّرے لی۔

اب ذرا مضمون میں توازن پیدا کروں۔ ورنہ آپ کہیں گے کہ میں بار بار نیاز مندی برتتا چلا جا رہا ہوں۔ مرحوم تو واقعی بڑی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان کی تعریف و توصیف نہ بھی کروں تو بھی ان کا کچھ نہ بگڑے گا۔ میرا "پتّا" ہو جائے گا۔ اسی الزام سے بچنے کے لئے مرحوم کے چٹکی لے رہا ہوں۔ اس کے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو پطرس بے چارے اوتاروں کے زمرے سے نکل جائیں گے۔ دوسرے پطرس کے بدخواہوں میں سے کوئی مجھے جان سے نہیں مارے گا — وہ تو مرحوم ہیں۔ میں مرحوم بننا نہیں چاہتا۔ موت برحق ضرور ہے مگر وہ پطرس کی وجہ سے کیوں آئے۔

پطرس کے ہاں فقروں، ترکیبوں اور خیالات کی تکرار بہت ہے۔ وہ اپنے ایک دوست کو جن خوبصورت الفاظ سے یاد کریں گے، انہی الفاظ اور انہی طرحدار ترکیبوں سے اپنے دوسرے دوست کو زیر کریں گے۔ مرحوم کو کیا پتہ تھا کہ میرے بعد یہ کم بخت میری اس کمزوری کو اچھالے گا۔ یہ نقص مرحوم کے خطوط میں زیادہ نمایاں ہے۔ اُن میں ایک ہی طرح کے الفاظ ملتے ہیں۔ ترکیبیں کھلتی ہیں مگر بعض جگہ تو پیرے کے پیرے لڑ گئے ہیں۔ مثالیں کیا دوں۔ خود پڑھ لیجئے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔

اسی ضمن میں، میں نے ایک لطیفہ سنا ہے۔ معلوم نہیں کہاں تک صحیح ہے۔ راوی اس کا معتبر ضرور ہے۔

دلّی میں جب عصمت چغتائی پطرس سے ملیں۔ تو یہ ان دنوں آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل تھے۔ عہدے کا بھی رعب تھا اور پھر علمیت بھی۔ پطرس کے مقابلے میں بھی عصمت تھیں۔ ایک ادیبوں کا امام، ایک ادیبنیوں کی امام۔

مرحوم نے تابڑ توڑ کئی خوبصورت فقرے کہہ ڈالے۔ عصمت چپ، خاموشی سے سنتی رہیں۔ جب پطرس دم لے چکے تو عصمت نے کہا: "آپ کے یہ سارے فقرے میں پہلے بھی سن چکی ہوں۔ کوئی نیا فقرہ کہئے۔"

معلوم نہیں یہ دو بڑے ذہنوں کی زور آزمائی تھی، چھیڑ چھاڑ تھی یا افسانہ۔ عصمت بفضلِ تعالےٰ زندہ ہیں۔ اگر انہوں نے مجھے اس واقعہ کے غلط یا صحیح ہونے کے بارے میں لکھ دیا تو میں وہ آپ کو بھی بتا دوں گا۔ ویسے آپ اسی شمارے میں عصمت کا بھی مضمون پڑھ لیں۔ یہ واقعہ ممکن تو ہے پطرس کبھی بلا عصمت کبھی ملا ہے۔

---

[1] عصمت کی پہلی ملاقات بمبئی میں ہوئی۔ ملنے میں پہل پطرس کی طرف سے ہوئی۔ مگر یہ واقعہ دلّی کا ہے۔

ویسے یہ واقعہ ہے کہ پطرس صحت سے بہت تنگ تھے۔ [illegible] نے صحت پر ایک [illegible] مضمون لکھا تھا۔ بات [illegible] میں صحت نے مضمون "سیر دن" کا انگریزی میں ترجمہ کیا، [illegible] صحت کے اصولوں کی حمایت کی۔

پطرس کے مزاج میں اپج بن چکی تھی۔ زندگی کے عام چلن میں بھی یہ بات تھی کیا نیت سے کہ ابھی بیان کرتے ہیں۔ وہ کبھی کالج کے زمانہ میں انہوں نے [illegible] کی ایک سوسائٹی بنائی۔ دوستوں سے سگریٹ مانگنے کے لیے [illegible] تھی۔ نتیجہ۔ سگریٹ مانگتے اور جیب میں ڈال لیتے۔ شام کو باقاعدہ حساب ہوتا۔ بخاری کی جیب میں باقی ممبروں سے زیادہ سگریٹیں برآمد ہوتیں۔ [illegible] پروفیسر [illegible] ڈبیں معاف کر دیا کرتے تھے۔ سالک صاحب راوی ہیں کہ ایک بار انہوں نے اپنے ایک پروفیسر سے [illegible] سگریٹ مانگنے سے [illegible] جیب میں ڈالی۔ پروفیسر نے چلا کر کہا بخاری خدا کے لیے میری ماچس تو چھوڑو۔ بخاری نے ماچس واپس کر دی۔ مگر اس دن سے یہ سوسائٹی بھی توڑ دی۔ [illegible] ختم ہو گئی تھی۔

لڑکپن کے زمانے کی بعض شرارتوں کا ذکر انہوں نے اپنے مضمون "ہوسٹل میں پڑھنا" میں کیا ہے۔ یہاں ان کا اعادہ ان صفحوں پر بار ہوگا جن معلوموں نے وہ کتاب پڑھی ہے اور بار بار پڑھی ہے۔

عابد صاحب نے بتایا، ایک رات میں، حسرت، تاثیر، صوفی، اور پطرس موٹر پر [illegible] رہے تھے۔ راستے [illegible] کسی نے کہا، پیاس لگی ہے۔ لیمونیڈ پیا جائے۔ کچھ دکانیں کھلی تھیں۔ جن میں ایک سگریٹ والا بھی تھا۔ اس سے پانچ لیمونیڈ [illegible] بخاری صاحب نے ان سے پوچھا "پیسے ہیں آپ حضرات کے پاس؟" جیبیں ٹٹولی گئیں تو سب کی [illegible] آنے نکلے۔

سب موٹر ہی میں بیٹھے رہے۔ پانچ لیمونیڈ کا آرڈر دیا گیا۔ جب سب پی کر ڈکار لے چکے تو بخاری صاحب دکاندار سے کہنے لگے۔ "بڑے میاں یہ لوگ شریفانہ لباس میں ضرور ہیں۔ مگر ہیں سب کے سب آوارہ اور لفنگے۔ ان کی جیبوں میں پھوٹی کوڑی نہیں۔ ان لفنگوں کی دوستی میں مجھ جیسے شریف آدمی کا بھی حال پتلا ہو گیا ہے۔ بہرحال ہم اس وقت آپ کے چار روپے کے مقروض ہیں۔ اعتبار کریں تو یہ رقم کل تک بھجوا دوں گا۔ اگر آپ کو میری بات پر اعتبار نہ ہو تو یہ میری ۲۵ ہزار کی گاڑی کل تک کے لیے گروی رکھ لیں۔ ہم آپ کا چار روپیہ دے جائیں گے اور اپنی موٹر لے جائیں گے۔"

ابھی دکاندار فیصلہ ہی کر رہا تھا کہ موٹر گروی رکھ لوں یا اعتبار کروں۔ بخاری صاحب نے موٹر اسٹارٹ کر دی۔ دکاندار [illegible] رہ گیا۔ [illegible] سوچتا ہوگا، پانچوں ہی اچکے ہی نکلے۔[1]

ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب یہ آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل تھے، انہوں نے ایک گٹار خریدا اور اپنے ایک دوست کو ساتھ لے کر دلی کی نواحی بستیوں میں گھوم گھوم کر جا کر یہ صدا دی:

"بابا اللہ کے نام پر کچھ دے گا؟"
"ہم دونوں بھائی کل رات سے بھوکے ہیں۔"
"بھلا کر بھلا ہوگا۔"
اپنے بچوں کے صدقے میں ہمیں کھانا کھلا دو۔"

---

[1] ویسے دوسرے دن یہ رقم مع سود کے ادا کر دی گئی تھی۔

معلوم ہے ان کا ساتھی کون تھا؟ سابق گورنر جنرل پاکستان غلام محمد!

پطرس کے یہ مشغلے عجب مزہ کے تھے۔ مگر ان میں زندگی سے پیار اور اس سے لطف اندوز ہونے ہی کے تو سارے رنگ روپ ہیں۔ مرحوم کو معلوم تھا، زندگی بڑی نعمت ہے۔ اسے ہر رنگ میں بسر کر دیکھو۔ میرا خیال ہے وہ دنیا سے اپنی کوئی حسرت ساتھ لے کر نہیں گئے۔ کوئی بھی حسرت، سوائے مچھلی کے۔

تاج صاحب نے مجھے بتایا، ایک بار حفیظ جالندھری، پطرس سے ناراض ہو گئے۔ دوستوں کی ناراضی پطرس سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ بے چین اور بے کل رہتے تھے۔ چنانچہ ایک دن کہنے لگے۔ حفیظ مجھ سے ناراض ہے۔ چلو اسے چل کر منائیں۔ چنانچہ میں اور پطرس، حفیظ صاحب کے ہاں پہنچے۔

پطرس نے جاتے ہی کہا۔ حفیظ میری خطائیں معاف کر دو میں آج معافی ہی مانگنے آیا ہوں۔ پطرس نے ہر ہر انداز سے چاہا، حفیظ کی ناراضی ختم ہو مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ مرحوم آزردہ ہو کر لوٹے۔

کوئی آٹھ دس دن ہوئے حفیظ صاحب میرے دفتر آ نکلے۔ میں نے اس واقعہ کے بارے میں استفسار کیا۔ فرمانے لگے۔ "تم نے جو کچھ سنا ہے، ٹھیک سنا ہے۔"

"آخر بات کیا تھی؟"

"تمہیں کیا بتاؤں طفیل، بخاری میرا دوست تھا۔ جگری دوست، اس جیسا آدمی پاکستان نے پیدا ہی نہیں کیا۔ ذہانت اُس پر ختم تھی۔ دوستانہ حقوق کی بجا آوری میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہ تھا۔ مگر ـــــ"

"مگر کیا؟"

"وہ کم بخت پاکستان کی بعض ایسی شخصیتوں کی صلاحیتوں کا منکر تھا۔ جو میرے نزدیک واجب الاحترام تھیں۔"

حفیظ صاحب کہنے کو تو یہ فقرہ کہہ گئے۔ میں نے بھی سن لیا۔ مگر میں اسے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ اس لئے کہ کوئی بڑا آدمی، اگر دوسرے کی بھی بڑائی کا اقرار کرے تو اس کی اپنی بڑائی پر حرف آ جاتا ہے یا وہ سمجھ لیتا ہے کہ حرف آ گیا ـــــ یہ بھی امکان ہے کہ اس معاملے میں، پطرس کی نظر ہی چوک گئی ہو اور انہوں نے ان بزرگوں کو سمجھنے میں بھی غلطی کی ہو۔ مگر ان کی تحریریں، تقریروں، اور خطوں سے یہ بات ظاہر نہیں ہوتی۔ برخلاف اس کے پاکستان کی تبلیغ کے لئے مرحوم کے کارنامے اَنمٹ ہیں۔ دنیا میں ان کی حب الوطنی کا شہرہ رہا۔ یو۔ این۔ او کی در و دیوار مرحوم کی پاکستان دوستی کی قسمیں کھانے کو تیار ہیں۔ میرے دعوے کی تصدیق میں، اس ناچیز کی پیش کش میں بھی بہت کچھ ملے گا۔ ایک جگہ نہیں۔ کئی جگہ۔

بخاری صاحب کو کوئی باتوں سے جیت لے۔ یہ ناممکن تھا۔ آغا اشرف بتاتے ہیں کہ لیک سکس میں بخاری صاحب کا جب پہلی پریس کانفرنس سے واسطہ پڑا تو چہرے سے نڈھال نظر آئے۔ بخاری صاحب کو بھی معلوم تھا۔ میری زندگی اور موت کا فیصلہ آج ہی ہونے والا ہے۔ چنانچہ یہ اپنی جگہ پہ چوکس تھے۔

ہندوستانی اخبار نویسوں کو سوجھی۔ بخاری کا جلوس آج ہی نکال دیا جائے۔ چنانچہ وہ سب بڑھ بڑھ کے سوال کر رہے تھے۔ عین ممکن تھا کہ ان کے پاؤں اکھڑ جاتے۔ مگر ادھر قدرت نے بخاری کو قوتِ گویائی کی غیر معمولی صلاحیتیں عطا کی تھیں۔ اکھڑتے تو کیسے اکھڑتے۔ یہ پے بہ پے اپنی لسانی اور مزاحی حربوں سے ہندوستانی اخبار نویسوں کو چت کرتے رہے۔ ایک سوال کے جواب میں کہا ـــــ پاکستان تو ہندوستان سے تعاون کرنا ہی چاہتا ہے۔ مگر ہندوستان ہی راہِ راست پر نہیں ہے۔ قیام پاکستان کے وقت یہ طے ہوا تھا کہ پاکستانی فوج کو مشترکہ ذخیروں میں سے کئی ہزار جوتے دیے جائیں۔ جوتے دینے سے مکر گئے۔

لیکن جب صندوق کھولے گئے تو سارے جوتے بائیں پاؤں کے نکلے۔ دایاں پاؤں ایک بھی نہ تھا۔

یہ اور اس قسم کے سیکڑوں واقعات ہیں۔ جو بخاری صاحب کی غیر معمولی ذہانت و فطانت کے مظہر ہیں۔ کوئی ان کا کہاں تک ذکر کرے۔ مولوی غلام مصطفیٰ صاحب تبسم راوی ہیں کہ فسادات کے دنوں میں امتیاز علی تاج بڑے ہی گھبرائے ہوئے تھے۔ ایک شام سالک، بخاری اور میں ان کے گھر گئے تو تاج کو بے حد خوفزدہ پایا۔ وہ بخاری سے کہنے لگے۔ اب کیا ہوگا۔ بخاری صاحب نے کہا۔ کچھ بھی نہیں مصیبت یہ ہے کہ ہم لوگ یا تو پینک میں رہتے ہیں یا (PANIC) پینک میں۔ سب ہنس پڑے۔ تاج صاحب میں بھی زندگی کے آثار نظر آئے۔

بخاری صاحب غالب کے بڑے مداح تھے۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ غالب کا خیال ہے کہ انسان حیوانِ ناطق ہے۔ لیکن غالب خود حیوانِ ظریف تھے۔ میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں، بخاری غالب کے ہم پلہ تھے بلکہ اس سے بھی دو ہاتھ آگے۔ ان کے سبھی دوستوں کو ان کے متعدد لطیفے اور قصے یاد ہیں۔ مجید ملک نے ایک دفعہ بخاری سے کہا کہ آپ اپنے مضامین کا ایک مجموعہ چھپوائیں اور اس کا نام صحیح بخاری رکھیں۔ بخاری نے بے ساختہ جواب دیا۔ عزیز من! آپ اپنی نظموں کا مجموعہ چھپوائیں اور اس کا نام "کلام مجید" رکھیں۔

ایک بار، ایک صاحب نے بخاری صاحب سے پوچھا "بخاری صاحب آج کل آپ کچھ موٹے سے ہیں؟"

بخاری صاحب نے جواب دیا: یہ سوال ایسا ہی ہے جیسے کسی عورت سے پوچھا جائے۔ تو حاملہ ہے؟

اگر کوئی بخاری صاحب کے لطیفے، چٹکلے سننے ہی پہ آجائے تو پھر وہ سنتا ہی چلا جائے گا۔ ایک دو نہیں، ہزاروں لطیفے (واقعی ہزاروں لطیفے) اگر میں نے اس سلسلے کو یہیں ختم نہ کیا تو بہت ممکن ہے یہ حصہ بخاری صاحب کی شخصیت پر چھا جائے اور خود بخاری صاحب چُھپ جائیں۔ اس لئے یہیں چپ ہوتا ہوں۔

بخاری صاحب کو ڈرامے سے بڑی دلچسپی تھی۔ اس کے فن سے بھی کما حقہ واقف تھے۔ جس کا ذکر اور کئی جگہوں پہ آئے گا۔ جب تک گورنمنٹ کالج میں رہے۔ کالج کی ڈرامیٹک کلب زوروں پر رہی۔ خوب خوب داد حاصل کی۔ ضرورت پڑتی تو خود بھی ڈرامے کا کردار بن جاتے اور لوگ بخاری کی ایکٹنگ دیکھ کر دنگ رہ جاتے۔ ان کا ارادہ تھا۔ پختہ ارادہ کہ ڈرامے کے فن پر ایک مبسوط کتاب لکھیں۔ یہ اس ضمن میں اپنے دوستوں کو پکارتے رہے کہ میرا ساتھ دو تاکہ ایک کام ہو جائے مگر یہ خواہش ان کے ساتھ اس لئے دفن ہوگئی کہ ان کا کوئی دوست آگے نہیں بڑھا تھا۔

اور بھی کئی تحقیقی کام کرنا چاہتے تھے۔ جن میں ایک بچوں کے لئے درسی کتابیں لکھنے کا پروگرام تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ بچوں کے لئے ایسی درسی کتابیں لکھ جائیں کہ پھر مدتوں ان کی یاد بھلائی نہ جاسکے۔ اسی ارادے سے انہوں نے ایک اسکیم بنائی۔ جو کسی وجہ سے بارآور نہ ہوئی۔

ایک کتاب ایڈٹ بھی کر رہے تھے۔ نام تھا اس کا A STUDY OF PAKISTAN کئی ابواب میں اسے تقسیم کیا۔ جو بھی جس موضوع پر کام کی چیز لکھ سکتا تھا۔ اسے اس کام کی تکمیل کے لئے پکارا۔ ادبی رجحانات پر خود لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ مگر یہ کام بھی تکمیل کو نہ پہنچا۔ غرض بہت کچھ کرنے کے ولولے تھے جو ساتھ لے گئے۔ اگر وہ آخری عمر میں پاکستان سے باہر نہ جاتے تو وہ کچھ نہ کچھ کر گذرتے۔ وہ اسی خوشی میں زندگی بسر کر رہے تھے کہ کچھ کریں گے۔ اگر انہیں یہ یقین ہوتا کہ کچھ نہیں کر پائیں گے اور چل دیں گے۔ تو یقیناً ان کا اجل سے بھی پہلے انتقال ہو جاتا۔

اصل میں بخاری صاحب ادب ہی کے لئے سب سے زیادہ موزوں تھے۔ مگر زندگی کی اڑان میں وہ اس طرف توجہ نہ کر سکے۔ افسوس کہ ہمارے ہاں جتنے بھی صاحب اختیار تھے۔ ان میں بھی کوئی ایسا دیدہ ور نہ ہوا۔ جو بخاری کی شخصیت کو پہچان لیتا اور ان سے ادب کے سنوارنے کا کام لے سکتا۔

بخاری صاحب اپنی آخری عمر میں پنجاب یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے لئے کوشاں رہے۔ مگر انہیں وہ بھی نہ ملی۔ یہ بخاری صاحب کے ساتھ

علم نہیں تھا تو کیا تھا۔ یہ بات ان کے لئے باعث فخر نہ تھی کہ وہ کسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوتے۔ بلکہ اس یونیورسٹی کی خوش قسمتی تھی جس کے وائس چانسلر بخاری صاحب ہوتے۔

ایک دو واقعات، جناب شورش کاشمیری نے بھی خوب سنائے۔ جیسے شورش صاحب ہیں۔ ویسے ہی یہ واقعات یعنی جرأت و شجاعت سے لبریز۔ مرحوم کی دلیری کے ایسے واقعات پر اور کسی نے روشنی نہیں ڈالی۔

ایک زمانے میں، ایک اخبار نویس کا کام یہ تھا کہ وہ بخاری صاحب کے خلاف لکھا کرتا۔ اور جی بھر کے لکھا کرتا تھا۔ بخاری صاحب پہلے تو دل کو بہلاتے رہے کہ کسی دن یہ اللہ کا بندہ خود ہی راہ راست پر آ جائے گا۔ جب مایوس ہو گئے تو ایک دن اس اخبار کے دفتر جا پہنچے۔

اخبار کے ایڈیٹر کرسی ادارت پر براجمان تھے۔ انہوں نے اس کے کان میں کہا: "مجھے آپ سے علیحدگی میں ایک کام ہے۔"

وہ صاحب گھبرائے نہ۔ آج ضرور ہی کارگزاریوں کا سودا ہونے لگا۔ خوش ہو کر اٹھے۔ من میں ہزاروں کی سوچ لی۔

جب بخاری صاحب اور وہ ایڈیٹر صاحب ایک الگ کمرے میں پہنچے تو انہوں نے دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔ منہ سے کچھ نہ بولے۔ بلکہ اطمینان سے ان کے منہ پر زور سے چانٹا رسید کیا۔ ایک اِدھر، ایک اُدھر، اس کے بعد چٹخنی کھولی اور یہ کہتے ہوئے سیڑھیاں اتر گئے۔ اب اطمینان سے بیٹھا لکھا کرو۔

متحدہ ہندوستان میں، جب انگریزی کا طوطی بولتا تھا، خلاف حکومت سرگرمیوں کے سلسلے میں، حاکمانِ وقت کو ارونا آصف علی کی تلاش ہوئی۔ وہ روپوش ہو گئیں۔ یہ بھی انہی دنوں کا قصہ ہے۔ جب بخاری صاحب ریڈیو کے ناظم تھے۔

ریڈیو پر روز اعلان ہوتا۔ ارونا آصف علی کے وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے ہیں۔ جو صاحب ان کا اتہ پتہ بتائیں گے۔ انہیں انعام دیا جائے گا۔ یہ اعلان ایک دن نہیں ہوا کئی دن ہوتا رہا۔

جو محکمہ لوگوں سے یہ کہتا تھا کہ ارونا آصف علی کا اتہ پتہ بتانے والے کو انعام دیا جائے گا۔ اسی محکمہ کے ناظم کے گھر ارونا آصف علی رہتی تھیں۔ آصف علی سے مرحوم کے بڑے مخلصانہ تعلقات تھے۔ یہ واقعہ ایک طرف تو حق دوستی کی آخری حد ہے اور دوسری طرف جرأت و ہمت کی ایک عجیب داستان!

بخاری صاحب نے زندگی بھر اپنے دوستوں سے ٹوٹ کر محبت کی اور نبھائی۔ برخلاف اس کے ان کے دوست اتنے عاشق ثابت نہ ہو سکے۔ اپنے خطوں میں، انہوں نے کیا کیا گلے نہیں کئے۔ اس کی ایک نفسیاتی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مرحوم کو چھوٹے چھوٹے کئی عارضے تھے۔ اس پر کینسر جیسی خوفناک بیماری۔ موت ان کے سامنے مدتوں ناچتی رہی۔ مگر یہ آنکھیں چرائے، دل کو طرح طرح سے بہلاتے رہے۔ بالآخر اس جیالے مخلص اور عالم کو موت نے آن ہی دبوچا۔ آج یہاں سوگ ہے۔ عرش پر جشن ہوگا۔

یہ مانگے تانگے کا مضمون ضرور ہے۔ مگر "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" کی قسم بھی کون کھائے!

پطرس بحیثیت مزاح نگار

محمد احسن فاروقی

لکھنؤ یونیورسٹی میں داخل ہوئے ایک مہینہ گزرا تھا کہ ایک دن لائبریری میں شفیق وجاہت رضا نے میرے ہاتھ میں ڈکنس کی ایک ناول دیکھ کر کہا: اگر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جانا چاہتے ہو تو مضامین پطرس پڑھو۔ میں نیا نیا جب میں یونیورسٹی میں آیا تو ادب کی صحبت کا اندازہ اور ادب کی اتنی ہی پستی کا احساس لے کر داخل ہوا تھا۔ سنا تو یہی سمجھا کہ صاحب ذوق تھا ہیں تو اس قدر سستا مذاق تھا۔ کہ اسے ڈکنس کی تصنیف کے علاوہ ہر معمولی تصنیف سے نفرت کا اظہار کرنا فرض سمجھتا تھا۔ پھر اس وقت میری ایک ادبی بزرگی وفن رکھ کر تھی۔ جو میرے جاننے والوں میں کچھ مقبول سی ہو چلی تھی۔ وہ یہ جسمانی امراض بھی ادبی تاثرات سے دور کئے جاسکتے ہیں۔ اور میرے پیٹ کی خرابی اس وقت ایک مشہور تھا جس میں میں بھی مبتلا تھا میں اپنے نظریہ کی مثال میں یہ کہا کرتا تھا کہ پیٹ خراب ہو تو ڈکنس کی ناولیں پڑھو پیٹ ٹھیک ہو جائے گا۔ چنانچہ میرے ہاتھ میں ڈکنس کی ناول دیکھ کر وجاہت رضا نے یہی تصور کیا تھا کہ پیٹ میں درد کی شکایت سے جا رہا ہوں۔ اور جیسے لوگ انگریزی دوا کی شیشی ہاتھ میں دیکھ کر ازراہ ہمدردی کہتے ہیں: کبھی یونانی ڈاکٹر کی دوا سے بھی ہو، حکیم کا علاج کرو زیادہ فائدہ ہوگا: اسی طرح وجاہت رضا نے بھی ڈکنس کی بجائے پطرس سے علاج کا مشورہ دیا۔ مگر جیسے جدید لوگ حکیم کے علاج کا نام سنتے ہی صاف ٹال دیتے ہیں اور مشورہ دینے والے کو ہنسی نما سے دیکھتے ہوئے چلے جاتے ہیں ویسے ہی میں نے وجاہت رضا کو دیکھا اور اپنا رستہ لیا۔

پطرس نام عجیب تھا۔ کوئی عیسائی ہے؟ نہیں عیسائی عبرانی نام سے عربی نام پر اترنے کی ذلت برداشت نہیں کر سکتا۔ کوئی لونڈا لاڈلا ہی ہوگا جس نے یہ تخلص رکھ لیا اور پھکڑ بازی کرتا ہوگا۔ وجاہت رضا اردو کے لکھنے والوں کو اچھالا کرتے تھے۔ بات یہ تھی کہ وہ اردو بہت زیادہ جانتے تھے مگر انگریزی میں کچے تھے اس سے پطرس کو ڈکنس کی بجائے پیش کر کے ہم کو دھوکے میں ڈالنا چاہتے تھے۔

مگر کچھ ہی عرصے کے بعد معلوم ہوا کہ پطرس کوئی لونڈا لاڈلا نہیں جس استاد نے ہمیں انگریزی ہیومر کو سمجھنا سکھایا تھا۔ وہ اور پطرس کیمبرج میں ساتھی تھے۔ پطرس اصل میں پروفیسر بخاری تھے۔ جو ہندوستان کے سب سے بڑے تعلیمی ادارے یعنی گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی ادب پڑھاتے تھے فوراً ہمیں یقین آگیا کہ وہ ضرور جانتے ہوں گے کہ ہیومر کیا چیز ہے مگر ان کا ہیومرسٹ ہونا ابھی تک شبہ میں تھا

مگر جادو وہ ہے جو سر چڑھ کے بولے۔ جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ ہم مانیں چاہے نہ مانیں وہ سر پر چڑھ ہی بیٹھے گا۔ اور پھر ہم کو اسے ماننا ہی پڑے گا۔ ایک جادو اقبال تھا۔ "شکوہ" و "جواب شکوہ" پڑھتے ہی ہمارے سر پر ایسا سوار ہوا کہ قیامت کے دن بھی سوار ہی نظر آئے گا۔ دوسرا جادو پطرس' اس کے سر پر سوار ہونے کا قصہ سنئے۔

کوئی صاحب کی کتاب تھی۔ اس میں کتے نظر آیا کرتے تھے وہ سب کے سب عجیب ہی ہوا کرتے تھے۔ ہمیں ان سے اس قدر خطرہ لگتا تھا کہ جس گلی میں داخل ہوتے تو پہلے دیکھ لیتے کہ دور دور تک کوئی کتا تو نظر نہیں آرہا ہے اور اگر نظر آتا تو اس گلی میں کبھی قدم نہ رکھتے۔ بڑے ہوئے تو دوست اس بات پر ہمارا مذاق اڑایا کرتے۔ ہمارے بزرگ فاتحانہ کہتے کہ یہ ڈر ہمارے اندر فطری تھا۔

پھر ہم نے اسٹیونس کی کتاب "ٹریولز ود دی ڈنکی" پڑھی۔ اس نے ایک جگہ کتوں سے خوف کا پر لطف ذکر کیا ہے۔ ہمیں بڑی تقویت ہوئی کہ ایک تو ساتھی ملا۔

اس پس منظر کو ساتھ لیے ہوئے جب میری نظر "کتے" اور اس کے نیچے پطرس پر پڑی۔ تو کیا بتاؤں کیا ہوا۔ فوراً کتاب لے کر بیٹھ گیا اور پڑھنے

۵ ـــ

پہلے ہی جملے نے مار ڈالا: "علم الحیوانات کے پروفیسروں سے پوچھا۔ سلوتریوں سے دریافت کیا۔ خود سر کھپاتے رہے۔ لیکن کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر کتوں کا فائدہ کیا ہے؟" اچھل کر دل بول اٹھا "قسم استاد کی ہیومر یہ ہے"۔ کہیں کوئی غلط نہ سمجھ لے ہیومر جملوں اور فقروں کی چیز نہیں ہے۔ یہ ایک نقطۂ نظر، مزاج کے حقائق سے تصادم، زندگی میں ایک مخصوص کیفیت کے احساس کا نام ہے۔ اس جملے میں ہیومر نہیں، اس سے ہیومر شروع ہوتا ہے یہ جملہ ایک نئی نظر ایک نئی ہستی ایک نئی ادا ایک نئے عالم خیال ایک نئی بے ڈھنگی دنیا کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ یہ کتوں کے ایک نئے عجائب فلسفے کا رستہ تیار کر رہا ہے۔

دیکھئے یہ نئے نکتے آگئے۔ "یہ کتے کیا کرتے ہیں؟" وفادار جانور؟ "واہ کیا وفاداری ہے کہ شام کے سات بجے سے جو بھونکنا شروع کیا تو لگاتار بغیر دم لیے صبح کے چھ بجے تک بھونکتے چلے گئے"۔ "جیسے یہ کتوں کا مشاعرہ گرم ہے" کم بخت بعض تو دو غزلے اور سہ غزلے لکھ کر لائے ہیں" ہنگامہ گرم ہے۔ پطرس آرڈر آرڈر پکار رہا ہے کچھ اثر نہیں مجبور ہو کر کہتا ہے: "اب ان سے کوئی پوچھے کہ میاں تمہیں ایسا ہی ضروری مشاعرہ کرنا تھا تو دریا کے کنارے کھلی ہوا میں جا کر طبع آزمائی کرتے یہ گھروں کے درمیان آکر سوتوں کو ستانا کون سی شرافت ہے"۔

دیکھئے اور "کتے" "قومیت کے دلدادہ کتے۔ پتلون کوٹ کو دیکھ کر بھونکنے لگ جاتے ہیں۔" کیسے قوم پرست ہیں!

انگریزوں کے کتے۔ ان کی شائستگی دیکھئے۔ "ایک نازک اور پاکیزہ آواز میں بخ بخ کر رہے ہیں۔ چوکیداری کی چوکیداری موسیقی کی موسیقی۔ اور ہمارے کتے۔ بے تالے کہیں کے نہ موقع دیکھتے ہیں نہ وقت پہچانتے ہیں گلے بازی کئے جاتے ہیں"۔

ظاہر ہے کہ پطرس سے ان کے تعلقات کشیدہ ہی رہتے ہیں مگر مسٹر پطرس۔ بااخلاق انسان ہیں طبعی شرافت ان پر غالب آ ہی جاتی ہے۔ ہم انہیں بزدل ہرگز نہ سمجھیں گے۔ ہاں ان کے حال سے بے حال ہو جانے پر ہماری نظر ہے۔ "آیۃ الکرسی کی جگہ دعائے قنوت پڑھنے لگے ہیں۔ رات کے وقت تھیٹر سے واپس آرہے ہیں ...... " اتنے میں ایک موڑ پر سے جو مڑے تو سامنے ایک بکری بندھی تھی۔ ذرا تصور ملاحظہ ہو آنکھوں نے اسے بھی کتا دیکھا۔ ایک تو کتا اور پھر بکری کی جسامت کا۔ گویا بہت ہی کتا۔" بہت ہی کتا۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ "بس ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ چھڑی کی گردش دھیمی ہوتے ہوتے ایک نہایت ہی نامعقول زاویے پر ہوا میں کہیں ٹھہر گئی۔ سیٹی کی موسیقی بھی تھرتھرا کر خاموش ہو گئی۔ لیکن کیا مجال جو ہماری تھوتھنی کی مخروطی شکل میں ذرا بھی فرق آیا ہو۔ گویا ایک بے آواز لے ابھی تک نکل رہی ہے۔ طب کا مسئلہ ہے کہ ایسے موقعوں پر اگر سردی کے موسم میں بھی پسینہ آجائے تو کوئی مضائقہ نہیں بعد میں پھر سوکھ جاتا ہے"۔ ہاہاہاہا۔ اف۔ اف۔ ہم نے بھی کچھ ایسا ہی محسوس کیا ہے مگر اب اس پر ہنستے ہنستے لوٹے جا رہے ہیں۔ پطرس سچ مچ ہیومرسٹ ہے۔ پیدائشی ہیومرسٹ ہے۔

معلوم ایسا ہوتا تھا جیسے کسی کتے نے کاٹ لیا ہوتا اور آج اس کا نتیجہ چھپ رہا ہو...... "جب تک کتے موجود ہیں اور بھونکنے پر مصر ہیں سمجھ لیجئے کہ ہم قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں... بھونکنا عجیب چیز ہے۔ اس کے اصول نرالے ہیں۔ متعدی مرض ہے [illegible]۔ دو دو تین تین آنے کے کتے بھی بھونکنے سے باز نہیں آتے۔ اور پھر بھونکتے ہیں چلتی موٹر کے سامنے آکر گویا اسے روک ہی تو لیں گے"... بھونکنا عجیب شے ہے۔ پطرس کے حواس کو معطل کر دیتا ہے۔ لیجئے بھونکنے کا ایک اور منظر۔ پہلا منظر مشاعرہ ہو چکا۔ اب ایک پورا جلسہ باہر سڑک پر آکر تبلیغ کا کام شروع کر رہا ہے۔ پطرس سڑک پر ہے۔ آپ کیسے ہوش ٹھکانے رکھ سکتے ہیں؟...... بہرصورت کتوں کی یہ [illegible] ہے"... پطرس کو غصہ آگیا۔ پوری مجلس کا ان متفقہ متحدہ طور پر چند زوردار "کتا ایک کمینہ ذات ہے" یہ الفاظ اس کے منہ سے نکل ہی گئے [illegible]۔ مگر کسی کتے کی دل شکنی اسے منظور نہیں..... "یہ مضمون کسی [illegible] پڑھا جائے"

خیر، ولایتی کتوں کو چھوڑیئے۔ خدا ترس کتے دیکھئے۔ مسکینی و عجز [illegible] سڑک کے بیچوں بیچ [illegible] لیٹا ہوا ہے۔ گاڑی کے بیل کوئی اثر نہیں کرتے۔ کسی نے چابک مارا تو ایک گز پرے جا بیٹھا۔ بالکل ایسے مجبور ہیں۔ اپنے سامنے راستہ چھوڑ دینا فقیری کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں... "رات کے وقت اپنی دم کو تا بحد امکان سڑک پر پھیلا کر رکھتے ہیں۔ اس سے محض خدا کے برگزیدہ بندوں کی آزمائش مقصود ہوتی ہے"... اگر ان کی دم پر کسی نے پاؤں رکھ دیا تو رات بھر خواب میں بے شمار کتے پاؤں سے لپٹے نظر آئے۔

پطرس کے دل میں ان سے انتقام لینے کی آگ ہے۔ اگر خدا اسے بھونکنے اور کاٹنے کی طاقت عطا کرے تو سب کتوں کو [illegible] پہنچا دے۔ کاٹنا اور بھونکنا..... یہی دو طاقتیں ہیں۔ "انگریزی میں ایک مثل ہے کہ "بھونکتے ہوئے کتے کاٹا نہیں کرتے" یہ بجا سہی لیکن کون جانتا ہے کہ ایک بھونکتا ہوا کتا کب بھونکنا بند کر دے اور کاٹنا شروع کر دے؟" واہ۔ واہ۔ کیا بات کہی ہے۔ اس کے جملے مضمون کو [illegible] نہ جانا چاہیے۔

یہ سب کیا ہوا؟ ایک مخصوص پیرائے پر بنانے والی ہستی دکھائی دی۔ اس نے اپنے تئیں دکھایا۔ واقعہ کیا کرتی ہے۔ ہمیں ایسا ہے بالکل ہمارا ساتھی ہم زاد۔ اور اس نے کتے دکھائے۔ عجب حالات کے کتے...... دیکھئے وہ دروازے پر گلی میں کتے بھونک رہے ہیں۔ آس پاس یہ کیا ہوا۔ یہ سب پطرس کے کتے ہو گئے۔ جو کتا دکھائی دیتا ہے وہ پطرس کا کتا ہے۔ ہم پطرس ہیں وہ ہمارا کتا ہے۔ یہ جادو ہے۔ ہمارا نقطۂ نظر ہی بدل گیا۔ [illegible] کہتے ہیں [illegible] کوئی لفظ اس لفظ کے معنی نہیں ادا کر سکتا۔

اب سنئے کہ اس مضمون کو پڑھ کر ہمارا کیا حال ہوا..... ہمارے اندر سب سے بڑی بیماری یہ ہے کہ ہم پر کتابوں کا جنون سوار ہو جاتا ہے۔ اس کی شدت کا اندازہ یوں کیجئے کہ اگر کسی رات کو کسی کتاب کا جنون ہم پر سوار ہو تو ہم بازار جا کر کتابوں کی دوکان کے تالے توڑ کر کتاب نکال کر گھر لے آئیں گے اور بغیر اس کو ختم کئے دم نہ لیں گے...... تو بس صاحب مضامین پطرس کا جنون ہم پر سوار ہوا۔ فوراً بازار پہنچے اور ایسی جلدی کتاب لے کر واپس آئے کہ معلوم ہوتا تھا کہ کتاب چرا کر بھاگے ہیں۔

اب پطرس میری نگاہ میں پکا ہیومرسٹ تھا۔ اردو کا واحد ہیومرسٹ۔ بلکہ صف اول کا ایک ہیومرسٹ۔ اور پھر ایک ہی جلسے میں ہم سودائی ہو چکے تھے۔ کتابوں کا سودا بہت اچھی چیز ہے۔ ادھر سودا ہوا اور ادھر وصل میسر ہو گیا۔ اتنی آسانی کسی اور عشق میں نہیں ہوتی۔ غرض ہم اور پطرس من تو شدم تو من شدی ہو گئے۔

دیباچہ شروع کیا۔ یہ کتاب ہمیں کیسے ملی؟ ایک مضمون تو مفت ملا۔ اتنا پطرس پر احسان تھا۔ ہاہا احسان پطرس پر۔ باقی کتاب ہم نے

چرانی [illegible] جب سے آپ [illegible] ساتھ [illegible] رہ گئے رہتے تھے وہ گھر پولیس کے تھانے چوری کے درپے ہی آتی ہے۔ چوری اور اس کا لازم و ملزوم ہیں [illegible] اگر وہ چوری نہیں تو پھر چوری ضروری ہوا۔ [illegible] کہتا ہے مگر یہ کتاب [illegible] خرید لائے ہیں۔ اس سلسلے میں اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کرنا ضروری ہے۔

[illegible] حماقت کو حق بجانب [illegible] کتاب پر عاشق ہونے [illegible] تو ہیومر لیا جاتا ہے ہمارے نزدیک ہیومر کی سب سے بہتر تعریف [illegible] بڑے سویفٹ کے قلم سے نکل گئی۔ یہ بہت ٹھیک ہے۔ اور اس نے اپنی کتاب " انگلش ہیومرسٹس " میں سوئفٹ " SWIFT " پر لکھتے ہوئے یہ فقرہ چھوڑ دیا TRUTH TOPSY-TURVY, AT ONCE TRUE AND ABSURD. یہ بات [illegible] ہے حماقت کو حق بجانب ثابت کرنا حق بجانب کو حماقت ثابت کرنا۔ پطرس پر اتفاق سے وہی کچھ لکھ گیا جو ٹھیک اتفاق ہی سے کہہ گیا ہمیں یقین ہے کہ کوئی سچا مصنف تو نہیں لکھتا۔ قلم تو اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے مگر چلانے والی اس کی کوئی روحانی چیز ہے۔ اور یہ روحانی چیز ایک موج خرام ہے ایسے کل لگ جاتی ہے جس کا احساس مصنف کو شعوری طور پر بعد میں ہی شاید کبھی ہوتا ہے۔ چنانچہ ہیومر کی روح جب پطرس کا قلم چلا رہی تھی تو اس نے حقیقت کو حق بجانب ثابت کرنے والا فقرہ کر دیا۔ یہ روح جسے یونانی علم الاصنام میں موس MOMUS کہتے ہیں یہی کرتی ہے۔ حقیقت اور حماقت کو اس طرح گڈمڈ کر دی جاتی ہے کہ حقیقت لگے اور حماقت ثابت ہو۔ یہ روح ہمارے عیب نگاروں سے کبھی چھو کر نہیں گزری۔ ان کی حماقتوں کو پڑھئے ہنسی کی ایک لہر دوڑے گی۔ مگر ذرا غور کیجئے تو ان کی حماقت حماقت ہی رہ جائے گی۔ بالکل ناممکن، غلط بات۔ من گھڑت لفظوں کو ہنسانے کے لئے ٹھیک ہے۔ اس پر ہنسنا بدمذاقی ہے مگر پطرس تو موس سے ہم کنار ہے۔ اس کے قلم کی آواز تو اسی موس کی ہے۔

اب بتائیے کہ پطرس کیا ہے؟ اتنا پتہ مل گیا۔ اس کے کتے دیکھے اس کو کتے پالتے دیکھا۔ اسے خود ہنستے دیکھا اس کا دیباچہ پڑھا اب اس پہیلی کو بوجھنے میں کیا شک ہے۔ ایک بات سمجھ میں آئی۔ یہ کہ پطرس جو کچھ بھی ہے مگر ہے دیکھنے کی چیز اور برتنے کی چیز شیکسپیئر کا پک PUCK. اس کے کان میں کہہ رہا ہے اس کی روح کے کان میں کہہ رہا ہے۔ ! O LORD WHAT FOOLS THESE MORTALS BE اور اس کا قلم چل رہا ہے وہ مارٹل ہے اس کے چاروں طرف سب مارٹلز ہیں۔ وہ فول ہے اور اس کے چاروں طرف سب فول ہیں۔ یہی دنیا ابھرتی آ رہی ہے۔

" ہاسٹل میں پڑھنا " وہ طالب علم ہے اس کا مقصد حیات یہ ہے کہ ہاسٹل میں پڑھے۔ اس کے گھر والوں کو دیکھئے۔ کھاتے پیتے مسلمان لوگ۔ لڑکے کو تعلیم دلاتے ہیں مگر تعلیم کے مقصد اور تعلیمی اداروں کے حالات سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ صاحبزادے کے لئے تعلیم گاہ تفریح گاہ کے ہم معنی ہے۔ سب سے زیادہ تفریح ہاسٹل میں پڑھ کر ہو سکتی ہے۔ اس لئے اس کی کوشش ہے کہ کوئی سال ایسا آ جائے کہ ہوسٹل میں داخل ہو سکے۔ اس لئے متواتر فیل ہی ہوتے رہنے میں ان کو دلچسپی ہے۔ اور ان کے سرپرستوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ ہاسٹل کوئی بری جگہ ہے والدین کی نگاہ میں ہاسٹل کو علم اور اخلاق کا اعلیٰ ترین مرکز ثابت کرنے کی کوشش بار بار مضحکہ خیز ہو ہو کر رہ جاتی ہیں۔ وہ جس جس طرح فیل ہوا ہے وہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ایسے بالکل ایسے کتنے لڑکے ہمارے ذہن میں ہیں ان سب کا وہ [illegible] مشترک ہے وہ ہمارے مشاہدے کی زبردست مضحکہ خیز حقیقت ہے۔

" سویرے جو کل آنکھ میری کھلی " وہی طالب علم ہے پڑھنے سے اس کی دلچسپی کا حال دیکھئے۔ پڑھنا امتحان کے لئے ہے تیاری کے لئے سویرے اٹھنا ہے۔ لالہ جی اس کے پڑوسی مضحک حد تک مستعد اور منہمک ہیں۔ اس کو صبح جگانے کے سین اور اس کے جاگ کر سو جانے کے حالات وغیرہ کسی طالب علم نے نہیں دیکھے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر طالب علم میں کچھ نہ کچھ ایسی باتیں ضرور ہوتی ہیں۔ پطرس اس میں منفرد ہے۔

ہماری صحافت تعلیمی جدوجہد کی تصویر پوری ہو گئی ہو تو ہے سینے میں اٹھ اٹھ کر [illegible] چاہے [illegible] وقت کی اپنی گائے بیٹ [illegible] کو۔ نکلوا دیا اور خوب ہنسایا

پھر خانگی زندگی کے حالات دیکھئے "اردو کی آخری کتاب" [illegible] ایک عام سے "مثلاً" [illegible] "میں ایک میاں ہوں" میں میاں بیوی کے درمیان تعلقات میاں کے دوستوں [illegible] بیوی بھی عام [illegible] میاں بیوی کے درمیان ہے۔ بیوی کے میکے جانے پر خوش ہے کہ [illegible] قسم کی آزادی ملی لیکن پھر بھی بیوی کے گھر میں نہ ہونے سے گھبراتے ہیں۔ [illegible] کمال ہے!

اب سیاسی زندگی کا کھیل دیکھئے "مریدپور کا پیر" لیڈر کیسے بنتے ہیں، دیکھئے بنایا جاتا ہے شروع میں ایک طرح بنایا جاتا ہے [illegible] لیڈر بننے کی بن پڑتی ہے۔ آخر میں تقریر کرتے ہیں اسے کیسا بلایا جاتا ہے اسے بھاگنے کی پڑتی ہے اور [illegible] لیڈر تو لیڈری کی حقیقت [illegible]

کالجوں کو دیکھئے "انسار [illegible]" کے مجسمے کے مزور پروفیسر [illegible] کو دیکھئے اور ان کے شاگرد [illegible] پیش کرنے پر غور کیجئے اور پھر ملک معظم وغیرہم کے تحائف پر ان کی سعادت۔ دیکھئے [illegible] کیمبرج یونیورسٹی میں [illegible] رفتہ رفتہ مجھے اس فن میں کمال حاصل ہو گیا جس روانی [illegible] کے ساتھ میں ناخواندہ کتابوں پر گفتگو کر سکتا تھا [illegible] خود حیران رہ جاتا تھا اس سے جذبات کو آسودگی نصیب ہوئی" واللہ کیا بات کہی ہے۔ کیمبرج سے لوگ یہی فن سیکھ کر آتے ہیں کیمبرج کی تعلیم کا [illegible]

ادب زندگی پر تنقید ہے؟ میتھو آرنلڈ نے اس بات کو کچھ ضرورت سے زیادہ انسپکٹر مدارس کے الفاظ میں ادا کیا ہے۔ جس سے کچھ بات ٹھیک نہیں بنتی دکھائی دیتی۔ ورنہ جو کچھ اس نے محسوس کیا تھا وہ ٹھیک ہی تھا زندگی کی [illegible] ہمیں دیتے آئے ہیں [illegible] پطرس نے بھی [illegible] اب اگر نظریۂ حیات، نصب العین، پول کھولنا، متفکرانہ سنجیدگی وغیرہ قسم کے صفات [illegible] الفاظ کا ذکر کیجئے تو جواب یہی ملتا ہے کہ اگر زندگی کے مکمل نقش میں کوئی نظریہ ہے، نصب العین ہے، کسی چیز کے پول کھولنے کی ضرورت ہے کوئی اخلاقی سیاسی وغیرہ قدر یا قدریں ہیں تو وہ پطرس کے یہاں بھی ہیں ورنہ ان کے ذکر پر کپ کا جملہ یاد کیجئے اور خاموش ہو جائیے "شیکسپیئر کا لاہور ہے"۔ صاف [illegible] طنز وغیرہ کی گندگی سے پاک ع

بے ادب پا منہ اینجا کہ عجب درگاہ است

اب دیکھئے پطرس کیا ہے۔ سب مضامین کو ملائیے اور دیکھئے کیا نکلتا ہے۔ الف لیلے میں ایک قصہ ہے جس میں ایک لڑکا سمندر کے کنارے ایک بوتل پڑی پاتا ہے اس بوتل کو کھولتا ہے تو اس میں سے ایک جن نکلتا ہے جو لڑکے کو کھا جانے کو تیار ہوتا ہے۔ پطرس بھی ویسا ہی ایک جن ہے، مگر یہ جن آدم خور نہیں ہے آدم خوردہ ہے۔ یہ ہمیں نہیں کھاتا اپنے تئیں ہم کو کھلاتا ہے۔ اس کو پھر شیشے میں نہیں اتارا جا سکتا۔ یہ الف لیلے والا احمق جن تو ہے نہیں کہ ایک لڑکے کے کہنے پر پھر بوتل میں واپس ہو جائے۔ اور ہم اسے بوتل میں واپس جانے کو کہیں ہی کیوں وہ تو ہماری خوراک ہے۔ بڑے مزے کی خوراک ہے۔

یہی بہادر جن سروانٹیز کے دماغ سے ڈان کوئکزٹ کی صورت میں رزمیات پر بیٹھ کر سانکو پانزا کو ساتھ لے کر ڈلسینیہ کے عشق میں سرد آہیں بھرتا ہوا دنیا کو فتح کرنے نکلا ہے۔ یہی اب پطرس کی صورت میں نمایاں ہوا ہے۔ جدید دور کے سب ہتھیار اس کے پاس ہیں۔ جدید تعلیم، کیمبرج کی ڈگری، پروفیسری کا عہدہ۔ اس کی ڈلسینیہ دلکشن آتا ہے جس کو وہ آہ سرد کا تار بھیجتا ہے اس کا بھی ایک سانکو پانزا ہے یعنی کبوتر باز مرزا صاحب جو

روشن ہو، ہمارے لفظوں کبوتر بازی، مرغ بازی، تاش بازی کے منصوبوں سے سامان ہوتا ہو۔ "سینما کا عشق" میں کہاں سے ساتھ ابھرتا ہے یاد رکھئے پطرس ایسا جن ہے جو اپنے تئیں جلوہ دکھاتا ہے چنانچہ اس کا اسلوب اس کو پریشان کرنے میں کمال دکھاتا ہے، سینما کا عشق۔ مرزا صاحب کا ساتھ لئے بغیر نہیں پڑتی۔ تماشا شروع ہو جانے کے بعد پہنچنا لازمی ٹھہرا۔ اس اندھیرے کی مہر شروع ہوتی ہے فلم کو غرض کی چمکیں والی مہم۔ آگے آگے۔ واہ مرزا خوب پھنستے ہو مگر مرالا جو تماشا بڑا مفید چیز ہے۔ چانس یہ مل کر ہی سہی مگر وہ رہا۔ دے اپطرس کو شستہ رہنمایا ہے رہنمائی میں تو اس سے وہ سواری دی جس کو دیکھ کر روحانیت بخش تک کے حاوی ہے، یاد ہو جاتی ہے اور ایسی ہو گئی ہے کہ پھر نہیں بھلا سکتے۔ وہی مرحوم کی یاد اردو زبان کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہے بلکہ اردو زبان کے ثبات کی ضامن ہے۔

کیا سواری ہے وہ جسے بنانے والے انسان کی توجیت کا معجزہ، جدید دور کی سب سے زیادہ تعجب انگیز سواری۔ اگر شاہ کنہرٹ آج کل تشریف لائیں تو شاید آج کل کی سب سے زیادہ تعجب میں ڈال دینے والی سواری بائیسکل کے سوا، اور کوئی نہ دکھائی دے گی۔ یہ ہوا پر اڑنے والی چڑیاں پر چلنے والی پہیوں کی غلام سواریاں کیا رقم ہیں!

پطرس اس معجزنما سواری کو دنیائے ادب کی مضحک ترین سواری بنا کر پیش کرتا ہے۔ یہ مرزا صاحب کا تحفہ ہے نہیں موٹس ایڈیٹا کا عطیہ ہے۔ رات ہی میں آگئی ہے اور اپنے ساتھ ایک پرانے نسخے کا اوزار بھی لائی ہے یہ اوزار ہی اس کا علاج دردِ دل بلکہ اس کی روح ہے۔ کیا شکل پائی ہے۔ "دیکھنے سے اتنا تو ثابت ہو جاتا ہے کہ بائیسکل ہے لیکن مجمل ہیئت سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پل اور رہٹ اور چرخہ اور اسی طرح کی جدید ایجادات سے پہلے کی بنی ہوئی ہے: پل اور رہٹ اور چرخہ اس کے مقابلے میں جدید ایجادات ہیں۔"

اور اس کی چال بھی کیا کمال ہے پطرس آخر کار اس پر سوار ہوا۔ پہلا ہی پاؤں چلایا تو ایسا معلوم ہوا کہ کوئی مردہ اپنی ہڈیاں چٹخا چٹخا کر اپنی مرضی کے خلاف زندہ ہو رہا ہے۔ بائیسکل اپنی آوازوں میں گم ہے۔ ان آوازوں کے مختلف گروہ تھے چیں چاں چوں قسم کی آوازیں زیادہ تر گدی کے نیچے اور پچھلے پہیے سے نکلتی تھیں۔ کھٹ کھڑ کھڑڑ کے قبیل کی آوازیں مڈگارڈوں سے آتی تھیں۔ چرچرخ۔ چرچرخ کی قسم کے سُر زنجیر اور پیڈل سے نکلتے تھے۔

جوڑ و بند کی حرکات ملاحظہ ہوں۔ زنجیر! "میں جب کبھی پیڈل پر زور ڈالتا تھا زنجیر میں ایک انگڑائی سی پیدا ہوتی تھی جس سے وہ تن جاتی تھی اور چرچر بولنے لگتی تھی اور پھر ڈھیلی ہو جاتی تھی۔"

پہیہ! "پچھلا پہیہ گھومنے کے علاوہ جھومتا بھی تھا یعنی ایک تو آگے کو چلتا تھا اور اس کے علاوہ دہنے سے بائیں اور بائیں سے دہنے کو بھی حرکت کرتا تھا چنانچہ سڑک پر جو نشان پڑتا جاتا تھا اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مخمور سانپ لہرا کر نکل گیا ہے۔"

مڈگارڈ! "مڈگارڈ تھے تو سہی لیکن پہیوں کے عین اوپر نہ تھے ان کا فائدہ صرف یہ معلوم ہوتا تھا کہ انسان شمال کی سمت سیر کو نکلے اور آفتاب مغرب میں غروب ہو رہا ہو تو مڈگارڈوں کی بدولت ٹائر دھوپ سے بچے رہیں گے۔"

"اگلے پہیے کے ٹائر میں ایک بڑا سا پیوند لگا تھا جس کی وجہ سے پہیہ ہر چکر میں ایک دفعہ لمحہ بھر کو زمین سے اوپر اٹھ جاتا تھا اور میرا سر پیچھے کو یوں جھٹکے کھا رہا تھا جیسے کوئی متواتر ٹھوڑی کے نیچے مکے مارے جا رہا ہو۔"

اس کی چال میں ارتقا بھی ہے۔ "جب اتار پر بائیسکل ذرا زیادہ تیز ہوئی تو فضا میں ایک بھونچال سا آگیا اور بائیسکل کے کئی اور پرزے جو اب تک سو رہے تھے بیدار ہو کر گویا ہوئے ......" اف اف۔ ایک نظموں کے گھوڑے کیا اڑیں گے۔ یہ سائیکل بالکل آسمان سے اتری ہے ..... موٹس نے پطرس کے لئے یہ براق بھیجا ہے!

کیا قیامت کی بائیسکل ہے۔ اس کے سامنے مستریوں کی پیشانی کے بل دور ہو ... کی بار ان سے کی بات چیت۔ یہ عبداللہ تو کا سکیلہ ہے جو والدین کو مرشد بائیسکل کے رستے ہاتھوں ہی سے سے آفاق پر چلا آیا ہے۔ یہ مرحوم فاقت کیا کہتے "KNIGHT OF THE BROKEN BICYCLE MASTER SHALLOM.

ہمیں اس سے کوئی مطلب نہیں کہ پروفیسر بخاری کہاں پیدا ہوئے۔ یہاں لکھا ہے، وہاں ہوئے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ ان سے پہلے ملک میں کا موقع نہ ملا۔ اچھا ہی ہوا ہمیں ان سے کیا مطلب تھا ہمیں پطرس سے غرض ہے اور ہمیں تو یہ غرض رہتی ہی رہے گی۔ یہ ضرور ہے۔ لاہور کا ایک قرض ہے اس کا لاہور یہ جان فاشت کا سب ہے یہ لاہور لاہور ہی ہے تسلیم کیجیے ہمیں اس کے پاس ایک دیا لیٹا رہتا ہے جسے کا شغل ہے سے بند ہے حملہ آوروں کی آمد کا ہے یہ لوگ حملہ آور دلی تک ... یہاں آئے ہیں اور اہل زبان کہلاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ منسوخ ہو چکے آب و ہوا کا سوال نہیں البتہ آب کی جگہ پائپوں میں ہائیڈروجن اور آکسیجن اور ہوا کی جگہ گرد اور خاص حالات میں یہاں ملتی ہے عبدالرحمن کی سڑکوں میں پھیلا دینے والے ملتے ہیں۔ مکانوں پر اشتہارات کے پیشتر پیڑ لگانے والے میں یہاں کی صنعت و حرفت اسی حد تک رسا ساز ہے جیسی اس کے زمانہ میں لڑائی بازی تھی۔ یہ برانچ پر یہاں بھی اسی طرح ایک انجمن موجود ہے جیسے شکسپیر کے لنڈن میں تھیٹر موجود تھے۔ یہاں کی سڑکیں پیدا وار میں اور قسم قسم کے ہیں اور پروفیسر بخاری نے یہ مشہور ہے کہ دودھ چلنے والے جانوروں میں سے ہوں؛ یہاں کے لوگ بہت خوش طبع ہیں۔ پکے پرستار ہیں اور تک کا لکا پطرس ہے۔

پطرس کا کام کھیل دکھانا ہے۔ لفظوں کا کھیل، فقروں کا کھیل، چست جملوں کا کھیل۔ وٹ (WIT) کا کھیل کھیلتا ہے۔ مگر یہ اس کا خاص کھیل نہیں۔ اس کا کھیل پکی کا کھیل ہے۔ موتیوں کا کھیل۔ ذرا ذرا سی عادت کا کھیل ہر مضمون ہی کھیل دکھاتا ہے

ہاسٹل میں پڑھنے والا والدین کو تعمیت کا مطلب سمجھا رہا ہے۔
سویرے آنکھ کھلنے والے پلنگ پر بیٹھا لا رجی کی وصلانے پر کھٹ کھٹ سن رہا ہے جاگنے کی کوشش ہونے ہونے
"بیننی بہت ہی کتا"
"باپ انگوٹھا چوس رہا ہے"
فرمانبردار میاں چور بنا ہوا ہے...... برقعہ پوش ...... منہ سے برقعہ اٹھا تو کاشن آر
مرید پور کا پیر تقریر کر رہا ہے۔ پیارے ہم وطنو ... ..!
پروفیسر پطرس پر عقیدت کی انگلیاں چڑھائی جا رہی ہیں۔
سینما کے اندھیارے میں آب حیات کی تلاش ہو رہی ہے۔
ایک کتب نا خواندہ کتابوں پر گفتگو کی مشق کر رہا ہے۔

"مرحوم کی یاد میں" یہ تماشا لیا ہے۔ سین نمبر ایک۔ مرزا سے گفتگو۔ سین نمبر دو۔ سائیکل کا معائنہ۔ سین نمبر تین۔ رفتار کا میک۔ منظر نمبر چار۔ مرمت کی دکان۔ نمبرہ فروخت۔ نمبر چھ ٹوٹی بائیسکل والا پیر۔ نمبر سات۔ ہوئے کیوں نہ غرق دریا۔

لاہور لاہور ہی ہے

کھیل ختم

ختم؟

یہ کھیل ختم نہیں ہوا۔ پولیس کا تماشا دیکھو پولیس کا تماشا دیکھو! ہم لوگ تیز ہے بل سے ہیں اب آپ پکٹ والوں کا تماشا دیکھیں گے جو پولیس نے پیش کیا ہے۔ . . . یہ پروگرام ہر سٹیشن پر ہر وقت سنا جا سکتا ہے اور سننے سے زیادہ دیکھا جا سکتا ہے

• • •

اس کھیل کے سلسلے میں ایک نیا اعلان سن لیں۔ اردو ادب میں متیان تنقید یا تنقید ما بر برساتی مینڈکوں کی طرح پھیل رہے ہیں پولیس کے کھیل کو یہ ہرگز نہ دیکھیں ورنہ . . . پکٹ نے ان کے لیے اب تک کوئی سزا تجویز نہیں کی۔

ان میں سے ایک بڑے بابو کو پکڑا گیا ہے وہ غالب کو تھرڈ کلاس کا اور اقبال کو انٹر کلاس کا ٹکٹ دے گئے تھے۔ اس وقت انہیں معاف کر دیا گیا تھا۔ مگر اب ان کی جرائم پیشگی پختہ ہو گئی اور سفر موقوف ہو گئی۔ انہوں نے اردو کی مزاحیہ نگاری پر بھی ایک نظر ڈالی ہے اور پولیس پر کچھ لکھا ہے۔ اس کی سزا ان کو اچھی طرح دی جائے گی۔

مضامینِ پطرس کا مطالعہ

تمکین کاظمی

پطرس ایک ذہین اور ذکی ادیب اور فن کار تھے۔ ان کا مطالعہ بہت ہی گہرا اور معلومات وسیع تھیں۔ اردو انگریزی دونوں زبانوں پر یکساں عبور رکھتے تھے [illegible] مگر انہیں [illegible] سات آٹھ [illegible] چاہیے تھیں [illegible] پیشہ ور [illegible] بھی بہت کم لکھتے تھے اور جب تک جی نہ چاہتا تھا نہیں لکھتے تھے۔ چنانچہ [illegible] ادارے کی [illegible] انہوں نے [illegible] بھیجے [illegible]۔ چنانچہ کئی سال [illegible] بھی ہونے تک اور میں پطرس سے بے تکلف ہو گیا۔ ان ہی کی خواہش اور تحریک پر میں نے بعض شخصی خاکے بھی لکھے تھے۔

اس زمانے میں ملا رموزی، امتیاز علی تاج، پطرس اور میں لکھا کرتے تھے۔ مزاح نگاری میرا اپنا فن نہ تھا۔ احباب کے تقاضوں پر [illegible] تعارف کچھ جب میرا مجموعہ "مختصر تبسم" شائع ہوا تو نیاز مندانِ لاہور نے میرے خلاف محاذ بنایا مگر پطرس شخصی طور پر مجھ سے موافق اور اس محاذ سے الگ رہے اور اسی زمانہ سے میری دلبستگی کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد احباب نے تنگ کر کے نہیں [illegible] چھوڑ دیا تو میں بھی "خوش مذاقی" چھوڑ کر ادب اور تاریخ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

مضامینِ پطرس تو بعد کو مجموعے کے ذریعے منظر عام پر آئے۔ میں نے ان مضامین کو طبع ہوتے ہی پرچوں سے علیحدہ کر کے محفوظ کر لیا تھا۔ اور [illegible] ایک مضمون کے متعلق ان سے میری مراسلت ہو چکی تھی۔ ملک کے آزاد ہونے سے پہلے میں نے ایک رسالہ جاری کیا تو پطرس سے بھی مضمون کی خواہش کی تھی اور انہوں نے بڑی خوشی سے وعدہ کر لیا تھا مگر چند ہی مہینوں کے بعد ہنگامے شروع ہو گئے اور رسالہ بند ہو گیا۔ جن دنوں ریڈیو پطرس سے متعلق تھا۔ میری مراسلت ان سے ہوئی مگر اس کے بعد نہ میں نے انہیں خط لکھا اور نہ انہوں نے مجھے، کہ وہ ہمیشہ کے لئے ہم سے دور ہو گئے۔ مرتے مرتے ہم نے چند خطوط جو بعض رسائل میں طبع ہوئے ہیں ان کی اردو انشاپردازی کے آخری نمونے ہیں جو لافانی ہیں۔

زیادہ لکھنا کوئی خوبی نہیں ہے ہم بعض ایسے "پُرنویسوں" سے واقف ہیں جو بہت لکھنے والے تھے اور جن کی بیسیوں کتابیں چھپیں، مگر بارہ پندرہ سال بھی ان کی کتابوں نے زندگی نہیں پائی۔ آج کتابیں تو کیا نظر آئیں گی نام بھی سننے میں نہیں آتے۔ ان کے مقابلے میں بعض ایسے "کم نویس" بھی نظر آتے ہیں جن کی کتابیں گنی چنی ہیں مگر لوگ انہیں سر آنکھوں پر لئے پھرتے ہیں۔ انہیں آخر الذکر لوگوں میں پطرس کا شمار بھی ہے۔ چند مضامین، چند ترجمے، چند ناول صرف یہی کائنات پطرس کی ہے۔ مگر یہ "بہ قامت کہتر" چیزیں قدر و قیمت میں بہتر سے بہتر ہیں اور آئندہ ان کی قیمت اور بھی بڑھ جائے گی۔

آئیے اب ذرا پطرس کے مضامین کا مطالعہ کریں۔ پطرس نے اپنے مضامین کا پہلا مجموعہ [illegible] شائع کیا ہے۔ اس میں شاید گیارہ مضامین

نہیں ہیں بلکہ کچھ کم ہی بعد کے ایڈیشنوں میں اضافہ ہوتا گیا۔

سب سے پہلے پطرس نے اپنے استاد پروفیسر مرزا محمد سعید دہلوی سے "اظہار عقیدت" کیا ہے کہ انہوں نے اس کتاب پر نظر ثانی کی اور اسے بعض لغزشوں سے پاک کیا پھر اس بات پر فخر بھی کیا ہے کہ "مجھے اب بھی ان سے شرفِ تلمذ حاصل ہے":

پطرس کی طبیعت کا سلجھاؤ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب میں لغزشوں کا اعتراف بڑی فراخ دلی سے کیا ہے۔ اور پھر اس بات پر اظہار افتخار بھی کیا ہے کہ انہیں اب بھی پروفیسر مرزا محمد سعید سے تلمذ حاصل ہے۔ ظاہر ہے کہ ادبی دنیا یہ معلوم کرکے کہ پروفیسر محمد سعید پطرس کے استاد ہیں، بہت زیادہ احترام کرنے لگے گی مگر اس اعتراف سے علمی طبقے میں پطرس کا احترام بہت زیادہ بڑھ گیا کہ وہ برخود غلط اور "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" کہنے والے ادیب نہیں بلکہ حقیقی معنی میں عالم ہیں۔ جو اپنے آپ کو طالب علم کہتے ہیں میں تو ان کی اس ادا سے بہت متاثر تھا۔

دیباچے میں تو پطرس نے غضب ہی کر دیا ہے۔

اگر

یہ کتاب آپ کو کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے

اگر

آپ نے کہیں سے چرائی ہے تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں۔ اپنے پیسوں سے خریدی ہے تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ آپ اس کتاب کو اچھا سمجھ کر اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کریں۔

ان مضامین کے افراد

سب خیالی ہیں حتیٰ کہ جن کے لئے [illegible] واحد متکلم کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے وہ بھی ہرچند کہیں کہ ہیں نہیں ہیں۔

آپ!

تو اس نکتے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں لیکن کئی پڑھنے والے ایسے بھی ہیں جنہوں نے اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھی ان کی غلط فہمی اگر دور ہو جائے تو کیا ہرج ہے؟

جو صاحب اس کتاب کو کسی غیر ملکی زبان میں ترجمہ کرنا چاہیں وہ پہلے اس ملک کے لوگوں سے اجازت حاصل کر لیں:

یہ دیباچہ پوری کتاب سے زیادہ دلچسپ اور پطرس کے سارے مضامین سے زیادہ دل فریب ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ قلم برداشتہ بلا فکر و تردد بیک گردش قلم لکھا گیا ہے اس لئے اس میں اختصار، حقیقت، طنز سبھی موجود ہے۔ خصوصاً آخری چوٹ تو ایسی بھرپور ہے کہ ہر مترجم قسم کا ادیب یا انشاپرداز تڑپ اٹھتا ہے۔ غور فرمائیے سینکڑوں کتابیں ایسی ترجمہ ہوتی ہیں جو لٹریچر کے سر پر ایک بوجھ ہیں۔ کاش یہ مترجمین ترجمہ کرنے سے پہلے اہل ملک سے مشورہ کر لیتے۔ نام بتاؤں تو آپ خفا ہوں گے اس لئے ذرا اردو میں جو ترجمے سامنے سامنے ہیں انہیں دیکھ لیجئے پھر غور فرمائیے کہ پطرس نے کتنی زہریلی گولی شکر میں لپیٹ دی ہے۔

"ہاسٹل میں پڑھنا" آپ کی طرح [illegible] یہ پطرس کی آپ بیتی ہے یا جگ بیتی سہی، آپ صرف یہ ملاحظہ فرمائیے کہ پطرس نے جو کچھ لکھا ہے صحیح لکھا ہے یا نہیں۔ جب آپ اس نقطۂ نظر سے غور فرمائیں تو آپ کو یہ مضمون صحیح اور بامقصد معلوم ہوگا۔ پرانے لوگوں اور محتاط بزرگوں کا یہی رویہ رہا ہے جو اس مضمون میں پطرس نے اپنے والدین کا بتایا ہے اور یہ مصیبتیں بیشتر طالب علموں پر بیت چکی ہیں۔ بلکہ اس روشن زمانے میں بھی بعض لڑکے اس میں مبتلا ہیں۔ یہ اچھی ہے یا بری؟ اس کا فیصلہ آپ کرسکتے ہیں، میں اور نہ کوئی اور۔ انسانوں کی طبائع مختلف ہوتی ہیں اور ہر طبیعت الگ الگ باتوں سے متاثر ہوتی ہے۔ ان سے یہ فیصلہ کرنا کہ ہاسٹل میں پڑھنا مفید ہے یا غلط، ہاسٹل میں رہنا مضر ہے یہ بھی [illegible]۔ میں سینکڑوں ایسے لوگوں سے واقف ہوں جنہوں نے ہاسٹل میں رہ کر سگریٹ نہیں پیا، چائے نہیں پی، سینما نہیں دیکھا، خوب پڑھیں اور فرسٹ ڈویژن پاس ہوتے گئے اور سینکڑوں ایسے بگڑے ہوؤں سے بھی واقف ہوں جو گھر پر اپنی نگرانی میں رکھے گئے تھے مگر سگریٹ کے عادی، چائے کے رسیا، سینما کے شوقین اور بری صحبت کے پورے پورے پابند ہوگئے۔ بعضوں نے نہ چھٹنے والی کافر سے بھی منہ لگا لیا اور بعض عیاشی و دلکش روگوں میں مبتلا ہوگئے [illegible] کسی نے کہا ہے کہ "عصمت زن اور تربیت فرزند من جانب اللہ ہے" بالکل صحیح بات ہے اس کیلئے کوئی اصول مقرر نہیں کئے جا سکتے۔

پطرس نے اپنے اس مضمون میں جس عمدگی سے طالب علموں کی نفسیات کا جائزہ لیا ہے اور جو خاکہ کھینچا ہے وہ صرف انہیں کا حصہ ہے۔ ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کو بڑی ہی تفصیل سے لکھا ہے۔ اور پھر بڑا کمال یہ ہے کہ ایک دیہاتی اور قصباتی طالب علم کی پوری پوری نمائندگی کی ہے۔ اور بڑی ہی صحت سے یہ تک ظاہر کردیا ہے کہ وطن اور لاہور میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ اس کی معراج یہ ہے کہ برخوردار طالب علم اپنے والد بزرگوار سے بحث فرمانے لگتے ہیں اور شخصیت کی تشریح میں نیاز مند ہو جاتے ہیں تو سیرت میں پناہ لیتے ہیں۔ اور اس کے معنی یا مطلب چال چلن قرار دے کر جب وضاحت کرنا چاہتے ہیں تو پرنسپل صاحب کی جلسہ تقسیم انعامات والی تقریر کا خیال آتا ہے مگر وہ تو آغاز میں لکھنا ہی نہیں ہوتی کیونکہ انہوں نے تو وہ سننے کی زحمت ہی نہیں کی گئی تھی۔ یہ سارا مضمون اسی معصومانہ ذہنیت کا مظہر اور طالب علمانہ کشمکش ذہنی کا آئینہ ہے جو اپنی طرز کا بہترین مضمون ہے

اس مضمون میں جگہ جگہ ایسی پچی کاری کی ہے کہ اس کی جدت سے آنکھیں منور ہو جاتی ہیں چنانچہ آخری فقرہ تو لاثانی ہے۔

> "یونیورسٹی والوں کی حماقت ملاحظہ فرمائیے کہ ہمیں پاس کر کے اپنی آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ
> ہاتھ سے گنوا بیٹھے۔"

"سویرے جو کل آنکھ میری کھلی" بھی بڑا ہی نفیس مضمون ہے۔ اس سے تقریباً سو فیصدی قارئین متفق ہوں گے۔ کیونکہ سو میں دس آدمی بھی بمشکل سحر خیز ہوتے ہیں۔ خصوصاً طالب علمی میں تو سحر خیزی بڑی تکلیف دہ معلوم ہوتی ہے۔ پطرس کی شامت جو آئی تھی تو اپنے ایک پڑوسی سے صبح جگا دینے کی خواہش کرتے ہیں۔ اور یہ پڑوسی بھی ایسے مستعد ہوتے ہیں کہ سحر کاذب ہی میں پطرس کے کمرے پر دھاوا بول دیتے ہیں اور بمباری شروع کر دیتے ہیں ان کی اس بمباری سے متاثر ہو کر پطرس کے قلم سے بے ساختہ یہ فقرہ نکل جاتا ہے۔

> "یہ سوتوں کو جگا رہے ہیں یا مردے کو جلا رہے ہیں؟ اور حضرت عیسیٰ بھی تو واجبی طور پر ہلکی
> سی آواز میں 'قم' کہہ دیا کرتے ہوں گے۔ زندہ ہوگیا تو ہوگیا نہیں تو چھوڑ دیا۔ کوئی مردے
> کے پیچھے لٹھ لے کے پڑ جایا کرتے تھے۔ توپیں تھوڑی داغا کرتے تھے۔"

یہ مضمون ہاسٹل والے مضمون کے بعد ہی لکھا گیا ہے اور لکھا اس لئے ہے جسے ہاسٹل میں رہنے کا ارمان تھا وہ ارمان اس نے اس طرح نکالا ہے۔

ـــ معمول ہدایت جناب نے ساتھ ملے آدمیوں کی طرح اپنے دس بجے اٹھے بارہ بجے، تو منہ دھویا اور چائے کے جسے پی، گنشتی سڑک کی سیر کو نکل گئے

تو ہم لوٹ کر پس بستر میں وارد ہوئے تو وقت تب قریب تھی کہ اس پر شام کا زمان آ چکا تھا ابھی نہایت ضعیف تھی صحت بھی ذرا اچھی ہو گئی تھی ہم ذرا ترنگ میں گاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے کہ

بلائیں زلفِ جاناں کی اگر لیتے تو ہم لیتے

کہ اتنے میں پڑوسی کی آواز آئی "مسٹر"

ہم اس وقت نہا چٹکی بجانے لگے تھے انگلیاں وہیں پر رک گئیں اور کان آواز کی طرف لگ گئے ارشاد ہوا "یہ آپ گا رہے ہیں (زور آپ پر) میں نے کہا جی میں کس لائق ہوں لیکن خیر فرمائیے!

بولے ... وہ میں ... ڈسٹرب ہوتا ہوں۔"

اس خرابی کے بعد پطرس دوسرے پڑوسی کو گھیرتے اور اس سے چھ بجے جگانے کی فرمائش کرتے ہیں اور وہ غریب چھ بجے انہیں جگا بھی دیتا ہے اس کے بعد کی واردات خود پطرس سے سنئے۔

"اس کے بعد کے واقعات ذرا بحث طلب ہیں۔ ان کے متعلق روایات میں کسی قدر اختلاف ہے۔ بہر حال اس بات کا تو مجھے یقین ہے اور میں قسم بھی کھا سکتا ہوں کہ آنکھیں، میں نے کھول دی تھیں پھر یہ بھی یاد ہے کہ ایک نیک اور سچے مسلمان کی طرح کلمۂ شہادت بھی پڑھا پھر یہ بھی یاد ہے کہ اٹھنے سے پیشتر دیباچے کے طور پر ایک آدھ کروٹ بھی لی۔ پھر پتہ نہیں شاید لحاف اوپر سے اتار دیا شاید سر اس میں لپیٹ دیا، یا شاید کھانسا کہ خراٹا لیا۔ خیر یہ تو یقینی امر ہے کہ دس بجے ہم بالکل جاگ رہے تھے لیکن لالہ جی کے جگانے کے بعد اور دس بجے سے پیشتر خدا جانے ہم پڑھ رہے تھے یا شاید سو رہے تھے، نہیں ہمارا خیال ہے پڑھ رہے تھے یا شاید سو رہے ہوں بہرصورت یہ نفسیات کا مسئلہ ہے جس میں نہ آپ ماہر ہیں نہ میں۔ کیا پتہ لالہ جی نے جگایا ہی دس بجے ہو یا اس دن چھ دیر میں بجے ہوں۔ خدا کے کاموں میں ہم آپ کیا دخل دے سکتے ہیں لیکن ہمارے دل میں دن بھر یہ شبہ رہا کہ تصور کچھ اپنا ہی معلوم ہوتا ہے۔"

دوسرا دن بھی یوں ہی آتا ہے جس کے متعلق پطرس لکھتے ہیں:—

"یہ مسئلہ مابعد الطبیعیات ہی سے تعلق رکھتا ہے کہ پھر جو ہم نے لحاف سے سر باہر نکالا، اور درود وظیفہ پڑھنے کا ارادہ کیا تو وہی دس بج رہے تھے اس میں نہ معلوم کیا بھید

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

تھا ... پہلے ... [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

تب سب بچے سو گئے تو اٹھ کر ... نمازی ... دیکھئے ... آپ ... پطرس نے ... اس قسم کی دردناک باتیں کی ہے یہ ان کی ایک معصومانہ عادت تھی ... بڑے بڑے ... عموماً ... میں ہوتے ہیں۔ پطرس کی اس ... کا ... فقرہ بھی ہے۔

اب تو ہمارا معمول ہو گیا ہے جاگنا ... ایک چھ بجے جاگنا ... اس دوران میں

لالہ پ آواز دیں ...

آپ یہ سمجھیں کہ پطرس صرف خوش مذاق کے دلدادہ تھے اور طنز و مزاح اور پیروڈی ہی لکھتے تھے بلکہ یہ بھی جان لیجئے کہ پطرس ایک ادیب اور انشاء پرداز بھی تھے اور فلسفہ لطیف پر بھی انہیں خاصا عبور تھا ذیل کا انشائیہ جس منقولہ بالا مضمون کا ذکر ہے پڑھیے اور لطف اٹھائیے

• جب دل مرحوم ایک جہان آرزو تھا تو یوں جاگنے کی تمنا کیا کرتے تھے کہ ہمارا فرق ناز محو بالش کمخواب ہو اور صبح کی پہلی کرن بجائے سیاہ و پُر پیچ بالوں پر پڑ رہی ہو کمرے میں پھولوں کی بوئے سحری روح افزائیاں کر رہی ہو نازک اور حسین ہاتھ اپنی انگلیوں سے بربط کے تاروں کو ہلکے ہلکے چھیڑ رہے ہوں اور عشق میں ڈوبی ہوئی سریلی اور نازک آواز مسکراتی ہوئی گا رہی ہو

تم جاگو موہن پیارے

خواب کی سنہری دھند آہستہ آہستہ موسیقی کی لہروں میں تحلیل ہو جائے اور بیداری ایک خوشگوار طلسم کی طرح تاریکی کے باریک نقاب کو خاموشی سے پارہ پارہ کر دے چہرہ کسی کی نگاہ اشتیاق کی گرمی محسوس کر رہا ہو آنکھیں مسرور ہو کر کھلیں اور چار ہو جائیں۔ دل آویز تبسم صبح کو اور

میں دو حصہ دکردے دو گیت
ساوری صورت تورزی سی کو کھالی
کے سو توہی مرد وجو پر یں ڈوب جائے "

یہ بھی ترزے لطیف مگر اس کے بجائے غریب کوئی خاص ماداتی کی زبان سے سنئے۔

> پیٹ سٹرمشہ کی آواز اور دروازے کی کال سامعہ نوازی کرتی ہے اور پھر چپ ہو گئے بعد کان کا گھڑیاں دماغ کے ربتے رہتے ہیں وہیں بجانا شروع کر دیتی ہے اور میں چار گھنٹے کے عرصے میں کروٹیں لے کر پڑنے ... دیکھیں کے الٹ جانے دروازوں کے بند ہونے برتنوں کے جوڑنے کرسیوں کے گھسیٹنے کلیاں اور جو غرارے کرنے گنگنانے اور کھانسنے کی آوازیں تو گویا اندیہ کھڑیاں ہیں اندازہ کر لیجئے کہ ان سازوں میں سُر تال کی کس قدر گنجائش ہے

پطرس کا یہ مضمون ان مضامین میں سے ہے جو انہیں زندہ رکھیں گے۔ اس میں خوش مذاقی، شائستہ لطیف طنز اور روانی جلوہ گر ہے اور ایک طالب علم کی ہوسٹل کی زندگی کا پورا پورا نقشہ اس میں موجود ہے۔ مجموعے کے یہ دونوں مضمون (پہلا اور دوسرا) ہاسٹل کی زندگی کا آئینہ ہیں۔ ہوسٹل کی زندگی اس سے زیادہ عمدگی اور لطافت سے پیش کی جا سکتی ہے اور نہ یہ تفصیل کہیں مل سکتی ہے۔

کُتے! یہ شاہکار ہے پطرس کا۔ بعض جانوروں سے بعضوں کو نفرت یا خوف ہوتا ہے چنانچہ اس کی تفصیل اکثروں نے لکھی ہے میرا حافظہ جہاں تک کام دے رہا ہے سب سے پہلے "ڈولان کا مارا آغا" مضمون نصیر حسین خاں خیال نے لکھا تھا جو ایک آغا صاحب یعنی ان کے بلی سے ڈرنے جھگڑنے اور نفرت کرنے کی تفصیل سے پُر ہے۔ یہ بڑا دلچسپ مضمون ہے مگر اس میں وہ لطافت نہیں جو پطرس کے مضمون میں ہے کیونکہ ایک آغا صاحب واقعی بلی سے ڈرتے تھے ان کی حرکات کو دیکھ کر خیال نے یہ مضمون لکھا ہے اس لئے واقعیت زیادہ اور اپج کم ہے بخلاف اس کے پطرس نے اپج ہی اپج پیش کی ہے جو واقعات کے ساتھ مل کر اتنی لطیف ہو گئی ہے کہ داد نہیں دی جا سکتی۔

کتے سے نفرت کرنے والے کا کردار افسانوی صورت میں سمرسٹ ماہم نے بھی پیش کیا ہے (جو بدنصیبی سے بصورت ترجمہ میری نظر سے گذرا ہے اصل میرے دیکھنے میں نہیں آیا) اس میں ایک کتوں سے نفرت کرنے والے کا کردار بڑی چابک دستی سے پیش کیا گیا ہے مگر یہ کوئی مضمون نہیں افسانہ ہے اس لئے میں افسانے کو اس اپج مضمون پر ترجیح نہیں دے سکتا۔

اس موضوع پر اپج اور واقعاتی مضمون صرف پطرس ہی نے لکھا ہے کتوں اور پھر سڑک کے کتوں سے کون نالاں نہیں۔ پھر ان کا بھونکنا کسے نہیں کھلتا؟ مگر اس بھونکنے اور ایک دوسرے کے سُر ملانے کو مشاعرے سے تشبیہ دینا اور اس نفرت خیز حرکت کو اس لطافت سے بیان کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ دیکھئے یہ کتوں کا مشاعرہ کس عمدگی سے شروع ہوتا ہے۔

> .. ... رات کے کوئی گیارہ بجے ایک کتے کی طبیعت جو ذرا گدگدائی تو انہوں نے باہر سڑک پر آ کر طرح کا ایک مصرع دے دیا۔ ایک آدھ منٹ کے بعد سامنے کے بنگلے میں سے ایک کتے نے مطلع عرض کر دیا۔ اب جناب ایک کہنہ مشق استاد کو جو غصہ آیا ایک حلوائی

> لے جاتے ہیں۔ رکتے اور ساتھ ہی دل منقطع ہو گئے۔ اس پر شمال مشرق کی طرف سے ایک قدر شناس کتے نے زوروں کی داد دی۔ اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہوا کہ کچھ نہ پوچھئے۔ کم بخت بعض تو دو غزلے سہ غزلے لکھ لائے تھے۔ کئی ایک نے فی البدیہ قصیدے کے قصیدے پڑھ ڈالے، وہ ہنگامہ گرم ہوا کہ ٹھنڈا ہونے میں نہ آتا تھا۔ ہم نے کھڑکی میں سے ہزاروں دفعہ آرڈر آرڈر پکارا لیکن ایسے موقعوں پر پردھان کی بھی کوئی نہیں سنتا۔

یہ تو کتوں کے مشاعرے کی روداد تھی جو دیسی کتوں نے منعقد کیا تھا۔ ان دیسی کتوں کی صرف ایک ادا پطرس کو بھلی لگی وہ ان کی قوم پرستانہ ذہنیت تھی کیونکہ:

> "اکثر تو ان میں ایسے قوم پرست ہیں کہ پتلون کوٹ کو دیکھ کر بھونکنے لگ جاتے ہیں۔ خیر یہ تو ایک حد تک قابل تعریف بھی ہے۔"

مگر یہی کتا جب ولائتی ہوتا اور صاحب کے بنگلے پر ہوتا ہے تو پطرس اس کی تعریف میں رطب اللسان ہوتے ہیں، یہ کہتے ہیں:

> "ہمیں بارہا ڈالیاں لے کر صاحب لوگوں کے بنگلوں پر جانے کا اتفاق ہوا، خدا کی قسم ان کتوں میں وہ شائستگی دیکھی ہے کہ عش عش کرتے لوٹ آئے ہیں۔ جوں ہی ہم بنگلے کے دروازے میں داخل ہوئے کتے نے برآمدے ہی میں کھڑے کھڑے ایک ہلکی سی "بخ" کر دی اور پھر منہ بند کر کے کھڑا ہو گیا۔ ہم آگے بڑھے تو اس نے بھی چار قدم آگے بڑھ کر ایک نازک اور پاکیزہ آواز میں پھر "بخ" کر دی۔ چوکیداری کی چوکیداری، موسیقی کی موسیقی۔ ہمارے کتے ہیں کہ نہ راگ نہ سُر، نہ سر نہ پیر، تان پہ تان لگائے جاتے ہیں، بے تالے کہیں کے، نہ موقع دیکھتے ہیں نہ وقت پہچانتے ہیں، گلے بازی کیے جاتے ہیں، گھمنڈ اس بات پر ہے کہ تان سین اسی ملک میں تو پیدا ہوا تھا۔"

کتے سے ڈرنے والے کا حال آپ نے بارہا دیکھا ہوگا۔ مگر اس کی تصویر اس عمدگی سے آپ نہ کھینچ سکیں گے جس چابک دستی سے پطرس نے کھینچی ہے۔ ملاحظہ ہو کتنی سیدھی سادی واقعی تصویر ہے جس میں مبالغہ یا رنگ آمیزی ذری بھی نہیں۔

> "کتے کے بھونکتے ہی ہماری طبعی شرافت ہم پر اس درجہ غلبہ پا جاتی ہے کہ آپ ہمیں اگر اس وقت دیکھیں تو یقیناً یہی سمجھیں گے کہ ہم بزدل ہیں۔ شاید آپ اس وقت یہ بھی اندازہ لگا لیں کہ ہمارا گلا خشک ہوا جاتا ہے۔ یہ البتہ ٹھیک ہے ایسے موقع پر کبھی گانے کی کوشش کروں تو کھرج کے سروں کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا۔ اگر آپ نے بھی ہم جیسی طبیعت پائی ہو تو آپ دیکھیں گے کہ ایسے موقع پر آیۃ الکرسی آپ کے ذہن سے اتر جائے گی۔ اس کی جگہ شاید دعائے قنوت پڑھنے لگ جائیں۔"

> "بعض اوقات یہ بھی اتفاق ہوا ہے کہ رات کے دو بجے چھڑی گھماتے تھیٹر سے واپس آ رہے ہیں اور ناٹک کے کسی نہ کسی گیت کی طرز ذہن میں بٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں چونکہ الفاظ یاد نہیں اور نومشقی کا عالم بھی ہے اس لئے سیٹی پر اکتفا کی ہے کہ بے سرے بھی ہو گئے تو کوئی یہی سمجھے گا کہ انگریزی موسیقی ہے اتنے میں ایک موڑ پر جو مڑے تو سامنے ایک بکری بندھی تھی۔ ذرا تصور ملاحظہ فرمائیے آنکھوں نے اسے بھی کتا دیکھا، ایک تو کتا اور پھر بکری کی جسامت کا، گویا بہت ہی کتا۔ بس ہاتھ پاؤں پھول گئے چھڑی کی گردش دھیمی ہوتے ہوتے ایک نہایت ہی نامعقول زاویئے پر ہوا میں کہیں ٹھہر گئی۔ سیٹی کی موسیقی بھی تھرتھرا کر خاموش ہو گئی لیکن کیا مجال کہ ہماری تھوتھنی کی مخروطی شکل میں ذرا بھی فرق آیا ہو گویا ایک بے آواز لے ابھی تک نکل رہی ہے۔ طب کا مسئلہ ہے کہ ایسے موقعوں پر اگر سردی کے موسم میں بھی پسینہ آ جائے تو کوئی مضائقہ نہیں بعد میں پھر سوکھ جاتا ہے۔"

یہ خیال۔ کہ پطرس کو بھی کتے نے یا پطرس نے کبھی کتے کو کاٹا ہے جس کی وجہ سے ایسا تنفر، خوف، ڈر یا اختلاف ہے۔ یہ بھی نہیں ہوا چنانچہ اس غلط فہمی کو خود پطرس نے رفع کر دیا ہے۔

> "چونکہ ہم طبعاً ذرا محتاط ہیں اس لئے آج تک کتے کے کاٹنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا یعنی کسی کتے نے آج تک ہم کو کبھی نہیں کاٹا اگر ایسا سانحہ کبھی پیش آیا ہوتا تو اس سرگذشت کی بجائے آج ہمارا مرثیہ چھپ رہا ہوتا تاریخی مصرعہ دعائیہ ہوتا
> "اس کتے کی مٹی سے بھی کتا گھاس پیدا ہو"

لیکن

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے سگِ رہ بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا!

کتے کی آواز یا اس کا بھونکنا پطرس کے لئے قہر سے کم نہیں جس طرح چوہے بلی کی میاؤں سے ادھ موا ہو جاتے ہیں اسی طرح پطرس بھی کتے کے بھونکنے سے اپنے آپ کو ملک الموت کے قریب پاتے ہیں اس بھونکنے کے اثرات کیا مرتب ہوتے ہیں انہیں سے سنئے۔

> "جب تک اس دنیا میں کتے موجود ہیں اور بھونکنے پر مصر ہیں سمجھ لیجئے کہ ہم قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں اور پھر ان کتوں کے بھونکنے کے اصول بھی تو کچھ نرالے ہیں یعنی ایک تو متعدی مرض ہے اور پھر بچوں بوڑھوں سبھی کو لاحق ہے اگر کوئی بھاری بھرکم اسفندیار کتا کبھی کبھی اپنے رعب اور دبدبے کو قائم رکھنے کے لئے بھونک لے تو ہم بھی چار و ناچار کہہ دیں کہ بھئی بھونک (اگرچہ ایسے وقت میں اس کو زنجیر سے بندھا ہوا ہونا چاہیئے)

لیکن یہ کم بخت دو دو تین تین آنے کے پلے بھی تو بھونکنے سے باز نہیں آتے۔ باریک سی آواز، ذرا سا پھیپھڑا، اس پر بھی اتنا زور لگا کر بھونکتے ہیں کہ آواز کی لرزش دم تک پہنچتی ہے اور پھر بھونکتے ہیں چلتی موٹر کے سامنے آ کر گویا اسے روک ہی تو لیں گے۔ اب اگر یہ خاکسار موٹر چلا رہا ہو تو قطعاً ہاتھ کام کرنے سے انکار کر دیں لیکن ہر کوئی یوں ان کی جان بخشی تھوڑا ہی کرے گا۔

کتوں کے بھونکنے پر مجھے سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ ان کی آواز سوچنے کے تمام قویٰ کو معطل کر دیتی ہے۔ خصوصاً جب کسی دکان کے تختے کے نیچے سے ان کا پورا خفیہ جلسہ باہر سڑک پر آ کر تبلیغ کا کام شروع کر دیتا ہے تو آپ ہی کہیے ہوش ٹھکانے رہ سکتے ہیں؟ ہر ایک کی طرف باری باری متوجہ ہونا پڑتا ہے۔ کچھ ان کا شور، کچھ ہماری صدائے احتجاج (زیر لب)، بے ڈھنگی حرکات و سکنات (حرکات ان کی، سکنات ہماری) اس ہنگامے میں دماغ بھلا خاک کام کر سکتا ہے اگرچہ یہ مجھے بھی نہیں معلوم کہ ایسے موقع پر دماغ کام کرے بھی تو کیا تیر مارے گا؟ بہر حال کتوں کی یہ پرلے درجے کی ناانصافی میرے نزدیک ہمیشہ قابل نفریں رہی ہے۔

اس طرح پچاس کتوں سے مالامال در حقیقت ہیں مگر نیک کتوں کا [illegible] بھی ہے۔ یہ ایک سے کیسے ہونے میں [illegible] سکتے۔

خدا نے ہر قوم میں نیک افراد بھی پیدا کیے ہیں۔ کتے اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں۔ آپ نے خدا ترس کتا بھی ضرور دیکھا ہوگا۔ عموماً اس کے جسم پر تپسیا کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ جب چلتا ہے تو اس مسکینی اور عجز سے گویا بار گناہ کا احساس آنکھ نہیں اٹھانے دیتا۔ دم اکثر پیٹ کے ساتھ لگی ہوتی ہے۔ سڑک کے بیچوں بیچ غور و فکر کے لیے لیٹ جاتا ہے اور آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ شکل بالکل فلاسفروں کی سی اور شجرہ دیو جانس کلبی سے ملتا ہے۔ کسی گاڑی والے نے متواتر بگل بجایا، گاڑی کے مختلف حصوں کو کھٹکھٹایا، لوگوں سے کہلوایا، خود دس بارہ دفعہ آوازیں دیں، تو آپ نے سر کو وہیں زمین پر رکھے سرخ مخمور آنکھوں کو کھولا، صورت حالات کو ایک نظر دیکھا، اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ کسی نے ایک چابک لگا دیا تو آپ نہایت اطمینان کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر ایک گز پرے جا لیٹے، اور خیالات کا سلسلہ جہاں سے ٹوٹ گیا تھا وہیں سے پھر شروع کر دیا۔ کسی بائیسکل والے نے گھنٹی بجائی تو لیٹے لیٹے ہی سمجھ گئے کہ بائیسکل ہے۔ ایسی چھچھوری چیزوں کے لیے وہ راستہ چھوڑ دینا فقیری کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔

رات کے وقت یہی کتا اپنی خشک پتلی سی دم تا بحد امکان سڑک پر پھیلا کر رکھتا ہے۔ اس سے محض خدا کے برگزیدہ بندوں کی آزمائش مقصود ہوتی ہے۔ جہاں آپ نے غلطی سے اس پر پاؤں رکھ دیا انہوں نے غیظ و غضب کے لہجے میں آپ سے پرسش شروع کر دی۔ "بچا!

فقیروں کو چھیڑتا ہے؟ سمجھ نہیں آتا۔ ہم سادہ لوگ یہاں بیٹھے ہیں۔ بس اس فقیر کی بددعا سے اسی وقت رعشہ شروع ہو جاتا ہے۔ بعد میں کئی راتوں تک یہی خواب نظر آتے رہتے ہیں کہ بے شمار کتے ٹانگوں سے لپٹے ہیں اور جانے نہیں دیتے۔ آنکھ کھلتی ہے تو پاؤں چارپائی کی ادوان میں پھنسے ہوتے ہیں۔"

یہ تو سب معمولی باتیں تھیں مگر اصل حقیقت اس میں ظاہر ہوتی ہے کہ خود پطرس کو جوش انتقام میں یہ آرزو بھی رہتی تھی۔ وہ سارے کتوں پر بھونکیں نہیں انہیں کاٹ بھی کھائیں چنانچہ اس آرزو کو انہوں نے ظاہر بھی کر دیا ہے

> "اگر خدا مجھے کچھ عرصے کے لیے اعلیٰ قسم کے بھونکنے اور کاٹنے کی طاقت عطا فرمائے تو جنونِ انتقام میرے پاس کافی مقدار میں موجود ہے رفتہ رفتہ سب کتے علاج کے لیے کسولی پہنچ جائیں۔"

جب یہ آرزو پوری نہ ہوئی تو جھنجھلا کر ان اشعار کی طرف توجہ کی جن میں کتوں کا ذکر آیا ہو چنانچہ سب سے پہلے عرفی کا ایک شعر ذہن میں آ گیا بس پھر کیا تھا بے چارے عرفی کی شامت آ گئی کہتے ہیں

ایک شعر ہے ؎

عرفی تو میندیش ز غوغائے رقیباں
آواز سگاں کم نہ کند رزقِ گدا را

یہی وہ خلاف فطرت شاعری ہے جو ایشیا کے لئے باعث ننگ ہے انگریزی میں ایک مثل ہے کہ ___

بھونکتے ہوئے کتے کاٹا نہیں کرتے

یہ بجا سہی مگر کون جانتا ہے کہ ایک بھونکتا ہوا کتا کب بھونکنا بند کر دے اور کاٹنا شروع کر دے"

انشاء پردازی یہی ہے کہ انشاء پرداز کو اتنی قوت حاصل ہو کہ ہر موضوع پر بے تکلف لکھ سکے اور شروع سے آخر تک اپنا رنگ بھی برقرار رکھے یہ بات پطرس میں پوری طرح موجود تھی۔ کتے جیسے حقیر، پامال اور پیش پا افتادہ موضوع پر اتنا جامع، شگفتہ اور رواں دواں مضمون لکھنا ان کا اور صرف ان کا ہی کام تھا ہر شخص اس میں کامیاب نہیں ہو سکتا

اردو کی آخری کتاب، یہ پیروڈی ہے اور اردو زبان کی سب سے پہلی پیروڈی ہے۔ آپ فرمائیں گے پہلی کس طرح ہوئی پطرس سے پہلے بھی لوگوں نے پیروڈی لکھی ہے؟ اس سوال کے متعلق میرا یہ جواب ہے کہ پیروڈی کو پیروڈی سمجھ کر اور پیروڈی کے طور پر سب سے پہلے پطرس نے لکھا ہے۔ ورنہ یوں تو رتن ناتھ سرشار نے جو "خدائی فوجدار" ترجمہ کیا ہے وہ بھی پیروڈی ہے مگر سرشار نے اسے محض ایک مزاحیہ کتاب سمجھ کر ترجمہ کیا ہے پیروڈی کی حیثیت سے انہوں نے کبھی نہیں پیش کیا اور اگر پیش بھی کیا تو غیر کا مال تھا جسے صرف ترجمہ کیا گیا، خود سرشار نے کوئی پیروڈی نہیں لکھی اس کے بعد سجاد حسین نے حاجی بغلول میں مولویوں کا مذاق اڑایا اور مولانا محمد علی کے روزنامہ ہمدرد میں حاجی بغلول یا طبع الاعلام سے دو تین بزرگوں نے اسی طرح مولویوں کا مذاق اڑایا جسے آخر میں ملا رموزی نے گلابی اردو بنا کر اپنا مستقل رنگ ہی بنا لیا تھا مگر یہ پیروڈی نہ تھی یہ مولویوں کا منہ چڑھاتے چڑھاتے خود ان لوگوں

[illegible] اور خود ۱۹۲۶ میں ترمیم کی گئی۔

لئے منہ میں چوسنی بیٹھے ہیں میاں صاحب
زباں بچوں کی تو گویا ہی [illegible]

یہ حال اس زمانے [illegible] مضمون [illegible]
حقیقت میں [illegible]

پیروڈی [illegible] سے پہلے پطرس نے پایا [illegible] اردو میں پہلی کوشش [illegible] کی تھی [illegible] پنجاب کے محکمہ تعلیم نے مولانا محمد حسین آزاد سے ایک سلسلہ اردو نصاب کا مرتب کرایا تھا [illegible] کی پہلی کتاب [illegible] ماں کے [illegible] گود میں سے بھی [illegible] "ماں بچوں کی کتاب" کہتے تھے [illegible] ماں بچوں [illegible] مشہور کر دیا گیا اور ماں بچوں کی [illegible] کتاب کہلانے لگی [illegible] شامل نصاب تھا اور [illegible] معلوم نہیں ہو کب سے اس کے متعلق سوچ رہے تھے آخر وہ نہ رکے اور انہوں نے یہ پیروڈی لکھ ڈالی۔

اس پیروڈی کو لکھتے وقت پطرس کے آگے صحافتی پروگرام تھا [illegible] مقصد پیش نظر تھا [illegible] نہایت ہی مختصر رسالہ یا چالیس سطر کی پیروڈی ہے مگر پطرس نے جان ڈال دی ہے۔

ماں بچے کے سبق کا خاکہ انہوں نے اس طرح اڑایا ہے

"ماں کی مصیبت

ماں بچے کو گود میں لئے بیٹھی ہے۔ باپ انگوٹھا چوس رہا ہے اور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ بچہ حسب معمول آنکھیں کھولے پڑا ہے۔ ماں محبت بھری نگاہوں سے اس کے منہ کو تک رہی ہے اور پیار سے حسب ذیل باتیں پوچھتی ہے:-

۱۔ وہ دن کب آئے گا جب تو میٹھی میٹھی باتیں کرے گا؟

۲۔ بڑا کب ہوگا؟ مفصل لکھو۔

۳۔ دولہا کب بنے گا اور دلہن کب بیاہ کر لائے گا؟ اس میں شرمانے کی ضرورت نہیں۔

۴۔ ہم کب بڈھے ہوں گے؟

۵۔ تو کب کمائے گا؟

۶۔ آپ کب کھائے گا؟ اور ہمیں کب کھلائے گا؟ باقاعدہ ٹائم ٹیبل بنا کر واضح کرو۔

بچہ مسکراتا ہے اور کلنڈر کی مختلف تاریخوں کی طرف اشارہ کرتا ہے تو ماں کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ جب ننھا سا ہونٹ نکال کر باقی چہرے سے رونی صورت بناتا ہے تو بے چین ہو جاتی ہے۔ سامنے نگوڑا ٹھنک رہا ہے۔ سلانا ہو تو افیم کھلا کر اسے سلا دیتی ہے۔ رات کو اپنے ساتھ سلاتی ہے (باپ کے ساتھ دوسرا بچہ سوتا ہے) جاگ اٹھتا ہے تو جھٹ چونک

[illegible] اور [illegible] [illegible] بچے [illegible] اس کے [illegible] پیاری ماما کی [illegible] اور [illegible] ایک [illegible] ہے جب [illegible] کھلتی ہے تو آپ بھی [illegible] ہے [illegible] کے [illegible] دن چڑھے منہ [illegible] ہے آنکھوں میں [illegible] ہے [illegible] ہے [illegible] [illegible]"

یہ تو [illegible] اب [illegible] ملاحظہ فرمائیے یہ [illegible] سبق کی پیروڈی ہے جو "کھانا پک رہا ہے" [illegible] ہے

"کھانا پک رہا ہے"

کھانا کیوں آپ ہی پک رہا ہے ورنہ اصل میں یہ کام میاں کا ہے ہر چیز کیا ترتیب سے رکھی ہے۔ دھوئے ہوئے برتن صندوق پر رکھے ہیں۔ [illegible] صندوق [illegible] ایک طرف بیچ میں [illegible] کے [illegible] میں کسی [illegible] ہے کہ کسی [illegible] پیچھے چمٹی اور پانی کا لوٹا پاس ہے کہ جب چاہے آگ جلائے جب چاہے پانی ڈال کر بجھا دے [illegible] چاول پکے [illegible] میں [illegible] اتار رکھے ہیں [illegible] پر چڑھی ہے [illegible] کام ہو چکا ہے لیکن یہ پھر بھی پاس بیٹھی ہے میاں جب آئیں گے کھانا لا کر سامنے رکھنی ہے پیچھے کبھی نہیں رکھتی۔ کھانا پکنے [illegible] ٹھنڈا کر دیتی ہے [illegible] تو میاں کے سامنے ہزاروں رکابیوں کا ڈھیر لگ جائے [illegible] پکانے سے فارغ ہوتی ہے تو کبھی سینا پرونا [illegible] کبھی چرخہ کاتنے لگتی ہے کیوں نہ ہو [illegible] گاندھی کی بدولت یہ ساری باتیں سیکھی ہیں آپ [illegible] ہو جائے تو ڈاکٹروں سے علاج کروانا پڑے۔"

[illegible] تیسرا شہپارہ جس کا عنوان "دھوبی کپڑے دھو رہا ہے" [illegible] یوں شروع ہوتا ہے

"دھوبی آج کپڑے دھو رہا ہے"

بڑی محنت کرتا ہے شام کو بھٹی چڑھاتا ہے دن بھر بے کار بیٹھا رہتا ہے کبھی کبھی بیل پر [illegible] لادتا ہے اور گھاٹ کا رستہ لیتا ہے کبھی نالے پر دھوتا ہے کبھی دریا پر تاکہ کپڑے والے کسی جگہ نہ دیکھیں۔ جاڑا ہو تو سردی ستاتی ہے گرمی ہو تو دھوپ جلاتی ہے صرف بہار کے موسم میں کام کرتا ہے دوپہر ہونے کو آئی [illegible] پانی میں کھڑا ہے راستے [illegible] سرسام ہو جائے گا۔ درخت کے نیچے بیل بندھا ہے جھاڑی کے پاس کتا بیٹھا ہے دریا کے اس پار ایک گدھا [illegible] ہے دھوبی انہیں سے اپنا جی بہلاتا ہے۔

دیکھنا دھوبن روٹی لائی ہے۔ دھوبی کو بہانہ ہاتھ آیا کپڑا پٹڑے پر رکھ کر اس سے باتیں کرنے لگا۔ کتے نے بھی دیکھ کر کان کھڑے کئے۔ اب دھوبن گانا گائے گی دھوبی دریا سے نکلے گا دریا کا پانی پھر نیچا ہو جائے گا۔

[illegible] صاحب [illegible]
چونکہ اسے دیکھا [illegible] کے لئے [illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible] نقل [illegible]

[illegible] مضمون نگاری کی پہلی کوشش میں [illegible] کامیاب [illegible] کا آخری مضمون [illegible] وسطانی جماعتوں کے لئے لکھا گیا ہو [illegible]

اب ان کی بے ساختہ تمہید ملاحظہ ہے

"لاہور لاہور ہی ہے اگر اس پتے سے آپ کو لاہور نہیں مل سکتا تو آپ کی تعلیم ناقص اور آپ کی ذہانت فاتر ہے۔"

محل وقوع بتاتے ہوئے دو بڑی غلط فہمیاں رفع کی ہیں ایک یہ کہ

"لاہور پنجاب میں واقع ہے لیکن پنجاب اب پنج آب نہیں رہا۔ اس پانچ دریاؤں کی سرزمین میں اب صرف ساڑھے چار دریا بہتے ہیں اور جو نصف دریا ہے وہ اب بہنے کے قابل ہی نہیں رہا۔ اسی کو اصطلاح میں راوی ضعیف کہتے ہیں۔ ملنے کا پتہ یہ ہے کہ شہر کے قریب دو پل بنے ہیں ان کے نیچے ریت میں دریا لیٹا رہتا ہے۔ بہنے کا شغل عرصہ سے بند ہے اس لئے اب یہ بتانا مشکل ہے کہ شہر دریا کے دائیں کنارے پر واقع ہے یا بائیں کنارے پر۔"

دوسری غلط فہمی اس طرح رفع کی ہے۔

"لاہور تک پہنچنے کے کئی راستے ہیں دو ان میں سے بہت مشہور ہیں۔ ایک پشاور سے آتا ہے اور دوسرا دہلی سے۔ وسط ایشیا کے حملہ آور پشاور کے راستے اور یو پی کے حملہ آور دہلی کے رستے وارد ہوتے ہیں۔ اول الذکر اہل سیف کہلاتے ہیں اور غزنوی یا غوری تخلص کرتے ہیں۔ مؤخر الذکر اہل زبان کہلاتے ہیں یہ بھی تخلص کرتے ہیں اور اس میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔"

حدود اربعہ جغرافیہ میں بڑی چیز ہے پطرس نے بڑی خوبی سے لاہور کے حدود اربعہ بیان کئے ہیں۔

"کہتے ہیں کسی زمانے میں لاہور کا حدود اربعہ بھی ہوا کرتا تھا لیکن طلبا کی سہولت کے لئے میونسپلٹی نے اسے منسوخ کر دیا ہے۔ اب لاہور کے چاروں طرف بھی لاہور ہی واقع ہے۔ اور روز بروز واقع تر ہوتا جا رہا ہے۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ دس بیس سال کے اندر لاہور ایک صوبے کا نام ہو گا جس کا دارالخلافہ پنجاب ہو گا۔"

آب و ہوا میں پطرس نے جو ندرت پیدا کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے سنئے۔

"لاہور کی آب و ہوا کے متعلق طرح طرح کی روایات مشہور ہیں جو تقریباً سب کی سب غلط ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لاہور کے باشندوں نے حال ہی میں یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ اور شہروں کی طرح ہمیں بھی آب و ہوا دی جائے۔ میونسپلٹی بڑی بحث و تمحیص کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی کہ اس ترقی کے دور میں جب کہ دنیا میں کئی ممالک کو ہوم رول مل رہا ہے، اور لوگوں میں بیداری کے آثار پیدا ہو رہے ہیں اہل لاہور کی یہ خواہش ناجائز نہیں بلکہ ہمدردانہ غور و خوض کی مستحق ہے۔

لیکن بدقسمتی سے کمیٹی کے پاس ہوا کی قلت تھی، اس لئے لوگوں کو ہدایت کی گئی کہ مفاد عامہ کے پیش نظر اہل شہر ہوا کا بے جا استعمال نہ کریں بلکہ جہاں تک ہو سکے کفایت شعاری سے کام لیں چنانچہ اب لاہور میں عام ضروریات کے لئے ہوا کی بجائے گرد اور خاص خاص حالات میں دھواں استعمال کیا جاتا ہے کمیٹی نے جا بجا دھوئیں اور گرد کے مہیا کرنے کے لئے مرکز کھول دئے ہیں جہاں یہ مرکب مفت تقسیم ہوتا ہے۔"

آب رسانی کی جو تفصیل لکھی ہے وہ تو بس غضب کی ہے۔

"پانی کا یہ انتظام کیا گیا ہے کہ فی الحال بارش کے پانی کو حتی الوسع شہر سے باہر نکلنے نہیں دیتے اس میں کمیٹی کو بہت کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ تھوڑے ہی عرصے میں ہر محلے کا اپنا ایک دریا ہو گا جس میں رفتہ رفتہ مچھلیاں پیدا ہوں گی اور ہر مچھلی کے پیٹ میں کمیٹی کی ایک انگوٹھی ہو گی جو رائے دہندگی کے موقع پر ہر رائے دہندہ پہن کر آئے گا۔

نظام سقے کے مسودات سے اس قدر ضرور ثابت ہوا ہے کہ پانی پہنچانے کے لئے نل ضروری ہیں چنانچہ کمیٹی نے کروڑوں روپے خرچ کر کے جا بجا نل لگوا دئے ہیں فی الحال ان میں آکسیجن اور ہائیڈروجن بھری ہے لیکن ماہرین کی رائے ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ گیسیں ضرور مل کر پانی بن جائیں گی۔ چنانچہ بعض بعض نلوں میں اب بھی چند قطرے روزانہ نکلتے ہیں اہل شہر کو ہدایت کی گئی ہے کہ اپنے اپنے گھڑے نلوں کے نیچے رکھ چھوڑیں تاکہ

عین وقت پر تاخیر ہونے سے کسی کی دل شکنی نہ ہو۔ ستم ظریفی کے نمونے اس میں بہت خوشنما ملتے ہیں:

ذرائع آمد و رفت میں جو نئے اضافے کئے گئے ہیں وہ قابل دید ہیں:—

چونکہ کل کھاتی ہوئی ادھر کے بازاروں پر سے گذرتی ہے [illegible] بہت اہم ہے [illegible] شہرت دوام [illegible] یاد تھا یہ آثار قدیمہ پر ختم ہوتی ہے، اور سب سے اہم مرکزی بازاروں سے یہی حال ہے تاکہ [illegible] کسی قسم کا [illegible] ان گڑھوں کو شہید کیا جاتا۔ وہ قدیم تاریخی گڑھے اور خندقیں جن کی [illegible] موجود ہیں انہوں نے کئی سلطنتوں کے تختے الٹ دیئے تھے آج تک بھی کئی لوگوں کے تختے یہاں الٹتے ہیں اور عظمت رفتہ کی یاد دلا کر انسان کو عبرت سکھاتے ہیں

بعض لوگ زیادہ عبرت پکڑنے کے لئے ان تختوں کے نیچے کہیں کہیں دو ایک پہیے لگا لیتے ہیں اور سامنے دو بانس لگا کر اس میں ایک گھوڑا ٹانک دیتے ہیں۔ اصطلاح میں اس کو تانگا کہتے ہیں شوقین لوگ اس تختہ پر موم جامہ منڈھ لیتے ہیں تاکہ پھسلنے میں سہولت ہو، اور بہت زیادہ عبرت پکڑی جائے۔

اصلی اور خالص گھوڑے لاہور میں خوراک کے کام آتے ہیں قصابوں کی دکانوں پر ان کا گوشت بکتا ہے اور زین کس کر کھایا جاتا ہے تانگوں میں ان کی بجائے بناسپتی گھوڑے استعمال کئے جاتے ہیں بناسپتی گھوڑا شکل و صورت میں دُم دار ستارے سے ملتا ہے کیونکہ اس گھوڑے کی ساخت میں دم زیادہ اور گھوڑا کم پایا جاتا ہے حرکت کرتے وقت اپنی دم کو دبا لیتا ہے اور اس ضبط نفس سے اپنی رفتار میں ایک سنجیدہ اعتدال پیدا کرتا ہے تاکہ سڑک کا ہر تاریخی گڑھا اور تانگے کا ہر ہچکولا اپنا نقش آپ پر ثبت کرتا جائے اور آپ کا ہر ایک مسام لطف اندوز ہو سکے۔"

قابل دید مقامات بھی بڑے ہی لطیف ہیں یوں تو یہ سارا مضمون طنز کی طنز ہے مگر یہ پارہ تو بڑا ہی گہرا طنز ہے سنئے:—

"لاہور میں قابل دید مقامات مشکل سے ملتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ لاہور میں ہر عمارت کی بیرونی دیواریں دہری بنائی جاتی ہیں پہلے اینٹوں اور چونے سے دیوار کھڑی کرتے ہیں اور پھر اس پر اشتہاروں کا پلستر کر دیا جاتا ہے جو دبازت میں رفتہ رفتہ بڑھتا ہی جاتا ہے، شروع شروع میں چھوٹے سائز کے مبہم اور غیر معروف اشتہارات چپکائے جاتے ہیں مثلاً "اہل لاہور کو مژدہ" یا "اچھا اور سستا مال" اس کے بعد ان اشتہاروں کی باری آتی ہے جن کے مخاطب اہل علم اور سخن فہم لوگ ہوتے ہیں مثلاً "ٹریبوٹ درزی ہاؤس یا سٹوڈنٹوں کیلئے"

اور مت یا کھمبی ہے کہ جس نے دامن سا نہ کیا، رفتہ رفتہ گھر کی چار دیواری ایک مکمل ڈائرکٹری کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ دروازے کے اوپر بوٹ پالش کا اشتہار ہے، دائیں طرف تازہ مکھن بنانے کا پتہ مندرج ہے، بائیں طرف حافظ کی گولیوں کا بیان ہے۔ اس کھڑکی کے اوپر گمشدہ سماعت کے ملنے کا پروگرام ہے، اُس کھڑکی پر کسی مشہور لیڈر کے سوانح حالات بوضاحت بیان کئے گئے ہیں۔ مسجد کی دیوار پر سرکس کے تمام جانوروں کی فہرست ہے اور اصطبل کے دروازے پر مس نور جہاں کی تصویر اور ان کے فلم کے محاسن گنوائے گئے ہیں۔ یہ اشتہارات بڑی سرعت سے بدلتے رہتے ہیں اور ہر نیا مژدہ اور ہر نئی دریافت یا ایجاد یا انقلابِ عظیم کی اطلاع چشم زدن میں ہر ایک چیز پر لیپ دی جاتی ہے اس لئے عمارتوں کی ظاہری صورت ہر لمحہ بدلتی رہتی ہے، اور ان کے پہچاننے میں خود شہر کے لوگوں کو دقت پیش آتی ہے

لیکن جب سے لاہور میں یہ دستور رائج ہوا ہے کہ بعض بعض اشتہاری کلمات پختہ سیاہی سے دیوار پر خوشنقش کرائے جاتے ہیں یہ دقت بہت حد تک رفع ہو گئی ہے ان دوامی اشتہاروں کی بدولت اب یہ خدشہ نہیں، کہ اگر کوئی شخص، پتا یا اپنے کسی دوست کا مکان صرف اس لئے بھول جائے کہ پچھلی مرتبہ وہاں چار پائیوں کا اشتہار لگا ہوا تھا، اور لوٹتے وقت وہاں اہالیانِ لاہور کو تازہ اور سستے جوتوں کا مژدہ سنایا جا رہا ہے چنانچہ اب وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جہاں "برق علی محمد علی دندان ساز" لکھا ہے وہ "انقلاب" کا دفتر ہے جہاں "بجلی پانی بھاپ کا بڑا ہسپتال" لکھا ہے وہاں ڈاکٹر اقبال رہتے ہیں "خالص گھی کی مٹھائی" امتیاز علی صاحب کا مکان ہے "کرشنا بوٹی کریم" شالامار باغ کو اور "کھانسی کا مجرب نسخہ" جہانگیر کے مقبرے کو جاتا ہے۔

صنعت و حرفت میں تو پیرس نے کمال کر دیا ہے تھا ہے..

اشتہاروں کے علاوہ لاہور کی سب سے بڑی صنعت رسالہ بازی اور سب سے بڑی حرفت انجمن سازی ہے ہر رسالے کا ہر نمبر عموماً خاص نمبر ہوتا ہے اور عام نمبر صرف خاص خاص موقعوں پر شائع کئے جاتے ہیں، عام نمبر میں صرف ایڈیٹر کی تصویر اور خاص نمبروں میں مس سلوچنا اور مس کجن کی تصاویر بھی دی جاتی ہیں اس سے ادب کو بہت فروغ نصیب ہوتا ہے، اور فن تنقید ترقی کرتا ہے

لاہور کے ہر مربع انچ میں ایک انجمن موجود ہے پریذیڈنٹ البتہ تھوڑے ہیں اس لئے فی الحال صرف دو تین اصحاب ہی یہ اہم فرض ادا کر رہے ہیں چونکہ ان انجمنوں کے اغراض

[illegible] ہیں [illegible] کا [illegible]
[illegible] کا [illegible]
[illegible] ہوتا ہے [illegible]
[illegible] ہے
[illegible] شعر [illegible] لکھتے ہیں
[illegible] طلباء [illegible]
[illegible]
عموماً [illegible] میں [illegible] مشہور
[illegible] ہوتے ہیں
[illegible]
[illegible]

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

تمہیں [illegible] سب کی تصویریں ہیں۔ بڑی بڑی مونچھوں کے [illegible] چھوٹے ہیں اور تعطیلات میں ایک ایک خط لکھتے رہتے ہیں۔ دوسری قسم طلائی طلباء کی ہے ان کا شکوہ و جلال دیدنی ہوتا ہے [illegible] ہندوستان کا تخت و تاج ان کی ملکیت ہو جاتا ہے شام کے وقت چند منچلے حضرات کو ساتھ لے نکلتے ہیں اور گردو نواح میں خرمستیاں کرتے ہوئے پھرتے ہیں۔ کالج کی خوراک انہیں راس نہیں آتی اس لئے ہوسٹل میں [illegible] نہیں ہوتے تیسری قسم خیالی طلباء کی ہے یہ اکثر روپ اور اخلاق اور [illegible] اور جمہوریت پر آزاد خیالات کرتے پائے جاتے ہیں۔ آرٹ اور نفسیات جنسی کے متعلق نئے نئے نظریے پیش کرتے ہیں۔ جسمانی صحت کو ارتقائے انسانی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں اس لئے علی الصباح پانچ چھ ڈنڈ پیلتے ہیں۔ اور شام کو ہوسٹل کی چھت پر گہرے سانس لیتے ہیں۔ گاتے مزے میں ہیں لیکن اکثر بے سُرے ہوتے ہیں چوتھی قسم خالی طلباء کی ہے یہ طلباء کی خالص ترین قسم ہے ان کا دامن کسی قسم کی آلائش سے [illegible] نہیں پاتا کتابیں، امتحانات، مطالعہ اور اس قسم کے خرخشے کبھی ان کی زندگی میں خلل انداز نہیں ہوتے جس معصومیت کو ساتھ لے کر کالج میں پہنچتے ہیں اسے آخر تک ملوث ہونے نہیں

بیتے اور تعلیم الانصاب اور درس کے ہنگاموں میں اس طرح زندگی بسر کرتے ہیں جس طرح بتیس دانتوں میں زبان رہتی ہے

پچھلے چند سالوں سے طلبا کی ایک اور قسم دکھائی دینے لگی ہے لیکن ان کو اچھی طرح سے دیکھنے کے لیے محدب شیشے کا استعمال ضروری ہے یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ریل کا ٹکٹ نصف قیمت پر ملتا ہے اور اگر چاہیں تو اپنی انا کے ساتھ زنانے ڈبے میں بھی سفر کر سکتے ہیں ان کی وجہ سے اب یونیورسٹی نے کالجوں پر یہ شرط عائد کر دی ہے کہ آئندہ سے صرف وہی لوگ پروفیسر مقرر کیے جائیں جو دودھ پلانے والے جانوروں میں سے ہوں۔"

طبعی حالات میں کوئی خاص بات نہیں بتائی گئی صرف یہ لکھا گیا ہے کہ

" لاہور کے لوگ بڑے خوش طبع ہیں "

البتہ سوالات بڑے ہی لطیف ہیں بسم اللہ آپ بھی ان کے جواب دیجیے:

" (۱) لاہور تمہیں کیوں پسند ہے؟ مفصل لکھو

۲۔ لاہور کس نے دریافت کیا اور کیوں؟ اس کے لیے سزا بھی تجویز کرو۔

۳۔ میونسپل کمیٹی کی شان میں ایک قصیدہ مدحیہ لکھو "

لیجیے اس شان سے یہ طنزیہ شاہکار ختم ہوتا ہے اس میں پیروڈی کا کمال طنز کی انتہا اور مزاح کا لطیف ترین پہلو موجود ہے پڑھتے اور مزے لیتے جائیے۔ کاش پطرس ایسے ہی دو چار مضامین اور لکھتے جو اردو ادب کی جان ہوتے۔ یہ دونوں مضامین ان کی جوانی کی امنگوں کے زمانے کے ہیں بعد میں وہ اس قسم کے مضامین اگر چاہتے بھی تو لکھ نہ سکتے۔

ابتدا طنز و مزاح مجھے بھی پسند تھا اور میں نے بھی چند مضامین لکھے جن میں سے دو ایک مضمون پطرس نے بہت پسند کیے تھے مگر وہ مضامین بھی میں نے اسی عمر میں لکھے تھے جس عمر میں پطرس نے یہ مضامین لکھے ہیں۔ اس عمر کے بعد یعنی چہل سال عمر عزیز گذار کر میں نے پھر ویسے ہی مضامین لکھنے کی کوشش کی تو کامیابی نہ ہوسکی

مزاح نگاری اور طنز نویسی کا تعلق اپچ سے ہے جس شخص میں جتنی اپچ ہوگی وہ اتنا ہی بہترین مزاح نگار اور طنز نویس ہوگا مگر یہ اپچ عنفوان شباب سے شروع ہو کر تیس پینتیس برس کی عمر میں ختم ہو جاتی ہے اس کے بعد اس میں شک نہیں کہ خیالات میں پختگی طرز تحریر میں لوچ اور اپنا ایک اسلوب اور ڈھنگ الگ ضرور بن جاتا ہے مگر وہ جو چیز اپچ کہلاتی ہے باقی نہیں رہتی اب کہنے کو یوں کہہ دیجیے ؎

گھٹا زور مشق سخن بڑھ گئی
ضعیفی نے ہم کو جواں کر دیا

مگر حقیقت یہ ہے کہ لطافت تحریر اور قلمی البیلا پن مفقود ہو جاتا ہے۔

" میں ایک میاں ہوں " یہ سو فیصدی مزاحیہ مضمون ہے ممکن ہے اس میں تھوڑی بہت حقیقت بھی ہو یا پھر بالکل ہی فرضی ہو مگر ہے بڑا ہی لطیف مضمون، اس میں وہ تمام باتیں آگئی ہیں جو ایک شادی شدہ اور نئے شادی شدہ نوجوان کو پیش آتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ بیوی اپنے شوہر کے ان سب دوستوں سے جلنے لگتی ہے جو بلا وجہ تکلف اور چہیتے ہوں کیونکہ اسے ایک قسم کی رقابت محسوس ہوتی ہے وہ یہ چاہتی ہے کہ ہر طرح صرف وہی اپنے شوہر کی توجہ کا مرکز بنی رہے اور شخص یا اشخاص اس میں حصہ دار نہ ہوں یہ عورت کی فطرت ہے اس لئے یہ مطالبہ بالکل فطری ہے اس سے بچنے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ عورت پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا جائے کہ دوستوں سے آپ کو محبت ہے یا آپ کے دوست آپ سے محبت کرتے ہیں چنانچہ اسی حقیقت کو پطرس نے بڑے ہی معصومانہ انداز میں بیان کیا ہے جو نکہ —

دل وحشی آرا کا اور پھر بیاں کیا

ہے اس سے شوخی بھی پیدا ہو گئی ہے۔

ہر شخص کی جب شادی ہوتی ہے تو اسے ابتداً اپنی زندگی میں تبدیلی دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے مگر رفتہ رفتہ یہ حالت زائل ہو جاتی ہے اور پھر وہ وہی تنہائی اور بے لگامی پسند کرنے لگتا ہے چنانچہ اس متاہلانہ زندگی میں اگر اتفاقاً بیوی سے تھوڑی بہت عارضی دوری کا مل جائے تو فوراً خوش ہو جاتا اور بڑی مسرت کا اظہار کرنے لگتا ہے مگر صرف چند گھنٹوں تک اس کے بعد پھر رد عمل شروع ہوتا ہے اور تنہائی بری طرح ستانے لگتی ہے چنانچہ پطرس نے بھی اسی تجربے کو بڑی ہی سادگی سے لکھ دیا ہے۔ وہ بیوی کے جانے کے بعد جتنے خوش تھے ایک رات گزرتے ہی ویسے ہی مغموم ہو گئے اور نہ صرف مغموم ہوئے بلکہ بیوی کو تار دے دیا کہ "فوراً آ جاؤ"۔

گھر خالی ہو اور بے تکلف احباب جمع ہو جائیں تو جوانی میں بالکل یہی کیفیت ہوتی ہے جو تاش کھیلنے میں پطرس کی ہوئی چنانچہ جب بنے ہوئے چلم بدست کلاہ کاغذی برسر رو سیاہی کے عالم میں بیوی نے دیکھ لیا اس کے بعد کی کیفیت پطرس ہی سے سنئے۔

> "روح منجمد ہو گئی اور تمام حواس نے جواب دے دیا روشن آرا کچھ دیر تک چپ کھڑی دیکھتی رہی
> اور پھر کہنے لگی ... لیکن میں کیا بتاؤں کہ کیا کہنے لگی؟ اس کی آواز تو میرے کانوں تک
> جیسے بے ہوشی کے عالم میں پہنچ رہی تھی۔"

اس کے بعد پطرس نے صفائی پیش کی ہے مگر یہ حصہ وہ نہ لکھتے تو بہتر تھا اس خلا کو پُر کر کے قاری سب کچھ سمجھ لیتا دیکھ لیتا پا لیتا سوچ لیتا اور محسوس کر لیتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ مضمون بڑا ہی نفیس ہے یہ کلاہ کاغذی جس کے سر پر رکھ دیجئے بقول بن جاتا ہے صاحب ذوق جوانوں میں اسی فیصدی ایسے نظر آئیں گے جن پر اس قسم کے حادثات گذر چکے ہیں مگر دس فیصدی بھی اتنے صاحب کردار نظر نہ آئیں گے جو ڈنکے کی چوٹ ان حادثات کا ذکر کر سکیں اور اگر دو ایک ہمت کر بھی لیں تو انہیں اسلوب نگارش نصیب نہ ہو سکے گا۔

بظاہر ایک سیدھا سادہ سا واقعہ بیان کر دینا کوئی بات نہیں مگر اس عمدگی اس تسلسل اس ہم آہنگی اس روانی اس ڈھٹائی اس صفائی اس شوخی اس شستگی اس خوب صورتی اس نفاست اس ندرت اور اس ہمت سے لکھنا کمال ہے اور یہ کمال پطرس میں بدرجۂ اتم موجود تھا۔

"مرید پور کا پیر" یہ مضمون پطرس نے معلوم نہیں کسی ایک شخص کو سامنے رکھ کر لکھا ہے یا کئی ایک اشخاص کو کیونکہ یہ بعض خاص خاص لوگوں کی چغلی کھاتا ہے ممکن ہے محض قیاسی اور ذہنی ہو مگر ہے بڑی اچھی چیز، بیشتر حضرات اس قسم سے بن چکے ہیں۔ چنانچہ میں بھی ذاتی طور پر مرید پور کے کئی ایک پیروں سے واقف ہوں جو لیڈر بنتے بنتے رہ گئے اور رہے بھی تو ایسے کہ کہیں کے نہ رہے، نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے۔

ایسے ہی ایک بزرگ کو ادھر ادھر میں مرحوم ۔ کسی اور کا نام لیا یہ خانیت میں خلل ڈال لیا تھا اس لیے پطرس نے بیچ آپ ہی کو مرید پور کا پیر بنا کر پیش کیا ہے۔ اگر آپ باور کیجیے کہ پطرس نے لیڈروں کا رول جو سلسلہ تھا اور نہ وہ تنے ۔ دوق کے ریشت لیڈ بننے کو تیار ہو جاتے۔ ان کے بے تکلف دوست سمجھتے ہیں کہ اس سلسلے میں کسی کی نشاندہی کی گئی ہے۔ کاش ساتک صاحب اس پر روشنی ڈالیں اور مرید پور کے پیر کو بے نقاب کریں۔

ایک جاہل اور سیاسیات سے ناواقف شخص لیڈر بننے کے لیے کس طرح کوشاں رہتا ہے اور لیڈری کی تیاری کس طرح کرتا ہے یہ مضمون آپ کو ساری تفصیل سمجھا دے گا۔ اگر اسے پڑھ کر آپ بھی لیڈری فرمانے لگیں تو بسم اللہ!

'انجام بخیر' کا پلاٹ کچھ غیر کا معلوم ہوتا ہے مگر پطرس نے اس عمدگی سے اپنایا ہے کہ داد نہیں دی جا سکتی۔ اسے آپ چاہے مکالمہ کہیں یا ایک ایکٹ کا ڈرامہ۔ یہ جو بھی ہے بڑی ہی عمدہ چیز ہے۔

'سینما کا عشق' بقول پطرس اس مضمون کا عنوان موزوں نہیں ہے مگر اس کے پڑھنے کے بعد تمام توقعات پوری ہو جاتی ہیں کیونکہ اس میں پطرس نے اپنے دل کے داغ دکھلائے ہیں۔

دراصل یہ جو کہا جاتا ہے کہ پطرس کے دوست مرزا کا اور ان کا کردار ہیں کے پطرس نے اپنا غصہ دور کیا ہے ایسے دوست اکثر ہوتے ہیں اور ان سے نباہ کرنا پڑتا ہے۔ ایسے ہی سب کمزوریاں ... سینما بینی میں تھوڑی بہت ترغیب رکھتے ہیں دوست احباب کو تفریح کے وقت ساتھ لے جاتے ہیں۔ خاص طور پر پطرس نے کسی ایسی ہی نسبت پائی ہے وہ جب بھی سینما دیکھنا چاہتے ہیں مرزا کو ساتھ لے جاتے ہیں اور مرزا اپنی کاہلی کی وجہ سے وقت پر پہنچتے ہی نہیں اور پھر سینما دیر سے پہنچنے کے بعد جو اذیتیں ہوتی ہیں ان کی بعینہٖ تفصیل پطرس نے لکھی ہے یہ باتیں اس وقت کی ہیں جب کہ بولنے فلم شروع نہیں ہوئے تھے ساکت فلم تھے۔ ایسے فلموں میں درمیان میں بیٹھے فلم شروع ہونے کے بعد پہنچنا بے فضول ہوتا تھا کیونکہ ان کا سمجھنا اور کرداروں کا ملانا مشکل ہو جاتا تھا صرف اس قدر سمجھ سکتے تھے کہ ایک مرد اور ایک عورت جو پردے پر بغل گیر نظر آتے ہیں ایک دوسرے کو چاہتے ہوں گے ظاہر ہے کہ وقت اور روپیہ خراب کرنے کے بعد اتنی سی بات معلوم کرنے سینما پہنچنا تو نہایت ہی دیوانہ پن ہے اسی بات پر پطرس کو غصہ آتا ہے اور وہ دل کی بھڑاس اس مضمون میں نکال لیتے ہیں۔

یہ مضمون اپنی روانی، تسلسل اور زور کے لحاظ سے بڑا ہی یکساں، ٹھیک اور برجستہ ہے اس میں انسانی جھنجھلاہٹ کے سارے پہلو نمایاں کیے گئے ہیں اور سینما دیکھنے والوں کی حرکات پر بڑا ہی لطیف طنز کیا گیا ہے یہ طنز جتنا گہرا ہے اتنا ہی لطیف اور اسی قدر واقعاتی ہے جسے لوگ صرف واقعات کا اظہار سمجھ کر بھی پڑھ لیتے ہیں اور صاحبانِ بصیرت اس سے عبرت بھی حاصل کرتے ہیں اور اہلِ دل اس کے طنز سے لطف اٹھاتے ہیں۔

'مرحوم کی یاد میں' یہ کسی کا مرثیہ نہیں ہے اور نہ اس میں کسی واقعی مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے بلکہ یہ بھی پطرس کے دوست مرزا کی ایک سادہ لوحی کا نقش جمیل ہے۔ قصہ یہ ہے کہ ایک روز پطرس کو اپنی 'پیدل زندگی' پر کوفت ہونے لگی۔ اور انہوں نے مرزا سے گفتگو کی تو مرزا نے عجیب و غریب رویہ کا اظہار کیا اس پر بجائے اس کے انہوں نے موٹر کی خریداری کا ارادہ ظاہر کیا اور مرزا نے سنجیدگی سے موٹر کی قیمت کی ادائیگی کے متعلق گفتگو شروع کر دی بالآخر موٹر کی بجائے سائیکل کی خریداری طے ہوئی تو مرزا نے اپنی سائیکل پیش کی کہ بلا قیمت لے لو، مگر پطرس کو بلا قیمت سائیکل قبول کرنے سے انکار رہا اور انہوں نے مبلغ چالیس روپے سائیکل کی قیمت کے طور پر مرزا کی جیب میں ڈال دیے۔ اور اسی رات ہی میں مرزا نے سائیکل بھجوا دی جسے

جب پطرس نے دیکھا تو خوش خوش اس پر سوار ہو کر سیر کو چلے۔ یہ سائکل ان کی تخلیقات میں سے تھی جو از کار رفتہ ہو گئی تھی اب اس پر جو گزری، کیا حال ہوا۔ اس کی تفصیل پطرس نے جس چابک دستی سے لکھی ہے وہ انہیں کا حصہ تھا۔ اس طرح کا ایک مضمون یا مضمون میں اسی طرح کا ایک پارہ سجاد حیدر یلدرم نے بھی آج سے پچاس سال پہلے لکھا ہے اور اس کے پڑھنے کے پچیس سال بعد پطرس نے لکھا ہے مگر جو بات پطرس نے پیدا کی ہے وہ سجاد حیدر کو نصیب نہ ہو سکی تھی۔

اس مضمون میں کوئی لفظ ایسا نہیں جو بے ہودہ ہو۔ کوئی عبارت ایسی نہیں جو مضحکہ خیز ہو۔ صرف سائیکل پرست کی کسلمندی کی تفصیل ہے وہ معصومانہ اور سیدھے سادے الفاظ میں ہے جو کمال ہے پطرس کی انشاپردازی کا۔ ناممکن ہے کہ کوئی شخص پڑھے اور ہنسی سے بے چین نہ ہو جائے۔ پطرس کے مزاحیہ مضامین میں یہ شاہکار ہے تو صرف بے ساختہ ہے بلکہ اسی فن کاری سے لکھا گیا ہے کیونکہ اس سائیکل سے گزر کر تاب لاتے ہوئے اسے صدمے اور عالم دید میں ڈال آتے ہیں اس نے اسے مرحوم فرض کیا ہے اور اس قصے کو مرحوم کی یاد سے تعبیر کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک لطیف طنز و مزاح کا آئینہ ہے۔

اس مضمون میں پطرس نے سماجیات، ثقافت، تہذیب، تمدن، روزمرہ زندگی اور فطرت انسانی کے بڑے بڑے مسئلے حل کئے ہیں۔ تمہید میں لکھا ہے "جب دوستی پرانی ہو جائے تو گفتگو کی چنداں ضرورت نہیں رہتی اور دوست ایک دوسرے کی خاموشی سے بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں" دیکھئے نفسیات کا کتنا پیچیدہ مسئلہ اس نکتے نے حل کر دیا اس کے بعد کمیونسٹ ذہنیت کا نقشہ کس صداقت سے کھینچا ہے۔

> "میری طبیعت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ میں جب کبھی کسی کی موٹر کار کو دیکھوں مجھے مساوات
> کی ناسازگاری کا خیال ضرور ستانے لگتا ہے اور میں کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگتا ہوں جس
> سے دنیا کی تمام دولت سب انسانوں میں برابر برابر تقسیم کی جا سکے۔ اگر میں سڑک پر پیدل جا
> رہا ہوں اور کوئی موٹر اس ادا سے گزر جائے کہ گرد و غبار میرے پھیپھڑوں، میرے دماغ
> میرے معدے اور میری تلی تک پہنچ جائے تو اس دن میں گھر آ کر علم کیمیا کی وہ کتاب
> نکال لیتا ہوں جو میں نے ایف اے میں پڑھی تھی اور اس غرض سے مطالعہ کرنے لگتا
> ہوں کہ شاید بم بنانے کا کوئی نسخہ ہاتھ آ جائے۔"

فرمایئے اس سے بہتر تشریح کمیونسٹ ذہنیت کی کوئی کر سکتا ہے۔ اور اس پر اس سے بہتر طنز کہیں آپ نے سنی ہے؟ پیدل روی اور انسانی پیدل زندگی سے متعلق پطرس کی بین جب مرزا پر اثر نہیں کرتی تو پطرس ان سے یوں انتقام لیتے ہیں۔

> "میں نے اپنے دانت پیچی کئے اور کرسی کے بازو پر سے جھک کر مرزا کے قریب پہنچ گیا۔ مرزا
> نے بھی سر میری طرف موڑا۔ میں مسکرا دیا لیکن میرے تبسم میں زہر ملا ہوا تھا۔ جب مرزا سننے کے لئے
> بالکل تیار ہو گیا تو میں نے چبا چبا کر کہا۔"

آپ جانتے ہیں پطرس نے مرزا سے کیا کہا؟ صرف اتنا "مرزا میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں" اور پھر اس کی توضیح و تشریح بھی الفاظ و اشارات سے کی مگر مرزا بھی ایسا ڈھیٹ تھا کہ ٹس سے مس نہ ہوا بلکہ اس نے "ہوں" پر ٹرخا دیا اور "مسلسل ہوں" کی رٹ لگا دی جس سے پطرس بھنا گئے اور ۔۔

> "میں نے کہا مرزا صاحب جہاں تک مجھے معلوم ہے تم نے اسکول اور کالج اور گھر پر دو دو تین تین زبانیں سیکھی ہیں اور اس کے علاوہ تمہیں کئی ایسے الفاظ بھی آتے ہیں جو کسی اسکول یا کالج یا شریف گھرانے میں نہیں بولے جاتے پھر بھی اس وقت تمہارا کلام 'ہوں' سے آگے نہیں بڑھتا تم مجھ سے جلتے ہو۔ اس وقت تمہاری جو ذہنی کیفیت ہے اس کو عربی زبان میں حسد کہتے ہیں۔"

مگر مرزا نے بڑی دکھتی رگ پکڑی پوچھا

> "تم نے کہا تھا میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں تو میاں صاحبزادے خریدنا تو ایک ایسا فعل ہے کہ اس کے لئے روپے وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے وغیرہ کا بندوبست تو کوئی ہو جائے گا لیکن روپے کا بندوبست کیسے کرو گے؟"

اس کے بعد پطرس نے اپنی قیمتی اشیاء بیچ کر موٹر کی قیمت جمع کرنی چاہی مثلاً سگریٹ کیس وغیرہ مگر یہ قیمتی اشیاء بہت ہی کم قیمت ثابت ہونے لگیں مجبوراً اس خیال کو ترک کر دینا پڑا۔ مگر مرزا نے حق دوستی ادا کر دیا اور اپنی سیکل مفت دینے کی پیش کش کی۔ اس پیش کش سے پطرس کو کتنی مسرت ہوئی ان الفاظ سے ظاہر ہے —

> "ایسے موقع پر جو ہنسی میں ہنستا ہوں اس میں معصوم بچے کی مسرت، جوانی کی خوش دلی، ابلتے ہوئے فواروں کی موسیقی اور بلبلوں کا نغمہ سب ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوتے ہیں اور اس طرح ہنسا کہ کھلی ہوئی باچھیں پھر گھنٹوں تک اپنی اصلی جگہ واپس نہ آئیں۔"

اس کے بعد بڑی دیر تک رد و قدح ہوتی رہی کہ پطرس مفت لینے کو تیار نہ تھے اور مرزا مفت دینے کے خواہشمند تھے بالآخر طے ہوا کہ پطرس قیمت مرزا کی جیب میں ڈال دیں گے چنانچہ انہوں نے اپنے خزانے کا جائزہ لیا تو چالیس روپے نکلے جن میں سے چالیس روپے انہوں نے مرزا کی جیب میں ڈال دیئے اور مرزا چلتے بنے۔ صبح اٹھے تو معلوم ہوا کہ مرزا نے رات ہی کو سائیکل بھجوا دی تھی۔ اور ایک اوزار بھی ساتھ ہی بھجوا دیا تھا۔ یہ سائیکل کیسی تھی پطرس ہی سے سنئے: —

> "رفتہ رفتہ میں اس چیز کے قریب آیا جس کو میرا نوکر بائیسکل بتا رہا تھا اس کے مختلف پرزوں پر غور کیا تو اتنا ثابت ہو گیا کہ بائیسکل ہے لیکن مجموعی ہیئت سے یہ صاف ظاہر تھا کہ ہل اور رہٹ اور چرخہ اور اسی طرح کی اور جدید ایجادات سے پہلے کی بنی ہوئی ہے۔ پہیے کو گھما گھما کر وہ سوراخ تلاش کیا جہاں کسی زمانے میں تیل دیا جاتا تھا لیکن اب اس سوراخ میں سے آمد و رفت کا سلسلہ بند تھا۔"

اس آلۂ ناکارہ پر جسے مرزا نے سائیکل بتایا تھا اور پطرس بھی سائیکل ہی سمجھ رہے تھے پطرس سوار ہوئے اور تماشا بنے ہوئے گھومتے رہے بالآخر تنگ ہو کر ایک مستری کی دکان پہنچے تو اس نے درستی کی اجرت چالیس روپے مانگی مگر انہوں نے پوری مشین درست نہیں کرائی صرف ہینڈل اور سیٹ (گدی) اونچی کر کے کسا دی اور دو آنے پیسے دے کر جانے لگے تو مستری نے کہا۔

> "میں نے کس تو دیا ہے لیکن پیچ سب گھسے ہوئے ہیں ابھی تھوڑی دیر میں پھر ڈھیلے ہو جائیں گے۔"

اس پر پطرس نے فرمایا

"بدتمیز کہیں کا، تو دو آنے پیسے مفت میں سمجھے؟"

مستری بند لبوں میں ہنستا رہا پھر بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا

"جناب آپ کی بائیسکل بھی آسمان سے ملی ہوگی۔ یہ آپ نے ولایت [illegible] یہ وہی بائیسکل ہے جو پچھلے سال مرزا صاحب یہاں بیچنے کو لائے تھے بیچاری تم نے [illegible] بائیسکل [illegible]"

یہ سن کر پطرس بگڑ گئے

"وہ مرزا صاحب سے لڑکپن میں پرانی آیا جایا کرتے تھے [illegible] ان کو [illegible] بھی نہیں [illegible]۔"

مگر مستری نے ترشی سے جواب دیا

"ہاں وہ تو ٹھیک ہے لیکن مرزا صاحب خود جب کالج میں پڑھتے تھے تو ان کے پاس بھی تو یہی سائیکل تھی۔"

اس بات چیت سے اندازہ کیجئے کہ [illegible] نے گھوڑے کی [illegible] جو یہ کہا تھا کہ آدم اسی پر سوار ہو کر جنت سے نکل آئے تھے اسی طرح یہ بائیسکل بھی وہی تھی جو موجد نے پہلے پہل تخلیق کی تھی۔

اس طرح مستری سے چٹ کر پطرس نے اس مشین کو فروخت کر دینا ہی مناسب سمجھا چنانچہ ایک دکان دار کو دکھایا تو اس نے بڑی رد و قدح کے بعد تین روپے قیمت لگائی یہ سن کر پطرس کا خون کھول اٹھا اور انہوں نے غصہ سے کہا

"او صنعت و حرفت سے پیٹ پالنے والے نچلے طبقے کے انسان کے اپنی ترجیح کی پروا نہیں لیکن تو نے اپنی بیہودہ گفتاری سے اس بے جان چیز کو جو صدمہ پہنچایا ہے اس کے لیے تجھے قیامت تک معاف نہیں کر سکتا۔"

اسی غصے میں وہ اس بائیسکل پر سوار ہو گئے اور لگے اندھا دھند پاؤں چلانے مگر بمشکل بیس قدم گئے ہوں گے کہ ایک پہیہ ہی الگ ہو گیا اور حضرت گر گئے۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ سائیکل کا باقی ماندہ حصہ اور علیحدہ شدہ پہیہ ہاتھ میں لیے وہاں سے رفوچکر ہو جائیں چنانچہ ایسا ہی کیا مگر راستہ والوں کے فقرے، پھبتیاں، جب برداشت نہ ہو سکے تو یہ بوجھ اٹھائے ہوئے سیدھے دریا پر پہنچے اور پل پر کھڑے ہو کر یہ [illegible] غرق کر دیا اور پھر مرزا کے گھر پہنچ کر اس اوزار کو جو مرزا نے سائیکل کے ساتھ دیا تھا یہ کہہ کر نذر کر دیا کہ

"مرزا صاحب! آپ ہی اس اوزار کا شوق فرمایا کیجئے۔ میں اب اس سے بے نیاز ہو چکا ہوں۔"

پھر وہاں سے گھر آ کر علم کیمیا کی اس کتاب کا مطالعہ شروع کر دیا جو ایف اے میں پڑھی تھی۔ معلوم نہیں اس مطالعے سے بم بنانے کا نسخہ معلوم کرنا تھا یا خودکشی کے لئے زہر کا انتخاب مقصود تھا۔ بہرحال صرف اتنی سرگزشت سائیکل کی تھی۔

"میبل اور میں" یہ ایک افسانہ اور طنزیہ افسانہ ہے مرد عام طور پر نیک اور سادہ لوح واقع ہوا ہے وہ ہمیشہ عورت کو نیک اور معصوم سمجھتا ہے اور پھر اگر تعلیم یافتہ مرد ہو اور عورت یورپ کی ہو تو اس کی نیک نیتی اور سادہ لوحی اور بڑھ جاتی ہے چنانچہ ایسا ہی معاملہ میبل سے ہوا ہے عورت ہمیشہ مرد کو دھوکہ دیتی ہے اور شرماتی نہیں مگر مرد کسی عورت کو کبھی دھوکا دیتا ہے تو مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتا ہے چنانچہ یہی اس افسانے کا ماحصل ہے شکر ہے کہ یہ عقیدہ پطرس پر میبل کی وجہ سے عنفوان شباب ہی میں حل ہو گیا جس کی وجہ سے وہ آئندہ زندگی میں خصوصاً آخری زندگی میں محفوظ اور مطمئن رہ سکے ورنہ بڑے پریشان ہوتے۔

بس یہ کائنات ہے پطرس کے مضامین کی۔ اتنے ہی مضامین ان کے مجموعہ میں ہیں۔ ان مضامین کے علاوہ ان کی طالب علمی کے زمانے کے چند اور مضامین بھی ہیں جو راوی میں شائع ہوتے رہے۔ پطرس نے گالزوردی، شا اور ایمی ونس کے ترجمے بھی کئے ہیں مگر افسوس کہ وہ اس وقت میرے پیش نظر نہیں ہیں۔

پطرس نے اس ساٹھ سالہ مدت میں بہت کم لکھا ہے۔ ان کی نگارش کی ابتدا تقریباً بیس سال عمر سے ہوتی ہے۔ اس طرح وہ چالیس سال لکھتے رہے مگر اس چالیس سالہ قلم کاری اگر یکجا کی جائے تو بمشکل نقوش کے تین سو صفحات پر محیط ہو سکے گی۔ مگر یہ کمی ادب کے نشاط پیمانوں کی تنگی سے متاثر نہیں ہوتی ادب میں اصل چیز ندرت اور نفاست ہے بہتات نہیں ورنہ بعض کم سوادوں نے آٹھ دس سال میں ہزاروں صفحات سیاہ کر دیئے ہیں مگر ان کی نگارش میں کوئی بات نہیں۔ پطرس نے انگریزی ادب کی روح کو ہندوستانی مزاج دے کر اپنی نگارش میں ایک خاص لطف، نکھار اور گھرکھاؤ پیدا کر لیا تھا جو اپنی وضع کی ایک ہی چیز ہے۔

پطرس کی موت نے علم و ادب کو بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ اس کی تلافی کی ایک ہی صورت ہے کہ ان کا پورا کلام اکٹھا کر کے شائع کیا جائے اور لوگ ان کی پیروی کی کوشش کریں۔ کاش طفیل صاحب اس پطرس نمبر میں پطرس کا پورا کلام شریک کر دیں۔ یہ بہترین خراج عقیدت ہوگا پطرس کی روح کو۔

افسوس ہے کہ طفیل صاحب نے مجھ سے ایسے وقت میں مضمون کی خواہش کی ہے جبکہ میں دمہ اور خفقان کے دورے جھیل رہا ہوں۔ اس پر ان کا تقاضا بھی ہوتا رہا ہے۔ مجبوراً اس مضمون کو میں نے بڑے ہی ناساعد حالات میں ختم کیا ہے۔ اگر پطرس کا حق مجھ پر نہ ہوتا تو یقیناً یہ نہ لکھ سکتا مگر مرحوم کا حق مجھ پر ہے اس لئے میرا فرض ہے کہ انہیں خراج عقیدت ادا کروں۔ رہا مضمون کی ناہمواری اور بے ترتیبی اس کے لئے مجبور ہوں کیوں کہ علالت کی وجہ سے دل قابو میں ہے نہ دماغ نہ قلم۔

پطرس کی تحریف نگاری

وزیر آغا

پطرس کی تحریف نگاری کے بارے میں کچھ کہنے سے قبل تحریف یا پیروڈی کے مزاج کے سلسلے میں بعض باتوں کا اعادہ ضروری ہے۔ پیروڈی یا تحریف کسی تصنیف یا کلام کی ایک ایسی نقل یا نقالی کا نام ہے جس سے اس تصنیف یا کلام کی تضحیک ہو سکے۔ تحریف کا بنیادی اور امتیازی عنصر نقل ہے لیکن نقل بذاتہ کوئی مضحک پہلو پیدا نہیں کرتی۔ مثلاً فیشن ایک خاص انداز یا طرز کی نقل ہی تو ہے لیکن یہ سراسر سنجیدگی سے متصف ہے۔ اور ہنسی کو تحریک نہیں دیتا۔ اسی طرح بچے غیر ارادی طور پر اپنے بڑوں کے اعمال کی نقل کرتے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی سعی کرتے ہیں۔ اور دراصل یہ نقل فطرت کا وہ طریق کار ہے جو تجربے کے عمل کو کشید کرکے تہذیبی ارتقاء کی راہ میں انسان کو سرگرم عمل کرتا اور اسے جدید تر سے بہتر تہذیبی مراحل سے آشنا کرتا ہے لیکن جب یہی نقل اس مقصد کے ساتھ معرض وجود میں آئے کہ اصل کی تضحیک کے سامان بہم پہنچ سکیں تو تحریف یا پیروڈی کی صف میں شمار ہوتی ہے۔ چنانچہ تحریف کا امتیازی وصف یہ ہے کہ تحریف عمل، اشیاء یا تخلیقات کی "عظمت" اور زندگی کے غیر اہم مظاہر سے اس کی "عظمت" کے سحر کا پردہ چاک کرتی اور ناظر کو کھلکھلا کے ہنسنے پر آمادہ کرتی ہے۔ دراصل تحریف کی کامیابی کا راز بھی اس بات میں ہے کہ یہ عقیدت، جذباتی وارفتگی اور اندھا دھند تقلید کے عمل اور اس عمل کی بیزار کن یکسانیت کا ناظر کو احساس دلاسکے اور اسے "قامت" کے حصار سے لمحہ بھر کے لئے رہائی دلانے میں کامیاب ہو سکے۔ چنانچہ جتنی جذباتی کوئی کیفیت ہوگی اور جتنے انہماک، خود سپردگی اور والہانہ پن کا یہ مظاہرہ کرے گی، اتنا ہی تحریف کی زد میں بھی آجائے گی۔ شاید اسی لئے کامیاب ترین تحریف ہمیشہ وہی ہوتی ہے جو مقبول عام نظریات کی جذباتی قبولیت کو ختم کرنے کا اہتمام کرتی۔ اور ایک خاص ڈگر پر چلتی ہوئی زندگی کا رخ موڑ دیتی ہے چنانچہ قابل تحریف تخلیقات یا نظریات کے لئے پہلے زبان زد خاص و عام ہونا ضروری ہے ورنہ تحریف کا وہ تیکھا نقطہ ابھر کر سامنے نہیں آسکے گا جو بلند آہنگی کے ساتھ ٹکرا کر ایک مضحکہ خیز صورت حال کو جنم دیتا اور جذباتی ابال میں شگاف پیدا کرکے زندگی کو اپنی نارمل سطح حاصل کرنے میں مدد بہم پہنچاتا ہے۔

تحریف کا مقصد کیا ہے؟ — مقصد کے تعین کے سلسلے میں تمام اہل نظر متفق نہیں ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ تحریف کا مقصد بجز تفریح اور کچھ نہیں ہونا چاہیئے۔ یعنی سنجیدگی، کام کاج، جذباتی انہماک اور خود سپردگی کے ایک طویل وقفے کے بعد اعصاب اور کیفیات کی درشتی کو کم کرکے تفریح مہیا کرنا ہی تحریف کا سب سے بڑا مقصد ہے لیکن بعض اہل نظر اس سے متفق نہیں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ تحریف ایک سنجیدہ مقصد لے کر برآمد ہوتی ہے۔ اس کے پیش نظر معاصر ادیبوں کی بے اعتدالیوں کو روکنا اور ان کی اصلاح کرنا ہی اہم ترین مقصد ہے۔ اصل بات ان دونوں نظریوں کے بین بین ہے یعنی تحریف کا مقصد نہ صرف تفریح بہم پہنچانا ہے۔ اور نہ اس کے پیش نظر محض اصلاح کا نظریہ ہوتا

چاہیے۔ چنانچہ تحریف ایک ایسا حربہ ہے جسے مزاح نگار بھی استعمال کرتا ہے اور طنز نگار بھی۔ مزاح نگار اس سے آسودگی [illegible] کے حصول میں مدد لیتا ہے، طنز نگار اس کا سہارا لے کر ساتھ ہی ناہمواریوں کو ہدفِ طنز بناتا ہے۔ چنانچہ تحریف کے ضمن میں اصل بات کسی مقصد کا تعین نہیں بلکہ یہ ہے کہ تحریف نگار اصل کی ایسی لفظی نقالی کا نمونہ پیش کرے کہ اصل کی تضحیک ہو سکے۔ تضحیک کے بنیادی عناصر ہیئت تک بھی محدود ہو سکتے ہیں۔ اور بعض اوقات موضوع تک بھی پہنچ سکتے ہیں۔ اور یہ چیز موضوع اور ماحول کے تابع ہے۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ تحریف کا تخلیقی عنصر اس کی اپنی ہیئت ہے۔ جتنی کامیاب اس کی ہیئت ہوگی اور جتنی کامیابی سے یہ اصل اور نقل میں ہم آہنگی اور تضاد کو نمایاں کر سکے گی۔ اتنا ہی یہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوگی چاہے یہ مقصد محض آسودگی کی تحصیل ہو یا طنز یا انتشار کی تسکین۔

پطرس کے اس تحریف کے یہ دونوں رُخ ملتے ہیں یعنی ان کی ایک تحریف نے تو آسودگی کے احساس کو جنم دیا ہے اور دوسری نے بعض ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کو ہدفِ طنز بنایا ہے۔ ہیئت کے لحاظ سے بھی ان دونوں تحریفوں میں ایک نمایاں فرق ہے۔ ایک تحریف قطعاً لفظی ہے اور اس میں بعض الفاظ کی معمولی تبدیلی سے اصل کا حلیہ اس طور بگاڑ دیا جاتا ہے کہ اصل سے ناظر کا جذباتی تعلق بڑی حد تک ختم ہو جاتا ہے اور ہنسی کو تحریک مل جاتی ہے۔ دوسری تحریف لفظی نہیں بلکہ صرف ایک مخصوص طریق کار اور ایک خاص اندازِ نظر کی نقل تک محدود ہے۔ ان دونوں میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ پہلی تحریف براہِ راست اصل سے متعلق ہے لیکن دوسری نے اصل کا سہارا لے کر ایک بالکل مختلف میدان میں اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ پہلی تحریف "اردو کی پہلی کتاب" پر پطرس کی مشہور پیروڈی ہے۔ اور دوسری میں انہوں نے جغرافیہ لکھنے کے عام انداز کا تو ایک خاص حد تک لیکن بعض سماجی بے اعتدالیوں کا ایک بڑی حد تک مذاق اڑایا ہے۔ تاہم ان دونوں تحریفوں میں تحریف کے بعض بنیادی عناصر کا اس درجہ ملحوظ رکھا گیا ہے کہ ہم ان کو اردو زبان کی بہترین تحریفات میں شمار کرنے پر مجبور ہیں۔ پطرس کی پہلی تحریف "اردو کی آخری کتاب" سے یہ چند نمونے دیکھیے:

> "دیکھنا بیوی آپ بیٹھی پکا رہی ہے ورنہ دراصل یہ کام میاں کا ہے۔ ہر چیز کیا قرینے سے رکھی ہے۔ دھلے دھلائے برتن صندوق پر چنے ہیں تاکہ صندوق نہ کھل سکے۔ ایک طرف نیچے اوپر مٹی کے برتن دھرے ہیں کسی میں دال ہے کسی میں آٹا اور کسی میں چوہے۔ پھکنی اور پانی کا لوٹا پاس ہے تاکہ جب چاہے آگ جلائے جب چاہے پانی ڈال کر بجھا دے۔ آٹا گندھا رکھا ہے چاول پک چکے ہیں۔ نیچے اتار کر رکھے ہیں۔ دال چولھے پر چڑھی ہے غرضیکہ سب کام ہو چکا ہے لیکن بیوی پھر بھی پاس بیٹھی ہے۔ میاں جب آتا ہے کھانا لا کر سامنے رکھتی ہے۔ پیچھے بھی نہیں رکھتی۔ کھا چکتا ہے تو کھانا اٹھا لیتی ہے۔ ہر روز یوں نہ کرے تو میاں کے سامنے ہزاروں رکابیوں کا ڈھیر لگ جائے۔"

کھانا خود بخود پک رہا ہے ——————

> "بڑی محنت کرتا ہے شام کو بھٹی چڑھاتا ہے دن بھر بے کار بیٹھا رہتا ہے۔ کبھی کبھی بیل پر لادی لاتا ہے اور گھاٹ کا رستہ لیتا ہے کبھی نالے پر دھوتا ہے کبھی دریا پر تاکہ کپڑوں والے کبھی پکڑ نہ جا سکیں۔ جاڑا ہو تو سردی ستاتی ہے۔ گرمی ہو تو دھوپ جلاتی ہے صرف بہار کے موسم میں کام کرتا ہے۔۔۔۔۔

[illegible] صاحب [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

——— .... [illegible]

تحریف سے [illegible] کتاب سے [illegible] میں یہ بات [illegible] تحریف میں [illegible] کی تحقیقات [illegible] ایک ایسی تحریف [illegible] [illegible] پیدا [illegible] تک [illegible] ۔ تحریف کی [illegible] احساس ہو [illegible] تحریف [illegible] کامیابی [illegible]

پطرس کی اس تحریف کی ایک خاص خوبی یہ بھی ہے کہ اس نے محض [illegible] سنجیدہ مقصد نہیں اور نہ [illegible] سے [illegible] حاصل کرتا ہے اس کی ساری کامیابی اس آسودگی کے احساس میں ہے جو اسے پڑھتے [illegible] پیدا ہوتا ہے۔ [illegible] میں بھی ایک بچت (ECONOMY) پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ تصویر کا [illegible] کے ملنے پر پطرس نے ایک ایسا [illegible] انداز اختیار کیا ہے کہ [illegible] اصل سے نفرت کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا [illegible] اصل سے محظوظ ہونے لگتا ہے

پطرس کی دوسری تحریف کا عنوان ہے — "لاہور کا جغرافیہ"۔ اس تحریف سے یہ چند نمونے قابلِ غور ہیں۔

تمہید — تمہید کے طور پر صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ لاہور کو دریافت ہوئے اب بہت عرصہ گزر چکا ہے، اس لئے دلائل و براہین سے اس کے وجود کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔

محلِ وقوع: لاہور پنجاب میں واقع ہے لیکن پنجاب اب پنج آب نہیں رہا۔ اس پانچ دریاؤں کی سرزمین میں اب صرف ساڑھے چار دریا بہتے ہیں اور جو نصف دریا ہے وہ اب بہنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ اس کو اصطلاح میں "راوی ضعیف" کہتے ہیں۔ ملنے کا پتہ یہ ہے کہ شہر کے قریب دو پل بنے ہیں ان کے نیچے ریت میں یہ دریا لیٹا رہتا ہے۔ بہنے کا شغل عرصے سے بند ہے۔

لاہور تک پہنچنے کے کئی رستے ہیں، وسط ایشیا کے حملہ آور پشاور کے رستے اور یوپی

کے علاوہ دہلی کے رہنے والے ہوتے ہیں۔ اول الذکر اہلِ سیف کہلاتے ہیں اور خونریزی اور فوری تخلص کرتے ہیں۔ موخر الذکر اہلِ زبان کہلاتے ہیں یہ بھی تخلص کرتے ہیں اور اس میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔

آب و ہوا: لاہور کی آب و ہوا کے متعلق طرح طرح کی روایات مشہور ہیں جو تقریباً سب کی سب غلط ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لاہور کے باشندوں نے حال ہی میں یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ اور شہروں کی طرح ہمیں بھی آب و ہوا دی جائے ـــ لیکن بدقسمتی سے کمیٹی کے پاس ہوا کی قلت تھی۔ اس لئے لوگوں کو ہدایت کی گئی کہ مفادِ عامہ کے پیشِ نظر اہلِ شہر ہوا کا بے جا استعمال نہ کریں بلکہ جہاں تک ہو سکے کفایت شعاری سے کام لیں۔ چنانچہ اب لاہور میں عام ضروریات کے لئے ہوا کی بجائے گرد اور خاص خاص حالات میں دھواں استعمال کیا جاتا ہے۔ کمیٹی نے جا بجا دھوئیں اور گرد کے مہیا کرنے کے لئے مرکز کھول دیئے ہیں۔

صنعت و حرفت: اشتہاروں کے علاوہ لاہور کی سب سے بڑی صنعت رسالہ بازی اور سب سے بڑی حرفت انجمن سازی ہے۔

پیداوار: لاہور کی سب سے مشہور پیداوار یونیورسٹی کے طلبا ہیں جو بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اور ہزاروں کی تعداد میں دساور کو بھیجے جاتے ہیں۔ فصل شروع سرما میں بوئی جاتی ہے اور عموماً اواخر بہار میں پک کر تیار ہو جاتی ہے۔

طبعی حالات: لاہور کے لوگ بڑے خوش طبع ہیں۔"

پطرس کی مندرجہ بالا تحریف کے دو پہلو قابلِ ذکر ہیں۔ پہلا تو یہ کہ یہ تحریف لفظی نہیں بلکہ ایک خاص اندازِ تحریر کی نقل پیش کرتی ہے جغرافیہ لکھنے کا ایک خاص انداز اب اس قدر رائج ہے کہ اس انداز کی سنگلاخی کیفیت میں لچک کی اس قدر کمی ہے کہ تحریف نگار کی تگ و تاز کے لئے ایک وسیع میدان عالمِ وجود میں آ گیا ہے چنانچہ پطرس نے اپنی اس پیروڈی میں جغرافیہ کی کسی خاص کتاب کو نہیں بلکہ جغرافیہ لکھنے کے عام انداز کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ تاہم اگرچہ یہ تحریف نقل تو جغرافیہ لکھنے کے عام انداز کی پیش کرتی ہے۔ اس کا روئے سخن ایک بالکل مختلف صورتِ حال کی طرف ہے۔ اور یہ اس تحریف کا دوسرا قابلِ ذکر پہلو ہے۔ پطرس نے اپنی اس پیروڈی میں آب و ہوا، پیداوار، صنعت و حرفت، طبعی حالات اور بعض دوسرے عنوانات کے تحت لاہور کا جغرافیہ بیان کرنے کی سعی کی ہے لیکن ان عنوانات کے تحت غیر متعلق باتوں کا ذکر کر کے نہ صرف جغرافیائی معلومات کے بارے میں ناظر کی توقعات کو مسخ کیا ہے بلکہ لاہور اور اہلِ لاہور کی بعض ناہمواریوں کو بھی ہدفِ طنز بنایا ہے لیکن شاید اس لئے کہ پطرس بنیادی طور پر ایک مزاح نگار ہیں ان کی اس تحریف میں طنز کی نشتریت بہت کم پیدا ہوئی ہے اور ہمدردانہ اندازِ نظر اور محظوظ ہونے کے رجحان نے اندازِ نظر کی تلخی کو قطعاً ابھرنے نہیں دیا ہے۔ اس کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ حملہ آوروں کے تذکرے میں پطرس نے ازراہِ مذاق یو پی کے حملہ آوروں کا ذکر کیا ہے لیکن بات کو اس سے آگے نہیں بڑھایا کہ یہ لوگ اہلِ زبان ہیں اور تخلص کرتے ہیں اور اقلیمِ سخن کی وسعت کے لئے قریبی علاقہ

پیدا بھی کرتے ہیں۔ اتنی سی بات نے کسی قدر اور بھی اثر پیدا نہیں کر دی اور وہ [illegible] جا بجا ملتے ہیں [illegible] لیکن جب کنہیا لال کپور نے اسی طرز کے ایک مضمون اہلِ زبان کے بارے میں لکھ ڈالا اور اس مضمون میں تیز تیز نشتر بھی استعمال کئے تو صرف ایک مکمل طنزیہ صورت حال معرضِ وجود میں آئی بلکہ بعض مقامات پیمانہ اعتدال کی حد سے بھی گزر گئے۔ [illegible] ترشی تیز تھی اور انداز [illegible] شروع ہو گیا چنانچہ ناگوار طور سے دیکھئے تو محسوس ہوگا کہ اگرچہ اپنی اس تحریف میں پطرس نے طنز کا استعمال بھی کیا ہے تاہم ان کا اخلاقی رکھ رکھاؤ اور [illegible] خوش مزاجی کا رجحان پورے مضمون پر غالب ہے اور جذبہ انتقام کو تحریک دینے کی بجائے نفسی انبساط کا سامان مہیا کرتا ہے۔

خاتمے سے قبل اس بات کا اظہار مقصود ہے کہ اردو نثر میں تحریف نگاری کے سلسلے میں پطرس کو ایک مقامِ امتیاز حاصل ہے۔ پطرس نے کہ پطرس نے غالباً سب سے پہلے نثر میں پیروڈی کے اعلیٰ نمونے پیش کئے۔ پطرس سے قبل اردو شاعری میں پیروڈی کے نمونے ملتے ہیں اور اس ضمن میں رتن ناتھ سرشار، اکبر الہ آبادی اور اودھ پنچ کے بہت سے معاونین کے نام پیش کئے جا سکتے ہیں لیکن نثر میں پطرس سے قبل اول تو پیروڈی کا نمونہ ہی مشکل سے ملتا ہے اور اگر کہیں ایک آدھ چیز نظر بھی آتی ہے تو اس کی ادبی حیثیت کچھ زیادہ بلند نہیں چنانچہ بعض دوسرے اوصاف کے علاوہ پطرس کی تحریف نگاری کو تاریخی اعتبار سے بھی اہمیت حاصل ہے۔ اردو طنز و ظرافت کے طالب علم کے لئے اس بات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

پطرس کے مضامین

کا سرسری جائزہ

اثر لکھنوی

پطرس کے مضامین میں ظرافت عام عادت سے ہٹ کر ہے۔ اور اس کا آغاز مختصر دیباچے ہی سے ہوتا ہے ۔۔۔

> "اگر یہ کتاب آپ کو کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے اگر آپ نے کہیں سے چرائی ہے تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں اپنے پیسوں سے خریدی ہے تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے (یعنی آپ کی حماقت سے ہمدردی ہے) اب مصلحت یہی ہے (اگر آپ اپنی حماقت کو نہ مانیں) اور اسے حق بجانب ثابت کریں۔"

معلوم یہ حقیقت ہے یا یہ بھی تنک بھری ملیت کہ پطرس نے اظہار حقیقت کے تہ میں بھی ظرافت کی ایک لہر دوڑی ہوئی ہے کیوں کہ اپنے استاد کی خدمت میں، اعتراف ممنونیت ان الفاظ میں کیا ہے ۔۔۔

"اس کتاب پر نظر ثانی کی اور اسے بعض فقروں سے پاک کیا" جس کا مفہوم میرے نزدیک اس کے سوا نہیں ہو سکتا کہ جہاں کوئی بات ہوش مندی کی دیکھی اسے حماقت میں بدل دیا۔

کتاب میں گیارہ مضامین ہیں جو بظاہر ہوا خبطی پن کے شاہکار ہیں مگر فی الحقیقت سوسائٹی اور تمدن کی دکھتی رگوں کو چھوتے ہیں ۔۔۔ اور خامکاریوں اور سفیہانہ رواسم و توہمات کا پردہ فاش کیا ہے۔ پطرس نے اپنا مطلب زیادہ تر مزاح میں طنز کی چٹ دے کر نکالا ہے۔ بخلاف دیگر ظرافت نگاروں کے جو تمسخر کو آلۂ کار بناتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مضامین میں باوجود اس احساس کے کہ ہم کو (اور معاف کیجئے گا آپ کو) بے دال کا بودم بنایا جا رہا ہے جھنجھلاہٹ کے بجائے گدگدانے کی دلکشی ہے اور اسی کے ساتھ غور و فکر کی دعوت ہوتی ہے۔

ان مضامین کے کاتب کو بھی ظرافت سے کافی بہرہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ علاوہ دیگر مخترعات کے "ہاسٹل میں پڑھنا" کے عنوان کو ہر جگہ "ہاسٹل میں پڑنا" بنا دیا ہے۔

مضمون میں ظرافت کی چاشنی پہلے ہی فقرے سے شروع ہو جاتی ہے ۔۔

"ہم نے کالج میں تعلیم تو ضرور پائی اور رفتہ رفتہ بی اے بھی پاس کر لیا۔" "رفتہ رفتہ" اور "بھی" کی معنویت دعوت فکر دیتی ہے۔ آگے چل کر بی اے کے فلنے اس خوبی سے گنوائے ہیں کہ باید و شاید۔

مضمون میں ایسے خاندان کی ذہنیت کا خاکہ ہے جو مہذب اور اخلاق پسندیدہ کا مالک ہونے کے باوصف قدامت پسند ہے اور حال کو

ماضی کے تجزیے میں شبہ نظروں سے دیکھنے والے کے لئے اس اتفاق میں [illegible] ہے کہ جب [illegible] ہیں۔ مثالی تقسیم کی جا رہی ہے۔ [illegible] سے [illegible] وقت کے [illegible] سے عداوت کھینچنے کی معقول ترین وجہ یہ ہے کہ اردو زبان سے کسی کا دامن ابھی تک داغدار نہ ہوا تھا؟

[illegible] کی بات کے لئے کہ لاہور میں یا گورنمنٹ کے جلسے ایک ہی [illegible] جس سے رشتہ [illegible] کی نوعیت معلوم ہو سکے [illegible] وہ لوگ [illegible] طہارت کا ایک کعبہ اور [illegible] حقیقت [illegible] حسن عبادت کے [illegible] کو ڈھونڈنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا اور اس تنازع میں شکلیں [illegible] سے [illegible] ہے۔ پطرس کے الفاظ میں :—

> جس نے فصیل شہر کا [illegible]
> سوچا [illegible] سے بھی
> [illegible] کہ ہمارے [illegible] اور دنیاوی [illegible]
> [illegible] ہوگا اور نظم کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔ جیسا کہ [illegible] ہے؟

معاذاللہ [illegible] کی شرح ہے [illegible] میں پیچ در پیچ [illegible] مصلحتوں [illegible] صاف گوئی [illegible] کالج [illegible] اختیار کرنا نفس فلسفے میں چھپ چھپ کر گزرتے ہیں۔ [illegible] اصل مقصد ہے:

پطرس نے مسئلے کے اس پہلو کی ظریفانہ انداز میں اس حسن و خوبی سے وضاحت کی ہے کہ جیسے [illegible] ہے۔ تفصیل میں جانا مضمون کی لذت کو فنا کر دینا ہے۔ پڑھیے اور لطف اندوز ہوجیے۔

کتاب کا مقصد بھی نابود ہو جائے گا اگر اس کے مضامین کی چیر پھاڑ کی گئی۔ کتاب، انگریزی کے اس مقولے کی بہترین ترجمان ہے
(مذاق کے پردے میں بہت سی سنجیدہ باتیں کہہ دی جاتی ہیں۔) Many a serious thing is said
(in joke

نقشِ گم گشتگی

شدی تا باعثِ آرام جاں آرام جاں گم شد
حدیثِ نام تو تا بر زباں آمد زباں گم شد

مپرس از جستجو و نارسائی ہائے مجنونے
چو آوازِ جرس ہر سو دوید و ہر زباں گم شد

نشانِ سجدہ ام اہلِ نظر را آستاں باشد
کہ زیرِ سجدہ ہائے شوقِ من آں آستاں گم شد

مرا جز خامشی محرم نبود و وائے ناکامی
بہ اظہارِ سخن چوں لب کشودم رازداں گم شد

مگر آوارگی آرد سوئے منزل بخاری را
کہ از گمراہی خود ہم ز راہ گمرہاں گم شد

مخزن۔ نومبر، دسمبر ۱۹۲۱ء

غزل

ہم آں داغے کہ بر دل از تو دیدم حرزِ جانم شد
ہم آں چشمے کہ نامندش سخنگو رازدارم شد

دلے بود و در آغوشم نگنجید و جہانم شد
خیالے داشتم از سر گذشت و داستانم شد

بپرس اے داورِ محشر چہ مے پرسی چہ می پرسی
نگاہ حسرت آلایم کہ مے بینی بیانم شد

نگہ دزدیدہ افگندی بدل چوں ماز جاں دارم
نظر کردی بہ بیباکی و فصلِ داستانم شد

دگر قدحِ جنوں در دہ کہ ہم در منزلِ اوّل
خیالِ وحشتم واماند و گردِ کاروانم شد

ہزار داستان، ستمبر ۱۹۲۲ء

فرمودۂ پطرس

اے حسن تو زیاد و تماشا کنم ترا
عمرم دراز بادِ تمنا کنم ترا
برہم نظر مکن من ناکردہ کار را
گر ابتدائے بوسۂ بے جا کنم ترا

بہ تبسم چہ تسلی بہ نگاہے چہ قرار
شکر آرزوئے از لبم انگیختہ
بر سرِ خاکِ من تشنہ لبے ریختہ باد
قطرۂ مے کہ تو از لغزشِ پا ریختہ

(کاروان)

دوراہہ

یہ میں نے کہہ تو دیا تجھ سے عشق ہے مجھ کو
ترا ہی در میری آوارگی کا محور ہے
تجھی سے رات کی مستی تجھی سے دن کا خمار
تجھی سے میری رگ و پے میں زہر احمر ہے
تجھی کو میں نے دیا اختیار گریے پر
یہ چشم خشک اگر ہے۔ یہ چشم اگر تر ہے
ترا ہی جسم چمن ہے ترا ہی جسم بہار
تری ہی زلف سے سر آرزو معطر ہے
ترا ہی حسن ہے فطرت کا آخری شاہکار
کہ جو ادا ہے وہ تیری ادا سے کمتر ہے

یہ میں نے کہہ تو دیا تجھ سے عشق ہے لیکن
مرے بیان میں اک لغزش خفی بھی ہے
تو میرے دعوئے الفت کی آن پہ مت جا
کہ اس میں ایک ندامت دبی دبی بھی ہے
وفا طلب ہے ترا عشق اور مرے دل میں
تری لگن کے سوا اور بے کلی بھی ہے
تجھی سے دل کا تلاطم ہے اور نگہ کا قرار
اسی قرار و تلاطم سے زندگی بھی ہے
مگر ہیں اور بھی طوفان اس زمانے میں
کہ جن میں عشق کی ناؤ شکستنی بھی ہے
مری نگاہ کے ایسے بھی ہوں گے چند انداز
کہ تو کہے کہ یہ محرم ہے اجنبی بھی ہے
شب وصال کے اس مخملیں اندھیرے میں
مری تلاش میں فردا کی روشنی بھی ہے
مجھے تو آکے ملی وقت کے دوراہے پہ
کہ صبح زیست بھی ہے۔ موت کی گھڑی بھی ہے

میکدے میں

جو تو کہے تو کسی میکدے میں چل بیٹھیں
جو دل کی بات ہے دل میں وہ دل کی بات کریں

میں خم کے سائے میں سرگوشیاں کروں ایسی
کہ تیرے لب مری ہر بات کو نبات کریں

جو بے ثبات ہے دنیا تو بے ثبات سہی
فریبِ مے سے اسے اور بے ثبات کریں

اگر ستارۂ کسریٰ پہ دن نکل آئے
تو چشم وا نہ کریں اور دن کو رات کریں

(سویرا) ۔

دو شعر

اُڑ گیا اپنے یہاں سے ٹیلی فون
اب کہیں جا کر ملے گا اگلی جون

اس کے ہونے سے رہا کرتی تھی تیخ
یہ چمن یونہی رہے گا اور ـــ ایخ

یہ دو شعر پطرس نے شملہ سے (حکومت ہند کے دیگر دفاتر کے واپسی کلکتے کے ساتھ) رخصت ہوتے ہوئے کہے تھے۔ جون کے ہر دو معنی کی رعایت بھی خوب ہے لیکن ایخ کا قافیہ یوں اور کون لا سکتا ہے۔

دہلی کی سیر

ایک چھوٹا سا لڑکا الہ آباد کا
اپنے گھر سے چلا اور دلی گیا

واں جو پہنچا تو دیکھا
کہ اس جا کے لڑکے ہیں ویسے ہی ننھے
اور اس جا کے گنے ہیں ویسے ہی لمبے
اور اس جا کی برفی ہے ویسی ہی میٹھی
اور اس جا کی بلی ہے ویسی ہی موٹی
اور اس جا کی چڑیاں ہیں ویسی ہی چھوٹی
اور اس جا کے چالیس ہیں بیس اور بیس
اس نے یہ کچھ جو دیکھا
تو حیراں ہوا اور تکتا رہا
اور تکتا رہا اور حیراں ہوا

(پہل)

مارخائیم

آر۔ ایل۔ اسٹیونسن

(ترجمہ)

پطرس

دوکاندار بولا۔ حضرت ہماری کمائی کا کیا پوچھے ہو۔ طرح طرح کے ذریعے ہیں۔ کوئی جاہل گاہک آجاتا ہے تو میں اپنے علم و دانست سے فائدہ اٹھاتا ہوں۔ کوئی اُچکا آجائے (وہ یہ کہنے کے ساتھ ہی اس نے شمع کو اتنا اوپر اٹھایا کہ روشنی اچھی طرح اجنبی کے چہرے پر پڑنے لگی) تو اپنی نیکی اور دیانت سے فائدہ اٹھاتا ہوں۔

مارخائیم ابھی ابھی دکان میں داخل ہوا تھا۔ باہر کھلے بازاروں میں سورج کی روشنی اچھی خاصی تھی اور دکان کے اندر کی تاریکی سے جس میں چمکتی ہوئی چیزوں کی روشنی ملی تھی۔ آنکھیں ابھی مانوس نہ ہوئی تھیں۔ کچھ ان پُرمعنی الفاظ کو سن کر اور کچھ شمع کی لو کو اس قدر اپنے قریب پاکر اس انداز میں آنکھیں جھپکنے لگا جیسے درد ہو رہا ہو اور نگاہیں ایک طرف کو پھیر لیں۔

دکاندار ہنس دیا اور کہنے لگا۔ تم آج کرسمس کے دن میرے پاس آئے ہو۔ یہ جانتے ہوئے کہ میں اکیلا ہوں۔ نیز جو بڑھا رکھے ہیں اور کاروبار قطعی بند کر رکھا ہے۔ تو حضرت اس کی آپ کو قیمت ادا کرنی ہوگی۔ میں اس وقت اپنا حساب کتاب درست کر رہا تھا۔ میرے وقت کا جو حرج ہوا۔ اس کی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ اور پھر اس خاص رویے کی بھی قیمت ادا کرنی پڑے گی جو میں آج نمایاں طور پر آپ میں پاتا ہوں۔ رازداروں کا سردار ہوں۔ اور کبھی کسی سے آڑے ٹیڑھے سوال نہیں کرتا۔ لیکن جب کسی گاہک کا انداز اس قدر مجرمانہ ہو کہ مجھ سے نظریں چار نہ کر سکے تو پھر اسے اس کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ دکاندار دوبارہ ہنس دیا اور پھر حسب معمول اپنے کاروباری لہجے میں (جس میں پھر بھی کچھ کچھ طنز پایا جاتا تھا) کہنے لگا۔ تو تم سب سے پہلے اس بات کا اطمینان کرا دو گے کہ یہ چیز تمہارے قبضہ میں کہاں سے آئی؟ پھر وہی اپنے چچا کی الماری میں سے؟ حضرت یہ آپ کے چچا جان نے بھی دنیا جہان کے عجائبات جمع کر رکھے ہوں گے!

دکاندار کوتاہ قد، زرد رو، خمیدہ پشت، پنجوں کے بل کھڑا ہو گیا۔ عینک کے سنہری فریم کے اوپر سے نظریں ڈالنے لگا۔ اور سر کو یوں ہلانے لگا کہ صاف ظاہر ہوتا تھا۔ مارخائیم کو مشتبہ سمجھتا ہے۔ مارخائیم نے دکاندار کی آنکھ سے آنکھ ملائی تو نظر سے انتہا درجے کا رحم اور تھوڑی سی ہیبت ٹپک رہی تھی۔

بولا۔ اب کے تم غلطی پر ہو۔ میں بیچنے نہیں کچھ خریدنے آیا ہوں۔ میرے پاس اب کوئی عجائبات نہیں۔ جن کے دام وصول کروں۔ چچا کی الماری دیوار تک خالی ہو چکی ہے اور نہ ہوتی جب بھی میں سٹہ بازی میں اس قدر روپیہ کما چکا ہوں کہ اس الماری میں تخفیف

بجائے کچھ اضافہ ہی کر سکتا ہوں۔ آج جس کام کو آیا ہوں وہ تو بہت معمولی سا کام ہے۔ مجھے ایک خاتون کے لئے کرسمس کا تحفہ مطلوب ہے (اس تقریر کے دوران میں جو وہ پہلے ہی تیار کر کے لایا تھا۔ اُس کے لفظوں کی روانی بڑھتی چلی گئی) اور میں جانتا ہوں شادی کی بات کے سلسلے میں مستقبل کا بھلا ہیں۔ اس کے لئے مجھے ہر طرح کی معذرت کر لینی چاہیے۔ بات یہ ہے کہ میں اپنی غفلت کی وجہ سے کل یہ کام کرنا بھول گیا۔ آج ہی کھانے کے وقت مجھے اپنا یہ حقیر سا تحفہ پیش کرنا ہے۔ اور تم خود جانتے ہو جس شادی سے بہت سارا روپیہ ملنے کی امید ہو اُسے پکا کرنے میں غفلت نہیں کرنی چاہیئے

اس کے بعد کچھ دیر تک دونوں خاموش رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دکاندار اس دفعہ میں اجنبی کی بات کو تول رہا ہے۔ لیکن اُسے کچھ یقین نہیں آیا۔ اس خاموشی کے دوران میں دکان کے عجیب و غریب سامان میں جو بہت سی گھڑیاں پڑی تھیں اُن کے ٹک ٹک کرنے کی آواز اور ساتھ ہی بازار میں جو گاڑیاں چل رہی تھیں۔ اُن کے پہیوں کے مدھم شور کے علاوہ اور کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔

دکاندار بولا۔ اچھا حضرت یونہی سہی۔ آخر تم پرانے گاہک ہو اور اگر تمہیں ایک اچھی جگہ شادی کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ تو بھلا میں اس میں کیوں روڑا اٹکاؤں۔ یہ لو تمہیں عورتوں کے پسند کی چیز دیتے ہیں۔ یہ دستی آئینہ پندرھویں صدی کا جھوٹ ہو تو میرا ذمہ۔ اور یہ ملا بھی ایک ایسے گھر سے جہاں بڑے بڑے کمال کے عجائبات ہوتے تھے۔ مگر میں اُس شخص کا نام نہ بتاؤں گا۔ اپنے گاہک کی رازداری واجب ہے اور حضرت وہ بھی تمہاری ہی طرح ایک ایسے شخص کا بھتیجا اور واحد وارث تھا۔ جسے عجائبات جمع کرنے کا بے حد شوق تھا۔"

دکاندار کرخت اور تیز آواز میں باتیں کرتے کرتے جب آئینے کو اپنی جگہ سے اٹھانے کے لئے نیچے جھکا تو مارخائیم کے جسم میں بجلی کی ایک لہر سی گزر گئی۔ ہاتھ پاؤں یک لخت تھرا اُٹھے اور ہزارہا طوفانی جذبات دفعتہً لپک کر چہرے پر چھا گئے۔ یہ سب کچھ اچانک ہی ہوا۔ اور پھر تھوڑی ہی دیر میں مارخائیم سنبھل بھی گیا۔ اور ان جذبات کا کوئی اثر باقی نہ رہا۔ بجز اس کے کہ جب آئینہ ہاتھ میں لیا تو ہاتھ ذرا کانپ رہا تھا۔

دھیمی بھرّائی آواز میں بولا "آئینہ؟" کچھ دیر خاموش رہا۔ اور پھر صاف آواز میں دوبارہ بولا "آئینہ؟ کرسمس کے لئے؟ یہ بھلا کیونکر ہو سکتا ہے؟" دکاندار بولا "ہو کیوں نہیں سکتا؟ آئینے میں کیا حرج ہے؟"

مارخائیم اس کی طرف ایک ایسے انداز سے دیکھ رہا تھا جس کا بیان کرنا ناممکن ہے۔ بولا "تم مجھ سے پوچھتے ہو اس میں حرج کیا ہے؟ یہ دیکھو! اپنا چہرہ دیکھو! اتنہیں دیکھنا گوارا ہے؟ ہرگز نہیں! تمہیں۔ مجھے۔ کسی آدمی کو گوارا نہیں!"

مارخائیم نے جب یوں دفعتہً آئینہ اُس کے سامنے کر دیا۔ تو دکاندار یک لخت پیچھے کو ہٹ گیا تھا لیکن جب اُس نے دیکھا کہ کوئی خطرے کی بات نہیں تو ہنس دیا اور کہنے لگا "تو جناب آپ کی ہونے والی اہلیہ محترمہ بہت ہی کم رو ہوں گی۔"

مارخائیم بولا "میں نے تم سے کرسمس کے لئے تحفہ مانگا۔ اور تم مجھے یہ لا کر دے رہے ہو ——— یہ مکروہ ملعون چیز ——— جو ہر وقت بڑھاپے کی آمد اور گناہوں اور حماقتوں کی یاد دلاتی رہتی ہے ——— یہ دستی ضمیر! کیا تمہارا واقعی یہ مطلب تھا کہ میں یہ خرید لوں؟ تم نے کچھ سوچا بھی تھا؟ مجھے بتاؤ۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے۔ کہ تم مجھے بتا دو۔ لو آؤ مجھے اپنا حال سناؤ۔ میرا اندازہ ہے کہ تم پوشیدہ طور پر بہت ہی خیرات کرتے ہو؟"

دکاندار نے اُسے بہت غور سے دیکھا۔ عجیب بات ہے کہ مارخائیم ہنستا ہوا معلوم نہیں ہوتا۔ چہرے میں خواہش اور امید کی جھلک تو ضرور نظر آتی ہے۔ لیکن ہنسی کا نام و نشان تک نہیں۔

مارخائیم مغموم لہجے میں بولا "نیک نہیں۔ دیندار نہیں۔ ایماندار نہیں۔ نہ کسی سے محبت رکھتے ہو۔ نہ کسی کے محبوب ہو۔ ایک ہاتھ ہے جس سے روپیہ وصول کرتے ہو۔ ایک تجوری ہے کہ جس میں سنبھال رکھتے ہو۔ بس ساری بساط یہی ہے؟ خداوندا! بس یہی کچھ ہے۔"

دکاندار کچھ ڈانٹ کے بولا "میں تمہیں بتاتا ہوں" اور پھر ہنس دیا اور کہنے لگا "میں سمجھا۔ یہ تمہاری معاشقے کی شادی ہے اور تم اسی خاتون کی صحت کے جام پیتے رہے ہو؟"

مارخائیم کو ایک عجیب قسم کی دلچسپی سی ہو گئی۔ بولا "اچھا! تم بھی عشق کر چکے ہو؟ مجھے اس کا حال سناؤ۔"

دکاندار بولا "میں اور عشق! مجھے کبھی اس کی فرصت ہی نہیں ملی۔ اور نہ آج ہی مجھے اس کی فرصت ہے کہ میں اس بے معنی گفتگو میں اپنا وقت گنواؤں۔ آئینہ خریدتے ہو یا نہیں؟"

مارخائیم نے کہا۔ "اتنی جلدی کیا ہے؟ یہاں کھڑے باتیں کرتے جی بہل رہا ہے۔ اور زندگی اتنی مختصر اور ناپائیدار ہے کہ میں تو باتوں کے کسی لطف سے منہ موڑنے میں جلدی نہ کروں۔ خواہ وہ اس لطف کی طرح معمولی سا ہی کیوں نہ ہو۔ جو تھوڑا بہت نصیب ہو۔ اس کے ساتھ چمٹ جانا چاہئے۔ جیسے کوئی گرتا ہوا آدمی پہاڑ کی چٹان سے چمٹ جاتا ہے۔ غور سے دیکھو تو زندگی کا ہر لمحہ ایک چٹان ہے۔ میل بھر اونچی چٹان اتنی اونچی کہ وہاں سے چھوٹ کر گریں تو زمین سے ٹکرا کر انسانیت کا تمام حلیہ مسخ ہو جائے۔ اسی لئے مزے مزے کی باتیں کرتے رہنا ہی بہتر ہے۔ چلو تم مجھے اپنا حال سناؤ۔ میں تمہیں اپنا حال سناتا ہوں۔ حجاب ہم میں کیوں حائل رہے؟ آؤ رازداری کی باتیں کریں۔ کیا معلوم ہم ایک دوسرے کے دوست ہی بن جائیں؟"

دکاندار بولا "مجھے تم سے صرف ایک بات کہنی ہے۔ سودا خریدنا ہے تو خریدو ورنہ دکان سے باہر نکل جاؤ!"

مارخائیم نے کہا "سچ ہے سچ ہے۔ کافی دل لگی ہو چکی۔ اب کام کی بات کرنی چاہئے۔ اچھا کوئی اور چیز دکھاؤ؟"

آئینے کو پچھلے طاق پر رکھنے کے لئے دکاندار پیچھے جھکا تو اس کے تھوڑے سے سنہری رنگ کے بال اس کی آنکھوں پر آ گرے۔ مارخائیم ذرا اور بھی قریب کو سرک آیا۔ ایک ہاتھ اوورکوٹ کی جیب میں تھا۔ تن کے کھڑا ہو گیا اور ایک لمبا سانس کھینچ کر چھاتی پھیلائی۔ چہرے پر کئی مختلف جذبات ایک ساتھ جھلک رہے تھے۔ ڈر بھی تھا۔ ہیبت بھی تھی۔ کچھ تہیہ بھی کر چکا ہے سحر بھی ہے اور کچھ تنفر بھی۔ بالائی ہونٹ جیسے ناتوانی کے انداز میں اوپر کو اٹھا ہوا اور دانت جیسے باہر کو جھانک رہے تھے۔

دکاندار بولا "یہ شاید پسند آ جائے۔" یہ کہہ کر سر اوپر اٹھانے لگا کہ مارخائیم پیچھے سے اس پر جا پڑا۔ سیخ کی شکل کا ایک لمبا خنجر چمکا اور پھر نیچے کو اترا۔ دکاندار مرغ بسمل کی طرح تڑپا۔ کنپٹی طاق پر جا لگی اور وہ ڈھیر ہو کر فرش پر جا گرا۔

دکان میں وقت کی کئی چھوٹی چھوٹی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ بعض اپنی عمر کے شایان شان آہستہ آہستہ اور وقار کے ساتھ بول رہی تھیں۔ بعض جلدی جلدی گڑبڑا رہی تھیں۔ یہ سب ایک دوسرے کے ساتھ پیچ در پیچ مل ہوئی آوازیں ٹک ٹک کر کے ثانئے گن رہی تھیں۔ باہر سڑک کے فرش پر کوئی لڑکا کھٹ کھٹ دوڑتا ہوا گزرا جس کے پاؤں کی آہٹ نے ان چھوٹی چھوٹی آوازوں کے تسلسل کو برہم کر دیا۔ مارخائیم چونکا اور اُسے یک لخت اپنے گرد و پیش کا احساس ہوا۔ ہیبت خوردہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ شمع دکان کے تختے پر جل رہی تھی۔ اور شعلہ ہوا سے ہلکے ہلکے جھوم رہا تھا۔ شعلے کی اس خفیف حرکت سے ایک بے آواز سا ہنگامہ برپا تھا۔ اور کمرہ سمندر کی مانند لہریں مار رہا تھا۔ لمبے لمبے سائے اوپر نیچے ہو رہے تھے۔ تاریکی کے مہیب دھبے پھیلتے تھے سمٹ جاتے تھے جیسے ہانپ

ہے ہوں تصویروں کے چہرے ساکت چینی سے بت پانی کے عکس کی مانند لرزاں اور متغیر تھے۔ اور دروازہ ذرا کھلا تھا۔ اور اس میں سے روشنی کی ایک لکیر سایوں کی اس دنیا میں یوں جھانک رہی تھی۔ جیسے کوئی انگلی اشارہ کر رہی ہو۔

اس کی سہمی ہوئی نظریں ان چیزوں سے بھٹکنے کے بعد پھر اس پر آ کر رک گئیں۔ جو فرش پر کچھ بے ترتیبی کچھ چت پڑی تھیں۔ بہت ہی پھولی ہوئی زندگی میں جس قدر حقیر مفلسوں اور مسکینوں کا سا لباس اور پھر نہایت بدنما انداز معلوم ہوتا تھا لڑکی کے بڑے سے کا ڈھیر پڑا ہے۔ مارخائیر کا خیال تھا۔ میں اس کے دیکھنے سے ہیبت کے جاتے کا ذکر ہو وہ تو کچھ بھی نہ تھی لیکن پھر بھی اس نے دیکھتے دیکھتے اس پرانے کپڑوں کے ڈھیر اور اس خون کے دھبے کا اب میں عجیب معنی پیدا ہونے شروع ہو گئے تو یہ یہیں پڑا رہے گا۔ اب کوئی بھی ہو اس کے پرکار پرندوں سے یہ کام لے سکے۔ یہ حرکت کے اس معجزے کو پھر زندہ کر دکھائے۔ جب تک کسی کو اس کا علم نہ ہو۔ یہ یہیں پڑا رہے گا۔ اور جب کسی کو معلوم ہو جائے گا! ہاں تو پھر! تو پھر یہ مرگ ہر ایک سپاہی پائے گی جو انگلیاں پھر میں عرائے گی۔ اور تمام دنیا تعاقب کی گرجوں سے گونج اٹھے گی۔ مر کر بھی یہیں پڑا رہے گا۔ اس نے سوچا ایک وقت ایسا بھی تھا جب انسان کا بھیجا پاش پاش ہو جاتا تھا تو پہلے ہی الفاظ نے اسے چونکا دیا۔ وقت اب کر کام تمام ہو چکا۔ وقت جو مردہ شخص کے لئے ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ وہ قاتل کے لئے دفعتاً اہم بن گیا ہے۔ جو کچھ کرنا ہو ابھی اور اسی وقت . . . .

یہ خیال ابھی اس کے دل میں تھا کہ گھڑیوں نے یکے بعد دیگرے ہر رفتار اور ہر قسم کی آواز کے ساتھ۔ کوئی مینار کلیسا کے گھنٹے کی طرح گھمبیر کوئی باریک آواز میں دالان کے سدا الی سر ہلاتے ہوئے سر پھیر کے تین بجانے شروع کر دیئے۔

اس خموش دنیا میں یک لخت اتنی زبانوں کے بول اٹھنے سے مارخائیر لڑکھڑا گیا۔ اور اپنی جگہ سے حرکت کر کے شمع ہاتھ میں لئے آگے پیچھے پھرنے لگا۔ متحرک سائے اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ اتفاقیہ کہیں روشنی کا عکس دکھائی دے جاتا تو روح تک کانپ اٹھتی اسے اپنا چہرہ طرح طرح کے بھیس بدلے ۔۔۔ بعض ولایتی بعض دیسی یا امسٹرڈم کے بنے ہوئے آئینوں میں عکس در عکس دکھائی دیا۔ جیسے جاسوسوں کی فوج اسے دیکھ رہی ہو۔ اس کی نظریں اپنی ہی نظروں سے چار ہوئیں۔ اور اس کے جرم کو پا لیں۔ اس کے قدموں کی آہٹ گو اس کے قدم بہت ہی ہلکے ہلکے پڑ رہے تھے۔ ارد گرد کی خاموشی کو برہم کئے دیتی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ اپنی جیبیں بھرے چلا جاتا تھا دل ہی دل اس کے منصوبے کی بڑی بڑی خامیاں اسے بار بار سمجھائیں۔ یہاں تک کہ وہ اس کی تکرار سے تنگ آ گیا۔ تمہیں ہر کام کسی اور وقت کرنا تھا۔ جبکہ کسی کے مل جانے یا آ جانے کی بالکل ہی توقع نہ ہوتی۔ اس بات کا انتظام کر رکھنا تھا کہ ضرورت پڑے تو ثابت کیا جا سکے۔ میں اس وقت یہاں نہیں کسی اور مقام پر تھا۔ تمہیں بہت محتاط ہونا چاہئے تھا۔ دکاندار کی صرف مشکیں کس لیتے اور منہ بند کر دیتے۔ جان سے نہ مارتے۔ تمہیں اور بھی جرأت کر کے خدمتگار کا کام بھی تمام کر دینا چاہئے تھا۔ یہ سب کچھ کسی اور طرح کرنا تھا۔ طرح طرح کے افسوس اس کے دل کو مجروح کئے دیتے تھے۔ ذہن مسلسل اس تھکا دینے والی کشمکش میں مصروف تھا۔ کہ ان باتوں کو کس طرح بدل ڈالے۔ جن کا بدلنا اب ناممکن تھا۔ وہ تجویزیں سوچ رہا تھا۔ جن کا سوچنا اب بالکل بیکار تھا۔ گویا نہ مٹنے والے ماضی کو نئے سرے سے تعمیر کرنا چاہتا تھا۔ اس دوران میں اور اس تمام ذہنی مصروفیت کی تہہ میں قسم قسم کے حیوانی خوف اس کے دماغ کے نہاں خانوں میں کھیل مچا رہے تھے۔ جیسے کسی ویران اور تنگ و تاریک کوٹھڑی میں چوہے دوڑ رہے ہوں۔ سپاہی کا ہاتھ زور سے کندھے پر پڑے گا۔ تو تمام اعصاب یوں جھٹکا کھائیں گے۔ جیسے مچھلی کانٹے میں لگ کر جھٹکا کھاتی ہے۔ عدالت کا کٹہرہ اور قید خانہ اور پھانسی کا تختہ اور سیاہ رنگ کا تابوت۔ سب ایک قطار میں ایک دوسرے کے پیچھے سرپٹ بھاگتے ہوئے اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر گئے۔

رہگیروں کا خوف اس کے دل کے سامنے محاصرہ فوج کی طرح جم کے بیٹھ گیا۔ اس نے سوچا اس کشمکش کی کوئی نہ کوئی آواز ضرور ان کے

کانوں تک پہنچتی ہوگی۔ اور وہ [illegible] جانتے ہیں کہ [illegible] اب [illegible] طرح [illegible] بجھے ہوں گے۔ تنہا زندگی بسر کرنے والے لوگ جن کی فرصت [illegible] بیٹھے [illegible] ان کے شفقت آمیز خیالات ایک لحظہ [illegible] ہوں گے۔ جو اپنے گھروں میں اپنے اہل خانہ کے ساتھ بیٹھے [illegible] ایک لحظہ رک گئے ہوں گے [illegible] ماں اپنی [illegible] طبیعت [illegible] بیٹھے گھروں میں بیٹھے۔ گو بستر پر دراز ہوں گے گویا عاشق کا [illegible] کرتے ہوں گے [illegible] معلوم ہوتا [illegible] بیہودہ مذہب سے [illegible] لیے جاتا [illegible] ٹکڑا کر دیا جاتا تھا کہ سب ٹکڑا [illegible] سا تنگ [illegible] ہو جاتا موجب معلوم ہوتا تھا گویا [illegible] خاموشی [illegible] کر دیا اب کے بیچ میں منہ چھپا پڑا اور اداس صورت موت کی عبادت کے ساتھ اس طرح اکتا بیٹھا جیسے گویا [illegible] اسے کسی [illegible] نہ ہو۔

لیکن ان مختلف خطرات نے اس کا [illegible] حال کر دیا۔ اس کی روح کا ایک حصہ اب بھی جیتا اور ہوشیار تھا لیکن دوسرا حصہ دیوانگی کے کنارے پر کانپ رہا تھا خصوصاً ایک وہم نے تو اس کے دل پر بری طرح تسلط جما لیا [illegible] گویا [illegible] کے [illegible] سن رہا ہو یا کوئی راہرو جو چلتے چلتے کچھ شبہ کرے یک لخت گزر جانے اس طرح کے لوگ زیادہ [illegible] شک ہی کرتے ہیں۔ اصل بات تو علم الغیب ہی تو ہو نہیں سکتا۔ اینٹوں کی دیوار اور بند کھڑکیوں میں سے تو صرف آوازیں ہی باہر جا سکتی ہیں لیکن خود دکان کے اندر ــــ تو میں اکیلا ہوں وہ جانتا تھا کہ میں اکیلا ہوں۔ اس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ گھر کی خادمہ اپنے بہترین کپڑے [illegible] جیسے [illegible] کسی چاہنے والے سے ملنے باہر گئی ہے۔ اور اس کے لب [illegible] اور اس کے چہرے کی ہر مسکراہٹ سے [illegible] باہر گئی ہے ــــ تو پھر میں اکیلا ہی تو ہوں۔ لیکن پھر بھی اُسے یقین تھا کہ مکان کی بالائی منزل سے [illegible] خالی پڑی تھی۔ قدموں کی ہلکی ہلکی آہٹ سنائی دیتی ہے نہ معلوم کیوں۔ لیکن کسی ہستی کے موجود ہونے کا احساس بہت زبردست تھا جس کے تعاقب میں اس کا [illegible] مکان کے کونے کونے اور کونے کونے میں پھر گیا۔ کبھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس موہوم ہستی کا چہرہ ہی نہیں لیکن پھر بھی دیکھنے کو آنکھیں موجود ہیں۔ کبھی [illegible] پرچھائیں معلوم ہوتیں جو مرے ہوئے دکاندار کی شکل دکھائی دیتی۔ جسے مکاری اور نفرت کی روح نے پھر زندہ کر دیا ہو۔

بعض اوقات دل کڑا کر کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف دیکھتا تو نظر اس سے متنفر واپس آتی۔ مکان کی چھت اونچی تھی۔ روشندان چھوٹا سا اور میلا تھا۔ موسم کا یہ حال تھا کہ کہر کی وجہ سے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جو روشنی چھن چھن کر نچلی منزل تک پہنچتی وہ بہت ہی کم تھی۔ اور دکان کی دہلیز پر مدھم سی دکھائی دیتی تھی۔ لیکن پھر بھی اُسے یہ شبہ ہوتا تھا کہ اس خفیف سی روشنی کے گوشے میں کوئی سایہ معلق لرزاں ہے۔

دفعتہً باہر بازار سے کسی خوش طبع آدمی نے اپنی چھڑی کے ساتھ دکان کے دروازے کو کھٹکھٹانا شروع کیا۔ ساتھ ہی کچھ بولتا جاتا تھا۔ اور بلند آواز سے ہنس ہنس کر کئی ایسی مذاق کی باتیں کرتا جاتا تھا جن میں کئی دفعہ اس نے دکاندار کا نام لے کر بھی پکارا۔ مارخائم کا خون جم گیا۔ اور اس نے نعش کی طرف دیکھا لیکن نہیں۔ وہ بالکل بے حس و حرکت پڑا تھا۔ وہ اب وہاں پہنچ چکا ہے۔ جہاں آوازوں کی رسائی نہیں۔ وہ سکوت کے سمندر میں ڈوب چکا ہے۔ اور اس کا نام جسے کبھی وہ طوفان کے شور میں بھی سن لیتا۔ اب ایک بے معنی سی آواز ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس خوش طبع آدمی نے دروازہ کھٹکھٹانا بند کر دیا۔ اور وہاں سے چل دیا۔

یہ گویا اس بات کا اشارہ تھا کہ جو کچھ کرنا باقی ہے بہت جلد کرنا چاہیے۔ اس مخدوش علاقہ سے باہر نکل کر فوراً شہر کے گنجان ہجوم کے تلاطم میں گم ہو جانا چاہیے اور دن ڈھل چکنے پر امن اور بظاہر معصومیت کی جائے پناہ یعنی اپنے بستر پر پہنچ جانا چاہیے۔ ابھی ایک ملنے والا آیا تھا۔ ابھی کوئی دوسرا آ جائے اور وہ شاید اس آسانی سے نہ ٹلے۔ ارتکاب جرم کے بعد جو کچھ وصول ہونا تھا اُس سے محروم رہ جانا یہ تو ایسی ناکامی ہے کہ طبیعت اُسے قبول نہیں کرتی۔ اب سب سے بڑی فکر تو روپے کی اور تلاش تھی تو چابیوں کی جن کے ذریعے یہ روپیہ حاصل کیا جا سکتا تھا

سر پھیر کر کھلے ہوئے دروازہ کی طرف دیکھا جہاں سایہ رہ رہ کر کانپ رہا تھا۔ مقتول کے قریب آیا۔ کسی ذہنی کراہیت کا احساس نہ تھا۔ پھر بھی معدے کی نسوں میں کھنچاؤ سا لگا۔ لاش کی انسانیت بالکل مفقود ہو چکی تھی۔ ہاتھ پاؤں بکھرے پڑے تھے۔ اور وہ عجیب بے ڈھنگا سا ہو گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کپڑوں کے اندر انسانی جسم نہیں۔ تھوڑا سا بھوسہ بھرا ہے۔ لیکن پھر بھی طبیعت اس سے متنفر تھی۔ دیکھنے کو حقیر اور بے حقیقت تھی لیکن ڈرتا تھا کہ ہاتھ سے چھوؤں تو شاید اتنی حقیر معلوم نہ ہو۔ لاش کو کندھے سے پکڑ کر اٹھایا اور چت لٹا دیا۔ کچھ عجیب ہلکی ہلکی اور ڈھیلی ڈھیلی سی تھی۔ بازوؤں اور ٹانگوں کی عجیب عجیب ہیئتیں بن جاتیں۔ جیسے ٹوٹے ہوئے ہوں۔ چہرے پر جذبات کی کوئی کیفیت باقی نہ رہی تھی۔ اور وہ موم کی طرح بے رنگ تھا۔ ایک کنپٹی خون آلود تھی جس کے دیکھنے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ مارخائیم کو بس یہی ایک بات ناگوار معلوم ہوتی تھی۔ یہ دیکھ کر اسے فوراً ہی ایک خاص میلے کا دن یاد آ جاتا۔ جو اس نے مچھیروں کے ایک گاؤں میں گزارا تھا۔ بازاروں میں لوگوں کا ہجوم تھا جس کے باجوں کی بلند آوازیں اور ڈھول کی دنا دن سنائی دے رہی تھی۔ ایک داستان گو گویا ناک میں گا رہا تھا۔ ایک لڑکا جسے کچھ ڈر بھی تھا۔ کچھ شوق بھی تھا۔ بھیڑ میں ادھر اُدھر پھر رہا تھا۔ آخر کار سب سے زیادہ رونق کے مقام پر پہنچ گیا۔ جہاں ایک چبوترہ سا بنا تھا۔ اور ایک لمبے چوڑے پردے پر تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ایک تصویر براؤن رگ اور اس کے شاگرد کی تھی۔ ایک مسٹر اور مسز میننگ اور اُن کے مقتول مہمان کی تھی — ایک تصویر میں وئیر اپنے قاتل تھرٹل کے خونی پنجے میں گرفتار نظر آ رہا تھا۔ اس کے علاوہ اور بیسیوں جرائم کی تصاویر پیش نظر تھیں۔ یہ تمام نظارہ اُسے اس وضاحت کے ساتھ یاد آ رہا تھا۔ جیسے کسی شعبدہ باز نے ماضی کو پھر زندہ کر دیا ہو۔ اپنے آپ کو پھر از سر نو وہی لڑکا سمجھنے لگا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ میں پھر وہی تماشا دیکھ رہا ہوں۔ ان مکروہ تصاویر کو دیکھ کر پھر میرا دل کراہت سے بھر گیا ہے۔ اور اس ڈھول کی آواز سے میں پھر جیسے سُن سا ہو گیا ہوں۔ اس موسیقی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اُسے یاد آ گیا۔ اور اس کی وجہ سے پہلی دفعہ اس کی طبیعت گھبرانے لگی۔ اُسے متلی سی ہوئی۔ جوڑوں میں ایک لخت ایک ضعف سا محسوس ہونے لگا۔ جس پر قابو پانا ضروری تھا۔

عقلمندی اسی میں تھی کہ ان خیالات سے پیچھا چھڑانے کی بجائے اُن کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ لاش کے چہرے کو اور بھی غور سے دیکھنے لگا۔ اور اپنی طبیعت پر زور ڈال کر اپنے جرم کی ماہیت اور سفاکی کو پوری طرح محسوس کرنے لگا۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی یہی چہرہ مختلف جذبات کے زیر اثر تیور بدلتا رہا تھا۔ یہ ہونٹ بولتے تھے۔ اس جسم میں فرماں پذیر قوتوں کی آگ بھری تھی۔ اور اب میرے ایک ہی فعل سے کارخانۂ حیات کا پرزہ یک لخت ختم گیا۔ جیسے ساز اپنی خمیدہ انگلی سے کسی گھڑی کی حرکت کو روک دیتا ہے۔ وہ اپنے دل کو ہزار سمجھاتا لیکن بے سود۔ کسی تاسف کا احساس نہ ہوتا تھا۔ وہی دل جو جرم کی نقلی تصویروں کے سامنے کانپ اٹھتا تھا۔ اب حقیقت کو دیکھ کر بھی نہ پسیجتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ اُسے دکاندار پر تھوڑا سا رحم آتا۔ کہ اُسے بھی خدا نے وہ تمام قوتیں عطا کی تھیں جن سے دنیا کو ایک عجیب و غریب طلسماتی بہشت بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن اُن سے اُس نے کچھ فائدہ نہ اٹھایا۔ اب وہ مر چکا ہے لیکن حقیقی معنوں میں وہ کبھی زندہ ہی نہ تھا۔ بس اس بات پر اُسے کچھ ترس آتا تھا۔ لیکن تاسف یا ندامت کا شائبہ تک اُس کے دل میں موجود نہ تھا۔

چنانچہ اُس نے ان خیالات کو دماغ سے نکال دیا اور سیاہ بلی کی تلاش کے لئے وہاں سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ [illegible] بارش شروع ہوگئی تھی اور سیاہ بلی کی تلاش سے خاموشی [illegible] ہو چکی تھی۔ [illegible] ہر طرح طرح کی آوازوں سے [illegible] ابھی ڈھکی تھیں۔ اور جو کھڑکیوں کی کھٹ کھٹ سے [illegible] ۔ ایک سیٹی کی آواز آئی تھی۔ اور جب مار خانم دروازہ کے قریب پہنچا تو اسے ایسا معلوم ہوا۔ جیسے اس کے پیچھے پیچھے قدموں کی آہٹ [illegible] جا گیا ہے۔ [illegible] ابھی تک دہلیز پر کانپ رہا تھا۔ اس سے [illegible] دائیں طرف کھینچ رکھا ہو۔

گھر چھپا ہوا تھا۔ [illegible] کی مدھم روشنی اس [illegible] پر جو [illegible] کے [illegible] میں [illegible] رہی تھی۔ اور [illegible] ہوئی سیاہ چوبی دیوار پر لٹکی ہوئی تصویروں اور [illegible] پر بھی پڑ رہی تھی۔ [illegible] سے سنائی دیتا تھا۔ مار خانم [illegible] قسم کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ پاؤں کی آہٹ اور [illegible] کی کھٹ کھٹ اور [illegible] کی جھنکار اور دروازوں کے ہلکے ہلکے [illegible] کے ساتھ کھلنے کی صدائیں [illegible] کے ساتھ ملی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ یہ احساس کہ میں اکیلا نہیں اس قدر تیز ہوتا گیا کہ دیوانگی کی حد تک پہنچ گیا۔ اسے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا کہ گویا یہ ہستیاں [illegible] چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ بلکہ اوپر کے کمروں میں چلتی پھرتی معلوم ہو رہی ہیں۔ بڑی مشکل سے سیڑھیوں پر چڑھنا شروع کیا۔ تو معلوم ہوا جیسے اوپر کوئی دبے پاؤں پیچھے کو بھاگ گیا ہے اور کوئی ہلکے ہلکے اس کے پیچھے چڑھ رہا ہے۔ [illegible] اگر میں بہرا ہوتا تو اس وقت روح کو زیادہ اطمینان ہوتا۔ لیکن [illegible] بیدار حواس ہی تو ہیں۔ جو اس وقت میری زندگی کی حفاظت کے لئے پہرہ دے رہے ہیں۔ اس خیال سے اسے کچھ تسلی سی ہوئی اور پہلے سے بھی زیادہ توجہ کے ساتھ کان لگائے رہا۔ ہر لحظہ بار بار پیچھے مڑتا۔ اس کی آنکھیں ابلی پڑتی تھیں۔ اور ہر طرف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ لیکن ہر طرف کامیاب ہوتے ہوتے رہ جاتیں۔ کیونکہ جدھر دیکھتیں ادھر ہی کسی نامعلوم بھاگتی ہوئی چیز کا پچھلا حصہ غائب ہوتا نظر آتا۔ پہلی چھت تک چوبیس سیڑھیاں تھیں اور ہر ایک سیڑھی ایک قیامت معلوم ہوتی تھی۔

اوپر کی چھت پر تینوں دروازے کھلے پڑے تھے۔ اور [illegible] معلوم ہوتے تھے۔ ان کو دیکھ کر مار خانم یوں کانپا۔ جیسے دوزخ کے دہانے نظر آرہے ہوں۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ اب گویا لوگوں کی تیز نظروں سے پوری طرح کبھی نہ بچ سکوں گا۔ جی چاہا کہ کسی طرح اپنے گھر کے اندر پہنچ جاؤں۔ جہاں چاروں طرف دیواریں کھڑی ہوں گی۔ اپنے بستر میں جا کر چھپ جاؤں گا۔ اور سو [illegible] اور کسی کی آنکھیں مجھے نہ دیکھ سکیں گی۔ اس خیال پر اسے کچھ تعجب سا ہوا [illegible] اور ناولوں کے قصے یاد آئے جن کا [illegible] انتقام [illegible] سے خوف کھاتے تھے۔

کم از کم مار خانم کے دل میں اس بات کا خوف نہ تھا۔ خدا سے تو [illegible] قوانین قدرت سے ضرور ڈرتا تھا کہ ممکن ہے میری موجودگی کے بعض ایسے آثار باقی رہ جائیں۔ جو اثباتِ جرم میں مدد دیں۔ ان آثار کو تو قوانین قدرت کی بے رحم اور [illegible] کارفرمائی کبھی محو نہ کرے گی۔ اس سے بھی [illegible] وہ اس بات سے خوف کھاتا تھا۔ وہم پرست ضعیف الاعتقاد لوگوں کا سا خوف کہ کیا معلوم کوئی ایسی بات ظہور میں آجائے جو آج تک کسی نے دیکھی ہو نہ سنی ہو۔ کیا معلوم قدرت خود اپنے قوانین کی خلاف ورزی کرنے لگے۔ میں ایک ایسا کھیل کھیل رہا ہوں جس پر ذہانت اور فراست کی ضرورت ہے جس میں کامیابی خاص قواعد و ضوابط پر مبنی ہے۔ جس میں اقلیدس کی طرح خاص اسباب و علل سے خاص نتائج ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اگر قدرت اس جابر و مطلق العنان بادشاہ کی طرح جو کھیلتے کھیلتے شطرنج کی بساط الٹ دیتا ہے۔ یک لخت علت و معلول کا یہ سلسلہ برہم کر دے تو کیا ہوگا؟ مورخ کہتے ہیں جب موسم نے اپنی آمد کا وقت بدل ڈالا تھا۔ تو نپولین کا یہی حال ہوا تھا۔ کیا معلوم مار خانم کا بھی یہی حال ہو؟ کیسا

علاوہ ازیں خوف۔ اندرون میں شیشے کی یہ خاصیت پیدا ہو جائے اور بیرونی تمام حرکات باہر سے صاف صاف نظر آنے لگیں۔ جیسے کسی شیشے کے بکس میں شہد کی مکھیوں کی حرکات نظر آتی ہیں۔ فرش کے مضبوط تختے سرکتی ریت کی طرح بیٹھ جائیں اور دلدل کی طرح مجھے اپنی گرفت میں پھنسا لیں یا یہ تو وہم کی باتیں ہیں۔ کیا معلوم یہ مکان ہی گر پڑے اور میں اس لاش کے ساتھ ہی پیس کر رہ جاؤں۔ یا سامنے کے گھر میں آگ لگ جائے اور آگ بجھانے والے لوگ سب طرف سے اندر آ گھسیں۔ ان چیزوں سے وہ ضرور خوف کھاتا تھا۔ ان کو چاہو تو گناہ کا خداوندی انتقام سمجھ لو۔ لیکن خود خدا کی ذات سے وہ بالکل نہ گھبراتا تھا۔ دل سے کہتا میرا یہ فعل تجاوز سہی۔ لیکن اس کی وجوہ بھی تو خاص ہیں اور خدا کو ان کا پورا پورا علم ہے۔ یہی نہیں بلکہ انصاف کا یقین بھی خدا ہی پر تھا۔ انسانوں پر نہ تھا۔

جب صحیح سلامت ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا اور دروازہ بند کر لیا تو اُسے محسوس ہوا۔ اب کوئی خطرہ نہیں۔ کمرہ بالکل بے آراستہ تھا۔ فرش پر قالین تک نہ تھا۔ جا بجا خالی بکس اور دوسرا بے جوڑ سا فرنیچر پڑا تھا۔ کئی لمبے لمبے آئینے تھے جو مختلف زاویوں سے اپنا عکس نظر آ رہا تھا۔ جیسے کوئی ایکٹر اسٹیج پر ہو۔ کئی تصاویر بعض چوکھٹوں میں لگی ہوئی۔ بعض بغیر چوکھٹوں کے۔ دیوار کے ساتھ اُلٹی کھڑی تھیں۔ اس کے علاوہ کھانے کے کمرے کی شیرٹن الماری، ایک اور الماری جس میں لکڑی کی پچی کاری کی ہوئی تھی اور ایک بہت بڑا پرانی وضع کا پلنگ تھا۔ جس پر دبیز قیمتی کپڑے کے پردے لگے تھے۔ کھڑکیوں کی چوکھٹ فرش تک پہنچتی تھی۔ لیکن خوش قسمتی سے ان کا نچلا حصہ بند تھا۔ اس لئے پڑوس کے لوگوں کی نظر نہ پڑ سکتی تھی۔ مارخائم نے ایک بکس کو الماری کے سامنے کھینچ لیا اور کنجیوں کے گچھے میں سے ایسی کنجی تلاش کرنے لگا جس سے الماری کا قفل کھل سکے۔ کنجیاں بے شمار تھیں۔ اس لئے یہ کام لمبا تھا۔ اور طبیعت گھبرانے لگتی تھی۔ اس خیال سے اور بھی گھبراہٹ ہوتی تھی کہ ممکن ہے الماری میں کچھ بھی نہ نکلے۔ اور وقت گزرا چلا جا رہا تھا۔ لیکن اس پوشیدہ مصروفیت سے اُس کے حواس پھر درست ہو گئے۔ دروازہ کو کنکھیوں سے بلکہ بعض اوقات نظر بھر کر بھی دیکھ لیتا جیسے کوئی محصور سپہ سالار اپنی حفاظت کے انتظامات کو مستحکم پا کر خوش ہوتا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ بالکل مطمئن تھا۔ باہر بازار میں مینہ برس رہا تھا۔ اور بارش کا شور طبعی اور خوشگوار معلوم ہوتا تھا۔ تھوڑے عرصے کے بعد دوسری طرف سے حمد و مناجات کے گیت کے ساتھ پیانو بجنے کی آواز آنی شروع ہوئی۔ بہت سے بچے مل کر گیت گا رہے تھے۔ گیت کی موسیقی خوش آیند تھی۔ اور اس کے سروں سے ایک خاص وقار ٹپکتا تھا۔ بچوں کی آوازیں پیاری اور بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ مارخائم مسکراتا ہوا اُن کو سن رہا تھا۔ اور ساتھ ہی کنجیاں گھما گھما کر دیکھتا بھی جاتا تھا۔ دل میں اسی قسم کے تصورات اور خیالات کا ایک ہجوم تھا۔ کبھی گرجا جاتے ہوئے بچوں اور آرگن کے بجنے کا خیال آتا۔ کبھی کھیلتے کودتے بچوں کا تصور بندھ جاتا کہ ندی کے کنارے نہانے کو جمع ہیں۔ یا کھلے میدان میں گھوم رہے ہیں۔ یا جب آسمان پر ہوا بادلوں سے اٹھکیلیاں کر رہی ہے۔ تو پتنگ اڑا رہے ہیں۔ سر کے کسی اور تار چڑھاؤ کے ساتھ پھر گرجے کا خیال آ جاتا گرمیوں کا موسم ہے۔ اتوار کا خواب آور دن۔ پادری بلند آواز اور شائستہ لہجے میں وعظ کر رہا ہے (اس پر ذرا مسکرا دیتا) روغنی جیکوبین مقبرے اور کلیسا کے مشرقی حصے میں مدھم سے حروف میں لکھے ہوئے دس احکام آنکھوں کے سامنے پھر جاتے۔

ایسی باتیں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ یک لخت چونک کر کھڑا ہو گیا۔ دفعتہً برف کی سی خنکی، خون کا ابلتا ہوا فوارہ، آگ کا ایک شعلہ اُس کے جسم میں دوڑ گیا پاؤں وہیں کے وہیں جم گئے۔ اور جسم تھر تھر کانپنے لگا۔ کسی شخص کے سیڑھیوں پر آہستہ آہستہ چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ تھوڑی دیر بعد کسی ہاتھ نے دروازے کے دستے کو گھمایا۔ قفل سرکتا ہوا سنائی دیا اور دروازہ کھلا۔

خوف نے جیسے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ کچھ نہ سوچ سکتا تھا کہ اب کیا ظہور میں آئے گا۔ خود مقتول ہی اپنے پاؤں چل کر آ گیا ہے۔ یا عدالت

کا کوئی کام نہ ہے یا مغالطہ ہی [illegible] محض [illegible] ہے جس کی شہادت سے جاسوسی سے سنتے پر لگا دے۔ [illegible] لیکن جب دروازہ کھلا تو ایک شخص کا چہرہ دکھائی دیا جس نے [illegible] دروازہ [illegible] [illegible] [illegible] پہچان [illegible] پیچھے ہٹ کر دروازہ بند کر دیا۔ مارخائم [illegible] [illegible] [illegible] ایک [illegible] جیسے [illegible] اجنبی پھر واپس آیا اور نہایت اطمینان سے بیٹھ گیا۔

"تم نے مجھے بلایا تھا؟" [illegible] کہنے کے ساتھ ہی [illegible] [illegible] بیٹھ گیا۔

مارخائم تو [illegible] [illegible] [illegible] شاید [illegible] [illegible] [illegible] درمیان نظر آتی تھی جیسے کوئی کانپتی ہوئی روشنی میں [illegible] [illegible] لگتے تھے۔ کبھی کبھی [illegible] [illegible] شناسا سا [illegible] پھر خیال آتا مجھ سے شکل ملتی ہے [illegible] اور [illegible] یہ شخص اس دنیا کا مخلوق نہیں۔ نہ خدا کی مخلوق میں سے ہے۔

لیکن عجیب بات تھی کہ پھر بھی یہ اجنبی جو کھڑا مارخائم کو مسکرا مسکرا کر دیکھ رہا تھا معمولی سا اور معمولی [illegible] تھا اور جب اس نے یہ پوچھا کہ روپیہ کی تلاش میں ہو؟ تو لہجے میں وہی [illegible] تھا جو روزمرہ کی عام گفتگو میں پایا جاتا ہے۔ مارخائم نے کچھ جواب نہ دیا۔

اجنبی بولا: "میں تمھیں متنبہ کیے دیتا ہوں کہ ملازمہ اپنے چاہنے والے سے جلدی رخصت ہو گئی ہے اور اب وہ یہاں پہنچا ہی چاہتی ہے۔ اگر مسٹر مارخائم اس گھر میں پکڑے جائیں تو نتیجہ جو ہوگا وہ تم جانتے ہی ہو۔"

قاتل نے پوچھا: "تم مجھے جانتے ہو؟"

اجنبی مسکرا دیا اور بولا: "تم مدت سے میرے منظورِ نظر ہو۔ عرصے سے تمھیں دیکھ رہا ہوں اور بارہا میں نے چاہا ہے کہ تمھاری مدد کروں۔"

مارخائم بولا: "تم کون ہو؟ کیا شیطان ہو؟"

اجنبی نے جواب دیا: "میں تمھاری جو خدمت کرنا چاہتا ہوں اس پر اس بات کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا کہ میں کون ہوں۔"

مارخائم بولا: "ضرور پڑ سکتا ہے! کیا تم سے مدد چاہوں؟ تم سے؟ یہ ہرگز نہ ہوگا۔ تم ابھی مجھ سے واقف نہیں۔ خدا کا شکر ہے تم ابھی مجھ سے واقف نہیں۔"

اجنبی نے ایک مشفقانہ درشتی بلکہ تحکم کے ساتھ جواب دیا: "میں تمھیں جانتا ہوں۔ میں تمھاری روح تک سے واقف ہوں۔"

مارخائم بولا: "مجھے جانتے ہو! مجھے کون جان سکتا ہے؟ میری زندگی خود میرا ہی بگڑا ہوا نقشہ اور خود مجھ پر ایک تہمت ہے۔ میں نے عمر بھر اپنی فطرت کو جھٹلایا ہے۔ ہر انسان کا یہی حال ہے۔ ہر انسان اس ملمع سے بہرحال بہتر ہوتا ہے جو وہ اپنے اوپر چڑھاتا رہتا ہے اور جس کے اندر اس کا دم گھٹا جاتا ہے۔ ہر انسان کشاں کشاں جدھر زندگی لے جائے اُدھر ہی کھنچا چلا جاتا ہے، جیسے رہزن کسی کو پکڑ کر اس پر کمبل ڈال دیتے ہیں۔ اگر ان میں سے کسی کو اپنے اوپر اختیار ہو، اگر کبھی وہ اپنے اصلی روپ میں دکھائی دے سکیں تو تم انھیں اس سے کہیں مختلف پاؤ گے اور ان کے چہروں پر نامور بہادروں اور خدا رسیدہ بزرگوں کا سا نور چمکتا نظر آئے گا۔ میں بہت سوں سے بڑا ہوں۔ مجھ پر جھوٹ کی بہت موٹی تہ جمی ہے اور میرا عذر میرے خدا کو معلوم ہے۔ لیکن اگر مجھے مہلت ہو

تو میں اپنی اصل حقیقت آشکار کر سکتا ہوں۔"

اجنبی نے پوچھا: "مجھ پر؟"

قاتل نے جواب دیا: "سب سے پہلے تو میں تمھیں عقلمند سمجھتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اب تم آ ہی گئے ہو تو کم از کم میرے دل کا حال بھی جان لو گے لیکن افسوس پھر بھی تم میری نیکی بدی کا اندازہ میرے افعال سے لگانا چاہتے ہو! ذرا سوچو تو! میرے افعال سے! دیوؤں کے ملک میں پیدا ہوا اور میں نے دیوؤں کے ملک میں زندگی بسر کی۔ جب سے میں نے جنم لیا ہے حالات و واقعات کے دیو مجھے کلائیوں سے پکڑ کر گھسیٹتے پھرتے ہیں اور تم میری نیکی بدی کا اندازہ میرے افعال سے لگانا چاہتے ہو۔ تمھیں میرا باطن نظر نہیں آتا؟ تم یہ نہیں سمجھتے کہ مجھے بدی سے نفرت ہے۔ تمھیں میرے سینے کے اندر ضمیر کے احکام صاف صاف لکھے ہوئے نظر نہیں آتے؟ میں نے اکثر ان کی تعمیل سے گریز کیا ہے لیکن دیدہ و دانستہ کبھی ان کی غلط تاویل نہیں کی۔ اپنی مرضی کے خلاف گناہ کرنے والوں کی مثالیں تو لاکھوں کی تعداد میں موجود ہوں گی۔ کیا میں تمھیں ویسا ہی انسان معلوم نہیں ہوتا؟"

جواب ملا: "تم نے اپنے خیالات کا اظہار بڑے جذبے کے ساتھ کیا ہے لیکن اس سے مجھ پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ مجھے اس بات سے کوئی واسطہ نہیں کہ بدی سے نفرت کرنے کے باوجود بھی انسان گناہ کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ مجھے اس سے بحث نہیں کہ تمھیں کون سے واقعات کس طرف قدم اٹھانے پر مجبور کرتے ہیں۔ غرض تو اس سے ہے کہ جس رستے پر چلو وہ رستہ ٹھیک ہو لیکن وقت نکلا جا رہا ہے۔ بھیڑ کا تماشا کرتے کرتے اور اشتہاروں کی تصویریں دیکھتے دیکھتے تم کو دیر ہو گئی ہے تاہم ہوا یہ ہے جیسے پھانسی کا تختہ بازاروں میں کرسمس کا ہجوم گو ڈھونڈتا ہوا تمھاری طرف بڑھا چلا آ رہا ہے۔ کہو تو میں تمھاری مدد کر دوں۔ میں جو سب کچھ جانتا ہوں تمھیں بتاؤں۔ روپیہ کہاں رکھا ہے؟"

مارخایم نے پوچھا: "مجھے قیمت کیا ادا کرنی پڑے گی؟"

اجنبی نے جواب دیا: "میں یہ خدمت کرسمس کے تحفے کے طور پر کرنے کو تیار ہوں۔"

مارخایم سے نہ رہا گیا۔ ایک تلخ سے احساسِ تسخیر کے ساتھ مسکرا دیا اور بولا: "نہیں۔ میں تمھارا احسان کبھی نہ لوں گا۔ اگر پیاس کے مارے میری جان نکل رہی ہو اور پانی کا پیالہ تمھارے ہاتھ میں ہو جب بھی مجھ میں اتنی ہمت ضرور ہو گی کہ میں انکار کر دوں۔ یہ میری سادہ لوحی سہی لیکن میں اپنے آپ کو بدی کے ہاتھ بیچنا نہیں چاہتا۔"

اجنبی نے کہا: "مرتے وقت توبہ کر لینا۔ مجھے کوئی عذر نہیں۔"

مارخایم نے زور سے جواب دیا: "تمھیں اسی لیے عذر نہیں کہ تم جانتے ہو مرتے وقت توبہ کرنا بے سود ہے۔"

اجنبی نے جواب دیا: "میرا یہ خیال نہیں لیکن بات یہ ہے کہ میں ان باتوں کو اور ہی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہوں۔ جب زندگی ختم ہو جائے تو پھر مجھے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ ایک انسان عمر بھر میرے حکم کی تعمیل کرتا رہتا ہے۔ دینداری کے بھیس میں سیہ کاری پھیلاتا رہتا ہے یا اپنی کمزوری کے ہاتھوں مجبور ہو کر گندم کے کھیت میں حنظل بوتا ہے۔ جب اس کی مخلصی کا وقت قریب آتا ہے تو میں اس سے صرف ایک اور خدمت چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ گناہوں سے توبہ کر لے اور اس جہان سے مسکراتا ہوا رخصت ہو۔ یعنی میرے باقیماندہ پیروؤں میں سے جو لوگ ذرا کم حوصلہ ہیں انھیں ہمت دلائے، انھیں آس لگی رہے کہ عفوِ خداوندی مرتے وقت بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ میں کچھ ایسا جابر آقا تو نہیں۔ مجھے آزماؤ۔ میری مدد قبول کرو۔ اب تک تم نے جو دل چاہا کیا، اب بھی جو دل چاہے کرو بلکہ پہلے سے بھی زیادہ عیش اور

اطمینان کی زندگی بسر کرو اور جب رات پڑ سے گئے اور لڑکیاں سے کے روتے کھینچ، بیٹے جاگیں، اس وقت میں تمھاری ستی کے صدقے سے کلمے دیتا ہوں۔ اس وقت مجیب کے ساتھ صلح کر لینا اور خدا کی آغوش شفقت میں غوطہ زن ہو جو مسلسل رہتا ہے۔ جہاں سے آیا ہوں وہاں اسی طرح کا ایک تائب انسان بستر مرگ پر پڑا تھا۔ گروہ ماتم داروں سے گھرا ہوا تھا جس نے آخری لمحات کو بڑی توجہ سے شدت سے کھینچے۔ زندگی میں اس کی سنگدلی کا یہ عالم تھا کہ استغفار کی جھلک تک اس نے چہرے پر تھی، نہ آنکھ میں لیکن موت کے وقت اس کے چہرہ پر امید کا تبسم درخشاں نظر آتا تھا۔"

مارخائیم نے پوچھا: "تو تم مجھے بھی ایسی صورت و مردود انسان سمجھ ہو، اور مجھے جو بیہودہ تمنائی ہے وہ بس یہی ہے کہ جو عرصہ باقی ہے گزار دوں اور آخری وقت خدا کو لبوں سے پکاروں اور جنت میں داخل ہو جاؤں۔ میرا دل یہ سوچ کے مرتے ہی جلتا ہے۔ کیا تم نے بنی نوع انسان کو ایسا ہی پایا ہے؟ یا تمھیں میرے ہاتھ خون آلود دکھائی دیتے ہیں کہ اس بات کا گمان ہے کہ قتل کا گناہ اتنا مبارک ہے کہ نیکی کا احساس بالکل ہی مر جاتا ہے؟"

اجمی نے جواب دیا: "قتل کو میں کسی خاص قسم کا گناہ نہیں سمجھتا۔ جس طرح عام زندگی ایک جنگ ہے اسی طرح ہر گناہ ایک قتل ہے۔ میرے نزدیک تو تمام بنی نوع انسان کی مثال ان ملاحوں کی سی ہے جو ایسے ڈوبتے ہوئے جہاز کے تختوں پر تیر رہے ہوں، کھانے کو ان کے پاس کچھ نہ ہو فاقے کے ہاتھ سے تڑپتے ہوئے ایک دوسرے کو چھین کر کھا رہے ہوں۔ یہاں تک کہ وہ بے ہوشی پر اتر آتے ہیں۔ میری نگاہ میں اس نیچے سے کبھی پرے نکل جاتی ہے جس میں جرم کا ارتکاب ہوتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ ہر ایک کا انجام موت ہے۔ میری آنکھوں کو وہ حسین لڑکی جو ناچ پر جانے کے لیے ہزار اداؤں سے اپنی ماں کو بے بس کر رہی ہے اور ہر صبح قاتل دونوں یکساں خون میں لتھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ میں نے ابھی ابھی کہا تھا کہ بدی کے نتائج کو سوچتا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ میں نیکی کے مسئلے پر بھی غور کرتا ہوں۔ مجھے دونوں میں ہرگز فرق نظر نہیں آتا۔ گویا دونوں ایک ہی منزل کی راہیں ہیں جن سے موت کا فرشتہ فصل کاٹ کر لے جاتا ہے۔ جس بدی کے لیے میری زندگی وقف ہے وہ افعال کی بدی نہیں سیرت کی بدی ہے۔ مجھے گنہگار انسان محبوب ہے۔ گناہ کے فعل سے محبت نہیں۔ بڑے کاموں کا ثمر شاید بڑی بڑی نیکیوں کے پھل سے بھی زیادہ شیریں نکلے لیکن یہ ہمت کسے ہے کہ قرنوں اور صدیوں کے دندناتے ہوئے آثار کی تہ تک پہنچ کر بدی کے نتائج کا مطالعہ کر سکے۔ میں جو اب تمھاری دستگیری پر آمادہ ہوں تو وہ اس سبب نہیں کہ تم نے ایک دکاندار کو قتل کر ڈالا ہے بلکہ اس لیے کہ تم مارخائیم ہو۔"

مارخائیم نے جواب دیا: "میں تم سے اپنے دل کا حال صاف صاف بیان کرتا ہوں۔ یہ جرم میرا آخری جرم ہے اور پیشتر اس کے کہ یہ مجھ سے سرزد ہوا مجھے کئی سبق مل گئے۔ یہ خود ایک سبق تھا، بہت بڑا سبق۔ اب تک جو کچھ میں نے کیا وہ میری مرضی کے خلاف تھا لیکن سرکشی نے مجھ سے سب کچھ کرا دیا۔ میں افلاس کا مظلوم اور مجبور غلام تھا۔ بعض اوقات انسان کسی نیک کام کے لیے بیٹھے کا لالچ کرتا ہے۔ مجھے صرف عیش پسندی کی ہوس تھی لیکن آج مجھے اس جرم سے دولت اور عبرت دونوں چیزیں حاصل ہوئیں گویا میں اپنے اصل روپ میں ہو کر آنے کے لیے ارادہ اور سامان دونوں مہیا ہو گئے ہیں۔ اب میں اپنے افعال کا پورا پورا مختار ہوں اب میں بالکل بدل جاؤں گا۔ ان ہاتھوں سے نیکی کروں گا اور اس دل کو اطمینان نصیب ہوگا۔ میری گذشتہ زندگی کے بعض جذبات پھر میری طبیعت میں ہیجان پیدا کر رہے ہیں۔ اتوار کی شام کو جب گرجا کا آرگن بج رہا ہوتا یا جب کسی مقدس کتاب کی تلاوت سے میری

آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے یا جب میں معصومیت کے زمانے میں اپنی ماں سے باتیں کیا کرتا تھا تو اس وقت اپنی آئندہ زندگی کا جو تصور میرے سامنے تھا وہ اب سچ ہو کے رہے گا۔ میں چند سال بھٹکتا پھرا ہوں لیکن اب مجھے منزلِ مقصود پھر نظر آ رہی ہے۔"

اجنبی نے پوچھا: "یہ روپیہ تم سٹہ بازی میں لگاؤ گے؟ جہاں میں سمجھتا ہوں تم پہلے بھی کئی ہزار ہار چکے ہو۔"

مارخائیم نے کہا: "ہاں لیکن اب کے میرا جیتنا یقینی ہے۔"

اجنبی بولا: "اب کے پھر ہار دو گے۔"

مارخائیم نے کہا: "ہاں! مگر میں آدھا روپیہ اپنے پاس رکھوں گا۔"

اجنبی بولا: "وہ بھی ہار دو گے۔"

مارخائیم کے ماتھے پر پسینہ پھوٹ نکلا۔ بولا: "اچھا! کیا مضائقہ ہے؟ فرض کرو میں سب روپیہ ہار دوں اور فرض کرو میں پھر مفلس اور قلاش ہو جاؤں تو کیا میرا نفس ایک حصہ اور بھی اسفل، یوں ہی آخر تک اسفل رہے گا اور رفتہ رفتہ نیکی کی قوت کو سلب کر دے گا؟ نیکی اور بدی دونوں زبردست ہیں اور اپنی اپنی طرف بلا رہی ہیں۔ مجھے دونوں سے محبت ہے۔ میں بڑے بڑے کارنامے سوچ سکتا ہوں، اپنے نفس کو مار سکتا ہوں، نیکی کے رستے میں جان تک قربان کر سکتا ہوں اور گو میں اتنا ذلیل ہوں کہ قتل تک سے دریغ نہ کیا لیکن رحم سے بالکل نا آشنا نہیں۔ میں غریبوں پر رحم کھاتا ہوں (مجھ سے زیادہ ان لوگوں کی مصیبتوں کو کون جانتا ہے؟) میں محبت کی قدر کرتا ہوں۔ میں وہ ہنسی اور خوش دلی چاہتا ہوں جو اطمینانِ قلب کا نتیجہ ہوتی ہے۔ دنیا کی کوئی سچی یا کوئی اچھی بات ایسی نہیں جس سے مجھے دلی محبت نہ ہو، تو کیا صرف بدیاں ہی میری رہنمائی کریں گی؟ اور کیا میری خوبیاں کوڑے کرکٹ کی طرح بے کار پڑی رہیں گی؟ ہرگز نہیں۔ نیکی بھی افعال کی رہبر ہو سکتی ہے۔"

لیکن اجنبی نے اپنی انگلی اوپر کو اٹھائی اور بولا: "تمھیں اس دنیا میں آئے چھتیس سال ہو گئے۔ اس دوران میں تمھاری قسمت نے کئی دفعہ پلٹا کھایا اور تمھاری طبیعت نے کئی رنگ بدلے لیکن میں چھتیس سال سے دیکھ رہا ہوں کہ تم برابر قعرِ مذلت کی طرف جا رہے ہو۔ آج سے پندرہ سال پیشتر تم چوری کے خیال سے بھی کانپ اٹھتے۔ آج سے تین سال پیشتر قاتل کا نام سن کر تمھارا رنگ فق ہو جاتا لیکن اب کیا کوئی بھی جرم، کوئی بھی سفاکی، کوئی بھی ذلت ایسی ہے جس سے تمھاری طبیعت متنفر ہو اور پانچ سال میں تم ان سب کے مرتکب ہو چکے ہو گے۔ تم دن بدن پستی کی طرف جا رہے ہو اور بجز موت کے اور کوئی چیز تمھیں نہیں روک سکتی۔"

مارخائیم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا: "یہ سچ ہے۔ میں نے ایک حد تک بدی کے احکام کی تعمیل کی ہے لیکن سب کا یہی حال ہے۔ محض اس جہان میں بسر کرنے کی وجہ سے پاکیزہ ترین انسان بھی دنیا کی آلائشوں سے اپنا دامن نہ بچا سکے۔"

جواب ملا: "میں تم سے ایک سیدھا سادا سوال پوچھتا ہوں۔ جواب پانے پر میں تمھاری آئندہ اخلاقی زندگی کا حال تمھیں بتاؤں گا۔ بہت سی باتوں میں تم نیک و بد کی چنداں پروا نہیں کرتے اور ممکن ہے تم ایسا کرنے میں حق بجانب بھی ہو۔ بہرحال ہر انسان کا یہی حال ہے لیکن کوئی ذرا سی بات بھی ایسی ہے جس میں تم اپنے افعال کی پوری پوری نگہداشت کرتے ہو، یا ہر بات میں بے احتیاطی سے کام لیتے ہو؟"

مارخائیم کو جیسے جواب سوچنے میں بے حد تکلیف ہو رہی ہو۔ بولا: "کوئی ذرا سی بات ایسی ہے؟ نہیں کوئی نہیں۔ میں

ہر طرح ذلیل ہوں:

اجنبی بولا: "تو پھر اسی پر قناعت کرو کیونکہ تمہارا بدلنا ناممکن ہے۔ دنیا کے اسٹیج پر جو پارٹ تمہیں ادا کرنا ہے اس کے الفاظ مقرر ہیں اور ان میں رد و بدل کا کوئی امکان نہیں۔"

مارخائیم بہت دیر تک چپ کھڑا رہا۔ بلکہ دوبارہ بھی پہل اجنبی ہی نے بولنا شروع کیا۔ "تو پھر مجھے بتاؤ کہ روپیہ کہاں رکھا ہے ـــــ؟"

مارخائیم نے پوچھا: "اور عفو خداوندی؟"

جواب ملا: "وہ تم آزما چکے ہو۔ دو تین سال ہوئے تم ہی تو تھے جب میں نے مذہبی جلسوں کے پلیٹ فارم پر سب سے بلند آواز میں حمد و مناجات کے گیت گاتے سنا تھا۔"

مارخائیم بولا: "یہ سچ ہے۔ مجھے اپنا فرض صاف صاف نظر آ رہا ہے۔ میں اس سبق کے لیے دل و جان سے تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ تم نے میری آنکھیں کھول دی ہیں اور میری حقیقت اب مجھ پر آشکارا ہو چکی ہے۔"

عین اس وقت دروازے کی گھنٹی کے بجنے کی تیز آواز سارے گھر میں سنائی دی۔ اجنبی کا رویہ یوں بدلا جیسے گھنٹی کا بجنا پہلے ہی سے مقرر ہو چکا تھا اور وہ بس اسی کے انتظار میں تھا۔

بولا: "وہ ماما آ گئی۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ وہ واپس آ جائے گی۔ اب تمہارے سامنے فقط ایک مشکل کام انجام دینا باقی رہ گیا ہے۔ اس سے کہنا تمہارا آقا بیمار ہے۔ خود جاکے دروازہ کھولنا۔ تمہارے چہرے سے گھبراہٹ نہیں بلکہ سنجیدگی مترشح ہونی چاہیے۔ مسکرانا مت۔ بہت زیادہ اطمینان کا اظہار بھی نہ کرنا۔ میرے کہے پر عمل کرو گے تو یقین مانو تمہارا راز کبھی فاش نہ ہوگا۔ بس لڑکی اندر آ جائے اور دروازہ بند ہو جائے تو جس ہوشیاری سے تم نے آقا کو ٹھکانے لگایا ہے اسی طرح اس آخری کانٹے کو بھی اپنے رستے سے ہٹا سکتے ہو۔ پھر تو ساری شام اور اگر ضرورت ہو تو ساری رات پڑی ہے۔ گھر کے سب مال و اسباب کی اچھی طرح تلاشی لے لینا اور پھر مزے سے نکل جانا۔ ماما کے آ جانے میں بھی ایک عجیب حکمت ہے۔ اٹھو! میرے دوست اٹھو! تمہاری زندگی اس وقت ایک کچے دھاگے سے بندھی ہے۔ اٹھو! کچھ کر لو۔"

مارخائیم اپنے صلاح کار کو غور سے دیکھتا رہا اور بولا: "اگر میری قسمت میں یہ لکھا ہے کہ میری ہر حرکت بدی اور گناہ ہی کے لیے وقف ہے تو نجات کا ایک دروازہ تو اب بھی کھلا ہے۔ میں ہاتھ پاؤں ہلانا ہی کیوں نہ بند کر دوں؟ اگر میری زندگی ناپاک ہے تو میں اس زندگی سے دستکش ہی کیوں نہ ہو جاؤں؟ تم سچ کہتے ہو میں ہر چھوٹی سے چھوٹی خواہش کا غلام ہوں لیکن اب بھی میں ایک ہی فیصلہ کن جنبش کے ساتھ ان سب خواہشات سے آزاد ہو سکتا ہوں۔ میری تقدیر میں یہی لکھا ہے کہ نیکی کی تمنا کبھی پوری نہ ہو تو اچھا یونہی سہی لیکن بدی سے نفرت تو اب بھی باقی ہے اور تمہیں یہ دیکھ کر بہت ہی مایوسی ہوگی کہ میں اسی نفرت سے طاقت اور جرأت دونوں چیزیں حاصل کر سکتا ہوں۔"

اجنبی کا چہرہ بدلنا شروع ہوا۔ اس کے خد و خال حسین و جمیل ہوتے گئے اور ایک شفقت آمیز احساس تسخیر کے ساتھ چمکنے لگے اور پھر فوراً ہی مدھم ہو کر غائب ہو گئے لیکن مارخائیم اس تغیر کو دیکھنے یا سمجھنے کے لیے ذرا بھی متوجہ نہ ہوا۔ اس نے

پھر دروازہ کھولا اور کچھ سوچتا ہوا آہستہ آہستہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آگیا۔ اس کی گذشتہ زندگی کا صاف اور صحیح نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر گیا۔ خواب کی طرح بدنما اور تکلیف دہ بے ترتیب اور بے جوڑ۔ گویا شکست کا ایک منظر پھیلا ہوا ہے۔ جب اپنی زندگی یوں نظر آئی تو جینے کی ہوس باقی نہ رہی لیکن زندگی کے اس پار اسے اپنی کشتی کا ساحل دکھائی دے رہا تھا۔ دکان کے دروازے کے پاس پہنچا تو رک گیا۔ دروازے میں سے جھانکا۔ شمع ابھی تک لاش کے پاس جل رہی تھی اور ایک عجیب خاموشی طاری تھی۔ نظریں مبہوت تھیں اور ذہن میں دکاندار کے متعلق خیالات کا ایک ہجوم برپا تھا۔ گھنٹی جیسے بے صبری کے ساتھ دوبارہ بجی۔

دہلیز کے پاس ماما کے روبرو کھڑا ہوا تو چہرے پر مسکراہٹ سی تھی۔ بولا۔ "پولیس کو بلا لو تو بہتر ہے میں نے تمہارے آقا کو قتل کر دیا۔"

(علی گڑھ میگزین)

گونگی جورو

یہ ترجمہ بھی ہے اور خلاصہ بھی۔ اس دوگانہ وجہ سے، اصل کامیڈی کی سب لطافتیں فنا ہو گئی ہیں صرف کہانی باقی رہ گئی ہے لیکن صرف کہانی ہی کا منتقل کرنا مقصود بھی تھا ۔ اناطول فرانس نے اس قصے کو مشہور فرانسیسی مصنف رابیلے سے اخذ کیا ہے۔ رابیلے [illegible] سے سنوا دیا تھا۔ گویا کہانی دراصل بہت پرانی ہے۔ اناطول فرانس نے اسے نیا رنگ دے کر کامیڈی کی شکل میں پیش کیا۔

جو خاکہ اب آپ کے سامنے ہے، اس میں خوبیاں اساتذہ کی ہیں خامیاں میری ہیں

(پطرس)

پہلا ایکٹ

بوتال نامی پیرس کے ایک جج کا کمرہ

(ماسٹر آدم ایک بیرسٹر اس سے ملنے کے لئے آیا ہے۔)

آدم۔ (جھک کر آداب بجا لاتا ہے) زہے قسمت کہ آپ سے پھر ملاقات ہوئی۔

بوتال۔ واہ خوش قسمتی تو ہے میری کہیے۔ فرمائیے پیرس میں کس طرح آنا ہوا ؟

آدم۔ (کرسی پر بیٹھ کر) شارتر سے آیا ہوں۔ ایک سفارش کرنے کے لئے، ایک نوجوان خاتون کی۔ جس کے سر سے ماں باپ کا سایہ اٹھ گیا ہے۔ اس پر بڑا ظلم ہوا ہے۔ اس کا سرپرست اس کی سب جائداد ہضم کر گیا ہے بس اس مقدمے پر ہی اس کی قسمت کا دار و مدار ہے۔ اگر جیت گئی تو عمر بھر جہاں تک ہو سکا آپ کی ممنون رہے گی ورنہ . . . . .

بوتال۔ اچھا، اچھا ہم غور کریں گے۔

آدم۔ اب کچھ اپنی کہیے۔ تنہائی میں دن مشکل سے کٹتے ہوں گے۔ شادی کا ارادہ نہیں کیا ؟

بٹال۔ تم نے نہیں سنا؟ پچھلے ہی مہینے تو میں نے شادی کی ہے۔ ایک بڑے شریف گھر کی لڑکی سے۔ کیتھرین نام ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ وہ گونگی ہے۔

آدم۔ تو شادی سے پہلے تمہیں اس کا علم نہ تھا؟

بٹال۔ معلوم تو تھا۔ یہ بات بھی کب تک چھپی رہ سکتی تھی لیکن اس وقت مجھے اس کی پروا نہ تھی۔ ایک تو خوب صورت دوسرے بہت سا جہیز۔ میں نے سوچا چلو ہوا کیا۔ طبیعت بھی بہلے گی روپیہ بھی ہاتھ آئے گا۔ پر اب پچھتاتا ہوں۔ کچھ بات چیت کر سکتی۔ مقدمے والوں کی خاطر مدارات کرتی تو وہ بھی ہماری تواضع کرتے۔ کوئی مرغیاں لاتا، کوئی شراب کا پیپا دے جاتا لیکن اب تو یہ حالت ہے کہ گھر رونق سے محروم ہے اور میں خود بھی پژمردہ اور اداس رہتا ہوں۔ بیوی کیا ہے۔ ایک مشین ہے۔

آدم۔ بہری تو نہیں؟

بٹال۔ نہ۔ خیر سنتی تو تم ہم سے بھی زیادہ ہے۔

آدم۔ تو پھر کچھ مشکل نہیں۔ اگر کوئی گونگا شخص ساتھ ہی بہرہ نہ ہو تو اس کا علاج سہل ہے۔ آپ کے گھر کے پاس ہی ایک ڈاکٹر رہتا ہے۔ اس کا اپریشن اس بارے میں ہمیشہ کامیاب رہتا ہے۔

بٹال۔ میں ابھی اس کو بلاتا ہوں۔

آدم۔ تمہاری مرضی۔ لیکن اس کو بلانے سے پہلے ایک دفعہ سوچ لو۔ گونگی عورت کے جہاں کئی نقصان ہیں۔ وہاں کئی فائدے بھی ہیں۔

(آدم چلا جاتا ہے۔ جج اپنے ملازم کو ڈاکٹر کے گھر بھیجتا ہے۔ اس کے بعد
جج کی بیوی کیتھرین داخل ہوتی ہے)

بٹال۔ (کام کرتا کرتا رک جاتا ہے) آہا۔ میری جان۔ تم آ گئیں۔ مجھے تمہاری آہٹ تک سنائی نہیں دی۔ تم پریوں کی طرح خاموشی کے ساتھ گذر جاتی ہو۔ تم ایک خوشگوار خواب کی مانند ہو۔ تم قدرت کا ایک معجزہ ہو۔ تم میں سوائے ایک گویائی کے باقی تمام صفات موجود ہیں۔ اگر تمہیں گویائی کی قوت بھی عطا ہو جائے تو کیا تم خوش نہ ہو گی۔ جو جذبات اب مجھے تمہاری آنکھوں میں جھلکتے نظر آتے ہیں وہ تمہارے ہونٹوں سے ادا ہوں گے۔ تمہاری روح بے نقاب ہو جائے گی۔ تم اپنے منہ سے محبت کا اظہار کرو گی۔ اپنے شوہر کو اپنی زبان سے پکارو گی۔ میری جان میں تمہیں ایک خوش خبری سناتا ہوں۔ ایک ڈاکٹر ابھی آ کر تمہاری زبان کھول دے گا۔ تھوڑی ہی دیر میں تم چہچہانے لگ جاؤ گی۔

(کیتھرائن اشاروں سے بے انتہا مسرت کا اظہار کرتی ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر آتا ہے اور
سب کے سب اپریشن کی تیاری کے لئے ساتھ کے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔)

دوسرا ایکٹ

(جج کا گھر ——— شام کا وقت)

آدم۔ آپ نے میرے مؤکل کے مقدمے پر غور کیا؟

بوتال۔ ابھی نہیں۔ تم واقعات بھول گئے تھے۔ ہمیں پچھلے ہفتے کی فرصت نہ ملی۔ میں نے ڈاکٹر کو بلایا تھا۔ تمہارے مشورے پر عمل کیا۔ اب جان عذاب میں ہے۔ ڈاکٹر نے آپریشن کیا اور میری بیوی بولنے لگی۔

آدم۔ خدا کا شکر ہے۔ کیا کہا اس نے؟

بوتال۔ کچھ بھی نہیں۔ ذرا آئینہ دیکھا اور میری طرف متوجہ ہو کر بولی۔ میری جان! میری سالگرہ کے دن مجھے ساٹن کا ایک گون لا دو گے نا؟ — ساٹن کا گون اور ایک ٹوپی جس کے اندر مخمل کا استر لگا ہو۔

آدم۔ اس کے بعد اس کی زبان بند تو نہیں ہوئی؟

بوتال۔ نہیں بلکہ وہ متواتر گاؤن، [illegible]، تحفے کے بولتی رہی۔

آدم۔ شروع شروع میں تو یہ اچھا ہوا۔ بہت دنوں کی رکی ہوئی باتیں سب یک لخت نکلیں گی۔ بعد میں بولنا ذرا کم ہو جائے گا۔ میرے مقدمے کا خیال رکھئے۔ اس خاتون کا نام لیڈی آرملین ہے۔ خدا حافظ!

(آدم چلا جاتا ہے۔)

بوتال۔ (کاغذات پڑھنے لگ جاتا ہے) دوسرے جناب لیڈی آرملین . . .

(کیتھرین داخل ہوتی ہے)

کیتھرین۔ کیا کر رہے ہو میری جان؟ تم مصروف معلوم ہوتے ہو! تم ہمیشہ مصروف رہتے ہو۔ تم بہت کام کرتے ہو۔ دشمنوں کو کچھ ہو نہ جائے۔ میں کہتی ہوں کبھی آرام بھی کیا کرو، اور بھلا یہ تو بتاؤ کہ تم کیا کر رہے ہو؟

بوتال۔ میری جان......

کیتھرین۔ کیا کوئی راز کی بات ہے جس کے پوچھنے کا مجھے حق نہیں؟

بوتال۔ میری جان...

کیتھرین۔ کوئی راز کی بات ہے تو میں نہیں پوچھتی۔

بوتال۔ بات تو کرنے دو۔ میں ایک مقدمے کا فیصلہ لکھنے لگا ہوں۔

کیتھرین۔ تو بڑا ضروری کام ہوا نا؟

بوتال۔ بہت ضروری!

کیتھرین۔ تو میری جان تم اپنا فیصلہ لکھو میں کچھ نہ بولوں گی۔

بوتال۔ مقدمے کے واقعات یہ ہیں . . . . . لیڈی آرملین . . . .

کیتھرین۔ میری جان تمہاری رائے میں مجھے ریشم کا گون اچھا لگے گا۔ یا ترکی مخمل کا؟

بوتال۔ مجھے کیا معلوم، مجھے تو . . . . .

کیتھرین۔ میرا خیال ہے میری عمر کی عورت کو ساٹن اچھی لگے گی۔ بشرطیکہ ہلکے رنگ کی ہو اور اس پر چھوٹے چھوٹے پھول ہوں۔

بوتال۔ ممکن ہے۔ مگر.......

کیتھرین۔ اور دیکھو میری جان! تمہارے خیال میں گون کا گھیر بہت ہی زیادہ رکھنا بڑی بات نہیں۔ گھیر ہونا تو بیا ہی چاہیے اور معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کوئی کپڑا پہن رکھا ہے لیکن اتنا زیادہ بھی فضول ہے۔ تم دیکھنا یہ فیشن بھی اتر جائے گا۔ ٹھیک ہے نا؟

بپتال۔ بے شک مگر ....

کیتھرین۔ اور جوتے کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ عورت کا اندازہ ہی اس کا پاؤں دیکھ کر لگایا جاتا ہے۔ اور ضرور اچھی عورتیں جوتوں کا خیال سب سے زیادہ رکھتی ہیں۔ ٹھیک سمجھتا؟

بپتال۔ ٹھیک ہے مگر ....

کیتھرین۔ اچھا تم اپنا فیصلہ لکھو۔ میں نہ بولوں گی۔

بپتال۔ بہت اچھا (کاغذات اٹھا کر پڑھنے لگتا ہے) ـ مذکورہ بالا خاتون کے سرپرست نے خیانت مجرمانہ کا مرتکب ہو کر ....

کیتھرین۔ کل ہی مجھ سے ایک سہیلی کہہ رہی تھی کہ دنیا کا حال دن بہ دن بدتر ہوتا جا رہا ہے۔ ہر طرف بے ایمانی بڑھتی جاتی ہے۔ لوگوں میں دیانتداری اور شرافت نام کو نہیں۔ کیا یہ سچ ہے یا میری سہیلی یوں ہی مبالغہ کر رہی تھی؟ بولو میری جان!

بپتال۔ مہربانی کر کے یا تو تھوڑی دیر کو چپ ہو جاؤ یا کہیں اور جا کر بولتی رہو۔ میرے کام میں ہرج ہوتا ہے۔

کیتھرین۔ میری جان! تم اطمینان رکھو میں بالکل کچھ نہ کہوں گی۔

بپتال۔ اچھی بات (پڑھنے لگتا ہے) ـ مذکورہ بالا سرپرست نے اس خاتون سے بہت سا روپیہ ...

کیتھرین۔ میں کبھی کبھی سوچتی ہوں چیزیں مہنگی کتنی ہو گئی ہیں۔ پھر بھی تو ہم لوگ کفایت شعاری نہیں کرتے۔ دسترخوان پر جب تک دس دس کھانے نہ ہوں چین نہیں آتا۔ میں تو سمجھتی ہوں تھوڑی سی یخنی، تھوڑا سا گوشت، اور ایک میٹھی چیز بس یہ کافی ہونا چاہیے۔ لیکن لوگ میٹھے بھی تو بہت سے چاہتے ہیں۔ میری جان! تم کو ایسے لوگوں سے نفرت نہیں ہوتی؟ اور یوں کھانے کو کس کا جی نہیں چاہتا کھانے کے بغیر گزارہ کس طرح ہو؟ لیکن ذرا سوچو تو۔ لوگ کیسی کیسی بدمزہ اور غلیظ چیزیں کھاتے ہیں۔

بپتال۔ میں بالکل پاگل ہو جاؤں گا۔ میں پاگل ہو جاؤں گا۔

کیتھرین۔ میری جان! میں اب اور کچھ نہ کہوں گی۔ ممکن ہے تمہارا ہرج ہوتا ہو۔ میں وہاں تک جاؤں گی۔

بپتال۔ تمہاری بڑی مہربانی۔

(وقفہ)

کیتھرین۔ دیکھا میری جان! میں اب کچھ کہتی ہوں؟ بالکل چپ بیٹھی ہوں۔

بپتال۔ ٹھیک۔

(وقفہ)

کیتھرین۔ اب تو تمہارا ہرج نہیں ہوتا؟

بپتال۔ بالکل نہیں۔

(وقفہ)

ب اطمینان سے اپنا فیصلہ لکھو کیا ختم نہیں ہوا ابھی؟

ر (قلم لے کر) نا بندی کا ابھی ختم نہ ہوگا۔ (مسئلے میں مصروف ہو جاتا ہے)

(ایک گھنٹہ کہیں بجاتی ہے) اف! معلوم ہوتا ہے کہیں آگ لگی ہے۔ (فائر کا شور سنائی دیتا ہے) (تماشا کھڑا ہو جاتا ہے) نہیں نہیں۔ میں غلطی پر ہوں۔ خدا کا شکر ہے آگ نہیں لگی۔ آہ! جب کہیں آگ لگتی ہے تو کیسی مصیبت ہوتی ہے گھروں میں کہرام مچ جاتا ہے لوگ اپنا اسباب دریا میں پھینک دیتے ہیں اور کھڑکیوں میں سے کود کر۔ باہر نکل آتے ہیں خوف اور ڈر کے مارے لوگ دیوانے سے ہو جاتے ہیں۔

بس اب اس سے زیادہ برداشت کرنا ناممکن ہے اگر یہی حالت رہی تو مجھ سے کوئی شدید جرم سرزد ہو جائے گا۔ (نوکر کو آواز دیتا ہے) دیکھو جا کر ڈاکٹر صاحب کو ابھی بلا لاؤ۔ کیونکہ بہت ضروری کام ہے۔ جلدی آجائے۔

کیا ہے میری جان! تم کچھ پریشان معلوم ہوتے ہو۔ موسم کی خرابی ہے یا کھانے میں کچھ نقص تھا؟

اے کاش! میں نے تمہاری زبان نہ کھلوائی ہوتی۔ لیکن گھبراؤ نہیں۔ ابھی ڈاکٹر آ رہے ہیں۔ ان سے تمہاری زبان کو بند کروا دوں گا

(کاغذ اٹھا کر کیتھرین کے منہ پر مارتا ہے۔ کیتھرین چیخیں مارتی ہوئی کمرے سے باہر نکل جاتی ہے ـــــــــــ ڈاکٹر داخل ہوتا ہے)

ڈاکٹر صاحب! مجھے آپ کی سخت ضرورت ہے۔ میں نے آپ کو اپنی بیوی کے علاج کے لئے بلایا ہے۔

کیا انہیں کوئی تکلیف ہے؟

ہے؟ مجھے کیا تکلیف ہوتی۔ بدقسمت ستم رسیدہ مظلوم تو میں ہوں۔

تکلیف آپ کو ہے علاج آپ اپنی بیوی کا کرانا چاہتے ہیں!

ڈاکٹر صاحب اسے گویائی کی طاقت آپ نے بخشی تھی تو اس قدر فیاضی سے کیوں کام لیا تھا۔ کیا اس کی زبان کسی طرح بند ہو سکتی ہے؟

بالکل ناممکن! بولتے ہوئے آدمی کو گونگا بنانا میری قدرت سے باہر ہے۔

آپ نے میرا دل توڑ دیا ہے میں اجڑ گیا اب تو میں صرف یہی کر سکتا ہوں کہ اپنے گلے میں ایک بھاری سا پتھر باندھ کر دریا میں کود پڑوں۔

تمہاری بیوی کا تو کوئی علاج نہیں البتہ تمہارا علاج ہو سکتا ہے۔

وہ کیسے!

بہت بولنے والی بیوی کا دفعیہ تو صرف یہی ہے کہ شوہر کو بہرا بنا دیا جائے۔ میرے پاس ایک سفید سفوف ہے جسے کان میں ڈالتے ہی انسان ہمیشہ کے لئے بہرہ ہو جاتا ہے

ہمیشہ کے لئے!

ہمیشہ کے لئے!

نہیں مجھے یہ ہرگز منظور نہیں۔ میں بہرا بننا نہیں چاہتا۔

(کیتھرین داخل ہوتی ہے)

کیتھرین۔ اوہ! یہاں تو ڈاکٹر صاحب آئے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب۔ بیگم آپ کو اب بولنے میں تکلیف تو نہیں ہوتی؟

کیتھرین۔ ڈاکٹر صاحب! میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ شروع شروع میں تو صرف چند مرتبہ ہی بول سکتی تھی لیکن اب روانی کے ساتھ گفتگو کر سکتی ہوں تاہم میں ضرورت سے زیادہ نہیں بولتی۔ ابھی ابھی میرا شوہر کہہ رہا تھا۔ میں چپ چاپ بیٹھی تھی لیکن پھر بھی میرے شوہر کو شکایت ہے کہ تمہارے بولنے سے میرے کام میں ہرج ہوتا ہے (شوہر سے مخاطب ہو کر) میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم ناراض کس بات پر ہو؟ آخر وجہ کیا ہے؟ کوئی بات تو ایسی ضرور ہے جو تم مجھے نہیں بتاتے! للہ مجھے کچھ تو بتاؤ۔ میرا فرض ہے کہ میں تمہاری آسائش کا خیال رکھوں اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو میں آئندہ کے لئے احتیاط کروں گی۔ میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم رنجیدہ نہ ہو۔ اماں جان کو خدا جنت نصیب کرے کہا کرتی تھیں کہ میاں بیوی کو ایک دوسرے سے کوئی بات نہ چھپانی چاہئے۔ بے چاری سچ کہتی تھیں۔ دل میں کبھی کوئی بات نہ رکھنی چاہئے۔ جو ہو صاف صاف کہہ دینا چاہئے۔ میرا خدا جانتا ہے میں نے کوئی قصور نہیں کیا اگر پھر بھی تمہارا یہ خیال ہے کہ میں گنہگار ہوں تو بے شک ڈاکٹر کے سامنے سب حال بیان کر دو۔

بوتال۔ (بے بس ہو کر) ڈاکٹر صاحب! خدا کے واسطے وہ سفید سفوف میرے کان میں ڈال دیجئے۔ (ڈاکٹر بوتال کے کان میں سفوف ڈال دیتا ہے)

کیتھرین۔ میری جان۔ میرے سرتاج! آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ کیا میں ایسی ہی بے رحم ہوں کہ تمہیں ستاؤں؟ میں نے تم سے کبھی کوئی دغا کی ہے؟ کبھی تمہیں دھوکا دیا ہے؟

بوتال۔ (مونچھوں پر تاؤ دے کر) آہا! زندگی کس قدر شیریں ہو گئی ہے! مجھے اب ایک لفظ بھی سنائی نہیں دیتا۔

کیتھرین۔ بوتال! میری بات سنو! میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ میں تمہیں اپنے دل کا حال سناتی ہوں۔ میرا دل بچپن ہی سے نرم تھا جب میں سات سال کی تھی۔ تو میرے پاس ایک چھوٹا سا کتا تھا۔۔۔ سن رہے ہو؟ میری جان! میری روح! میرے شوہر! (بوتال کو جھنجھوڑتی ہے)

بوتال۔ زندگی اب ایک جنت ہے۔

(آزاد)

صید و صیاد

۲ دسمبر ۱۸۸۲ء کو رات کے وقت پیرس کا ایک نوجوان دریائے سین کے کنارے پل پر چلا جا رہا تھا۔ اس نے اس جہانِ فانی سے ہمیشہ کے لئے اپنا تعلق منقطع کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔ اس کے قدم نہایت آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے۔ جوں جوں وہ اپنی منزل کے قریب پہنچ جاتا، اس کے دل میں اطمینان اور سکون بڑھتا جاتا تھا۔

یہ نوجوان (جس کا نام ایڈمنڈ سیورین تھا) جب پل کے عین وسط میں پہنچ گیا تو جنگلے پر جا کر کھڑا ہو گیا اور نیچے بہتے ہوئے پانی کو گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس کا جسم تھرتھرا رہا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن ایک لمحے کے لئے تیز ہوئی لیکن پھر وہ سنبھل گیا اور فاتحانہ انداز میں اپنا اوورکوٹ اتارنے لگا۔

اوورکوٹ کو تہ کر کے اس نے بینچ پر رکھ دیا۔ تھوڑے سے تامل کے بعد اس نے جنگلے کو مضبوط پکڑا اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ دریا میں کودنے ہی کو تھا کہ کسی نے اسے کندھے سے پکڑ لیا اور اس کے کانوں میں آواز آئی "ذرا ٹھہر جائیے حضرت۔"

اس موت کے تمنائی نے اجنبی کے ہاتھ کو ایک جھٹکے سے ہٹا دیا اور پھر چھلانگ لگانے کو تھا لیکن اب کے بار اس کے کندھے کو دو ہاتھوں نے زور سے کھینچ لیا اور پھر وہی آواز آئی "حضرت! ذرا ٹھہر جائیے، صرف ایک گھنٹے کے لئے ٹھہر جائیے۔ کیا اتنا بھی آپ کو بہت معلوم ہوتا ہے؟"

سیورین نے مڑ کر دیکھا۔ اجنبی درمیانہ قد کا ایک دبلا پتلا سا آدمی تھا۔ چہرے کے نقش باریک جن پر نیکی یا بدی کسی صفت کی کوئی تحریر نہ تھی۔ صرف ایک تفکر سا تھا۔ آواز اس نازک وقت میں بھی نہایت مطمئن معلوم ہوتی تھی۔

لیکن موسیو سیورین کو غصہ سا آ گیا۔ اس نے اپنے دل کو جس محنت سے خودکشی پر آمادہ کیا تھا اس کا یوں رائیگاں جانا اسے ناگوار معلوم ہوا۔

وہ جھلا کر بولا "آپ ہوتے کون ہیں؟"

اجنبی نے کہا "حضرت یہی تو میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔ میرا ایک کام ہے جو پیرس بھر میں سوائے آپ کے کوئی نہیں کر سکتا۔ ورنہ میں کاہے کو مخل ہوتا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ اگرچہ آپ کا خودکشی کا طریقہ نہایت بھدا سا ہے لیکن میں کیوں دخل دیتا۔ لیکن بات یہ ہے کہ اس وقت ایک خاتون کو آپ کی امداد کی بہت ضرورت ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو آپ یقین جانیے میں کبھی یوں آپ کو تکلیف نہ دیتا۔"

سیورین بڑی درشتی سے ہنس کر کہنے لگا "تم نے میرے پاس آنے میں غلطی کی ہے۔ ایک عورت ہی کی خاطر تو میں یہ (اس نے دریا کی

طرف ہاتھ پھیلا دیا۔ "وقت کی جنس میں یہاں جان کا حرج ادا کرنے آیا ہوں۔ اس سے زیادہ میں کیا کر سکتا ہوں؟"

اجنبی بولا "قصور ایک عورت کا اور آپ سب عورتوں کو الزام دے رہے ہیں۔ اب انکار نہ کیجئے میں آپ کے منہ سے "نہ" نہیں سنوں گا۔ دوبارہ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ایک خاتون کی چوک سے درگزر کیجئے۔ ایک نوجوان خاتون کی۔ ایک حسین خاتون کی۔ آپ اپنے سفر کو ایک گھنٹہ تک ملتوی کر دیجئے۔ محض ایک گھنٹہ تک۔ کیا یہ بہت زیادہ ہے؟ اس وقت سے لے کر ایک گھنٹہ تک بھی زمانہ ہے آپ اس کے مالک و مختار ہیں۔ کیا آپ اس میں سے ایک گھنٹہ بھی کسی کو نہیں بخش سکتے؟"

سیوین نے جو باوجود ناراض ہونے کے اجنبی کی باتوں کو غور سے سننے لگا تھا، پوچھا "تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

اجنبی نے کہا "یہ دیکھئے میں ابھی آپ سے کہتا ہوں۔ یہاں سردی ہے آپ اتنی مہربانی کیجئے کہ اپنا اوور کوٹ پہن لیجئے۔ اور میرے ساتھ اس شراب خانے تک چلے چلیے۔ وہ جہاں سرخ روشنی نظر آ رہی ہے۔ جو کچھ مجھے کہنا ہے آپ وہاں پہنچ کر سن لیجئے۔ اگر اس سے آپ کی تشفی نہ ہوئی تو آپ بے شک واپس آ جائیے۔ اس میں ہرج ہی کیا؟"

سیوین نے دیر تک کچھ سوچا اور اجنبی کی بات مان لینے کو تیار ہو گیا۔ اپنا کوٹ پہنا اور ساتھ ہو لیا۔

اجنبی نے کہا "شکر ہے کہ آخر کار آپ مجھے مل گئے ورنہ خدا جانے میں کہاں مارا مارا پھرتا۔ آج رات مجھے آپ سے پہلے دو آدمی آپ ہی کی طرح کے اور ملے تھے لیکن وہ کسی کام کے نہ تھے۔ بد تمیز کہیں کے۔ میری سنی ہی نہیں میں کرتا کیا۔ اس وقت وہ دونوں دوسری دنیا میں ہیں۔ اور شاید تمنا کر رہے ہیں کہ کسی طرح واپس پیرس پہنچ جائیں۔ لیکن آپ بالکل میرے مطلب کے آدمی ہیں —— یہ لیجئے ہم پہنچ گئے یہ شراب خانہ ہے تو چھوٹا سا لیکن کیا معقول ہے...... پہلے آپ صاحب۔"

دونوں کمرے میں ایک طرف کو ہو کر بیٹھ گئے۔ اور ایک دوسرے کو غور سے دیکھنے لگے۔ اجنبی کی شکل پہلے کی بہ نسبت زیادہ عقاب سے مشابہ اور زیادہ متفکر معلوم ہوتی تھی۔ لیکن یوں دیکھنے میں برا نہ تھا۔ موسیو سیوین پچیس برس کی عمر کا نوجوان تھا۔ چہرے کے نقش نفیس ترشے ہوئے، لباس پیرس کے دیہاتیوں کا، رنگ ذرا زرد۔ بولا "تو تمہارا کیا مقصد ہے؟"

اجنبی نے کہا "مجھے اپنا مقصد تفصیل سے بیان کرنے کی فرصت نہیں، میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ میرے لئے "شیر شکاری" کھیلئے۔ "شیر شکاری" کے کھیل سے تو آپ واقف ہوں گے؟"

"نہیں"

"افسوس! انسان اپنی شہرت پر کیا بھروسہ کر سکتا ہے۔ تو حضرت آپ نے میرا نام تو یقیناً سنا ہوگا؟ مجھے پول کہتے ہیں۔"

سیوین نے کہا "کہتے جاؤ، میں نے تمہارا نام کبھی نہیں سنا۔"

پول مایوسی کے لہجے میں بولا "جب تو مجھے بہت ہی افسوس ہے۔ تو جناب سنئے۔ جو حضرات اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا چاہیں ان کے لئے میں نے ایک ایسا طریقہ ایجاد کر رکھا ہے جس پر انہیں کسی طرح کی ملامت نہ ہو سکے۔ اگر آپ کو اس بات کا علم ہوتا تو آپ دریائے سین کے پاس جانے کی بجائے یقیناً میرے پاس آتے۔ اگر اشتہار دینے میں مجھ سے کوئی دقیقہ فروگذاشت ہو گیا ہے تو یہ میرا قصور نہیں۔ میں مجبور ہوں۔ میرا کام ہی ایسا ہے۔ لیکن میرا خیال تھا کہ آپ نے معزز طبقوں میں میرا ذکر ضرور سنا ہوگا۔"

سیوین نے کہا "جو کچھ تمہیں کہنا ہے جلدی کہو، آدھ گھنٹے سے زیادہ گزر چکا ہے اور مجھے ابھی تک کچھ پتہ نہیں چلا۔"

یول نے کہا "میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں۔ دیکھئے [illegible] صاحب بات یہ ہے کہ آپ جانتے ہیں یہ کھیل ایک ہسپانوی کھیل ہے۔ [illegible] زندگی کے آخری لمحوں میں بھی [illegible] ایسے موجود ہیں جو آپ کو [illegible] کے لئے تیار ہیں [illegible] زیادہ پر لطف بنا دیا وہ خوبصورت بنا سکتا ہے۔ [illegible] کا لطف حاصل کر سکتے ہیں [illegible] ایک کا انجام قطعی یقینی ہوتا ہے [illegible] ہیں کہ کون شیر ہے اور کون شکاری۔ اس کے بعد [illegible] ان سے تمام [illegible] میں چھوڑ دیا جاتا ہے [illegible] موسیقی [illegible] جاتی ہے پھر موسیقی بند ہو جاتی ہے شیر کی حرکت سے [illegible] ایک دفعہ اور پھر ایک دفعہ اور۔ پھر چراغ روشن کر دئے جاتے ہیں اگر شیر زخمی ہو گیا ہو تو وہ یقیناً مر جاتا ہے کیونکہ گولیاں زہر آلود ہوتی ہیں۔ اگر وہ بچ جاتا ہے تو [illegible] شکاری [illegible] اور یہ کھیل پھر سے شروع ہو جاتا ہے اسی طرح کھیل جاری رہتا ہے حتیٰ کہ ان میں سے ایک رخصت ہو جاتا ہے۔ پہلے پہل صرف مردوں میں اس کھیل کا رواج تھا۔ لیکن جب اس کی شہرت بہت بڑھ گئی۔ تو بعض عورتوں نے بھی اس میں شرکت کی درخواست کی۔ یہ بات کسی قدر پسند کی گئی۔ اب جہاں تک ممکن ہو سکے۔ ایک مرد اور ایک عورت کو شریک بنایا جاتا ہے۔ عام طور پر دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوتے ہیں۔ تو صاحب اس کھیل کو بہت پسندیدگی نصیب ہوئی ہے میں نے اس میں ایک دو ترمیمیں بھی کی ہیں۔ [illegible] کبھی کبھی ایک خالی کارتوس بھی بھر دیتا ہوں [illegible] اور کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ کون سا کارتوس خالی ہے اس سے ذرا لطف اور بھی بڑھ جاتا ہے معزز حضرات اور معزز خواتین کو اب اس بات کی ضرورت نہیں کہ وہ دریائے [illegible] میں پڑے پائے جائیں۔ وہ صاحب اس پرلطف موت کو ترجیح دیتے ہیں۔"

سیورین نے پوچھا "لیکن تمہاری اس ہرزہ سرائی کو مجھ سے کیا تعلق؟ اگر مجھے اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا منظور ہے تو یہ میرا اپنا ذاتی معاملہ ہے۔ تم اس میں کیوں دخل دیتے ہو؟ میں سمجھتا ہوں تمہیں اپنے اس قبیح فعل کے لئے کسی فیس کی توقع ہے تو وہ پھر تم کو مجھ سے نہ ملے گی۔ میں واپس چلا جا رہا ہوں۔ اور نہیں سمجھتا کہ کسی طرح بھی تمہارا ممنون ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اپنی ٹوپی کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

یول نے نوجوان کا کوٹ پکڑ کر کہا "خدا کے لئے پانچ منٹ یہاں اور ٹھہر جائیے۔ میں آپ سے کوئی فیس نہیں مانگتا۔ آج رات ایک ڈیوک اور ایک خاتون کو آپس میں یہ کھیل کھیلنا تھا۔ خاتون تو پہنچ گئی ہیں لیکن ڈیوک صاحب ابھی تک تشریف نہیں لائے۔ ان کے بغیر کھیل کیسے کھیلا جا سکتا ہے اس طرح کا واقعہ کبھی پہلے پیش نہیں آیا۔ اس میں میری سخت بدنامی ہے۔ [illegible] یہ خبر پہنچی تو میری ناموری میں خلل آ جائے گا۔ آپ چل کر ڈیوک کی جگہ لے لیجئے۔ اور مجھے اور اس خاتون کو اپنا شرمندۂ احسان بنائیے اگر خدانخواستہ آپ اس کے نشانے سے بچ گئے۔ تو آپ اس پر [illegible] کر کے واپس یہاں تشریف لے آئیے۔"

سیورین نے گھبرا کے پوچھا "تم چاہتے ہو میں اس کی جان لوں۔"

یول نے کہا "یہ کیا ضروری ہے۔ ممکن ہے آپ اس کا نشانہ بن جائیں۔ آپ یہ بتائیے کہ آپ کو دونوں میں سے کون سی بات پسند ہے

چشم زدن میں ایک حسین خاتون کے ہاتھوں مرنا یا ایک ندی میں پڑے سڑتے رہنا۔ حالاں اس بات کا بھی خطرہ سا تو لاحق ہے کہ کوئی غذائی زہر مار کے اندر پہنچے۔ کس قدر شرم کی بات ہے۔ میرے ہاں آپ کی تسلی کو کم از کم یہ خیال تو ہوگا کہ آپ کی موت دل پسند صحبت میں واقع ہوئی ہے۔

سیوین نے کہا "ممکن ہے یہ بات ہو کہ مرنے کو ایک حسین عورت کے قتل پر ترجیح دوں۔ تمہیں تمہاری ایجاد مبارک ہو۔ جس کی بدولت تم خدا جانے کتنے انسانوں کو پیش از وقت مار رہے ہو۔"

موجد بولا "حضرت آپ بہت جلد بازی سے کام لے رہے ہیں آپ کے الفاظ سے مجھے صدمہ پہنچا ہے ذرا آپ غور تو فرمائیے۔ میں نے کسے جا کر کہا کہ تم قبل از وقت مر جاؤ۔ میرے پاس تو وہی لوگ تشریف لاتے ہیں جنہوں نے مر جانے کا مصمم ارادہ کر لیا ہوتا ہے۔ اس کا فائدہ کیا ہے؟ یہ (جیب سے ایک پاکٹ بک نکال کر) یہ میرے بہی کھاتے کا حساب سنئے۔ آج تک کل بیاسی فرمائشیں ہو چکی ہیں جن میں سے ۴۴ مردوں کی تھیں اور اڑتیس عورتوں کی۔ کل بیالیس بازیاں کھیلی جا چکی ہیں۔ نتیجہ؟ بیالیس اموات۔ اب حضرت! اگر میرے مربی اپنا طریقہ مرگ خود سوچتے تو اموات کی تعداد اس سے قریباً دگنی ہوتی ہے نہیں؟ جناب والا! میں تو مصیبت زدہ نوع انسان ہوں۔ میں تو جانیں بچاتا ہوں۔"

سیوین نے کہا "اور تمہیں اس بات کا خیال نہیں کہ جو لوگ تمہاری بازی کے بعد زندہ بچ جاتے ہیں۔ وہ پھر کسی اور طرح خودکشی کر لیتے ہیں؟"

"حضور مجھے معاف کیجئے۔ آپ پھر غلطی پر ہیں۔ پہلی اکتالیس بازیوں میں سے جو زندہ بچ گئے۔ ممکن تھا کہ وہ سب آپس میں پھر یہ کھیل کھیلتے حتیٰ کہ ان میں سے صرف ایک باقی رہ جاتا۔ لیکن ہوا یوں کہ زندہ بچ جانے والوں میں سے صرف ایک نے دوبارہ مرنے کی خواہش کی۔ اس ایک کے باقی سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اور جاتے ہوئے میرا شکریہ ادا کرتے گئے۔ اندھیرے میں گولی کے چلنے کا ڈر، ایک مختصر مگر شدید انتظارِ مرگ، مجروح نعش کا گھناؤنا نظارہ۔ یہ ایسی ہیبت ناک باتیں ہیں کہ جو لوگ زندہ رہ جاتے ہیں وہ پھر فیصلہ کر لیتے ہیں کہ مرنا ہے تو گھر میں جا کر طبعی موت ہی مریں۔ — حضور! اگر آپ چل کر اس خاتون کے سر پر تھوڑا سا احسان کر دیں۔ اور خوش قسمتی یا بدقسمتی سے آپ اس کی گولیوں سے بچ جائیں تو مجھے یقین ہے کہ آپ خدا تعالیٰ کا شکریہ ادا کریں گے کہ آپ زندہ بچ گئے۔"

سیوین نے کہا "خیر یہ بات تو غلط ہے لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ تمہاری باتیں بہت دلچسپ ہیں۔ مختصر یہ کہ میں یہ کھیل کھیلنے کو تیار بقول تمہارے زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ میری موت چند گھنٹے دیر میں آئے اور کیا؟"

تیل بے انتہا مسرور ہوا اور بڑے چٹخارے دار فقروں میں شکریہ ادا کرنے لگا۔

سیوین نے اس کی بات کو کاٹ کر کہا "بل ادا کر دو اور چلو چلیں۔ بہت وقت ضائع ہو چکا ہے۔"

شراب خانے سے نکلے تو تیل آگے آگے چلنے لگا۔ چلتے چلتے وہ تنگ و تاریک گلیوں میں پہنچ گئے۔ جہاں کہیں کہیں ایک آدھ لالٹین لیمپ ناکام روشنی رات کی سیاہی کو اور بھی تاریک کر دیتی تھی۔ تیل نہایت روانی سے باتیں کرتا جاتا تھا شاید اس ڈر سے کہ کہیں اس کا ساتھی خاموشی سے گھبرا کر واپس ہو جانے کا ارادہ نہ کرے۔ دن بھر کی تازہ خبروں پر تبصرہ کرتا رہا۔ کبھی دربار شاہی کے معاملات پر اور کبھی تازہ ترین ڈرامے کے متعلق کہ فلاں ایکٹر نے بہت بری طرح ایکٹ کیا۔ اور گزرتے وقت بے ربطی ہو گئی۔ اور جب اس طرح کی باتیں ختم ہو چکیں تو اس نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔ اور چاند ستاروں کے متعلق ایک تقریر شروع کر دی۔ سیوین بالکل خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔

کوئی بیس منٹ چلنے کے بعد وہ ایک کشادہ بازار میں پہنچے اور ایک کسی قدر خستہ گھر کے دروازے کے سامنے آکر ٹھہر گئے۔ تیل نے

ایک منٹ کی بجائے کچھ تھوڑی دیر کے بعد دروازے کی ایک کھڑکی میں سے کسی نے باہر جھانکا اور آواز آئی "کون ہے؟"

پیل نے کہا "میں ہوں دروازہ کھولو۔"

دروازہ کھلا اور دونوں اندر داخل ہوئے۔ پیل نے پوچھا "وہ خاتون ابھی بیٹھی ہیں؟" جواب ملا "ہاں صاحب" "ڈرائنگ روم میں؟" جواب ملا "نہیں صاحب۔"

پیل نے اپنے ساتھی کی آستین پکڑ کر کہا "آئیے۔"

دونوں ایک کمرے میں داخل ہوئے جہاں ایک [illegible] ساتھ کا کمرہ [illegible] ایک [illegible] تھا۔ صوفے پر ایک عورت سوئی پڑی تھی شکل حسین تھی۔

سیون نے ذرا سر مڑ کر پوچھا "کیا یہی وہ خاتون ہیں؟"

پیل نے کہا "نہیں صاحب۔ یہ تو پیانو بجانے والی عورت ہے۔ انتظار کرتے کرتے تھک کر سو گئی ہے۔ وہ خاتون تو ساتھ کے کمرے میں ہیں۔ آپ اپنی ٹوپی اور لبادہ اتار کر یہاں لٹکا دیجئے۔ اور یہ ایک معمولی سی رسم ہے جسے بجا لا کر دیکھئے یعنی یہ نیم نقاب پہن لیجئے۔ گستاخی معاف یہاں کا سب سے مقدم اصول ہے۔ ٹھیک۔ اب تشریف لائیے۔"

ساتھ کا کمرہ پہلے کمرے سے بڑا تھا۔ فرنیچر تھوڑا مگر جس قدر بھی تھا اچھا تھا۔ ایک دیوار تصویروں سے بالکل عاری تھی۔ انگیٹھی میں لکڑیاں جل رہی تھیں۔ اور آگ کے سامنے ایک عورت نہایت قیمتی لباس پہنے بیٹھی تھی۔ دروازہ کھلا تو وہ چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور کہنے لگی "اب تک کیا کیا؟ اتنی دیر کر دی تم نے۔ اگر میرا دل مضبوط نہ ہوتا تو میں کب کی واپس چلی گئی ہوتی۔"

پیل نے کہا "بیگم صاحبہ میں تہ دل سے معافی کا خواستگار ہوں کچھ مشکلات پیش آ گئی تھیں جن کی وجہ سے میں رک گیا۔ یہ میرے ساتھ جو صاحب ہیں۔ یہ ان بے وفا حضرت کی قائم مقامی کریں گے جو آنے کا وعدہ کر کے نہیں آئے۔ اب قاعدے کی رو سے آپ کو آدھ گھنٹہ دیا جاتا ہے آپ اس میں ایک دوسرے سے واقفیت پیدا کیجئے۔ یا دنیا کے لئے کوئی پیغام چھوڑنا ہو تو وہ لکھ ڈالئے۔"

عورت نے اٹھ کر کہا "نہیں میں فرصت سے [illegible] انتظار کر چکی ہوں۔ یہ ابھی اور انتظار کیا معنی؟ اجنبی صاحب اگر ہم قاعدے کی خلاف ورزی کر کے یہ آدھ گھنٹہ استعمال میں نہ لائیں تو آپ کو اس میں کیا اعتراض ہے؟"

سیون نے کہا "سچ بات یہ ہے کہ تھوڑی دیر ہوئی میں فوراً اس دنیا سے رخصت ہو جانا چاہتا تھا لیکن کچھ پیل کی باتوں کا اور کچھ آپ کی ملاقات کا مجھ پر یہ اثر ہوا کہ مجھے تعجیل کا کوئی فائدہ معلوم نہیں ہوتا۔ آپ یہ آدھ گھنٹہ ٹھہر جائیے مجھے آپ سے یہ درخواست کرنے کا حق ہے کیونکہ آپ ہی نے میرے اصلی ارادے کو درہم برہم کر دیا ہے۔ آپ نہ ہوتیں تو میں اس وقت دریا کی تہ میں پڑا ہوتا یا بہہ کر سمندر تک پہنچ گیا ہوتا۔"

خاتون نے کہا "جس طرح آپ کی مرضی ہو صاحب! لیکن افسوس کہ میں اس وقت اپنی رفاقت میں کوئی دل پذیری پیدا نہیں کر سکتی۔"

چند منٹ تک کمرے میں بالکل خاموشی رہی۔ جس میں سیون اس حسینہ کے چہرے کا مطالعہ کرتا رہا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ نقاب نے چہرے کے بالائی حصے کو مستور کر رکھا تھا لیکن پھر بھی ٹھوڑی کی گولائی، ہونٹوں کی کمان، چھوٹے چھوٹے کانوں کی خوب صورتی جو بالوں کے گھونگریالے جال میں سے جھانک رہی تھی۔ اس بات کے لئے کافی تھیں کہ سیون نقاب پوش حصے کے متعلق غور کرنے لگ جائے شاید خاتون بھی اسی طرح اس کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ بہرحال ان کی آنکھیں کبھی کبھی چار ہو ہی جاتی تھیں۔

اتنے میں خاتون بولی "جناب! اگر میں اپنی زندگی کے آخری لمحے بھی گذار رہی ہوں تو ہنس کھیل کے ہی گزار دوں۔ دو گھنٹے خاموش بیٹھی چکی ہوں۔ خدا میرے دل کو بہلنے دیجئے۔ خدا کے لئے بات ہی کیجئے!"

سیون نے کہا "بیگم! بسر و چشم۔ کیا بات کروں۔ اچھا ستاروں ہی کی بات کرتا ہوں۔ جب میں اوپر کو آ رہا تھا تو رستے میں قطب ستارہ کے متعلق باتیں کرتا رہا تھا۔ ایک طرف کو زہرہ دکھائی دے رہی تھی۔ یوں نے مجھ سے پوچھا تھا "یہ زہرہ یہاں کیسے آگئی؟" اسی قسم کا ایک سوال اس وقت میرے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ زہرہ یہاں کیسے آگئی؟ کیا دنیا میں کوئی ایسا دل باقی نہیں رہا جسے توڑا جا سکے۔ کوئی ایسا انسان موجود نہیں جو حسن کا فریب کھا سکے۔ دلوں کے توڑنے کا مشغلہ اسی قدر دل چسپ ہے جس قدر یہ کھیل جو ہم کھیلنے والے ہیں۔ اس کی طرح اس میں بھی صرف ایک ہی آدمی مجروح ہوتا ہے۔ میں پھر پوچھوں گا زہرہ یہاں کیسے آگئی؟"

خاتون نے جواب دیا "جناب معلوم ہوتا ہے آپ کو تشبیہوں کا بہت شوق ہے۔ یہ سوال آپ کسی اور وقت پوچھتے تو میں اس کا آپ کی دیدہ دلیری کی تعریف اور خاموشی کے سوا دوسرا جواب دینا گوارا نہ کرتی۔ لیکن اب چونکہ ہم میں سے ایک کو صرف آدھ گھنٹہ اور زندہ رہنا ہے میں سمجھتی ہوں کہ صاف گوئی سے کام لیا جائے تو بہتر ہوگا۔ تو جناب زہرہ کے یہاں موجود ہونے کی وجہ عطارد ہے۔ جس کی ظاہرا شکل و صورت تو ایک اچھے بھلے انسان کی تھی لیکن دل دغا سے بھرا ہوا تھا۔"

سیون نے کہا "اس کے اور حالات سے مجھے آگاہ کیجئے۔"

خاتون نے حقارت آمیز لہجے میں کہا "میں اس سے زیادہ کیوں بتاؤں۔ میں اس کے بعد راز کا اظہار کر سکتی ہوں۔ گمنام صاحب! آپ بتائیے۔ آپ یہاں کیوں تشریف لائے ہیں؟" (معاف کیجئے میں آپ کو کسی آسمانی نام سے نہیں پکارتی)

"بیگم صاحبہ! میرے یہاں آنے کا باعث حسن و خوبی کا ایک درخشندہ ستارہ ہوا ہے جو میرے ساتھ قران میں آیا ہے۔ اور کچھ عرصے تک میری ہمراہی میں گردش کرتا رہا۔ لیکن یہ ستارہ آخر میں آپ کے عطارد کی طرح کج رفتار نکلا۔ اب وہ ایک سیاہی کی آغوش میں چھپ گیا ہے۔ یہ دنیا اس کے بغیر تاریک ہے اس لئے میں کسی دوسری دنیا میں جانا چاہتا ہوں۔"

"تو آپ سے ایسا سلوک پہلے کبھی نہیں ہوا؟"

"کبھی نہیں۔ اسی لئے میں نے قسم کھالی ہے کہ پھر اس طرح کا واقعہ کبھی پیش نہ آنے دوں گا۔"

"آپ کے خیال میں وہ خاتون اس قابل ہے کہ اس کے لئے جان یوں قربان کر دی جائے۔"

"کیا آپ کا محبوب اس قابل ہے؟"

خاتون نے جوش میں آکر کہا "ہرگز نہیں۔ قطعاً نہیں۔ آپ یہ نہ سمجھئے کہ میں موت کو دل شکستہ کا مرہم جان کر اس کی طلبگار ہوں۔ آپ کا شاید یہ خیال ہو لیکن میں تو صرف اس لئے مرنا چاہتی ہوں کہ مبادا دربار شاہی کے لوگ میری ہنسی اڑائیں۔ زندگی میں پہلے بھی ایک دفعہ مجھ سے یوں دغا کی گئی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ تیسری دفعہ پھر یوں ہو! مرد سب کے سب دغا باز ہیں۔"

"بیگم صاحبہ! ایک آپ کو چھوڑ کر عورتیں بھی کچھ کم نہیں۔"

بات کو یہاں پہنچا کر دونوں غمزدہ نظروں سے آگ کے شعلوں کو دیکھتے رہے۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد سیون نے کہا "بیگم صاحبہ! زندگی کی چند گھڑیاں باقی ہیں۔ آپ میری اتنی بات مان لیجئے کہ اپنا نقاب اتار کر مجھے اپنا چہرہ دکھا دیجئے۔"

خاتون نے نہایت بے پروائی سے کہا: "کیوں؟"

"میری آنکھ سے آج میں اس خاتون کی شکل دیکھ لوں۔ جو ابھی ابھی میری [illegible] مجھ سے چند منٹ پہلے وہاں جا پہنچی گی۔"

جواب ملا: "فضول تھا ہے۔ آپ کو چاہیے کہ اس وقت آپ سب دل کو اعلیٰ و ارفع خیالات میں مصروف رکھیں۔"

سیون نے کہا: "بیگم صاحبہ! معاف کیجئے۔ ابھی ابھی [illegible] نے کہا تھا کہ انسان ایک حیوان [illegible] ہے۔ ہم ایک طویل سفر کی تیاری کر رہے ہیں۔ اور اگر میں نے اپنے ہم سفر کی شکل دیکھنا چاہا ہوں تو یہ کون سی عجیب کی بات ہے۔ معاف کیجئے۔ آپ کو میرا شرمندۂ احسان ہونا چاہیے۔ آپ نہ ہوتیں تو میری تکلیف کا اب تک خاتمہ ہو گیا ہوتا اور پھر آپ کی گولی کا نشانہ بنا۔ یا آپ کا ایک شانہ بنانا کوئی معمولی سی بات ہے؟ ـــــ مجھے اپنی شکل دکھا دیجئے۔"

کچھ دیر تک وہ تامل میں رہی۔ پھر کہنے لگی: "جناب [illegible] حقیقت [illegible] آپ کہتے ہیں میں آپ کی احسان مند ہوں۔ آپ کا شکریہ ادا کرنے کے بجز چارہ نہیں۔ آپ بھی اپنا نقاب اتار دیجئے۔"

دونوں نے اپنے نقاب اتار دیے۔ اور دونوں غور سے ایک دوسرے کے چہرے کو دیکھنے لگے۔ [illegible] شکل [illegible] خاتون کے چہرے کے جس حسن کو آشکار کر دیا تھا سیون کی توقع سے بالا تھا۔ [illegible] چہرے کی [illegible] معشوق کی تصویر [illegible] خوب صورت آنکھیں، لمبی لمبی گھنی پلکیں، آنکھوں کی پتلیوں گہری اداس۔ سیون کا دل دھڑکنے لگا۔

خاتون نے کہا: "کیا آپ کو میرے چہرے میں کوئی ایسی قباحت نظر آئی ہے جس کی وجہ سے دور رہ کے یوں منہ پھیر لیں۔"

سیون نے کہا: "جو کچھ میری آنکھوں کو نظر آ رہا ہے اس سے تو [illegible] بھی مسحور ہو سکتا ہے۔ کاش دو دن پہلے آپ سے [illegible] کی وجہ اس مرمریں صورت میں مجھے کہیں دکھائی نہیں دی۔ کیا انہوں نے کوئی [illegible] نہیں بتائی؟"

"ایک سبب وفا کو میرا افلاس ناگوار تھا۔ جب میرے والد کے ساتھ ہی میرا [illegible] رخصت ہو گیا اور [illegible] نے مجھے آن گھیرا۔ تو میرا چچیرا ایک دن مجھ سے ملنے آیا۔ عشق و محبت کی داستان رک رک کے اور کم کم کر کے مجھ سے کہتا رہا۔ آخر میں [illegible] تھا۔ [illegible] ساتھ ہی یہ بھی کہہ گیا کہ میں محض اپنی آمدنی پر گھر بار کے اخراجات کا کفیل نہیں ہو سکتا۔ شادی کیسے ہو سکتی ہے ـــــ حضرت میرے جہیز کی ہوس میں منہ کھولے بیٹھے تھے۔ وہ دور اندیش واقع ہوئے تھے۔"

سیون نے جیسے ایک درد محسوس کر کے کہا: "وہ خدا ایسی شکل کو دیکھتا اور پھر دور اندیش رہتا۔ اور آپ کے عشق کا دوسرا شعلہ۔ آپ کا [illegible]۔ وہ بھی دور اندیش تھا؟"

"نہیں اب میں دولت مند ہوں۔ چچا کے مر جانے کے بعد مجھے بہت کچھ ورثے میں ملا۔ میرے [illegible] چھ مہینے تک میری قدم بوسی کرتے رہے۔ لیکن آہ میں کیا کہوں۔ جو [illegible] ایسے نہیں ہوا کیا کرتے۔ یکایک انہوں نے حسن کا معیار بدل لیا۔ ذرا آپ کا عندیہ ملاحظہ فرمائیے میری دردمندی کا بھی خیال کیجئے۔ جیسا کہ آپ کہتے ہیں۔ رنگ کے بارے میں ان کے خیالات کچھ بدل گئے ہیں۔ اب تک وہ اندھا تھا ایک نئی [illegible] نے اسے بصارت بخشی۔ اب اسے نیلی آنکھوں کی بجائے بھوری آنکھیں اچھی لگتی ہیں۔"

سیون نے کہا: "یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے لیکن نہیں بیگم صاحبہ یوں ہو سکتا ہے۔ اس سے پیشتر مجھے بھورا رنگ دنیا کے تمام رنگوں

سے پایا معلوم ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر ہوئی میں نے اپنا مذہب بدل ڈالا۔ اب میں نیلے رنگ کی قسم کھایا کروں گا۔"

"حضرت آپ اسی بھورے رنگ کا ذکر رہے ہیں جس کی خاطر آپ ایک گھنٹہ پہلے جان دینے کو تیار تھے؟"

"بیگم صاحبہ میں شاعر ہوں۔ جس بے رحم عورت کی خاطر میں آج جان دینے والا تھا اس کی صورت میں مجھے تمام محاسن سب کی سب خوبیاں نظر آتی تھیں۔ میں نے اس کی تعریف میں قصیدے لکھ لکھ کے گھسے ہیں۔ لیکن اب مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ میری جہالت کا نتیجہ تھا۔ میں گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ اور مجھے شہر سے نفرت تھی اب مجھے اپنی حماقت کا احساس ہو رہا ہے میں اسے تمام عورتوں سے بڑھ کر حسین جانتا تھا۔ اس لئے کہ میں نے ابھی آپ کو دیکھا نہ تھا؟"

نفرت آمیز جواب ملا "شاعر صاحب کیا کہنے! آپ بھی اور مردوں کی طرح ہر لحظہ بدلنے والے ہیں۔ آپ بھورے رنگ کی پرستش کرتے ہیں۔ اس کے لئے جان دینے کو تیار ہوتے ہیں اور بمشکل ایک گھنٹہ گزرنے پاتا ہے کہ آپ کو نیلا رنگ مرغوب ہے۔ شاید آپ نیلے رنگ کے لئے بھی جان دینے کو تیار ہو جائیں۔"

سیورین نے کہا "میں نیلے رنگ کے لئے زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ یہ نیلی آنکھیں مجھے التفات نظر دیکھیں تو یہی زندگی جنت ہو سکتی ہے۔"

خاتون طنزاً ہنس دی اور کہنے لگی ــــ

"جناب آپ یقین مانیے کہ نیلا رنگ کبھی مہربان نہیں ہو سکتا۔ آپ شاعر لوگ سمندر کو نیلا کہتے ہیں لیکن اس کی لہریں غرق و فنا کر سکتی ہیں۔ آسمان نیلگوں ہے لیکن اس کی بجلیاں تاراج کر سکتی ہیں۔ اور ابھی میں آپ کو دکھا دوں گی کہ نیلی آنکھیں پستول کا نشانہ بھی لگا سکتی ہیں۔"

سیورین نے آہستہ سے کہا "آپ کو شاید یاد نہیں کہ پستول اندھیرے میں چلانا ہوگا۔"

خاتون نے جوش میں آ کر کہا "میں بہت ہی خوش ہوں کہ آپ تشریف لے آئے۔ آپ کو مار دینے سے مجھے بہت ہی مسرت حاصل ہوگی۔"

شاعر نے کہا "اب میری سمجھ میں آیا ہے کہ روما نڈیش صاحب نے اور عطارد نے کیوں آپ سے بے اعتنائی کی۔ بیگم صاحبہ! یہ برہم ہوتا نیلی آنکھوں کو نہیں سمجھی۔ آپ بہت بے رحم ہیں۔ لیکن آپ کے عطارد کا دل معلوم ہوتا ہے شرارت سے بالکل مبرا تھا آپ کا غضب میں بگڑنا آپ میں جو حسن پیدا کر دیتا ہے وہ اسے دیکھ نہ سکتا تھا۔ ان نیلی آنکھوں میں جب غصہ چمک آتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا آسمان کی نیلگوں گہرائیوں کے ایک تلاطم میں کہیں سورج نظر آ رہا ہے۔ پھر اس پر بادل گھر آتے ہیں پھر کس ناز سے بجلیاں چمکتی ہیں پھر شاید چند بوندیں بھی ٹپک پڑتی ہیں۔ اور پھر سورج اپنا رخ تاباں بے نقاب کر دیتا ہے جس نے اس روح افزا نظارے کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں وہ حسن کی کس طرح قدر کر سکتا ہے۔ لیکن بیگم صاحبہ اگر میں آج رات زندہ بچ جاؤں تو ذرا اس پری وش کا اور پھر بیان اپنا۔ جو آپ کے ساتھ بے وفائی کر گئے ہیں۔ لعنت افسوس میں۔ آپ کو فردوس پُر فضا گلشنوں میں مسرت ہو کر اسے کاش میں اس بے چارے شاعر کی پرستش قبول کر لیتی اور زندہ رہتی۔ اس وقت شہرۂ آفاق ہوتی۔"

اس تقریر کے دوران میں خاتون اس کے چہرے کا نہایت غور سے مطالعہ کرتی رہی۔ آخر بولی۔

"سبحان اللہ! کیا فصاحت ہے۔ کیا شاعر احمق ہوتے ہیں۔ کیوں صاحب! کوئی شخص آپ کی نظموں کو چھاپنا بھی گوارا کرتا ہے؟"

شاعر نے فخر و غرور سے کہا "بیگم صاحبہ میرا نام ایڈمنڈ سیورین ہے۔"

"کون سیمیں؟" وہ گھبرا کے بولا:

"شاعر نے کہا: میں وہی ہوں۔ آپ نے میری نظموں میں سے اس کی بہت سی حسن شیریں، عشق پیشہ!"

"نہیں، میں نے نظمیں کبھی نہیں پڑھیں! شاعر سیمیں کا نام میں نے آج سے پہلے کبھی نہیں سنا۔ کیا آپ کی محبوبہ اس بھوری آنکھوں والی کا نام تو نہیں ہے؟"

"ہاں، ہاں۔ مگر آپ اسے کیونکر جانتی ہیں؟"

"میرا تخیل، میرا شعور، میرا الہام، روان کا نغمہ ہیں۔ سے ہی دل سے جیتا ہے۔ ہاں میں نے حال ہی میں ایک کتاب پہلے سیمیں نامی ایک مجنوں شاعر کی دیوان کی۔ اب وہ ایک جنگل کو، سامنے بیابان کو ترجیح دیتی ہے۔ میرا عطر، میرا مشہور نغمہ وہ ہے۔ خاص بہت مفصل لکھا گیا ہے۔"

غصے سے سیمیں کا چہرہ تمتما اٹھا۔ وہ بیتاب ہو کر کرسی میں پہلو بدلنے لگا۔ آخر کار بولا۔

"تو بیگم صاحبہ آپ ہی میری مجبوری بے دردی کے ساتھ میری خوشی، میری راحت مجھ سے چھین لی ہے اگر آپ اس سودا کو اپنے پاس سنبھال کر رکھتیں تو میں اپنی زندگی مسرت اور اطمینان سے گزارتا۔ میں شہر ایک ضروری کام کے لئے آیا تھا۔ مجھے کیا معلوم کہ میری عدم موجودگی میں میری دولت کو یوں ایک لٹیرا آ کر لوٹ لے جائے گا۔"

اس نے تکلیف دہ نظر سے کمرہ کی ایک دیوار سے دوسری دیوار تک چلا گیا۔ وہاں سے مڑا۔ اس نے اپنی نظریں اس خاتون کے چہرے پر گاڑ دیں۔ گرمی تیز سے خاتون کے چہرے پر ایک سرخی جھلک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک ادا چمک رہی تھی۔ اس کے حسن کا طلسم پہلے سے بھی زیادہ ہوش ربا تھا۔

عجب حسن اور اس پر شاعر کی نگاہ۔ سیمیں کی پلکوں کو انکسار نے جھکا دیا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا ——— وہ ایک پیکر التجا ہو کر بولا ———

"بیگم کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ اپنے سودا کو بھلا دیں، میں اپنی بے وفا محبوبہ کو بھول جاؤں اور ———"

"اور کیا؟"

"اور ہم دونوں ایک دوسرے کے ہو جائیں؟"

خاتون نے ایک قہقہہ لگایا اور دیر تک ہنستی رہی۔ اتنی دیر تک کہ سیمیں توہین محسوس کرنے لگا۔ کہنے لگی

"شاعر صاحب! مجھ سے آپ کے عشق کی پائیداری کو تو نہیں سراہا جا سکتا البتہ میں آپ کی جدت طبع کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی اس دانشمندانہ تجویز کو قبول نہیں کر سکتی۔ میں نے سچے عشق کی پہچان الفاظ سے کرنی چھوڑ دی ہے جو مجھ سے شادی کرنا چاہے اسے کچھ کر کے بتانا پڑے گا۔ میں اپنا دل کسی ایسے آدمی کو نہیں دے سکتی۔ جو آج کسی کی آنکھوں پر مرتا ہے، اور پھر قوس قزح کے ساتوں رنگ باری باری اسے اپنی طرف مائل کر لیتے ہیں۔ مجھ سے ایسی حماقت نہیں ہو سکتی۔ اور چونکہ ایسے شخص کا ملنا ناممکن ہے ——— اس لئے ———"

اتنے میں دروازہ کھلا اور ایک قلی اندر داخل ہوا۔ دونوں کو بے نقاب دیکھ کر چونکا اور کسی قدر درشتی سے کہنے لگا: "یہ سخت بے قاعدگی ہے۔ آپ از راہ نوازش اپنا اپنا نقاب پہن لیجئے۔"

خاتون نے کہا "اب کیا ہے؟ اب تو ہم نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا ہے۔ یوآن! تمہیں جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو۔ یہ صاحب تو ایسے خلط گفتار ہیں جیسے کوئی واعظ ہوں۔ آپ شاعر ہیں۔ مجھے شاعروں سے نفرت ہے۔ میں شاعروں کو گولی سے بھی مار سکتی ہوں۔"

یوآن نے ایک تھیلی آگے بڑھا کے کہا: "اس میں کپڑے کی بہت سی چھوٹی بڑی کترنیں ہیں۔ آپ ایک ایک کترن نکال لیجئے، جس کے حصے میں چھوٹی کترن آئے گی اسے شیر بننا پڑے گا۔"

خاتون نے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر کپڑے کا ایک ٹکڑا نکال لیا۔ سیوین نے بھی اپنی قسمت آزمائی۔ کترنوں کو ایک ساتھ رکھ کر ماپا گیا ——

خاتون پکار اٹھی "میں شکاری ہوں۔"

سیوین نے کہا "اور میں شیر ہوں۔ بیگم صاحبہ! گولی بالکل سیدھی چلائیے۔ یہ جھگڑا جلد پاک ہو جائے گا۔"

یوآن نے کہا: "یہ دیکھئے۔ یہ گھنٹی ہے۔ اسے سینے میں لٹکا لیجئے اور ہلا کے دیکھئے ٹھیک بجتی ہے یا نہیں۔ ٹھیک۔ بیگم صاحبہ یہ پستول۔ اس میں کسی طرح کا نقص نہیں۔ صاحب آپ اس دیوار کے سامنے کھڑے رہئے اور جس وقت موسیقی بند ہو جائے تو آپ دو تین قدم چلئے اور گھنٹی کو بجنے دیجئے اور بیگم صاحبہ آپ جس وقت گھنٹی کی آواز سنیں فوراً پستول چلا دیں۔ لیجئے! آداب عرض ہے۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ خدا کرے آپ کا سفر جلدی سے طے ہو جائے اور آپ کی منزل خوش گوار و دل پذیر ہو۔ صاحب آپ کو کس طرح کی موسیقی پسند ہے؟"

سیوین نے کہا "کوئی درد ناک سا نغمہ بجاؤ۔ جس میں امیدوں کا خاک میں مل جانا ہو۔ جس میں بے بس آنسوؤں کی سلامی ہو جس میں ایک درد بھرے دل کا نالہ ہو۔ ایک بے رحم شکاری کے شکار کی آہ و زاری ہو۔ بیگم صاحبہ! لیجئے جو انتقام آپ کو مرد کی جنس سے لینا ہے، وہ مجھ اکیلے کی ذات سے لے لیجئے۔"

یوآن نے طاق پر رکھی ہوئی شمعیں بجھا دیں۔ انگیٹھی کی آگ کے سامنے لوہے کا ایک تختہ رکھ دیا۔ پھر میز کا لیمپ اٹھا کر باہر چلا گیا۔ جب دروازہ بند ہو گیا تو کمرے میں بالکل اندھیرا تھا ساتھ کے کمرے سے بربط اور رباب کی دردناک موسیقی نے فضا میں ایک بے تابی پیدا کر دی تین منٹ تک یہی حالت رہی اس کے بعد موسیقی بند ہو گئی۔

محیط تاریکی اور خاموشی میں گھنٹی کی نقرئی آواز بالکل صاف سنائی دی۔ پستول کی ایک گولی چل گئی۔ دوبارہ گھنٹی بجی۔ ایک اور گولی چلائی گئی۔ یوآن لیمپ ہاتھ میں اٹھائے اندر داخل ہوا۔ پستول خاتون کے ہاتھ میں تھا۔ نالی میں سے دھواں ابھی نکل رہا تھا۔ سیوین ویسے کا ویسا کھڑا تھا۔

یوآن نے دیوار پر نظر ڈال کر کہا "گولیوں کے نشان کہاں ہیں؟ وہ ہیں وہ دو سوراخ۔ بیگم صاحبہ۔ آپ کا نشانہ بہت ہی غلط تھا۔ اب صاحب آپ گھنٹی بیگم صاحبہ کو دے دیجئے۔ اور میں پستول ابھی آپ کو بھر کے لا دیتا ہوں۔"

یوآن کونے میں میز کے پاس کھڑا ہو کر پستول بھرنے لگا۔ شاعر نے کہا ——

"بیگم صاحبہ! آپ نے پستول بہت اونچا چلا دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آپ نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے۔ میرے دل میں اتنا رحم نہیں۔ میری ایک نہ ایک گولی ضرور مہلک ہو گی۔"

خاتون نے کہا "شاعر صاحب یہی تو میری تمنا ہے۔"

یوآن نے پستول بھر کر سیوین کو دے دیا۔ خاتون سے پوچھا: "آپ کو کس طرح کی موسیقی چاہیے؟"

جواب ملا۔ "کوئی نسبتاً پرامن جگہ چن لو۔ ٹھیک ہے، شب بخیر۔"

دروازہ بند ہو گیا۔۔۔ ایک لمحے کے بعد اس تاریکی میں ایک کھٹکا سا سنائی دیا۔ آخر وہ بھی ختم ہو گیا۔ ایک گھنٹی کی آواز آئی۔

ایک گولی چلی۔

صیاد نے آواز دی: "شاعر صاحب۔ پستول۔ بائیں جیب کے نیچے۔"

صیاد نے کہا: "ٹھیک نشانے والی۔ خدا حافظ۔"

اندھیرے میں ایک ہنستی ہوئی آواز نے جواب دیا: "بے وفا شاعر۔ خدا حافظ۔" اور پھر گھنٹی گئی۔ ایک فائر ہوا۔ ایک چیخ سنائی دی اور کوئی زمین پر بچھ کے گرا۔

پول روشنی لے کر اندر آیا۔ خاتون اپنی جگہ پر کھڑی تھی۔ سیرین کے ہاتھ میں پستول تھا۔ خود فرش پر پڑا تھا۔

خاتون نے ایک چیخ ماری اور گرتی پڑتی سیرین کے پاس پہنچ کر زمین پر بیٹھ گئی۔ چلا چلا کر کہتی رہی۔

"میرے شاعر، میرے پیارے شاعر، تو نے اپنے آپ کو کیوں مار ڈالا۔ ہائے کس انداز سے تو نے خدا حافظ کہا تھا۔ اور میں نے یہ بھی تیرا مضحکہ اڑا دیا۔ میرے خوبصورت شاعر تو کیوں مر گیا؟"

پول نے شبہ کی نظروں سے دیوار کو دیکھ کر کہا: "لیکن وہ کیسے مر سکتا ہے؟ کارتوس تو خالی کارتوس تھا۔"

"کیا کہا تم نے؟"

"میرا خیال ہے میں نے آپ سے ذکر بھی کیا تھا کہ میں کبھی کبھی ایک خالی کارتوس بھر دیا کرتا ہوں۔ پہلا کارتوس جو چلایا گیا اس کا نشان دیوار پر موجود ہے اس لیے دوسرا کارتوس بھی خالی ہوگا۔ ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ کارتوس خالی ہے۔ یہ مر کیسے سکتے ہیں، صرف بے ہوش ہو گئے ہیں! وہ بھی نہیں۔ دیکھئے۔ ان کی آنکھیں کھل رہی ہیں!"

سیرین نے آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا کہ حسن عشق کے دربار میں نیاز مند ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا: "تو گویا میں جنت میں پہنچ گیا ہوں۔ تم بھی یہاں ہو۔ او خدا میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں؟"

خاتون نے آہستہ سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا اور اٹھ کھڑی ہوئی کہنے لگی: "نہیں میرے صاحب! ہم ابھی پیرس میں ہیں۔"

"پیرس میں؟ کیا کہا تم نے؟ پیرس میں! کیا لغویات ہے؟" سیرین اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ میں نے اپنے دل پر پستول چلایا تھا۔ یہ دیکھو بارود کا نشان اس بات کا شاہد ہے۔"

پول بولا: "وہ خالی کارتوس تھا۔ آپ کو نئے سرے سے کھیل شروع کرنا پڑے گا۔ بیگم صاحبہ! اب آپ کے شکاری بننے کی باری ہے۔"

خاتون نے کہا: "اب مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ میں تنگ آ گئی ہوں۔ براہ مہربانی مجھے ایک گاڑی منگوا دیجئے۔ مجھے آج ہی ورسیلز پہنچنا ہے۔"

پول نے کہا: "بیگم صاحبہ یہ نہیں ہو سکتا۔ ابھی تو کھیل شروع ہی ہوا ہے۔ دیکھئے ایک دو گھونٹ سے آپ کا خون ابھی پھر گرم ہو

پلانے لگا " پی لیجئے۔"

" صاحب! آپ مجھے ذرا گاڑی منگوا دیجئے۔ آپ سنتے ہیں؟"

پوّل مایوس ہو کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ سیویں آہستہ آہستہ فرش پر سے اٹھا۔ خاتون نے پوچھا " میرے بھلے صاحب! مجھے ایک بات بتا دیجئے۔ آپ نے مجھ پر گولی کیوں نہ چلائی؟"

" تم میرے عشق کی سچائی کا ثبوت مانگتی تھیں۔ میں یہی کر سکتا تھا کہ تمہارے لئے اپنی جان دے دوں! افسوس وہ بھی نہ ہوا!"

خاتون نے بڑی ملائمت سے کہا " پھر آپ کیا جانیں؟" اور پھر خاموش ہو گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد بولی: " میرا نام وِن سینیز ہے۔ میں ملکہ کی درباریوں میں سے ہوں۔ کیا آپ اتنی تکلیف گوارا کر سکتے ہیں کہ کل دوپہر کے بعد ولاسیلر میں آ کر مجھ سے ملیں۔ میں آپ کے شعر آپ کے منہ سے سنوں گی۔ اور پھر ——"

" اور پھر کیا؟"

" اور پھر میرے شاعر! ہم ستاروں کی بہاروں کی باتیں کریں گے۔"

شاعر نے پوچھا " ان دو ننھے ستاروں کی جو اس وقت مجھ پر چمک رہے ہیں؟"

خاتون نے نوجوان کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر کہا " یونہی سہی۔"

"پطرس"

(ماخوذ از فرانسہ) (مخزن اکتوبر ۱۹۲۱ء)

عشق کی خودکشی

مقصد زیں تحریر کے پڑھنے سے جیل جانے کی ... شوق میں پڑھنے سے جواب ہے

دوست قاسم کو پھانسی سے پہلے گو کہ اس قدر اس کے سوا ت علی فر ... دار و جیل کے

مہربان سے اجتناب ہو سکے تاکہ قاسم کی زندگی تمدن اور کیف کے سر چکر دینے

والے جذبات سے معمور تھی آج دوسری دنیا میں ہے جہاں خود جانے سے پیشتر وہ کہ

محبوب بیوی رضیہ کو بھیج چکا تھا۔ ان دونوں کی روحوں کی بابت ملاحظہ ہو (ادارہ)

(۱) شاید مجھے داروغہ جیل کا شکرگزار ہونا چاہیے کہ اس کی اجازت سے میں یہ چند سطریں تحریر کر رہا ہوں لیکن میرا دل اس وقت جذبات سے بالکل خالی ہے۔ میرے دل کی اس وقت وہی حالت ہے جو کسی محفل کی صبح کے وقت ہوتی ہے جب سوائے چند شمعوں کی روشنی اور ترکان کا خواب آلود سکون شب عیش شبانہ کی ہوسناکیوں اور عشرتوں کو بے رنگ اور بھیانک کر دیتا ہے میرا دل ایک کھنڈر ہے جس میں زندگی نہیں آتی ہیں، جہاں حال بیدار نہیں، ماضی خفتہ ہے، جہاں نہ نالہ ہے نہ نغمہ، فقط ایک ویران سی گونج ہے جس کے میرے نزدیک کوئی معنی نہیں جو نہ تو زندگی اور نغمۂ حیات نہیں۔ ایک خندۂ بے مسرت، ایک فریاد بے درد ہے

کل مجھے قانون کی انتہائی سزا دی جائے گی۔ میں اس کے لیے تیار ہوں۔ ہر شخص اس کے لیے تیار رہتا ہے۔ موت کے لیے کسی تیاری کی ضرورت نہیں۔ موت اسی لیے موت ہے کہ ناگہانی ہوتی ہے۔ ہر ایک موت ناگہانی موت ہے۔ موت کا وقت معین ہے اور اس طرح معین کیا گیا ہے کہ بے موقع لگے۔ اگر ہمیں اپنی موت کا وقت معلوم ہو تو ہماری تمام زندگی اس موت ہی کی تیاری میں صرف ہو جائے زندگی اس قیام کی مانند ہو جو ریل کے اسٹیشن پر گاڑی کے انتظار میں کیا جاتا ہے۔

(۳) انسان کی ہستی فوری ضروریات اور فطری انقلابات کا ایک اجتماع ہو جس میں عشق کی ناپائیداری حسن کی بے وفائی کی طرح ہو جہاں تعمیر ایک غلطی ہو جہاں اعتبار ایک حماقت ہو۔

مجھے اپنی موت کا وقت بتا دیا گیا ہے اس لیے میں نے جو کچھ تعمیر کیا تھا اسے منہدم کر چکا ہوں۔ مجھے اس تخریب میں بہت کم تکلیف ہوئی ہے۔ میں نے کبھی کسی عمارت کی بنیاد استوار نہیں رکھی۔ میری آرزوؤں کے محل، میری توقعات کے قصر، میرے ارادے کے قلعے سب بلند اور شاندار تھے۔ لیکن مجھے انہدام کے وقت معلوم ہوا کہ سب کی بنیادیں نہایت کمزور تھیں۔

شروع میں جب میں نے مجرم ہونے سے انکار کر دیا تھا، تو اکثر لوگ مجھے سچا جانتے تھے۔ ان کو یقین تھا کہ میں اپنی بیوی کا قاتل نہیں ہو سکتا۔ ہر شخص مجھے بے گناہ سمجھتا تھا۔ حالانکہ وہ مجھے کتنی نفرت سے جانتا تھا۔ ایسے لوگ مجھ پر رحم کھاتے تھے اور مجھ سے ہمدردی کرتے تھے۔

چند ایسے بھی تھے جو مجھے جھوٹا سمجھتے تھے، ان کو گمان تھا، رضیہ کی موت میرے ہی ہاتھوں ہوئی ہے وہ بھی مجھ پر رحم کھاتے تھے لیکن مجھے حقیر جانتے تھے۔

یہ دونوں غلطی پر تھے۔ میرے اعتراف جرم کو دیوانگی سمجھنے والے سن لیں کہ میں نے واقعی رضیہ کو قتل کیا ہے اسی دائیں ہاتھ نے جو اس وقت خامہ فرسائی کر رہا ہے۔ رضیہ کے نازک گلے کو اپنی لمبی لمبی انگلیوں میں دبا کر اس کے سانس کو ہمیشہ کے لئے بند کیا ہے میرے انکار جرم کو میری بزدلی اور دروغ گوئی سمجھنے والے سن لیں کہ جب میں نے عدالت میں کٹہرے میں کھڑا ہو کر یہ کہہ دیا تھا کہ میں رضیہ کا قاتل نہیں تو میرے دل اور زبان میں یہی سچائی تھی جس نے مجھ سے بعد میں اعتراف کروایا۔ میں ایک نہیں، دو ہوں۔ شاید میں دس بیس ہوں۔ مجھے اب اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں معلوم ہوا ہے کہ میری ایک تنہا ہستی میں کس قدر کثرت تھی۔ رضیہ کو چاہنے والا ایک انسان تھا جو اب اس کے قتل کی سزا میں پھانسی پانے والا ہے۔ میں کیسے قاتل؟ اگر میں ایک ہوں تو میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں ——— کہ میں نے رضیہ کو اس لئے قتل کیا کہ مجھے اس سے محبت تھی۔ یہ کتنی مہمل بات معلوم ہوتی ہے لیکن نہیں یہی ٹھیک ہے۔ سب کچھ ٹھیک ہے کوئی بات غلط نہیں ہو سکتی۔ میں سب کچھ ہوں۔ مجھے نہیں معلوم میں کیا ہوں۔ شاید میں نے غلطی کی ہے۔ میں ایک کمزور ہوں سب انسان کمزور ہوتے ہیں۔

(۳) دو سال ہوئے میں اور رضیہ بیاہے گئے۔ اس کے سنگدل والدین نے اب تک اسے معاف نہیں کیا۔ میرے محلے کے لوگ اب تک میری شادی کو "اوباشی" سمجھتے ہیں۔ کیونکہ وہ رضیہ کے والدین کی مرضی کے خلاف ہوئی۔ اگر ہمارے محلے میں حسن اتفاق یہ نہ ہوتا تو شاید چند اور والدین بھی اس وقت اپنی بیٹیوں سے ناراض ہوتے لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے مامون رہنے کی وجہ ان کی اولاد کی عصمت شعاری ہے۔ کیا شاعرانہ خیال ہے۔ وہ اپنی لڑکیوں کی نیک خصائلی پر فخر کرتے ہیں۔ اس صفت پر فخر کرتے ہیں۔ جو مردوں کے وہم و تخیل نے عورت کو بخش دی ہے۔ ان سے کہہ دو جو مجھ سے پوچھ گئے ہیں کہ اصل وجہ ان کی لڑکیوں کی پاکبازی نہیں میری عالی نگاہی تھی جو ان میں سے کسی کو بحیثیت بیوی کے گوارا کر سکتی تھی۔ یہ نقادانِ اخلاق سمجھتے ہیں کہ میں نے رضیہ کو اس کی بدچلنی کی وجہ سے مار ڈالا۔ احمقو! جب مجھے پھانسی ہی پانا ہے تو محض ایک قتل کے بدلے کیوں؟ میں رضیہ کا قاتل کیوں ہوں؟

رضیہ کو کس نے مارا؟ شاید میں نے! یہ نہ کہو۔ تم رضیہ سے جا کر پوچھ لو۔ وہ کبھی میرا نام نہ لے گی۔ وہ کبھی یقین نہیں کر سکتی کہ میں نے اسے قتل کیا ہے۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں تمام دنیا سے بڑھ کر اس سے محبت کرتا تھا۔ تم یقین مانو کہ وہ اس محبت کی قدر کرتی تھی۔ محض میری خاطر اس نے تمام جہان کے الزامات اپنے سر لئے۔ دنیا بھر کے مصائب اس نے میرے ساتھ مل کر برداشت کئے۔ ٹھیک وقت پر میرے لئے کھانا تیار کرنا اور بڑے اہتمام سے میرے بستر کو بچھانا وہ اپنی زندگی کے اعلیٰ فرائض میں سے سمجھتی تھی۔ گرمی کے دنوں میں ساری ساری دوپہر وہ مجھے پنکھا جھلتی رہتی۔ رات کو بڑی دیر تک میرے انتظار میں جاگتی رہتی۔ اسے یہ نہ کہو کہ میں نے اسے مارا ہے۔ یہ جھوٹ ہے۔ تم اس سے پوچھ لو۔ جاؤ تمہیں اختیار ہے۔ پوچھ لو۔

عورت اگر چاہے تو مرد کی زندگی کو تباہ کر سکتی ہے۔ نفرت سے دلوں کے توڑنے کے جس قدر بھی ڈھنگ ہیں وہ تمام عورت کو سکھا رکھے ہیں۔ قدرت نے مردوں کے دل محض اس لئے بنائے ہیں کہ عورتیں ان کو بے پروائی سے توڑ ڈالا کریں۔ ہماری آنکھیں اس لئے ہیں کہ یا ہم ان کو دیکھیں

یا ہم ان کے سامنے رو دیں۔ محبت اخراج نکل جائے یا اخراج نہ ہو۔ ایک عورت سے وہ شوہر سے پر محبت نہ کر سکتی ہو [illegible] ظلم ہو جاتا ہے اور ایک بے بس تھم۔ جہاں بغاوت کے بغیر چارہ نہیں۔

میں نے رضیہ سے بغاوت نہیں کی۔ میں نے صرف یہ چاہا کہ وہ مجھ سے محبت کرے۔ وہ رہتی تھی۔ میرے پاس اسے آگ بنا دوں اور محبت کی میں چاہتا تھا کہ اس محبت ہو۔ وہ چپ چاپ پانی کی طرح سہتی تھی اور میں اسے شعلوں کی طرح بھڑکانا چاہتا تھا۔ میں رات کی خاموشی میں بیٹھا گھنٹوں تک متواتر اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لئے بیٹھا رہتا۔ میں اس سے اپنے عشق کی داستان کہتا۔ اسے دیوی سمجھ کر پجاریوں کی طرح اس کی پوجا کرتا۔ وہ بت کی طرح بیٹھی رہتی۔ میں اس سے کہتا "اے میرے دل پر حکومت کرنے والی ملکہ! میں تیرا ایک ادنیٰ غلام ہوں۔ تیری محبت کرنا میرے لئے جنت میں زندگی گذارنا ہے۔ کیا تجھے مجھ سے محبت ہے؟" وہ کچھ نہ بولتی۔ میں اس کی باتیں دہراتا۔ جب کبھی وہ کچھ بولتی، اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار ظاہر ہوتے۔ مجھے خوشی حاصل ہوتی کیونکہ اس پر کبھی وہ کچھ بولتی۔ تم ہنستے ہو شرم کی وجہ سے! تم کیا جانو؟ تم نے صرف عورتوں کو دیکھا ہے۔ تمہیں "نسوانیت" کا کچھ علم نہیں۔ تم صرف مرد ہو۔ تم میں ذرا کشش نہیں۔ تمہاری نگاہوں میں جذب کی قابلیت نہیں۔ تم اچھوتی اچھوتی باتیں خوش کر سکتے ہیں۔ اور عورت [illegible] تم مجھے کچھ نہ کہو۔

میں کئی دفعہ رات کو دیر میں گھر آیا۔ اس نے کبھی اس کا گلہ نہیں کیا۔ جہاں محبت ہوتی ہے وہاں طلب ہوتی ہے۔ طلب کے ساتھ شکایت ہوتی ہے۔ میں کیا جانوں وہ میرا انتظار کرتی تھی۔ میں نے کئی دفعہ اس سے پوچھا "رضیہ! میرا دیر سے آنا تمہیں ناگوار تو نہیں معلوم ہوتا؟" وہ کہتی "آپ کی کوئی بات مجھے ناگوار معلوم نہیں ہوتی۔" تمہیں تمہاری بیوی یوں کہے تو تمہارے لئے اطمینان کا باعث ہو۔ شاید تمہیں کبھی یہ خیال بھی نہ آئے کہ جسے تمہاری کوئی بات ناپسند نہیں اسے تمہاری کوئی بات پسند بھی نہیں۔ شاید تم یہ کبھی نہ سوچو۔ تمہیں عورتوں کا تجربہ نہیں۔ تم میں غیرت نہیں۔

ایک دن میں نے اس سے کہا۔ "رضیہ جب تم میری ہو تو پھر کیسے کہ تم میرے ہوتے ہوئے بھی اس قدر وقت پڑھنے اور سینے پرونے میں صرف کر دیتی ہو؟ تم مجھ سے باتیں کیا کرو۔" وہ پھر بھی پڑھنے سے باز نہ آئی۔ میں نے اس کی سب کتابیں پھاڑ ڈالیں۔ میں نے اس کے کپڑے جلا دئے۔ وہ روتی رہی اور کھانا پکاتی رہی۔ ان کتابوں اور کپڑوں کے لئے روتی رہی۔ جن کو وہ مجھ پر ترجیح دیتی تھی۔ میرے دل میں اس دن ایک ارادہ آیا لیکن جلد غائب ہو گیا۔ اور میں منصوبوں کو بند کر کے رہ گیا۔ دو دن میں اس سے روٹھا رہا۔ اس نے مجھے نہ منایا۔ تم کہو گے لڑتی تھی، پھر تغافل کسے کہتے ہیں؟

کل میری زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ میں خوش ہوں۔ رضیہ کو مار ڈالنے کے بعد میرا زندہ رہنا فضول ہے۔ جب پروانے کو شمع کے جلتے ہی مر جانا چاہئے تھا۔ وہ شمع کے بجھ جانے کے بعد بھی زندہ رہے تو یہ عشق کی خامی ہے۔ رضیہ! تم مجھے معاف کر دینا۔ دنیا کی معافی کی مجھے پروا نہیں۔ دنیا میں میں نے اگر کسی عورت کے ساتھ وفا نہیں کی تو اس کا الزام مجھ پر نہیں عاید ہوتا۔ وہ اسی قابل تھیں کہ ایک رات کے لئے بد منیر ہوتیں اور بس۔ ان کو چند گھنٹوں کے مشغلے سے زیادہ کچھ بھی سمجھنا مذاق سلیم کا خون کرنا تھا۔ اس پر اگر اہل دنیا مجھے قصوروار سمجھتے ہیں تو مجھے اس کی پروا نہیں۔ وہ مجھے کل مار ڈالیں گے۔ اس سے زیادہ کسی کو کیا سزا دے سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ کیا انتقام لے سکتے ہیں۔ افسوس! اگر مجھ کو معلوم ہوتا کہ مجھ سے یوں بدلہ لیا جائے گا تو اب ناکردہ گناہوں کی حسرت دل میں نہ ہوتی۔ کسی سے کوئی ایسا پیمان نہ باندھا تھا جس کو توڑتے ہوئے میرے دل کو ذرا بھی رنج ہوتا۔ میں رضیہ سے شادی کرتا؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ جس کی زبان نے مجھے کبھی پیار سے نہیں بلایا جس نے چپ کے سوا کبھی دوسرا جواب نہیں دیا۔ جس نے دل کا حال ہمیشہ مجھ سے چھپایا۔ جسے میرے مشتعل جذبات کے روح سوز شعلے کبھی نہ بھڑکا سکے۔ جسے میرے عشق کے فنا انجام زلزلے کبھی نہ ہلا سکے۔ اس

شادی کرنا؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟

چودھویں کی چاندنی میں وہ سفید لباس پہنے ٹھٹک رہی تھی۔ اور میں اس کے پاس بیٹھا ہوا اپنے دل کی بے قراری کا نغمہ بہکے ہونٹوں سے لرزتے ہوئے لفظوں میں بیان کر رہا ہے۔ "رضیہ تم نے مجھ پر کیا جادو پھونک دیا ہے۔ میرے جسم میں کوئی روح ہے تو وہ تم ہو۔ میری آنکھوں میں کوئی نور ہے میرے دل میں کوئی سرور ہے تو وہ تم ہو۔ میری زندگی میری راحت، اب یہ ناممکن ہو گیا ہے کہ میں تمہارے بغیر اس دنیا میں کہیں خوشی پاؤں۔ رضیہ صرف تمہارے ہوتے ہوئے میرے سینے میں ہزاروں امنگیں اٹھتی ہیں۔ آرزوؤں کا ایک طلاطم بپا ہوتا ہے۔ تمناؤں کا ایک کہرام مچ جاتا ہے۔ تمہیں ایک دفعہ دیکھ لینا ساز ہستی کے تمام تاروں کو یوں چھیڑ دیتا ہے جیسے ہوا کا کوئی لطیف جھونکا ان پر سے گزر گیا ہو۔ میرے دل میں نغمے گونجتے ہیں کہ قربان کر دینے۔ کیا تو سنتی ہے؟" وہ کچھ نہ بولی۔ میں نے کہا "رضیہ سنتی ہے؟" کہنے لگی "سنتی ہوں"۔ میں نے کہا۔ "کیا تمہارے دل میں موسیقی نہیں؟ کیا تم مجھے وہ نہیں سنانا چاہتیں؟" وہ کچھ نہ بولی۔ میں نے اسے کندھوں سے پکڑ لیا۔ اور بے انکسار سے کہا۔ "رضیہ کچھ تو کہو۔" اس نے کچھ نہ کہا یا شاید یہ کہا "میں کیا کہوں"۔ میں اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی بند آنکھوں کو دیکھتا رہا۔ اس کے ہونٹوں کے سکون کو دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے کی بے پروائی کو دیکھتا رہا۔ اس کا تغافل مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میرے ہاتھ اس کے گلے کے قریب آ گئے۔ میری انگلیوں کو ایک زبردست خواہش نے ذرا دبا دیا۔ میرا نچلا ہونٹ میرے دانتوں سے کٹ گیا۔ میرے دائیں ہاتھ کا پنجہ سکڑتا گیا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے اس کی نظروں میں وحشت نظر آئی۔ لیکن وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ میں اور وحشی ہو گیا۔ میرے پنجے کی گرفت مضبوط ہوتی ہو گئی۔ اس نے کچھ کہا۔ لیکن اس سے کہنے میں الفاظ نہ تھے۔ میں اس کا گلا بھینچتا گیا۔ حتیٰ کہ میرا ہاتھ تھک گیا۔ یہاں تک کہ اس کا اور دنیا کا تعلق منقطع ہو گیا۔ مجھے چاند تاریک دکھائی دینے لگا۔ میری نگاہ میں ایک سیاہ سی سرخی پھر گئی۔ میرا گلا خشک ہو گیا۔ میں نے ایک چیخ ماری اور اس سے لپٹ گیا۔ چلا چلا کر پوچھتا۔ "اُف رضیہ! میری جان!! تم کیوں چپ ہو؟ تم کو کس نے مار ڈالا ہے! رضیہ میری پیاری رضیہ! تمہارا قاتل کون ہے۔" وہ کچھ نہ بولی ——

(۲) وہ بے چاری مر گئی۔ میرے ہاتھوں سے مر گئی۔ میں نے اسے مارا میں کل مر جاؤں گا۔ اس نے میرا دل دکھایا۔ میں اس کے لئے مرتا تھا۔ وہ میری بہت خدمت کرتی تھی۔ خدائی قوانین کی گرفت مضبوط ہے اور ان سے رہائی مشکل۔ مرد عورت کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس خیال سے کہ اس کی خواہشات کی تکمیل بطریق احسن ہو، وہ اس کی مرضی ڈھونڈتے رہتے ہیں کہ اسے پورا کریں۔ عورت دیوانگی کا سحر کرنا جانتی ہے، راحت کی نیند سلانا نہیں جانتی۔ انتظار دیتی ہے۔ اپنے قریب کرنے کا رستہ نہیں بتاتی۔ اس نے تمام دنیا کو ناراض کیا کہ مجھے خوش کرے۔ میں نے اسے مار ڈالا کہ وہ مجھے خوش نہ کر سکی۔ کائنات ایک مجسم بے قاعدگی ہے۔ عورت کی محبت ایک افسانہ ہے۔ روح جسم کا دوسرا نام ہے۔ جذبات کی کوئی حقیقت نہیں۔ ایک ہستی کئی ہستیوں سے مرکب ہوتی ہے۔ آج تم کچھ ہو۔ کل خدا جانے کیا ہو سکے؟

قاسم

"پطرس"

(مخزن جون ۱۹۲۱ء)

تائیس

رومان از اناطول فرانس

اوپرا از موسیو گیلے

اناطول فرانس کی "تائیس" بہت مشہور کتاب ہے۔ سب جانتے ہیں کہ وہ ناول کی صورت میں لکھی گئی ہے جس میں تھیبس اور سکندریہ کے رومانی مناظر اور راہب پفنوتس کے کرب و اضطراب کی تفاصیل بیان کی گئی ہیں۔ یہ منظوم "تائیس" موسیو گیلے کے اوپرا کا ترجمہ ہے جو اناطول فرانس کے ناول سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ لیکن اس میں ڈرامہ کی مخصوص تحدید کی وجہ سے واقعات اور مناظر محدود کر دیئے گئے ہیں اور چند کرداروں کے نام بھی بدل دیئے گئے ہیں۔

اوپرا ڈرامہ کی ایک ایسی قسم ہے۔ جس میں ڈرامائی واقعات تو موسیقی کے ذریعے سے اور متاثر جذبات الفاظ کے علاوہ اسٹیج کی آرائش اور اداکاری سے ظاہر کئے جاتے ہیں۔ پڑھنے والے کو خیالی سٹیج اور خیالی اداکار وضع کرنے پڑتے ہیں اس کے بغیر اوپرا سے محظوظ ہونا ممکن نہیں۔

پطرس کے ترجمے کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے پڑھنے والے کا کام ہلکا کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ ضمنی گرفت میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ الفاظ کی رفتار، موسیقی، فقروں کے اتار چڑھاؤ، مکالموں کی ڈرامائی ترنم و حرکت سے نہ صرف کرداروں میں جان آ گئی ہے بلکہ تھیبس اور سکندریہ کی دھندلی اور رنگ و ساز فضا دات کے کسی دلفریب خواب کا جزو معلوم ہونے لگتی ہے۔ اسلوب یکساں ہموار نہیں تنگ ہے اور ترجمے کے بعض حصوں میں نثر کے ٹکڑے نظم بلا تفریق جانتے ہیں —— (ادارہ)

افراد

تائیس —— سکندریہ کی ایک حسین رقاصہ

اتانئیل —— ایک راہب

پالیمون —— ایک بڈھا راہب

نسیس —— سکندریہ کا رئیس

کرتال }
کروبیل } —— نسیس کی خادمیں

البین —— راہبہ عورتوں کی سردار

چند اور راہب

باب اوّل

پہلا منظر

(صحرائے تھیبس دریائے نیل کے کنارے سینو بیت راہبوں کی جھونپڑیاں۔
ابھی آفتاب غروب نہیں ہوا۔
بارہ راہب ایک لمبی میز کے گرد بیٹھے ہیں ان کے بیچ میں بڑھا پالیمون اس غریبانہ طعام کی
صدارت کے فرائض انجام دے رہا ہے جو میز پر چنا ہے۔
ایک جگہ خالی ہے جہاں آتانیئل کو بیٹھنا ہے)

ایک راہب۔ یہ روٹی بھی ہے۔

دوسرا۔ اور یہ نمک ہے۔

تیسرا۔ اور یہ پودینہ ہے

چوتھا۔ اور یہ شہد ہے۔

پانچواں۔ اور یہ پانی ہے۔

پالیمون۔ (کھڑا ہو کر بڑے جوش کے ساتھ) آسمان سے ہر صبح شبنم کی طرح ہمارے باغیچے پر برکات کا نزول ہوتا ہے۔ آؤ اس خدا کی ستائش کریں جو ہمیں نعمتیں بخشتا ہے آؤ اس کے حضور میں دعا مانگیں کہ وہ ہمیں اپنی رحمت کے سایہ میں رکھے۔

راہب۔ (بہت نرم آواز سے) اے خدا! جہنم کے شیاطین ہمارے راستے سے دور ہو جائیں۔

(راہب چپ چاپ کھانا کھاتے ہیں)

ایک راہب۔ (مہر سکوت توڑ کر) اے خداوند! ہمارے بھائی آتانیئل پر اپنے بازوئے قوت پھیلائے رکھ۔

بہت سے راہب۔ (افسوسناک لہجے میں) آتانیئل!

چند اور راہب۔ (اسی لہجے میں) کتنا عرصہ گذر چکا اور وہ ابھی واپس نہیں لوٹا!

دوسرے راہب۔ مگر وہ کب واپس آئے گا؟

پالیمون۔ (جیسے کسی راز کو چھپا رہا ہو) اس کی واپسی کا وقت قریب آ رہا ہے۔ میں نے کل رات اسے خواب میں دیکھا اس کے قدم تیز تیز اٹھ رہے تھے اور وہ ہماری طرف آ رہا تھا۔

راہب۔ (جوش کے ساتھ) آتانیئل خدا کے برگزیدہ بندوں میں سے ہے (تقدس کے لہجے میں) وہ خواب میں جلوہ نما ہوتا ہے۔

(آتانیئل داخل ہوتا ہے اور بہت آہستہ آہستہ قریب آتا ہے جیسے غم اور تھکن سے چور چور ہے)

---

[۱] ناول میں اس کردار کا نام پفنوتس ہے، اوپیرا والوں نے پفنوتس کے نام کو بھدا سمجھ کر اسے بدل دیا۔

راہب۔ (راہبوں کے ساتھ) [illegible]

اناٹیکل۔ (دھیان میں کھوئی ہوئی معصوم آواز میں) [illegible]

پامیون (راہب سے)۔ بھائی تم بہت معصوم ہو [illegible] جگہ پر [illegible] لگا دیتی ہے

(تائیس [illegible] انداز میں بیٹھ جاتی ہے [illegible] اپنے سامنے [illegible])

اناٹیکل۔ نہیں میرا دل [illegible] ہمیشہ [illegible] معصومیت کے [illegible] انہوں نے بدکاری اور عیاشی کا جال پھیلا رکھا ہے اور اس کے ہاتھ سے جہنم بھی [illegible] رحمت [illegible]

راہب۔ (معصومیت اور [illegible] کے انداز میں) [illegible] کون ہے؟

اناٹیکل۔ (تھوڑی دیر کے لیے جیسے خواب سے بیدار ہوتا ہے اور [illegible] ایک [illegible] کہانی [illegible] سے جیسے کسی گئے زمانے کے واقعات دہرا رہا ہو) [illegible] اس وقت جب میں کم عمر تھا [illegible] میری روح پر رحمت خداوندی کا نزول ہو [illegible] کے عالم میں [illegible] اعتراف کرتا ہوں [illegible] کے [illegible] کی قربت [illegible] کے احسان [illegible] عطا فرمایا۔ جہاں میں نے [illegible] گناہ سے کنارہ کشی اختیار کی [illegible] میری روح میں ایک [illegible] عیاشی اور بدکاری سے میرا دل [illegible] کہ [illegible] عورت کی روح کو [illegible] کے نام پر [illegible] کروں۔

پامیون۔ (نرمی کے ساتھ دانشمندانہ انداز میں) [illegible] بیٹے! ہم [illegible] لوگوں سے [illegible] شیطان کے مکر سے [illegible] نے ہمیں یہی سبق سکھایا ہے۔ [illegible]

(راہب پامیون [illegible] مقدس کے انداز میں [illegible] سر جھکائے
ایک ایک کر کے دعا مانگتے ہوئے اپنے اپنے حجروں کو چلے جاتے ہیں)

پامیون۔ اے خدا! جہنم کے سیاہ شعلے ہمارے رستے سے دور ہٹ جائیں! اے خدا! ہمارے رزق اور پانی کو برکت دے۔ اے خدا! ہمارے باغوں کے پھلوں پر اپنی رحمت نازل کر! ہمیں وہ نیند نصیب کر جسے بدخوابی برہم نہ کرے اور وہ آرام عطا فرما جس میں کوئی کھٹکا نہ ہو!

(اندھیری رات میں سکون اور خاموشی کے ایک لمحے کے بعد تاریکی کے درمیان ایک روشنی نمودار ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ بڑھتی جاتی ہے۔ روشنی کی اس دھند میں سکندریہ کے تھیٹر کا اندرونی حصہ دکھائی دیتا ہے۔ بنچوں پر ہزاروں لوگ بیٹھے ہیں۔ سامنے ایک اسٹیج ہے جس پر تائیس نیم برہنہ لیکن نقاب پوش افرودائتی کے عشقیہ جذبات کو حرکات رقص سے ادا کر رہی ہے۔ تماشائی بلند آہنگی کے ساتھ رہ رہ کر داد دیتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ تمام آوازیں یوں سنائی دیتی ہیں جیسے بہت دور سے آ رہی ہوں۔ تائیس کا نام اس ہجوم میں ہر شخص کی زبان پر ہے لیکن کانوں تک بہت مدہم ہو کر پہنچتا ہے۔ شور و ہنگامہ بڑھتا جاتا ہے اور تائیس کی حرکات اور

(دھیمی پڑتی جاتی ہیں پھر یہ تمام منظر دفعتہً غائب ہو جاتا ہے ـــــ دن نکل آتا ہے)

اتانئیل۔ (آہستہ آہستہ خواب سے بیدار ہو کر یک لخت اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اس کی آواز خفگی اور رنج سے بھری ہے) شرم! شرم! قہر! ابدی تاریکی! اے خداوند میری مدد کر! (جیسے ہیں کہ جاتا ہے) اے خداوند! اے خدائے ذوالجلال! جس نے ہماری روح اور ہمارے دل میں رحم ڈالا، تعریف تجھی کو ہے، میں اس خواب کا اشارہ سمجھتا ہوں۔ میں ابھی یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ (جوش سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے) میں اس عورت کو گناہ سے نجات دلاؤں گا۔ میں اسے نفس کے بندھنوں سے آزاد کراؤں گا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آسمان کے ماتم زدہ فرشتے اس کی طرف جھک رہے ہیں۔ اے خدا کیا وہ تیرے ہی مبارک دم کا ایک سانس نہیں؟ اس کا گناہ جس قدر تاریک ہو اتنا ہی رحم کا سزاوار ہے لیکن میں اسے بچاؤں گا۔ اسے تیرے حوالے کر دوں گا اور اے خداوند پھر میں اسے تیری نذر کروں گا تاکہ اسے حیات ابدی نصیب ہو اور راہبوں کو ملا سکے جو اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں؟ اے بھائیو! آپ سب کے سب اٹھ کھڑے ہو۔ آؤ۔ مجھے غیب کی طرف سے اشارہ ہوا ہے۔ مجھے پھر اسی منحوس شہر کی طرف لوٹنا ہے۔ خدا نہ کرے کہ گناہ کے سمندر میں اور بھی ڈوب جائے۔ خدا نے مجھے منتخب کیا ہے کہ میں تائیس کو اس کے پاس لے آؤں۔

(اتانئیل پالیمون کے سامنے جھکتا ہے)

پالیمون۔ (نہایت پرسکون لہجے میں نرمی کے ساتھ ملامت کرتے ہوئے) میرے بیٹے! ہم راہبوں کو اس دنیا کے لوگوں سے احتراز واجب ہے ـــــ خدائے ابدی نے ہمیں یہی سبق سکھایا ہے۔

(راہب اتانئیل کے ساتھ ساتھ سڑک تک جاتے ہیں اور پھر گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر اتانئیل کی دعاؤں کو دہراتے ہیں جس کی آواز صحرائے تھیبس کی تنہائیوں میں آہستہ آہستہ غائب ہو جاتی ہے۔)

اتانئیل کی آواز۔ (دور سے) نور اور رحمت کی مقدس روح۔ میرے دل کو تقویت دے۔

راہب۔ اس کے دل کو تقویت دے۔

اتانئیل کی آواز۔ (بہت دور سے) اور مجھے معلم الملکوت کی سی طاقت دے تاکہ میں بدی کی چالوں کا مقابلہ کروں۔

راہب۔ اور اسے معلم الملکوت کی سی طاقت دے۔ تاکہ وہ بدی کی چالوں کا مقابلہ کرے۔

(مکمل خاموشی۔ پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے۔)

دوسرا منظر

(اسکندریہ۔

نیسیس کے گھر کے باہر کا چبوترہ آس پاس بڑے بڑے سایہ دار درخت ہیں۔ چبوترے پرے شہر اور سمندر کا منظر دکھائی دے رہا ہے۔ دائیں طرف بھاری بھاری پردے لٹک رہے ہیں۔ ان کے پیچھے ایک عالیشان ایوان ہے جو ضیافت کے لئے آراستہ

(تائس اپنا ستار لے کر جلدی سے اٹھ جاتی ہے
ایک غلام تیزی سے دوڑ کر داخل ہوتا ہے اور اس کی طرف بڑھتا ہے)

غلام۔ سُنتا ہے! یہاں سے دفع ہو جا اور کہیں اور جا کر بھیک مانگ۔ میرے آقا تجھ جیسے فقیروں کو پاس نہیں آنے دیتے

اتانیل۔ (نرمی کے ساتھ) میرے بیٹے مجھے نیسیاس کا محل بتا دو۔ میں جیسا آیا ہوں ویسا ہی اس سے اسی وقت ملنا چاہتا ہوں۔

غلام۔ بھکاری یہاں سے دور ہو جا (اتانیل پر چابک اٹھاتا ہے)

اتانیل۔ (نرم لہجے میں مگر رعب کے ساتھ) ہاتھ روک لو۔ لیکن اپنے آقا کو میرے آنے کی اطلاع کر دو۔ جاؤ۔

(اتانیل کی پرجلال نگاہوں سے ڈر کر غلام پیچھے ہٹ جاتا ہے
جھک کر سلام کرتا ہے اور پھر محل میں غائب ہو جاتا ہے۔
اتانیل تنہائی میں تھوڑی دیر کے لیے چبوترے پر سے سامنے
پھیلے ہوئے منظر کو غور سے دیکھتا رہتا ہے۔)

اتانیل۔ بدکار شہر! ـــ خدا کی پناہ! سکندریہ! جہاں میں گناہ میں پیدا ہوا۔ وہ محل جہاں میں نے عشرت کی بے پناہ مستیوں میں سانس لیا ہوس انگیز سمندر جہاں میں نے زریں چشم ہرکہ نازنین کا ترنم سنا۔ وہ بھی میرے سفلی نفس کا گہوارہ تھا۔ سکندریہ، میرے گہوارہ، میرے وطن! سکندریہ میں نے تیرے عشق سے اپنے آپ کو آزاد کر لیا ہے۔ مجھے تیری دولت سے، تیرے علم و فن سے، تیرے حسن سے نفرت ہے میں تجھ سے نفرت کرتا ہوں ـــ اور تجھ پر لعنت بھیجتا ہوں۔ مجھے یہ اس عبادت گاہ کی طرح معلوم ہوتا ہے جس میں ناپاک ارواح نے اپنا بسیرا بنا لیا ہو۔ آسمانی ہوا کے جھونکو! جنت کے فرشتو! آؤ اور اپنے پروں کی جنبش سے اس زہر آلود فضا کو پاک کر کے چاروں طرف سے تم اسے گل معطر بنا دو!

(آوازیں اور قہقہے سنائی دیتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد نسیاس کروبیل اور مرتال دو حسین رنڈیوں
کے کندھوں پر ہاتھ رکھے داخل ہوتا ہے۔ اتانیل کو دیکھ کر رک جاتا ہے اور رنڈیوں کو
چھوڑ کر اپنے دونوں بازو پھیلائے تپاک کے ساتھ اتانیل کی طرف بڑھتا ہے۔)

نسیاس۔ (گرمجوشی کے ساتھ) اتانیل! تم ہو؟ میرے مکتب کے رفیق، میرے دوست، میرے بھائی۔ ہاں میں تمہیں پہچانتا ہوں۔ گو تمہاری صورت اب انسانوں کی بہ نسبت حیوانوں سے زیادہ مشابہ ہے۔ آؤ، آؤ۔ مجھ سے بغلگیر ہو جاؤ۔ تم صحرا کو خیرباد کہہ کر آئے ہو؟ تم پھر ہم میں شامل ہونے آئے ہو؟

اتانیل۔ نہیں۔ تم اس رقاصہ تائس کو جانتے ہو؟

نسیاس۔ (ہنس کر) یقیناً میں اسے جانتا ہوں۔ صرف جانتا نہیں بلکہ وہ میری ہے صرف ایک اور ایک دن کے لئے۔ میں نے اپنے تاکستان اس کی خاطر بیچ ڈالے۔ اپنے تاکستان اور اپنی زمینیں اور اپنی چکیاں اور اس کی خاطر میں نے تنقیدوں کے تین دیوان مرتب کئے لیکن یہ سب کچھ بے سود

تھا، اس کی ہوس کو پورا کرنے کے لئے میری استعانت کی کوشش بھی لا حاصل ہے۔ اس کا عشق خواب کی مانند نازک اور جلد غائب ہو جانے والا ہے۔ آتانیئل! تم کو اس سے کیا کام ہے؟

آتانیئل۔ میں اس کے قدم خدا کے رستے پر لانے آیا ہوں۔

نسیس۔ (کھلکھلا کر ہنس پڑتا ہے) میرے سادہ لوح دوست! وہ وینس کی پجارن ہے۔ وینس کے قہر کو مت جگاؤ۔

آتانیئل۔ میں اس کے قدم خدا کے رستے پر لانے آیا ہوں۔ نسیس! میں تائیس کو اس ناپاک محبت سے چھڑا کر لے جاؤں گا۔ میں اسے یسوع مسیح کی دلہن بناؤں گا اور وہ اپنی زندگی راہبہ خانے میں بسر کرے گی۔ تائیس آج میرے ساتھ جائے گی۔

نسیس۔ (آتانیئل کے کان میں جھک کر) وینس کے قہر کو مت جگاؤ، وہ انتقام لے گی۔

آتانیئل۔ خدا میرا نگہبان ہوگا۔ (ایک لمحے کے بعد) اس عورت سے میں کہاں مل سکتا ہوں،

نسیس۔ یہیں پر۔ آج وہ میرے دسترخوان کی زینت ہوگی۔ آج آخری دفعہ وہ اس نشاط پرست محفل کی رونق ہوگی۔ آج رات وہ تھیٹر میں رقص کر رہی ہے اور وہاں سے سیدھی یہاں آئے گی۔

آتانیئل۔ میرے دوست مجھے ایشیائی لباس پہننے کو دو تاکہ میں اس ضیافت کے شایان نظر آؤں۔

نسیس۔ اے نازنینو! کروبیل اور مرتال! جلدی کرو آتانیئل کو لباس پہنا دو۔

(نسیس اور آتانیئل رفیقانہ گفتگو میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ مرتال تالی بجاتی ہے۔ ایک خدمتگار حاضر ہوتا ہے اور مرتال کا حکم پا کر چلا جاتا ہے تھوڑی دیر بعد غلام ایک صندوق اٹھائے داخل ہوتے ہیں جس میں سے کروبیل اور مرتال آتانیئل کے لئے سنگھار کا سامان نکالتی ہیں ایک چمکدار نقرئی آئینہ آتانیئل کو دکھاتی ہیں اور ہنس دیتی ہیں۔ آتانیئل اسی طرح بیٹھا نسیس سے باتیں کرتا رہتا ہے لونڈیاں اس کے بالوں کو خوشبودار تیل لگاتی ہیں۔ اور اس کے سر اور داڑھی کو کنگھی کرتی ہیں نسیس مسکراتا ہوا ان کو دیکھتا رہتا ہے۔)

نسیس۔ اب میں ایک بار پھر تمہیں ویسا ہی دیکھوں گا جیسے کبھی پہلے دیکھا کرتا تھا۔

آتانیئل۔ ہاں میں جہنم کا مقابلہ کرنے کے لئے جہنم ہی کے ہتھیاروں سے سجوں گا۔

نسیس۔ مغرور فلسفی! انسان کا دل کمزور ہے۔

آتانیئل۔ جب خداوند میرا رہبر ہے تو میں غرور سے خوف نہیں کھاتا۔

کروبیل۔ (مرتال سے) جوان ہے!

مرتال۔ (کروبیل سے) خوب صورت ہے!

کروبیل۔ اس کی داڑھی کے بال لمبے ہوئے ہیں۔

مرتال۔ اس کی آنکھوں میں آگ بھری ہے۔

کروبیل۔ اس کے سر کے گرد یہ پٹی بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔

مرتال۔ یہ کنگن پہن لو۔

کروبیل۔ اپنے پاؤں کو پھیلاؤ۔

مرتال۔ اور اپنی انگلیاں۔

مرتال اور کروبیل۔ جوان ہے اور خوبصورت ہے۔ اور اس کی آنکھوں میں آگ بھری ہے۔

مرتال۔ (خوشگوار قہقہے لگاتے ہوئے) یہ لباس پہن لو۔

کروبیل۔ (خوشامد سے) یہ سیاہ پشم کا کرتا اتار ڈالو۔

آتانیل۔ (ان سے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے) ہٹ جاؤ۔ یہ مجھ سے کبھی نہ ہوگا۔

(کروبیل اور مرتال پہلے تو اس کے درشت انکار سے ڈر کر پیچھے
ہٹ جاتی ہیں لیکن پھر آہستہ آہستہ اس کے قریب آتی ہیں)

کروبیل اور مرتال۔ (سیاہ پشمینے کرتے پر لباس فاخرہ پہنا کر) یہ لو اب زہد و تقویٰ کو اس نرم و نفیس ملبوس سے ڈھانپ دو۔

نسیس۔ (آتانیل سے) ان کی ہنسی مذاق سے رنجیدہ نہ ہو اور ان کے سامنے اپنی نظروں کو نیچا نہ رکھو بلکہ انھیں اٹھا کر ان کے حسن کی داد دو۔

آتانیل۔ (اپنے آپ سے) اے نور کی روح! آ اور میرے دل کو اس جنگ کے لیے مضبوط بنا دے کہ بدی کی قوتوں سے لڑنا ہے

کروبیل۔ اس کا حسن کسی نوجوان دیوتا کا سا ہے اگر تائیس اسے دیکھ پائے تو اس خشک زاہد کے سینے میں پھر انسانوں کا سا دل دھڑکنے لگ جائے

مرتال۔ (آتانیل سے) آؤ ہم تمہیں کفش زریں پہنا دیں۔

کروبیل۔ (آتانیل سے) آؤ ہم تمہارے رخساروں پر عطر چھڑک دیں۔

کروبیل اور مرتال۔ (ایک دوسری سے) اس کا حسن کسی نوجوان دیوتا کا سا ہے۔

(بہت دور سے تحسین کے نعروں کی آواز سنائی دیتی ہے نسیس چبوترے
پر جا کر شہر کی طرف دیکھتا ہے پھر واپس آ کر مسکراتا ہوا آتانیل سے مخاطب ہوتا ہے)

نسیس۔ اپنے آپ کو سنبھالو غنیم بڑھا چلا آ رہا ہے۔

(رقاصوں اور ایکٹروں کے گروہ جن کے ساتھ نسیس کے فلسفی دوست بھی
شامل ہیں، تائیس کے آگے آگے چبوترے پر داخل ہوتے ہیں۔)

ایکٹر اور فلسفی۔ (تائیس کے گرد جمع ہو کر اور اس کے سامنے جھک کر) تائیس! خواہر کریتز! اسکندریہ کا پھول! تائیس! محبوب ترین دولت! تائیس!
تائیس! تائیس!

(نسیس اپنے مہمانوں سے مراسم ملاقات ادا کرنے کے بعد ایوان
ضیافت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ غلام پردے اٹھا دیتے ہیں۔)

نسیس۔ تائیس! پیاری تائیس! ہرمادورے! ارستوبولے! کیلی کریٹی! ڈورین! میرے مہمانو! میرے دوستو! مقدس دیوتا تمہارے ساتھ رہیں۔

(سب مہمان ہال میں داخل ہوتے ہیں۔ تائیس بھی اور مصاحبوں کے پیچھے پیچھے ایوان میں داخل ہونے لگتی ہے لیکن نسیس اسے تھام لیتا ہے اور اس کے پاس کی ایک نشست پر بیٹھ جاتا ہے وہ کھڑی ٹکٹکی باندھے ہوئے پیالۂ شراب تھامے ہوئے نسیس کی طرف محبت بھری حسرت آلود نگاہوں سے دیکھتی ہے)

تائیس۔ ہاں یہ تائیس ہے وہ رقاصہ جو آج آخری مرتبہ تمہارے پھولوں سے آراستہ دسترخوان کی زینت بننے کو آئی ہے۔ کل صرف میرا نام باقی رہ جائے گا۔

نسیس۔ ہم نے سات دن تک ایک دوسرے سے عشق کیا۔ مکمل سات دن۔ تمہارا بے وفائی کرنا بہت بڑی خطا ہے۔ میں شکوہ نہیں کرتا۔ تم میرے دلوں کو خالی چھوڑ کر بالکل آزاد ہو جاؤ گی۔

تائیس۔ نسیس! آج تو بہت خوش ہو لو۔ مسرت کے ان گزشتہ دنوں کی دوستی بھی لے لو اور اس آخری رات سے بڑھ ایک مختصر سا رفاقت کا دور جو ہوگی سے درگزر کرو۔ [illegible] کل صرف میرا نام باقی رہ جائے گا۔

(کئی فلسفی جن میں تائیس بھی شامل ہے مباحثۂ علمی میں مشغول ایوان کی طرف سے داخل ہوتے ہیں۔ اور آہستہ آہستہ چبوترے تک پہنچ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اتانیل باقی لوگوں سے علیحدہ دور بے حس و حرکت کھڑا رہتا ہے اور تائیس کو غصہ کی نظروں سے دیکھتا رہتا ہے)

تائیس۔ (نسیس سے) یہ اجنبی کون ہے جو مجھے قہر آلود نگاہوں سے گھور رہا ہے۔ میں نے اسے کبھی ضیافت میں نہیں دیکھا۔ کہاں سے آیا ہے؟ یہ کون ہے!

نسیس۔ (جیسے نہایت معمولی سی بات ہو) ایک سیدھا سادا فلسفی، صحرا کا رہنے والا راہب (طنز کے ساتھ) تم سے ملنے آیا ہے۔ خبردار ہو جاؤ!

تائیس۔ ساتھ کیا لایا ہے؟ عشق!

نسیس۔ کوئی انسانی کمزوری اس کے دل کو نہیں ہلا سکتی۔ وہ تمہیں اپنے مقدس عقیدے پر لانا چاہتا ہے۔

تائیس۔ اس کا عقیدہ کیا ہے؟

اتانیل (آگے بڑھ کر) اپنے جسم سے نفرت، دکھ اور رنج سے محبت کرو۔ نفس کو کچل ڈالو اور گناہوں کی تلافی کرو۔

تائیس۔ (تھوڑی دیر تک اس کو چپ چاپ دیکھتی رہتی ہے) جاؤ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ میں صرف عشق پر ایمان لائی ہوں۔ کوئی اور طاقت مجھ پر قابو نہیں پا سکتی۔

اتانیل۔ (غصے کی حالت میں اس کے کلام کو سنتا رہتا ہے اور آگے بڑھ کر درشتی کے ساتھ مخاطب ہوتا ہے) کفر بک!

(ان الفاظ کو سن کر فلسفی اپنی باتیں چھوڑ تائیس کے قریب آتے ہیں۔ خدام سب مہمانوں کو اس ——— واقعے کی اطلاع پہنچا دیتے ہیں۔ مہمان ایوان ضیافت سے باہر نکل آتے ہیں اور آہستہ آہستہ اضطراب اور حیرت کے عالم میں تائیس اور نسیس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں)

تائیس۔ (اتانیل سے ایسے لہجے سے جس میں طنز اور خوشامد دونوں کی آمیزش ہے) تم کس لئے اس قدر غصے سے بھرے ہو؟ اور تمہاری آنکھوں سے جو روشنی چمک رہی ہے اسے کیوں جھٹلا رہے ہو؟ —— وہ کون سی منحوس طاقت ہے جو تمہاری تقدیر کے رستے میں حائل ہے؟ —— انسان عشق کے لئے بنا ہے اور تم دھوکہ کھا رہے ہو —— انسان علم و فن کے لئے بنا ہے تمہاری آنکھیں کیوں اندھی ہو رہی ہیں؟ —— تمہارے ہونٹ زندگی کی شراب سے ناآشنا ہیں —— تم عشق کی پرستاری کو نہیں جانتے —— آؤ ہمارے ساتھ بیٹھ جاؤ اور پھولوں کا تاج پہن

دے۔ عشق کے مذاق سے محروم ہے.... بیچ... روشنی لے کے چلے جاؤ

اتانیل۔ (بہت جوش کے ساتھ) ابھی جب میں تمہاری حقیقت کا [illegible] ـــ نہیں نہیں میں [illegible] خاموشی کی [illegible]

کو نیلی سمندر سیاہ کا [illegible] میں تمہیں کل ہی اس سے نجات دلاؤں گا۔ [illegible]

تائیس نسیس اور باقی لوگ۔ پھولوں کا تاج پہن رہے ـــ عشق کے مذاق سے محروم ہے۔ روشنی لے کے چلے جاؤ۔

اتانیل۔ (دیکھ کر بیٹھ جاتا ہے اور غصہ ہوتے ہوئے [illegible]) میں [illegible] کل میں [illegible] ڈال دوں گا۔

نسیس اور باقی لوگ۔ (اتانیل کو اٹھا کر) روشنی سے [illegible] بہت خوب ہے

تائیس۔ (افروڈائٹ کے [illegible] بہت [illegible] رقص سے [illegible] اتانیل [illegible] روشنی سے [illegible] آ

بہت ہو گیا۔

سامعین تائیس کا رقص آغاز [illegible] کرتے ہیں ـــ اتانیل
انتہائی غصہ سے پیچ و تاب کھاتا ہوا چلا جاتا ہے۔)

باب دوم

پہلا منظر

(تائیس کا محل

سورج کی روشنی صحن اور [illegible] کے اس پار سے ایوان تک پہنچ رہی ہے اس سے [illegible]
کے ایوان مختلف رنگین ہے اور آنکھوں کو تسکین بخشتی ہے

سامنے زمین کا بت [illegible] ہے اور اس کے پاس [illegible] ایک [illegible] سے خوشبو
دھواں اٹھ رہا ہے فرش پر بیش بہا قالین اور ان پر [illegible] اور صوفے [illegible] کی
کرسیاں بھی ہیں۔ جا بجا پھولدان میں موسم بہار کے پھول سجے ہیں۔
تائیس مغنیوں اور رقاصہ لڑکیوں کے ساتھ داخل ہوتی ہے۔
تھوڑی دیر بعد ان سب کو ایک اشارے سے چلے جانے کا حکم دیتی ہے)

تائیس۔ (تنہا، مایوسی اور رنج کے لہجے میں) آہ! تھکن اور اداسی سے میری زندگی بھاری ہو رہی ہے ـــ مرد سب کے سب بے پروا اور ہوس کار ہیں۔ عورتیں حاسد اور بد خواہ ہیں ـــ اور زندگی کی گھڑیاں بوجھل ہو رہی ہیں ـــ میرے دل میں ہوکیں اٹھتی ہیں ـــ مجھے آرام کہاں نصیب ہوگا اور مسرت کہاں حاصل ہوگی؟ ـــ (سوچ میں ڈوبی ہوئی آئینہ اٹھا لیتی ہے) اے میرے وفادار آئینے۔ مجھے ڈھارس دے ـــ مجھ سے کہہ کہ میں اب بھی حسین ہوں۔ مجھ سے کہہ کہ میرا حسن لازوال ہے۔ میرے گلاب کے سے ہونٹ کبھی خشک نہ ہوں گے۔ اور میرے بالوں کی سنہری چمک کبھی مدھم نہ ہوگی ـــ مجھ سے کہہ کہ میں حسین ہوں اور میرا حسن لازوال ہے ـــ (مضمحل ہو کر اور فکر

سے کون سا آسن ہے گویا کسی عجیب نامعلوم مقام سے وہ آواز کچھ کہہ رہی ہے) آہ! اب یہ تو راز فاش ہو گیا وہ کہتا ہے مجھ سے کہ: 'ایک دن تمہارا حسن ڈھل جائے گا' —— تو پھر ایک دن ایسا بھی آئے گا جب تائیس تائیس نہ رہے گی؟ نہیں! نہیں! یقین ہی نہیں آتا —— اگر کوئی مخفی ترکیب، کوئی سحر کا فن ایسا نہیں جو حسن کو برقرار رکھ سکے: تو اے وینس، تو ہی مجھے اس کے ابدی ہونے کا یقین دلا (وینس کے بت سے مخاطب ہو کر زیر لب دعا مانگتے ہوئے) وینس! —— جو آنکھوں سے اوجھل ہے اور پھر بھی موجود! وینس! مجھے جواب دے، مجھ سے کہہ کہ میں حسین ہوں اور میرا حسن لازوال ہے۔ میرے گلاب کے سے ہونٹ کبھی خشک نہ ہونے پائیں، میرے بالوں کی سنہری چمک مدھم نہ ہو گی —— مجھ سے کہہ کہ میں حسین ہوں اور میرا حسن لازوال ہے ہمیشہ کے لئے! ہمیشہ کے لئے! ہمیشہ کے لئے!

(اس کی نظر آتانیل پر پڑتی ہے جو چپ چاپ اندر آ کر دہلیز کے پاس ٹھہر گیا ہے۔)

تائیس۔ (خلوص کے ساتھ) اجنبی تم اپنے کہنے کے مطابق آ ہی گئے۔

آتانیل۔ (زیر لب دعا مانگتے ہوئے) اے خداوند! اس عورت کا درخشاں چہرہ میری آنکھوں کو خیرہ نہ کرے۔ اس کی دلاویزی کا جادو میرے استقلال کے سامنے بے کار ہو جائے۔

تائیس۔ (مسکرا کر) کہو کیا کہنا ہے؟

آتانیل۔ لوگ کہتے ہیں تم بے مثال ہو، اس لئے میں تم سے ملنے کا آرزو مند تھا۔ اب جبکہ میں نے تم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے میں اچھی طرح سمجھ کہ تم پر قابو پانا میرے لئے کس قدر فخر کا باعث ہو گا۔

تائیس۔ (مسکرا کر) تمہارا عجز بلند مرتبہ ہے تمہارا غرور اس سے بھی زیادہ سرکش ہے۔ خود سر اجنبی! ہشیار رہو، کہیں مجھ سے محبت نہ کرنے لگ جاؤ۔

آتانیل۔ (جذبے کے ساتھ) تائیس میں تم سے محبت کرتا ہوں اور اس کا اعتراف کرنے کے لئے بے قرار ہو رہا ہوں۔ لیکن ویسی محبت نہیں جیسی تم ہو۔ میں مقدس روح کے نام پر، حق اور راستی کے نام پر تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں تمہیں جس عیش کا وعدہ دلاتا ہوں وہ تمہا پھولوں سے آراستہ عشرت کدوں اور ایک مختصر شب وصال کے خواب سے کہیں بڑھ کر ہے۔ جو راحت میں آج تمہارے پاس لے آ اس کا کوئی انجام نہیں۔

تائیس۔ (طنز آمیز لہجے میں) اچھا تو مجھے اس عجیب و غریب محبت کے کرشمے دکھاؤ۔ سچا عشق تو صرف بوسوں کی زبان سے بولتا ہے۔

آتانیل۔ تائیس! میری ہنسی مت اڑاؤ۔ جو عشق میں تمہیں سکھانے آیا ہوں اس سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔

تائیس۔ (بے پروائی سے) دوست! تم بہت دیر میں آئے۔ میں ہر لذت سے واقف ہوں۔

آتانیل۔ جس عشق سے تم واقف ہو وہ شرم اور حیا سوزی سے ہم کنار ہے۔ جو میں تمہیں سکھانے آیا ہوں۔ صرف وہی ایک عشق بلند پایہ ہے۔

تائیس۔ احمق ہو کہ جس کے ہاں مہمان ہو، اس کی توہین کرتے ہو!

آتانیل۔ توہین! —— میں تو صرف تمہیں راہ حق پر لانا چاہتا ہوں۔ (اس کا جوش بڑھتا جاتا ہے) آہ کون ہے کہ جو میرے الفاظ کو شعلوں کی بھڑکا دے تاکہ میرے ایک سانس سے اے رقاصہ! تیرا دل موم کی طرح پگھل جائے۔ کون ہے جو تجھے میرے حوالے کر دے۔

[illegible]

تائیس۔ (بے اختیار ہو کر آتانیل کو اسی طرح نفرت سے دیکھتی ہے) [illegible]!

آتانیل۔ [illegible]۔

تائیس۔ (اپنے دل سے مجبور ہو کر [illegible]) [illegible]

(تائیس [illegible])

آتانیل۔ (گھبرا کر اپنے آپ سے) [illegible] آنکھوں کو [illegible]

[illegible] تائیس [illegible]

[illegible]

تائیس۔ اے راہب [illegible]

آتانیل۔ اے خداوند! اس کی [illegible] میرے استقلال کے سامنے [illegible]۔

تائیس۔ اے راہب! اپنی منزل سے مجھے [illegible] سعیدی ہے [illegible] زندگی سے راحت ہے اور سیری ہے۔

آتانیل۔ (اپنے دل کو کڑا کر کے [illegible] پشمینہ [illegible] پھاڑ کر تار تار کر دیتا ہے) میں تیرا [illegible] آتانیل ہوں۔ میں مقدس صحرا سے آیا ہوں اور میں نفس امارہ پرست بھیجا ہوں اور اس موت پرست بھیجتا ہوں جس کے پیچھے [illegible] اے عورت! میں تیرے سامنے اس طرح کھڑا ہوں گویا مسیح قبر کے سامنے کھڑا تھا اور تجھ سے کہہ رہا ہوں کہ [illegible]! خدا کے حکم سے زندہ ہو جا!

(تائیس کا رنگ خوف کے مارے فق ہے — وہ ہاتھ جوڑے
روتی اور سسکیاں بھرتی ہوئی آتانیل کے قدموں میں گر پڑتی ہے)

تائیس۔ مجھے سزا مت دو، کہو تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ میں جانتی ہوں کہ صحرائے مقدس کے لوگ ان ہستیوں سے نفرت کرتے ہیں جو عشرت کا کھلونا بن جاتی ہیں۔ لیکن مجھ سے نفرت مت کرو۔ مجھے نہ تقدیر پر، نہ فطرت پر اختیار تھا اور میرا کیا قصور کہ میں حسین ہوں۔ مجھے جان سے مت مارو کہ میں موت سے خوف کھاتی ہوں۔

آتانیل۔ (جوش کے ساتھ) نہیں تم ابد تک زندہ رہو گی اور ہمیشہ کے لئے یسوع مسیح کی محبوبہ اور دلہن بنی رہو گی۔ وہ یسوع مسیح جس کی تم دشمن تھیں۔

تائیس۔ (جوش مسرت کے ساتھ) میری روح مسرت اور تازگی سے بھر رہی ہے۔ میں تھرتھرا رہی ہوں لیکن مسرور ہوں۔ یہ مجھ پر کیا جادو کر رہا ہے۔

(نسیس کی آواز دور سے سنائی دیتی ہے، اور آہستہ آہستہ قریب تر ہوتی جاتی ہے)

نسیس کی آواز۔ اے تائیس! نازک اندام حسینہ! میں آخری مرتبہ تیرے پھول سے ہونٹوں کا عشق تجھ سے طلب کرتا ہوں۔

تائیس۔ (اس آواز کو نفرت سے سنتی ہے) آہ نسیس! (گھبراہٹ کے عالم میں اپنے آپ سے) میری روح اب میرے بس میں نہیں۔ مجھے محبت

کرو۔ (بیاک نفرت کے ساتھ) اس نے کبھی کسی کو نہیں چاہا۔ اسے صرف عشق سے عشق ہے۔

آتانیل۔ تم اس کی آواز سن رہی ہو!

تائیس (آتانیل سے) ہاں بابا! اس سے کہہ دو میں اس سے نفرت کرتی ہوں۔

آتانیل۔ (تحکم کے لہجے میں) تمہاری دہلیز پر طلوعِ آفتاب تک میں تمہارا انتظار کروں گا۔

تائیس۔ (سرکشی کی آخری کوشش کرتے ہوئے) نہیں میں رقاصہ تائیس ہوں اور رقاصہ تائیس ہی رہوں گی۔ مجھے کسی چیز پر یقین نہیں۔ اور مجھے کسی چیز کی تمنا نہیں۔ نہ اس کی نہ تمہاری نہ تمہارے خدا کی۔

(دیوانہ وار ہنستی ہے اور پھر سسکیاں بھرنے لگتی ہے۔ اور گدیلوں پر سر کے بل گر کر رونے لگتی ہے آتانیل تقدیس اور اعتماد کی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا ہے اور پھر رخصت ہو جاتا ہے۔

پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے موسیقی اگلے سین کے آغاز تک جاری رہتی ہے۔

دوسرا منظر

(صبح کا سمے۔

تائیس کے محل کے سامنے کا چوک۔

محل کی ڈیوڑھی کے پاس ایروس کا ایک چھوٹا سا بت استادہ ہے اور اس کے سامنے ایک چراغ روشن ہے ابھی چاند کی روشنی پھیکی نہیں پڑی۔

ڈیوڑھی کی سیڑھیوں کے سامنے آتانیل فرش کے پتھروں پر سر رکھے سو رہا ہے۔

دور دائیں طرف کو ایک مکان ہے جس میں نسیاس اور اس کے ہمراہی جمع ہیں۔ مکان کی کھڑکیوں میں سے روشنی دکھائی دے رہی ہے۔ اور محفلِ نشاط کی موسیقی مدھم سی سنائی دے رہی ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد تائیس کے محل کا دروازہ کھلتا ہے اور تائیس باہر آتی ہے۔ چراغ کو سر سے اوپر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھتی ہے اور پھر سیڑھیوں سے نیچے اترتی ہے۔ جب اس کی نظر آتانیل پر پڑتی ہے تو چراغ کو اپنی جگہ پر رکھ کر وہ پھر آتانیل کی طرف واپس آتی ہے۔)

تائیس۔ (آتانیل کی طرف جھک کر نرم لہجے میں اور ادب کے ساتھ) اے مقدس باپ! میں نے خدا کا پیغام تیری زبان سے سنا میں حاضر ہوں۔

آتانیل۔ (اٹھ کر نرم لہجے میں اور ادب کے ساتھ) تائیس! خدا تمہاری راہ تک رہا تھا۔

تائیس۔ (اور بھی نرم لہجے میں اور عجز کے ساتھ) تمہارے الفاظ میرے دکھے ہوئے دل کا مرہم تھے۔ میں دعا مانگتی رہی ہوں اور میں آنسو بہاتی رہی ہوں۔ میری روح کے اندر نور کے چشمے ابل رہے ہیں ـــــ میں نے ہوس اور نفسانیت کی بے مائیگی کو دیکھ لیا ہے تم نے آنے کا

حکم دیا تھا، میں آگئی ہوں۔

اتانیل۔ اے میری بہن! [illegible] مسرت کی لہر دوڑتی ہے۔

تائیس۔ (عجز کے ساتھ) کیا حکم ہے؟

اتانیل۔ یہاں سے قریب مغرب کی طرف ایک راہب خانہ ہے۔ جہاں [illegible] دوسروں کی [illegible] زندگی بسر کرتی ہیں، وہ مقدس ہیں تاکہ یسوع مسیح ان سے محبت کرے۔ [illegible] یسوع مسیح اس کی طرف نظر اٹھائے۔ عصمت [illegible] انہیں اپنی آغوش میں لے لے۔ میں تمہیں وہاں لے جاؤں گا اور تجھے وہ مقدس [illegible] کے حوالے کر دوں گا۔

تائیس۔ آمین [illegible]!

اتانیل۔ (سادگی سے) اور یسوع کی پاکیزہ [illegible] (دریاں لے جاتے ہیں) وہاں میں تمہیں ایک تنگ کوٹھری میں بند کر دوں گا [illegible] مسیح اگر تمہیں نجات دلائے گا [illegible] خوف سے [illegible] تمہاری [illegible] انگلیاں [illegible] جب وہ آئے گا اپنی انگلیوں سے تمہارے آنسو پونچھنے کے لئے تمہاری [illegible] گا۔

تائیس۔ (مسرت سے) آہ مقدس باپ مجھے وہیں لے چلیے۔

اتانیل۔ ہاں۔ مگر پہلے ان سب چیزوں کو فنا کر دو جو ناپاک تائیس کی ملکیت تھیں۔ [illegible] کا شاہد ہے سب کو پھونک دو سب کو فنا کر دو۔

تائیس۔ (مقابلے کی تاب نہ لا کر) مقدس باپ ایسا ہی ہوگا (گھر کی طرف جانے لگتی ہے پھر [illegible]) میں اپنے ساتھ اپنی گذشتہ زندگی کی کوئی یادگار نہیں لے جانا چاہتی [illegible] بجز اس ہاتھی دانت کے بت کے جو قدیم [illegible] کی ہنرمندی [illegible] یہ عشق کا دیوتا ہے (نرم بچے اور پاکیزہ لگتا ہے) اے مقدس باپ! ہم اس پر بے رحمی کیسے رکھتے ہیں۔ عشق ایک [illegible] عشق نہیں۔ عشق کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہے۔ آہ مجھے اس بات کا افسوس نہیں کہ میں نے عشق کو [illegible] بلکہ صدمہ اس بات کا ہے کہ میں نے اس کے احکام کو غلط سمجھا۔ عشق کا حکم ہے کہ [illegible] اپنی آغوش پھیلائے اس کی آغوش سے کنارہ کرو۔ اس قانون کی وجہ سے اس کا احترام واجب ہے [illegible] راہب خانے میں [illegible] وہ پھر خدا کی طرف رجوع کریں۔ کیونکہ عشق ہی [illegible] حقیقت ہے (ایک لمحے کے بعد) جب نسیس مجھے چاہتا تھا تو اس نے مجھے یہ بت تحفے کے طور پر دیا تھا۔

اتانیل۔ (غصے سے بے تاب ہو کر) نسیس! آہ ان مردود ہاتھوں پر لعنت ہو جن سے یہ تحفہ تجھے ملا۔ اس کا [illegible] بھی باقی مت رہنے دو۔ (بت کو چھین کر زور سے فرش پر پھینک دیتا ہے جس سے وہ چور چور ہو جاتا ہے اتانیل اس کے ٹکڑوں کو ٹھوکروں سے بکھیر دیتا ہے) اور اپنا سب کچھ شعلوں کے سپرد کر دو یا کسی گہری غاروں میں دھکیل دو۔ تائیس! اپنی گذشتہ زندگی کو پھر خاک میں ملا دو اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی یاد دل سے محو کر دو۔

تائیس۔ (سر جھکائے کانپ رہی ہے) سب کچھ خاک میں مل جائے گا۔ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محو ہو جائے گا۔ آؤ!

اتانئیل۔ چلو

(اتانئیل اور تائیس کے چلے جانے کے بعد نسیس اور بزم کے تمام اشخاص داخل ہوتے ہیں
شور مچاتے ہوئے اور ہنستے کھیلتے آگے بڑھتے ہیں۔ نسیس سب سے پیش پیش سرخوشی کے عالم میں
ذرا لڑکھڑاتا ہوا چل رہا ہے)

نسیس اور اس کے ہمراہی۔ دوستو! میرے ساتھ ساتھ رہو۔ ابھی صبح نہیں ہوئی۔ قسمت نے تائیس کی قسمت سے تیس گنی مسرت میرے دامن دی ہے اس لئے ایک بار نہیں سو بار خوشی مناؤ

مشرق کی رقاصہ لڑکیوں کو بلاؤ۔ رقاصہ لڑکیوں کو، پیروؤں کو، اہل سرود کو، اور رقص کا ہنگامہ صبح تک نہ تھمنے دو۔

مینا برس کے سرداروں کے کشکول و مشعلیں روشن کردو۔ سورج کو شرما دو۔ برف میں لگی ہوئی شراب سنبھالو۔ نرم نرم قالین بچھا دو اور کروبیل اور مرتال تم بھی میری آغوش میں آجاؤ۔

زندگی کے سوا باقی۔۔ جھوٹ ہے دیوانگی کے سوا باقی سب حماقت ہے

(نسیس کے ہمراہی بڑی مستعدی کے ساتھ اس کے احکام بجالاتے ہیں وہ خود عیش پرست انداز
میں گدیلوں پر گر پڑتا ہے اس کے اردگرد کروبیل، مرتال، بہت سی لونڈیاں اور رقاصہ لڑکیاں
جمع ہو جاتی ہیں۔)

(ہنگامہ رقص)

(کئی قسم کے رقص ہو چکنے کے بعد 'ساحرہ' داخل ہوتی ہے)

نسیس۔ آہ وہ حسینۂ بے مثال آگئی ۔۔۔ کروبیل اپنا رباب اٹھالو۔ مرتال اپنی سارنگی سنبھال لو اور دونوں مل کر حسن کا گیت گاؤ۔

(کروبیل اور مرتال دونوں ساز بجاتی ہیں اور گاتی ہیں' ساحرہ ہلکے ہلکے قدم اٹھاتی ہوئی اور
آہستہ آہستہ اپنے جسم کو لچکاتی ہوئی رقص کرتی ہے اور نرم آواز میں کروبیل اور مرتال کے ساتھ مل
کر گاتی ہے)

کروبیل اور مرتال۔ (۱) وہ حسینہ آگئی جس کا حسن ملکہ صبا سے بھی زیادہ دلآویز ہے جو جنّوں پر رقص کرتی تھی!
(۲) اور اس کے نقاب کے اندر سے اس کی سریلی آواز آگ کے تیروں کی طرح نکل رہی ہے۔
(۳) اس کا رنگ کہربا کی مانند ہلکا سنہری ہے اس کے ہونٹ لہو کی مانند سرخ ہیں۔ اس کی آنکھیں رات کی مانند کالی ہیں۔
(۴) اس کی حرکات سرکنڈے کی جنبش کی مانند نازک اور کسی پرندے کی پرواز کی مانند لطیف ہیں۔

،، اس کی زلفوں کے دام میں کئی دل گرفتار ہیں۔ اس کی نگاہیں بے پناہ ہیں
،، وہ دل چھین لیتی ہے اور وصل کی لذت نا آشنا ہے اس کے ساحر حسن کا کوئی جواب نہیں استاد
،، وہ سنگ دل صنم کی مانند ہے اسے علم نہیں کہ وہ جب چاہے تباہ کر سکتی ہے

(رقص کچھ دیر جاری رہ کر ختم ہو جاتا ہے)

(عین اس وقت آتانئیل ایک روشن مشعل لئے غصے سے بھری ہوئی صورت میں داخل ہوتا ہے)

نیسیس۔ (دفعتہً) آپ ہیں! ارے یہ تو وہ ہے۔ یہ تو آتانئیل ہے۔

ہرمی۔ آتانئیل! عاشق مزاجوں کے اصل معبود! تم پر سلامتی ہو! تائیس نے تمہاری عقل کو اندھا کر دیا؟ (ہنس کر) وہ دیکھو وہ دیکھو۔ اس راستے درخشاں چہرے کی طرف دیکھو!

آتانئیل۔ (مشعل کو زمین پر پھینک دیتا ہے جس سے وہ بجھ جاتی ہے) اپنی زبان روک لو۔ تائیس خداوند کی دلہن ہے۔ اب وہ تم لوگوں کی ملکیت نہیں ہے ناپاک تائیس ہمیشہ کے لئے مر چکی۔ اور اب ایک دوسری تائیس — وہ دیکھو آ رہی ہے!

(تائیس داخل ہوتی ہے)

اس کے بال کھلے ہیں اور اس نے موٹا اونی لباس پہن رکھا ہے لونڈیاں حسرت سے اس کے پیچھے پیچھے آتی ہیں۔ وہ بار بار مڑ کر محل کی طرف دیکھتی ہے۔
محل سے ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا ہے تھوڑی دیر میں آگ کے شعلے نکلنے لگیں گے اور آگ سین کے اختتام تک بڑھتی جائے گی۔
شور و غوغا اور قہقہوں کی آوازیں سن کر آہستہ آہستہ چوک میں ہجوم جمع ہونا شروع ہو گیا ہے

آتانئیل۔ (تائیس سے) مقدس بہن! آؤ اس شہر سے ہمیشہ کے لئے بھاگ جائیں۔

لوگوں کا ایک گروہ۔ نہیں۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ کبھی نہیں۔

ہجوم اور نیسیس کے ہمراہی۔ (حائل ہو کر) کیا یہ اسے اپنے ساتھ لے جا رہا ہے؟ یہ کیا کر رہا ہے!

تائیس۔ ہاں یہ سچ کہتا ہے۔

نیسیس۔ تائیس! تم ہم سے چلی جاؤ گی کیا یہ ممکن ہے؟ (تائیس کو بازو سے پکڑ لیتا ہے)

آتانئیل۔ (تائیس کو چھڑا کر) ناپاک شخص! ہاتھ لگایا تو جان سے مار دیا جائے گا۔ اس کا جسم مقدس ہے! یہ خدا کی ملکیت ہے۔ (تائیس کو اپنے قریب لا کر چلے جانے کی کوشش کرتا ہے) آگے سے ہٹ جاؤ۔

ہجوم۔ (برافروختہ ہو کر) نہیں نہیں۔ یہ شخص کیا چاہتا ہے؟ یہ صحرا کو واپس کیوں نہیں چلا جاتا؟

ایک گروہ۔ (آتانئیل کو دھکا دے کر) بن مانس! یہاں سے دور ہو جاؤ!

ہجوم۔ یہ تائیس کو ہم سے لے جائے گا! اچھا؟ ہم زندہ کیسے رہیں گے؟ میرے محلات! میرے ہار! میرے گھوڑے! میرے جواہرات! ہائے ان کی قیمت کون ادا کرے گا؟ کیا کوئی قانون ہماری مدد نہیں کر سکتا؟ یہ تائیس کو ہم سے چھین رہا ہے۔

خوفزدہ عورتیں۔ (جلتے ہوئے مکان کی طرف اشارہ کر کے) شعلے! آگ! محل جل رہا ہے۔

ہجوم۔ (شور مچاتے ہوئے) تائیس یہیں رہے گی۔ اس شخص کو جان سے مار دو! اسے کسی گڑھے میں دھکیل دو! اسے پھانسی پر لٹکا دو! اسے بیلوں کے آگے ڈال دو۔

ہجوم میں سے ایک شخص۔ (ایک پتھر اٹھا کر آتانیل کے مارتا ہے جس سے اس کا چہرہ زخمی ہو جاتا ہے) مردود! یہ لے!

آتانیل اور تائیس۔ (ایک دوسرے کے بالکل پاس کھڑے ہوئے سخت خوف و اضطراب کے عالم میں ادھر ادھر دیکھ رہے ہیں شعلے تیز تر ہوتے جاتے ہیں) آہ! اگر موت کی گھڑی سر پر آگئی ہے تو آؤ جان خدا کے سپرد کر دیں اور اپنے خون کی قیمت سے ایک لمحے کے اندر ابدی مسرت خرید لیں۔

ہجوم۔ (برافروختہ ہو کر) اسے جان سے مار ڈالو

نسیس۔ (ہجوم کے رستے میں حائل ہو کر) تمہیں دیوتاؤں کا واسطہ ہے ٹھہر جاؤ۔ یہ لو۔ اس سے اپنے دل کو ٹھنڈا کر لو۔ (تھیلی میں ہاتھ ڈالتا ہے اور اشرفیوں کی مٹھیاں بھر بھر کر ہجوم کے سامنے بکھیر دیتا ہے)

ہجوم۔ (ایک دوسرے پر گرتے ہوئے اشرفیاں اٹھانے لگ جاتے ہیں) اشرفیاں! سونا!

نسیس۔ (آتانیل اور تائیس سے) جاؤ! خدا حافظ! تائیس تم مجھے بھلا دو گی! لیکن اس سے کیا حاصل؛ تمہاری یاد سے میری روح ہمیشہ خوشبو میں بسی رہے گی۔

نسیس اور بھی سونا بکھیرتا ہے۔ ہجوم پھر شور مچاتا ہے۔ آتانیل اور تائیس بھاگ جاتے ہیں —
محل جل رہا ہے)

باب سوئم

پہلا منظر

(خیابان —
کھجور کے درختوں کے سایے میں ایک کنواں۔
دور درختوں میں راہگیروں کے آرام کے لیے ایک جھونپڑی ہے اس سے بھی پرے ریگستان کے کنارے البین کا سفید گھر دھوپ میں چمک رہا ہے۔
سورج بہت بلند ہے۔ کھجور کے درختوں کے نیچے بہت سی عورتیں چپ چاپ کنوئیں تک جاتی ہیں۔ اور پھر اوپر آکر واپس چلی جاتی ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد آتانیل اور تائیس داخل ہوتے ہیں۔ تائیس تکان کے مارے کھڑی بھی مشکل سے ہو سکتی ہے)

تائیس۔ میں گرمی کی شدت سے نڈھال ہو رہی ہوں۔ آہ میں سختیوں سے مری جاتی ہوں۔ ذرا دم لینے کو ٹھہر جائیں۔

آتانیل۔ ٹھیرو، تم تھک گئی ہو۔ [illegible]

تائیس۔ (لڑکھڑاتے ہوئے) مقدس باپ! [illegible]

آتانیل۔ صرف تھوڑی سی [illegible] اور [illegible] سے انہیں کے واسطے گیا تھا۔ [illegible] حقیقت کی [illegible] ہے [illegible] موت [illegible]

تائیس۔ مقدس باپ تم سچ کہتے ہو۔

آتانیل۔ آگے بڑھو، [illegible]

تائیس۔ (ہونٹ زرد، [illegible])

آتانیل۔ (درشتی سے) یہ پچھتانا بے سود ہے آگے بڑھو!

تائیس۔ (درد ناک ہو کر) میں اب نہیں چل سکتی۔ محترم باپ! مجھے معاف کرو۔

(زمین پر گر پڑتی ہے۔ آتانیل اسے اپنے بازوؤں میں سنبھال لیتا ہے اور سائے میں بٹھا دیتا ہے۔ کچھ دیر چپ چاپ اس کو دیکھتا رہتا ہے۔ اور پھر یک لخت اس کے چہرے سے رحم ٹپکنے لگتا ہے)

آتانیل۔ تمہارے سفید سفید تلووں سے خون کے قطرے نکل رہے ہیں۔ میرا دل ترس کھا رہا ہے۔ بدنصیب لڑکی! [illegible] مقدس تائیس! میری بہن! میں نے اس آزمائش کو حد سے زیادہ سخت بنا دیا۔ مجھے معاف کرو۔ (زمین پر جھک جاتا ہے اور احترام کے جذبات کے ساتھ تائیس کے خون آلودہ پاؤں چومتا ہے) مقدس تائیس! محترم تائیس۔

تائیس۔ (دیر تک اس کے چہرے کو دیکھتی رہتی ہے) تمہارے الفاظ میں صبح کی سی تازگی ہے۔ چلو اب آگے چلیں۔

آتانیل۔ (نرمی کے ساتھ) ابھی نہیں! تازہ پانی اور پھلوں سے تمہارے جسم میں طاقت آ جائے گی۔ تم یہیں ٹھیرو۔ میں اس مسافر خانے کے پاس کنوئیں تک جا کر پانی لے آؤں۔ وہ پرے جو سفید جھونپڑیاں دکھائی دیتی ہیں۔ راہبوں کا راہب خانہ ہے۔ منزل قریب ہے۔ ہمت نہ ہارو اور خدا سے دعا کرو۔

(آہستہ آہستہ چلا جاتا ہے۔ درختوں کے پاس جھونپڑی کے اندر داخل ہوتا ہے۔ وہاں سے ٹوکری میں کچھ پھل لے کر باہر آتا ہے اور پھر مٹی کا ایک پیالہ لے کنوئیں کی طرف جاتا)

تائیس۔ (تنہا) اے خدا کے پیغامبر! جس کی سختی بھی نیکی ہے۔ تجھ پر خدا کی رحمت ہو کہ تو نے آسمان کے دروازے مجھ پر کھول دئے۔ میرے جسم سے خون بہہ رہا ہے اور میری روح مسرت سے لبریز ہے۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے میرے تپتے ہوئے ماتھے کو ٹھنڈک پہنچا رہے ہیں۔ تمہارا شیریں اور قوت افزا تصور چشمے کے پانی سے بھی تازہ اور شہد سے بھی میٹھا ہے۔ میری روح علائق سنگل سے آزاد ہو کر ایک لامتناہی فضا میں پرواز کر رہی ہے۔ محترم باپ! تم پر خدا کی رحمت ہو!

(آتانیل پانی اور پھل لے کر واپس آتا ہے)

آتانیل۔ اپنے ہاتھ دھوؤ۔ اپنے ہونٹ تر کر لو، یہ پھل کھا لو، اور اس تپش کو ٹھنڈا کرو جس سے تمہاری آنکھیں چمک رہی ہیں۔ تمہاری زندگی اب میری بے بہا دولت ہے۔ یہ میری ہے، خدا نے اسے میرے سپرد کیا ہے۔

(تائیس کے ہاتھ پر پانی ڈالتا ہے اور اپنے ہاتھوں سے اسے پانی
پلاتا ہے تائیس خود پی کر مسکراتی ہوئی پیالہ اس کی طرف بڑھاتی ہے۔)

تائیس۔ اب تم پیو!

آتانیل۔ نہیں! تمہیں تازہ دم دیکھ کر میری پیاس بجھ گئی ہے۔ تمہارے دکھ کو دور کرنا ہی میری سب سے بڑی خوشی ہے۔ تائیس! اے جان کی راحت۔

تائیس۔ اے نیکی کے فرشتے۔

(اسے پھل کھانے کو دیتا ہے اور خود پھر کنویں سے پانی بھر لاتا ہے اس کے بعد مکمل خاموشی
چھا جاتی ہے
دور سے حمد کے گیتوں کی آواز مدھم سی سنائی دیتی ہے اور آہستہ آہستہ بلند ہوتی جاتی ہے اور
البین اور راہب لڑکیوں کا گروہ داخل ہوتا ہے۔)

آوازیں۔ (دور سے) اے باپ جو آسمان پر حکومت کر رہا ہے ـــ ہمیں آج کے دن رزق عطا فرما!

تائیس۔ کون آ رہا ہے؟

آتانیل۔ محترمہ البین اور اس کی بہنیں راہب خانے کی کالی ردائیں اوڑھے ہیں۔ وہ ہماری طرف آ رہی ہیں اور خدا کی حمد گا رہی ہیں۔

آوازیں۔ (بہت ہی قریب) خداوندا ہمیں آزمائش میں نہ ڈال اور ہمیں بدی سے بچائے رکھو!

(البین اور دوسری عورتیں داخل ہوتی ہے)

آتانیل۔ آمین!

(آتانیل کو دیکھ کر البین اور دیگر راہب عورتیں ٹھہر جاتی ہیں اور بہت ادب اور احترام کے
انداز میں کھڑی ہو جاتی ہیں تائیس بھی اٹھ کر آتانیل کے پاس کھڑی ہو جاتی ہے)

آتانیل۔ (البین سے) محترم البین! تم پر خدا کی برکت نازل ہو۔ میں تمہارے آسمانی چھتے میں ایک ایسی شہد کی مکھی لایا ہوں۔ جسے میں نے فضل خداوند کی مدد سے ایک بے برگ و گل رستے پر بھٹکتا پایا۔ میں نے اس کمزور و نحیف جان کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اپنے سانس سے اس میں جان ڈالی اور اب میں اسے خدا کی نذر کرنے کے لئے تمہارے سپرد کرتا ہوں۔

البین۔ میری بیٹی میرے قریب آؤ۔

(تائیس کو مادرانہ شفقت کے ساتھ گلے لگا لیتی ہے)

آتانیل۔ میں اس سے آگے نہ جاؤں گا۔ میرا فرض پورا ہو چکا۔ پیاری تائیس! خدا حافظ! اب تم تنگ کوٹھری میں تنہا زندگی بسر کرو اپنے گناہوں سے توبہ کرو، اور ہر وقت میرے لئے دعا مانگتی رہو!

تا۔ (اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر) میں تمہارے دستگیر ہاتھوں کو بوسہ دیتی ہوں کہ تم نے مجھے خدا کے دروازے تک پہنچایا۔ تم سے جدا ہوتے ہوئے مجھے دکھ ہوتا ہے۔

بل۔ رقت انگیز الفاظ! قابل پرستش آنسو! وہ خاص خوش قسمت ہے جسے عشق [illegible] بنایا جاتا ہو۔ [illegible] اس کا چہرہ کس قدر دلفریب ہے۔ اس کی آنکھوں میں مسرت کا نور چمک رہا ہے۔

تا۔ خدا حافظ محترم باپ خدا حافظ! ... ہمیشہ کے لئے!

ئیل۔ (دھیمے سے) اس پل گھڑی! ہمیشہ کے لئے!

بن۔ دوبارہ ملاقات آسمان پر ہوگی

بن اور راہب عورتیں۔ آمین!

(لڑکیاں تائیس کو ساتھ لے کر رخصت ہو جاتی ہیں۔ آتانئیل
ان کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے خواب کے عالم میں ہو)

ئیل۔ (تنہا) اس کے قدم آہستہ اٹھ رہے ہیں۔ [illegible] میں جھلا دیتے ہیں گویا اس کے دیکھنے کو غم پہنچا دیتے ہوں۔ وہ کئی دن اور پھر کئی سال گزر جائیں گے اور میں اس کا چہرہ کبھی نہ دیکھ سکوں گا۔

(عصا کا سہارا لئے مبہوت کھڑا اسی طرف دیکھ رہا ہے۔ پردہ گرتا ہے)

دوسرا منظر

(صحرائے تھیبس ـــ
دریائے نیل کے کنارے سینوبیت راہبوں کی جھونپڑیاں۔ مغرب کی طرف آسمان کا رنگ
سرخ ہے اور معلوم ہوتا ہے آندھی آنے والی ہے۔
راہب اپنا شام کا کھانا کھا چکے ہیں اور آسمان کو خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔
دور باد سموم چلنے لگی ہے۔
صحرا کی گہرائیوں میں سے گیدڑوں کی آوازیں اور شیروں کی دہاڑ سنائی دیتی ہے۔)

راہب۔ آسمان تاریک ہو رہا ہے۔ جان دار اور بے جان اشیا پر بے ہوشی سی طاری ہو رہی ہے۔ دور سے گیدڑوں کی چیخیں سنائی دے رہی ہیں۔ تھوڑی دیر میں ہوائیں، بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک کے ساتھ قہر کے دروازے کھول دیں گی۔

پالیموں۔ اپنی اپنی جھونپڑیوں کو واپس چلے جاؤ! اور اپنا ظرف اور پھل سنبھال لو ورنہ آندھی ان کو صحرا میں دور تک بکھیر دے گی۔ (راہب اس حکم کی تعمیل کرتے ہیں)

ایک راہب۔ (چلتے ہوئے) آتانئیل! ـــ کیا کسی نے اس کو دیکھا؟

پالیموں۔ اسے واپس لوٹے بیس دن ہو چکے ہیں لیکن اے بھائیو! جس دن سے وہ واپس آیا ہے نہ اس نے کچھ کھایا ہے نہ پیا ہے۔ اسے جھونپڑے پر جو

صبح نصیب ہوتی ہے۔ ریاضت نے اس کے جسم و روح کو چور چور کر دیا ہے۔

(آتانئیل جھونپڑی سے باہر نکلتا ہے۔ جسم خمیدہ ہے چہرہ ستا ہوا ہے نظریں بہت نیچی ہیں!)

راہب۔ (ادب کے ساتھ) وہ آگیا!

(آتانئیل ان کے بیچ میں سے ان کو دیکھے بغیر گزر جاتا ہے۔)

چند راہب۔ اس کا دھیان کہیں اور لگا ہے ——

چند اور راہب۔ وہ مراقب ہے

راہب۔ (چپکے ہوئے) اس کی خاموشی کا احترام کرو، اور اسے مت چھیڑو۔

آتانئیل۔ (پالیمون سے عاجزی کے ساتھ) محترم راہب مجھے کچھ کہنا ہے۔ مجھے تو اپنے درد و کرب کا اعتراف کرنا ہے۔ اے پالیمون! زمانے ہوئے کہ میں نے سیہ کار تائیس کی روح پر فتح پائی۔ اس فتح پر مجھے فخر تھا اور میں شاداں تھا اور پھر میں اس پرسکون صحرا میں واپس آیا۔ لیکن اب طمانیت قلب مجھ سے کوسوں دور ہے۔ میں نے اپنے نفس کو بے رحمی سے کچلا لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔ میں نے اپنے جسم کو زخموں سے چور چور کیا لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ میں کسی شیطانی جذبے کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوں۔ اس عورت کے حسن کا تصور مجھے دیوانہ بنا رہا ہے۔ مجھے سوائے تائیس کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ وہاں ایک ہستی ہے مجھے جسم کی ہر لذت اور دنیا کے حسن کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔

(شرم کے مارے پانی پانی ہو کر پالیمون کے قدموں میں گر پڑتا ہے)

پالیمون۔ (نرمی کے ساتھ) میں نے تم سے نہ کہا تھا "میرے بیٹے ہم راہبوں کو اس دنیا کے لوگوں سے احتراز واجب ہے۔ شیطان کے مکر سے خبردار رہو؟" تو پھر تم کیوں جا کے پھنسے ہوئے تھے؟ آسمانی باپ تمہارا حامی و ناصر ہو —— خدا حافظ!

(آتانئیل کھڑا ہوتا ہے پالیمون اسے گلے لگا کر چلا جاتا ہے۔ آتانئیل تنہا گھٹنوں کے بل چٹائی پر گر کر اپنے بازو پھیلا دیتا ہے۔ اور خاموشی کے ساتھ خدا سے دعا مانگتا ہے۔ پھر ہاتھ سامنے لیٹ کر سو جاتا ہے)

(تھوڑی دیر کے بعد اندھیرے میں تائیس کا تصور چمکتا ہوا دکھائی دیتا ہے)

تائیس۔ (آتانئیل سے دلفریب اور دلکش انداز میں) تم کس لئے اس قدر غصے سے بھرے ہو؟ اور تمہاری آنکھوں میں جو روشنی چمک رہی ہے اسے کیوں جھٹلا رہے ہو؟

آتانئیل۔ (عالم خواب میں) تائیس . . . . .

تائیس۔ وہ کون سی منحوس طاقت ہے جو تمہاری تقدیر کے رستے میں حائل ہے۔ انسان عشق کے لئے بنا ہے اور تم دھوکا کھا رہے ہو!

آتانئیل۔ (گھبرا کر جاگ اٹھتا ہے) ملعون شیطان! میرے سامنے سے ہٹ جا . . . آہ! میرا جسم پھنک رہا ہے۔

تائیس۔ (غصہ دلا کر) وینس سے سرکشی کرنے والے، ہمت ہو تو آجانا!

آتانئیل۔ (سراسیمہ) میرا دم نکل رہا ہے! تائیس میرے پاس آؤ!

(جب وہ منظر [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible])

آتانیل۔ (اس طرف دیکھ کر [illegible]

آوازیں۔ ایک مقدس ہستی [illegible]

آتانیل۔ (دیوانہ وار) تائیس [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

قتل کر دیتا [illegible] تائیس [illegible]

(بجلی [illegible] تاریکی میں غائب ہو جاتا ہے۔

(اندھیرا [illegible] بجلی اور گرج۔ موسیقی [illegible])

تیسرا منظر

(البین کے قصر کا باغیچہ —
ایک درخت کے سائے میں تائیس بے حس و حرکت پڑی ہے گویا مر رہی ہے۔
راہب عورتیں اور البین اس کے گرد جمع ہیں)

راہب عورتیں۔ (ہاتھ باندھے گھٹنوں کے بل کھڑی ہیں اور زیر لب دعا مانگ رہی ہیں) اے خداوندا! مجھ پر رحم کر، اے خداوندا اپنی محبت کے صدقے اپنی رحمانیت کے طفیل میرے گناہوں کو دھو ڈال۔

البین۔ (تائیس کو دیکھ کر) خدا بلا رہا ہے اور آج رات یہ پیارا چہرہ کفن کی سفیدی میں چھپ جائے گا۔ تین دنوں تک یہ راتوں کو جاگ کر دعائیں مانگتی رہی ہے اور آنسو بہاتی رہی ہے اس کا جسم کمزور ہے لیکن اس کے گناہ سب دھل چکے ہیں۔

راہب عورتیں۔ اے خدا مجھ پر رحم کر۔ اے خدا اپنی محبت کے صدقے

(آتانیل زرد رو اور مغموم باغ میں داخل ہوتا ہے البین کو دیکھ کر سنبھل جاتا ہے اور
عاجزی کے انداز میں ٹھہر جاتا ہے البین آگے بڑھتی ہے اور راہب عورتیں آتانیل اور
تائیس کے درمیان حائل ہو جاتی ہیں)

البین۔ (آتانیل سے) محترم باپ! تمہارا آنا مبارک ہو، یقیناً تم اس مقدس ہستی کو برکت دینے کے لئے آئے ہو!

آتانئیل۔ (اپنی بدحواسی پر مشکل سے قابو پا کر) ہاں . . . تائیس!

البین۔ تمہارے احکام کی پوری تعمیل کرنے کے بعد اب وہ خدا کے دیدار سے مشرف ہونے والی ہے۔

(راہب عورتیں پیچھے ہٹ جاتی ہیں اور آتانئیل کی نظر تائیس پر پڑتی ہے)

آتانئیل۔ (جیسے درد سے بے قرار ہو) تائیس! تائیس!

(بے تاب ہو کر منہ کے بل گر پڑتا ہے۔ البین اور راہب عورتیں پرے ہٹ جاتی ہیں اور دعا میں مشغول ہو جاتی ہیں آتانئیل بمشکل گھٹنوں کے بل کھڑا ہو کر اپنے بازو تائیس کی طرف پھیلاتا ہے)

آتانئیل۔ (بہت ہی ہلکی آواز میں) تائیس!——

تائیس۔ (آنکھیں کھول دیتی ہے اور حیرت زدہ نظروں سے آتانئیل کے چہرے کو دیکھتی ہے) محترم باپ! تم ہو! (آتانئیل کا جواب اسے بالکل سنائی نہیں دیتا) تمہیں وہ شاندار سفر یاد ہے جب تم مجھے یہاں لے کر آئے تھے؟

آتانئیل۔ میں تمہارے نسوانی حسن کے سوا باقی سب کچھ بھلا چکا ہوں۔

تائیس۔ تمہیں وہ راحت اور آرام کی گھڑیاں یاد ہیں، اس خیابان کی ٹھنڈی ہوائیں؟

آتانئیل۔ (والہانہ) مجھے صرف وہ پیاس یاد ہے جو تمہارے سوا اور کوئی نہیں بجھا سکتا۔

تائیس۔ اور پھر تمہیں وہ مقدس الفاظ یاد ہیں وہ جب تمہاری زبان سے میں نے سچے عشق کی حقیقت کو پہچانا۔

آتانئیل۔ (بے قرار ہو کر) میں تمہیں دھوکہ دے رہا تھا!

تائیس۔ اور وہ دیکھو صبح ہونے والی ہے۔ مشرق کے شہابی رنگ کو دیکھو!

آتانئیل۔ نہیں نہیں۔ آسمان بے حقیقت ہے سب کچھ ہیچ ہے زندگی اور انسانی محبت کے سوا باقی سب جھوٹ ہے۔ میں تم پر مر چکا ہوں۔

تائیس۔ جنت کے دروازے کھل رہے ہیں۔ وہ دیکھو خدا کے فرشتے اور رسول آپہنچے، وہ مسکراتے ہوئے ہاتھوں میں پھول اٹھائے آ رہے ہیں۔

آتانئیل۔ میری راحت، میری زندگی، میری بات سنو!

تائیس۔ (اٹھ کر کھڑی ہو گئی ہے اور کانپ رہی ہے) دو سفید سفید پروں والے فرشتے آسمان سے اتر رہے ہیں اور جیسا کہ تم نے کہا تھا۔ شفیع خداوندی اپنی نور کی انگلیوں سے میرے آنسو ہمیشہ کے لیے پونچھ رہا ہے۔

آتانئیل۔ کہو میں زندہ رہوں گی، کہو میں ابھی نہ مروں گی!

تائیس۔ سنہری ساز کا ترنم مجھے مسرور کر رہا ہے، معطر ہوائیں مجھے مست کر رہی ہیں۔ میری مصیبتوں پر آسمانی برکات کا نزول ہو رہا ہے۔ آہ۔ خداوندا آہ۔ مجھے خدا نظر آ رہا ہے۔ (مر جاتی ہے)

(آتانئیل چیخ کر گھٹنوں کے بل گر پڑتا ہے)

ترجمہ: پطرس

سیب کا درخت

جان گالزوردی

اپنی شادی کی پچیسویں سالگرہ کے دن ایشرسٹ اور اس کی بیوی جنگل کے کنارے موٹر میں سیر کر رہے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ دن بھر سیر کرنے کے بعد رات اس تقریب کی خوشی میں ٹورکی کے مقام پہ گزاریں۔ جہاں ان دونوں کی سب سے پہلے ملاقات ہوئی تھی۔ یہ تجویز سٹیلا ایشرسٹ کی تھی۔ اس کی فطرت میں جذباتیت کی ایک جھلک سی پائی جاتی تھی۔ سٹیلا میں اب وہ پہلے کا سا حسن تو نہ تھا۔ نہ وہ نیلی آنکھیں۔ نہ وہ پھول کی سی لطافت۔ نہ وہ چہرے اور اعضا کی نزاکت و پاکیزگی جسے دیکھ کر آنکھوں کو تسکین ہوتی تھی۔ نہ وہ سیب کے شگوفے کی سی رنگت جس نے آج سے چھبیس سال پہلے ایشرسٹ کے دل کو یک بیک جھلک میں موہ لیا تھا۔ لیکن تینتالیس برس کی عمر ہونے پر بھی اپنے شوہر کی وفادار رفیق تھی۔ چہرہ اب بھی حسین تھا۔ گالوں پر ہلکے ہلکے داغ پڑ گئے تھے۔ اور آنکھوں میں ایک برنزی سی آ گئی تھی۔

سٹیلا ہی نے موٹر کو ایسے مقام پر ٹھہرایا۔ جہاں بائیں ہاتھ کو مرغزار کی اونچی چڑھائی تھی۔ اور جنگل کا ایک تنگ سا خطہ جس میں زیادہ تر بیچ اور لارچ اور کہیں کہیں چیڑ کے درخت اُگے ہوئے تھے۔ اس وادی کی طرف بڑھا ہوا تھا۔ جو سڑک سے لے کر بھرے جنگل کی نیلی اونچی پہاڑی تک پھیلی ہوئی تھی۔ اسے ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں دونوں بیٹھ کر لنچ کھائیں۔ ایشرسٹ کو تو کبھی کسی چیز کی تلاش نہ تھی)۔ ادھر ادھر چاروں طرف قرمزی سنہری پھول اگ رہے تھے۔ لارچ کے ہرے بھرے ہلکے پھلکے پتوں پر اواخر اپریل کی دھوپ پڑ رہی تھی۔ اور ان میں سے لیموں کی خوشبو آ رہی تھی۔ سامنے گہری وادی کا منظر جنگل کے لمبے لمبے ٹیلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ سٹیلا کو آبی رنگوں سے تصویر کھینچنے کا شوق تھا۔ یہ ایمان انگیز منظر اس کے دل کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔ اس پر طبیعت ایسی کہ جھٹ ہر بات کا فیصلہ کر لیتی۔ چنانچہ یہی مقام اسے موزوں معلوم ہوا۔ رنگوں کا ڈبہ ہاتھ میں لے اور موٹر سے نیچے اتری۔

"کیوں فرینک؟ یہ جگہ ٹھیک ہے؟"

ایشرسٹ کی شکل کچھ کچھ شیلر سے ملتی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس کے داڑھی تھی۔ شیلر کے داڑھی نہ تھی۔ گالوں پر کے بال سفید تھے۔ لمبا قد۔ لمبی لمبی ٹانگیں۔ بڑی بڑی بھورے رنگ کی کھوئی کھوئی سی آنکھیں جو پُرمعنی ہوتیں تو چہرہ پر ایک حسن سا آ جاتا۔ ناک ذرا ایک طرف کو۔ داڑھی اور مونچھوں کے بیچ میں ہونٹ ذرا کھلے ہوئے۔ اڑتالیس برس کی عمر۔ چپ چاپ کھانے کی ٹوکری اٹھائے موٹر سے نیچے اترا۔

"دیکھو فرہنگ: قبر"

مرغزار کی اونچان سے ایک پگڈنڈی نیچے کو اترتی تھی۔ جو جنگل کے تنگ خطے کے ساتھ ہو کر ایک پھاٹک میں سے نکل جاتی تھی۔ جہاں یہ پگڈنڈی سڑک کو عموداً کاٹتی تھی۔ وہاں سڑک کے کنارے مٹی کی ایک ڈھیری سی تھی جو فٹ لمبی فٹ بھر چوڑی۔ اور گھاس اگی ہوئی تھی۔ مغرب کو ایک پتھر کھڑا تھا۔ جس پر کوئی اللہ کا بندہ بلیک تھارن کی ایک ٹہنی اور کچھ نیلے پھول ڈال گیا تھا۔ الیشرسٹ نے قبر کو دیکھا تو شاعرانہ دل امڈ آیا۔ سوچا چوراہے پر تو اس شخص کی قبر بناتے ہیں جس نے خودکشی کی ہو۔ اللہ اللہ فانی انسان بھی کیسے کیسے توہمات پر تکیہ کرتا ہے! لیکن جو بھی یہاں دفن ہے سکھ کی نیند سو رہا ہے۔ قبر کے سرہانے ایک ناہموار سا پتھر ہے۔ سر پر کھلے آسمان کا سائبان ہے۔ اور راہ چلتے لوگ فاتحہ پڑھ جاتے ہیں۔ جیسی موت مرتا تو کسی قبرستان میں سیلا ہوا مقبرہ ہوتا۔ اور چاروں طرف بدوضع قبریں۔ جن پر طرح طرح کے لاحاصل کلمات کندہ ہوتے۔ منہ سے کچھ۔ بلا جانتا تھا کہ گھر کے لوگوں میں فلسفہ بگھارنا بے سود ہے۔ چپ چاپ مرغزار کی جانب چل دیا۔ ایک دیوار کے نیچے کھانے کی ٹوکری رکھی۔ بیوی کے بیٹھنے کو کمبل بچھایا۔ (کیونکہ جب اسے بھوک لگے گی تو تصویر کشی چھوڑ کر یہیں آ نکلے گی) اور جیب سے مرے کا ہپالٹس کا ترجمہ نکالا تھوڑی دیر میں سپرینا اور اس کے انتقام کی داستان پڑھ چکا تو آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ نیلگوں آسمان پر اجلے بادلوں کو دیکھ کر الیشرسٹ کا دل آج اپنی شادی کی پچیسویں سالگرہ کے دن نہ معلوم کس چیز کے لئے تڑپنے لگا۔ سچ ہے۔ زندگی اور فطرت انسانی کا آپس میں جوڑ نہیں! انسان کی زندگی کتنی ہی پاک اور ارفع ہو۔ پھر بھی اندر ہی اندر ایک ہوس ایک جستجو لگی رہتی ہے اور زندگی خالی خالی معلوم ہوتی ہے۔ کیا عورتوں کے دل کا بھی یہی حال ہے؟ یہ کون جانے؟ انسان میں ایک جدت پسندی ہے جس کی وجہ سے وہ نت نئے حسن کی تلاش میں رہتا ہے۔ اور متضاد اور نت نئے جھگڑوں میں پڑنا چاہتا ہے۔ لیکن اگر اس کی تسکین ہو جائے تو جہاں پہلے طبیعت میں ایک تشنگی تھی وہاں اب ایک سیری آ جاتی ہے۔ طبیعت اکتا جاتی ہے۔ اطمینان مفقود ہو جاتا ہے۔ غرضیکہ یہ مرض لاعلاج ہے زندگی اور تہذیب یافتہ انسان کا آپس میں جوڑ نہیں۔ انسان کو یہ قدرت تو حاصل ہے کہ حسن کو فن کے کسی نمونے میں قید کر کے ہمیشہ کے لئے ایک جگہ جکڑ رکھے۔ اور جب اسے دیکھے یا پڑھے۔ ہمیشہ اسی قابل قدر علو اسی تسکین بخش نشے کا احساس ہو۔ لیکن اسے یہ قدرت نہیں کہ اسی طرح اپنی زندگی کے اندر بھی اپنی مرضی کا ایک گلزار بنائے۔ جس میں بقول اس خوش گفتار یونانی کے اس کے "سیب کا درخت ہو۔ موسیقی ہو اور سنہری پھول ہوں۔" جس انسان کے اندر احساس حسن موجود ہے اسے زندگی میں جنت نہیں مل سکتی۔ دائمی مسرت اس کے قبضے سے باہر ہے۔ بعض بعض لمحے البتہ اس قسم کی دلفریبی سے ضرور معمور ہوتے ہیں جن میں ایک سریع بے خودی آپ ہی آپ انسان پر طاری ہو جاتی ہے۔ لیکن جتنی دیر میں ایک بادل سورج کے سامنے سے گزر جاتا ہے اتنی دیر میں یہ لمحے بھی گذر جاتے ہیں جس طرح فن حسن کو قید کر لیتا ہے۔ اسی طرح ان لمحوں کو قید کر رکھنا ممکن نہیں۔ یہ ان لمحوں کی طرح گریزپا ہیں جن میں انسان کو اس روح فطرت کے درخشاں یا جھلملاتے ہوئے جلوے کی ایک جھلک دکھائی دے جاتی ہے جو انسانوں سے دور اپنی سوچ میں مستغرق بیٹھی ہے۔ اس مقام پر اور اس لمحے کے اندر جبکہ دھوپ اس کے چہرے پر پڑ رہی ہے تھارن کے درخت پر ککو بول رہا ہے گورس کی خوشبو سے ہوا میں شہد کی سی چاشنی ہے۔ چاروں طرف بلیک تھارن اور نوخاستہ فرن کے چھوٹے چھوٹے پتوں کی ہریاول ہے۔ اور سفید براق بادل پہاڑیوں اور پرکیف وادیوں کے اوپر آسمان پر ہلکے ہلکے اڑ رہے ہیں۔ الیشرسٹ کی آنکھوں کے سامنے قدرت کا جلوہ

پہلی بے نقاب سے۔ لیکن چشم زدن پر یہ جلوہ غائب ہو جائے گا جیسے شب کا چہرہ جو ایک چٹان کے کونے پر سے دکھائی دے رہا ہو۔ انسان کی نگاہ سے خوف زدہ ہو کر غائب ہو جاتا ہے ۔۔۔ ایشرسٹ یکلخت، نہ جانے ۔۔۔ سے کلفت، اس بات کا احساس ہوا کہ گھاس کا یہ تختہ۔ یہ تنگ سی سڑک، پیچھے یہ پرانی دیوار۔ یہ سب منظر کچھ مانوس سا معلوم ہوتا ہے۔ جب وہ موٹر میں سوار تھے تو اس نے حسب عادت اس طرف توجہ ہی نہ کی تھی لیکن اب تو وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اس مقام سے کوئی آدھ میل کے فاصلے پر ایک فارم ہاؤس واقع تھا۔ جہاں سے وہ چھبیس سال ہوئے ایک دن اسی موسم میں نوکری روانہ ہوا تھا اور یوں سمجھئے کہ وہ پھر کبھی واپس نہ آیا تھا۔ دل میں ایک ٹیس اٹھی۔ گزشتہ زندگی کا ایک ایسا لمحہ یاد آگیا۔ جس کی دلفریبی اور بے خودی ہاتھ میں آ کر نکل گئی تھی۔ ایک ایسا لمحہ جو پھر پھڑپھڑاتا ہوا کسی نامعلوم دنیا کو اڑ گیا تھا۔ دفعتہً ایک ایسے زمانہ کی یاد پھر تازہ ہو گئی جو شیریں اور شباب سے لبریز تھا۔ لیکن یکلخت منقطع ہو گیا تھا۔ ہاتھوں کو ٹھوڑی کے نیچے رکھا اور سبزہ زمین پر لیٹ گیا اور نوخاستہ سبزے کو جس کے بیچ میں ملک ورٹ کے ننھے ننھے پھول اُگ رہے تھے۔ کھوئی ہوئی نظروں سے تکتا رہا ۔۔۔ اور جو کچھ اسے یاد آیا وہ یہ تھا۔

(۱)

فرینک ایشرسٹ اور اس کا دوست رابرٹ گارٹن ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے۔ زمانۂ تعلیم کا آخری سال گذار چکنے کے بعد گرمی کو دونوں سیاحت کی غرض سے پاپیادہ سفر کر رہے تھے۔ برینٹ سے پیدل چلے تھے اور ارادہ تھا کہ چگ فورڈ پہنچ کر دم لیں گے لیکن ایشرسٹ کے گھٹنے میں ایک دفعہ فٹ بال کھیلنے میں چوٹ لگی تھی۔ چلتے چلتے گھٹنے میں درد ہونے لگا یہاں تک کہ قدم اٹھانا مشکل ہو گیا۔ نقشہ کو دیکھا تو ابھی سات میل باقی تھے۔ ایک چوراہے کے پاس جہاں ایک پگڈنڈی جنگل کے ساتھ ساتھ ہوتی ہوئی سڑک کو کاٹ کر نکل جاتی تھی۔ دونوں دوست سڑک کے کنارے گھاس پر بیٹھے سستا رہے تھے اور جیسا کہ نوجوانوں کا دستور ہے کائنات کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ دونوں کا قد چھ فٹ سے اونچا تھا اور جسم چھریرا۔ ایشرسٹ کا رنگ ذرا پیلا تھا۔ تخیل پسند طبیعت۔ ہمیشہ کھویا کھویا رہتا تھا۔ گارٹن نے نرالی طبیعت پائی تھی جس کا اندازہ پوری طرح لگانا مشکل تھا۔ کچھ کرخت تھا۔ کچھ بڑھ جنگ جیسے زمانۂ قدیم کا کوئی حیوان ہو۔ دونوں کو ادب سے بہت دلچسپی تھی۔ دونوں سر سے ننگے تھے۔ ایشرسٹ کے بال ہلکے رنگ کے، ملائم اور مروڑ والے تھے۔ اور کنپٹیوں پر سے یوں اوپر کو اٹھتے تھے جیسے کوئی ہمیشہ انھیں پیچھے کو جھٹک رہا ہو۔ گارٹن کے بال سیاہ رنگ کے تھے اور از حد بے ترتیب۔ دونوں دوست چلتے چلتے میلوں نکل گئے تھے۔ لیکن راستے میں اپنے سوا کوئی اور رہرو نظر نہ آیا تھا۔

گارٹن کہہ رہا تھا۔ تم میری بات مانو۔ رحم صرف شعورِ نفس کا نتیجہ ہے۔ یہ ایک ایسا مرض ہے جو آج سے پانچ ہزار سال پہلے مفقود تھا۔ جب رحم نہ تھا تو دنیا کے لوگ زیادہ مزے میں تھے۔

ایشرسٹ نے جو بادلوں کی حرکت کا تماشا دیکھ رہا تھا جواب دیا۔ بہرحال میرا یہ عقیدہ ہے کہ دنیا میں رحم کا وہی رتبہ ہے جو صدف کے اندر موتی کا ہے۔

گارٹن بولا۔ برخوردار موجودہ زمانہ کی تمام بے اطمینانی رحم ہی کا نتیجہ ہے۔ جانوروں کو دیکھو امریکہ کے اصلی باشندوں کو دیکھو انھیں صرف اپنے اپنے دکھ کا احساس ہے اور اس کا موقع بھی کبھی کبھی پیش آتا ہے لیکن ہمیں دیکھو کہ کسی دوسرے کی ڈاڑھ میں بھی درد ہو تو ہم بے قرار ہو جاتے ہیں۔ بخدا دل پر ترس کھانے سے کیا حاصل؟ میں تو کہتا ہوں کہ وحشیوں کی طرح دوسروں کے غم سے نجات

• **کامل کرو اور اطمینان سے رہو۔**

ایشرسٹ نے کہا کہ میں شرط لگاتا ہوں کہ تم اس پر کبھی عمل نہ کرو گے

گارٹن غور و فکر کے انداز میں اپنے بے ترتیب بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

• رکھ رکھاؤ کی زندگی میں انسان پوری طرح نشوونما نہیں پا سکتا۔ جذبات کو اپنے اوپر حرام کر لینا غلطی ہے۔ ہر جذبہ مفید ہ کیونکہ اس سے زندگی کو سیرابی حاصل ہوتی ہے۔

• اور اگر کوئی جذبہ توقیر نسواں کے اصول کے منافی ہو۔ تو پھر؟

• تم نے بالکل انگریزوں کی سی بات کی ہے۔ انگریزوں کے سامنے جذبہ کا ذکر کرو تو وہ سمجھتے ہیں۔ اس سے مراد جسمانی لذ ہے۔ اور وہ جذبہ کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔ لیکن شہوت سے نہیں گھبراتے۔ بشرطیکہ کسی اور کو معلوم نہ ہو جائے۔

ایشرسٹ نے کچھ جواب نہ دیا۔ وہ ایک ننھے سے نیلے رنگ کے پھول کو آسمان کے سامنے رکھ کر گھما رہا تھا۔ قریب ان کے ایک درخت پر کوکو نے بولنا شروع کیا۔ خوش رنگ آسمان کے نیچے جہاں پھول اُگ رہے ہوں اور پرندے چہچہا رہے ہوں رابرٹ کی باتیں کتنی معنی معلوم ہوتی تھیں۔

ایشرسٹ بولا۔

• چلو اب چلیں۔ کسی فارم میں جگہ مل جائے تو رات وہیں گزاریں۔

جب یہ الفاظ کہے تو وہ دیکھ رہا تھا کہ سامنے ایک لڑکی ٹوکری اٹھائے مرغزار کی اونچان سے نیچے اتر رہی ہے۔ آسمان کے بالمق (جو ایشرسٹ کو لڑکی کے خمیدہ بازو میں سے دکھائی دے رہا تھا) اس کے جسم کا خاکہ واضح نظر آ رہا تھا۔ ایشرسٹ نے جو حسن کا قد کیا کرتا تھا بغیر یہ سوچے کہ اس سے کیا فائدہ پہنچتا ہے۔ دل میں کہا "بہت خوب!" لڑکی نے گہرے رنگ کے موٹے کپڑے کا م پہن رکھا تھا۔ ہوا کے زور سے سایہ اس کی ٹانگوں سے چمٹ رہا تھا اور اس کی پھٹی پرانی طاؤسی رنگ کی ٹوپی اوپر اٹھ گئی بھورے رنگ کا بلاؤز پرانا اور گھسا ہوا تھا۔ جوتے پھٹے ہوئے تھے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ سرخ اور کھردرے تھے۔ گرد رنگ سانولا پڑ گیا تھا۔ اس کے پریشان بال اس کے فراخ ماتھے پر لہرا رہے تھے۔ چہرہ لمبانہ تھا۔ اوپر کا ہونٹ چھوٹا سا تھا اور دا چمک رہے تھے۔ بھویں کالی اور سیدھی تھیں۔ پلکیں سیاہ اور لمبی لمبی۔ ناک ستواں اور اس کی بھوری آنکھیں تو غضب ڈھا رہی تھیں۔ ان میں شبنم کی سی تازگی اور طراوت تھی۔ گویا ابھی ابھی نہا ہوئی ہیں۔ اس نے ایشرسٹ کی طرف دیکھا۔ شاید لنگڑاتا ہوا آدمی (سر سے ننگا بال پیچھے کو جھٹکے ہوئے) جو اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اسے تک رہا تھا۔ عجیب معلوم ہوا۔ ایشرسٹ نے سر پر ٹوپی تو تھی نہیں۔ ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا اور بولا۔

• یہاں پاس ہی کوئی ایسا فارم نہیں جہاں ہم رات گزار سکیں۔ میں چل نہیں سکتا۔ میری ٹانگ دکھتی ہے۔

لڑکی بغیر شرمائے نرم نازک اور پیاری آواز میں بولی۔

• جناب یہاں قریب تو ہمارا ہی فارم ہے۔

• کہاں؟

"اس طرف نیچے کو۔"

"ہم وہاں رات گزار سکتے ہیں؟"

"میرا خیال تو ہے۔"

"تو ہمیں راستہ بتا دو۔"

"آیئے۔"

ایشرسٹ لنگڑاتا لنگڑاتا ساتھ چل پڑا۔ جب وہ چپ ہوا تو گارٹن نے جرح شروع کر دی۔

"تم ڈیون شائر کی رہنے والی ہو؟"

"نہیں جناب!"

"تو پھر؟"

"میرا وطن ویلز میں ہے۔"

"ٹھیک۔ میں بھی کہتا تھا کہ شکل سے تو تم کیلٹ معلوم ہوتی ہو — تو یہ فارم تمہارا نہیں؟"

"نہیں۔ میری خالہ کا ہے۔"

"اور تمہارا خالو؟"

"وہ زندہ نہیں۔"

"تو فارم کا کام کون چلاتا ہے؟"

"میری خالہ اور خالہ کے تین لڑکے۔"

"تمہارا خالو تو ڈیون شائر کا رہنے والا تھا؟"

"جی ہاں۔"

"تمہیں یہاں آئے ہوئے بہت عرصہ ہو چکا ہے؟"

"سات سال۔"

"ویلز کے بعد یہ جگہ تمہیں کچھ پسند بھی آئی؟"

"معلوم نہیں جناب۔"

"شاید تمہیں ویلز اب یاد نہ رہا ہو۔"

"اچھی طرح یاد ہے وہ جگہ تو کچھ اور ہی تھی۔"

"مجھے بھی تم سے اتفاق ہے۔"

ایشرسٹ یکلخت بولا۔

"تمہاری عمر کیا ہے؟"

"جناب سترہ سال"

"اور تمہارا نام کیا ہے؟"

"میگن ڈیوڈ"

"ان کا نام رابرٹ گارٹن ہے۔ میرا نام فرینک ایشرسٹ ہے۔ ہمارا ارادہ تو تھا کہ چیگ فورڈ پہنچنے سے پہلے دم نہ لیں لیکن ـــ"

"مجھے افسوس ہے کہ آپ کی ٹانگ دکھ رہی ہے"

ایشرسٹ مسکرا دیا۔ اور جب وہ مسکراتا تھا تو اس کے چہرے پر ایک حسن سا آجاتا تھا۔

اونچان سے نیچے اتر کر جنگل کے برابر سے نکلے تو سامنے فارم دکھائی دیا۔ پتھر کی ایک عمارت تھی۔ لمبی اور نیچی نیچی کھڑکیوں میں پٹ لگے ـــ تھے۔ ارد گرد ایک احاطہ تھا جس میں سؤر اور مرغیاں اور ایک بوڑھی گھوڑی ادھر ادھر پھر رہی تھی۔ پرے گھاس سے ڈھکی ہوئی ایک پہاڑی تھی۔ جس پر اسکاچ فر کے چند درخت اُگ رہے تھے۔ سامنے سیب کے درختوں کا ایک پرانا باغ تھا۔ جن کے شگوفے پھوٹ رہے تھے۔ باغ کے کنارے کنارے ایک ندی بہہ رہی تھی۔ اور ندی کے پار ایک لمبا مرغزار پھیلا ہوا تھا۔ سیاہ اور ترچھی آنکھوں والا ایک چھوٹا سا لڑکا ایک سؤر کی رکھوالی کر رہا تھا۔ گھر کے دروازے کے پاس ایک عورت کھڑی تھی۔ جو انہیں دیکھ کر آگے بڑھی۔ لڑکی نے کہا۔

"یہ میری خالہ مسز نیرد کومب ہیں"

خالہ مسز نیرد کومب کی آنکھیں بچوں والی جنگلی بطخ کی مانند سیاہ اور تیز تھی۔ گردن میں بھی وہی سانپ کی سی اٹھان تھی۔

ایشرسٹ نے کہا۔ "ہمیں آپ کی بھانجی رستے میں مل گئی۔ یہ کہتی ہے یہاں رات بسر کرنے کا انتظام ہو جائے گا"

"ہو تو جائے گا لیکن آپ دونوں کو ایک ہی کمرے میں سونا پڑے گا۔ میگن بیٹی جاؤ وہ خالی کمرہ ان کے لئے صاف کر دو۔ کریم کا ایک پیالہ بھی لیتی آنا۔ چائے تو آپ پئیں گے"

یو کے دو درختوں اور چند پھولدار جھاڑیوں سے ایک محراب سی بنی ہوئی تھی۔ لڑکی اس میں سے گزر کر گھر کے اندر غائب ہو گئی۔ گلابی رنگ کے پھولوں اور یو کے سبز پتوں کے سامنے اس کی ٹوپی کا طاؤسی رنگ بھلا معلوم ہوتا تھا۔

"آپ کی ٹانگ میں تکلیف ہو رہی ہوگی۔ چل کر پارلر کے اندر آرام کیجئے۔ آپ کالج میں پڑھتے ہیں؟"

"پڑھتے تھے اب تو فارغ ہو چکے"

مسز نیرد کومب نے دانشمندانہ انداز میں سر ہلایا۔

پارلر کا فرش اینٹوں کا تھا اور اس پر چمکتی ہوئی صاف کرسیاں اور سوفا پڑا ہوا تھا۔ جس کے گدیلوں میں گھوڑے کے بال بھرے ہوئے تھے۔ ایک میز تھی۔ مگر اس پر میز پوش نہ تھا۔ کمرہ اس قدر صاف تھا کہ معلوم ہوتا تھا کبھی استعمال ہی نہیں ہوا ایشرسٹ فوراً سوفے پر جا بیٹھا۔ اور دکھتے ہوئے گھٹنے کو ہاتھوں سے تھام لیا۔ مسز نیرد کومب اسے بغور دیکھتی رہی۔ ایشرسٹ اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کا باپ کیمیا کا ایک سابق پروفیسر تھا۔ تاہم لوگوں کو اس لڑکے میں امیرانہ تکبر نظر آتا تھا گو ایشرسٹ کا اپنی

ملاقاتیوں کی وجہ سے اکثر ان کی موجودگی تک کا احساس نہ ہوتا۔

"یہاں کوئی ندی ہے جہاں ہم نہا سکیں؟"

"باغیچے کے ساتھ ایک ندی ہے۔ لیکن اس میں تو بیٹھ کر بھی سر تک پانی نہیں پہنچتا۔"

"کتنی گہری ہے؟"

"یہی کوئی ڈیڑھ فٹ۔"

"اوہ تو بہت ٹھیک ہے۔ ہے کس طرف کو؟"

"آپ ڈنڈی کے ساتھ چلے جائیے۔ دائیں ہاتھ کو جو دوسرا پھاٹک آئے گا اس میں سے گزر کر سامنے ایک بڑھا سیب کا درخت ہے۔ سب سے الگ۔ اس کے پاس ہی تالاب ہے۔ مچھلیاں پکڑنے کا شوق ہو تو تالاب میں مچھلیاں بھی ہیں۔"

مسز نیرو کومب مسکرا دی اور بولی۔ "جب آپ واپس آئیں گے تو چائے تیار ہوگی!"

ندی میں ایک جگہ ایک چٹان کا بند سا لگا ہوا تھا جس سے پانی رک گیا تھا اور ایک تالاب سا بن گیا تھا جس کی تہہ ریتلی تھی۔ وہ بڑا سا سیب کا درخت سب درختوں سے نیچا تھا۔ اتنا نیچا کہ اس کی شاخیں ندی کے پانی پر جھکی پڑتی تھیں کونپلیں پھوٹ آئی تھیں۔ شگوفے کھلنے کو تھے اور قرمزی کلیاں چٹک رہی تھیں۔ اس چھوٹے سے تالاب میں ایک ہی آدمی نہا سکتا تھا۔ چنانچہ ایشرسٹ کنارے پر منتظر کھڑا اپنے گھٹنے کو ملتا رہا۔ اور اس مرغزار کا نظارہ کرتا رہا جس میں چٹانوں کے درمیان تھارن کے درخت اور جنگلی پھول اُگ رہے تھے۔ پرے ایک اونچے ناہموار ٹیلے پر بیچ کے درختوں کا جھنڈ تھا۔ ہر سمت ہوا میں جھوم رہی تھی۔ بہار کا ہر پرندہ چہچہا رہا تھا۔ اور سورج کی ترچھی شعاعوں سے گھاس پر دھوپ چھاؤں کی شطرنج سی بچھی تھی۔ اسے کئی چیزیں یاد آئیں۔ تھیوکرٹس اور دریائے چرول۔ چاندنی اور دوشیزہ۔ جس کی آنکھوں میں شبنم کی سی تازگی اور طراوت تھی۔ اتنی باتیں یاد آئیں کہ معلوم ہوتا تھا کسی بات کا خیال نہیں۔ اور وہ بغیر کسی وجہ کے خوش تھا۔

(۳)

چائے دیر سے چنی گئی۔ لیکن تھی پرتکلف۔ کھانے کو ساتھ انڈے، کریم، مربہ اور پتلے پتلے تازہ کیک تھے جن پر زعفران کے چھینٹے دیے ہوئے تھے۔ چائے کے دوران میں گارٹن کیلٹ قوم کے متعلق ایک طویل تقریر کرتا رہا۔ ان دنوں ہر جگہ کیلٹوں کا چرچا تھا۔ گارٹن خود بھی کیلٹ تھا اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اس کنبے میں بھی اسی قوم کا خون موجود ہے تو اس قدر دلچسپی پیدا ہوئی کہ آپے سے باہر ہو گیا۔ وہ ایک کرسی پر دراز تھا جس کے گدیلوں میں گھوڑے کے بال بھرے تھے۔ ہاتھ کا بنایا ہوا سگریٹ اس کے خم دار ہونٹوں کے کنج میں جیسے لٹک رہا تھا۔ اور اپنی چھوٹی چھوٹی سرد مہر آنکھوں کو ایشرسٹ کی آنکھوں میں ڈالے اہل ویلز کی شائستگی کو سراہتا رہا۔ ویلز کو چھوڑ کر انگلستان میں آ جانا ایسا ہی ہے جیسے انسان چینی کے برتنوں کو چھوڑ کر مٹی کے برتن استعمال کرنے لگے۔ فرینک آخر پھر انگریز ہے۔ اسے کیا معلوم اس ویلز کی رہنے والی لڑکی میں کس درجہ شائستگی اور اس کی فطرت میں جذبات کی کس قدر گنجائش ہے! اپنے گیلے سیاہ بالوں کو ہلکے ہلکے اپنی انگلیوں سے پریشان کرتا رہا اور باوضاحت یہ ثابت کیا کہ یہ لڑکی ان نظموں کے مطابق ہے۔ جو ویلز کے کسی داستان گو شاعر نے بارھویں صدی میں لکھی تھیں۔

ایشرسٹ چت لیٹا گہرے رنگ کا ایک پائپ پی رہا تھا۔ تھا قدآور اس لئے ٹانگیں سوفے سے باہر لٹکی ہوئی تھیں۔ اس نے گارٹن کی باتوں کو توجہ سے نہ سنا جب لڑکی دوبارہ کیک لے کر اندر آئی تھی۔ اس وقت سے اس کی شکل جسے دیکھ لینا پھول یا قدرت کے کسی اور حسین منظر کی دید سے کم نہ تھا، آنکھوں میں سمائی ہوئی تھی۔ لڑکی نے عجیب انداز کے ساتھ ایک جھرجھری سی لے کر اپنی آنکھیں نیچے ڈال لی تھیں۔ اور چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

گارٹن نے کہا۔ چلو باورچی خانے میں چل کر اسے ایک نظر اور دیکھ لیں۔

باورچی خانہ کی دیواروں پر سفیدی پھری ہوئی تھی۔ چھت میں بڑے بڑے شہتیر لگے تھے جن میں بھنی ہوئی سؤر کی رانیں لٹک رہی تھیں۔ کھڑکی میں پھولوں کے گملے پڑے تھے۔ دیوار پر بندوقیں۔ چینی اور جست کے عجیب و غریب آبخورے اور ملکہ وکٹوریا کی تصویریں کیلوں سے آویزاں تھیں۔ بیچ میں معمولی لکڑی کی ایک لمبی تنگ سی میز بچھی تھی۔ جس پر پیالے اور چمچے رکھے ہوئے تھے۔ اوپر چھت سے پیاز کی گٹھیوں کی ایک لڑی لٹک رہی تھی۔ آتشدان خاصا گہرا تھا۔ جس کے ایک طرف دو چھوٹے لڑکے بڑی تمیز کے ساتھ نچلے بیٹھے تھے۔ اور دوسری طرف ایک بھوری آنکھوں اور سرخ چہرے والا موٹا سا جوان آدمی بیٹھا سن کے پھوسڑوں سے بندوق کی نالی صاف کر رہا تھا۔ اس کی پلکوں اور سر کے بالوں کی رنگت بالکل ان پھوسڑوں جیسی تھی۔ دونوں کے درمیان ایک بڑے دیگچے میں اسٹو پک رہا تھا۔ جو خوشبو سے بہت خوش ذائقہ معلوم ہوتا تھا۔ اور سامنے مسز نیروکومب کسی سوچ میں بیٹھی چمچہ ہلا رہی تھی۔ دو اور نوجوان جن کی آنکھیں ترچھی اور بال سیاہ تھے اور جو چہروں سے ان دو چھوٹے لڑکوں کی طرح عیار معلوم ہوتے تھے دیوار کے ساتھ سہارا لگائے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک پست قد ادھیڑ عمر کا آدمی۔ ڈاڑھی مونچھ منڈھی ہوئی کارڈرائی کی برجیس پہنے کھڑکی میں بیٹھا ایک پرانا سا اخبار پڑھ رہا تھا۔ صرف میگن ہی کام کاج میں لگی ہوئی تھی اور پیپوں سے سیب کی شراب کے جگ بھر بھر کر میز پر رکھتی جا رہی تھی۔

ظاہر تھا کہ یہ لوگ کھانے پر بیٹھنے والے ہیں۔ چنانچہ گارٹن بولا۔

• اگر آپ لوگوں کو کوئی اعتراض نہ ہو تو ہم کھانے کے بعد آجائیں۔

اور جواب کا انتظار کئے بغیر دونوں پھر پارلر میں آ بیٹھے۔ لیکن باورچی خانہ کی اس رونق۔ اس گرماہٹ، ان خوشبوؤں اور ان چہروں کے بعد یہ چمک دار کمرہ پہلے سے بھی کچھ اجاڑ معلوم ہونے لگا۔ دونوں دوست پژمردہ ہو کر پھر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔

• لڑکے شکل سے بالکل جپسی معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں صرف ایک لڑکا سیکسن تھا۔ وہ جو بیٹھا بندوق صاف کر رہا تھا۔ اور وہ لڑکی تو نفسیاتی نقطۂ نظر سے دقیق مطالعہ کی چیز ہے۔

ایشرسٹ کے ہونٹ پھڑک اٹھے۔ گارٹن اسے اس وقت بالکل گدھا معلوم ہوتا تھا۔ دقیق مطالعہ کی چیز! کیا بکواس ہے۔ وہ لڑکی تو جنگل کا ایک پھول ہے۔ جسے دیکھنے سے دل کو ٹھنڈک سی ہوتی ہے۔ مطالعہ!

گارٹن بولا۔

• جذباتی لحاظ سے وہ لڑکی ایک حیرت انگیز چیز ہے۔ صرف اس کے بیدار ہونے کی کسر ہے۔

• تو کیا جناب اسے بیدار کیجئے گا؟!

گارتھ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ اس کا تمام دل تبسم کر رہا تھا۔ "کیا بدمذاقی کی بات ہے! بالکل گرینڈ مدر کی سی!"

الیشرسٹ پائپ کے کش لگا رہا۔ "بیدار ہونے کی کسر ہے۔ اس بے وقت گارتھ کو تو دیکھو۔ اپنے آپ کو کیا سمجھ بیٹھا ہے!" الیشرسٹ نے کھڑکی کھول دی اور جسم باہر کو جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ باہر اندھیرا ہو چکا تھا۔ گاڑی خانہ اور فارم کی عمارتیں دھندلی اور نیلی اور سیب کے درختوں کا باغیچہ غیر واضح نظر آ رہا تھا جہاں ان لالٹینوں کی دھیمی روشنی جو باورچی خانے میں جل رہی تھیں۔ ایک پرندہ جو ابھی جاگ رہا تھا بے دلی سے چہچہایا۔ گویا اسے اندھیرے پر تعجب ہو رہا ہے۔ اصطبل سے ایک گھوڑے کی ٹھوکر اور دانہ کھاتا تھا شیوں اور جھومنے کی آواز آئی۔ سامنے جنگل تھا جو تاریکی میں دور دور تک پھیلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اور اس سے پرے محجوب ستارے تھے جو ابھی پوری طرح عریاں نہ ہوئے تھے۔ اور جن کی سفید شعاعوں نے گہرے نیلے آسمان کو چھلنی کر دیا تھا۔

ایک اُلو کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔ الیشرسٹ نے ایک لمبا سانس لیا۔ ایسی رات میں باہر آوارہ پھرنا کتنا پُرلطف ہوگا! تھوڑی دیر کے بعد سڑک پر کھلے سموں کے ٹاپوں کی آواز آئی۔ اور تین ٹٹو اس اندھیرے میں دھندلے سیاہ سائے سے گذرتے ہوئے دکھائی دیئے۔ جن کی کالی ایال اور گردنیں پھاٹک کے اوپر سے نظر آ رہی تھیں۔ جب اس نے پائپ کو ٹھونک کر خالی کیا تو اس سے شراروں کی ایک پھلجھڑی سی نکلی۔ تو چاروں بدک کر بھاگ نکلے۔ ایک چمگادڑ سر پھڑپھڑاتی ہوئی نکل گئی۔ اس کی ہلکی ہلکی چیپ چیپ کی آواز مشکل سے سنائی دیتی تھی۔ الیشرسٹ نے اپنا بازو پھیلایا۔ ہتھیلی پر اوس پڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ یک لخت اسے اوپر کی منزل میں بچوں کی آوازیں سنائی دیں۔ ان کے چھوٹے چھوٹے جوتے ٹھپ ٹھپ فرش پر گرے۔ اور پھر ایک نرم اور نازک آواز سنائی دی —— لڑکی کی آواز —— جو بچوں کو بستر میں سلا رہی تھی —— تو الفاظ صاف اور واضح طور پر کان میں پڑے، "نہیں بک میں بلی ساتھ نہ سلانے دوں گی!" پھر ننھے بچوں کے قہقہوں کی آواز آئی۔ کسی نے ہلکے سے ران کے ایک تھپڑ لگا۔ اور پھر کوئی ہلکی آواز میں ایسی پیاری ہنسی کہ الیشرسٹ کانپ سا گیا۔ پھر ایسی آواز آئی جیسے کسی نے پھونک ماری ہو۔ موم بتی جس کی روشنی تاریکی پر انگلیاں پھیر رہی تھی بجھ گئی اور خاموشی چھا گئی۔ الیشرسٹ کھڑکی سے ہٹ آیا۔ اور کمرے میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس کا گھٹنا دکھ رہا تھا اور اس کی روح ملول تھی۔

گارتھ نے کہا۔ "تمہیں باورچی خانہ میں جانا ہو تو جاؤ۔ میں تو سونے چلا ہوں۔"

(۳)

الیشرسٹ ہمیشہ غفلت کی نیند سوتا تھا۔ لیکن جب گارتھ سونے کے کمرے میں آیا تو گو الیشرسٹ بظاہر گہری نیند میں تھا لیکن درحقیقت بالکل جاگ رہا تھا۔ کمرے کی چھت نیچی تھی۔ گارتھ بستر میں چت لیٹا تاریکی کے طلسم پر ناک بھوں چڑھا کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکا تھا۔ لیکن الیشرسٹ کو اُلوؤں کے بولنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس کا گھٹنا دکھ رہا تھا۔ لیکن اس کے علاوہ اسے اور کوئی تکلیف نہ تھی۔ دنیا کے تفکرات رات کے وقت الیشرسٹ کے آرام میں کبھی خلل انداز ہوتے تھے اور یوں بھی تو اسے زندگی میں کوئی فکر ہی نہ تھا۔ بیرسٹروں کی فہرست میں نام درج ہو چکا تھا۔ تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ دنیا اس کے سامنے کھلی پڑی تھی۔ والدین کی وفات کے بعد گھر کے علائق سے بھی پاک ہو چکا تھا۔ ذاتی آمدنی چار سو پونڈ سالانہ تھی۔ اب اس کی آزادی میں بھلا کیا حائل تھا؟ جہاں چاہے جائے۔ جو چاہے کرے۔ جب چاہے کرے۔ اس کا بستر سخت تھا۔ اس لئے اسے بے آرام ہونا پڑا۔ سرہانے کے پاس ایک کھڑکی کھلی تھی

جس میں سے عطر کی خوشبو کمرے میں پھیل رہی تھی۔ اور ایشرسٹ بستر میں لیٹا اس خوشبو کو سونگھ رہا تھا کافی سے کچھ بہتر تھا۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ تین دن تک پیدل سفر میں جس شخص کا ساتھ رہا ہو اس سے کچھ جانا قدرتی امر ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اس کے باقی تمام خیالات شفقت آمیز تھے۔ بعض تصورات سے تو اس کے دل میں ہوکیں اٹھ رہی تھیں۔ بعض سے طبیعت میں ایک ہیجان سا پیدا ہو گیا تھا۔ اسے اس نوجوان کا چہرہ یاد آیا جو باورچی خانہ میں بیٹھا بندوق صاف کر رہا تھا۔ جب دونوں دوست باورچی خانہ میں داخل ہوئے تھے تو اس نے یکلخت آنکھیں اٹھا کر پہلے ان دونوں کو اور پھر فوراً ہی اس لڑکی کو جو اس وقت سیب کی شراب کا جگ اٹھائے جا رہی تھی ایک نظر دیکھا تھا۔ اس کی نظر میں نہ ذہانت پائی جاتی تھی نہ بے دلی۔ تاہم وہ ایسے آدمی کی نظر ضرور تھی جو دفعتاً چونک اٹھا ہو۔ اس وقت ایشرسٹ نے اس بات کا دھیان بھی نہ کیا تھا۔ لیکن حیرت ہے کہ اس کا تصور نہایت واضح طور پر اس کے ذہن میں محفوظ تھا جس طرح اس لڑکی کا تر و تازہ چہرہ اسے نہ بھولتا تھا۔ ویسے ہی اس نوجوان کا سرخ چہرہ۔ نیلی آنکھیں ہلکے رنگ کی پلکیں اور سن کے سے بال بھی اس کی یاد سے محو نہ ہوتے تھے۔ کھڑکی کے سامنے پردہ نہ تھا۔ اس کی بجائے تاریکی کی ایک مستطیل سی دکھائی دے رہی تھی۔ رفتہ رفتہ اس تاریکی میں سحر کی روشنی نمودار ہوئی اور ایک نیم خوابیدہ کوے کی گھٹی ہوئی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ایک بلیک برڈ نے جس کی آنکھیں ابھی پوری طرح کھلی نہ تھیں۔ اپنی خوش الحانی سے خاموشی کے طلسم کو برہم کر دیا۔ کھڑکی کے چوکھٹے میں بڑھتی ہوئی روشنی کی مستطیل کو دیکھتے دیکھتے ایشرسٹ کی آنکھ لگ گئی۔

دوسرے دن اس کا گھٹنا بہت سوجا ہوا تھا۔ اس لئے پیدل سفر کا ارادہ ترک کرنا پڑا۔ گارٹن کو اگلے دن لندن پہنچنا تھا وہ دوپہر کے وقت وہاں سے روانہ ہو گیا۔ چلتے وقت اس کے ہونٹوں پر طنز آمیز تبسم دیکھ کر ایشرسٹ بہت چڑا۔ لیکن جب وہ دوڑتا دوڑتا ڈھلوان سڑک کے موڑ تک پہونچ کر نظر سے اوجھل ہو گیا تو ایشرسٹ کا غصہ فوراً اتر گیا۔ پھل کے درختوں کی محراب کے پاس گھاس کا ایک قطعہ تھا۔ ایشرسٹ دن بھر ایک سبز رنگ کی چوکی پر بیٹھا رہا۔ سورج کی شعاعیں خوشبودار پھولوں کا عطر کھینچ رہی تھیں۔ اور پھلواری کی جھاڑیوں سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ ایشرسٹ ایک سرور کے عالم میں بیٹھا کبھی کبھی پائپ سلگا لیتا۔ کبھی منظر کا لطف اٹھاتا۔ اور کبھی کسی سوچ میں مصروف ہو جاتا۔

ایک فارم کے اندر بہار کے موسم میں بے شمار ہستیاں عالم وجود میں آتی ہیں۔ ننھی ننھی جانیں انڈوں اور کلیوں سے جنم لیتی ہیں فارم کے لوگ اس عمل کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور نوزائیدہ ہستیوں کی دیکھ بھال اور پرورش میں لگ جاتے ہیں۔ ایشرسٹ اس قدر چپ چاپ بیٹھا تھا کہ ایک مادہ ہنس اپنے چھ بچوں کو جن کی گردنیں زرد اور پیٹھ بھورے رنگ کی تھی۔ ساتھ لئے مٹکتی مٹکاتی قریب آ پہنچی اور بچے ایشرسٹ کے پیروں کے پاس گھاس کے پتوں پر اپنی ننھی ننھی چونچیں تیز کرنے لگے۔ کبھی کبھی مسز نیرکومب یا میگن آن کر پوچھ جاتی کہ کیوں صاحب آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ـــ ایشرسٹ مسکرا کر جواب دیتا۔ نہیں تھینک یو! مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں یہاں بڑے مزے میں ہوں۔ چائے کے وقت وہ دونوں سیاہ رنگ کی ایک لمبی سی پلٹس ایک پیالے میں ڈال اپنے ساتھ لے کر آئیں۔ سوجے ہوئے گھٹنے کو دیر تک غور سے دیکھتی رہیں اور پلٹس اس پر باندھ گئیں۔ جب وہ چلی گئیں تو ایشرسٹ کو لڑکی کا وہ نیچی آواز میں "اوئی" کہنا۔ وہ ہمدردی کی نظروں سے دیکھنا وہ ماتھے پر ہلکی سی تیوری ڈالنا یاد آیا۔ اور جب اسے خیال آیا کہ گارٹن اس لڑکی کے متعلق کتنی فضول باتیں کر رہا تھا تو ایک بار پھر گارٹن سے چڑ ہو گئی۔ اس نے یہ ذرا سر جھٹکا کر آخر اس میں چڑنے کی کیا بات ہے۔ جب لڑکی چائے لائی۔ تو

ایشرسٹ نے پوچھا۔

"میگن، یہ کہو، میرا دوست بھی تمہیں پسند آیا؟"

میگن نے منہ سکیڑ لیا۔ گویا ڈری تھی کہ کہیں مسکرا دوں تو بدتمیزی نہ سمجھی جائے۔ پھر بولی۔

"بڑے مسخرے تھے وہ۔ ہم سب کو ہنساتے رہے۔ وہ بہت لائق معلوم ہوتے تھے۔"

"کیا ایسی بات کہی انھوں نے جو تم سب کو ہنسا دیا؟"

"وہ مجھ سے کہتے تھے تم بارڈوں کی بیٹی ہو۔ بارڈ کیا ہوتے ہیں؟"

"بارڈ ان شاعروں کو کہتے ہیں جو آج سے کئی سو سال پہلے ویلز میں رہتے تھے۔"

"تو بھلا میں ان کی بیٹی کیونکر ہوئی؟"

"میرے دوست کا مطلب یہ تھا کہ وہ تم جیسی ہی لڑکیوں کے متعلق گیت گایا کرتے تھے۔"

میگن نے اپنی بھنویں سکیڑ کر کہا۔ "انھیں مذاق سوجھا ہوگا کیا میں ویسی لڑکی ہوں؟"

"میری بات پر یقین کرو گی؟"

"کیوں نہیں؟"

"میرے خیال میں وہ سچ کہتا تھا۔"

لڑکی مسکرا دی۔

ایشرسٹ نے دل میں کہا۔ "واقعی تم خوبصورت ہو۔"

"وہ یہ بھی کہتے تھے کہ جو شکل و صورت سے سیکسن معلوم ہوتا ہے۔ اس کا کیا مطلب تھا؟"

"جو کون ہے؟ وہ جس کی نیلی نیلی آنکھیں اور لال لال چہرہ ہے؟"

"ہاں وہ میرے خالو کا بھتیجا ہے۔"

"اچھا؟ تمہاری خالہ کا لڑکا نہیں؟"

"نہ۔"

"ان کا مطلب یہ تھا کہ جو کی شکل ان لوگوں سے ملتی جلتی ہے جو تقریباً چودہ سو سال پہلے انگلستان پر آکر قابض ہو گئے تھے۔"

"اینگلوں کا حال تو میں جانتی ہوں۔ کیا جو واقعی سیکسن ہے؟"

"گارٹن کو ایسی باتوں کا جنون ہے لیکن جو کا چہرہ قدیم زمانے کے سیکسنوں سے کچھ کچھ ملتا ضرور ہے۔"

"ٹھیک ہے۔"

میگن کے اس آخری جملے سے ایشرسٹ کے دل میں گدگدی ہوئی۔ مختصر سا جملہ تھا۔ لیکن اس میں کتنی سادگی اور خوش اسلوبی پائی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ بات اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ پھر بھی اس نے کس سلیقے اور شائستگی کے ساتھ ہاں میں ہاں ملا دی تھی۔

"وہ کہتے تھے کہ . . . تو لڑکے تو سب ہوتے جیتی ہیں۔ یہ سمجھا کیوں کہ خالہ نسیں تو دیں لیکن یہ بات انھیں ناگوار گزری اور میری خالہ کے بیٹوں کو تو بہت غصہ آیا خالو تو کسان تھے۔ کہیں کسان بھی چپ بیٹھے ہوتے ہیں۔ یوں لوگوں کا دل دکھانا بری بات ہے۔"

ایشرسٹ کے دل میں آیا کہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بھینچے۔ لیکن منہ سے صرف اتنا کہا۔ "میگن تم سچ کہتی ہو ۔۔۔ اچھا کل رات تم ہی بچوں کو بستر میں سلا رہی تھیں نا؟ مجھے نچلی منزل میں آواز آ رہی تھی۔"

میگن کے چہرے پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔ "آپ جائیے پیچھے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ کہیں تو میں اچار لا دوں؟"

"تمہیں کبھی اپنے کسی کام کو بھی فرصت ملتی ہے؟"

"واہ ملتی کیوں نہیں؟"

"آخر میرے بھی آنکھیں ہیں۔ میں نے تو تمہیں فارغ کبھی نہیں دیکھا۔"

میگن نے ماتھے پر تیوری ڈال لی۔ جیسے دماغ میں کوئی بات ہے۔ جسے سلجھا نہیں سکتی۔ پھر وہ بھی لال ہو گیا۔ جب چلی گئی تو ایشرسٹ نے سوچا۔ کیا وہ سمجھتی تھی کہ میں اس سے دل لگی کر رہا ہوں۔ میں تو ایسے مذاق پر موت کو ترجیح دیتا ہوں۔

ایشرسٹ کی وہ عمر تھی جس میں بعض لوگ حسن کو ایک پھول سمجھتے ہیں۔ اور اس نظارہ سے ان کے دل میں عورت کی توقیر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ ایشرسٹ اپنے گرد و پیش سے اکثر غافل رہتا تھا۔ چنانچہ اسے یہ احساس دیر کے بعد ہوا کہ وہ نوجوان جس کے متعلق گارٹن نے کہا تھا کہ شکل سے سیکسن معلوم ہوتا ہے اصطبل کے دروازے کے باہر کھڑا ہے۔ بادامی رنگ کی پھیلی ہی برجیس کیچڑ سے بھرے ہوئے گیٹر اور نیلے رنگ کی قمیض میں وہ ایک رونق کی چیز معلوم ہوتا تھا۔ نہ چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ نہ بشرے پر ذہانت کے آثار۔ کسی اڑیل جانور کی طرح بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ چہرہ اور بازو سرخ تھے۔ سر پر دھوپ پڑ رہی تھی جس کی وجہ سے اس کے بال کاتی ہوئی اون کی طرح معلوم ہوتے تھے۔

جب اس نے دیکھا کہ ایشرسٹ میری طرف دیکھ رہا ہے تو احاطہ میں سے گزر کر باورچی خانہ کے دروازہ کی طرف چل دیا۔ اور مکان کے کونے پر سے مڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ چال سے ظاہر ہوتا تھا کہ نوجوان دیہاتی ہے۔ دہقانوں کی طرح آہستہ آہستہ بھاری قدم نہ اٹھا سکنے کی وجہ سے شرماتا ہے۔ ایشرسٹ پر اداسی سی پڑ گئی۔ اکثر لوگ طبیعت پر کتنا ہی زور ڈالئے۔ ایسے لوگوں سے نباہ بھلا کیسے ممکن ہے! لیکن اس لڑکی کو دیکھو۔ جوتے پھٹے ہوئے کھردرے ہاتھ۔ پھر بھی اس میں کتنی رعنائی ہے! شاید گارٹن ہی کا کہنا ٹھیک ہو۔ اور یہ سب کیلٹ خون کا اثر ہو۔ بہت ممکن ہے اس کی تعلیم اس سے زیادہ نہ ہو کہ تھوڑا بہت لکھ پڑھ لیتی ہو۔ لیکن وہ تو ہیرے کی مانند ہے۔ اسے تو قدرت ہی نے نجیب و اصیل پیدا کیا ہے۔

وہ داڑھی مونچھ منڈا ادھیڑ آدمی جسے کل رات باورچی خانہ میں دیکھا تھا۔ ایک کتے کو ساتھ لے کر احاطے میں داخل ہوا گایوں کو دودھ دوہنے لے جا رہا تھا۔ ایشرسٹ کو اب معلوم ہوا کہ ایک ٹانگ سے لنگڑا ہے۔

"اچھے اچھے جانور لئے جا رہے ہو۔"

لنگڑے آدمی کا چہرہ چمک اٹھا۔ اس کی نظریں اوپر کو اٹھی رہتی تھیں۔ مدتوں دکھ سہنے سے آنکھوں میں اکثر یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔"

"ہاں بہت خوبصورت ہیں۔ دودھ بھی بہت دیتی ہیں۔"

"ان کی شکل سے ہی معلوم ہوتا ہے۔"

"آپ کی ٹانگ تو پہلے سے بہتر ہے؟"

"ٹھیک ہے۔ رفتہ رفتہ اچھی ہو رہی ہے۔"

لنگڑے آدمی نے اپنی ٹانگ کو ہاتھ لگا کر کہا: "اس دکھ کو میں خوب جانتا ہوں صاحب۔ گھٹنے کی تکلیف بہت بڑی تکلیف ہے۔ میرا گھٹنا دس سال سے خراب ہے۔"

ایشرسٹ نے آواز سے ہمدردی کا اظہار کیا (ایسی ہمدردانہ آواز نکالنا مرفہ الحال لوگوں کے لئے بہت سہل بات ہے) لنگڑا آدمی پھر مسکرا دیا۔

"پھر بھی خدا کا شکر ہے۔ ورنہ وہ تو ٹانگ ہی کاٹنے لگے تھے۔"

"اچھا!"

"جی ہاں۔ اور پہلے تو بہت ہی برا حال تھا۔ میں تو اسے بہت ہی غنیمت سمجھتا ہوں۔"

"میرے گھٹنے پر تو دوا باندھ گئی ہیں۔ جس سے بہت فائدہ ہے۔"

"ایک بوٹی تھی جو لڑکی کہیں سے توڑ لائی تھی (پھولوں سے بہت اچھی طرح واقف ہے یہ لڑکی) بعض لوگ صاحب بوٹیوں کی خاصیتیں خوب سمجھتے ہیں۔ میری ماں تو اس بات میں اپنا جواب نہ رکھتی تھی۔ اچھا صاحب خدا کرے آپ جلد اچھے ہو جائیں۔ گڈ آفٹرنون۔"

ایشرسٹ مسکرا دیا۔ "پھولوں سے واقف ہے اور وہ خود پھول سے کیا کم ہے؟"

شام کے کھانے پر پھر ٹھنڈا گوشت۔ جنکٹ اور سیب کی شراب تھی۔ کھانا کھا چکا تو لڑکی کمرے میں آئی۔

"خالہ پوچھتی ہیں آپ ہمارے نئے ڈے کیک کا ایک ٹکڑا کھائیں گے؟"

"ہاں مگر باورچی خانے میں بیٹھ کر۔"

"شوق سے ــــ آپ کے دوست تو چلے گئے۔ اکیلے آپ کا دل تو گھبراتا ہوگا؟"

"ارے نہیں ــــ لیکن یہ کہو میرا باورچی خانے میں آنا کسی کو برا تو نہ لگے گا؟"

"واہ برا کیوں لگتا۔ ہمیں تو بلکہ بہت خوشی ہوگی۔"

ایشرسٹ کو اپنے گھٹنے کا خیال نہ رہا۔ یکلخت جو اٹھا تو لڑکھڑا کر بیٹھ گیا۔ لڑکی نے ایک سسکی بھری اور اپنے بازو سامنے پھیلا دیئے۔ ایشرسٹ ان چھوٹے چھوٹے کھردرے، سانولے ہاتھوں کو پکڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ جی میں آیا ان ہاتھوں کو ہونٹوں سے لگائے لیکن اپنے آپ کو روکا۔ لڑکی نے قریب آ کر کندھا آگے کر دیا۔ ایشرسٹ اس کے سہارے چل کر دروازے تک پہنچا۔ اس شانے پر ہاتھ رکھنے سے جو لطف حاصل ہوا۔ عمر بھر کسی چیز کے مس سے نصیب نہ ہوا تھا۔ اتنی عقلمندی ضرور کی کہ چلتے چلتے اسٹینڈ میں سے اپنی چھڑی نکال لی۔ اور باورچی خانے میں پہنچنے سے پہلے ہاتھ لڑکی کے کندھے سے ہٹا لیا۔

اس رات وہ ایسا غافل سویا کہ تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ صبح اٹھا تو گھٹنے کا ورم بہت گھٹا ہو گیا تھا۔ وہ دوپہر تک اکیلے میں بیٹھا شعر موزوں کرتا رہا۔ سہ پہر کے وقت ان دو چھوٹے لڑکوں کو جن کا نام ٹیک اور رِک تھا ساتھ لے کر ادھر ادھر گھومتا رہا۔ جمعے کا دن تھا اس لئے وہ اسکول سے جلدی لوٹ آئے تھے۔ ایک سات سال کا تھا ایک چھ سال کا۔ شریر بچے گو ہیں۔ رنگ بہت کھلا نہ تھا اور بالوں کی رنگت بھی سیاہ۔ مگر الیٹرسٹ سے بچے بہت جلد مانوس ہو جاتے تھے۔ چنانچہ تھوڑی دیر میں دونوں پٹر پٹر باتیں کرنے لگے۔ سوائے مچھلیوں کے باقی جانوروں کے مارنے کے جتنے طریقے انھیں یاد تھے چار بجے تک ایک ایک کر کے الیٹرسٹ کو سکھا دیئے۔ پھر پائنچے گھٹنوں تک چڑھا کر پیٹ کے بل ندی کے کنارے مچھلیوں کی تاک میں لیٹ گئے۔ گویا اس فن میں بھی کچھ نہ کچھ مہارت انھیں ضرور حاصل ہے۔ لیکن ہنستے اس قدر تھے اور غل اس قدر مچاتے تھے کہ ایک مچھلی بھی قریب نہ پھٹکی۔ الیٹرسٹ بیچ کے درختوں کے جھنڈ کے پاس ایک چٹان پر بیٹھا پرندوں کے گیت پر کان لگائے انھیں دیکھتا رہا۔ آخر کار ٹیک جو ان دونوں میں سے بڑا تھا۔ مچھلیوں کے کھیل سے اکتا کر اس کے پاس آ کھڑا ہوا اور بولا۔

"بھیتی ہرا اس پتھر پر بیٹھتا ہے۔"

"وہ کیا بلا ہے؟"

"معلوم نہیں۔ کبھی اسے دیکھا نہیں مگر میگن کہتی ہے کہ وہ یہیں بیٹھتا ہے۔ بڑے جم کو ایک دفعہ نظر آیا تھا جس دن بابا کے سر میں ٹٹو نے لات ماری۔ اس سے پہلے رات کے وقت ہرا یہاں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ یہاں بیٹھ کر سارنگی بجاتا ہے۔"

"کون سا راگ بجاتا ہے وہ؟"

"معلوم نہیں۔"

"اس کی شکل کیسی ہے؟"

"کالے رنگ کا بڈھا جم لگتا ہے اس کے جسم پر بال ہی بال ہیں۔ بڑا سخت ہوتا ہے۔ کبھی کبھی دن کو بھی آ جاتا ہے۔" پھر اپنی ترچھی سیاہ آنکھوں کے ڈھیلے پھرا کر کہا۔ "مجھے تو اٹھا کر نہیں لے جائے گا۔ میگن اس سے بہت ڈرتی ہے۔"

"میگن کو کبھی نظر آیا ہے؟"

"کبھی نہیں۔ لیکن میگن آپ سے نہیں ڈرتی۔"

"واہ مجھ سے بھلا کیوں ڈرتی؟"

"وہ آپ کے لئے دعا مانگتی ہے۔"

"چل بدمعاش۔ بھلا تجھے کیسے معلوم ہے؟"

"جب میں سویا ہوا تھا۔ تو وہ کہہ رہی تھی۔ خدایا ہم سب پر اپنا فضل کر اور مسٹر الیٹرسٹ پر بھی۔ بڑی دھیمی آواز میں دعا مانگ رہی تھی۔ میں نے خود اسے سنا ہے۔"

"تم بڑے بدمعاش ہو۔ جو باتیں تمہیں خود بھی نہ سننی چاہئیں تھیں وہ تم اوروں کو سنا رہے ہو۔"

لڑکا جھینپا ہو گیا اور پھر بڑے فخر سے بولا۔

"میں خرگوش کی کھال اتار لیتا ہوں۔ میگن تو کھال اترتی ہوئی دیکھ بھی نہیں سکتی۔ مجھے بڑا اچھا لگتا ہے۔"

"اچھا جناب کو یہ اچھا لگتا ہے! جن کہیں کا!"

"جن کیا ہوتا ہے؟"

"جن اسے کہتے ہیں جو دوسروں کو دکھ پہنچا کر خوش ہو۔"

پھول نے ذرا سے ماتھے پر تیوری ڈال کر کہا۔ "جو خرگوش ہم کھاتے ہیں وہ تو مرے ہوئے ہوتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے نک۔ میں معافی مانگتا ہوں۔"

"میں مینڈک کی کھال بھی اتار لیتا ہوں۔"

لیکن ایرنسٹ کسی سوچ میں پڑ گیا تھا۔ "خدایا ہم سب پر فضل کر" مسز ایرنسٹ بڑبڑائی۔ نک نے دیکھا کہ ابھی تو ابھی خاصی باتیں کر رہا تھا۔ اور اب جیسے کچھ سن ہی نہیں رہا۔ بہت حیران ہوا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو دوڑتا ہوا پگڈنڈی پر جا پہنچا جہاں پھر دونوں نے مل کر ہنسنا اور غل مچانا شروع کر دیا۔

جب میگن چائے لے کر آئی تو ایرنسٹ نے پوچھا۔

"میگن۔ جیسی ہو، کیا چیز ہے؟"

میگن نے چونک کر سر اٹھایا۔

"اس کا قدم بہت منحوس ہے۔"

"تم بھوت پریت کو مانتی ہو۔؟"

"اللہ کبھی اس کی شکل نہ دکھائے۔"

"نظر کیونکر آئے گا۔ کچھ ہو تو نظر آئے۔ بڑے جم نے یونہی کسی ٹنڈ کو دیکھ لیا ہو گا۔"

"نہیں ان چٹانوں میں بھوتوں کا ڈیرا ہے۔ یہاں ان لوگوں کے بھوت رہتے ہیں جو بہت عرصہ پہلے یہاں آباد تھے۔"

"تو بھلا جیسی تو نہ ہوئے نا! یہاں کے قدیم باشندے تو جیسیوں کے آنے سے بہت عرصہ پہلے مر کھپ گئے تھے۔"

میگن نے صرف اتنا کہا۔ "وہ سب منحوس ہیں۔"

"پھر کیوں! اور اگر یہاں بھوت ہیں بھی تو خرگوشوں کی طرح اپنا جنگل میں رہتے ہیں۔ اب جنگل میں جو پھول اگتے ہیں وہ منحوس ہوتے ہیں۔ یہ سنتارن کے درخت بھی تو سب خودرو ہیں۔ یہ تو منحوس نہیں اور بھوت منحوس ہو گئے! میں رات کو جنگل میں جا کر اپنی آنکھوں سے انھیں دیکھ آؤں گا۔ بلکہ ان سے دو چار باتیں بھی کر آؤں گا۔"

"ارے نہیں! نہیں!"

"میں ضرور جاؤں گا اور جا کر اس چٹان پر بیٹھوں گا جہاں بھوت بیٹھتا ہے۔"

لڑکی نے اپنا ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "خدا کے لیے!"

"پر کیوں؟ اگر مجھے کچھ ہو بھی گیا تو کیا مضائقہ ہے؟"

لڑکی نے کچھ جواب نہ دیا۔ ایشرسٹ پیار کے انداز میں بولا۔

"خیر میں جانوں، رہنا ہی بہتر ہے۔ آخر اب یہاں سے بھی تو جلد کوچ کرنا پڑے گا۔"

"جلد؟"

"تمہاری خالہ آخر کب تک مجھے رہنے دیں گی؟"

"ہم تو گرمیوں کے موسم میں ہمیشہ کمرے کرایہ پر دیتے ہیں۔"

ایشرسٹ نے لڑکی کے چہرے پر نظریں گاڑ کر پوچھا۔

"تم چاہتی ہو میں ٹھہر جاؤں؟"

"ہاں۔"

"تو آج رات میں تمہارے لئے دعا کروں گا۔"

ایشرسٹ نے تمہارے کے لفظ پر خاص زور دیا۔ میگن کا چہرہ تمتما اٹھا۔ چیں بجبیں کمرے سے باہر نکل گئی۔ ایشرسٹ نے چائے کو ابھی ہاتھ نہ لگایا تھا۔ پتیاں ابھی اچھی طرح بھیگی نہ تھیں۔ اپنے آپ کو بہت برا بھلا کہا۔ یہ کیا منہ سے نکل گیا؟ یہ تم نے کیا کیا؟ خوشنما پھولوں کو اپنے جوتے کی ٹھوکر سے کچل ڈالا۔ میں بھی رابرٹ گارٹن کی طرح گدھا ہوں۔ شہر کا رہنے والا۔ کالج کا طالب علم۔ اس لڑکی کو سمجھنے سے بالکل قاصر!

(۴)

اگلے ہفتے ایشرسٹ کو یقین ہو گیا کہ اب گھٹنے کی تکلیف جاتی رہی۔ کیونکہ اس نے اردگرد کے علاقہ کی خوب سیر کی۔ ایشرسٹ پر اب کے سال موسم بہار کی وہ کیفیتیں آشکار ہوئیں کہ آنکھیں کھل گئیں۔ کبھی کسی پیچ کے سرخ و سفید شگوفوں کو جو گہرے نیلے آسمان کے بالمقابل دھوپ میں کھلے ہوتے یا کبھی سکاچ فر کے تنوں اور ٹہنیوں کو جو تیز روشنی میں نیلے معلوم ہوتے تھے۔ ایک نشے کے عالم میں بیٹھا دیکھتا رہتا۔ یا پھر جنگل میں لارچ کے درختوں کا نظارہ کرتا۔ جو ہوا کے زور سے سیاہی ہو گئے تھے۔ نچلے ٹہنے کالے کالے تھے۔ اوپر کی ٹہنیوں میں کونپلیں پھوٹ رہی تھیں جو ہوا کے جھونکوں سے پھڑک اٹھتیں تو درخت میں ایک زندگی سی آجاتی۔ کبھی سڑک کے کنارے گھاس پر لیٹ جاتا اور بنفشے کے پھولوں، گچھوں کو دیکھتا رہتا یا سوکھے ہوئے سبز کھین میں کھڑا ٹیڈبری کی گلابی گلابی کلیوں کو جن کے آر پار دکھائی دیتا تھا۔ انگلیوں سے چھیڑتا رہتا۔ کبھی ککو چہچہانے لگتے۔ کبھی سبز ہدہد بول اٹھتے۔ کبھی آسمان کی بلندی سے کوئی لارک اپنے گیت کے موتیوں کو قطروں کی طرح ایک ایک کر کے زمین پر ٹپکاتا۔ بہاریں کئی دیکھی تھیں لیکن ان میں یہ بات نہ تھی۔ وہ بہاریں سبزہ و گل کی بہاریں تھیں۔ یہ بہار دل کی بہار تھی۔ دن کے وقت گھر کے لوگوں سے ملنا کم ہوتا۔ جب میگن کھانا لے کر آتی تو یا گھر کے کسی کام کاج میں ہوتی یا اسے احاطے میں ننھے ننھے جانوروں کی دیکھ بھال کرنی ہوتی اس لئے ایک دو باتوں سے زیادہ نہ ٹھہرتی۔ لیکن شام کے وقت ایشرسٹ باورچی خانہ کی کھڑکی کے پاس بیٹھ جاتا۔ پائپ سلگا لیتا۔ لنگڑے جم یا مسز نرکومب سے باتیں کرتا رہتا۔ لڑکی سینا پرونے بیٹھتی یا کھانے کے برتن سنبھالتی پھرتی۔ بعض دفعہ اسے یہ احساس ہوتا کہ میگن اپنی چلتی پھرتی بھوری بھوری آنکھوں سے

جھلملاتے میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ اس سے عجیب نخوت آمیز مسرت ہوئی۔ دل کی وہ کیفیت ہوئی جو ایک بلی کی ہوتی ہوگی جب وہ میاؤں میاؤں کرتی ہے۔

ایک ہفتہ بیت گیا۔ اتوار کے دن شام کے وقت ایشرسٹ باغیچے میں بیٹھا بلیک برڈ کی آواز پر کان لگائے ایک مشتبہ نظم موزوں کر رہا تھا کہ راستے میں پھاٹک کے بند ہونے کی آواز آئی۔ اور درختوں کے بیچ میں آگے آگے لڑکی اور اس کے پیچھے پیچھے وہ لال لال گالوں والا دہقان بھاگتے نظر آئے۔ ایشرسٹ سے بیس گز کے فاصلے پر آ کر لڑکی ٹھیر گئی۔ جو نہی آ پہنچا دونوں آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ایشرسٹ گھاس پر لیٹا ہوا تھا اس پر کسی کی نظر نہ پڑی۔ لڑکا آگے بڑھا گیا لڑکی اسے پیچھے ہٹاتی رہی۔ لڑکی کے چہرہ پر طیش اور پریشانی تھی۔ اور لڑکے کا چہرہ؟ کسی کو کیا معلوم تھا کہ اس دہقان کے لال چہرے پر بھی اتنا اضطراب ظاہر ہو سکتا ہے۔ ایشرسٹ کو یہ منظر دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ وہ یکلخت اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں نے اسے دیکھا۔ میگن نے اپنے ہاتھ ڈھیلے چھوڑ دیئے اور سہمی سہمی ایک درخت کے تنے کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ لڑکا گھبرا کر کنارے کی طرف بھاگ نکلا اور چھلانگ لگا کر غائب ہو گیا۔ ایشرسٹ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا لڑکی کے پاس گیا۔ وہ حسن کی مورت ہونٹ دانتوں میں دبائے بالکل بت بنی کھڑی تھی۔ نظریں زمین دوز تھیں۔ ملائم سیاہ بال چہرے پر پریشان تھے۔

ایشرسٹ نے کہا۔ "میں معافی مانگتا ہوں"

لڑکی نے سر نیچا ڈالے پلکیں اٹھا کر بھیگی بھیگی آنکھوں سے ایشرسٹ کو ٹک ٹک دیکھا۔ ایک سسکی بھری اور مڑ کر چل دی۔

ایشرسٹ اس کے پیچھے گیا۔

"میگن"

لیکن وہ نہ رکی۔ آخر ایشرسٹ نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ اور آہستہ سے اسے اپنی طرف موڑ کر کہا۔

"ٹھیر جاؤ۔ مجھ سے بات تو کرو۔"

"آپ مجھ سے کیوں معافی مانگتے ہیں! مجھ سے معافی مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"اچھا تو میں جو سے معافی مانگ لیتا ہوں۔"

"اسے میرے پیچھے آنے کی جرأت کیسے ہوئی؟"

"تم پر عاشق ہوگا اور کیا؟"

لڑکی نے زور سے پاؤں زمین پر پٹکا۔

ایشرسٹ ہنس دیا۔ "کہو تو میں اسے ڈانٹ دوں؟"

لڑکی یکلخت جذبہ سے بے قابو ہو کر رونے لگی۔

"آپ مجھ سے دل لگی کر رہے ہیں۔ آپ ہم لوگوں کی ہنسی اڑاتے ہیں۔"

ایشرسٹ نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ لیکن وہ پیچھے ہٹ گئی۔ حتیٰ کہ اس کا تمتمایا ہوا چھوٹا سا چہرہ اس کے پریشان بال ایک سیب کے درخت کے گلابی شگوفوں میں جا لگے۔ ایشرسٹ نے اس کا ایک ہاتھ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ دل میں سوچا کہ

یہ جرأت کی کتنی قدر کرتا ہوں۔ وہ امر جو میرے منہ پر ہی کتنی حقیر ہے اور یہ احساس محض اتنی بات سے پیدا ہوا کہ اس لڑکی نے ہاتھ کو ہونٹوں سے چھو لیا تھا۔ میگن اس وقت تک اپنا جسم چرائے کھڑی تھی لیکن اب یکلخت تھرتھر کانپتی ہوئی ایشرسٹ کی طرف بڑھی۔ نیم میٹھی سی حرارت ایشرسٹ کے بدن میں سر سے پاؤں تک پھیل گئی۔ سمجھ گیا کہ اس نازک بدن بھولی بھالی دوشیزہ کو میرے ہونٹوں کے مس سے خوشی ہوئی ہے۔ عجلت بے تاب ہو کر بانہیں اس کے گرد ڈال دیں۔ اور سینے سے لپٹا کر اس کا منہ چوم لیا۔ پھر کچھ سہم گیا۔ میگن کا رنگ سفید تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ لمبی لمبی سیاہ پلکوں نے بے رنگ رخساروں پر صف باندھ رکھی تھی۔ بے جان بازو پہلوؤں کے ساتھ لگے تھے۔ اس کے سینے کے مس سے ایشرسٹ کے بدن میں بجلی سی دوڑ گئی۔ ایک آہ بھر کر کہا "میگن" اور اسے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ اس گہری خاموشی میں ایک بلیک برڈ چہچہایا۔ پھر لڑکی نے ایشرسٹ کا ہاتھ زور سے پکڑ لیا۔ پہلے رخسار پھر ہونٹوں سے لگایا۔ اور اسے دیوانہ وار چوما اور پھر بھاگ کر سیب کے درختوں کے کائی دار تنوں میں غائب ہو گئی۔

ایشرسٹ ایک پرانے مڑے تڑے درخت پر جس کی شاخیں زمین کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی تھیں بیٹھ گیا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اور حواس پریشان تھے۔ ان گلابی گلابی کلیوں کو جن میں کی ایک کلی کھل کر سفید ستارہ بن گئی تھی۔ ان شگوفوں کو جنوں نے میگن کے بالوں کے ارد گرد پھولوں کا ایک تاج گوندھ دیا تھا۔ کھوئی کھوئی نظروں سے تکتا رہا۔ حسن کے ہاتھوں شکست کھائی تھی یا خدا جانے بہار کا جادو چل گیا تھا۔ بہر حال دل مسرت اور احساس فتحمندی سے لبریز تھا۔ ٹانگیں اور بازو پھڑک رہے تھے۔ کچھ سہما ہوا بھی تھا۔ یہ آغاز ہے۔ مگر کاہے کا آغاز؟ بھنگے اسے کاٹ رہے تھے۔ مچھر اڑ اڑ کر اس کے منہ میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ککو اور بلیک برڈ چہچہا رہے تھے۔ بیغل ہنس رہے تھے۔ سورج کی شعاعیں زمین کے متوازی پڑ رہی تھیں۔ سیب کے شگوفے کھلے ہوئے تھے اس کے چاروں طرف بہار کی کیفیات میں پہلے سے زیادہ حسن اور پہلے سے زیادہ زندگی آ گئی تھی۔ درخت کے تنے سے اٹھا اور باغیچے سے باہر نکل گیا۔ اسے کسی کھلی جگہ اور کھلے آسمان کی ضرورت تھی۔ جہاں چل کر اپنے جذبات سے مفاہمت کرے۔ اس نے جنگل کا رخ کیا۔ جھاڑیوں میں سے ایک میگ پائی نے ایش کے درخت پر سے اڑ کر جنگل والوں کو اس کے آنے کی خبر کر دی۔

جس شخص کی عمر پانچ سال سے زیادہ ہو۔ اس کے متعلق کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اسے کبھی عشق نہیں ہوا! جب رقص کی تعلیم لے رہا تھا تو جن کے ساتھ ناچتا تھا ان پر عاشق تھا۔ اسکول کی چھٹیوں میں کئی لڑکیوں پر عاشق ہوا۔ عشق کا نشہ جب ایک دفعہ چڑھنا شروع ہوا تو پھر شاید ہی کبھی اترا۔ ہمیشہ (کم و بیش دور سے) کسی نہ کسی کی پرستش کرتا رہا۔ لیکن یہ عشق سب سے زیادہ نرالا تھا یہاں دوری کا تو سوال ہی نہ تھا۔ یہاں تو بات ہی کچھ اور تھی۔ یہاں تو روح مسرت سے لبریز تھی۔ اور دل میں مردانگی کے تکمیل پانے کا احساس تھا۔ ایسے جنگلی پھول کو ہاتھوں میں تھامے رہنا جب دل چاہے اسے ہونٹوں سے لگا لینا اور اسے خوشی کے مارے کانپتے ہوئے محسوس کرنا۔ اس میں کتنا سرور ہے۔ ہاں مگر اس سرور کے ساتھ ساتھ ایک الجھن بھی ہے۔ اس پھول کو آخر کرے کیا؟ دوبارہ اس لڑکی سے کس طرح ملے؟ پہلا پیار تو کچھ ٹھنڈے دل سے کچھ ترس کھا کر کیا تھا! لیکن اب تو ایسا کرنا ممکن نہیں۔ اب تو جانتا ہے کہ اسے بھی مجھ سے عشق ہے۔ کس جذبے کے ساتھ اس نے میرے ہاتھ کو چوما تھا۔ کس زور کے ساتھ اسے سینے سے لگایا تھا بعض لوگ ایسے ہیں کہ جب انھیں خراجِ عشق ادا کیا جائے تو ان کی فطرت میں ایک کرختگی آ جاتی ہے۔ لیکن ایشرسٹ ان لوگوں میں سے تھا جو محبوب بن کر جھک جاتے ہیں۔ کسی کو گرویدہ دیکھ کر خود مسحور ہو جاتے ہیں۔ ان کے جذبات میں گرمی اور طبیعت میں گداز پیدا

پہنچتا ہے۔ وہ عشق کو ایک معجزہ سمجھتے ہیں۔ جس سے ان کی فطرت میں ایک غلو پیدا ہو جاتا ہے۔

ایشرسٹ جنگل کے ٹیلوں کے پاس بیٹھا عجیب کشمکش میں گرفتار تھا۔ دل کے اندر جو بہار کھل گئی تھی۔ اس کے مزے لوٹنے کا بہت قوی تھا۔ لیکن ذرا بھی تصفیہ معلوم تھا کس چیز سے لیکن ذرا متاثر ضرور تھا دل سے کتنا ایسی خوبصورت لڑکی بھولا بھالا چہرہ جھکتی جھکتی آنکھیں۔ اس کے دل پر فتح حاصل کر لینا۔ کیا کچھ کم فخر کی بات ہے۔ اب خدشہ کاہے کا ہے۔ لیکن پھر ایک معنوی سنجیدگی کے ساتھ سوچتا۔ سب کچھ سہی۔ لیکن تم انجام سے پوری طرح واقف ہو۔ سمجھ سے کام لو۔

اپنے خیالات میں محو تھا کہ شام ہو گئی۔ چٹانوں کے ترشے ہوئے شاہی وضع کے ڈھیروں پر تاریکی چھا گئی۔ اور قدرت کی آواز نے کہا۔ یہ تمہارے لیے نئی دنیا ہے۔ جس طرح انسان گرمیوں کے موسم میں صبح جاگنے کے اٹھ کر باہر نکل جائے تو چرند پرند اسے گھور کر دیکھتے ہیں۔ اور اسے محسوس ہوتا ہے گویا ہر چیز نئی ہے۔

وہ گھنٹوں وہاں بیٹھا رہا۔ لیکن جب سردی محسوس ہونے لگی تو اٹھا۔ پتھروں اور بید کی جھاڑیوں کے بیچ سے راستہ ٹٹولتا ہوا سڑک پر پہنچا۔ سڑک کی پگڈنڈی پر نکلا اور پھر مرغزار کے پار ہوتا ہوا پیچھے سے داخل ہوا۔ وہاں پہنچ کر دیا سلائی جلائی اور گھڑی کو دیکھا۔ ساڑھے بجنے والے تھے! چھ گھنٹے پیشتر دن کی روشنی کچھ کچھ باقی تھی اور پرندے چہچہا رہے تھے۔ لیکن اب تو چاروں طرف تاریکی مسلط تھی اور کہیں بھی زندگی کے آثار نظر نہ آتے تھے۔ اور پھر اس نے یکلخت اپنے عشق روستائی کو بیرونی نقطۂ نظر سے دیکھا۔ تصور میں اس گھاگ عورت یعنی مسز نیردکومب کی ترش روئی اس کی سانپ کی سی مڑی ہوئی گردن اس کی تیز سیاہ آنکھ سب باتوں کا جائزہ لیتی ہوئی دکھائی دی۔ جیتی وضع لڑکوں کے شہوات انسان کے ناشائستہ طعنے سنائی دیئے۔ اکھڑ جو کا چہرہ غصہ سے لال نظر آیا۔ صرف دکھ بھری آنکھوں والا لنگڑا جم ہی ایسا تھا جس کا تصور تکلیف دہ نہ تھا۔ گاؤں کے شراب خانہ میں کیا کیا چہ میگوئیاں نہ ہوں گی۔ بوڑھی عورتیں جنہیں اکثر سیر کے وقت سڑک پر چلتے دیکھا تھا کیا کیا باتیں نہ بنائیں گی۔ اور پھر اس کے اپنے دوست کیا کہیں گے۔ رابرٹ گارٹن تو رخصت ہوتے وقت واقفکارانہ انداز سے اور طنز کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔ اس کا دل گھن سے بھر گیا۔ لمحہ بھر کو اسے اس اسفل حصہ زن دنیا سے نفرت ہو گئی جس میں انسان زندگی گذارنے پر مجبور ہے۔ جس پھاٹک کے سہارے کھڑا تھا اس کی سیاہی مدھم پڑ گئی۔ اور ایک ازرق جھلک اس کے پاس سے گذر کر نیلی تاریکی میں پھیل گئی۔ چاند نکل آیا۔ ایشرسٹ نے مڑ کر دیکھا۔ عجیب نظارہ تھا۔ چاند مٹی کے پشتہ پر دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن سرخ اور تقریباً گول۔ ایشرسٹ نے گھر کی طرف قدم اُٹھائے۔ پگڈنڈی پر پات اور گوبر اور نوخاستہ سبزے کی خوشبو آ رہی تھی۔ احاطے میں مویشی بڑے بڑے کالے کالے دھبے سے معلوم ہوتے تھے۔ اس سیاہی میں کہیں کہیں ان کے پیلے پیلے سینگوں کے قوس دکھائی دیتے تھے جیسے آسمان سے ہلالِ نو کون کے بل آ گرے ہوں۔ گھر میں کہیں روشنی نظر نہ آئی۔ دبے پاؤں ڈیوڑھی تک پہنچا اور ایک یو کے درخت کی تاریکی میں گم ہو کر میگن کی کھڑکی کی طرف سر اٹھا کر دیکھا۔ کھڑکی کھلی تھی۔ نہ معلوم میگن سو رہی ہے یا اس کی جدائی میں پریشان اور بے آرام کروٹیں بدل رہی ہے۔ کھڑکی کو تک رہا تھا کہ ایک اُلو بولا۔ بجز ندی کے ہلکے ہلکے مسلسل و متواتر شور کے چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اُلو کی آواز جیسے تاریکی میں گونج اٹھی۔ دن کو ککوؤں کا چہچہانا۔ رات کو اُلوؤں کا بولنا۔ ایشرسٹ کے دلی ہنگاموں کا ان سے بہتر ترجمان کون ہو سکتا ہے۔ دفعتاً میگن نے کھڑکی کے باہر جھانکا۔ ایشرسٹ درختوں سے ذرا ہٹ آیا اور نہایت ہلکی آواز میں بولا۔ "میگن" میگن پیچھے ہٹی۔

غائب ہو گئی۔ پھر آئی، باہر کو جھکی۔ ایشرسٹ اس گھاس کے قطعہ پر پنجوں کے بل آگے بڑھا۔ سبز کرسی سے ٹکرا گیا۔ دیکھ لیا میگن کے چہرے اور پھیلے ہوئے بازوؤں میں جو غیر واضح نظر آ رہے تھے کوئی حرکت نہ ہوئی۔ ایشرسٹ نے کرسی کو سرکا کر دیوار کے ساتھ لگا دی اور چپ چاپ اس پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہاتھ بڑھایا تو میگن تک جا پہنچا۔ میگن کے ہاتھ میں دروازہ کی ایک بڑی سی چابی تھی۔ ایشرسٹ نے گرم ہاتھ ٹھنڈی چابی سمیت زور سے پکڑ لیا۔ میگن کا چہرہ دھندلا سا نظر آ رہا تھا۔ ہونٹوں کے بیچ میں دانت چمک رہے تھے۔ اور بال پریشان تھے کپڑے اس نے ابھی نہ اتارے تھے۔ بے چاری ایشرسٹ کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ "خوبصورت میگن!" اس کی گرم گرم کھردری انگلیاں ایشرسٹ کی انگلیوں سے لپٹ گئیں۔ بشرے سے کھوئی کھوئی معلوم ہوتی تھی۔ چہرے پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی "اس کے چہرہ تک ہاتھ پہنچ جانا بھی کیسی خوش نصیبی ہے!" وہ پھر بولا۔ سوئٹ برائڈ کی خوشبو ایشرسٹ کے نتھنوں میں سما گئی۔ فارم کا ایک کتا بھونکا۔ میگن کی انگلیاں ڈھیلی پڑ گئیں اور وہ پیچھے ہٹ گئی۔

"گڈ نائٹ میگن!"

"گڈ نائٹ جناب!" وہ چلی گئی۔ ایشرسٹ آہ بھر کر نیچے اترا۔ کرسی پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا۔ اس کے سوا اب کیا ہو سکتا ہے کہ چپ چاپ جا کر سو رہے۔ لیکن پھر بھی وہ بہت دیر تک بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اس کے بازو اوس میں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ لیکن وہ نیم متبسم چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھر رہا تھا۔ وہ گرم انگلیاں۔ اسے یاد آ رہی تھیں جو چابی اس کی ہتھیلی میں دبا کر اس کے ہاتھ کو لپٹ گئی تھیں۔ اور ایشرسٹ پر ایک نشہ سا چھایا ہوا تھا۔

(۵)

رات کو بھر کا ہی سو گیا تھا۔ لیکن صبح اٹھا تو طبیعت میں گرانی تھی۔ جیسے رات کو کھانا پیٹ بھر کر کھایا ہو۔ کل کی سرگزشت عشق برسوں پہلے کی ایک کہانی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اس دن پھر صبح میں ایک عجیب سی دلفریبی تھی۔ بہار کا موسم آج پورے جوبن پر تھا۔ راتوں رات سنہری پھول تمام مرغزار پر چھا گئے تھے۔ اور کھڑکی میں سے باغیچہ سیب کے شگوفوں سے ڈھکا ہوا نظر آتا تھا۔ جیسے کسی نے گلابی اور سفید رنگ کا لباس بچھا دیا ہو۔ جب ایشرسٹ نیچے اترا تو دل ڈر رہا تھا کہ میگن سے سامنا نہ ہو جائے لیکن جب اس کا ناشتہ میگن کے بجائے مسز نیرکومب لے کر آئی تو ایشرسٹ کو ناگوار گزرا اور مایوسی ہوئی۔ آج مسز نیرکومب کی تیز آنکھ اور سانپ کی سی گردن پہلے سے بھی زیادہ چوکنا تھی۔ اسے کہیں معلوم تو نہیں ہو گیا؟

"اچھا مسٹر ایشرسٹ۔ رات آپ گویا چاند کے ساتھ ساتھ سیر کرتے رہے۔ کھانا بھی کہیں کھایا یا نہیں؟"

ایشرسٹ نے سر ہلا دیا۔

"ہم نے تو آپ کے لئے کھانا رکھ چھوڑا تھا لیکن میں جانوں آپ کا دماغ اتنا مصروف تھا کہ کھانے کا خیال بھی نہ آیا ہوگا۔"

کیا وہ اپنے ویلز کے لہجے میں (جس پر [illegible] کی بولی بہت غالب آتی جا رہی تھی) اس کا مذاق اڑا رہی تھی؟ اگر اسے اس بات کا علم ہو جائے تو ـــ! ایشرسٹ نے اس وقت دل سے کہا: "نہیں نہیں میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

لیکن ناشتہ ہو چکنے کے بعد میگن سے ملنے کی خواہش ہر لحظہ بڑھتی گئی۔ دل میں ڈرتا تھا کہ کہیں کسی نے اس سے ایسی ویسی بات نہ کہی ہو جس سے سب بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔ تاہم دال میں کچھ کالا ضرور ہے جو صبح سے اس نے شکل تک نہیں دکھائی۔ وہ عشقیہ نظم جو کل سہ پہر کو سیب کے درختوں کے نیچے اس پر اس قدر چھائی ہوئی تھی اب اسے اتنی پھیکی معلوم ہوئی کہ مسودہ پھاڑ ڈالا اور اس کی چپیاں بنا بنا کر اس نے پائپ سلگایا۔ اس ہاتھ کو پکڑ کر چوم لینے سے پہلے وہ عشق کی رمزوں سے بے خبر تھا۔ اور اب تو کوئی بھی کیفیت ایسی نہیں جس سے وہ بے خبر ہو۔ لیکن ان کیفیات کو نظم کرنا گویا پانی کی لہریں گننا ہے۔ ایک کتاب لانے کو سونے کے کمرے میں گیا۔ وہاں پہنچا تو دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میگن اس کا بستر لگا رہی تھی۔ ایشرسٹ دروازہ میں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ میگن نے جھک کر تکیے کو عین اس جگہ پر جہاں ایشرسٹ کے سر رکھنے سے پچک گیا تھا چوم لیا۔ ایشرسٹ کے دل میں یکلخت مسرت کا ایک طوفان بپا ہوا۔ اب اس پر کس طرح ظاہر کرے کہ میں نے دیکھ لیا ہے۔ اگر دبے پاؤں واپس لوٹ گیا اور اس نے آہٹ سن پائی تو اور بھی برا ہوگا۔ میگن نے تکیے کو ہاتھ میں اٹھا لیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ رخسار کے نقش کو مٹانا نہیں چاہتی۔ پھر اسے نیچے رکھ دیا۔ اور دروازہ کی طرف مڑی۔

"میگن"

لڑکی نے چونک کر اپنے ہاتھ رخساروں پر رکھ لیے۔ لیکن اس کی آنکھیں ایشرسٹ کے آرپار دیکھ رہی تھیں۔ ایشرسٹ کو ان جھلکتی ہوئی آنکھوں کی گہرائی پاکیزگی اور ان میں رقت انگیز دعا کی جھلک۔ ان کا اس قدر احساس پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ رک رک کر بولا۔

"رات تم میرے انتظار میں بیٹھی رہیں۔ میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں؟"

لڑکی کچھ نہ بولی۔

"میں رات جنگل میں ادھر ادھر پھرتا رہا۔ بڑا سہانا وقت تھا۔ اب میں یہ کتاب لینے اوپر آیا تھا۔"

میگن کا وہ تکیے کو بوسہ دینا یاد آیا۔ ہمت بڑھی۔ دل میں ایک جوش سا اٹھا۔ قریب آیا اور اس کی آنکھیں چوم لیں۔ رگوں میں خون تیز تیز دوڑنے لگا۔ دل نے کہا۔ "اب بتاؤ کل جو کچھ ہوا تھا۔ وہ تو محض اضطراری حالت میں سرزد ہوا تھا لیکن اب؟ اب کس منہ سے کہو گے کہ......" لڑکی نے اپنا ماتھا ہونٹوں سے الگ نہ کیا۔ ایشرسٹ کے ہونٹ نیچے کو سرکتے گئے اور آخر کار میگن کے ہونٹوں سے جا ملے۔ عمر بھر میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی کو مکمل احساس عشق کے ساتھ چوما ہو۔ بوسہ عشق جس میں کیف آور نشہ لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک معصومیت سی بھی تھی۔ اس سے دونوں میں سے کس کا دل زیادہ تڑپا ہوگا؟

"رات کو جب سب لوگ سو جائیں تو اس بڑے سے سیب کے درخت کے پاس ملنا۔ میگن وعدہ کرو۔"

میگن نے بڑی دھیمی آواز میں کہا۔ "میں وعدہ کرتی ہوں۔"

میگن کا رنگ فق تھا۔ ایشرسٹ نے کچھ اسے دیکھ کر کچھ اس سارے واقعہ پر غور کیا۔ سہم گیا۔ لڑکی کو چھوڑ کر نچلی منزل میں آ گیا۔ جانتا تھا کہ اب پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ اس کے عشق کو قبول کر لیا۔ اپنا عشق ظاہر کر دیا۔ اب باقی کیا رہ گیا ہے؟ کتاب لانا تو بھول ہی گیا تھا۔ خالی ہاتھ اس منبر کی پر جا بیٹھا۔ اس کے سامنے اور پیچھے فارم کے لوگ کام کاج میں مشغول تھے۔ لیکن

• ایشرسٹ کی نظریں مبہوت تھیں۔ اترا بھی رہا تھا۔ پچتا بھی رہا تھا۔ نہ معلوم کتنی دیر یونہی بیٹھا رہا اور پھر جو دیکھا تو دائیں ہاتھ کچھ پیچھے ہٹ کر جو کھڑا تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ کھیت پر سے ابھی ابھی لوٹا ہے۔ جسم کا بوجھ کبھی اس ٹانگ پر ڈالتا کبھی اس ٹانگ پر۔ چہرے کا رنگ ڈوبتے سورج کی مانند تھا۔ نیلی قمیص کی آستینیں چڑھا رکھی تھیں۔ بازوؤں کی رنگت اور چمک پکے ہوئے آڑوؤں کی مانند تھی۔ لال لال ہونٹ کھلے ہوئے تھے اور سانس دھونکنی کی طرح سنسنائی دیتا تھا۔ نیلی نیلی آنکھیں سن کی سی پلکیں۔ نظریں ایشرسٹ کے چہرے پر گاڑ رکھی تھیں۔ ایشرسٹ نے طنز سے پوچھا۔

• کیوں جو۔ کوئی خدمت میرے لائق؟"

"ہاں"

• کیا؟"

• تم یہاں سے چلے جاؤ۔ ہمیں تمہاری ضرورت نہیں!

ایشرسٹ پہلے ہی کون سا مسکین صورت تھا۔ اور اب تو وہ اور بھی تن کر بولا۔

• تمہاری بڑی مہربانی ہے۔ لیکن تمہیں خدائی فوجدار بننے کو کس نے کہا؟

جو ایک دو قدم آگے بڑھا۔ محنتی نوجوانوں کے پسینے کی بو ایشرسٹ کے نتھنوں کو ناگوار گزری۔

• تم یہاں کیوں ٹھہرے ہو؟"

میری مرضی!

• چندیا کی استری ہو گئی تو مرضی ورضی سب بھول جائے گی!

• تو تمہارا ہاتھ کس نے روکا ہے؟"

جو نے کچھ نہ کہا۔ صرف سانس اور بھی تیز ہو گیا۔ جوان اور بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح آنکھوں سے آگ برسنے لگی غصہ کے مارے چہرے کے پٹھے اینٹھ گئے۔

• میگن تمہیں نہیں چاہتی!

اکھڑ۔ بدتمیز دہقان کی یہ بات سن کر ایشرسٹ کے سر سے پاؤں تک آگ لگ گئی۔ حماقت اور غصہ اور حسد سے ہکا بکا ہو گیا۔ اپنے آپ پر قابو نہ رہا۔ یکلخت اٹھ کر کرسی پیچھے کو دھکیل دی اور بولا۔

ایسی کی تیسی تمہاری!

یہ الفاظ منہ سے نکلے تو سامنے میگن نظر پڑی۔ بادامی رنگ کا کتے کا پلا گود میں اٹھائے دروازہ میں کھڑی تھی۔ جلدی سے پاس آئی اور بولی۔

• دیکھو اس کی آنکھیں نیلی ہیں!

جو چل دیا۔ گردن کا رنگ پکے پکے قرمزی سا تھا!

ایشرسٹ نے کتے کے ہونٹوں کو پیار سے چھیڑا۔ کتا بڑے مزے سے مینڈک کی مانند موٹا تازہ پیٹ منہ سے

گود میں لیٹا ہوا تھا۔

"یہ ابھی سے تمہیں پیار کرنے لگا ہے۔ سبھی تم سے پیار کرتے ہیں۔"

"جو آپ سے کیا کہہ رہا تھا؟"

"کہتا تھا تم یہاں سے چلے جاؤ۔ میگن کو تمہاری ضرورت نہیں۔"

لڑکی نے پاؤں زور سے زمین پر مارا۔ پھر آنکھ اٹھا کر ایک ہرن کی نظروں سے ایشرسٹ کو دیکھا۔ ایشرسٹ کانپ اٹھا
روانے کے پر جلتے دیکھ لئے ہوں۔

"نہیں!" سر جھکا کر کتے کو پیار کیا اور اس کے موٹے تازے جسم سے چہرہ ڈھلکے اندر چلی گئی۔

ایشرسٹ پگڈنڈی کے ساتھ ساتھ چل دیا۔ مرغزار کے پھاٹک پر وہ لنگڑا آدمی ملا۔ گائیں چرا رہا تھا۔ ایشرسٹ بولا

"بڑا اچھا موسم ہے۔"

"گھاس کے لئے بہت اچھا ہے۔ اس لئے اوک کے درخت ایش کے درختوں سے پہلے ہرے ہوں گے۔ مثل ہے
اوک کے درخت ایش سے پہلے ——"

ایشرسٹ نے یونہی پوچھا۔ "ہم جب تمہیں جپسی ہوا نظر آیا تھا تو تم کہاں کھڑے تھے؟"

"بس اس بڑے سیب کے درخت کے نیچے سمجھ لیجئے۔"

"کیا واقعی بھی کچھ تھا یا یونہی؟"

"اب یہ تو خدا جانے۔ کم از کم مجھے یہی معلوم ہوا کہ کھڑا ہے۔"

"یہ ہوا آتا کیوں ہے؟"

لنگڑے آدمی نے دھیمی آواز میں کہا۔

"کسی کی برائی نہیں کرنی چاہئے۔ لیکن کہتے ہیں کہ مسٹر نیردکومب نسل کا جپسی تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ جپسی لوگ
کے آدمی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ انھیں کسی نہ کسی طرح خبر ہو گئی ہو گی کہ مسٹر نیردکومب مرنے والا ہے۔ چنانچہ انھوں
ت کو بھید یار جاؤ تم پاس رہو —— میں تو یہی سمجھتا ہوں۔"

"دیکھنے میں کیسا تھا؟"

"چہرے پر بال ہی بال۔ یوں چلتا تھا جیسے ہاتھ میں فڈل اٹھا رکھا ہو۔ بعض لوگ کہتے ہیں بھوت پریت سب
ہے۔ لیکن صاحب اندھیری رات میں اس کتے کے جسم پر رونگٹے کھڑے ہوتے تو میں نے اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں۔ خدا جا
رت نظر نہ آیا ہو۔"

"چاند نکلا ہوا تھا؟"

"کوئی بارھویں تیرھویں رات تھی۔ چاند ابھی ابھی نکلا تھا۔ اور درختوں کے پیچھے سنہری دکھائی دے
لا۔

"ہمارا خیال ہے بھوت منحوس ہوتے ہیں۔"

لنگڑے آدمی نے اپنی ٹوپی پیچھے سرکا دی اور اٹھی ہوئی نظروں سے ایشرسٹ کو ادب کی نظر سے دیکھنے لگا۔

"صاحب یہ تو خدا جانتا ہے لیکن آخر بھوت ہیں مارے مارے کیوں پھرتے ہیں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ خدا کے ان بھیدوں کو ہم کیا جانیں۔ بعض لوگوں کو کچھ نظر آتا ہے بعض کو نہیں آتا۔ اب ہمارے جو کو یا ہمارے لوگوں کو لیجیے۔ سامنے پڑی چیز دکھائی نہیں دیتی لیکن میگن کی نظر کی مجال جو کبھی چوک جائے۔ جو ہو گا دکھائی دے گا۔ بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی نظر آئے گا۔"

"وجہ یہ ہے کہ وہ حساس ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"میرا مطلب ہے وہ ہر چیز کو محسوس کرتی ہے۔"

"یہ سچ ہے۔ میگن کا دل بڑا نرم ہے۔"

ایشرسٹ کو اپنے چہرے پر خون دوڑتا ہوا محسوس ہوا۔ تمباکو کی تھیلی آگے بڑھا دی۔ "لو پائپ بھرو۔"

"تھینک یو صاحب۔ بس لاکھوں میں ایک ہے یہ لڑکی۔"

ایشرسٹ نے جواب میں مختصر سا فقرہ کہا۔ تھیلی لپیٹ لی اور چل دیا۔

"اس کا دل نرم ہے۔" بجا لیکن میں بھلا کس فکر میں ہوں۔ میری نیت کیا ہے۔ ادھر ادھر کھیتوں میں گھومتا پھرا۔ لیکن اس خیال نے پیچھا نہ چھوڑا۔ کھیتوں میں بٹر کپ کے پھول اگ رہے تھے اور لال رنگ کے بچھڑے گھاس چر رہے تھے۔ آسمان پر ابابیلیں اڑ رہی تھیں۔ واقعی ایش کے درخت ابھی ہرے نہ ہوئے تھے۔ لیکن اوک کے درختوں پر بھورے بھورے سنہری پھول کھل رہے تھے۔ ہر درخت کا رنگ جدا تھا۔ کسی کی اٹھتی جوانی تھی۔ کوئی اپنے بھورے جوبن پر تھا۔ ککو اور ہزاروں پرندے چہچہا رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی ندیوں کا پانی دمک رہا تھا۔ قدیم زمانے کے لوگوں کا عقیدہ تھا کہ عیش و عشرت کا زمانہ آنے والا ہے..... باغ جنت میں...... ایک بھڑ اس کی آستین پر آ بیٹھی۔ ایک بھڑ سے دو ہزار بھڑیں پیدا ہوتی ہیں اور ایک بھڑ کو مار ڈالو تو گویا جو سیب ان شگوفوں سے اگیں گے۔ وہ دو ہزار بھڑوں کی دستبرد سے محفوظ ہو جائیں گے۔ پر کون ایسا سنگدل ہو گا جو ایسے خوشگوار موسم میں کسی کی بھی جان لے سکے۔ ایک کھیت میں سرخ رنگ کا ایک جوان سانڈ چر رہا تھا ایشرسٹ نے اسے دیکھا تو جو کی شکل یاد آئی۔ لیکن سانڈ نے ایشرسٹ سے کچھ تعرض نہ کیا۔ شاید یہ پست قد جانور خود بھی اس سنہری چراگاہ کی خوبصورتی اور موسیقی سے مست تھا۔ ایشرسٹ بے کھٹکے ندی کے پاس ڈھلوان پر جا پہنچا۔ سامنے ایک پہاڑی چٹانوں کا تاج پہنے کھڑی تھی۔ بلیو بل اس کثرت سے اگ رہے تھے کہ ذہن پر ایک نیلی سی دھند چھا گئی تھی۔ اور سیب کے کوئی بیس درخت شگوفوں سے لدے کھڑے تھے۔ ایشرسٹ گھاس پر لیٹ گیا۔ کھیتوں کے منظر پر اوک کے درختوں اور بٹر کپ کے پھولوں کا سنہری رنگ چڑھا ہوا تھا۔ لیکن یہاں مٹیالے رنگ کی پہاڑی کے دامن میں گویا جیسے آسمان کا حسن زمین پر اتر آیا تھا۔ ایشرسٹ اس زمین کو دیکھ کر محو حیرت تھا۔ ککوؤں کا چہچہانا اور ندی کا شور البتہ دھیمے ہی سنائی دے رہا تھا۔ بہت دیر تک لیٹا رہا۔ شہد کی مکھی کے سوا اور کوئی ساتھی نہ تھا۔ سورج نے رفتہ رفتہ اپنا رخ بدل لیا اور سیب کے درختوں کے سائے بلیو بل کے پھولوں پر پہنچنے

گھر جاتے [illegible] سے جو ہاتھ [illegible] رات سیب کے پیڑ کے نیچے ملاقات ہوگی۔ چڑیاں ابھی سے درختوں پر ہجوم کر رہی تھیں اور سمٹے ہوئے بیچ کی رنگت کے نیلے کالوں والے دیہاتوں کے کھیتوں میں پٹ بجتے ہیں۔ [illegible] چھا رہے تھے اور جھینگے پہاڑی کا دامن ستاروں سے بھر رہا تھا لیکن سورج پہاڑی کے پیچھے جا چھپا تھا۔ ڈھلوان پر ایک خنکی سی آ گئی تھی اور کہیں کہیں خرگوش باہر نکل آئے تھے۔ سوچا "آج رات" جس طرح ہر شے زمین سے ابھری آ رہی تھی۔ اور ایک خوبرو [illegible] کی نرم اور پُراسرار شائستگی سے اس کا حسن بڑھ آ رہا تھا۔ ترچھا تھا اسی طرح اس کے دل اور اس کے حواس کی بھی جیسے انہیں ایک ایک کر کے کھلتی جا رہی تھیں۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ سیب کے درخت کی بھی ایک ٹہنی توڑی۔ شگوفوں میں وہی میگن کا حسن سمایا ہوا تھا۔ وہی [illegible] سب شبابی نکھار، وہی تازگی اور کھلے ہوئے پھولوں میں میگن کی سی سفید رنگت۔ وہی دل کو موم کر دینے والی دلفریبی جلوہ گر تھی۔ ٹہنی کو کوٹ میں لگایا۔ دل کے اندر جو بہار کھل رہی تھی۔ اس کا تمام زور جوشِ فتحمندی کے ایک گہرے سانس کے ساتھ ہونٹوں سے باہر نکلا لیکن خرگوش بدک کر بھاگ گئے۔

(۶)

اوڈیسی کی جلد آدھ گھنٹے سے ایشرسٹ کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن پڑھا ایک لفظ بھی نہ تھا۔ رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ کتاب رکھ دی اور احاطے میں سے ہو کر باغیچے میں پہنچ گیا۔ پہاڑی کے عقب سے سنہری رنگ کا چاند ابھی ابھی نکلا تھا اور ایک ایش کے درخت کی نیم برہنہ ٹہنیوں میں سے ایک [illegible] پُرجلال محافظ فرشتہ کی طرح جھانک رہا تھا۔ سیب کے پیڑوں کے نیچے ابھی اندھیرا تھا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ میں کہاں ہوں اور مجھے کس طرف جانا ہے۔ ناہموار گھاس کو پاؤں سے ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھا۔ اس کے پیچھے قریب ہی کسی تاریک چیز نے حرکت کی اور ڈکار لینے کی سی آواز آئی۔ تین بڑے بڑے سور دفعتاً چونکے اور ہل جل کر پھر ایک دوسرے کے پہلو میں دیوار کے نیچے لیٹ گئے۔ اس نے کان لگا کر سنا۔ ہوا بند تھی۔ لیکن راہ میں ندی کی سرگوشیاں اور مدھم سی دو چند سنائی دیتے تھے۔ ایک پرندہ (نہ معلوم کون سا) لگاتار پِپ۔ پِپ۔ پِپ کر رہا تھا اور کبھی کبھی نٹ جار کے اڑنے اور ایک الو کے بولنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ایشرسٹ ایک دو قدم آگے بڑھا اور پھر رک گیا۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ اس کے سر کے ارد گرد ایک دھندلی سی سفیدی چھائی ہوئی ہے جس میں زندگی دھڑک رہی ہے۔ ساکن اور سیاہ درختوں پر بے شمار کلیاں اور شگوفے جن کے نقش پھیلے ہوئے اور دھندلے سے دکھائی دے رہے تھے، بڑھتی ہوئی چاندنی کے طلسم سے زندہ ہو رہے تھے۔ اسے ایک عجیب احساس ہوا کہ وہ تنہا نہیں بلکہ رفیقوں کی صحبت میں ہے۔ گویا کئی لاکھ پروانے یا فرشتے کہیں سے اتر آئے ہیں اور تاریک آسمان اور تاریک تر زمین کے درمیان آ کر ٹھہر گئے ہیں اور اس کی آنکھوں کے برابر اپنے پر کھول رہے ہیں اور بند کر رہے ہیں۔ اس ہوش رُبا لمحے کے حسن سے مسحور ہو کر جس میں کوئی آواز کوئی خوشبو نہ آتی تھی، وہ یہ بھی بھول گیا کہ باغیچے میں کیوں آیا تھا۔ وہ حسنِ پرّاں جس سے یہ زمین دن بھر ملبوس رہی تھی۔ چاندنی اسے تحلیل نہ کر سکی، صرف اس کی وضع بدل ڈالی۔ جھاڑیوں اور شاخوں میں سے ہوتا ہوا جن پر وہ زندہ سفیدی سفوف کی طرح بکھری ہوئی تھی، آگے نکل گیا اور بڑے سیب کے درخت تک جا پہنچا۔ اندھیرے میں بھی وہ درخت باقی درختوں سے گھیر اور بلندی میں زیادہ، گویا کھلے میدان اور ندی کی طرف

جوں جوں ساعت بیتتا جاتا تھا گھنی ٹہنیوں کے نیچے پہنچ کر وہ رک گیا۔ اور کان لگا کر سننے لگا۔ دھیمی آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔ اور نیم خوابیدہ ستور دھیمی آواز میں ڈکرا رہے تھے۔ اس کے مس سے تنے کی کھردری کائی دار سطح میں سے ایک کائی کی سی خوشبو نکلی۔ کیا وہ آئے گی؟ کیا سچ مچ؟ تھرتھراتے ہوئے مہتاب درختوں کے درمیان اس کے دل پر ہر طرح کی بیتابی نے احاطہ کر لیا۔ یہاں کی کوئی شے بھی اس دنیا کی معلوم نہ ہوتی تھی۔ یقیناً یہ مقام فانی عاشقوں کے لئے ہے۔ ایشرسٹ اور دہقانی لڑکی کے لئے نہیں۔ صرف دیوتاؤں اور دیویوں کے لئے بنا ہے۔ اگر وہ ذاتی ذکی طبیعت کا ایک الٰہیانہ ملکی سا احساس نہ ہو گا؟ لیکن پھر بھی اس کے کان اس کی آہٹ سننے کے منتظر تھے۔ وہ نامعلوم پرند بدستور سپ سپ کر رہا تھا۔ ندی کا شور بدستور سنائی دے رہا تھا۔ اور درخت کی ٹہنیوں میں جو بس چاندنی کو جھلک رہا تھا۔ بلکہ کبھی ابر جو گزر رہے تھے معلوم ہوتا تھا ہر لحظہ زندہ تر ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کا پراسرار نقرئی حسن بھی ایشرسٹ کی بے تابی کا ایک جزو بنا جا رہا تھا۔ اس نے ایک ٹہنی جس پر ان شگوفے کھل رہے تھے، توڑ لی۔ کیا ان درختوں کے شگوفوں کو نرم۔ پاکیزہ۔ مقدس۔ ذی حیات شگوفوں کو توڑنا اور پھر پھینک دینا کیا یہ گناہ عظیم نہیں؟ یکلخت پھاٹک کے بند ہونے کی آواز آئی۔ سور پھر جاگ اٹھے اور ڈکرانے لگے۔ ایشرسٹ درخت کے ساتھ سہارا لگائے کھڑا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کائی دار تنے کو دبا رہے تھے۔ میگن کو دیکھ کر حیرت سے دم روک لیا۔ اس کی خاموش رفتاری ایک پری کی سی تھی جو درختوں کے بیچ میں پھر رہی ہو۔ جب قریب پہنچی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا تاریک جسم ایک چھوٹے سے درخت کا حصہ ہے۔ اس کا سفید چہرہ شگوفوں میں ایک شگوفہ ہے۔ وہ چپ چاپ ایشرسٹ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایشرسٹ نے دھیمی آواز میں کہا میگن! اور ہاتھ بڑھا دیئے وہ سیدھی دوڑ کر اس کے سینے سے آ لگی۔ جب اس کا دل اپنے دل کے ساتھ دھڑکتا ہوا محسوس کیا تو ایشرسٹ نے اپنے دل کو توقیر نسواں اور سوز عشق سے لبریز پایا۔ چونکہ وہ اس دنیا کی نہ تھی۔ نوجوان تھی۔ معصوم تھی۔ اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار تھی۔ عشق میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اور کسی طرح اپنی حفاظت نہ کر سکتی تھی۔ اس تاریکی میں اس کا محافظ نہ بنے تو اور کیا کرے؟ مگر چونکہ وہ ہمہ تن حسن اور سادگی تھی۔ اور زندہ شگوفوں کی طرح بہار کی اس رات کا ایک جزو تھی۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ وہ جو کچھ دے وہ سب کا سب قبول کر لے۔ اور اپنے دل کی بہار اور بہتے دل کی بہار دونوں کی تکمیل نہ کرے؟ یہ دو جذبے اپنی اپنی طرف اسے کھینچ رہے تھے۔ لڑکی کو زور سے سینے کے ساتھ لگا لیا اور اس کے بالوں کو بوسہ دیا۔ کچھ معلوم نہ تھا کہ کتنی دیر دونوں یونہی خاموش وہاں کھڑے رہے۔ ندی بڑبڑاتی رہی۔ الّو بولتے رہے چاند چپکے چپکے بلند اور سفید ہوتا گیا۔ ان کے ارد گرد شگوفے زندہ حسن کے دل کی دھڑکن سے اور بھی چمک اٹھے۔ ہونٹوں کے وصل نے گفتگو کے دروازے بند کر رکھے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گفتار کا یہاں کوئی کام نہیں۔ بہار صرف سرسراتی ہے۔ اور سرگوشیاں کرتی ہے۔ بہار بولتی نہیں۔ لیکن بہار کے کھلے ہوئے پھول پھوٹتی ہوئی کونپلیں۔ ندیوں کی مسکب پائی، ان کی خوش آہنگ والہانہ جستجو۔ یہ تقریر و گفتار سے کہیں بڑھ کر نہیں۔ اسی طرح بہار بعض اوقات زندہ بھی ہو جاتی ہے۔ اور ایک پراسرار ساحر کی طرح دو عاشقوں کے پاس کھڑی ہو کر ان دونوں کے گرد اپنی باہیں ڈال دیتی ہے۔ اپنی انگلیوں کے مس سے ان پر اپنا جادو پھیر دیتی ہے۔ اور پھر وہ ہونٹوں سے ہونٹ ملائے پھر اس دنیا کے سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ جب میگن کا دل اس کے دل کے ساتھ دھڑک رہا تھا۔ اور میگن کے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر پھڑک رہے تھے ایشرسٹ کے دل کو شیفتہ مسرت کے سوا اور کوئی احساس نہ تھا۔ قسمت میں یہی لکھا تھا کہ وہ اس کی آغوش کو زینت بخشے۔ عشق کا [illegible]

سکتا ہے؟ لیکن جب سانس لینے کو ان کے ہونٹ جدا ہوتے۔ تو دوئی فوراً حائل ہو تی۔ البتہ عشق کا جذبہ اب پہلے سے زیادہ مونہہ زور تھا۔ ایشرسٹ نے آہ بھر کر کہا۔

"او میگن۔ تم کیوں آئیں؟"

میگن نے نظر اٹھائی۔ کچھ حیران تھی، کچھ مجروح

"جناب آپ ہی نے بلایا تھا۔"

"میری جان مجھے جناب نہ کہو۔"

"تو پھر کیا کہوں؟"

"فرنیک۔"

"میں نہیں کر سکتی۔ ہرگز نہیں۔"

"تو کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں؟"

"دل پر میرا زور نہیں۔ میں ہمیشہ آپ کے پاس رہنا چاہتی ہوں اور بس۔"

"بس؟"

دھیمی آواز میں جو بمشکل سنائی دیتی تھی۔ میگن نے کہا

"آپ کے پاس نہ رہ سکی تو میں مر جاؤں گی۔"

ایشرسٹ نے ایک لمبا سانس لیا۔

"تو آؤ پھر میرے پاس آؤ۔"

"اوہ"

اس "اوہ" میں جو لذت اور مسرت تھی۔ اس سے ایشرسٹ پر ایک نشہ سا چھا گیا۔ دھیمی آواز میں بولا۔

"میں تمہیں لندن لے چلوں گا۔ میں تمہیں سب دنیا کی سیر کراؤں گا۔ اور میگن میں قسم کھاتا ہوں کہ میں ہر طرح تمہارا خیال رکھوں گا۔ کبھی تم سے درشتی کے ساتھ پیش نہ آؤں گا۔"

"اگر میں آپ کے پاس رہ سکوں تو یہی کافی ہے۔"

ایشرسٹ نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا

"کل میں ٹورکی جاؤں گا اور وہاں سے روپیہ لے کر تمہارے لئے کپڑے خرید دوں گا۔ ان کپڑوں میں لوگ خواہ مخواہ شبہ کریں گے۔ پھر ہم چپکے سے لندن چلے جائیں گے۔ اور وہاں پہنچ کر اگر تمہیں مجھ سے محبت ہوئی تو شادی کریں گے۔"

میگن کے بالوں کی تھرتھراہٹ سے اس کے سر کی جنبش کا پتہ چلتا تھا۔

"نہیں نہیں میں یہ نہیں کر سکتی۔ میں صرف آپ کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔"

اپنی دیوانگی سے خود ہی مسحور ہو کر ایشرسٹ نے کہا

"نہیں بلا میں تمہارے قابل نہیں۔ میگن تمہیں مجھ سے محبت کب پیدا ہوئی؟"

"جب میں نے آپ کو سڑک پر دیکھا اور آپ نے مجھ پر نگاہ ڈالی۔ پہلی ہی رات مجھے آپ سے محبت ہو گئی تھی۔ لیکن مجھے میرے وہم میں بھی نہ آیا تھا کہ آپ مجھے چاہیں گے۔"

یکلخت گھٹنوں کے بل جھک کر ایشرسٹ کے پاؤں چومنے لگی۔

ایشرسٹ کانپ اٹھا۔ فوراً اسکو اٹھا لیا۔ اور بھینچ کر گلے سے لگا لیا۔ بہت پریشان ہو گیا تھا۔ اس سے کچھ بولا نہ گیا۔ میگن نے کہا۔ "آپ مجھے چومنے کیوں نہیں دیتے؟"

"مجھے تمہارے پاؤں چومنے چاہئیں۔"

میگن کی مسکراہٹ سے ایشرسٹ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ چاندنی کی روشنی میں ایشرسٹ کے قریب میگن کے چہرے کی سفیدی اور اس کے کھلے ہوئے ہونٹوں کا ہلکا گلابی رنگ ان ہی سیب کے شگوفوں کا سا زندہ غیر ارضی حسن تھا۔

اور پھر یکلخت میگن نے آنکھیں پھاڑ کر دکھے ہوئے انداز میں سامنے دیکھا۔ کسمسا کر اس کی آغوش سے اپنا آپ چھڑایا اور بولی۔

"وہ دیکھو!"

ایشرسٹ کو روشن ندی، ہلکے سنہری رنگ کے چمکتے ہوئے بیچ کے درختوں اور ان کے پیچھے چاندنی میں اس پہاڑی کے سوا اور کچھ نظر نہ آیا۔ پیچھے سے اس کو میگن کی سہمی ہوئی آواز سنائی دی۔

"جپسی ہوا!"

"کہاں؟"

"وہ درختوں کے پیچھے۔ پتھر کے پاس۔"

ایشرسٹ نے برافروختہ ہو کر ندی کو پھاندا اور بیچ کے درختوں کی طرف چلا۔ چاندنی کا فریب ہے! کچھ بھی نہیں! اچھلتا اور تھارن کے درختوں کے بیچ میں بڑبڑاتا، اور لعنتیں بھیجتا ادھر ادھر بھاگتا اور ٹھوکریں کھاتا پھرا۔ واہیات! فضول! پھر سیب کے درخت کے پاس گیا لیکن وہ جا چکی تھی۔ اسے ایک سرسراہٹ، سؤروں کے ڈکرانے اور پھاٹک کے بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ وہ چلی گئی۔ صرف وہ پرانا سیب کا درخت وہاں رہ گیا۔ اس نے اپنی باہیں تنے کے گرد ڈال دیں۔ کہاں اس کا نرم جسم کہاں یہ سخت تنا! کھردری کائی اس کے چہرے کو چبھ رہی تھی۔ کہاں اس کا کھردراپن۔ کہاں اس کا نرم رخسار! صرف خوشبو۔ جنگل کی خوشبو کم و بیش ویسی تھی۔ اور اس کے اوپر اور اس کے ارد گرد شگوفے پہلے سے زیادہ زندہ۔ چاندنی میں پہلے سے زیادہ روشن۔ دمکتے اور سانس لیتے معلوم ہوتے تھے۔

(۷)

ٹورکی اسٹیشن پر ریل سے اتر کر ایشرسٹ نے سمندر کا رخ کیا اور ساحل کے ساتھ ساتھ رک رک کر ٹہلنے لگا۔ کیونکہ وہ

ایشرسٹ کو ساحلی بستی کی اس ملائمی ڈھنگ سے اچھی طرح واقف نہ تھا۔ اپنے لباس کا چنداں خیال نہ تھا۔ اس لئے اسے اس بات کا احساس نہ ہوا کہ یہاں کے باشندے اسے تعجب کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ ایک موٹی سی نارفوک جیکٹ، گرد آلود بوٹ اور [illegible] ٹوپی پہنے لمبے لمبے قدم اٹھائے چلا جا رہا تھا۔ اس بات سے مطلق بے خبر کہ لوگ اس بات کو حیرت سے تک رہے ہیں۔ اس کا بینک لندن میں تھا لیکن وہ اس تلاش میں تھا کہ یہاں اس کی کوئی شاخ موجود ہو تو وہیں سے روپیہ نکلوا لے۔ جب بینک میں پہنچا تو اس کے خوشگوار خیالات کو سخت دھچکا لگا۔ انھوں نے پوچھا آپ ٹورکی میں کسی کو جانتے ہیں؟ جواب ملا: نہیں۔ انھوں نے کہا کہ آپ لندن تار بھیج دیجئے۔ وہاں سے جواب آنے پر ہم بڑی خوشی سے روپیہ ادا کر دیں گے۔ نحوس کاروباری دنیا کے مشتبہ سانس نے اس کے درخشاں تصورات کو دھندلا کر دیا۔ لیکن تار اس نے بھیج دیا۔

ڈاکخانہ کے سامنے عورتوں کے ملبوسات کی ایک دکان نظر پڑی۔ اس نے کھڑکی میں لٹکے ہوئے کپڑوں کو انوکھے پن کے احساس کے ساتھ دیکھا۔ اپنی محبوبۂ دہقان کے لئے کپڑے خریدنا خاصا پریشان کن ثابت ہوا۔ دکان کے اندر گیا۔ ایک جوان عورت سامنے آئی۔ اس کی آنکھیں نیلی تھیں اور ماتھے پر خاصے تعجب کے آثار تھے۔ ایشرسٹ بغیر کچھ بولے اسے تکا کیا۔

"کہیے جناب؟"

"مجھے ایک نوجوان خاتون کے لئے لباس خریدنا ہے۔"

نوجوان عورت مسکرا دی۔ ایشرسٹ نے ماتھے پر تیوری ڈالی۔ یکلخت اور بڑے شدومد سے اس بات کا احساس ہوا کہ یہ فرمائش انوکھی فرمائش ہے۔

نوجوان عورت نے جلدی سے کہا

"کس قسم کا لباس چاہیئے آپ کو؟ بہت وضعدار؟"

"نہیں سیدھا سادا"

"یہ نوجوان خاتون کس قد کی ہیں؟"

"معلوم نہیں۔ بس تم سے دو انچ چھوٹی ہوں گی؟"

"کمر کا ناپ آپ مجھے بتا سکتے ہیں؟"

میگن کی کمر!

"بس یہی جو عام طور پر ہوتا ہے!"

"بہت خوب!"

جب وہ چلی گئی تو ایشرسٹ کھڑکی میں رکھے ہوئے لباسوں کو پریشان نظروں سے دیکھتا رہا۔ اور یکلخت اسے خیال پیدا ہوا کہ میگن ــــ اس کی میگن ــ سوائے کھردری پٹی کے سائے، کھردرے جامہ اور دہقانی ٹوپی کے یعنی سوائے ان کپڑوں کے جن میں اسے بارہا دیکھا تھا کسی اور لباس میں بہت ہی عجیب معلوم ہوگی۔ نوجوان عورت بازو پر بہت سے کپڑے ڈالے واپس آئی۔ اور ایک ایک لباس کو اپنے طرحدار جسم سے لگا کر دکھانے لگی۔ ان میں سے ایک کا فاختئی رنگ ایشرسٹ کو بہت پسند آیا

لیکن میگی کو یہ لباس پہنے ہوئے تصور نہ کر سکتا تھا۔ نوجوان عورت چلی گئی اور چند اور کپڑے اٹھا لائی لیکن ایشرسٹ کا دماغ سن ہو چکا تھا۔ کیا چیز اور کیونکر خریدے؟ ٹوپی اور جوتا اور دستانوں کی بھی ضرورت ہوگی اور فرض کرو سب کچھ خرید کر اسے پہنا دیا اور اس لباس نے اسے بالکل ہی بے رنگ بنا دیا جیسے اتوار کے کپڑے اکثر دہقانوں کو بنا دیتے ہیں۔ تو پھر کیا ہوگا؟ سفر میں بھی اپنے ہی کپڑے کیوں نہ پہنے؟ ہاں۔ لیکن ان کپڑوں میں وہ بہت نمایاں معلوم ہوگی۔ یہ ہنسی کھیل نہیں۔ غور و فکر کا معاملہ ہے۔ نوجوان عورت کو بے معنی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ کیا معلوم یہ سب کچھ تاڑ گئی ہو اور مجھے ایک بدمعاش شخص سمجھتی ہو۔ آخر کار بولا۔ "یہ فاختئی رنگ کا لباس علیٰحدہ رکھ دو۔ میں اس وقت فیصلہ نہیں کر سکتا۔ دوپہر کے بعد آؤں گا۔"

نوجوان عورت نے ایک آہ بھری۔

"بہت اچھا۔ بہت خوبصورت لباس ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو اس سے عمدہ لباس نہیں مل سکتا۔"

ایشرسٹ نے کہا "غالباً نہیں"۔ اور چل دیا۔

مشینی دنیا کے کاروباری پن سے ایک بار پھر آزاد ہو کر اس نے ایک لمبا سانس لیا۔ اور پھر اپنے تصورات میں مشغول ہو گیا۔ تصور میں اس بھولی بھالی پیاری لڑکی کو دیکھا جو اپنی زندگی اس کی زندگی کے ساتھ وابستہ کرنے کو تیار تھی۔ دیکھا کہ دونوں رات کے وقت چپکے سے باہر نکلے ہیں۔ چاندنی رات ہے۔ وہ جنگل میں جا رہے ہیں۔ اس کا بازو لڑکی کی کمر کے گرد ہے۔ لڑکی اپنے نئے کپڑے اٹھائے جا رہی ہے۔ علی الصباح وہ کسی دور دراز جنگل میں پہنچ گئے ہیں۔ لڑکی نے اپنے پرانے کپڑے اتار کر نئے کپڑے پہن لئے ہیں۔ اسٹیشن پر صبح کی گاڑی تیار کھڑی ہے جس میں سوار ہو کر وہ اپنے ہنی مون کے سفر پر روانہ ہو گئے ہیں اور پھر لندن نے انہیں نگل لیا ہے اور عشق کے خواب سچے ثابت ہو رہے ہیں۔

"فرینک ایشرسٹ! واللہ رگبی کے بعد تمہیں آج دیکھا ہے۔"

ایشرسٹ کے ماتھے کے شکن صاف ہو گئے۔ جو چہرہ اس کے قریب تھا اس کی آنکھیں نیلی تھیں اور بشرے پر آفتاب کی جھلک تھی۔ ایسے شخص کا چہرہ تھا جس کا آفتابِ دل آفتابِ فلک کے ساتھ مل کر اس کی زندگی کو درخشانی بخش رہا ہو۔

"ارے فل ہیلی ڈے!"

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"کچھ نہیں۔ یونہی گھوم رہا تھا۔ روپیہ لینے آیا تھا۔ میں جنگل میں رہتا ہوں۔"

"لنچ کے لئے کہیں جانا تو نہیں؟ آؤ ہمارے ساتھ لنچ کھاؤ۔ میرے ساتھ میری بہنیں بھی ہیں۔ انہیں خسرہ نکلا تھا۔"

ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے دونوں وہاں سے روانہ ہوئے اور ایک پہاڑی پر سے ہوتے ہوئے شہر سے باہر نکل گئے۔ ہیلی ڈے کا چہرہ آفتابی تھا تو آواز میں بھی بہجت اور تازگی اور خوش دلی پائی جاتی تھی۔ کہہ رہا تھا کہ یہاں اجاڑ مقام ہے تو سوائے نہانے اور کشتی چلانے کے اور کوئی شغل نہیں۔ ہوتے ہوتے مکانات کی ایک ہلالی قطار کے سامنے آکر ٹھہر گئے جو سمندر سے ذرا ہٹ کر واقع تھے۔ عین وسط میں ایک ہوٹل تھا۔ دونوں اندر داخل ہوئے۔

میرے کمرے میں آ کر منہ ہاتھ دھو لو۔ لنچ ابھی تیار ہوا چاہتا ہے۔"

ایشرسٹ نے اپنا چہرہ آئینے میں دیکھا۔ فارم ہاؤس میں پندرہ دن تک صرف ایک کنگھی اور دو قمیصوں پر گزارہ کیا تھا اور یہاں تو کئی کپڑے اور کئی برش رکھے تھے۔ سوچا عجیب بات ہے۔ انسان کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ ——— کا ہے کا احساس؟ یہ اسے ٹھیک معلوم نہ تھا۔

ہیلی ڈے کے ساتھ بیٹھنے کے کمرے میں جب گھسنے گیا تو تین ہنستے چہرے نظر آئے۔ رنگ بہت گورے، آنکھیں نیلی۔ ہیلی ڈے نے کہا۔ "یہ فرینک ایشرسٹ ہیں۔ یہ میری چھوٹی بہنیں ہیں۔" تینوں کے چہرے یکلخت دمک اٹھے۔

دو تو بہت ہی چھوٹی تھیں۔ ایک دس سال کی۔ ایک گیارہ سال کی لیکن تیسری کی عمر سترہ سال کے لگ بھگ تھی۔ قد لمبا، بال ہلکے رنگ کے۔ سرخ سفید رخسار جن کو سورج نے ذرا سنولا دیا تھا۔ بھنویں [illegible]۔ دائیں بائیں ذرا اٹھی ہوئی تھیں۔ اور ان کی رنگت سر کے بالوں سے قدرے گہری تھی۔ آوازیں تینوں کی ہیلی ڈے کی طرح بلند اور بشاش تھیں۔ تینوں سیدھی کھڑی ہو گئیں۔ جلدی جلدی ہاتھ ملایا۔ ایشرسٹ پر ایک متجسس نظر ڈال کر فوراً آنکھیں ہٹا لیں۔ اور سہ پہر کے مشاغل کے متعلق باتیں کرنے لگیں۔ ایک ڈائنا اور باقی دو اس کی داسیاں معلوم ہوتی تھیں۔ فارم کی زندگی کے بعد ان کی شوخ، پرجوش، بے تکلف گفتگو، ان کا پرسکون مہذب مگر بے تکلف انداز شائستگی پہلے تو انوکھا اور پھر اس قدر فطری معلوم ہوا کہ فارم ہاؤس کا ماحول یکلخت کسی دور دراز دنیا کا خواب معلوم ہونے لگا۔ چھوٹی بہنوں کا نام سبینا اور فریڈا اور بڑی کا نام اسٹیلا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد سبینا اس کی طرف متوجہ ہوئی اور بولی۔

"آپ ہمارے ساتھ مچھلیاں پکڑنے چلیں گے؟ بڑا لطف رہے گا۔"

اس غیر متوقع بے تکلفی پر متعجب ہو کر ایشرسٹ نے کہا۔

"مجھے تو آج سہ پہر واپس جانا ہے۔"

"اچھا؟"

"جانا ملتوی نہیں کر سکتے؟"

یہ سٹیلا کا فقرہ تھا۔ ایشرسٹ اس کی طرف مڑا اور سر ہلا کر مسکرا دیا۔ کیا حسن تھا۔ سبینا نے افسوس کے لہجے میں کہا "ملتوی کر دیجئے تو بہتر ہو۔" اس کے بعد پھر غاروں اور تیرنے کے متعلق باتیں ہونے لگیں۔

"آپ بہت دور تیر سکتے ہیں؟"

"تقریباً دو میل۔"

"سچ مچ؟"

"خوب"

"واقعی؟"

تینوں نے نیلی نیلی آنکھیں اس کے چہرہ پر گاڑ دی تھیں۔ ایشرسٹ کو اپنی اہمیت کا احساس ہوا۔ خوشگوار احساس۔ ہیلی ڈے نے کہا۔

"ایشرسٹ تمہیں ٹھہرنا پڑے گا۔ ہمارے ساتھ نہانے نہ چلو گے؟

"میں تو کہتا ہوں رات یہیں ٹھہر جاؤ۔"

"ہاں ضرور۔"

لیکن ایشرسٹ نے پھر مسکرا کر سر ہلا دیا۔ اور پھر یکلخت ہی لڑکیاں اس کے کھیلوں اور جسمانی کرتبوں کے متعلق دھڑا دھڑ اس سے سوالات پوچھنے لگیں۔ رفتہ رفتہ معلوم ہوا کہ وہ کالج میں کشتی بھی چلاتا رہا ہے۔ فٹ بال کی ٹیم میں شامل تھا اور ایک میل کی دوڑ میں اوّل بھی آیا تھا۔ لنچ ختم ہونے تک اس نے اپنی ان صفات کی بدولت لڑکیوں کے دل میں گھر کر لیا۔ چھوٹی لڑکیاں مصر ہوئیں کہ ہمارے ساتھ چل کر وہ غار دیکھئے۔ جہاں ہم کھیلنے جاتی ہیں۔ چنانچہ طوطوں کی طرح ٹائیں ٹائیں کرتی وہ ایشرسٹ کو ساتھ لے غار کی طرف روانہ ہو گئیں۔ پیچھے پیچھے سٹیلا اور اس کا بھائی تھا۔ غار دوسرے غاروں کی طرح سیلا ہوا اور تاریک تھا۔ خوبی اس میں صرف یہ تھی کہ اندر ایک پانی کا تالاب تھا جس میں سے کئی جانور پکڑ کر بوتلوں میں بند کئے جا سکتے تھے۔ سبینا اور فریڈا نے جن کی سڈول سانولی پنڈلیاں موزوں سے بے نیاز تھیں۔ تالاب کے بیچ میں کھڑے ہو کر ایشرسٹ کو شمولیت کی دعوت دی۔ تاکہ تینوں اکٹھے مچھلیاں پکڑیں۔ ایشرسٹ نے ٹوپی اور موزے اتار دیئے۔ جس کے دل میں احساسِ حسن ہو اسے وقت گذرتا معلوم نہیں ہوتا۔ دو خوبصورت بچے پانی میں کھیل رہے تھے۔ نوجوان ڈائنا کنارے پر کھڑی تھی۔ اور جو کچھ یہ تالاب میں سے نکالتے تھے اسے حیرت اور تعجب سے پکڑتی جاتی تھی۔ ایشرسٹ یوں بھی وقت کا اندازہ ٹھیک نہ لگا سکتا تھا جب گھڑی جیب سے نکالی تو حیران رہ گیا۔ تین کب کے بج چکے تھے۔ گویا بنک بند ہو گیا ہو گا اور روپیہ آج نہ مل سکے گا۔ اس کے بشرے کو دیکھ کر چھوٹی لڑکیاں چلانے لگیں۔

"آہا — اب تو آپ کو ٹھہرنا ہی ہو گا۔"

ایشرسٹ نے کچھ جواب نہ دیا۔ اسے میگن کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ ناشتہ کے وقت میگن سے دھیمی آواز میں کہا تھا۔ میری جان میں سامان خریدنے ٹورکی جا رہا ہوں آج شام واپس آ جاؤں گا۔ اگر موسم اچھا ہوا تو آج رات ہی چل دیں گے۔ تم تیار رہنا۔" اسے یاد آیا کہ میگن تھرتھرا اٹھی تھی اور اس کے الفاظ کو سن کر بہت خوش ہوئی تھی۔ وہ دل میں کیا کہے گی؟ پھر یکلخت احساس ہوا کہ تیسری لڑکی۔ لمبا قد۔ گورا رنگ۔ ڈائنا کا سا حسن۔ تالاب پر کھڑی تیز نیلی آنکھوں سے بغور اسے دیکھ رہی ہے۔ انھیں کیا معلوم کہ اس کے دل پر کیا گذر رہی ہے؟ انھیں کیا معلوم کہ آج رات کے لئے اس کے دل نے کیا ٹھان رکھا تھا؟ اگر انھیں معلوم ہو جائے تو وہ نفرت کا اظہار کر کے اسے تنہا غار میں چھوڑ کر خود چلے جائیں۔ اس خیال سے کچھ مایوسی ہوئی۔ کچھ شرم سی آئی۔ گھڑی کو جیب میں ڈال کر یکلخت بولا۔

"آہا — اب تو آپ ہمارے ساتھ ہی نہائیں گے۔؟"

یہ خوبصورت بچے کس قدر بے فکر تھے۔ سٹیلا مسکرا رہی تھی۔ ہیلی ڈے کہہ رہا تھا۔ "لطف آ گیا بس رات کے کپڑے

ں تمہیں دیدوں گا۔" اس تمام خوش دلی سے متاثر نہ ہونا ناممکن تھا۔ لیکن پھر بھی پشیمانی اور تمنا کے جذبات سے دل دھڑکنے لگا۔

داسی کے لہجے میں بولا۔

"مجھے ایک تار بھیجنا ہے۔"

تالاب کے کھیل سے اکتا گئے تو ہوٹل کو لوٹ آئے۔ ایشرسٹ نے مسز نیراکومب کے پتہ پر اس مضمون کا تار بھیجا۔ "افسوس ہے مجھے رات یہیں ٹھہرنا ہوگا۔ کل آؤں گا۔" اس سے دل کچھ ہلکا ہوگیا۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ ہلکی ہلکی گرمی جسم کو بہت اچھی معلوم ہوتی تھی۔ سمندر پرسکون اور نیلا نیلا تھا اور ایشرسٹ تیراکی کا شوقین۔ خوبصورت بچوں کی تعریف و توصیف سے اس کی نخوت کی تسکین ہوتی تھی۔ سٹیلا اور ہیلی ڈے کے بشاش چہرے کو دیکھ کر خوشی حاصل ہوتی تھی۔ گویا میگن کے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کرنے سے پہلے اپنی اصلی زندگی کو آخری نظر دیکھ رہا ہے۔ ہیلی ڈے سے غسل کا لباس مستعار لیا اور اکٹھے روانہ ہوئے۔ ہیلی ڈے اور ایشرسٹ نے ایک چٹان کی اوٹ میں کھڑے ہو کر کپڑے اتارے۔ سب سے پہلے ایشرسٹ پانی میں داخل ہوا اور اپنی زبانی اپنی جو تعریف ان کو سنا چکا تھا۔ اس کو سچ ثابت کرنے کے لئے جان بوجھ کر دلیرانہ تیر کر بہت دور نکل گیا۔ مڑ کر دیکھا تو ہیلی ڈے ساحل کے ساتھ ساتھ تیر رہا تھا۔ لڑکیاں پانی میں اچھل رہی تھیں، اور ڈبکیاں لگا رہی تھیں اور چھوٹی لہروں کے سامنے بھی اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیتی تھیں۔ ایشرسٹ عام طور پر ایسے نظارے کو حقارت کی نظر سے دیکھا کرتا تھا لیکن اس وقت لڑکیوں کی یہ کمزوری معقول اور دلکش معلوم ہوئی۔ کیونکہ اس کے مقابلے میں اس کا اپنا کمال بہت نمایاں معلوم ہوتا تھا جب ان کے قریب پہنچا تو سوچنے لگا میں ایک اجنبی ہوں۔ میری شرکت کہیں ان کو ناگوار نہ گزرے۔ اس نازک بدن دوشیزہ کے قریب جاتے ہوئے اسے شرم آتی تھی۔ لیکن سٹیلا نے اسے خود بلایا اور کہنے لگی مجھے تیرنا سکھا دیجئے۔ چھوٹی لڑکیوں نے اسے اس قدر مصروف رکھا کہ اسے یہ معلوم کرنے کا کہ اسٹیلا اس کے قرب سے مانوس ہو چکی ہے۔ یا نہیں۔ موقع ہی نہ ملا۔ یکلخت سٹیلا چونک کر پکاری۔ ایشرسٹ نے دیکھا تو سٹیلا مڑی اور نازک بازو پھیلا کے جسم ذرا آگے کو جھکائے کمر کمر تک پانی میں کھڑی ہے۔ اس کے چہرے پر دھوپ کی وجہ سے جھنجھنیں سی پڑ رہی ہیں اور وہ سہمی ہوئی ایک طرف کو اشارہ کر رہی ہے۔

"فل کو دیکھو! یہ کیا کر رہا ہے؟ ارے دیکھو!"

ایشرسٹ تاڑ گیا کہ فل خطرے میں ہے۔ وہ ایشرسٹ سے سو گز کے فاصلے پر تھا۔ اس کے پاؤں اکھڑ چکے تھے۔ اور وہ ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ یکلخت اس نے چیخ ماری۔ بازو اوپر کو اٹھے اور پانی میں ڈوب گیا۔ لڑکی اپنے بھائی کی طرف بڑھی۔ لیکن ایشرسٹ نے "واپس جاؤ سٹیلا" کہہ کر اسے روک دیا اور خود لپکا۔ عمر بھر اس قدر تیز کبھی نہ تیرا تھا۔ ہیلی ڈے دو سے زیادہ غوطے نہ کھانے پایا تھا کہ ایشرسٹ نے اسے پکڑ لیا۔ حادثے کی وجہ تشنج اعضا تھی۔ لیکن اسے بچانے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ کیونکہ اس نے مزاحمت نہ کی۔ آخر وہاں پہنچے جہاں ایشرسٹ لڑکی کو روک گیا تھا جب زمین پر پاؤں لگے تو لڑکی بھی آ گئی۔ فل کو اٹھایا اور ساحل پر لے گئے۔ ایشرسٹ اور اسٹیلا اس کے بازوؤں اور ٹانگوں کی مالش کرتے رہے چھوٹی لڑکیاں سہمی ہوئی پاس کھڑی رہیں۔ تھوڑی دیر میں ہیلی ڈے مسکرانے لگا۔ اور اس قدر تکلیف کا موجب ہونے پر ندامت کا اظہار کرنے لگا۔ ایشر سے بولا۔ "ذرا سہارا دو تو میں کپڑے بدل لوں۔" ایشرسٹ سہارا دینے لگا تو سٹیلا نے تر و خشک اور سرخ چہرے چمکا کر

برہم ہو چکا تھا۔ نظر بچی تو سوچنے لگا میں نے اسے سٹیلا کہہ کر بلایا تھا۔ اس نے برا تو نہیں مانا۔

کپڑے پہن رہے تھے تو ہیلی ڈے نے نیچی آواز میں کہا

"ایشرسٹ تم نے مجھے موت سے بچایا ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو؟"

کپڑے پہن چکے تو ہوٹل میں آئے۔ لیکن ابھی کچھ پریشان تھے۔ باقی لوگ تو چائے پی کر بیٹھ گئے۔ ہیلی ڈے کو لسا ملا مربہ اور روٹی کے ایک دو ٹکڑے کھا چکی تو سبینا بولی۔

"آپ نے تو بہت بہادری دکھائی۔"

اور فریڈا بولی۔

"آپ کمال کے آدمی ہیں۔"

ایشرسٹ نے دیکھا کہ اسٹیلا کی نظریں نیچی ہیں۔ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا اور وہاں سے اس نے سٹیلا کو دھیمی آواز میں کہتے سنا۔ آؤ خونی قسم کھائیں کہ ہم ہمیشہ دوست رہیں گے۔ فریڈا تمہارا چاقو کہاں ہے؟ کنکھیوں سے دیکھا کہ تینوں نے چاقو کی نوک اپنے جسم میں چبھا کر خون کا ایک ایک قطرہ نکالا ہے اور کاغذ کے ایک ورق پر کچھ لکھ رہی ہیں۔ وہ مڑ کر دروازے کی طرف چلا۔

"اب یوں نہ بنئے یہاں آئیے۔" چھوٹی لڑکیوں نے اسے بازو سے پکڑ لیا اور گھسیٹ کر میز تک لے آئیں میز پر وہ کاغذ پڑا تھا جس پر خون سے ایک انسان کی تصویر بنی تھی۔ اور خون ہی سے تین نام لکھے تھے سٹیلا ہیلی ڈے۔ سبینا ہیلی ڈے فریڈا ہیلی ڈے۔ کاغذ پر بہتے ہوئے لہو سے ایسی شکل بن گئی تھی۔ جیسے ایک ستارے کی شعاعیں ادھر ادھر پھیل رہی ہوں سبینا بولی

"یہ بیچ میں تم ہو۔ تمہیں معلوم ہے۔ اب تو ہم تمہیں چومیں گی۔"

اور فریڈا بولی۔ "ارے ہاں واقعی!"

ایشرسٹ کے لئے کوئی مفر نہ تھا۔ اس کے گیلے بال اس کی آنکھوں کے سامنے لٹک رہے تھے۔ کسی نے اس کی ناک کو جیسے کاٹ لیا۔ اس کے بائیں بازو پر کسی اور نے چٹکی بھری اور دانت اس کے رخسار پر آ لگے۔ اس کے بعد انہوں نے اس کو چھوڑ دیا۔ اور فریڈا بولی۔

"سٹیلا اب تمہاری باری ہے۔"

ایشرسٹ کا رنگ سرخ ہو رہا تھا۔ اس کا جسم اکڑا ہوا تھا میز کے اس طرف اسٹیلا کا بھی یہی حال تھا سبینا نے ایک طفلانہ قہقہہ لگایا اور فریڈا پکاری۔

"اب چلو بھی نہیں تو سب مزا کرکرا ہو جائے گا۔"

ایشرسٹ کے جسم میں ایک عجیب و غریب محجوب سے اشتیاق کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے نیچی آواز میں کہا۔

"بکو مت۔ بہت شریر لڑکیاں ہو تم۔"

سبینا پھر ہنس دی۔

"اچھا تو سٹیلا اپنے ہاتھ چومے اور تم اس کے ہاتھ کو لے کر اپنی ناک سے لگا لو۔ آپ کی ناک ہے بھی اس طرف اوپر کو اٹھی ہوئی۔"

سٹیلا نے سچ مچ اپنا ہاتھ چوم کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ایشرسٹ نے بڑی متانت کے ساتھ اس خنک نازک ہاتھ کو اپنے رخسار سے لگایا۔ چھوٹی لڑکیاں تالی بجانے لگیں۔ فریڈا بولی۔

"بس اب جب موقع آیا ہمیں آپ کی جان بچانی ہوگی" "میں چائے کا ایک اور پیالہ پی لوں سٹیلا؟ لیکن ایسی ہلکی پتلی سی چائے نہیں جیسے تم نے پہلے مجھے دی تھی؟"

چائے کا دور پھر چلنے لگا۔ ایشرسٹ نے وہ دستاویز تہ کر کے جیب میں رکھ لی۔ پھر خربوزوں پر، نارنگیوں پر، چھتے سے شہد کھانے پر اور اسکول نہ جانے کے فوائد پر گفتگو ہوتی رہی۔ ایشرسٹ چپکا سنتا رہا۔ صرف کبھی کبھی سٹیلا سے جس کے چہرے کی سرخ سفید رنگت پھر عود کر آئی تھی آنکھیں چار ہو جاتیں۔ اور نظروں ہی نظروں میں عہد رفاقت کا اعادہ ہوتا رہتا۔ ایک اجنبی کے ساتھ ان بشاش لوگوں کے مشفقانہ سلوک سے ایشرسٹ کے دل کو راحت ہوئی۔ ان کے ہنستے ہوئے چہروں سے ایشرسٹ آنکھیں نہ ہٹا سکتا۔ چائے کے بعد چھوٹی لڑکیاں تو سمندری کائی کو خشک کرنے کے شغل میں مصروف ہو گئیں۔ اور ایشرسٹ کھڑکی کے قریب جو نشست تھی اس پر بیٹھ کر سٹیلا سے باتیں کرتا رہا اور سٹیلا کی کھینچی ہوئی آبی رنگوں کی تصاویر کو دیکھتا رہا۔ اس پر ایک خوشگوار خواب کی سی کیفیت طاری تھی۔ وقت اور واقعے اور اہمیت اور حقیقت کا احساس معطل و معلق ہو گیا تھا۔ کل وہ پھر میگن کے پاس چلا جائے گا۔ اور اس لطف و مسرت کی کوئی نشانی اس کے پاس نہ ہوگی۔ بجز اس کاغذ کے جو ان بچوں کے خون سے رنگین تھا۔ بچے! سٹیلا تو عمر میں میگن کے برابر ہے۔ وہ بچہ کیونکر ہوئی؟ اس کی باتیں تیز تیز، قدرے خشک اور محجوب تاہم دوستی کے رنگ میں ڈوبی ہوئی۔ ایشرسٹ کی خاموشیوں میں کسی ساز کی آواز کی مانند گونج اٹھتی تھیں۔ سٹیلا کے انداز میں ایک خنکی، ایک دوشیزگی پائی جاتی تھی۔ جیسے کسی افسانے کی محبوبہ پھولوں کی جھونپڑی میں بیٹھی ہو۔ ہیلی ڈے کے پیٹ میں بہت سا کھاری پانی جا چکا تھا اس لئے وہ کھانے پر نہ آیا۔ کھانے کے دوران میں سبینا بولی۔

"میں تو آپ کو فرینک بلایا کروں گی۔"

اور فریڈا پکار اٹھی۔ "فرینک۔ فرینک۔ فرینکی۔"

ایشرسٹ نے مسکرا کر تعظیماً سر جھکا دیا۔

"جب کبھی سٹیلا آپ کو مسٹر ایشرسٹ کہہ کر بلائے اسے جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔ مسٹر ایشرسٹ کہنا کیا فضول معلوم ہوتا ہے۔"

ایشرسٹ نے سٹیلا کی طرف دیکھا جس کا رنگ حجاب سے سرخ ہو رہا تھا۔ سبینا ہنس دی۔ فریڈا بولی۔

"وہ دیکھو۔ وہ دیکھو شرما رہی ہے۔ اللہ رے شرم۔"

ایشرسٹ نے دائیں بائیں دونوں لڑکیوں کے سنہری بال پکڑ لئے۔ اور بولا۔

"دیکھو لڑکیو سٹیلا کو مت چھیڑو ورنہ میں تم دونوں کو باندھ دوں گا۔"

ریٹا بولی۔ "تم بہت وحشی ہو!"

دوسری نے محتاط بن کر کہا۔ "تم جو اسے سٹیلا بلاتے ہو۔"

"تو کیوں نہ بلاؤں؟ سٹیلا بہت اچھا نام ہے۔"

ایشرسٹ نے ان کے بال چھوڑ دیے۔ سٹیلا! اس گفتگو کے بعد وہ سمجھا تھا کہ کس نام سے پکارے گی! لیکن ا نام استعمال ہی نہ کیا۔ سونے کا وقت آیا تو ایشرسٹ نے عموماً کہا۔

"گڈ نائٹ سٹیلا!"

"گڈ نائٹ مسٹر گڈ نائٹ زبک! آج تم نے بہت ہی بہادری دکھائی!"

"اس کا ذکر مت کرو!"

سٹیلا کا مصافحہ سیدھا سادا مصافحہ تھا۔ لیکن لمحہ بھر کو اس نے ایشرسٹ کا ہاتھ زور سے دبایا۔ اور پھر یکلخت ا گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

ایشرسٹ خالی کمرے میں بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ صرف کل رات کا ذکر ہے کہ سیب کے پیڑوں اور زندہ شگو نیچے کھڑا میگن کو سینے سے چمٹائے اس کی آنکھوں اور ہونٹوں کو چوم رہا تھا۔ یہ بات کیا یاد آئی جیسے کسی طوفان کے تھپیڑے پاؤں اکھڑ گئے۔ وہ ہانپنے لگا۔ آج رات ایک نئی زندگی کا آغاز ہونا تھا۔ ایک ایسی لڑکی کے ساتھ جس کی تمنا صرف یہ تھی کہ کے ساتھ رہے۔ اور یہ سب کچھ ملتوی ہو گیا۔ جو بیس گھنٹے آگے جا پڑا۔ محض اس لئے کہ ——— اس نے اپنی گرو دیکھا تھا۔ ان معصوم بچوں سے تعلقات کیوں پیدا کر لئے۔ جبکہ خود معصومیت ہی کو خیرباد کہنے والا تھا! لیکن پھر سوچا میرا ارا اس سے شادی کرنے کا ہے۔ میں نے اسے کہہ بھی دیا تھا۔

روشن شمع ہاتھ میں لئے سونے کے کمرے کی طرف چلا۔ ہیلی ڈے کا کمرہ راستے میں پڑتا تھا۔ اس کے پاس سے گذر ہیلی ڈے اندر سے پکارا۔

"تم ہو! ایشرسٹ! اندر آجاؤ۔"

ہیلی ڈے بستر پر بیٹھا پائپ مونہہ میں لئے پڑھ رہا تھا۔

"بیٹھ جاؤ!"

ایشرسٹ کھلی ہوئی کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔

ہیلی ڈے یکلخت بول اٹھا۔ "تمہیں معلوم ہے آج دن بھر مجھے بار بار تمہارا ہی خیال آتا رہا۔ لوگ کہتے ہیں۔ جب ا ڈوبنے لگتا ہے تو گذشتہ زندگی آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے لیکن میرے معاملے میں ماضی کا بیشتر حصہ جوں کا توں مدفون ر میں موت سے ابھی بہت دور تھا۔"

"تو پھر تمہیں خیال کس بات کا آیا؟"

بجھانے سے پہلے تو کچھ۔ ہاں اور پھر بجھے گا۔

"عجیب بات ہے مجھے کیمبرج کی ایک لڑکی کا خیال آیا۔ جس سے میں ایک دفعہ ——— تقریباً ——— اب یہ نہیں کہ بتاؤں تم کو بھی کچھ نہ بتاؤں میں نے شکر کیا کہ اس کے بارے میں میرا ضمیر صاف تھا۔ بہرحال تمہاری بدولت میں زندہ ہوں۔ وہ اس وقت تاریک گہرے سمندر میں تو استراحت ہوتا۔ وہاں نہ بیتے کا یاد نہ شان سے جینے کو منانا۔ کچھ بھی نہ تھا۔ الشرسٹ جب ہم مر جاتے ہیں تو کیا ہوتا ہے؟"

الشرسٹ بولا۔

"ہم بوڑھی شمعوں کی طرح بجھ جاتے ہیں۔"

"واللہ!"

"شاید بجھنے سے پہلے تھوڑا بہت ٹمٹماتے ہوں۔"

"یہ تو بہت غم انگیز خیال ہے۔ بہرحال ——— میری بہنیں تو اچھی طرح پیش آئیں۔"

"بہت اچھی طرح۔"

بیلی ڈے نے اپنا پائپ ہٹا دیا اپنے ہاتھ گردن کے پیچھے ایک دوسرے پر رکھ لئے۔ اور کھڑکی کی طرف سر کو گھمایا۔

"بیچاری بڑی بہنیں۔"

بیلی ڈے بستر پر دراز تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی چہرے پر شمع کی روشنی پڑ رہی تھی۔ الشرسٹ نے اپنے دوست پر نظر ڈالی تو کپکپی سی جسم میں دوڑ گئی۔ اگر زندہ نہ ہوتا تو سمندر کی تہہ میں پڑا ہوتا۔ چہرے پر مسکراہٹ نہ ہوتی اور یہ بشاشت ہمیشہ کے لئے غائب ہو جاتی۔ شاید لاش بھی نہ ملتا۔ ریت ہی میں دفن ہو گیا ہوتا اور حشر کے لئے روزِ دین کا ہی منتظر رہتا۔ دفعتاً الشرسٹ کی مسکراہٹ عجیب و غریب چیز معلوم ہونے لگی۔ یہی زندگی کا شعلہ ہے یہی سب کچھ ہے اٹھ کھڑا ہوا اور دھیمی آواز میں بولا۔

"میرے خیال میں تمہیں سو جانا چاہیئے۔ شمع بجھا دوں؟"

بیلی ڈے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"تم جانتے ہو جو کچھ میرے دل میں ہے وہ ادا نہیں کر سکتا۔ موت بہت بڑی چیز ہے گڈ نائٹ الشرسٹ۔"

الشرسٹ کا دل بھر آیا۔ بیلی ڈے کے ہاتھ کو دبا کر نچلی منزل میں آگیا۔ ہال کا دروازہ ابھی کھلا تھا۔ اس میں سے گزر کر مکانوں کی قطار کے سامنے جو چمن تھا۔ وہاں جا بیٹھا۔ آسمان کا رنگ گہرا نیلا تھا تارے جھک رہے تھے اور ان کی روشنی میں املک کے پھولوں کی رنگت کہیں کہیں ایسی پراسرار دکھائی دیتی تھی جیسی رات کے وقت اکثر پھولوں کی دکھائی دیتی ہے۔ اور جس کا بیان کرنا ناممکن ہے۔ الشرسٹ نے اپنا رخسار ایک ٹہنی پر رکھ دیا۔ آنکھیں بند کیں تو ایک کتے کے بچے کو سینے سے چمٹائے سامنے لڑکی دکھائی دی۔ "مجھے کیمبرج کی ایک لڑکی کا خیال آیا۔ جس سے ایک دفعہ ——— تقریباً ——— میں نے شکر کیا کہ اس کے بارے میں میرا ضمیر صاف تھا۔" یکلخت سر کو املک کی شاخ سے ہٹا لیا۔ اور گھاس پر ٹہلنے لگا۔ دونوں سروں کے پودے عجیب مدہوش تھے۔ ان کی اوٹ میں تصور لوٹ کر پھر زندہ ہو گیا۔ الشرسٹ اس کے ساتھ شگوفوں کی زندہ سانس لیتی ہوئی سفیدی کے نیچے کھڑا تھا اور زندگی بخش جھلملا رہی تھی چاندنی کی نیلاہٹ تالاب کے پانی پر جھک رہی تھی۔ وہ اوپر کو اٹھا ہوا چہرہ۔ اس پر معصومیت اور عشق نیاز مندی کی جھلک وہ آگ

نگاہ پڑی تو اسے پورے ساحل کا نظارات کا وہ حسن، اور دل کی وہ دھڑکن سب کچھ یاد آ گیا۔ وانگ کے ساتھ میں بکھرا ہوا۔ یہاں رہ وقت ندی کی آواز نہ تھی۔ یہاں سمندر کا شور تھا۔ وہ سمندر سر پٹک رہا تھا۔ اور آہیں بھر رہا تھا۔ کوئی نغمہ نہ تھا۔ کوئی گیت۔ کوئی ناٹک بولتا ناچتا تھا۔ ان کی بجائے پیانو کی آواز آ رہی تھی۔ اور سفید مکانات نے آسمان کو جیسے قینچی سے کتر دیا تھا۔ اور وانگ کی خوشبو معدوم تھی۔ کسی اونچی منزل میں ہوٹل کی ایک کھڑکی میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ پردے کے سامنے ایک سایہ حرکت کرتا ہوا دکھائی دیا۔ دل میں عجیب و غریب احساسات نے شورش بپا کر دی۔ جیسے کوئی ایک ہی جذبہ پیچ و تاب کھا رہا ہو۔ گھلا جا رہا ہو۔ پیہم جیسے پیار اور عشق پریشانی کے عالم میں ٹکریں مار رہے ہوں۔ رستہ ڈھونڈ رہے ہوں۔ انھیں رستہ مل گیا ہو۔ یہ لڑکی جس نے زینگ کہہ کر پکارا تھا۔ جس کے ہاتھ نے اس کے ہاتھ کو دفعتاً بھینچ لیا تھا۔ یہ شائستہ اور پاکیزہ لڑکی اس کے برعکس۔ جو فرطِ عشق کا حال سن لے تو کیا کہے۔ وہ مکان کی طرف پیٹھ موڑے گوتم بدھ کے مجسمے کی طرح بے حس و حرکت آلتی پالتی مارا بیٹھ گیا۔ کیا واقعی اس کا یہ ارادہ تھا کہ جنگلی پھول کی خوشبو سونگھ لے۔ اور ــــ شاید ــــ پھر اسے پھینک دے! ایسی لڑکی تھی جس سے میں ایک دفعہ تم خود ہی سمجھ لو۔ دونوں ہتھیلیاں دائیں بائیں گھاس پر رکھ کر دبا دیں۔ ابھی گھاس میں گرمی باقی تھی۔ ابھی اس میں نمی آئی تھی۔ ابھی اس کا سہارا لے سکتا تھا۔ اپنے آپ سے پوچھا "میں کیا کروں؟" شاید میگن پاس کھڑی شگوفوں کو دیکھ رہی ہے۔ اور اس کے خیال میں محو ہے! بیچاری میگن! پھر خیال آیا۔ "کیا سچ ہے؟ کہ میں اسے چاہتا ہوں! لیکن ــــ لیکن۔ کیا مجھے اس سے واقعی محبت ہے؟ یا صرف اس کو اس لئے چاہتا ہوں کہ وہ خوبصورت ہے اور محبت کرتی ہے؟ میں کیا کروں؟" پیانو کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ تارے جگمگا رہے تھے۔ ایشرسٹ مبہوت ہو کر ان کو تکتا رہا۔ آخر اٹھا۔ اعضا جیسے جڑ گئے تھے۔ اور جسم کو خنکی محسوس ہو رہی تھی۔ کھڑکی میں اب روشنی نظر نہ آتی تھی۔ جا کر سو رہا۔

(۸)

ایشرسٹ گہری نیند سو رہا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی اور آنکھ کھل گئی۔ پھر کوئی کرخت آواز میں پکارا

"اٹھو بھائی ناشتہ تیار ہے!"

ایشرسٹ یکلخت اٹھ بیٹھا۔ میں کہاں ہوں ــــ ہاں ہاں یاد آ گیا!

باقی لوگ مربہ کھا رہے تھے۔ سٹیلا اور سبینا کے درمیان ایک نشست خالی تھی۔ ایشرسٹ اس پر جا بیٹھا۔ سبینا اسے بغور دیکھتی رہی۔ اور پھر بولی۔

"ذرا جلدی کیجئے ساڑھے نو بجے یہاں سے چلنا ہے!"

"ایشرسٹ ہم بیری ہیڈ کو جا رہے ہیں۔ تمہیں بھی چلنا ہوگا!"

ایشرسٹ نے سوچا۔ "میں ان کے ساتھ جاؤں ناممکن! مجھے تو چیزیں لے کر واپس جانا ہے۔" اس نے سٹیلا کی طرف دیکھا۔ سبینا نے بڑی جلدی سے کہا

"ضرور چلئے!"

— سینا بولی۔

"آپ کے بغیر کیا خاک لطف آئے گا؟"

زینا اٹھ کر کرسی کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔

"آپ چلے نہیں تو میں آپ کے بال کھینچوں گی۔"

الشرسٹ نے سوچا۔ "ایک دن اور سہی۔ اس میں کچھ غور بھی کر لوں گا ایک دن اور!" اور پھر بولا۔

"اچھا اچھا میں چلتا ہوں۔ میری ایال کھینچنے کی ضرورت نہیں۔"

"ہُرّا!"

اسٹیشن پر پہنچ کر اس نے ایک تار اور بھیجنے کا ارادہ کیا لیکن لکھ کر پھاڑ ڈالا۔ انھیں کیا بتاتے کہ کیوں نہیں آ سکتا پھر سے ایک چھوٹی سی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ الشرسٹ سینا اور زینا کے بیچ میں چپکا ہوا بیٹھا تھا گھٹنے سٹیلا کے گھٹنوں سے جا لگے تھے۔ راستے میں "اپ جینکنز" کا کھیل کھیلتے رہے۔ دل بہل گیا۔ سوچا تو یہ تھا کہ ایک دن مزید غور کرنے میں صرف کروں گا۔ لیکن اب غور کرنے کو دل ہی نہ چاہتا تھا۔ دن بھر دوڑتے رہے کشتی لڑتے رہے۔ گھٹنے گھٹنے پانی میں بھاگے پھرے۔ نہانے کو کسی کا دل نہ چاہتا تھا) گیت گاتے رہے کھیل کھیلتے رہے۔ اور جس قدر سامان خورد و نوش ساتھ لائے تھے سب چٹ کر گئے۔ واپسی میں چھوٹی لڑکیاں الشرسٹ کے کندھے سے سر رکھ کر سو گئیں۔ الشرسٹ کے گھٹنے سٹیلا کے گھٹنوں سے چھو رہے تھے۔ یقین نہ آتا تھا کہ تیس گھنٹے پہلے وہ ان تین لڑکیوں میں سے (ان کے بال کس قدر ملائم تھے) کسی کو جانتا تک نہ تھا۔ ریل میں وہ سٹیلا سے شاعری کے متعلق تبادلہ خیالات کرتا رہا۔ سٹیلا نے الشرسٹ کو اور الشرسٹ نے سٹیلا کو (مگر ایک خوشگوار احساس برتری کے ساتھ) اپنی اپنی پسند کے شعراء کے نام بتائے یکلخت لڑکی نے دھیمی آواز میں کہا۔

"فل کہتا ہے۔ آپ حیات بعد الموت کے قائل نہیں۔ یہ تو بہت بری بات ہے زینک!"

الشرسٹ نے پریشان ہو کر کہا

"نہ قائل ہوں نہ منکر۔ میرا عقیدہ تو صرف یہ ہے کہ ہم حیات بعد الموت کے متعلق کچھ جانتے ہی نہیں۔"

لڑکی نے جلدی سے کہا

"میرا تو یہ عقیدہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ زندگی کا بھلا پھر فائدہ ہی کیا؟"

ان خوبصورت ابروؤں کے شکنوں پر نگاہ ڈالتے ہوئے الشرسٹ نے جواب دیا۔

"یہ کیا کہ جس چیز کے وجود کی تمنا ہو اس کے وجود پر انسان ایمان ہی لے آئے۔"

"لیکن اگر اس کے بعد اور کوئی زندگی نہیں تو انسان کو دوبارہ زندہ ہونے کی تمنا ہی کیوں ہوتی ہے؟"

یہ کہا اور نظر بھر کر الشرسٹ کی طرف دیکھنے لگی۔

الشرسٹ اس کے جذبات کو مجروح تو نہ کرنا چاہتا تھا لیکن برتری کی خواہش غالب آ گئی۔ بولا۔

"جب تک انسان زندہ ہے اس وقت تک اس زندگی کو دائمی بنانے کا آرزو مند رہتا ہے۔ یہ آرزو خود زندگی کا

جو ہے۔ مگر اس سے زیادہ اور کچھ نہیں:

"تو کیا تم انجیل کو نہیں مانتے؟"

ایلشرسٹ نے سوچا اسے ضرور اس سے صدمہ ہو گا۔ بولا۔

"یسوع مسیح نے پہاڑی پر جو وعظ سنایا تھا۔ میں اس کو مانتا ہوں کیونکہ وہ بہت دلکش ہے۔ اس کے اثرات ہمیشہ باقی رہیں گے:"

"لیکن کیا تم یسوع مسیح کو خدا کا جز نہیں سمجھتے؟"

ایلشرسٹ نے سر ہلا دیا۔

لڑکی نے اپنا چہرہ جلدی سے کھڑکی کی طرف موڑ لیا۔ ایلشرسٹ کو یکلخت میگن کی دعا یاد آئی "خدایا ہم سب پر اپنا فضل کر اور مسٹر ایلشرسٹ پر بھی!" اور کون ایسا ہو گا جو اس لڑکی کی طرح یوں اس کے لئے دعا مانگے۔ اس لڑکی کی طرح جو اس وقت خود منتظر ہو گی اور سڑک پر کھڑی اس کی راہ تک رہی ہو گی۔ دل نے کہا۔ "تم کس قدر ذلیل ہو!"

یہ خیال بار بار دل میں اٹھتا رہا لیکن اس کی چبھن رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی (اکثر یہی ہوتا ہے) حتیٰ کہ ذلیل بننا نہایت معمولی بات معلوم ہونے لگی اور نہ تعجب کی بات ہے۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ واپس میگن کے پاس چلے جانا۔ ذلیل بات ہے یا اس سے ملنے کا خیال ترک کر دینا۔

شام کے وقت سب مل کر تاش کھیلتے رہے۔ اور جب بچوں کے سونے کا وقت آ پہنچا اور وہ چلے گئے تو سٹیلا پیانو پر جا بیٹھی۔ ایلشرسٹ کھڑکی کے باہر اندھیرے میں بیٹھا شمعوں کے بیچ میں سے سٹیلا کو دیکھتا رہا (اس کے بال ہلکے رنگ کے اور ان کے پیچھے وہ لمبی گوری گردن جو ہاتھوں کی حرکت کے ساتھ ساتھ خم کھاتی تھی!)

سٹیلا کے پیانو بجانے میں کوئی خاص رنگینی نہیں تھی۔ لیکن بلا تکلف بجاتی تھی۔ ایلشرسٹ کو وہ ایک دلکش مورت معلوم ہو رہی تھی۔ جس کے ارد گرد ہلکے نیلے رنگ کا نور جھلملاتا تھا گویا انسان نہیں فرشتہ ہے۔ اس لڑکی کی موجودگی میں جس کا لباس سفید جس کا سر فرشتوں جیسا اور جس کا جسم موسیقی کے ساتھ لچک رہا تھا کس کی جرأت ہے کہ بے عنان خواہشات یا گمراہ خیالات کا دل میں گذر بھی ہونے دے۔ وہ شومان کا ایک گیت بجا رہی تھی جس کا نام "وارم" تھا! اس کے بعد ہیلی ڈے نے اپنی بانسری نکالی۔ اور طلسم ٹوٹ گیا۔ پھر انہوں نے ایلشرسٹ کا گانا سنا۔ اور سٹیلا شومان کی گیتوں کی ایک کتاب کو سامنے رکھ کر اس کے ساتھ پیانو بجاتی رہی۔ "ایخ گرول نخت" کا گیت ابھی ختم نہ ہونے پایا تھا کہ چھوٹی لڑکیوں نے (جو نیلے رنگ کے ڈریسنگ گاؤن پہنے تھیں) دبے پاؤں کمرے میں داخل ہو کر پیانو کے پیچھے چھپنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ اس کے بعد کھلبلی مچ گئی اور بقول سبینا کے "بڑا مزہ آیا!"

اس رات ایلشرسٹ کو نیند نہ آئی۔ اس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات چکر لگا رہے تھے اور وہ بے چینی کے عالم میں کروٹیں بدلتا رہا۔ دو دن کے اندر اندر ان لوگوں سے اس قدر ربط پیدا ہو گیا تھا۔ ان کی بے تکلفی اور اپنائیت نے اس کے طبع پر اس قدر تسلط حاصل کر لیا تھا کہ فارم اور میگن ــــ خود میگن! خواب و خیال ہو گئی۔ کیا سچ مچ اس سے اظہار عشق کیا تھا؟ کیا سچ مچ

[illegible] جانے کا اور اس کے ساتھ رہنے کا وعدہ کیا تھا؟ جیسے جیسے وہ مسرور ہو گیا تھا۔ اس پر جادو چل گیا۔ بیدار کا۔ بات کا عیب [illegible] کا؟ اس کو۔ اس کمسن بچی کو جس کی عمر ابھی اٹھارہ سال بھی نہ ہونے پائی تھی۔ اپنی داشتہ بنانا۔ اس خیال کے آتے ہی ایشرسٹ کو اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔ لیکن پھر بھی جسم میں گرمی اور خون میں تیزی پیدا ہو گئی۔ دل نے کہا۔ "میں نے بہت برا کیا۔ میں نے بہت برا کیا۔" خزاں کی موسیقی اس کے پریشان خیالات کے ساتھ مل کر اس کے دل کے اندر جیسے دھڑکنے لگی۔ اسے تصور میں سٹیلا کا چہرہ نظر آیا۔ پرسکون۔ سنہری ہلکے رنگ کے بال۔ چہرہ اور گردن اور گرد فرشتوں کا سا ہالہ۔ اس نے سوچا میرے حواس قائم نہ تھے۔ میں دیوانہ تھا۔ مجھے کیا ہو گیا تھا؟ بدنصیب میگن! "خدایا ہم سب پر اپنا فضل کر اور مسٹر ایشرسٹ پر بھی!" "میں صرف آپ کے پاس رہنا چاہتی ہوں!" اور اس نے چہرہ تکیے میں ڈھانپ لیا۔ ہچکی بندھ چلی تھی۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھالا واپس چلا جائے تو مصیبت۔ نہ جائے تو اور بھی آفت!

جوان آدمی اگر اپنے دل کی بھڑاس نکال لے تو اس کی بے چینی مٹ جاتی ہے۔ ایشرسٹ کی آنکھ لگ گئی جب نیند آنے لگی تھی تو سوچ رہا تھا۔ "آخر کیا ہوا۔ چند لمحے ـــ مہینے بھر میں بھول جائیں گے۔"

اگلے دن صبح کے وقت اس نے چیک کے روپے وصول کئے لیکن کپڑوں کی دکان کے پاس بھی نہ پھٹکا۔ اس فاختئی رنگ کے لباس کے بجائے اپنی ضرورت کی چند چیزیں خرید لیں۔ دن بھر اس کے دل کی عجیب حالت رہی۔ جیسے اپنے آپ سے روٹھا ہوا ہے۔ دو دن سے دل میں امنگیں اٹھ رہی تھیں۔ لیکن اب جذبات سے یکسر خالی تھا جیسے آنسوؤں کے طوفان سے دل کے شعلے سب بجھ گئے ہوں۔ چائے کے بعد سٹیلا نے ایک کتاب اس کے پاس رکھ دی اور کچھ شرما کر بولی۔

"فرینک تم نے یہ کتاب پڑھی ہے؟"

فیرو کی "سوانح یسوع" ایشرسٹ مسکرا دیا۔ سٹیلا اس کے عقائد کے متعلق کس قدر فکرمند ہے۔ اسے کچھ ہنسی آئی۔ کچھ پیار آیا۔ اپنی طبیعت کو بھی گدگدی ہوتی کہ اسے اپنا ہم عقیدہ بنانے کی کوشش کرے یا کم از کم ان کے عقائد کی حمایت میں کچھ کہے۔ شام کے وقت چھوٹی لڑکیاں اور بیلی ڈے اپنے اپنے جال کی مرمت کر رہے تھے۔ ایشرسٹ سٹیلا سے مخاطب ہوا۔

"مذہب انعام اور صلے کا لالچ دلاتا ہے کہ نیک زندگی بسر کی تو یہ کچھ ملے گا۔ گویا انعام کے لئے ہی بھیک مانگتا ہے یہ رجا درحقیقت بیم سے پیدا ہوتا ہے۔"

وہ موڑھے پر بیٹھی رسی کے ایک ٹکڑے پر گانٹھیں دے رہی تھی۔ اس نے یکلخت نگاہ دوڑائی۔

"نہیں۔ اس کی وجہ اور ہے اور اس سے کہیں گہری ہے۔"

ایشرسٹ کے دل میں پھر وہی تحکم کی خواہش پیدا ہوئی اور بولا۔

"کیا واقعی آپ کا یہ خیال ہے۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کسی بات کی وجہ دریافت کرنے کی خواہش ہی سب سے زیادہ عمیق ہے اور اس کی تہ کو پہنچنا بہت مشکل ہے۔"

سٹیلا نے ماتھے پر تیوری ڈال لی۔

"میں نہیں سمجھی۔"

ایشرسٹ اپنی ہٹ پر قائم رہا اور بولا۔

" ذرا غور کیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آخرت کے معتقد بیشتر وہی لوگ ہوتے ہیں جو یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کی تمام خواہشات اس دنیا میں پوری نہیں ہو سکتیں۔ برعکس اس کے میں نیکی کا قائل اس لئے ہوں کہ نیکی ایک اچھی چیز ہے۔"

" تو آپ نیکی کے قائل تو ہیں"؟

وہ کتنی خوبصورت معلوم ہوتی تھی اور اس کی صحبت میں نیکی کس قدر سہل! ایشرسٹ نے [illegible] میں سر ہلایا اور بولا۔

" اس طرح کی گرہیں لگانا مجھے بھی سکھا دو"۔

جب گرہیں لگا رہے تھے تو اسے راحت ملی تھی۔ سونے کو چلا تو بالارادہ اسی کے متعلق سوچتا رہا۔ اس کے درخشاں، پرسکون، خواہرانہ تصور کے انوار سے اپنا آپ یوں ڈھانپ لیا جیسے اس ملبوس میں اب اسے کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا۔

اگلے دن معلوم ہوا کہ اگلے دن وہ لوگ ریل میں سوار ہو کر ٹوٹنس جانا چاہتے ہیں۔ اور بیری پومرائے کاسل کے مقام پر پکنک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ ماضی کو دل سے محو کر دینے کا جو مصمم ارادہ کر چکا تھا اس نے اسے پختہ کیا اور گھوڑا گاڑی کی طرف پیٹھ کر کے ہیلی ڈے کے ساتھ لینڈو میں بیٹھ گیا۔ سمندر کے ساحل کے کنارے ساتھ چلے جا رہے تھے اور اسٹیشن کی طرف مڑنے ہی کو تھے کہ ایشرسٹ کا دل دھک سے رہ گیا۔ میگن ـــــ خود میگن! ـــــ پیدل پگڈنڈی پر چلی جا رہی تھی۔ وہی پھٹا پرانا سایہ اس نے پہن رکھا تھا۔ وہی جیکٹ۔ وہی ٹوپی اور راہ گیروں کے چہروں کا جائزہ لے رہی تھی۔ کچھ سوچے سمجھے بغیر ایشرسٹ نے یکلخت ہاتھ اٹھا کر چہرہ ڈھانپ لیا۔ اور ظاہر یہ کیا گویا آنکھ میں سے مٹی کا کوئی ذرہ نکال رہا ہے۔ لیکن انگلیوں کے بیچ میں سے میگن پھر بھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی چال میں دہقانوں کی سی بے تکلفی نہ تھی۔ برعکس اس کے وہ کھوئی کھوئی سی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے قدم متامل تھے۔ اور اس کی حالت رحم کی طالب۔ جیسے کوئی کتا اپنے آقا سے جدا ہو گیا ہو۔ اور یہ نہ جانتا ہو کہ سیدھا دوڑتا چلا جائے۔ یا واپس پلٹ جائے اور جائے تو کہاں! یہ یہاں کیسے آ گئی! بہانہ کیا بنایا ہوگا! یہ کس امید میں پھر رہی تھی گاڑی کے پہیے گھومتے چلے گئے اور وہ میگن سے دور تر ہوتا گیا۔ لیکن اس کا دل اس پر لعنت بھیج رہا تھا اور چیخیں مار مار کر اس سے کہہ رہا تھا کہ ٹھہر جاؤ۔ گاڑی سے اتر جاؤ۔ اس کے پاس جاؤ۔ جب گاڑی اسٹیشن کی طرف مڑی تو ایشرسٹ سیدھا ہو گیا۔ دروازہ کھول کر بولا۔ " میں کچھ بھول آیا ہوں۔ تم چلو۔ میرا انتظار نہ کرو۔ میں اگلی گاڑی سے آؤں گا۔ اور تمہیں کاسل ہی میں آ ملوں گا۔" یہ کہہ کر گاڑی سے کود پڑا۔ ٹھوکر کھائی۔ گھوم گیا۔ پھر سنبھلا اور چل پڑا۔ ہیلی ڈے اور اس کی بہنیں حیران تھیں کہ یہ کیا ہو گیا۔ لیکن ان کی گاڑی آگے نکل گئی۔

موڑ سے اسے میگن بہت دور دکھائی دے رہی تھی۔ ایشرسٹ چند قدم دوڑا۔ پھر رک گیا۔ اور آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ جوں جوں میگن کے قریب تر اور ہیلی ڈے اور اس کی بہنوں سے دور تر ہوتا گیا۔ قدم ڈھیلے پڑتے گئے۔ اسے دیکھ لیا تو پھر کیا ہوا! کیا فرق پڑ گیا؟! اس سے جو ملاقات ہوگی اور اس ملاقات کا جو نتیجہ ہوگا۔ اس کی کراہت کو کیونکر کم کرے۔ اچھی طرح جان چکا تھا کہ ہیلی ڈے کی بہنوں سے ملنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچ چکا ہے کہ میگن سے شادی کرنا نہیں چاہتا۔ چند دن اس سے عشق کرے گا۔ تکلیف میں رہے گا۔ پچھتائے گا اور پھر اکتا جائے گا۔ محض اس لئے کہ وہ اپنا سب کچھ دے ڈالے گی۔ اس لئے کہ وہ

سادہ لوح ہے۔ بھولی ہے شبنم آلود ہے۔ لیکن شبنم جلد خشک ہو جاتی ہے۔ اس کی ٹوپی جو دور سے پھیکے رنگ کا ایک دھبہ سا معلوم ہوتی تھی، ہجوم میں نظر آ رہی تھی جس سے میگن کی مسلسل حرکات کا پتہ چلتا تھا۔ وہ ہر چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ ہر لڑکی پر نگاہ ڈالتی تھی کیا کسی مرد کو اس سے بھی زیادہ دکھ کا لمحہ نصیب ہوا ہوگا! جی ارادہ کرتا تھا دل اسی پر جست کرتا تھا۔ اور اپنا آپ ذلیل معلوم ہوتا تھا مدد کی ایک ہلکی سی چیخ اس کے منہ سے نکلی جسے سن کر ایک راہ گیر عورت مڑ کر اس کا منہ تکنے لگی۔ سامنے دیکھا تو میگن ساحل سمندر کے پاس جو دیوار کھڑی تھی اس کے ساتھ سہارا لیے کھڑی ٹھہر گئی۔ اور سمندر کی طرف دیکھتی رہی۔ ایشرسٹ بھی رک گیا شاید میگن نے سمندر اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اس اضطراب کی حالت میں بھی وہ اس نظارے سے باز نہیں رہ سکی۔ ایشرسٹ نے سوچا اس بے چاری نے ابھی کچھ نہیں دیکھا۔ اس کا مستقبل ابھی نہ جانے کن کن نعمتوں کا سرمایہ دار ہے۔ چند ہفتوں کے عیش کی خاطر اس کی زندگی کے چیتھڑے اڑا دوں؟ یکلخت تصور میں سٹیلا کی پرسکون آنکھوں سے آنکھیں ملیں۔ اس کے ملائم بال ہوا سے اس کے ماتھے پر لہرا رہے۔ یہ دیوانگی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جن چیزوں کو قابل احترام سمجھتا ہے۔ ان سب سے اور احترام نفس سے ہاتھ دھو بیٹھنا پڑے گا۔ مڑ گیا اور جلد جلد اسٹیشن کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ لیکن اس بے بس سراسیمہ لڑکی کی یاد سے جس کی متفکر آنکھیں راہ چلتوں کے چہروں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ دل کو دھچکا لگا۔ اور وہ پھر سمندر کی طرف پلٹا۔ وہ ٹوپی سب نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی وہ دھبہ سیر بینوں کے ہجوم میں کہیں غائب ہو گیا تھا۔ دل میں ایک ہوک سی اٹھی سینے میں خلا محسوس ہوا (جیسا تو قدرتاً کسی کی وجہ سے کوئی چیز ہاتھ سے چھن جائے تو یہی حال ہوتا ہے) وہ تیز تیز چلنے لگا۔ لیکن میگن کہیں دکھائی نہیں دی۔ آدھ گھنٹے تک وہ اس کی تلاش میں پھرتا رہا اور پھر ساحل سمندر کی ریت پر پڑ کر اوندھا لیٹ گیا۔ جانتا تھا کہ اس سے ملنے کی سہل ترکیب یہ ہے کہ اسٹیشن پر جا کر اس کا انتظار کرے۔ حتیٰ کہ وہ مایوس ہو کر لوٹ آئے۔ یا ریل پر سوار ہو کر فارم کو چلا جائے۔ تاکہ وہ واپس آئے تو یہ وہاں پہلے ہی موجود ہو۔ لیکن پھر بھی بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ اور اس کے آس پاس بے پروا بچے بیلچے اور بالٹیاں لیے کھیلتے رہے۔ اس متلاشی سرگرداں لڑکی پر رحم ضرور آتا تھا لیکن یہ رحم بھی کم و بیش خون کی اس سرگرمی اور تیزی کا ایک جزو بن گیا۔ جو بہار نے جسم میں پیدا کر دی تھی۔ اب دل میں صرف ایک بے عنان جذبہ باقی رہ گیا تھا۔ توقیر نسواں کے جذبات مفقود ہو چکے تھے۔ دل میں پھر میگن کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس کے بوسوں، اس کے نازک اور گداز جسم۔ اس کی دلفریبی۔ اس کے کافرانہ عشق کی گرم جوشی کے لیے دل پھر بے قرار ہو گیا۔ مہتاب سے روشن سیب کے درختوں کی شاخوں تلے۔ اس رات کا پھر لطف اٹھانا چاہتا تھا۔ اور اس کا دل ان خواہشات کی تکمیل کے لیے یوں مضطرب تھا جیسے کوئی جنگل کا دیوتا کسی بن دیوی کے لیے مضطرب ہوتا ہے۔ اس ندی کا پُر کیف شور، خود رو بٹرکپ کے پھولوں کی دمک۔ وہ پرانی تاریخی چٹانیں۔ ککو اور یفل کی کوک۔ الوؤں کا بولنا۔ سرخ چاند کا مخملی تاریکی میں سے شگوفوں کی زندہ سفیدی کو جھانکنا۔ وہ کھڑکی جس میں اس کے چہرے کا نظر آنا اور ہاتھ ہلانا وہاں پہنچ کر رہ جاتا تھا) اس کی عشق میں ڈوبی ہوئی نگاہیں۔ سیب کے درخت تلے دھڑکتے ہوئے سینوں کا ملنا۔ اپنے ہونٹوں سے اس کے پھڑکتے ہوئے ہونٹوں کا محسوس کرنا۔ ان تصورات نے اس کے دل کو مسحور کر لیا۔ لیکن پھر بھی بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ یہ کیا ہے جو رحم کے جذبات اور ان بے قرار خواہشات کے ساتھ دست و گریباں ہے۔ اور جس نے اسے مفلوج بنا کر گرم گرم ریت پر لٹا رکھا ہے! تین ملائم بالوں والی لڑکیاں۔ ایک دلفریب چہرہ۔ جس کی نیلی آنکھوں میں دوستی کا جذبہ جھلک رہا ہے لیکن

ننگے ہاتھ جو اس کے ہاتھ کو کھینچ رہا ہے۔ ایک آواز جو جلدی سے، اس کا نام پکار کر کہتی ہے: "تو آپ نیکی کے قائل تو ہیں؟" یہ کچھ علاوہ اس کے علاوہ ایک عجیب فضا جیسے چار دیواری کے اندر ایک باغیچہ ہو۔ قدیم انگریزی وضع کا جس میں ہر جا گلابی رنگ کے پھول ہوں۔ کارن فلاور، گلاب کے پھول اور لونڈر اور لائلک کی خوشبو ہو، خنک اور دلفریب۔ انسانی مس سے غیر ملوث مقدس۔ غرضیکہ ان تمام چیزوں کا نچوڑ جنہیں وہ بچپن سے پاکیزہ اور قابل احترام سمجھتا تھا۔ یکلخت اسے خیال آیا۔ ممکن ہے وہ ادھر ہی کو آنکلے اور مجھے دیکھ پائے؟ اٹھ کھڑا ہوا۔ ساحل سمندر کے دوسرے سرے پر ایک چٹان تھی اس پر جا بیٹھا۔ سمندر کی چھینٹیں اس کے چہرے کو کاٹ رہی تھیں۔ اس سے ہوش و حواس پھر بجا ہو گئے۔ فارم کو واپس چلے جانا اور وہاں جنگلوں میں اور چٹانوں کے درمیان رہ کر میگن سے عشق کرنا یعنی روستانی ماحول میں اس دہقان لڑکی کو چاہنا، قطعاً ناممکن ہے۔ اسے کسی بڑے شہر میں لے آنا اور کسی فلیٹ میں رکھنا۔ اس سے اس کی شاعرانہ طبیعت کو صدمہ ہوتا تھا۔ کیونکہ جانتا تھا کہ وہ لڑکی تو قدرتی مناظر کا ایک جزو ہے۔ اسے شہر میں لا کر رکھا تو محبت کا جذبہ ایک نفسانی خواہش بن کر رہ جائے گا اور دنوں ہی میں غائب بھی ہو جائیگا لندن میں اس کی سادگی اور اس کا گنوارپن اس قدر نمایاں ہوگا کہ اسے محض کھلونا سمجھ کر رکھنا پڑے گا۔ جس سے چوری چھپے دل بہلا لیا جائے۔ وہ چٹان پر بیٹھا ایک سبزی مائل تالاب کے اوپر ٹانگیں لٹکائے جس کا پانی اتر رہا تھا ان خیالات میں محو تھا اور یہ سب باتیں اس پر روشن تر ہوتی جا رہی تھیں۔ لیکن ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے میگن کا بازو اور اس کا جسم ڈھیلا پڑ رہا ہے۔ آہستہ آہستہ نیچے ہوتا جا رہا ہے اور پھر اس تالاب میں جا گرا ہے اور بہہ کر سمندر میں جا پہنچا ہے میگن کا چہرہ اوجھل ہو رہا ہے۔ اس کی کھوئی ہوئی نظروں میں ایک التجا ہے۔ اور اس کے سیاہ بال بکھرے ہوئے ہیں۔ اس تصور نے دل میں کچوکے دیئے۔ ہر چند اسے دل سے ہٹانے کی کوشش کی لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ یہ خیال اسے دق کرتا رہا۔ آخر کار وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ چٹان سے نیچے اترا اور پانی کے قریب ایک غار میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ شاید سمندر میں نہانے سے اس کا دل بہل جائے اور یہ بخار اتر جائے۔ کپڑے اتار دیئے اور تیر کر دور نکل گیا۔ چاہتا تھا کہ تھک کر چور ہو جائے تاکہ حواس سن ہو جائیں۔ اس لئے تیز تیز اور دور دور چکر کاٹے۔ پھر دفعتاً بغیر کسی وجہ کے اسے خوف سا معلوم ہوا کہ فرض کرو وہ واپس ساحل تک نہ جا سکا اور سمندر کی ندا اسے بہا لے گئی۔ یا ہیلی ڈے کی طرح اس کے پٹھے اینٹھ گئے۔ تو کیا ہوگا! یہ سوچ کر وہ واپس پلٹا۔ سرخ رنگ کی چٹانیں بہت دور معلوم ہوتی تھیں۔ اگر وہ ڈوب گیا تو کسی کی نظر اس کے کپڑوں پر پڑے گی۔ ہیلی ڈے اور اس کی بہنوں کو تو خبر مل جائے گی۔ لیکن میگن کو شاید کبھی علم نہ ہونے پائے گا۔ فارم کے لوگ کوئی اخبار نہیں خریدتے)۔ فل ہیلی ڈے کے الفاظ اسے پھر یاد آئے۔ "کیمبرج میں ایک لڑکی تھی جس سے میں شاید ـــــ بہرحال خدا کا شکر ہے کہ اس کی طرف سے میرا ضمیر صاف ہے"۔ مجنونانہ خوف کے اس لمحہ میں اس نے قسم کھائی کہ میں میگن کی طرف سے اپنا ضمیر صاف رکھوں گا۔ لیکن خوف جاتا رہا۔ اطمینان سے تیرتا ہوا ساحل پر آن پہنچا۔ دھوپ میں جسم سکھایا اور کپڑے پہن لئے۔ اس کا دل زخمی تھا لیکن درد محسوس نہ ہوتا تھا جسم خشک اور تر و تازہ ہو گیا تھا۔

ایشرسٹ کی عمر میں رحم کا جذبہ شدت کے ساتھ محسوس نہیں ہوا کرتا۔ جب واپس ہیلی ڈے کے کمرے میں پہنچا اور چائے پر خوب پیٹ بھر کر کھایا تو ایسے معلوم ہوا جیسے ایک بخار آیا تھا جو اب اتر چکا ہے۔ ہر شے نئی نئی اور صاف ستھری معلوم ہوتی تھی۔ چائے۔ توس اور مکھن لگا ہوا مربہ، غرضیکہ ہر چیز میں اسے بہت مزا آیا۔ تمباکو کی خوشبو آج تک اتنی اچھی معلوم نہ ہوئی

تھی۔ خالی کمرے میں ٹہلتا ٹہلتا رک جاتا۔ کبھی اس چیز کو دیکھتا کبھی اس کو چھوتا۔ پھر سٹیلا کے سینے پر دھنکی ہوئی اون کی ٹوکری اٹھا لیتا ہے گویا نرم اور خوش رنگ، ریشم کی ایک گچھی کو مس کرتا ہے۔ ٹوکری میں ایک تھیلی تھی۔ جو کسی خوشبودار بوٹی سے بھری ہوئی تھی۔ اسے اٹھا کر سونگھا۔ پھر پیانو کے پاس جا بیٹھا اور ایک انگلی سے مختلف سُر بجاتا رہا۔ پھر سوچنے لگا۔ کل پھر وہ بجائے گی۔ اور میں پاس بیٹھا اسے دیکھتا رہوں گا۔ اسے دیکھتے رہنے سے دل کو تسکین حاصل ہوتی ہے۔ جو کتاب اسٹیلا نے اس کے پاس لا کر رکھ دی تھی، وہ وہیں پڑی تھی۔ اسے اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ لیکن میگن کی اداس شکل پھر آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ اٹھ کھڑا ہوا اور کھڑکی میں سے جھانک کر باغیچے میں جو تیتریاں اُڑ رہی تھیں۔ ان کو دیکھتا رہا۔ اور سمندر کا نظارہ کرتا رہا جو درختوں کے پیچھے نیلا نیلا اور خواب آلود نظر آتا تھا۔ ایک خادمہ اندر آئی اور چائے کے برتن اٹھا کر لے گئی۔ لیکن وہ وہیں کا وہیں کھڑا شام کی ہواؤں کا لطف اٹھاتا رہا اس کوشش میں کہ اس کا دماغ کسی بات کو سوچنے نہ پائے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہیلی ڈے اور اس کی بہنیں پھاٹک میں سے اندر آتی ہوئی دکھائی دیں۔ سٹیلا آگے آگے تھی۔ اس کے پیچھے فل اور فل کے پیچھے چھوٹی لڑکیاں اپنی اپنی ٹوکری اٹھائے چلی آ رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر اشرسٹ اضطراراً پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا مجروح اور مایوس دل ان لوگوں کی ملاقات سے گھبراتا بھی تھا اور ان کی دوستانہ شفقت سے تسکین بھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ان کے سحر کو محسوس کر کے چوٹ کھاتا تھا۔ لیکن ان کی پرسکون معصومیت اور سٹیلا کی دید سے مسرت اندوز ہونا چاہتا تھا۔ پیانو کے پیچھے دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا کہ سٹیلا اندر داخل ہوئی۔ لیکن کچھ کھوئی سی جیسے کوئی ڈری ہوئی ہو۔ پھر اشرسٹ پر نظر پڑی۔ مسکرا دی۔ اس کا تبسم بجلی کی طرح سریع اور درخشاں تھا جس سے اشرسٹ کو مسرت بھی ہوئی اور ٹھٹکا بھی گیا۔

"فرینک تم نہ گئے نا؟"

"ہاں آنا ہی نہ ہو سکا۔"

"دیکھو ہم کیسے جنگلی کے پھول چن کر لائے ہیں۔ اب ان کا موسم ختم ہونے کو ہے۔" سٹیلا نے پھول آگے بڑھا دیئے۔ اشرسٹ نے انہیں سونگھا۔ دل میں مبہم سی خواہشات پیدا ہوئیں۔ لیکن پھر یکلخت مر بھی گئیں۔ میگن کا متفکر چہرہ نظر آیا۔ وہ اوپر تک رہی تھی۔ راہگیروں کے چہروں کا جائزہ لے رہی تھی۔

اس نے مختصر سا جواب دیا۔ "بہت خوبصورت ہیں" اور منہ موڑ لیا۔ چھوٹی بچی سیڑھیاں چڑھ رہی تھیں۔ ان سے بچتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اور بستر پر جا گرا اور دونوں بازوؤں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ تو پھینک چکنے کے بعد۔ میگن کو چھوڑ چکنے کے بعد اسے نہ صرف اپنے آپ سے بلکہ ہیلی ڈے اور اس کی بہنوں اور ان کی انگریز گھرانوں کی سی خوش دلی سے بھی نفرت ہونے لگی۔ قسمت نے یہ کیا ظلم کیا کہ انہیں یہاں لے آئی اور اس کے اولین عشق کا گلا گھونٹ دیا اور اسے یہ سمجھایا کہ یہ عشق اوباشی سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ سٹیلا کا کیا حق تھا کہ اس کا دل فریب مجسم حسن اسے یقین دلا دے کہ وہ میگن سے کبھی شادی نہیں کرے گا اور اس کے عشق کو مذموم ثابت کر کے اس کا دل تاسف اور حسرت اور رحم سے بھر دے۔ میگن بیچاری تلاش کے بعد مایوس ہو کر واپس چلی گئی ہو گی۔ اور شاید یہ امید دل میں لئے گھر کو جا رہی ہو گی کہ اشرسٹ پہلے سے پہنچ گیا ہو گا۔ تاسف اور حسرت سے بے تاب ہو کر اشرسٹ نے اپنی آستین کو کاٹ لیا۔ کھانے پر بیٹھا تو اداس اور چپ چپ تھا۔ اسکی

ہالی کو دیکھ کر بچے بھی پژمردہ ہو گئے۔ سب کے سب تھکے ہوئے تھے اس لئے ان کا مزاج برہم تھا۔ چنانچہ شام کے وقت میں کئی کئی بار ایشرسٹ کی سٹیلا سے آنکھیں چار ہوئیں۔ وہ پریشان اور مجروح نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ ایشرسٹ تھا اس لئے بس یہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ رات بھر بے چین رہا۔ صبح بہت سویرے اٹھا۔ اور باہر نکل گیا۔ ساحل سمندر کی تنہائی کے عالم میں پرسکون۔ نیلے وسیع سمندر کو دیکھ کر اس کا دل قدرے پسیجا۔ مغرور احمق سمجھتا ہے کہ میگی کو بہت ہی جلد دو ہفتے میں بھول بھی جائے گی۔ باقی رہا وہ خود تو اسے اپنی پاکبازی کا صلہ ملے گا! نیک رہا! سٹیلا کو اس کا علم ہو تو وہ اس ضبط نفس کو کس قدر سراہے۔ وہ شیطان کی قائل ہے۔ مجھے شیطان کو نیچا دکھایا۔ خیال آیا کہ نیکی کر کے [illegible] لیکن رفتہ رفتہ سمندر اور آسمان کے سکون اور حسن اور سمندری پرندوں کی پرواز کے نظارے سے متاثر ہو کر اس کی خفگی لگی۔ نہایا اور گھر کو چلا۔

سٹیلا مکان کے باہر باغیچے میں ایک سفری اسٹول پر بیٹھی تصویر بنا رہی تھی۔ چپکے سے اس کے پیچھے جا کر [illegible] قدر حسین ہے۔ جسم آگے جھکائے۔ موقلم ہاتھ میں تھامے۔ ماتھے پر ہلکی سی تیوری ڈالے وہ کس قدر پیاری معلوم ہوتی ہے۔ بڑے ملائم لہجے میں بولا

"سٹیلا مجھے افسوس ہے کہ رات میں نے بہت ہی بدتمیزی کی۔"

سٹیلا چونک کر مڑی۔ چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ حسب عادت جلد جلد بولی

"اس کا ذکر مت کرو۔ میں سمجھ گئی تھی کہ کچھ نہ کچھ بات ہو گی۔ لیکن دوستوں میں ایسی باتوں کا تذکرہ ہی فضول ہے نا؟"

ایشرسٹ نے جواب دیا۔

"ہاں دوستوں میں ——— تو ہم آپس میں دوست ہیں نا؟"

سٹیلا نے اس کے چہرے کو دیکھا۔ بڑے زور سے اثبات میں سر ہلایا۔ برق صفت سرخی اور درخشاں تبسم کے چمکتے دانت پھر دکھائی دیئے۔

تین دن کے بعد ایشرسٹ ان لوگوں کے ساتھ لندن چلا گیا۔ فارم کے لوگوں کو خط نہ لکھا۔ لکھتا تو کیا لکھتا۔ اگلے سال اپریل کے آخری دن سٹیلا سے اس کی شادی ہو گئی ....

یہی وہ واقعات تھے جن کی یاد اب ایشرسٹ کے دل میں جبکہ وہ اپنی شادی کی پچیسویں سالگرہ کے دن گورز کے بیچ میں دیوار کا سہارا لگائے بیٹھا تھا۔ تازہ ہو رہی تھی۔ جہاں اب لنچ چن رکھا تھا۔ یہی وہ مقام ہو گا جہاں میگن اسے آسمان کے بالمقابل کھڑی دکھائی دی۔ انسان کو زندگی میں کیسے کیسے اتفاقات پیش آتے ہیں۔ دل میں تمنا پیدا ہوئی کہ اس کا

باغیچے اور جیسی ہوتے والے مرغزار کو پھر جا کر دیکھے۔ اس میں بہت وقت نہ لگے گا۔ سٹیلا ابھی شاید گھنٹے بھر تک نہ لوٹے۔

چوٹی پر وہ چیڑ کے درختوں کا جھنڈ اور عقب میں وہ گھاس سے ڈھکی ہوئی ڈھلوان، اسے اچھی طرح یاد تھی۔ فارم کے دروازے تک پہنچ کر رک گیا۔ وہ پتھر کی بنی عمارت۔ بوڑھے درختوں کا وہ محراب۔ وہ انگور کے شگوفے بالکل جوں کے توں تھے وہی ہلکے سبز رنگ کی چوکی بھی وہیں کھڑکی کے نیچے گھاس پر رکھی تھی۔ جہاں کھڑے ہو کر اس نے میگن کے ہاتھ سے چابی لی تھی۔ پگڈنڈی پر چل کر باغیچے کے پھاٹک تک پہنچا جو پہلے کی طرح اب بھی سیاہی مائل اور شکستہ تھا۔ درختوں میں ایک سیاہ رنگ کا سور بھی ادھر ادھر پھر رہا تھا۔ کیا یہ سچ ہے کہ چھبیس سال گزر چکے ہیں یا محض کسی خواب سے بیدار ہوا ہے۔ اور اس بڑے سیب کے درخت کے پاس میگن اس کا انتظار کر رہی ہے؟ خود فراموشی کے عالم میں اپنی بھوری ڈاڑھی کو ہاتھ لگایا اور واقعات کی دنیا میں واپس آ گیا۔ پھاٹک کھول کر باغیچے میں داخل ہوا اور خاردار جھاڑیوں میں سے ہوتا ہوا اس چٹان تک جا پہنچا جہاں وہ پرانا سیب کا درخت کھڑا تھا۔ بالکل ویسے کا ویسا! ہلکے رنگ کی کائی پہلے سے قدرے زیادہ تھی۔ دو ایک شاخیں بھی خشک ہو رہی تھیں لیکن اس کے سوا اس میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کل رات ہی کا واقعہ ہے۔ جب کہ میگن کے بھاگ جانے کے بعد وہ ایک دفعہ کائی دار تنے سے لپٹ گیا تھا۔ اور اس کی خوشبو نے جو ہی سے مشام کو لطف اندوز کیا تھا اور سر کے اوپر چاندنی میں شگوفے سانس لیتے ہوئے زندہ معلوم ہوتے تھے۔ اوائل بہار کا زمانہ تھا۔ کہیں کہیں کلیاں پھوٹ چکی تھیں۔ بلیک برڈ اپنے راگ الاپ رہے تھے اور ککو کی کوک سنائی دے رہی تھی۔ دھوپ کھلی ہوئی تھی۔ اور اس کی میٹھی میٹھی گرمی خوشگوار معلوم ہوتی تھی۔ مقام حیرت ہے کہ کہیں کوئی تبدیلی نظر نہ آتی تھی۔ وہی شور مچاتی ہوئی ندی تھی اور وہی تنگ سا تالاب جس میں وہ ہر روز صبح کے وقت لیٹ جایا کرتا تھا اور پانی اچھال اچھال کر اپنے پہلوؤں اور سینے پر ڈالا کرتا تھا۔ دریائی مرغزار میں بیچ کے درختوں کا وہی جھنڈ تھا۔ وہاں کے پاس وہی پتھر جہاں بیٹھتے تھے جیسے ہی آن کر بیٹھتا ہے۔ گم گشتہ شباب کا خیال آیا۔ عشق کی بربادی کا خیال آیا کہ کس بے دردی سے اس کی شیرینیوں کو ضائع کر دیا تھا۔ دل میں ایک ٹیس ایک ہوک اٹھی جس نے ایشرسٹ کا گلا گھونٹ دیا۔ اس غیر فانی حسن سے بھری ہوئی دنیا میں انسان اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ جو مسرت اسے حاصل ہو اسے دل سے جانے نہ دے۔ جس طرح یہ زمین یہ آسمان جدا نہیں ہونے دیتے! لیکن انسان بے بس ہے!

ندی کے کنارے پہنچ کر اس چھوٹے سے تالاب پر نظر پڑی۔ سوچا شباب اور میگن کیا معلوم دونوں کہاں چلے گئے پھر یکلخت ڈر گیا کہ کسی سے سامنا ہو گیا تو یہ خوشگوار تصورات برہم ہو جائیں گے۔ پگڈنڈی کی طرف پلٹا اور کسی سوچ میں کھویا ہوا پھر اس چوراہے پر جا پہنچا۔

موڑ کے پاس ایک [illegible] بڑی ڈاڑھی والا بوڑھا شخص ایک چھڑی کا سہارا لئے کھڑا شوفر سے باتیں کر رہا تھا۔ ایشرسٹ کو دیکھ کر وہ یکلخت رک گیا۔ گویا کوئی بے ادبی کر بیٹھا ہے اور تعظیماً ٹوپی کو چھو کر لنگڑاتا لنگڑاتا پگڈنڈی پر ہو لیا۔

ایشرسٹ نے مٹی کی اس سبز ڈھیری کی طرف اشارہ کیا اور پوچھا۔ "تمہیں معلوم ہے یہ کیا ہے؟"

بوڑھا شخص ٹھہر گیا۔ چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ دل میں کہہ رہا ہے۔ "مجھ سے بہتر تمہیں بتانے والا اور کون مل سکتا ہے؟" بولا۔ "یہ ایک قبر ہے۔"

"لیکن یہاں کیوں؟"

بڈھا مسکرا دیا۔ "یہ بھی داستان ہے۔ میں اسے کئی دفعہ سنا چکا ہوں۔ کئی لوگ پوچھتے ہیں کہ یہ ڈھیری کیسی ہے۔ ہم لوگ اسے دوشیزہ کی قبر کہتے ہیں۔"

ایلبرسٹ نے تمباکو کی تھیلی آگے بڑھادی۔ "پائپ بھر لو۔" بڈھے نے اپنی ٹوپی کو چھوا۔ اور آہستہ آہستہ اپنی مٹی کا پائپ بھرنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں جو جھریوں اور بالوں میں سے اوپر کو تک رہی تھیں ابھی چمک باقی تھی۔

"جناب اجازت ہو تو میں بیٹھ جاؤں۔ آج ذرا ٹانگ دکھ رہی ہے۔" یہ کہہ کر وہ اسی ڈھیری پر بیٹھ گیا۔

"اس قبر پر ہمیشہ ایک آدھ پھول پڑا رہتا ہے۔ کچھ ایسی تنہائی بھی نہیں یہاں۔ اب تو جب سے یہ موٹروں کا جھمیلا شروع ہوا ہے۔ اکثر لوگ ادھر سے گزرتے ہیں۔ پچھلے زمانے کی اور بات تھی۔ اب تو یہاں چہل پہل رہتی ہے۔ اس بیچاری نے خودکشی کر لی تھی۔"

ایلبرسٹ نے کہا۔ "سمجھ گیا۔ جبھی تو چوراہے میں دفن ہے۔ میرا خیال تھا اب یہ دستور نہیں رہا۔"

"مگر یہ تو بڑے عرصے کی بات ہے۔ ان دنوں ہمارے ہاں کا پادری بڑا خدا ترس شخص تھا۔ اگلے کرسمس میں میری پنشن کو چھ سال ہو جائیں گے۔ اور جب یہ واقعہ ہوا۔ اس وقت میں پچاسویں برس میں تھا۔ اب تو کوئی ایسا شخص زندہ نہیں جسے اس کا حال مجھ سے بڑھ کر معلوم ہو۔ وہ یہاں قریب ہی رہتی تھی۔ اسی فارم میں جہاں مسٹر نیرد کومب کے ہاں کام کیا کرتا تھا اب وہ فارم جیک نیرد کومب کے پاس ہے۔ میں کبھی کبھی اس کے ہاں بھی متفرق کام کر لیتا ہوں۔"

ایلبرسٹ پھاٹک کے سہارے کھڑا پائپ سلگا رہا تھا۔ دیاسلائی بجھ گئی۔ لیکن ایلبرسٹ نے دیر تک خمیدہ ہاتھوں کو چہرے کے سامنے سے نہ ہٹایا۔

اس نے کہا۔ "اچھا!" لیکن اپنی آواز خود اپنے کانوں کو عجیب معلوم ہوئی۔ جیسے بیٹھی ہوئی ہو۔

"وہ لڑکی لاکھوں میں ایک تھی! جب میں گزرتا ہوں یہاں ایک آدھ پھول ڈال جاتا ہوں۔ خوبصورت اور نیک تھی گو انھوں نے اسے گرجے میں دفن نہ کیا۔ نہ وہیں دفنایا۔ جہاں وہ خود چاہتی تھی۔"

بڈھا ذرا دیر ٹھہر گیا اور اپنا بالوں والا مڑا تڑا ہاتھ کھول کر اس ڈھیری پر بلیو بل کے پھولوں کے پاس رکھ دیا۔

ایلبرسٹ نے کہا۔ "اچھا۔"

بڈھے نے کہا۔ "بس یوں سمجھئے کہ کسی سے عشق ہو گیا تھا اس لڑکی کو۔ گو یقین سے کوئی نہ کہہ سکتا تھا۔ کسی لڑکی کے دل کا حال اللہ ہی جانے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اسے کسی سے عشق تھا۔"

قبر پر ہاتھ پھیرا۔ "مجھے اس لڑکی سے بہت محبت تھی۔ لیکن وہ خود بھی بہت زیادہ محبت کرنے والی تھی۔ یہی اس میں خرابی تھی۔" اس نے نظریں اوپر اٹھائیں اور ایلبرسٹ نے جس کے ہونٹ اس کی داڑھی کے بالوں میں چھپے ہوئے تھے لیکن پھڑک رہے تھے کہا۔

"اچھا؟"

موسم بہار کا واقعہ ہے۔ بس یہی موسم تھا۔ عجب ہے یا ذرا چند دن بعد ہوگا۔ شگوفوں کے دن تھے۔ فارم میں ایک لڑکا تھا۔ اچھا لڑکا تھا۔ اپنے ذرا کھینچ کر رہتا تھا۔ مجھے بہت پسند تھا۔ میں نے تو صاحب کوئی ایسی بات نہیں دیکھی لیکن میرا خیال ہے اس نے اس لڑکی کا سر پھرا دیا تھا۔

بڈھے نے پائپ منہ سے ہٹایا۔ زمین پر تھوکا۔ پھر بولا۔

بات یہ ہوئی کہ یہ لڑکا ایک دن یہاں سے چل دیا اور واپس کبھی نہ آیا۔ اس کا تھیلا اور چھوٹی موٹی چیزیں ابھی تک یہ میں ہمیشہ یہی سوچتا رہا کہ اس نے اپنی چیزیں منگوائی کیوں نہیں۔ ایشر یا ایسا ہی کچھ نام تھا اس لڑکے کا۔

ایشرسٹ نے پھر کہا۔ "اچھا!"

بڈھے نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

اس دن سے اس لڑکی کے ہونٹوں پر تو جیسے مہر لگ گئی۔ دن بھر یوں پھرتی رہتی تھی جیسے حواس بجا نہ ہوں۔ وہ نا ہو گئی۔ میں نے کبھی کسی کی حالت یوں بدلتے نہیں دیکھی۔ فارم میں ایک اور لڑکا تھا۔ جو تھی۔ وہ اسے چاہتا تھا۔ اس سے بہت ہی پریشان رہتی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کی حالت بگڑتی گئی۔ بعض اوقات میں شام کے وقت بچھڑوں وہ لڑکی باغیچے میں بوڑھے سیب کے درخت کے پاس کھڑی ہوتی۔ وہ بالکل سے تک رہی ہوتی۔ میں دل میں کہتا کہ میں کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے لیکن تمہاری حالت زار ہے۔

بڈھے نے اپنا پائپ پھر سلگایا اور سوچ کے انداز میں کش لگانے لگا۔

ایشرسٹ نے کہا۔ "اچھا؟"

"ایک دن مجھے یاد ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ میگن تمہیں یہ کیا ہو گیا ہے۔ (اس کا نام میگن ڈیوڈ تھا اور وہ اور اس کی تیرد کو سب دو توں اور لڑے آئی تھیں) میں نے کہا تمہیں ضرور کوئی دکھ ہے۔ کہنے لگی نہیں جم مجھے کسی چیز کا دکھ نہیں۔ میں نہیں۔ ہے اور ضرور ہے۔ کہنے لگی نہیں تو۔ یہ کہا اور اس کی آنکھوں سے دو آنسو چھلک پڑے۔ میں نے کہا پھر تم اپنی اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ یہاں دکھ ہوتا ہے۔ لیکن تھوڑے دنوں میں آپ ہی ہٹ جائے گا۔ پھر کہنے لگی۔ جم اگر مجھے اس سیب کے درخت تلے دفن کیجیو۔ میں ہنس دیا۔ میں نے کہا تمہیں کیوں کچھ ہونے لگا۔ پگلوں کی سی باتیں منہ سے نہیں میں پگلوں کی سی باتیں نہ کروں گی۔ میں نے دل میں سوچا لڑکیوں کی باتوں کا کیا ہے۔ آپ ہی ٹھیک ہو جائے گی بات کا خیال میں نے دل سے نکال دیا۔ لیکن دو دن کے بعد کوئی شام کے چھ بجے میں بچھڑوں کو لے کر آ رہا تھا کہ میں نے سیب کے درخت کے پاس کالی سی کوئی چیز پڑی دیکھی۔ میں سمجھا سؤر ہے۔ پھر خیال آیا یہ بھی کوئی سؤر کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ معلوم ہوا کہ کیا ہے؟

بڈھا رک گیا۔ اس کی آنکھیں اوپر کو تک رہی تھیں۔ نظروں میں چمک تھی اور دکھ بھرا تھا۔

ندی کنارے ایک چٹان ہے۔ اس میں رک کر پانی کا ایک تالاب سا بن گیا ہے۔ وہاں وہ لڑکی پڑی تھی۔ اسی مقام پر لڑکے کو ایک دو مرتبہ نہاتے بھی دیکھا تھا۔ لڑکی پانی میں اوندھی پڑی تھی۔ اور اس کے سر کے پاس ایک پتھر کے نشانات

یہیں سے سنہری پھولوں کا ایک پودا اگ رہا تھا۔ چہرے کو دیکھا تو اس پر ایسا حسن آگیا تھا کہ آپ سے کیا کہوں۔ ننھے بچے کی طرح پرسکون اور خوبصورت تھا۔ جب ڈاکٹر نے اسے دیکھا تو وہ بولا۔ اتنے پانی میں ڈوبنا تو ناممکن ہے۔ اور سچ پوچھو تو اس کے چہرے سے کچھ یہی معلوم ہوتا تھا۔ میں تو زور و شور سے رد دیا۔ وہ کتنی خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔ جون کا مہینہ تھا لیکن اسے سیب کے شگوفے کی ایک آدھ کھلی کہیں سے مل گئی تھی اسے بالوں میں لگا رکھا تھا۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ اسے شادی کی امنگ ہوئی تھی۔ ورنہ اس سادگی سے کیوں مرتی۔ اور پھر پانی بھی تو فٹ ڈیڑھ فٹ سے زیادہ نہ تھا۔ لیکن یہ میں آپ سے کیسے کہوں کہ یہ جنگل بھید کا ہے۔ سبھی کو معلوم ہے۔ اسے بھی معلوم تھا۔ اور کوئی کہے کہ کنواری نہیں۔ تو میں کبھی نہ مانوں۔ میں نے لوگوں سے کہہ دیا کہ وہ سیب کے درخت تلے دفن ہونا چاہتی تھی۔ لیکن یہ سن کر لوگ اور بھی خلاف ہو گئے۔ انھیں یقین ہو گیا کہ اگر یہ بات ہے تو ضرور خودکشی کی ہوگی چنانچہ انھوں نے یہاں دفنا دیا۔ ہمارے پادری کو ایسی باتوں کا بہت خیال تھا۔"

بڈھے نے پھر ڈھیری پر ہاتھ پھیرا۔ اور پھر رک رک کر بولا۔

"لڑکیاں عشق کی خاطر کیا کچھ نہیں کر گزرتیں۔ وہ بڑی محبت کرنے والی لڑکی تھی۔ میرے خیال میں اس کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ لیکن یقین سے کسی کو کچھ معلوم نہیں۔"

داد لینے کے لئے اس نے نظر اوپر اٹھائی۔ لیکن ایشرسٹ وہاں سے چل دیا تھا۔ اس طرح کہ گویا اور کوئی وہاں موجود ہی نہ تھا۔

پہاڑی کی چوٹی پر جہاں لنچ چن رکھا تھا اس سے پرے نظروں سے اوجھل وہ زمین پر اوندھا لیٹ گیا۔ تو اس کی پاکبازی کا صلہ یہ تھا! یہ عشق کی دیوی سائپرین کا انتقام! اس کی پرنم آنکھوں کو میگن کا چہرہ دکھائی دیا۔ جس کے سیاہ بھیگے ہوئے بالوں میں سیب کے شگوفے لگے تھے۔ اور اس نے دل سے پوچھا۔

"میں نے کیا گناہ کیا تھا؟ میں نے کیا کیا تھا؟" لیکن اسے کوئی جواب نہ ملا۔ وہ تو یہ سمجھتا تھا کہ اس کے دل میں جذبات خیز گل ریز مترنم بہار نے طوفان بپا کر دیا تھا۔ اس کے اور میگن دونوں کے دل میں۔ لیکن کیا دراصل عشق کو محض کسی کی جان لینا مطلوب تھا! تو پھر وہ یونانی ہی راستی پر ہے۔ اور "ہپالیٹس" کے الفاظ آج بھی سچے ہیں۔

عشق کا دل دیوانہ ہے
اور اس کے پروں کی چمک سنہری ہے
اور جب وہ جست بھر کر اڑتا ہے
تو کوئی اس کے جادو کی تاب نہیں لا سکتا۔
وہ تمام زندگی جو پہاڑ اور موج اور آب جو میں
شباب اور خودسری سے مست ہے
ہر وہ شے جو سینۂ زمین سے پھوٹتی ہے
یا سورج کی شہابی شعاعوں میں سانس لیتی ہے۔

الما یہ سب کچھ ہر مرد اور ہر عورت
سب کے اوپر اے سائپرین۔ اے سائپرین تو حکومت کرتی ہے
صرف تو۔

یونانی سچ کہتا ہے۔ میگن حسرت زدہ میگن! پہاڑی سے نیچے اترتی ہوئی! میگن پرانے سیب کے درخت کے نیچے راہ تکتی ہوئی! بےجان۔ مردہ میگن جس پر حسن کی مہر ثبت ہے:

ایک آواز کانوں میں پڑی۔

"وہاں ہو تم۔ ذرا آؤ دیکھو!"

ایشرسٹ اٹھا۔ بیوی نے جو تصویر کھینچی تھی، اسے ہاتھ میں لیا اور چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔

"فرینک اس کا پیش منظر ٹھیک ہے؟"

"ہاں"

"لیکن پھر بھی کچھ کمی رہ گئی ہے۔ ہے نا!"

ایشرسٹ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "کمی! سیب کا درخت موسیقی اور سنہری پھول!"

ترجمہ: پطرس

(کاروان)

نوعِ اِنسان کی کہانی

دُنیا کی ابتدا

ہماری ہستی ایک بہت بڑا گورکھ دھندا ہے۔

ہم کون ہیں؟

ہم کہاں سے آئے ہیں؟

ہم کہاں جا رہے ہیں؟

ان سوالات کا جواب افق سے بھی پرے کہیں دور ہمارا انتظار کر رہا ہے۔ اور ہم بہت ہی آہستہ آہستہ لیکن بڑے استقلال اور ہمت کے ساتھ اس کے قریب پہنچ رہے ہیں۔

لیکن ابھی ہم نے کچھ بھی مسافت طے نہیں کی!

ابھی ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں۔

ابھی ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں۔ تاہم اتنا کچھ جان گئے ہیں کہ اپنے علم کی بدولت کئی اور باتیں بہت حد تک بوجھنے کے قابل ہو گئے ہیں۔

اس باب میں میں تمہیں یہ بتاؤں گا کہ انسان سے پہلے جہاں تک ہمیں معلوم ہے دنیا کا کیا حال تھا!

اگر ہم یہ اندازہ لگائیں کہ کرۂ زمین پر جاندار اشیا کا وجود کتنے عرصہ سے ممکن ہے، اور مدت کو اس لکیر سے ظاہر کریں کہ جو ننھی سی لکیر اس کے نیچے کھینچی گئی ہے وہ یہ ظاہر کرتی ہے کہ انسان یا انسان کے درجے کی مخلوق یہاں کتنے عرصہ سے رہتی ہے۔

انسان سب سے آخر میں آیا لیکن عقل کے ذریعہ قدرت کی طاقتوں کو تسخیر سب سے پہلے کیا۔ اسی لئے ہم بلیوں یا کتوں یا گھوڑوں یا دوسرے جانوروں کی بجائے انسان ہی کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے گو اپنی اپنی جگہ ہر ایک کی تاریخ بہت دلچسپ ہے۔

جہاں تک ہمیں معلوم ہے یہ کرۂ زمین جس پر ہم آباد ہیں شروع شروع میں شعلہ بار مادے کا ایک بہت بڑا گولا تھا جو فضا کے ناپیدا کنار سمندر میں دھوئیں کے ایک ننھے سے بادل کی مانند اڑ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ کئی سال بعد جب زمین کی سطح جل چکی تو اس پر چٹانوں کی ایک ہلکی سی تہہ نمودار ہوئی۔ ان جلتی چٹانوں پر مسلسل دھواں دھار مینہ برسا۔ سخت پتھر بارش کے پانی میں تحلیل ہو گئے۔ اور گدلا پانی ان وادیوں میں بہہ نکلا جو گرم گرم زمین کی اونچی اونچی

مچھلیوں کے میدان میں چہل پہل

آخر ایک ایسا زمانہ آیا جب سورج نے بادلوں میں سے جھانکا [illegible] کی سطح پر پانی کے چھوٹے تالاب سے بن گئے ہیں یہی تالاب جنہیں مشرقی اور مغربی نصف کرّہ کے عظیم الشان سمندر بن گئے

پھر ایک ایسا عجیب [illegible] ظہور میں آیا جب [illegible] چیزیں [illegible]

چھوٹے چھوٹے زندہ حصے [illegible] پر نمودار ہوئے۔

کئی سال تک یہ زندہ چیزیں پانی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ بہتی رہیں۔ اس عرصے میں رفتہ رفتہ زمین کے ناموافق حالات سے [illegible] اور بالآخر زندگی کی مشکلات پر قابو پا لیا۔ بعض ایسے تھے جو [illegible] ایک گوشے ہی میں خوش رہتے تھے۔ بہت سی مٹی [illegible] کیچڑ پھیلیوں کی چٹانوں سے [illegible] اس میں جڑیں پکڑ لیں [illegible] بعض نے کسی جگہ ٹھہرنا پسند نہ کیا اور ادھر ادھر گھومتے رہے۔ ان کے جسم میں سے مچھلیوں کی سی [illegible] ترتیب جوڑ [illegible] نمودار ہوئیں اور وہ سمندر کی تہ میں پودوں [illegible] کے درمیان جو آج کل کی مچھلیوں سے مشابہ تھے [illegible] بعض مچھلیاں [illegible] خوراک کی تلاش میں ادھر ادھر تیرنا پڑا۔ ان کی بدولت سمندر رفتہ رفتہ کروڑوں مچھلیوں سے آباد ہو گیا۔

اس عرصے میں پودوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ انہیں [illegible] نئی نئی جگہیں تلاش کرنی پڑیں [illegible] کے دامن میں کیچڑ اور دلدلوں کے اندر سکونت اختیار کر لی۔ دن میں دو دفعہ جوار بھاٹے کی وجہ سے [illegible] لیکن باقی تمام وقت [illegible] اور [illegible] ہوا میں جو زمین کی سطح کو لپیٹے ہوئی تھی۔ زندہ رہنے کی کوشش کرتے کئی صدیوں کی تربیت کے بعد اس قابل ہو سکے کہ جس طرح پہلے پانی میں رہتے تھے۔ اسی آسانی کے ساتھ اب ہوا میں بسنے لگے۔ بڑے ہونے [illegible] جھاڑیاں اور درخت بنے اور [illegible] خوب صورت پھول پیدا کرنا سیکھا۔ جب پھول آئے تو بھونرے آ کر رس چوسنے لگے۔ [illegible] بیج [illegible] یہاں تک کہ سبزے [illegible] نے اپنی چادر پہاڑی اور بڑے بڑے درختوں نے اپنے سائبان پھیلا دیئے۔

بعض مچھلیوں نے بھی سمندر سے باہر قدم رکھا اور گلپھڑوں کی بجائے پھیپھڑوں سے سانس لینا سیکھا۔ ایسے جانوروں کو [illegible] کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خشکی اور تری دونوں جگہ آسانی سے زندہ رہ سکتے ہیں کسی مینڈک سے پوچھو تو وہ تمہیں بتائے گا کہ [illegible] جانور کس مزے سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

جب ایک دفعہ پانی سے باہر نکل آئے تو یہ جانور رفتہ رفتہ خشکی ہی کے ہو رہے۔ بعض نے رینگنا سیکھا اور [illegible] جنگلوں میں [illegible] کے ساتھ بسنے لگے۔ نرم نرم زمین پر تیزی سے چلنے کی خواہش پیدا ہوئی تو رفتہ رفتہ ٹانگیں بڑی ہو گئیں۔ ساتھ ہی جسامت بھی بہت بڑھ گئی۔ چنانچہ دنیا بڑے بڑے جانوروں سے آباد ہو گئی۔ علم حیوانات کی کتابوں میں اکتھیا سورس (ICHTHYOSAURUS) میگا سورس (MEGALOSAURUS) اور برانٹو سورس (BRANTOSAURUS) نامی جانوروں کا ذکر آتا ہے جو تیس تیس چالیس چالیس فٹ لمبے تھے اور [illegible] سے اس طرح کھیل سکتے تھے جس طرح بلی اپنے بچوں سے کھیلتی ہے۔

ان رینگنے والے جانوروں میں سے بعض جانور درختوں پر جا چڑھے اور وہیں رہنے لگے۔ درخت ان دنوں سو فٹ سے زیادہ اونچے تھے۔ چلنا پھرنا موقوف ہو گیا تو ٹانگوں کی بھی ضرورت نہ رہی لیکن ایک شاخ سے دوسری شاخ تک پھرتی سے حرکت کرنے کے لئے اپنی جلد کی جھلی

نمونہ ـــــــ ۲۸۴ ـــــــ پرچہ نمبر

کی کھال اور مستقل پنجوں کی انگلیوں کے درمیان اس ٹانگ سے اس ٹانگ تک پتنگ کی طرح پھیلی یا پھر اس جھلی پر پڑا ہوا دھیرے دھیرے ترنے کا کام لیا۔ ڈال ڈال اڑنے لگے اور چمگادڑ پکھے پرندے بن گئے۔

اس کے بعد ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ بڑے عظیم الجثہ رینگنے والے جانور سب کے سب مر گئے۔ اس کا سبب آج تک معلوم نہیں ہو سکا۔ شاید آب و ہوا ایک دم تبدیل ہو گئی۔ یا شاید بھوک کے مارے مر گئے کیونکہ بہت ممکن ہے وہ اتنے بڑے ہو گئے ہوں کہ تیرنے کے قابل رہے ہوں نہ چلنے کے نہ رینگنے کے۔ اور بڑے بڑے پودے اور درخت سامنے رکھے رہے ہوں لیکن وہاں تک پہنچ نہ سکتے ہوں۔ بہرحال بڑے بڑے رینگنے والے جانور دس لاکھ سال تک اس دنیا پر مسلط رہے اور پھر یہاں سے چل بسے۔

ان کی جگہ بالکل ہی مختلف جانوروں نے لی۔ یہ اور تو رینگنے والے جانوروں کی طرح تھے لیکن ان میں بڑا فرق یہ تھا کہ اپنے بچوں کو اپنا دودھ پلاتے تھے اس لئے انہیں دودھ پلانے والے جانور کہتے ہیں۔ مچھلیوں کے سے چھلکے ان کے جھڑ چکے تھے۔ پرندوں کے سے پر بھی نہ رکھتے۔ ان کی کھال پر بال اُگ آئے۔ ان دودھ پلانے والے جانوروں نے بعض ایسی عادات سیکھیں جن کی بدولت ان کی نسل کو باقی تمام جانوروں پر فوقیت حاصل ہو گئی۔ جیسے بچے پیدا ہونے تک مادہ اپنے انڈے جسم کے اندر ہی اٹھائے پھرتی۔ باقی سب جانور تو اپنے بچوں کو گرمی اور سردی کے رحم پر چھوڑ دیتے تھے لیکن دودھ پلانے والے جانور بہت مدت تک اپنے بچوں کو ساتھ رکھتے اور جب تک وہ طاقت ور ہو کر دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ ہو جاتے ان کی حفاظت کرتے۔ اس طرح دودھ پلانے والے جانوروں کے بچے کئی باتیں اپنی ماں سے سیکھ لیتے اور زیادہ آسانی سے زندہ رہتے۔ کسی بلی کو دیکھو کس طرح بچوں کو اپنی حفاظت کرنا اور شکار ڈھونڈنا اور چوہے پکڑنا سکھاتی ہے۔

لیکن ان دودھ پلانے والے جانوروں کے حالات بہت تفصیل کے ساتھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ تم انہیں اچھی طرح جانتے ہو وہ تمہارے ارد گرد ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ بندر بھی اور گھریلو پرندے تمہارے ساتھ رہتے ہیں اور جو اتنے عام نہیں انہیں تم چڑیا خانے میں جا کر دیکھ سکتے ہو۔

ان بے شمار بے زبان جانوروں میں سے ایک جانور نے باقی سب سے آگے بڑھ کر ایک رستہ نکالا۔ عقل و شعور سے کام لیا اور اس کی بدولت زندگی کی کش مکش میں اپنی نسل کی رہنمائی کی۔ یہ جانور "انسان" کہلایا۔

تھا تو یہ بھی دودھ پلانے والا جانور لیکن خوراک حاصل کرنے اور جان بچانے میں سب سے ہوشیار۔ تھا پہلے اگلی ٹانگوں سے شکار پکڑنے کی عادت ڈالی۔ ہوتے ہوتے پنجے کی شکل ہاتھ کی سی بن گئی۔ پھر بے انتہا کوششوں کے بعد پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہونا سیکھا (یہ کرتب اب بھی کچھ ایسا آسان نہیں۔ انسان دس لاکھ سال سے اس کا عادی ہے پھر بھی بچے کو یہ از سر نو سیکھنا پڑتا ہے)

یہ جانور دیکھنے میں کچھ بندر، گوریلا، بن مانس سے ملتا جلتا تھا لیکن ذہانت میں دونوں سے بڑھ کر تھا۔ شاید ہی کوئی اس کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ ہر قسم کی آب و ہوا میں رہ لیتا تھا۔ ایک مقام سے دوسرے مقام تک جاتا تو حفاظت کی خاطر ہم جنسوں کی ایک ٹولی بنا کر سفر کرتا۔ بچوں کو خطرے سے آگاہ کرنے کے لئے عجیب و غریب آوازیں نکالتا۔ کئی لاکھ سال بعد انہی آوازوں سے گفتگو کرنا سیکھا۔

تمہیں یقین تو مشکل سے آئے گا کہ ہم تم سب اسی جانور کی اولاد ہیں۔ لیکن حقیقت یہی ہے۔

وہ سچ جو کبھی جھوٹ نہ ہو گا

میں انسانی زندگی کی الجھنوں پر جس قدر غور کرتا ہوں اتنا ہی مجھ پر روشن تر ہوتا جاتا ہے کہ جس طرح قدیم مصر کے لوگ بخشش اور نجات کے لئے آئیسس اور نیفتیس کا دامن پکڑتے تھے اسی طرح ہمیں اپنی مشکلات کے حل کے لئے طنز اور رحم کا دامن پکڑنا پڑتا ہے

طنز اور رحم سے بڑھ کر کوئی چیز ہماری مشکل کشا نہیں ہو سکتی۔ طنز سے زندگی کے ہر غم پر مسکراہٹ پیدا ہوتی ہے اور رحم اپنے آنسوؤں سے زندگی کو مقدس بنا دیتا ہے

جس طنز کو میں اپنا دیوتا بنانا چاہتا ہوں وہ کوئی سنگدل دیوتا نہیں۔ محبت اور حسن کا مخول نہیں اڑاتا۔ وہ حلیم اور مہربان دیوتا ہے اس کا تبسم دشمنی کو بھی دوست بنا لیتا ہے اور وہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ احمقوں اور ظالموں پر ہنسو ان سے نفرت مت کرو۔ کیونکہ یہ کمزوری کی نشانی ہے۔

ایک بہت بڑے فرانسیسی کے ان دانش مندانہ الفاظ پر میں اس کتاب کو ختم کرتا ہوں اور رخصت چاہتا ہوں۔ خدا حافظ

ماخوذ از کتاب "نوع انسان کی کہانی" مصنفہ ہنڈرک وان لون
مترجم پطرس

بچے کا پہلا سال

ایک زمانہ ایسا تھا کہ لوگ بچے کی عمر کے پہلے سال کو تعلیم کے دائرے سے خارج سمجھتے تھے جب تک بچہ کچھ نہ کچھ بولنا شروع نہ کر دیتا۔ اسے صرف ماں یا دایہ کی زیر نگرانی رکھا جاتا تھا اور یہ فرض کر لیا جاتا تھا کہ وہ خود ہی بچے کے نیک و بد کو ایسی اچھی طرح سمجھتی ہیں کہ انہیں سکھانے کی ضرورت نہیں لیکن فی الحقیقت لوگوں کا یہ خیال غلط تھا۔ اکثر بچے سال بھر کے بھی نہ ہونے پاتے کہ مر جاتے اور جو زندہ بچتے ان میں سے کئی ایک کی صحت ہمیشہ کے لئے خراب ہو جاتی۔ غلط تربیت کی وجہ سے خطرناک ذہنی عادات کی بنیاد پہلے ہی پڑ جاتی۔ یہ حقیقت ابھی حال ہی میں معلوم ہوئی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ اکثر لوگ شیر خوار بچوں کی پرورش کے معاملے میں سائنس کا دخل پسند نہیں کرتے۔ کیونکہ اس سے ماں کی ممتا اور بچے کے لاڈ پیار کا جو رومانوی تصور ان کے ذہن میں موجود ہے اسے صدمہ پہنچتا ہے لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ اندھا دھند محبت اور لاڈ پیار اور چیزیں ہیں۔ اصل محبت اور چیز ہے جن والدین کو اپنے بچوں سے سچی اور اصلی محبت ہے وہ ان کی تربیت کے لئے سائنس کے اصولوں پر عمل کرنے سے نہیں گھبراتے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مذکورہ بالا قسم کی محبت انہی لوگوں میں سب سے زیادہ پائی جاتی ہے جن کے کوئی اولاد نہیں ہوتی۔ یا جو دوسروں کی مانند اپنے بچوں کو کسی یتیم خانے کے حوالے کر دینا چاہتے ہیں۔ اکثر تعلیم یافتہ والدین سائنس کی معلومات سے متنفر ہونے کی بجائے استفادہ کرتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ان پڑھ لوگوں میں بھی سائنس کا چرچا روز بروز بڑھتا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بچوں کی اموات روز بروز کم ہوتی جاتی ہیں۔ اگر لوگ پوری احتیاط سے کام لیں تو نہ صرف اموات کی تعداد اور بھی کم ہو جائے گی بلکہ جو بچے زندہ رہیں گے ان کی دماغی اور جسمانی حالت بہت بہتر ہوگی۔

جسمانی صحت کے ماہر ڈاکٹر لوگ ہیں وہی ان مسائل کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ مسائل اس کتاب کے دائرے سے خارج ہیں۔ لیکن ہم یہاں جسمانی صحت کے مسائل پر اسی حد تک بحث کریں گے جس حد تک ان کا تعلق ذہنی یا نفسیاتی زندگی سے ہے۔ علاوہ بریں اس وقت بحث کرنا یوں ضروری ہے کہ اول تو عمر کے پہلے سال میں جسمانی زندگی اور ذہنی زندگی میں تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے دوسرے اگر شروع میں بچے کے جسم کا کما حقہ خیال نہ رکھا جائے تو چند ایسے نقائص کے پیدا ہونے کا احتمال رہتا ہے جو بڑے ہو کر تعلیم کے رستے میں حارج ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ہر چند کہ جسمانی صحت پہ بحث کرنا ڈاکٹروں ہی کا حصہ ہے تاہم اس موضوع پر ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے متعلق کچھ عرض کریں۔

نوزائیدہ بچہ کسی چیز کا عادی نہیں ہوتا۔ اس کی تمام حرکات کسی عادت کی وجہ سے نہیں بلکہ اضطراراً سرزد ہوتی ہیں۔ اگر ماں کے پیٹ میں اس نے بعض عادتیں اختیار کر لی ہیں تو وہ کم از کم ایسی نہیں کہ پیدا ہونے کے بعد بھی اس کے کام آ سکیں۔ یہاں تک کہ سانس لینا بھی اسے پیدائش کے بعد سیکھنا پڑتا ہے۔ اور بعض بچے تو مر ہی اسی لئے جاتے ہیں کہ تنفس کا عمل دیر میں سیکھتے ہیں۔ ایک زبردست خواہش جو فطرت کی طرف سے اپنے ساتھ لاتا ہے اور

یہ مشغلہ کا سبق ہے جب تک کہ اس عمل میں مصروف رہے بہت خوش رہتا ہے۔ اپنی تمام وقت وہ ایک تحریک عالم میں گذارتا ہے جس سے بڑی توجہ حاصل ہوتی ہے کیونکہ ان احساسات کا بیشتر حصہ نیند میں گذر جاتا ہے۔ چند دنوں کے بعد یہ حالت بدل جاتی ہے۔ بعض باتیں (مثلاً دودھ پینا وغیرہ) تو وقت کے ساتھ ساتھ ٹھیک ہی ہو سکتی ہیں۔ اس کے سوا ان باتوں کا متوقع رہتا ہے یعنی یہ کہیئے اب وہ بعض چیزوں کا عادی ہو جاتا ہے اور جن باتوں کا عادی ہو جاتا نہیں گریز کرتا ہے گویا عادات پیدا ہو جاتی ہیں۔ معقول پسندی ایسا کہ اُٹھا پھر عمر بھر ایسا نہیں ہوتا۔ ہر نئی چیز سے ناپسند ہوتی ہے اگر بچہ اس عمر میں بولنے کے قابل ہوتا تو بڑے بوڑھوں کی طرح اپنی پسندیدگی کا اظہار ان الفاظ میں کرتا کہ بس جانے دو اس عمر میں اب ہم نئی نئی باتیں کیوں کر سیکھ سکتے ہیں۔ تاہم شیر خوار بچے نئی عادتیں بہت جلد اختیار کر لیتے ہیں۔ اس دوران میں اگر کوئی بری عادت سیکھیں تو وہ بعد میں اچھی تربیت کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں۔ اس لئے شیر خواری کے زمانے کی عادات کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہئے۔ اگر شروع شروع کی عادات اچھی ہوں تو بہت سہولت ہوتی ہے۔ حالانکہ بعض اوقات شیر خوارگی کے زمانے کی عادت اتنی راسخ ہوتی ہے کہ وہ بالکل جبلت معلوم ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ماحول یا اس کا اثر بہت گہرا ہوتا ہے جو عادات بعد میں سیکھی جائیں ان میں یہ پختگی کبھی نہیں ہوتی۔ اس لئے زمانہ طفلی کی عادات خاص طور پر توجہ کی مستحق ہیں۔

اس سلسلے میں دو باتیں پیش نظر رکھنی چاہئیں۔ اوّل اور سب سے مقدم صحت، دوم سیرت۔ ہم چاہتے ہیں کہ بچہ بڑا ہو کر ایک ایسا انسان ثابت ہو جس کے اوصاف پسندیدہ ہوں اور جو اپنے گردوپیش سے بخوبی عہدہ برآ ہو سکے۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ صحت اور سیرت دونوں کے مطالبات ایک ہیں۔ جو چیز ایک کیلئے مفید ہے وہی دوسرے کے لئے مفید ہے۔ یہاں بحث سیرت سے ہے لیکن جو اصول ہم سیرت کی بہتری کے لئے وضع کریں گے۔ وہی صحت کے لئے بھی مفید ہیں گویا یہ نہیں ہو سکتا کہ بچہ تندرست ہو لیکن اس کے اخلاق بُرے ہوں۔ یا نیک سیرت ہو لیکن اس کا جسم امراض کا شکار ہو۔

آج کل یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ بچے کو صرف مقررہ اوقات پر دودھ پلانا چاہئے اس سے بچے کا ہاضمہ درست رہتا ہے۔ یہ بجائے خود ایک نہایت معقول وجہ ہے لیکن اس کے علاوہ اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی یہ بہت مفید ہے۔ شیر خوار بچہ اتنا بے عقل نہیں ہوتا جتنا ہم اسے سمجھتے ہیں۔ اسے ایک دفعہ یقین ہو جائے کہ رونے سے مطلب نکل آتا ہے تو وہ ضرور روتا ہے لیکن جب بڑا ہو کر اسی عادت کے زیر اثر وہ ہر وقت رونی صورت بنا کر لوگوں سے گلے شکوے کرتا رہتا ہے تو لوگ اسے پچکارنے کی بجائے اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ لوگوں کا یہ سلوک اسے ناگوار گزرتا ہے اور وہ دنیا کو خود غرض اور ہمدردی کے جذبے سے معرا سمجھ لیتا ہے۔ اگر لڑکی ہو اور بڑی ہو کر خدا اسے حسین بنا دے تو بے جا توجہات اسے بے جا طور عادات کا سلسلہ جاری رکھتا ہے اور یہ نقص اور بھی مستحکم ہو جاتا ہے۔ یہی حال دولت مند لڑکوں کا ہوتا ہے کہ بچپن میں بگڑ جاتے ہیں تو پھر تمام عمر بگڑتے چلے جاتے ہیں جس شخص کی پرورش شیر خوارگی کے زمانے میں غلط طریقے پر ہو وہ بڑا ہو کر اگر ذی اقتدار ہے تو تندی اور جبر پر اتر آتا ہے اور اگر بے بضاعت ہے تو لوگوں کی مفروضہ بے توجہی سے گرفتار رہتا ہے اس لئے اخلاقی تعلیم روز اوّل ہی سے شروع کر دینی چاہئے۔ تاکہ نہ غلط توقعات پیدا ہوں۔ نہ بعد میں انہیں مجروح ہونا پڑے۔ اگر شروع میں اس کا تدارک نہ کیا جائے تو بعد میں بچے کی خواہشات کو ٹھکرانے سے اس کے دل میں غصے اور رنج کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

گویا بچے کی تربیت اس طرح کرنی چاہئے۔ کہ نہ تو اسے لاڈ پیار اور چاؤ چونچلوں سے بگاڑا جائے نہ اس کی طرف سے بالکل بے توجہی برتی جائے مثلاً جو باتیں صحت کے لئے ضروری ہیں ان میں کوتاہی نہ کرنی چاہئے۔ بچے کو ہوا اور بارش سے تکلیف پہنچ رہی ہو تو اسے اٹھا لینا چاہئے۔ تاکہ اسے سردی نہ لگے اور وہ بھیگ نہ جائے لیکن اگر بچہ بغیر کسی جسمانی تکلیف کے رونا شروع کر دے تو اسے رونے دینا چاہئے ورنہ وہ بے جا خدمت کرانے کا عادی ہو جائے گا۔ جب اس کی دیکھ بھال کی جائے تو بہت زیادہ چاؤ اور اہتمام کرنا فضول بلکہ مضر ہے جو بات مناسب ہو وہ کر دینی چاہئے اور

ضرورت سے زیادہ پیار محبت اور ہمدردی کا اظہار نہ کرنا چاہیے۔ بچوں کی پرورش چاؤ مگر بچوں سے نہیں متانت اور سچی لگن سے کرنی چاہیے۔ گویا وہ بچہ نہیں بلکہ بڑی عمر کا انسان ہے۔

بچوں میں بڑوں کی سی عادتیں تو پیدا نہیں ہو سکتیں لیکن ہمیں یہ خیال ضرور رکھنا چاہیے کہ کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے جو ان کی عادت کے راستے میں رکاوٹ ثابت ہو۔ خیال رہے کہ بچہ مزاج دار نہ بن جائے۔ ورنہ بعد میں سخت بیزاری کا سامنا ہوگا اور یوں دیکھئے تو وہ خود بھی اس قابل نہیں کہ اس میں اس قدر اہمیت کا احساس پیدا کیا جائے۔

بچوں کی پرورش میں سب سے مشکل بات یہ ہے کہ والدین کو شفقت اور لاڈ کے بیچ میں رہنا پڑتا ہے۔ بچے کی صحت کو درست رکھنے کے لئے ہر وقت اس کی نگہداشت کرنی پڑتی ہے۔ اور اس کی خاطر بڑی بڑی مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں۔ اس سلسلے میں ضروری یہ ہے کہ والدین کو بچے سے بہت زیادہ محبت ہو لیکن مصیبت یہ ہے کہ جہاں والدین کو محبت زیادہ ہوتی ہے وہاں اکثر ان کی عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ جن والدین کو اپنے بچوں سے بہت محبت ہے۔ ان کے نزدیک اولاد کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے اگر احتیاط نہ برتی جائے تو بچہ بھی اس بات کو محسوس کرنے لگتا ہے اور جتنا اہم اسے والدین سمجھتے ہیں اتنا ہی اہم وہ بھی اپنے آپ کو سمجھتا ہے جب اسے خود بینی کی عادت پڑ جاتی ہے اور جب بڑے لوگ والدین کی طرح اس کی خوشامد اور آؤ بھگت نہیں کرتے تو اسے مایوس ہونا پڑتا ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ نہ صرف پہلے سال بلکہ بعد میں بھی جب کبھی بچہ بیمار ہو والدین خندہ پیشانی اور بظاہر بے فکری کے ساتھ اس کا علاج کریں۔ اور بات کا بتنگڑ نہ بنائیں۔

پہلے زمانے میں بچوں کو جکڑ کر بھی بہت رکھا جاتا تھا اور ان سے لاڈ بہت کیا جاتا تھا ان کے اعضا کو حرکت کرنے کا موقع نہ دیا جاتا تھا کپڑے ضرورت سے زیادہ گرم ہوتے تھے فطری حرکات پر پابندیاں عائد کی جاتی تھیں۔ لیکن ساتھ ہی ان کو ہر وقت گودیں اٹھائے اٹھائے پھرتے تھے ان کے سامنے گاتے گاتے پھرتے تھے۔ اور انہیں چومنے چاٹنے کا تختۂ مشق بنائے رکھتے تھے۔ یہ بہت غلط طریقہ تھا اس سے بچے بگڑ جاتے تھے اور ہر وقت ماں باپ کے گلے کا ہار بنے رہتے تھے۔ صحیح اصول یہ ہے کہ نہ بچے کی فطری حرکات و خواہشات پر پابندیاں عائد کیجئے نہ اسے ان سے تجاوز کرنے دیجئے۔ بچے کے لئے آپ جو تکلیف اٹھاتے ہیں اس سے بچے کو بے خبر رہنا چاہیے۔ خدمت کرانے کا چسکا اسے نہ پڑنے دیجئے جہاں تک ممکن ہو اسے کامیابی کا لطف اسے ضرور اٹھانے دیجئے جو خود اس کی اپنی کوشش کا نتیجہ ہو۔ جدید تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے بچے کو خارجی قواعد و ضوابط کی غلامی سے آزاد کیا جائے۔ لیکن اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ خود بچے کے دل میں انضباط کا احساس پیدا کیا جائے۔ اور اس احساس کا پیدا کرنا عمر کے پہلے سال میں نسبتاً آسان ہوتا ہے مثلاً جب بچے کو سلانا ہو تو اسے گود میں نہ لینا چاہیے، بازوؤں میں تھام کر "سو جا سو جا" نہ کرنا چاہیے۔ بلکہ اس کے پاس تک نہ ٹھہرنا چاہیے۔ اگر آپ ایک مرتبہ یوں کریں گے تو بچہ دوسری مرتبہ بھی یہی چاہے گا اور تھوڑے عرصہ میں بچے کا سلانا ایک مصیبت بن جائے گا۔ بچے کو اوڑھا لپیٹا کر بستر میں سلا دینا چاہیے اور ایک دو باتیں کر کے اسے اکیلا چھوڑ دینا چاہیے۔ ممکن ہے وہ چند منٹ تک روتا رہے لیکن اگر وہ بیمار نہیں تو تھوڑی دیر میں خود بخود چپ ہو جائے گا۔ اس کے بعد جا کر دیکھئے تو مزے کی نیند سو رہا ہوگا۔ لاڈ پیار سے ایک تو اس کی سیرت بگڑ جائے گی۔ دوسرے وہ سوئے گا بھی کم۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ نوزائیدہ بچہ ماں کے پیٹ سے کوئی عادت ساتھ نہیں لاتا اس کی عادات فطری اور اضطراری ہوتی ہیں چنانچہ اسے اشیاء کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ اشیاء کے احساس کے لئے یہ ضروری ہے کہ بچہ اشیاء کو پہچانے اور اشیاء کو پہچاننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اشیاء کا بار بار تجربہ ہو۔ سو وہ رفتہ رفتہ ہی حاصل ہوتا ہے پیدائش کے تھوڑے عرصہ بعد بچہ پنگوڑے کے مس، ماں کی چھاتی یا دودھ کی بوتل کے مس اور خوشبو اور ماں یا دائی کی آواز سے مانوس ہو جاتا ہے۔ ماں یا پنگوڑے کو دیکھنے کی قابلیت بعد میں پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ نوزائیدہ بچے کی آنکھیں ابھی اس قابل نہیں ہوتیں کہ

وہ اشیاء کی شکلوں کو واضح طور پر دیکھ سکے۔ جب رفتہ رفتہ مختلف احساسات کے اکٹھا ہونے سے بچے کے ذہن میں عادات واضح ہو جاتی ہیں تو حسی ادراک کی بدولت ذہن میں اشیاء کے تصورات مکمل ہو جاتے ہیں۔ خاص خاص احساسات بچے کے دل میں خاص خاص اشیاء کی قدر و قیمت پیدا کرتے ہیں۔ (دودھ کی بوتل اچھی لگتی ہے یا اس سے مس کرنے سے تسکین ہوتی ہے اس زمانہ میں اس کی شکل دیکھنے کا اشتیاق ہے وغیرہ وغیرہ) تاہم کچھ عرصے تک شناخت اور اشیاء میں تمیز نہیں کر سکتا۔ جب بچے کو کبھی بوتل کا دودھ اور کبھی چھاتی کا دودھ دیا جاتا ہے اس کے نزدیک کچھ عرصے تک ماں اور بوتل ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس عمر کے بچے کے دماغ میں صرف کام چلانے کا ذریعہ محض جسمانی ہوتا ہے۔ بچے کی تمام مسرتیں (جو زیادہ تر گرماہٹ اور خوراک تک محدود ہوتی ہیں) اس کے لیے تمام تر محض جسمانی ہوتی ہیں۔ اس سے ملتی جلتی اس کی عادات اس شکل پر ہوتی ہیں کہ جو چیز اس کے ذہن میں مسرت سے تعلق رکھتی ہے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے جو دکھ سے متعلق ہو اس سے گریز کرتا ہے۔

بچے کا رونا ایک حد تک ایک اضطراری حرکت ہے جو دکھ کی وجہ سے ظہور میں آتی ہے اور ایک حد تک ایک ارادی عمل ہے جو بچہ مسرت حاصل کرنے کے لئے اختیار کرتا ہے۔ شروع شروع میں وہ محض دکھ کی وجہ سے روتا ہے لیکن جب اس کو گود میں لیا جاتا ہے (پیار کیا جاتا ہے) تو بچے کے دل میں یہ احساس پیدا ہو گا کہ رونے کے نتائج خوشگوار رہتے ہیں۔ رفتہ رفتہ بچے کی یہ عادت ہو جاتی ہے کہ نہ صرف دکھ کے اظہار کے لئے روتا ہے بلکہ مسرت حاصل کرنے کے لئے بھی اس طریقے کو کام میں لاتا ہے۔ یہ اس کی عادات میں شامل ہو جاتا ہے لیکن ماں باپ اگر احتیاط کریں کہ جب تک اسے واقعی تکلیف نہ پہنچے وہ جو وہ چاہتا ہے نہیں دیں گے جیسا دکھ کے وقت روتا ہے۔ ہوشیار مائیں اس قسم کے رونے اور اس قسم کے رونے میں کوئی تمیز کر سکتی ہیں۔ عقلمندی یہی ہے کہ جب بچہ رونا دھونا کرتا ہو تو اس پر ماں توجہ نہ کی جائے بچے کو لٹا دیا جائے پھر اس سے پیچھے رہنا یا اس کے سامنے گانا گانا آسان بھی ہے اور پر لطف بھی۔ لیکن بہت جلد بچہ اس قسم کی تفریح کا عادی ہو جاتا ہے جو اس کی نیند میں خلل انداز ہوتی ہے۔ تیسرے ماہ بچے کا بیشتر وقت (سوائے دودھ پینے کے اوقات کے) نیند میں گزرنا چاہیے۔ ممکن ہے کہ بعض والدین کو یہ باتیں سخت معلوم ہوں لیکن تجربے سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ بچے کی صحت اور خوشی کے لئے یہ باتیں بہت مفید ہیں۔

بچے کے لئے جو تفریحات والدین مہیا کرتے ہیں ان کو تو ایک خاص حد کے اندر رکھنا چاہیے۔ لیکن جو تفریحات وہ خود اپنے لئے پیدا کرے ان کو ترقی دینے کی کوشش کرنی چاہیے۔ شروع ہی سے اسے اس بات کا موقع دینا چاہیے کہ وہ آزادی سے ہاتھ پاؤں ہلا سکے۔ وہ اپنے اعصاب کو کام میں لا سکے۔ پرانے زمانے کے لوگ بچوں کو باندھ کر رکھا کرتے تھے اس کی وجہ سستی کے سوا اور کچھ نہ تھی کیونکہ جن بچوں کو کھلا رکھا جائے ان کی نگہداشت زیادہ کرنا پڑتی ہے۔ حیرت ہے کہ ان لوگوں کی ممتا بھی ان کی سستی پر غالب نہ آ سکی تھی۔ جب بچے کی نظر ٹھیک ہو جاتی ہے تو وہ متحرک چیزوں کو خصوصاً جو جھولتی رہتی ہوں دیکھ کر خوش ہوتا ہے لیکن پھر بھی جب تک وہ اشیاء کو پکڑنا سیکھے اس کی دلچسپیوں کا دائرہ بہت محدود رہتا ہے جب پکڑنا سیکھ لے۔ تو یہ دائرہ یک لخت وسیع ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصے تک تو محض گرفت ہی کی مشق اتنی مسرت انگیز ہوتی ہے کہ وہ گھنٹوں اسی میں مشغول رہتا ہے۔ بھینچنے کا شوق بھی اسی زمانے میں پیدا ہوتا ہے۔ بھینچنے کے زمانے سے قدرے پہلے وہ اپنے ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں پر قابو حاصل کرتا ہے شروع شروع میں پاؤں کی انگلیوں کی حرکات محض اضطراری ہوتی ہیں۔ بعد میں بچہ یہ دریافت کرتا ہے کہ میں انہیں اپنی مرضی سے بھی ہلا سکتا ہوں اس احساس سے وہ اتنا خوش ہوتا ہے گویا بہت بڑی مملکت حاصل کر لی ہے کیونکہ انگلیاں اب اجنبی نہیں رہتیں۔ بلکہ جسم کا جزو بن جاتی ہیں۔ اس کے بعد اگر بہت سی چیزیں بچے کے آس پاس ایسی ہوں جنہیں وہ پکڑنے کے شوق سے دل بہلا سکے تو بہتر سامان مہیا ہو جاتا ہے بچے کو تفریح بھی ایسی ہی حرکات سے ہوتی ہے جو تعلیم کے نقطۂ نظر سے ضروری ہیں البتہ گر جانے یا چوٹ لگ جانے یا کسی تکلیف دہ چیز مثلاً پن یا سوئی کے نگلنے سے اسے بچانا ضروری ہے۔

چاہتی ہیں۔ پہلے چھ مہینے میں بچہ دودھ پیتے وقت تو بہت خوش ہوتا ہے لیکن باقی تمام وقت اس کی طبیعت اکتائی رہتی ہے جب وہ ہوش میں ہوتا ہے جب جاگ رہا ہو تو کوئی دکھائی دینے والی چیز سے مسرور رہتا ہے انسان کی خوشی کا انحصار اس کی ذہنی قابلیت پر ہے لیکن تین مہینے کی عمر کے بچے کا کسی چیز کا اس قدر تجربہ ہوتا ہے نہ وہ اپنے اعصاب پر قادر ہوتا ہے اس لئے مسرتوں سے محروم رہتا ہے۔ جانوروں کے بچے نسبتاً جلد زندگی سے لطف اٹھانے کے قابل ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کی مسرتیں غذائی ہوتی ہیں اور تجربے پر منحصر نہیں ہوتیں۔ انسان کا بچہ اگر محض جبلت پر تکیہ کرے تو اس کی خوشیوں اور دلچسپیوں کا حلقہ تنگ رہتا ہے۔ بچہ اپنی عمر کے پہلے تین مہینے عام طور پر اکتایا رہتا ہے اس کا سبب یہی حالت ہے۔ اس سے [illegible] ہے۔ اگر بچے کو بہت زیادہ بہلایا جائے تو وہ سوتا کم ہے۔

جب بچہ دو تین مہینے کا ہو جاتا ہے تو مسکرانا سیکھتا ہے اور اشخاص کے متعلق اس کے جذبات اشیاء سے ممیز ہونے لگتے ہیں۔ اس عمر کو پہنچ کر ماں اور بچے میں سوشل تعلقات کا امکان شروع ہو جاتا ہے بچہ ماں کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کر سکتا ہے اور کرتا ہے۔ اور نہ صرف حیوانوں کی مانند بلکہ دوسری طرح سے متاثر ہوتا ہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد تحسین و تعریف کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ میرے اپنے بچے میں اس خواہش کے واضح آثار پانچ مہینے کی عمر میں ظاہر ہوئے۔ میز پر ایک وزنی گھنٹی پڑی تھی۔ بڑی مشکلوں سے اس نے اسے اٹھایا اور بجایا اور فخریہ مسکرا کر سب لوگوں کی طرف دیکھنے لگا۔ جب یہ خواہش پیدا ہو جائے تو گویا ایک زبردست حربہ معلم کے ہاتھ آ جاتا ہے۔ جو تعریف اور ملامت کا حربہ ہے۔ بچپن کے تمام زمانے میں اس سے بڑا کام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس حربے کو از حد احتیاط کے ساتھ استعمال کرنا چاہیئے۔ عمر کے پہلے سال میں بچے کی مذمت بالکل نہ کرنی چاہیئے بعد میں بھی اس سے بہت حد تک احتراز واجب ہے۔ تعریف نسبتاً کم مضر ہوتی ہے لیکن تعریف نہ تو اس قدر فراخدلی سے کرنی چاہیئے کہ اس کی قدر ہی جاتی رہے اور نہ اس بخل کے ساتھ کہ بچے کو اس کے حاصل کرنے کے لئے بہت زیادہ زور لگانا پڑے۔ جب بچہ پہلی دفعہ قدم اٹھائے یا پہلی دفعہ الفاظ منہ سے نکالے تو کسی معقول شخص کو اس کی کارگزاری کو سراہنے میں تامل نہ کرنا چاہیئے۔ جب کبھی بچہ بہت سی کوششوں کے بعد کسی مشکل کو حل کرے تو اس کی تعریف ضرور کرنی چاہیئے۔ بچے کو یہ احساس دلانا چاہیئے کہ ہمیں اس کی خواہش اکتساب کے ساتھ ہمدردی ہے۔

عام طور پر بچے میں خواہش اکتساب اتنی زبردست ہوتی ہے کہ اس کے لئے صرف مواقع مہیا کر دینا ہی کافی ہوتا ہے باقی سب کچھ وہ خود ہی کر لیتا ہے۔ مثلاً بچے کو گھٹنوں چلنے یا پاؤں پاؤں چلنے یا اسی طرح کی دیگر حرکات سکھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ باتیں کرنا البتہ محدود طور پر اسے سکھلاتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ باقاعدہ الفاظ سکھانے کی کوشش کرنا غیر ضروری ہے۔ بچے اپنی ترقی کی رفتار خود ہی معین کرتے ہیں۔ اسے تیز تر بنانے کی کوشش کرنا غلطی ہے۔ مرتے دم تک انسان کا یہ حال ہوتا ہے کہ مشکلیں پیش آتی ہیں۔ ان پر قابو پاتا ہے اور اس سے مزید کوشش کے لئے حوصلہ بڑھتا ہے۔ اس سے بہتر طریقہ شوق کے بڑھانے کا اور کوئی نہیں۔ مشکلات نہ اتنی زیادہ ہونی چاہئیں کہ کام کرنے کا شوق ہی مر جائے اور نہ اتنی کم کہ طبیعت کو اکسا نہ سکیں۔ ہم کچھ سیکھتے اسی بات سے ہیں جو ہم خود کرتے ہیں۔ بڑوں کو صرف یہ کرنا چاہیئے کہ ایک دفعہ بچے کو کر کے دکھا دیں۔ مثلاً اس کے سامنے ایک دفعہ جھنجھنا بجا دیں اور پھر بچے کو چھوڑ دیں کہ وہ خود اس کی نقل اتارنے کی کوشش کرے۔ جو کام دوسرے لوگ سرانجام دیں۔ وہ صرف شوق پر تازیانے کا کام کر سکتے ہیں۔ لیکن جب تک بچہ وہ کام خود نہ کرے۔ اسے تعلیم نہیں کہا جا سکتا۔

باقاعدگی اور وقت کی پابندی شروع بچپن اور خصوصاً پہلے سال میں بہت ضروری ہیں۔ نیند، خوراک اور رفع حاجت کے لئے شروع ہی سے باقاعدگی کی عادت ڈالنی چاہیئے۔ گردوپیش کے حالات و واقعات کا مانوس ہونا ذہنی نقطۂ نظر سے بہت ضروری ہے اگر ایک ہی بات باقاعدگی سے پیش آتی ہے تو بچے کو اس کے پہچاننے میں آسانی ہوتی ہے۔ ذہن پر ضرورت سے زیادہ زور نہیں ڈالنا پڑتا۔ اور بچہ محسوس کرتا ہے کہ میں محفوظ ہوں

بچہ اس سے [illegible] ہوتا ہے۔ اسے تسکین کی ضرورت ہے تاکہ اسے یہ احساس پیدا ہو جائے کہ ہر بات باقاعدگی سے ہوتی ہے اور کوئی نئی بات یکلخت اس کی زندگی میں خلل نہیں ڈال سکتی۔ تو وہ خوش رہتا ہے۔ ذرا بڑی عمر میں تو بچے کو نئی نئی باتوں کا شوق پیدا ہوتا ہے لیکن زندگی کے پہلے سال میں ہر نئی بات میں بچہ کو خطرہ محسوس ہوتا ہے جس سے جہاں تک ممکن ہو محفوظ رکھنا چاہئے

اگر بچہ بیمار ہو تو آپ متفکر ہوں تو اپنا تفکر حتی الامکان اس پر ظاہر نہ ہونے دیجئے ورنہ وہ بھی متفکر ہو جائے گا۔ ورنہ ایسی بات نہ کرنی چاہئے جس سے بچے کی طبیعت میں ہیجان پیدا ہو بچے کو ٹھیک نیند آنی چاہئے۔ اس کا پہلا خواب ہو تو بچے کے سامنے بے پروائی ظاہر کرنی چاہئے۔ اسے یہ احساس نہ ہونا چاہئے کہ اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے ورنہ وہ معمولی باتوں میں بھی آپ کی خوشامد اور ترغیب کا خواہش مند ہو گا۔ اس بات کا خیال نہ صرف عمر کے پہلے سال میں بلکہ بعد میں بھی رکھنا چاہئے۔ پھر شاید اس اصول پر سختی سے پیش نظر رہنا چاہئے۔ بچے کے دل میں یہ احساس کبھی نہ پیدا ہونے دینا چاہئے کہ اس کے معمولی افعال مثلاً کھانا پینا وغیرہ اس کے لئے مسرت کا موجب ہیں آپ کی ممنونیت کا باعث ہیں۔ اگر اس میں یہ احساس پیدا ہو جائے تو وہ خوشامد کا متمنی رہتا ہے علاوہ اس کے ایسی باتیں خود کو بغیر ترغیب کے کرنی چاہئیں

یہ بھی خیال مت کیجئے کہ بچے میں اتنی عقل کہاں ہو سکتی ہے۔ بچے بڑے ذہین ہوتے ہیں اور اس کا علم [illegible]۔ لیکن جہاں یہ کوتاہی اس کے رستے میں حائل نہ ہو وہاں اس کی ذہانت بڑوں سے کم نہیں ہوتی۔ بچہ جو کچھ شروع کے ایک سال میں سیکھتا ہے پھر عمر بھر ایک سال کے عرصہ میں اتنا نہیں سیکھ سکتا۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ بچے کی ذہانت بہت تیز ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ بچے کو یہ سمجھانا کہ ایک دن اسے بڑا ہونا ہے اور دنیا کے کاروبار میں حصہ لینا ہے اس کی موجودہ سہولتوں یا اپنی خوشی پر اس کی آئندہ بہتری کو قربان مت کیجئے اس سے اسے بہت نقصان پہنچتا ہے۔ ٹھیک تربیت دینے کے لئے محبت اور علم دونوں کا ہونا ضروری ہے

ماخوذ از کتاب تعلیم خصوصاً اوائل طفلی میں

مصنف برٹرنڈ رسل ــــ مترجم [illegible]

دیہات میں بوائے سکاؤٹ کا کام

مکھیوں کا بادشاہ

ایک دن سقراط گاؤں کے اسکول میں آیا۔ سب لوگ اسے جانتے تو تھے ہی جونہی بچے بچیوں نے اس کی صورت دیکھی ان کے چہرے خوشی سے چمک اٹھے۔ پڑھنا لکھنا بھول گیا۔ اور سب کی نظریں دروازے پر گڑ گئیں جہاں بڈھے میاں کھڑے بڑے غور سے بچوں کی صورتیں دیکھ رہے تھے۔

سقراط نے کچھ کہے سنے بغیر کمرے کا ایک چکر لگایا۔ پھر اپنے آپ سے منہ ہی منہ میں باتیں کرنے لگا: "نہ کسی کے کانوں میں مُرکیاں دیکھیں۔ نہ ناک میں نتھ، نہ کسی کے چہرے پر میل، نہ کسی کی ناک بہہ رہی ہے نہ ناخن بڑھے ہوئے ہیں (ایں یہ کیا؟ اس بچی کے ناخن تو بڑھے ہوئے ہیں۔ لیجیے افسوس کی بات ہے! لیکن نہیں یہ کوئی نئی لڑکی ہوگی) اور ہاں نہ کسی کا پیٹ بڑھا ہوا ہے، نہ چہرے پر زردی ہے، نہ آنکھیں خراب ہیں، نہ کپڑے میلے ہیں۔ سب کے چہروں پر خوشی اور مسکراہٹ ہے۔ معلوم ہوتا ہے اصلاح اور ترقی کے لیے جو ہم نے کوشش کی تھی وہ بے نتیجہ ثابت نہیں ہوئی۔"

چوتھی جماعت کے ایک شوخ لڑکے نے کہا: "بڑے میاں یہ ہم پر منتر پڑھ پڑھ کر کیا پھونک رہے ہو؟"

سقراط یوں چونک اٹھا گویا وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ بولا: "سلام اے لڑکو! ہاں میں ایک خواب دیکھ رہا تھا۔"

"تو بڑے میاں! اس میں حیرانی کی بات ہی کیا ہے۔ ابا جان کہتے ہیں کہ تم خواب دیکھنے کے عادی ہو لیکن ہم تو خواب نہیں دیکھ رہے ہم تو سب جاگ رہے ہیں۔"

"تو پھر عزیزو میرے خوابوں میں سے ایک خواب سچا ثابت ہوا ہے۔"

ایک ننھے سے لڑکے نے کہا: "واہ وا۔ تو اب سقراط میاں ہمیں ایک کہانی سنائیں گے۔"

سقراط کے آنے سے ماسٹر صاحب کا چہرہ بھی اپنے شاگردوں کی طرح خوشی سے دمکنے لگا تھا۔ انھوں نے پوچھا: "کہیے آپ کا کون سا خواب سچا ثابت ہوا؟"

"میں چھوٹے لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک ایسا اسکول دیکھ رہا ہوں جس میں گندگی نام کو بھی نہیں۔ جہاں نہ کوئی بچہ بیمار ہے، نہ کسی نے سونے چاندی کے زیور پہن رکھے ہیں۔ یہی خواب سچا ثابت ہوا ہے۔"

ماسٹر صاحب نے کہا: "یہ تو کچھ بھی بات نہیں۔ مہینوں سے ہمارے اسکول کی یہی حالت ہے۔ کبھی کبھی کوئی نیا بچہ اسکول میں داخل ہوتا ہے تو ہمیں تھوڑی سی تکلیف ہوتی ہے لیکن ہم جلد ہی اسے بھی راہ پر لے آتے ہیں۔"

عین اس موقع پر ایک عورت داخل ہوئی۔ وہ چپ چاپ اور شرمائی ہوئی تھی لیکن تھی چست چالاک اور اکثر یہاں آیا کرتی تھی اس

کے ہاتھ میں ایک کتاب اور کچھ کاغذ تھے۔ سب دیکھ کر سب لڑکے اور لڑکیاں اٹھ کھڑے ہوئے اور جب بیٹھ گئے تو تھوڑی دیر میں سب لڑکے ایک طرف بیٹھ گئے اور سب لڑکیاں دوسری طرف۔ اس عورت نے لڑکیوں کو سلائی کا ایک سبق پڑھانا شروع کر دیا۔ سقراط نے کمرے سے چل جانا چاہا۔ مگر لڑکے کچھ پوچھنے والے تھے۔ سب کے سب چلا اٹھے "ہیں ہیں بڑے میاں کہاں چل دیئے۔ ٹھہرو تم ہی ہمیں بتاؤ۔ کیوں بیٹھے نہیں؟ کیا بچوں سے باتیں کرتے جھجکتے ہو؟ کیا ہم نے کچھ قصور کیا ہے؟"

سقراط نے کہا "یہاں میری ضرورت ہی کیا ہے۔ جو کچھ میں تمہیں بتا سکتا ہوں تمہارے استاد اس سے بہت زیادہ جانتے ہیں۔ میں کسی ایسی جگہ جاؤں گا جہاں میری ضرورت ہو۔"

استاد نے کہا "نہیں آپ نہیں جا سکتے۔ ہم نے سب کچھ آپ ہی سے سیکھا ہے۔ کچھ دیر یہاں ٹھہریے اور کوئی بات بتائیے۔"

سقراط نے کہا: "میں کیا بتا سکتا ہوں؟ میں استاد تھوڑا ہی ہوں۔"

اسی شوخ لڑکے نے پھر کہا "اچھا تو کوئی کہانی ہی سنا دو۔" کہانی کا نام سننا تھا کہ سب لڑکے چلا اٹھے: "ٹھیک ہے کہانی، کوئی کہانی۔"

سقراط نے کہا: "میں کہانیاں وانیاں نہیں سنایا کرتا۔"

اس پر کئی لڑکے بول اٹھے: "ہم نہیں مانتے۔ تم بچوں والے ہو۔ اپنے بچوں کو تو ضرور کہانیاں سناتے ہو گے۔"

سقراط نے کہا "یہ کام میرا نہیں۔ ان کی ماں انہیں کہانیاں سنایا کرتی ہے لیکن تمہاری ماؤں کو کپڑے تھاپنے ہی سے فرصت نہیں تھی۔"

اس پر کئی لڑکیوں نے ایک زبان ہو کر کہا: "ہرگز نہیں۔ تمہیں ہماری ماؤں پر یہ الزام لگاتے شرم نہیں آتی۔ انہوں نے تو یہ کام برسوں سے چھوڑ رکھا ہے۔"

سقراط نے کہا: "توبہ توبہ، مجھے بہت ہی افسوس ہے کہ میں نے تمہاری ماؤں پر یہ جھوٹا الزام لگایا ہے۔ مجھے امید ہے تم معاف کر دو گے۔"

"معاف تب کریں گے جب تم ہمیں کوئی کہانی سناؤ گے۔"

"اچھا تو سنو، ایک تھا گدھا بہت ہی بڑا ___"

"رہنے دو، ہم ایسی بے ہودہ کہانی نہیں سننا چاہتے۔ سنانی ہے تو کسی کام کی کہانی سناؤ۔"

"دیکھو میاں سقراط! عقل کے ناخن لو اور ہمیں اچھی کہانی سناؤ جس میں بادشاہ ہوں، شہزادے اور شہزادیوں کا ذکر ہو۔ اگر تم چاہو تو ایسی کہانی سنا سکتے ہو۔"

"اچھا تو سنو۔ ایک تھا بادشاہ۔ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ۔ وہ ایک چھوٹی سی ریاست پر حکومت کرتا تھا۔ رعایا اس سے بہت خوش تھی۔ جہاں بادشاہ کا پسینہ گرتا وہاں رعایا اپنا خون بہانے کو تیار ہو جاتی۔"

لڑکوں نے کہا: "اب آئے نا راہ پر، ہاں تو پھر کیا ہوا؟"

"اس چھوٹی سی ریاست سے ملی ہوئی ایک بہت بڑی ریاست تھی جس پر ایک بہت ظالم بادشاہ حکمران تھا۔ اس بادشاہ کی بڑی آرزو یہ تھی کہ کسی طرح اس چھوٹی ریاست پر قبضہ جما لوں۔ اس چھوٹی ریاست کے بادشاہ کے ہاں کوئی بیٹا نہ تھا، ہاں ایک بہت خوب صورت بیٹی تھی۔ بڑے بادشاہ نے اپنے دل میں سوچا کہ اگر میرے بیٹے کی شادی اس چھوٹے بادشاہ کی بیٹی سے ہو جائے تو بادشاہ کے مرنے کے بعد اس کی سلطنت پر میرا قبضہ ہو جائے گا۔

لیکن چھوٹا بادشاہ اور اس کی رعایا اس کی نیت سے واقف تھے چنانچہ انہوں نے اس کے بیٹے کے ساتھ اپنی شہزادی کی شادی کرنے

سے انکار کیا۔ اس پر بڑا بادشاہ بہت ہی جھنجھلایا اور اپنے امیروں وزیروں کو بلا کر ان سے مشورہ کیا۔ وزیروں نے کہا۔ اس چھوٹے بادشاہ نے ہماری ہتک کی ہے۔ ہمیں اس پر چڑھائی کر کے اس کی ریاست پر قبضہ کر لینا چاہئے۔ چنانچہ انہوں نے چڑھائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ جب چھوٹے بادشاہ کو اس کی خبر ملی تو وہ اپنے دل میں بہت ڈرا کیونکہ اس کی فوج بڑے بادشاہ کی فوج کے مقابلے میں ایک چوتھائی بھی نہ تھی۔

اس چھوٹے بادشاہ نے اپنے امیروں وزیروں کو بلایا اور کہا: "اگر ہم لڑے تو یہ بادشاہ ساری سلطنت پر قبضہ کر لے گا۔ مگر ایسے ہی بیٹھے رہے تب بھی وہ ہماری سلطنت پر قبضہ کر لے گا ہم کیا کریں؟"

اس کی رعایا نے جواب دیا: "ہم لڑیں گے اور اپنی جانیں حضور پر فدا کر دیں گے۔"

بادشاہ نے کہا: "لیکن اس کا کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ غنیم کے مقابلے میں ہماری فوج بہت ہی تھوڑی ہے۔"

اس پر سب چپ ہو گئے لیکن اس ریاست کے تمام باشندے اپنے بادشاہ سے بے حد محبت رکھتے تھے۔ چنانچہ کیا دیہات میں اور کیا شہروں میں سب جگہ لوگوں کو یہی فکر تھی کہ ہم اپنے بادشاہ اور اپنے ملک کو غنیم کے ہاتھ سے کس طرح بچائیں یہاں تک کہ حیوانوں اور درندوں کو بھی اپنے بادشاہ کی امداد کی فکر ہوئی۔

جب بادشاہ نے دوسری مرتبہ اپنے امیروں وزیروں کو طلب کیا تو اس موقع پر شیر بھی آئے اور کہنے لگے۔ "ہم دشمن کے گھوڑوں اور مویشیوں کو چیر پھاڑ ڈالیں گے۔"

بھیڑیے اور گیدڑ آئے اور کہنے لگے۔ "ہم دشمن کے خیموں کے ارد گرد گھومتے رہیں گے اور جو کوئی اکیلا دکیلا باہر نکلے گا اسے کھا جائیں گے۔"

کوّوں نے کہا: "ہم ان کی ہڈیاں تک نہ چھوڑیں گے۔"

لیکن بادشاہ نے کہا: "یوں کام نہ چلے گا۔"

عین اس موقع پر ایک مکھی بادشاہ کی ناک پر آ کر بیٹھی۔ بادشاہ نے ہاتھ سے اڑا دی مگر مکھی وہاں سے جانے کا نام نہ لیتی تھی۔ اس دفعہ وہ آ کر بادشاہ کے کان پر بیٹھ گئی۔ بادشاہ جھنجھلا اٹھا اور کہنے لگا۔ "اس مکھی نے تو ناک میں دم کر دیا۔ یہ مجھے کیوں تنگ کرتی ہے؟ میں پہلے ہی پریشان ہو رہا ہوں۔"

بادشاہ کے کان میں بھنبھناہٹ کی آواز آئی جیسے کوئی کہہ رہا ہو: "میں حضور کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

بادشاہ چونک اٹھا اور کہا: "یہ کون بولا؟"

وزیر نے عرض کیا: "حضور! کوئی بھی تو نہیں بولا۔"

بادشاہ کے کان میں پھر وہی باریک آواز آئی۔ "میں بولا تھا۔"

اب تو بادشاہ اچھل پڑا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے ارد گرد دیکھنے لگا مگر اس کے آس پاس کوئی نہ تھا۔ ناچار پھر آ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا مگر دل ہی دل میں سخت حیران ہوتا اور کہتا تھا کہ میری پریشانیوں اور اندیشوں نے کہیں مجھے دیوانہ تو نہیں بنا دیا۔

اتنے میں پھر وہی آواز سنائی دی کہ "میں حضور کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

امیر وزیر سب دم بخود کھڑے ہو گئے۔ کسی کے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکلا۔ مگر اب بادشاہ سمجھ گیا کہ یہ ضرور کسی ایسی ہستی کی آواز ہے جو نظر نہیں آتی۔

بادشاہ نے پوچھا: "تم کون ہو؟"

”میں مکھیوں کا بادشاہ ہوں اور آپ کی مدد کے لئے حاضر ہوا ہوں۔“

بادشاہ نے کسی قدر ناراضی سے کہا۔ ”جاؤ اپنا فضول وقت ضائع نہ کرو۔ بھلا تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟ تم مجھے پریشانیوں میں مبتلا دیکھ کر مجھ سے مذاق کرنے آئے ہو؟“

”نہیں، میں اس خیال سے ہرگز نہیں آیا ہوں۔ میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔ اور اگر آپ وعدہ کریں کہ میں جو کچھ مانگوں آپ دیں گے تو میں آپ کی مدد سے دریغ نہ کروں گا۔“

”میں صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ مجھے آپ کے دسترخوان پر بیٹھنے کی اجازت مل جائے اور جہاں چاہوں اڑ سکوں۔“

بادشاہ نے ہنس کر کہا ”جاؤ تمہیں اجازت ہے۔ میرے دشمن اب حملہ کرنے کو ہیں۔ اپنا سامان درست کر رہا ہوں لیکن مجھے یقین نہیں ہے کہ تم میری کچھ مدد کر سکتے ہو، نہ میرے دشمن کو نقصان پہنچا سکتے ہو۔“

آس پاس جو لوگ بیٹھے تھے جب انہوں نے بادشاہ کو آپ ہی آپ باتیں کرتے اور ہنستے دیکھا تو انہیں بہت فکر ہوئی۔ وہ سمجھے کہ پریشانیوں کی وجہ سے بادشاہ کا سر پھر گیا ہے اور وہ دیوانوں کی طرح آپ ہی آپ ہنس رہا ہے۔ لیکن بادشاہ نے سارا واقعہ ان سے بیان کر دیا۔ اس بات کا تو کسی کو بھی یقین نہ تھا کہ مکھیاں ہماری کچھ امداد کر سکتی ہیں۔ البتہ اس خیال پر انہیں بہت ہنسی آئی کہ مکھیاں ہماری سلطنت کی حفاظت کرنا چاہتی ہیں۔ اس موقع پر ایک بڈھا جو سب سے پیچھے بیٹھا تھا اٹھ کھڑا ہوا اور مکھی کی شرطیں مان لینے کے خلاف دہائی دینے لگا۔ اس نے چلا کر کہا ”بادشاہ سلامت! آپ نے اپنے معزز اور ظالم ہمسائے سے بھی زیادہ خطرناک دشمن کے ہاتھ اپنی سلطنت بیچ ڈالی ہے۔“

اس پر چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں۔ ”چپ رہو بڈھے، کیا بکتا ہے؟“ اور بے چارے بڈھے کو زبردستی خاموش کر کے اپنی جگہ پر بٹھا دیا گیا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد مجلس ختم ہو گئی۔ اور سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔ مگر اس عرصے میں بڈھا منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا رہا۔“

ایک لڑکے نے کہا ”خدا جھوٹ نہ بلوائے تو وہ بڈھا ضرور سقراط ہی ہو گا۔“

سقراط نے کہا ”اگر تم یونہی میری بات کاٹو گے تو میں باقی کہانی تمہیں نہ سناؤں گا۔“

ایک ننھی سی لڑکی نے کہا ”یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں کہ اس خوب صورت شہزادی کا کیا حال ہوا؟“

سقراط نے چپکے سے اسکول سے باہر نکلتے ہوئے کہا ”یہ پھر کبھی بتاؤں گا۔ آج صبح میں نے پہلے ہی تمہارا بہت سا وقت ضائع کر دیا ہے۔“

کچھ دنوں کے بعد سقراط اپنی کہانی کا باقی حصہ سنانے پھر اسکول میں آیا۔ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے وہ اسکول کے احاطے میں ادھر ادھر اوپر نیچے بڑے غور سے دیکھتا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی کوئی چیز کھو گئی ہے لیکن تھوڑی دیر بعد وہ اسکول کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

لڑکوں نے پوچھا ”احاطے میں تمہاری جو چیز کھو گئی تھی وہ ملی یا نہیں؟“

سقراط نے جواب دیا ”نہیں۔“

ایک لڑکے نے کہا ”مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔ لیکن یہ تو بتاؤ تمہاری کیا چیز گم ہوئی ہے؟“

”میری کوئی چیز گم نہیں ہوئی اور جو چیز میں تلاش کر رہا تھا وہ مجھے نہیں ملی اور مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ وہ نہیں ملی۔“

کئی لڑکوں نے زچ ہو کر پوچھا: "تمہاری کوئی چیز گم بھی نہیں ہوئی اور تم دیر تک اِدھر اُدھر تلاش بھی کرتے رہے اور جب وہ تمہیں نہیں ملی تو تمہیں خوشی بھی ہوئی۔ یہ تو پہیلی ہے پہیلی۔"

"اچھا۔ اگر تم اسے پہیلی سمجھتے ہو تو پہیلی ہی سہی۔"

ماسٹر صاحب نے کہا: "مجھے معلوم ہے آپ کو کس چیز کی تلاش تھی۔ آپ کوڑا کرکٹ تلاش کر رہے تھے لیکن وہ اب آپ کو یہاں نہیں مل سکتا۔"

سقراط نے کہا: "بجا فرمایا آپ نے اور اس سلسلے میں آپ کو دلی مبارکباد دیتا ہوں۔ مجھ کو ایک تنکا بھی تو احاطے کے آس پاس کہیں نظر نہیں آیا۔ تمام گندگی اور کوڑا کرکٹ اسکول کے گڑھے میں پھینکا جاتا ہے یقین جانیے مجھے یہ معلوم کر کے بہت خوشی حاصل ہوئی۔"

اس کے بعد سقراط چھوٹے لڑکے اور لڑکیوں کو مخاطب کر کے بولا: "مجھے امید ہے کہ جب تم بڑے ہو جاؤ گے اور اسکول چھوڑو گے تو اپنی ان تمام اچھی عادتوں کو کبھی نہ بھولو گے۔"

استاد نے کہا: "اس کی طرف سے آپ بے فکر رہیے۔ اب صفائی ان کی فطرت کا جزو بن گئی ہے اور غلاظت سے انہیں دلی نفرت ہے۔ اور یہ نفرت ان کے دل سے کبھی نہیں نکل سکتی۔ سبق پڑھنے سے پہلے یہ ہر روز اپنے اسکول کی صفائی کرتے ہیں اور مجھے پورا یقین ہے کہ اگر یہ جگہ کوڑے کرکٹ سے اٹی رہے تو اس کے خیال سے بھی انہیں یہاں بیٹھنا دوبھر ہو جائے۔"

یہ سن کر سقراط کے منہ سے بے اختیار "مرحبا" نکل گیا۔

اب کئی لڑکوں نے پوچھا: "ہاں بڑے میاں! اب وہ کہانی بھی تو سناؤ۔ ہم جانتے ہیں کہ تم بات ٹالنے کی کوشش کر رہے ہو!"

سقراط نے کہا: "وہ بھی سنائے دیتا ہوں۔ اچھا تو کہاں چھوڑی تھی کہانی؟ ہاں ہاں یاد آگیا۔ خوب صورت شہزادی باغ میں بیٹھی جراب بُن رہی تھی۔"

"نہیں یہاں تو نہیں چھوڑی تھی۔"

"تو پھر یہاں چھوڑی ہو گی کہ "بہادر نوجوان شہزادہ گھوڑے پر سوار ہو گیا اور نیام سے تلوار نکال لی۔"

"نہیں، یہاں بھی نہیں چھوڑی۔ سقراط تم جان بوجھ کر انجان بنے جاتے ہو۔ خیر ہم تمہیں بتائے دیتے ہیں۔ تم نے کہانی وہاں چھوڑی تھی جہاں مکھیوں کے بادشاہ نے چھوٹی سلطنت کو بچانے کا وعدہ کیا تھا۔"

"ہاں ہاں۔ یہیں چھوڑی تھی۔ تو صاحب! یہاں سے رخصت ہو کر مکھیوں کا بادشاہ بھن بھن کرتا ہوا سیدھا بڑے بادشاہ کی سلطنت کی طرف روانہ ہو گیا جس وقت وہ وہاں پہنچا تو وہ بڑا بادشاہ چڑھائی کے لیے اپنی فوجوں کو تیار کر رہا تھا۔ اس سلسلے میں سوچا کہ اپنی راجدھانی میں ایک بہت شاندار جشن منانا چاہیے جس میں ہمارے تمام نوجوان شامل ہوں اور دنگل میں سب اپنے اپنے جوہر دکھائیں اور اس طرح ان میں سے تمام بہادروں اور سورماؤں کو چن کر اپنی ایک زبردست فوج تیار کر لوں جو میرے گستاخ ہمسایے کو تباہ و برباد کر ڈالے۔

چنانچہ بادشاہ کے حکم سے ایک شاندار جشن منایا گیا اور ملک کے کونے کونے سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ آ کر اس میں شامل ہو گئے۔ جس جگہ نظر پڑتی تھی لوگوں کے خیمے ہی خیمے دکھائی دیتے تھے۔ ان لوگوں کا جب جی چاہتا۔ بادشاہ کے خزانے سے کھاتے پیتے اور رنگ رلیاں مناتے۔ انہوں نے بادشاہ کی راجدھانی کی تمام زمین اور پانی کو گندہ اور نجس بنا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یکایک وبا پھیل گئی اور ہزاروں موتیں ہونے لگیں۔ بہتیرے جتن

بلکہ مرنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی ہی جاتی تھی۔ تو جب بادشاہ نے سب کو حکم دیا کہ اپنے اپنے گھروں کو چلے جاؤ۔ میرے افسر تم سب کے پاس خود آئیں گے اور تم میں سے بہادروں کو چن چن کر فوج میں بھرتی کریں گے۔ یہ سن کر سب لوگ اپنے اپنے دیہات اور شہروں کو لوٹ گئے اور اپنے ساتھ بیماری کو بھی لیتے گئے اور اس طرح بڑھتے بڑھتے بادشاہ کی تمام سلطنت میں وبا پھیل گئی اور چند ہی روز میں ہزاروں لوگ موت کے گھاٹ اتر گئے تب بادشاہ نے اپنی سلطنت کے بڈھوں، امیروں، وزیروں کو بلایا۔ انہوں نے کہا "بادشاہ سلامت! ہمارے تمام نوجوان مر چکے ہیں۔ ہمارے گھر ویران ہو گئے ہیں ہم اب جنگ نہیں کر سکتے۔ آپ نے بہادر سورماؤں کی فوج تیار کرنے کے لئے جو حکم دیا تھا اس نے نہ صرف اس فوج ہی کو برباد کر ڈالا بلکہ ہمارے ملک میں بھی تباہی پھیلادی"

بادشاہ نے کہا: "افسوس! اب کئی سال تک ہم جنگ نہیں کر سکتے۔" اور سب بڈھے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

اس خوفناک وبا کا حال جب دوسرے بادشاہ کے کانوں تک بھی پہنچا اور اس کے امیر وزیر ایسے طاقت ور دشمن کے حملے سے بچ جانے پر مبارکباد دینے لگے جس وقت وہ بادشاہ کے آس پاس بیٹھے تھے تو مکھیوں کا بادشاہ بھی بھن بھن کرتا ہوا ان کے پاس آیا اور اپنی ننھی سی ترئی بجا کر اونچی آواز میں جو سب کے کانوں تک پہنچ جائے چلا کر کہنے لگا۔ "بادشاہ سلامت لائیے میرا انعام! میں نے اپنا کام انجام دے دیا ہے۔"

اس کی یہ بات سن کر سب لوگ ہنسنے لگے۔ "اے مکھیوں کے ننھے بادشاہ! ذرا ہمیں بھی معلوم ہو تم نے کیا کام سرانجام دیا ہے؟ ہمارے دشمن اگر مرے ہیں تو وبا سے مرے ہیں۔ اس میں تیری کوشش کو کیا دخل ہے؟ تو جھوٹا اور دغاباز ہے۔"

مکھیوں کے بادشاہ نے کہا: "میں ہرگز دغاباز نہیں۔"

بادشاہ نے کہا: "ثابت کرو"

مکھیوں کے بادشاہ نے کہا "میں ثابت کرتا ہوں سنئے۔ جب اس ملک کے دیہات اور شہروں سے نوجوان بادشاہ کی راجدھانی کی طرف روانہ ہوئے تو ہم بھی ان کی پیٹھوں، ان کے اسباب اور ان کے گٹھڑوں اور بیلوں پر بیٹھ کر ان کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے وہاں ہر جگہ اپنے خیمے گاڑ دیئے اور بڑی بے احتیاطی سے، رہنے سہنے لگے۔ وہ اور ان کے بیل اور گھوڑے جہاں جی چاہتا پاخانہ اور لید کر دیتے۔ اور کوئی شخص زمین صاف نہ کرتا۔ اتفاق سے ان میں ایک شخص ایک ایسی جگہ سے آیا تھا۔ جہاں ہیضہ پھیلا ہوا تھا وہ اپنے ساتھ اس بیماری کے جراثیم بھی لیتا آیا تھا ہم سب یعنی میں اور میرا لشکر پہلے تو گندگی اور کوڑے کرکٹ پر بیٹھتے اس کے بعد ان لوگوں کے کھانوں اور مٹھائیوں اور ان کے ہونٹوں اور آنکھوں پر جا بیٹھتے۔ ہم گندی جگہوں پر بیٹھنے کے بعد کبھی اپنے پاؤں صاف کرتے اور نہ دھوتے اور نہ تھکتے۔ پہلے تو ہم نے دستوں کی بیماری پھیلائی پھر جب ہم نے سنا کہ کوئی شخص اپنے ساتھ ہیضے کے جراثیم بھی لایا ہے تو ہم نے ہیضہ بھی پھیلا دیا۔" یہ کہہ کر مکھیوں کے بادشاہ نے پھر اپنی ترئی بجائی۔ اور چلا کر کہا: "اے عادل اور انصاف پسند بادشاہ اب میں اپنا انعام مانگتا ہوں۔"

یہ سن کر سب لوگ خوف سے تھرا اٹھے اور بادشاہ نے کہا: "بے شک تم انعام کے حقدار ہو۔ میں اپنے قول کے مطابق تمہیں انعام دوں گا۔ اور تمہیں میری مٹھائیوں پر بیٹھنے اور جہاں جی چاہے اڑنے کی اجازت ہوگی۔"

اب وہی بڈھا جس نے بادشاہ کے مکھی کی شرطیں مان لینے کی مخالفت کی تھی اپنی جگہ سے اٹھا اور بولا: "بادشاہ سلامت! میری التجا ہے کہ آپ نے مکھیوں کے بادشاہ سے جو اقرار کیا ہے اس سے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھئے۔"

بادشاہ نے پوچھا: "بڑے میاں یہ کیوں؟"

اس کے جواب میں وہ بڈھا جو بلاشبہ سقراط ہی تھا اور اس وقت تک لوگوں نے ٹھیک طرح پہچانا نہ تھا کہنے لگا: "جب آپ نے مکھیوں کے بادشاہ

کے ساتھ اتحاد کیا تھا۔ تو آپ نے انسان کے سب سے خطرناک دشمن کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ بادشاہ سلامت آپ کو معلوم ہونا چاہیے جتنی بھی گندگی اور غلاظت کی بیماریاں پھیلتی رہتی ہیں ان میں سے زیادہ یہی مکھیاں پھیلاتی ہیں۔"

بادشاہ نے پوچھا: "تب میں کیا کروں؟"

سقراط بولا: "حضور! آپ نے یہ وعدہ کیا تھا کہ مکھیوں کو آپ کی مٹھائیوں پر بیٹھنے کی اجازت ہوگی اور وہ جہاں چاہیں گی اڑ سکیں گی۔"

بادشاہ نے کہا: "ہاں! اور اس قول کو نبھانا میرا فرض ہے۔"

سقراط بولا: "تو اپنے قول کو نبھائیے، لیکن خبردار رہئے کہ مکھیوں کا بادشاہ بھی آپ کے دشمن کی سلطنت کی طرح آپ کی سلطنت کو بھی تباہ کر ڈالے گا۔ مکھیاں گندگی میں پرورش پاتی اور بچے دیتی ہیں اور آپ نے یہ تو وعدہ نہیں کیا کہ آپ ان کے لئے گندگی بھی مہیا کرتے رہیں گے۔"

بادشاہ نے کہا: "نہیں میں نے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا اور نہ یہ اجازت دی ہے کہ وہ بادشاہ کے سوا کسی اور کے دسترخوان پر بھی بیٹھ سکیں۔"

یہ سن کر ایک چھوٹے قد کا شخص جو کہ وہاں کھڑا تھا۔ بول اٹھا: "بادشاہ سلامت! خدا کے لئے اس طاقتور دشمن کو معاف نہ کیجئے۔" لیکن بادشاہ نے اس کی بات کی کچھ پروا نہ کی اور کہا: "ہمیں اپنی جانوں کی حفاظت کرنی چاہیے۔ ان مکھیوں نے جس طرح ہمارے پہلے بادشاہ کی فوج میں وبا پھیلا کر اسے تباہ کر ڈالا ہے اسی طرح ہمیں بھی تباہ کر ڈالیں گی۔"

مکھیوں کے بادشاہ نے اپنا ننھا سا پاؤں زمین پر مارا اور بڑی بے صبری سے پوچھا: "اے بادشاہ! انعام کب ملے گا؟"

بادشاہ نے جواب دیا: "اسی وقت لیکن میں نے تم سے جو وعدہ کیا تھا اس سے ذرا بھی تم قدم نہ بڑھا سکو گے۔"

یہ سن کر مکھیوں کا بادشاہ اڑ گیا۔ اور تھوڑی دیر میں اپنا لاؤ لشکر لے آیا۔ تمام مکھیاں بادشاہ کی مٹھائیوں کے دسترخوان پر جا جا کر بیٹھیں اور جہاں جا بیٹھی اڑتی پھرتیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ تھوڑے ہی دنوں میں بیمار پڑ گیا لیکن چونکہ اور کسی نے مکھیوں کو اپنے کھانے پینے کی چیزوں کے قریب نہ پھٹکنے دیا تھا اس لئے اور کسی کو کچھ ضرر نہ پہنچا۔ وہ اپنی کھانے پینے کی چیزیں یا تو باریک کپڑوں سے ڈھک دیا کرتے یا الماریوں، برتنوں اور بکسوں میں بند کر کے رکھتے۔ اس طرح مکھیوں کا کچھ بس نہ چلتا اور وہ وبا نہ پھیلا سکتیں۔ اور چونکہ مکھیاں گندگی میں انڈے دیا کرتی ہیں۔ انہوں نے غلاظت اور کوڑے کرکٹ کے لئے الگ گڑھے کھدوا لئے۔ وہ ان میں تمام کوڑا کرکٹ پھینک دیتے۔ اور کسی جگہ گندگی وغیرہ کا نام تک نہ رہنے دیتے۔ وہ اپنے گھروں اور دیہات کو ایسا صاف ستھرا رکھتے کہ مکھیوں کو انڈے دینے کے لئے کوئی جگہ ہی نہ ملتی۔ پہلے تو وہ لوگ جہاں جی چاہتا پاخانہ کر لیتے تھے لیکن اب انہوں نے اس رسم کو بالکل بند کر دیا اور یہ قانون بنا دیا کہ کوئی شخص بھی سوائے گڑھوں اور گھروں کے پاخانوں کے جو انہوں نے خاص طور پر اس کام کے لئے بنوائے تھے۔ اور کسی جگہ رفع حاجت نہ کرپائے۔ اور وہ اپنے اصطبلوں اور مویشی خانوں کو بھی بہت صاف ستھرا رکھتے اور لید اور گوبر وغیرہ گڑھوں میں پھنکوا دیتے وہ ان گڑھوں کو پانی سے تر کرتے رہتے تاکہ وہ گرم رہیں۔ اور ان میں خمیر اٹھتا رہے۔ اور مکھیاں وہاں بھی انڈے نہ دینے پائیں۔ جب گڑھے بھر جاتے اور تمام کوڑا کرکٹ اور گندگی مٹی میں گھل مل کر نہایت عمدہ کھاد بن جاتی تو وہ اسے اپنے کھیتوں میں استعمال کرتے۔ اب انہیں مکھیوں کا کچھ اندیشہ نہ تھا۔ انہیں نہ صرف بیماریوں اور مکھیوں ہی سے چھٹکارا مل گیا۔ بلکہ ان کی کھیتیاں بھی پہلے سے زیادہ ہری بھری ہو گئیں۔ اور ان کی جسمانی صحت بھی پہلے کی نسبت اچھی ہو گئی۔

اس طرح انہوں نے اپنی سلطنت کو نہ صرف اپنے ظالم ہمسایہ بادشاہ ہی سے بچا لیا بلکہ اس سے بھی زیادہ خطرناک دشمن یعنی مکھی کے شر سے بھی محفوظ ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی چھوٹی سلطنت کی رعایا نے بڑی سلطنت کی رعایا سے دوستی بھی پیدا کر لی۔ اور دونوں نے آپس میں عہد کر لیا کہ ہم بجائے ایک دوسرے سے لڑنے کے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر گندگی، مکھی اور وبا کے خلاف جنگ کرتے رہیں گے۔ اور چھوٹی سلطنت کی شہزادی

شہزادے سے شادی کرلی اور وہ اس کے بعد ہمیشہ ہنسی خوشی زندگی بسر کرتے رہے۔"
نے ننھی لڑکی سے کہا: "کیوں ننھی اب تو تم خوش ہو؟ اب تو تمہاری شہزادی پھر خوش رہنے لگی ہے۔"
بڑی ہوئی لڑکی نے جواب دیا: "ہاں اب جب ختم ہوئی تو تم اس کہانی کو جو میں نے تمہیں سنائی ہے ناٹک تیار کرکے
دکھاؤ اور بیزہ سے [illegible] کے لیے [illegible] سا لباس تیار کرنا اور اس کے شانوں پر پر بھی لگا جب تمہارے
س ناٹک کو دیکھیں گے تو ان کی کمر میں اکڑ آجائے گا۔ اگر تم بنا لے جاؤ گے، [illegible] اس قدر خیال کیوں رکھتے ہو اور تمہیں اپنے
ور دیہات کو صاف ستھرا رکھنے کی اتنی فکر کیوں ہوتی ہے۔"

(دیہات میں بوائے سکاؤٹ کا کام)
از ایف ایل برین: ایم سی، آئی سی ایس

ترجمہ، پطرس

اخبار میں ضرورت ہے

یہ ایک اشتہار ہے لیکن چونکہ عام قسم کے اشتہاروں سے بہت زیادہ طویل ہے اس لئے شروع ہی میں یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوا ورنہ شاید آپ پہچان نہ سکتے۔

یہ اشتہار دینے والا ایک ہفتہ وار اخبار کا ایڈیٹر ہے۔ چند دن ہوئے ہمارا ایک چھوٹا سا اشتہار اس مضمون کا اخباروں میں نکلا۔ ضرورت ہے مترجم اور سب ایڈیٹر کی ضرورت ہے۔ یہ غالباً آپ کی نظر سے بھی گزرا ہوگا۔ اس کے جواب میں کئی امیدوار ہمارے پاس پہنچے اور بعض کو تنخواہ وغیرہ طے کرنے کے بعد ملازم بھی رکھ لیا گیا لیکن ان میں سے کوئی بھی ہمارے منشا سے زیادہ دن ٹھہر نہ پایا۔ ہم سمجھتے ہیں یہ غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ اشتہار کا مطلب وہ کچھ اور سمجھے۔ ہمارا مطلب کچھ اور تھا۔ مختصر سے اشتہار میں سب باتیں وضاحت کے ساتھ بیان کرنا مشکل تھا جب رفتہ رفتہ ہمارا اصل مفہوم ان پر واضح ہوا یا ان کی غلط توقعات پوری نہ ہوئیں تو تعلقات کشیدہ ہونے لگے اور بعض اوقات دست درازی تک نوبت پہنچی۔ اس کے بعد یا تو وہ خود ہی ناشائستہ باتیں ہمارے منہ پر کہہ کر چائے والے کا بل ادا کئے بغیر چل دیئے یا ہم نے ان کو دھکے مار کر باہر نکال دیا۔ اور وہ باہر کھڑے نعرے لگایا کئے جس پر ہماری اہلیہ نے ہم کو اگلے دوسرے دن دفتر جانے سے روک دیا اور اخبار بغیر ایڈیٹری کے شائع کرنا پڑا۔ چونکہ اس قسم کی غلط فہمیوں کا سلسلہ ابھی تک بند نہیں ہوا اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ ہم اپنے مختصر اور مجمل اشتہار کے مفہوم کو وضاحت کے ساتھ بیان کریں کہ ہمیں کس قسم کے آدمی کی تلاش ہے۔ اس کے بعد جس کا دل چاہے ہماری طرف توجہ کرے جس کا دل نہ چاہے وہ بے شک کوئی پیپر الاٹ کرا کے ہمارے مقابلے میں اپنا اخبار نکال لے۔

امیدوار کے لئے سب سے بڑھ کر ضروری یہ ہے کہ وہ کام چور نہ ہو۔ ایک نوجوان کو ہم نے شروع میں ترجمے کا کام دیا۔ چار دن کے بعد اس سے ایک نوٹ لکھنے کو کہا تو بگڑ کر بولے کہ میں مترجم ہوں سب ایڈیٹر نہیں ہوں۔ ایک دوسرے صاحب کو ترجمے کے لئے کہا تو بولے میں سب ایڈیٹر ہوں، مترجم نہیں ہوں۔ ہم سمجھ گئے کہ یہ تجربے کار لوگ مترجم اور سب ایڈیٹر کو الگ الگ دو آدمی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے اخبار میں یہ قاعدہ نہیں۔ ہم سمجھے تھے کہ آپ نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔ دوسرے صاحب کہنے لگے آپ کے اشتہار میں عطف کا استعمال غلط ہے۔ ایک تیسرے صاحب نے ہمارے ایمان اور ہمارے صرف و نحو دونوں پر حملے کئے۔ اس لئے ہم واضح کئے دیتے ہیں کہ ان لوگوں کی ہم کو ہرگز ضرورت نہیں جو ایک سے دوسرا کام کرنے کو اپنی ہتک سمجھتے ہیں اور اس کے لئے صرف و نحو کی آڑ لیتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو ملازم ہوں گے انہیں تو وقتاً فوقتاً سامنے کی دکان سے پان بھی لانے پڑیں گے اور اگر انہیں بحث ہی کرنے کی عادت ہے تو ہم ابھی سے کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے نزدیک سب ایڈیٹر کے معنے یہ ہیں۔ ایڈیٹر کا اسم مخفف۔ اخبار میں ایک عہدہ دار کا نام جو ایڈیٹر کو پان وغیرہ لا کر دیتا ہے۔

یہ مجھ [illegible] معاف [illegible] پرسی [illegible] ذرا پہلے خیال تھا کہ [illegible] کو معاف کر دیا جائے۔ ترجم [illegible] ایڈیٹر [illegible] سے تو [illegible] لیکن یہ خیال [illegible] سے مٹنے [illegible] شاید [illegible] طرح کے [illegible] اور مجاہدیاں [illegible] شائع کریں یہ بھی خیال [illegible] کی [illegible] ایسی ہو گیا [illegible] لیکن ایک دن [illegible] معلوم ہوا کہ [illegible] سے [illegible] نہیں [illegible] تو [illegible] ہم نے [illegible] آج کل [illegible] ہی [illegible] مولانا [illegible] آپ [illegible] کی [illegible] اب تو [illegible] گا۔ [illegible] دیکھ لیجئے [illegible] کے اندر [illegible] کر نے [illegible] نہیں سکتے انہوں نے [illegible] کہ آپ بھی [illegible] کے پیٹ [illegible] کی [illegible] اولاد [illegible] نے اپنا تکیہ کلام بنا لیا [illegible] آپ کی [illegible] سے کیا تعلق [illegible] آپ [illegible] کر رہے ہیں [illegible] روٹی کی [illegible] کے متعلق [illegible] بیان کریں کہ آپ [illegible] جائیں۔ خدا حافظ [illegible]

ہمارے اخبار میں [illegible] کا اہتمام سب سے مقدم ہے [illegible] شہر کے ایک معزز [illegible] میں اخبار [illegible] نے [illegible] خدمت خلق اور [illegible] کیلئے [illegible] پبلک [illegible] حیثیت اور [illegible] وقت [illegible] چنانچہ [illegible] کی [illegible] میں [illegible] کامیابی [illegible] حیرت انگیز [illegible] میں [illegible] ایسے واقعات سے [illegible] کانفرنس [illegible] جہاں خود [illegible] کا انتظام بھی ہو [illegible] اپنے دو چھوٹے بچوں کے [illegible] سال اور لڑکی کی پانچ سال ہے شریک ہوں گے [illegible] شامل ہوں گے اور [illegible] ایڈیٹر کو زیر لب [illegible] کی اجازت [illegible] کی [illegible] اور [illegible] میں غیر معمولی دلچسپی لیتے ہیں [illegible] پریس کانفرنس [illegible] ہندوستانیوں کی [illegible] رہے [illegible] ان کی طبیعت سنبھل۔

ہمارے اخبار کا نام آسمان ہے [illegible] پر [illegible] آسمان [illegible] فقرہ [illegible] ہے اس فقرے [illegible] کی کوئی [illegible] ایڈیٹر [illegible] کیونکہ یہ خود ہمارے [illegible] صاحب کا انتخاب ہے [illegible] شروع [illegible] میں ان سے [illegible] بھی [illegible] صاحب اس [illegible] کا اخبار سے [illegible] بننے لگے اخبار کا نام آسمان ہے اور اس مصرعے میں بھی آسمان آتا ہے ہم نے کہا [illegible] لیکن [illegible] اس مصرعے میں کیا خوبی ہے [illegible] علامہ اقبال [illegible] علامہ اقبال سے [illegible] اور [illegible] اس پر ہم چپ ہو گئے پیشانی [illegible] کثیر الاشاعت اخبار [illegible] یہ [illegible] تجویز کیا ہوا ہے [illegible] کی کوشش نہ کی جائے کیونکہ [illegible] کی عادت ہے ہم نے جہاں جہاں ایڈیٹری کی اپنے اخبار کی پیشانی پر یہ مزار [illegible]

بعض امیدوار ایسے بھی آتے ہیں [illegible] سوالات پوچھنے لگتے ہیں ایک سوال [illegible] کہ آپ کے اخبار کی [illegible] ہے جیسے کوئی پوچھے کہ آپ کی ذات کیلئے ہماری پالیسی میں چند باتیں [illegible] مستقل طور پر شامل ہیں [illegible] اور [illegible] ہرگز نہیں [illegible] ہم نے پریذیڈنٹ [illegible] کے [illegible] اخبار [illegible] شائع [illegible] لیکن [illegible] پالیسی میں [illegible] کے [illegible] ہیں اسی لئے [illegible]

معلوم ہوا ہے [illegible] ہمارے [illegible] کے بعد [illegible] نے بیٹا [illegible] ہم سے پہلے [illegible] جانشینوں کا تبادلہ [illegible] کیا جائے اور ان کے لڑکے کی شادی جلد پروپرائٹر کی لڑکی سے طے پائی ہے اور خیال ہے کہ [illegible] شادی کردی جائے۔

ہفتے کے متعلق ہمارا خاص [illegible] ہے اور ہر سب ایڈیٹر اور [illegible] کو اس کی مشق بہم پہنچانی پڑے گی۔ مثلاً پاکستان [illegible] نہیں [illegible] آئے، ہوائی جہاز [illegible] نہیں [illegible] ہوتا ہے، [illegible] کو اس بات کا خاص طور پر خیال رکھنا پڑے گا۔ ایک [illegible] نے [illegible] کی خبر [illegible] اور تین آدمی مر گئے۔ حالانکہ انہیں لکھنا چاہئے تھا کہ دو موٹروں کے تصادم کا حادثہ رونما ہوا جس [illegible] کے [illegible] پر چند اشخاص جن کی تعداد تین بتائی جاتی ہے مہلک طور پر مجروح ہوئے۔

لاہور کارپوریشن نے اعلان کیا کہ [illegible] پالتو کتے رکھے گئے ہیں [illegible] ایک ٹیکہ [illegible] لازمی ہے جس پر کمیٹی کا نمبر لکھا ہوگا۔ ایک مترجم نے یہ ترجمہ یوں کیا کہ جو کتے رکھے گئے ہیں [illegible] ہونا چاہیے حالانکہ کارپوریشن کا مطلب صرف یہ تھا کہ ایک جانور کے گلے میں ایک [illegible] لٹکا دیا جائے۔

[illegible] سب ایڈیٹر [illegible] شامل نہیں۔ [illegible] ایڈیٹر کے نام [illegible] ان کو استعمال کرنے کا مجاز ہے۔ [illegible] یہ پروپرائٹر [illegible] کے کام [illegible] عنقریب اس بارے میں [illegible] ایک نیا سمجھوتہ ہونے والا ہے۔ اگر کوئی سب ایڈیٹر اپنی تحریر کے ذریعے کسی [illegible] سے پاس حاصل کرے تو وہ اس کا اپنا حق ہے لیکن اس بارے میں ایڈیٹر کے ساتھ کوئی مفاہمت کرلی جائے تو بہتر ہوگا۔ علیٰ ہذا جو اشیا ریویو کے لئے آتی ہیں مثلاً بالوں کا تیل، عطریات، صابن، ہاضم دوائیاں وغیرہ وغیرہ ان کے بارے میں بھی ایڈیٹر سے تصفیہ کرلینا ہر سب ایڈیٹر کا اخلاقی فرض ہوگا۔

ممکن ہے ان شرائط کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد کوئی شخص بھی ہمارے ہاں ملازمت کرنے کو تیار نہ ہو۔ اس کا امکان ضرور موجود ہے لیکن ہمارے لئے یہ چنداں پریشانی کا باعث نہ ہوگا۔ ہمارے پروپرائٹر [illegible] دو تین مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ اشاعت بہت بڑھ رہی ہے بہت بڑھ رہی ہے اور اسی وجہ سے انہوں نے ہماری ترقی بھی روک دی ہے۔ عجب نہیں کہ جب ہم دفتر میں اکیلے رہ جائیں تو وہ ہمیں ترقی دینے پر آمادہ ہو جائیں۔ وہ اصولاً اسٹاف بڑھانے کے خلاف ہیں۔ دانشمندانہ انداز میں کہتے ہیں کہ اسٹاف زیادہ ہو تو بات باہر نکل جاتی ہے۔ یہ معلوم کبھی نہیں ہوا کہ کیا بات؟ کون سی بات؟ اپنے ڈرائیور کو بھی وہ اکیلے ہی کام کرتے ہیں اور اس کی وجہ بھی یہی بتلاتے ہیں کہ ورنہ بات باہر نکل جاتی ہے۔

دوست کے نام

مرزا محمد

میرے کراچی کے دوست!

چند دن ہوئے میں نے اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ کراچی میں فنون لطیفہ کی ایک انجمن قائم ہوئی ہے جو وقتاً فوقتاً تصویروں کی نمائشوں کا اہتمام کریگی واضح طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ اس کے کرتا دھرتا کون اہل حضرت ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ کو ایسی باتوں کا بڑا شوق ہے اور مدت سے ہے اور آپ ادب اور آرٹ کا ذوق صحیح رکھتے ہیں اس لئے مجھے یقین ہے کہ آپ اس میں ضرور شریک ہوں گے۔ بلکہ عجب نہیں کہ یہ انجمن آپ ہی کی مساعی کا نتیجہ ہو اور آپ ہی نے اپنی عادت سے میری خوش مذاق لوگوں کو ایک نقطہ پر جمع کر لیا ہو جنہیں شوق تو ہے لیکن آپ کا سا [illegible] نہیں۔ یہ سوچ کر بہت اطمینان ہوا کہ چلو دیر سویر خیالوں کی ایک انجمن بنا کر آپ کو ضرور ایک گونہ تقویت قلب نصیب ہوگی۔ وہ ذوق جو کتابوں اور تصویروں سے دل اور دنیا کی [illegible] کم کرنے کے لئے انسان تھک جاتا ہے۔ ذوق سلیم کی تازگی پریشانی کی وحشت اور تلخی غالب آنے نہیں دیتی ہے ورنہ انسان دیوانہ نہیں تو علیل دماغ ضرور ہو جاتا ہے اور غالب کا ایک مصرعہ ثانیہ جل پر پڑھنے کو جی چاہتا ہے کہ "مقدور ہو تو ساتھ رکھوں راز داں کو میں۔"

لیکن میرے دوست! کیا اس کام میں کسی نے آپ کی مزاحمت نہیں کی؟ کیا کسی مقامی اخبار نے جل کر نہیں لکھا کہ پاکستان پر ابتلا کا زمانہ آیا ہوا ہے۔ اور آپ جیسے خوش فکر لوگوں کو مصوری اور نقاشی کا شوق چرایا ہے؟ کسی نے مجاہدے شہر رقص اور موسیقی کی سازش کا اعتراض نہیں کیا؟ کسی دستور چشم بددور میں آپ دیں سے [illegible] نے مسجد میں وعظ کرتے ہوئے آپ کے لہو و لعب اور تفریح کوشی پر لعنت نہیں کی؟ اور آپ پر کفر اور شرک اور الحاد کا فتویٰ لگا کر لوگوں کو آپ کے خلاف نہیں اکسایا؟ اور کچھ نہیں تو کیا کسی گنگ مصلحت بین افسر نے ہمدردی اور تہذیب کے رکھ رکھاؤ کے ساتھ آپ کو یہ مشورہ نہیں دیا کہ برخوردار

ببانگ چنگ مخور مے کہ محتسب تیز است؟

اور بالفرض ان باتوں سے بچ نکلے تو کیا منافقت کے موقعے پر کسی نیم تعلیم یافتہ ہمسفر نے جو تنخواہ میں آپ سے برتری کا دعوے دار ہے آپ کی آزاد منشی کا مذاق نہیں اڑایا؟ اور جب آپ پیچھے ہوئے فقرے کسے تو آپ پر قہقہے بلند نہیں ہوئے؟

اگر آپ کو ایسی منزلیں پیش نہیں آئیں تو کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ ہوگی یا پھر بیزاری اور بددلی کم رہی ہوگی اور آپ کراچی [illegible] پاکستانی رہی ہوگی [illegible] حسن مذاق [illegible] وہ آج کل ایک مہاجر یتیم کی طرح [illegible] کسی کمال کے کرنے میں سرخرو ہو جاتا

جہاں ابر چھا رہا ہے، مینہ برس رہا ہے، اور آندھیاں چل رہی ہیں۔

پچھلے سال قائد اعظم یہاں تشریف لائے تھے ـــ اور وہ باغ جس کو لارنس گارڈن کہا کرتے تھے، اس میں جو قطعہ "روز گارڈن" کہلاتا تھا وہاں ایک عظیم الشان پارٹی ہوئی۔ اس دن جو پاکستان کا پہلا جشن کا دن تھا "روز گارڈن" کا نام "گلستانِ فاطمہ" رکھا گیا۔ اور یہ نام ایک بڑا پتھر کھدوا کر باغ میں جو چھوٹی سی روش اشجار کی جنوب مغرب سمت ایستادہ ہے اس کی پیشانی پر نصب کیا گیا لیکن اس کی کتابت ایسی کاریگری سے منسوب تھی کہ مدرسے کے لڑکوں کو بھی کسی انسپکٹر کی تشریف آوری پر ایسا قطعہ نستعلیق لکھتے شرم آتی۔ "گلستانِ فاطمہ" کی بے ذوق ترکیب سے قطع نظر کیجئے اور اس کے مصنوعی پن کو جانے دیجئے جس کی بدولت نہ وہ غریب کہیں کا اس نام سے رہا، ان کا ذکر نہیں جو دوپہر کے وقت درختوں کے سائے میں اپنا گرد آلود جوتا سرہانے رکھ کر اس باغ میں سو جاتے ہیں۔ وہ بچے اور بوڑھے جو [illegible] کشش پاتے ہیں، یا جو شام کے وقت موٹروں میں سوار ہو کر یہاں ٹینس کھیلنے آتے ہیں۔ لیکن جب ان بھوکے پیاسے گنہگار آنکھوں نے اسے یوں ایک نمایاں جگہ پر منقوش دیکھا تو ہر دل دہل کر رہ گیا، ہونے لگا کہ کاش ایسے شاندار موقع کے لئے اس سے بدصورت کتابت کی نمائش ذہن میں نہ آسکتی تھی۔ مسلمانوں کی قوم، وہ قوم جو کبھی بچپن سے لے کر خوشنویسی کی علمبردار ہے جس نے قرآن پاک کے ہزاروں نسخے اس صناعی اور ہنرمندی سے لکھے کہ آج تک قدامت سے بھی ان کو آنکھوں پر رکھا ہوا۔ پنجاب کا خطہ، وہ خطہ ہے نستعلیق کی ایک جدید اور جمیل طرز کے موجد ہونے کا فخر حاصل ہے۔ لاہور کا شہر، وہ شہر جہاں ہر گلی میں ایک خوشنویس رہتا ہے اور جہاں حکیم فقیر محمد مرحوم جیسے استاد فن پیدا ہوئے جن کے سامنے ہندوستان بھر کے جادو رقم زانوئے تلمذ تہ کرتے تھے۔ اور اس پر یہ حال کہ اس تقریب سعید پر، اس شہر میں، مسلم قوم کی طرف سے عقیدت اور محبت کے صرف دو لفظ لکھنے پڑے یا اوراق کے کسی داغ سے خطا ہوں اور نشست بے ڈھنگی ہو۔ آپ دیکھتے تو یقیناً آپ کو اس کی تہ میں بدمذاقی کا عروج نظر آتا۔ اور آپ پژمردہ ہو جاتے اور ڈھونڈتے پھرتے کہ کس کے پاس جا کر شکایت کروں۔ اور اگر آپ کچھ بولتے تو بعض ایسے بھی ہوتے کہ ایسی خردہ گیری پر آپ کو بدتمیز کہتے یا آپ سے توقع رکھتے کہ آپ ہر قباحت کو حسن کہیں یا حسن کہیں۔ مگر آپ کو پاکستان میں کیسے خط کا اہتمام کھٹکتا اور آپ کی دل افگاری پر بن آتا۔

اب آپ اس انجمن کے حلقے میں بیٹھے آپ کو کسی منبر پر پائیں اور آپ کے سامنے آپ کے ہم قوم بیٹھے ہوں اور وہ آپ کو زبان کھولنے کی اجازت دیں تو آپ جو سینے میں دردمند دل رکھتے ہیں یہ کہنے سے کیوں کر باز آئیں گے کہ اے مسلمانو! تمہارے آباؤ اجداد قطعہ نویسی اور علم اور ادب کا وہ ذوق رکھتے تھے کہ دنیا میں اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ کوفی اور طغرے، نستعلیق اور نسخ، کس کس نہج سے انہوں نے اسے نقش کیا ہے۔ ان کے ایوانوں میں آویزاں وصلیوں کو دیکھو، ان کے مطلا اور مذہب نسخوں کو دیکھو، ان کے روضوں اور محلوں، ان کی مسجدوں اور مقابر، ان کے مزاروں اور سکوں اور مہروں، ان کی قبروں اور ان کے کتبوں کو دیکھو۔ مرگ یا زیست کا کوئی مقام، سلطنت یا افلاس، مسرت یا ماتم، جشن یا یکسوئی، خلوت یا جلوت کا کوئی مقام ایسا ہے جہاں انہوں نے قلم اٹھایا ہو اور ان کے قلم نے حسین و جمیل حروف کے لافانی نقوش چوب و کاغذ اور سنگ پر ثبت نہ کر دئیے ہوں۔ اب جب کہ خدا نے تمہیں اپنے گھر کے جیالے محافظ بنا کر سب قوتیں تمہارے ہاتھ میں دے دی ہیں تمہیں کیا لازم ہے کہ اس ورثہ کو ہاتھ سے جانے نہ دو گے اور عہد کرو کہ آج سے تمہاری دکانوں، تمہارے مکانوں، تمہارے دفتروں، تمہاری کتابوں اور اخباروں اور رسالوں، تمہاری مسجدوں اور تمہارے مزاروں، تمہارے سرناموں اور تمہارے نوٹس بورڈوں پر جہاں جہاں تمہارے ہاتھ کے خط لکھے جائیں گے اسلاف کا نام روشن کریں گے۔ اور جو نزاکتیں اور لطافتیں اور رعنائیاں انہوں نے صدیوں میں پیدا کی ہیں انہیں مسخ نہ ہونے دیں گے تاکہ جہاں کسی کو تمہاری تحریر نظر آئے وہاں بے کھٹکے یہ کہا جائے کہ یہ اس قوم کا لکھا ہوا ہے جس نے دنیا میں حرفِ خطی کا مرتبہ بلند کیا اور جو اب بھی اپنی حسن آفرینی پر ناز کرتی ہے

بیٹھے سے آپ کیوں شکایت بتائیں گے، لیکن کیا آپ کی بات کوئی سنے گا؟ کیا کراچی میں ہیں ایسے لوگ؟ فنون لطیفہ کی انجمن تو آپ نے بنالی ہے۔

اور پھر نقوش والے تک کو تعارف رہے گی لیکن کیا اسے کبھی پڑھے گا؟ بات تصویروں کا ذکر بھی کیجئے گا)، اخبار میں لکھا تھا آپ تصویروں کی نمائش کا اہتمام کر رہے ہیں۔ یہ پچھلے کلسمہ دوست وقتاً فوقتاً مجھے اپنی خیریت سے مطلع کرتے رہتے ہیں گا. کیونکہ کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ نہیں تو آپ کو بے انتہا احتیاجات سے کام لینا پڑے گا اور عجب نہیں کہ لوگ آپ کا حال دیکھ کر عبرت پکڑا کریں۔

ہمارے ملک میں اس وقت کوئی بھی ادارہ ایسا نہیں جسے آپ صحیح معنوں میں آرٹ سکول کہہ سکیں۔ لاہور یونیورسٹی کے نصاب میں آرٹ بحیثیت ایک مضمون کے شامل تھا لیکن یہ ایک مخلوط سا شغل تھا جس میں تھوڑی سی موسیقی، تھوڑی سی مصوری اور کچھ صنعت اور دستکاری سب چٹکی چٹکی بھر چھڑک دی گئی تھیں اور اس معجون کو ایک زنانہ مشغلہ سمجھ کر صرف لڑکیوں کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ یہ مضمون اب بھی نصاب میں موجود ہے۔ لیکن کب تک؟ پہلے امتحان لینے والی ایک یورپین خاتون تھیں جو یہ مضمون پڑھاتی تھیں۔ وہ لمبی ادھر ادھر ہو گئیں اور کوئی ان کی جگہ دستیاب نہ ہوئی (یہ قصہ بھی پاک ہو جائے گا کیونکہ لڑکیوں کو پڑھانے کا کام تھا تو اسے کسی مرد کے سپرد کیا جاتا؟ آوازے نہ کسے جائیں گے؟) اور پھر اس مضمون کا حلیہ بھی ہر سال نئے سال بدل رہا ہے۔ موسیقی تو ترک کر دی گئی ہے کیونکہ ہو تو بھلا کس کی مجال کہ اس کی بیٹی اس کے ہاتھ سے یہ لکھا لیجئے کہ ہمیں گانے کا شوق ہے؟ باقی رہی تصویر کشی تو ایک نئے ملے دن سنا گیا کہ ایک کالج نے لکھا، عجیب ہے کہ ہماری لڑکیاں جان داروں کی شکلیں نہ بنائیں گی۔ چنانچہ تجویز ہو رہی ہے کہ تصویر کشی کی مشق صرف سیب، ناشپاتی، مرتبان یا پہاڑیا، جنگل پر کی جائے۔ اس پر ایک آدھ جگہ بحث ہوئی۔ شریعت کا قدم درمیان میں آیا۔ ایک روشن خیال مولوی صاحب نے صرف اتنی ڈھیل دی کہ ہاتھ کی بنی ہوئی تصویریں تو ہرگز جائز نہیں فوٹو البتہ جائز ہے وجہ یہ بتائی کہ فوٹو میں انسان کی شبیہ ہو بہو ویسی ہی ہوتی ہے۔ ہاتھ سے تصویر بنائی جائے تو اس میں جھوٹ ضرور سرایت کر جاتا ہے کسی نے کہا فوٹو بھی تو کئی حرفتوں سے لی جاتی ہے اور بعض فوٹوگرافر بھی تو برشے لئے کار رہتے ہیں جو اب طلا یا پکڑ ستی اور تکلف سے کام لیا جائے تو فوٹو بھی جائز نہیں رہتا۔ غرضیکہ ان کے نزدیک اسی ایک فوٹوگرافر کا کام حق و راستی کا آئینہ دار ہے جو لاہور کے چڑیا گھر کے باہر دو روپے لے کر تصویر کھینچتا ہے یہ حال تو جوان ہمارا شیاد کالج باقی ہے جنگل پہاڑ، دیا تو وہاں بھی ایک نہ ایک دن کوئی کو راہ حق بین مصوروں کے "مجموعہ" کو گردن سے دبا دیں گے، اور آپ پیچھے رہ جائیں گے کہ یہ تو دین کا ہے یا یہ تو بہت بڑا آرٹسٹ ہے! اور آپ کے ہاتھوں سے تصویر نوچ کر پھاڑ دی جائے گی۔

ان حالات میں چغتائی کے بچنے کا امکان بہت کم ہے کوئی بات "پیچ" بھی ہوتی ہے اس کی تصویروں میں؟ صرف تم آنکھوں کی انگلیاں معلوم ہوتے ہیں۔ اور پھر انسانوں کی تصویریں بنانے سے بھی تو نہیں چوکتا اور صرف مردوں ہی نہیں بلکہ عورتیں بھی۔ غزال چشم سینہ چاک اور بعض اوقات عریاں کے بند تک دکھائی دے جاتے ہیں۔ گو یقین سے کچھ کہنا مشکل ہوتا ہے کیونکہ چغتائی کی تصویروں میں کسے ڈوریاں، پھندنے بہت ہوتے ہیں اور کچھ میں نہیں آتا کہ یہ تکیہ یا ڈوری لیلیٰ کے لباس کا حصہ ہے یا ناقہ کے ساز و سامان کا۔ لیکن چغتائی کی وجہ سے ایک سہولت مزید نظر آتی ہے وہ یہ کہ لے دے کے یہی ایک ہمارا مصور ہے اسے دفن کر دیا تو یہ وبا فوراً ختم ہو جائے گی اور ہماری مصوری ایک ہی ضرب سے ہمیشہ کے لئے پاک ہو جائے گی۔ باقی رہی مغلوں کی قدیم تصویریں یا ایرانی مصوروں کے قدیم نمونے جو چند لوگوں کے پاس بطور تبرک محفوظ ہیں یا جن کی انڈیا آفس کے عجائب خانے کی تقسیم کے بعد پاکستان کو مل جانے کی امید ہے تو ان کو کسی اور ملک کے ہاتھ بیچ کر دام وصول کئے جا سکتے ہیں۔ کیا کراچی میں لوگوں کا یہ خیال نہیں؟ اگر نہیں تو کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ ہوگی۔

لیکن یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ آپ کا ان سا ایسا جو بیچ ہے اور ان سے کم عمر یا کم تر ہیں، اٹھیں ہے کہ معاشرے کے منصفی اور ان کی دریوں تک پہنچا سکیں گے۔ آپ کی تحریر و تحقیق کی سوجھ بوجھ رہی ہے لیکن یہاں آ کر یہ بات رہ جاتی ہے۔ اشتراک سے لڑ بھی ہوا، ان کا مطالعہ اور علم آپ کہیں کر دکھا دیتے ہیں، آپ کوئی سا بیان پیدا کیجئے۔ آپ نے دیکھے دیکھے، وہ تخریب کی راہ اختیار کرتا ہے۔ رنگ جس چیز کا نمونہ ہو اس کے لئے ہی سب سے پہلے اس چیز کا تعین کرنا ہے۔ ہیں آپ کہتے ہیں کہ رمضان کا احترام، اب ہے یہ لوگ ٹولیاں بنا بنا کر بازاروں میں ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ کس کا منہ کالا کریں۔ آپ اسلام کی رحمت دیکھئے تو کہاں نظر آتی ہے جس کے رستے کے [illegible] ہیں؟ آپ خیال تو کیجئے کہ لوگ سر بازار ڈھولوں والے منہ پر جھکے ہیں اور کیوں پر اپنا سیاہ زردہ آزماتے ہیں ؎

بیزار آسماں سے ہے ادھر ننگ زندگی
اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگ مسلمانی؟

ایسے غیظ و غضب کی فضا میں بھی آج تک کہیں آرٹ پنپا ہے؟ آرٹ کے لئے تو جذبہ اور لطف اور استحکام اور اخلاق اور فراغ لازم ہیں یا پھر کوئی ولولہ کوئی امنگ کوئی عشق جو دلوں کے دروازے کھول دے اور ان میں سے شعر و نغمہ، نقش و رنگ کے طوفان اچھل اچھل کر باہر نکل پڑیں۔ کیا کہیں آرٹ ایسے میں بھی پنپتا ہے؟ کہ ہر طرف دولت اور اقتدار کی ہوس نے اندھا اور بہرہ کر رکھا ہو اور ہر چھوٹا اپنی بے بضاعتی کا بدلہ ہر چھوٹے سے اپنی جگہ سے بیٹھے بیٹھے لیتا ہو، نہ کوئی اقتصادی نظام ایسا ہو کہ ہر چیز کی پوری قیمت اور ہر قیمت کی پوری چیز نصیب ہو اور تنگ قلب کے کوسے نجات پا کر قناعت کی گود میں ذرا آنکھ جھپک لیں نہ کوئی اخلاقی نظام ایسا ہو کہ لوگوں کو اس دنیا یا اس دنیا میں کہیں بھی جزا و سزا کی امید یا خوف ہو، نہ مسرت کا کوئی ایسا جوبن ہو کہ درختوں کی ٹہنیاں مست ہو کر جھومیں اور چڑیوں کی سرسراہٹ سے آپ ہی آپ نغمے پیدا ہوں، نہ حقیقت کا کوئی گوشہ ایسا ہو جہاں آپ کا تماشا مشغول ہو کر بیٹھ جائے اور آپ کے لئے تصویریں بناتا ہے، نہ آس پاس کوئی ایسی نرالی بستی ہو جہاں شاعر غریب شہر کو گھومتا پھرے اور لوگ اسے دیوانہ نہ سمجھ کر اسے بکنے دیں۔ فنون لطیفہ کی انجمن تو آپ نے بنا لی ہے لیکن ڈرتا ہوں کہ کہیں پہلا کام اس انجمن کا یہ نہ ہو کہ چند تصویروں کو مخرب اخلاق اور عریاں کہہ کر جلا دیا جائے، چند مصوروں پر اوباشی اور بے دینی کی تہمت لگا کر انہیں ذلیل کیا جائے یا پھر ان پر ایسے لوگ مسلط کر دئے جائیں جو ان کے ہنر کو فکر و دین سے کمزوری کی کسوٹیوں پر پرکھیں اور ان پر واضح کر دیں کہ جس برتری کا انہیں دعویٰ تھا اس کا حساب ہو گیا ؎

ہیں اہل خرد کس روش خاص پہ نازاں
پابستگیٔ رسم و رہ عام بہت ہے

میں جانتا ہوں کہ آپ آرٹ کو عشرت جنس سمجھتے ہیں محض امارت کا دل بہلاوا نہیں سمجھتے، آپ ایسے نہیں کہ آپ کو جاندار ہی کی تصنع پر اصرار ہو یا محض تصویر ہی پر اصرار ہو۔ جس کو اختیار ہے جہاں چاہے رہے جو شغل چاہے اختیار کرے۔ فرق یہ ہے کہ زندہ رہے اور امیر غریب اچھے برے، ادنیٰ اعلیٰ سب پر اپنی بخششیں ارزانی فرمائے۔ ایک زمانہ تھا کہ آرٹ اور صنعت و حرفت کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ تھا۔ آپ تو اس عہد زریں کو واپس لانا چاہتے ہوں گے، تاکہ آرٹ کا جلوہ بچوں کے کھلونوں میں، کسان کے شہد میں، سیلانی کے ہاتھ کی چوڑی میں، پنہاری کے مٹی کے گھڑے میں، غرض زندگی کے ہر گوشے میں ضو پاش ہو لیکن جو ننھی ننھی شمعیں یہاں وہاں فشاں ہیں انہیں ہی بجھا دیا گیا تو لاکھوں انسانوں کی زندگیاں جو ابھی تک تاریک پڑی ہیں وہ کیسے جگمگائیں گی؟ کیا کراچی میں جو آپ کے ہم جلیس ہیں انہیں اس بات کا احساس ہے؟ اگر ہے تو انہیں بتا دیجئے کہ آرٹ کی ایک مسکراہٹ کے لئے انہیں اس بے گیاہ و نم ماحول میں کئی صحرا چھاننے پڑیں گے۔

[illegible]
[illegible]

اگر یہ صحیح معیار ہے تو آپ سے دوست پھر آپ سب سے الگ نظر آئیں گے؟ آپ اپنے دوست ہم سب کو وہاں بلا لیجئے یا کراچی کو اتنا وسیع کیجئے کہ ہم سب اس میں سما جائیں۔

کراچی میں آپ نے بہت کچھ رسوخ پیدا کر لیا ہوگا۔ آپ کے اخلاص اور محبت ماننے کے سب لوگ قائل ہوں گے۔ بڑے بڑے فرعون صفت کی ملاقات ہوگی بڑے بڑے ارباب حل و عقد کا قرب نصیب [illegible] ان سے کہئے کہ

منزلِ راہرواں دور بھی دشوار بھی ہے
کوئی اس قافلہ میں قافلہ سالار بھی ہے؟

(نقوش جشن آزادی نمبر ۱۹۴۸ء)

بچے

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ بچوں کی کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً بلی کے بچے، فاختہ کے بچے وغیرہ۔ مگر میری مراد صرف انسان کے بچوں سے ہے، جن کی ظاہرا تو کئی قسمیں ہیں، کوئی پیارا بچہ ہے اور کوئی ننھا بچہ ہے، کوئی پھول سا بچہ ہے، اور کوئی چاند سا بچہ ہے۔ لیکن یہ سب اس وقت تک کی باتیں ہیں جب تک برخوردار پنگوڑے میں سویا پڑا ہے۔ جہاں بیدار ہونے پر بچے کے پانچوں حواس کام کرنے لگے، بچے نے ان سب خطابات سے بے نیاز ہو کر ایک الارم کلاک کی شکل اختیار کر لی۔

یہ جو میں نے اوپر لکھا ہے کہ بیدار ہونے پر بچے کے پانچوں حواس کام کرنے لگ جاتے ہیں، یہ میں نے اور حکما کے تجربات کی بنا پر لکھا ہے ورنہ حاشا وکلا میں اس بات کا قائل نہیں۔

سنتے ہیں بچہ سنتا بھی ہے اور دیکھتا بھی ہے لیکن مجھے آج تک سوائے اس کی قوت ناطقہ کے اور کسی قوت کا ثبوت نہیں ملا۔ کئی دفعہ ایسا اتفاق ہوا ہے کہ روتا ہوا بچہ میرے حوالے کر دیا گیا ہے کہ ذرا اسے چپ کرانا۔ میں نے جناب اس بچے کے سامنے گانے گائے ہیں، شعر پڑھے ہیں، ناچ ناچے ہیں، تالیاں بجائی ہیں، گھٹنوں کے بل چل کر گھوڑے کی نقلیں اتاری ہیں، بھیڑ بکری کی سی آوازیں نکالی ہیں، سر کے بل کھڑے ہو کر ہوا میں بائیسکل چلانے کے نمونے پیش کیے ہیں۔ لیکن کیا مجال جو اس بچے کی یکسوئی میں ذرا بھی فرق آیا ہو، جس سُر پر اس نے شروع کیا تھا اس سے ذرا بھی نیچا اترا ہو۔ خدا جانے ایسا بچہ دیکھتا ہے اور سنتا ہے تو کس وقت؟

بچے کی زندگی کا شاید ہی کوئی لمحہ ایسا گزرتا ہو جب اس کے لیے کسی نہ کسی قسم کا شور ضروری نہ ہو۔ اکثر اوقات تو وہ خود ہی سامعہ نوازی کرتے رہتے ہیں ورنہ یہ فرض ان کے لواحقین پر عائد ہوتا ہے۔ ان کو سلانا ہو تو لوری دیجیے۔ ہنسانا ہو تو مہمل سے فقرے بے معنی سے بے معنی منہ بنا کر بلند سے بلند آواز میں ان کے سامنے دہرائیے اور کچھ نہ ہو تو شغل بے کاری کے طور پر ان کے ہاتھ میں ایک جھنجھنا دیجیے۔ یہ جھنجھنا بھی کم بخت کسی بے کار کی ایسی ایجاد ہے کہ کیا عرض کروں۔ ذرا سا آپ ہلا دیجیے، لڑھکتا چلا جاتا ہے اور جب تک دم میں دم ہے اس میں سے ایک ایسی بےسُری، کرخت آواز متواتر نکلتی رہتی ہے کہ دنیا میں شاید اس کی مثال محال ہے اور جو آپ نے ماشاءاللہ باپ ہونے کے جوش میں آ کر برخوردار کو ایک عدد وہ ربڑ کی گڑیا منگوا دی جس میں ایک بہت ہی تیز آواز کی سیٹی لگی ہوتی ہے تو بس پھر خدا حافظ۔ اس سے بڑھ کر میری صحت کے لیے مضر چیز دنیا میں اور کوئی نہیں سوائے شاید اس ربڑ کے غبارے کے جس کے منہ پر ایک سیٹی دار نالی لگی ہوتی ہے اور جس میں منہ سے ہوا بھری جاتی ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اولاد کہلاتے ہیں۔ بدقسمت ہیں تو وہ بےچارے جو قدرت کی طرف سے اس ڈیوٹی پر مقرر ہوئے ہیں کہ جب کسی عزیز یا دوست کے بچے کو دیکھیں تو ایسے موقع پر ان کے ذاتی جذبات کچھ ہی کیوں نہ ہوں وہ یہ ضرور کہیں کہ کیا پیارا بچہ ہے۔

میرے ساتھ کے گھر ایک مرزا صاحب رہتے ہیں۔ خدا کے فضل سے چھ بچوں کے والد ہیں۔ بڑے بچے کی عمر نو سال ہے۔ بہت شریف آدمی ہیں۔ ان کے بچے بھی بے چارے بہت ہی بے زبان ہیں۔ جب ان میں سے ایک روتا ہے تو باقی کے سب چپکے بیٹھے سنتے رہتے ہیں۔ جب وہ روتے روتے تھک

بالمشافہ ان کا دوسرا [illegible] شروع ہوتا ہے۔ دو بار [illegible] آتی ہے۔ رات کی ڈیوٹی دس بجے [illegible] میں۔ ان کا [illegible] دیکھیے۔ آپ [illegible] کر [illegible] کانوں میں روئی [illegible] رہیے [illegible] آپ [illegible] کے [illegible] نزدیک [illegible]

[illegible] مرزا صاحب کے گھر جب میں جاتا ہوں تو ایک [illegible] آپ کی [illegible] بیمار ہوں۔ کئی دفعہ دل میں آیا [illegible] حضرت! آپ کی ان [illegible] نے میری زندگی [illegible] کام کرتا ہوں [illegible] کر سکتا ہوں۔ بلکہ [illegible] لکھنے ہی رہتا ہوں کہ ان [illegible] اور مرزا صاحب [illegible] کہتے ہیں [illegible] سلام [illegible] صاحب ذرا اچھا بیٹھا ہے۔ [illegible] کبھی [illegible] کبھی [illegible] کے رنگ ہے [illegible]

[illegible] صاحب [illegible] شاید [illegible] کے [illegible] [illegible] کبھی ہوتا ہوں۔

[illegible] بچے [illegible] بھی [illegible] آنکلا۔ [illegible] کیونکہ ایسے [illegible] ایسی [illegible] ہم نے کبھی [illegible] پہنچائی تھی۔

اب اور تب

جب مرض بہت پرانا ہو جائے، اور صحت یابی کی کوئی امید باقی نہ رہے تو زندگی کی تمام سرگرمیاں محدود ہو کر بس یہیں تک رہ جاتی ہیں کہ چارپائی پر میز پر جو اخبار رکھا ہے اس کے چند ورق الٹ لیے، بیس دن یا مہینے کے بعد کسی نے غسل کرا دیا، یا ناخن ترشوا لیے۔

کالج کا طالب علم ہوئے اب کئی برس ہو چلے ہیں۔ شباب کا زمانہ امتحانوں میں جو بات تھی گزر گیا۔ احباب زندگی کے جو دو دم باقی ہیں وہ سوالات مرتب کرنے میں گزر رہے ہیں گے۔ ایم اے کا امتحان گویا مرض کا بحران تھا جس کے بعد یہ مرض دائمی ہو گیا ہے۔ اب بستر بیماری ہے اور ہم ——— ہر چند کہیں کہ ہیں ——— نہیں ہیں۔ طالب علمی کا زمانہ بے فکری کا زمانہ تھا، نرم نرم گدیلوں پلنگ پر گویا عیش پرواز تھا صاحب فراش ہوں اب بمشکل اس قدر نصیب ہے کہ اٹھ کر کھا لیا غسل کر لیا ناخن ترشوا لیے۔

تمام حلقۂ دوراں لائبریری کے ایک کمرے اور سٹاف کے ایک ڈربے تک محدود ہے اور دونوں کے درمیان کا ہر موڑ ایک کمیں گاہ معلوم ہے ———

کبھی راوی سے بہت دلچسپی تھی۔ روزانہ علی الصباح اس کی تلاوت کیا کرتا تھا اب اس کے ایڈیٹر صاحب سے ملتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ کہیں نہ کہیں سلام روستائی کھینچ ماریں گے۔ ہال میں سے گزرنا قیامت ہے۔ وہم کا یہ عالم ہے کہ ہر ستون کے پیچھے ایک ایڈیٹر چھپا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کالج کے جلسوں میں اپنی دریدہ دہنی سے بہت ہنگامہ آرائیاں کیں۔ صدر جلسہ نے ہمیشہ گھبرایا کہ اہل کرے۔ دہن سے کب بے موقع وقت وہ معاملہ ہے اب جب کبھی جلسہ کا سن پاتا ہوں ایک خفیف سا ضعف بدن پر طاری ہو جاتا ہے جانتا ہوں کہ کرسیٔ صدارت کی سولی پر چڑھنا ہوگا اور کبھی ایسی کرامات کا نعرہ نہیں لگا سکتا۔

قاضی صاحب قبلہ نے اگلے دن کالج میں ایک مشاعرہ کیا۔ مجھ سے بدگمانی اتنی کہ مجھے اپنے عین مقابل ایک نمایاں اور بلند مقام پر اور میری ہر حرکت پر نگاہ رکھی۔ میرے ارد گرد محفل گرم تھی اور میں اس میں کنچن جنگا کی طرح اپنی بلندی پر جا بیٹھا تھا۔

جس دن کالج میں تعطیل ہوا کرتی بو ہر اداسی سی چھا جاتی۔ جانتا کہ آج کے دن جہد پوش، گر لیے بردار صابن نواز ہستیاں دن کے بارہ ایک تک نظر آتی رہیں گی۔ دن بھر لڑکے چوں چوں کرتا بجا پھوک کے ڈھیر لگا دیں گے۔ جو رفتہ رفتہ آثار قدیمہ کا سا شمالی رنگ اختیار کر لیں گے۔ ہم کسی کو ایک کرسی اور سٹول پیش آ گیا وہیں کھانا منگوا لے گا اور کھانا کھا چکنے پر کوڑوں اور چھلکوں کی ایک بستی آباد کرتا جائے گا تاکہ دنیا میں نام رہ جائے اب یہ حالت ہے کہ مہینوں سے چھٹی کی تاک میں رہتا ہوں۔ جانتا ہوں کہ اس چھٹی کے دن بال ڈکٹو لے کر پھر بات کرنی کی

[illegible] صاحب [illegible] کتاب ہے۔ دنیا [illegible] متعلق [illegible] پہلے شمار [illegible] گیا تو پھر [illegible] زندگی پہلی [illegible] غیب ہو گی۔

سب سے پہلے [illegible] ایک جاری رکھنے [illegible] ہوں تو سوچتا ہوں کہ اس دوران [illegible] کے پاس [illegible] یا ادبی [illegible] اس دوران [illegible] کے پاس [illegible] جہاں [illegible] پہنچے [illegible] مگر [illegible] پہلے [illegible] کی کرامت سے غائب ہو جاتے تھے۔ اور پھر [illegible] صاحب [illegible] ہوتے تھے [illegible] زبان پر [illegible] دیں گے۔ آج کل کے زمانے میں ایسی [illegible] کی تکمیل کر [illegible] میں آتی ہے۔ یا صاحب کمال [illegible] کا تماشا کرتا ہوں جو [illegible] کے دوران میں [illegible] ایک [illegible] ٹکڑا ہوتا ہے اور بیماروں کی طرح [illegible] سے [illegible] سمجھا نہیں جاتا۔ یا ان اہل فن کی داد دیتا ہوں جو زمانہ دیر سے آتے ہیں۔ [illegible] صاحب [illegible] بہت [illegible] ہوسٹل کی پہلی منزل پر ہے لیکن منہ سے کچھ نہیں کہتا۔ میری بات پر یقین انہیں بھلا کیسے آسکے گا۔ اور بھی ایک [illegible] سوال کا [illegible] ہے کہ ہال کی گھڑی مینار کی گھڑی سے تین منٹ پیچھے ہے [illegible] ہال کی گھڑی سے سات منٹ آگے ہے۔ [illegible] دوسری گھنٹی مینار کے گھڑیال سے پانچ منٹ پہلے بجائی اور تیسری گھنٹی ہال کی گھڑی سے [illegible] منٹ پہلے تو [illegible] صاحب [illegible] کس کا [illegible] جائے۔

وہی میں نے کہا تھا کہ [illegible] کیا، قتل کر لیا، [illegible] شور ہے

دل نے دنیا نئی بنا ڈالی
اور ہمیں آج تک خبر نہ ہوئی

پطرس
(راوی ۱۹۲۹ء)

مضحک اشیاء کے متعلق چند عام اصول

(پروفیسر ہنری برگساں کا فلسفۂ خندہ)

ہنسی کے کیا معنی ہیں؟ ہنسی مضحک چیزوں میں ہنسانے والا عنصر کون سا ہے؟ ہم کبھی کسی کے منہ چڑانے پر، کبھی کسی مسخرے [illegible] اور کبھی کسی شخص کی ہیئت کذائی پر ہنس دیتے ہیں۔ ان سب میں مشترک بات کون سی ہے؟ ہم سے پہلے کے فلاسفر اس پہیلی کو سلجھانے میں الجھتے ہیں جو ایک روح کی طرح مختلف اجسام میں آ کر مختلف شکلیں اختیار کرتی ہے اور مسائل تضحیک میں اس قدر تنوع پیدا کرتی ہے؟ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر ارسطو سے لے کر آج تک اکثر حکما اپنا دماغ صرف کرتے رہے لیکن جو ہمیشہ ان کے ہاتھوں سے نکل نکل کر پھر ان کے سامنے آکھڑا ہوا اور ان کی ہنسی اڑاتا رہا۔

جانِ خندہ یا مدحِ ظرافت یا عنصرِ مضحک جو نام بھی آپ اس پری کے لئے تجویز کریں۔ اس نام کو منطق کے اصولوں پر کسی تعریف کے بندھن میں جکڑ دینا فضول ہے۔ ہم اتنا جانتے ہیں کہ روحِ خندہ ایک زندہ چیز ہے اس لئے ہمیں اس کا ادب و احترام کرنا چاہئے۔ اور ایک آدھ فقرے میں اس کی تمام ہستی کو بند کر ڈالنا اس کی توہین کرنا ہے ہم صرف یہی کر سکتے ہیں کہ اس کا نظارہ کریں کہ وہ کس طرح پیدا ہوتی ہے۔ اور کس طرح نشو و نما پاتی ہے۔ دیکھیں کہ کس کس ڈھنگ سے طرح طرح کی شکلیں اختیار کرتی ہے۔ ممکن ہے ہم اس دیرپا آشنائی کی وجہ سے اس کو اچھی طرح جاننے لگیں۔ اور ہمیں اس بات کی ضرورت ہی نہ رہے۔ کہ کوئی ایک فقرے کی حدود کے اندر اس کو بند کر کے ہمارے سامنے لا کھڑا کر دے۔ اور ممکن ہے یہ آشنائی ہمارے لئے بہت ہی مفید ثابت ہو۔ کیونکہ روحِ خندہ کی بھی ایک منطق ہے۔ وہ بھی اپنا ایک مقررہ طریق عمل رکھتی ہے۔ خواہ وہ کتنی ہی آزاد و وارفتہ کیوں نہ ہو۔ کیونکہ کئی مضحک باتیں ایسی ہیں جن کو ایک زمانہ جانتا ہے۔ اور ان سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ جن پر ایک قوم کی قوم ہنس پڑتی ہے۔ جن پر ایک ملک کا ملک دوہرا ہو جاتا ہے۔ تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اگر ہم روحِ خندہ سے اچھی طرح واقف ہو جائیں۔ تو ساتھ ہی ہمیں عوام الناس کے تخیل کا بھی کچھ نہ کچھ علم حاصل نہ ہو جائے۔ ہنسی خود زندگی سے پیدا ہوتی ہے۔ اور فن کی بہت ہی قریبی رشتہ دار ہے۔ تو ممکن ہے یہ زندگی اور فن پر بھی بہت سی روشنی ڈالے۔

شروع شروع میں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہنسی کے متعلق تین بنیادی اصول بیان کر دئیے جائیں ان اصولوں کا خود مضحک اشیاء سے بہت تعلق نہیں لیکن ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے میدانِ تضحیک کی حدود قائم کی جا سکتی ہیں۔

فصل۔ دورانِ بحث میں سب سے پہلی بات جس کی طرف ہمیں اپنی توجہ مبذول کرنی چاہئے یہ ہے کہ کوئی سامانِ تضحیک انسانی دائرہ سے باہر نہیں پایا جاتا۔ کسی دریا یا پہاڑی کا منظر ممکن ہے کہ خوب صورت ہو ممکن ہے کہ دلفریب و دلکش ہو یا ممکن ہے کہ بالکل ہی حقیر و بدنما ہو لیکن مضحک ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے کہ بعض اوقات ہمیں ایک جانور کو دیکھ کر بے اختیار ہنسی آ جائے۔ لیکن اس کی وجہ صرف یہی ہوتی ہے۔ کہ ہماری نگاہ کو اس جانور

لا سکتی ہیں کہ [illegible] کا سا انداز یا انسانوں کی سی حرکت محسوس ہو جاتی ہے جو باعث تضحیک بن جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض اوقات آپ ایک لمبوتری ٹوکری [illegible] دیکھ کر ہنس پڑیں۔ لیکن جو چیز مضحک ہے وہ اس کا نمدہ نہیں۔ دراصل وہ اس ٹوپی کی شکل ہے۔ وہ شکل جس کو انسان نے ٹوپی میں ڈھالا۔ باعث تضحیک انسانی اختراع ہے یعنی مضحک انگیز ٹوپی کی قطع وضع ہے۔ جو اس وجہ سے مضحک نظر آتی ہے کہ وہ کسی انسانی دماغ کے ایک عجیب و مضحک خیال کی ترجمان ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ ایسا اہم اور ایسا بین نکتہ مفکروں کی تفتیش سے اس قدر دور رہا ہے۔ اکثر لوگ انسان کو "حیوان ضاحک" کے نام سے پکارتے ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو انسان نہ صرف "حیوان ضاحک" بلکہ "حیوان مضحک" بھی ہے۔ اگر کوئی اور حیوان یا کوئی بے جان چیز ہنسی کا باعث ہوتی ہے تو ہمیشہ دیکھا گیا ہے کہ وہ مضحک یا کسی انسانی مشابہت کے سبب ہے یا صفت انسانی کا کوئی نقش اور یہ مضحک وہ کام ہوتا ہے۔ جو کسی انسان نے اس چیز سے لیا ہو۔

دوسری بات جس کا بیان کرنا ضروری ہے یہ ہے کہ اکثر ہنسی کے وقت جذبات مفقود ہوتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی مضحک چیز اپنا اثر پیدا ہی نہیں کر سکتی جب تک روح انسانی مکمل سکون و قرار کی حالت میں نہ ہو۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم ایسے شخص کی ہنسی نہیں اڑا سکتے جس پر ہم ترس کھاتے ہوں۔ یا جس سے ہمارے الفت و محبت کے تعلقات وابستہ ہوں۔ لیکن یہ بات ضرور ہے کہ ایسے شخص کی ہنسی اڑانے کے موقع پر ہم تھوڑی دیر کے لئے رحم اور محبت کی زبان بندی کر دیتے ہیں۔ چند ایسے اشخاص کی جماعت میں جو صرف دماغ ہی دماغ رکھتے ہیں اور جن کا دل (ان معنوں میں کہ وہ جذبات کا خزینہ ہو سکتا ہے) معدوم ہو۔ شاید کوئی شخص بھی کبھی روتا ہوا نہ پایا جائے۔ لیکن ہنسنے والے پھر بھی اس میں موجود ہوں گے اس کے مقابلے میں ایک جماعت صرف حساس طبیعت رکھنے والے اشخاص کی ہے جن کا دل زندگی کی اہمیت کے ساتھ پورے طور پر ہم آہنگ ہے (یعنی وہ اشخاص جن کو اہل دل کہا جاتا ہے اور جن کی فطرت میں ہر ایک واقعہ ایک جذباتی کیفیت پیدا کر دیتا ہے جو ہمیشہ کمال کو پہنچی رہتی ہے۔) ایسے اشخاص تو ہنسی سے آشنا ہی نہیں ہو سکتے ہیں جو آوازیں آپ کے کانوں تک پہنچتی ہیں یا جو حرکات و افعال آپ کے سامنے ظہور پذیر ہوتے ہیں اگر آپ ان کے ساتھ دلی تعلق پیدا کر لیں۔ اگر آپ تصور و تخیل میں ان لوگوں کے افعال میں ان ہی کی طرح شریک کار ہو جائیں اور انہیں کی طرح سب کچھ محسوس کرنے لگیں۔ مختصر یہ کہ اگر آپ اپنے جذبہ ہمدردی کو پوری طرح وسعت دے دیں تو حقیر سے حقیر چیز آپ کی نظروں میں اس قدر وقیع و اہم بن جائے گی۔ گویا کسی طلسم نے اشیا کی حقیقت کو یک لخت بدل دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام محسوسات پر ایک تاریکی چھا جائے گی۔ جو آپ کو ہنسی سے محروم کر دے گی۔ اب اگر آپ کش مکش حیات سے الگ ہٹ کر اور اپنے آپ کو بالکل لاتعلق بنا کر اس کا نظارہ کریں تو کئی باتیں آپ کے لئے مضحک بن جائیں گی۔ اگر کہیں موسیقی کے ساتھ باقاعدہ تال پر ناچ ہو رہا ہو تو آپ اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن اگر آپ اپنے کانوں کو اس طرح بند کر لیں کہ موسیقی کی آواز آپ بالکل نہ سن سکیں تو نظارہ رقص مضحک ہو جاتا ہے۔ اور شاید ہی کوئی فعل انسانی ایسا ہو۔ جو اس طرح کی آزمائش میں پورا اترے۔ اگر ہم افعال و حرکات کو جذبات کی ہم آہنگ موسیقی سے علیحدہ کر کے ان پر نظر ڈالیں تو ان میں سے کئی ایسے ہوں گے جو فوراً ثبات سے گرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ ثابت ہوا کہ کسی مضحک چیز کے پورے طور پر اثر پذیر ہونے کے لئے ایک عارضی انعدام جذبات ضروری ہے۔ تضحیک کا تعلق عقل و فہم اور صرف عقل و فہم سے ہے۔

لیکن ہنسی کے لئے یہ بات بھی ضروری ہے کہ ایک انسان کا دماغ اور انسانوں کے دماغوں سے علاقہ قائم رکھے۔ اور یہ تیسرا نکتہ ہے جو توجہ کا طالب ہے۔ اگر آپ اپنے آپ کو بالکل تنہا اور علیحدہ محسوس کریں تو آپ مضحک اشیاء سے متاثر نہیں ہو سکتے۔ ہنسی کے لئے ہمیشہ ایک گونج، ایک صدائے بازگشت یعنی شرکت و رفاقت کا ہونا ضروری ہے۔ آپ خود ہنسی کی آواز کو غور سے سنئے۔ یہ صاف و [illegible] اور شستہ آواز نہیں۔ خود ایک آواز

کی ضرورت سی لگتی ہے۔ ہنسی کی یہ خاص صفت معلوم ہوتی ہے کہ ایک سے دوسرے کی طرف چلتی رہے، شروع میں ایک کڑک معلوم ہوتی ہے اور پھر ایک تسلسل کے ساتھ جاری رہتی ہے۔ جیسے پہاڑوں میں بادل گرجتے ہیں۔ لیکن یہ بازگشت ہمیشہ جاری نہیں رہ سکتی۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اس کا دائرہ جس قدر چاہے وسیع ہو جائے اور اس سے کہا جا سکتا ہے کہ ہماری ہنسی ہمیشہ ایک جماعت یا ایک حلقے کی ہنسی ہوتی ہے۔ آپ کو ریل گاڑی کے سفر میں کبھی یہ دیکھنے کا اتفاق ہوا ہوگا کہ آپ کے بعض ہم سفر آپس میں ایسی باتیں کر رہے ہیں جو ان کے لئے یقیناً پرلطف ہیں کیونکہ وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ اگر آپ بھی ان کی صحبت میں شریک ہوتے تو آپ بھی یقیناً ہنستے لیکن چونکہ آپ ان سے علیحدہ ہیں، آپ کو ہنسی نہیں آتی۔ ایک دفعہ ایک شہر کی جامع مسجد میں اس شہر کے بڑے مولوی وعظ فرما رہے تھے۔ ان کی تقریر اس قدر مؤثر تھی کہ سب سامعین زار و قطار رو رہے تھے مگر سوائے ایک کے جو بالکل ہی مطمئن بیٹھا تھا۔ جب اس شخص سے اس کے اس قدر غیر متاثر ہونے کی وجہ دریافت کی گئی تو اس نے جواب میں کہا "میں اس شہر کا باشندہ نہیں۔ میں تو اجنبی ہوں۔" رونے کے متعلق اس شخص نے جس خیال کا اظہار کیا وہ ہنسنے کے متعلق اور بھی زیادہ صحیح ہے۔ ہنسی میں بے اختیاری کی ایک کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ سمجھئے کہ ایک ہنسنے والے کو ہنسنے کے لئے اور ہنسنے والوں کے ساتھ (خواہ وہ حقیقت میں موجود ہوں یا محض تصور میں) سازش کرنی پڑتی ہے اور بعض اوقات تو وہ محض دوسروں کی مدد ہی سے ہنستا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ تھیٹر میں تماشہ دیکھنے والوں کی تعداد جس قدر زیادہ ہوتی ہے اسی قدر عوام کی ہنسی بھی زیادہ بے قابو ہوتی ہے۔ اور آپ دیکھتے ہیں کہ ایک زبان میں بہت سی ظرافت کی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا ترجمہ اگر کسی دوسری زبان میں کیا جائے تو وہ ظرافت سے خالی رہ جاتی ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی ظرافت ایک خاص قوم کے رسم و رواج اور خیالات سے تعلق رکھتی ہے۔ جنہوں نے اس مسئلے کو نظر انداز کیا ہے وہی لوگ ہیں جن کے نزدیک ظرافت ایک نہایت ہی حقیر شغل سے زیادہ قابلِ غور حقیقت نہیں رکھتی۔ اور جو ہنسی کو حیاتِ انسانی کی باقی تگ و دو سے بالکل ہی بے تعلق سی چیز خیال کرتے ہیں۔ اکثر لوگ ظرافت کی یوں توضیح کرتے ہیں کہ "ظرافت ایک تقابلِ ذہنی کا نام ہے" یا "ظرافت ایک محسوس بے جوڑ کا نام ہے۔" ممکن ہے یہ تعریفیں ٹھیک ہوں لیکن یہ اس سوال کا جواب دینے سے قطعی قاصر ہیں کہ آخر بعض چیزوں پر ہمیں ہنسی کیوں آتی ہے؟ کیا وجہ ہے کہ بعض محسوسات ایسے ہیں کہ ان کو دیکھتے یا سنتے ہی ہمارے پیٹ میں بل پڑ پڑ جاتے ہیں حالانکہ اور ہزاروں اشیاء بھی دنیا میں موجود ہیں جن کا مطلقاً کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ہنسی کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے ہمیں ہنسی کو ہنسی کے گھر میں اٹھا کر دیکھنا چاہئے اور یہ ظاہر ہے کہ ہنسی کا گھر انسانوں کی سوسائٹی ہے۔

مندرجہ بالا بحث سے تین باتیں واضح ہوتی ہیں:—

(۱) سامانِ تضحیک انسانی دائرے سے باہر نہیں پایا جاتا۔

(۲) ہنستے وقت جذبات معطل ہوتے ہیں۔

(۳) ہنسی کے لئے ایک سے زیادہ (حقیقی یا خیالی) ہنسنے والوں کا ہونا لازمی ہے۔ یعنی ہنسی اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب انسانوں کی ایک جماعت اپنی توجہ اپنے ایک فرد کی طرف اس طرح منعطف کرتی ہے کہ اپنے جذبات کو معطل کر دیتی ہے اور صرف اپنے عقل و فہم سے کام لیتی ہے۔

مثلاً۔ ایک شخص بازار میں دوڑتا چلا جا رہا ہے۔ یکایک وہ ٹھوکر کھا کر گر پڑتا ہے اور لوگ ہنس دیتے ہیں۔ اب اگر لوگوں کو یہ معلوم ہوتا کہ وہ گرا نہیں بلکہ جان بوجھ کر اپنی خوشی سے زمین پر بیٹھ گیا ہے۔ تو وہ اس پر نہ ہنستے۔ لوگ ہنستے اس لئے ہیں کہ اس شخص کا زمین پر یوں بیٹھ جانا غیر ارادی فعل تھا۔ یعنی باعث خندہ اس شخص کے انداز کا یوں یکایک تغیر ہو جانا نہیں بلکہ اس تغیر میں عدم ارادہ نے مضحکہ پیدا کیا ہے۔ اس کی [illegible]

تھا کہ اس پتھر سے ٹھوکر لگی ہے۔ اس سے بچ سکتا تھا یا اپنی رفتار بدل دیتا۔ اس نے ایسا نہیں کیا اور تو ضرور ہے مگر اس میں لچک اور بدلنے کی قابلیت نہ تھی یا شاید وہ کسی اور خیال میں ڈوبا ہوا تھا یعنی اس کا خیال غیر حاضر تھا۔ اور اس کے جسم میں اتنی لچک اور تیزی کی قابلیت نہ تھی کہ وہ خیال کے یکا یک حاضر ہو جانے پر اپنے بگڑے ہوئے توازن کو فوراً سنبھال لیتا۔ اس سے اس کے اعصاب اپنے پہلے فعل یعنی تن کر چلنے کی حرکت ہی میں مصروف رہے حالانکہ تغیر حالات کچھ اور چاہتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ وہ گر پڑا اور یہی وجہ تھی کہ لوگوں کو ہنسی آگئی۔

اب ایک ایسے شخص کی مثال لیجئے جس کا معمول نہایت ہی باقاعدہ اور منظم ہے اور جو چھوٹی سے چھوٹی بات میں بھی اپنے معمول سے سر مو انحراف نہیں کرتا۔ اس کی تمام اشیا ایک مقررہ طریقے اور ترتیب سے رکھی رہتی ہیں اور وہ بہت ہی باقاعدگی سے ان کو استعمال کرتا ہے۔ اب فرض کیجئے کوئی شریر لڑکا آکر ان تمام چیزوں کی ترتیب کو بدل دیتا ہے۔ اب وہ شخص دوات سے قلم اٹھانے لگتا ہے تو اس کے ہاتھ میں چاقو آجاتا ہے جب وہ الماری میں سے طب کی کتاب نکالتا ہے تو اس کی جگہ مخزن کا فائل نکل آتا ہے جب وہ کرسی پر بیٹھنا چاہتا ہے تو دھم سے زمین پر جا گرتا ہے غرضیکہ اس سے کوئی کام ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ عادت اس کو مجبور کرتی ہے کہ جب اسے کرسی پر بیٹھنے کی ضرورت ہو تو وہ ایک خاص جگہ پر پہنچ کر بیٹھ جائے۔ اب اگر خلاف معمول کرسی وہاں موجود نہیں تو چاہئے تھا کہ وہ اپنی اس حرکت کو روک لیتا یا منحرف کر دیتا لیکن اس نے ایسا نہ کیا بلکہ ایک مشین کی طرح بے خطا سیدھا چلتا رہا۔ گویا جو شخص اس قسم کی شرارت کا نشانہ بنایا جاتا ہے اس کی حالت بھی ایک طرح سے اسی شخص کی سی ہے۔ جو رستے میں ٹھوکر کھا کر گر پڑتا ہے۔ سامان تضحیک دونوں حالتوں میں ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ ان دونوں اشخاص میں ان خاص موقعوں پر بدل جانے یا لچک جانے کی قابلیت کافی مقدار میں نہیں ہوتی۔ اور چونکہ ہم ایک انسان سے اس بات کی توقع کرتے ہیں۔ کہ وہ نہایت ہی بیداری سے حرکت کرے اور اس میں موقع پر بدل جانے کی قابلیت پائی جائے۔ اس لئے ہمیں ان پر ہنسی آتی ہے۔ ان دو اشخاص کی مضحک کیفیتوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ ایک حالت میں تو ہنسنے کا سامان سوئے اتفاق نے مہیا کیا تھا۔ اور دوسری حالت میں ایک لڑکے کی شرارت نے۔ ان دو وجوہات سے ان دو شخصیتوں میں فوراً بدل جانے کی قابلیت کی کوتاہی ظہور میں آئی۔

لیکن ان دونوں میں یہ بات بھی مشترک ہے کہ جو مضحک نتیجہ رونما ہوا اس کی علت خارجی تھی۔ یعنی ان اشخاص کی اپنی ذات میں پیدا نہ ہوئی تھی۔ اب اگر اس لچک کی کوتاہی کے ظہور کے لئے سڑک میں کسی پتھر کے پڑے ہونے یا کسی شریر لڑکے کی شرارت کی ضرورت نہ ہو۔ بلکہ یہ کوتاہی قدرتی اور طبعی طریقے پر خود اپنے خزانے میں سے اپنے ظہور کے لئے کوئی موقع نکال لے تو سامان تضحیک کی علت خارجی نہ رہے گی بلکہ داخلی بن جائے گی۔ ایک ایسے شخص کی مثال لیجئے جس کا دماغ اپنے گذشتہ افعال کے متعلق مصروف رہتا ہے۔ اور اس بات کی طرف کبھی توجہ نہیں کرتا کہ وہ فی الحال کیا کر رہا ہے۔ یعنی اس کے خیالات زمانۂ حال سے ہمیشہ ایک قدم پیچھے رہتے ہیں۔ اگر آپ اس سے کوئی سوال پوچھتے ہیں تو وہ اس کا وہی جواب دیتا ہے جو کبھی اس نے کسی اور شخص کو کسی اور بات کے متعلق دیا تھا۔ اگر اس کے سامنے ایک گاڑی آکر ٹھہر جاتی ہے تو وہ اس پر اسی طرح چڑھنا شروع کر دیتا ہے جس طرح وہ صبح اپنے مکان کی سیڑھیوں پر چڑھا تھا۔ یعنی چڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے حواس اور عقل دونوں میں ایک لچک اور تیزی کی ایسی کمی اور کوتاہی ہے۔ کہ وہ زمانہ حال میں وہ آوازیں سنتا ہے جو کچھ عرصہ ہوا بلند ہوئیں اور وہ کچھ دیکھتا ہے جو آنکھوں سے کب کا اوجھل ہو چکا۔ اس کے حواس اور اس کی عقل میں اتنی لچک نہیں کہ وہ ان پر زور ڈال کر ان کو گرد و پیش کے حالات کے ساتھ مطابقت دیتا رہتا۔ جب کہ اس پر واجب یہ ہے کہ اس کے افعال حقیقت حاضرہ کے موافق ہوں۔ ایسی حالت میں سامان تضحیک (اور اس کی علت ظہور) تو اس شخص کی ذات کے اندر موجود ہے۔ ایسا شخص بعض اوقات بہت ہی مضحکہ انگیز ہوتا ہے۔ اور اگر آپ ذرا غور کریں تو آپ کو شیخ چلی کی کئی ایسی باتیں یاد آجائیں گی جو اس خیال کی ترجمانی کریں گی۔

خیال کی غیر حاضری کا جو تجزیہ ہوا ہے۔ اس کا منشا یہ ہے بعض اوقات دیگر وجوہ سے اور بھی زیادہ قوت پکڑ جاتا ہے مثلاً اگر آپ کو اس شخص کے خواب و ترانے یا ان غیر حاضر رہنے کی ساری تاریخ سے واقفیت ہو اس کی وابستگی گویا آپ کی نگاہوں کے سامنے پیدا ہوئی ہو تو آپ اس بات سے بھی واقف ہوں کہ وہ جیسے بڑھتی گئی ہے ورنہ وجوہ سے ترقی کرتی ہے تو آپ کو اور بھی زیادہ ہنسی آئے گی۔ فرض کیجیے ایک شخص رات دن مجنوں اور فرہاد کے قصے پڑھتا رہتا ہے اور جو سنے گھنٹوں اس کا دل و دماغ عشق کی وحشت، صحرا نوردی، خود فراموشی، بے خودی اور دیگر کیفیات میں مبتلا رہتا ہے۔ جتنے کتابیں زیادہ پڑھتا ہے ایسا کیریکٹر اسے اتنا جاذب و دلکش معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کی تقلید کرنے لگ جاتا ہے۔ اب وہ اپنے آپ کو اصل قیس سمجھتا ہے۔ اور اس کے خیالات اور ارادے اسی کی طرف مائل ہوتے ہوتے بالکل اسی کی طرح ہو گئے ہیں۔ اگرچہ اسے اس کی یہی حالت نہ معلوم ہو لیکن اب تنے گا کہ وہ اگر اور لوگوں کی صحبت میں شریک ہوگا تو اس طرح گویا ایک مسلسل خواب اس پر طاری ہے۔ وہ اسی خواب میں ادھر ادھر چل پھر رہا ہے اس کی باتیں اس طرح کی ہوں گی جیسے کوئی نیند میں بڑبڑا رہا ہو۔ اب اس کی تمام حرکتیں کسی دوسری دنیا سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایسے شخص میں سامان تضحیک کس قدر عمیق ہوتا ہے۔ جب آپ اس سے وقت پوچھتے ہیں تو وہ ایک شعر پڑھ دیتا ہے اور کبھی وہ آپ کو اپنا محبوب فرض کر کے ایک قصیدہ دہرانے لگ جاتا ہے ایسے شخص کے خیال کی غیر حاضری میں یہ بات نہ رہے کہ اس کا خیال غیر حاضر تو ضرور ہے لیکن اس کے علاوہ کسی اور جگہ حاضر بھی ہے جہاں وہ موجودات کی بے خبر ہے۔ وہاں متخیلات سے باخبر بھی ہے۔ یعنی صرف یہی نہیں کہ وہ گرد و پیش میں بے کار ہے۔ بلکہ وہ ایک اور دنیا میں مصروف بھی ہے۔ ایسی ہستی اس شخص سے زیادہ مضحک ہے۔ جس کے خیال کے متعلق آپ صرف یہی جانتے ہیں کہ غیر حاضر ہے لیکن یہ نہیں معلوم کہ غیر حاضر ہے کہاں؟ مگر جب آپ کو اس بات کا علم ہو جائے کہ واقعات موجودہ سے بے خبر اس کا دماغ کس بات میں مصروف ہے تو وہ زیادہ مضحک ہو جاتا ہے۔ ایسے اشخاص کو عرف عام میں جنونی اور پاگل کہتے ہیں۔ ان دیوانوں کو دیکھ کر جب ہمیں ہنسی آتی ہے تو ہمارے ساز ہستی میں وہی تار لرزاں ہوتے ہیں جو کسی ایسے شخص کو دیکھ کر لرزاں ہوتے تھے۔ جو ایک شریر لڑکے کی شرارت کا تختۂ مشق بنتا ہے یا جو بازار میں دوڑتا ہوا پھسل کر گر پڑتا ہے۔ یہ دیوانے بھی ایک نصب العین کی طرف دوڑ رہے تھے۔ اور اس تگ و دو میں کسی سخت درخت حقیقت سے ٹھوکر کھا کر گر پڑتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ ایسے لوگوں سے اس بات میں بڑھے ہوئے ہیں۔ کہ ان کی بے خبری باقاعدہ منظوم و منضبط ہوتی ہے اور ایک خاص مرکز کے گرد چکر لگاتی رہتی ہے ان کے سوانح اور ان کے حالات و معمولات ایک خاص سلسلے میں جڑے ہوئے ہیں۔ جو باہوش انسانوں کی منطق سے کسی طرح کم نہیں۔ ان کی عقل میں کچھ کمی ہے تو ایک ایسی کمی ہے جس کے ہوتے ہوئے وہ اپنے حواس کو اپنی دنیا سے موڑ کر اس دنیا کے حواس کے ساتھ مطابقت نہیں رکھ سکتے۔

مذکورہ بالا شخص کے ایک خاص خیال میں اس قدر ہٹ اور ضد ہے کہ وہ دماغ میں سے باہر ہی نہیں نکلتا۔ اس کے خیالات اس کے دماغ میں جگہ نہیں پا سکتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ شخص مضحک حرکتوں کا مرتکب ہوتا ہے اب ذرا اس سے آگے چلیے اور فرض کیجیے کہ جو تعلق ایک خاص خیال کی ہٹ کو انسانی دماغ سے ہے۔ وہی تعلق بعض برائیوں کو انسان کی سیرت سے ہے یہاں پر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ بد اخلاقیاں دو قسم کی ہیں۔ بعض برائیاں ایسی ہیں کہ روح انسانی اپنی تمام قوتوں اور طاقتوں کو ساتھ لے کر ان میں کود پڑتی ہے اور اپنی حیات سے ان برائیوں کو گویا زندگی بخش کر ان کو اپنے ساتھ ساتھ گھسیٹتی چلی جاتی ہے۔ اور اس طرح سے مختلف شکلوں میں انہیں ظاہر کرتی رہتی ہے۔ ایسی برائیاں درد انگیز اور ملال خیز ہوتی ہیں۔ برخلاف اس کے مضحک برائی گویا ایک چوکھٹا سا ہوتا ہے۔ جس میں انسان کو کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ ہم میں حلول کر جائے وہ ہم پر مسلط ہو جاتی ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم اسے اپنے رنگ تنوع میں رنگ دیں۔ وہ ہمیں اپنی کیفیات کا جامہ پہنا دیتی ہے۔ ڈرامے اور کامیڈی میں فرق صرف اسی سے ہے۔ ممکن ہے کہ ڈرامے میں چند ایسی برائیوں کا نقشہ کھینچا گیا ہو جو خاص اسماء سے موسوم ہو سکتی ہیں۔ لیکن وہ کچھ اس طرح سے کیریکٹر کا جزو بدن بن

جاتی ہیں کہ ہم ان برائیوں کے نام بھول جاتے ہیں۔ ان سے خواص کو روشن کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہم ان برائیوں کا خیال تک نہیں کرتے۔ بجائے اس کے ہمارے پیش نظر صرف وہ کیریکٹر ہوتا ہے جس کی ذات میں ان برائیوں کو مجسم پاتے ہیں۔ اسی لئے ایک ڈرامہ کا نام کوئی اسم ہوتا ہے۔ مثلاً اتھیلو، ہملٹ وغیرہ لیکن ایک مضحک برائی خواہ وہ ایک شخص سے نہایت ہی بے پروائی کے ساتھ وابستہ ہو پھر بھی اپنی علیحدہ نوعیت و ہستی کو قائم رکھتی ہے۔ وہ بذات خود ایک کیریکٹر ہو جاتی ہے جس کے اردگرد زندہ ... گھومتے رہتے ہیں۔ دیکھئے کہ ... مضحک برائیاں کیریکٹروں کو کٹھ پتلیوں کی طرح نچاتی ہیں۔ اسی لئے ایک شخص جتنا زیادہ وہ اپنی ذات سے بے خبر ہوتا ہے اتنا ہی وہ مضحک بھی ہوتا ہے۔ ایک ڈرامے کے کیریکٹر کو اگر یہ بات معلوم ہو جائے کہ وہ کیا ہے اس میں کونسی برائیاں ہیں۔ اور ان برائیوں کو کس نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں تو ممکن ہے کہ وہ اپنے آپ میں کوئی مناسب یا تغیر پیدا کرنا چاہے لیکن جہاں صاحب تماشہ مضحکہ کو اپنے مضحک ہونے کا احساس ہوا وہیں وہ اپنی ذات میں ترمیم شروع کر دیتا ہے یا کم از کم یہ اثر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اب اس میں وہ بات نہیں رہی۔ کچھ نہ کچھ تغیر ہوتا ہی ہے۔ لوگوں کی ہنسی مصلح اخلاق ہے۔

سو ہم دیکھتے ہیں کہ اس شخص میں جو دوڑتے ہوئے گر پڑتا ہے۔ اور اس شخص میں جو کسی شرارت کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اور اس شخص میں جو ایک خیالی دنیا میں رہتا ہے۔ اور اس شخص میں جس کی سیرت کے نقائص مضحکہ انگیز ہوتے ہیں۔ ان سب میں لچک یا فوری تبدیلی کر سکنے کی کمی کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ اور یہی سامان تضحیک کی رونمائی کا باعث ہوتی ہے۔ کشمکش حیات اور سوسائٹی کے تقاضے ہم سے ہمیشہ اس بات کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں کہ ہماری توجہ ہر وقت بیدار رہے اور ہم اسی کے ساتھ واقعات موجودہ کو پیش نظر رکھیں۔ ساتھ ہی ہمارے جسم اور دماغ میں وہ لچک پائی جائے جس کی بدولت ہم اپنے آپ کو موجودات کے ساتھ مطابقت دیتے رہیں۔ اگر ہمارے جسم میں اس کی کوتاہی ہو تو ہم مختلف عوارض و حادثات میں مبتلا رہتے ہیں۔ اگر یہ کوتاہی ہمارے دماغ میں پائی جائے تو ہر ایک قسم کی ابلہی اور ہر ایک قسم کا جنون ہماری زندگی میں خلل انداز ہوتا ہے اگر یہ کوتاہی ہماری سیرت میں پائی جائے تو ہماری ہستی اپنے گرد و پیش کی سوسائٹی سے ہٹ کر بے جوڑ سی رہ جاتی ہے۔ طرح طرح کے مصائب ہم پر نازل ہوتے ہیں۔ اور انواع و اقسام کے جرائم ہم سے سرزد ہوتے ہیں۔ ہنسی گویا سوسائٹی کی ایک اختیاری سزا ہے جو وقتاً فوقتاً ہماری اصلاح کرتی رہتی ہے۔ اس کا تعلق محض ظرافت طبعی سے نہیں۔ اگرچہ یہ کون نہیں جانتا کہ ہم ہنستے صرف اس وقت ہیں جب ہم تھوڑا نفس کے تکلفات سے آزاد ہو کر ایک دوسرے کو صرف مخلوق فن اور دلچسپ صنعت کاریاں تصور کرنے لگ جاتے ہیں۔

"پطرس"

(مخزن۔ جنوری ۱۹۲۲ء)

یہ مضمون آج سے چھتیس سال قبل لکھا ہے۔ اس وقت فرانس کے مشہور فلسفی برگساں کا فلسفہ بے انتہا مقبول تھا۔ "عالم خواب"، "دماغ و قوت" اور "خندہ" کے متعلق اس کے نظریات دنیائے مغرب سے خراج تحسین وصول کر رہے تھے۔ پطرس نے اس کے فلسفہ خندہ سے اردو کو پہلی مرتبہ روشناس کرایا۔ یہ مضمون ترجمہ نہیں بلکہ قابل مضمون نگار نے اس کے فلسفہ میں ادب کی انگریزی مثالوں کو اپنی معاشرت کے حسب حال بنانے میں مجتہدانہ قدرت سے کام لیا ہے۔

(ادارہ)

پاکستان میں تعلیم کا مستقبل

یہ امر نہایت قابل مسرت ہے کہ سب سے پہلے جو کل پاکستان کانفرنس منعقد ہوئی وہ تعلیمی کانفرنس تھی جو سال گذشتہ ماہ نومبر میں کراچی میں ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب سرحد پار سے مہاجرین کی آمد کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ اور کشمیر کا مسئلہ روز بروز اس قدر زیادہ نزاکت پکڑتا جاتا تھا کہ بمشکل توجہ کسی دوسری طرف منعطف کی جا سکتی تھی اور پھر دیگر اہم ترین سیاسی مسائل کے مقابلے میں تعلیم کا نمبر ویسے بھی بعد میں آتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد تقریباً ایک سال گذر چکا اس عرصہ میں نہ تو تعلیم کی مد میں کوئی کثیر رقم مخصوص کی گئی اور نہ ہمارے سکولوں اور کالجوں کی تعداد میں کوئی نمایاں اضافہ ہوا نہ ہمارے نظام تعلیم اور طریق امتحان میں کوئی انقلاب برپا ہوا اور نہ رضاکاروں اور کارکنوں کی کوئی جماعت ناخواندگی کے خلاف جہاد کرنے کے لئے میدان عمل میں اتری لیکن یہ سب کچھ نہ ہو سکا تو اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ہم نے آزادی کے پہلے سال کو رائیگاں کھو دیا تو وہ برخود غلط ہے اس لئے کہ اس عرصہ میں تعلیمی مسائل پر جوش و خروش سے گرما گرم بحثیں بھی ہوئی ہیں اور سنجیدگی و متانت سے غور و خوض بھی ہوا اول سال ہی میں پاکستان کے طول و عرض سے ماہرین تعلیم کا اجتماع منعقد ہوا تاکہ پاکستان کے تعلیمی مسائل کو سامنے لا کر ان کا حل تلاش کیا جائے۔

اگر مجھے ایک فرسودہ سا استعارہ استعمال کرنے کی اجازت دی جائے تو میں کہوں گا کہ ہماری تعلیمی آزادی ہماری پونجی ہے محض اس کی ملکیت احساس فخر و اطمینان پیدا کر دیتی ہے لیکن جلدی یا بدیر ہمیں اس پونجی کو ضرور استعمال کرنا پڑے گا ورنہ اس کی حیثیت مردہ دھات سے زیادہ نہ رہے گی استعمال کی کئی صورتیں ہیں۔ یہ پونجی فضول خرچ کر کے ہم دوبارہ مفلس بن سکتے ہیں پونجی کو ایسی مد میں لگایا جا سکتا ہے جہاں سے کوئی فائدہ نہ ہو یا سوچ سمجھ کر پونجی کو کسی سود مند کاروبار میں لگایا جا سکتا ہے تعلیمی آزادی کا مفہوم یہ ہے کہ ہم جس طرح چاہیں جس کو چاہیں جو چاہیں پڑھائیں۔ تعلیمی آزادی کا مطلب یہ ہے نصاب تعلیم اور طریق تعلیم بلکہ یوں کہئے مکمل نصاب تعلیم میں حسب ضرورت مناسب رد و بدل کرنے کی آزادی۔ سات کروڑ بندگان خدا کو جہالت کی تاریکی سے نکالنے کے لئے نہایت تفصیلی ڈھانچہ تیار کرنے کی ضرورت ہے اس سلسلے میں مفصل تعلیمی رپورٹوں کی ترتیب و تدوین بھی ایک امر ناگزیر ہے پاکستان کے ماہرین تعلیم خواہ وزارتوں میں ہوں خواہ یونیورسٹیوں میں خواہ خالص علمی حلقوں میں کئی ماہ سے غیر معمولی خلوص اور محنت سے اس قسم کی رپورٹیں مرتب کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں ان کوششوں کے نتائج تاحال بار آور نہ ہو سکنے کا سبب یہ ہے کہ نہ صرف تعلیمی مسائل پیچیدہ ہیں بلکہ ہمارے سامنے تعلیم کا نصب العین بھی مکمل طور پر واضح نہیں بہت سی حقیقی اور واضح چیزیں غیر حقیقی اور مبہم چیزوں سے کچھ اس طرح خلط ملط ہو چکی ہیں کہ امتیاز مشکل ہو گیا ہے۔

موجودہ طریق تعلیم کو گذشتہ کئی برسوں سے بالاتفاق آمار مذموم قرار دیا جاتا رہا ہے موجودہ نظام تعلیم سے بے اطمینانی و بددلی کے احساسات ہر جگہ موجود تھے اگرچہ ان جذبات کے اسباب و علل مختلف جگہوں میں مختلف تھے یہی وجہ ہے کہ پاکستان بنتے ہی لوگوں نے فوراً اس طرف توجہ کی اور موجودہ نظام تعلیم کے

نقائص سے پاک ہونے کی مساعی شروع کر دیں۔ موجودہ نظام کے نقائص و عیوب کی مفصل و مکمل فہرست تیار کرنا تو یقیناً بے حد دشوار ہے لیکن تین باتوں پر تو غالباً سب متفق ہوں گے

اوّل تو انگریزی زبان کی حیثیت ——— ہمارے موجودہ نظام تعلیم میں انگریزی کو ذریعہ تعلیم اور لازمی مضمون ہونے کی حیثیت سے جو اہمیت [illegible] علمی [illegible] ہے کیونکہ [illegible] زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دینا نہ صرف غیر فطری ہے بلکہ [illegible] یونیورسٹی کی تعلیم میں انگریزی زبان و ادب کے مطالعے کو لازمی قرار دے دیا گیا ہے [illegible] کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

دوسرا نقص ہے ہماری تعلیم کی مادیت ——— اس مادیت کے مختلف مظاہر ہیں مثلاً ایک طرف تو یہ کہ دیسی ملکی زبانیں کسمپرسی کی حالت میں پڑی ہوئی ہیں اور دوسری طرف یہ کہ ہماری موجودہ تعلیم نہ صرف مادی اعتبار سے نقصان دہ ہے بلکہ اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی ناکارہ اور لایعنی ہے۔

تیسری خصوصیت ہے ہماری تعلیم کی محدودیت ——— پڑھنے لکھنے والوں کی تعداد پندرہ فی صد سے بھی کم ہے۔ اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو محض دستخط کرنا جانتے ہیں اور عورتوں کا تناسب تو اس سے بھی کہیں گیا گزرا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان نقائص کو دور کرنے کا ہمارے پاس کیا طریقہ ہے۔ گو ابھی تک ہم کسی آخری فیصلے یا تعلیمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے لیکن بحث و تمحیص کے دوران میں بعض [illegible] منظرِ عام پر آئے ہیں ان کا جائزہ [illegible] مثلاً زبانوں کے مسئلہ پر کراچی کی تعلیمی کانفرنس میں بہت کچھ کہا گیا لیکن پھر بھی بہت کچھ نہیں کہا گیا۔ میں نے خطبۂ صدارت میں کہا تھا کہ:—

> "پاکستان میں صوبائی زبانوں کو نشوونما کے زیادہ سے زیادہ مواقع بہم پہنچانے ہوں گے چنانچہ ہمیں ان صوبائی زبانوں کو مختلف صوبوں میں نہ صرف ذریعہ تعلیم قرار دینا ہوگا بلکہ دیگر ایسے طریقے بھی اختیار کرنے ہوں گے جن سے وہ تہذیب و تمدن جو کسی خاص صوبائی زبان سے مختص ہے اس زبان کے توسط سے ترویج و ترقی پا سکے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی مدنظر رکھنا ہوگا کہ ہماری (پاکستانی) کلچر کی وحدانیت و یگانگت کو صدمہ نہ پہنچنے پائے۔ ثقافتی وحدت کو برقرار رکھنے اور مختلف صوبوں کے درمیان ذریعہ مراسلت و مکاتبت و اظہار مشترکہ کا کام دینے کے لیے ایک خاص زبان کی ضرورت ہے اور اس سلسلے میں اردو زبان کے حقوق خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔ اردو نہایت آسانی اور عمدگی سے بیرونی زبانوں کے الفاظ اپنے اندر سمونے اور جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اردو کا تعلق فارسی، عربی، سنسکرت اور انگریزی سے تاریخی ہے۔ اردو میں گراں بہا ادبی سرمایہ موجود ہے۔ ان سب وجوہ کی بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ اردو پاکستان کی قومی زبان بننے کی مستحق ہے۔ جہاں تک انگریزی کا تعلق ہے غیر ملکی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دینا یقیناً مضرت رساں ہے لیکن پھر بھی آئندہ کئی سال تک ہمیں انگریزی زبان کو یونیورسٹی کی تعلیم میں اور بین الاقوامی مراسلت و مکاتبت کے ذریعے کی حیثیت سے صفِ اوّل میں جگہ دینا پڑے گی۔ گزشتہ تیس چالیس برس سے فرانسیسی کی جگہ انگریزی دنیا کی ممتاز ترین زبان ہوتی جا رہی ہے۔ علاوہ ازیں محض ذاتی منفعت کے نقطۂ نگاہ سے قطع نظر

ہمیں کس قدر طلباء ایک ایسی زبان ہاتھ سے نہیں کھو دینی چاہیے جو نہایت آسانی سے ہمیں مغربی سائنس اور کلچر سے روشناس کراتی ہے۔

فارسی اور عربی زبانوں میں ہمارا ثقافتی اثاثہ محفوظ ہے لہٰذا ان زبانوں کے مطالعے کو بھی ہمارے نظام تعلیم میں ممتاز حیثیت حاصل ہوگی۔

(خطبہ صدارت پہلی کل پاکستان تعلیمی کانفرنس)

اس اقتباس کو دوسری بار پڑھنے کی ضرورت ہے۔ پہلی مرتبہ تو ایسا معلوم ہوگا کہ اس میں ہماری قیادت کا کافی سامان ہے لیکن دوسری دفعہ پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ اس میں ایک پیچیدہ مسئلہ کو صرف بیان کیا گیا ہے حل معلوم کرنا سوال باقی ہے۔ اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے نزدیک کچھ نہیں تو دو تین زبانوں کو مساوی حیثیت حاصل ہے۔ اردو کو خاص اہمیت دی جائے گی کیونکہ یہ ہماری یگانگت و روایت کی علمبردار ہے۔ بنگالی کو زیادہ سے زیادہ نشوونما کا موقع دیا جائے گا تمدن کی خاطر۔ انگریزی کو صف اول میں جگہ دی جائے گی منفعت کی خاطر۔ فارسی اور عربی کو ممتاز جگہ دی جائے گی ثقافتی اثاثہ کی حفاظت کے لئے۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا تکمیل حیات ملی کی خاطر ہمارے لئے ان تمام زبانوں کا سیکھنا ضروری ہے یا ان میں حق انتخاب یا کم از کم حق ترجیح بھی ہو سکتا ہے۔ مختلف صوبوں میں مختلف حلقوں میں اس مسئلہ پر غور و فکر ہو رہا ہے لیکن ابھی تک کسی ایسے نقش تعلیمی کے صدور کی اطلاع موصول نہیں ہوئی۔

زبان اردو کے متعلق مختلف نظریوں کا اظہار کیا گیا ہے۔ صدارتی خطبہ میں اسے پاکستان کی قومی زبان (لنگوا فرانکا) بننے کا مستحق قرار دیا گیا ہے لیکن بہت غیر واضح اور مبہم سی بات ہے اور بعد کے مباحث سے ظاہر ہوا کہ اس سے مختلف معانی تعبیر کرنا ممکن تھا۔ اس مسئلہ پر جب کمیٹی میں بحث ہوئی تو کمیٹی نے سفارش کی کہ اردو کی تعلیم و تدریس کو تمام اسکولوں میں لازمی قرار دے دیا جائے اور اسے بتدریج زیادہ سے زیادہ حد تک ذریعۂ تعلیم بنانے کی کوشش کی جائے۔ دوسرے لفظوں میں مشرقی پاکستان والے اسکولوں میں بنگالی کو ذریعۂ تعلیم قرار دے سکتے ہیں لیکن زیادہ عرصے تک نہیں۔ یہ تو تھیں کمیٹی کی سفارشیں جن میں پنجابی ممبر تعلیم کی اکثریت تھی لیکن جب معاملہ پوری کانفرنس میں پیش ہوا تو مشرقی بنگال نے اس کی زبردست مخالفت کی اور آخری جو سمجھوتہ ہوا اس کی حیثیت کچھ نیچے درجے کی سی تھی۔ کانفرنس نے مجلس دستور ساز سے سفارش کی کہ اردو کو پاکستان کی قومی زبان (لنگوا فرانکا) تسلیم کر لیا جائے۔ یہ حیثیت اس سے بھی کمتر تھی جو صدارتی خطبے میں دی گئی تھی۔ کانفرنس نے یہ بھی سفارش کی کہ اردو کی تعلیم کو تمام اسکولوں میں لازمی قرار دیا جائے لیکن اسے کس منزل سے شروع کیا جائے اس کی تعیین کا اختیار صوبائی حکومتوں کو دے دیا گیا۔ صوبائی حکومتوں کو یہ اختیار بھی دے دیا گیا کہ وہ چاہیں تو اسے ذریعۂ تعلیم بنائیں اور نہ چاہیں تو نہ بنائیں۔

اس سے ظاہر ہوا کہ اگرچہ اردو کو اکثر قومی زبان کے خطاب سے نوازا جاتا ہے لیکن وقت آنے پر صورت مختلف ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے سیاسی رہنماؤں کی زیر قیادت مشرقی بنگال اردو زبان سے قطعی بے تعلقی کا اعلان کر دے لیکن مشرقی بنگال میں اردو زبان کے لئے بیش از بیش جوش و خروش پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ جب تک انگریزی موجود ہے اس وقت تک ایسے صوبے کے لئے اردو کا قومی زبان (لنگوا فرانکا) ہونا بھی زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ سندھ اور صوبہ سرحد نے پنجاب کا ساتھ دے کر اپنا فرض ادا کیا ہے لیکن خدشہ یہ ہے کہ آگے چل کر اگر سندھی نہیں تو پشتو یہ دعوے نہ کر دے کہ قومی یگانگت کے اندر ثقافتی انفرادیت کے تحفظ و بقا کی خاطر پاکستان کی تعلیمی ترقی میں مجھے اور زیادہ اہمیت ملنی چاہیے۔

مغربی پنجاب تو بلاشبہ اردو کا سب سے بڑا پرستار ہے۔ مغربی پنجاب میں پنجابی کی حمایت کرنا غداری کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ اس کی کچھ وجہ یہ بھی ہے کہ پنجابی کو سکھوں نے اپنی محبوب زبان قرار دیا ہے۔ ممکن ہے جب سکھوں کی یاد محو ہو جائے تو پنجابی کا گناہ بھی معاف ہو جائے لیکن اس سے پہلے نہیں۔ لہٰذا یہاں مغربی پنجاب میں اردو نہایت آسانی اور سہولت سے اپنا راستہ طے کر رہی ہے۔ عہد ماضی میں تقسیم سے پہلے اردو کی ترویج و ترقی میں جن لوگوں

نے [illegible] تعلیم اور علم بھی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] علاوہ چند بزرگوں کے ذہنوں میں یہ بھی خیال قائم ہو گیا [illegible] [illegible] جدید [illegible] [illegible] [illegible] دشمن کی چالیں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] نے فیصلہ کیا ہے کہ [illegible] سال [illegible] [illegible] میں اردو ذریعہ تعلیم [illegible] [illegible] [illegible] انتخابی مضامین کے [illegible] [illegible]

اردو ذریعہ تعلیم قرار [illegible] طلبہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اردو میں ان مضامین پر کس قدر جلد کتابیں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اساتذہ [illegible] کے ذہنی افق کے وسعت [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اختلافات نہیں [illegible] [illegible]

[illegible] تعلیم [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
اس سلسلے میں کراچی کانفرنس نے مندرجہ ذیل تجاویز منظور کیں۔

پاکستان کے نظام تعلیم کی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] زیادہ زور دیا جائے

وحدت عامہ کی [illegible] "آزادانہ" [illegible] اعلان کر سکتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں [illegible] منظور کر لیا گیا تھا درحقیقت اس قرارداد نے [illegible] تعلیم میں [illegible] باقی [illegible] [illegible] [illegible] سے مختلف [illegible] کے [illegible] کا دعویٰ [illegible] ہے ان کا نظریہ یہ تھا کہ [illegible] اوصاف و خصائل کی جگہ [illegible] کا لفظ استعمال کیا جائے [illegible] [illegible] کی جگہ توحید، رسالت و آخرت [illegible] جائے کیوں کہ [illegible] [illegible] اسلام کا [illegible] [illegible] سے دو طرح [illegible] ہماری تعلیم پر غیر [illegible] [illegible] قومیت کا مجاز [illegible]

یہ تو ظاہر ہے کہ ہماری تعلیم اسلامی رنگ میں رنگی جائے گی کیونکہ طلباء اور اساتذہ، منتظمین، مصلحین، مقننین میں اکثریت مسلمانوں کی ہو گی لیکن سوال محض تشکیل کی اہمیت اور وسعت کا ہے اگر اس مسئلہ پر آزادانہ بحث کا پورا موقعہ دیا جائے تو ہماری قوم کی ذہنی کشمکش مختلف مظاہر میں عیاں ہو جائے گی اس کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ جو کمیٹی، سب کمیٹی، پینل یا بورڈ موجودہ نصاب تعلیم پر نظر ثانی کرنے کے لئے مقرر کیا جاتا ہے وہ [illegible] کشمکش کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے چلئے یہ مان لیا کہ ہماری تعلیم میں قومی رنگ ہونا چاہئے لیکن "قومیت" کے مفہوم میں اختلافات [illegible] یہ اختلافات جگہ جگہ اپنا سر اٹھا دیتے ہیں مثلاً ہماری قومی زبان اردو ہے لیکن عربی بھی ہے کیونکہ "قومی" کا مطلب "پاکستانی" بھی ہو سکتا ہے "مسلم" بھی ہو سکتا ہے لیکن بعض ماہرین تعلیم نے تو نہایت سنجیدگی سے یہ تجویز پیش کی ہے کہ عربی کو مدرسوں کے ابتدائی مدارج میں ہی لازمی قرار دے دیا جائے پنجاب کی ایک کمیٹی میں یہ احساس قوی تھا کہ مڈل سکول میں عربی اور فارسی کو لازمی مضامین ہونا چاہئے (غالباً اردو اور انگریزی بھی) لیکن اس سے چشم پوشی اختیار کی گئی تھی۔ ایک تجویز یہ بھی تھی کہ عربی اور فارسی میں سے ایک کی تعلیم لازمی قرار دے دی جائے لیکن اس تجویز کو اس خدشہ کی بنا پر مسترد کر دیا گیا کہ اگر طلباء کو حق انتخاب دیا گیا تو وہ زیادہ تر عربی کی بجائے فارسی ہی لیں گے اس سے کم از کم والدین اور نصاب مرتب کرنے والوں کی آراء کا اختلاف ظاہر ہوتا ہے

دوسری کشمکش دینی اور دنیاوی مضامین کے بارے میں ہے۔ افادیت کے حامی دینی مطالعہ کو محض تعیش ذہنی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور جہاں تک ان سے بن پڑتا ہے وہ اقبال کے قومی شاعر ہونے کی ترجیح کو پیش کرتے ہیں ان دو گروہوں کے علاوہ دو اور بڑی بڑی الجھنیں ہیں۔ ۱۔ موضوعات بر مطالعہ فارسی ـــ فارسی صرف گلستان کے ذریعے پڑھائی جاتی ہے فارسی "کیمیائے سعادت" پڑھنے کا محض ایک ذریعہ ہے۔ ۲۔ ذہنی طرز فکر بر مقابلہ عقلی طریق فکر ـــ: تاریخ تصور کو انسانی فکر و ذہن کے ارتقا کے مطالعے کی حیثیت سے پڑھایا جائے یا محض کلمات نصیحت کے مجموعے کی حیثیت سے۔

یہ الجھنیں ہمیں ایک ایسے مقام پر لے جاتی ہیں جہاں ہمیں ایک طرف نوجوان طبقے کا پیش کیا ہوا اسلام اور دوسری طرف قدیم اور تحریکوں کا حقیقی یا غیر حقیقی صحیح نظر آتا ہے یہ ایک زبردست اختلاف ہے کہ کس حد تک اسلام بغیر اپنی مخصوص اساس کھوئے افکار جدید کو اپنے اندر سمونے کی صلاحیت رکھتا ہے؟ کیا ہم جدید ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی بھی ہو سکتے ہیں؟ کسی نے کبھی یہ سوال نہیں کیا کہ کیا "ہمارے واقعی اسلامی ہونا بالکل ضروری ہے؟ سوال ہمیشہ یہ کیا گیا ہے کہ آیا ہمیں "ماڈرن" ہونے کی ضرورت ہے؟

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ ان سوالوں کے جوابات مختلف اور متضاد ہیں لیکن کسی نہ کسی طرح ان سب کو ایک کل میں پیدا ہوگا ورنہ ہمارا نظام تعلیم ساری احتیاجات کا بار اٹھانے کی استعداد سے محروم ہو جائے گا۔ سر سید کے زمانے میں بھی اس قسم کے سوالات کئے گئے تھے اور اس قسم کی الجھنیں اور پیچیدگیاں اس وقت بھی سطح پر ابھر آئی تھیں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو سر سید پر ہندوستان میں اسلام کی بیخ کنی کا الزام دھرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آج بھی ہمیں روحانی اور ذہنی سکون حاصل نہیں۔

اس مسئلے کا حل یا تو وقت کے ہاتھوں ہو سکتا ہے جس میں دیر لگے گی یا زبردست جنگ کے ذریعہ اس میں خدشہ ہے کہ تعمیر سے زیادہ تخریب ہوگی یا قابل قیادت کے توسط سے جو اس وقت موجود معلوم نہیں ہوتی جب تک یہ نہیں ہوتا تعلیمی مباحث کا نتیجہ کچھ زیادہ اشتراک نہیں ہے بلکہ اشتعال کی صورت میں ظاہر ہوتا رہے گا۔ اشتعال کی علامتیں ابھی سے ظاہر ہیں اگر ہم ہر مختلف زاویہ نگاہ کو تسلیم کر کے اپنے نصابوں میں اضافہ کرتے گئے تو طلبا اور بلکہ صرف ہماری تعلیم گاہیں خود اس بار گراں کی شاید متحمل نہ ہو سکیں۔ ہر تجویز کو اس شد و مد سے پیش کیا جاتا ہے اور اسے لازمی قرار دیئے جانے پر اس قدر زور دیا جاتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے نظام کے تحت جو طالب علم بھی کامیاب ہو کر نکلے وہ ایک ہی وسیع طریق کے مطابق چلا ہوا ہو۔ اب تک انگریزی، اردو، فارسی، عربی، دینیات، اسلامی تاریخ، عسکری تربیت اور سائنس، ان سب کو لازمی مضامین قرار دیئے جانے کی تجویزیں پیش کی جا چکی ہیں کہا گیا ہے کہ انہیں نہ صرف کالجوں اور سکولوں میں بلکہ مقابلے کے امتحانوں میں بھی لازمی قرار دے دیا جائے ہمارے سامنے جو خطرہ اس وقت درپیش ہے وہ یہ نہیں ہے کہ ہماری تعلیم کا مواد بہت کم ہوگا بلکہ یہ کہ بہت بھاری ہوگا اس قدر بھاری کہ یا تو تعلیم بالکل ناممکن ہوگی یا بالکل فضول ہوگی۔

تعلیمی حلقوں میں انگریزی کے متعلق بہت کم کچھ کہا سنا جاتا ہے بس خاموشی سے یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ انگریزی ابھی جاری رہے گی۔ لیکن انگریزی کی پرجوش حمایت سے احتراز کیا جاتا ہے۔ اس کے بین الاقوامی رتبہ اور اہمیت کا تو احساس ہے لیکن اس کی معاشرتی اہمیت پہلے ہی بہت کم ہو چکی ہے اور اس کی کلچری وقعت سے اگرچہ اعلانیہ انکار تو نہیں کیا جاتا ہے لیکن بعض لوگ اسے پسند نہیں کرتے ان حالات میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اب اس کا مستقبل کیا ہوگا بلکہ آیا اس کا مستقبل بھی ہے یا نہیں؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریزی کے خلاف جو معاندانہ جذبہ پایا جاتا ہے خواہ وہ فطری اور حقیقی ہو اور خواہ انتقامی ہو اس کا بالآخر اثر یہ ہوگا کہ اس مضمون کی تعلیم کا معیار گر جائے گا ایسے ماہرین تعلیم بھی موجود ہیں جو اس قسم کی صورت حال کو خالی از خطرہ تصور نہیں کرتے ان کا کہنا ہے ہمیں مغربی ادبی و علمی ذخائر کے مقابلے کا ادب و علم از سر نو تیار کرنا پڑے گا لہٰذا ہمیں زمانۂ حال کو زمانۂ تراجم بنانے کی ضرورت ہے تاکہ انگریزی کی مراجعت

پیچھے بھاگیں سے مغربی سائنس اور علوم کے تمام راز ہمارے لئے مرتب ہو کر پہلے ہی علمی اصطلاحات سے بے تعلق رہ کر اپنے علم اور زبانوں کے لئے جو حق و انصاف روش میں ہم انگریزی زبان سے بھی اپنے تعلق و ربط کو قائم رکھیں گے تو ہم سے یہ سخت غلطی ہو چکی ہے

ان خطرات، مشکلات اور الجھنوں اور پیچیدگیوں کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی ایک اتفاق حسنہ کی صورت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ سائنٹیفک طریقوں کی تربیت کی خواہش پاکستان میں اس وقت سب سے بڑی اپیل رکھتی ہے اور وہ دیکھ رہی ہے کہ نئے نئے آلات جنگ کی حفاظت ہے حتیٰ کہ اس نوزائیدہ مملکت کو بھی نئے حالات کا مستقبل اور حقیقی تقاضوں سے واسطہ پڑتا ہے جن کا سبب یہ ہے کہ سائنس کی طرف رجوع بنے اور اس کی افادیت کا بہت زور گھٹا کہ اس شدید وقت تک کسی سے کہا جاتا ہے روایت پرست لوگ بھی سائنس کو محض چند طلسم تک محدود بنا کر منظور کر لیتے ہیں سائنس دانوں، ٹیکنیکل ماہرین اور تجربہ کاروں کے خاص ٹیکنیکل ساز و سامان کی مانگ بڑھ رہی ہے اور ترقیات در جاتی ہے اور تعلیمی مباحث میں سائنس کی ایک عظیم فلسفے کی صورت یہ مسرت جاتی ہے جا رہی ہے۔ یہ حسن اتفاق ہے جو وہم سے اختلافات کو دور کرنے کا باعث بن سکتا ہے ہم سائنس کی ایجادوں کا نتیجہ ہے ہمیں یہ بھی علوم ہے کہ سائنس کا ظرف حقیقت، صداقت اور اقدار تنگ ہے ہمیں یہ بھی احساس ہے کہ اس میں حسن و محبت کے لطائف کو سمجھنے کی صلاحیت سے بے بہرہ ہے اور یہ اس لئے غیر اخلاق سے بے نیاز) نقطۂ نظر کا بھی حامل ہے لیکن ان تمام خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود اگر سائنس ہمیں اپنی الجھنوں اور پریشانیوں سے نکلنے میں کچھ مدد دے تو اس کی راہ چلنا اس سے بہتر اور مصلحت سے بہتر ہے۔

اختتام سے قبل تعلیم عامہ و تعلیم بالغاں کے بارے میں بھی دو چار کلمے مناسب ہوں گے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اگر تعلیم کی موجودہ رفتار جاری رہی تو ہماری آبادی کو خواندگی اور جہالت دور کرنے کے لئے کچھ نہیں تو ڈیڑھ سو سال درکار ہوں گے اگر ہم فوق العادت کوشش کا مظاہرہ کریں اور اپنے اثر کو بروئے کار لائیں یعنی یہ کہ ہر پڑھے لکھے آدمی کو استاد بنا دیں اور ہر گھر کو اسکول بنا دیں تو ڈیڑھ سو سال کا کام بیس سال میں مانوس ہے کہ اس موازنہ پر کوئی بات قابل ذکر نہیں برطانوی راج پر سب سے بڑا داغ یہ ہے کہ انہوں نے ہمیں ہمارے فائدے کے لئے نہیں بلکہ اپنے لئے پڑھایا

کس قدر افسوس کا مقام ہوگا اگر ہمارے ارباب اختیار بھی برطانوی روایت کو برقرار رکھیں اور اسے نہایت اعتماد سے پروان چڑھاتے

ایڈیٹنگ کا فن

بدقسمتی سے بہت سے حضرات بھی ایسے مل جائیں جو اس مضمون کو پڑھیں گے۔ اگر ان میں سے کم از کم ایک بزرگوار تو ایسے ضرور ہوں گے جنہیں سینما سے نفرت ہے اور اظہار نفرت میں کوئی تامل محسوس نہیں کرتے۔ باقی حضرات میں بھی بعض ایسے ہوں گے جو کبھی کبھی اس گناہ کا ارتکاب تو کر لیتے ہیں لیکن اقبال جرم نہیں کرنا چاہتے اور اکثر اوقات اپنے سینما تشریف لے جانے کی تاویل یوں فرمایا کرتے ہیں:-

"شام کو کوئی شغل نہیں تھا۔ آپ جانتے ہیں میری بیوی روڈولف والنٹینو کی فلموں کو بہت پسند کرتی ہے میں نے سوچا کہ لاؤ ہم بھی چلے چلیں چنانچہ ہم ...."

لیکن اس جگہ نہ تو میں ان صاحب کے خلاف جہاد کرنا چاہتا ہوں جنہیں سینما سے نفرت ہے اور نہ دوسرے گروہ کو جسے بیوی کے سر الزام تھوپنے میں لطف آتا ہے اس لطف و مسرت سے محروم کرنا چاہتا ہوں۔ میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر سینما واقعی آرٹ کہلانے کے قابل ہے اور اس کے کمالات کا کوئی جداگانہ مظہر ہے اور اس کے آرٹ کا کوئی مخصوص وسیلۂ اظہار ہے تو وہ کیا ہے؟ مصور کے کمالات کا مظہر خطوط اور رنگ ہیں۔ شاعر الفاظ کے ذریعے اپنا مطلب ظاہر کرتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ فلم کار کن چیزوں سے کام لیتا ہے، اس کے پاس کس قسم کا مواد موجود ہے اور اس مواد کے امکانات کا دائرہ کہاں تک وسیع ہے۔

اس قسم کے سوالات کا جواب دینے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ فلم کیوں کر بنایا جاتا ہے کیونکہ اس طرح ہمیں یہ بتانے میں آسانی ہوگی کہ سینما میں کس قدر وسعت ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ فلم متحرک کیمرے کی تصاویر کے ایک سلسلہ کا نام ہے، جو یکے بعد دیگرے دکھائی جاتی ہیں۔ یا یوں کہئے کہ سینما کے شاٹ جب ترتیب و تسلسل کے ساتھ دکھائے جاتے ہیں تو انہیں فلم کہا جاتا ہے۔ شاٹ فلم کے ایک ایسے ٹکڑے کا نام ہے جس کی تصویر متحرک کیمرہ میں بیک وقت لی جاتی ہے جہاں تسلسل ٹوٹا، شاٹ ختم ہو جاتا ہے جب کیمرہ دوبارہ چلنے لگتا ہے تو دوسرا شاٹ شروع ہو جاتا ہے۔

قصہ (یا جو کچھ بھی فلم کا موضوع ہو) کے انتخاب کے بعد دوسرا مرحلہ فلم بنانے کا مرتب کرنا ہے۔ میں یہ تو تفصیل نہیں بیان کرنا چاہتا کہ فلم نام کتنے مرحلوں سے گزرنے کے بعد تکمیل کی منزل تک پہنچتا ہے بلکہ میں صرف اس قدر عرض کروں گا کہ فلم بنانے میں قصے یا موضوع فلم کی تمام روداد کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور اسے "شاٹوں" میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ہر شاٹ کا حال پورے تفصیل کے ساتھ لکھا جاتا ہے اس کی تمام جزئیات کو واضح طور پر بیان کیا جاتا ہے گویا وہ تمام اجزا جن کی ترکیب سے فلم کی تکمیل ہوتی ہے اسی ترتیب اور تقدم و تاخر کے ساتھ فلم بند کئے جاتے ہیں جس ترتیب کے ساتھ انہیں پردے پر دکھانا منظور ہے۔ ہر شاٹ کے متعلق پوری وضاحت اور تفصیل کے ساتھ ہدایات دی جاتی ہیں اور بتایا جاتا ہے کہ شاٹ کا موضوع

سیاہ ہوگا

زیادہ پیچیدگی نمودار ہوگی۔ دو کیمرا شاٹ ہوتے ہیں یا [illegible] میں رفتار پر آ جاتا ہے یا یہ ابتدا میں تھم تھم کر نمودار ہوگا اور رفتہ رفتہ بتدریج ڈوب جاتا ہے۔ ابتدا یا آخر میں [illegible] ہو جاتا ہے یا آہستہ آہستہ ہوگا یا سرعت سے۔ اور اگر دونوں صورتیں نہیں تو یا وہ پچھلے شاٹ میں سے رفتہ رفتہ نمودار ہوگا اور اگلے شاٹ میں تحلیل ہو جائے گا۔ اسے اصطلاح میں عمل تحلیل کہتے ہیں اور یہ عمل تحلیل آہستہ آہستہ ہوگا یا تیزی سے۔ پھر یہ تمام ہی ضروری ہے کہ شاٹ لیتے وقت کیمرا [illegible] "زوم" کے قریب ہو جاتا ہے یا پیچھے ہٹ جاتا ہے یا اس کے متوازی حرکت کرتا ہے اور گھوم کر پورے منظر کی تصویر لیتا ہے۔

"فلم نامہ" میں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ کس چیز کا شاٹ لیا جائے۔ کیمرا اس کے سامنے کس بلندی پر ہوگا جیسے جھک کر، انسان کی آنکھ سے یا کسی اور نقطے سے۔ ایسے شاٹ لیا جائے گا کہ وہ کس حد تک نزدیک ہوگا۔ شاٹ قریبی ہوگا یا اصلی یا بعیدی۔ غرض فلم نامے میں ان تمام سوالوں کے جواب اور ہر شاٹ کے متعلق تفصیلی باتیں موجود ہوتی ہیں۔

میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ فلم نامہ میں شاٹ اسی ترتیب سے لکھے جاتے ہیں جس ترتیب سے انہیں پردے پر دکھایا جاتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ شاٹ لیتے وقت بھی یہی ترتیب ملحوظ رکھی جائے۔ شاٹ تو اسی ترتیب سے لئے جاتے ہیں جس میں زیادہ سہولت ہو۔

فرض کیجئے کہ ایک کہانی کا آغاز [illegible] سے ہوتا ہے اور خاتمہ بھی [illegible] ہی میں۔ اگر درمیان میں [illegible] کے تمام سین پہلے لے لئے جائیں اور پھر انہیں فلم نامے کے مطابق مرتب کر لیا جائے تو آسانی رہے گی۔ جو کہانی کا ایک سین تو ایک مقام قدرتی یا اسٹوڈیو میں مصنوعی طور پر تیار کردہ سے متعلق ہو، تمام اور دوسرے سین کا تعلق کسی دوسرے مقام سے ہو، ہر مقام کے مناظر متواتر اسی طرح تبدیل ہوتے رہتے ہیں جیسا کہ فلموں میں ہوا کرتا ہے تو آپ وہ تمام مناظر جو ایک جگہ سے تعلق رکھتے ہیں ایک مرتبہ لے لیں گے۔ اور پھر دوسری جگہ پہنچ کر تمام متعلقہ مناظر کا عکس لے لیا جائے گا۔ اس بات کا خیال نہیں رکھا جائے گا کہ ترتیب کے لحاظ سے جو سین پہلے ہے سب سے پہلے لیا جائے۔ اور جو آخر میں ہے سب سے آخر میں "فلم بند" کیا جائے۔ اس کے بعد آپ آخر تمام عنوانات کے فوٹو لے لیں گے۔ جب تمام واقعات اور عنوانات کا عکس لے لیا جائے گا تو سیلولائڈ کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا جائے گا ایک ایک شاٹ الگ کر لیا جائے گا پھر ہر شاٹ میں کسی قدر کاٹ چھانٹ ہوگی (ہر شاٹ کے دونوں سروں پر کسی قدر زائد سین لیا جاتا ہے تاکہ بعد میں اسے کاٹ کر تناسب پیدا کر دیا جائے) اور آخر میں یہ شاٹ مناسب ترتیب کے ساتھ جوڑ دیئے جائیں گے۔ اور فلم کی تکمیل ہو جائے گی۔ فلم کی تنقیح و برید اور از سر نو شیرازہ بندی جسے تدوین یا ایڈیٹنگ کہتے ہیں فلم سازی کا ایک اہم مرحلہ ہے کہ بعض ڈائریکٹر خصوصاً روسی ماہرین تو حقیقت میں فن اسی کو سمجھتے ہیں۔

سینما ایک "صوری" فن ہے۔ تمام صوری فنون سے کم عمر لیکن اس کم عمری کے باوجود اسے ایک حیثیت سے ان پر فوقیت حاصل ہے تمام صوری فنون "حرکت" کے اظہار سے قاصر ہیں۔ بہت ہوا تو انہوں نے حرکت کا مفہوم ادا کر دیا۔ لیکن فلم کو یہ دشواری نہیں۔ وہ "حرکت" کو عین اور صحیح طور پر ظاہر کر سکتی ہے۔ عمل ڈرامے کی جان ہے اور فلم میں بھی اسے یہی حیثیت حاصل ہے کیونکہ فلم میں تو کوئی چیز دکھائی ہی نہیں جاتی جس کی ظاہری حالت اس کی تمام کیفیات کی ترجمان ہو اور جس میں واضح طور پر حرکت نظر آئے۔ اور وہ فلم ہی کیا ہے جس میں حرکت اور اس کا اتار چڑھاؤ، اس کا توڑ یا روک دیا جانا اور یا حرکات کا باہمی تصادم نہ دکھایا جائے۔ تمام صوری فنون میں یہ امتیاز فلم کو ہی حاصل ہے کہ مسلسل حرکات اور روانی کو اس کا اصول موضوعہ قرار دیا جا سکتا ہے گویا فلم کا آغاز حرکت سے ہوتا ہے اور ایک شاٹ سے دوسرے شاٹ کے درمیانی فاصلہ میں بھی تسلسل یا روانی موجود ہوتی ہے اور

یہی خصوصیات ہیں جو اسے دوسرے فنون سے ممتاز کرتی ہیں۔ آپ نے بہتر سے بہتر تصویر دار پوسٹ کارڈوں کے البم دیکھے ہوں گے جن پر تفریح گاہوں اور صحت افزا مقامات کے مناظر ہوتے ہیں۔ یہ تصاویر ایک خاص تعلق کی بنا پر ایک دوسرے سے منسلک تصور ہوتی ہیں لیکن ان میں یہ خاصیت کہاں ہے کہ ایک تصویر دوسری تصویر میں داخل ہو جائے۔ اور متواتر تحلیل سے ایک تسلسل پیدا کرے۔ یعنی البم سے یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ کیا ہوا؟ لیکن یہ کون بتائے کہ کیوں کر ہوا؟ اس کے متعلق پر صرف فلم ہی قادر ہے۔ جب تک واقعہ کی پوری ترتیب اور پوری صحت اور کیفیت اس کی ملاوٹ و حاشیہ کو بھی نہ دیا جائے لطف نہیں آتا۔

ناولسٹ الفاظ میں منظر کی تصویر کھینچتا ہے۔ ڈرامسٹ مکالمے سے یہ کام لیتا ہے۔ فلم نگار کے لئے ضروری ہے کہ جب وہ فلم لکھنے کے لئے قلم اٹھائے تو اس کے ذہن میں ایسی ہی متحرک اشکال موجود ہوں جو سالم ایک دوسرے پر ڈھلتی چلی جائیں۔

ایک کہانی میں جو فلم کے لئے لکھی گئی ہے ایک فقرہ یہ ہے :۔

"زید اس کے مکان میں اکثر آیا کرتا تھا۔" یہ جملہ بحیثیت فقرے کے معنی اور اظہار مطلب پر پوری طرح قادر ہے۔ لیکن اسے اسی طرح فلم کی صورت میں منتقل کر دینا ناممکن ہے۔ ناولسٹ کے قلم سے جب یہ جملہ نکلا تھا تو اس کے ذہن میں اشکال و صور نہیں بلکہ الفاظ تھے یہ تو اسی صورت میں فلم کے لئے ممکن ہو سکتا تھا کہ لکھنے والے کے ذہن میں الفاظ کے بجائے تصاویر ہوتیں۔ اکثر ایک غیر معین عدد ہے جس کے معنی کئی مرتبہ کے ہیں۔ اگر فلم میں زید کو اس مکان پر پانچ چھ مرتبہ آتا دکھایا جائے تو کہیں جا کر "اکثر" کا مفہوم پورا ہوگا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ "اکثر" کا مفہوم ادا کرنے کا یہ طریقہ بے حد صبر طلب ہے ایک فلم میں یہ مشکل اس طرح حل کی گئی تھی۔ کہ زید مکان میں قدم رکھتا ہے تو بچے خوشی سے اس کی طرف دوڑتے ہیں اور کتا اچھلتا اور دم ہلاتا اس کی جانب لپکتا ہے۔ اس طرح تماشائیوں کو معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ زید اس مکان میں نو وارد نہیں بلکہ اکثر آتا ہے۔

"اے وومن آف پیرس" نام فلم میں جس کا ڈائرکٹر چارلی چیپلن تھا۔ یہی مفہوم زیادہ لطیف طریقے پر ادا کیا گیا ہے مکان میں وہ تنہا بیٹھے دکھائے گئے ہیں اور نہ کوئی پالتو حیوان تھا نوکروں کے سوا مکان میں کوئی نہ تھا زید ایک مکان میں داخل ہوتا ہے صوفے پر جا بیٹھتا ہے کچھ دیر سیکسوفون بجاتا رہتا ہے۔ پھر اسے خیال آتا ہے کہ اس کے پاس رومال نہیں وہ بغیر کسی پس و پیش کے اٹھتا ہے اور دوسرے کمرے میں جا کر اور نہایت بے تکلفی سے ایک دراز کھول کر ایک رومال نکال لیتا ہے

لیکن یہ تو ایسی مثالیں ہیں کہ کہانی پہلے موجود تھی۔ بعد میں اسے فلم کی صورت میں ڈھال لیا گیا اور بہتر یہ ہے کہ تصاویر سے کہانی مرتب کی جائے۔ گویا تصویر بمنزلہ بیج کے ہے جو کہانی کے پودے کو جنم دیتی ہے اس کے برعکس کہانی کو بیج اور تصویر کو پودا فرض کر لینا سخت غلطی ہے۔ میں یہاں بعض اچھے فلموں کی ایک فہرست پیش کرتا ہوں۔ جس کی ترتیب میں کسی خاص غور و فکر سے کام نہیں لیا گیا۔ ایک نقاد نے اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے یہی فہرست بطور دلیل پیش کی ہے۔

دی کروزر پوٹمکن۔ دی کیبنٹ آف ڈاکٹر کیلی گاری۔ اے وومن آف پیرس۔ وارننگ شیڈوز۔ دی سالویشن ہنٹرز۔ وارائٹی۔ دی پلگرم برلن اور دی میرج سرکل۔

یہ سب کے سب کامیاب فلم ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک بھی کسی ناول یا ڈرامے سے ماخوذ یا مستعار نہیں۔ اس سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ جب کسی ناول کو فلم کے قالب میں ڈھالا جاتا ہے تو کیوں ناکامی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر "ٹیس" کو لیجئے۔ فلم میں خیر ایک تو بے جا جابرانہ تصرف کیا گیا ہے کہ کہانی کو مسرت انجام بنا دیا گیا ہے لیکن اس سے ذرا قطع نظر کر کے دیکھئے تو بھی فلم اکثر حیثیتوں سے ناکامیاب نظر آئے گی۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ٹامس ہارڈی نے جو مطالب الفاظ میں ادا کئے ہیں۔ انہیں تصاویر میں ظاہر کرنے کے لئے ہارڈی جیسے نکتہ رس دماغ کی ضرورت ہے جسے اتنا تعذر ہی ہو

ناول نگار تصویر کے فن میں اتنی ہی مہارت رکھتا ہو جتنی [illegible] پروڈیوسر اور ڈائرکٹر میں [illegible] پیش کش [illegible] سے چارلس [illegible] مہارت و قابلیت سے محروم تھا۔ اس فلم نے بہترین حصے جن میں ناول کے رنگ و روپ کا کمال صرف کیا ہے، دیکھئے تو [illegible] سے زیادہ آپ ہی ہے۔ [illegible] کی کتاب کا جدید [illegible] ایڈیشن طبع کیجئے گا۔ اب اس کا مقابلہ ایک اور فلم "سنہری شے" سے کیجئے یہ بھی ایک ناول سے ہی ماخوذ ہے لیکن جو نقشہ میں پیش کر رہا ہوں اس کے اعتبار سے یہ کامیاب اور مختلف حیثیت سے جانچا ہوا ثابت ہوا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس فلم کا [illegible] ایسا شخص ہے جس کا شمار کامیاب فن [illegible] میں کیا جاتا ہے لیکن میرے خیال میں فلم کی کامیابی کا راز خود ناول میں پنہاں ہے کیونکہ میں ناول سے ایک ٹکڑا اقتباس پیش کرتا ہوں۔

"لیکن زار اٹھ کھڑا ہوگیا اور اس کا ایک ہاتھ سلام کے لئے ٹوپی پر جا پہنچا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر طرف سے حس و حرکت موت [illegible] رہی ہے۔ زار کے پیش خدمت کا چہرہ [illegible] ہوا تھا۔ [illegible] ہو گیا تھا۔ اس کے [illegible] دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کہ [illegible] نکلنے ہی والی ہیں کیونکہ اس کے [illegible] زاروں کے ساتھ [illegible] [illegible] بیٹھنے کا [illegible] تھا۔

زار دروازے میں کھڑا تھا۔ آنکھوں کے پپوٹے بھرے ہوئے تھے [illegible] جس [illegible] تھے [illegible] نہیں [illegible] سے گذر کر برآمدے کے بیرونی حصے تک جا پہنچی تھیں۔ اور اس کیفیت میں [illegible] قدم آگے بڑھ گیا۔ اس کے پیچھے [illegible] دستہ [illegible] صورت چہرہ [illegible] تھی۔ اس کا دبلا پتلا [illegible] معلوم ہوتا تھا [illegible] ایک [illegible] کپتان کے پاس سے گذرا [illegible] سلامی کے [illegible] بوٹ سے ٹھوکر ماری۔ اپنی غلطی محسوس کر کے اپنی قاعدے کے مطابق سیدھا کھڑا ہوگیا۔ زار [illegible] اور کپتان کے چہرے پر موم کی طرح زرد چہرہ رہا [illegible] نظریں گاڑ دیں۔ اور [illegible] آواز میں کہا۔

"مرادیف"

ایڈجوٹنٹ تین قدم آگے بڑھ کر زار کے پیچھے کھڑا ہوگیا۔ زار نے شانت کپتان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ اسے [illegible] پیدل فوج کی رجمنٹ متعینہ [illegible] میں تبدیل کیا جاتا ہے۔

مرادیف نے حکم کی یادداشت رکھ لی۔ زار کی ملاقات کا [illegible] کا مضبوط جسم اور [illegible] آمیز چہرہ نظر آتا تھا۔ اس نے نیم باز آنکھوں سے معتوب کپتان پر نظر ڈالی جس کی نگاہوں میں غصہ کی بجلیاں کوند رہی تھیں۔ اور اس کے ابرو کسی قدر اوپر چڑھ گئے۔"

کیا اس سے زیادہ واضح اور سینما کے مقاصد سے اس قدر مطابقت رکھنے والا کوئی ناول لکھا جا سکتا ہے۔ ہر لفظ بجائے خود ایک تصویر ہے جس میں [illegible] حرکت کرتے نظر آتے ہیں۔ پھر جب فلم نگار کا قلم ان تصویروں میں رنگ بھرتا ہے تو اور ہی کیفیت ہو جاتی ہے۔ مثلاً زار ایک جگہ کہتا ہے "سعدا میں تمہیں ایک راز بتاتا ہوں۔ میرا باپ بھی قتل کیا گیا تھا اور غالباً میرا بیٹا بھی کسی دن میری طرح قتل کر دیا جائے گا۔"

اب فلم کار کی جدت طرازی دیکھئے کہ زار کے منہ سے یہ الفاظ کہلوانے کی بجائے اس کے باپ دادا کی تصویر دکھائی جاتی ہے جو نہایت موزوں طریق پر ہماری نظروں سے گذرتی ہے زار آخری تصویر کے سامنے جو اس کی اپنی شبیہ ہے ٹھہر جاتا ہے یہ عجیب پر حسرت منظر ہے زار کی آنکھوں میں التجا اور استفہام کی ملی جلی کیفیت نظر آتی ہے گویا یہ کچھ مانگ بھی رہی ہیں کچھ پوچھ بھی رہی ہیں۔

ایک جگہ ناول نگار لکھتا ہے کہ "زار نے گھونسا تان کر کہا۔ میں زار ہوں اور زار رہوں گا۔" فلم نگار نے یہاں بھی اپنی سحر آفریں قلم کے عجیب کرشمے دکھائے ہیں۔ زار بھاگ کر اپنے دربار کے کمرے میں پہنچتا ہے قاتل پیچھے پیچھے ہیں زار بھاگ کر چبوترے پر چڑھ جاتا ہے اور تخت کے سامنے تن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ پھر اپنا ہاتھ بلند کر کے کہتا ہے۔

میں زندہ رہوں گا:

فلم ساز کے کیمرے کی ہلکی سی جنبش نے اس منظر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ جب ناول کے مقامات کو جو کہ ہم تصاویر سے کم نہ تھے یوں واضح کر دیا جائے تو ایسی فلموں کی کامیابی پر کسے تعجب ہو سکتا ہے۔

فلم میں مرئی اشکال سے بنتا ہے وہ بآسانی دوسرے قالب میں ڈھل جاتی ہیں۔ ایک تصویر پردے پر جلوہ دکھا کر غائب ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ دوسری تصویر لے لیتی ہے۔ ہر دم رنگ بدلنے اور نئے نئے پیکر اختیار کرنے والی شکلیں اپنے حالات کی ترجمان آپ ہوتی ہیں۔ ہر تصویر واضح اور غیر مبہم معنی رکھتی ہے جن کی شرح بیان کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ ذہن خود بخود انہیں سمجھ لیتا ہے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ ہر خیال کو سینکڑوں طریقوں سے ادا کیا جا سکتا ہے۔ ایک مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ہزاروں تصویریں بن سکتی ہیں۔ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ پورے غور و فکر کے بعد تصاویر کا انتخاب کیا جائے اور ان تصاویر کو منتخب کیا جائے جو سب سے زیادہ واضح ہوں۔ اور ہمارے مفہوم ذہنی کو پوری طرح ادا کر سکیں۔ کیمرہ دیکھتا ہے، سنتا ہے، چھوتا ہے، سونگھ سکتا ہے، چکھتا ہے گویا وہ انسان کی طرح حواس خمسہ رکھتا ہے لیکن اس کی آنکھ بے پروا تماشائی کی سی آنکھ نہیں، بلکہ وہ ہر چیز کا مطالعہ ناقدانہ نگاہ سے کرتا ہے اور فلم کار کو بڑی آسانی یہ ہے کہ کیمرہ کی وسیع طاقت اور قوت اسے مدد دینے کے لئے موجود ہے۔

فرض کیجئے کہ ہمارے سامنے دربار شاہی کا منظر ہے۔ تماشائی اگر اس منظر کا پوری طرح مشاہدہ کرنا چاہے گا تو وہ بالا خانے پر چلا جائے گا تاکہ وہاں سے تمام منظر اچھی طرح دیکھ سکے۔ پھر بھی اس کی خواہش یہ ہوگی کہ بادشاہ کو قریب سے دیکھے درباریوں کے ہجوم میں مل کر ایک ایک چیز پر نظر ڈالے لیکن تماشائی کی توجہ پر پوری طرح تصرف کر لیتا ہے۔ تماشائی انہیں چیزوں کو دیکھتا یا دیکھ سکتا ہے جنہیں فلم ڈائریکٹر انہیں دکھانا چاہتا ہے اور پھر ان مناظر کا انتخاب اس ڈھنگ سے کیا جاتا ہے کہ تماشائی انہیں صرف دیکھتا ہی نہیں بلکہ وہ اس کے ذہن پر نقش ہو جاتے ہیں۔

ایسے ہی مقام پر فلم کار کے جوہر کھلتے ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ فلم میں جو قدرت ہے وہ تھیٹر میں نہیں۔

فلم کی قدرت کا دائرہ اس اعتبار سے بھی وسیع ہے کہ وہ جزئیات اور تفصیلات کو نہایت واضح طور پر پیش کرنے کی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ فلم کار کیمرے کی مدد سے ہر چیز کی گہرائیوں تک اتر جاتا ہے اور تصویر کی روح کو بے نقاب کر دیتا ہے چنانچہ ایک نقاد لکھتا ہے کہ

کیمرہ ہمیشہ زندگی کی گہرائیوں میں اتر جانے کی کوشش کرتا ہے اور ایسی ایسی پوشیدہ چیزوں تک پہنچتا اور انہیں بے نقاب کر دینا چاہتا ہے جنہیں عام تماشائی کی نظر نہیں دیکھ سکتی۔ کیمرے کی قدرت کا دائرہ اس سے بھی زیادہ وسیع ہے جو چیز بھی اس کے سامنے آتی ہے وہ اسے سلولائڈ پر محفوظ کر لیتا ہے۔ جب ہم کسی تصویر کو دیکھتے ہیں تو بہت دیر کے بعد اچھی خاصی کوشش کر کے ہماری نگاہ کسی خاص نقطے پر مرکوز ہوتی ہے اور ہم تصویر کے محاسن کو سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن فلم میں نہ اتنا وقت صرف کرنے کی ضرورت ہے نہ تصویر کی خوبیاں سمجھنے کے لئے کوئی کوشش کرنا ضروری ہے۔

فلم کو ایک اور بھی سہولت حاصل ہے جو اس سے بھی بڑھ کر کہیں اہم ہے۔ فلم اپنے لئے الگ زمان و مکان پیدا کر لیتا ہے جو حقیقی زمان و مکان سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ سٹیج میں کسی حد تک یہ بات ہے کہ امتداد زمانہ کو واضح کرنے کے لئے پردہ گرایا جاتا ہے یا اٹھایا جاتا ہے۔ لیکن فلم اس بارے میں تھیٹر پر سبقت لے گیا ہے۔ سٹیج پر ہر کیریکٹر ایک نقطے سے دوسرے نقطے تک حرکت کرتا ہے اور یہ کیفیت ہوتی ہے کہ کوئی اہم واقعہ اسی وقت رونما ہوتا اور کسی ایکٹر یا پروڈیوسر کو یہ قدرت حاصل نہیں ہے کہ اس بعد مکانی کو جو ان دونوں نقاط کے درمیان حائل ہے دور کر سکے یا اس وقت کو جو فاصلہ طے کرنے میں صرف ہوتا ہے مٹا ڈالے اور تماشائی کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ جب کیریکٹر ایک نقطے سے دوسرے نقطے کی جانب حرکت کر رہا ہو تو وہ اپنے ذہن کو معطل کر سکے۔

اب دوسری طرف ملاحظہ کیجئے کس طرح مکانی کو زمانی سے ملا دیتے ہیں۔ ایک شاٹ اس وقت لیتے ہیں جب کیمرہ نقطہ الف پر ہوتا ہے اور دوسرا اس وقت جب وہ نقطہ ب پر پہنچ جاتا ہے پھر دونوں شاٹ ملا دیے جاتے ہیں۔ اور تھوڑی دیر سے آپ کی ساری توجہ ایک نقطہ پر مرکوز ہو جاتی ہے وقت کا ایک دھارا سا بہنے لگتا ہے۔ جس میں سے بعض لمحے اہم ہوتے ہیں اور بعض غیر اہم۔ فلم کار بڑی ہنر مندی سے غیر اہم کو نظر انداز کرتے ہوئے بلکہ حذف کر کے ایک نیا زمان پیدا کر دیتا ہے جس میں صرف اہم لمحے ہوتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ چاہے تو لمبے عرصۂ وقت کو مختصر کر جائے اور دوسری جگہ پھیلا کر دکھائے اور دو مختلف مقامات میں ایک وقت دو مختلف کیفیتیں نظر آئیں اور وہ یہ بھی کر سکتا ہے کہ وقت کا سیل رواں ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے اور وہ ساتھ ساتھ پہلو بہ پہلو بہتے نظر آئیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ فلم میں جب کوئی ایسا منظر دکھایا جاتا ہے کہ ایک طرف ایک مصیبت زدہ کی زندگی کے آخری لمحے ہیں اور دوسری طرف کوئی اسے نجات دلانے چلا ہے تو فلم کار اپنے فن کے ایسے ہی کمالات دکھا رہا ہے۔

جس طرح آپ فلم میں نیا زمان پیدا کر سکتے ہیں اسی طرح نیا مکان بھی خلق کیا جا سکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک ڈائریکٹر چند ایسے مناظر فلم بند کر لیتا ہے جو مختلف مقامات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان کے درمیان بعد مکانی حائل ہے لیکن وہ ان تمام اجزا کو ملا کر ایک نیا "فلمی مکان" بھی پیدا کر سکتا ہے۔ ایک روسی نقاش کیولیشوف نامی نے جو فلم سازی کے فن میں بصیرت رکھتا ہے ۱۹۲۰ء میں تجربے کے طور پر حسب ذیل مختلف شاٹ جمع کئے تھے۔

۱۔ ایک نوجوان بائیں جانب سے دہنی جانب جاتا دکھائی دیتا ہے۔
۲۔ دوسری جانب سے ایک عورت آتی ہے۔
۳۔ وہ دونوں ملتے اور ہاتھ ملاتے ہیں۔ نوجوان انگلی سے اشارہ کرتا ہے۔
۴۔ ایک وسیع سفید رنگ کی عمارت دکھائی جاتی ہے جس کی سیڑھیاں بہت دراز ہیں۔ وہ سیڑھیوں سے چڑھ کر مکان میں داخل ہو جاتے ہیں۔

یہ تمام مناظر الگ الگ مقامات پر لئے گئے تھے اور پھر انہیں مندرجہ صدر ترتیب سے فلم کے پردے پر دکھایا گیا تو دیکھنے والوں کو ایک مرتب واقعہ نظر آیا کہ ایک نوجوان مرد اور ایک عورت آپس میں ملتے ہیں مرد پاس کے مکان کی طرف اشارہ کر کے اندر چلنے کی دعوت دیتا ہے اور دونوں مکان میں داخل ہو جاتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ سارے اجزا الگ الگ مقامات سے تعلق رکھتے تھے۔ مثلاً وہ نوجوان ماسکو کی ایک پبلک عمارت کے قریب تھا اور عورت شہر کے دوسرے حصے میں تھی۔ مصافحہ انہوں نے ایک تھیٹر کے پاس کیا جو ان دونوں مقامات سے بہت دور واقع ہے۔ سفید رنگ کی عمارت کا شاٹ کسی امریکن فلم سے لیا گیا تھا در حقیقت یہ سفید رنگ کی عمارت امریکہ کا مشہور قصر سفید تھا اور سیڑھیاں جن سے وہ چڑھ کر مکان میں داخل ہوئے ایک گرجا کی سیڑھیاں تھیں۔ اب دیکھئے کہ سلولائڈ کے مختلف ٹکڑے ملانے سے ایک نیا "فلمی مکان" پیدا ہو گیا جو محض نمائش سراب ہے اور در حقیقت کوئی وجود نہیں رکھتا۔ یہی چیز ہے جسے "تخلیقی جغرافیہ" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

پڈوفکن سب سے پہلا فلم کار ہے جس نے فلمی مکان و زمان کا تخیل وضاحت سے پیش کیا۔ گو اب دنیا کے ہر ملک میں اکثر ڈائریکٹر اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور فائدہ کیوں نہ اٹھائیں اس سے کیمرہ کی قدرت کے امکانات بھی بہت وسیع ہو جاتے ہیں۔ پچھلے سال جو برف پڑی تھی اس سے اگلے سال کام لیا جا سکتا ہے۔ ایکٹر دیکھئے قطب مینار سے کودتا ہے اور دریائے راوی میں آ گرتا ہے۔ آپ کسی کمرے سے باہر قدم رکھئے۔ اپنے آپ کو شالامار باغ میں پائیے گا۔ خواہ آپ نے کمرے سے باہر نکلنے سے کئی سال پہلے یا کئی سال بعد شالامار باغ میں قدم رکھا ہو گا۔

اب آپ پر واضح ہو گیا کہ فلم کے حدود کس قدر وسیع ہیں۔ انسان کا دائرہ کہاں سے کہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ فلم کا نقطۂ نگاہ ایک سنہری کنجی ہے وہ جس زاویے سے چاہے دنیا پر نظر ڈالے جس نقطے سے چاہے مشاہدہ کرے۔ اور ساری جزئیات کو ایک ایک کر کے دیکھا جائے اس میں یہ بھی قدرت ہے کہ نیا زمان و زمانہ پیدا کرے۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ ڈائریکٹر کی خواہش کے سوا کسی کا پابند نہیں۔ فلم کے سامنے ساری کائنات اور سارے کا سارا تاریخی سلسلہ پڑا ہوا ہے۔ اختیار ہے کہ زماں و مکاں کے دامن میں جتنے رنگا رنگ جلوے ہیں ان میں سے جسے چاہے منتخب کرے اور جسے چاہے چھوڑ دے۔ البتہ انتخاب بہت اہم کام ہے اور ایک فلم پر کیا موقوف ہے ہر فن میں انتخاب کو اہمیت حاصل ہے۔ میں پہلے مثال کے طور پر "وومن آف پیرس" کے ایک شاٹ کا ذکر کر چکا ہوں۔ اس فلم کا ڈائریکٹر چارلی چپلن تھا۔ اور یہ پہلا فلم تھا جو چارلی کی نگرانی میں تیار ہوا۔ لیکن اس میں خود اس نے پارٹ نہیں کیا بجز ایک نہایت ہی معمولی مختصر پارٹ کے۔ جہاں تک ڈائریکٹر کے فرائض کا تعلق ہے، یہ فلم بہت کامیاب ثابت ہوا ہے۔ میں نے جو مثال پیش کی تھی وہ آپ کو یاد ہوگی۔ اور جو آپ کے ذہن سے اس شخص کا خیال محو نہیں ہوا ہوگا جس نے دراز سے رومال نکالا۔ تو ایک مردانہ کالر بھی گر پڑا۔ اس نے کالر اٹھایا اور پھر دراز میں رکھ دیا۔ عورت کے مکان میں مردانہ کالر کا پایا جانا اور مہمان کا اس پر اظہار تعجب نہ کرنا۔ غور کیجئے ایک کتنا بلیغ انداز بیان ہے حسن انتخاب کی بدولت جزئی باتوں میں کیا کیا رمزیں بھری جا سکتی ہیں اور کیا کیا معنی پنہاں کئے جا سکتے ہیں۔ "ان ٹالرنس" میں جس کا ڈائریکٹر ڈی ڈبلیو گرفتھ تھا ایک عورت دکھائی گئی جس کا خاوند کسی عدالت میں ماخوذ تھا۔ وہ بیچاری اس انتظار میں بیٹھی ہے کہ دیکھیں جج مقدمے کا کیا فیصلہ کرتا ہے۔ یہیں صرف اس کا چہرہ دکھایا گیا ہے۔ یا ہاتھ جنہیں وہ بار بار مروڑتی ہے لیکن اس کا بے پناہ اثر ہوتا ہے۔ تشویش و فکر کے جتنے مظاہرے ہو سکتے تھے ان میں سے ڈائریکٹر نے صرف وہی منتخب کئے ہیں جو سب سے زیادہ موثر ثابت ہوں

ایک اور مثال سنئے۔ پچھلی گرمیوں میں "لاسٹ پرفارمینس" نام ایک فلم لاہور میں دکھایا گیا تھا۔ پال فیجوس ڈائریکٹر تھا اور کونریڈ ویڈٹ ہیرو کا پارٹ ادا کر رہا تھا۔ کہانی کا موضوع گو کچھ ایسا شاندار نہ تھا لیکن صنعتی اور فنی حیثیت سے یہ فلم درجہ کمال کو پہنچا ہوا تھا اور ڈائریکٹر نے اپنی قابلیت کے جو کرشمے دکھائے تھے ان کے لحاظ سے بہت قابل تعریف تھا۔ اس میں سے ایک واقعہ پیش کرتا ہوں۔

ایک مداری ایک شعبدہ دکھاتا ہے وہ یہ کہ اس کا ایک اسسٹنٹ ایک صندوق میں داخل ہوتا ہے۔ صندوق کے پہلوؤں میں سوراخ ہیں جو ایک دوسرے کے قریب واقع ہیں۔ ان سوراخوں میں سے صندوق میں اس طرح تلواریں داخل کی جاتی ہیں کہ اس کا بچ جانا ناممکن معلوم ہوتا ہے تلواریں نکال لی جاتی ہیں۔ لیکن اس کا بال تک بیکا نہیں ہوتا۔ تلواریں نکال لی جاتی ہیں اور صندوق کا ڈھکنا اٹھایا جاتا ہے تو وہ صحیح و سالم نکل آتا ہے۔ ایک دن مداری کی نیت بدل جاتی ہے اور وہ ارادہ کر لیتا ہے کہ اسے کھیل ہی کھیل میں سچ مچ قتل کر ڈالے۔ اب غور کیجئے۔ کھیل دیکھنے والوں کو ارادۂ قتل سے آگاہ کر دیا جاتا ہے۔ تماشائی اس کے لئے پہلے ہی تیار بیٹھے ہیں اور بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ کہ کب صندوق کا ڈھکنا اٹھتا ہے مقصود اس بے چینی کو بڑھانا اور کانپتے ہوئے دلوں کی ترجمانی کرنا ہے۔ صندوق سے تلواریں نکال کر اس طرح سٹیج پر کھڑی کر دی جاتی ہیں کہ ان کے قبضے اوپر کی جانب ہیں۔ اور نوکیں فرش پر دھنسی ہوئی ہیں ڈائریکٹر کو اس مقام پر یہ فکر تھی، کہ کسی طرح دیکھنے والوں پر اضطراب و بے تابی اور تذبذب کی کیفیت طاری ہو جائے۔ چنانچہ اس نے ایک ایسا شاٹ لیا جس نے تماشائیوں کو عجیب حیص بیص اور گومگو میں مبتلا کر دیا۔

مداری سٹیج پر کھڑا ہے اور اس کے سامنے تلواروں کا ایک کٹہرا سا بن گیا ہے کیمرہ نشیب میں رکھ دیا گیا تاکہ مداری کا سر تلواروں کے دستوں کے عین اوپر نظر آئے تلواروں کے دستے بوجھل ہیں اس لئے ان میں ایک لرزش سی پیدا ہو رہی ہے اور پھل چمک رہے ہیں ان کے اوپر مداری کا ہولناک چہرہ دکھائی دیتا ہے اس شاٹ نے دیکھنے والوں پر وہی کیفیت طاری کر دی۔ جو آرکسٹرا کے گمبھیر سُروں کے زور سے پیدا ہو جایا کرتی ہے۔

ایک منظر جب پردے پر [illegible] میں [illegible] ہے [illegible] سامنے [illegible] ہیں۔ اس سوٹ کیس پچھلے شاٹ میں آپ کا [illegible] دکھایا گیا ہے [illegible] اب [illegible] ہے اس کے بعد تیسرا شاٹ [illegible] دکھایا گیا ہے [illegible] شاٹ [illegible] مکمل [illegible] تیسرے میں [illegible] نظر آتا ہے [illegible] شاٹ [illegible] ہے [illegible] ڈرامائی [illegible] پیدا [illegible] ہو جاتا ہے [illegible] تھا [illegible] تصویریں [illegible] نظر [illegible] ہیں [illegible] مثال ہے۔

[illegible] ایک اور مثال لیجئے۔ [illegible] کے [illegible] میں کتنی [illegible] ہوتی ہے [illegible] ہندوستان میں [illegible] ہے [illegible] جاتا ہے [illegible] تماشائیوں کو ان کی [illegible] ہوتی ہیں [illegible] تھے [illegible] اور تماشائی [illegible] ہیں۔ یہ سب [illegible] اس طرح [illegible] ہیں [illegible] دیکھنے [illegible] کے ساتھ [illegible] ہیں تو [illegible] ہے [illegible] ہو جاتی تو یہ اثر پیدا [illegible] تھا۔

[illegible] مثالوں سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ تصویروں کے انتخاب [illegible] منظر [illegible] فلم کار کے حسن انتخاب کی داد دینا پڑتی ہے۔ یہ [illegible] کی کار فرمائیاں نہیں بلکہ فلم کار [illegible] سکتا ہے لیکن یہ فیصلہ تو فلم کار ہی کا کام ہے کہ وہ کیا دیکھے اور کیا دکھائے۔

فلم کے مناظر پیش کرنے کا فن جوں جوں ترقی کرتا جاتا ہے فلم کار ایسے نئے نئے طریقے ایجاد کرتے جاتے ہیں جن کی بدولت وہ فلم کی جزئیات کو نمایاں کر کے پیش کر سکتا ہے ان نئے نئے طریقوں کے طفیل ڈائریکٹر کو یہ قدرت حاصل ہو گئی ہے کہ وہ غیر اہم واقعات پر کم [illegible] اہم واقعات کو زیادہ نمایاں اور واضح کر کے پیش کرتا ہے ان میں رنگ بھرتا ہے اور جو واقعات زیادہ توجہ کے محتاج ہیں انہیں ہمارے ذہن پر نقش کر دیتا ہے۔

تصویر کو واضح اور نمایاں طور پر پیش کرنے کا ایک طریقہ "کلوز اپ" یا قریبی شاٹ ہے۔ کیمرہ پیچھے ہٹتا ہے تو قریبی شاٹ سے وسطی شاٹ تک پہنچتا ہے اور وسطی شاٹ سے ہٹتا ہے تو بعید کا منظر [illegible] ہے گویا جوں جوں جزوی حرکات کی اہمیت کم ہوتی جاتی ہے وہ پیچھے ہٹتا جاتا ہے جب تصویر مدھم ہوتے ہوتے غائب ہو جاتی ہے تو تماشائی کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ ماحول سے رفتہ رفتہ جدا ہو رہا ہے۔ اور جب وہ آہستہ آہستہ ابھرتی ہے تو جذبات اس کے برعکس ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض اوقات کیمرہ گھومتا ہے اور پورے منظر کو قلم بند کر لیتا ہے بعض اوقات سارا وسیع منظر سامنے ہوتا ہے۔ تمام جزئیات دکھائی دیتی ہیں۔ اور پھر کسی ایک جگہ پر تماشائی کی توجہ مرکوز بھی کر دی جاتی ہے یعنی کوئی چیز جسے نمایاں کرنا مقصود ہو ایک چھوٹے سے حلقے میں اس طرح دکھائی جاتی ہے کہ وہ ہماری توجہ جذب کر لیتی ہے پھر کبھی ایک شاٹ دوسرے شاٹ میں تبدیل ہو جاتا ہے ان مختلف طریقوں کو فلم سازی میں جو اہمیت حاصل ہے وہ چنداں محتاج بیان نہیں۔

اب تدوین یعنی "ایڈیٹنگ" کو لیجئے جسے فلم سازی کا آخری مرحلہ کہنا چاہیے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب سارے مناظر کو فلم بند کر لیا جاتا ہے، تو سلولائڈ کو کاٹ کر شاٹ الگ الگ کر دیے جاتے ہیں پھر ہر شاٹ میں کسی قدر قطع و برید ہوتی ہے اور آخر کار سب شاٹ مناسب ترتیب و تسلسل سے جوڑ دیے جاتے ہیں۔ انگلستان اور امریکہ میں آج کل ایڈیٹر کو چنداں اہمیت نہیں دی جاتی۔ فلم کے بڑے بڑے [illegible] کا [illegible] ہو جاتا ہے تو کہیں ایڈیٹر کی باری

جس تیسرے درجے کے کام کو فلم سازی کے دوسرے عنصروں کے مقابلے میں کم سمجھا جاتا ہے آج بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایڈیٹر کو زیادہ دماغی محنت صرف نہیں کرنا پڑتی۔ وہ مشین کی طرح ایک بڑے ڈھیر سے اور منتخب ہوئے فاصلہ پر چلتا ہے یعنی مختلف شاٹ جمع ہو جاتے ہیں ان کو صحیح جگہ جوڑ دیا جاتا ہے لیکن روسی ماہرین ڈائریکٹر تدوین کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ اسے تدوین کی بجائے تعمیر کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک تدوین ہی حقیقت کی اصل اور تخلیقی قوت کا سرچشمہ ہے۔ مزید یہ ہے کہ بعض مضمون کے اہم مسئلے کے لیے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ تدوین کا وہ حصہ بیان کیا جائے اور اس کے لیے یہ پیچیدہ مسئلہ واضح ہو جائے۔ بعض باتوں کے لیے مجھے الگ عنوان قائم کرنے پڑیں گے۔ ایک بہت پہلے فلسفی نے کہا تھا کہ تمام فنون لطیفہ میں دو چیزیں ضروری ہیں اول مواد اور اس کی ترتیب کا اسلوب۔ یہ ضروری ہے کہ مواد کو اس فن سے خاص مناسبت ہو مثلاً مصور کا مواد مختلف رنگ ہیں جنہیں وہ کینوس کی سطح پر ترتیب دیتا ہے۔ مغنی کے نزدیک آوازیں مواد ہیں جنہیں وہ لے کے مطابق مرتب کرتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ فلم ساز کے پاس کس قسم کا مواد موجود ہے اور اس کی ترتیب کا طریقہ کیا ہے۔ پڈوفکن کے نزدیک فلم کا مواد اس کے اجزا یعنی مختلف شاٹ ہیں اور ان کی ترتیب کا طریقہ یہ ہے کہ انہیں ایک خاص تسلسل سے جس سے ذہن کی تخلیقی قوت معلوم کی جا سکتی ہے جوڑ دیا جائے۔ وہ یہاں تک کہتا ہے کہ عام لوگوں کے نزدیک فلم سازی کا فن ایکٹروں کی حرکات و سکنات سے شروع ہوتا ہے اور شاٹ پر ختم ہو جاتا ہے لیکن یہ سارا عمل ابتدائی درجے کے مدارج ہیں۔ فلم ساز کا اصل کام تو اس وقت شروع ہوتا ہے جب ڈائریکٹر فلم کے مختلف ٹکڑوں کو آپس میں جوڑنے لگتا ہے کیونکہ انہیں جیسے جوڑا جائے ویسے ویسے معنی پیدا ہوتے ہیں۔

فلم ایڈیٹر کے ذمہ دو باتیں ہوتی ہیں ایک تو اس امر کا فیصلہ کہ شاٹ کتنا لمبا ہے دوسرے یہ بات کہ شاٹ کس ترتیب سے جوڑے جائیں ان دونوں باتوں میں سے ترتیب کو زیادہ اہمیت حاصل ہے کیونکہ فلم کے معنی کا انحصار اجزا کے سیاق و سباق اور ان کے باہمی ربط پر ہے جس طرح ایک جملے کے معنی کا انحصار الفاظ کی ترتیب پر ہے اسی طرح فلم کے معنی بھی اجزا کی ترتیب کے مطابق ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر دو جملے لیجیے: "کتے نے آدمی کو مار ڈالا"، "آدمی نے کتے کو مار ڈالا"۔ دیکھیے لفظوں کی ترتیب میں تھوڑے سے الٹ پھیر نے سارے جملے کے معنی بدل ڈالے۔ یہ مثال فلم پر پوری طرح منطبق ہوتی ہے۔ ایک متبسم چہرے کا شاٹ لیجیے۔ دوسرا شاٹ ایک پستول کا ہو جو چلنے کے لیے تیار ہو اور تیسرا شاٹ اسی چہرے کا لیکن اب تبسم کی بجائے تیور پر بل پڑے ہوئے ہوں۔ اگر یہ تینوں شاٹ اسی ترتیب سے دکھائے جائیں تو آپ ان کو دیکھ کر یہ سمجھیں گے کہ یہ شخص پستول کو دیکھ کر خوش نہیں ہوا۔ اب ساری ترتیب الٹ دیجیے۔ یعنی آخری شاٹ پہلے آ جائے اس کے بعد پستول نظر آئے پھر متبسم چہرہ دکھائی دے تو اس کے معنی بالکل بدل جائیں گے۔ اسی مثال سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ جو شخص فلم کے اجزا کو ترتیب دیتا ہے (اسے ڈائریکٹر کہیے یا ایڈیٹر کے نام سے پکاریے) بہرحال وہی فلم کا ناظم ہے۔ فلم کی کامیابی میں ایکٹر کی ہنرمندی کو کوئی دخل نہیں۔

بعض روسی ڈائریکٹر تو تدوین کی قدرت کے اس حد تک قائل ہیں کہ ان میں سے ایک نے تدوین کی رنگا رنگیوں کو واضح کرنے کے لیے ایک دلچسپ تجربہ کیا ہے۔ اس نے کسی فلم سے مشہور روسی ایکٹر موس یوخین کے کئی "کلوز اپ" یعنی قریبی شاٹ لیے۔ اس نے کلوز اپ بھی ایسے منتخب کیے جن میں ایکٹر کے چہرے پر کسی جذبے کے اثرات نظر نہیں آتے ہیں۔ پھر اس نے اپنی فلم کے دوسرے ٹکڑوں کے ساتھ تین مختلف طریقوں پر شاٹ جوڑ دیا۔ پہلی بار ایک کلوز اپ کے ساتھ ایک شاٹ جوڑا۔ جس میں میز پر شوربے کی ایک پلیٹ پڑی دکھائی گئی تھی۔ ان دونوں کے ملنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ موس یوخین شوربے کی جانب دیکھ رہا ہے۔ دوسری مرتبہ اس نے اسی کلوز اپ کے ساتھ ایک اور شاٹ جوڑا جس میں ایک مردہ عورت کا تابوت دکھایا گیا تھا۔ تیسری مرتبہ اس نے ایک لڑکی کا شاٹ لیا جو کھلونوں سے کھیل رہی ہے۔ اور اسے موس یوخین کے کلوز اپ سے جوڑ دیا۔ اس ڈائریکٹر نے

کی فلم سوسائٹی نے سلسلے میں کے لئے کی تھی جب داستان ان الفاظ میں بیان کی تھی۔

جب یہ تینوں تصویریں ہم نے لوگوں کو دکھائیں جو اس راز سے واقف نہ تھے تو ان پر حیرت انگیز اثر ہوا۔ لوگ ایکٹر کے کمال فن کی تعریفیں کرتے نہ تھکتے تھے۔ انہیں پہلی تصویر میں ایکٹر کے چہرے پر فکر اور سوچ کے آثار نظر آئے۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ سوپ کی پلیٹ کو بھول چکا ہے اور اس کی طرف اب کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے۔ دوسری تصویر پر انہیں ایکٹر کے چہرے پر رنج و ملال کی کیفیات نظر آئیں گویا مردہ عورت کا تابوت دیکھ کر اسے بہت قلق ہوا ہے۔ تیسری تصویر میں ہنسی ایکٹر کے ہونٹوں پر تھی۔ تبسم دکھائی دیا۔ گویا وہ بچی کو کھیلتے دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔ لیکن ہم جانتے تھے کہ تینوں تصویروں میں ایک ہی چہرہ ہے جس سے اصلا کوئی جذبہ ظاہر نہیں ہوتا۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ فلم سازی میں جتنے لوگ حصہ لیتے ہیں ان میں سے ورنہ کسی کو کوئی اہمیت حاصل ہے۔ جو ایکٹر نے [illegible] لوگوں کی تعداد زیادہ ہے جو ایکٹر کو اتنی حقیقت نہیں سمجھتے تاہم اتنا تو ماننا پڑے گا کہ تاثر کے [illegible] انحصار اس کے سیاق و سباق پر ہے اور یہ ظاہر ہے کہ فلم کے اجزا کی ترتیب میں ایکٹر کو مطلق کوئی دخل نہیں۔

لیکن فلم کے مختلف اجزا کو مرتب کر دینا ہی کافی نہیں۔ ایڈیٹر میں یہ سمجھ بوجھ بھی ہونی چاہئے کہ اجزا کی لمبائی کتنی ہو کیونکہ جس طرح موسیقی میں نہ صرف سروں کا اتار چڑھاؤ بلکہ ان کی کمی بیشی بھی ایک اثر پیدا کرتی ہے اسی طرح فلم میں بھی شاٹوں کی کمی بیشی سے خاص خاص تناسب اور آہنگ پیدا ہوتے ہیں اور ان سے دیکھنے والوں پر مختلف قسم کے اثرات طاری ہوتے ہیں۔ یہ آہنگ و تناسب کا سوال ذرا ٹیڑھا سا ہے اور اس قابل ہے کہ فلم سے شغف رکھنے والے لوگ جن کا مطالعہ مجھ سے زیادہ وسیع ہے اس جانب توجہ کریں۔ میں صرف چند ضروری باتیں بیان کرنے پر اکتفا کروں گا۔

میں اس جگہ صرف دو مثالیں پیش کروں گا۔ یہ مثالیں یہ ذہن نشین کرانے کے لئے پیش کی ہیں کہ مختلف مقاصد کے لئے آہنگ میں کیا تبدیلی ہوتی ہے یعنی شاٹ پہلے دھیمے جس رفتار سے آتے ہیں وہ رفتار کس طرح بدلتی رہنی چاہئے۔ اس سے شاید یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مناظر کو فلم بند کرنے میں موقع و محل کے اعتبار سے کیا کیا خاص طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔

عنوان

- مزدوروں کی بغاوت فرو کر دی گئی:

۱۔ تصویر آہستہ آہستہ نمایاں ہوتی ہے۔ دوربین پر فانی کا ترس اور جھنڈے بڑی نظر آتی ہیں۔

۲۔ کیمرہ گھما کر پورے منظر کا شاٹ لیا جاتا ہے اور لینز کے سامنے سے ایک لمبا پشتہ گزرتا ہے۔ جس پر مزدوروں کی لاشیں پڑی ہیں۔

۳۔ ان میں ایک عورت بھی ہے جس کا سر پیچھے کی طرف جھکا ہوا ہے ایک ٹوٹے ہوئے کھمبے کے ساتھ ایک پھٹا ہوا جھنڈا لٹکا ہوا ہے یہ شاٹ اگلے شاٹ میں تحلیل ہو جاتا ہے۔

۴۔ قریب سے شاٹ لیا جاتا ہے۔ عورت جس کا سر پیچھے کی طرف جھکا ہوا ہے۔ لینز کی طرف گھور گھور کر دیکھتی ہے۔ یہ شاٹ اگلے شاٹ میں تحلیل ہو جاتا ہے۔

۵۔ پھٹا ہوا جھنڈا ہوا میں لہراتا ہوتا ہے۔

یہ تو ایک ابتدائی واقعہ کی مثال ہے جس میں سکون بلکہ سکوت اور غم پایا جاتا ہے ایک شاٹ دوسرے شاٹ میں اس لئے تحلیل ہو جاتا ہے تاکہ ناظر کے سامنے آہستہ آہستہ آئے۔ اور اس سکوت و سکون کی پوری کیفیت معلوم ہو جائے۔ کیمرہ گھما کر پورے منظر کا شاٹ لیا جاتا ہے اور تصویر کے آہستہ

آہستہ آہستہ نمودار ہونے اور غائب ہو جانے سے بھی یہی واضح کرنا مقصود ہے کہ فلم کا یہ مختصر سا حصہ بذات خود ایک واقعہ کی سی اہمیت رکھتا ہے۔ اب ایک پُرشور اور ہنگامہ خیز واقعہ کی مثال پیش کی جاتی ہے۔

۱۔ ایک گوشے سے مزدوروں کا ہجوم نمودار ہوتا نظر آتا ہے وہ لینز کی جانب بڑھتے دکھائی دیتے ہیں سب کے سب یکے بعد دیگرے لینز کے سامنے سے گزر جاتے ہیں۔

۲۔ ایک مزدور ایک آہنی سلاخ پرے کرتا ہے اور بھاگتا ہوا چلا جاتا ہے پھر یک بیک ٹھہر جاتا ہے اور پکار اٹھتا ہے۔

عنوان :-

"سب سے پہلی دکان کو بچاؤ"

۳۔ ایک مزدور کرین پر چڑھ جاتا ہے۔

۴۔ دھواں ہوا میں بلند ہوتا ہے بھاپ کی سیٹی بجتی ہے۔

۵۔ مزدور جو کرین پر چڑھا ہے وہ جھک کے نیچے دیکھتا ہے۔

۶۔ مزدور بھاگتے دکھائی دیتے ہیں (یہ شاٹ اوپر سے لیا گیا ہے۔)

۷۔ مزدور جو کرین پر ہے پوری قوت سے چلاتا ہے

"پہلی دکان کو بچاؤ"

۸۔ اوپر سے شاٹ لیا گیا ہے بھاگتے ہوئے مزدور ٹھہر جاتے ہیں تھوڑی دیر توقف کرتے ہیں اور پھر بھاگ نکلتے ہیں۔

۹۔ ایک عورت ان سے ٹکرا کر گر پڑتی ہے۔

۱۰۔ فوراً پھر دکھایا جاتا ہے عورت گر کر پھر اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیتی ہے۔

۱۱۔ مزدور بھاگتے دکھائی دیتے ہیں۔

اگر ان میں سے کوئی شاٹ پردے پر اپنے اصل وقت سے آدھ سیکنڈ زیادہ دکھایا جائے تو سارا تناسب خاک میں مل جائے گا اور جو اثر پیدا کرنا مقصود ہے پیدا نہیں ہوگا۔

اب اس سے بھی زیادہ آسان مثال لیجئے۔ یہ مثال بھی پڈوکن نے ہی پیش کی ہے اور کسی بازار کے حادثے کے متعلق ہے حادثہ اس طرح دکھایا گیا ہے۔

۱۔ ایک بازار دکھائی دیتا ہے جس میں گاڑیاں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ ایک راہگیر بازار کو عبور کرتا ہے اس کی پشت کیمرے کی جانب ہے پاس سے ایک موٹر کار گزرتی ہے جو اس کے اور کیمرے کے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔

۲۔ موٹر ڈرائیور کے چہرے کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے وہ بریک پر قدم رکھتا ہے اور گھبرایا ہوا نظر آتا ہے۔

۳۔ جو بدنصیب حادثے کا شکار ہوتا ہے اس کے چہرے کی ایک جھلک نظر آتی ہے اس نے چیخ مارنے کے لئے منہ کھول دیا ہے۔

۴۔ یہ شاٹ موٹر ڈرائیور کی نشست سے لیا گیا ہے۔

گھسٹتے ہوئے پہیئے کے قریب ٹانگیں نظر آتی ہیں۔

وہ مونڈے پیچھے ہٹتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

د۔ لڑائی ختم ہو گئی ہے اور اس کے پاس لاش پڑی ہے۔

اس واقعہ میں اگر ہونے والے حادثہ دو سیکنڈ کے بجائے ایک منٹ تک لمبا دکھایا جاتا تو سارا اثر زائل ہو جاتا۔

یہ تاثیری تدوین کی مثالیں ہیں۔ یہ مضمون ختم کرنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ تدوین کے اس اہم شعبہ پر بھی اچٹتی ہوئی نظر ڈالی جائے۔ جسے اصطلاح میں "تخیلی تدوین" کہتے ہیں۔ اس میں ایڈیٹر کے ہاتھوں سے عجیب عجیب کرشمے نظر آتے ہیں۔

میں گذشتہ اوراق میں "دی لاسٹ پرفارمنس" نامی ایک فلم کا ذکر کر چکا ہوں۔ اس فلم میں ایک واقعہ یہ ہے کہ چند اشخاص تھیٹر میں بیٹھے تماشا دیکھ رہے ہیں اور ایک پیشہ ور ماہر مسمریزم ان پر عمل کر رہا ہے اب اس عمل کا اثر فلم کے ذریعے دکھانا مقصود ہے اور فلم کے لیے حقیقتاً یہ موضوع بہت مشکل ہے۔ صحیح اثر پیدا کرنے کے لیے پہلے عامل کے چہرے کا قریبی شاٹ لیا۔ اس کی آنکھیں چند اشخاص کے چہرے پر گڑی ہوئی ہیں۔ اور وہ انھیں گھور گھور کر دیکھ رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور تصویر اس طرح دکھائی گئی کہ دونوں تصویریں ایک دوسرے کے بیچ میں جھلملاتی نظر آتی تھیں اس دوسری تصویر میں بڑے بڑے اونچے ستارات جیسے نقشے میں صورتیں دکھلائے گئے ہیں۔ یہ شاٹ دوسرے شاٹ میں تحلیل ہو جاتا ہے اور جس میں وہ تماشائی نظر آتے ہیں جن کا ذکر ہوا ہے جب عامل کا چہرہ آہستہ آہستہ غائب ہو جاتا ہے کیمرہ پیچھے ہٹتا ہے اور دھندلکے سے تماشائیوں کے چہرے ابھرتے نظر آتے ہیں اور پھر کیمرہ قریب آ جاتا ہے یہ تمام شاٹ خاص آہنگ و تناسب سے یکے بعد دیگرے دکھلائے جاتے ہیں اور ایک دوسرے میں تحلیل ہو جاتے ہیں اس طرح پردے پر رنگ برنگ شکلیں نظر آتی ہیں۔ کوئی دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہے کوئی پیچھے ہٹتی ہے کوئی آگے بڑھتی ہے اور کوئی جھوم رہی ہے چنانچہ اس کا نتیجہ حیرت انگیز ہوا ——— ایڈیٹر تماشائیوں پر اس قسم کے جو اثرات طاری کر دیتا ہے اس کا تجزیہ آسان نہیں چنانچہ اس کے کمال فن کی مثالیں مہیا کرنا مشکل ہے۔ پڈوفکن نے اپنی فلم "دی اینڈ آف سینٹ پیٹرز برگ" سے ایک مثال پیش کی ہے جسے اسی کے الفاظ میں بیان کرتے ہیں وہ لکھتا ہے کہ جنگ کے مناظر دکھاتے ہوئے میں ایک ہولناک دھماکہ دکھانا چاہتا تھا اور کہ یہ دھماکہ اپنی پوری قوت کے ساتھ فلم کے پردے پر نمودار ہو جائے۔ میں نے بہت سا ڈائنامیٹ زمین میں دفن کر دیا پھر اسے اڑایا اور اس کا شاٹ لیا۔ اس سے بڑا دھماکہ تو پیدا ہو گیا لیکن یہ فلم کے کسی کام کا نہ تھا پردے پر محض ایک بے جان سی حرکت دکھائی دی بہتیرے تجربات کے بعد آخرکار میں فلم کے پردے پر دھماکہ ہوا اور اس کے تمام اثرات دکھلانے میں کامیاب ہو گیا اور وہ بھی یوں کہ ڈائنامیٹ کے دھماکے کا جو شاٹ لیا اس کا کوئی ٹکڑا استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی میں نے ایک مشعل سے دھوئیں کے بادل پیدا کئے اور شور و تصادم کا اثر پیدا کرنے کے لیے "میگنیزیم فلیش" سے کام لیا اس شاٹ کے درمیان میں نے ایک دریا کا شاٹ بھی داخل کر دیا جو میں نے اس سے پہلے کسی زمانہ میں لیا تھا اس طرح پردے پر وہ مرئی شکل سامنے آئی جیسے میں پیدا کرنا چاہتا تھا دھماکہ تو پیدا ہو گیا لیکن اس غرض کے لئے کوئی ایسی چیز استعمال نہ کی گئی تھی جو بہ حیثیت دھماکہ پیدا کرنے کیلئے استعمال کی جاتی ہو۔

میں اس مثال کی روشنی میں آپ پر یہ امر بخوبی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ عامل تدوین ہی فلم کو جنم دیتی ہے وقت محض خام مواد مہیا کرتی ہے جس سے ایڈیٹر اپنی دنیا آپ پیدا کر لیتا ہے حقیقت اور فلم میں یہی تعلق ہے ——— فلم کے مضمون کو انہی الفاظ پر ختم کر دینا چاہیے۔ میرا یہ مضمون سینما کے مبادیات سے تعلق رکھتا ہے ہندوستان میں جو لوگ سینما کا مطالعہ کرتے ہیں انہیں کئی دشواریاں پیش آتی ہیں خوش قسمتی سے لاہور میں دنیا کے بعض بہترین فلم دکھائے گئے ہیں۔ جن کی وجہ سے لاہور کی خوش قسمتی انگلستان کے بڑے بڑے شہروں کیلئے بھی قابل رشک ہو سکتی ہے لیکن افسوس کہ سینما کے ندرت پسند اور قدامت پسند سب کے نزدیک ابھی تک اکثر ایسے فلم موجود ہیں جنہیں انسانی ذہن و عقل کا عظیم ترین کارنامہ کہنا چاہیے اور ہمیں ان کے دیکھنے سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

امید ہے جب آپ اس نوع کی تجربوں کو میری دوسری فلموں کے ساتھ ملا کر دیکھیں گے تو آپ کو یہ مضمون غنیمت معلوم ہوگا۔ (نیرنگ خیال)

انگلستان کا جدید تھیٹر

پطرس

چونکہ مجھے تھیٹر اور اس کے فن سے خاص دلچسپی ہے اس لیے سفر یورپ کے دوران میں، میں نے اپنی فرصت کا بیشتر حصہ اسی کے مطالعہ میں صرف کیا۔ اس سے میرا مقصود صرف اپنی پیاس بجھانا تھا۔ یہ ارادہ ہرگز نہ تھا کہ ہندوستان واپس آکر اس کے متعلق کوئی تبلیغ کروں گا۔ یا کسی رسالے یا اخبار میں کوئی سلسلۂ مضامین شروع کروں گا۔ میرے احباب میں سے سید امتیاز علی تاج کا تجربہ ہندوستانی ناٹک کے متعلق بہت وسیع ہے اور یورپ کے تھیٹروں کے متعلق بھی ان کی معلومات کا ذخیرہ حیرت انگیز ہے وہ اور میں اپنے پرانے کالج یعنی گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر گردت سوندھی کے زیر قیادت ایک کلب بنا کر برسوں سے ناٹک کے شوق کو پورا کر رہے ہیں۔ چنانچہ اس موضوع پر گاہے گاہے امتیاز صاحب کو خط لکھتا رہا۔ اور واپسی پر بھی انہیں سے اس کے متعلق تبادلۂ خیالات کرتا رہا۔ باقی رہے پروفیسر سوندھی، سو میرا انہیں کچھ بتانا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ اندریں حالات میں ہرگز اس بات کے لیے تیار نہ تھا کہ یورپ کے تھیٹروں کے متعلق کوئی مضمون لکھتا اور حق تو یہ ہے کہ اگر امتیاز صاحب کی یہ مداخلت نہ ہوتی کہ میرے بعض بعض مشاہدات قارئین نیرنگ خیال کے لیے دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں تو یہ مضمون کبھی ظہور میں نہ آتا۔

ایک تو ہندوستان کا تھیٹر یورپ کے مقابلے میں اس قدر حقیر ہے کہ یورپ کے تھیٹر کا ہندوستانی نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنا بے معنی بات ہے اور ایک ہندوستانی رسالے میں اس کا کماحقہٗ بیان کرنا بے حد مشکل ہے دوسرے موضوع اس قدر وسیع ہے کہ میں کسی طرح بھی اس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اگر آپ اس تحریر سے کسی طرح بھی مستفید یا لطف اندوز نہ ہوں تو کم از کم میرے اس تامل کے شاہد تو ضرور رہیں جس کا اظہار میں شروع ہی میں کر رہا ہوں۔

اس وقت میں صرف ایک تھیٹر کا ذکر کروں گا۔ جس کا نام فیسٹی ول تھیٹر (FESTIVAL THEATRE) ہے اور جو کیمبرج (انگلستان) ہی میں ہے۔ خوش قسمتی سے اس تھیٹر کا افتتاح عین اس وقت ہوا جب میں کیمبرج پہنچا۔ لیکن اس کے لیے اسکیمیں مدت سے تیار ہو رہی تھیں۔ اور اس کے شروع ہونے سے پہلے جو جو بیانات وقتاً فوقتاً اس کے متعلق اخباروں میں شائع ہوتے رہے ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ کم از کم انگلستان میں اس تھیٹر کی نظیر نہ ہوگی۔ مجھے یاد ہے کہ جب پہلی دفعہ میں نے لندن سے کیمبرج کا سفر کیا تو سفر کے دوران میں ٹائمز کے کالموں میں اس تھیٹر کے آئندہ پروگرام کا حال بہت انہماک سے پڑھ رہا تھا۔ یونیورسٹی کے کھلتے ہی پہلا کھیل دکھایا گیا۔ اور اس دن سے لے کر آج تک میں نے سب کھیل دیکھے ہیں اور آج کل جہاں یورپ کی اور باتیں یاد آ رہی ہیں وہاں فیسٹی ول تھیٹر کا فراق کچھ کم افسوسناک نہیں۔

شروع ہی میں اس تھیٹر کے اغراض و مقاصد ان الفاظ میں بیان کیے گئے تھے ۔—

> "فیسٹیول تھیٹر کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ ہر ملک اور ہر زمانے کے مختلف ڈرامے اسٹیج پر پیش کرے۔ اور اس بات کا مطلق خیال نہ رکھے کہ انگلستان کی پبلک کی عادت بگڑی ہوئی ہے اور لوگ جو محض آرام ہی کے لئے تھیٹر میں آتے ہیں اور ڈراموں کا بحیثیت تماشبین کے مطالعہ کرتے ہیں اور ڈرامے کے فن کے نقطۂ نظر سے ان پر غور نہیں کرتے۔ اس کے لئے [illegible] ڈراموں کا انتخاب کیا ہے۔ دنیا کے سب سے دلچسپ ڈرامے یہاں دکھلائے جائیں گے۔ موجودہ زمانے میں جو تھیٹر محض تجارتی اغراض سے چلائے جاتے ہیں ان میں [illegible] ڈراموں کو تلاش کرنا بے سود ہے کیونکہ ان تھیٹروں کا انتظام ایسی کمپنیوں کے ہاتھ میں ہے جن کے نزدیک ڈرامے کا فن کچھ معنی نہیں رکھتا۔ لہٰذا وہ لوگ جو اس فن کے دلدادہ ہیں اور اس کی ارتقاء اس فن کے سلسلے میں نئے تجربے لوگوں کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں وہ ایسا کرنے سے قاصر ہیں کیونکہ عام تھیٹروں میں عمارت کی ساخت اور اسٹیج کا سامان کئی صدی سے چلا آتا ہے اور جدید ترین طرز کا استعمال نہیں ہو سکتا۔"

اس میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک تو یہ کہ عام تجارتی تھیٹر اصل فن سے محض بے خبر ہے اور صرف عامۃ الناس کی اسفل خواہشات کو پورا کرنا ہی اپنا مقصد سمجھتا ہے کیونکہ روپیہ کمانے کا یہی ایک ڈھنگ ہے۔ دوسری بات یہ کہ تھیٹروں کا طرز تعمیر اور اسٹیج کی مشینری وغیرہ خود انگلستان جیسے ترقی یافتہ ملک میں بھی فرسودہ اور بے کار ہے۔ یہ دونوں باتیں بہت حد تک تفصیل طلب ہیں لیکن مضمون کو اس قدر طول دینا کہ ہر تفصیل سلجھ جائے میری طاقت اور نیرنگ خیال کی ضخامت سے افزوں ہے۔

انگلستان کے عام تھیٹروں میں سے ہر ایک میں ایک ہی کھیل ہر رات، مہینوں بلکہ بعض اوقات برسوں ہوتا رہتا ہے۔ دیکھنے والوں کی تعداد بے شمار ہوتی ہے اس لئے ایسا کرنا ممکن ہوتا ہے۔ کھیل بہت ہی مقبول ہو تو سال ڈیڑھ سال دو سال تک آمدنی کا ذریعہ بنا رہتا ہے اور کوئی برا کھیل فیل ہونے پر آئے تو دوسرے ہی دن فیل ہو جاتا ہے۔ جب ایک کھیل ختم ہو جائے تو پھر دوسرا کھیل تیار کیا جاتا ہے اور وہ بھی اسی طرح اپنی مقبولیت کی حد تک دکھایا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے فیسٹیول تھیٹر میں ہر ایک کھیل صرف ہفتہ بھر تک ہوتا رہتا ہے۔ جب یونیورسٹی میں چھٹیاں ہوں تو تھیٹر بھی بند ہو جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ تھیٹر یونیورسٹی ہی کے سر پر قائم ہے۔ کیونکہ یہاں کھیلوں کا جو معیار ہے اس کے مطابق دیکھنے والے بھی ایسے ہی تربیت یافتہ آدمی ہونے چاہئیں۔ جو یونیورسٹیوں میں پائے جاتے ہیں اسی لئے اس تھیٹر کا قیام لندن یا کسی بڑے شہر کی بجائے کیمبرج ہی میں مناسب سمجھا گیا۔

کھیلوں کے انتخاب میں بہت ہی وسعت نظر سے کام لیا جاتا ہے۔ ایک طرف تو جدید سے جدید کھیل جو عام تھیٹروں کے مالک اس ڈر کے مارے قبول نہیں کرتے کہ کہیں ان کی جدت عامۃ الناس کے ناپسند نہ ہو اور کاروبار میں نقصان نہ اٹھانا پڑے، پیش کئے جاتے ہیں (بشرطیکہ ان میں فن کے اعتبار سے کوئی خاص خوبی ہو) اور دوسری طرف قدیم سے قدیم یونانی کھیلوں کے دکھلانے میں ماہرین تھیٹر کمال فن کا ثبوت دیتے ہیں اور ان دونوں کے مابین ڈرامے کے ہر مشہور دور کا ایک نہ ایک نمونہ ضرور پیش کیا جاتا ہے اور اس میں ملک و قوم کی کوئی قید نہیں۔ چنانچہ یہاں میں نے جرمن اور فرانسیسی اور امریکن اور ہسپانوی، آسٹرین اور نارویجن سبھی مصنفوں کے کھیل دیکھے ہیں البتہ ہوتے سب انگریزی زبان میں ہیں۔ اور پھر اس کے علاوہ ٹریجڈی، کامیڈی، فارس وغیرہ سب اصناف ڈراما شامل کئے جاتے ہیں۔

سامان کی سیٹنگ کا حال خاص طور پر بیان کرنا ضروری ہے کیونکہ یہ چیز ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ افسوس کہ ہمیں یہاں کوئی ایسی تصویر نہیں ملی جس سے خالی سٹیج کا منظر پیش کر سکوں۔ یہ کام تصویر نمبر ۔۔ سے نکالنا پڑے گا (اس تصویر میں سٹیج پر جو سین لگا ہوا ہے وہ ایک قدیم یونانی کھیل کا ایک سین ہے۔ سٹیج کا بہت سا حصہ سینری کی وجہ سے ڈھک گیا ہے۔ تاہم جو حصہ نظر آتا ہے وہ بعض حالات بیان کرنے کو کافی ہے)

پہلی بات قابل غور یہ ہے کہ سٹیج اور حاضرین کے درمیان بڑی بڑی سیڑھیاں ہیں جو تصویر میں سب سے نیچے نظر آ رہی ہیں (دیکھئے کہ اوپر جو سیڑھیاں دکھائی دے رہی ہیں وہ سین کا حصہ ہیں۔ لیکن جن سیڑھیوں کا میں اس وقت ذکر کر رہا ہوں وہ تھیٹر سٹیج کا مستقل حصہ ہیں) گویا اگر آپ تماشائیوں کی پہلی قطار میں بیٹھے ہوں۔ تو سٹیج آپ کے پاس سے بتدریج اٹھنی شروع ہوتی ہے حتیٰ کہ آپ سٹیج کی سب سے بڑی سطح پر پہنچ جائیں اس سطح کا کچھ حصہ سٹیج کی سیڑھیوں اور سین کی سیڑھیوں کے درمیان دکھائی دے رہا ہے۔ اس حصے پر آپ غور سے دیکھیں تو حصے کی شکل میں ایک خط سا کھنچا ہوا ہے۔ یہ ایک دائرہ ہے جس کا کچھ حصہ بھی سیڑھیوں کے نیچے آ کر چھپ گیا ہے اس دائرے کے اندر جس قدر حصہ سٹیج کا ہے وہ باقی سٹیج سے علیحدہ ہے اور بوقت ضرورت اس حصے کو گھمایا جا سکتا ہے۔

سٹیج ساری کی ساری ایک ہی ہموار سطح نہیں بلکہ اس کا کبھی نصف حصہ اور کبھی ایک حصہ اوپر کو اٹھا ہوا ہے۔

اس تصویر میں سب سے پیچھے جو ایک سفید سا پردہ نظر آتا ہے وہ دراصل ایک سفید دیوار ہے جو سیدھی نہیں بلکہ گول ہے جیسے جلتی ہوئی شمع کو ہوا کے جھونکے سے بچانے کے لئے ہاتھ کو خم کر کے شمع کے پیچھے رکھ لیا جاتا ہے۔ یہ دیوار کھوکھلی اینٹوں کی بنی ہوئی ہے تاکہ ایکٹروں کی آواز اس سے بخوبی منعکس ہو سکے اور اس پر بہت ہی پختہ سفید رنگ کا پلستر ہے جس پر کسی چیز کی رگڑ سے خراش وغیرہ آنا بہت محال ہے۔ اس دیوار کو اصطلاح میں سائیکلوراما (Cyclorama) کہتے ہیں اور یورپ کے جدید تھیٹروں میں اس کا ہونا بے حد ضروری ہے۔

تھیٹر کا وہ حصہ جہاں تماشائی بیٹھتے ہیں۔ تصویر نمبر ۔۔ میں دکھایا گیا ہے (یہ گویا وہ منظر ہے جو ایکٹر کو سٹیج پر سے دکھائی دیتا ہے) اس سے آپ اس بات کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں کہ تھیٹر کی لمبائی بہت کم ہے۔ ایکٹروں کو خواہ مخواہ چلانا نہیں پڑتا۔ ورنہ تقریر کی وہ تمام خوبیاں جو آواز کے اتار چڑھاؤ پر منحصر ہیں ضائع ہو جائیں۔ تھیٹر کے اس حصے کی شکل گھوڑے کے نعل کی مانند ہے۔ [illegible] اوپر کی منزلوں میں ہیں اور فرش کی نشستیں بتدریج اوپر کو اٹھتی جاتی ہیں۔ گویا فرش نہیں فرش کی بجائے بہت سی سیڑھیاں ہیں اور ہر سیڑھی پر کرسیوں کی ایک قطار رکھی ہے صرف دو راستے آمد و رفت کے لئے خالی چھوڑ دئے ہیں۔

یہ تو عمارت کا حال تھا لیکن اس تھیٹر کا سب سے ضروری جزو جس کی وجہ سے اس کو انگلستان کے باقی تمام تھیٹروں پر تفوق حاصل ہے اور جو اس کے لئے خاص طور پر باعث ناز ہے وہ یہاں کی روشنی کا انتظام ہے۔ فٹ لائیٹس یعنی وہ لیمپ جو سٹیج کے کنارے پر ایکٹروں کے قدموں میں لگے ہوتے ہیں اور جن کا رخ ایکٹروں کی طرف ہوتا ہے۔ وہ قطعاً مفقود ہیں سامنے سے روشنی ڈالنے کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے سب سے اوپر کی گیلری میں چار بڑے بڑے لیمپ لگے ہیں (تصویر نمبر ۔۔) جن کا رخ سٹیج کی طرف ہے اور جو ٹھیک ٹھیک ایسے زاویے پر رکھے گئے ہیں کہ ان کی روشنی سٹیج یا ایکٹروں پر تو پڑتی ہے لیکن سائیکلوراما پر نہیں پڑتی۔ ورنہ ایکٹروں کے سائے سائیکلوراما پر پڑا کریں۔

سٹیج کے اوپر ایک پل سا بنا ہے (اس کے محل وقوع کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر اس پر سے کوئی چیز گرائی جائے تو سٹیج کے عین وسط میں آ گرتی ہے) اس پر لیمپوں کی قطاریں لگی ہیں بعض کا رخ تو بالکل نیچے کی طرف ہے لیکن چند لیمپ ایسے ہیں جن کی روشنی سائیکلوراما پر پڑتی ہے اور لیمپ۔ سات سات لیمپوں کی ایک ایک قطار ہے۔ ان سات لیمپوں کے سامنے قوس قزح کے سات مختلف رنگوں کے شیشے لگے ہیں۔

١

٢

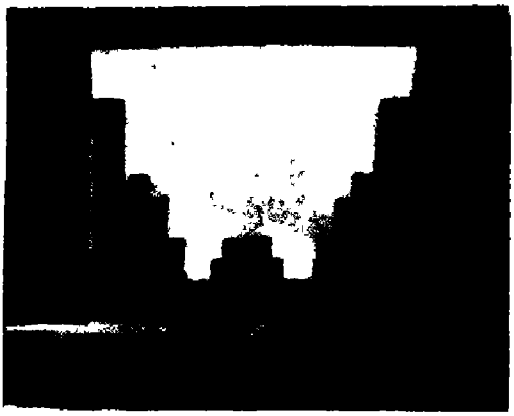

٣

٤

٥

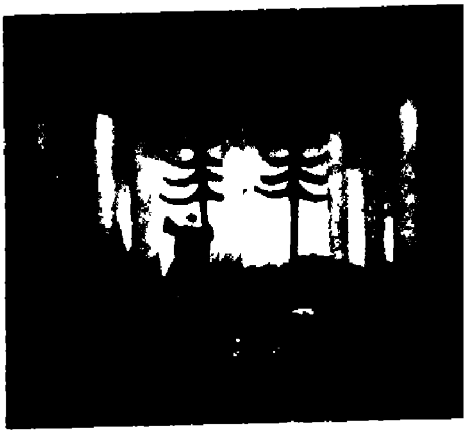

٦

٧

٨

اصولاً انہی سات رنگوں میں سے مختلف رنگ انتخاب کر کے ان کو مختلف تناسب میں ملا کر نیا اور ایک رنگ بنایا جا سکتا ہے اس لئے اب سائیکلوراما پر ہر قسم کے رنگ کی روشنی ڈالنی مطلوب ہو ڈالی جا سکتی ہے۔

ان لیمپوں کے علاوہ اور بھی لیمپ ہیں جو مختلف موقعوں پر لگتے ہیں لیکن ان کا بیان ضروری نہیں۔

سائیکلوراما کے لیمپوں کی روشنی اس قدر تیز ہوتی ہے کہ اگر اس کے سامنے عام قسم کے شیشے لگائے جائیں تو یا تو حرارت کی وجہ سے ٹوٹ جاتے ہیں یا ان کا رنگ مدھم پڑ جاتا ہے اس لئے ان میں ایک خاص قسم کا شیشہ استعمال کیا جاتا ہے جو جرمنی میں بنتا ہے اور جو بہت مہنگا ہوتا ہے۔

صرف ایک اور بات کا ذکر باقی ہے اس کے بعد اس سٹیج کے گرد سے آپ کو جدا کر کے رکھ دوں گا۔ ہر ایک لیمپ کے جلانے کا بٹن علیحدہ ہے نہ صرف یہ بلکہ اس بٹن کے ساتھ ایسا انتظام بھی ہے کہ لیمپ کی روشنی نہایت آہستہ آہستہ بالکل بے معلوم طور پر مدھم یا تیز کی جا سکتی ہے تمام لیمپوں کے تار ایک خاص کمرے میں جاتے ہیں۔ جہاں بٹنوں کی قطاروں کی قطاریں لگی ہیں اور جہاں سے کمیرہ کا ماہر روشنی کا انتظام کرتا ہے۔ اس ماہر کو اپنی نشست پر سے سٹیج بالکل نظر نہیں آتی۔ لیکن مسٹر رچرڈ جو آج کل وہاں یہ کام کر رہے ہیں ان کے تجربے کا یہ عالم ہے کہ اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے مختلف بٹنوں کو دیکھ کر اندازہ لگا لیتے ہیں کہ سائیکلوراما پر کس رنگ اور کس شدت کی روشنی پڑ رہی ہوگی یا ان کو کسی رنگ کا ٹکڑا دکھا دیجئے وہ بجلی کے بٹنوں کو اوپر نیچے سرکا کر آپ سے کہہ دیں گے کہ اس وقت سائیکلوراما پر جو رنگ ہے اس میں اور اس کپڑے کے رنگ میں سر مو تفاوت نہیں اور وہ اس میں کبھی غلطی نہیں کرتے۔ ریہرسل کے دوران میں جب ڈائریکٹر مختلف رنگ آزماتا رہتا ہے تو وہاں اور بجلی کے کمرے کے درمیان عارضی ٹیلیفون لگا دیتے ہیں ڈائریکٹر تو تماشائیوں کی نشست پر بیٹھا ہوتا ہے۔ ماہر روشنی اپنے کمرے میں ہوتا ہے۔ ڈائریکٹر ہدایات دیتا جاتا ہے کہ مثلاً سرخی مائل کہربائی رنگ مطلوب ہے۔ ماہر روشنی اپنی انگلی سے محض بٹنوں کو اوپر نیچے سرکا کر اس کی تعمیل کر دیتا ہے حالانکہ سائیکلوراما خود اسے نظر نہیں آتا ـــ

تصویر نمبر ۱ میں سائیکلوراما کو دیکھئے یہی معلوم ہوتا ہے کہ رنگ کی گہرائیاں دور تک پھیلی جا رہی ہیں۔ جب تک مجھے یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ دیوار ہے مجھے اس بات کا گمان تک نہ تھا۔

یہ تمام وہ سامان ہے جس کی مدد سے وہاں کے خداوند تھیٹر دنیا کے اعلیٰ ترین ڈرامے پیش کرتے ہیں۔ سینری کے متعلق ان کے بعض خیالات الگ ہیں۔ پردے پر پینٹ کی ہوئی سینری تو خیر ذلیل سے ذلیل تھیٹر بھی وہاں استعمال نہیں کرتا۔ اس کا تو ذکر ہی جانے دیجئے۔ فیسٹی ول تھیٹر کا رجحان زیادہ تر ایسی سینری کی طرف ہے جس میں انتہا درجے کی سادگی سے بڑے سے بڑا کام نکل سکے۔ تصویر نمبر ۱ کا سین محض لکڑی کے کندوں کو جوڑ کر بنایا گیا ہے لیکن سیڑھیوں اور ستونوں کے تناسب سے پاکیزگی اور رفعت ٹپکتی ہے۔ سائیکلوراما کا رنگ اس سین میں آسمانی ہے۔

تصویر نمبر ۲ ایک محل کا منظر ہے کالے پردوں میں سے سائیکلوراما دکھائی دے رہا ہے۔ یہ ایک ڈرامے کا آخری سین ہے کھیل اس واقعے پر ختم ہوتا ہے کہ ایک بادشاہ اپنی سلطنت چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ یہ ادا یوں کیا گیا کہ بادشاہ سٹیج پر آگے کو بڑھتا بڑھتا سیڑھیوں پر سے اتر کر تماشائیوں میں سے ہوتا ہوا تھیٹر سے باہر نکل گیا۔ فیسٹی ول کی یہ خاص جدت ہے کہ اکثر اوقات ایکٹر تماشائیوں میں سے ہو کر سٹیج پر آتے ہیں اور اسی طرح باہر نکل جاتے ہیں البتہ یہ صرف وہیں کیا جاتا ہے جہاں موزوں معلوم ہو۔

تصویر نمبر ۳ ان کی سینری کی سادگی کا ایک اور نمونہ ہے یہ منظر ایک خوشنما باغ ہے آسمان (یعنی سائیکلوراما) کا رنگ شہابی ہے جو بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ درخت بہت ہی نفاست اور سادگی سے پیش کئے گئے ہیں۔

تصویر نمبر ۵ دوسرے منظر میں بہت ہی گھنا جنگل دکھانا مقصود تھا (اس سین پر صرف تین طرف سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایک تو سائیکلوراما روشن ہے اس کے علاوہ دائیں بائیں دو چھپے ہوئے لیمپوں سے روشنی کی شعاعیں ستونوں پر پڑ رہی ہیں) بے شمار ستونوں میں دو تین درختوں کو کھڑا کر دیا۔ یہ ستون اور بھی کئی ڈراموں میں استعمال ہوں گے۔ اس لئے درخت گو صرف تین ہیں لیکن جو اثر پیدا کرنا مطلوب تھا وہ ہو گیا۔

ایک خلائی فیکٹری دکھانے کے لئے جو جو انتظامات کرنے پڑے ان کو سوچتے ہوئے دماغ گھبراتا ہے لیکن اس ترکیب سے اس مشکل کو یوں حل کیا کہ سٹیج کے اوپر کے پل پر جو لیمپوں کی قطاریں لگی تھیں ان کا سایہ سائیکلوراما پر ڈال دیا یعنی ان تمام لیمپوں کو ان کے پیچھے ایک اور لیمپ روشن کر دیا۔ نتیجہ تصویر نمبر ۶ سے ظاہر ہے۔

تصویر نمبر ۷ میں ایک ڈرامے کا آخری منظر ہے۔ ڈرامے کی کہانی مصر کی قدیم تاریخ سے تعلق رکھتی ہے۔ دو لاشوں کی ممیاں بنا کر لے جا رہے ہیں۔ صرف سائیکلوراما روشن ہے باقی سب تاریکی ہے لیکن چونکہ آخری سین ہے لوگ کرداروں سے کب کے آشنا ہو چکے ہیں اس لئے اس سے کوئی ہرج واقع نہیں ہوتا۔ البتہ روشنی کی اس ترتیب سے سین میں ایک خاص خوبی پیدا ہو گئی ہے۔

سائیکلوراما پر روشنی کی بجائے سائے ڈالنے کی مثال اوپر پیش کی جا چکی ہے۔ اس کی ایک اور مثال بھی ملاحظہ کیجئے جو میرے خیال میں بہ اعتبار فن کامیاب تر ہے۔ (تصویر نمبر ۸) شیکسپیئر کے رچرڈ سوم کا وہ سین ہے جہاں رچرڈ سویا ہوا ہے۔ اور طرح طرح کے پریشان خواب دیکھ رہا ہے ہیبت ناک صورتیں دکھائی دے رہی ہیں۔ سٹیج پر ایک لیمپ کسی چیز کے پیچھے چھپا کر رکھ دیا ہے اور اس کی وجہ سے جو سائے سائیکلوراما پر پڑ رہے ہیں ان سے ہیبت اور وحشت میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔

اور بہت سے مناظر پیش کرنے کا ارادہ تھا لیکن امید نہیں کہ نیرنگ خیال میں ان سب کے متعلق تصاویر چھاپنے کی گنجائش ہو اور تصاویر کے بغیر میرا کچھ بیان کرنا بے معنی ہوگا اس لئے اس قصہ کو یہیں ختم کئے دیتا ہوں، اس امید پر کہ ان چند مثالوں سے قارئین کو اس تغیر کے طرز و نہج کا کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور ہو گیا ہوگا۔

صرف ایک کھیل کے دو سین تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں ایک تو تصنیف ہی بالکل نرالے طرز کی ہے اور اس کے علاوہ جس طریقے سے یہ ڈرامہ پیش کیا گیا وہ بھی سٹیج کے فن کی بعض جدت طرازیوں پر روشنی ڈالتا ہے اس کھیل کا نام (THE ADDING MACHINE) یعنی جمع کرنے والی مشین ہے اس کھیل میں جو پیغام مضمر ہے وہ یہ ہے کہ امریکہ اور اس سے کم درجے پر انگلستان اور یورپ کے بعض اور ممالک میں جو حیرت انگیز مادی ترقی ہوئی ہے اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ ہزارہا افراد (مثلاً کلرک اور مزدور) ایسے پیدا ہو گئے ہیں جن کی زندگی بالکل ایک مشین کی طرح چلتی ہے گویا روح اور احساس کی تمام لطافتیں مر چکی ہیں۔ زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں۔ کام میں کوئی لطف نہیں۔ برسوں تک ایک ہی دفتر میں ایک بے رونق سی مصروفیت میں مبتلا ہیں۔ ہر صبح اسی وقت پر اٹھنا۔ اسی وقت پر کام کو جانا۔ اسی کرسی پر بیٹھنا۔ وہی ہندسے جمع کرتے رہنا۔ ہر شام اسی گھر کو واپس آ جانا۔ کوئی تفریح نہیں۔ کوئی انوکھے خیالات نہیں۔ کوئی ترقی کی امید نہیں۔ اس کاروباری دنیا میں نیرنگی بالکل مفقود ہے۔ بے رنگ یکسانیت چھائی ہوئی ہے جس کی وجہ سے ایک کلرک اور دوسرے کلرک یا ایک مزدور اور دوسرے مزدور میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے سب کے سب جانوروں کی طرح ایک ہی لاٹھی سے ہانکے جاتے ہیں۔ سب ایک ہی جیسی باتیں کرتے ہیں ایک ہی جیسے خیالات رکھتے ہیں غرضیکہ کولہو کے بیل کی طرح پیدائش سے مرگ تک ایک ہی نقطے کے گرد چکر کاٹتے رہتے ہیں۔

ڈرامے میں جس کلرک کی زندگی پیش کی گئی ہے اس کا نام مسٹر زیرو یعنی صفر ہے۔ ڈرامے کے بیشتر افراد کے ناموں کی بجائے اسی طرح نمبر ہے

سے ہوتے ہیں۔ یعنی کسی میں کوئی انفرادیت نہیں کسی کی کوئی خاص شخصیت نہیں گویا یہ ذی روح اشخاص نہیں، جاندار مشین ہیں۔ ایک بالکل دوسرے جیسا۔ ان میں تمیز کرنا ہو تو بجز اس کے کہ ہر ایک پر ایک لیبل لگا دیا جائے اور کوئی طریقہ نہیں۔ اسی لیے افراد کو ہندسوں سے تعبیر کیا گیا ہے صرف چونکہ کھیل کے ہیرو یعنی مجموعہ انسان نما مشینوں میں ایک خاص مشین کو باقی مشینوں سے ممیز کرنا تھا اس لیے اس کا نام زیرو رکھ دیا۔

کھیل کا پلاٹ، اور اس کو سٹیج پر ادا کرنے کا ڈھنگ دونوں ساتھ ساتھ بیان کرتا جاؤں گا۔ (میں صرف اپنے حافظہ کی مدد سے لکھ رہا ہوں۔ تفصیلات میں کمی بیشی ممکن ہے مگر اتنی نہیں کہ اس سے کوئی خاص فرق پڑے) پہلا سین مسٹر صفر کی خواب گاہ کا ہے۔ میاں بیوی دو بستروں پر ساتھ ساتھ لیٹے ہیں۔ بیوی بدمزاج ہے اور ہر وقت میاں کو ڈانٹتی ڈپٹتی رہتی ہے۔ گویا نہ صرف یہ کہ اس کلرک بے چارے کی زندگی دفتر میں بے لطف ہے بلکہ گھر پر بھی اس کو کوئی آرام کوئی خوشی نصیب نہیں۔ ایک سین میں بیوی نہایت غصے میں طلاقت لسانی کے ساتھ بول رہی ہے اور میاں کو طرح طرح کی باتوں پر ملامت کر رہی ہے میاں سامنے سے کچھ نہیں بولتا۔ چنانچہ اس تمام سین میں میاں کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلتا۔ صرف کبھی کبھی جب لے بھر کے بیوی آرام لینے کے لیے ٹھہر جاتی ہے تو اس وقفہ میں مسٹر صفر کے دماغ میں اپنے محدود سے خیالات گونجنے لگتے ہیں۔ اس کو یوں ادا کیا گیا کہ جہاں بیوی چپ ہوئی تب پردے کے پیچھے پانچ ایکٹر بھاری، اداس اور نہایت ہی مدھم آواز میں ہندسوں کا ایک بے معنی سا سلسلہ دہرانے لگ جاتے ہیں حتیٰ کہ پھر خاموشی چھا جاتی اور بیوی پھر بولنے لگ جاتی۔ اس دوران میں مسٹر صفر لب تک نہ ہلاتا تھا۔ صرف بے قراری سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا تھا اور پھر جیسے نیند میں ڈوب جاتا تھا۔ جو ایکٹر پردے کے پیچھے بولتے تھے ان کی آوازیں ایک بجلی کے آلے کے ذریعے سے تمام ہال میں گونجتی تھیں۔ گویا پانچ چھ آوازوں والا عجیب دیو سرگوشیاں کر رہا ہے۔ ہندسوں کے دہرانے سے مطلب یہ تھا کہ مسٹر صفر کی روح روزمرہ کی بے رنگ کاروباری مصروفیت کی وجہ سے اتنی مردہ ہو چکی ہے اور اس میں نئے خیالات کے پیدا ہونے کی طاقت اس حد تک سلب ہو چکی ہے کہ دفتر کے دن بھر کے کام کے علاوہ اسے اور کچھ نہیں سوجھتا۔ دل و دماغ پر اس مشین کی طرح وار زندگی نے اس قدر قابو پا لیا ہے۔

دوسرا سین دفتر کا ہے۔ پیچھے سیاہ رنگ کے پردے لٹکے ہوئے ہیں سٹیج کے عین وسط میں ایک بہت اونچا سا دو رخا ڈیسک ہے دونوں طرف دو اونچے سٹول ہیں۔ جن پر بیٹھنے سے آدمی کے پاؤں زمین سے تین فٹ کے قریب اونچے رہتے ہیں ایک طرف مسٹر صفر بیٹھا ہے دوسری طرف ایک کام کرنے والی عورت بیٹھی ہے ڈیسک کے عین اوپر ایک لیمپ لٹک رہا ہے۔ لیمپ تو دکھائی نہیں دیتا لیکن اس میں سے جو پیلی پیلی تیز روشنی کا ایک مخروطی مینار سا نیچے ڈیسک پر پڑ رہا ہے وہ اردگرد کی تاریک فضا میں نمایاں نظر آتا ہے یہ سب سامان سٹیج کے اس حصے پر ہے جو گھمایا جا سکتا ہے مسٹر صفر اور لڑکی دونوں نے آنکھوں پر سبز رنگ کے چھجے لگا رکھے ہیں۔ لڑکی کے سامنے بل فارموں کا ایک ڈھیر ہے ایک بل کو اٹھاتی ہے رقم بلند آواز سے بول کر اس کو فائل میں لگا دیتی ہے پھر دوسرے بل کو اٹھاتی ہے اس کو بھی یونہی پڑھتی ہے غرضیکہ متواتر یہی کیے جاتی ہے۔ مسٹر صفر ہر رقم کو دہراتا ہے اور سامنے جو رقموں کی فہرست رکھی ہے اس پر نشان لگاتا جاتا ہے یہ رقمیں جس لہجے میں بولی اور دہرائی جاتی ہیں اس سے تھکن اور بے رونقی ٹپکتی ہے بیچ میں کہیں کہیں ٹھہر جاتے ہیں ایک دوسرے سے ہم کلام نہیں ہوتے مگر بغیر نظر اٹھائے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں جس سے ان کی زندگی کی مردہ ہوسوں اور شکست خوردہ امنگوں کا پتہ چلتا ہے۔ مصروفیت کا یہ عالم ہے کہ مسٹر صفر کی گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے کہ گو یہاں شاید برسوں سے اسی لڑکی کے سامنے بیٹھا کام کر رہا ہے لیکن کبھی جی بھر کے اس کا چہرہ دیکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ دل میں یہ امید ہے کہ آج نہ سہی کل میری ترقی ہو گی آخر اتنے سالوں سے کام کر رہا ہوں۔ مالک کمپنی سے آج تک صرف ایک مرتبہ گفتگو کا موقع ملا وہ یوں کہ ایک دفعہ میں نے اس کے لیے دروازہ کھولا اور اس نے کہا کہ "نوازش" لیکن کیا عجب کبھی تو اس کو خیال آئے گا کہ یہ شخص اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی تنخواہ میں اضافہ کیا جائے۔

اسٹیج پر مل کی سیٹی بجتی ہے دن کا کام ختم ہو گیا۔ دونوں ایک ساتھ سٹولوں پر سے اترتے ہیں۔ دونوں کی حرکات میں، اس حد تک مطابقت پیدا کرنے سے صرف یہی بتانا مقصود تھا کہ ان کی زندگیاں بالکل مشین کی مانند ہو گئی ہیں۔ لڑکی باہر چلی جاتی ہے مسٹر صفر جانے ہی کو ہے کہ مالک کمپنی اندر داخل ہوتا ہے۔ بڑے تحکم کے انداز میں پوچھتا ہے تم کو یہاں ملازم ہوئے کتنے سال ہو گئے؟ تم کیا کام کرتے ہو؟ وغیرہ وغیرہ۔ اور آخر میں مسٹر صفر سے کہتا ہے کہ جو کام تم یہاں کرتے ہو یعنی رقمیں جمع کرنے کا اس کے لئے ایک ایسی مشین ایجاد ہو چکی ہے جو تم سے کہیں تیز کام کرتی ہے وہ مشین میں نے منگالی ہے اس لئے تم آج سے برخاست کئے جاتے ہو۔ یہ سب کچھ بہت تیز تیز بولتا ہے مسٹر صفر کچھ احتجاج کرتا ہے وہ نہیں سنتا۔ اس بحث کے دوران میں دونوں کی آوازیں بلند تر ہو جاتی ہیں سٹیج گھومنے لگتی ہے لیکن مسٹر صفر اور مالک کمپنی دونوں اس طرح چلتے ہیں کہ اگرچہ سٹیج گھومتی رہتی ہے لیکن وہ دونوں اپنی جگہ پر قائم ہیں آوازیں اور بھی بلند ہوتی جاتی ہیں گفتگو اور بھی تیز ہو رہی ہے سٹیج پر سرخ اور سفید رنگ کی روشنی کبھی جلتی کبھی بجھتی ہے پردے کے پیچھے سے ایکٹر ڈراؤنی سرگوشیاں شروع کر دیتے ہیں۔ جو رفتہ رفتہ مہیب تر ہوتی جاتی ہیں۔ الفاظ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتے۔ کہیں ایک گھنٹی بجنی شروع ہو جاتی ہے قسم قسم کے شور سنائی دیتے ہیں مسٹر صفر میز پر سے فائل اٹھا کر اس کے نوک دار سرے سے مالک پر حملہ کرنے کو بڑھتا ہے آوازیں اور شور اور روشنی کی چمک اور سٹیج کا گھومنا سب کچھ بہت تیز ہو گیا ہے تماشائیوں کے دل دہلنے لگتے ہیں مسٹر صفر دفعتاً اپنا ہاتھ اوپر کو اٹھاتا ہے یک لخت ایک دھماکا سنائی دیتا ہے (یہ آواز پستول کے ایک خالی کارتوس سے زمین پر مار کر پیدا کی گئی تھی) اور تمام چراغ گل ہو جانے سے مکمل اندھیرا اور تاریکی چھا جاتی ہے اور پھر جو دوبارہ لیمپ روشن ہوتے ہیں تو پردہ گر چکا ہوتا ہے تماشائیوں کے دل کی دھڑکن درست ہوتی ہے تو وہ زور سے داد دیتے ہیں۔

یہ اس حیرت خانے کی ایک جھلک ہے مکمل ڈرامے کو اس تفصیل سے بیان کرنے کی ہمت اور فرصت کہاں!

(نیرنگ خیال)

یوپی کے تنقید نگاروں کی خدمت میں

نیاز مندانِ لاہور

مخزن، نیرنگ خیال اور [illegible] سب تسلیم [illegible] سے پنجاب میں تنقید نگار [illegible] چھلکوں [illegible]

«کاروان» کا یہ دور [illegible] نئے سرے سے [illegible] پنجاب سے جدید ادبیات کی تحریک کا نقیب ہے، جس کے پچھلے سال جناب چغتائی اور جناب تاثیر کے زیر ادارت [illegible] اس سال جناب چغتائی اور جناب حمید نظامی نے [illegible] اس بات کی کوشش کی ہے کہ [illegible] ہندوستان سے [illegible] کوشش کیا جائے [illegible] فہرست مضامین سے ظاہر ہوگا کہ اس مبارک دریا دلی کے لئے ہندوستان کے سب صوبوں کے ادبوں کو بلایا گیا ہے۔ اگر آپ کو اپنے بعض [illegible] نام [illegible] میں نظر نہ آئیں تو اس کو رسالے کے استغنا پر نہیں، ان کی نامرادی پر محمول کیجیے۔

ادب و انشا کے نمونے پیش کرنے کے لئے زبان اردو کو منتخب کیا گیا ہے۔ [illegible] پنجاب میں صرف یہی ایک زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے بلکہ اس لیے کہ پنجاب کے نوجوان [illegible] وابستگی کا ثبوت [illegible] ایک عظیم الشان تہذیب، ایک تربیت اور اپنے جذبات عقیدت و الفت کی وجہ سے اردو کو اپنے لیے بہترین ذریعۂ اظہار سمجھتا ہے۔ یہ کسی سے پوشیدہ نہیں کہ اس وقت ہندوستان میں اردو کے تین مرکز ہیں۔ یوپی، حیدرآباد (دکن) اور لاہور۔ لیکن اہلِ بینش بھی یہ بات اکثر بھول جاتے ہیں کہ یوپی میں یہ زبان خود رو ہے۔ حیدرآباد میں یہ زبان ایک والیٔ ملک کے سایۂ عاطفت میں پل رہی ہے اور صرف پنجاب ہی ایک علاقہ ہے جہاں اس کی نشو و نما محض خوش مذاقی کی مرہونِ منت ہے۔ جس جگہ یہ زبان خود رو ہے وہاں خود بین بھی ہے۔ جہاں اتالیق شاہی سے تعلیم پا رہی ہے وہاں عوام سے کچھ کٹ کے رہتی ہے لیکن پنجاب میں اس زبان کی حالت ایک ہونہار تنومند نوجوان کی سی ہے جس کا خون گرم ہے اور جس کے اعضا میں لچک ہے جو ہاتھ پیر مارتا جاتا ہے اور اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ اس کا ہر قدم گلدستوں پر پڑتا ہے یا نہیں۔ اسے صحت کا اتنا ہی شعور ہے جتنا کسی اور قدرتی نمو کو ہوتا ہے۔ یعنی یہ گرم سانس گرمیٔ حیات کے اور کسی بیرونی قوت کا احساس نہیں لیکن قوتِ نامیہ خود ہی رستہ ڈھونڈ لیتی ہے جو بجائے مستقیم کھلی روشنی اور تازہ ہوا کی طرف جاتا ہے۔

یہ کہنا کہ پنجاب نے یوپی سے کسبِ فیض نہیں کیا یا یہ کہ پنجاب یوپی کی روایات سے یکسر قطع تعلق کرنے پر تلا ہوا ہے، کذب اور مبالغہ ہوگا۔ یوپی کے اساتذۂ قدیم میں سے کون سا ایسا ہوگا جسے پنجاب نے ایک بار، سو بار، ہزار بار نہیں پڑھا۔ وہ کون سا ایسا دیوان ہے جس کی ورق گردانی نہیں کی۔ وہ کون سا ایسا شاہکار ہے جسے حرزِ جاں بنا کر نہیں رکھا۔ لیکن یوپی کے چشمے خشک ہو چکے۔ پیاس بجھانے کے لیے اب وہاں جانا بے سود ہے۔ اب

پنجاب کی رعایت بجز اس کے کہ یہی قوت نامیہ کے کوئی چیز نہیں رکھتی۔ یو پی میں اب اردو کا ایک مستقل معیار سا بن گیا ہے جو کبھی کبھی ایک بیت سی چیز بنا رہا ہے اور بس۔ اب یو پی صرف اعتراض کر سکتا ہے۔ رہنمائی نہیں کر سکتا۔ اور نہیں جانتا کہ اس کا چرچا اپنی اس کا معیارانہ انداز اس کی غلط تنقید و بے انصافی کی نشانیاں ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ یوں ایک خود بینی بتی ہے اس کے انحطاط کی خبر سنا رہی ہے لیکن یہ جملہ ایک منتشر رت کی بے رحمی ہے۔ اس پر سوال کی ادھر کا خیال کرنا فضول ہے۔

اس انحطاط کے ثبوت میں کوئی سی ایسی تنقید اٹھا کے دیکھ لیجیے جو کسی یو پی کے مرتب کے ہر ایک رسالے میں چھپی ہو۔ اگر وہ تنقید ادبی ہے تو اشاعت کے مسودوں سے کچھ بحث نہیں۔ معانی کی ترتیب سے کچھ واسطہ نہیں۔ سنجیدگی و متانت سے کچھ تعلق نہیں۔ اگر نظم ہے تو شاعر کی نفسیت و فراست سے غرض نہیں۔ اس کے جذبات پر غور نہیں۔ اس کی ذہنی کشمکش پر نظر نہیں۔ اگر افسانہ ہے تو توازن کا ذکر نہیں۔ فضا کا احساس نہیں۔ مطلب کا شعور نہیں۔ اگر ترجمہ ہے تو فقروں کی ترتیب پر اعتراض نہیں۔ اصل سے مقابلہ کا حوصلہ نہیں۔ اعتبار کر لینے کی استعداد نہیں۔ صرف زبان کے اقتباسات پر زور ہے۔ اس محاورے پر، اس لفظ پر، اس حرف پر، اس نقطہ پر بادشاہ گردی ہوتی ہے۔ نگاہوں میں یہ وسعت نہیں اور طبیعت میں یہ جودت نہیں کہ کسی ادبی چیز کو جانچ سکیں۔ یا اصل معاملے کے متعلق پہلے منہ سے دو لفظ بھی لکھنے کی توفیق پیدا کر سکیں۔ زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ عالمی ادب اردو کی منزلیں طے کر گیا۔ لیکن حضرات یو پی ہنوز "ٹھک" اور "ٹھک" کے پھیر میں ہیں۔ وہ زبان اور ادب کو ایک سمجھتے ہیں۔ جو دہلی یا لکھنؤ میں منصب ہے اور جس کا تتبع ان پر بھی فرض ہے جو جمادات کی منزل سے آگے نکل چکے ہوں۔

گزشتہ سال کے کاروان پر کئی رسائل نے زبان کے اعتراض کیے تھے لیکن ہم لوگ اس قسم کے اعتراضات سننے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ہم یو پی کے حضرات کو اس مشغلے سے محروم نہیں کرنا چاہتے۔ اس انحطاط کے زمانے میں اب یو پی کے پاس یہی ایک کھلونا رہ گیا ہے گو چھوٹے پن کا یہ عالم ہے کہ خود اس سے کھیل نہیں سکتے اور کسی کو کھیلنے نہیں دیتے۔ بے ہنر نقادوں کا مزاج یہی رہ گیا ہے کہ جہاں پنجاب کا کوئی مضمون چھپے اس کے ہر چھوٹے سے چھوٹے نقطے کو ہر بڑی سے بڑی خوردبین کے ساتھ پرکھیں۔ اہل قلم کی جرأت کو محض تذکیر و تانیث کے معیار سے ناپیں اور اس کے بعد ایک "فہرست اغلاط" مرتب کر کے فن تنقید کی گرہ پر ہاتھ مار دیں۔ مطالب یا فن یا حسن بیان کی طرف ڈر کے مارے صرف کنکھیوں سے دیکھ لیں۔ اور اگر باوجود اپنی نااہلی کے مرعوب ہوئے بغیر چارہ نہ ہو تو اپنی بے چارگی کو "اچھا ہے" یا "خوب ہے" جیسے بے معنی فقروں سے ڈھانپ کر اپنی کم مائگی کو فہرست اغلاط کی طوالت سے پورا کرنے کی کوشش کریں۔ یا اگر کسی ریلوے بک سٹال سے کسی انگریز لال بجھکڑ کی کوئی ارزاں کتاب مبادیات انشا کے متعلق دستیاب ہو جائے تو اس کے فرسودہ خیالات کے چیتھڑوں سے اپنی تھوڑی بہت ستر پوشی کر کے یہ سمجھ بیٹھیں کہ اب ہم علم و فن کی تمام آرائشوں سے مزین ہیں۔ اور کیا مشرق اور کیا مغرب دنیا بھر کا ادب ہمارے ہی گوشۂ چشم سے کیمیا بننے کو ہماری دہلیز پر پڑا ہوا ہے۔

اگر یو پی کے سب رسالے اسی جہل سے مرتب ہوتے تو اس مضمون کا لکھنا محض بے سود تھا۔ لیکن ان میں سے چند رسالے ایسے بھی ہیں جن کی ہر اشاعت کے ساتھ نہایت خوش گوار توقعات وابستہ ہوتی ہیں۔ اور جنہیں پنجاب کا ہر وہ ادب آشنا جسے اہل نظر کی تلاش رہتی ہے بہت شوق سے پڑھتا ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ ایسے رسالوں کے مرتب کرنے والے بھی باوجود اپنے علم اپنے ذوق اور اپنی متانت طبع کے یو پی کے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہمارا روئے سخن اس وقت ان کی طرف ہے اور ان میں سے دو رسالے خاص طور پر ایسے ہیں جن سے مخاطب ہونا خود ہمارے لیے فخر کا باعث ہے۔ ہماری مراد "علی گڑھ میگزین" اور "جامعہ" سے ہے۔

علی گڑھ کا خطہ مردم خیز خطہ ہے۔ اور اس کی زمین کا ہر ذرہ قابل احترام ہے۔ ہندوستان میں جہاں بھی کوئی ایسا شخص ہے جو تہذیب جدید کے ساتھ ڈھلنے میں پریشان نہیں ہوتا لیکن پھر بھی اردو زبان کو اپنے لئے روح پرور تصور کرتا ہے وہ علی گڑھ کے نام کو اسم اعظم اور علی گڑھ کی مطبوعات

[illegible] پرچہ کی کتابت [illegible] بھی ہے [illegible] پہنچ [illegible] سے [illegible] تنقید [illegible] رسائل [illegible]
سوالوں کا ایک پیراگراف لکھا اور وہ بھی ایسا ہی ہے [illegible] متانت [illegible] بھی [illegible] سب [illegible]
اور دلاور ہیں" یہ الفاظ نہایت غلط ہیں لیکن [illegible] کے شائق [illegible] سے [illegible]
مؤنث ہے مذکر نہیں اس کا جواب [illegible] صاحب [illegible] کی [illegible]
بڑھے گی کہ یہاں "[illegible]" لکھا ہے [illegible]
اچھا ہے ورنہ اس [illegible]
کرنے سے کیا حاصل؟ اس [illegible] آپ [illegible] آپ کی تنقید [illegible] عقیدت [illegible]
کیا خوب ہے ۔

کسی [illegible] سال [illegible] سے [illegible]
[illegible] نہیں [illegible] عشق [illegible]

شعر معمولی ہے لیکن جذبہ نہایت صحیح ہے اور عجب نہیں کہ آپ اس سے متاثر ہوں۔

[illegible] تنقید خود ایڈیٹر صاحب کے زور قلم کا نتیجہ ہے [illegible] "آغاز داستان" کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے اس کے تقریباً ہر صفحے پر اس سے بدتر لغزشیں موجود ہیں۔ فرماتے ہیں :—

"سالنامہ کی خصوصیات اس کی دلچسپیاں اور خوبیاں ہم سے پوچھیے" ـــــــــ
(سالنامہ کے لیے استعمال خاص ایڈیٹر [illegible] خصوصیات کہلوانا تو ایک محاورہ ہے کہ کیا کیجئے۔)

"چھوٹے منہ سے بڑا" (غالباً اس مطلب کو ادا کرنا آپ کی منشا ہے ورنہ یہاں "بڑی بات" چاہیے۔)

"سب سے زیادہ موجب مسرت خبر کابل یونیورسٹی کا قیام ہے" : جناب [illegible] صاحب! کابل یونیورسٹی ابھی قائم نہیں ہوئی۔ جب قائم ہو جائے گی (تو آپ کا دل چاہے تو لکھ دیجئے گا۔ فی الحال تو جس خبر سے آپ کو مسرت ہوئی ہے وہ قیام کی تجویز ہے)

"پہلے سے جو مضامین کی آخری تاریخ مقرر کی جاتی ہے ..." (مضمون کی تاریخ نہیں ہوتی۔ مضمون بھیجنے یا پہنچنے کی تاریخ ہوتی ہے)

"تمام ضروری خبریں اور اہم اقتباس کے متعلق پچھلے نمبروں میں لکھا جا چکا ہے" : (اس ایک فقرے میں صرف و نحو اور بیان کی اتنی غلطیاں ہیں کہ ان میں سے دو ایک آپ خود ہی آپ کو سمجھنی چاہئیں)

معلوم ہوتا ہے آپ ہماری اصلاح میں اس قدر وقت ضائع کر دیتے ہیں کہ خود کچھ سیکھنے سکھانے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ لیکن پنجاب کا ایک رسالہ بھی ایسا نہیں جو آپ پر نکتہ چینی کرنے کو اپنے لئے باعث فخر و ناز سمجھے۔ ہم مہینے کے مہینے خود پنجاب کے رسالوں میں سے زبان، صرف و نحو اور انشا کی غلطیوں کی ایک طویل فہرست اہل بصیرت کی عبرت کے لئے مرتب کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم نے اب تک یہ پیشہ اختیار نہیں کیا۔ اور سچ پوچھیے تو ہمیں اس کی فرصت بھی نہیں۔ یہ مشغلہ آپ ہی کو مبارک ہو۔ ہم آپ کی خوبیوں پر نظر رکھتے ہیں کیونکہ ہم تو اسے وجہ مسرت اور ذریعۂ اتحاد سمجھتے ہیں۔ آپ ہمارے نقائص گنواتے رہتے ہیں۔ آپ نے زبان کو اپنے لئے ایک مستقل موضوع بنا لیا ہے جو بحیثیت مجموعی آپ کا [illegible] رکھا ہے۔

"جامعہ" کی حالت اس سے بھی زیادہ قابل افسوس ہے کیونکہ "جامعہ" کے حلقے میں بعض ایسی شاندار ہستیاں بھی شامل ہیں جن کی

تو بڑے تعجب کی بات ہے۔ حسرت صاحب ان کا جواب ... اس کا تمام تر حصہ مرحوم میرزا کی تعریف و توصیف سے بھرا ہے۔ پھر کیا یہ حیرت کا مقام نہیں کہ یہ زبان کا مجنون ان کی سلامت طبع کا بھی منکر ہو جائے۔ اردو کی تنقیص کے نشے سے ہم لوگ اکثر تفکر و تعمق سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ اس زبان دانی کا جوہر یہیں صرف اس سے معلوم ہوگا کہ جامعہ نے فہرست اغلاط میں "منزل گاہ" جیسے لفظ کو بھی شامل کر لیا اور کہہ دیا کہ یہ ترکیب صحیح نہیں۔ غالباً قافیہ کی مجبوری تھی۔ یہی وہ اردو دانی اور تعمق ہے جس کی ایک مثال سی ترقی کے اکثر داعیوں پر بھی ہوتی ہے۔ کاش کہ فاضل تنقید نگار صاحب اپنے ہی گھر سامنے یہ منزل مقصود تک پہنچ رہتے۔ کاش اب بھی کبھی کبھار اپنا انداز طالب علمانہ بنا لیا کریں اور خشوع و خضوع کے ساتھ یہ شعر گایا کریں ؎

کس ندانست کہ منزل گہ مقصود کجاست
ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

لیکن اسے پڑھ کر بھی وحشت یہی کہیں گے کہ ترکیب صحیح نہیں۔ غالباً قافیہ کی مجبوری تھی۔

جامعہ کے جس نمبر میں کارواں پر تنقید چھپی ہے اسی میں خود زبان کی کئی دلچسپ غلطیاں موجود ہیں جنہیں ہم یہاں نقل کرنا سوءِ ادب سمجھتے ہیں لیکن اگر اب جامعہ کا اشارہ پائیں تو ہم ان کی خدمت میں پیش کرنے کو تیار ہیں۔

جامعہ کی تنقید کا انداز ضرورت سے زیادہ پیغمبرانہ ہے اور "عمل پیہم" اور "قومی سیرت" اور "اصلاح" وغیرہ اور "ہمیں خوشی ہے" اور "ہمیں امید ہے" اور اسی قسم کی آیات سے فال المشورہ من تنبیہ پر عمل کرنے کی کوشش بہت نمایاں ہے لیکن چونکہ یہ انداز جامعہ کا مستقل انداز ہے اور اس کے اغراض و مقاصد میں شامل ہے اس لئے ہمیں اس پر اعتراض کرنے کا حق غالباً حاصل نہیں تاہم اتنا عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ نقد و نظر کے اعتبار سے اس تنقید کا وزن مخصوص بہت کم ہے اور پڑھنے والے کو اس سے حاصل کچھ نہیں ہوتا، بجز اس احساس کے کہ تنقید نگار اپنے سینے میں دل زندہ رکھتے ہیں۔ اور یہ احساس لاریب دونوں جہان میں امت مرحومہ کے لئے "بھلائی" کا موجب ہوگا۔

"پنجابی محاورے" خاص طور پر قابل بحث ہیں۔ علی گڑھ میگزین اور جامعہ دونوں نے ان کو رد کیا ہے اور کتنا بجا؟ بالکل بجا فرمایا ہے کہ یہ محاورے ٹھیٹھ پنجاب کی پیداوار ہیں۔ یہاں تک تو ہمیں ان سے پورا اتفاق ہے مثلاً پنجاب کے لوگ "مجھے جانا ہے" کی بجائے "میں نے جانا ہے" اور "میری سمجھ میں نہ آتا تھا" کی بجائے "مجھے سمجھ میں نہ آتا تھا" بولتے ہیں لیکن یہ دونوں رسالے اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ جب پنجاب نے اردو کو اپنایا ہے تو اس قسم کے تصرفات لابدی ہیں اور جوں جوں پنجاب میں اردو ترقی کرے گی ایسے تصرفات کی تعداد بجائے کم ہونے کے اور بڑھے گی۔ اس کے ثبوت درکار ہوں تو کسی زبان کی تاریخ ارتقاء کا مطالعہ کیجئے۔ اس کے بعد اگر آپ ذرا بلند نظری سے کام لیں تو آپ پر روشن ہو جائے گا کہ اگر اردو کو پنجاب میں نشو و نما نصیب ہوئی ہے تو ان تصرفات کے بغیر چارہ نہیں بلکہ ان ہی کی بدولت پنجاب میں اردو کی جڑیں مضبوط ہوں گی۔ اردو ایک اکتسابی زبان کے درجہ سے ایک فطری زبان کے رتبے تک جا پہنچے گی۔ وہ وقت آن پہنچا ہے جب کہ آپ اردو لغت کی کتابوں میں لکھنؤ اور دلی کے محاوروں کے پہلو بہ پہلو پنجاب کے محاورے بھی شامل کریں۔ چہ جائیکہ آپ ان کو اغلاط قرار دیں۔ پنجاب کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی تو اب یہ حالت ہو چلی ہے کہ جہاں کوئی محاورہ یا "مجھے جانا ہے" کہتا ہے، پڑھے لکھے لوگ اسے ملامت کرتے ہیں کہ یہ کیا ٹھیٹھ تیلیوں کی زبان بول رہے ہو۔ اپنا "پنجابی ڈھنگ" کی طرح باقی رکھو، یہ مت بولو۔ کارواں کی اس اشاعت میں جناب تاثیر کی نظم کا پہلا مصرعہ ہے ؎

تو نے الفت مجھ سے کرنی ہے تو آ میرے لئے

ان سے کہا گیا کہ "تو نے ... کرنی ہے" کی بجائے "تجھ کو الفت مجھ سے کرنی ہے" رکھ دیجئے۔ انہوں نے فرمایا "ہرگز نہیں۔ "تو نے الفت مجھ سے کرنی ہے" میں ترنم زیادہ ہے۔" اس مصرعہ کے ساتھ "نے" استعمال کرتا بھی ہوں اور نہیں بھی کرتا۔ مصرعے پڑھنے کے ترنم کے مطابق جہاں

پنجاب کا معاملہ مجھے منیہ مطلب نظر آتا ہے۔ وہاں میں بحیثیت پنجابی اردو خوان کے اسے مستعار زبان نہیں سمجھتا ہوں۔ یوپی سے صورت اس حق سے محروم تھی۔ وہ مجبور ہوں تو ہوں میں مجبور نہیں۔"

علی گڑھ میگزین اور جامعہ دونوں بہترین ہندوستانی تہذیب کے علمبردار اور آئینہ دار ہیں۔ جس فضا میں یہ رسالے ترتیب پاتے ہیں۔ وہ ہندوستان کی بہترین علمی فضا ہے اور ان کے مدیر و معاون حضرات اہل پنجاب کے نزدیک [illegible] محبوب و معتقد ہیں۔ ہم میں سے اکثر ایسے ہیں جن کو ان حضرات سے ذاتی تعارف کا فخر حاصل ہے اور [illegible] ان کی صحبت کی یاد ہر چند کہ وہ صحبت بہت مختصر تھی، باسیلی اور رنج کا موجب ہے۔ لیکن جہاں ہماری عقیدت کا یہ عالم ہے وہاں توقعات بھی کچھ کم نہیں۔ ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ یہ دو رسالے ہندوستان بھر میں ہندی کی رہنمائی کریں گے اور ادب و انشا کے مقتدیٰ ہیں [illegible] کریں گے جو [illegible] تک [illegible] قوم کے لئے مسلسل حمایت کا کام دیں۔ صوبجاتی اور علاقائی حدود سے باہر قدم رکھ کر کل ہندوستان میں اردو کے مستقبل پر غور کریں گے اور ایسے رویے سے ایسے ایسے اصولوں کی نگہبانی کریں گے جن کی تائید ہمیشہ فرہنگ تصنیف سے ہو سکتی ہے۔ بلکہ جن کی بدولت خود فرہنگ تصنیف رفتہ رفتہ بے کار ہو کر رہ جائے گی۔ تاکہ دنیا پر یہ ثابت ہو جائے کہ اردو ایک زندہ زبان ہے جو بڑھ رہی اور پھول رہی ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں پنجاب اس زبان کو اپنے خون سے سینچ رہا ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ اس سے [illegible] علاوہ کہ ہمارا حق [illegible] ہے۔ اور اس کے مقابلے میں [illegible] رہزنی کو آپ کی شان کے شایاں نہیں سمجھتے ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ آپ ہم [illegible] بزم اردو کی زینت کو بڑھائیں گے نہ یہ کہ [illegible] کے کھنڈروں پر [illegible] چلے جائیں گے۔

مدیر پطرس

ہمارے زمانے کا اُردو ادب

ترجمہ
مظفر علی سید

پطرس مرحوم نے یہ مقالہ ۱۹۴۵ء میں پی ای این کے سالانہ جلسہ منعقدہ جے پور میں پڑھا تھا۔ اس میں انھوں نے اردو ادب کے جدید دور یعنی اقبال کے فوراً بعد کے زمانے کو موضوع بنایا تھا۔ اور اپنے مخصوص جچے تلے انداز میں اس پر رائے زنی کی تھی۔ اس مضمون کی اصل خوبی تو ان کی انگریزی انشا پردازی ہے جس کا اُردو ترجمہ وہ خود ہی کرتے تو کرتے۔ زیر نظر ترجمہ محض اس لئے کیا گیا ہے کہ وہ لوگ بھی جو انگریزی سے زیادہ واقف نہیں، اُن کے اندازِ نظر، جدید اردو ادب کے بارے میں ان کے نقطۂ نگاہ سے واقف ہو جائیں۔

چونکہ پطرس مرحوم کا اپنا تعلق اس دور کے ادب سے دوگونہ تھا۔ نئے ادیب کی حیثیت سے اور اس سے بھی زیادہ نئے ادیبوں کے استاد کی حیثیت سے، اس لئے اس معاملے میں ان کی "معروضیت" اور بھی لائق مطالعہ شاید عجیب معلوم ہو۔ پطرس نے اپنے نوجوان ساتھیوں کو ایک پہاڑی پر چڑھ کے دیکھنے کی کوشش کی ہے (یہ الگ بات کہ دو ایک بزرگوں کو بھی اپنے ساتھ لے گئے ہیں) اور اُن پر ہلکی ہلکی کنکریاں بھی پھینکی ہیں۔

ممکن ہے آپ اس مضمون کو محض تبرک سمجھیں مگر واقعہ یہ ہے کہ چند ایک ٹکڑے اس میں ہر لحاظ سے اچھے ہیں۔

گیارہ سال پہلے، جب اقبالؔ اپنے اسلاف سے عالمِ بالا میں جا کر ملے تو دور و نزدیک کے زمانوں سے کئی ایک دوست ان کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ غالبؔ اور میرؔ، حالیؔ، شبلیؔ اور اکبر الٰہ آبادی، حتیٰ کہ نظیریؔ، رومیؔ اور حافظؔ بھی۔ چنانچہ گفتگو روانی سے ہونے لگی۔ کچھ لمحے گرمگو کی حالت میں بھی گزرے۔ مثلاً جب خودی کے مسئلے پر ایک عالمانہ بحث رومیؔ اور اقبالؔ کے درمیان شروع ہوئی تو باقی لوگ اونگھنے لگے اور 'وقت برائم' پر اقبالؔ کی تنہا کلامی کے دوران میں تو غالبؔ کے خراٹے بھی سنائی دیئے۔ مگر مجموعی طور پر یہ صحبت بے حد سازگار رہی۔ جانے پہچانے اقتباسات، کتابوں سے یا حافظے سے بآوازِ بلند پڑھے گئے اور شب و روز کی بے زماں لہروں پر حکمت اور ظرافت کا ملاپ ہوتا رہا۔ بہت سے قضیے سامنے آئے اور اُن میں سے کئی ایک حل نہ ہو سکے۔ اس کے باوجود

نئی طبیعت کے تازہ اور فرحت بخش [illegible] خیالات و روایات ہوتے۔ اقبال تک یہ رسم رہی ہے۔ تب تو ہم تماشا لے لیتے اپنے دور سے لیکن بس ذرا سننے کو رہ بھی سکتے تھے۔

آج کا نوجوان اُردو ادیب، اگر ہم کو اس سفر پر وقت سے پہلے روانہ ہونا پڑے، اس محفل میں شامل ہونا ہے تو مجھے یقین ہے کہ اس کا استقبال محبت اور شفقت سے کیا جائے گا مگر یہ خود بھی اپنے کردار کو کھو نہیں سکتا۔ قدما سے اطمینان حاصل کرنے کے لئے سامان موجود تھا۔ سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ ان کے پیش رو اور ان کے درمیان ایک بہت گہری خلیج حائل ہو گئی ہے کہ جسے پاٹنے کے لئے ان کو کتب سامراج دوسری یورپی ادبیات کا سہارا لینا پڑ رہا ہے۔ وہ حالات کی مجبوری سے اپنے اجداد کا سرمایہ ورثہ وصول نہیں کر سکا۔ [illegible] ماضی کے [illegible] سے بہت پیچھے ہیں اگرچہ مضمون نویسی لطف سے بہت دور ہے ساتھ ہی اپنے آپ کو حال یا مستقبل کے ساتھ وابستہ رکھا ہے۔ ساتھ ہی چونکہ ہونی تو ادبی تہذیب سے تعلق رکھتے ہیں اور سلف کی [illegible] جو [illegible] جواب پیدا ہوتا ہے لکھنے والوں کی اکثریت اپنے آپ روایت سے دور ہوتی جاتی ہے۔ مولوی نذیر احمد جو آج سے پچاس برس پہلے کے ناول نگار تھے، دنیا کے ادبا کو احترام کے ساتھ اور شعرا کے اقوال کو کراہت کے ساتھ نقل کرتے تھے۔ آج کا دہلی والا ادبا کو کراہت اور شعرا کو لذت کے ساتھ نقل کرتا ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ مصنف اور اس کے کردار دونوں میں حوالہ دینے کی اہلیت تھی۔ دونوں نے ادب کی ایک مشترک دولت ورثے میں پائی تھی جو اس دور کے ذہن اور حافظے میں [illegible] کے ساتھ موجود تھی۔ آج کے ناول نگار اور اس کے ہیرو میں کوئی بات مشترک ہے تو یہ کہ دونوں کوئی قول نقل نہیں کر سکتے۔ یہ نہیں کہ وہ پڑھتے نہیں۔ وہ ہر قسم کا ادب پڑھتے ہیں مگر ولایتی ناشروں کی چھاپی ہوئی ہمارے لئے ولایتی ادیبوں کی تصنیف اور ترجمہ [illegible] سلسلے کے ساتھ چلے آتے ہیں کہ نہ چھپنا اور چھپنے کی رسم اور معانی سے نہ کسی چیز کو دوبارہ پڑھنے کی۔ بنیادی ادب کا نصاب بھی لکھا ہوا ہے اور پیچھے مڑ کے دیکھنے کی تحریک ہی پیدا نہیں ہوتی۔ ہمارے زمانے نے اُردو ادب کا مستقبل تو بنا ہو، ماضی کوئی نہیں۔

اس قطع تعلق کی وجوہات گونا گوں اور پیچیدہ ہیں۔ اوپری نظر سے دیکھیں تو یہ خیال ہوتا ہے کہ ہمارے ادیب جس نظام تعلیم کے تحت تربیت پاتے ہیں یہ سب اسی کا قصور ہے۔ رسمی تعلیم پچھلے پچاس ایک سال میں مشرقیات اور ادبیات کے اس قدیم تصور سے دور ہٹ گئی ہے جو طالب علم کو اس دنیا اور دنیا کے لئے انبیا و شعرا کی مناسب مقدار کی مدد سے تیار کرتا تھا۔ پرانے مسلمات غائب ہو چکے ہیں اور اس کے ساتھ انبیا و شعرا بھی۔ یہی ایک کارنامہ ہے جو ہمارے نظام تعلیم نے سرانجام دیا ہے۔ باقی اس عرصے میں ہماری تعلیم ایک نئے تصور کی تلاش میں جو پرانے تصور کی جگہ لے سکے، تجربوں یا ناکام کوششوں کا ایک سلسلہ ہے اور یہ ناکام کوششیں اب بھی جاری ہیں۔

مگر یہ خیال پوری طرح صحیح نہیں۔ بنیادی وجوہ اس سے کہیں زیادہ گہری ہیں۔ دنیا بڑی تیزی سے بدل رہی ہے۔ اور لکھنے والا بھی نئی نسل کی طرح اس بڑھتے ہوئے پھیلاؤ کو محسوس کرتا ہے۔ اس نصف صدی میں بہت سے بند اور پشتے ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں۔ روایتی اقدار جو معاشرے کو بقا اور استحکام بخشتی تھیں، اسی وقت تک کارآمد تھیں جب تک معاشرے کا ناک نقشہ درست تھا۔ ناک نقشہ پھیل پھیل کر یوں منتشر ہو گیا ہے۔ جیسے پانی کی سطح پر تیل کے لہریے۔ قدیم معاشرے سے اس کا کوئی ربط نہیں کیونکہ قدیم

معاشرہ باقی نہیں رہا۔ وہ اپنے آپ کو ایک نئے اور ہر لحظہ بدلتے ہوئے معاشرے میں گھرا ہوا دیکھتا ہے جس سے مربوط ہونا اس کے لئے لازم ہے۔ اگر وہ بالکل ہی کٹ کے رہ جانا نہیں چاہتا۔ وہ پوری طرح اس کا شعور نہیں رکھتا مگر یہ بات اس کو معلوم ہو چکی ہے کہ پچھلی نسل نے اس کو کچھ نہیں دیا۔ نئی دنیا میں کوئی مناسب مقام اس کو حاصل کرنا ہے۔ ماضی کی کئی چیزیں اس کو ایسا کرنے سے روکتی ہیں اور وہ ماضی مردہ باد کا نعرہ لگاتا ہے۔ اس لئے نئی پود کا سب سے بڑا تقاضا بغاوت ہے، رسم و رواج کے خلاف، قوت اور اختیار کے خلاف، والدین اور پولیس کے خلاف۔ وہ قدیم انبیا اور شعرا دونوں سے دور بھاگتا ہے بلکہ ہر اس چیز سے جو اُسے ماضی کی یاد دلائے۔ یہ جنگ کبھی کبھار دھندلی اور غیر واضح سی ہو جاتی ہے اور پرکار کے نقطے آپس میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ مگر خیر ایسا تو ہر جنگ میں ہوتا ہے۔

اردو ادیب کو اپنے ماضی سے قطع تعلق کر کے کچھ کم ایک بڑی قربانی تو دینی پڑی ہے۔ وہ بیک جنبش قلم الفاظ و تلمیحات اور حکایات و علائم کے ذخیرے سے، جو فن کار مصنف کو نازک اور کارآمد ترین آلات اظہار بخشتا ہے، محروم ہو گیا ہے۔ لفظ محض چند آوازوں اور لکیروں کا نام نہیں جو مٹ جانے کے بعد پھر پیدا کی جا سکیں۔ ان میں ہمارے پیشروؤں کی جذباتی وارداتیں اور نفسیاتی مشاہدات مضمر ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک، انسانی تجربے کے طیف میں ایک خط کا حکم رکھتا ہے۔ اگر طیف کا ایک خط گم ہو جائے تو ہم اُس کی جگہ دوسرا خط نہیں کھینچ سکتے۔ اُس پہلے خط کو پھر سے دریافت کرنا پڑے گا۔ آج کے لکھنے والے کو اس وجہ سے نئی چیزوں کو نئے نام دینے ہیں۔ اُسے اُن چیزوں کو جو پہلے معلوم و محسوس تھیں پھر سے جاننا اور پہچاننا ہے۔ ماضی سے دست بردار ہو کر اُس نے اپنی تخلیقی شخصیت پر نایاب بوجھ ڈال دیا ہے جس سے اس کی فنی مشکلات دوچند ہو گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس کو بیک وقت نازک اور اکھڑ، واضح اور دھندلا، گو مگو میں گرفتار اور ہزار معنوں میں مضطرب دیکھتے ہیں۔ نقاد جن سے اُس نے پہلو تہی برتی تھی اب اس سے پہلو چراتے ہیں۔ مسٹر ڈینی سن روس نے، جو اس بات سے واقف تھے کہ زندہ زبانوں میں تلمیحات اور حوالوں کا ایک ذخیرہ مخفی ہوتا ہے جسے تعلیم یافتہ افراد اپنا کر اپنی تحریر و تقریر میں رنگ اور زور پیدا کرتے ہیں، چند سال پہلے ایک کتاب کی صورت میں انگریزی زبان کے پس منظر کا نقشہ کھینچا تھا۔ ادبی حوالوں کے زیر عنوان انھوں نے بائبل کے مستند ترجمے کا، شیکسپیئر کا اور بچوں کے گیتوں کا تذکرہ کیا تھا اور "انگریزی روایت" کے تحت قومی تہوار، معروف شخصیتوں کے القاب و خطابات اور مشہور اشتہارات گنائے تھے۔ حتیٰ کہ ایک جز "گھسے پٹے جملوں" پر بھی لکھا تھا۔ آج سے پچاس برس پہلے، اسی انداز سے، اردو کا ناک نقشہ کتنی آسانی سے بیان ہو سکتا تھا اور آج یہ کام کتنا مشکل ہے!

اردو ادیب کو یہی ایک مشکل درپیش نہیں۔ وہ دو زبانیں پڑھتا اور بولتا ہے اور جب یہ دو زبانیں اردو اور انگریزی کا سا وسیع اختلاف رکھتی ہوں تو یہ خوبی کتنی بڑی خرابی بن جاتی ہے۔ علما اور ماہرین تعلیم تاریخ اور تجربے کی مدد سے کئی ایک ناقابل تردید دلائل پیش کر کے ارشاد کریں گے کہ دو زبانوں کی مہارت بہت بڑی نعمت ہے۔ بین الاقوامیت کے قائل یہ کہیں گے کہ یہ بیرونی زبان دوگونہ رحمت ہے، اس ملک کے لئے جس کی وہ زبان ہے، اور اس کے لئے بھی جس نے اُسے اختیار کیا۔ ان کا ارشاد بجا ہے کیونکہ ہر نئی زبان ذہن میں ایک نیا دریچہ کھول دیتی ہے اور کون ہے جو روشنی کو پسند نہیں کرتا۔ انسانوں کی اکثریت کے لیے اس کے اثرات خوشگوار ہوں گے مگر افسوس کہ لکھنے والے کو اپنا دماغ ہی روشن نہیں کرنا، کچھ کام بھی کرنا ہے اظہار خیال

ان کا فرض ہے اور اس خطرہ یہ کہ ایک وقت میں ایک ہی زبان کے ہو رہیے۔ جیسے [illegible] زبانوں سے [illegible] عمل کی جو روش تو اس کے پاس ایک ہی ہے۔ ایک [illegible] ہے تو دوسرا سرخ کا دیتی ہیں [illegible] ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو [illegible] دوسرے [illegible] رہ سکتے۔ [illegible] ایک تیسرے [illegible] میں جو [illegible] کے پاس ذرا زیادہ سبز ہے وہ دوسرے کے پاس ذرا زیادہ سرخ [illegible] تو ان میں پوری طرح سبز ہے اور نہ پوری طرح سرخ۔ یہ [illegible] روشنی اس کے لیے باعث نشاط بھی ہو سکتی ہے اور باعث خیر بھی۔ مگر اس ملی جلی روشنی کو سبز یا سرخ [illegible] سے اپنے اصلی رنگ میں کرنا کتنا مشکل ہوگا۔ اس لحاظ سے یہ کہنا درست ہے کہ دو زبانی ادیب اپنے دل کی بات [illegible] نہیں کہہ سکتا جب تک کہ دونوں زبانیں استعمال نہ کرے۔ [illegible] اس صورت میں بھی ایک [illegible] ہے۔ اس کا [illegible] کسی واضح شکل میں ہمارے سامنے نہیں آتا بلکہ [illegible] کی [illegible] جیسے جو کچھ سوا ابھرتی ڈوبتی دکھائی دیتی ہیں۔ اگر اس کو ایک زبان میں بند کر دیا جائے [illegible] پوری بات کہنے کی مجبوری بھی [illegible] واضح اور بے ربط قسم کی گفتگو سننے میں آئے گی۔ اس کی تحریر [illegible] آپ کو عجیب قسم کے [illegible] نظر آئیں گے اور [illegible] کی کئی صورتیں ملیں گی اور [illegible] سے بڑھ کر انگریزی ساخت کے جملے جو [illegible] اردو میں [illegible] جن کو دونوں زبانوں کے ماہر ہی سمجھ سکیں گے۔ زبان ایک نازک اور لطیف ذریعۂ اظہار ہے جسے فن کار [illegible] مہارت سے برتتا ہے۔ مگر یہ دوغلی زبان محض نئے گرد طواف کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی اور [illegible] اشاروں سے زیادہ [illegible] نہیں ہوتی۔ لفظ اپنے معنوں کو ساتھ لے کے نہیں چلتے بلکہ محض دور سے ان کی طرف اشارہ کر کے رہ جاتے ہیں۔ جب [illegible] شکست [illegible] ہو جاتا ہے تو [illegible] ادیب اردو کو چھوڑ کے انگریزی میں لکھنے لگ جاتا ہے۔ [illegible] سبز ہو یا سرخ، مسئلہ جوں کا توں رہتا ہے

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ ہمارا ادیب [illegible] ایک نئے معاشرے میں ابھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ [illegible] اس کے نقوش کی حدوں سے بڑھ کر وسیع اور پیچیدہ [illegible] ہوتا چلا جاتا ہے [illegible] ایسا معاشرہ [illegible] کے افراد کے تجربات [illegible] ہے [illegible] اور اسی وسیع اور پیچیدہ حقیقت سے اس کو موافقت پیدا کرنی ہے تاکہ تکمیل اور استحکام حاصل ہو۔ جب تک یہ موافقت پوری نہیں ہوتی وہ بڑے پرجوش اضطراب کے ساتھ کسی نہ کسی طرز کی محفل بنا کے بیٹھ جاتے ہیں۔ اسی اضطراب کی وجہ سے اس زمانے کے اکثر ادیب کسی نہ کسی انجمن یا حلقے سے وابستہ ہو گئے ہیں اور ایک دوسرے کی تصانیف پر دیباچے اور پیش لفظ لکھتے رہتے ہیں۔ آج سے پہلے شاید ہی کبھی ہمارے ادیبوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑنے، محفلیں، انجمنیں اور حلقے بنانے کی ضرورت محسوس کی ہو۔ یہ ادارے کتنی ہی سنجیدگی اور خلوص سے کیوں نہ وجود میں آئے ہوں، معاشرہ سازی کی جبلی اور محزونانہ کوششوں کا نتیجہ ہیں اور ادیب کو ان اداکاریوں اور ریاضتوں کی قیمت اپنے تخلیقی جوہر سے ادا کرنی پڑتی ہے۔ ان غیر واضح قسم کی حرکتوں سے اس کا مدعا یہ ہے کہ زندگی کے "کل" کو پالے اور چونکہ بیرونِ خانہ سے اس کا رابطہ قائم نہیں ہوا۔ اس کو درونِ خانہ میں تلاش و تجسس سے کام لینا پڑتا ہے۔ مگر اس تلاش کے دوران میں زندگی کا کاروبار ملتوی ہوتا رہتا ہے اور جب تک کوئی زرخیز زمین ملے۔ زندگی کا رس خشک ہو جاتا ہے۔

پی۔ ای۔ این کی سترھویں سالانہ مجلس میں تقریر کرتے ہوئے آرتھر کیسلر نے بتایا تھا کہ تورگنیف کیسے لکھتا تھا۔ اپنے پیروں کو گرم پانی کی بالٹی میں ڈالے ہوئے وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھتا رہتا تھا۔ یہ گرم پانی کی بالٹی، کیسلر کے نزدیک الہام یا تخلیقی سرچشمے سے عبارت تھی اور کھلی کھڑکی سے مراد باہر کی دنیا تھی۔ جو فن کار کے لیے خام مواد کا کام دیتی ہے۔ کیسلر نے

یہ بھی کہ تقاضائے ماہر فن دریا اور ساحل کے دل میں ایک [illegible] احساس کو جنم دیتی ہے یعنی یہ کہ وہ لکڑی [illegible] کے بچ جائے اور اپنے علم پر اکتفا کرے مگر اس کے علاوہ بھی ایک خواہش [illegible] رہتی ہے۔ ماہر کی [illegible] کے بجائے اس کو ماہر ہی کھینچ سکتی ہے تا پانی سے ایسے پیر نکال کر لکڑی پر جھپٹ جائے۔

ہمارے اردو ادب کو بار [illegible] لے واقعات کچھ [illegible] مشاہدہ اور مراقبہ [illegible] کہ [illegible] شدت [illegible] کوئی پرانا [illegible] بیشتر لوگوں [illegible] دیکھ کر [illegible] جاتے۔ [illegible] اس سے [illegible] ہوتا ہے کہ وہ پیچھے چلنے [illegible] نہیں ہو سکتا۔ وہ چلتے [illegible] میں آتا اور گرم پانی [illegible] ٹھنڈا ہو جاتا ہے [illegible] کے سامنے ایک [illegible] دنیا [illegible] پیچھے دیکھنے کے لیے بے شمار [illegible] اور پہچاننے کے لئے [illegible] ہے [illegible] جانب [illegible] غلطی [illegible] ہے جاتے اور یہ [illegible] عجیب ہے کہ وہ اپنے پیر گرم پانی [illegible] ڈالے رکھے [illegible] شامل نہیں ہو گا [illegible] ساتھیوں کو اس کے بیان [illegible] دیکھے اور مستقبل [illegible] کی سمت [illegible] اصطلاحاً [illegible] کے ساتھ [illegible] اس کی [illegible] فطرت [illegible] اور [illegible] ہے [illegible] خراج تحسین [illegible] کی مشکلات [illegible] اس کی جدوجہد [illegible] قدر [illegible] میں نے اس [illegible] کی کوشش

کچھ عصمت چغتائی کے بارے میں

عصمت چغتائی کے افسانہ میں ایک لڑکی دوسری کے متعلق کہتی ہے کہ: "سیدہ موٹی تھی تو کیا، مگر وہ تو صحت سے زیادہ کچی بے چاری۔ لوگ جسم دیکھتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے جی کیسا ہر وقت خراب رہتا ہے۔" جب میں نے عصمت کی کلیاں اور چوٹیں دونوں مجموعے ختم کر لیے، اور جو چند دیباچے اور مضامین ان کے مداحین اور معترضین نے ان پر ازرو تنقید و تعارف لکھے ہیں ان سے سیراب ہو چکا، تو استعجاب کے رنگ میں یہ فقرہ پھر یاد آیا: "لوگ جسم دیکھتے ہیں، یہ نہیں دیکھتے جی کیسا ہر وقت خراب رہتا ہے۔"

اس فقرے کے معانی کو کھینچ تان کر پھیلائیے اور اس پر تھوڑا سا فلسفیانہ رنگ چڑھا دیجیے، تو عصمت کے بعض کمالات اور نقادوں کی بعض کوتاہیوں کا بیان بننے کا اچھا خاصا سامان ہو جاتا ہے۔ دماغ ذہن کا ہے، دل کی حالت کی، اور معروف اور متداول لیبلوں کا ہے جو مستعمل الفاظ اور کلمات مستعارہ کی شکل میں قسم قسم کی تیار بیٹھے چلے آتے ہیں۔ ذہن کی کاہلت اور خوف، دماغ و دل کے مارے ہم اکثر فیصلے لیبلوں ہی کو دیکھ کر صادر کر دیتے ہیں، یہاں سے آگے کل اصل چیز کو جانچنے اور پرکھنے کی ہمت چپکے آپ میں نہیں پاتے۔ مثلاً اور عشق پر دل گدازی کا لیبل مدت سے لگا ہوا ہے، اس لیے جہاں ان کا ذکر آئے پڑھنے والے دل ہی دل میں ایک پاکیزہ رقت کے لیے پہلے ہی سے تیار ہو بیٹھتے ہیں۔ جنسی مشاغل تحقیر کی پستی کی طرف لے جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کا بیان ہو کراہت یا اخلاقی قباحت بنے تو یہ لوگ برہم ہو جاتے ہیں۔ بہن بھائیوں کا سایا پیار رہنا چاہئے، گویا محبت کا سب سے اونچا درجہ ہے، لہٰذا بہن بھائی کے رشتے میں اس جذبۂ عالیہ کے سوا اور تعلق کی گنجائش ناممکن یا کم از کم نامناسب سمجھی جاتی ہے۔ عصمت چغتائی کے رسالے بھی اور عادات بھی ایسے ہی لکھے ہوتے تو ادب ان کی بہترین انشا سے محروم رہتا لیکن ان کی بصیرت اس سے کہیں زیادہ دور رس ہے۔ وہ لیبلوں کے فریب میں نہیں آتیں اور جسم اور دل اور دماغ کی کیفیتیں جیسی ہیں، جن سے وہ دیکھتی ہیں دوچار ہوتے نہیں گھبراتیں۔ ایسے انشا پرداز کا بغیر جرأت مشاہدہ، دقت نظر اور جرأت بیان کے گزارہ نہیں۔ اور یہ ادب کی خوش قسمتی ہے کہ عصمت کو یہ تینوں نعمتیں میسر ہیں۔

برخلاف اس کے احساس ہمدردی کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس جرأت اور دقت نظر میں سے عصمت کے نقادوں کو حصہ وافر نہیں ملا۔ ان کا حال، ان کا ذکر جانے دیجیے، جن کو عصمت کی تحریروں میں اپنے اخلاق اور ادب دونوں کی تباہی نظر آتی ہے۔ وہ تو ان لوگوں میں سے ہیں جن کے لیبل گوند سے چپکے ہوئے نہیں، سینوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ جنہوں نے ذہنوں میں ایک موٹی موٹی لکیروں والی جدول بنا رکھی ہے کہ ان چیزوں کا ذکر حلال ہے، ان کا حرام ہے۔ نامحرم کا ذکر ہم مقرر کر چکے ہیں کہ فحش ہے۔ محرم کا ذکر معاملہ بندی ہے یعنی جائز ہے۔ حرام کا کچھ قدرت کو منظور ہے تو ہوا کرے، ہمارے ادب کو منظور نہیں۔ اور یہ نفاست کا مطالبہ؟ محض ایک ڈھونگ! آوارہ مزاجی کا عذر آوارگی! ہمیں بچپن میں مطالعہ پر کوئی مجبور نہ کر سکا تو اب کسی کی

کیا حال ہے؟ ہم جب بھی کھلونوں سے دل بہلاتے تھے اب بھی کھلونوں سے دل بہلائیں گے ..... ایسے لوگوں سے اس وقت بحث نہیں کیونکہ ــ

وہ وہاں ہیں جہاں سے ان کو بھی
کوئی ان کی خبر نہیں آتی

شکایت ان سے ہے ــــ اور ایسوں کی شکایت ہے، بیگانوں کی سی نہیں ــــ جو عصمت چغتائی کے قدردان اور مداح ہیں۔ ان کے مضامین کو پڑھ کر روح میں ایک مایہ کی محسوس کرتے ہیں جس سے دل میں اُمنگیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور نئی راہیں کھلتی ہیں۔ قدرشناس کرتے ہیں، پھر کر پہلوؤں کے چکر میں پھنس جاتے ہیں۔ افسوس کہ عصمت پر وہ نہیں اور افسوس کہ پہلوؤں میں سے سب سے بڑا اور گراں پہلو عورت ہے۔ مرد ذات کے قرآن کے خرابوں اور محرومیوں سے چھپا ہوا۔ عورت وہ ہے جو ہے، صنف نازک ہے، ایک معمہ ہے، کمزور ہے، کم عقل ہے، مجموعۂ اضداد ہے ..... جہاں آپ نے عورت کا نام لیا، ان میں سے دو چار گھڑے گھڑائے معنی ذہن ان کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ چنانچہ اسی فریب میں آ کر ایک صاحب اور دیباچہ نویس فرماتے ہیں:۔

> "عصمت کے افسانے گویا عورت کے دل کی طرح پُرپیچ اور دشوار گزار نظر آتے ہیں۔ میں شاعری نہیں کر رہا اور اگر اس بات میں شاعری ہے تو اسی حد تک جہاں تک شاعری کو سچی بات میں دخل ہوتا ہے۔ مجھے یہ افسانے اس جوہر سے متشابہ معلوم ہوتے ہیں جو عورت میں ہے۔ اس کی روح میں ہے۔ اس کے دل میں ہے۔ اس کے ظاہر میں ہے۔ اس کے باطن میں ہے۔"

اب نہ معلوم اس نوجوان نقاد کے تصور نے عورت کا ہیولیٰ کس قسم کی چیزوں پر کھڑا کیا ہے۔ یہ معلوم ہوتا تو وہ جوہر بھی کھلتا جو بقول ان کے عصمت کے افسانوں میں ہے لیکن ان کے رنگین تصورات و مفروضات کے خلوت کدہ میں ہمیں کیونکر باریابی ہو سکتی ہے اور کوئی ایسی ڈکشنری بھی نہیں جس میں عورت کے وہ معنی مل جائیں جو اس تنقید کی تہ میں کام کر رہے ہیں۔ دیباچے کا مقطع ہے:۔

> "عصمت کا نام آتے ہی مرد افسانہ نگاروں کو دورے پڑنے لگتے ہیں۔ شرمندہ ہو رہے ہیں آپ ہی آپ خفیف ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ دیباچہ بھی اسی خفت کو مٹانے کا ایک نتیجہ ہے۔"

لیجئے۔ عورت کے ایک دوسرے تصور سے پھر میرے عزیز کی ناقدانہ نظر بہک گئی۔ دکھانے تو چلے تھے عصمت کے افسانوں کا جوہر لیکن آخر میں کہہ گئے کہ یہ عورت ناقص العقل جانور ہے ڈاکٹر جانسن کے کتے کی طرح کہ دو ٹانگوں کے بل کھڑا ہو جائے تو تعجب و تحسین ہی کا نہیں بلکہ ہم انسانوں (یعنی مردوں) کے لئے شرم و ندامت کا موجب ہے۔

ایک اور مقتدر و پختہ کار دیباچہ نویس نے بھی معلوم ہوتا ہے انشا پردازوں کے ریوڑ میں نر اور مادہ الگ الگ کر رکھے ہیں عصمت کے متعلق فرماتے ہیں کہ "اپنی جنس کے اعتبار سے اردو میں کم و بیش انہیں وہی مرتبہ حاصل ہے جو ایک زمانہ میں انگریزی ادب میں جارج ایلیٹ کو نصیب ہوا۔" گویا ادب بھی کوئی ٹینس کا ٹورنامنٹ ہے جس میں عورتوں اور مردوں کے میچ علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔ جارج ایلیٹ کا رتبہ مسلم، لیکن لیں اس کا نام لے دینے سے تنک ہی طلا اور بوجھوں تو کوئی کیا مرے گا۔ اب یہ امر ایک علیحدہ بحث کا محتاج ہے کہ کیا کوئی مابہ الامتیاز ایسا ہے ــــ خارجی اور ہنگامی اور اتفاقی نہیں، بلکہ داخلی اور جبلی اور بنیادی۔ جو انشا پرداز عورتوں کے ادب کو انشا پرداز مردوں کے ادب سے ممیز کرتا ہے اور اگر ہے تو وہ کیا ہے؟ ان سوالوں کا جواب کچھ بھی ہو، بہرحال اس نوع کا ہرگز نہیں کہ اس کی بنا پر مصنفین کو "جنس کے اعتبار سے" الگ الگ قطاروں میں کھڑا کر دیا جائے۔

اسی طرح جہاں کسی نسبتاً نئے موضوع کو بار بار دہرایا [illegible] یا کسی مخصوص جنسی [illegible] وہ فوراً [illegible] رکھنے والے نقادوں نے عصمت کا [illegible] سماج کی [illegible] ہوتی ہے۔ اس وجہ سے دیکھئے تو عصمت [illegible] پچھلے افسانوں میں ماحول محض اس لئے [illegible] بغیر [illegible] ہو گئے [illegible] کا [illegible] ہونے میں کوئی کوشش [illegible] ہوگا پھر اس لئے بھی کچھ چارہ نہیں [illegible] ماحول [illegible] متوسط طبقہ کا ماحول ہے [illegible] اس کا مطلب تو نہیں کہ یہ ماحول جن معاشی اسباب [illegible] سے پیدا ہوا [illegible] رکھے جاتے ہیں۔

عصمت نے بعض [illegible] سماج کو نیا نقشہ بنانے کی کوشش کی ہے ان کا [illegible] یہ ہے کہ سماج کی [illegible] سے عورت کا [illegible] جہاں [illegible] عصمت نے [illegible] لیکن کچھ کام [illegible] لینے چاہئیں [illegible] کی پیٹھ میں [illegible] خیال چھوڑ دیتی ہے۔ عصمت [illegible] حقیقت [illegible] ہے۔ ان کی [illegible] اور [illegible] کشمکش اور [illegible] کا [illegible] ان کا [illegible] ہوتی ہیں۔ توجہ [illegible] احساس میں [illegible] جنسیت [illegible] ہے کہ عصمت [illegible] کیا جائے [illegible] ایک خاص [illegible] کشمکش کی [illegible] نہیں [illegible] عصمت جیسے [illegible] اس صدی کے اوائل [illegible] مختلف چیزیں ہیں۔ اس بات کا مطالعہ کرنا [illegible] عصمت [illegible] سماج کی [illegible] عصمت [illegible] یقیناً کشش [illegible] نہیں رکھا جا سکتا۔ [illegible] سمجھنے میں [illegible] ہوتی ہے۔

عصمت کے دونوں مجموعوں میں ڈرامے، افسانے اور اسکیچ تینوں قسم کی چیزیں شامل ہیں۔ ان میں ڈرامے سب سے کمزور ہیں۔ [illegible] کی وجہ میں اوّل تو یہ کہ ڈرامے کی ٹیکنیک عصمت کے قابو میں نہیں آئی۔ یا یہ کہیے کہ ابھی تک ان کو اس پر قدرت حاصل نہیں ہوئی۔ پلاٹ کو مناسب ترتیب [illegible] تو [illegible] سے سنیں [illegible]۔ یونہی باتوں سے [illegible] چھوٹے [illegible] بنا ڈالتی ہیں چنانچہ پیوند جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔ کوئی سین جب پھیلتا ہے تو [illegible] بغیر کسی خاتمے کے ختم ہو جاتا ہے جیسے گاڑی دو اسٹیشنوں کے درمیان کہیں بھی رک جائے۔ [illegible] سے کیا حاصل، [illegible] تو کیا مضائقہ ہے۔ ڈرامے کو ڈرامہ نہ سمجھئے، کہانی سمجھ کر پڑھئے اور محسوس کیجیے کہ کہانی نے ڈرامے کا لباس کسی ضرورت سے نہیں بلکہ محض تنوع کی خاطر پہن رکھا ہے۔ لیکن افسوس کہ رواداری سے بھی مشکل حل نہیں ہوتی۔ کہانی کو ڈرامے کی شکل دی جائے تو ایک جبر اپنے اوپر ضرور کرنا پڑتا ہے اور وہ یہ کہ شروع سے آخر تک مع اپنے نشیب و فراز کے تمام تر افراد قصہ ہی کے اقوال و افعال کے ذریعے بیان کرنا پڑتا ہے۔ مصنف سے یہ آزادی چھن جاتی ہے کہ ساتھ ساتھ کرداروں کے جذبات و خیالات کو اپنی زبان سے واضح کرتا جائے۔ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ پابندی عصمت کے بس کا روگ نہیں۔ افسانہ ہو تو عصمت کو کسی [illegible] یا تبصرے کے واضح کہنے میں دقت پیش نہیں آتی۔ انہیں افسانہ نویس کے اس حق سے فائدہ اٹھانا خوب آتا ہے کہ جب چاہا کردار کے

کچھ کھلوا لیا۔ جب چاہا خود لپک کر لیا۔ لیکن جب ایک ذرا سی ضد ہو اور سب کچھ کیریکٹروں ہی کو کہنا ہو تو عصمت [illegible] ہیں۔ رومانی مجادلوں میں گھر کر ان کا مطلب اکثر فوت ہو جاتا ہے [illegible] جب [illegible] کی سمجھ میں آتے ہیں اور ان میں اس [illegible] کا نام و نشان تک نظر نہیں آتا۔ جو ان کے افسانوں کے مکالموں میں اکثر پایا جاتا ہے (بعض [illegible] میں کس غضب کی چستی اور چلبلا پن ہے) بعض اوقات تو مکالمہ کچھ ایسا بے جوڑ ہو جاتا ہے کہ یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ [illegible] پیش کیا جا رہا ہے [illegible] انتخاب [illegible] صفات پیشتر [illegible] بہت کچھ وضاحت کے محتاج ہیں۔ یہ نقص ان کے افسانوں [illegible] میں بھی [illegible] ہے۔ ڈرامہ نویس کو اتنا وقت نہیں کہ وہ سیدھے منہ سے بات کرے۔ باقی رہے کیریکٹر سو وہ آپس میں ابھی بھی گفتگو کرتے [illegible] ہیں۔ ڈرامہ [illegible] سے کچھ نہیں پڑنے دیتے۔ ڈرامہ نویس عدم تعاون پر مصر رہتے اور کیریکٹروں کو تعاون کا سلیقہ نہیں۔ ان حالات میں [illegible] کیا ہو؟ پھر [illegible] میری سمجھ میں آئے ہیں۔ عصمت کی کوشش یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ چند اشخاص نہیں چند ٹائپ پیش کر رہی ہیں۔ ہر شخص ایک طبقہ کا نمائندہ [illegible] اشخاص کا ادراک نہیں [illegible] احساس ہو جائے۔ [illegible] ہیں جو اشخاص ہیں ہے تو پھر نہ معلوم انہوں نے یہ [illegible] کیوں مول لی!

علاوہ ان سب باتوں کے ان ڈراموں کی کمزوری کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان میں عصمت نے جس قسم کے لوگوں کا نقشہ کھینچا ہے۔ ان سے وہ طبعاً تعلق نہیں رکھتیں۔ یعنی [illegible] لوگ تو عصمت تعلیم یافتہ میں [illegible] کی ترکیب میں تعصب کم اور [illegible] زیادہ ہوتا ہے۔ یہ خوش حالی بے حسی، انحطاط اور اپنے [illegible] کے بل پر پہنچنے [illegible] اور اپنی [illegible] کی بدولت وہ [illegible] کہلاتے ہیں۔ [illegible] لوگ کچھ ان سے نفرت کچھ ان [illegible] کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے [illegible] عصمت کو فقط آتا ہے جس کو [illegible] جانتی ہیں۔ [illegible] لیکن یہ بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس اونچے طبقہ کو انہوں نے دور ہی سے دیکھا ہے۔ قریب [illegible] کا موقع نہیں ملا کہ اس [illegible] اور اس کے خوب و زشت اور ظاہر و باطن کا وہ اچھی طرح موازنہ کر سکتیں۔ چنانچہ جب عصمت اس قسم کے کیریکٹروں یا اس کے ماحول کی تصویر کھینچتی ہیں تو زلف بلک کبھی درست نہیں ہوتی۔ چھوکری، [illegible] [illegible] جمع کر کے ایک [illegible] سا بنا لیتی ہیں۔ مگر ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس ساز و سامان سے [illegible] باندھا جائے اور پھر ان چیزوں کے ساتھ [illegible] چلی ہیں کہ ان کی سادگی پر رشک آتا ہے۔

کیریکٹروں کی گفتگو اور حرکتیں بھی اس قسم کی ہوتی ہیں کہ جب عصمت [illegible]۔ ایک تصنع تو ان میں [illegible] ہے جس کا مصنف کو علم ہے لیکن ایک تصنع ان میں ایسا بھی آ جاتا ہے جس سے مصنف خود بے خبر ہے۔ اور جو در اصل اس کے اپنے تصنع کا عکس ہے یعنی کیریکٹروں کی سطحیت کو بے نقاب کرنا ہی تھا اپنی سطحیت کی ساتھ بے نقاب ہو رہی ہے۔ ایکٹروں سے پہلے کیریکٹر خود ایکٹ کرتے ہیں۔ بات بات پر اپنی زندگی میں تبدیلی کی سچوایشن (SITUATION) پیدا کر لیتے ہیں اور پھر اس طرح بجتے ہیں کہ ان کے تو خیر خود ڈرامہ نویس کے حسن مذاق پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ "سانپ" میں عصمت نے چند ایسی عورتیں دکھانے کی کوشش کی ہے جو بزعم مصنف "شکاری عورتیں" ہیں یعنی وہ رنگیں تریا چلتر سے مردوں کے جذبات کے ساتھ کھیلتی ہیں۔ جیسے بلی چوہے سے کھیلتی ہے لیکن ان کی تھکی ہوئی باتیں سنئے اور ان کی اکتا دینے والی خوش فعلیوں کا تماشا کیجئے۔ تو اس نتیجے پر پہنچئے گا کہ کسی چوہے کا شکار تو یہ شاید کر لیں لیکن اس سے زیادہ کی ان بے چاریوں سے [illegible] ہے معلوم ہوتا ہے چند کم عقل چھوکریاں ہیں۔ جنہوں نے کوئی ارزاں قسم کا خوش پوش امریکن فلم دیکھ لیا ہے۔ اور گھر میں اور ایک جگہ صوفے اور کرسیاں سجا کر اس کی نقل اتارنے کی کوشش کر رہی

میں خیال بھی [illegible] نہیں کرتا۔ وہ جو مصنف کی سنہ دیکھا ہو۔ [illegible] کہ ہو رہا ہے معاشرہ اس وقت میں ایسا ہے [illegible] ساتھ سیوڑا دیکھ صاحب کی دو ٹکٹ [illegible] رفیعہ ننھی غفار سے پوچھتی ہے کہ وہ اس سے نہیں غفار سے شادی کرے گی۔ غفار کا اس [illegible] جواب [illegible] ہوتا ہے

رفیعہ۔ میں آپ کی [illegible] کوئی [illegible] نہیں کروں گی

غفار۔ (ذرا سوچ کے) [illegible] نہیں تم میری کوئی بات نہ مانو گی

رفیعہ۔ میں آپ کی سب بات مانوں گی۔ آپ کی ہر بات

غفار۔ (بات ٹالتے ہوئے) بس بالکل ٹھیک ہے [illegible] مجھے تمہاری کبھی کوئی بات بری
سے بھی بات ہوتی۔

خالدہ۔ (رفیعہ کو چھیڑتے ہوئے) [illegible] رفیعہ

غفار۔ [illegible] یا فیصلہ کریں

خالدہ۔ (ہنس کر) رفیعہ تمہیں لے جائے گی۔

رفیعہ۔ ہاں میں آپ سے طلاق لے لوں گی۔۔

(غفار پریشان ہو کر مسکراتا ہے۔)

غفار۔ (مسکرا کر) [illegible] تمہارا یہ مطلب ہے کہ تم مجھے چھوڑ دو گی؟

رفیعہ۔ (گھبرا کے) [illegible] نے بھی ایسا شادی کا سوچ کر دی

غفار۔ (پریشانی سے انگلیاں چٹخا کر) اور عزیز کو بھیجے رشتہ کا دیتے ہیں۔

عزیز۔ غفار، [illegible] تم بہت کہتے ہو کہ اس کا رشتہ [illegible] کہ مجھ سے ہی [illegible] ہم بچ
گئے۔ تم دیکھنا میری وہ گت بنائے گی کہ توبہ ہی بھلی۔

غفار۔ کاش میری بھی وہ گت بن جاتی۔

خالدہ۔ مگر غفار سوچو تو ۔۔

غفار۔ ایک عرصہ ہوا ہمارے بزرگوں نے یہ بات طے کر دی تھی

خالدہ۔ یہ ٹھیک ہے کہ آپا کی خواہش تمہارے بیاہ اور رفیعہ کا معاملہ آن پڑا ہے۔ وہ
ایک ضدی ہے!

غفار۔ (اندوہگیں ہو کر) میں ——— جا رہا ہوں (نہایت اداسی سے) رفیعہ! خدا کرے
تم خوش رہو۔

عصمت اس سین کو ایک سین سمجھ کر لکھتیں تو شاید ڈراموں میں ان کا نام رہتا لیکن افسوس کہ ان کے ہونٹوں پر مجھے مسکراہٹ نظر نہیں آئی۔ اور جب مصنف ہنسانے والی باتیں لکھے اور خود اسے ہنسی کی کوئی بات نظر نہ آئے تو افسوس ہوتا ہے۔

کچھ ایسی ہی بے تکلفی ان ڈراموں سے علاوہ ان افسانوں میں بھی پایا جاتا ہے جن میں مصنف نے ان جدید ناچیکلے رنگوں کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ ایسے افسانوں میں نہ پلاٹ کی چولیں ہی ٹھیک بیٹھتی ہیں نہ زیرِ بحث کا ناک نقشہ ہی درست ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی میگزینوں میں سے کہانیوں کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر جوڑ لیے ہیں۔ اور پیشہ ور افسانہ نویسوں کی طرح رسمی رومان کا رنگ دے کر جھوٹ موٹ ایک بات بنا لی ہے۔ "پنکچر" اور "شادی" پڑھ کر دل پر یہی اثر ہوتا ہے۔ "نیا کھیل" میں تو برنارڈ شا کے "آرمز اینڈ دی مین" کے پہلے سین پر کچھ اس طرح سے ہاتھ صاف کیا ہے کہ شبہ کی گنجائش نہیں۔

"سیلیا اور سیل اور ارغنون" ادب پارٹیوں کی دنیا عورت کی دنیا ہے۔ اس میں وہ عمیق ہوتی ہیں اس کی تہ کو وہ جب پہنچیں گی تب دیکھا جائے گا۔ فی الحال ان کی دنیا وہی ہے جو ان کے بہترین افسانوں یعنی "جوانی"، "ڈائن"، "نیرا"، "بھول بھلیاں"، "ساس"، "بیمار" اور "تل" میں پائی جاتی ہے۔ یہ وہ دنیا ہے جس میں عورتیں پردے کے پیچھے سے دیکھتی رہتی ہیں جس میں زینوں پر اور دیواروں کی آڑ میں آنکھ مچولی کھیلی جاتی ہے۔ جس میں نوابی پلنگ پوش پر پٹیاں رکھی ہیں۔ سمدھیوں کی جوان بہوئیں کمر لچکا کر چلتی ہیں۔ مہ لڑکیاں گویا سینی پھرتی ہیں۔ وہ تکیا میں ڈبکیاں لگاتی ہیں جس میں کلکلے بچے ماں کے پیٹ سے چھپکلی کی طرح چپکے ہوئے چپڑ چپڑ منہ مارتے ہیں۔ اس گردش میں وہ اس بے تکلفی اور احساس ہم آہنگی کے ساتھ گھومتی پھرتی ہیں کہ اسی کا ایک جزو معلوم ہوتی ہیں چنانچہ وہ کس سہولت کے ساتھ دو چار خط کھینچ کر اس دنیا کو کاغذ پر لے آتی ہیں۔ مصنف کے بہترین افسانوں میں آپ کو نقشہ اور ماحول کے لمبے لمبے پر تکلف ڈسکرپشن (DESCRIPTION) کہیں نہیں ملیں گے۔ یہی وجہ ہے وہ ایسے چپکی ہیں کہ اختصار سے تشنگی اور خلا کی شکایت پیدا نہیں ہوتی۔ "ساس" کے شروع کے فقرے ہیں:—

> "سورج کچھ ایسے زاویے پر پہنچ گیا کہ معلوم ہوتا تھا جو سات سورج ہیں جو تاک تاک کر
> بڑھیا کی کوٹھری کی روشنی سیدھے پڑتے ہوئے ہیں۔ تین دفعہ کھٹولی دھوپ کے رخ سے
> گھسیٹی اور اسے پھر پھر پائنتی پر دھوپ اور جو ذرا اونگھنے کی کوشش کی تو دھما دھم قدموں کی
> آواز چھت پر سے آئی۔ "خدا غارت کرے پیاری بیٹیوں کو۔" ساس نے بے حیا بہو کو
> کوسا جو محلے کے چھوکروں کے سنگ چھت پر آنکھ مچولی اور کبڈی اڑا رہی تھی۔ "دنیا میں
> ایسی بہویں ہوں تو کوئی کاہے کو جئے۔ اسے لو دوپہر ہوئی اور لاڈو چڑھ گئیں کوٹھے پر۔ ذرا
> ذرا سے چھوکرے اور چھوکریوں کا دل آ پہنچا۔ پھر کیا مجال ہے جو کوئی آنکھ جھپکا سکے۔"

اتنے مختصر سے الفاظ میں اس سے زیادہ کوئی کیا رنگ بھرے گا اور رنگ بھی ایسے کہ نہ ضرورت سے زیادہ شوخ نہ ضرورت سے زیادہ مدھم۔ یہی حال "نیرا" میں کے ایک ٹکڑے کا ہے۔—

> چھوٹے تال سے گزر کر پیار سے ہوتے ہوئے دونوں ننھے منے بیوپاری شہر کی سڑک پر
> چلنے لگے۔ یہ کم بخت جاڑا آفتاب کے ایسا مانت پیس کر پیچھے پڑا تھا کہ نرم ہونے کا نام ہی
> نہ لیتا تھا۔ گرمی تو جیسے تیسے کٹ جاتی ہے۔ جا ہو جتنا نہاؤ، پیاؤ پر سے ٹھنڈا پانی جتنا
> چاہو پی لو۔ نہ کپڑوں کی ضرورت نہ کچھ۔ رمو کو تو دھوتی کا بھی مرہونِ منت نہ ہونا پڑتا تھا۔
> یا دو سوت کا ڈورا جو اس کے کچری جیسے پیٹ پر سے پھسل کر کولہے کی ہڈیوں پر سے

> سے تنگ جاتا تھا ضرورت سے زیادہ تقاضے سے تنگ میں ڈبکی لگائی، کناروں پر گراں
> بیٹھ گئے اور لڑکے چپا کرنے سے سوکھ گئے۔

اور اس سے بھی مختصر یہ کہ:—

> اندھیری سنسان راتیں بسر تیسے کٹنے لگیں۔ جوانی دنیا بھر ادھار جو مٹھا حاصل کرنے کے لئے
> سارے گھر کا دن بھر ترتیب میرے کھیت میں ستھتے گذر جاتی۔ یہ گھاس چھیل لاتی کھنبوں
> کو بھی دن لئے اور دودھ چرانا شروع کر دیا کرتی۔ بھتا جاتا کو بھی ادھر میں ہی ایک لمبا
> ہو گئی۔ دوسری بیاہنے کا نام ہی نہیں تھی۔ جیسے جب بوڑھی ہو جاتی ہے تو پتہ بھی
> نہیں چلتا۔ نہ اس کی کمر جھکے نہ بال چونڈی ہوں۔

ان اقتباسات میں پانچ پانچ چھ چھ نقطے ایک ساتھ پائے جاتے ہیں۔ میں نے ان کو یہاں نقل بھی کر دیا ورنہ اسی قسم کے ایک ایک دو نقطوں کے کنائے تو کئی جگہ ہیں۔

یہ دنیا بیشتر مفلسوں اور اکھڑوں کی دنیا ہے جہاں امیروں، نفاست پسندوں اور تہذیب یافتہ لوگوں کی دنیا نہیں۔ اس میں قلعے ہیں کلاطین ہیں، اور غلاظتوں کا حال عصمت کتنی بے رحم ہو کر ریشے ریشے کر بیان کرتی ہیں)، جہالتیں ہیں، بدزبانیاں ہیں، بدکاریاں ہیں، بیماریاں ہیں، ڈھیروں بچے ہیں، لیکن پھر بھی ان میں زندگی کا ایک جذبہ ہے جو دبائے نہیں دبتا، امنگیں ابھرتی ہیں، جوانی اپنے جلوے دکھاتی ہے جس میں شرارتیں چٹکیاں لیتی ہیں۔ اور نفس انسانی کا میلان زور آزمائی کرتا ہے جن افسانوں کو میں نے بحث کے لئے منتخب کیا ہے ان میں آپ کو بہت بڑی جنگ یا بہت پُر معنی تہذیبی نظر آئے گی۔ عمیق امن، خاموشی، آسودگی یا مسرت عالیہ کہیں نہ ملے گی نہ دوام۔ دل ہی نہ لگا جو کہ کی دوح دل پر حکم ہوتا ہے اس میں ٹریجیڈی کی کوشش ہے نہ کامیڈی کی، لیکن انسانی خون آپ کو رگوں میں دوڑتا نظر آئے گا۔ اس طرح دوڑتا ہوا جیسے پہاڑی ندی کا پانی دوڑتا ہے، لبالب اور ابلتا ہوا اور ٹکراتا ہوا اور رستہ چیرتا ہوا۔

ان افسانوں کا موضوع کیا ہے؟ اگلے وقتوں کے لوگ ان افسانوں کو (اگر ایسے افسانے انہیں ہاتھ آتے تو) عشقیہ افسانے یا عشقیہ افسانے ہی سمجھتے لیکن عشق کے معنی اس قدر پھیل چکے ہیں کہ عشقیہ سے یہاں کام نہ چلے گا۔ لیلیٰ مجنوں کا عشق، صوفیوں کا عشق، غزالوں کا عشق، افلاطون کا عشق، اور وطن پرستوں کا عشق۔ سبھی طرح کے عشق ہمارے ہاں پائے جاتے ہیں اور ہر ایک کا مزاج جدا ہے۔ اس لئے عشق کے لفظ سے نہ معلوم کہنے والے کا مفہوم کیا ہو اور سننے والے کیا سمجھ بیٹھیں۔ "جنسی بھوک" پر مجھے کوئی خاص اعتراض نہیں، لیکن محض اس سے بھی بات نہیں بنتی۔ کیونکہ جنسی بھوک تو دانتے اور بیاٹرس سے لے کر کتے کتیا تک سبھی کو لگتی ہے۔ عصمت کے افسانوں میں جو جذبہ مرد عورت کو ایک دوسرے کی طرف کھینچتا ہے اس کی کسی قدر اور تخصیص کرنی چاہیے۔ ایک بات تو ظاہر ہے اور وہ یہ کہ اس جذبے میں شاعرانہ لطافتوں کی رنگینی نہیں پائی جاتی۔ اس کا رومان سے کوئی تعلق نہیں۔ عصمت کے کسی افسانے میں مرد یا عورت کے حسن کا کبھی ذکر نہیں آتا۔ کیونکہ جو جذبہ ان کے پیش نظر ہے اس کی تحریک کے لئے حسن کی ضرورت نہیں۔ یہ محض خون کی تاریک حرارت اور جسم کی جھلسا دینے والی گرمی سے پیدا ہوتا ہے اور جب انسان کے جسم میں یہ آگ لگتی ہے تو وہ کبھی اس کو سمجھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ کیونکہ اس آگ سے کوئی پیچیدہ نفسیاتی مسئلے پیدا نہیں ہوتے۔ صرف تند و تیز شراب کا سا نشہ دوڑتی رگوں میں

سرایت کر جاتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے: "وہ بے رنگ چڑیل ہیں۔ وہ جوانی یاسمین کو بھی نصیب ہوئی تھی جس کا منظر [illegible] عمر بھر کی [illegible] ہے عصمت کی [illegible] میں کہ "شہد کے قند سے [illegible] کا [illegible] جسم [illegible] ہے۔" اور جب تک [illegible] اور گال [illegible] میں سب [illegible] کچھ نہیں۔" اور پھر وہ بہار تو آ گئی [illegible] اس میں بیوی کا [illegible]۔ وہ نوجوان تھی [illegible] میں [illegible] تھا مگر [illegible] کون اس سے کچھ کہتا تو [illegible] مطلب یہ [illegible] زندگی سے وہ نہیں پتہ۔ [illegible] شعور عصمت کے [illegible] میں اس قدر [illegible] ہے [illegible] والا جسم [illegible] خود مصنف کی [illegible] مثلاً [illegible] اور جب جوانی آئی تو [illegible] سے اس کا چہرہ [illegible] ہو گیا۔ [illegible] شاخوں کی طرح [illegible] ہوئے۔ [illegible] ڈھلک گئے۔۔ [illegible] کے ہونٹ [illegible] ہو گئی تھیں۔ اور پنڈلیاں [illegible] ۔ ۔ ۔ [illegible] جسم [illegible] ڈوبے رہتے ہیں۔ [illegible] جاتا ہے۔ اور جس نے [illegible] ہیں۔ [illegible] شرارت سے [illegible] ۔ [illegible] اور [illegible] کی چھوٹی [illegible] جیسی [illegible] ۔۔ [illegible] ۔۔۔۔ [illegible] عورت [illegible] جسم [illegible] ہوئے یا پاکیزگی اور لطافت [illegible]۔ نہیں۔ بلکہ محض جسم [illegible] خون کی حرارت سے [illegible] جسم [illegible] خواہشوں کے [illegible] کی طرح [illegible] جب خواہشیں [illegible] جسم جسم کو پکارتا ہے تو ان انسانوں [illegible] شعور نہیں رکھتے۔ بلکہ [illegible] کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ اور وہ [illegible] لیکن [illegible] ہیں۔ [illegible] کے قدم نہیں رکتے یا عصمت کے الفاظ میں یوں [illegible] جوانی [illegible] لڑکی [illegible] خواب تو کوئی روک نہ سکا۔ پھر [illegible] اور یہاں عزت اور رشتوں کی جگہ [illegible] جسم کے [illegible] گئے۔

اور جب [illegible] جسم میں طوفان اٹھتے" اور [illegible] لگتے ہیں۔" اور دل و دماغ [illegible] کیفیت طاری ہو جاتی ہے [illegible] جسم [illegible] کو اس کشمکش کے زیر اثر [illegible] اور گناہ اور ملامت نہیں پیدا ہوتی۔ کیونکہ [illegible] بستر میں لپٹ کر [illegible] نہیں ہو جاتے بلکہ ان میں [illegible] قسم کا [illegible] اور [illegible] قسم کی [illegible] بیدار ہو جاتی ہیں وہ ایک دوسرے کو نوچتے ہیں [illegible] کرتے ہیں۔ [illegible] دیتے ہیں۔ [illegible] جسم پر [illegible] ڈال دیتے ہیں۔ ہونٹوں کو چٹکیوں سے مسل دیتے ہیں۔ [illegible] ہیں۔ بال پکڑ کر جھٹکے دیتے ہیں۔ [illegible] مارتے ہیں [illegible] کس کر [illegible] ہیں۔ گھسیٹتے ہیں [illegible] جسم کی گرفت کبھی ڈھیلی ہونے نہیں پاتی۔ اور یہ جذبہ شروع سے آخر تک اپنے کو دہراتا ہے اور بربریت کی شان کو نہیں چھوڑتا۔

تو پھر عصمت کے افسانوں کا موضوع جسم ہے؟ نہیں یہ کہنا تو درست نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ افسانے بلاشبہ ادب کے دائرے میں شامل ہیں۔ اور ادب (یا کسی بھی آرٹ) کا موضوع جسم نہیں ہو سکتا یعنی وہ جسم جو علم الاعضا کی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ نہ جسم نہ چاند تارے نہ پھول [illegible]۔ آرٹ کا تو ذہنی کیفیات سے سروکار ہے کیونکہ آرٹ کا منصب ذہنی [illegible] کا بیان اور بالآخر ان کیفیات کی تربیت ہے یہ سب چیزیں تو محض محرکات

ہیں۔ ان میں سے کچھ دوسری [illegible] جیسے [illegible] دیکھئے [illegible] حیات کا فعل ہو تو [illegible] ایک لمحہ ہے۔ ادیب ادب میں نقل [illegible] اور تجربہ کا نتائج [illegible] نہیں کر سکتا۔

جو کچھ میں نے اب تک بیان کیا ہے اس کا مقصد [illegible] عصمت [illegible] کی [illegible] سلسلہ [illegible] لیکن [illegible] کا نام [illegible] ان کا کیا مقام ہے ان سوالوں کا جواب میں کیا [illegible] کر مذاق سے بہ [illegible] زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

لیکن [illegible] ہے۔ جیسا کہ [illegible] بات [illegible] احساسات [illegible] ہو سکتی ہیں۔ [illegible] ہو سکتی ہے [illegible] شامل ہے [illegible] عظیم بیگ چغتائی [illegible] ہے [illegible] ان کی [illegible] ادب [illegible] اپنے [illegible] ہیں۔

عصمت نے کچھ تھوڑے سے اسکیچ بھی لکھے ہیں جن میں سے اب تک بھی دلچسپی وقت نظر اور عصمت کی [illegible] سے خالی نہیں۔ لیکن پھر بھی ان میں کوئی ”دوزخی“ کے رتبے کو نہیں پہنچا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ [illegible] اس اسلوب نگارش کی مثال نہیں ملتی جو عصمت نے اس اسکیچ میں اختیار کیا ہے۔ ان چند صفحات میں عصمت نے اس طرح سے پردوں کو پھاڑ ڈالا ہے، کہ دیکھتے ہی دیکھتے اپنے بلند ترین مقام پر پہنچ جاتی ہیں۔ ”میں ایک بہن کی حیثیت سے نہیں عورت بن کر ... [illegible] بہن ہو کر نہیں انسان بن کر کہتی ہوں [illegible]“ اس عدم توازن کی ضرورت بھی [illegible] پیش آئی [illegible] دیانت پر تو ایمان تھا پڑھنے والوں کی دیانت پر ایمان نہ تھا لیکن چند ہی فقروں میں وہ ایسے خلوص اور اپنی جرأت سے پڑھنے والوں کی ہمت بلند کر دیتی ہیں۔ ”آرٹسٹ کسی کا بھائی نہیں ہوتا کسی کی بہن نہیں ہوتی۔ احساسات اور تجربات کی دنیا میں رشتے ناتے محض اتفاقات کا نام ہیں۔ چند پسلیاں جو نہ معلوم کن چیزوں پہ سے ڈھکے ہوئے ہیں، بعض ہٹا کر دیکھیے تو نیتوں اور دماغوں کا امتحان ہوگا، اور ذہن جلا پائے گا۔“ عصمت نے کس خود اعتمادی کے ساتھ پسلیوں کو ہٹا کر پھینک دیا ہے اور جو زندگی میں بھی لاش تھا اس کی لاش کو بھی زندہ کر دکھایا ہے۔*

مضمون ختم کرنے سے پہلے دو ایک باتیں عصمت کی زبان کے متعلق بھی کہنا چاہتا ہوں کیونکہ ان کے مغربی مذاق میں کچھ ہمارے لئے ایک ہدایت ہے۔ عصمت کی انشا پر فارسی اور عربی کا اثر بہ نسبت اور ادیبوں کے بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اور یہ بے نیازی الفاظ تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ ترکیبوں اور فقروں کی ساخت میں بھی پائی جاتی ہے۔ اسی طرح ان کی تحریر ایک حد تک اس عامیانہ سی نقالی کے انگریزی تراکیب اور انگریزی اسالیب خیال سے بھی پاک ہے۔ اس زمانے کے اکثر انشا پردازوں کو بہ وجہ اپنی تعلیم یا ماحول کے اس سے مفر نہیں کہ ان کے کلام میں وقتاً فوقتاً انگریزی کے سُر بھی سنائی دے جائیں۔ اردو میں مغربی تلمیحات روز بروز بڑھتی جاتی ہیں۔ چنانچہ عام مضمونوں میں بھی اور کچھ نہیں تو ترجمہ شدہ ترکیبوں کی گٹھلیاں تو آ کر شامل جاتی ہیں۔ عصمت انگریزی کے غیر شائستہ دخلوں سے مبرّا ہیں۔ یہ تو بتانا مشکل ہے کہ وہ کیا لطف ہے جو ان کی تحریر میں پیدا ہو جاتا اور اس پاکدامنی کی وجہ سے پیدا نہ ہوا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس کی بدولت ٹھیٹھ اردو کے بہت سے ایسے الفاظ کام میں لے آئی ہیں جو آج تک پردے سے باہر نہ نکلے تھے۔ اور جن کو اب انہوں نے نئے نئے مطالب کے اظہار کے قابل بنا دیا ہے۔ گویا ہماری اردو انشا کو ایک نئی جوانی نصیب ہوئی۔ اُدھر خانہ نشین الفاظ کو تازہ ہوا میں سانس لینے کا موقع ملا۔ عصمت کے فقروں میں بول چال کی سی لطافت اور روانی ہے اور جملوں کا زیر و بم روزمرہ کا ساتھ [illegible] دیتا ہے۔ اس لئے ان کے فقروں کا سانس کبھی نہیں پھولتا۔ اور ان میں فضول ثقالت اور تکلف نہیں آنے پاتے۔ مختصر یہ کہ الفاظ کے انتخاب اور فقروں کی ساخت ان دونوں رستوں سے وہ انشا کی زبان کو زندگی کے قریب تر لے آئی ہیں۔ جس کے لئے ہمیں ان کا ممنون ہونا چاہئے۔ اس نیک کام میں عصمت کے علاوہ چند اور قابل قدر اہل زبان انشا پرداز بھی شریک ہیں۔ (اور سچ تو یہ ہے کہ یہ کام اہل زبان کے سوا کسی دوسرے کے لئے کچھ ایسا آسان بھی نہیں) لیکن عصمت کے احسان کا بوجھ کچھ اس وجہ سے ہلکا نہیں ہو جاتا۔

عصمت کوئی قدآور ادیب نہیں۔ اردو ادب میں جو امتیاز ان کو حاصل ہے۔ اس سے منکر ہونا کج بینی اور بخل سے کم نہ ہوگا۔ اور یہ مضمون بذات خود اس امتیاز کا اعتراف ہے۔ لیکن بھول نہ جانا چاہئے کہ ہمارا افسانہ ابھی سن رشد یا سن بلوغ کو نہیں پہنچا۔ آج کل جبکہ نظروں کو وسعت نصیب ہو رہی ہے۔ اور دنیا بھر کا ادب کتاب کی طرح ہمارے سامنے کھلا پڑا ہے۔ اردو ادب کے قدردانوں میں یہ حوصلہ پیدا ہونا چاہئے کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے ادب کا دنیا کے بہترین ادب سے مقابلہ کرتے رہیں۔ تاکہ تناسب کا احساس کند نہ ہونے پائے۔ مقامی تعصبات کی حقیقت واضح ہوتی رہے اور دل میں امنگ پیدا ہو۔ ہمارے ادب جدید کے پات سرسبز چکنے چکنے ہیں۔ لیکن اس میں ابھی بڑے بڑے پھول نہیں لگے۔ اتنی حد بندی کر لینے کے بعد ہمیں اس بات کو تسلیم کرنے میں ذرا بھی تامل نہ ہونا چاہئے کہ عصمت کی شخصیت اردو ادب کے لئے باعث فخر ہے۔ انہوں نے بعض ایسی پرانی فصیلوں میں رخنے ڈال دئے ہیں کہ جب تک وہ کھڑی تھیں کئی رستے آنکھوں سے اوجھل تھے اس کارنامے کے لئے اردو خوانوں ہی کو نہیں بلکہ اردو کے ادیبوں کو بھی ان کا ممنون ہونا چاہئے۔

(ساقی دہلی فروری ۴۵ء)

ہیبت ناک افسانے

"ہیبت ناک افسانے" کا پیکٹ جب یہاں پہنچا۔ میں گھر پر موجود نہ تھا۔ میری عدم موجودگی میں چند اعزا و احباب نے جو کتابوں اور
اتے خورد و نوش کے معاملے میں ہر قسم کی بے تکلفی کو جائز سمجھتے ہیں۔ پیکٹ کھول لیا۔ یہ دوست اردو بالکل نہیں جانتے۔ بجز چند ایسے
ے جو غصے یا رنج کی حالت میں وقتاً فوقتاً میری زبان سے نکل جاتے ہیں اور جو بار بار سننے کی وجہ سے انھیں یاد ہو گئے ہیں اور
ان کی قابلیت یہیں تک محدود ہے۔ تحریر میں اخبار "انقلاب" کا نام پہچان لیتے ہیں۔ وہ بھی اگر خط طغریٰ میں لکھا گیا ہو۔ چنانچہ
پس پہنچا تو ہر ایک نے محض کتاب کی وضع قطع دیکھ کر اپنی اپنی رائے قائم کر رکھی تھی۔ سرورق پر جو کھوپری کی تصویر بنی ہوئی
ہے ایک صاحب نے یہ اندازہ لگایا کہ کتاب

میں بھی کبھی کسی کا سر پر غرور تھا

ق ہے۔ ایشیا کے ادیب (عمر خیام۔ گوتم بدھ وغیرہ) اکثر اس قسم کے خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے صاحب
فنِ جراحی کے متعلق کوئی تصنیف ہے۔ ایک بولے جادو کی کتاب معلوم ہوتی ہے۔ ہندوستان کے مداریوں کا بیان بڑا شہرہ
ب خاتون نے کتاب کی سرخ رنگت دیکھ کر اشتراکی شبہات قائم کر لیے۔

میں نے کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھا۔ گو یہ سب کی سب کہانیاں میں پہلے انگریزی میں پڑھ چکا ہوں۔ اور ان میں بہت
کتابی صورت میں شائع ہونے سے پہلے خود امتیاز سے سن چکا ہوں۔ وہ مختلف قسم کی دلفریبیاں جو مجھے کبھی کسی تصنیف کو مسلسل
مجبور کر سکتی ہیں سب کی سب یہاں یکجا تھیں۔ کتابت ایسی شگفتہ کہ نظر کو ذرا الجھن نہ ہو۔ تحریر میں وہ سلاست اور روانی کہ طبیعت
بوجھ نہ پڑے۔ اور پھر امتیاز کے نام میں وہ جادو جس سے ہندوستان یا انگلستان میں کہیں بھی مفر نہ ہو۔

یہ کتاب تیرہ ہیبت ناک افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جن کے مصنف کا مدعا یہ تھا کہ پڑھنے والوں کے جسم پر رونگٹے کھڑے ہو جائیں
سانے میں درد و کرب خوف و دہشت یا پھر مرگ و ابتلا کی ایسی خونیں تصویر کھینچی جائے کہ بدن پر ایک سنسنی سی طاری
ے۔ ایڈگر ایلن پو کے پڑھنے والے ایسے افسانوں سے بخوبی آشنا ہوں گے۔ حق تو یہ ہے کہ پو اس فن کا استاد تھا اور یہ جو آج کل
ف ادب کی کثرت فرانس میں نظر آتی ہے عجب نہیں کہ اس کا بیشتر حصہ پو ہی کی بدولت ہو۔ کیونکہ فرانس کی ادبیات پر پو کا اثر

مسلّم ہے۔ اردو ادب کا شاید ہی کوئی ایسا شعبہ ہو۔ جس میں کسی نہ کسی صورت میں اس نے اپنا رنگ نہ بھر رکھا ہو۔ پیرس میں ایک خاص تھیٹر اسی بات کے لیے وقف ہے کہ اس میں دہشت انگیز کھیل دکھائے جائیں۔ اس کمپنی نے اس قسم کے ڈراموں کا اچھا خاصا مجموعہ تیار کر رکھا ہے۔ تھیٹر کی ڈیوڑھی میں چیدہ چیدہ ڈراموں کے مشہور مناظر کی تصاویر آویزاں ہیں۔ کہیں کوئی بدنصیب موت کی آخری انگڑائیاں لے رہا ہے۔ چہرہ فق ہوا ہے اور آنکھیں باہر کو ابلی پڑتی ہیں۔ کہیں کوئی سفاک کسی حسینہ کی آنکھیں نکال رہا ہے۔ بائیں ہاتھ سے گردن دبوچے ہوئے ہے۔ دائیں ہاتھ میں خون آلود چھری ہے اور لڑکی کی آنکھوں سے لہو کی دھاریں بہہ رہی ہیں۔ کھیل کو ہیبت ناک بنانے کے لیے جو تدبیر بھی ذہن میں آسکتی ہے ان سب پر عمل کیا جاتا ہے۔ ایکٹر اپنی شکل و شباہت اپنی آواز اور اپنی حرکات کے ذریعے ایک خوف سے کانپتی ہوئی فضا پیدا کر لیتے ہیں۔ پردہ اٹھنے سے پہلے ہی گھنٹی نہیں بجائی جاتی بلکہ چراغ گل کر کے لکڑی کے تختے پر دستک دی جاتی ہے۔ اس سے ہیبت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔

اس بات میں بحث کی گنجائش نہیں کہ درد و کرب یا خوف و دہشت کے مناظر یا افسانوں سے ایک خاص قسم کی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ یہ فقرہ بظاہر خود اپنی تردید کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ جس کو درد کہا جائے اس سے خوشی کیسے حاصل ہو گی۔ لیکن یہ ہمارے متداول الفاظ کی کم مائیگی کا نتیجہ ہے۔ اصل خیال کو جو اس فقرہ سے ظاہر کیا گیا ہے الفاظ کے اس گورکھ دھندے سے باہر نکالنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اسی وجہ سے بعض ماہرین نفسیات دکھ، درد، کرب وغیرہ اس قسم کے الفاظ کے استعمال سے مجتنب رہتے ہیں کیونکہ وہ کب کے اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ بہت سی ایسی کیفیات جن کو ہم عام زبان میں دکھ، درد وغیرہ سے موسوم کرتے ہیں۔ بسا اوقات اس قدر تسکین بخش ہوتی ہیں کہ لوگ ان کے حصول کے لیے جد و جہد کرتے ہیں۔ اور ان میں اپنی مسرت ڈھونڈتے ہیں یقیناً آپ کے پڑوس میں کئی ایسی عورتیں ہوں گی جو اس تلاش میں رہتی ہیں کہ کسی نہ کسی کی موت کی خبر سن پائیں اور بین اور واویلا میں شامل ہو کر آنسو بہا بہا کر اپنی تمنا پوری کر لیں۔ جرائم اور اموات کی گھناؤنی سے گھناؤنی تفصیلات کی اشاعت یورپ اور امریکہ کے کئی اخبارات کی مقبولیت کا باعث ہے۔ لوگوں کو ان کے پڑھنے میں ایک خاص لطف آتا ہے۔ اسی طرح اگر آپ بھی بعض دہشت ناک افسانوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں تو ہمیں اس کا اعتراف کرتے ہوئے محض اس وجہ سے متامل نہ ہونا چاہیے کہ کہیں لوگ اس کو ہماری طینت کے کسی نقص پر محمول نہ کریں۔ مجھے یقین ہے کہ قدیم زمانے میں رومن قوم کے جو اپنے اکھاڑوں میں پہلوانوں کی لڑائیاں اسی جذبے کے تحت دیکھنے آتے تھے۔ ہر کشتی ایک نہ ایک حریف کی موت پر جا کر ختم ہوتی تھی۔ اور کشت و خون کا یہ نظارہ ہزارہا لوگوں کو خوشی کے مارے دیوانہ بنا دیا کرتا تھا۔ ہماری تہذیب اس تجاوز کی متحمل نہیں۔ لیکن افسانوں اور ڈراموں سے لطف اندوز ہونا اب بھی ہمارے بس میں ہے۔ اور اگر ہم اس جذبے کو فن کی کیمیا سے کشید کر کے لمحے بھر کو اپنے اعصاب میں ایک کیف انگیز تھرتھراہٹ پیدا کر لیتے ہیں تو کم از کم میں تو کسی طرح بھی نادم نہیں۔ آپ اپنے دل کو ٹٹول لیجئے۔

اعصاب میں ایک تھرتھراہٹ! بس یہی ان افسانوں کا مقصد ہے۔ اور جس کامیابی، جس خوبی اور جس فن کے ساتھ اس کتاب کے مصنف نے اس مقصد کی تکمیل چاہی ہے۔ اس کی تعریف اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ امتیاز جیسے ذی مطالعہ اہل قلم کو اس کے ترجمے کی خواہش ہوئی۔ ان لوگوں کے سامنے جو اردو ادب کے مشاہیر سے واقف ہیں اس سے زیادہ قابل وقعت ضمانت نہیں پیش کی جا سکتی۔ مصنف کی سب سے بڑی خوبی خود مترجم نے کتاب کے دیباچے میں واضح کر دی ہے۔

موسیو لیول بے انتہا سلیس عبارت استعمال کرتے ہیں، جس کی پختگی اور روانی پڑھنے میں نظم کا سا لطف دیتی ہے۔ ایک فقرہ یا لفظ بھی ضرورت سے زیادہ یا کم نہیں ہوتا۔ مختلف چیزوں کے بیان میں تناسب کی کچھ عجیب تمیز ہے۔ چنانچہ ان کی ہر مکمل کہانی ایک نفیس اور صاف ستھرے تراشے ترشائے ہیرے کی طرح دل کش معلوم ہوتی ہے:

یہ اختصار دہشت انگیز افسانوں کی ایک ضروری صفت معلوم ہوتی ہے۔ اس کے بغیر ان میں وہ تندی وہ تیزی نہیں رہتی جس سے سنسنی پیدا کی جا سکے اور پھر یہ اختصار ہر رنگ میں شامل حال رہتا ہے۔ وہ افسانے یا ڈرامے کی کامیابی پر نمایاں طور پر اثر ڈالتا ہے اس کی وجہ میں کبھی ٹھیک طور پر سمجھ نہیں سکا۔ لیکن اس کی حقیقت کے متعلق میرے دل میں کوئی شبہ نہیں۔ پیرس کے جس تھیٹر کا میں نے ذکر کیا ہے۔ وہاں اکثر کھیل صرف ایک ایکٹ کے ہوتے ہیں اور خود تھیٹر بھی بہت چھوٹا سا ہے۔ چند دن ہوئے میں نے لندن میں ایک ایسی قسم کا کھیل دیکھا جو موسیو لیول کے ایک ناول سے مرتب کیا گیا ہے۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ اس کھیل کے لئے بھی لندن کا ایک بہت چھوٹا سا تھیٹر منتخب کیا گیا۔ اس تھیٹر کا نام "لٹل تھیٹر" یا "چھوٹا تھیٹر" ہے۔

باقی رہا امتیاز کا ترجمہ۔ میں حیران ہوں کہ اس مختصر سے تبصرے میں اس موضوع کے متعلق کیا کہوں اور کیا کسی اور وقت پر اٹھا رکھوں۔ آج کل اردو میں تراجم کثرت سے شائع ہو رہے ہیں اور ضرورت ہے کہ کوئی صاحب فہم ان کے متعلق ایک بسیط تنقیدی مضمون سپرد قلم کر دیں تاکہ "چترا" اور "ٹائمس" اور "مذہب اور سائنس" اور "عذرا" اور "ہیلن" ایسی تصانیف کی ادبی حیثیت کو جانچنے کے لئے ایک معیار مقرر ہو جائے۔ میں ایسی بحث سے گریز کرتا ہوں۔ خصوصاً اس وقت جبکہ میرے زیر نظر صرف "ہیبت ناک افسانے" ہے اور میرا قلم صرف اس کی خدمت میں مصروف ہے۔

یہ کہنا کہ امتیاز صاحب انگریزی جانتے ہیں۔ اس وقت تک بے معنی فقرہ ہے جب تک کہ میں اس کی مزید تشریح نہ کر دوں۔ آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی جانتا ہوں کہ "گدھا" کس کو کہتے ہیں کسی انگریز کے لئے اس لفظ کے معنی سیکھ لینا کچھ مشکل نہیں۔ جانور کی تصویر دکھا دیجئے اور نام بتا دیجئے۔ قصہ ختم ہو گیا۔ لیکن اس لفظ کے ساتھ "ارے گدھے" سے لے کر "خر عیسیٰ" تک جو شعر و ادب۔ فلسفہ و مذہب رسم و عادات۔ محاورہ اور روزمرہ کی ایک تاریخ وابستہ ہے۔ اسکو منتقل کرنے کے لئے ایک عمر چاہیئے اور پھر اس کے لئے بصیرت، لطافت مذاق اور مطالعے کی ضرورت ہے۔ امتیاز کو خدا نے یہ سب خوبیاں عطا کی ہیں اور یہ ہندوستان کی خوش قسمتی ہے کہ انہوں نے اپنی ان قوتوں کو مطالعۂ السنہ اور علم و ادب کی تحصیل کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ ہاں وہ انگریزی جانتے ہیں۔ اسی لئے جب کبھی ان کا کوئی دلدادہ اپنی عقیدت کی وجہ سے ان کے نام کے ساتھ بی اے لکھ دیتا ہے تو مجھے غصہ آتا ہے۔

ان کی اردو پرکھنے کے لئے ہندوستان میں مجھ سے بدرجہا بہتر نقاد موجود ہیں۔ اس کے علاوہ میں امتیاز کے نیاز مندوں میں سے ہوں مجھے سنبھل کر قلم اٹھانا چاہیئے۔ مبادا قارئین میرے جذبات کی تو تعریف کریں لیکن میری تنقید کو محض اظہار نیاز مندی سمجھ کر پس پشت ڈال دیں۔ اس لئے بہتر یہی ہوگا کہ اس کتاب کے ایک دو صفحے آپ اور میں مل کر پڑھیں۔

"شام ہو رہی تھی۔ فقیر سڑک کے کنارے خندق کے پاس کھڑا ہو گیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کوئی کونا کھدرا نظر آئے تو وہاں پڑ کر رات بسر کرے۔ اور کوٹ بچھونا یا جو کچھ بچھونا اور ایک بوریا سا اس کے پاس تھا اسی میں گھس گیا۔ لاٹھی کے سرے پر ایک گٹھری سی

اور کندھے پر اٹھا رکھی تھی۔ تکیے کی جگہ اسے سر کے نیچے رکھ لیا۔ تھکن سے چور چور ہو رہا تھا بھوکا تھا۔ چپ چاپ پڑا رہا اور نیلے آسمان پر تاروں کو ایک ایک کر کے ابھرتے ہوئے دیکھنے لگا۔

سڑک کے دونوں طرف جنگل بیابان پڑا تھا۔ پیڑوں پر چڑیاں نیند میں چپ چاپ تھیں۔ دور بہت فاصلے پر گاؤں ایک بہت بڑا سیاہ دھبہ سا دکھائی دے رہا تھا۔ یہاں سکون اور سناٹے میں لیٹے لیٹے غریب بڈھے کا دل بھر آیا۔

اسے کچھ معلوم نہ تھا میرے ماں باپ کون تھے۔ لاوارث کو ثواب کمانے کے لئے کسی زمیندار نے لے لیا تھا۔ اسی کے ہاں پروان چڑھا تھا۔ بچہ ہی سا تھا کہ وہاں سے نکل بھاگا۔ ادھر ادھر اس فکر میں پھرنے لگا کہ کہیں کچھ کام مل جائے جس سے روٹی کا سہارا ہو سکے۔ بڑی کٹھن زندگی گذر رہی تھی۔ دکھوں کے سوا جینے کا کوئی مزا نہ دیکھا تھا۔ جاڑوں کی لمبی لمبی راتیں چکیوں کی دیواروں تلے پڑ کر کاٹ دی تھیں۔ سوال کے لئے ہاتھ پھیلانے کی ذلت اٹھائی تھی۔ چاہتا تھا کہ مر جائے۔ ایسی نیند سوئے کہ پھر کبھی آنکھ نہ کھلے۔ جتنے لوگوں سے اب تک واسطہ پڑا تھا بے درد تھے۔ شقی تھے۔ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ معلوم ہوتا تھا ہر ایک اس سے خفا ہے۔ بچے دیکھ پاتے تو بھاگ جاتے۔ کتے اس کو چیتھڑوں میں دیکھ کر بھونکنے لگتے۔

"پھر بھی کبھی کسی کا برا نہ چاہا تھا۔ سیدھی سادی اور نیک طبیعت پائی تھی۔ جسے مصیبتوں نے مردہ بنا دیا تھا۔"

"یہ وہ زبان ہے جو قلعے میں پیدا ہوئی اور جو برسوں تک 'اہل زبان' کے لئے باعث فخر و ناز رہی۔ شمالی ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقے کو یہ زبان رتن ناتھ سرشار، داغ اور امیر، نذیر احمد اور محمد حسین آزاد سے ورثہ میں ملی۔ اور اسی خزانے کے سکوں سے جنھیں خود 'اہل زبان' محض سکوں کی طرح اپنے ہاتھوں ہی میں مل مل کر خوش ہو لیتے ہیں۔ اب لاہور کا ادیب فرانس اور انگلستان کا سامان ادب خرید خرید کر ہندوستان میں منتقل کر رہا ہے۔ اس قدیم دولت سے ادب جدید کے بازار میں اپنی ساکھ قائم رکھنا صرف امتیاز ہی کا کام تھا

اب ایک اور صفحے کو پڑھیے۔ جو دہلی اور لکھنؤ دونوں سے بے نیاز ہے بلکہ جو اکثر پرانی وضع کے بزرگوں کو اپنی جدت سے برہم کر دے گا۔

"اس روز میں بہت دیر تک کام کرتا رہا تھا۔ اتنی دیر تک کہ آخرکار جب میں نے میز پر سے نظریں اٹھائیں تو کیا دیکھتا ہوں کہ شفق شام سے میرا مطالعہ کا کمرہ لالہ زار بن رہا ہے۔ ذرا دیر تک میں بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ دماغ پر کسل کی وہ کیفیت طاری تھی جو کسی بڑی ذہنی محنت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ بے تعلق نظروں سے ادھر ادھر تکتا رہا۔ مدھم روشنی میں ہر چیز دھندلی دھندلی اور بے وضع نظر آ رہی تھی۔ اگر کچھ روشنی تھی تو ان جگہوں پر جہاں غروب ہوتے ہوئے سورج کی آخری شعاعیں سبز شیشے اور تصویر پر سے منعکس ہو کر روشنی کے دھبے ڈال رہی تھیں۔ کتابوں کی الماری پر ایک انسانی کھوپڑی رکھی تھی۔ اس پر شعاعیں ضرور خاص قوت سے منعکس ہو کر پڑ رہی ہوں گی۔ کیونکہ میں نے نظریں اٹھائیں تو وہ مجھے ایسے روشن طور پر نظر آئی کہ گال کی ہڈی سے لے کر جبڑے کے زبردست ناہموار ٹکڑے تک ہر حصہ بخوبی واضح تھا۔ شام کا دھندلکا بڑی سرعت سے گہرا ہوتا چلا جاتا تھا اور ہر چیز کو جیسے نگلے جا رہا تھا۔ اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا کہ رفتہ رفتہ مگر قطعی طور پر اس سر میں زندگی کی چنگاری چمک اٹھی ہے۔ وہ گوشت پوست سے ڈھک گیا ہے۔ دانتوں پر ہونٹ سرک آئے ہیں۔ حلقوں میں آنکھیں جڑی گئی ہیں۔ بہت جلد کسی انوکھے سحر سے مجھے ایسا نظر آنے لگا کہ میرے سامنے تاریکی میں گویا ایک سر معلق ہے اور میری طرف تک رہا ہے۔

وہ سرمئی ہوئی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اور اس کے چہرے پر استہزا کا ایک تبسم تھا۔ یہ کوئی اس قسم کا گویا تصور تھا جو

تخیل پیدا کر لیا کرتے تھے۔ یہ چہرہ ایسی حقیقی چیز معلوم ہوتا تھا کہ ایک مرتبہ تو میں بے قرار ہو گیا کہ ہاتھ بڑھا کر اسے چھو لوں لیکن یکلخت خیال
ہو کر رہ گئے۔ حلقے خالی ہو گئے۔ ایک بجلی سی کوندنے نے اسے مفقود کر لیا ۔ ۔ ۔ ۔ پھر مجھے عام کھوپریوں کی طرح ایک کھوپری نظر

یہ ہر دو ہمارے ہاں پیدا ہوئے۔ گھر میں۔ اس میں مشکل سے دو شعر پائے جاتے ہیں۔ بلکہ یہ صرف ملک کے بہترین دماغوں کی تجہ ہے۔ نئی تہذیب کی عمدہ باتیں ہمارے لئے ایجاد کیں اور مطالعے اور خوش مذاقی نے اسے دلفریب صورت بخشی۔ اس بارے میں سجاد حیدر۔ ظفر علی خاں۔ ڈاکٹر اقبال اور ابو الکلام آزاد جیسی شخصیتوں کا ممنون ہے۔ جنھوں نے بعض ایسے دروازے کھول دئیے کئی راستے آنکھوں کے سامنے پھیلتے ہوئے نظر آنے لگے۔

یہ دو مختلف نمونے ہیں جنہیں امتیاز کی قادر الکلامی کو ثابت کرنے کے لئے پیش کئے ہیں۔ ان پر یہ اعتراض بجا نہ ہوگا کہ ایک ہی تصنیف متباین ڈھنگ یک رنگی کے منافی ہیں۔ اس کے جواب میں یہ کہوں گا کہ جب آپ کسی ایک ایسی کتاب کو جو ایک غیر ملکی تہذیب وئی ہو۔ محض اردو جاننے والے ہندوستانیوں کی ضیافت طبع کے لئے کسی دیسی زبان میں ڈھالنے کی کوشش کریں۔ تو یقین مانئے ی کا کوئی اسلوب نہ ہوگا جس سے آپ بے نیازی برت سکیں۔ اس کے لئے قلم نہیں بلکہ دسوں انگلیاں دس چراغ ہونی چاہئیں۔

پطرس از کیمبرج
(مخزن مئی ۱۹۲۸ء)

وارفتگیٔ جذبات

بھائی...... تم سے کیا کہوں طبیعت روز بروز حساس ہوتی جاتی ہے۔ دل میں ایک بے نام سا رنج رہتا ہے جس میں اشتعال اور بھی بڑھا دیتی ہے مختلف اسباب مل کر ایک عجیب سے ولولے پیدا کر دیتے ہیں۔ میں نفرتاً ہوں تنگ ہوں۔ ناکامیوں نے مجھے دل برداشتہ بنا دیا ہے۔ اس لیے بعض اوقات ایک پیالی کا ٹوٹ جانا زلزلے کی طرح مجھے برہم کر دیتا ہے۔ اسے شاعری نہ سمجھنا یہ حقیقت ہے۔ گھنٹوں مطالعہ میں مشغول رہتا ہوں پھر خیال آتا ہے کہ یہ سب بے فائدہ ہے۔ پہروں سوچتا رہتا ہوں اور کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتا۔ رات کو لیمپ بجھا دیتا ہوں کہ اب سو جاؤں اور پھر جلا دیتا ہوں کہ نیند نہیں آتی۔ آدھی رات کے وقت گھر کے سب لوگ دن بھر کی کلفت اور تھکان کے بعد خواب راحت میں ہوتے ہیں۔ میں اپنے آپ میں اس وقت حیات کی ایک بیداری، اور جذبات کی ایک بے قراری پاتا ہوں جو مجھے سونے نہیں دیتی۔

کہیں دور چند غریب پٹھان مزدور رباب بجا رہے ہیں اور پشتو کے کسی دردناک گیت کی فراق زدہ لَے، رباب کی سادہ موسیقی، رات کی تنہائی اور خاموشی دل کے تاروں میں ایک میٹھے سے درد کا نغمہ چھیڑ دیتی ہے جس کو گھنٹوں تک بے حس و حرکت پڑا سنتا رہتا ہوں مضطرب روح سوکھے کوہساروں کے وحشت عشق و حسن کی داستان سن کر اور مضطرب ہو جاتی ہے۔ بار بار یہی تصور آتا ہے کہ ایک جنگجو، غیور اور تنومند افغان نے اپنی بندوق کو کندھے سے اتار کر پتھروں پر رکھ دیا ہے اور ایک ٹیلے پر بیٹھے ہوئے تصنع سے مبرا فقروں میں اپنے عشق کی کہانی کہہ رہا ہے۔ جس کی آغوش کوہ کی پروردہ حسینہ کے خوب صورت سڈول بازوؤں کو نسوانیت نے ڈھیلا کر دیا ہے اور اس کی معصوم نگاہوں میں ایک جرأت آ گئی ہے یکایک اس کے جوانی بھرے سینے کو غیرت نے ابھار دیا ہے۔ اور وہ اپنے چاہنے والے کو بزدلی کے بھوت کے خوف کے طعنے دے رہی ہے۔ رعب حسن میں تنی ہوئی اسے اجتناب کی نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔ پھر غصہ میں آ کر اس نے اپنی گھاس کی گٹھڑی اور درانتی کو سر پر رکھ لیا ہے اور ندی کے بیچ میں سے گذر کر اس پار چلی گئی ہے۔ رباب کے تاروں میں ایک اضطراب، ایک تشنگی سنائی دیتی ہے غیرت مند افغان نے اپنی بندوق کو اٹھا کر مضبوط گرفت میں پکڑ لیا ہے اور ایک پتھر پر کھڑا اردگرد کی چوٹیوں کو، پتھریلے ٹیلوں کو بے رحم پہاڑیوں کو طیش کی نظروں سے دیکھ رہا ہے اس کی آنکھوں میں خون ہے اور آگ ہے۔ اس نے بندوق میں ایک کارتوس بھر لیا ہے اور اس بنجر اور ریتلے کوہستان میں اس کے گیت کی مہجور سُریں وادیوں میں گونج گونج کر موت کو تلاش کر رہی ہیں ایک جنگ جو کی موت کو، ایک فاتح کی موت کو، عشق اس میدان وغا میں آوارہ، سرگرداں پھر رہا ہے اس جستجو میں کہ کہیں ایک بے رحم عورت کی خاطر اپنی جان، مردانگی اور بہادری کے حوالے کر دے۔ رقیب سے بنجر اور ڈراؤنے پہاڑ محبت کی اس وارفتگی کو دیکھ رہے ہیں۔ اور موت کی طرح خاموش اور دہشت انگیز ہیں۔ اس موت کی طرح جو آتی ظالم ہے کہ نہیں آتی۔ رباب کی موسیقی بے دردی سے دل کے ٹکڑے کر رہی ہے۔

مجھے اس وقت ایک عجیب درد، افسردگی، ایک غربت، ایک بے کسی کا احساس ہوتا ہے گویا ایک درماندہ اور راہ گم کردہ مسافر ہوں۔ نظر کو سوائے افق کی ناشکستہ سیاہی کے اور کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ اور تکان نے منزل سے مایوس کر دیا ہے گویا میں صحرائی وحشت، اور آسمان کی پہنائی میں ایک ذرہ ہوں۔ اور ستاروں کی دور دراز دنیا تک اپنی آواز پہنچانا چاہتا ہوں۔ کیونکہ وہی سب سے نزدیک معلوم ہوتے ہیں۔ چاند کھجور کے درختوں کے ایک جھنڈ میں سے جھلک رہا ہے اور کائنات میں یا چاندنی ہے جو چپ چاپ خاموشی سے برس رہی ہے یا تاریک سائے ہیں جن میں رات نے اپنے پراسرار اقتدار کی ہیبت کو چھپا رکھا ہے۔ فضا میں اس درد کے گیت سے ایک لے اور بے قراری پیدا کر دی ہے۔ میرے دل میں اس وقت ڈر نہیں ہوتا۔ خوف نہیں لیکن ایک اضطراب ہوتا ہے ایک ناقابل بیان بے قراری ہوتی ہے۔ اپنے آپ کو بستر پر سکون کی حالت میں مردہ کی طرح دیکھ کر دل سینے میں پیچ و تاب کھاتا ہے کہ میں بے بس کیوں ہوں۔ یہی بے بسی کا احساس جذبات میں ایک تلاطم پیدا کر دیتا ہے اور تنہائی ایک محشرستان، بیداری کا ایک ہنگامہ بن جاتی ہے۔

رفتہ رفتہ رباب کی موسیقی دھیمی ہو جاتی ہے۔ درد گیت بن کے آہستہ آہستہ چاندنی میں تحلیل ہو کر خاموش ہو جاتی ہے۔ رات کا طلسم جذبات کی سردی پر سکون کی چادر ڈال دیتا ہے۔ آنسو پلکوں پر سوکھ جاتے ہیں اور آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ قدرت کے دل میں رحم آ جاتا ہے تو ہوا کے جھونکے تھپک تھپک کر سلا دیتے ہیں۔ نیند آ ہی جاتی ہے۔ مگر آہ! کس بیداری کے بعد!

(مخزن جولائی ۱۹۲۱ء)

تنزل

مجھے نہیں معلوم میرا انجام کیا ہوگا، جس تیز روی سے میں تنزل کی طرف جا رہا ہوں اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ دل و دماغ کے لئے مہلک ثابت ہوتی ہے۔ مجھے خود بھی اس بات کا یقین ہے۔ میں ہمیشہ سے اس کا قائل رہا ہوں۔ لیکن میں سوائے اس کے کیا کہہ سکتا ہوں کہ میں بے بس ہوں۔ میں مجبور ہوں۔ میں اپنے آپ کو نہیں روک سکتا۔ ایک زبردست کشش، ایک ہمہ گیر جاذبیت مجھے ہلاکت اور پستی کی طرف کھینچے لئے جا رہی ہے آہ! بہت تھوڑے عرصہ کا ذکر ہے کہ میں اپنے آپ کو ایک نہایت عالی مقام پاتا تھا۔ میرا مطمع نظر اور میرا دائرہ افق اس قدر وسیع تھا کہ اس پر نظر ڈالتے ہوئے میرا دماغ چکر کھاتا تھا۔ مجھے صرف عالی نگاہ لوگ دیکھ سکتے تھے اور میں کوتاہ بینوں سے امون تھا۔ اب میری یہ حالت ہے کہ کسی اور کو تو کیا میں خود اپنے آپ کا مطالعہ نہیں کر سکتا۔

مجھے معلوم ہے کہ بہت عرصہ نہیں گذرنے نہیں پائے گا جب میرے حسیات فنا ہو جائیں گے۔ شاید میرے حواس مجھے جواب دے جائیں میں اپنے آپ کو زندہ کہتا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مردوں سے بدتر ہوں۔ کیونکہ جو شخص مر جاتا ہے وہ کہیں نہ کہیں ٹھکانے تو لگ جاتا ہے اور میرا حال یہ ہے کہ دنیا میں کوئی سہارا نہیں۔ آرام و سکون میرے لئے ناممکنات سے ہیں۔ نہ مجھے اس وقت کوئی ناصح مفید ہو سکتا ہے اور نہ میں خود ہی اپنی رہنمائی کر سکتا ہوں۔ چارہ گر کو مجھ پر رحم آ سکتا ہے اسے میرے نزدیک آنے کی ہمت نہیں پڑ سکتی۔

زندگی میں یہ ایک — صرف ایک لغزش کا نتیجہ ہے۔

آپ نہیں سمجھے؟ خوب! بات یہ ہے کہ میں جامع مسجد کے مینار سے گر رہا ہوں۔

(مخزن۔ اکتوبر ۱۹۲۱ء)

آئینۂ دل

بچپن [illegible] بات کیا ساحل دریا پر تھوڑی جھونپڑی [illegible] ہیں جہاں ننھے ننھے بچے پاؤں پسپوں کی خواہش میں ریت کی [illegible] اور نفیس لڑکی معصوم ہے [illegible] دل سے سل دب رہی ہیں جہاں کا طوفان قہقہوں دریائی کے بیٹوں سے زیادہ نہیں ہوتا۔

گویا یہ شورش نمایاں [illegible] ہر لطف کو اب تک کسی اصلی ہاتھ سے نہیں چھوا اور جوانی [illegible] وقت کے [illegible] سے تنہا چھوڑا ہے جس پر لاابالیانہ [illegible] دل میں [illegible] بکھرا پڑا ہے [illegible] جیسے [illegible] کوئی گدگدا دیتے ہیں اور اس میں سے ایک [illegible] آزادانہ ایک بے ساختہ [illegible] بے اختیار ہو کر فضا میں سے نکل جاتا ہے جیسے کسی بادرفتار پری کے پازیب کی جھنکار۔

لیکن جوانی کا عالم مجھے یوں دکھائی دیتا ہے جیسے ایک دریا جس کی گہرائیوں سے [illegible] پر سکون [illegible] خبر سا منظر ہے۔ جس کے [illegible] لہروں میں [illegible] اٹھتی ہیں۔ اور سطح زمین پر [illegible] ڈوب جاتی ہیں۔ جہاں ایک [illegible] نہاں ہے [illegible] ایک محشر [illegible]

جیسے رباب [illegible] ہستی کے ہاتھوں میں ہے۔ ہر ایک تار ایک شدید انتظار [illegible] معلوم ہوتا ہے۔ نغمے اپنی [illegible] کے [illegible] منتظر ہیں اور [illegible] کو نافہم نظروں سے دیکھ رہے ہیں

اس وقت کی حالت نہ پوچھو جب عشق [illegible] طوفان [illegible] دریا کو ایک کر دیتا ہے۔ جب [illegible] کی سرکشی اور ہر تیراک کو پستی سے اور بلندی سے پھر پستی تک یوں دھکیل کر لے جاتی ہے جیسے [illegible] جہاں ہر ایک کمزور طاقت ور سے [illegible] انسان کو اپنی طرف یوں کھینچ لیتا ہے قسمت کی مجبوری۔

ہر لطف ہستی کے تار تار میں تھرتھراہٹ کا ایک ہنگامہ ہوتا ہے۔ دل نواز نغمے بگولے کی طرح چکر کھاتے ہوئے اٹھتے ہیں اور اسی سرچکرا [illegible] تیزی میں [illegible] کوششوں کی طرح پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ہوش و حواس سراسیمہ ہجوم میں کہیں غائب ہو جاتے ہیں۔ [illegible] ایک دل چیرنے والے سوز بھرے شور کے سوا اور کچھ محسوس نہیں ہوتا۔

آہ! اگر جب دریا اپنے کناروں کی حدود کو توڑ کر اپنے جوش مستی میں آوارہ ہو جاتا ہے۔ جب اس کی لہریں ایک بے معنی تلاش میں کوسوں [illegible] پڑ جاتی ہیں۔ تو اس کا دم ٹوٹ جاتا ہے بے رحم زمین قطرہ قطرہ کر کے اس کو چوس لیتی ہے۔ اس کا طوفان بس ہو جاتا ہے پھر اس کی روانی [illegible] جاتی ہے اور آخرکار اس کا پانی سوکھ جاتا ہے پھر وہاں موجود ریگ کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ پھر جب یہ نہیں رہتا تو بیابان ہو جاتا ہے اور ایک ویران [illegible] ایک بھیانک وحشت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

محبت کی دردناک لے جب تاروں میں ایک بے قراری، ایک وجد کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے جب ساز کی جان سے جدا ہو کے بے تحاشہ اور بے تابانہ ایک دوسرے سے سر ٹکراتے ہیں۔ جب بربط کی جان نازک اپنی بساط سے بڑھ کر چیخ اٹھتی ہے تو اس کے تار ٹوٹ جاتے ہیں، شکستگی نغموں کا خاتمہ کر دیتی ہے، پھر وہ بربط، بربط نہیں رہتا بلکہ فنا کا ایک خاموش زور، ماتم ہو جاتا ہے۔ یہ ہے عشق کی نامرادی۔ "

(مخزن۔ نومبر دسمبر ۱۹۲۱ء)

آسمان

مجھے یاد ہے کہ بچپن کے زمانے میں میں آئینہ کو ہاتھ میں لے کر اس میں آسمان کا عکس دیکھا کرتا تھا۔ وسعتِ فلک کا اندازہ میں صرف آسمان کو یوں اوندھا کر کے ہی لگا سکتا تھا۔ آسمان کی بلندی سے ماورا فطرتِ انسانی کو اس کی عظمت کا احساس صرف اسی طرح ہو سکتا تھا کہ میں اس بلندی کو گہرائی بنا کر دیکھتا۔ پھر جب میں آئینے کو دونوں ہاتھوں میں تھامے اپنی نظر کو اعماقِ فلک میں پھیلتے ہوئے چلنے کی کوشش کرتا تو ہر ایک قدم ایک مہیب اتھاہ کے کنارے پر ہوتا اور ہر ایک لغزش گویا مجھے غرقابی کی گود تک لے جاتی اور پھر سلامتی تک یوں واپس پہنچاتی کہ میرا دل دھڑک رہا ہوتا اور میری آنکھیں بند ہو جاتیں۔ عقل کے بے رحم ہاتھوں نے اس فریب و طلسم کو توڑ دیا۔ اب میں آسمان کی طرف نگاہیں جما کر دیکھ بھی سکتا ہوں۔ اب اس کی حقیقت کے متعلق ہرزہ سرائی بھی کر سکتا ہوں۔ اب میں کئی دفعہ اپنے آپ سے لاتعلق بھی سمجھتا ہوں گویا اس کی ہستی ہی نہیں۔

مگر ایک رات ایسی بھی آتی ہے جب ایک بے نام بے چینی مجھے نیند سے ناآشنا کر دیتی ہے۔ دل ایک خاموش اور بے نوا اضطراب بیداری بن کر آنکھوں میں بھر آتا ہے۔ کسی تنہا، آہستہ خرام، جھینگر کی سریلی تان رات کی گہری تاریکی میں سے چھن کر مجھ تک ایک رقیق سی بے قراری اور ایک خفیف سی لرزش ہو کر پہنچتی ہے۔ درختوں میں ہوا کی سرسراہٹ قدرت کے عالی شکوہ گنبد میں کسی سانپ کے پھن کا ایک پُراسرار گونج معلوم ہوتی ہے گویا فطرت کی آہ سرد ہے یا الہامی سرگوشی جو ایک عظیم الشان کائنات کے خاموش اندھیرے اور تاریک سمندر کے راز سے مجھے غرقِ تحیر کر رہی ہے۔ ستاروں میں ایک ابدی روشنی چمکتی نظر آتی ہے۔ کالے آسمان کی مہیب سیاہی ایک لازوال اور ہمہ گیر غم کی طرح دنیا و مافیہا پر چھائی ہوئی ہے اور ستارے اس غیر محدود بلندی پر آگ کے قطروں کی طرح معلق و لرزاں معلوم ہوتے ہیں۔ اس وقت میں اس دور دراز بلند اور پر ہیبت فطرت کے نیچے ایک ذرۂ حقیر اور ایک روح بے مایہ کی طرح گم ہو جاتا ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر ایک ستارہ رات کا ایک خاموش اور بے بہا آنسو ہے۔ جو صبح کے وقت زمین کے کسی پھول کی پتیوں پر سورج کی کرنوں میں مسکرا رہا ہوگا۔ آسمان ایک بھیانک غم کی طرح ہر ایک طرف طاری دکھائی دیتا ہے اور میں اپنے آپ کو اس میں گھرا ہوا پاتا ہوں جب کوئی ٹوٹتا ہوا تارا ایک دہشت ناک سرعت کے ساتھ آسمان کی وسعت و پہنائی پر ایک افق سے لے کر دوسرے افق تک ایک طویل خطِ آتشیں کھینچتا ہوا تاریکی میں کہیں فنا ہو جاتا ہے تو میں آسمانی زلزلے سے خوفزدہ ہو کر اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں

اس وقت میں قدرت سے رحم کا طلبگار ہوتا ہوں۔ اس وقت میں اپنی تمام زندگی میں سے آنسوؤں کے سوا اور کوئی چیز آسمان کے حضور میں پیش نہیں کر سکتا۔ میرے ہونٹوں پر ایک مہرِ سکوت ہوتی ہے اور میری روح ایک حیرت بن کر رہ جاتی ہے اس وقت میں آسمان کی سیاہ وسعت و رفعت کو دیکھ کر بھول جاتا ہوں کہ ازل اور ابد میں کیا فرق ہے؟

(مخزن۔ جنوری ۱۹۲۲ء)

ایک رات

رات کے بارہ بجنے والے ہیں۔ آدھ گھنٹہ ہوا میں مطالعے سے فارغ ہو چکا ہوں۔ اردگرد تمام کوٹھی میں مکمل خاموشی اور سکون ہے۔ کھلے ہوئے دروازے میں سے باہر کا رنگین منظر دکھائی دے رہا ہے۔ جس پر اس قدر سکوت طاری ہے کہ کبھی کبھی ہوا کا ایک جھونکا میرے چہرے پر دفعتہً ایک عجیب سی خنکی پیدا کر دیتا ہے۔ اور میں کانپ اٹھتا ہوں۔ کہیں دور ایک کتا بھونک رہا ہے جس کی آواز محیط خاموشی میں ایک دھیمی سی ہیبت ہو کر رہ گئی ہے جب یہ آواز ایک لمحے کے لئے میرے کان تک نہیں پہنچتی تو اس چپ چاپ میں وحشت کی سی سرسراہٹ سنائی دینے لگتی ہے۔ اور میرا دل ایک لمحے کے لئے زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ سکوت کی بے زبان اور ڈراؤنی آوازوں سے اپنے دل کو ہٹاتا ہوں تو لیمپ کی خاموش روشنی اور گھڑی کی ٹک ٹک اور بھی گھبرا دیتی ہے۔ میز پر رکھی ہوئی تصویروں کا سکون اور ان کی بے حس و حرکت روحوں کو دیکھ کر کسی قبرستان کا بھیانک منظر تصور میں آ کر ڈراتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کمرے کی تمام چیزیں اس وقت سو رہی ہیں اور میں اس وقت سگریٹ پینا چاہتا ہوں لیکن میں اس آواز سے خوف کھاتا ہوں جو دیا سلائی جلاتے وقت اس سنسان کیفیت کو اپنی درشتی سے پریشان کر دے گی۔ مجھے اس بل کھاتی ہوئی دھوئیں کی باریک دھار سے ڈر لگتا ہے جو سلگتے ہوئے سگریٹ سے ایک نازک اور پراسرار ناگ کی طرح نکل کر میرے سامنے کمرے کی تاریکی میں غائب ہو جائے گی۔ میں دروازے میں سے چمن کی کالی کالی جھاڑیوں کو کچھ دیر دیکھتا رہتا ہوں۔ تو مجھے یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ باہر کی تاریکی ایک مہیب خاموشی کے ساتھ آہستہ آہستہ کمرے میں داخل ہو رہی ہے اور میرے لیمپ کی روشنی مدھم ہوتی جا رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آہستہ سے اٹھ کر دبے پاؤں دروازے تک جا کر اسے جلدی سے بند کر دوں۔ لیکن میں ڈراؤنی کالی رات سے ڈرتا ہوں۔ میں ڈرتا ہوں کہیں میرے حواس اس کی ہوشربائی کے بے پناہ طلسم سے مسحور ہو کر رات کی تاریکی کے ساتھ نہ مل جائیں اور میں اس سکوت کے سمندر میں آہستہ سے ڈوب کر غائب نہ ہو جاؤں۔ مجھے صرف لمبے لمبے بکھرے ہوئے گھنے سیاہ لہروں والے بال دکھائی دے رہے ہیں اس حسین کے جس نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا ہو۔ ان کی ڈراؤنی سیاہی میری آنکھوں میں چھا رہی ہے حسن میری آنکھوں سے اوجھل ہے اور خیال میں ایک کانپتی ہوئی امید کی طرح ڈر ڈر کر جھجک رہا ہے۔ ہوا کے کمزور سے جھونکے میرے حلق میں خون کی سی ٹھنڈک پیدا کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھی میرے لٹکتے لمبے بال گر کر میری آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں تو مجھ پر ایک تھرتھرانے والا ڈر طاری ہو جاتا ہے۔ آنکھیں ان کو دیکھ کر ہیبت زدہ ہو جاتی ہیں۔ اور ہاتھ ان کو ہٹاتے ہوئے کانپتا ہے۔ زمین پر میرا سیاہ کمبل اس سکون سے پڑا ہے گویا رات نے اس پر اپنی لمبی لمبی انگلیاں پھیر کر ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ ہلکے سے اپنی خاموشی کا دھیما سا طلسم پھونک دیا ہے۔ میں اس کو ہاتھ لگاتے ہوئے سہم جاتا ہوں گویا پراسرار چپ چپ دنیا کا کوئی بھیانک سا منظر یک لخت مجھے اپنی وحشت دکھلائے گا۔ اور میں ہیبت ناک چیخ مارنے کی کوشش کروں گا۔ جو میرے منہ سے نہ نکلے گی۔ میرا گلا ان تصورات سے خشک ہو رہا ہے۔

میں اپنے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوں۔ لیکن وہ خشک ہو جاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میں کسی چیز کو نہ دیکھوں اور رات کی خاموشی اور میرے سکون میں کوئی اضطراب پیدا ہو جائے لیکن میں اپنے آپ کو کسی جادو میں جکڑے ہوئے پاتا ہوں۔ جو میری آنکھوں کو زور سے کھولے ہوئے ہے، جو میرے سینے کو دبا رہا ہے اور جو مجھے سانس نہیں لینے دیتا۔ گھڑی کی سوئیاں جن پر میں نے کوئی حرکت نہیں دیکھی اب کسی اور جگہ ہیں رات کے ساتھ ساتھ وہ بھی چپ چاپ آہستہ آہستہ سانپ کی طرح آگے سرکتی رہی ہیں۔ کیا کمرے کی دیواریں بھی اسی طرح قریب ہوتی جا رہی ہیں۔ کیا کائنات چاروں طرف سے آہستہ آہستہ تنگ ہو کر مجھے بھینچنے کیلئے میری طرف آ رہی ہے۔ اور کیا خاموشی اور تاریکی نے جادو سے مجھے اس تنہا بچھونے تک مرنے کے لئے یہاں باندھ رکھا ہے۔

باہر سڑک پر ایک تانگا گزر رہا ہے۔ یہ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز ہے۔ یہ پہیوں کی۔ دو آدمی آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ شاید تھیٹر سے واپس آئے ہوں گے۔ آج تھیٹر میں خدا جانے کونسا کھیل تھا۔ سگریٹ میں نے کہاں رکھے ہیں؟ دیا سلائی کی ڈبیا تو اس جیب میں ہے۔

میں اب سگریٹ پی رہا ہوں۔ اور رات اب میرے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ سوائے اس کے کہ میں اب سو جاؤں اور صبح پھر اٹھوں۔

(نیرنگِ خیال)

ایک غیر مطبوعہ کتاب کا دیباچہ

یہ کتاب ساٹھ مضامین کا مجموعہ ہے جو ۲۹ پاکستانی اور ۳۱ غیر پاکستانی (بیشتر امریکی) [illegible] مشاہیر کے خیالات و مشاہدات کے آئینہ دار ہیں۔ ہر حصے کے پہلے مضمون کو چھوڑ کر باقی مضامین کی ترتیب بلحاظ ابجد ہے ورنہ حفظ مراتب میں نہ معلوم کیا لغزشیں سرزد ہوتیں۔ پاکستانی مضامین چند ایک اور دیگر مضامین تمام تر انگریزی سے ترجمہ کئے گئے ہیں۔ مترجمین کا شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ یہ کام انہوں نے خوش اسلوبی سے انجام دیا۔

مجھے کتاب کا خیال ایڈورڈ آر مرو (EDWARD. R. MURROW) کی ایک تالیف دس آئی بلیو THIS I BELIEVE سے پیدا ہوا۔ مرو صاحب امریکہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے مشاہیر میں سے ہیں کولمبیا براڈکاسٹنگ سسٹم کے وائس پریذیڈنٹ ہیں۔ حالات حاضرہ خصوصاً خارجی اور بین الاقوامی معاملات کے ماہرین میں ان کا رتبہ بلند سمجھا جاتا ہے۔ ان تعلیمی مسائل سے بھی ان کو بہت دلچسپی ہے۔ لاکھوں لوگ ان کے ترتیب دئے ہوئے پروگرام بغور سنتے اور دیکھتے ہیں اور ان سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔

مرو صاحب اس سے بے حد متاثر ہوئے کہ پچھلی جنگ عظیم میں اہلِ انگلستان نے بہت ثابت قدمی دکھائی۔ باوجود بے سروسامانی کے دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اور یہی نہیں کہ تیغ و تفنگ کے جوہر دکھائے بلکہ اپنے قدیم اصولوں اور روایتوں کی پابندی میں بھی کبھی خم نہیں کھایا۔ چنانچہ حب وطن عدل و انصاف جمہوریت پسندی [illegible] جب بھی ان کے امتحان کی نوبت آئی ہر انگریز نے ٹھیک ٹھیک اپنے قدیم اصولوں کی پیروی کی۔ اور شدید خطرے کے لمحے میں بھی جب کہ دل یہی چاہتا ہے کہ کسی مانند ہمت میں پیچ نہ نکالی جائے اپنی روایات کو پس پشت نہ ڈالا۔ اس سے مرو صاحب نے یہ نتیجہ نکالا کہ کسی قوم کا عمل دراصل اس کے عمیق عقائد پر مبنی ہوتا ہے اور وہی کسی بحران کے زمانے میں رہنے کا راستے ہیں۔ یہاں سے انہیں تلاش ہوئی کہ امریکیوں کے عقائد کیا ہیں؟ اور اس غرض کے لئے انہوں نے بڑے بڑے لوگوں کی طرف رجوع کیا اور ان سے کہا کہ آپ اپنے عقائد اور خیالات کا مختصر سا خاکہ کھینچ دیجئے۔ اس کے جواب میں جو مضامین وصول ہوئے انہیں پہلے ایک اور پھر ایک دوسری کتاب میں شائع کیا ـــ دونوں کتابیں شوق سے پڑھی گئیں چند مضامین ان میں کے اس کتاب میں بھی شامل ہیں اور امید ہے دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

مکتبہ فرینکلن نے ایسا ہی سوال میری وساطت سے پاکستان کے مشاہیر کے سامنے پیش کیا۔ جن مہربانوں نے اس کے جواب میں مضمون عطا فرمایا میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔

پاکستانی اور امریکی مضامین یکجا شائع ہوں تو دل ان کا مقابلہ کرنے کو چاہتا ہے۔ دونوں ملکوں کا آپس میں جو تفاوت ہے وہ ظاہر ہے ایک امیر ملک، ایک غریب ملک ـــ ایک آزادی کا عادی، دوسرے کا تعارف آزادی سے بالکل ہی نیا ـــ ایک بیشتر مسیحیوں کا ملک، دوسرا مسلموں

ایک کی تاریخ یورپ سے وابستہ دوسرے کا ماضی یورپ کی مخالفت سے لبریز۔ ایک یورپین ڈھانچے کا ملک، دوسرا ایشیائی ڈھانچے کا۔ اس ہوتی ہے کہ دونوں ممالک کے مشاہیر کے خیالات میں جس قدر ہم آہنگی ہے وہ کس قدر زیادہ ہے۔ دونوں قنوطیت سے دست بردار، دونوں ایمان و عمل کے قائل، عزم و ہمت کے قائل، دونوں کے نزدیک معاشرتی خدمت بہترین عبادات کی میں سے ہے۔ البتہ امریکہ میں ان مدت کچھ سہولتیں اور آسائشیں عوام کو نصیب ہو چکی ہیں اور ہمارے ہاں ابھی بہت کچھ محض مستقبل میں ہے۔ لیکن فخر و مسرت کا مقام ہے ہمارے ہاں جو لوگ برسر کار ہیں یا جن کا معاشرے میں حصہ لینا لازم ہے یا جو ایسے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، جو بہت عرصے تک مرکز دید و نمایاں رہے گا، ان کے خیالات [illegible]۔ وہ بلندی کے خواہاں ہیں، وقت کا احساس رکھتے ہیں، معاشرتی خدمت کی اہمیت کو پہچانتے ہیں۔ کہ وہ زندگی کا جہد عظیم سمجھتے ہیں، وہ منزل سے دور سہی لیکن ترقی کی سمت انہیں باوجود اس کے زندگی کی ایسی ہی صاف دکھائی دے رہی ہے، امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک کو۔

سچ یہ ہے کہ میں اس کتاب کو اس نظر سے دیکھتا ہوں تو اس کی قدر بڑھ جاتی ہے اگر میری قوم بالواقع مجموعی طور پر ان خیالات کی علم بردار ہے جو مشاہیر نے اپنے مضامین میں واضح کئے ہیں۔ تو ہمارا مستقبل ایسا نہیں کہ ہم گھبرا جائیں۔ آپ بھی اس کتاب کو اسی نظر سے پڑھئے۔ تو خوشی کا باعث ہوگی۔

(بشکریہ مکتبہ فرینکلن)

چمپا اور دوسرے افسانے

دیباچہ

(مولانا عبدالمجید سالک) سالک (بٹالوی) کے افسانے بہت کم ہی چھپے ہیں اور صرف فرزانے اس کی سحر نگاری سے محروم۔ لیکن چہرہ نوازی کے جو خاص اس کی قلم طرازی کے ممنون احسان ہیں وہ ہمیشہ چشم قدردانی کی پتلی بنے رہیں گے۔

یہ انتخاب بہت عجلت سے مرتب کیا گیا ہے۔ کہ جب تک زندان کی چار دیواری سالک کو اہل نظر سے پوشیدہ رکھے۔ سالک کے شیدائی اس کے دانش دل کی ضیا پاشی سے محروم نہ رہیں۔ مگر وہ "گمنام" گمنامی کا شیدا وہ عزلت نشین محشر۔ وہ انجمن خلوت۔ اس وقت حراست زنداں سے آزاد ہوتا۔ تو یقین نہیں کہ وہ اپنی "گمنامی" کے نقاب کو یوں چاک چاک دیکھنا گوارا کر سکتا۔ کیونکہ اس کی نقادانہ نظر اور نگاہ انتخاب کبھی بیباک اور نکتہ چیں ثابت ہوتی — ایک وقت اور صرف ایک وقت — جب وہ اپنی بیش بہا تصنیفات کو کھول کر اپنے سامنے میز پر رکھ لیتا۔

وہ شخص جو ادب لطیف کے خیابان سے رہ نورد صحافت کی سنگلاخ زمین اور سیاسیات کے خارزار میں گامزن ہوا۔ جذبۂ وفا کو ہمیشہ اپنے سینے میں لئے پھرا۔ گلزار و گل گشت میں یہی رنگ دل تھا۔ بادیۂ دشت میں آج بھی اس کی آبلہ پائی ہے اس سے اہل مذاق برسوں لطف اندوز ہوتے رہے اور اس سے اہل درد آج اشک ریز و غمزدہ ہیں۔

افسانہ نگاری میں وفا کو وہ ہمیشہ "عشق کی دلہن" سمجھتا رہا۔ اور عورت کے دل کو خواہ وہ "فلمیا کی کمسن" ہی کیوں نہ ہو اس کا حجلۂ عروسی۔ اس کی "چمپا" نے اپنے سوامی کے قدموں میں جان دی۔ اس کی "عذرا" کی وفا حسد اور رشک کو پامال کر گئی۔ "بھولا" کی آہ و زاری نے دیوتاؤں کے دل ہلا دئے اور "موہنی" کے عشق کا شعلہ اب تک رات کی ہیبت اور تاریکی میں پہاڑ کی برفانی چوٹیوں پر درخشاں نظر آتا ہے۔

ہمارے شعور و حسن کے آئینے میں عشق کو اپنا چہرہ اکثر دلبرانہ سا نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ عشق جنوں کو اپنا ایک دوسرا نام سمجھتا ہے "سدا بہار ٹاپو کا ہندی" میں عکس اور معکوس۔ اسم اور مسمّیٰ دونوں سامنے کھڑے ہیں۔ اور جو نظر فریب نظارہ ہمارے پیش نگاہ ہے وہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم ماتھے پر تیوری چڑھائے ایک نقادانہ اور مربیانہ انداز میں کھڑے ہو کر اس پر تبصرہ کریں۔ ہم صرف یہی کر سکتے ہیں کہ اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اپنے حواس کو محویت میں گم کر دیں اور کتاب کو اپنے بے جان ہاتھ سے گر پڑنے دیں۔

سالک کی تحریر ساز دل میں ضرور کوئی نہ کوئی تار ایسا چھیڑ جاتی ہے۔ جو نغمے کے خاموش ہو جانے کے بعد بھی تھرتھراتا رہتا ہے۔ اور بارہا میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ایسے تار بھی ہیں جن کو مضراب نے نہیں چھیڑا۔ پھر بھی ہم آہنگ ہیں اور کانپ رہے ہیں۔ "بھولا" ایک چھوٹا سا افسانہ ہے لیکن "بھولا" کو جیسے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ سالک نے مجھ سے کبھی نہیں کہا۔ لیکن مجھے اس وفا شعار رعنا دوشیزہ اس عصمت و عفت کی دیوی کے ماتھے

پر تک وحشیانہ نظر آتا ہے۔ ہرشاد کی کشتی دیکھتے ہی دیکھتے نیلے افق میں غائب ہوگئی ہے لیکن اس کے چہرے پر عشق کی دل دوز وحشت اب تک بس رہی ہے۔

سالک کو منتہائے جذبات کا بہت شوق ہے۔ تہذیب و تمدن کے دائرے کے اندر لاہور اور بمبئی کے خوشنما بنگلوں میں اس نے جذبات کو پابجولاں دیکھا تو انہیں سمندر پار ٹاپو میں دلدلوں اور سرکنڈے کے جھنڈوں کے بیچ میں لے جا کر ان کی عریانی، مستی اور پاکیزگی کو آزاد چھوڑ دیا۔ جہاں مرد صرف مرد اور عورت صرف عورت ہوتی ہے جہاں کے طوفان سخت بلاخیز ہیں اور درندے سخت خونخوار

لیکن سالک کا دل حیات کی نزاکتوں اور جذبات کی لطافتوں سے ناآشنا نہیں۔ اس کے سینے میں بے شمار ہلکے ہلکے درد اور ہلکی ہلکی کسکیں اٹھتی ہیں۔ مگر غضب یہ ہے کہ وہ آفات و مصائب کو دلیرانہ برداشت کرنے والا اچھا مرد اس شعریت کو اپنی فطرت کی کمزوری سمجھتا ہے۔ "جانِ عید" جو اس کے قلم کی بے ساختگی اور بے تصنعی اور اس کی طبیعت کی نازکی کا بہترین نمونہ ہے۔ ایک سرگوشی ہے جو کبھی بلند آہنگ نہیں ہوتی۔

میں یہ کہہ دیتا کہ سالک بارہا ایک لفظ سے وہ کام لیتا ہے جس کے سرانجام دینے میں ہندوستان کے اکثر انشا پردازوں کے لمبے لمبے فقرے ناکام رہتے ہیں۔ الفاظ میں وہ موسیقی اور شیرینی بھر دیتا ہے جو صوت کو معنی سے زیادہ دلآویز بنا دیتی ہے لیکن مجھے اس کے کہنے سے سالک کی "چترا" کا ذکر کرنا پڑے گا اور وہ اس ادیب سحر طراز اور شاعر شیریں مقال، اس آئینہ دار فکر کے ذوقِ سخن کا ایک دوسرا پہلو ہے۔

میری یہ ہذیان تحریری سالک کی کافر ماجرائی کے ہمرکاب ہے۔ اس لئے میں محسوس کرتا ہوں کہ حیاتِ ابدی کا دامن میرے ہاتھوں میں ہے۔ مجھے اس کی کبھی جرأت نہ ہوتی اگر مجھے یہ فخر حاصل نہ ہوتا کہ میرے نیاز مندانہ تبسم حوصلہ افزا کو اکثر سالک کے لبوں پر کھیلتے ہوئے دیکھا ہے۔

آج وہ حراست میں ہے اور شاید اب بھی مسکرا رہا ہے۔ نیاز مند انہیں پھر اس مسکراہٹ کو دیکھیں۔

۱۹۲۲ء

"پطرس"

نغمہ زار

ابوالاثر حفیظ جالندھری کی کتاب کا دیباچہ

جالندھر کے نغمہ پرور شہر نے حفیظ نامی ایک ساحر پیدا کیا ہے جو کچھ عرصے سے لاہور کے مشاعروں اور ہندوستان کے ادبی حلقوں کو مسحور کر رہا ہے جس کے قلم کی ایک بے پروا جنبش سے موسیقی کی روح کانپ کر بیدار ہو جاتی ہے۔ قدرت کی رنگینیاں تصویریں بن بن کر آنکھوں کے سامنے آتی ہیں اور غائب ہو جاتی ہیں اور لطافت اور نزاکت شاعری کا جھلملاتا جامہ پہن کر رقص کرنے لگ جاتی ہیں۔

ساون رت، گھنگھور گھٹاؤں میں کھیلتی ہوئی بجلی، موروں کی جھنکار، پپیہوں کی پکار، برسات کی ٹھنڈی ہوا، ہوا میں اڑتے ہوئے آنچل، آنکھوں میں تمنائے دید، درد فراق کے آنسو، دل کی انتظاری دھڑکن، یہ ایک مست کیف شاعری کی وہ دنیا ہے جس میں حفیظ گاتا پھرتا ہے، جب اس کا دل بھر آتا ہے تو وہ آنسو بہا دیتا ہے، جب اس کے دل میں ایک ہوک اٹھتی ہے تو وہ اسے اپنے سروں میں لاتا ہے اور سننے والوں کا کلیجہ مسل دیتا ہے۔

یہ اس کے کلام کا مجموعہ ہے۔ چند ورق ہیں۔ خشک طبیعتوں کو جا بجا اس میں "فن" کے نقائص، ادب کی خامیاں نظر آئیں گی۔ اہل ذوق دیکھیں گے اور جانیں گے کہ ایک وارفتہ عاشق مزاج عشق کے اتھاہ سمندر میں خود بھی کس طرح ڈگمگاتا ہے اور دوسروں کے دل بھی کس طرح ہلاتا ہے۔ حفیظ ایک ایسا شاعر ہے جس کے قدم پامال رستے سے ادھر ادھر جا پڑتے ہیں۔ لیکن یہ ایک راہ گم کردہ کی آوارگی نہیں، ایک مست کی لغزشیں ہیں۔ نشے میں چور، کیف میں سرشار، جو پیتا بھی ہے اور پلاتا بھی ہے۔ پیالے میں بھی بھر کر دیتا ہے اور یوں بھی لنڈھاتا ہے۔ ایک آنا ہے جو گاتا ہے اور الفاظ اس کی زبان پر ناچتے ہیں۔

ہمارے شاعر برسوں سے ترک شیرازی پرست ہیں۔ ایک ایسی شراب طہور سے بے خود ہونے کا بہانہ کر رہے ہیں جو نہ خود پی سکتے ہیں نہ اوروں کو پلا سکتے ہیں۔ شاعری ایک فریب ہے لیکن اس تصنع کا کیا نام ہے جو کسی کو دھوکہ نہ دے سکے؟

حفیظ کی نظر ہندوستان کی دلہن پر ہے اور وہ اس جھلک پر فدا ہے جو باریک آنچل میں سے دکھائی دیتی ہے لیکن ابھی وہ ترک شیرازی کی غلامی سے بالکل آزاد نہیں ہوا اور اس کو کنکھیوں سے کبھی کبھی دیکھ لیتا ہے۔ یہ بے وفائی آخر کب تک؟ عاشق کہ نظر باز؟

۱۹۲۵ء "پطرس"

جھولنے

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی کتاب کا دیباچہ

ایسی ہی پہلی کتاب ہے جو چھوٹے بچوں کے لیے لکھی گئی ہے دیباچہ کا وجود پڑتا چاہیے تھا لیکن بچوں کے ساتھ قدرت نے والدین کی اور ان کے استاد کی جگہ بھی رکھی ہے صوفی تبسم کو مصنف کتاب ہونے کے علاوہ وہ والد بھی ہیں اور استاد بھی، یہ گوارا ہوا کہ بچوں کو تو بہلایا جائے اور والدین اور استادوں کی پروا نہ کی جائے۔ اس لیے قرار پایا کہ وہ بچوں کو نظمیں سنائیں اور میں والدین وغیرہ کو باتوں میں لگائے رکھوں۔

بچوں کا بہلانا سہل ہے۔ بڑوں کا بہلانا سہل نہیں۔ بچوں نے تو یہ پڑھا کہ "چیچوں چیچوں چاچا، گھڑی پہ چوہا ناچا" اور خوش ہوئے، بڑے کہیں گے چیچوں سرے سے تو کسی لغت میں دیکھا نہیں۔ اور اگر چاچا سے مراد چچا ہے تو یہ شائستہ لوگوں کی زبان نہیں۔ اور یہ جو گھڑی پہ چوہا ناچا تو آخر کیوں؟ اور بہرحال اس تک بندی کا نتیجہ کیا؟ اس سے بچوں کو کون سا سبق حاصل ہوا؟

یہ سب سوال نہایت ہی دانشمندانہ سوال ہیں۔ بالفاظ دیگر ان بڑوں کے سوال ہیں۔ جو اپنا بچپن بھلا بیٹھے ہیں۔ یا جو یہ تہیہ کیے بیٹھے ہیں کہ جن باتوں سے ان کا بچپن رنگین ہوا تھا وہ اس دنیا میں اب نہ دہرائی جائیں گی۔ تک بندی کا مطلب بے فائدہ بات ہے اور اسے مرنا چاہیے۔

خدا کا شکر ہے صوفی تبسم کو ایک ایسی روحانی عطا ہوئی ہے کہ وہ اس کی لذت سے ابھی محروم نہیں ہوئے۔ وہ جانتے ہیں کہ بچوں کا ذہن وہ عجیب و غریب دنیا ہے جس میں پیڑوں پر ناگ ناچتے ہیں اور تتلیاں بیر کھاتی ہیں اور ٹر ٹر موڑ، چھم چھم، ٹم ٹم میں آہنگ اور لے کی وہ تمام لذتیں سما جاتی ہیں جو بڑے ہو کر تان سین کی کرامات سے بھی حاصل نہیں ہوتیں۔ یہ وہ دنیا ہے جس میں گڑیاں اور جانور اور پرندے اور انسان سب ایک دوسرے کے دوست ہیں اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں۔ گویا سب مخلوق ایک ہی خدا کی مخلوق ہوتی ہے۔ بڑے ہو کر ذہن انسانی ہزار فلسفیانہ کش مکش اور خیال آفرینی کے بعد بھی مشکل سے اس سطح پر پہنچتا ہے۔

اس لیے قابل رشک ہیں صوفی تبسم کہ بلا تکلف اس رنگین دنیا میں چہچہا رہے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ صوفی تبسم ایک کہنہ مشق سخن سنج اور سخن گو ہیں۔ اردو فارسی غزل استادانہ کہتے ہیں اور جذبے اور ادا کی باریکیوں کو خوب سمجھتے ہیں یہ مجموعہ ان کی شاعری میں اتوار کا دن ہے اور یوں اتوار منانے میں انھوں نے بڑے بڑے اساتذہ کا تتبع کیا ہے لیکن یہ نہ سمجھیے کہ اس دن وہ بالکل ہی خالی الذہن ہو کر بیٹھے ہیں اور جو منہ میں آئے کہہ ڈالتے ہیں۔ غور سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ یہ تمام قافیے اور وزن اور آہنگ اور الفاظ کی نزاکتوں پر قادر ہوئے بغیر ممکن نہ تھا۔ اس لیے صوفی تبسم کی پختہ کاری اور طباعی کے شواہد اس میں جا بجا آپ کو نظر آئیں گے۔ ایسے کلام کا درجہ مہمل ممتنع کا درجہ ہے۔ جیسے سہل ممتنع سہل نہیں ہوتا اسی طرح مہمل ممتنع بھی مہمل نہیں ہوتا۔ دعا ہے کہ صوفی تبسم کا یہ بچپن ہمیشہ قائم رہے اور ان کے قدر دان ہمیشہ انہیں یہ کہنے کے قابل ہوں کہ — چہل سال عمر عزیزت گذشت مزاج تو از حال طفلی نگشت۔ تاثیر

دہلی ۵ رجولائی ۱۹۴۹ء

ایران میں اجنبی

ن۔م۔ راشد کی نظموں کے دوسرے مجموعہ کی تمہید

راشد صاحب! یہ مجموعہ جب چھپ جائے گا تو آپ ایک نسخہ مجھے مفت بھیجیں گے۔ بلکہ اس پر میرا نام بھی اپنے قلم سے لکھ دیں گے۔ اور میں فخر سے لوگوں کو دکھاتا پھروں گا۔ اور اسے بلا وجہ اپنا ہی کمال سمجھوں گا۔ کہ میرا ایک شاگرد اردو کے دورِ حاضر کا بہت بڑا شاعر ہوا اور میری اس کمزوری پر کہ خواہ مخواہ آپ کی شاعری پر اپنا حق جتا رہا ہوں ہنسیں گے بھی اور اسے ضعف الذہن سمجھ کر معاف بھی کر دیں گے لیکن یہ تو آپ نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا کہ قبل از وقت اس کتاب کے پروف مجھے پڑھنے کو دے دئے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں انہیں کس شوق کے ساتھ لیے یو این کی غلام گردشوں میں اٹھائے اٹھائے پھرا ہوں کہ ع

کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

ایران کو بیچ میں لا کر زیادہ تر اتفاقات میں آپ سے کیسی مزے مزے کی بحثیں یو این کے کیفے ٹیریا میں ہوئی ہیں۔ اور ہم نے آپ کی شاعری کو سمجھانے سمجھنے کے بہانے سے اردو سے کتنی عشق بازی کی ہے۔ اجازت ہو تو آپ کے نام ایک مکتوب بھی اس عاشقی میں لکھ ڈالوں اور آپ سے مجھے جو محبت ہے اس کا عیب پوش رنگین پردہ اپنی بے سود نگاری پر ڈال لوں۔ تاکہ کوئی بات میرے پاس کہنے کے قابل نہ ہو اسے لوگ سننے کے قابل مزید کہیں ؎

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

راشد صاحب! وہ دن آپ کو یاد ہے جب آپ کی نظم "اتفاقات" شائع ہوئی تھی اور میں آپ کے گھر پر قلعہ گوجر سنگھ میں والہانہ آپ کو مبارک باد دینے آیا تھا۔ ان دنوں ابھی جدید شعرا پر لعن طعن برابر ہو رہی تھی۔ اور ان کی نئی آزادی اور عروض کی بے راہ روی پر پھبتیاں کسی جاتی تھیں لیکن آج یہ کیفیت ہے کہ لوگ پرانی وضع کی شاعری سے اکتاتے جا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ غزل بھی جب تک نئے شباب، نئی نظر اور نئے اسلوب کی حامل نہ ہو بزم میں توقیر نہیں پاتی۔

اس انقلاب میں کن کن قوتوں کا ہاتھ ہے اسے مورخ اپنے مقام پر بیان کرے گا۔ لیکن جن لوگوں کو آپ کے ہم عصر ہونے کا فخر حاصل ہے وہ جانتے ہیں کہ دورِ جدید کے اکثر شعرا نے آپ اور فیض اور آپ ہی جیسے معدودے چند باغیوں سے ہدایت پائی ہے ورنہ نہ معلوم ہماری شاعری کی کشتی اور کتنا عرصہ دلدل میں پھنسی رہتی۔ جیسا کہ آپ نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے آپ لوگوں کی تربیت میں نئے نئے علوم کو دخل تھا جس سے متقدمین بے بہرہ تھے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ دورِ جدید کے ذہنی اور معاشرتی طوفانوں اور زلزلوں کی بدولت آپ کو ایک نئی بینش نصیب ہوئی۔ اور آپ لوگوں نے وہ افق دیکھے۔

جو اس سے قبل نظموں سے واضح تھے، یہ ممکن تھا کہ آپ کی شاعری ایک نیا انداز فکر اور نئی زبان، نیا لہجہ (بقول آپ کے نئی ہیئت) اپنے ساتھ نہ لاتی۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کی طفیل کتنے نوخیز شاعروں کی بہت بڑی جماعت آپ کے اسلوب بیان میں آخر کچھ ایسا نشہ ہے۔ ان کے بعض معتقدین کچھ زیادہ ہی پی گئے۔ یہ جاذبیت جو کہ جادو فسوں میں بھی ہے لیکن فسوں کی کمی اور لاحق نقصے نظم میں نظر آ جاتی ہیں ہر پتے اور ہر پھول میں نظر نہیں آتی۔ اس کے مقابلے میں آپ کا چہیتا نوجوان شاعر کم بہت جلد پہچانا گیا ہے۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بزم میں شمع پہلے کس کے سامنے رکھی جائے۔ اس قسم کا سابقہ ہی مقصود تھا اس سے تو صرف یہ واضح کرنا تھا کہ آپ سے جو شعرا رجحانات پیدا ہوئے وہ آپ کے تعارف لفظ کے امین کیا علاوہ تھا۔

ایران میں اجنبی کا عنوان ایک دلچسپ فریب ہے۔ جس کے آپ خود بھی شکار ہوئے۔ اس عنوان کے تحت میں جو تیرہ نظمیں آپ نے یکجا کر دی ہیں ان میں اس جذبے کا سراغ کہیں نہیں ملتا۔ جسے عزیز لکھنوی نے ایک مطلع میں یوں بیان کیا ہے ؎

دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا
وہ مرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا

(داخلِ ایراں ہونا؟) ہر چند کہ ایران آپ کا جغرافیائی وطن نہیں اور تہران اور لاہور کا فرق واضح ہے تاہم جس ذہنی اور جذباتی دنیا میں آپ کی شاعری بار لگاتی ہے وہ ایران سے دور نہیں بلکہ وہ تو ہندوستان سے دور تر ہو گی۔ سعدی اور حافظ اور خیام اور رومی اور نظیری کی دنیا میں آپ اجنبی کیوں کر ہوتے؟ ایران تو ہمارے شعرا کا روحانی وطن ہے۔ ہندوستان میں جو پردیسیوں کی سی اداسی ذہن پر چھائی رہتی ہے وہ اسے ایران اور عربستان کی ذہنی یا جسمانی سیاحت سے دور کرتے تھے۔ آپ کے قطعات اس بات کے گواہ ہیں کہ آپ کو ایران میں بیگانگی کا نہیں بلکہ ایک ہی یگانگت کا احساس ہوا من و سلوٰی۔ میں تو آپ ایران سے درپردہ یہی کہہ رہے ہیں کہ میں اجنبی نظر آتا ہوں، اجنبی ہوں نہیں ؎

بس ایک ہی عنکبوت کا جال ہے کہ جس میں
ہم ایشیائی اسیر ہو کر تڑپ رہے ہیں

اور پھر زبان بھی آپ کے رضائی بھائی کی زبان ہے اجنبی کی نہیں ——

خدائے برتر

یہ داریوش بزرگ کی سرزمیں
یہ نوشیرواں عادل کی داد گاہیں
تصوف و حکمت و ادب کے نگار خانے

آپ کے قلم نے تو آپ کے لئے ایران میں اجنبی کا لقب انتخاب کیا لیکن آپ کا دل پکار پکار کر یہی کہہ رہا ہے کہ میں ایک عجمی ہوں اور جانِ عجم سے ملنے آیا ہوں۔

یہ ایک عجیب واقعہ ہے کہ جب آپ انگریزی وردی پہن کر ایران پہنچے تو ماحول نے کچھ اس طرح آپ کا دامن کھینچا اور ماضی کی یادوں نے آپ کے دل پر کچھ ایسی دستک دی کہ آپ ہندوستان اور انگریز دونوں کو بھول گئے اور آپ کے سیاہ فام "جسم" میں ایشیائی روح بیدار ہو گئی۔ وہ احساس مظلومیت جس سے ہم میں کوئی ہندی نا آشنا تھا۔ اس میں ایک نئی کسک پیدا ہوئی اور غیر کے بے پناہ بچھڑے ہوئے "ستم" نے ایک نئے انداز سے آپ کو چونکا دیا۔ ایشیائیوں کو آپ نے دیکھا کہ ——

قیدی جو ادھر سرداروں کی اک ڈار کا غل ہے
اور یہ جن کی راہوں پر تیز گامی سے جا رہے ہیں
تو آپ بہتر، یہ آزمائے ـــ
ان دیکھے درخشندہ شہروں کی
رہ فصیلوں کو مضبوط کر دو!
ہر اک برج و بارو پر اپنے نگہبان چڑھا دو۔
گھروں میں ہوا کے سوا
سب صداؤں کی شمعیں بجھا دو!
کہ باہر فصیلوں کے نیچے
کئی دن سے رہزن ہیں خیمہ فگن

ایسے چونکا دینے والے اشعار آپ کے مجموعہ میں کتنی جگہ ملتے ہیں۔ ہمارے ہاں وطنی شاعر بھی ہوئے ہیں اور قومی شاعر بھی، اخلاقی بھی ۔ اور اشتراکی بھی لیکن جہاں تک میری نگاہ پہنچتی ہے ایشیائی شاعر آپ کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔

کیا یہ احساس ایک قسم کا سیاسی احساس ہے؟ کیا یہ کہنا کافی ہے کہ اس دور میں راشدؔ نے سیاسیات کا رخ کیا؟ کیا آپ کی اس رنگ کی نظمیں سیاسی کہلائیں گی؟ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا تسمیہ تو اہل مکتب کے سوا کسی کو پسند نہ آئے گا۔ آپ کا شمار "سیاسی شاعروں" میں کرنا کور ذوقی معلوم ہوتا ہے کسی نازک مزاج کی اس سے تشفی ہرگز نہ ہوگی کیوں کہ اکثر مقام ایسے ہیں جہاں ہر چند کہ آپ سیاست کے رہبان پکڑے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن آپ کی نظر اور جذبوں پر پڑ رہی ہے اور روح کی بعض گہرائیاں آپ کو ایسی نظر آتی ہیں۔ جو محض سیاسیات کی تہ سے عمیق تر ہیں۔ مثال کے طور پر "کیمیاگر" کو لیجئے جو بظاہر ایرانی سیاست کے ایک دور کا مرقع ہے۔ شروع شروع میں تو اس نظم کا مقصد واضح اور سہل معلوم ہوتا ہے لیکن پارہ بہ پارہ نظم کی حرارت بڑھتی جاتی ہے بات آمریت اور آمر سے شروع ہوئی تھی لیکن ذیل کے اشعار ایسی خود بینی کا المیہ ہیں جو اپنی سزا اپنے ساتھ لاتی ہے اور جس کی گرفت جنوں کی سی گرفت ہے ـــ

مگر وہ تیری حد سے گزری ہوئی رازداری
کہ جس نے تجھے
اپنے افکار کے قید خانے میں
محصور سا کر دیا تھا
وہ زنداں جہاں گھوم پھر کر نگاہیں
فقط اپنا چہرہ دکھاتی تھیں تجھ کو
جہاں ہر عقیدے کو تو
اپنے الہام کے شیشۂ گرد میں دیکھتا ہے

جہاں ایک چھوٹا سا مدرسہ بھی بنایا تھا
جس میں حق کے متلاشی اک کرن کا گنبد ہو
اسی کا تذکرہ اب رہ
کہنے کو باتیں بہت تھیں
گو سننے والے کہیں بھی نہ تھے
اور تھے بھی تو بہرے ہو گئے تھے

اس نظم کو سیاسی کہہ کے ٹال دینا محض کج بحثی ہے۔ یہ تو ایک مرثیہ ہے جو آپ نے خود پسند سا نوں پر لکھا ہے جو خود ہی اپنے زمانی ہو جاتے ہیں۔ بس حال کا نقشہ جو انتہائی قوت کی انتہائی سزا ہے۔

آپ کے نیاز مند پہلے بھی اس بات سے بے خبر نہ تھے اور اب آپ کے مجموعے نے دوبارہ اس کی تصدیق کر دی۔ کہ آپ کا مزاج شاعری کا بہت حد تک شوکت و شدت سے رنگ پکڑتا ہے۔ لیکن الفاظ پر محمول کیجئے دوسری کے جذبات پر گر سادہ الفاظ و جذبات کی یہ تیز محض سوجھ بوجھ سہولت ہے اس پر بہت بوجھل نہ چلئے ہیے۔ شوکت لیجئے ان اساتذہ کو چھوڑ کر جو خلیفہ زبان کے ماہر بھی تھے۔ اور شعر میں اس سے گریز بھی کرتے تھے۔ (بلکہ افسوس کہ بعض اوقات اسی کو شاعری کے لئے کافی سمجھتے تھے) ہمارے بیشتر شعراء خصوصاً پنجاب کے اردو شعراء کے ہاں سنگین اور گمبھیر الفاظ ملتے ہیں۔ وہ شعر کہتے نہیں سجاتے ہیں اور اس مقصد کے لئے کثرت سے لغت کو ایران اور عربستان کا جبہ و دستار پہنا دیتے ہیں۔ ہر کوئی بات بھی ہو تو اسے سر تکلف کو کسی میں کر کے فربہ کر لیتے ہیں۔ سالہا سال میں یہ شعر جھوم جھوم کے پڑھتا رہا

کبھی قبلہ رو جو کھڑا ہوا تو حرم سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

مگر حسن و نازک اس میں عجز و ندامت کہاں ہے۔ رفتہ رفتہ احساس ہوا کہ جو جتنا بھی تھا اس سے لغت کا مقصد کہیں بڑھ کر ہے الفاظ ایسے دلکش ہیں کہ معنی تک نہیں پہنچنے دیتے۔ ہمارے جدید شعراء اس بارے میں اکثر قدامت پسند ہیں۔ لغت میں کوئی جدت دکھاتے بھی ہیں تو بس اتنی کہ ولایت ایران سے چند اور الفاظ بہ طور سوغات کے لے آتے ہیں یا اگلے سال کے فارسی الفاظ کو نئی ترکیب سے شعر میں جڑ دیتے ہیں۔ الفاظ کے بارے میں وہ ابھی تک غالب کے قائل ہیں کہ جو شعر و ہماری کبھی برہمن کی پابندی نہیں کر سکتے اور جس لفظ کی قسمت میں نثر کی خدمت لکھا ہے اس کی رسائی آستان شعر تک کبھی نہ ہو گی اس سے ہماری شاعری پر کئی راہیں مسدود ہو گئی ہیں جنہیں کھولنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ نہ معلوم فارسی اور عربی کے تسلط سے ہماری شاعری کو اپنے شکنجے سے ہٹائے پھریں گی اور وہ دن کب آئے گا جب ہمارے شعراء اپنی زبان کو نہ دیں گے۔ اور قیام پاکستان کے بعد کہ وہ لوگ جن کی مادری زبان اردو ہے اگر پاکستان میں ہیں تو اقلیت میں ہیں۔ اور اگر ہندوستان میں ہیں تو ان سے رشتہ ٹوٹ چکا۔ نہ معلوم "ہماری اپنی زبان" آئندہ کیا شکل اختیار کرے گی۔ خیر میں ایک آپ ہی کا کلام لے کر بتلاتا ہوں اس عالم میں ہم بھی بیٹھے ہیں۔ غنیمت بلاشک ہے کہ آپ پڑھنے والوں کو محض الجھن تو نہیں مارتے بلکہ جہاں بے اعتدالی بھی کرتے ہیں وہاں بھی گرما ہی دیتے ہیں۔ چنانچہ مجھے آپ کے "داریوش" اور "ولاک" اور "لباس کبودی" اور "سپاہان" اور "گرد راہی" و الخ سب گوارا ہیں۔ بلکہ میں آپ کی قوت کی داد دیتا ہوں کہ آپ نے بڑے بڑے گراں الفاظ کو بھی ایسا مطیع کر لیا ہے کہ خانہ زاد معلوم ہوتے ہیں آپ جب بھی انہیں بلائیں حاضر ہو جاتے ہیں اور ہر خدمت بجا لاتے ہیں ــــ

شہر و قصبے کے مضافات و بلاد
جو بازار میں انتہائی گراں سکے
اس سے کسے انکار ہے کہ اپنی چند اچھیوں کی بدولت آپ یہ بھی عطا فرما سکتے ہیں ــــ

منو کے ہیں ناظم سجتے ہوئے برہمن
کہ جن کا سایہ بھی برہمن کے لئے
ہے وزرِ شبِ زمستاں
وہ سوچتے ہیں
کہیں یہ ممکن ہے
بیچ ڈالے گا
ہم کو بردہ فروشِ افرنگ
اب اسی برہمن کے ہاتھوں
کہ جس کے صدیوں پرانے پیسے
آج بھی گروی ہیں ہم سب
جواب بھی چاہئے
آرزو کے لئے ہم سے لدِ عرفاں

ایسے شعروں سے محروم رہ جانا کسے منظور ہوگا۔

باقی رہی شدت تو اس کی رمق آپ میں آغاز ہی سے پائی جاتی ہے اس کے لئے ہماری تنقیدی زبان میں کوئی مناسب لفظ نہیں ملتا۔ سیاق و سباق کے اعتبار سے کبھی اسے جوش کہہ لیتے ہیں کبھی جذبہ۔ لیکن مجھے تلاش ایسے لفظ کی ہے جس میں جوش اور جذبے کے علاوہ کچھ درشتی بھی پائی جائے جیسے کوئی کسی سے انتقام لے رہا ہو جب شدت اس حد تک پہنچے تو مزاج کچھ تلخ ہو جاتا ہے شاعر اپنی ہی کیاریوں کو روندنے لگتا ہے جیسے بچہ ضد میں آکر چیزیں توڑ ڈالے۔ شروع شروع میں یہ منہ زوری غالباً آپ کے شباب کا تقاضا تھی اور چونکہ ہمارے بیشتر جدید شعرا جوان ہیں یا جوانی کے دنوں میں اسی سے کام لیا گیا۔ اور علاوہ برآں آزادی (سیاسی یا معاشی یا فنی) کی پیاس سے ہمیشہ ان پر ایک اضطراب طاری رہتا ہے اس لئے اس سلسلے میں آپ تنہا نہیں مگر آپ کی محبوب نظمیں وہی ہیں جن میں اس شدت پر شاعری غالب آئی اور اسے اپنے پیمانے سے بڑھنے نہ دیا۔ مثلاً میں کہتا ہوں کہ تہہ تک میں آپ اس شدت پر پورا قابو نہ پا سکے جن کا "درویش" اور "تیل کے سوداگر" میں قائل ہونا پڑتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی شاعری پختگی کے اس درجہ تک جا پہنچی ہے۔ جہاں درشتی سے آپ کا قلم نا آشنا ہوا جاتا ہے۔ "درویش" اور "سوداگر" جیسی نظمیں دیر تک دلوں میں گونجتی رہیں گی۔ کیونکہ کنایہ جو شاعری کی جان ہے ان نظموں میں باوجود جوش اور جذبے کے شدت کے ہاتھوں کند ہونے نہیں پایا۔

میرے ہاتھ میں ہاتھ دے دو
میرے ہاتھ میں ہاتھ دے دو

کو بھی میں نے بار بار زندگی کی چوٹیوں پر شعاعیں

یہ حسن کی وہ تین قسمیں ہیں جنہیں شاعر نے بے ساختگی کے ساتھ دو تین مصرعوں میں پیش کر دیا ہے۔ "درویش" کا یہ پارہ ابھی آپ کو یاد ہوگا۔

یہ دور دیس
جن کے صاحب وجد
وہ صحرا کے دیرینہ رہنے والے
تھک کے رہنے والے
اسی کی طرح تھے
تہی دست، وہ خاک تیرہ میں غلطاں
جو تسلیم کے بے نیازی خمار
ہمیشہ کی محرومیوں ہی کو اپنے لئے
بال و پر جانتے تھے
جنہیں تھی نہ فروغ گدائی کی خاطر
ملال شہی کی بقا بھی گراں
جو لاشوں میں چلتے تھے
کہتے تھے لاشوں سے
"سو گئے رہو
صبح فردا کہیں بھی نہیں ہے"
وہ جن کے لئے حریت کی نہایت یہی تھی
کہ شاہوں کا اظہار شاہنشہی حد سے بڑھنے نہ پائے
بھلا ان کی کس کو خبر ہے؟

"لاشوں" کا ذکر آیا تو میں نے سمجھا کہ آپ پھر بپھرنے لگے۔ نہ معلوم کیا درشت کلامی کریں گے لیکن ضبط ہاتھ سے نہ چھوٹا اور آخری جملے نے اپنی ملائمت سے وہ اثر پیدا کیا جو شدت سے نہ ہو سکتا۔ اس مجموعے میں "درویش" کیا باعتبار صنعت اور کیا باعتبار واردات قلب اور مزاج شاعری کے کامل کلام ہے۔

آپ نے بجا فرمایا کہ "بعض قطعے محض منظوم مختصر افسانے ہیں جن میں زیادہ زور کسی تصویر کشی پر ہے یا کسی واقعے کو بیان کرنا ہے تاکہ اس سے وہ تاثر پیدا ہو سکے جو شاعر کے دل پر ہوا تھا۔ بعض نظموں کی حیثیت اسکیچ یا انگارے کی سی ہے بعض خود کلامی سے زیادہ نہیں": یہ ہمہ گیری بھی جدید شاعری کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ آپ نے اس نئے اسلوب کو جن کے آپ بانیوں میں ہیں ہر طرح آزمایا ہے جس کی مثالیں اس مجموعہ میں جا بجا پائی جاتی ہیں۔ آپ نے معاملے کو جس بے تکلفی سے اپنی نظموں میں نبھایا ہے وہ یقیناً پڑھنے والوں کی نظر سے چھپی نہ رہے گی۔ ہماری شاعری میں داستان گوئی نئی چیز نہیں

اور جہاں داستان یا افسانہ اور رواں سلسلے سے مفر نہیں۔ لیکن قدما کے سلسلے الف سے بے الف لیلہ ..... کی ترتیب سے سیدھی سڑک پر لڑھکتے چلتے تھے —

یہ زبانی تھا رتی تھی وہاں
حال کرتی تھی عرض اپنا احوال

رقص کرتے تھا۔ لیکن جدید شاعری میں معاملہ ایک پیچدار معاملہ ہے جہاں متکلم کے جذبات کے ساتھ ساتھ نشیب و فراز، شاعر کے خیالات، کرداروں کی آپس میں الجھن سب کو ایک ساتھ نبھانا پڑتا ہے۔ یہ مہم آپ کو اس مجموعے میں جا بجا پیش آئی۔ اور آپ نے اسے جا بجا چابک دستی سے سر کیا ہے۔ آپ وسعت مضامین میں قدرتی مناظر کا ذکر کرنا بھول گئے۔ حالانکہ یہ خوبی آپ کی نظموں میں بہت نمایاں ہے —

زمستاں کے دن تھے
لگاتار ہوتی رہی تھی سرِ شام سے برف باری
دریچے کے باہر سپیدے کے انبار سے لگ گئے تھے
مگر برف کا رقص پیہم تھا جاری

. . . .

مگر رات ہوتے ہی چاروں طرف بے کراں خامشی چھا گئی
خیاباں کے دو رویہ سرو و صنوبر کی شاخوں پہ
یخ بستہ گالے پرندے سے بن کر لٹکنے لگے تھے
زمیں ان کے بکھرے ہوئے بال و پر سے
کف آلود ساحل سا بنتی چلی جا رہی تھی

ہماری شاعری —

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی!

سے کتنی دور نکل گئی ہے۔

آپ نے یاد دلایا کہ آپ کی تصنیف قسم قسم کے نقوش کا مجموعہ ہے۔ تو لامحالہ براؤننگ یاد آیا۔ اس کی نظموں میں بھی افسانے، اسکیچ، خود کلامی، مکالمے، کہانیاں غرضیکہ ایک فراوانی پائی جاتی ہے۔ اسے بھی وہی مشکلات پیش آتی تھیں جو غالباً آپ کو بھی پیش آئی ہوں گی۔ اس کے کلام کو بھی بعض اوقات ایسا اختصار اختیار کرنا پڑتا تھا کہ معنی کا سمجھنا قدرے مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کی قوتِ تخلیق بھی ایسی تھی کہ ابلتے چشمے کے پانی کی طرح ہر قسم کے پتھر کو ہٹاتی دھکیلتی چلی جاتی تھی۔

نیویارک
۵ اکتوبر ۱۹۵۰ء

"پطرس"

چھپے چوری

ہاجرہ مسرور کی کتاب "چھپے چوری" کا دیباچہ

جب بیسویں صدی پروان چڑھی ادیبوں کی فہرست میں کئی عورتوں کے نام چھپنے لگے تو بعض ایسے نقاد ملے کہ جن میں خواتین بھی شامل تھیں اس سوال سے لگ گئے کہ آیا کیا عورتوں کا ادب مردوں سے جدا ہوتا ہے؟

انسان ہمیشہ سے یہی پوچھتا چلا آیا ہے کہ عورت اور مرد میں کیا فرق ہے؟ جو فرق آنکھوں کو نظر آیا اس سے مطمئن نہ ہوا بلکہ اس سے تو الجھن اور بھی بڑھی کہ ظاہر کا یہ حال ہے تو باطن میں خدا جانے کتنے فاصلے ہوں گے۔

عورت مرد نہیں بن سکی۔ مرد عورت نہیں ہو سکا۔ آدھی دنیا آدھی دنیا سے چھپی۔ اندھیرے میں ایک دوسرے کو چھوتی اور ٹٹولتی چلی آئی ہے لیکن جب عورتیں بھی ادب کی دنیا میں مردوں کی ہمسایہ بن کر رہنے لگیں تو اندھیرا کچھ کم ہو گیا کیونکہ ادب سے بڑھ کر ادیب کی فطرت کا مخبر اور غماز کوئی نہیں۔ یہ تو کچھ پہلے سے بھی زیادہ پردہ رہے۔ پہلے پہل تو ادیب عورتوں نے مردوں کی نقل کی گویا اپنے روپ میں سامنے نہ آئیں یا ادب کے کسی روایتی مسلک پر ڈٹ کے ساتھ ہو لیں۔ جہاں سب ہم سفروں کا بھیس ایک سا ہوتا ہے اور ایک سے دوسرا پہچانا نہیں جاتا۔ لیکن جب خود اعتمادی بڑھی اور سچی سچی باتیں کہنے لگیں تو مردوں سے الگ نظر آنے لگیں۔

ایک جدید انگریزی ناول کی ہیروئن کہتی ہے "میں ایک عورت ہوں، میری زندگی کیا ہے، ایک لمبی مضبوط سی رسی جو کئی شخصی اور ذاتی رشتوں کے دھاگوں سے بٹی ہوئی ہے۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں۔" عورتوں کے ادب کو غور سے دیکھئے تو یہ کلیہ کچھ ایسا غلط معلوم نہیں ہوتا۔ ادیبوں کی فہرست میں کئی مرد آپ کو ایسے ملیں گے۔ جن کی روح کائنات کے جنگل میں آسودگی ڈھونڈتی پھرتی ہے یا انسانی رشتوں کو توڑ کر منہ زور گھوڑے کی طرح سب کچھ پھلانگ جانا چاہتی ہے لیکن عورتوں کی جذباتی دنیا شخصی اور ذاتی ماحول تک ہی محدود رہتی ہے یہی وجہ ہے کہ ادیب عورتوں نے جو رتبہ افسانہ اور ناول میں حاصل کیا ہے کسی اور صنف ادب میں نہیں کر سکیں۔ معلوم ہوتا ہے فطرت نسوانی شخصی اور ذاتی رشتوں کے جال ہی میں الجھی رہتی ہے اور یہ جال سب سے زیادہ دل جمعی اور فراغت کے ساتھ ناول اور افسانے ہی میں بُنا جا سکتا ہے۔

شخصی رشتوں کی دنیا محدود سہی لیکن پایاب نہیں۔ اس کی گہرائیاں آفاق کی وسعتوں سے کم نہیں اس لئے یہ نہ سمجھئے کہ عورتوں کا ادب مردوں کے مقابلے میں ہمیشہ دبا دبا رہے گا۔ فطرت نسوانی نے پہنائی اور وسعت کو اپنے اوپر حرام کر لیا ہو، عمق کو اپنے اوپر حرام نہیں کر سکتی۔

یہ خصوصیت یعنی شخصی رشتوں میں انہماک۔ آپ کو ہماری اکثر ادیب عورتوں میں ملے گی۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنی فطرت کو جھٹلاتی نہیں۔ بلکہ خلوص اور دیانت داری سے لکھتی ہیں، سچ پوچھئے تو اس معاملے میں ان کا نامۂ اعمال مردوں سے زیادہ روشن ہے ہمارے ہاں ادیب عورتوں

کی تعداد بہت زیادہ نہیں لیکن شخصی اور ذاتی رشتوں کی دنیا جس جرأت و بے ساختگی کے ساتھ انہوں نے پیش کی ہے اس سے ہمارے موجودہ ادب کو بھی یادوں کے گھونگٹ اٹھے پڑتے ہیں اور سب اردو ادب کو ان کی بدولت تازہ ہوا نصیب ہوئی ہے

ہاجرہ مسرور کا یہ مجموعہ تازہ ہوا کا ایک اور جھونکا ہے۔ پچھلے مجموعوں میں بھی انہوں نے اپنی نسوانی فطرت ہی کو نمایاں کیا ہے۔ یہاں بھی وہ اپنی فطرت ہی کو نکھارتی ہیں۔ ان کی نظر پہلے سے کہیں زیادہ بلند اور گہری ہے۔ لیکن شخصی اور ذاتی رشتوں کے جال وہ یہاں بھی بن رہی ہیں۔ الجھے اور پُراسرار جال ان رشتوں کی دنیا بھی ایک حیرت انگیز دنیا ہے۔ ان میں انسان ایک دوسرے کو کھینچتے بھی ہیں، اور دھکیلتے بھی ہیں اور یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک ہاتھ سے کھینچتے اور دوسرے سے دھکیلتے ہیں اور زندگی اس جال میں تنی تنی سی رہتی ہے۔ شوپن ہاور کا قول ہے کہ "انسانوں کی مثال ان خار پشتوں کی سی ہے جنہیں سردی لگ رہی ہو، ٹھٹھرنے لگتے ہیں، تو گرم ہونے کو ایک دوسرے کے قریب سرک آتے ہیں۔ کانٹے چبھتے ہیں تو ایک دوسرے سے پرے ہٹ جاتے ہیں۔ اور پھر ٹھٹھرنے لگتے ہیں۔"

کیا آپ کو یہی نقشہ "آپ ہی کی دنیا کا ذکر ہے کہ ....." میں نظر نہیں آتا؟ اس میں شوہر اور بیوی کے درمیان ایک تناؤ اور ایک قرب — ایک بُعد اور ایک کشش ہے جسے ہاجرہ نے بہت نزاکت سے بیان کیا ہے۔ اس کہانی میں ہاجرہ چھوٹے چھوٹے بے وجہ جالوں کو اس بے تکلفی سے جمع کرتی چلی گئی ہیں کہ تھوڑی دیر کے بعد منافرت کے اس بیٹھے ہوئے سایہ سے ڈر لگنے لگتا ہے جس فریب خوردگی کو وہ بیان کرنے چلی تھیں، وہ شاید کہانی کے آخر میں ظاہر ہو جاتا ہے لیکن کوئی پڑھنے والا اس کہانی کی اٹھان ہی کو دیکھ کر افسانہ نویس کے فن کا قائل ہو جائے (کہانی کا انجام خواہ کچھ ہی ہو) تو ہاجرہ کو اس پر برہم نہ ہونا چاہئے۔ بلکہ اسے بھی قدردان ہی سمجھنا چاہئے۔

"کالبد" بھی ایک شوہر اور بیوی کی کہانی ہے۔ یہاں بھی بیوی کے دل میں احتجاج اور تسلیم کے ملے جلے جذبے پلتے جاتے ہیں اور اگر فریب خوردگی نہیں تو ایک بے بسی ضرور ہے لیکن بیوی اسے ظاہر نہیں کر سکتی کیونکہ اسے ظاہر کرنا آتا ہی نہیں۔ اس الجھاؤ کو میاں بیوی دونوں میں سے کوئی بھی ٹھیک طرح نہیں سمجھ سکتا۔ شوہر کبھی چٹکیاں لے گا کبھی بیوی کی خاموشی سے اکتا جائے گا۔ بیوی کبھی ہنس دے گی، کبھی اس کے آنسو نکل آئیں گے اور ان دو ہم بستر اجنبیوں کی عمریں یوں ہی ایک دوسرے سے بے خبر گزرتی چلی جائیں گی۔

"ایک بچی" کو آپ مرحوم ممتا کا افسانہ کہنا چاہیں تو نہ افسانہ کو اس سے انکار ہوگا نہ افسانہ نگار کو، لیکن یہاں بھی اس کے علاوہ تعلقات اور رشتوں اور ماحول کی کئی الجھنیں ہیں جن کا حال ناہید (ہاجرہ سے پوچھے بغیر) ہمیں سناتی چلی جاتی ہے:

> "مجھے جانے کیوں دبی دبی کیفیتوں سے نفرت ہونے لگتی ہے ..... گلی کے اس مکان میں
> رہ کر تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ میں بھی کہانیوں والی شہزادی ہوں جسے اس کے باپ نے ناراض
> ہو کر جنگل کے قلعے میں قید کروا دیا تھا ..... میرے اندر کوئی الجھ کر گھٹنے لگا .....
> میری جوان جوان بہنیں اور بوڑھی ماں۔ جی میں آیا کہ سب کے پلنگ گھسیٹ گھسیٹ کر گلی
> میں ڈال دوں ...... گلی میں جیسے کوئی نشہ میں بہکتا ہوا گذرا، مست اور بے پروا اور
> مجھے ایک دم احساس ہوا کہ میری بانہیں بھی تھک گئی ہیں، پانی بھرتے بھرتے نہیں، سینے
> پر بے کار پڑے پڑے، پہلو میں بے قدری سے رکھے رکھے اور سر پر ہالہ بناتے بناتے۔"

ایسے جال ہاجرہ بہت ہی پھرتی اور بے تکلفی سے بُن لیتی ہیں۔ تار تار کر کے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کتنی گتھیاں تھیں اس جال میں اور

معلوم ہاجرہ نے بننے سے پہلے انہیں اپنے دماغ میں کیوں کر سمجھایا ہوگا۔ اور دھاگوں کے سب پیچ کیوں کر یاد رہے ہوں گے۔ اس حیثیت کی اصلی قدر کوئی مشاق افسانہ نگار ہی کر سکتا ہے یا پھر آپ کو بتا دے گا کہ یہ کام کتنا مشکل ہے اور ہاجرہ نے اپنے تخلیقی جذبے کی بدولت اسے کتنا سہل بنا لیا ہے۔

اس مجموعے میں کم از کم دو کہانیاں ـــ "سرگوشیاں" اور "لاعلاج" ـــ ایسی ہیں، ہمارے جدید ادب کو ان پر فخر کرنا چاہیے۔ دونوں کا رنگ ایک دوسرے سے جدا ہے۔ "سرگوشیاں" ایک کردار کی مسلسل تقریر ہے جو آپ اپنے ذہن میں اس کی باتیں سنا سنا کر ہمارے سامنے لاتی چلی جاتی ہے۔ بخار کی سی تیز نگاری نے کہانی میں ایک بے پناہ قوت، شدت اور حرارت پیدا کر دی ہے جو ہیجان کے ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ کہانی کا خطیبانہ انداز شروع شروع میں کھٹکتا ہے۔ جیسے کوئی شیر آیا شیر آیا دوڑنا پکار کر ہمیں زمانے کی توجہ کی کوشش کر رہا ہو لیکن جب تیقیا کی گذشتہ زندگی کے ورق ایک ایک کر کے الٹنے لگتے ہیں۔ تو گہرائیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں اور رفتہ رفتہ بات اتفاقات زیست کے کنارے تک جا پہنچتی ہے۔ یہ خطابت نا خوشگوار خطرات سے پُر ہے لیکن ہاجرہ نے باوجود ڈرامائی طمطراق کے کہانی میں کہیں بھی کھوٹ نہیں آنے دی۔ "لاعلاج" میں ایک سادگی ہے ایک لپک ـــ دونوں میں سے جسے چاہیں آپ کہانی کا محور سمجھ لیں۔ بعض لوگوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہاجرہ نے کہانی پوری کی پوری سامنے بٹھا رکھی ہے لیکن مجھے تو پوری کی پوری ناول سی کی طرح الجھی ہوئی زندگی میں ایک الجھن معلوم ہوتی ہے۔ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کے ٹکڑے ہیں۔ زندگی کے ٹکڑوں کو ہاجرہ نے ایک مختصر افسانے کی حدود کے اندر اس خوبی اور حسنِ انتخاب سے سمیٹا ہے کہ اس کی مثال اردو میں مشکل سے ملے گی۔ اگر اردو میں کوئی کہانی ہی تکمیل، اصلیت اور حسن کے اعتبار سے اس رتبے کو پہنچتی ہے تو وہ کم از کم میری نظر سے اب تک نہیں گزری۔ اس افسانے میں بڑھیا بہن کی بھائیں بھائیں کرتی تنہائی کو دیکھ کر مجھے ایک اور ناول نگار عورت کا ایک کردار یاد آیا جو کرین ہی کی طرح عمر بھر انسانی رشتوں کا محتاج رہا اور یہ رشتے ایک ایک کر کے اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چلے گئے۔

> "اس کی روح ایسی ویران اور اجاڑ تھی کہ اس ویرانی کے مقابلے میں بیرونی ماحول کوئی حقیقت
> ہی معلوم نہ ہوتی تھی۔ تنہائی نے دل میں اپنے پنجے گاڑ دیے اور ایسے معلوم ہوا جیسے برس
> و سال کی ایک منہ زور ندی ہے کہ بہے چلے جاتی ہے اور اس کی سطح پر جڑ سے اکھڑے
> ہوئے درخت کی مانند ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ جڑ اکھڑ چکی اور زندگی کو رہ جانے کس وقت کوئی
> پھونک مار کر بجھا دے۔ کہنے کو زندہ ہے لیکن ایک طوفانی سطح پر بے اختیار بہے چلی جاتی ہے
> آس پاس کوئی ایسی چیز نہیں جسے کمزور انگلیاں پکڑ سکیں۔ پیشتر اس کے کہ منہ پھاڑتی ہوئی
> لہریں اسے نگل جائیں......"

ہاجرہ ہمارے کئی افسانہ نگاروں سے زیادہ حساس اور نازک بین ہیں۔ ان کی نظر دور تک پہنچتی ہے اور ان کے افسانوں میں اکثر گہرائیاں ایسی آجاتی ہیں جو اور افسانہ نگاروں میں نہیں ملتیں۔ ان کی یہ ادا بھی حساسی سے خالی نہیں کہ ان کے کم از کم تین افسانے حال سے ماضی کی طرف چلتے ہیں جب کوئی انسانی الجھاؤ انہیں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے تو ان کا ذہن ٹٹولنا شروع کر دیتا ہے کہ یہ الجھاؤ کہاں سے شروع ہوا۔ یہ تجسس حساسی کی ہی ایک الوٹ کا نام ہے۔ یہی انہیں ماضی کی طرف لے جاتا ہے کیونکہ الجھے ہوئے دھاگوں کے سرے تو اکثر ماضی ہی میں ملتے ہیں۔ انسانی رشتوں میں جنس کا رشتہ سب سے زیادہ پیچیدہ ہوتا ہے۔ جنس کا پیڑ ایک ایسا پیڑ ہے جس میں لاکھوں قسم کے کڑوے میٹھے پھل لگ سکتے ہیں اور کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ جو اسے بوئے گا وہ کیا کاٹے گا۔ اس کی جڑیں دل اور دماغ اور اعصاب اور گوشت میں نہ معلوم کہاں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ جس نے جہاں تک چیر کر دیکھا، نئی

سے کئی جگہ خدائی ہاجرہ کے کرداروں کا جنسی شعور جمالی مظاہرے سے بہت آگے نکل جاتا ہے اور ہاجرہ کے احساس میں کچھ تو تلخیاں اور پیچیدگیاں ایسی ہیں کی وجہ سے ان کے جنسی افسانے دوسروں سے زیادہ دقیق اور عمیق معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے جنسی تعلقات میں تنوع اوروں سے زیادہ ہے اور ان تعلقات کی رنگینی بھی زیادہ حقیقت اور نگاہ فریب ہیں۔

ہماری عورتیں اپنی فطرت شعاری کی وجہ سے صداقتی، رومانوی "ادبی" زبان سے بہت حد تک اجنبی رہی ہیں۔ چنانچہ انھوں نے جب لکھنا شروع کیا تو جیتے جاگتے مسائل کے سوا ان کے قلم سے کچھ نہ نکلا۔ ہاجرہ کی زبان بھی جیتی جاگتی زبان ہے جو سیدھی مطلب کی طرف لپکتی ہے۔ استعارات کی طرف دلچسپی نہیں رہی اور اس طرز کی وجہ سے بے تکلف وہ باتیں کہہ جاتی ہے جو مصنوعی ادبی زبان کے نقشے میں الگ کر دی جاتیں یا بڑے تکلف سے ادا ہوتیں۔

یوں الفاظ کا ذخیرہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو کہنے کی باتیں بہرحال ان گنت ہوتی ہیں اور لفظ اکثر ہار ہار کر بیٹھ جاتے ہیں اسی لئے ادیبوں کو بار بار استعاروں اور تشبیہوں سے کام لینا پڑتا ہے اور بالخصوص ان کی قدرت نگاہی کا پتہ ان کی تشبیہوں ہی سے چلتا ہے۔ لیجئے ہاجرہ کی تشبیہوں پر ایک نظر ڈال لیں۔

"کوئی ساتھ رونے والا ہو تو اپنے آنسو گالوں پر چنگاری بن کر نہیں رہ جاتے۔"

"لگاوٹ بھی کہیں چھپتی ہے، جامن چاہے کہیں بھی چھپا کر کھائی جائے کم بخت مسکی اور دانت چغلی کھا دیتی ہے۔"

"آپا کی آنکھیں کیا تھیں۔ بس ڈگڈگی تھیں کہ سب بندر کی طرح اس کے گرد ناچتے۔"

"سبھی نقطے مطلب کے نہیں ہوتے قلم روشنائی میں ڈبو کر لکھنے بیٹھو، تو حرف سب پر زور دے کر کھینچ لو نہیں تو کتنے ہی بے معنی نقطے کاغذ پر پھیل جاتے ہیں۔"

"محبت مکڑی کا ایک ایسا جالا ہے جو اگر کونوں کھدروں میں گھسنے پر جسم سے لپٹ جائے تو چھڑانے کے باوجود کہیں نہ کہیں ذرا بہت چپکا ہی رہ جاتا ہے۔"

"تم کہنا چاہتی تھیں کہ تمہیں جو کچھ دیا گیا ہے یہ تو صرف اتنا ہے جیسے کسی کو تحفہ میں بغیر دستے کی کٹار پکڑا دی جائے۔"

"تم تو ایسی ٹھنڈی نظر آرہی ہو جیسے کسی بنگالی قحط زدہ کا چولھا۔"

"اس کے احساسات پر جیسے سڑا ہوا آم نچڑ رہا تھا۔ گھناؤنا اور کڑوا رس ٹپ ٹپ گر رہا تھا۔ وہ کوئی بڑا زہریلا جواب دینا چاہتی تھی لیکن اس کے ذہن کے سیال زہر کا کھولاؤ ہر ڈھلے ہوئے فقرے کو کمبوروں میں پڑی ہوئی سیپ کی طرح نچا ڈالتا۔۔۔"

"یہ کتنے مزے کی بات ہے کہ جن لڑکیوں کے لئے فساد ہوتے ہیں وہی چند روز بعد ایسی فضول ہو جاتی ہیں جیسے نارنگی کا چھلکا۔۔۔"

"کتنی مشکل سے تو انہیں بات کرنے کا ایک موضوع ملا تھا۔ لیکن انہوں نے ایک دوسرے پر تیزاب پھینکنے کی کوشش میں اسے بھی ختم کر دیا۔۔۔"

"مگر وہ دونوں اس سے محظوظ ہونے کا خیال نہیں کر سکتے تھے۔ جیسے دونوں کی زندگی میں سوائے نیم کے کچھ پھولتا ہی نہ ہو۔۔۔"

"وہ اس کی نظر سے دور ہوتے ہی اپنی ہستی کو اکیلے بے بس اور دردناک محسوس کرنے لگی۔ جیسے میٹھا بیا کوہ میں ریت کے پہلوؤں میں دبی ہوئی گنگا۔۔۔"

"شادی کے بعد ایک سال ایسا گزرا جیسے کوئی ننھی چڑیا پھدکتے پھدکتے ایک درخت سے دوسرے پر جا بیٹھے۔"

"جتنی لمبی عمر ہو، اتنی ہی لمبی الجھنیں۔ سوئی میں لمبا تاگا ڈال کر جیسے سینا لو، بار بار گتھیاں پڑ جاتی ہیں۔"

ماننا پڑے گا کہ ہاجرہ کی تشبیہیں بیشتر انوکھی اور عجیب ہیں، خیال کے ساتھ ہی بے تکلف ان کے ذہن میں چلی آتی ہیں۔ جس ادیب کو اپنی سوچی ہوئی، اپنی دیکھی ہوئی، اپنی بیتی ہوئی بات کہنی ہو اس کا کام گھڑی گھڑائی تشبیہوں سے نہیں چل سکتا ہے، اور جو گھڑی گھڑائی تشبیہیں استعمال کرتے ہیں وہ اپنے دل کی بات کیونکر کہہ پاتے ہوں گے۔

اس مجموعے میں ایک آدھ مضمون ایسا بھی ہے جسے شاید افسانہ نہ کہہ سکیں۔ میرا بس چلتا تو اس کی جگہ بھی ہاجرہ کو افسانہ ہی لکھنے پر مجبور کرتا لیکن مجھے یقین ہے کہ ایسے جبر کی ضرورت آئندہ کبھی پیش نہ آئے گی۔ ان کی طبیعت کا اصل جوہر جو ان کے تین مجموعوں میں چمکا ہے وہی خود افسانہ لکھنے پر مجبور کرے گا۔ اور انہیں افسانہ لکھے بغیر چین نہ آئے گا۔

جب تک ان کا چوتھا مجموعہ نہ چھپے، ہمیں بھی چین نہ آئے گا

"پطرس"

سفرِ انگلستان

(خطوں کے پیرائے میں)

[illegible] ستمبر [illegible] دس بجے دن

عزیزم [illegible] یہ خط ایک ایسے مقام سے لکھ رہا ہوں جو عدن سے ..۹ میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ اندازہ لگائیں اس وقت بھی [illegible] ہزار میل کے فاصلے پر ہوں جو پشاور سے ڈیڑھ ہزار میل رہ گیا ہے اور ابھی منزل مقصود کا پتہ ہی نہیں۔ [illegible] سفر [illegible] کے مقابلے میں پہلی قدمی سا معلوم ہوتا ہے۔

میرا جی چاہتا ہے سفر کی ابتدا سے شروع کروں۔ بمبئی پہنچے تو کمپنی والوں کی طرف سے نوٹس ملا کہ تیرہ ستمبر کو جہاز پر پہنچ جائیں طبی معائنہ ہوگا۔ یہاں تیرہ ستمبر آ گئی، ڈاکٹر [illegible] دل ہر وقت دھک دھک کرتا رہا۔ وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ وہ معائنہ ہے جو جہازوں کے قوانین کے مطابق ہر جہاز کی روانگی سے پیشتر ہونا ضروری ہے۔ اس معائنے کی کیفیت میں یونہی بیان کر سکتا ہوں کہ جس کی نبض چلتی ہے اسے تو جانے دیتے ہیں جس کی نبض بند ہو اسے بمبئی میں ہی روک لیتے ہیں۔

جہاز پر سوار ہوئے تو بہت سی جماعت کے طلبہ دکھائی دیئے۔ ہندوستانیوں کی تعداد میری توقعات سے بہت زیادہ تھی۔ بنگال، مدراس، پنجاب، یو پی، بمبئی سبھی صوبوں کے لوگ تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہر ایک صوبے کی گورنمنٹ نے اپنے ہاں کے سب سے نرالے چیدوں کو چن کر بھیجا ہے۔ کیسے ایک ایک رالی صورت کا آدمی، اور ان میں سے ہر ایک اپنی وضع کی انگریزی بولتا ہے۔ بعض نسوانی نما [illegible] ان میں [illegible] سے [illegible] ہوتے جاتے ہیں اور رومال سے آنسو پونچھ رہے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو اپنے آپ کو بہت [illegible] ظاہر کرنا چاہتے ہیں اور اس اظہار کے لئے کبھی کبھی ادھر سے ادھر اور کبھی ادھر سے ادھر تیز تیز قدم اٹھاتے نکل جاتے ہیں جیسے جہاز کے انتظام و انصرام میں مصروف ہوں۔

جب جہاز روانہ ہوا اور جہاز پر سے بھی اور ساحل پر سے بھی رومال ہلنے شروع ہوئے۔ کئی دیسی شرفا معلوم ہوتا تھا برسوں سے رومال ہلانے کے منتظر تھے دل کھول کر رومال ہلائے۔ ان میں سے [illegible] کا اضطراب دیکھئے کہ تین تھے جو اپنی سب جیبوں کو ٹٹول رہے ہیں اور رومال نہیں ملتا اور جب کسی حضرت کا رومال ہاتھ سے چھوٹ کے سمندر میں گر جاتا تو ان کی خفت قابل دید ہوتی۔ جب ساحل آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو یہ [illegible] بدتمیزی تھا۔ اب جہاز کی کیفیت یہ ہے کہ ہر فرد بشر کرسی بچھائے جہاز پر بیٹھا ہے اور سمندر کو دیکھ رہا ہے۔ چہرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دل میں کہہ رہے ہیں۔ "اچھا، تو گویا یہ سمندر ہے۔ تو گویا اب ہم سمندر میں ہیں۔ بھئی بہت اچھے!" [illegible] دوست ہیں وہ ساتھ ساتھ

بیٹھے ہیں اور ابھی سے صد فیصد لندن اور ایڈنبرا کے متعلق نہایت واقفکارانہ انداز اور بے پروائی کے لہجے میں گفتگو کر رہے ہیں۔ ایک کونے میں میں بیٹھا سمندر کو دیکھ رہا تھا۔

تھوڑی دیر میں ہم ساحل سے بہت دور نکل گئے۔ ہوا تیز ہونے لگی اور سمندر یوں معلوم ہونے لگا جیسے کسی کمبخت مصور نے کوئی تصویر کھینچی ہے۔ بھوک کے مارے آنتیں قل ہو اللہ پڑھنے لگیں اور میں بے صبری سے کھانے کا انتظار کرنے لگا۔ میں دور افق کو بے معنی نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ یک لخت معلوم ہوا جیسے افق کچھ ٹیڑھا سا ہو گیا ہے جیسے ترازو کی ڈنڈی ایک طرف کو جھکی ہوئی نظر آتی ہے۔ لمحے بھر کے بعد آپ دوسری طرف کو جھک گئے۔ ایک دو منٹ نہ گذرے تھے کہ ایسے معلوم ہوا جیسے کسی نے دفعتاً ٹخنوں اور گھٹنوں کے پیچ ڈھیلے کر دیئے ہوں۔ معدے میں ایک برف کا گولا بہت زور سے نیچے کو گرا۔ انتڑیوں نے اچھل کر پھیپھڑوں کے ایک گھونسا مارا اور کھوپڑی کے اندر بھیجے نے آہستہ آہستہ پنڈولم کی طرح جھولنا شروع کیا۔ اور پھر قے۔

یہ ابتدائے عشق تھی۔ ہم بھاگے ہوئے اپنے کمرے میں پہنچے اور بستر پر چت لیٹ کر اس شخص کے خاندان بھر کو کوسنے لگے جس نے ہمیں ولایت آنے کا مشورہ دیا تھا۔ بس اباجان، کچھ پوچھو مت۔ دنیا میں ایسی تکلیف دہ بیماری کوئی نہ ہوگی۔ موت بھی خوشگوار معلوم ہونے لگتی ہے۔ مجھے کمرے میں پہنچے ہوئے چار پانچ منٹ ہی گذرے ہوں گے کہ نزدیک دوسرے دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آنے لگیں اور تھوڑی دیر میں ہر طرف سے قے کی صدائیں بلند ہوئیں۔ معلوم ہوتا تھا جیسے توپ خانہ داغ رہا ہے۔ جب کمرے کی کھڑکی کھولی تو تمام جہاز چت پڑا تھا۔ "کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی"

پانچ دن رات میں بستر پر پڑا رہا۔ دوسرے دن شام کو ڈاکٹر کو بلایا۔ ایک فرانسیسی لونڈا سا ہے۔ شکل میں لڈ ماؤ سے بہت ملتی ہے۔ انہوں نے آتے ہی بے تحاشا فرنچ شروع کر دی اور متواتر بیس منٹ تک بکتا چلا گیا۔ اتنا سمجھ میں آیا کہ انجکشن کریں گے چنانچہ کیا۔ اس سے قے تو بند ہو گئی لیکن دماغ برابر جھولا جھول رہا تھا۔ سمندر میں بہت بڑی بڑی لہریں اٹھ رہی تھیں اور جہاز پر جیسے وجد کی کیفیت طاری ہے۔ ہر لحظہ طوفان بڑھتا ہی چلا جاتا تھا۔ چھٹے دن کچھ افاقہ ہوا تو ہم ہمت کر کے تختۂ جہاز پر پہنچے۔ اور ایک کرسی پر لیٹ گئے۔ ہماری طرح اور بھی کئی کشتگانِ ناز ہولے ہولے باہر نکل رہے تھے۔ شکلیں چوہوں کی سی بنی ہوئی۔ چال ایسی جیسے ہوا میں تنکا اڑتا ہوا جا رہا ہو۔ جہاں بیٹھتے تھے بیٹھتے ہی آنکھیں بند کر لیتے تھے۔ لیکن طوفان کے تھمتے ہی طبیعت فوراً ٹھیک ہو گئی اور ایک آدھ گھنٹے کے اندر ہی اس قدر زور کی بھوک لگنے لگی کہ عمر بھر نہ لگی تھی۔ جہاز پر دن میں پانچ دفعہ کھانے پر جمع ہوتے ہیں۔ مجھے نہیں یاد کہ کسی وقت بھی کھانے کے کمرے میں بے تابانہ داخل نہ ہوا ہوں۔

کھانے کے کمرے کی دنیا ہی نرالی ہے۔ ہندوستانی بھائیوں کے لئے اس کمرے کے اندر طرح طرح کی مایوسیوں، بے عزتیوں اور ذلتوں کے سامان موجود ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جو لوگ اتنے عرصے سے ولایت آنے کی تیاریاں کرتے رہتے ہیں وہ ساتھ ہی ساتھ چھری کانٹے کے استعمال کی مشق کیوں نہیں کر لیتے اور انگریزی کھانے کے آداب و قواعد کیوں نہیں سیکھ لیتے۔ ویشنو حضرات کے لئے اور بھی مصیبت ہے۔ اول پوچھتے ہیں اس میں گوشت کی تو کوئی آمیزش نہیں۔ اس میں بیکن تو نہیں ڈالتے۔ یہ چربی میں پکا ہے یا مکھن میں۔ آئس کریم میں انڈے تو نہیں پھینٹے۔ غرض [illegible] بارہ بارہ قسم کے کھانے ہوتے ہیں لیکن ان بے چاروں کے پلے ایک دو ابلی ہوئی ترکاریوں سے زیادہ نہیں پڑتا۔ ہونقوں کی طرح سے چھری اور کانٹے دونوں کو بائیں ہاتھ میں تھامے رہتے ہیں اور دائیں ہاتھ کے ساتھ [illegible]

جاتے ہیں۔ آئس کریم کے چمچے کو نمک کی پیالی میں ڈال دیتے ہیں اور پھر نمک کے چمچے سے آئس کریم کھانے لگ جاتے ہیں۔ پھر کھاتے کھاتے ہر وقت مجرم نظروں سے دائیں بائیں جھانکتے رہتے ہیں۔ کسی کو دائیں ہاتھ میں چھری پکڑے دیکھا تو خود بھی دائیں ہاتھ میں پکڑ لی اور پھر جو کسی کو دیکھا کہ بائیں ہاتھ میں تھامے ہوئے ہے تو بائیں ہاتھ میں منتقل کر لی۔ سور کا گوشت ہر روز کھانے پر ہوتا ہے لیکن بھائی اب تک ہم نے کھایا نہیں۔ آگے بھی خدا حافظ و نگہبان ہے۔

عدن پہنچے تو ساحل پر گئے۔ ہم چار آدمیوں نے مل کر ایک ٹیکسی کرایہ پر لی جس پر سوار ہو کر ہم عدن اور عدن کے گرد و نواح ۲۵ میل گھومے۔ اس کا کرایہ کوئی ایک پونڈ کے قریب بنا۔ وہ غوطہ لگانے والے لڑکے بہتر الاخلاص کی کہیں نظر نہ آئے۔ خدا جانے متمدن یورپین ہانکتے تھے یا اب ان کی نسل ہی ناپید ہو گئی ہے۔ عدن ہندوستان کے عام شہروں کی نسبت بہت ستھرا شہر ہے بلکہ بہت بے رونق سا مقام ہے۔ پارسیوں کی دکانیں جا بجا نظر آتی ہیں۔ عدن میں پہنچ کر ٹکٹ وغیرہ خریدے اور خط پوسٹ کئے تمہیں ایک پوسٹ کارڈ بھیجا تھا جس پر ہمارے جہاز کی تصویر تھی، امید ہے ملا ہو گا۔

یہاں سے ۷ ستمبر کو دن کے ۱۲ بجے روانہ ہوئے اور بحیرۂ احمر میں داخل ہوئے جہاں کی گرمی توقع سے بہت ہی کم ہے البتہ رات کو کمرے کے اندر نہیں سویا جاتا۔ دن بھر سب سے اوپر کے تختے پر کرسی بچھائے بیٹھا رہتا ہوں اور رات کو وہیں بستر بچھا کر سوتا ہوں۔ طلوع اور غروب کے نظارے بسا اوقات بہت ہی شاندار ہوتے ہیں۔ وسیع سمندر، وسیع آسمان اور آفتاب کا بہت بڑا آتشیں گولہ۔ جب صبح ہوتی ہے یا شام پڑتی ہے تو قوس قزح جیسے پھیلنے لگ جاتی ہے۔

ایک دن رات کو جزیرہ پیرم کے پاس سے گزرے۔ جزیرے کے ایک سرے پر لائٹ ہاؤس ہے جس کی روشنی ایک ایک منٹ کے وقفہ کے بعد چمکتی ہے اور جزیرے سے لے کر جہاز تک ایک چمکتا ہوا شاہراہ سا بچھا دیتی ہے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جزیرے کے ٹیلوں کی مدھم سی تصویر دکھائی دیتی تھی۔ یہ تمام نظارہ کچھ ایسا پُراسرار معلوم ہوتا تھا کہ مجھے عمر بھر نہ بھولے گا۔

جب سے سمندر کا طوفان بند ہوا ہے ہر روز رات کو سینما کا تماشا اور ناچ ہوتا ہے۔ کھانے پر ہی دعوت مقرر ہو جاتی ہے ایک پروگرام میں تمہیں اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ تماشا جہاز کے تختے پر ہوتا ہے نہ کہ بند کمرے میں۔ اور مفت ہوتا ہے۔ اچھا خاصا لطف رہتا ہے۔ ساتھ ساتھ ایک بہت بڑا گراموفون بینڈ کے بجائے بجتا ہے۔ سوائے ایک فلم کے (THE BACK BITER) باقی کی سب میرے لئے نئی تھیں۔ اس پروگرام کی فلم مسٹر ہیرلڈ لائڈ کا کامک تھا۔ دل بہلاوے کو کافی سامان ہے۔ باقاعدہ سینما نہ سمجھو۔

اب ہم بحیرۂ احمر میں ہیں۔ مکے اور مدینے کے عرض البلد سے اوپر گزر چکے ہیں۔ شروع شروع میں ساحل عرب کے پاس اکثر جزیرے نظر آتے رہے۔ اب کوئی ساحل نظر نہیں آتا۔ کل دوپہر کو سویز پہنچنے کی توقع ہے۔ پرسوں پورٹ سعید۔ جہاں یہ خط پوسٹ کروں گا۔ ہوا بہت خوشگوار اور فرحت افزا ہے۔ سمندر کا رنگ بالکل سلیٹ کا سا ہے۔ چھوٹی چھوٹی لہریں اٹھتی ہیں اور افق تک جا بجا سفید جھاگ کے گالے سے دکھائی دے رہے ہیں۔ جہاز تھوڑا سا ڈگمگانے لگ گیا ہے جس کی وجہ سے لکھنا مشکل ہو گیا ہے۔

روانہ ہونے سے پہلے تمہیں یاد ہو گا میں نے اسی کمپنی کے پراسپکٹس وغیرہ منگائے تھے ان میں لکھا تھا کہ جہاز پر انگریزی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اب معلوم ہوا کہ یہ ایک حد تک ٹھیک ہے۔ مسافر تو انگریزی بول بھی لیتے ہیں اور سمجھ بھی لیتے ہیں ورنہ جہاز کے افسر اور ملازم نہیں سمجھتے۔

بہت سی باتیں کہنے کو ہیں۔ خطوں کے بس کا روگ نہیں۔ واپس ان شاء اللہ پہنچوں گا تو سنانے کو ہزارہا لطیفے ہیں جو عمر بھر نہ بھولیں گے۔ قبلہ مولوی صاحب۔ حمید علی صاحب۔ سالک صاحب۔ جگل صاحب۔ مفتی صاحب اختر صاحب حفیظ صاحب سب کو میرا نیازمندانہ سلام، بہت یاد آتے ہیں۔ کیا کروں۔

خاکسار
بخاری

(۲)

لندن ۲۲ ستمبر سنہ ۱۹۲۶ء

امتیاز بھائی: میں تم کو کہیں یورپ کے کسی اور مقام سے خط لکھتا لیکن اس لیے نہ لکھا کہ یورپ کا سفر ایک ہنگامہ تھا جس میں میں ہندوستان کو تقریباً بھول ہی گیا اور دوسرے اٹلی اور سوئٹزرلینڈ میں ہندوستانی ڈاک کا کچھ ایسا انتظام ہے کہ وہاں کا لکھا ہوا خط تم کو اس خط سے جلدی نہ ملتا۔ پہلا خط میں نے آپ کو سوئز سے لکھا تھا اور پورٹ سعید میں پوسٹ کیا تھا۔ پورٹ سعید میں ہمارا جہاز دن کے دس بجے پہنچا۔ کشتیوں پر سوار ہو کر ساحل پر گئے۔ پورٹ سعید کی عمارتیں نہایت خوش وضع اور خوبصورت ہیں۔ حفظانِ صحت کے اصول کے مطابق مغرب کی تقلید کی ہے لیکن افریقی طرزِ تعمیر کا رنگ غالب ہے۔ بازار صاف ستھرے اور کشادہ ہیں۔ دکانیں خوش رنگ ہیں۔ تعجب ہمیں اس بات پر ہوا کہ قہوہ خانوں کی تعداد بہت ہی زیادہ ہے اور دن کے دس بجے بھی ان میں اس قدر بھیڑ تھی کہ یہی معلوم ہوتا تھا کہ یہاں کے لوگ بالکل بے کار ہیں۔ انگریزی سوٹ، سر پر ترکی یا انگریزی وضع کی پھوس کی ٹوپیاں، ہزاروں کی تعداد میں لوگ بیٹھے کافی پی رہے ہیں، حقے کے کش لگا رہے ہیں اور جوا کھیل رہے ہیں۔ دوکاندار بہت خوشامد اور چاپلوسی کے ساتھ دعوت دیتے ہیں۔ اگر آپ بے نیازی کے انداز میں چل دیں تو فحش گالیاں سناتے ہیں۔ بے شمار گائیڈ بازار میں چلنا مشکل کر دیتے ہیں اور ازحد بے حیائی کے مشاغل کے متعلق نہایت بے باکانہ گفتگو کرتے ہیں۔ آپ جیسے بھی ہو کر ان سے کنارہ کریں تو گالیاں دینے لگ جاتے ہیں۔

بارہ بجے ہمارا جہاز وہاں سے روانہ ہوا اور ہم بحیرۂ روم میں داخل ہوئے۔ سب نے گرم کپڑے پہن لیے گو موسم کچھ اتنا سرد نہ تھا تاہم یورپ کی تعظیم لازم تھی۔ تین دن کے بعد ہم برنڈیزی (BRINDISI) پہنچے۔ وہاں بھی ساحل پر اتر کر شہر کا ایک چکر لگایا۔ برنڈیزی میں فروٹ بہت ہی سستا ہوتا ہے چنانچہ ہم نے ایک بہت بڑا ٹوکرا کوئی دس آنے میں خرید لیا اور پیٹ بھر کے کھایا۔ یہاں ہم نے پہلی مرتبہ اطالوی فوج اور پولیس کے سپاہیوں کو دیکھا۔ فوجی سپاہی کی وضع سابق ہند سے ملتی جلتی ہے۔ سر پر دیسی سی ٹوپی اور اس میں ایک پر جس کا ہلنا یہ بانکپن کی شان دکھا رہا ہے۔ پولیس کے افسر بڑے بھلے ڈیوک آف ولنگٹن کی سی ٹوپیاں پہنے سرخ اور نیلی وردی میں تنے کھڑے تھے جس پر پیتل کی آرائش عجب بہار دکھا رہی تھی۔ سفید دستانے اور چمکدار تلوار جب بازار میں کھٹ کھٹ کرتے گزرتے تھے آنکھیں روشن ہو جاتی تھیں۔

ایک دن کے بعد شام کے وقت ہم وینس پہنچے اور وہاں چار دن گزارے۔ وینس ایک معجزہ ہے۔ ایک طلسم ہے ایک رومان انگیز خواب ہے۔ اطالوی آرٹسٹ شراب کے نشے کی ایک ترنگ ہے جو مجھے عمر بھر نہ بھولے گی۔ اس سمندر کی شہزادی کے متعلق آپ نے جو کچھ افسانے سنے ہیں سب سچ ہے۔ تصویریں اس کے حسن کی داد نہیں دے سکتیں اور دنیا بھر کا لٹریچر یہاں کی دلکشی کا سماں نہیں باندھ سکا مگر حقیقی

نہایت حسین، خوش مذاق، خوش سلیقہ، مرنجاں مرنج، خوش اخلاق۔ خوبصورت اور بنکے بنکے لمبے لمبے بال کٹے ہیں اور ان کو پیچھے ہی پیچھے سنوارتے ہیں۔ اکثر لوگ مرد اور عورتیں سر ننگے پھرتے ہیں اور حق تو یہ ہے کہ ان کے بالوں کی خوبصورتی کو خوشنما سے خوشنما ٹوپی میں چھپانا بھی ظلم ہے۔ خلق کا یہ حال ہے کہ سارا دن آپ کے کانوں میں پرمیسیاں پرمیسیاں (PERMISSION) کی آواز آتی رہے گی۔ جو انگریزی کے EXCUSE ME کے مرادف ہے۔ لیکن جس لہجے، جس لوچ اور جس تبسم کے ساتھ کہا جاتا ہے وہ تو انگلش کو بھی نصیب نہیں ہو سکتا۔ رات کو وینس ایک دلہن ہے جس کا سنگھار کوئی ایسی زبان بیان کر سکتی ہے جس میں کے مترنم VIOLIN اور QUITAR اور BONJO وینس کی بڑی خوبصورت، نازک ہلکے پھلکے گنڈولے، ہفت رنگ کی روشنی، حسین لوگ جن کی زندگی سر تا سر محبت کا ایک نغمہ معلوم ہوتی ہے۔ امتیاز! خدا کی قسم یہیں مرنے کو دل چاہتا تھا۔ ہائے میں کیا کروں ہندوستان میں کوئی بھی تو ایسی جگہ نہیں جس کا نام لے کر میں تم سے کہوں کہ وینس اس سے دس ہزار گنا ہوش انگیز ہے۔ ہندوستان کا تو ذکر ہی کیا دنیا بھر میں کوئی ایسا مقام نہیں۔ میں دن بھر (pilla San Marco) (وینس کا ایک بہت مشہور چوک ہے) میں گھوم کر اپنی آنکھوں کی ساقی گری کرتا رہتا تھا۔ رات کو گرینڈ کنال (Grand Canal) کے کنارے بیٹھے بیٹھے ہی جھومتا رہتا تھا۔ ایک دن پوپ سینٹ مارک کا گرجا (Ducal Palace) اور ڈیوکل پیلس دیکھنے میں گذرا۔ ان کے حالات انشاء اللہ مختصر ہو کر سناؤں گا ورنہ یہ خط کبھی ختم نہ ہوگا۔

وینس کا شیشہ تو آپ جانتے ہیں دنیا بھر میں مشہور ہے اس کے وہ وہ عجائبات دیکھے کہ ان کے تصور سے آنکھیں اب تک خیرہ ہیں۔ دل کڑا کر کے وینس کو خیرباد کہا اور میلان (MILAN) آیا۔ یہاں کی چند عمارتوں کے علاوہ کوئی بات قابلِ بیان نہیں اور ان کے ذکر سے میں اپنے خط کو خشک بنانا نہیں چاہتا۔ اور پھر اس کے بعد اٹلی کی کوہستانی دلنوازی اور سوئٹزرلینڈ کی دلفریب فضا، یہ سب قصے دلی مسلم ہوٹل میں بیٹھ کے سنو گے۔ فرانس میں داخل ہوئے تو پرمیسیا کی جگہ پارداں میسیو (PARDON MONSIEUR) اور پارداں مادام (PARDON-MADAME) ہونے لگی۔ فرانس میں یہ قاعدہ ہے کہ جب دو آدمی ایک دوسرے کے پاس سے گذرتے ہیں تو دونوں یہی فقرہ دہراتے ہیں۔

یورپ کی ٹرین (CORRIDOR TRAIN) ہوتی ہے اور سفر بہت لمبا تھا اس لئے اکثر لوگ ٹرین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک آتے جاتے رہتے تھے۔ یا کوئی شخص شوقیہ ادھر سے ادھر تک چکر لگاتا تھا۔ بس سر جھکا کے، چہرے پہ مسکراہٹ، پارداں میسیو پارداں مادام پارداں میسیو، پارداں مادام کہتا ہوا نکل جاتا تھا۔ عجب لطف تھا۔ فرانس کے لوگ ٹرین میں ہمسفر ہوں تو گو آپ ان کی زبان سے ناواقف ہوں اور انہیں اس بات کا علم بھی ہو تاہم مرد ہو یا عورت، آپ کی طرف دیکھ کر مسکرا دیں گے اور کوئی نہ کوئی بات شروع کر دیں گے۔ میرے ساتھ ایک مادام تھیں وہ فرانسیسی بولتی جاتی تھیں اور مسکراتی جاتی تھیں۔ میں انگریزی بولتا جاتا تھا اور مسکراتا جاتا تھا۔ نہ میں ان کی بات سمجھتا تھا نہ وہ میری بات سمجھتی تھیں۔ تاہم ایک رشتہ سا قائم ہو گیا تھا جو بہر نوع بہت خوشگوار تھا۔

اسی ٹرین میں انگریزی آدمی دور سے ظاہر ہو جاتا تھا۔ یا تو منہ پھلائے ٹرین کے ایک کونے میں بیٹھا، ماتھے پہ تیوری چڑھائے کسی اخبار کے اشتہارات کا مطالعہ کر رہا ہے۔ آپ نے کسی موقع پر (Excuse me) کہا تو انہوں نے اپنی بھنویں ذرا اونچی کیں۔ آپ کی طرف ایک نظر دیکھا اور پھر مطالعے میں مصروف ہو گئے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اٹالیہ، سوئٹزرلینڈ اور فرانس دیکھنے کے بعد انگلستان جانے کو دل نہیں چاہتا۔ یہاں یہ حال تھا کہ کوئی چہرے کی قیمت سے واقف نہ تھا۔ اب مجھے ایک پرمیسیاں دوسرا پارداں لئے [illegible]

ہوتا تھا اور بعد میں معلوم ہوتا تھا وہ ذول انگریز ہیں۔ میل میں دو نیوزی لینڈ کے باشندے (میاں بیوی) جو سوئٹزرلینڈ کی سیاحت سے واپس آ رہے تھے اور اپنے Honeymoon پر سب دنیا کا چکر لگا رہے تھے ان سے دوستی ہو گئی۔ وہ بھی آجکل لندن میں ہیں۔ یہاں ان کی اپنی موٹر کار ہے۔ آج شام کو انہوں نے مجھے کھانے اور سیر کی دعوت دی ہے۔ غالباً تھیٹر لے جائیں گے۔ افریقہ، سیلون، چین اور امریکہ دیکھ چکے ہیں۔ ہندوستان جانا مقصد ہے۔ فی الحال یورپ کی سیاحت کر رہے ہیں۔

خیر میں داستان کو مختصر کروں۔ ہوتے ہوتے لندن پہنچا۔ لندن کی وسعت اور عظمت کی کہانیاں تم بھی سن چکے ہو۔ لیکن لندن مجھ جیسے آدمی کو موہ نہیں سکتا۔ بھلا جہاں بازاروں میں لاکھوں موٹریں اور ٹرمیں، اور بسیں گاڑیاں اور جانے کیا کیا بے تحاشا بھاگی جا رہی ہوں وہاں دماغ کو فرصت نہیں ملتی۔ اور دل بے چارا کس شمار میں ہے۔ دل یہاں ہو بھی تو جب انھیں حب وطن ہوتے ہوئے دیس کی کیسا بستی ہے!

یہاں آتے ہی ضروریات سے فارغ ہو کر تھیٹروں کے اشتہار دیکھے۔ کہیں کی تیں EVERY MANS THEATRE میں Alms of the man ہو رہا ہے۔ کمبخت دور بہت ہے۔ لیکن بھلا ہم دیکھے کیوں باز رہیں گے Old Vain میں KING JOHN ہو رہا ہے وہ بھی دیکھوں گا۔ (PHILHORMOUR) میں Light of Asia ہو رہا ہے۔ وہ کل رات دیکھ آیا ہوں۔ فلم بہت شان سے شروع ہوتی ہے اور دیکھنے کے قابل چیز ہے۔ ایکٹنگ تو خیر معمولی ہے اور بے ہودہ نہیں۔ لیکن Atmosphere بہت زبردست پیدا کیا ہے۔ فلم تو آپ لاہور میں ضرور دیکھیں گے لیکن اللہ کرے جو موسیقی یہاں تھی وہ وہاں بھی ہو۔ گوتم کی پیدائش میں انہوں نے یسوع مسیح کی پیدائش کا سا رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس دوران میں جو موسیقی بجی تھی ان میں بہاگ کی بے شمار تانیں صاف سنائی دیتی تھیں۔ اس میں آپ ذرہ برابر بھی مبالغہ نہ سمجھیں اور یوں بھی آرکسٹرا کے سارے پروگرام میں ہندوستانی راگوں کا رنگ نمایاں تھا۔ ایک مقام پر گوتم کا باپ ایک خواب دیکھتا ہے وہاں پر باقی آرکسٹرا تو بالکل خاموش تھا صرف CELLO (وہ طنبورے کی مانند بہت بڑا سا وائلن VIOLA ہوتا ہے) صرف اس کے تار کمان سے نہیں ہاتھ سے بجا رہے تھے جس طرح ستار بجاتے ہیں تو ان کی گمبھیر تھرتھراتی ہوئی سُریں بہت ہی موزوں معلوم ہوتی تھیں۔ ایک مقام پر کچھ بنگالہ سا تھا۔ یہاں سب آرکسٹرا بجانے والے اپنے گلے سے بھی سُریں نکالتے تھے۔ الفاظ نہیں محض الاپتے تھے۔ یہ تصویریں جو میں آپ کو بھیج رہا ہوں۔ تماشے کے بعد مفت ملتی ہیں۔ ملتی کیا معنی وہاں ایک طاق میں رکھی ہیں جو چاہے جتنی چاہے اٹھا کے لے جائے۔ باقی سینما، تھیٹروں وغیرہ کے متعلق جو سوالات آپ کے دل میں اٹھیں وہ یا تو مجھ سے پوچھیے یا میرے آنے تک ملتوی رکھیے۔ میں فی الحال لندن میں مقیم ہوں۔ چند دن کے بعد کیمبرج جاؤں گا۔

لندن میں ہندوستانی طلبا کی انجمن میں بھی گیا۔ حب وطن کی خاطر وہاں کا ممبر بھی بن گیا۔ لیکن وہاں کی فضا میرے لئے ناموافق ہے۔ بھلا جہاں طرح طرح کا نیٹو اپنی جہالت، بدتمیزیوں پر ایک ہالہ سا انگریزی اخلاق کا غلاف چڑھائے فرعون بے سامان بنا پھرتا ہو وہاں بخاری کے پیٹ میں درد ہو یا نہ ہو؟ خیر دیسی بھائیوں کا ذکر ہی جانے دیجیے۔

مرا ز روز قیامت اگر غم است این است
که روئے مردم عالم دوبارہ باید دید*

عدن اور پورٹ سعید میں بہت سا اسلامی ولولہ لیے ہوئے داخل ہوا تھا اور حال یہ ہوا کہ محض اپنی شرافت کی وجہ سے ابھی تک مسلمان ہیں

وہ اسلام نعوذ باللہ تنگ معلوم ہوتا ہے (سالک صاحب کو یہ فقرہ سنا دیجئے)

میرا یہ خط احباب کو سنا دینا۔ جگل سے کہئے کہ ظالم تو نہیں رہے نہ بھاگ سندر کی سیمل جو جاتی تیرے پہلے محمد سالک کو میری طرف سے بہت بہت پیار کرنے کا وعدہ کیا ہے؟ پیار لینا! لیکن سالک کو پیار لینا مجھے کچھ سا معلوم ہوتا ہے۔ سالک سے پیار لینا کچھ کاروباری سا معلوم ہوتا ہے خیر)

میرے ذمے منشی صاحب کے کچھ روپے نکلتے ہیں۔ تین پلیٹ ہیں جلد آئی تو ان کے لئے چاکلیٹ کا ایک ڈبہ خرید لاؤں گا اور میں کیا کر سکتا ہوں۔ حفیظ صاحب کی نظمیں وہیں تو بہت یاد آتی ہیں۔ مثلاً کشتی میں سوار ہو کر ہم "گنگا کے ترنگ سے چلی" گاتے ہیں

قبلہ مولوی صاحب اور برادر محترم حمید علی صاحب کی خدمت میں میرا سلام عرض کر دیجئے۔ گردھاری بابو، تاثیر صاحب، اختر صاحب ... اور منشی لچھمن کو نیاز۔

حکیم یوسف حسن سے کہئے نیرنگ خیال خدا کے لئے بھجوا دیجئے۔ معلوم ابھی تک تہذیب نکلی یا نہیں۔ حکیم احمد شجاع کو میرا سلام پہنچا دیجئے۔ اور کہئے کہ یہاں لندن میں ایک ہندوستانی تھیٹر کی سخت ضرورت ہے۔ کچھ اس کے متعلق بھی غور فرمائیے۔

تاثیر صاحب کو سلام۔ باقی جو تمھو خیراتے اس سے کہئے بخاری نے تمہیں سلام بھیجا ہے۔ آئندہ ہفتے میں ایک فہرست بنا کے ملک چھوڑتا ہوں۔ اس کی ہزار دو ہزار کاپیاں چھپواؤں گا۔ میرا پتہ یہ ہے۔

(۳)

امتیاز بھائی! غالباً میں نے تمہیں آخری خط لندن سے لکھا تھا۔ بجز اس ایک کاروباری خط کے جو کیمبرج سے اس کے بعد بھیجا۔ اس وقت دل کی کیفیت یہ تھی کہ انگلستان میں نو وارد تھا۔ ہر ایک چیز کو بظاہر متانت سے دیکھتا تھا لیکن اندر ہی اندر گنواروں کی مانند متحیر اور بدحواس سا ہو جاتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں مرعوب کر دیتی تھیں اور بسا اوقات انگریزوں کی اور خصوصاً کیمبرج کی روز مرہ سمجھ میں نہ آتی تھی۔ سیکھنے کا بے حد مشتاق تھا لیکن کوئی سکھانے والا نہ ملتا تھا۔ سوائے ان چند ہندوستانیوں کے جو پرانے واقف تھے اور جن کو انگلستان میں آئے ہوئے کچھ عرصہ گزر چکا تھا۔ لیکن ان کے رویے میں ایک تصنع، ایک رعونت، ایک سطحی پن، ایک "کھوکھلاہٹ" پائی جاتی تھی جس سے میں کوسوں بھاگتا ہوں۔

اب یہ حالت ہے کہ کیمبرج کے علمی، ادبی، معاشرتی مشاغل میں منہمک ہوں اور جس سہولت اور سلیقے سے میں نے یہاں کی زندگی اختیار کی ہے اس پر میں خود حیران ہوں۔ ہندوستانیوں سے رفتہ رفتہ قطع تعلق ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ آج کسی ہندوستانی سے بات کئے چند دن ہو جاتے ہیں۔ انگریز دوستوں کا حلقہ روز بروز وسیع ہو رہا ہے اور گزر اوقات کا ایک خاص ڈھنگ بنتا چلا جا رہا ہے۔ دل و دماغ نے اپنے لئے ایک معیار اختیار کر لیا ہے اور ہر سرگرمی اس معیار پر پوری اترنے کے لئے وقف ہے۔

جب میں کیمبرج میں پہنچا تو تمام کالج بند تھے۔ بازار بے رونق اور ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس عرصہ میں میں نے چھوٹی چھوٹی ضروریات بہم پہنچا لیں اور کیمبرج کے گرد و نواح سے خوب اچھی طرح واقف ہو گیا۔ جب کالج کھلے تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دائیں بائیں اور ہر طرف ہزاروں دروازے یک لخت کھل گئے جن میں سے ہجوم کے ہجوم کالے گاؤن پہنے تمام شہر پر چھا گئے۔ لہراتے ہوئے گاؤن، ہنستا ہنستا چہرہ، پرانے گھسے گھسائے گاؤن، کیا کالے کیا چیتھڑے، چال میں بے پروائی۔ چہرے پر ایک تیقن، استادہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی دھن

ابھے ہیں۔ یونیورسٹی نے سانس کیا لیا ایک چھینک سی دی جس سے کیمبرج بھر میں ایک لرزہ سا آ گیا جیسے کسی گھڑی ساز کی سب گھڑیاں یک لخت چلنے لگ جائیں۔ اس بھونچال میں میں بھی ایک طرف کو دھیمے دھیمے چلا جا رہا تھا سینے میں ایک عجب ڑکن تھی اور دل پہ ایک اداسی چھائی ہوئی تھی یا الٰہی اب کیا ہوگا۔ یہ تو دنیا ہی نرالی ہے اور یہ بے یار و مددگار نہ ہم سخن نہ ہم خیال سب دور دور۔ پھر اپنے دل کی تقویت کے لئے کوئی سہارا نہیں۔ سننے کے بعد گھر سے خود آتا تو اپنی تنہائی کو اور بھی زیادہ محسوس کرنے

جب لیکچر شروع ہوئے تو اس مایوسی نے کشمکش کی صورت اختیار کر لی۔ وہ یوں کہ بعض لیکچروں میں تو قوی میں ایک حرکت ادیں پیدا محسوس ہونے لگتی اور بعض لیکچروں میں یہ حالت تھی کہ ہونٹ بند کر کے بیٹھا ہوں۔ پنسل ہاتھ میں ہے۔ آنکھیں لیکچرار پر جمی ہوئی ہیں۔ ماتھے پر تیوری ہے۔ ہمہ تن گوش ہوں۔ ایک ایک لفظ کو غور سے سن رہا ہوں اور ہر فقرے کو دل میں دہرا رہا ہوں گزر جاتا ہے اور دماغ کسی چیز پر قابو نہیں پاتا۔ کچھ لکھنے لگتا ہوں لیکن نہیں لکھ سکتا۔ خیالات میں ایک گونج سی ہے جس میں کچھ ڈال سکتا۔ ایسے لیکچر کے خاتمے پر مجھ سا دل شکستہ اور حیران انسان کیمبرج میں نہ ہوتا ہوگا۔ اپنی کم مائیگی پر بے انتہا نادم، زندگی کے ہندوستان میں صرف کئے ان کا بھیانک نقش۔ دل میں غضبناک سے ارادے، نخوت علم کو شدید صدمہ، غصہ، رنج، ملال اور سر جھکا ہوا، ایک نیم مردہ، مایوس انسان آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے لائبریری کی طرف جا رہا ہے۔ یہ وہ انسان ہے جو ہندوستان میں انگریزی کا ماہر، ننھی عمر میں لامحدود قابلیتوں کا مالک سمجھا جاتا تھا۔ دھوکا، احباب سب دھوکا۔ ہائے میرے بچپن کے رفیق ہم عصر سب مایا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے ایک تیسری کی زندگی بسر کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اپنے آپ کو یونیورسٹی لائبریری کے ایک کونے میں گم کر دیا۔ ے کے میرے معنی جب تمہارا کالج بن آئیں گے جب تمہیں یہ معلوم ہوگا کہ لندن کے عجائب خانہ کی لائبریری کی طرح یہاں کی بھی روایت ہے جو کتاب چھپے اس کی ایک کاپی کی حقدار ہے۔ اس کتب خانے میں یوں ہاتھ پاؤں مارے جیسے مثلاً تم ڈوبلی ن کو تیر کر عبور کرنے کی کوشش کرو۔ غرضیکہ ایک تلاطم مچا ہوا تھا۔ ایک دیوانگی سی طاری تھی۔ چاہتا تھا کہ چاسر سے لے کر رڈی تک شعر و سخن کی تمام دنیا پر ایک بجلی سی چمکے اور روشن تصویر پوری کی پوری ایک لمحے کے اندر میرے دل پر نقش ہو جائے چونکہ ممکن تھا۔ چنانچہ دیوانگی نے ایک خطرناک صورت اختیار کر لی۔ کیمبرج کے طوفان نے میرے قدم کہیں بھی نہ جمنے دیئے اور علوم اس سمندر میں غوطے کھانے لگا۔

اس کے بعد مجھے کیا پیش آیا؟ اس کے متعلق مجھے یہاں کے طریقۂ تعلیم کے متعلق ذرا تفصیل سے لکھنا پڑے گا۔

یہاں کے کالجوں کی تعداد چودہ پندرہ کے قریب ہے۔ ہر کالج کا انگریزی لیکچرار لٹریچر کے ایک خاص موضوع پر لیکچر دیتا ہے میں ایک دفعہ اور بعض اوقات ہفتے میں دو دفعہ۔

بعض کالجوں میں انگریزی کے دو تین لیکچرار ہیں اور بعض لیکچرار ایک سے زیادہ موضوع پر لیکچر دیتے ہیں۔ اس طرح انگریزی لٹریچر بھر میں ایک ہفتے کے اندر تیس پینتیس لیکچر ہوتے ہیں۔ ہر کالج میں ایک لیکچرار انگریزی کا انچارج ہوتا ہے جس کو ڈائرکٹر یا اوور سیر سے پکارا جاتا ہے۔

ہم کے مسٹر [illegible] کی ہر طالب علم اپنے کالج کے اندر ہیں کے پاس جانے جاتی بلکہ کلاس کا [illegible]
[illegible] کے کمرے کے پاس بیٹھے ہوئے پہنچے۔ ڈ۔ لیڈلے نے دروازے پر دستک دی۔ لیکن بہت نرم آواز نے "کم ان" کہا۔ ہم اندر داخل ہوئے تو دیکھا آپ کو کتابوں کی الماریوں میں گھرا ہوا پایا۔ ایک معمر پروفیسر مسٹر بینٹ (BENNET) صاحب تھے جو شیکسپیئر اور چاسر کے ماہر تھے اور چاسر کے زمانہ پر ایک قابل قدر تصنیف (THE PASTONS) کے مالک ہیں۔ مجھ سے تعارف کے بعد انھوں نے ہندوستان سے متعلق باتیں شروع کر دیں۔ گفتگو بہت جلد قسم قسم پر ختم کی اور زیادہ تر ہندوستان، اردو شعر، فن تعمیر، سروجنی نائیڈو، مرحوم، ملک لیڈر، [illegible] اقبال، ٹیگور، برنارڈ شا، کپلنگ اور حیدرآباد کے متعلق علم و ادب کو ہم بھی آخر تک سے بڑی دلچسپی سے سنتے گئے ہیں۔ گھبرانے ہٹ دی۔ جھجک کے بعد ہم نے بھی دل کھول کر بحث شروع کیا گو کہ اوقات داستان کو زینت دینے کے لئے حقیقت سے ذرا انحراف بھی کیا محض حب وطن کی خاطر، لیکن عام لہجہ ایک راست گو، حق پرست انسان کا تھا، اپنی اور اپنی قوم کی کمزوریوں سے بھی طرح واقف ہے۔ جو باوجود قوم انگلش کے گوناگوں احسانات سے باخبر ہونے کے انھیں ایشیائی تہذیب کے لئے کچھ مضر بھی سمجھتا ہے اور جو اب تحصیل علم کی خاطر یہاں کے مشاہیر کے قدموں میں بیٹھنے کو باعث صد فخر و مسرت تصور کرتا ہے۔

جناب کچھ مسکرائے۔ ایشیائی تہذیب اور تاریخ اسلام سے بہت دلچسپی ظاہر کی۔ میرے انگریزی [illegible] کی [illegible] کی داد بھی یہ باتیں کہنے لگے جیسے میں العنایہ کا کوئی لیکچرر ہوں۔ لیکن افسوس کہ تھوڑی ہی دیر بعد گفتگو نے انگریزی لٹریچر کی طرف رخ کیا جہاں اپنے عجز اور کم مائیگی کا اعتراف کیا۔ اپنی نالائقی کو کوسا۔ اپنی جہالت کے متعلق ایک بلیغ تقریر کی اور جو کچھ کہا اس کا مطلب یہ تھا کہ ہمارا علاج کیا ہے؟

جو کچھ انھوں نے جواب میں کہا اس کا مطلب یہ تھا کہ تم بالکل جینئس ہو۔ اگر تم یہ توقع کرتے ہو کہ تمھیں ہر لکچر سمجھ میں آ جائے تو تم غلطی پر ہو۔ ڈاکٹر لیوس (LEWIS) کے لکچر جن کے متعلق تم نے شکایت کی ہو وہ کیمبرج میں کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آتے اور کوئی بھی اس قدر لکھا نہیں ہوتا کہ چاسر سے لے کر ہارڈی تک سب انگریزی لٹریچر کی ہر ایک [illegible] بنا کر جا جانا چاہئے۔ جو مصنف تمھیں پسند ہیں صرف ان کی تصنیفات تمھارے دل و دماغ میں ایک خوشگوار ہیجان پیدا کرتی ہیں صرف وہی پڑھو۔ صرف انہی کے متعلق لکچروں میں جاؤ۔ باقی بالکل چھوڑ دو۔ چنانچہ یہ رہی لکچروں کی فہرست۔ فلاں فلاں لکچروں میں جاؤ۔ ان کے متعلق اس ہفتہ صرف یہ دو کتابیں پڑھو۔ اگلے ہفتے اس کے بعد ہر ہفتے مجھ سے اسی وقت ملو۔ جو وقت تمھیں [illegible] آئے بالکل دن اوقات یہی کسی وقت مجھ سے مل کر بیان کرو۔ یہ کتابیں مجھ سے مستعار لے جاؤ۔ پرسوں اگر میرے ساتھ چائے پیو تو میری بیوی تم سے مل کر بہت خوش ہوگی۔ رہتے کہاں ہو؟ میں کسی وقت آ کر تم سے ملوں گا۔ جب لندن میں جاؤ پروفیسر جونز سے ملو تو بعد میں مجھے اس ملاقات کا مفصل حال سنانا۔ کوئی کھیل کھیلتے ہو؟ نہیں کوئی اور شغل؟ شاید موسیقی؟ خوب کبھی ہمیں بھی سنانا۔ تمھارے [illegible] کا وقت قریب آ رہا ہے۔ میں تم سے مل کر بہت خوش ہوا ہوں اور حیران ہوں کہ تم لوگ ہندوستان میں رہ کر اتنی انگریزی کیونکر سیکھ لیتے ہو۔ تمھارے دستانے کہاں ہیں؟ راستہ تو نہیں بھول جاؤ گے؟ میں تمھارے ساتھ چلوں؟ نہیں؟ اچھا خدا حافظ۔ خوش رہا کرو اور جب کبھی کسی قسم کی تکلیف ہو فوراً میرے پاس آ جایا کرو۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا اور واپسی میں تمام راستے مسکراتا آیا۔

پھر تو ہمارے حوصلے بڑھنے لگے اور جوں جوں دن گذرنے لگے زندگی خوشگوار تر ہوتی گئی۔ آہستہ آہستہ میں نے [illegible]

سالک صاحب سے۔ واقفیت سے دوستی اور دوستی سے بے تکلفی کی نوبت آئی۔ ایک آدھ صحبت سے مجھے معلوم ہوا، بیچ کی حالت بدل گئی ہے۔ لیکن ـــــ

لیکن وہ ہندوستان کی صحبتیں کہاں، وہ خوش گفتاری، وہ شعر بازی، وہ بحثیں، وہ مذاق، وہ مناظرے، وقت بے وقت گرما گرم چائے اور عمل و ادب، وہ ہوٹل کی مجلسیں وہ دارالاشاعت کے مجمعے، ہنسے اٹھنا، ایک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے۔ چیدہ بگا کی خوش اخلاقیاں، تمکنت کی چپیں، میرے سالک کی مذہبی لن ترانیاں (اللہ دودھوں نہائے اور پوتوں پھلے) وہ حفیظ کی عمر یا اللہ (دانش کی ماں)

غرضیکہ ان باتوں کو دو سال کے لئے بھلانا پڑے گا۔ اب زندگی کا یہ ڈھنگ ہے کہ کالج کے ہوسٹل میں دو کمرے میرے ہیں۔ ایک بیٹھنے کو، ایک سونے کو۔ باقی جگہوں میں صرف رات کا کھانا اکٹھا کھایا جاتا ہے۔ ہمارے ہوسٹل میں یہ دستور ہے کہ ہوسٹل کے رہنے والے جن کی تعداد تیس کے قریب ہے، ناشتہ اور لنچ کامن روم میں اکٹھے کھاتے ہیں اور شام کا کھانا سب کالج کے طلبا اور اساتذہ کے ساتھ کالج کے ہال میں ہوتا ہے۔ چائے کا اکثر یہ حال ہے کہ یا کہیں مدعو ہوں یا کوئی میرے ہاں آیا ہوا ہے۔

صبح کے وقت ڈریسنگ گون، پاجامہ، سلیپر اور تولئے غسل خانے سے آتے جاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ غسل خانے کے اندر سب ننگے ہو کر بغیر کسی شرم و حیا کے ایک دوسرے کے سامنے نہاتے ہیں۔ پھر کامن روم میں حاضری۔ نو بجے کے بعد سب گون پہنے ہوئے پیدل اور بائیسکلوں پر بھاگتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ہر بائیسکل کے ہینڈل کے ساتھ ایک ٹوکری لگی ہوتی ہے جس میں کتابیں وغیرہ ڈال لیتے ہیں۔ نو بجے سے ایک بجے تک لیکچروں کے اوقات ہوتے ہیں۔ اس دوران میں کیمبرج کا نظارہ تین عناصر سے مرکب ہوتا ہے (۱) گون (۲) بوٹ کیپ (۳) جلدی۔ دس بجے ایک لیکچر اس کالج میں ختم ہوا۔ اور دس بجے دوسرا لیکچر دوسرے کالج میں شروع ہونے والا۔ چنانچہ اکثر اوقات بازاروں میں سے بے تحاشا بھاگتے ہوئے جانا پڑتا ہے۔ لیکچرار ہر قسم کے ہیں۔ ایک مسٹر بیٹ ہیں۔ دبیز عمر، جوانی میں بہت ہی خوبصورت ہوں گے۔ شیکسپیئر اور زمانہ وسطیٰ کے لٹریچر پر لیکچر دیتے ہیں۔ اس انہماک، اس جوش، اس فصاحت، اس بلاغت کے ساتھ کہ اکثر کلاس دو دو منٹ تک داد دیتی رہتی ہے (جس کا طریقہ یہ ہے کہ فرش پر زور زور سے پاؤں مارتے ہیں) ایک مسٹر ٹل یارڈ (TILL YARD) ہیں ملٹن پڑھاتے ہیں اور اس کے علاوہ تاریخ تنقید پر بھی لیکچر دیتے ہیں۔ لیکن جس موضوع پر بولتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عمر اسی پر صرف کر دی۔ ایک مسٹر لوکس (LUCAS) ہیں۔ اچھے اچھے فقرے، اعلیٰ درجہ کا تمدن، غضب کی تشبیہیں۔ لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی ان پر ختم ہے مگر مطلب کی بات بہت کم کہتے ہیں اس لئے گو دکا ٹیوٹس من پر نکتہ دیتے ہیں لیکن میں نے ان کے مضمون کا ذکر نہیں کیا۔ ایک ڈاکٹر لیوس (LEWIS) ہیں، نوجوان لیکن D. Litt. کی ڈگری کے مالک۔ تنقید جدید ان کا خاص مضمون ہے۔ تنقید کی بنیاد دقیق نفسیات پر رکھتے ہیں۔ بڑے بڑے موجودہ معقولات کے بخیئے ادھیڑتے ہیں (ان میں بے چارے لوکس بھی شامل ہے) لیکن اپنے موضوع میں اس قدر ڈوبے ہوتے ہیں کہ ہنسی مذاق کی بات ان کے ہونٹوں پر آتی ہی نہیں۔ جو شخص ان کے لیکچروں میں دو نقرے بھی اچھی طرح سمجھ لے یقینی امر ہے کہ دو تین سال کے بعد انگلستان کے بہترین نقادوں میں شمار ہو گا لیکن ہیں وہ دو نقرے!

میں ان کے پاس بھی بیٹھتا ہوں۔ دو دفعہ اپنا جواب مضمون دکھلانے جا چکا ہوں۔ بے چارے میرے ساتھ بہت محبت کرتے ہیں لیکن ان میں جتنی پرواز ہے اور جس زمین پر میں رینگتا ہوں ان میں فاصلہ اس قدر ہے کہ میرا ان کے برابر آنا شاید کبھی ممکن ہو سکے

میں اب تک اس قطعی ناممکن بنا پر ان سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہوں۔ بہت کچھ۔ لیکن ہر دفعہ اپنے مضامین کا نصف تیز احساس ہے جو ان کا ہولناک بہت دیر تک برہم کئے رکھتا ہے۔

اور ان سب سے بڑھ کر پروفیسر کوئلر کوچ (ARTHUR QUILLER COUCH) ان کے نام سے تو تم واقف ہو گے اگر نہیں تو تمہاری جہالت کی انتہا ہے۔ کیمبرج میں ہر کوئی ان کو Q کے نام سے جانتا ہے۔ صحت کی خرابی کی وجہ سے باہر کم نکلتے ہیں۔ اور باقاعدہ لیکچر بھی نہیں دیتے۔ صرف ہفتے میں ایک بار کلاس لیتے ہیں۔ بدھ کے دن شام کے ساڑھے آٹھ بجے ان کی کلاس ہوتی ہے جس میں تمام پچاس ساٹھ آدمیوں کو۔ ارسطو کی POETICS پڑھاتے ہیں۔ کلاس کا حال سن لو۔ ایک اوسط درجے کا کمرہ ہے۔ زمین پر قالین عمدہ۔ بیس پچیس کرسیاں، آتشدان میں آگ خوب جل رہی ہے۔ بیچ میں ایک بڑی میز ہے جس پر پچاس ساٹھ پرچ پیالے پڑے ہیں۔ ساڑھے آٹھ بجے لوگ آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ جو پہلے آتے ہیں وہ کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ باقی فرش پر ہی پالتی مار کر یا نیم دراز۔

ساڑھے آٹھ بجے دروازہ کھلتا ہے اور صاحب داخل ہوتے ہیں۔ سر اور مختصری مونچھوں کے بال سفید، خمیدہ قامت، ہاتھ میں چھڑی۔ عینک پہنے، چہرہ پر مسکراہٹ۔ مسکراہٹ بھی شرابیوں کی سی اور فی الواقع پیتے بھی بہت ہیں۔ سب لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ورنہ کلاس میں کھڑے ہونے کا دستور نہیں۔ Q کے پیچھے پیچھے ایک ملازم طشت میں چائے لئے ہوئے داخل ہوتا ہے۔ سب لوگ میز کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ ہر ایک کافی کا پیالہ اٹھا کر اپنی نشست پر جا بیٹھتا ہے اور سگریٹ یا پائپ سلگا لیتا ہے۔ پروفیسر صاحب کسی طالب علم کو پڑھنے کا اشارہ کرتے ہیں۔ وہ ایک آدھ پیراگراف پڑھتا ہے اور پھر Q صاحب اس پر بحث کرتے ہیں۔ جس میں دنیا جہان کی باتیں بیان کر جاتے ہیں۔ بعض دفعہ خوب نوک جھونک کی بحث بھی ہوتی ہے۔ کلاس کیا ہے ضیافت اور دعوت ہے۔ علم ادب کی ایک ضیافت ہے جس سے دل کبھی سیر نہیں ہوتا۔ خود پروفیسر Q کی تصنیف کا میں تمہیں اس سے بہتر اندازہ نہیں دے سکتا کہ ان کی ترکیب طبیعت کا نمونہ ان الفاظ میں لکھو کہ شبلی، غالب، حالی، آزاد اور اودھ پنچ کو ملا کر اس کی انگریزی بنا لو اور سو سے ضرب دے دو۔ انگریزی پڑھانے والوں میں سے لٹریچر کے شعبے میں صرف یہی ایک بزرگ ہیں جو پروفیسر کے لقب سے ملقب ہیں۔ لہذا تم ان کے تبحر کا اندازہ خود ہی لگا لو۔

دوپہر کے ایک بجے لیکچر ختم ہوتے ہیں اس کے بعد دو بجے تک لنچ اور دو بجے سے چار بجے تک۔ تمام طلبہ کوئی نہ کوئی کھیل کھیلنے جاتے ہیں۔ چار بجے شام ہو جاتی ہے اور اندھیرا چھا جاتا ہے۔ چراغ روشن کر دیئے جاتے ہیں۔ آگ جلائی جاتی ہے اور اس پر چائے کے لئے پانی رکھ دیا جاتا ہے۔ چائے کے بعد ہال تک (یہاں کی اصطلاح میں ہال شام کے کھانے کو کہتے ہیں) چاہو تو ایک آدھ گھنٹہ مطالعہ کرو، چاہو تو کسی کا وقت ضائع کرو۔ ہال کے بعد کافی کے لئے آگ پر پانی رکھ دو اور جب تک دل چاہے پڑھتے رہو یا بے شک کالج سے باہر نکل جاؤ اور اگر بہت ہی بدتمیز دوستوں سے واسطہ پڑا ہے تو دروازہ کو اندر سے تالا لگا کر بیٹھو (یہ فعل تو ناگوار شبہات کا باعث ہو سکتا ہے۔ لہذا اپنے دوستوں کو اس کے صحیح معنی سمجھنے کی عادت ڈالو۔)

یہ تو تمہیں معلوم ہوگا کہ ابتدا میں یہ سب کالج راہب خانے تھے۔ چنانچہ یہاں کی زندگی میں مذہبی رنگ بہت نمایاں ہے۔ ہر کالج کے متعلق ایک گرجا ہے اور اس کے علاوہ شہر میں اور بھی بہت سے گرجے ہیں جن کے گھنٹے یہاں کی فضا کو ہر وقت موسیقی سے بھرے رکھتے ہیں۔ ہر ہفتے اتوار کو کسی نہ کسی گرجے میں ایک نہ ایک مشہور پادری یا واعظ یا مبلغ کا لیکچر ہوتا ہے۔ کیمبرج کا شہر بہت چھوٹا سا ہے۔ اور یہاں کی آبادی خاص طور پر دو حصوں میں منقسم ہوتی ہے۔ ایک تو وہ لوگ جو یونیورسٹی سے متعلق ہیں اور طلبہ

کے شروع ہوتے ہی یک لخت غائب ہو جاتے ہیں ان کو GOWN MAN کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جس قدر شہر کے اصلی باشندے ہیں وہ سب کے سب دوکاندار پیشہ یا مزدور پیشہ ہیں۔ ان کو TOWNS MAN اور طلبا کی اصطلاح میں ٹاؤنی کہا جاتا ہے یہ سب لوگ نچلے طبقے کے ہوتے ہیں۔ کیمبرج میں کالج کی حدود کے باہر شرفا مفقود ہیں۔

انڈر گریجویٹ UNDER GRADE لڑکوں کا یہ حال ہے کہ اگرچہ جوں بالکل نہیں رہا تو چھوٹی ٹوپی پہننا گناہ سمجھتے ہیں۔ نیلا کوٹ اور فلالین کی پتلون یہاں کا لباس ہے۔ پتلون پر بڑے بڑے سیاہی کے داغ۔ گاؤن کی بے حرمتی کرنا فخر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ جان بوجھ کر اس میں جابجا سوراخ کرتے ہیں۔ اس سے یہ بھی مقصود ہوتا ہے کہ ذرا پرانا معلوم ہو۔ ان کے مشاغل کی کثرت کا کچھ نہ پوچھو۔ ہر قسم کے جنون ہیں۔ پڑھتے ہیں، کھیلتے ہیں۔ سیر و سیاحت کی ایک کلب بنا لیتے ہیں جس میں جنوبی افریقہ تک ہو آتے ہیں۔ مچھلیاں پکڑتے۔ گولف کھیلتے ہیں۔ کشتیاں چلاتے ہیں۔ طرح طرح کے ساز بجاتے ہیں۔ ناچتے ہیں۔ گرجا کو جاتے ہیں۔ تبلیغ کا کام سیکھتے ہیں۔ تصویر کشی کرتے ہیں۔ بعض رؤسا بہت اعلیٰ درجہ کی پوشاک پہنتے ہیں۔ بعض کسی سیاسی کلب کے ممبر ہیں جہاں ہمیشہ کسی نہ کسی سیاسی لیڈر کے لیکچر ہوتے رہتے ہیں۔ بعض ایک پیانو کرایہ پر لے آتے ہیں۔ بعض نے دو موٹر کاریں رکھی ہوئی ہیں اور کسی موٹر کار کلب کے ممبر ہیں جس کے باعث دنیا کی ہر بڑی سڑک پر مل جاتے ہیں۔ بعض کی زندگی گھوڑ دوڑ کے لئے وقف ہے۔ بعض صبح سے شام تک لیبارٹری میں بھاڑ جھونکتے ہیں۔ ڈرامیٹک کلبیں بے شمار ہیں۔ بعض صرف اوپیرا اور میوزیکل کامیڈی کرتے ہیں۔ بعض صرف یونانی کھیل۔ بعض سیدھی سادی کامیڈی۔ سینری۔ ڈریس وغیرہ سب خود بناتے ہیں۔ یا کم از کم وضع کرتے ہیں۔ غرضیکہ ایک تعلیمی میلہ ہے جس میں جو کام ہوتا ہے انہیں کے ساتھ انہاک و انضباط۔ یہاں کے دو بڑے اصول ہیں۔ اور ان سب کی تہہ میں وہ حیرت انگیز طاقت کام کر رہی ہے جس کو TRADITION کہتے ہیں۔ ہفتہ بھر پہیئے چلا دینے والی مصروفیت میں گزرتا ہے۔ دن کو بھاگتی ہوئی ٹانگیں۔ رات کو بند کمرے، روشن چراغ اور کھلی ہوئی کتابیں۔ اتوار کے دن کیمبرج کی سب آبادی، سب مصروفیت، سب چہل پہل خدا جانے کہاں غائب ہو جاتی ہے۔ اتوار! یہاں کی اتوار ایک معجزہ ہے۔ دن کے گیارہ بجے میلوں گھوم جاؤ۔ ایک درجن سے زیادہ آدمی نہ پاؤ گے۔ وہ بھی سیاہ پوشاک، سست رفتار، سوائے گرجاؤں کے گھنٹوں کے اور زندگی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ بازاروں کو دیکھو تو ہو کا عالم۔ آہیں بھرنے کو دل چاہتا ہے۔ شام کے وقت دن کی کسر پوری کر دی جاتی ہے اور مردوزن کے جوڑے ہزاروں کی تعداد میں چہل قدمی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اکثر قبل ازدواج کے مراحل طے کرنے میں مصروف ہوتے ہیں اور یہ وہ شغل ہے جو انگلستان میں شادی سے پہلے بھی جاری ہے اور شادی کے بعد بھی۔ شادی کا ارادہ نہ ہو جب بھی۔ حق تو یہی ہے کہ اسے شادی سے کچھ چنداں تعلق نہیں اور چونکہ کیمبرج کے لوگ تمام تر نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے اس کے قبیح ترین پہلو بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔

کیمبرج آکسفورڈ کی بہ نسبت بہت زیادہ قدامت پرست ہے۔ چنانچہ گو یہاں لڑکیوں کے دو کالج ہیں۔ لیکن یہاں کی طالبات نہ تو یونیورسٹی کی ممبر شمار کی جاتی ہیں نہ کسی ڈگری کی حقدار۔ البتہ لیکچروں میں آتی ہیں اور امتحانوں میں بیٹھ سکتی ہیں لیکن امتحان پاس کرنے کے بعد ان کو ڈگری نہیں ملتی۔ باوجود اس کے انگریزی کی کلاس میں پچاس ساٹھ لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ اگر اتفاق سے لیکچر میں کوئی ساتھ بیٹھ جائے تو شامت آ جاتی ہے۔ ہم لوگ ایک نوٹ بک کھول کر نوٹ لینا شروع کر دیتے ہیں اور

زیادہ سے زیادہ میز کا ایک مربع فٹ استعمال کرتی ہیں۔ وہ پہلے آگے سے ولز کی کادم کھول کر میز پر رکھتی ہیں۔ پھر دستانے اتار کر رکھتی ہیں۔ پھر کوٹ اتار کر بنچ کی پشت پر پھیلاتی ہیں۔ دستانوں کے پاس ٹوپی اتار کر رکھ دیتی ہیں۔ پھر ہینڈ بیگ کھول کر اس میں سے پنسل اور رومال نکالتی ہیں۔ رومال سے ناک پونچھتی ہیں۔ ہینڈ بیگ کے چھوٹے سے آئینے میں اپنے چہرے کا جائزہ لیتی ہیں۔ کنپٹی پر سے زلفوں کو کچھ سنوارتی ہیں۔ پھر کچھ جھک کر کہنی کو پڑوسی کی ناک میں دے کر بہت خوبصورتی اور سلیقے سے نوٹ لینا شروع کر دیتی ہیں۔ دو منٹ کے بعد ان کے قلم میں سیاہی ختم ہو جاتی ہے۔ فرماتی ہیں کہ آپ اپنا قلم یا پنسل پیش کیجئے اور خود گھنٹہ بھر مکھیاں مارتے رہیئے۔ ایک ایسے تلخ تجربے کے بعد اب میں ایک فالتو پنسل ضرور رکھتا ہوں۔

یہ حقیقت کیمبرج یونیورسٹی ہے۔ یہاں کا ہر ذرہ جو تاریخ انگلستان کی ایک فراموش نسل ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ہم سے کہیں پہلے جان ہارورڈ جس نے امریکہ میں ہارورڈ یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی، آیا۔ کرامویل CROM WALL سٹرن STERENE کولرج، کیمویل، بنز، بیکن، ٹینی سن، تھیکرے، میکالے، نیوٹن، بل ور لیٹن، پٹ، ورڈز ورتھ، ہربرٹ، ولیم پٹ، گرے اور ملٹن کسب فیض کر چکے ہیں۔ اور جہاں انگلستان کی آئندہ نسل کے کئی ہزار اس وقت تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اس بہارستان میں ہندوستان کا ایک مرجھایا ہوا بے رنگ پھول کیا حقیقت رکھتا ہے۔ غریب ماں باپ کا بیٹا۔ ایک غلام قوم کا فرد۔ نسیم اور مرزا شوق کی مثنویوں کا پڑھنے والا۔ فسانہ آزاد کا دلدادہ۔ جلسے اور ساز کا شوقین۔ "زمیندار" اور "گلستان" کا خریدار۔ ایشیا کے عشقیہ افسانوں میں رچا ہوا۔ مغلیہ عیش و عشرت کا خواہشمند۔ اتحاد اسلامی کے خواب دیکھنے والا۔ میں بھلا کیا حقیقت رکھتا ہوں۔ خدا آبرو سے رکھے اور آبرو سے وطن کو واپس لے جائے۔ آپ میرے لئے یہی دعا کیجئے۔

دو سال کے بعد "میرے مولا بلا لے مدینے مجھے" دعا کرو

اس دوران میں ایک دو دفعہ لندن بھی گیا۔ گلیڈس کوپر اور جیرالڈ . . . . کو ایکٹ کرتے دیکھا۔ لیکن تھیٹروں کے متعلق پھر کسی خط میں لکھوں گا۔ ایک دن پورا فرتھ کے ساتھ گذارا۔ اصوات کی معیت میں پروفیسر جونز اور یونیورسٹی کالج کے ماسٹر سے دن بھر اردو، پشتو اور پنجابی کی اصوات کے متعلق نہایت تپاک سے ملا۔ انھوں نے میرے حروف تہجی کو سراہا۔ میں نے ان کی ڈرافٹ کو پرکھا۔ بعض اصوات کے متعلق کچھ تیز بحث ہوئی کہ حلق کے کون کون سے کونے میں سے نکلتی ہیں۔ بحثتے بحثتے ہاتھا پائی کی نوبت آنے لگی لیکن بعد میں صلح صفائی ہو گئی۔

ایک دن لندن سے ہاشمی کا خط آیا۔ "ارے تم!" "ارے ہیں!!" "اُفوہ" اس قسم کے جذبات کے اظہار کے بعد جناب نے لکھا تھا کہ کسی دن شام کے سات بجے کے بعد فلاں پتہ پر ہم سے آ کر ملو۔ حضرت یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ میں لندن میں ہوں۔ خط میرے بزرگوں کی معرفت بھیجا تھا۔ ہم نے انہیں جواب میں لکھا۔ "بے عقل! ہمارے جیسے شرفا کو لندن سے کیا واسطہ۔ ارے تم کیمبرج آؤ ہمیں کیمبرج میں یہیں یہاں آ کے ہم سے ملو۔" چنانچہ ایک دن شام کے تین بجے کے قریب آپ وارد ہوئے۔ "ارے یار بخاری" "ارے سید ہاشمی" قصہ مختصر

دو لیٹس کے ڈھنگ پر بغل گیر ہوئے، اور شام تک بغیر ایک دوسرے کی بات سننے کے دونوں ایک ساتھ بکتے چلے گئے۔ کبھی گلے لگ جاتے، کبھی شعر پڑھنے لگ جاتے۔ غرضیکہ عجب ہنگامہ رہا۔ عجب عجب قصے دہرائے گئے۔ ہندوستان کی حالت زار پر بہت افسوس کیا گیا۔ اب آپ سب لوگوں کا انگلستان آنے سے محرومی پر لعنت و نفرین کے ووٹ پاس کئے گئے۔ شام کی گاڑی سے وہ لندن چلے گئے اور دوبارہ آنے کا وعدہ کر گئے۔ تم پوچھو گے ہاشمی کا کیا حال ہے؟ بہبر بالکل وہی تیز ہے بالکل وہی۔

اس ہفتے کی ڈاک میں تمہارا خط۔ سیفی کا خط، زبیدہ کا خط، بچوں کی تصویریں سب ایک ساتھ ملیں یعنی ہندوستان میرے لئے جو کچھ محبوب ترین اور عزیز ترین ہے وہ یک لخت چھت پھاڑ کر میرے سر پر آگرا۔ جگل کے خط کا بہت بہت شکریہ۔ ان کی غزل نے مجھے گھنٹوں مست رکھا۔ جگل میرے بھائی اور حفیظ میرے بھائی اور امتیاز میرے بھائی اور سالک میرے بھائی! خط ضرور لکھتے رہا کرو۔ اگر تم سب لوگ باری باری بھی خط لکھو تو ہر ہفتے مجھے اپنے احباب کی ایک جیتی جاگتی تصویر مل جایا کرے اور تم میں سے ہر ایک کو مہینے میں ایک دفعہ خط لکھنا پڑے۔ اور میرے بھائیو تم خود ہی سوچو کہ مجھے ہر ہفتے ایک خط والد کو، ایک خط ڈپٹی صاحب کو، ایک خط اپنی رفیق حیات کو، ایک رفعت صاحب کو لکھنا ہوتا ہے۔ اے میرے بھائیو! میں تم سے ہر ایک کو ہر ہفتے کیسے خط لکھ سکتا ہوں (میری آواز اس وقت بھرائی ہوئی ہے) لہٰذا اے میرے بھائیو! اسلامی اخوت کا ثبوت دو اور خط لکھو۔

میں نے اس اپیل کو بہت رقت انگیز بنانے کی کوشش کی ہے لیکن مجھے شبہ ہے کہ دفتر اشاعت میں اس کی ہنسی اڑائی جائے گی۔ اور میرے جذبات کو غائبانہ مجروح کرنے کی از حد سعی کی جائے گی۔ ’فلک حقہ باز کو کیا کہوں‘

سالک صاحب! استاذی و محبی! خدا کے لئے خط لکھو۔ جگل کے خط نے تڑپا تڑپا دیا۔ خدا اسے خوش رکھے۔

خاکسار بخاری
عمانویل کالج کیمبرج

۵ر نومبر ۱۹۲۶ء

میکسیکو کے کوچہ و بازار

پروفیسر احمد شاہ بخاری سن ۱۹۴۷ء کی یونیسکو جنرل کانفرنس میکسیکو میں پاکستان کے نمائندہ کی حیثیت سے تشریف لے گئے تو آنریبل خواجہ شہاب الدین وزیر داخلہ کے نام حسب ذیل خط بھیجا:

عزیز و مشفق، سلام مسنون

ڈان کے کسی تازہ پرچے میں یہ خبر پڑھ کر طبیعت خوش ہوئی کہ کراچی میں بازاروں اور سڑکوں کے نام مشاہیر قوم کے نام پر رکھے جائیں گے۔ اس سلسلے میں میکسیکو کے بعض طریقے اچھے ہیں۔ دلچسپ بھی۔ ان کا مختصر حال لکھتا ہوں۔ ممکن ہے کوئی بات آپ کے کام کی نکل آئے۔

جہاں تک مجھے نظر آیا۔ یہاں کسی بازار یا سڑک کا نام کسی زندہ شخص سے منسوب نہیں۔ ہمارے لاہور کی طرح نہیں کہ جو شخص دو تین سال سے نیا نیا کمشنر ہوا، وہ کسی نہ کسی سڑک کو اپنے نام سے مزین کر گیا۔ چنانچہ لاہور میں کئی سڑکوں اور محلوں کے نام اب ایسے ہیں کہ کسی کو یاد بھی نہیں کہ کن کے نام منسوب ہوئے تھے اور اگر وہ اب تک زندہ ہیں تو سب کے گمنام یا بدنام ہو چکے ہیں۔ میکسیکو کی تاریخ یہ ہے۔ تین سو سال تک یہاں ہسپانوی حکمران رہے۔ ان لوگوں کا خون چوسا۔ ۱۸۲۱ء کے لگ بھگ اس ملک نے بزور شمشیر آزادی حاصل کی۔ اس کے تقریباً سوا سو سال تک خانہ جنگی رہی۔ جس میں بڑے بڑے لیڈر اور بڑے بڑے اولوالعزم محب وطن دونوں قسم کے لوگ پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۰ء میں ایک انقلاب عظیم ڈکٹیٹری کے خلاف برپا ہوا جو کئی سال تک رہا اور جس میں میکسیکو کے بیشتر ذکر مارے گئے۔ اس سو دو سو سال کی تاریخ میں کئی محبان وطن اور مشاہیر قوم برسر کار آئے اور اکثر قوم کی راہ میں شہید ہوئے۔ یعنی قوم کے دشمنوں یا غداروں یا کوتاہ نظر لوگوں اور اہل ہوس کی گولی یا تلوار کا نشانہ بنے۔ ان سب کے نام آج بازاروں کی زینت ہیں۔ بعض ناموں ہی سے میکسیکو کے قومی عروج کی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔ تین نام تو بالخصوص جا بجا ملتے ہیں۔

ایدالگو (HIDALGO) موریلاس (MORELOS) جواریز۔ ان میں سے دو مشاہیر نے ۱۸۱۰ء میں ہسپانیہ کے خلاف علم آزادی بلند کیا تھا۔ تیسرا انیسویں صدی کے وسط میں میکسیکو کا پریذیڈنٹ تھا۔ اس نے نیا کانسٹی ٹیوشن ۱۸۵۷ء میں بنایا تھا اور کئی اصلاحات مرتب کی تھیں۔ اس کے علاوہ ہر شہید پریذیڈنٹ کا نام کسی نہ کسی بازار پر ثبت ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور ادا ان کی مجھے بہت پسند آئی۔ وہ یہ کہ کئی بازاروں کے نام [illegible] قوم کی اہم تاریخوں سے منسوب ہیں۔ آپ کو یاد ہو گا پیرس میں بھی ایک مشہور بازار کا نام "۴ ستمبر" ہے۔ یہاں یہ رسم عام ہے۔ ہر بڑے شہر میں ایک نہ ایک بازار کا نام "۵ مئی" ضرور ہو گا۔ اس تاریخ کو میکسیکو کی حکومت نے فرانسیسیوں کو شکست دی تھی۔ ایدالگو (HIDALGO) نے آزادی کا اعلان ۱۶ ستمبر ۱۸۱۰ء کو کیا تھا چنانچہ ایک بازار کا نام "۱۶ ستمبر" ہے۔ اسی طرح ایک اور بازار کا نام "۲۰ نومبر" ہے۔ کوئی ناواقف اجنبی یا سیاح جب میکسیکو آتا ہے تو لامحالہ ایک د

ایک دن ان تاریخوں کی اہمیت دریافت کرتا ہے۔ گویا وہ محض میکسیکو کی تاریخ کے درخشاں پہلوؤں سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ خود قوم پر بھی اس کا اثر بہت اچھا پڑتا ہے۔ بچے بچے کو اپنی تاریخ کے اہم واقعات سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔

صرف مشاہیر اور تاریخوں ہی پر کفایت نہیں۔ ایک بازار کا نام آرٹیکل ۱۲۳ (ARTICLE — 123) ہے یہ میکسیکو کے کانسٹی ٹیوشن کی طرف اشارہ ہے جو آئینی [illegible] ۱۹۱۷ء میں مرتب ہوا تھا۔ اس کانسٹی ٹیوشن کی دفعہ ۱۲۳ میں مزدوروں کے حقوق با وضاحت محفوظ کر دیے گئے ہیں اس بازار کا نام گویا اس بات کی یادگار ہے کہ میکسیکو کی کانسٹی ٹیوشن مزدوروں کی دوست اور خیرخواہ ہے۔

میکسیکو کا شہر اچھا خاصا وسیع ہے آبادی ۲۵ لاکھ کے قریب ہے چنانچہ سینکڑوں بڑے اور چھوٹے بازار ہیں۔ ناموں کی تلاش میں یہاں کے ارباب اقتدار نے بڑی بڑی جدتیں دکھائی ہیں اپنے مشاہیر کے ناموں اور اپنی تاریخ کے اہم واقعات سے پورا پورا فائدہ اٹھا چکے تو دنیا کی تاریخ اور دنیا کے جغرافیہ کی طرف رجوع کیا۔ یورپ کا کوئی مشہور دارالخلافہ یا شہر ایسا نہیں جس کے نام پر کسی نہ کسی بازار کا نام نہ ہو۔ ایک بازار کا نام پیرس بازار ہے۔ ایک کا نام "مارسیلز" ایک کا نام "لندن" وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ایسے بازار سب کے سب ایک دوسرے سے متصل اور ایک ہی علاقے میں واقع ہیں۔ چنانچہ آپ سے اگر کوئی بازار پیرس کا ذکر کرے تو آپ کو نام سنتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ شہر کے کس حصے میں واقع ہے۔ علیٰ ہذا ایک اور علاقہ ایسا ہے کہ اس میں سب بازاروں کے نام دنیا کے مشہور دریاؤں پر رکھے گئے ہیں۔ مثلاً نیل، ڈینیوب، دجلہ، فرات، رائن وغیرہ۔

شہر کے ایک اور علاقے میں سب بازاروں کے نام دنیا کے مشہور اہل فن اور اہل علم کے ناموں پر رکھے گئے ہیں مثلاً شیکسپیئر، ڈارون، ریگل، کوپرنیکس وغیرہ وغیرہ۔ ایک اور علاقہ میں سب بازاروں کے نام جنوبی امریکہ کے نام پر رکھے گئے ہیں مثلاً برازیل، ارجنٹائن، کیوبا، گوئٹے مالا وغیرہ۔

لیکن جہاں کسی بازار کا نام پہلے ہی کوئی خاص تاریخی یا اسی قسم کی کوئی اور اہمیت رکھتا ہو اسے بدل نہیں دیتے، خواہ یہ تاریخی اہمیت قومی ہو یا محض مقامی اور خواہ کوئی ادبی یا کوئی اور اہمیت ہو۔ اس کی مثال لاہور میں یہ ہے کہ انارکلی بازار، چوک وزیر خان، تیر اندازوں کی گلی ایسے نام نہ بدلے جائیں کیونکہ ان میں مقامی تاریخ کے کئی دلچسپ پہلو نکلتے ہیں یہاں ہر شہر کی مقامی تاریخ میں خاص طور پر دلچسپی پیدا کی جاتی ہے ہر شہر کا اپنا ایک عجائب خانہ ہے جس میں مقامی تاریخ، تصاویر یا نقشے یا دیگر یادگاریں اور علاوہ بریں مقامی صنعت و حرفت کے نمونے خاص طور پر رکھے جاتے ہیں تاکہ سیاح فوراً شہر کی تمام خصوصیات سے آگاہ ہو جائے اور اہل شہر خود بھی جان لیں کہ ان کے شہر نے تاریخ میکسیکو اور میکسیکو کی قومی زندگی میں بالخصوص صنعت و حرفت اور فن اور کاریگری کے کیا اہمیت رکھتی ہے۔

تاریخ اسلام بے شمار مشاہیر کے ناموں سے پُر ہے اور عالم اسلام میں بہت سے شہر مثلاً مکہ، مدینہ، بغداد، قرطبہ، غرناطہ ایسے شہر ہیں، جو قوم کے ذہن میں محکم ہو جائیں۔ تو احساس قومی کو تقویت پہنچے گی۔ علیٰ ہذا تہذیب اسلامی اکثر مشہور مفکر اور ادیبوں کی ممنون احسان ہے۔ مثلاً جلال الدین رومی، خواجہ معین الدین چشتی، یا شعراء میں حافظ، عمر خیام اور ہمارے اپنے شعراء میں غالب، ذوق، محمد حسین آزاد وغیرہ وغیرہ۔ مزید غور کیا جائے تو ہماری تاریخ اور تہذیب کے کئی اور پہلو ایسے نکلیں گے۔ جن سے ہماری قوم کو آگاہ ہونا چاہیے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اس نقطۂ نظر سے تجویز اور مشورہ کے طور پر ناموں کی ایک فہرست مرتب کی جائے اور اس فہرست کو پاکستان کے تمام صوبوں اور صوبوں کی معرفت میونسپل کمیٹیوں کے پاس بھیجا جائے اور ان کی توجہ بالوضاحت اس مقصد کی طرف مبذول کرائی جائے جو اس کی تہ میں ہے اور اس غرض کے لئے ہر جگہ ہوشیار لوگوں کی کمیٹیاں بنائی جائیں جو شہر کے تمام بازاروں کے ناموں پر غور کریں۔ میری ناقص رائے ہے کہ یہ کام پاکستان کی وزارت داخلہ بہ احسن انجام دے سکتی ہے۔ اسی لئے یہ مشورہ آپ کے گوش گذار کرنے کی جرأت کی علاوہ بریں انگریزی الفاظ مثلاً روڈ، اسٹریٹ وغیرہ کی لعنت سے بھی نجات حاصل کرنی چاہیے۔ مثلاً دہلی میں ہر سڑک اور بازار کا نام موجود تھا لیکن

نتیجہ ـــــ ۲۰۸ ـــــ پورے نمبر

ڈسٹر یا ماسٹر سیٹ استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی تھی۔ بادام، چاک، چماٹا، تنکا، بچہ، گلی، کپڑا، دوپٹہ وغیرہ۔ کئی اشیاء ایسی گھر میں یا اسکول سے مل سکتی ہیں جو ڈسٹر، ماسٹر سیٹ وغیرہ کا کام دیں۔

ہمیشہ آپ کی خیریت اور بہبود کا طالب
بخاری

خطوط

بنام عبدالمجید سالک :—

نیویارک۔ ۱۲ر اگست ۵۰ء

برادر محترم۔ سلام مسنون۔ گرامی نامہ ملا۔ لاہور کا نقشہ واقعی بدل گیا ہوگا آپ ہی کا؟ شہر آشوب پڑھ کر افسوس ہوا۔ آپ کو خط لکھنا بالکل بھائیوں کی سی حالت میں ن م راشد کا خط بھی ملا جس میں حفیظ (ہوشیارپوری) کی تازہ تاریخ گوئی کا لطیفہ شگفتگی کا باعث ہوا۔ سنا ہو تو سناؤں۔ راشد نے جدید شعرا پر ایک مضمون لکھا جس کے بعض فقرے حفیظ صاحب (جالندھری) کو گراں گذرے۔ انہوں نے تاڑ لی۔ شعر لکھ بھیجا ؎

خبث دروں کیا باہر دہن غلیظ نے
کچھ نہ کہا حفیظ نے ہنس دیا مسکرا دیا

اس پر حفیظ ہوشیارپوری نے اس واقعہ کی تاریخ کہی۔ چہ خبث دروں (۱۳۶۸ھ) راشد نے چند اردو کی کتابیں بھیج دیں جن سے شب و روز میں کچھ شگفتگی پیدا ہوگئی۔ آپ کو خط لکھنے سے طبیعت کا [illegible] تو سلمان صاحب کو بھی ایک خط لکھ دیا۔ اگر انہیں جواب کی توفیق ہوئی تو دل میں ہوک ایک اور بلند نظر آنے لگے گی۔ بہرحال محض انہیں مخاطب کر کے بھی بزعم ملاقات کا مزا تو آ ہی گیا۔ اگلے دن ایک کتب فروش کے ہاں ملک راج آنند کی ایک تازہ تصنیف انڈین تھیٹر نظر آئی۔ کتاب مختصر ہے وہیں کھڑے کھڑے پڑھ لی۔ بڑے طمطراق اور شان و شکوہ سے چھپی ہے۔ لیکن جہل اور تعصب کا عجیب و غریب مرقع ہے۔ آندھرا تھیٹر اور بنگالی تھیٹر کو بہت سراہا ہے لیکن ہندوستانی تھیٹر کے عنوان کے تحت میں بہت کچھ زہر اگلا ہے۔ خواجہ احمد عباس اور پرتھوی راج کپور کو تھیٹر کا امام قرار دیا ہے۔ آغا حشر کے متعلق کہا ہے کہ ..... "A HACK WRITER CALLED AGHA HASHR A THIRDRATE POETASTER!" اور اسی قسم کی اور خرافات لکھ کر آغا حشر کو تین چار سطروں میں نمٹا دیا ہے۔ تن بدن میں آگ لگ گئی۔ سالہا سال سے احباب سے التجا کرتا چلا آیا ہوں کہ آؤ ہم تم مل کر اردو تھیٹر پر ایک کتاب لکھیں اردو میں بھی اور انگریزی میں بھی۔ ہمارے انتقال کے بعد کوئی یہ کام نہ کر پائے گا۔ جو مسالہ ہمارے پاس موجود ہے اور جتنی جوانی ہم نے تھیٹر پر چھڑکی ہے کسی اور کو نصیب نہیں ہو سکتی لیکن انہوں نے توجہ نہ کی فلم سازی انہیں ایسی چمٹی ہے کہ ان کی علم دوستی خواب اور افسانہ ہو کر رہ گئی ہے ان کے بغیر یہ کام مجھ اکیلے کے بس کا نہیں۔ وغیرہ سب ان کے پاس ہے اور وہ متعدد کھیلوں سے واقف ہیں جن کا مجھے صرف نام معلوم ہے۔ آپ کو یہ داستان درد اس لئے سنا رہا ہوں کہ اگر ان کی طبیعت میں اکساہٹ مجھ سے نہ پیدا ہو سکے تو آپ اس کام کا بیڑا کیوں نہیں اٹھاتے۔ مانا کہ آپ کراچی میں ہیں اور میں نیویارک میں ہوں اور نہ معلوم یہ بعد کب تک رہے گا تاہم یہ مشکل ایسی نہیں کہ راستے کو پھاند نہ سکیں جب تک ہم لوگ زندہ ہیں یہ امر محال نہیں۔ موت بیچ میں حائل ہو گئی تو کوئی اسے نہ پھاند

سکے گا لیکن "غالباً غلط" تو چھپ گئے ہیں۔

ہندوستان سے جو تار آتا ہے اس کی خبر محض سرکاری ذرائع سے ہم تک پہنچتی ہے تفصیلات سے تشنہ رہتے ہیں جس سے طبیعت مضطرب رہتی ہے۔ نہ معلوم نہرو صاحب کے سر میں کیا سودا سمایا ہے کہ حق و راستی اور صلح کوشی سے انہوں نے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ شاید آئندہ الیکشن کی مہم نے عمل و فکر میں کجی پیدا کر دی ہے۔ اخباروں سے معلوم ہوتا ہے کہ لندن سفیران کے ذہن زرخیز ہے۔ عام لوگوں کا وہی رنگ ہے تاہم ہر پاکستانی کی ہمت اور پاکستان کے لیڈروں کی دانائی اور مدبری کے یہاں سب لوگ قائل ہیں اور بیش از بیش ان کی عزت بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ بہتر خدا کا شکر ہے ہندوستان کے ہاں کسی موڑ تک سب اپنا زور بے جا صرف کرتے ہیں۔

مجید لاہوری صاحب کا سلام پہنچا۔ خدا انہیں خوش رکھے۔ ان سے ملاقات افسوس کہ بہت مختصر ہوئی ہے۔ ہم یار زندہ صحبت باقی انہیں میرا سلام شوق بھی پہنچا دیجئے۔

خاکسار
بخاری

---

(۲)

نیویارک، ۱۹ ستمبر ۵۱ء

برادر محترم سلام مسنون۔ امید ہے آپ مع الخیر لاہور پہنچ گئے ہوں گے۔ انقلاب کے معطل ہو جانے کے بعد آپ اغلباً مسلم ٹاؤن ہی میں خانہ نشین ہوں گے تاہم جب کبھی شہر جانا ہو اور دوستوں سے ملاقات ہو تو انہیں میرا سلام کہئے۔ چند دن ہوئے میں نے امتیاز کو خط لکھا تھا جواب سے حسب معمول محروم ہوں اور شاید محروم رہوں۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم میری محرومی ہی کا احساس ان تک پہنچا دیجئے۔ کرشن کے کاروبار میں اس سے بھی بسا اوقات خلل پہنچ چکا ہے۔ کیا صوفی صاحب بدستور نیو ہاسٹل میں نگران ہیں یا کچہری روڈ کی سرکاری کوٹھیوں میں سے کسی کوٹھی میں پہنچ گئے ہیں۔ نہ معلوم پرنسپل کون ہیں۔ آخری اطلاع ڈاکٹر صادق کے متعلق تھی۔ اور کیا شریف صاحب کراچی ہی میں ہیں یا لاہور واپس آ گئے؟ ان سوالات سے مکمل معلومات فراہم کرنا مطلوب نہیں محض احباب کے مستقر و احوال کا نقشہ ذہن میں جمانا چاہتا ہوں اسی طرح کے سوالات ہاشمی صاحب اور عابد علی صاحب کے متعلق بھی پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ کے خط سے معلوم ہوا کہ عابد صاحب نے زندگی میں چند در چند ڈرامے پیدا کر لئے ہیں۔ میں ابتدائی مناظر سے بھی بے خبر ہوں۔ اس لئے تکمیل کا اشارہ تک سمجھ میں نہ آیا۔ خلیفہ حکیم کے متعلق آخری اطلاع تھی کہ وہ اقبال اکیڈمی کے ڈائرکٹر ہیں۔ کیا یہ اکیڈمی پنپ رہی ہے اور لاہور ہی میں ہے؟ میں نے خلیفہ صاحب سے اسلامی کلچر پر یہاں کے ایک متقدر مؤلف کے لئے ایک مضمون لکھوایا تھا وہ عنقریب انشاء اللہ فلسفیانِ عالم کے رشحات قلم کی معیت میں کتابی شکل میں شائع ہوگا اور یہ پہلا موقع ہوگا کہ اسلام پر کسی پاکستانی کا مدلل مضمون اس ملک میں عزت و آبرو کے ساتھ چھپے۔ یہاں کی ایک یونیورسٹی میں مذاہب قدیم اور حقوق انسانی کے مضمون پر دسمبر میں ایک مناظرہ ہوگا۔ اس سلسلے میں بھی میں نے خلیفہ حکیم صاحب کے لئے بے حد سعی کی کہ اسلام کی نمائندگی وہ کریں۔ آخر اس میں کامیاب ہوا۔ خلیفہ صاحب کا کرایہ وغیرہ یونیورسٹی دے گی۔ کنیڈا کی McGill یونیورسٹی نے طے کیا ہے کہ اسلامیات کے طلباء اور فارغ التحصیل بزرگوں کو سال دو سال کے لئے یہاں بلانا چاہتی ہے عنقریب وہاں کے پروفیسر سمتھ انتخاب

انتخاب کے لئے پاکستان کا دورہ کریں گے میں نے ان سے کہا ہے کہ وہ آپ سے بھی ملیں۔ سمتھ صاحب بھی ہمارے ملک کی سیاحت کر چکے ہیں ـــــ " MODERN ISLAM IN INDIA " کے مصنف ہیں۔ آغا [illegible] انہیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ چودھری ظفر اللہ خان صاحب آج کل یہاں ہیں۔ مباحثۂ کشمیر کے آنے والے سین کے لئے ہتھیار تیار کر رہے ہیں اور سب انتہائی ان دنوں مصروف ہیں۔ خدا کرے ہم اس قضیے سے عزت کے ساتھ اور بہ حسن و خوبی عہدہ برآ ہوں۔ ایک اور یونیورسٹی خشک علاقوں میں آب پاشی پر ریسرچ کرنا چاہتی ہے لیکن کسی ایشیائی یونیورسٹی کے ساتھ مل کر۔ بیروت اور پنجاب دونوں زیر غور ہیں۔ میں پنجاب کے لئے کوشش کر رہا ہوں۔ خدا کرے ہمارے ہاں کی حکومت اور پنجاب یونیورسٹی کے ارباب کا منتظر ہوں کہ وہ بر وقت اقدام کر سکتے ہیں۔ اس میں ڈاکٹر لوکس (سابق پرنسپل فارمن کالج) میرے ممد ہیں اور خوب زور لگا رہے ہیں۔

آپ کے لاہور میں کچھ پریشان ہونے کا خیال آتا ہے تو کچھ [illegible] ہو جاتی ہے تاہم جب تک آپ کراچی میں تھے آپ کی موجودگی سے زبیدہ اور ان کے تعلق سے مجھے ایک اطمینان تھا۔ سب لوگ کراچی کی سمت ہجرت کر رہے ہیں لاہور کا بقول [illegible] اب کیا بنے گا؟

مہر صاحب کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ انشا اب بھی اپنی [illegible] ہاتھ میں لے کر العیاذ سانپ مارنے کے لئے جنگل میں گشت لگاتے ہوں گے۔ انہیں بھی میرا سلام کہئے گا۔

آج اتوار کا دن ہے۔ روزی تیار بیٹھا ہوں۔ مشغلہ ہر ملک اور ہر موسم میں [illegible] چلا آیا ہے۔ اگلے ہفتے سے پیرس کے سفر کے لئے بستر باندھنا شروع کر دوں گا۔ پہلے بچے سب کے سب [illegible] بیٹھے ہیں۔ کل شام ٹیلی ویژن پر میری [illegible] نشر ہوگی۔ کچھ شعر کچھ جواب [illegible] عہد نامہ کچھ کر دیا۔ وقس علیٰ ہذا ـــ غرضیکہ صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے عمر

خاکسار

بخاری

---

②

12 E 65th STREET NEWYORK

۲۲ر مارچ ۵۲ء

برادر محترم سلام مسنون۔ نہ معلوم آپ کا کیا حال ہے عرصے سے آپ کا خط نہیں آیا۔ یہ آپ کا شیوہ نہیں۔ اس لئے آپ کے متعلق تشویش ہے۔ خدا آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ چند دن سے بیماری ہی بیماری سننے میں آتی ہے۔ سمعان بے چارے کو نمونیا ہو گیا انور کا خط آیا تھا کہ اب بہتر ہیں۔ اسے بھی ایک دو ہفتے گزر گئے نہ معلوم اب ان کا کیا حال ہے۔ میں پرسوں سے یہاں [illegible] کو بھیجا بالکل چور۔ پہلے انفلوئنزا ہو گیا اس سے صحت یابی ہوئی تو خون کا دباؤ یک لخت گر گیا۔ سر میں چکر آنے لگے اور صاحب فراش ہونا پڑا۔ اب بالکل تندرست ہوں۔ زبیدہ کو عرصے سے [illegible] کی شکایت ہے۔ وہ آج کل پنجاب میں ہیں امید ہے آپ سے ملاقات ہوئی ہوگی (بشرطیکہ آپ کراچی نہ اٹھ گئے ہوں) آج کل کام میں گھرا ہوا ہوں۔ سیکورٹی کونسل اور ڈس آرمامنٹ کمیشن میں ہونے کی وجہ سے مصروفیت بہت بڑھ گئی ہے۔ پاکستان کے کئی لوگ آئے ہوئے ہیں ہر وقت یہی فکر رہتی ہے کہ کوئی ٹوٹا گھاٹا نہ پڑ جائے۔ اسد صاحب بحیثیت وزیر کے میرے معاون مقرر ہوئے تھے۔ جنوری کی بجائے مارچ میں یہاں پہنچے۔ وزیر خارجہ

انہیں اپنے ساتھ بلاد اسلامیہ کے دورے پر لے گئے تھے۔ جب کراچی واپس پہنچے تو انہیں ہیڈ ماسٹری پر سے ہٹا دیا۔ دو پسلیاں ٹوٹ گئیں اور ان کے تنے [illegible] اللہ تعالیٰ مدد کرے۔ وہ بوجوہ پریشان رہا۔ اب زندگی کا نقشہ پھر کچھ بننے چلا ہے۔

لاہور کی خبر بہت کم ملتی ہیں۔ ہاشمی صاحب ریٹائر ہو گئے۔ یہ دو طالب علموں نے سنایا۔ اسے بھی کئی ہفتے ہو چلے ہیں۔ مزید اطلاع۔ آل صوفی [illegible] کا ایک نادر رسالہ حمید الدین (بن مولوی صدر الدین مرحوم) کی وساطت سے پہنچا۔ حمید یہاں [illegible] یونیورسٹی میں نفسیات پڑھ رہے ہیں۔ عنقریب واپس جائیں گے۔ عباس [illegible] سے یہاں بلانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ وہ آ جائیں تو بہت کچھ ہو۔ یوسف عبد الحکیم یہاں اپنی لیکچر بازی ختم کر چکے ہیں۔ اب واشنگٹن میں رہتے ہیں۔ اگلے ہفتے نیویارک آئیں گے اور دو چار دن کے بعد کراچی کا عزم کریں گے۔

اخبار و اطلاعات تو ختم ہو لیں۔ اب دو تین باتیں کرنی تھیں۔ پرسوں یہاں برف پڑی تھی۔ یہ مارچ کا آخر ہے۔ یہی سنبھالا تھا۔ [illegible] کے ساتھ بہار کا موسم شروع ہو چلا ہے۔ عنقریب مکان کی دیوار پر جو بیلیں ہیں وہ بیلیں رنگ لائیں [illegible] لاہور کی گلی یاد آتی ہے۔ [illegible] تو مارچ کے مہینے میں امتحان کے خیال سے [illegible] معلوم ہوتے تو مارچ میں تعطیلات کا انتظار رہتا تھا۔ بہار کی ہوائیں یوں بھی چلتی تھیں [illegible] اور کاروبار عشق بہ نوع جاری رہتا تھا۔ کیا اب بھی راوی کے اس پار مقبرہ جہانگیر کے باغ میں گل کی [illegible] دیتی ہے؟ کیا اب بھی کالج کا موسم قریب آ رہا ہے؟ جب بہاری کے دن ہیں۔ [illegible] تو سب احباب اور لاہور شب کے کئی قصے تھوڑی دیر کو دماغ میں جاگ اٹھتے تھے۔ [illegible] کی بزم عشاق [illegible] بے دل مرحوم۔ فرزند علی (جو ہر وقت پان کی وجہ سے رطب اللسان رہتے تھے) منشی نعمت علی کی [illegible] پرانی انارکلی میں حکیم احمد شجاع کا مکان [illegible] باپ کا گناہ۔ تاثیر کی [illegible] چراغ حسن حسرت (دم حسرت کی قسم وہ یہیں ہیں) [illegible] پھر گورنمنٹ کالج [illegible] صوفی کی پنجابی غزلیں۔ تب دیکھی تو یہیں۔
اے کاش لوٹ آئے زر زمان اوراق پریشاں کا شیرازہ باندھ دے۔

وحش برباد خریداں سحر ابات ستدم ‌ ‌ ‌ خمے دیدم ز خوں دل دو در گل بود
بس بگشتم کہ بہر سبب درد فساں ‌ ‌ ‌ نخل عقل و بایں مسئلہ لا یعقل بود

آپ کی خیریت کا طالب ہوں اور آپ کے خط کا منتظر

ہر آنکہ جانب اہل وفا نگہ دارد ‌ ‌ ‌ خداش در ہمہ حال از بلا نگہ دارد

خاکسار
بخاری

---

④

نیویارک، ۲۰ اپریل [illegible]

برادر محترم۔ سلام مسنون۔ گرامی نامہ بے تاریخ لیکن غالباً اوائل اپریل شرف صدور یافت۔ آپ خط لکھیں نہیں پر پولیس میں ایک ہی مکتوب سے آپ خبروں کا ایسا پلندہ ارسال کر دیتے ہیں کہ مہینوں کی تشنگی مٹ جاتی ہے۔ جب سے پیرس آیا۔ مسئلہ تونس میں مستغرق رہا۔ خدا نے اس

بس میں نے ایسا سفر کیا کہ ناشتے کا کوئی بھی تیر تو باقی نہ رہا۔ مرکزی اخباروں نے بہت لکھا ہے۔ قیامت کی یاد میں کوئی ترتیب ہوا مگر ابھی تک تو مجھے نقطہ کا آنا تانتا ہوتا ہے اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن والے ہر وقت تعاقب میں رہتے ہیں [illegible] ایک بہت نامی اخبار نے [illegible] مجھ پر ایک آرٹیکل لکھنے کا تہیہ کر لیا ہے اس مقصد کے لئے انھوں نے اپنے ہاں کا [illegible] مطابق ایک نامہ نگار میرے ساتھ متعین کر دیا ہے جو رات دن میرے ساتھ پھرتا ہے اور بے شمار سوالات پوچھ پوچھ کر نوٹ لیتا جاتا ہے۔ چند دن میں شائع ہو گا اس کے جدید [illegible] صفحے کا آرٹیکل نکلے گا۔ یہاں کے صحافت باز لوگ بھی عجیب والہانہ طبیعت رکھتے ہیں۔ بعض لوگوں پر ایک آرٹیکل لکھنے کی ٹھان لیتے ہیں جیسے ان کے ساتھ [illegible] دائرہ تحقیق کر دیتے ہیں شائع ہونے والے آرٹیکل پر ان کا بس [illegible] مرتب کرے گا۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے پاکستان کی اس خدمت کے لئے مجھے منتخب کیا اور پاکستان کے طفیل مجھ پر بھی اپنی رحمت برسائی۔ تفصیل کس کو خط میں لاؤں۔ [illegible] پنجاب کے دنگل میں [illegible] تماشے ہوتے ہیں۔ یہ داستان ایک زمانے سے [illegible] ملاقات انشاء اللہ کبھی عرض کروں گا۔ آپ جانتے ہیں کہ تقریر [illegible] لکھنے کا کام [illegible] مرتبہ تقریر کے مبتدی کی تقریروں کے دوران میں ایک عجیب کیفیت مجھ پر طاری ہوتی تھی۔ مجلس امن کے سامعین [illegible] ریڈیو وغیرہ [illegible] کروڑوں [illegible] نہیں ہوتے۔ اور پھر دائیں بائیں بھی [illegible] اور جغادری قسم کے لوگ، لیکن وہ سب [illegible] کیا عرض کروں

پاکستان آنے کے لئے بے قرار ہوں مگر [illegible] جنوری تک جنرل اسمبلی کی وجہ سے نیو یارک میں [illegible] ضروری ہے آیا تو یا تو اکتوبر سے پہلے یا جنوری فروری میں۔ تاریخ کے تعین میں توقف یوں ہے کہ [illegible] میاں چاہتے ہیں کہ میں ان کی شادی کے موقعے پر کراچی ضرور موجود ہوں۔ شادی کی تاریخ ابھی انھوں نے مقرر نہیں کی۔ خان صاحب میاں عبدالعزیز مرحوم کی صاحبزادی سے [illegible] پیغام بھیجا ہے۔ خاتون کا نام روشن ہے۔ اور ہر شخص سے اس بچی کی تعریف سنی ہے۔ زبیدہ یقیناً آپ سے بات کریں گی [illegible] آپ اپنے [illegible] مشورے سے [illegible] مجھے اطلاع [illegible] رکھیں گے۔ کبھی فرصت سے [illegible] عام معاملات پر بھی [illegible] خیالات لکھیے [illegible] عزیزوں کا ساتھ میں تو متوکل انسان ہوں البتہ زبیدہ کو [illegible] ایک حبشی کی عادی ہے [illegible] ہوتا ہے۔ [illegible] صبر و شکر سے کام لیتی ہے [illegible] ہے اس بد مزگی سے میں اکثر پریشان رہتا ہوں۔ کسی کے بس کی بات نہیں۔ تاہم عجب نہیں کہ [illegible] میں آپ کا کلام [illegible] کے دل میں جاگزیں ہو جائے۔ اور اس کی کدورتیں [illegible] واللہ اعلم کیا کدورتیں ہیں [illegible] دور ہو جائیں

آپ بھی اب کراچی ہو گئے۔ خدا کرے آپ کو مکان خاطر خواہ مل جائے۔ [illegible] کی کوٹھی کے بعد [illegible] جاری کر ہوٹل میں زندگی کا کیا لطف آئے گا۔ آپ کے کراچی آنے سے میں خوش ہوں۔ کراچی میں لاہور کا سا رس نہیں لیکن جب حلقہ احباب کے باقیات [illegible] سب کراچی میں ہیں تو لاہور سے بہتر ہے۔ کم از کم آشنا صورتیں تو نظر آئیں گی۔ شریف (محکمہ تعلیم) آج کل امریکہ میں ہیں ڈاکٹر وحید بھی (حقوق انسانی کے کمیشن کے سلسلے میں) یہاں ہیں۔ خلیفہ حکیم اس وقت بلاد اسلامیہ میں مزار مولانا روم پر فاتحہ پڑھ رہے ہوں گے۔ یا غضنفر کے ہاں پلاؤ کھا رہے ہوں گے عنقریب کراچی پہنچیں گے۔ مجید ملک اور آمنہ کی کبھی کوئی خبر نہیں آتی۔ فیلنگ [illegible] کے ایام کے بعد ان سے مخلص بالطبع ہونے کے موقعے کم ملے ہیں (کہ [illegible] ایران جنگ اور دلی میں) سلمان یقیناً صحت مند ہوں گے کیونکہ مدت سے ان کا خط نہیں آیا سنا ہے ایک بار کراچی آئے تھے چند محفلیں روشن کر کے پھر لاہور چلے گئے۔ ان کی جانب سے تو کبھی خط آتا ہی نہیں۔ ہمارے دوست ماشاء اللہ اہل قلم سے بڑھ کر اہل النقطا ہیں

خط لکھتے رہیے اور "چو با حبیب نشینی و ..... الخ

خاکسار

بخاری

(۵)

نیویارک ۳۱ اگست ۵۳ء

برادر محترم! سلام مسنون۔ یہ بھی بے کار رفتہ ایام زندگی کی ایک مثال ہے کہ جب آپ کا خط ملا میں ایک کانفرنس میں تھا۔ کھول کر صرف سرخیں پڑھیں اور پھر جیب میں رکھ لیا کہ فرصت میں پڑھوں گا۔ اب نہ معلوم وہ کون سی جیب کس کوٹ کی تھی۔ تین دن سے تلاش کر رہا ہوں۔ آخر ارادہ کیا کہ منہ زبانی ہی جواب لکھ دوں۔ اتنا ضرور دیکھ لیا تھا کہ آپ میری خاموشی سے شاکی ہیں اور خط کا خاتمہ اس پُرمعنی فقرے پر ہوا تھا کہ آپ "مع ڈیلیگیشن" سنتے ہی [illegible]!

جولائی اگست کے مہینے یہاں مشکل سے کٹتے ہیں۔ گرمی اور رطوبت یعنی بالکل کلکتہ [illegible]۔ اس دوران میں [illegible] جاری رہا۔ کشمیر سے نکلے تو [illegible] سے نیویارک [illegible] ڈس آرمامنٹ کمیشن، سیکیورٹی کونسل کے اجلاس تراتر ہونے لگے۔ ۱۴ اکتوبر کو جنرل اسمبلی ہے۔ اس کی تیاریاں ابھی سے شروع ہو گئی ہیں۔ معاونین سے جو توقع تھی [illegible] وہ توقع موہوم ہوئی۔ ہم سب بھی تھے کہ [illegible] مبارک۔ اسد محمد خواجہ، جان دردمند آیا۔ لیکن انہیں فرصت کشاکش غم پنہاں سے نہ ملی۔ [illegible] ہو گیا اور ہفتہ بھر صرف بستر میں لیٹے [illegible] پڑھنے کا ارادہ کر لیا۔ پر کیا کریں کہ دل ہی مدد ہے فرض کا۔ بہر حال اب [illegible] برداری کرنی پڑے گی۔ اس کے بعد چھٹی لے کر وطن واپس آنے کا ارادہ ہے۔ چھٹی ایک سے دو مہینے [illegible] لیے گھر رہنے کو بھی دل چاہتا ہے لیکن [illegible] کی رو سے قبضہ حصہ پاکستان رہوں۔ تاہم [illegible] الاؤنس مجھے ملتا ہے یہ بعد کی باتیں ہیں۔ نئے احوال آزادی پہنچنے کے نقشے دماغ میں ڈھل رہے ہیں۔

اس دوران میں غضنفر یہاں آئے۔ سنا ہے بادشاہ کے مہمان تھے چنانچہ اس ٹھاٹھ سے رہے کہ ہماری میزبانی کے متوقع بھی نہ تھے۔ [illegible] پھر برسے خوش کچھ شاکی گئے۔ غلام محمد چند دن سے یہاں ہیں۔ ایک دو دفعہ ماحضر تناول فرمایا۔ ان کے حالات سے [illegible] الحمدللہ بھی [illegible] وطن کے حالات سے بہت بے خبر رہتا ہوں۔ بس اتنا ہی علم میں آتا ہے جو سرکاری اطلاعات کے ذریعے پہنچتا ہے۔ ڈان پڑھنے کی کبھی فرصت ملتی ہے کبھی نہیں ملتی۔ جو یار یہاں آتا ہے وہ کسی نہ کسی افسر کی بیماری کا حال سناتا ہے۔ غلام محمد [illegible]، محمد علی بیمار ہوئے۔ اب سنا ہے عبدالقادر صاحب [illegible]۔ کراچی کی آب و ہوا [illegible] ڈالنے کا تجربہ کر لینا چاہیے۔ سلمان نے تو ان سے [illegible] کر ان کی جانب سے ایک مسودہ موصول ہوا ہے جس میں نیاز صاحب یا کسی [illegible] کی آپس میں نوک جھونک [illegible] کا نام [illegible] تھا۔ کچھ [illegible] اور مسودہ شرف صدور لایا جو خود ان کی ایک [illegible] کا مسودہ تھا۔ حاشیہ پر چند [illegible]۔ نقوش کے اسی دن کا گرامی نامہ سمجھ کر خوش ہو لیا۔ لیکن اس سے اتنی اکساہٹ پیدا ہوئی کہ [illegible] کہہ اٹھا۔ بہر حال انہیں عنقریب [illegible] کے ساتھ خط لکھوں گا۔

ہارون کی شادی دسمبر کے آخر میں ہو گی۔ میں وسط دسمبر سے کسی صورت پہلے نہ پہنچ سکوں گا۔ نہ معلوم ایسی تقریبوں پر کیا کیا انتظامات پیش از وقت کرنے پڑتے ہیں۔ امید ہے آپ زبیدہ کی اپنے مشورے سے وقتاً فوقتاً رہنمائی کرتے رہیں گے۔ آپ اور دیگر احباب اگر اس کام میں بقدر فرصت حصہ لیں تو بتقاضائے نیازمندی بے حد ممنون ہوں گا۔ ہارون منصور ماشاء اللہ جوان ہیں لیکن ناتجربہ کار ہیں۔ آپ کی ہدایت کی انہیں بے حد ضرورت ہو گی۔ سلمان کی خدمت میں بھی میری طرف سے یہ درخواست پہنچا دیجئے۔ ذوالفقار کو بھی خط لکھوں گا۔ لیکن نہ معلوم وہ کس حد تک توجہ کریں

آپ دوستوں پر بھروسہ ہے۔ خدا آپ کو خوش رکھے
امریکہ سے کچھ منگوانا ہو تو مجھ سے کہہ بھیجئے۔ یہاں کا شاپنگ ازحد صبر آزما ہوتا ہے

خاکسار
بخاری

---

(۶)

نیویارک۔ ۹؍ فروری ۵۸ء

برادر محترم سلام مسنون۔ جب نیویارک پہنچا تو جہاز سے بیمار اترا۔ (بے آرامی میں ایک قیمتی اوورکوٹ بھی جہاز ہی میں رہ گیا اور اب اس کے ملنے کی کوئی امید نہیں) سخت نزلہ اور بخار۔ سیدھا ہسپتال لے گئے۔ اب اتفاقیہ لندن میں چوبیس گھنٹے ٹھہرنا پڑا۔ جہاز والوں نے ایک ایسے ہوٹل میں ٹھہرایا جو مضافات میں واقع تھا۔ بڑی سی عمارت جیسے کسی انگریز رئیس کا محل ہو۔ اردگرد وسیع باغ۔ دن بھر ہوٹل کے آفتاب خانے میں بیٹھا رہا۔ بس دوست آشنا سے جو لندن میں رہتے ہیں ملاقات یا ٹیلیفون کی کوشش نہ کی۔ موسم سخت تھا خیال تھا کہ نزلے میں کچھ تخفیف ہو جائے گی۔ لیکن نہ ہوئی۔ قاہرہ کسی کو گزرنے کی اطلاع نہ دی تھی البتہ روم کے ایئرپورٹ پر اسلم ملک اور اس کی بیوی ملنے آئے۔ گزشتہ بار تو ان کی معیت میں گزرا۔ کراچی سے میرے ہی جہاز میں طیب حسین واپس جا رہے تھے۔ قاہرہ کے ایئرپورٹ پر ان کی بیگم صاحبہ (مرزا محمد سعید کی صاحبزادی) انہیں ملنے آئی ہوئی تھیں۔ ان سے کچھ گپ رہی۔ نیویارک ابھی خالی خالی ہے ابھی تک کسی دوست سے تجدید مراسم کی ہمت نہیں کی۔ چودھری ظفر اللہ خاں یہاں سے جنیوا پہنچے ہیں۔ آج پہلی دفعہ دفتر گیا۔ جاتے ہی کام میں مصروف ہو گیا۔ کچھ مجبوراً اور کچھ دل بہلانے کے لئے۔ ہمہ وقت [illegible] تفکرات ہوتے ہیں۔ آج ہارون کا خط آیا ہے کہ میں شادی مارچ کے آخر میں کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے لکھا ہے کہ زبیدہ اور منصور کے ساتھ مشورہ کر کے تاریخ کا تعین کر لیجئے۔ منصور کی شادی کے اخراجات کا نقشہ میں نے یہاں سے بھیج دیا ہے۔ اس سے مدد ملے گی۔ وہ سمجھتا ہے کہ شادی بجائے اپریل کے مارچ ہی کے مہینے میں مناسب ہو گی۔ خدا کرے اس وقت تک میں کچھ پونجی جمع کر سکوں۔ نئے اطفال تو تجویزیں کر رہی ہے۔ اندازہ ہے کہ گھر کے لوگ اس وقت سب منتشر ہوں گے اور زبیدہ اکیلی ہوں گی۔ خیریت دریافت کرتے رہئے گا۔ جب میں کراچی سے روانہ ہوا تھا تو اسے بھی بخار اور زکام تھا۔ شادی کی بھاگ دوڑ نے کافی تھکا دیا۔ منصور اور زرینہ غالباً تعطیل منانے دلی چلے گئے ہوں گے۔ ہارون لاہور میں سے غالباً آج کل دورے پر ہے وہ ۲۲؍ فروری تک دورے پر رہے گا۔ ذوالفقار کے اوقات جیسے مصروف ہیں وہ آپ جانتے ہیں

کراچی آنے کا وہ لطف نہ آیا جس کی امید تھی لوگ پژمردہ اور ان کی گفتگو اکثر متفکر تھی۔ علاوہ بریں شادی کے تفکرات ہمیشہ دماغ پر حاوی رہے۔ دو مرتبہ لاہور تو گیا لیکن لاہور سے محظوظ بالطبع ہونے کی فراغت نصیب نہ ہوئی۔ تاہم غنیمت ہے کہ سب احباب سے (بجز ایک عابد علی کے جو برات میں بھی شامل نہ ہوئے) ملاقات تو ہو گئی۔ اب دیکھئے اگلے دو ایک سال میں زمانہ ہر ایک سے کیا سلوک کرتا ہے۔ آپ کی صحبت بدستور فیض کا سرچشمہ تھی۔ جو قہقہے نصیب ہوئے وہ آپ ہی کی بدولت نصیب ہوئے اور شادی کے انتظام میں بھی آپ ہی کی ذات سے بہت کچھ ڈھارس بندھی رہی ورنہ میں بالکل ہی پچک گیا ہوتا۔ خدا آپ کو سلامت اور شاداں رکھے۔ مجید لاہوری کی صحبت بھی حاصل لطف تھی۔ ان سے میری

جانب سے معذرت کر دیجئے گا کہ وہ خط ان کے لئے تھے، قریش گو پر موجود نہ تھا۔ ان کی صاحبزادی رضیہ بیگم اور سب سے بڑھ کر ان کے خلاق صاحب کی نفاست کی یاد سے طبیعت تا دیر سیراب رہے گی۔ خدا ان کے دماغ کو اور جلا دے۔ ان پر سلام ہو نیز مندی صاحب پر بھی جن کی کتاب پڑھی (جو آپ کو انہوں نے تحفۃً دی تھی) وہ وہ میرے گھر پر ہے آپ وہاں سے وصول کر لیجئے گا۔

شاہد سہروردی نیویارک میں آ کر مقیم ہو گئے ہیں۔ کولمبیا یونیورسٹی میں ان کا منصب آرٹ لیکچرار کا ہے۔ ابھی ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ پرسوں یہاں کے سب سے بڑے عجائب خانے میں تصویروں کی ایک نمائش کا افتتاح ہے۔ ڈائریکٹر اور اس کی بیوی نے مجھے نمائش سے پہلے دیکھنے پر بلایا ہے۔ ارادہ ہے شاہد کو بھی ساتھ لے جاؤں۔ انہیں وہاں بہت سے ہم سخن اور ہم زبان ملیں گے۔ شاید ان پر انحطاط آ گیا ہے اور ان کا دل بڑھ رہا ہے۔ آخری عمر میں تنہائی کا عالم اور تلاش معاش میں وطن سے اس قدر دور۔ ان پر ترس آتا ہے۔ طبیعت کی ان کی حساس ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم کی سی خوشدلی ان میں نہیں۔ زہے وہ زندگی دا ایں گردوں کی زریں سپہرا! یہ محض نیویارک پہنچنے کا خط ہے اس لئے اختصار منظور ہے۔ باقی آئندہ!

ترجمے کے لئے اردو کے مختصر افسانوں کا انتخاب۔ عباس کو یاد دہانی کراتے رہیے گا۔ حسرت کو سلام۔ بڑھا انہوں نے کہ ایران میں بھی مکتب بیدار ہو رہا ہے؟

خاکسار

بخاری۔

---

(۷)

یو۔ ک

۱۹ فروری ۵۳ء

برادر محترم، بسلام مسنون۔ آپ نے جیسے لکھا تھا اسی کے مطابق آپ کا ۱۵ فروری کا لکھا ہوا گرامی نامہ آج ۱۹ فروری کو نہیں بلکہ ۱۸ کو یہاں پہنچ گیا۔ میرا یہ خط آپ کے خط کا جواب نہیں بلکہ بجائے خود خط ہے۔ اور ایک ضرورت سے آپ کو لکھ رہا ہوں۔ "بھنگیوں کی توپ" کے مکمل حالات مطلوب ہیں۔ کس نے بنائی؟ کہاں بنائی؟ کیا توپ ساز کا نام اور کوائف معلوم ہیں؟ توپ کا اصل مالک کون تھا؟ توپ کی عمر کتنی ہے؟ ہوتے ہوتے لاہور کے عجائب خانے کے سامنے کیسے پہنچ گئی؟

اس ریسرچ کا محتاج یوں ہوا کہ ایک جرنیل کی استمالت کرنی ہے۔ ان حضرت کی کیفیت یہ ہے کہ انہیں پاکستان کی کسی چیز کا مطلقاً کچھ علم نہیں، بجز بھنگیوں کی توپ کے۔ اور اس توپ کے بارے میں ایسا شغف ہے کہ عشق و جنون کی حد تک۔ کپلنگ کی کتاب "کِم" KIM میں اس کا حال انہوں نے پڑھ رکھا ہے (اسے کہتے بھی "کِم کی توپ" ہیں)۔ اس کے مفصل حالات ان تک پہنچا سکا تو وہ پھولے نہ سمائیں گے بلکہ شاید انہیں مطلّا و مجلّا کاغذ پر لکھوا کر اپنی لائبریری میں محفوظ کروا دیں۔ پہلے خیال آیا کہ لاہور کے عجائب خانے کے مہتمم صاحب کو لکھوں پھر جواب جلد دینا انہیں گوارا ہوگا یا میرا خط محکماتی مسلوں ہی میں کہیں پڑا رہے گا۔

اول تو مفصل حالات آپ کو خود ہی معلوم ہوں گے (آپ کا دماغ اور حافظہ عجائبات کی زنبیل سے کم نہیں)، اور نہ معلوم ہوں تو آپ کراچی میں کسی ماہر

سے حاصل کریں گے۔ جواب خط جلد لکھیے۔

غالب کا ہندی ترجمہ خوب رہا۔

دیکھو کیا جو کام کیا گیا ہے

یہی معلوم کرنے کے لیے اشتہار دیا گیا: "تاج کا محل" واہ وا بھئی شاد کام ہند کی "ترجمہ ہم" [illegible] کے بعد کا ہندی "[illegible]"۔ لہٰذا [illegible] "تاج کا محل" [illegible] ترجمہ سازی میں بھی مفید ہو سکتا ہے۔ مثلاً کہا جائے کہ "تاج کا محل" [illegible] کا ترجمہ نہیں تھا [illegible] کیوں [illegible] جو نہیں آتی میں [illegible] سمجھوں؟ [illegible] کی استعمال ہوتی ہے۔ [illegible] میں شادی پر باراتیوں کے لیے [illegible] تجویز [illegible] کی گئی ہو۔ [illegible] اس سے [illegible] جو اس پر مصر معلوم ہوتا ہے میں نے [illegible] سے جواب بھیجا ہے کہ مجھے اعتراض نہیں۔ البتہ زبیدہ سے مشورہ [illegible]۔ [illegible] حاصل کرے۔ روپے کا جو فیصلہ کرنا ہے اس کے متعلق [illegible] لیے اگر وہ پانچ یا آٹھ اپریل [illegible] لندن [illegible] کے متعلق تشویش نہ ہونی چاہیے۔ در حقیقت میرا خیال ہے [illegible] کرنا چاہیے [illegible] کا استقبال ہونا چاہیے [illegible] باقی حالات آپ برادرم زبیدہ پر چھوڑتا ہوں۔ [illegible] کے نزدیک شادی [illegible] اپریل تک [illegible] سے خوش گوار نہیں بلکہ [illegible] پیچیدگی کا موجب ہے۔ اس کے خط سے آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ اپریل پر [illegible] اصرار نہ کرنا چاہیے البتہ کوئی دیگر حالات مانع ہوں تو بہت سے ان کا مجھے علم نہیں۔ اگر تیاری میں کوئی کوتاہی ہو گئی تو اس کا الزام مجھ پر پڑے گا۔ لہٰذا اس بارے میں زبیدہ کو کوئی [illegible] اپنے [illegible] نہ کرنا چاہیے۔ [illegible] کا خط کچھ [illegible] تھا۔ بس مجھے [illegible] تو [illegible] سلامت نہ سمجھا۔ صحیح حالات آپ کو زبیدہ سے معلوم ہوں گے جب وہ کراچی واپس آئے گی۔

احباب کی یاد بھی تازہ ہے۔ حمید احمد خاں اور دیگر کرم فرماؤں کو سلام کہیے۔ ؎

فرصت کی صبح میں بھی نہیں ہے وہ دلکشی
جو دلکشی کہ شام ستارہ زدہ میں تھی

شام سے مراد وہ شام ہے جو آپ کے ہاں کٹتی تھی۔ اور [illegible] پیچھے [illegible] تھے

بخاری

---

(۸)

نیویارک ۱۰ اپریل ۵۳ء

برادرِ محترم سلام مسنون۔ گرامی نامہ ملا۔ نسخۂ دیوان بھی کتاب کے ساتھ ہی مل گیا تھا۔ خیال تھا اس کے متعلق علیحدہ خط لکھوں گا لیکن فرصت نہ ملی۔ مجید صاحب کو بہرحال میرا دلی شکریہ پہنچا دیجیے۔ نمکدان کی وجہ سے کئی دن اور شامیں دلکش ہو گئیں۔ اور بے اختیار ان [illegible] کا مزا آ گیا۔ آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اس قسم کا لطیفہ جو کبھی کبھار وطن سے آ جائے تو میں کتنی دیر تک یہاں مست رہتا ہوں۔

تنخواہ میں جو تخفیف ہوئی ہے وہ پندرہ سو روپے ماہوار کے برابر ہے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تخفیف کی ضرورت اس حد تک محسوس ہو گی۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ عہدہ اتنا اہم ہے اور یہاں ہم نے رستم کی گور پر دولت ماری ہے کہ ہم [illegible] رہیں گے۔ بہرحال [illegible] خورش بھی [illegible] کیوں ثابت ہوتی؟ یہ بھی خیال تھا کہ جو لوگ خود فارن سروس سے متعلق نہ ہوں اور باوجود اس کے سفیر وغیرہ مقرر ہوں۔ ان کی ریٹائرمنٹ کبھی ساٹھ برس کی عمر تک [illegible] بیس تو فارن سروس میں [illegible]

خدا کا شکر ہے رحمت اللہ، زاہد اور عمر بخیریت۔ حفیظ وزیر کی طرح سیاسی زندگی سے سفارت پر آیا تھا۔ یہ پرکٹ سا قانون ہے کیا؟ ہم بھی اب تک نہیں سمجھتا تو علم آیا کہ علم اکتوبر سے شروع ہے تو سب حال سبکدوش کر دیے جائیں گے۔ عرض سو ظن کی یہ ہے کہ یہ پاکستان روس والی کا قانون وارد نہ کیا جائے تو کچھ توسیع مدت اضافی فرمائیے ضابطہ کا اور ابھی نہیں۔ لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ پرپوزل کچھ لازمی منظور ہو گی اسے ایک سال کی توسیع یعنی عمر اکتوبر ۵۴ء تک مل جائے گی۔ خدا کرے ایسا ہی ہو کہ کچھ مہلت مل جائے اور اپنا مستقبل نئے سہولت کے ساتھ نکتہ در نکتہ سے پوچھوں۔

ساتھ ہی ساتھ تلاش معاش جاری ہے اور ادھر ادھر ہاتھ مار رہا ہوں۔ قدرے امید افزا ہیں۔ سرکاری ملازمت پر اب تو بیگم کا مشغلہ ہے کب تک ان میری معروضات پر غور کرتا رہے گا۔ ضابطہ کا فکر ہے نہ، ہوتا ہے یا بابا اپنے آپ کو مستثنیات میں سے ثابت کرنا مشکل ہے۔ سوچ کی عادت ہو چکی یورپ کی میں ترقی پڑھ سکی۔ دل میں بجز سرکاری ملازمت کے کیا ہے جس کے ہم شوق رکھ قابل ہوں اور جب ہاں کی ملازمت سے چلے گئے تو باقی کیا رکھا ہے۔ پنشن کی میعاد کے ساتھ ہی ساتھ کچھ مہلت بھی طاری ہو جاتی۔ تو کسی بستر پر پڑا رہتا لیکن صحت جانی کا کیا علاج؟ ابھی آپ حرف نہ ہوں یا کراچی کی بہتر اپنی بات ہے بیچارہ کیا کرے جو ضابطے کا بڑھاپا اور ذہن و دماغ کا بڑھاپا نہ ہو۔

زبیدہ کے خط سے معلوم ہوا کہ ہارون کی شادی ستائیس اپریل کو ہو گی اور آپ بھی شریک ہوں گے۔ جزاک اللہ۔ آپ کی مشتاق زبیدہ اور بچوں سے ملاقات ہو گی تو بہت خوش ہوں گے۔ ہم وہاں رہیں اگر سکتا آ جاتا۔ لیکن جو کچھ پس انداز کیا تھا وہ منصور کی شادی پر خرچ کر دیا۔ جو کچھ بچا تھا اسے جمع کر کے ہارون کے لیے بھیج دیا۔ اب محض قلندر ہوں۔ آئندہ معاش کا ابھی کچھ یقین نہیں۔ مگر جو کمایا تھا وہ کچھ زیادہ نہ تھا۔ پہلے نہ معلوم کہاں چلا گیا؟ کسی اور وقت سے اس پر غور کروں گا۔ ممکن ہے میں نے کہیں دفن کر رکھا ہو اور بھول گیا ہوں۔ میں نے اس وجہ تک آپ کو خط نہ لکھا۔ خیال تھا کہ آپ شاید مرزا غالب کے سلسلے میں سفر پر ہوں۔ خبریں یہاں دیر سے پہنچتی ہیں اور جو پہنچتی ہیں ان کا انداز و الفاظ ایسا ہوتا ہے کہ کچھ پتا نہیں چلتا۔ بہرحال کچھ سمجھنا ہی ضروری بھی نہیں۔ رموز مملکت خویش خسرواں دانند

آپ کی بہبود کا طالب

خاکسار

بخاری

۹

نیویارک ۵ مئی ۱۹۵۳ء

برادر محترم، آپ کا بے تاریخ خط آج ملا۔ اس سے پیشتر دو خط بھی موصول ہو چکے تھے جن میں عزیز ان اعجاز کے کوائف شامل (مشمول؟) تھے۔ اعجاز صاحب کے سلسلے میں میں نے سب سے پہلے بالواسطہ تحقیقات کی کہ ایسے گریڈوں میں کہاں تک کیا کیا گنجائشیں ہوتی ہیں۔ کیونکہ ابھی تک ہمیں ان سے سابقہ نہ پڑا تھا (آپ نے فرمایا ہے کہ ان کا ایک ساتھی حال ہی میں مقرر ہو کر امریکہ جا چکا ہے۔ معلوم نہ ہوا کہ وہ کون ہے؟ تفصیل مل جائے تو اس سے ہمیں ایک ساتھی میں مدد ملے گی) جو حالات سرسری طور پر معلوم ہوئے ہیں وہ یہ ہیں کہ نیز اپنے گریڈوں میں ہمیں اپنے کسٹے سے نیا حاصل ہے ہوا کلرک عموماً مقامی طور پر بھرتی ہو سکتے ہیں۔ دفتر سنبھالنے کا فرض تو ادا ہے ہی تھا ضد کرتا ہے گویا یا تو امریکنوں کو بھرتی کیا جاتا ہے یا ان لوگوں کو جو غیر ممالک سے آئے ہوں لیکن یہیں

مجبور ہوں۔ ۲ بیویاں مغرب میں یہ کام عورتیں کرتی ہیں۔ امریکی ذہنیت کے لئے ایسے کام پر کسی مرد کو مامور کرنا ایسی ہی ہنسنے کی بات ہے جیسے ہمارے ذہن میں چپراسی کے عہدے پر کسی عورت کو مقرر کرنا چاہیں حالانکہ ظاہر ہے کہ کام وہ بھی کر سکتی ہے۔ یہ معمولی معمولی باتیں سب میں خود کسی با اختیار افسر سے طاقت اپنے طور پر پوچھوں گا کہ باوجود ان تمام مشکلات کے کیا پھر بھی کوئی گنجائش موجود ہے اور آپ کو بذریعہ تار اس سے مطلع کروں گا۔

تنخواہ آپ کی موجودہ سے کم ہو گی۔ توسیع کے متعلق ابھی کوئی بات بذریعہ تار موصول نہیں ہوئی [illegible] وزیر تعلیم نے توسیع کی سفارش کی ہے اور وزیر خارجہ نے بھی صاد کیا ہے لیکن وہ سابق وزیر تعلیم تھے۔ معلوم نہیں اب صورت حال کیا ہے۔ افسوس آپ شادی پر نہ جا سکے۔ اس سے زیادہ افسوس اس بات کا کہ بھائی کی طبیعت اچھی نہیں۔ میں نے آپ سے کراچی میں بھی عرض کیا تھا کہ [illegible] مجھے بذریعہ خط اگر [illegible] تو مجھے لکھ بھیجئے۔ خدا کرے ان کی صحت اب سنبھل گئی ہو۔ شادی کے بعد زبیدہ کا خط نہیں آیا۔ اس لئے تفصیلات سے بے خبر ہوں۔ [illegible] کا ارادہ ہے [illegible] تھا کہ کام بخوبی سرانجام پا گیا۔ [illegible] زبیدہ کے خط کا انتظار ہے۔ معلوم نہیں [illegible] قریب [illegible] لیکن [illegible] کے لئے یقیناً مسرت کا باعث ہو گا۔ افسوس کہ زمانہ اب وہ نہیں کہ شادیاں بطرز قدیم چاؤ چونچلوں سے کی جائیں۔ [illegible] خوشحالیاں رہیں [illegible] ورنہ مجھے فکر اس بات کا شدید احساس رہتا ہے کہ زبیدہ کو کسی قدر ذہنی صحت [illegible] کا سامنا ہوتا ہے۔ آج [illegible] غفار کا خط آیا [illegible] پشاور کے رئیس خان [illegible] کے [illegible] فضل سے ہو گئی ہے۔ [illegible] خدا کرے اس بچی کی زندگی کامران ہو۔ [illegible] بہت خوشی ہوئی۔

سلمان کو نیا گھر مبارک [illegible] پہنچا دیئے گئے [illegible] ساتھ مل کر [illegible] مجید صاحب کو [illegible] شوق کیجئے گا۔ یقین ہے کہ [illegible] پانچ چھ [illegible] پڑھے [illegible] ہو گیا ہوں۔

سرفراز کا پنجاب چلے جانا حیرت کا باعث ہوا میں سمجھتا تھا ان کا مقصد [illegible] زیادہ مدت کی گنجائش زیادہ ہو [illegible] معلوم [illegible] اختر صاحب کو بھی سلام کہئے گا [illegible] آج کل کس شغل میں مصروف ہیں؟ ان کی کبھی کوئی خبر نہیں آئی [illegible] خدا یا ان کا [illegible]

بخاری

---

(۱۰)

نیو یارک ۴ جون ۵۳ء

برادر محترم، سلام مسنون! توسیع کے متعلق آپ کو اطلاع مل چکی ہو گی۔ وزیر اعظم اور [illegible] دونوں نے ازحد محبت اور اخلاق کے خط لکھے۔ ایک سال کی توسیع منظور ہو گئی ہے۔ اب کاش کسی کو اس سے پہلے ایسے [illegible] اخلاق خط لکھنے کی توفیق ہوتی۔ اکثر لوگ ضابطے کا خط لکھتے ہیں۔ [illegible] کر کے لکھتے ہیں کہ اس میں مکتوب علیہ کو اچھی طرح رگیدا جائے چنانچہ [illegible] اس میں کوٹ کوٹ کر بھر دیتے ہیں [illegible] نہیں انسان ہوتا۔

معاش کی [illegible] دو صورتیں ہیں۔ تعلیمی ادارے [illegible] امکانات دو [illegible] جب سے لوگوں کے کان میں بھنک پڑی ہے کہ میں قومی خدمت

سے بچنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ وہ اپنے پرانے لوگوں سے رشک کرتے ہیں۔ یہ [illegible] فقری ہے [illegible] سے [illegible] تک یہ [illegible] نشست۔ لیکن تحقیق نسبتاً زیادہ ہے۔ تعلیمی اداروں کا کام زیادہ تر تحقیق، مقالے اور تصنیف۔ [illegible] کتابیں اس میں نکلتی ہیں۔ بہتر تو یہ ہوتا ہے۔ یہ [illegible] تنقید کی آمد سے پہلا پڑے گا۔ آج کل اس کو تحریک کہتے ہیں۔ رجحان تنقیدی کام کا ہوتا ہے۔ تصنیف کی [illegible] ہے۔ کچھ حالات زمانہ اور کچھ اپنی غیر معمولی ذہنیت کی بدولت مولوی لوگ بھی [illegible] خدا کرے کوئی [illegible] کا کام کر جائے۔ جب سے [illegible] ہے۔ کبھی کبھی کی بابت جیسی چاہیے [illegible] وہ اس سے پہلے سے رہے [illegible] اور دن [illegible] سے [illegible] ہیں۔ جب [illegible] ہیں [illegible] ادب کا [illegible] بہت نہیں۔ [illegible]۔ ہم [illegible] ہیں [illegible] ہیں لیکن [illegible] میں پابند ہیں۔ اس لئے اور سے بھی کچھ [illegible] یار۔

غیر ملکی [illegible] تو ہوتا ہے کہ ان کی تصنیفات پر بہت کچھ غور کرتے ہیں۔ اس دوران میں تصنیف کی طرف بھی بڑھ جاتا ہوں۔ لوگوں نے یہاں مشورہ دیا ہے کہ دو کتابیں تم تو لکھو (انگریزی میں) ایک امریکنوں کے لئے اردو سیکھنے کی کتاب۔ دوسری امریکنوں کے لئے (ایک مختصر) تاریخ ادب اردو۔ ان کتابوں کے چھپنے [illegible] وصول ہوں گے۔ [illegible] لکھنے کا ارادہ [illegible] ہیں گے۔ اب آپ کے ذمہ یہ ہے کہ پاکستان سے ان کے لئے مسالہ بھیجئے۔ تاریخ ادب کے لئے تو بہت سی کتابیں جمع کرنی پڑیں گی۔ [illegible] پہلے اردو سیکھنے والی کتاب کا مسالہ بھیجئے۔ اور وہ مسالہ یہ ہے۔ عبدالحق کی قواعد اردو، اور وہ پانچ چھ کتابیں جو کسی زمانے میں صاحب لوگ کے لئے لکھی گئی تھیں۔ [illegible] ان کے نام [illegible] گے کہ اس سلسلے میں [illegible] ہوں۔ پہلے جو کتابیں ہاتھ آئیں ان کو بھیجئے۔ [illegible] ادارے [illegible] کے ساتھ ساتھ تاریخ ادب کے لئے فہرست کتب مرتب کرنا شروع کر دیجئے۔

یہ کام باقاعدہ تو نہ ہوگا؟ اردو کس سے کہوں؟ [illegible] کا خیال آتا ہے لیکن وہ ایسے کاموں کے لئے مدت سے بے کار ہو چکے۔ دوستی نہ کرتے تو انہوں نے [illegible] تاریخ ادب اردو پر ایک نہایت معقول کتاب آج سے دس پندرہ سال پہلے لکھ لی ہوتی۔ عباس صاحب اکرام فرمائی کرتے ہیں لیکن وہ کچھ اپنے مخمصوں میں ایسے گرفتار ہیں کہ پہلی سی [illegible] ان میں نہیں رہی۔

باقی آئندہ۔

خاکسار

بخاری

---

⑪

۱۲ جولائی [illegible]

برادر محترم، سلام مسنون۔ آپ کا یکم جولائی کا خط چند دن ہوئے ملا۔ کتابوں کا پارسل بھی مل گیا۔ بے حد شکریہ۔ جانتا تھا کہ کراچی میں کتابوں کا جمع کرنا کارِ ثقیل ہے۔ تاہم آپ کو تکلیف دینے سے باز نہ آیا۔ اور کیا کرتا؟ رشید (ریڈیو والے) سے یہاں کئی صحبتیں ہوئیں۔ ان سے کتابوں کے بارے میں میں نے اپنی مشکلات بیان کیں۔ انہوں نے کہا ہم آپ کے لئے کراچی میں ایک ایجنسی قائم کریں گے۔ جو آپ کے حسب ضرورت آپ کو اردو کی کتابیں بھیج دیا کرے تاکہ اگر آپ نیویارک میں بیٹھے تصنیف و تالیف کا شوق کرنا چاہیں تو بے کتابی سدّ راہ نہ ہو۔ میں نے کہا اس ایجنسی کا مہتمم کون ہوگا جس کو میں یہاں سے خط لکھوں؟ انہوں نے اپنا نام

پیش کیا۔ یعنی میں جنہیں نظموں کا اردو ادب کو بیچارہ میں پایا کہ جیسا جس سے سو سال تک میں حاصل کر سکے گا۔ مجھے یاد رہیں گے جس وقت سے بلند ہو سکی جا پہنچیں باتیں کبھی تازہ ماؤں گا۔ لیکن وہ بھی اگر آپ کی طرف جرأت کریں گے۔ اور اگر ان کی توجہ کبھی ہو رہی تو اس میں آپ کا بڑا ہاتھ ہوگا۔ جن سے ملاقات ہو ان سے کہیے۔ یہاں آ کر ان کی طبیعت میں چند شگوفے پھوٹنے لگے اور ان کے ذہن کو ایسی جلا ہوئی جس کی انہیں سالہا سال سے ضرورت تھی۔ وہ اپنے بیچ کو پہچانتے تھے تو میں کہہ نہیں سکتا آپ کی جوانی نگری کا آخر تذکرہ ہے۔ اگر رات [illegible] سے علم پرست [illegible] حق سمجھئے۔ وہ بھی راشد، رشید، میں اتنا دیوانہ تھا چند شمعوں کی طرح روشن ہوئے لیکن کچھ عجب بجھاؤں کا سنا ہوا شعلہ ہے۔ یا وہ دیوان ان کی قسمت میں تھا، مقدر کی ظلم کو کا سامان بھی نظر نہ آیا۔ چنانچہ سالہا سال سے بس سلگ رہے ہیں۔ آپ کو جن چشموں نے سیراب کیے، ان کی تازگی تو کہ ہم نے پائی۔ اس پر بھی حد سے گھٹنوں باتیں کرتے رہے آج آپ کو ہزاروں دعائیں دے کر آپ سے محبت پھر تازہ کیا۔ ان سے بھی یہی کہیے۔ پہلے رشید اور میری زندگی کے بہترین لمحے [illegible] آغوش کر کے فراموش کر دی۔

کتابوں کا بہت شکریہ۔ تاریخ ادب کی بھیجی کتابوں میں سے صرف آب حیات میرے پاس ہے۔ باقی جب میسر ہوں بھجوا دیجئے۔ پہلے ایک سرسری خاکہ بنا لوں پھر اس کے بعد مفصل کتابوں کی ضرورت بھی پڑے گی یعنی سب [illegible] سے لے کر آزاد کی تک لیکن یہ مرحلہ ابھی دور ہے۔ ابھی تو پہلے چند قدم اٹھا رہا ہوں

اب کے آپ نے طویل خاموشی کے بعد خط لکھا۔ خط لکھنے کے معاملے میں آپ نے کچھ موسموں کا سا رتبہ حاصل کر لیا ہے۔ دو چار دن سے زیادہ ادھر ادھر نہیں ہوتے اس لئے باران کرم میں غیر معمولی تاخیر ہو تو ہم برا جانے لگتے ہیں۔ آج کل آپ کے کام کاج کا کیا حال ہے کیا اب بھی آپ کا وہی منصب ہے جو سابق وزارت کے زمانے میں تھا؟

مجید لاہوری، رشید اختر ندوی، اور حسرت اور دیگر احباب کو سلام پہنچے۔ امید ہے بھابی کا مزاج اب بخیر ہوگا اور تشویش کی کوئی وجہ باقی نہ ہوگی۔ انہیں میرا مودبانہ سلام کہیے۔

خاکسار

بخاری

(۱۲)

نیویارک ۲۲ اکتوبر ۵۳ء

برادر محترم سلام مسنون۔

گرامی نامہ ملا۔ بیماری میں آپ اکثر یاد آئے۔ جہاں گردی سیر و سیاحت کے لئے خوب ہے۔ لیکن قدرت کو کوئی ایسا انتظام منظور کرنا چاہیے کہ انسان بیمار ہو تو اپنے ہی وطن میں۔ اور دفن ہو تو اپنی ہی مٹی میں۔ علاج تو یہاں سے بہتر دنیا میں نہیں لیکن روح کے زخم بھرنے نہیں پاتے۔ روح کی مسیحائی احباب ہی سے ہو سکتی ہے آپ خط جلدی لکھتے تو اچھا ہوتا۔ میں جواب نہ دے سکتا لیکن آپ کی آواز تو سن لیتا۔ بہرحال اب بھی آپ کا خط برکت کا موجب ہوا۔ یہ آپ نے خوب پوچھا کہ علالت کیا تھی۔ جو ہم جیسے اہل دل ہیں وہ کب تک دل کو سنبھالے رہیں گے اس سے پہلے تو کوئی آثار نہ تھے لیکن یہ پچھلا سال مجھ پر بہت گراں گزرا۔ پاکستان کا سفر اتنا مختصر تھا کہ اس سے جسم کو کچھ آرام نہ ملا۔ اخراجات بہت زیادہ ہوئے۔ واپس پہنچا تو بعض بزرگوں کی تنگ نظری سے جو خطرے لاحق تھے وہ سب سچ ثابت ہوئے۔ پھر تنخواہ کم ہوئی۔ پھر ریٹائرمنٹ کا نوٹس ملا.......... جب مجھ سے مایوس ہوئے تو امریکیوں نے اپنا ایک آدمی کھڑا کیا اور اسے منتخب کرا لیا

پچھلے سال پاکستان سے ایک سال کی رخصت ملی۔ اس میں کوشش ساتھ شروع کی کہ کچھ تحریر کا سبب ہو تو لیکن آنتوں نے بہت جلد پکڑ لیا۔ اب اچھا ہوں۔ اللہ کا شکر ہے پھر کوشش شروع کروں گا۔

لاہور کے ملنے والے صدیق ہیں۔ آپ ہر دل عزیز انسان ہیں۔ مدت سے جانتے ہیں آپ کے گرد عقیدت مندوں کا حلقہ بہت مستقل اس شریفانہ صورت اختیار کر لیتا ہے۔ تاہم آپ کے بزرگوں سے بھی [illegible] لاہور سے نام پر [illegible]۔ حمید نظامی کی طرف سے ایک خط کی رسید ملی تھی۔ دست بستہ معافی کی التجا کر کے جواب مزید لکھوں گا۔ میں نہ بیمار، بالکل [illegible] خط کے سلسلے میں [illegible] ہے۔ تاثیر سے بھی سلسلہ [illegible] ہے۔ تاثیر کا ایک خط (از صدر [illegible] آیا ہے) البتہ چند دن ہوئے آیا تھا۔

پچھلے ایک دو ماہ آپ سے [illegible] ایک پبلشر نے مجھ سے ایک بچوں کی کہانی مانگی ہے (تخمیناً ایک ہزار الفاظ) یہ ایک مجموعہ میں شامل کی جائے گی جس میں سب دیگر اقوام کے بچوں کی کہانیاں بھی شامل ہوں گی۔ کہتے ہیں کہانی ایسی ہو جو قدیم FOLK LORE پر مبنی ہو۔ دس بارہ سال کی عمر کے بچوں کے لئے موزوں ہو اور ممکن ہو تو ایسی ہو جو اس سے صلح و آشتی کا سبق [illegible] مقابل [illegible] ہو۔ جو بچوں کے کام کی اور [illegible] کے نصب العین پر بھی پوری اترے۔ آپ ایسی کہانی کا انتخاب [illegible] کر سکتے ہیں جن کی کوئی [illegible] بچوں میں مقبول [illegible] ہو۔ پہلے خیال آیا تاثیر سے پوچھوں لیکن ان سے جواب کی توقع نہیں اس لئے آپ کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ عباس بھی آج کل کراچی ہی میں ہیں۔ آپ دونوں مل کر ایسی کہانی انتخاب کر سکیں تو اور کرم ہوگا۔ کہانی اردو میں بھیج دیجئے۔ میں اس کا ترجمہ یہاں کرا لوں گا۔ [illegible] کہ ان کی کہانیوں کا ترجمہ بھی جاری ہے [illegible] آپ کا ممنون ہوں گا) امین الدین کے انتقال کی خبر آپ کے خط سے ملی۔ حمید نے میری بیوی کے پیش نظر اسے پوشیدہ رکھا۔ حسرت کاشمیری اور مجید لاہوری دونوں کو میرا سلام وہ کاشمیری اور وہ لاہوری ایسے ہیں جیسے میں پاکستانی ہوں۔ ہم تینوں کی قسمت ایک ہی نوشتے کے تحت کی گئی تھی۔ جس دیار کو فخریہ پہلے اپنایا اسی سے اخراج ہوا۔

خاکسار

بخاری

عنقریب ایک اور خط لکھوں گا پیاس نہیں بجھی

۱۴

نیویارک ۱۰ نومبر ۱۹۵۳ء

برادر محترم۔ سلام مسنون۔ گرامی نامہ کریم نومبر کا لکھا ہوا ملا۔ مختصر لیکن بہر حال مکتوب محبوب۔ دل سیر نہ ہوا، آنکھیں ترکشن ہوئیں۔ اس اثنا میں بشیر ہاشمی کا خط بھی ملا جن دنوں آپ لاہور میں تھے، اور دعوتیں اور بڑھ منانے آپ کے اعزاز میں ہو رہی تھیں۔ ان دنوں وہ بے چارہ ٹائیفائڈ میں مبتلا تھا اور ماتم کر رہا تھا کہ آپ کی صحبت سے محروم رہا۔ ان کے میرے درمیان خط و کتابت نے حال ہی میں ایک مخصوص رنگ اختیار کر لیا ہے۔ وہ بھی بیمار میں بھی بیمار۔ وہ بھی برلب پنشن میں بھی برلب پنشن۔ دونوں کے خط ایک ہی زمین میں ہوتے ہیں۔ البتہ ان کے کلام میں سوز مجھ سے زیادہ ہوتا ہے اور نزاکت طبع بھی مجھ سے وافر۔ چغتائی کے خطوط بھی حال میں مسلسل آئے۔ وہ اپنے گنبد علاج میں میری بیماری سے بے خبر رہے چنانچہ ان کے خطوں کا لہجہ حد تندرست ہے اور اکثر منطقی ثابت ہوا

ہے۔ ایک کہانی انہوں نے اس دوران میں لکھ ڈالی ہے (یہ بات صیغۂ راز میں ہے۔ آپ کسی سے ذکر نہ کیجیے۔ بات باہر نکلی تو وہ برہم ہو جائیں گے) کسی قدر کھینچ کر [illegible] بخشنا چاہتے ہیں۔ مجھے یہ صورت سوجھی ہے کہ اس کا پہلے انگریزی میں ترجمہ کروں اور پھر کسی رسالہ میں شائع کر لیں۔ خدا کرے ایسا ہی ہو اور ان کی سب توقعات پوری ہو جائیں لیکن میرے اختیار میں قسمت اور مستقبل کا اندازہ لگانے ہی کی طاقت دکھائی ہے۔ [illegible] کا نام تجویز کر ڈالا ہے کہ وہ بھی اس قسم کے افسانے لکھ سکتے ہیں۔ ورنہ لوگ پاگل سمجھنے لگیں گے۔ بلکہ دانت کاٹنے کو دوڑیں گے۔ ... وغیرہ وغیرہ

آپ کا اور تاثیر کا شکریہ۔ پریوں کی کہانی جس کی مجھے تلاش ہے محض وقتی کام ہے۔ یہاں کی بعض ادیب امریکی عورتوں نے ایک مضمون کا مجموعہ بنایا ہے۔ اس سے پہلے مختلف قوموں کے کھانوں کے ترکیبی نسخے شائع کر چکی ہیں۔ اب کہانیوں کی طرف متوجہ ہوئی ہیں۔ بین الاقوامی پن، امارت، اور تصنیف تینوں پرندوں کو ایک پتھر سے مارنا چاہتی ہیں۔ نیاز کو کیا ہو گیا، مجھے خط لکھنے کا نام نہیں لیتے۔ کئی مرتبہ میں نے پہل کی لیکن ہر مرتبہ تھک کر بیٹھ گیا۔ کچھ عرصے سے اور احباب کی وساطت سے ان کو سلام شوق بھیجتا رہا۔ وہ بھی قبول نہ ہوا تو اسے بھی ترک کر دیا۔ اس کے جانے پر کچھ عجیب کدورت سی چھا گئی۔ سٹوڈیو اور گھر کے آنگن سے باہر نہیں نکلتا۔ زبیدہ کے خط سے معلوم ہوا کہ حجاب اور یاسمین کو بھی ٹائیفائڈ کا عارضہ ہوا۔ خدا رحم کرے۔ یہ خبر سن کر بہت رنج ہوا لیکن کیا کروں۔ نیاز تک عرض نیاز کرنے کے سب رستے بند معلوم ہوتے ہیں۔ کبھی آپ سے عشق اللہ ہو تو میرا سلام کہیے گا

دو تین دن ہوئے حمید الدین (ابن ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم) امریکہ کو وارد ہوئے۔ ان سے لاہور کا ذکر دیر تک رہا۔ صوفی کی بے حسابیوں سے ملول لگے۔ کچھ تو اس میں ضیاء الدین کی اپنی تنگ نظری شامل تھی لیکن اس سے قطع نظر کچھ حقیقت بھی ان کے بیان میں ضرور تھی۔ حمید کی نظر میں لاہور بے حد خراب ہو گیا ہے۔ دیکھنے کے بعد محتسب تنگ کرتے ہیں اور ہر راہ رو کو آوارہ سمجھتے ہیں۔ کچھ حال عابد علی کا بھی بیان کیا۔ اس کی زندگی بھی سدا گردش رہتی ہے لیکن اگر مانند شیشہ [illegible] دلکش معلوم ہوتے ہیں۔

چاہتا ہوں کوئی پبلشر مجھ سے ٹیکسٹ بک لکھوائے۔ عمر بھر یہ کام نہیں کیا لیکن اب یہ گناہ کرنے کو بھی دل چاہتا ہے کسی کو شوق ہو تو آزما دیکھئے۔ میں نے ہاشمی سے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ آپ لوگ خیال رکھیں تو ممکن ہے کوئی سبیل نکل آئے۔ مانا کہ اس عمر میں جب کہ خود پرستی و پیری میں ہیں میری قیمت گر گئی ہو گی۔ تاہم کوئی معقول معاوضہ ہی سہی کا نقد کا پورا مل جائے تو عجب نہیں۔ عمر بھر میں "نہ" کہتا رہا اب "ہاں" کہنے کو تیار ہوں۔ [illegible] اور باتیں بھی کہنے کی ہیں۔ لیکن آئندہ خط میں ان کا ذکر کروں گا۔ آپ کو جب بھی خط لکھنے بیٹھتا ہوں جبراً اسے ختم کرتا ہوں۔ ورنہ عاشق کی داستانِ محبوب ختم کب ہوتی ہے۔ حسرت، مجید لاہوری اور اختر مدنی اور عباس اور دیگر احباب کو میرا نام اور شوق یاد دلا دیجیے گا۔ تازہ تازہ خبر آئی ہے کہ ڈان پر عتاب نازل ہوا۔ ڈان اور حکومت کے باہمی عشق کے رموز آج تک سمجھ میں نہیں آئے۔ مولانا کا شعر یاد آیا کہ ؎

عشق کا اس کے دونوں ہیں مرغوب
سحرِ وصل و شامِ تنہائی

خط لکھتے رہیے۔

خاکسار
بخاری

(۱۴)

نیویارک ۱۷ نومبر ۵۳ء

برادرم محترم سلام مسنون۔ تجویز ہے کہ یہاں ایک کتاب۔ پبلشرز کی جانب سے جس کا عارضی نام ابھی "A STUDY OF PAKISTAN"، قرار پایا ہے پندرہ ابواب ہوں گے۔ ہر باب میں پاکستان کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی ڈالی جائے گی۔ مصنف ایک نہیں بلکہ کئی ہوں گے۔ بیشتر امریکی یونیورسٹی کے پروفیسر یا کچھ ایسے پاکستانی اور امریکن ناشر چاہا گیا تصاویر اور نقشے وغیرہ بھی کتاب میں شامل ہوں گے۔ ادبیات کا باب [illegible] لکھیں گے۔ بعض موضوعات پر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب کو دعوت دی گئی ہے۔ چند ابواب راقم الحروف سے لکھوائے گئے۔ ایک باب پاکستان کے جرنلزم پر ہے۔ [illegible] میرا خیال ہے کہ آپ سے زیادہ موزوں کوئی شخص نہ ہوگا۔ آپ اردو میں لکھ ڈالیں۔ انگریزی میں ترجمہ یہاں ہو جائے گا۔ ترجمہ تو ظاہر ہے شاید غیر ملکی صحت کی نقل [illegible] کیونکہ یہ کتاب ہر جگہ دنیا بھر میں مشہور ہوگی۔

مضمون عالمانہ ہونا چاہئے اور آپ کے قلم سے توقع بھی یہی ہے۔ تاریخی کے دو پہلو مد نظر ہیں۔ اول پاکستان کے [illegible] دوم دو تین برس کے نشیب و فراز کیا ہیں درج کئے ہوں گے۔ مجھے سلسلہ کلام اس قسم کا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تقسیم سے پہلے یہاں مسلمان اخبارات کی کیا حالت تھی تعداد کیا تھی۔ اشاعت کیا۔ لکھنے والے، ایڈیٹر اور مالک کون؟ اخبارات کی چال ڈھال کیا تھی؟ سیاست کے کن کن پہلوؤں پر ایڈیٹروں کو [illegible] تھے؟ تقسیم کے بعد جرنلزم میں کیا انقلاب آیا۔ پریس کی کیا حالت ہوئی۔ انقلاب کے بعد توازن کہاں کہاں آن کر ٹھہرا۔ اردو کے کتنے اخبار ہیں۔ انگریزی کے کتنے؟ بنگالی کے کتنے؟ اشاعتیں کیا ہیں؟ موضوعات کیا ہیں؟ اس پانچ چھ سال کے عرصے میں سب سے زیادہ بحثیں اخباروں میں کن موضوعات پر ہوئیں اور کس قسم کے خیالات کا اظہار ہوا۔ اخبارات کی تیاری کیونکر ہوتی ہے (مثلاً ٹائپ وغیرہ) اشاعتیں کیا ہیں۔ حلیہ اور نقشہ کیا ہے۔ روزنامہ، ہفتہ وار ایڈیشن، ادبی مضمون، شعر، مجید لاہوری وغیرہ وغیرہ، پریس کے قوانین کس قسم کے ہیں؟ کیا اکثر اخبار ان کی زد میں آتے ہیں یا آ جاتا تھا؟ ایسی باتیں احتیاط سے لکھنی پڑیں گی لیکن نہ اس قدر کہ بالکل ہی بے ذوق ہو جائیں۔ اس لئے آپ کا خیال آیا کہ آپ میانہ رو مضمون اعلیٰ درجے کا لکھ سکتے ہیں) مضمون بہرحال معلومات سے پُر ہونا چاہئے اور یہ آپ کے لئے مشکل نہیں۔ آپ کے مختصر سوانح میں خود لکھوں گا۔ کہئے کیا خیال ہے؟ خدا کرے آپ کا جواب اثبات میں ہو۔ مضمون کے لئے آپ کو کتنی مہلت درکار ہوگی۔ اوروں کو ایک یا دو مہینے کی مہلت دی گئی ہے۔ یہ کم نہیں اور امید ہے کہ آپ کو بھی منظور ہوگی۔ جواب سے سرفراز کیجئے۔

ایک باب ادبی رجحانات پر ہے وہ خود لکھنے کا ارادہ ہے لیکن مواد اور رسالے یہاں ناپید۔ یہ تو ایک طرف یہاں سے یہ تک معلوم نہیں کہ رسالے کون کون سے اور کتنے نکلتے ہیں۔ باقی آپ مضمون کے لئے جو معلومات درکار ہیں اس کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔ عباس صاحب کو بیگار میں پکڑیئے اور ان سے کہئے میری مدد کریں۔

جرنلزم کے سلسلے میں خیال آیا کہ اگر کوئی مزے دار اخباری نظمیں پیش نظر ہوں تو ان کا ترجمہ بھی نمونۃً شامل مضمون کیا جا سکتا ہے۔ اور ہاں کارٹون کا ذکر بھی کیجئے گا۔

ذوالفقار سے ریڈیو پر گفتگو ہوئی تھی لیکن ذرا مختصر کیونکہ وہ آج کل بیٹی کی شادی کے انتظامات میں منہمک ہوگا۔ شادی ۵ دسمبر کو ہے کل ذوالفقار کا خط آیا ہے آج ہاشمی کا خط بھی آیا۔ یہاں کتابوں کا بازار مندا معلوم ہوتا ہے۔ بقول ہاشمی کے ہزاروں لاکھوں کا نقصان گیا۔ اب تک کوئی دو تین ہزار

ل ہائی سے مصنفہ سے لیکن اس نے مزید تفتیش کا وعدہ کیا ہے۔ ایک کتاب " PUNJAB PRELUDE " نامی میرے پاس ریویو کیلئے
۔ مصنفہ کا نام مس PIRIE ہے جو کچھ عرصہ ہوا ایچیسن کالج میں پڑھاتی تھیں۔ اب بھی پڑھاتی ہوں۔ پاکستان (پنجاب پر فوقیت) میں اور ہندوستان
ر بار بار شائع کرتی ہیں کہ پنجابی اور انگریز دونوں ایک ہی نسل سے ہیں۔ ایک باب ہاشمی صاحب کے خاندان پر (مع تصویر بہا) ہے اور پیار سے لکھا ہے
ی سکے جلسے سے بھی واقف ہیں۔ ایک حصہ "لیبے اینڈ گرل ڈبل" کے متعلق سے "صفیہ" لڑکے انڈلیسے ٹرل" کا حال بھی بیان کیا ہے۔

خاکسار

بخاری

نقوش یہاں کے اخبار میں جو چھپی ہے کہ کابینہ میں رد و بدل ہونے والا ہے تو مرکز کے افسروں میں ہیں۔ اللہ اپنے حفظ و امان میں رکھے
ر کی آفت سے بچائے۔ ہم یہاں پاکستان کی بہبود اور پاکستانیوں خصوصاً اپنے احباب اور اقربا کی بہبود اور سلامتی کے لیے دست بدعا رہتے ہیں۔

---

⑮

برادر مکرم۔

برادر مکرم سلام مسنون۔ گرامی نامہ ۲۰ نومبر کا ملا۔ یہ آپ کے مفصل تر خطوں میں تھا، بہت لطف آیا۔ اور ذہن نے لمبی چوڑی مسافت مرتب
کرنے کی۔ مضمون کے متعلق عرض یہ ہے کہ قبل پاکستان کے ان اخباروں کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جو موجودہ پاکستانی علاقہ سے شائع ہوتے تھے
علاقے کی صحافتی درجہ بندی کا کچھ حال معلوم ہو نیز ان اخباروں کا ذکر بھی مناسب ہوگا جو پاکستانی علاقے سے شائع تو نہ ہوتے تھے لیکن جن کا پاکستانی
سے گہرا تعلق تھا مثلاً ڈان۔ اتنا لکھنے کے بعد یہ بھی کہنا لازم ہے کہ میرا یہ مشورہ کچھ فضول سا ہے۔ دراصل پاکستانی صحافت کا احوال بیان کرنا ہے۔ اب
پس منظر بیان کرنے کے لئے کن چیزوں کی ضرورت ہے یہ آپ کے حسن مذاق اور احساس ربط پر چھوڑتا ہوں۔ ان سے بڑھ کر کسوٹی بھی کوئی نہیں البتہ
رہے کہ قارئین انگریز اور امریکن ہوں گے۔ اور جس بنا سے یہ باب کتاب میں شامل ہوگا اس سے پاکستانی معاشرت پر روشنی ڈالنا مقصود ہوگا۔ غیر ملکی
ایشیائی ممالک کے بارے میں اکثر باتوں سے بے خبر ہیں اور معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ایشیا کے لوگ کس قسم کے لوگ ہیں کیا کر رہے ہیں کیا سوچ رہے ہیں
نچ جا رہے ہیں ڈور کس کے ہاتھ میں ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان خیالات کے زیر عنوان صحافت کے بارے میں بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اس آلۂ جمہوریت کا ایشیا
ستعمال کیا ہے کون کر رہا ہے؟ کون لوگ اس سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایسی باتیں کہ کتنے لوگ اخبار خریدتے ہیں اور (اگر ہر اخبار کی ایک کاپی
ہے) کتنے لوگ اخبار پڑھتے ہیں۔ یہ لوگ کس طبقے کے ہیں کس قسم کی خبریں سب سے زیادہ جاذب توجہ ہوتی ہیں۔ کس قسم کی خبریں نادر یا مفقود۔ کون سے طبقے
کے اثر سے بالکل ہی نامحرم (یا محروم ہیں) اس نوع کی باتیں یہاں لوگوں کے لئے ازحد دلچسپ ہوں گی۔ لوگوں کو یہاں کرید رہتی ہے کہ ایشیائی ممالک
نے حال ہی میں آزادی حاصل کی ہے۔ اپنی آزادی کو کیا لباس پہنا رہے ہیں۔ اس کے تحت میں آپ جانتے ہیں صحافت ایک خاص اہمیت رکھتی ہے لوگ
کے متعلق سوالات پوچھتے رہتے ہیں مثال کے طور پر جب میں کراچی میں تھا تو مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ آئین کے متعلق ابھی بڑی بحث بھی چھڑی ہوئی
اختلافات کے کالموں ہی میں ہو رہی ہیں۔ اس کے علاوہ بحثوں سیاسی جماعتوں جلسوں اور لیکچروں میں بھی مختلف آراء کا اظہار کیا جا

لیکن جو سوال [illegible] نہیں ہوا۔ صاف ظاہر ہے میرا خیال ہے کہ انہوں نے دوستوں کے حلقوں میں [illegible] یا اخبارات میں [illegible] کے ساتھ [illegible] سب کا [illegible] اندازہ صحیح ہے تو یہ بات بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس قسم کی کی باتیں آپ نے بتا [illegible] خود ہی سوچیں گے۔ [illegible] مضمون بھی بھجوا دیجئے۔

[illegible] ادبی رجحانات کے متعلق عرض کیا تھا کہ میری جانب سے عباس سے استفادہ کیجئے۔ اس کے متعلق آپ نے کچھ نہ لکھا۔ آپ [illegible] اس سے براہ راست خط و کتابت کریں۔ [illegible] آپ کو اس میں سہولت ہو گی۔ کہانی کے متعلق آپ کی [illegible] کا شکریہ [illegible] کے خط کا انتظار کر رہا ہوں

ہاشمی کہتا ہے۔ کتابوں والی بات یہ ہے کہ حالات قطعی [illegible] میں ہیں جیسے کہ پہلے عرض کر چکا ہوں۔ . . . اس سلسلہ میں [illegible] صاحب کراچی کے [illegible] پبلشرز کو ادھر توجہ [illegible] چنانچہ ہاشمی صاحب کا ارشاد آپ کے گوش گزار کر رہا ہوں۔

اس خط کو ختم کرتا ہوں۔ عنقریب ایک اور خط [illegible] لکھوں گا۔ [illegible] تمہاری صحت بہت خراب ہے۔ [illegible] یہاں سے رخصت ہونے [illegible] کرانے [illegible] کراچی بھیجی ہے۔ [illegible] ختم ہوا [illegible] خاکسار

بخاری

ہمارے پتے پر [illegible] منصب لکھنے کی فرصت نہیں، دیکھئے آپ کو اس لئے بہت ہی [illegible] قلم استعمال کرنا پڑا۔ اس سے مجھے خفت

ہوئی

---

⑯

جانِ برادر! کئی دن سے آپ کا خط نہیں آیا۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔ آپ کا آخری خط غالباً وہ تھا جس میں آپ نے رزم نامے کے تاریخی حالات لکھ بھیجے تھے۔ اس کو میں نے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اچھا خاصا پُر از معلومات مقالہ بن گیا۔ اور اس کی بدولت میں مفت میں تاریخ دان بن گیا۔ جنگ [illegible] کی ترجمہ بھی کیا نعمت ہے۔ اسی لئے تو احباب سے عرض کرتا رہتا ہوں کہ ترجمے کے لئے مسالا فراہم کیجئے۔ عباس نے اس بارے میں دستگیری کا وعدہ کیا تھا۔ ایک خط بھی اس مضمون کا انہوں نے لکھا تھا۔ پھر خاموش ہو گئے۔ ملیں تو یاد دہانی کر دیجئے گا۔ آج کل کچھ پژمردہ رہتا ہوں۔ تخفیف کی زد میں آ گیا ہوں۔ تجویز ہے کہ اس عہدے کو فوراً یعنی اپریل سے [illegible] کر دیا جائے۔ اس کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ مجھے یہاں سے جدا کیا جاتا لیکن [illegible] اتنا [illegible] کیا کہ اگر مجھے [illegible] منظور ہو تو یہاں سے نہ نکالا جاؤں گا۔ میرے حالات آپ جانتے ہیں۔ [illegible] سرطان کا خطرہ لاحق ہے اس کی وجہ سے میں یہاں سے ہل نہیں سکتا چنانچہ میں نے منظور کر لیا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ اب معلوم نہیں کب تک ہے۔ اکتوبر میں اپنی مستقل ملازمت سے ریٹائر ہو رہا ہوں (وقت گزر گیا اور ہمیں اس کا احساس بھی نہ ہوا۔ ریٹائر ہونے کا سال اور مہینہ بھی یاد نہ تھا۔ [illegible] وزارت تعلیم سے دریافت کیا جواب آیا تو رنگ اڑ گیا) نہ معلوم اکتوبر کے بعد کیا حشر ہو۔ [illegible] اور [illegible] کیا کام [illegible] دیا جائے [illegible] اس عہدے پر ہم نے وہ خدمت گزاری کی ہے اور [illegible] بھی یہاں سے کہیں اور منتقل کرنے کا خیال بھی [illegible] ملازمت ترک [illegible] قریب [illegible] آپ جانتے ہیں [illegible]

ساتھ ہی مکمل [illegible] [illegible] میری بے صبری [illegible]۔ بہر حال تحریر ادب کے شب و روز آنکھوں کی نقالی سے گزرے۔ جو شاید ان کی صحبت میں بسر ہوئی زندہ دل انسان ہیں۔ اس بار ان کا افسانہ بعض مقامات اس میں نہایت دلچسپ ہیں مثلاً غلیظ دھبے، روز کا معمول بنی چہل پہل آیا بعض بیٹھے اس میں تاثرات ملا دیتے ہیں۔ شاید مقامات بعض حاشیہ نشین جنہیں میرے سرگزشت کی چاشنی پڑی ہے: جیسے فرمایا ذہن میں آتے وہ اصل کی طرف ماجرے تھے لیکن دوبارہ غور کیا تو اصل مطلب روشن ہو گئے۔ آخری باب میں جو پنجابی گیت شامل کئے ہیں ان میں سے بعض کئی روز دماغ میں گونجتے رہے ہیں۔ میری گڈی کٹے نہ دیکھیں تے شتری لال چک ما ماں۔ [illegible] بال کے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] رنگ [illegible]۔ [illegible] نے [illegible]۔ [illegible] بے ساختہ لبوں پر [illegible] [illegible] [illegible] معلوم ہوا [illegible] اور [illegible] یہی معلومات [illegible] اس خدا کی [illegible] بھیج دیجئے گا۔ [illegible] سے معلوم ہوتا ہے کہ اب پاکستان میں ہر طرح امن و امان ہے۔ خدا تم سب کا نگہبان ہو۔

بخاری

---

(۱۷)

برادر مکرم اس ڈاک میں دو خط ملے۔ ایک آپ کا ایک والد کا۔ دونوں کے جذبات ایک سے تھے مگر مضمون مختلف تھے۔ روز کا اثر طبیعت پر کیسا ہوا اس کا انفلوئنزا میں مبتلا ہوں۔ تیز بخار ہے اور ڈاکٹر کے مفصل معائنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس جسم فانی میں کئی اور نقائص پیدا ہو چکے ہیں۔ جن کا مجھے گمان بھی نہ ہو سکتا تھا قلب کی حرکت، خون کا دباؤ، جگر، معدے کی حالت ان میں سے کوئی بھی صحیح نہیں۔ بہر حال اب یہ توقع تو ہرگز بھی نہ تھی کہ زندگی بدلی ہے نہ اس بات سے لاعلم تھے۔ کہ جوانی آنی جانی چیز ہے۔ افسوس صرف اس بات کا ہے کہ کشاکش غم پنہاں نے وقت سے پہلے بیمار کر دیا۔ بہر حال بقول ایلا ہیرو ملاکس کی اس نظم کے حسین ترجمہ آپ کسی زمانے میں مشاعروں میں زور و شور کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ وہ تنہائی پسند ہے۔ اس لئے اب کیا آپ کی سمع خراشی کروں۔ بہتری کر رہا ہوں۔

آمدم برسر مطلب۔ حالات وہی ہیں جو آپ نے بیان کئے ہیں۔ پالان اور طوق زریں کے متعلق جو نظریہ آپ نے بیان کیا ہے۔ وہ بھی حرف بحرف صحیح ہے میری صرف اتنی درخواست تھی کہ آپ کو میرے خلوص یا مستعدی پر کسی شبہ نہ ہونا چاہئے میرے خط کا مطلب اس سے زیادہ کچھ نہ تھا کہ اگر آپ جذب ملے کریں آہ و زاریاں۔ مجھ سے جو کچھ بن پڑا جس طرح بن پڑا۔ جب بن پڑا۔ میں دریغ نہ رکھوں گا۔ اس میں کوتاہی ہو تو اسے اپنی رسوائی سمجھوں گا۔ کہنا صرف یہ تھا کہ میرے ہاتھ پاؤں اس وقت بری طرح بندھے ہوئے ہیں اس لئے میری بے بسی کو میری کم ہمتی ہی سمجھئے۔ اسے بے اعتنائی پر محمول نہ کیجئے۔ فی الحال اتنا کیجئے کہ لاہور میں جو صاحب اختیار ہیں۔ ان سے کسی وقت ملئے۔ امتیاز کی معیت میں ملنا ہو تو اور بھی بہتر ہوگا۔ دو ایک دن میں انہیں بھی پیغام بھیجوں گا۔ اور جو ترکیب میرے ذہن میں آئی۔ وہ انہیں سمجھاؤں گا۔ ملتے وقت میرا نام بھی لے دیجئے اور کہئے کہ میں ان کے ایما سے مل رہا ہوں۔ برادر مکرم ان کشمکشوں میں کئی معرکے اور مرحلے پیش آتے ہیں۔ لاحاصل مسلسل کوشش اور صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ بتا قسمت یاور ہو تو کامیابی جلد نصیب ہو جاتی ہے ورنہ بعض اوقات شکیب آزما صبر کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ وہ باتیں ہیں جو آپ کہیں اور میں سنوں۔ برعکس اس کے میں آپ کو نصیحت کر رہا ہوں میں مجبور ہوں معذور نہ ہوتا تو آپ کو اس معاملے میں ذرا بھی تشویش نہ ہونے دیتا لیکن کیا کروں ؎

پیکر تو حرم من نہ بدست جام جم من   گر دہام من طلبے نہ کنند من وداع

یہ اس خط کا جواب ضرور دیجئے۔ خواہ جواب پریشانی کے سوا کچھ نہ ہو۔ کم از کم اپنی پریشانی میں مجھے ضرور شریک کر لیا کیجئے۔

آپ کی محبت، شفقت، عنایت کی بدولت بلاغت کے تقریب نصیب ہوا ہے۔ جب آپ پریشان ہوں تو گمان نہیں کہ مجھ سے پیارا دوسرا سے میرا عقیدہ جو ہو ہی آپ کے پاس بس کا ستر پیشر کو سنبھال دیتا۔

میری تو یہی کا مصداق ہے اکمال، رہ رہ کر اور بہت تندرستی کی کیفیت سے گذرتا ہے۔ یہی درست ہوا تو منہ سے ایک شاید مطلب نے شعر سے مدت سے محتاج ہوں مجھ میں اب اتنی ہمت نہیں کہ کسی دوسری جگہ منتقل ہو جاؤں اور گزارا کر رہا ہوں۔ یقین ہے کہ آپ کے ساتھ وطن میں بھی میں آپ کو بھی اور گھر کے لوگوں کو بھی۔

خاکسار،

بخاری

۱۸

۴ تغلق روڈ

نئی دہلی ۱۱ دسمبر

مائی ڈیر محترم سلام مسنون۔ فی الحال نیوز ایجنسیاں غیر انگریزی اخبارات کو بھی خبریں انگریزی ہی میں بھیجتی ہیں۔ اور اخبارات خود اپنے مترجموں سے ان کا ترجمہ کرا لیتے ہیں۔ اس سسٹم کے نقائص یہ ہیں:-

(۱) نیوز ایجنسیوں کو ترتیب کرنے کے لیے ایسے ہی کارسپانڈنٹ رکھنے پڑتے ہیں جو انگریزی سے کما حقہٗ واقف ہوں۔ محض دیسی زبانیں جاننے والے کارسپانڈنٹ (خواہ انہیں اپنی زبان میں کتنی ہی مہارت حاصل ہو) کارسپانڈنٹ نہیں بن سکتے۔

(۲) تمام واقعات کی خبریں انگریزی ہی میں جمع کی جاتی ہیں حالانکہ مضافات میں کئی ایسے دل چسپ واقعات پیش آتے ہیں جو دیسی زبانوں ہی میں ادا ہو سکتے ہیں۔

(۳) ہر غیر انگریزی اخبار کو ایک دو تین مترجم رکھنے پڑتے ہیں۔ بضاعت کم ہو تو مترجم کم تنخواہ کے اور کم سواد ہوتے ہیں۔ اور خبروں کی ہیئت ناقص ہوتی ہے۔ علاوہ بریں ترجمے میں وقت صرف ہوتا ہے۔

ان نقائص کو رفع کرنے کے لیے نیز دیسی زبانوں کی عزت افزائی کے پیش نظر کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ نیوز ایجنسیاں اپنے کارسپانڈنٹوں سے خبریں دیسی زبانوں ہی میں منگائیں۔ اور انہی زبانوں میں اخبارات کو بھیج دیں۔ یعنی ایسوسی ایٹڈ پریس کا نامہ نگار رستم نگر (مثلاً) اپنے ہیڈ آفس کو خبر اردو میں بھیجے اور نیوز ایجنسی کا ہیڈ آفس آپ تک وہ خبر اردو ہی میں پہنچا دے جو آپ بعینہٖ یا انتخاب و اختصار کے بعد بغیر مترجم کی ضرورت پیش آنے کے اخبار میں چھاپ سکیں۔

اس سکیم میں آپ کو کوئی فائدہ یا سہولت نظر آتی ہے تو پھر دوسرا سوال یہ ہوگا کہ ایسی خبریں ٹیلی پرنٹر پر کیونکر بھیجی جائیں گی۔ اس کا جواب سوائے رومن رسم الخط کے اور کچھ نہیں۔ رومن حروف اور دیسی زبانوں کے حروف کی آپس میں پوری پوری تطبیق ممکن نہیں لیکن اس کی شاید ضرورت بھی نہیں۔ دیسی زبانیں بھی تھوڑی آسانی کے ساتھ رومن حروف میں منتقل کی جا سکتی ہیں۔ شاید کہیں کہیں ابہام رہ جائے لیکن سیاق و سباق اکثر ابہام کے رفع کرنے میں مدد دے گا۔ جہاں اس سے بھی کام نہ چلے وہاں شاید دقت ہو لیکن ابہامات کا خطرہ تو موجودہ سسٹم میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ بعض تراجم اصل سے بہت دور جا پڑتے ہیں۔

اس مسئلے پر آپ کی رائے سے مستفید ہونا چاہیے اور اگر ہو سکے تو ابھی کوئی فیصلہ عام طور پر ظاہر نہ ہو۔ سے ویسی اعتبار کس حد تک اس وقت یا بعد کالج مقدم رکھیں گے۔ ممکن ہے یہ خط پہلے ہی آپ کے زیر غور رہ چکا ہو اور آپ اس کے نشیب و فراز پر دماغ سوزی کر چکے ہوں۔ لیکن اس پر ترقی کے بہت سے مقامات نظر آئے۔ اس لئے آپ کی خدمت میں جرأت کی کہ آپ کی رائے دریافت کروں۔ جواب کا منتظر

بندہ خاکسار

بخاری

---

(۱۹)

برادر محترم۔ گرامی نامہ پہنچا۔

میاں صاحب کی معاملہ فہمی اور آپ کی معاملہ فہمی کی بدولت خاطر خواہ فیصلہ ہو گیا۔ کل میکلیگن کے نام چیف سیکرٹری کا خط پہنچا کہ پرنسپل کا عہدہ یکم مارچ سے خالی ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ اسی وقت سبکدوش کر دیا جائے۔ چیف سیکرٹری کا ایک نجی خط اور میاں صاحب کے ٹیلیفون سے معلوم ہوا کہ ڈکسن یکم مارچ سے رخصت لے گا۔ میرا ارادہ اب یہ ہے کہ جنوری فروری دو مہینے کی چھٹی لے لوں۔ بہرحال دسمبر کے آخر تک قطعی طور پر اس عہدے سے فارغ ہو جاؤں گا۔

آپ کی نمک دردی کا شکریہ۔ درست وہ ہے جو کہ . . . اگر اس مصرعے کے مطابق جو اس کے جو معنے نکلتے ہیں۔ ان کے مطابق دکھنے کے کیا معنی ہوئے؟ اور پکڑ دھکڑ پیش کر سکتے ہیں۔ ایک نسخہ فتنہ یہ ہے کہ درست وہ ہے جو کہ دھکڑ سے درست کر۔

ٹاٹا۔ انگریزی روزمرہ میں رخصت کے وقت ٹاٹا کہتے ہیں۔ جس کے معنی گڈ بائی کے ہیں۔ یار لوگوں نے تجویز کیا ہے کہ چونکہ دہلی کے ارباب اقتدار پانچ کل کے سرمایہ دار سمجھے جاتے ہیں۔ اس لئے دہلی میں جس طرح السلام علیکم کے جواب میں وعلیکم السلام کہا جاتا ہے اسی طرح ٹاٹا کے جواب میں کہیے برلا۔ دنیا برلا جائے۔ جو لوگ دیندار ہندو ہیں اور جے رام جی کی وغیرہ کہتے ہیں، انہیں چاہئے۔ اب سری رام (یعنی سر شری رام، مالک دہلی کلاتھ مل) کہا کریں۔ غصے کے اظہار کے لئے موزوں ترین لفظ "ڈالمیا" ہے اور اسے "قومی" ماٹو بنا لینا چاہیے۔ جالے ڈالمیا۔

نومبر کے تیسرے ہفتے میں لاہور سے دہلی سے چکنے کا ارادہ ہے۔ ملاقات ضرور ہوگی۔ سنتا ہے امتیاز لاہور واپس آ گیا ہے۔ نہ خط لکھتا ہے نہ ملتا ہے۔ دہلی سے شمال جنوب کو گزر جاتا ہے اور ہم سے نہیں ملتا۔ جیسے عصمت بچائے پھرتا ہو۔ ملے تو ڈنڈے ہوں گے۔

خاکسار

بخاری

---

(۲۰)

برادر محترم۔ گرامی نامہ ملا۔ آپ نے جو زحمت اٹھائی اس کے لئے آپ کا ممنون ہوں۔ حالات سے آگاہی ہوئی۔ مجھے میاں صاحب کے دلی منشا کا علم نہ

تھا کہ یہ بالکل بے تکلفی ہی ہے کہ ہم یہاں اکٹھے ہوں گے۔ ممکن ہے اور میاں صاحب دونوں کا سفر ایک ہی وقت سے متعلق ہو۔ بہرحال میں میاں صاحب سے بھی مل لوں گا۔ اور آپ کو ہر بات سے مطلع رکھوں گا۔

زبیدہ نے آپ کا خط پڑھا۔ امید ہے کہ آپ کے بچوں کو دعائیں دیں۔ مجھے تو سالک صاحب نے اس خط میں ادبی چہل پہل کا شمول نہیں کیا۔ میں نے کہا میرا خط بالکل [illegible] تھا۔ اس کا کیا جواب ضروری تھا۔ باقی حساب دوستاں در دل۔ بہرحال خوش ہیں کہ لاہور واپس آنے کے خیال سے زندگی میں ابھی سے تھوڑی کتنی تازگی پیدا ہو گئی ہے۔ جانتا ہوں کہ اس سال کا عرصہ اپنی طبیعت میں اور معاملات میں کئی ایسی تبدیلیاں پیدا کرتا ہے جن سے وہ پہلے آشنا نہ ہو سکے۔ بایں ہمہ کئی مرتبہ اور کئی موقعوں پر دل کو ٹٹول کر دیکھ لیا ہے۔ وہ سب نشیب و فراز دیکھے۔ کئی تلخیاں چکھیں اور کئی غلطیاں کیں۔ اس کے بعد بار بار اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ سہ دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است۔ صراحی مے ناب و سفینہ غزل است۔ وطن میں جو وقت تھے وہ سب [illegible] جنگ ہی نہ جانے کب ختم ہو۔ اتنا ہی بھروسہ کی کمی ختم ہو لیکن ایک سال ہے جس کا حسن [illegible] طرح بقول شکسپیر کے زمانہ سے زوال پذیر نہیں ہوتا۔ پہلے بعد اگر کسی شخص کا نام ہے تو وہ آپ ہیں۔ یہ سب کچھ کر ایک بار پھر آپ کی طولانی صحبتیں نصیب ہوں گی۔ اور فراغت بے خلل ہو گی۔ طبیعت میں ایک ہیجان سا پیدا ہو رہا ہے۔ بہت تھک گیا ہوں۔ کئی سال سے کوئی چھٹی نصیب نہیں ہوئی۔ آپ جن سے ملاقاتیں ہوں گے آزادی و خوشی بے خلل ہو گی۔ اور اگر خوشی بے خلل اس دنیا میں کسی کو نصیب نہیں۔ تو بہرحال اس کے قریب ترین کیفیت جو نصیب ہو سکتی ہے وہ ہمیں لاہور ہی میں ہو گی۔ جذباتی سی باتیں ہیں۔ لیکن اصل ضروری نہیں۔ ان باتوں پر میں نے بہت کچھ دماغ سوزی کی ہے کوئی ادبیات عالم میں ہی تسلی سے ملتی ہے گا۔

والسلام

بخاری

۳ر اکتوبر

(۲۱)

۵ر جنوری

برادر محترم میں نے ایک خط آپ کو لکھا تھا۔ اُس خط کے بعد رات میرے یہاں ایک طرحی مشاعرہ منعقد ہوا جس میں ان کے علاوہ آغا حمید، حفیظ، فیض، راشد، حسرت، عباس، حمید ملک سب موجود تھے۔ میں نے سب کو ایک طرح کا مصرعہ دے رکھا تھا کہ غزلیں وہیں کہی جائیں گی بد گمانوں پر۔ شرط تھی کہ ہر ایک چند شعر اس طرح پر موزوں کر لائے۔ چنانچہ سب نے حق ادا کیا۔ میں نے اور آغا حمید نے بھی طبع آزمائی کی۔ جب اس طرح شیطان جمع ہوں تو غزل بھی کچھ تھی بڑا بھی بن گیا۔ اور دونوں استادوں میں خوب خوب شور ہوئے۔ اس طرحی مشاعرے کے بعد سنجیدہ شاعری کی طرف رجوع ہوئے۔ راشد، تاثیر، حفیظ اور فیض نے اپنا تازہ کلام سنایا۔ پھر خوش گپیاں ہوئیں، بحثیں ہوئیں۔ رات کے ڈھائی بجے محفل برخاست ہوا اور میں دور دور رہنے والوں کو موٹر پر گھر پہنچا کر سوا چار بجے خود گھر پہنچا۔

ممکن نہ تھا کہ یہ سب لوگ جمع ہوں اور آپ کا ذکر ایک مرتبہ نہیں ہزار بار نہ ہوا ہو۔ جب یہ خبر تھی کہ آپ وسط جنوری کے لگ بھگ آ رہے ہیں تو سب مصر ہیں کہ آپ کے آنے پر پھر ایک ایسا مجمع اور ایک ایسا مشاعرہ ہو۔ طرح تجویز ہوئی کہ "وہ کون سی زمیں ہے جہاں آسماں نہیں" (قافیہ جہاں، آسماں) اور مجھ سے کہا گیا کہ سالک صاحب کو مطلع کروں تاکہ وہ اس طرح پر غزل ہر دو دن تھکا دیں۔ اور تیاری کی تاکید کی جائے۔ تاکہ ملاقات پر کام بنایا جائے آپ کے آنے

تک تاثیر نہیں ہوں گے۔ ذوالفقار نامہ اور اس کے بعد ازاں بھی جا رہے ہیں لیکن ممکن ہے وہ بھی اس وقت تک نہ ملیں

اس طرح پر آپ کو بہت زمانی فرصت مل جائے گی۔ ورنہ سب کا ایسی ہو گی۔ امید ہے کہ نظر انداز کیجئے۔ ورنہ ڈائری کے علاوہ صدمہ ہو گا۔ آپ کو فرصت ممکن ہو کہ ہو۔ لیکن یہاں بھی ایک تاثر چھوڑ گیا [illegible] فرصت میں آپ کہیں کیا [illegible] ہے

اور کہنے اور کہنے کی رنجش فرما تھے۔ ایک اور دن کا قیام ہمارے ہیں [illegible] کا مرتکب کی زحمت گوارا فرمائیے۔ وہاں سے اپنی ناک کا ریبار ڈیکھو کر سیج دیجئے۔ ہمیں نیاز مند [illegible] گذشتہ ۱۴ آپ ایسی ہی تو اس طرح گزریں۔ [illegible] کرسی کر بیٹھنا بھی نصیب نہ ہو دن ہو [illegible] معاش کے محفل میں گرفتار ہے۔ جب تک ایک [illegible] نہ ہوں [illegible] کی تسلی ہو۔ رکھئے کہ آپ کے لئے ناشتہ آدھی شام [illegible] بے قدر ہوگی نیوں کو ۹ بجے کے قریب گاڑی جاتی ہے۔ مکان اسٹیشن سے ۱ میل ہے۔ کھانے آپ روانہ کریں [illegible] شام کو بھیجے حساب میں شمار نہ کیجئے۔ خاکسار

بخاری

۱۴ تغلق روڈ، نئی دہلی

۱۱ جنوری

۲۲

۲ جنوری

برادرم محترم، سلام مسنون۔ گرامی نامہ ملا۔ معاہدے سے متعلق روک تھام کی مساعی ابھی تک جاری ہیں۔ ادارہ میں بہت کچھ ردوبدل ہو رہا ہے۔ اگر ہمارے بزرگوں نے نہایت سے کام لیا اور لوجہ اللہ [illegible] کا اظہار کیا تو ممکن ہے بلا کسی حد تک ٹل جائے۔ کیونکہ یہاں تو معاملہ بعض بحث کا بحث سے ہے ابھی تک کل فیصلہ نہیں ہوا ہے دونوں طرف سے کچھ حد تک اخلاق کا اظہار ہوا ہے۔ خدا کرے اخلاق بعض ہماری طرف سے اور بعض ان کی طرف سے نہ ہو۔ اس میں کچھ شبہ کی گنجائش ہے۔ اس لئے ابھی مطلع صاف نہیں ہوا۔ نتیجے کے متعلق اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ تاخیر ہو رہی ہے۔ لیکن بہرحال اپنی تیاری مکمل کر لینی چاہئے۔ مجھے نتیجے کے متعلق کچھ ایسا حسن ظن نہیں۔ یہاں پاپائے اردو سے بھی چند در چند مشورے ہوئے ہیں۔ اگر خدانخواستہ معاملہ حسب منشاء طے نہ ہوا تو وہ علاوہ یہاں کام کرنے کے زمانہ بعد بھی آئیں گے اور ان کی مخالفت کر کے [illegible] سے آگاہ کریں گے۔ اور لائحہ عمل کے متعلق مشورہ دیں گے۔ اس پہلو کو تیار کر لیا گیا ہے۔

میرے بائیں ران میں عرصے سے ایک مسا نکلا ہوا تھا۔ بڑھتے بڑھتے پون انچ کے قریب ہو گیا اور اس کی بیخ بھی گری پون انچ کے برابر ہو گئی۔ مدت سے ارادہ تھا کہ اسے کٹوا ڈالوں۔ "کھٹمل" ہونے کی وجہ سے تکلیف دینے لگا تھا۔ مصروفیتوں نے مہلت نہ دی۔ اب رخصت لی ہے تو یہ خرخشہ بھی پاک ہو گیا۔ کاٹنے کے بعد دو تین ٹانکے لگانے پڑے اس لئے نرسنگ ہوم میں چلا گیا۔ وہاں پانچ چھ دن ڈریسنگ روم میں فرصت اور یکسوئی کے گذارے۔ پھر واپس آ گیا۔ کوئی تشویش کی بات نہیں۔ جو مضمون گزشتہ کل تھا اس کا معائنہ کرا لیا ہے۔ شبہ ہے کہ سرطان نہ ہو۔ ڈاکٹر اس شبہے پر ہنستے ہیں لیکن دودھ کا جلا ہوں۔ اس لئے احتیاط کر رہا ہوں۔ سمجھتا تھا کہ رخصت کے ایام میں برسوں سے جو کام معرض التوا میں پڑے ہوئے تھے ان کو نبٹانے کی کوشش کروں گا۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ اس دوران [illegible]

[illegible]۔

یہ بڑی [illegible] اور بیہودہ [illegible] قدر نعمت ہوتی ہے [illegible] کا شوق [illegible] آج [illegible] گئے ہیں۔
ان کو پڑھنے کی کوشش [illegible] پڑھ چکا ہوں [illegible] پہنچ گیا [illegible] شعر [illegible]
[illegible] ایک تنہائی [illegible] دوستوں کی محبت [illegible] احباب [illegible]

والسلام

خاکسار

بخاری

۲۰ جنوری

---

(۲۳)

۸ اکتوبر

برادر محترم سلام مسنون

میری تقرری کی میعاد پانچ سال تھی۔ جو اپریل ۱۹۵۵ء کو ختم ہوگی۔ [illegible] کے مشورے سے یہ طے ہوا ہے کہ اسے مزید پانچ سال کے لیے بڑھا دیا جائے۔ اب پنجاب گورنمنٹ سے پوچھا جائے گا۔ ایک آدھ ہفتے کے اندر یہاں سے خط روانہ ہوگا۔ ٹھیک کس تاریخ کو وہ مکتوب ارسال ہوگا۔ یہ ابھی مجھے معلوم نہیں۔ جب معلوم ہوا تو آپ کو مزید اطلاع دوں گا۔ بہرحال ممکن ہے کہ کوئی [illegible] ہو، اور خط روانہ ہو جائے۔ پنجاب کے ارباب حل و عقد کا سنبھالنا اب آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ گو یقین نہیں کہ وہ معترض ہوں۔ میرے نائب [illegible] اصحاب [illegible] ایسا ہو [illegible] ضرور رکھنا چاہیے۔

دو ایک نکتے قابل غور ہیں۔ اول تو یہ کہ میرے جیسے شخص کے معاملے میں میعاد کا مقرر کرنا محض ایک اصولی اور تکنیکی بات ہوتی ہے [illegible] نہیں۔ مستقل سرکاری ملازم ہوں۔ [illegible] جن کا صوبوں سے [illegible] خاص قواعد و ضوابط سے منضبط کر دیا گیا ہے۔ میں خواہ پانچ سال کے لیے صوبوں سے باہر کام کروں۔ خواہ دس سال کے لیے۔ بہرحال اور ہر وقت [illegible] LIEN قائم رہتا ہے یعنی مرکز، صوبہ اور میں خود ہم تینوں میں جو جس وقت چاہے میری واپسی کا مطالبہ کر سکتا ہے اور اس کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ لہذا تقرری کی میعاد کا معین کرنا دراصل کچھ معنی نہیں رکھتا۔ بجز اس کے کہ اس سے سب متعلقہ لوگوں کے ذہن میں ایک اندازہ سا رہتا ہے علاوہ ازیں پنجاب میں میرا LIEN SUSPENDED ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ میری عدم موجودگی کی وجہ سے میری آسامی پر حکومت پنجاب کو کسی اور شخص کے مستقل کرنے میں کوئی امر مانع نہیں۔ مجھے مزید پانچ سال کا [illegible] حکومت پنجاب سے پوچھنے کے بعد کیا جائے گا۔

آپ اس معاملے میں کسی طرح سلسلہ جنبانی کریں گے یہ آپ پر چھوڑتا ہوں [illegible] آپ کی [illegible] سے لوگ یہ اندازہ لگائیں کہ کوئی بہت اہم بات ہے جس پر کھینچا تانی کا امکان ہے حالانکہ دراصل یہ صورت نہیں۔ اگر کہیں تذکرہ یہ بات ہو جائے اور کوئی اس پر [illegible] کے دوران میں نگاہ رکھے تو مفید ہوگا۔

میں آج P.E.N کانفرنس میں شامل ہونے کے لیے جا رہا ہوں جہاں "THE URDU WRITERS OF OUR TIMES" پر ایک پیپر پڑھ رہا ہوں۔ دو تین دن ہوئے بمبئی سے واپس آیا ہوں وہاں امتیاز صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ امتیاز کو [illegible] فلم [illegible] کسی چیز کا شوق معلوم ہوتا ہے نہیں [illegible] اس سے کچھ [illegible] وہاں یہ خیال آیا کہ آپ کو بھی [illegible] سے بمبئی جانا چاہیے۔ وہاں آج کل [illegible] ہیں۔ آپ کا

باہم یقیناً ان کے پاس ہوگا۔ مرنے سے پہلے ایک دفعہ سمندر تو دیکھ لینا چاہیے کہ آپ اس سود و سودا میں زندہ رہ سکے۔ تاہم

خاکسار،
بخاری
۱۹ اکتوبر

---

(۲۴)

مکرم بھائی

برادر محترم، سلام مسنون۔ گرامی نامہ ملا میں بمبئی میں تھا۔ آپ کا خط ایسا ہی میرا منتظر رہا۔ اسی لئے جواب میں تاخیر ہوئی۔

انتخاب افکار و حوادث کے بارے میں شرمسار و نادم ہوں کچھ تساہل کچھ مصروفیت اور پریشانی۔ علاوہ بریں میں نے یہ کام توقع سے زیادہ محنت طلب اور دقت طلب پایا۔ آپ کی برہمی اور بے قراری حق بجانب۔ ۱۵ جولائی کی صبح کراچی جا رہا ہوں۔ تین چار دن ٹھہروں گا۔ تہیہ ہے کہ بعد از تکمیل کار ساتھ لیتا آؤں گا۔ یہ وعدہ بھی وفا نہ ہوا تو آپ مجھے صف و حلقۂ بگوشاں سے خارج قرار کریں گے کچھ اور ڈانٹ دیں گے۔ وہ میرے سر آنکھوں پر۔ کام تو یہ مجھے ہی کرنا ہے اور مزدوری کروں گا لیکن مذاق برطرف۔ اس مہینے میں یہ کام ضرور ختم ہو جائے گا۔ وما توفیقی الا باللہ۔

دو بکریاں جو آپ نے پال رکھی ہیں ان کے حالات سے بھی آگاہی ہوئی۔ میں انشاء اللہ ہر طرح سے خیال رکھوں گا۔

ا۔ب صاحب اپنے بارے میں غیر شعوری طور پر مبالغہ کرتے ہیں۔ جب عہدہ ہی عارضی ہے تو جو اس عہدے پر مقرر ہے وہ کیونکر مستقل ہو سکتا ہے اور عہدہ عارضی یوں ہے کہ ابھی اس کام کے مستقبل کا فیصلہ نہیں ہوا۔ ممکن ہے یہ کام رہے نہ رہے۔ ا۔ب کی قسم کے اہل علم کی ضرورت ہو یا کسی اور قسم کے آدمی کے سپرد یہ کام کیا جائے۔ یہ تمام معاملے فیصلے کے محتاج ہیں۔ اور اس فیصلے میں ابھی کچھ عرصہ لگے گا۔ اس دوران میں ا۔ب صاحب کا کام اکثر کمزور پایا گیا۔ اس میں کسی کی شرارت مضمر نہیں۔ کیونکہ ان کوتاہیوں کا علم خود براہ راست مجھ کو ہے تاہم ان کو ہم گھسیٹے چلے جاتے ہیں۔ اب یہ استدلال ان کا عجیب و غریب ہے۔ چونکہ مجھے برخاست نہیں کیا اس لئے میں مستقل ہونے کا حق دار ہوں۔ اگر چھٹی دی ہے تو وہ ہونی چاہیے یا وہ خواہ مخواہ ایذا طلبی کرتے رہتے ہیں۔ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا تو سیکھتے ہی نہیں۔ سفارش اور دستگیری کے عادی ہو چکے ہیں دوسروں کو ظالم اور بے انصاف اور اپنے آپ کو مظلوم اور ہمدردی کا مستحق سمجھتے رہتے ہیں۔ لہٰذا القرآن کی بصیرت کام نہیں دیتی۔ کبھی خدا کا شکر نہیں کرتے بلکہ شکایت ہی کرتے رہتے ہیں ایسے شخص کا مطمئن کرنا یا اس میں ہمت پیدا کرنا مشکل ہے کیونکہ ایسا شخص ہر وقت مدد کا طالب ہوتا ہے۔ اور جب تک زندگی اس کے لئے وقف نہ کی جائے وہ خوش نہیں ہوتا۔

باقی عند الملاقات۔ کیا آپ کو دہلی بلایا جائے؟ بے موقع؟

خاکسار
بخاری

(۲۵)

ستاروں پہ جو غزل کا نقشہ کریں۔

۱) کبھی وہ تھے محفل کا ستان محفل آرائی کہ ان کی خاک ان برباد یاں رونق ہیں صحرا کی

آپ محفل آرا کو دشت پیما کر دینا چاہتے ہیں۔ میرا مطلب یہ تھا کہ وہ عشق جو محفلوں کی زینت تھے۔ اب برباد ہو چکے لیکن عشق ان کی ذات میں ہے کہ جہاں جہاں ان کی خاک برباد ہوئی وہ محفل آرا ہیں۔ اسی لیے ان کے برباد ہونے سے صحرا کی رونق بن بیٹھے۔ دشت پیما سے معنی بدل جائیں گے۔ لیکن آپ کو اس تبدیلی کی ضرورت پیش آئی تو یقیناً اچھے ہوئے ہوں گے۔ اس میں بعض باتیں ایسی ہیں جو یعنی صاف ہو جائیں لہٰذا دشت پیما منظور۔ اس سے شعر کا مطلب دور ہو جائے گا

۲) . . . . . . چشمِ گل کی نمناکی

آپ فرماتے ہیں یہ شعر وضاحت طلب ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے اصلاح طلب نہیں۔ لہٰذا منظور۔

۳) کھلے سوتیا ـــــ منظور

۴) وہ میخانہ نہ ہے چشمِ ساقی میں ہے بیباکی

میں نے لکھا تھا وہ میخانہ نہ رہا تھا میں ساقی کی بیباکی۔ آپ فرماتے ہیں ایک ہے کی کمی ہے۔ آپ کی اصلاح مجھے منظور ہے گو میں اس بات کا ابھی قائل نہیں ہوا کہ ایک ہے کی کمی ہے۔ یہ تعقید با محاورہ ذہن میں آتے ہیں۔ جہاں ایسی شکل ہوتی ہے اور وہ ایک ہی استعمال ہوتا ہے۔ بہرحال اصلاح منظور۔

مختصر یہ کہ کلی اتفاق۔ اور بہتر بھی یہی ہے۔ وہ تو خوب ہی ہے (اتفاق ہو بھی)۔ آپ کی اصلاح سے متفق ہوں جب بھی اتنا ضروری ہے کہ آپ کے اعتراض سے ایسا قوی شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اتفاق کے بغیر چارہ نہیں رہتا (جس کو حسنِ اتفاق کہتے ہیں) بہرحال دماغ سوزی کا بہت شکریہ!

۳۰ جون سے (تاریخ یاد رہے) میں ۹ اشوکا روڈ۔ نئی دہلی جا رہا ہوں۔ انگریزی میں اس کو 9 ASOKA ROAD لکھتے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ اور امتیاز چند دن کے لیے آ جائیں۔ برسات جوبن پر ہے۔

او بھائی! ممتاز بخشو سنے گئے تھے ...... الخ ۔ مضمون کا معاملہ سنتے ہوئے یہ اسلامیات سہارا فروش بازیچہ ہے تو لکھئے کہ کیا مہر صاحب اور میاں صاحب کی گفتگو میرے سننے کے متعلق بھی ہوئی یا نہیں۔ اگر ہوئی تو کیا نتیجہ ہوا ہے۔ اس موضوع پر تو برسوں سے آپ نے کچھ لکھا ہوتا ہے۔

خاکسار

بخاری

---

(۲۶)

۱۰ پرتھوی راج روڈ، نئی دہلی

ہوالکبیر

محترم بھائی۔ گورنمنٹ کو اس سال کے بجٹ میں کچھ خسارہ نظر آتا ہے اس سے خالی آسامیوں کی بھرتی یک قلم روک دی گئی ہے۔ معلوم نہیں کہ کب بھرتی ہو گی۔ اس سلسلے مراسلت میں تاخیر ہوئی ہے۔ یہ جواب ہے آپ کے اس خط کا جو آپ نے لکھا تھا۔ [illegible] جواب سے آپ مایوس ہو گئے ہوں گے۔

پچھلے دنوں ابوالکلام سے ہم کلامی کا فخر حاصل ہوا۔ [illegible] آپ کا ذکر [illegible] بار آیا۔ مولانا [illegible] مرحوم کا ذکر بھی آیا اور [illegible] کا ذکر بھی آیا اور حمید علی صاحب کا ذکر بھی آیا۔ [illegible] علم و ادب و تاریخ پر ان کی بحثیں [illegible] شعر خوانیاں بند کر لیں ہوں۔ علامہ اقبال کی یاد تازہ ہو گئی۔ کیونکہ بجز اقبال اور ابوالکلام کے اور کوئی شخص ایسا نہ تھا۔ جو عالم اسلام اور اس کی فرنگیوں اور [illegible] کا آشفتہ [illegible] ہو۔ یہ نسل ہی اب ختم ہوتی جاتی ہے

اس خط کو دیکھتے ہی رائے بہادر [illegible] صاحب سے ملیے۔ ان سے پوچھیے کہ کوئی رکاوٹ تو نہیں۔ اگر ہو تو اس کا ازالہ کیجیے۔ تفصیلات آپ کو معلوم ہوں گی۔ ضرورت ہو تو حمید علی صاحب کو بھی شامل کر لیجیے

اب کے کرسمس میں پھر ایک چکر ہے۔ بشیر ہاشمی غالباً [illegible] کے سلسلے میں دہلی آئیں گے۔ میں بے امتیازی بحیثیت ڈیلیگیٹ کانفرنس کی [illegible] کے شوہر کے آ جائیں۔ آپ [illegible] کانفرنس کی ایک ڈیلیگیٹ کے شوہر کے دوست کی حیثیت سے آ جائیے۔

زبیدہ سلام کہتی ہے۔

خاکسار

بخاری

بمبئی انقلاب بھیج کر بے انتہا احسان کرتے ہو جس دن انقلاب نہ پہنچے دن خالی معلوم ہوتا ہے کل یہ عنوان نظر آیا

لاہور میں گداگروں کی اکثریت

[illegible] کی کمی ایسی ہی کچھ۔ مگر اس کے لیے سند موجود ہے۔ "قلت مال و کثرت عیال" مشہور فقرہ ہے

ابوالکلام نے شاد عظیم آبادی کا ایک شعر سنایا تھا آپ بھی سن لیجیے۔ خوب ہے۔

ہوں پہ دم ہے تڑپتے ہیں دل منتظر ترے
وہ اور کوئی نہیں عاشقاں چند ترے

بخاری

---

(۲۷)

۲۳ر دسمبر

برادر محترم۔ یاد آوری کا شکریہ۔ خط کے مضمون سے آگاہ ہوا۔ احساس کو ذہن میں محفوظ کیا۔ کام کی کثرت اور تنوع کی وجہ سے اکثر فردی فرائض [illegible] پڑے رہ گئے ہیں۔ اور جیسا کہتا رہا ہوں ان میں حتی الوسع دخل نہیں دیتا۔ تا آنکہ کوئی اہم نکتہ اس میں پوشیدہ نہ ہو۔ آپ نے جس امر کا ذکر کیا۔ وہ بھی اپنی جگہ درست

یہ شائع ہونے کے قابل نہیں ہے۔ اگر مجید صاحب دکھا دیں تو اچھا ہے۔ [illegible] لیجئے گا۔ ایک بات اور بھی کہنا ہے۔
بشیر ہمارے شعر کے متعلق جو آپ نے [illegible] کی تھی وہ جواب [illegible] تک پہنچی۔ یا کہیں رہ گئی
ایک [illegible] ہے۔ [illegible] کہ [illegible] کے [illegible] ہم لوگ اپنی [illegible]
بالکل بہتر۔

میں نے [illegible] کے خطوط [illegible] ہیں۔ [illegible] سب [illegible] ہیں اور [illegible]
ہم [illegible] ہے۔ جناب [illegible] کو سلام پہنچے۔ اور بالخصوص [illegible] صاحب، [illegible] صاحب اور [illegible] صاحب کو۔ [illegible] آپ [illegible] سلام کہتی ہیں۔
یہاں میرے بچے [illegible] اور بہت [illegible] ہیں لیکن دلی شہر [illegible] ہوا ہے۔ [illegible] بہت [illegible] ہے
دل [illegible] ہے۔ [illegible] ہر شخص [illegible] اور [illegible] ہے۔ میں [illegible] کے [illegible] کوشش کر رہا ہوں۔ [illegible]

سجاد

---

(۲۸)

HOTEL MARIACRISTINA
MAXICO D.F.

۱۰ جنوری

برادرم۔ نوازش نامہ ملا۔ آپ کے سوا کسی اور دوست کا خط اب تک نہیں آیا ہے۔ [illegible] فیض [illegible] سب نے گویا مجھے بھلا دیا۔ زبیدہ اور [illegible] کے خط مسلسل آتے رہتے ہیں۔ ان سے بالواسطہ کچھ احباب کا حال بھی معلوم ہوتا ہے۔ ادھر کے حالات سے تو باقاعدہ مطلع رہتا ہوں۔ ورنہ بالکل ہی [illegible] ہو کر رہ جاتا۔ سیاسی حالات سے باخبر نہیں۔ [illegible] احمد کراچی سے جو خط لکھتے ہیں ان سے دو چار ادبی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ادبی دنیا کی کوئی خبر نہیں۔ نہ معلوم کون سے رسالے بند ہو گئے اور کون سے نکل رہے ہیں۔ [illegible] کی کیفیت طاری ہے۔ کس کس شاعر نے غالب کے گرد پرواز کی۔ آپ نے "انقلاب" کا ایک ورق بھیج کر [illegible] ذکر [illegible] کرنے [illegible] آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔ میں لاہور میں [illegible] دوستوں کے اجتماع کا ایک [illegible] جاتا اور سب شاعر دوستوں سے غزل لکھواتا اور شب [illegible]۔ خیر۔ گرچہ دوریم بیاد تو قدح می نوشیم۔ "انقلاب" کے [illegible] حال پڑھ کر [illegible] معلوم ہو گیا۔ [illegible] بڑی [illegible] اور [illegible] حالات کے بعد آپ [illegible] سخت مرحلے پیش نہ آنے چاہئیں تھے۔ لیکن آپ نے اخبار کا نام ہی [illegible] معلوم ہوتا ہے [illegible] کے کچھ [illegible] ہے۔ بہرحال آپ [illegible] قلندر ہیں۔ اپنی قلندری کو کام میں لائیے۔

کانفرنس کچھ زیادہ تجربہ بازی تھی لیکن آنے کے ساتھ ہی معلوم ہو گیا کہ یہاں بھی سیاسی کھینچا تانی کا اکھاڑا ہے۔ جھوٹی لہریں [illegible] اس کے اندر کچھ نہیں۔ دو مہینے تک کانفرنس کا [illegible] ہے [illegible] اصل [illegible] ہونے چاہئیں۔ [illegible] کی تعداد کل (۱۰۰) ہے۔ [illegible] کے [illegible] ہیں۔ [illegible] تقریباً [illegible] ہر گھنٹے [illegible] ہیں۔ سب [illegible] سے ان کی [illegible] دیانت داری کی [illegible]۔ [illegible] پیدا [illegible] جا پہنچا۔ [illegible]

وہاں [illegible] اور بعض آدمیوں بجائے جرابوں سے کی [illegible] لڑ گئے۔ بیٹھے رہنے میں بیٹھے ہیں۔ یہ اندر [illegible] تقسیم کیوں کر ہو۔ رات دن لوگ اصول اصول پکارتے ہیں۔ اور اس پاسداری میں ہر ملک [illegible] ڈنکا پیٹا۔ اور ذرا حالی بیٹھنے کی کوشش کے بعد معلوم ہوا کہ اصولوں کی کمی نہیں بلکہ بھرمار ہے۔ ہر ملک اپنے اپنے مطلب کے اصول وضع کر لیتا ہے۔ مشکل یہ ہو گئی کہ اصول جن پر سب کا یا اکثریت کا اتفاق ہو، دستیاب نہیں ہو سکتے۔ وہاں اور اس کے بعد امریکہ کی ریاست ہائے متحدہ وہ بیچارے ہزار ہزار [illegible] کے PLAN ترتیب دے کر تشریف لے آئے۔ مگر [illegible] نے اپنے PLAN میں اپنے حواریوں کی مٹھیاں بھر بھر کر ہم [illegible] دیئے۔ امریکہ نے لاطینی امریکہ (یعنی جنوبی امریکہ کی ریاستوں) کو بڑی بڑی رقمیں دیں۔ غرضیکہ ہر ایک نے اپنا سیاسی اثر بڑھانے کی کوشش کی۔ جس مرحلے پر کانفرنس اس وقت ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں سودے ہوں گے۔

وفدِ پاکستان کی جانب بھی کسی سے سودا کرے۔ سو چاکر ہمارے پاس جو شخصیت ہے، اس میدان میں کچھ نہیں۔ خدا کا نام لے کر شروع ہی سے چھا جانے کی کوشش کی لیکن اس طرح کہ اصل مسئلے ہی پیچھے رہ گئے۔ جب یہاں آئے تو [illegible] بتانا پڑتا تھا کہ لوگ پاکستان سے بھی بے خبر تھے۔ خدا کی مہربانی سے پہلے ہی ہفتے کے اندر دو تین زوردار تقریروں کا موقع مل گیا۔ ساتھ ہی ساتھ میں نے ہسپانوی بھی سیکھنی شروع کر دی۔ کچھ بحث بازی میں کرتب دکھانے کا موقع پا کر بعض تقریروں کے زور سے ایک دن انگریزوں کو وہ شکست دی کہ [illegible] بہت سے زیادہ ووٹ حاصل نہ ہوئے۔ چنانچہ لوگوں کو خبریاں ہوا کہ بحث و تمحیص میں پاکستان کی دوستی مفید ہے۔ بہرحال اس کی دشمنی مضر ہو سکتی ہے۔ [illegible] سلیقہ بازی سے بھی کام لیا۔ ایک مزاحیہ نظم انگریزی میں کانفرنس کے بارے میں لکھی جو [illegible] کے رستے سے کانفرنس کے روزنامہ سرکاری اخبار میں چھپ گئی۔ اور لوگوں نے پاکستانیوں سے جو تعجب ہوتا [illegible] مسکرا کر مصافحے کرنا شروع کئے۔ ہندوستان والوں نے اپنا وفد محض انجینیروں سے مرتب کیا ہے۔ وہ لوگ [illegible] مالی صورت [illegible]۔ [illegible] انگریزی ہسپانوی لہجے میں بولتے ہیں جس پر ترجمان [illegible] سکتے ہیں۔ اور خود بھی [illegible] ہسپانوی بلا تکلف [illegible] اخبار وغیرہ پڑھتے ہیں تو [illegible] وقت سب [illegible] ہے کہ [illegible] تقریر ہسپانوی میں کروں گا۔ میری اس [illegible] دوستی پر جنوبی امریکہ کے [illegible] لوگ بہت خوش ہیں۔ [illegible] سب [illegible] استعمال کر رہا ہوں۔ [illegible] پہلے سے بھی [illegible] پاکستانی ہو جائے۔ یہی کیفیت ہماری ہے [illegible] آخری مرحلوں میں ہیں [illegible] ہو۔ اور دو تین مہینے کی محنت کہیں ٹھکانے لگے۔ کانفرنس کا کام توقع سے بہت زیادہ نکلا۔ اجلاس صبح دس بجے سے شام سات بجے تک اور بعض اوقات رات کے دس بجے تک رہتے ہیں۔ ایک دن تو صبح کے دو بج گئے۔ سوائے سنیچر کے آدھے دن، اور اتوار کے کوئی تعطیل نہیں ہوتی اور [illegible] اوقات [illegible] کی سازشوں اور مشوروں میں صرف ہو جاتی ہیں۔ کانفرنس کی دستاویزات کا بھی باقاعدہ مطالعہ کرنا پڑتا ہے اور ان کی تعداد اس وقت تک چھ سات ہزار صفحوں تک پہنچ چکی ہے۔ انجینیر یا [illegible] کے مسئلے بھی کہنے پڑتے ہیں۔ ریڈیو کی تعلیم جو دس سال میں حاصل کی ہے وہ ایسے وقت میں کام آتی ہے۔ تاہم بعض باتیں بچوں کی طرح بیٹھ کر سمجھنی پڑتی ہیں۔ آپ خوش ہوں گے کہ میں کئی مرتبہ باتفاق رائے صدر منتخب ہو چکا ہوں۔ اور چند طبقوں کے مشوروں [illegible] خاص طور پر بلایا جاتا ہے۔

میکسیکو بھی عجیب ملک ہے [illegible] پہاڑی ملک ہے آب و ہوا خوشگوار ہے۔ لوگ رنگین طبع، بااخلاق، رنگین پوش ہیں۔ پابندیٔ اوقات کو رذیلوں کا شیوہ سمجھتے ہیں۔ موسیقی اور ناچ اور سواری کے بے حد شوقین ہیں۔ [illegible] کانفرنس کا افتتاح [illegible] ہوا [illegible] میں آپ، جناب، حضور وغیرہ کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ ناممکن ہے کہ رذیل سے رذیل آدمی آپ کا شکریہ شاعرانہ ادا نہ کرے۔ اور آپ شکریہ ادا کریں تو انکسار کے دو تین فقرے جواب میں نہ کہے۔ یہاں کثرت اصلی باشندوں کی ہے۔ ان سے کم دوغلے لوگ ہیں۔ اور اصل خالص ہسپانوی نژاد لوگ اقلیت میں ہیں۔ پچاس [illegible] سال سے یہاں ایک نئی نیشنلزم پروان [illegible] رہی ہے۔ جو اپنے آپ کو [illegible] میکسیکو سے وابستہ کرتی ہے۔ اور ہسپانیہ کو بہت نفرت سے [illegible] ہے۔ چنانچہ ہسپانوی اقتدار کی دو تین صدیاں جو میکسیکو پر گذری تھیں انہیں تاریخ سے [illegible] کیا جاتا ہے اور موجودہ [illegible] سلسلہ قبل از ہسپانیہ دور سے ملایا جاتا ہے جب یہاں کے اصل باشندے برسر اقتدار تھے اور ان کی ایک

عظیم الشان سلطنت اور تہذیب تھی۔ اور ہسپانوی پیشرو سے اگر ان کو نسبت نہیں رہی تاہم بلکہ شہر کی آبادی تقریباً بیس لاکھ ہے اور سب سے منظم شہر ہے گلیاں بازار کوچے کئی عجیب باتیں نظر آتی ہیں۔ پچھلے ہفتے یہاں تیس سال کا جشن تھا۔ جس میں جلسے جلوس ہو گئے۔ اب یہاں Republic ہے۔ دیو ناموں کی تعمیر کا بہت شوق ہے۔ اور ملک نے نئی ترقی دیے ہیں جو کام کیا ہے اس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ وزیر تعلیم پاکستان سے مجھے ملاقات کا موقع ملا۔ اس پر ایک رپورٹ لکھا تھا میں نے بہت سے سال اس پر خرچ کیا اور اس کے خیال انگریز پالیسی کے ایک نئے خواہ انگریزی ہو خواہ اردو خواہ دونوں زبانوں میں پاکستان کی خاطر لکھنے کا عزم ارادہ کر لیا لیکن کانفرنس کی وجہ سے فرصت بہت کم ملی۔ وزیر تعلیم اور اس کے افسروں سے تبادلۂ خیالات کے لئے کئی مرتبہ وقت مقرر کیا اور اکثر وعدہ ایفا نہ کر سکا۔

دنیا بھر میں کئی دلچسپ خط تھے۔ اگر دوستوں کے خط اس کے محرک ہوتے ہیں تو کس کی ملاقات بہت کم رہا۔ مولانا نصیب ہوئی۔ آ سہیل انتظاری غائب آئی۔ فرصت بھی بہت کم ملتی ہے۔ تاہم آپ لوگ آ سکتے تو تحفہ کے طور پر یہاں کے بازار کا نظارہ دکھاتا۔

دوستوں کو میرا سلام دیجئے گا۔

خاکسار

بخاری

---

(۲۹)

HOTEL MARIA CRISTINA,
MEXICO. D. F.

یکم اپریل

برادر محترم سلام مسنون۔ آپ کا تیسرا خط ملا یعنی جس خط کے متعلق آپ کو شبہ تھا وہ بھی مل گیا تھا۔ جواب نہ لکھنے کا وہم نہیں، فرصت ہی نہ ملی۔ نیز فرصت کے جو چند لمحے ملتے ہیں اس میں اتنے خط لکھنے پڑتے ہیں کہ سب سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ نعوذ باللہ، زبیدہ، سرکار پاکستان، بعض تاثیر سب کو خط لکھے کسی کو صرف ایک اور کسی کو مثلاً سرکار پاکستان کو ہر ہفتے اور بعض اوقات اس سے بھی زیادہ۔ یہاں موسم بدل گیا ہے اپریل میں وہ حال ہے جو ہمارے ہاں مارچ کے اوائل میں ہوتا ہے۔ آنکھیں دھوپ سے گریز کرنے لگی ہیں۔ اور کوٹ پہننے کو دل نہیں چاہتا۔ کانفرنس آخری مرحلے پر ہے۔ لوگ تھک کر چور ہو گئے ہیں۔ اس سے پہلے میں یا تو چرچا اپنی دکھاتے تھے یا ہتھیار ڈال دیتے ہیں لیکن جو آدمی منجھے ہیں۔ وہ اب بھی خم نہیں آنے دیتے۔ اور آنکھ تک نہیں جھپکتی۔ ہمارا کام خدا کے فضل سے بہت ہی ٹھیک رہا ہے۔ دو تین دن ہوئے یہ طے پایا کہ یہاں کی کانفرنس عنقریب ختم کر دی جائے کیونکہ اصول وغیرہ طے ہو چکے ہیں۔ باقی اصل پلان سازی کا کام جو تفصیل کا ہے اور جس میں کم از کم چھ مہینے اور شاید لگے ایک مختصر سی کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے جو اکتوبر تک پیرس میں بیٹھا ہو جب چار پانچ چھ مہینے میں وہ اپنا کام ختم کرے تو کانفرنس پھر بیٹھے مگر صرف چند دن کے لئے۔ اور پلان کمیٹی کے کام پر نظر ڈال کر معاہدے پر دستخط کر دیئے جائیں۔ اس پلان کمیٹی میں شامل ہونے کے لئے ہر ملک نے ہاتھ پاؤں مارے۔ بڑی جتھہ بندیاں ہوئیں۔ سودے ہوئے۔ رعب گانٹھے گئے۔ تقریریں ہوئیں، آنکھیں دکھائی گئیں۔ غرض اعلیٰ سے اعلیٰ ہتھکنڈے سیاست کے سب حربے استعمال ہوئے۔ خدا نے یہ معجزہ دکھایا کہ جب ستر ملکوں میں سے صرف پندرہ ملکوں کی ایک کمیٹی بنی تو اس میں پاکستان کو شامل پایا۔ یہ

تھا۔ ایک دو ہفتے کے لمبے اجلاس کی گھنٹوں کی ایسی گرم بحث اور تقریروں کے بعد ہوا۔ جب لمبے اجلاس میں گھر واپس آیا۔ تو عجیب اطمینان اور مسرت کی کیفیت تھی یا نا خوش اور دیر تک بیٹھا رہا۔ اور یہ ہفتوں کی آپ کے سوا کسی آواز ستائی نہ دیتی تھی جب ۲۴ اکتوبر کو ہم یہاں پہنچے تھے تو کوئی بھی جانتا نہ تھا پاکستان کے نام سے بھی لوگ ناواقف تھے سترہ ملکوں میں سے سب سے نئی قوم۔ سترہ ملکوں میں سے سب سے نئے تجربہ کا ملک۔ ڈرانسیٹر یاں بہت کمیں سال بخیر۔ ریڈیو کی صدا میں کوئی حیثیت ہی نہیں۔ لیکن پانچ مہینے کے عرصے میں پاکستان کا فیصلہ یہ بات ہی کہ ہم کمیٹی اور اہم ممبر ہے اس کی حیثیت صدیا نائب صدر کی ہوتی تھی۔ احباب جب کانفرنس نے دنیا بھر کی ایک مختصر کمیٹی بنائی ہے تو اس میں ہم پاکستان کی طرف سے وہاں ہے کہ کسی کو اس کے حق عضویت پر شبہ کرنے کا خیال تک نہیں آیا۔ وزارت تعلیم پاکستان کا ارشاد ہے کہ کانفرنس کے بعد کچھ وقت میکسیکو اور میکسیکو کے نظام تعلیم کا مطالعہ کر کے اس پر ایک رپورٹ لکھوں۔ یہاں کے لوگ بھی ہماری طرح ناہموار اور ان پڑھ تھے میکسیکو کی انقلابی جماعت نے برسر اقتدار آتے ہی تعلیم کے میدان میں حیرت انگیز کام کیا کہ تمام دنیا انگشت بدنداں ہوئی۔ اس لئے یہاں کا مطالعہ ہمارے لئے بہت مفید ہوگا۔ نہ معلوم اس کام کے لئے سرکار کتنی میعاد مجھے مقرر کرتی ہے اس لئے آنے میں اب کچھ تاخیر ہوگی۔ بہر حال سالوں کی تاریخ نہیں۔ جیتوں کی وہ بھی ابھی پوری طرح طے نہیں ہوا۔ دیکھئے پہلے لوگ پاکستان کو ہندوستان کا شاگرد اور پیرو سمجھتے تھے اور جب بھی انتخاب کی نوبت آتی تو لوگ کہتے کہ پاکستان اور ہندوستان دونوں میں سے صرف ایک کا ہونا کافی ہے رفتہ رفتہ لوگوں نے محسوس کیا کہ پاکستان ہندوستان کا چھوٹا بھائی نہیں۔ تمام مسلم ممالک کا بڑا بھائی ہے۔ پھر اس کے بعد یہاں تک نوبت آئی کہ لوگ ہندوستان کے ساتھ پاکستان کا ہونا از حد ضروری سمجھنے لگے اب آئندہ خدا کے فضل سے کم از کم یونیسکو کے بین الاقوامی میدان میں پاکستان کی کرسی ہمیشہ صف اول میں رہے گی۔ ہم پاکستانیوں نے اس پر ایک جشن منایا اور سب آبدیدہ ہو گئے۔

خاکسار

بخاری

۳۰

یکم جولائی سنہ ۱۹۵۱ء

برادر محترم۔ آپ کے خط سے بڑی ندامت ہوئی۔ جب آپ کا خیال آتا تھا تو شرم کے مارے گھبرا کر ہاتھ پاؤں سرد ہو جاتے تھے لیکن یقین مانیے کہ اپنی خاموشی کی سزا بھی سب سے زیادہ مجھ ہی کو ملتی رہی۔ احباب بعید تر ہوتے گئے اور میری تنہائی بڑھتی گئی۔ بہنوں کی غفلت کے بعد کسی کو خط لکھا بھی تو جواب نہ آیا۔ کیونکہ وہاں تو محبت کا چشمہ اس عرصے میں خشک ہو چکا تھا۔ یہ ندامت اور تنہائی کا صدمہ بھی نہ ملا لیکن سالک کی وفا شعاری ہمیشہ استحقاق سے تجاوز کر جاتی ہے۔ خدا آپ کو زندہ و سلامت اور خوش و خرم رکھے۔ آئین دوستی آپ ہی کے دم سے زندہ ہے۔ ورنہ دوستی بائیں النفیس مر رہی ہیں اور جو نہیں مریں وہ زندہ درگور ہیں ـــ

جولائی سنہ ۱۹۵۱ء میں یہاں پہنچا تو ذیابیطس کا شکر اپنے ساتھ لایا۔ کئی ہفتے رضانہ پیشاب کا مطالعہ کرتا رہا۔ اور زندگی کے باقی اوراق سب تہ کر کے رکھ دیے کہ شفائے شافی ہو لے۔ تو زندگی کا دعا مانگ کر ٹھیک سے جینے لگا لیکن جب تک اس میں شکر شامل ہے باقی شیرینیاں حرام ہیں۔ چینی کی پیالیاں اور قطرہ پیالیاں۔ دن رات اسی قسم کے "شیشہ آلات" کی نذر ہو گئے۔ اس عرصے میں علاج کی کوشش رہی۔ یہ بعد دیگرے دو اپارٹمنٹ بسنے۔ دو ڈاکٹروں نے یقین ہو گیا کہ اپارٹمنٹ میں رہنا ہم بیماروں کے لئے ممکن ہوگا۔ ایک بیمار کی حالت اس جنون کی سی ہے۔ کوئی پھر لے کر کوئی بھاگے۔

جو جاپانی عقل اور جاپانی [illegible] ایک بلڈنگ میں چودھویں منزل پر رہتا تھا۔ کئی مرتبہ خیال آیا کہ [illegible] واقعی بڑے لطف کی بات ہے کہ جس شخص کو [illegible] تو صرف [illegible] جس دن [illegible] چودھویں منزل تک چڑھا چلا جاتا تھا اور وہاں پہنچ کر اس کا سارا دم نکل جاتا تھا اور اسے [illegible] بھی [illegible] بلی دیا گیا تھا۔ اب سمجھ لیجئے کہ [illegible] ہے۔ [illegible] اس خیال سے ایک وحشت ہوتی تھی۔ [illegible] کہ اس کے مرجانے پر کچھ غلط ہوا۔ [illegible] سب پر آتا تھا کہ [illegible] مفقود [illegible] چاروں طرف تاریکی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ یہاں آکے معلوم ہوا کہ ہم لوگوں کی زندگی عبادت کی حد تک عادی ہے۔ اس عرصے میں [illegible] ہمیشہ باہر کھاتا تھا۔ صبح کے ناشتے کے چائے خود بنانے میں مہارت حاصل کرلی۔ لیکن روز بازار سے ہر چیز [illegible] کے منہ اٹھا کر دوڑنے پڑتے تھے اس لیے کبھی مہارت حاصل نہ ہوئی۔ جیسے مجھے آپ پر ترس آتا تھا کہ اللہ اللہ [illegible] دن کی بات ہے۔ [illegible] وغیرہ چنانچہ زندگی استعجاب اور اضطراب کا مجموعہ تھی۔

ستمبر ۱۹۵۰ء میں مکان کرایہ پہ لے لیا۔ ایک حبشی کو ملازم رکھ لیا۔ لیکن ساتھ ہی جنرل اسمبلی کا زمانہ آ گیا۔ ڈیلیگیشن کا قافلہ پاکستان سے آن پہنچا۔ رات تو شہر میں گزرتی تھی لیکن صبح نو بجے سے شام کے سات آٹھ بجے تک لیک سکسیس میں رہتے تھے جو یہاں سے بیس میل کے فاصلے پر ہے۔ دن کو ڈیلیگیشن نو بجے وقت سے شروع ہوتا تھا کیونکہ ظفر اللہ خاں صاحب جو یہاں سے اور بھی تیس میل دور رہتے تھے باوجود اس فاصلے کے نو بجے سب سے پہلے آن پہنچتے تھے۔ ہم شب زندہ دار ٹھہرے۔ کچھ نہ پوچھئے کہ دنیا و عاقبت دونوں میں سرخروئی حاصل کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارا یہ حال تھا کہ رات پی زمزم پہ مے اور صبحدم دھوئے دھبے جامۂ احرام کے۔ اسمبلی ختم ہوئی تو کشمیر کا شعلہ پھر بھڑکنے لگا۔ اسمبلی کے ڈیلیگیٹ اسمبلی ختم کرنے کے بعد اور موٹروں اور دیگر چیزوں کا سودا چکانے کے بعد پاکستان لوٹے۔ تو محمد علی اور ان کا قافلہ آ پہنچا۔ وہ گئے تو ڈاکٹر گراہم کا تصفیہ لٹکا چھوڑ گئے۔ خدا خدا کر کے پچھلے ہفتے گراہم یہاں سے روانہ ہوئے تو پہلی مرتبہ اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن یہ بھی کب تک۔ رات دن چکر میں ہیں سات آسمان۔

رفتہ رفتہ نئی زندگی کا عادی ہو گیا ہوں۔ جب میں یہاں پہنچا تو دفتر کو (اپنے معیار کے مطابق) مردہ پایا۔ اس سے متقدمین کی گستاخی یا مذمت مقصود نہیں۔ ہر طبیعت کا تقاضا الگ ہوتا ہے۔ میری طبیعت ایسی ہے کہ بے حسی سے کام کر ہی نہیں سکتا۔ [illegible] ہے تو کہتا ہوں کہ عادت فریبی سے محروم ہوں۔ اور محو طاری ہو رہا ہے۔ یہاں حالت یہ تھی کہ یو این کا فیصلہ کراچی پہنچا دیا۔ کراچی کے کہنے پر ووٹ دے دیا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ مشن محض ایک ڈاکخانہ بن کر رہ گیا ہے۔ "کار ما نخاص" "بجز ہرکارہ کے کچھ نہ تھا" کام پھیلایا۔ تو خود اس کا بوجھ میرے کندھوں پر پڑا۔ اپنی وقت پسندی کی شکایت کس سے کروں۔ یہاں کا کام وقت بہت زیادہ مانگتا ہے۔ ساٹھ ملکوں کے ساٹھ وفد۔ ہر ایک کا ووٹ کسی نہ کسی موقعے پر اہم بن جاتا ہے۔ سفارتی گفت و شنید بہت سست رفتار ہوتی ہے۔ ساٹھ وفدوں میں سے ہر ایک کو سلام کیجئے۔ مناسب وقفے کے بعد خیریت دریافت کیجئے۔ بیوی بچوں کا حال پوچھئے کھانے کی دعوت دیجئے۔ موسم کا ذکر بالتفصیل کیجئے۔ صرف مطلب زبان پر لانے نہ پائیے کہ بار نہ ہو پھر ہفتوں جواب کا انتظار کیجئے۔ اس دوران میں مسکراتے رہئے۔ اور کھا کھلا کر پیتے چلے جائیے یا کہیں رک گئے۔ رک گئے ہوں تو روغن تازہ آتش سیال با قطرہ تیزاب جیسا حکیم بتائے کام میں لائیے۔ کاک ٹیل پارٹیوں میں حاضری دیجئے۔ یہ کاک ٹیل پارٹیاں بھی خدا جانے کس موذی نے ایجاد کی تھیں۔ جب کوئی تین شخص ہوا کرتی تھیں۔ تو کوئی باتیں دسترخوان پر پوری ہو جاتی تھیں۔ محمد شاہ ایسی ظرافت دے کہ بادشاہ کا دل پسیج جائے کہ یہ ہوتی سیاست۔ لیکن یہاں تو کوئی بغیر اپنی حکومت کے اشارے کے انگلی تک نہیں ہلاتا۔ پھر بھی کم بخت ضیافتوں پر وقت اور روپیہ ضائع کرتے رہتے ہیں۔ شراب کا میں کبھی دلدادہ نہ تھا لیکن عصمت بچانے کے لئے ایک گلاس [illegible] میں رکھنا پڑتا ہے۔ ورنہ ہر دو منٹ کے بعد کوئی نہ کوئی آپ سے فارغ ہوگا۔ اور آپ جواب دیتے دیتے اور دامن بچاتے بچاتے [illegible] اتنی

زیادہ ہوتی ہے کہ کندھے سے کندھا چھلتا ہے (اور یہ تعداد میں [illegible] نہیں ہوتی) وقت ایسے ہوتے ہیں۔ آپ شاید کھانا اس سے پہلے کھا سکتے ہیں نہ بعد میں۔ لیکن جو لوگ سفر یا زیر زمین جاتے ہیں۔ ان کی قسمت میں یہی ہوتا ہے کہ ٹھنسے رہیں۔ [illegible] مرتبہ [illegible] ہفتے میں [illegible] کا منتظر رہتا ہوں۔ جیسے کوئی کسی بڑے جشن کا منتظر ہو کہ طبیعت اچھی ہوگی لیکن اس سے [illegible] کبھی کبھی جس دن کوئی ٹیلی [illegible] ہو۔ میری تمام حالت ہو جاتی ہے۔ دو لفظ مسکرا مسکرا کے کہہ جاتے ہیں۔

خوش قسمتی سے کچھ مکان یہاں مل گیا ہے [illegible] یہ ترقی [illegible] مکان [illegible] ہے لیکن [illegible] کا خرچ خود برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اور چونکہ رتبہ اونچا ہے، تنخواہ تھوڑی۔ میں نے تنخواہ کے مطابق مکان لیے [illegible] پاکستان کی قومی عزت ہے اور رتبے کے مطابق [illegible] کو رکھتا تو جیب اس کو نہیں دیتی۔ ہفتوں اسی کشمکش میں گزر گئے [illegible] مکان مل گیا۔ جس میں [illegible] سے کام چل سکتا ہے [illegible] پاکستان کے [illegible] نکالا [illegible] تنخواہ چھ سو روپے ماہوار ہے۔ اس کی خوراک اور [illegible] ہو گئے [illegible] ہوائی جہاز کے نظارے سے تنہائی کا احساس کم ہوتا ہے۔ ایک ہزار کے قریب [illegible] چغتائی کی [illegible] تصویریں، ایک اونٹ کی اور جوڑی کا لیمپ۔ دو تین پاکستانی پھلکاریاں [illegible] ساتھ لایا تھا [illegible] دل میں لہو کی ایک بوند [illegible] رہتی ہے۔

میرے شغل تین قسم کے ہیں۔ ایک تو سیاسی یعنی شطرنج، جوڑ توڑ [illegible] اور [illegible] اور گفت و شنید ہیں۔ اور کراچی کے ساتھ تلغرافات جاری [illegible] تعمیل احکام [illegible] دوسرے تبلیغی یعنی مسلسل تقریریں [illegible] کشمیر [illegible] پاکستان کے عام حالات پر چند [illegible] اور دیگر کلچرل معاملات پر۔ میری مانگ بہ نسبت اور عالموں کے کالجوں، اسکولوں، یونیورسٹیوں اور گرجاؤں میں زیادہ ہے اور روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ اب تک کوئی سو دو سو لیکچر دے چکا ہوں۔ اس سلسلے میں اکثر سفر میں رہتا ہوں۔ دنیا میں ہمارا دشمن بجز ہندوستان کے اور کوئی نہیں ہے۔ لیکن ہندوستان کا نام چھایا ہوا ہے گاندھی اور [illegible] اور ساختگی اور [illegible] اور نہرو [illegible] سب اسی کے حصے میں آئے ہیں۔ پاکستان سے لوگ کم واقف ہیں۔ کھاتا پبلسٹی کے لیے کچھ لاکھوں روپیہ چاہیے۔ اس لیے سو مہینے مل جاتے ہیں۔ اس سے پورا لطف اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اکثر لوگ صاف دل لیکن ہندوستان سے [illegible] مرعوب ملتے ہیں۔ تاہم معقول بات کہیے تو اثر پذیر ضرور ہوتے ہیں۔ ایک گرجے میں لوگ پاکستان کے حالات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ لیکچر کے بعد سب نے زانوؤں کے بل کھڑے ہو کر پاکستان کی بہبود کے لیے دعا مانگی اور ایک مذہبی HYMN میں پادری صاحب کے تصنیف کردہ دو بند پاکستان کے متعلق شامل کر لیے۔ کالجوں اور سکولوں کے بیشتر طالب علم میرے گھر کا طواف کرتے رہتے ہیں۔ اور پاکستان کے ٹکٹ اور تصویریں اور پمفلٹ مجھ سے لے جاتے ہیں۔ ان دو شغلوں سے فراغت ملے تو ادبی ذوق کی آبیاری کرتا ہوں۔ یہاں پڑھے لکھے لوگ زیادہ ہیں، عالم کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ مقررین اس قدر مختلف ہیں کہ گھنٹوں ہم زبانی کے بعد بھی ہم خیالی کم نصیب ہوتی ہے۔ بچاروں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ جب امریکہ کے پاس سب کچھ موجود ہے تو سب لوگ اپنے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔ پھول دنیا میں سب کچھ حاصل کر لیتے ہیں۔ بجز حسن مذاق کے۔ چنانچہ حسن کو لپ اسٹک اور ہوائی جہاز میں ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ روپیہ اور سامان کی بہتات ہے جتنا کھا سکتے ہیں اس سے دگنا پھینک دیتے ہیں۔ دکانیں اٹا اٹ سامان سے بھری رہتی ہیں اشتہاروں کی وہ بھرمار ہے کہ سورج چاند نظر نہیں آتے۔ ایک اخبار کے ایک سنڈے ایڈیشن میں اتنا کاغذ لگتا ہے کہ پاکستان کے سب اخبار دس سال تک اس پر چھپ سکتے ہیں۔ تاہم خوش نہیں رہتے۔ کسی چیز پر قانع نہیں ہوتے۔ اور ایک بے قراری سی ہر وقت ان پر مسلط رہتی ہے۔ جب موقع ملے ایک آدھ دن ہارورڈ یونیورسٹی میں جا گزارتا ہوں۔ وہاں رچرڈز صاحب انگریزی کے پروفیسر ہیں کیمبرج میں میرے استاد تھے۔ ان کی مروت کی وجہ سے وقت وہاں اچھا کٹ جاتا ہے۔ انہی کی بدولت میرے وہاں چند لیکچر بھی انگریزی اور امریکی اساتذہ کے متعلق ہوئے۔ نیویارک میں دوست مشکل سے دستیاب ہوتے ہیں۔ ذہنی

ہو جاتی ہیں دونوں فاصلے زیادہ ہیں۔ دوستوں کا حلقہ جس کے ہم لوگ عادی ہیں وہ یہاں میسر نہیں بجز اس کے کہ ایک "پارٹی" کا ماحول ملے لیکن یہ ضیافتیاں محض سیاست والوں کے لئے وقف کر رکھی ہیں۔ ان سے علیحدہ ہو جانے کے بعد جیسی تنہا پاس جیسی ہوتا اتنا پاؤں پھیلنے کے دو تین مضمون اور ایک آدھ تقریر کے جواب میں دعوت سے ملاقات ہے ان کی بدولت کبھی کبھی شام رنگین ہو جاتی ہے آپ جانتے ہیں دوستی کے رشتے جو شباب میں قائم ہو جاتے ہیں۔ ان کا بدل باقی تمام عمر میں نصیب نہیں ہوتا۔ اس لئے تشنہ رہتا ہوں۔ اب کچھ معقول کتابیں ہی منگوائی ہیں تو یہ بھیجئے اردو کی صحبت سے محروم رہا یہاں کے ملازمے زبان بانٹنے لگی تھی

صحت کے متعلق پریشانی زیادہ ہے ڈاکٹروں سے چھٹکارا نہیں ہوتا۔ جو حکومت پاکستان کا بھلا ہے کہ علاج معالجہ کے اخراجات برداشت کرتی ہے۔ ورنہ یہاں کی فیسیں ایسی ہیں کہ خود ادا کرنی پڑتی تو حالت ہی خراب ہوتا۔ ذیابیطس مجھے نہیں تاہم احتیاطاً پرہیز کرنی پڑتی ہے۔ جو کچھ سرطان سے عود کا شبہ ہوا۔ پھر جگر میں خرابی پیدا ہوئی چنانچہ ہر ہفتے ایک نہ ایک ٹیسٹ ہوتا رہتا ہے۔ ناک میں دم آ گیا ہے۔ (ان باتوں کا ذکر زبیدہ سے ہرگز ہرگز نہ کیجئے گا وہ بے چاری ناحق پریشان ہوگی)

احباب سے بالکل بے خبر ہوں۔ تاثیر کی موت کا اب تک یقین نہیں آتا۔ اسماعیل کی شادی پر ان کی ہمشیرہ کا ایک تار دیا جواب دیا تھا۔ حسرت صوفی تبسم، عابد کسی نے بھی خط نہیں لکھا دو چار مرتبہ میں کچھ بھیجا، رسالے وغیرہ لکھ کے علاوہ رشید صاحب سے اس کی سمتوں کہ یہاں سے کچھ تحائف بھیجے۔ اسے بھی ایک دو خط لکھے لیکن کسی چیز کا جواب نہ آیا۔ جو پاکستانی یہاں آتے ہیں ان سے داستانیں سنتا رہتا ہوں لیکن وہ اپنی دنیا کا حال بیان کرتے ہیں۔ میری دنیا کی بات کوئی نہیں کرتا۔ یا سو ایک برس سے نہیں سنا بار بار وہی شعر گاتا رہتا ہوں جو صحبت رنگین میں زوروں پر تھے۔ ہارمونیم ساتھ لایا تھا کبھی کبھی اس پر قوالی گاتا ہوں۔ پاکستانیوں میں سے محمد علی، آفتاب، عبدالقیوم، زیڈ اے خان، عبدالقادر (فنانس) غلام محمد وغیرہ یہاں آتے جاتے رہتے ہیں ان سے چند محفلیں قائم ہو جاتی ہیں۔ لیکن پرانے دوستوں کی اس سے کیا تسکین ہو سکتی ہے۔

بڑھاپا بھی آ رہا ہے۔ اس کا احساس مجھے ابھی تک نہیں ہوا لیکن آثار تو اسے کبھی دکھائی دے رہے ہیں۔ وزیر اعظم کے ساتھ جو دورہ کیا تھا اس سے صحت پر سخت چوٹ پڑی کسی دن دو تین گھنٹے سے زیادہ نہ سویا اور عظیم ذمہ داری کی وجہ سے اعصاب پر بھی بہت اثر پڑا۔ اس کے بعد آج تک تعطیل نصیب نہ ہوئی۔ اکتوبر، نومبر میں تین مہینے کے لئے پیرس جانا ہوگا کیونکہ جنرل اسمبلی اس سال وہاں ہوگی۔ ارادہ ہے کہ بیچ میں کرسمس کے لگ بھگ دو تین ہفتوں کے لئے کراچی کا چکر لگاؤں لیکن دیکھئے حالات کیا کروٹ لیتے ہیں۔

آپ کی زندگی میں بھی انقلاب کی وجہ سے انقلاب آ گیا ہوگا۔ خدا کرے آپ کی ہمت میں فرق نہ آئے اپنے حالات سے مجھے مطلع رکھئے گا انشاء اللہ میں اب خط و کتابت میں کوتاہی نہ کروں گا۔ خط ضرور لکھئے۔ کوئی سفر مل جائیں تو وہ بھی بھیج دیجئے۔ کوئی کتاب کام کی ہو تو وہ بھی۔ منصور سے کہئے فارن آفس کی معرفت ڈپلومیٹک بیگ میں بھجوا دے گا۔

خاکسار

بخاری

اس خط پر نظر ثانی کی تو احساس ہوا کہ رونا رو دیا ہے۔ اور پژمردگی کے سوا کم کسی چیز کا ذکر کیا ہے۔ اسے مکمل تصویر نہ سمجھئے۔ پہلا خط ہے۔ اس لئے دکھڑا سا معلوم ہوتا ہے۔

(نوٹ) یہ خط نقوش مکاتیب نمبر میں اور خط نمبر ۱، ۲ اور ۲۸ نقوش کے سالنامہ ۱۹۵۰ء میں شائع ہو چکے ہیں۔

بنام مولانا غلام رسول مہر

یہ مکاتیب مختصر سی تمہید کے متقاضی ہیں:-

۱۔ یہ اس زمانے میں جب بخاری صاحب کی خدمات آل انڈیا ریڈیو سے مستعار لی گئی تھیں، حکومت پنجاب کے مدبران سے گریڈ کا معاملہ پیش ہوا تو یہ اعتراض اٹھا کہ جن اصحاب کی خدمات دوسرے محکموں میں منتقل ہو جاتی ہیں وہ پہلی سابقہ تنخواہ سے زیادہ تنخواہ وصول کرتے ہیں نئے محکمے میں ترقی کے زیادہ مواقع ہوں تو ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور سابقہ محکموں میں نہ صرف اپنی ملازمتوں کا رشتہ استوار رکھتے ہیں بلکہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ گریڈ سے اسی طرح مستفید ہوتے رہیں جس طرح اصل محکمے میں رہتے ہوئے مستفید ہوتے۔ ان حالات میں اس وقت کی حکومت پنجاب کا رجحان یہ تھا کہ کسی ایسے شخص کو گریڈ سے مستفید ہونے کا موقع نہ دیا جائے جو اصل محکمہ میں برسرکار ہوں۔

۲۔ اس وقت سردار سکندر حیات خاں مرحوم نے وزارت قائم کر رکھی تھی۔ میاں عبدالحئی مرحوم وزیر تعلیمات تھے۔ میں نے میاں صاحب اور سردار صاحب دونوں سے عرض کیا تھا کہ اوّل جس شخص کی خدمات سے کوئی دوسرا محکمہ فائدہ اٹھانے پر آمادہ ہو جائے لازماً وہ وسیع صلاحیتوں کا مالک ہوگا اور مستحق ہے کہ ان خوبیوں کی سزا نہ دی جائے۔ دوسرے بخاری صاحب کی غیر معمولی شخصیت پیش کی تھی اور کہا تھا کہ ان کے معاملے کو مستثنیٰ سمجھا جائے۔ دونوں نے میری یہ استدعا منظور کرلی اور بخاری صاحب کو گریڈ مل گیا۔

۳۔ مسٹر من موہن ڈپٹی ڈائریکٹر تعلیمات تھے اور جن اصحاب کو ان سے ملنے کا موقع میسر آیا وہ اعتراف کریں گے کہ موصوف بلند قابلیت اور بلند اخلاق کے انسان تھے۔ آج یہ حقیقت عرض کرنا غالباً غیر مناسب نہ ہو کہ مسٹر من موہن کے خلاف سب سے زیادہ شکایات جنوبی و مشرقی پنجاب کے جاٹ ممبروں نے پیش کی تھیں جو اتحاد پارٹی کا ایک اہم عنصر تھے اور چودھری چھوٹو رام کو اصرار تھا کہ مسٹر من موہن کو ڈپٹی ڈائریکٹری سے ہٹا دیا جائے۔ اس سلسلے میں بڑی تگ و دو کی ضرورت پیش آئی۔ یہاں تک کہ چودھری چھوٹو رام کی خدمت میں بھی تمام تفصیلات عرض کرکے انہیں راضی کیا گیا کہ مسٹر من موہن رتبت کے لحاظ سے بہترین شخص ہیں۔ مسٹر من موہن بخاری صاحب اور بعض دوسرے اصحاب کے عزیز دوست تھے۔ ان سب نے اس دور ابتلا میں موصوف کے لیے ہر ممکن کوشش کی تھی۔ یہاں تک کہ بخاری صاحب نے ان کے معاملے کو اپنے معاملہ پر بھی مقدم رکھا۔ اس کا نتیجہ بھی حسب مراد نکلا یعنی مسٹر من موہن اپنے عہدہ پر برقرار رہے۔

۴۔ دھرم پور میں ملاقات نہ ہو سکنے کا معاملہ یہ ہے کہ بخاری صاحب اپنے حقوق کے سلسلے میں ڈائریکٹر صاحب تعلیمات نیز وزیر تعلیمات و وزیراعظم سے ملنے کے لیے شملہ گئے تھے۔ میں اس زمانے میں اپنے بھائی کے پاس سناور میں ٹھہرا ہوا تھا جو دھرم پور (کوہستان شملہ) سے قریب ہے۔ فون کے ذریعے سے طے ہو چکا تھا کہ بخاری صاحب موٹر میں واپس ہوں گے تو میں دھرم پور پہنچ کر ان سے مل لوں گا۔ بخاری صاحب کو شملہ سے آنے میں دیر ہوگئی اور کسی قدر

معلوم ہوتا ہے میں دھرم پور اسٹیشن پر بیٹھا رہا جب کوئی موٹر آتی کسی آدمی کو بھیج کر دریافت کرا لیتا۔ بخاری صاحب اسٹیشن سے گئے نہیں کہ اس سڑک پر میرا انتظار کرتے رہے جو دھرم پور سے سناور کی طرف جاتی ہے میں واپس ہو کر سناور چلا گیا۔ وہ واپس ہو کر کالکا پہنچے اور وہاں سے سناور ٹیلی فون کرتے رہے تو میں دھرم پور میں تھا جس سے فون پر گفتگو نہ ہو سکی۔ سناور پہنچ کر ان کے فون کا علم ہوا تو وہ کالکا سے ٹرین میں سوار ہو کر دہلی پہنچ چکے تھے۔

۳ بخاری صاحب نے ایک مکتوب کے آخر میں لکھا ہے کہ خط کی رسید بھیج دی جائے اور اسے پڑھنے کے بعد چاک کر دیا جائے۔

اس آخری ارشاد کا مدعا یہ تھا کہ خط کسی کے ہاتھ نہ پڑ جائے کہ اس کی اشاعت سراسر خلاف مصلحت تھی۔ میں نے اسے چاک نہ کیا اور یہ ارادۃً نہیں بلکہ اتفاقیہ محفوظ رہ گیا۔ اب اس کی اشاعت کسی بھی مصلحت کے خلاف نہیں۔ اور یہ اس عزیز دوست کی نگارشات کا ایک مرقع ہے جس کی ہر تحریر کو اس وقت ایک بیش قیمت تحفے کی حیثیت حاصل ہے

---

①

۴ پرتھوی راج روڈ، نئی دہلی

بروز اتوار

مشفق محترم! نہ معلوم کیا بات ہوئی دھرم پور میں آپ دکھائی نہ دیئے۔ سناور کی سڑک اور بڑی سڑک کے مقام اتصال پر میں آدھ گھنٹہ انتظار کرتا رہا۔ پھر واپس ہو کر چلا گیا۔ کالکا پہنچ کر آپ کو سناور ٹیلی فون کیا اور ساڑھے نو بجے تک تین مرتبہ ٹیلی فون کیا لیکن آپ سناور میں تشریف فرما نہ تھے اس سے خیال ہوتا ہے کہ آپ ضرور دھرم پور تشریف لے گئے ہوں گے۔ اور وہاں میرے منتظر ہوں گے۔ مجھے ملال ہے کہ آپ کو بے انتہا کوفت ہوئی ہوگی جس کے لئے میں بہت نادم ہوں اور معافی کا خواستگار ہوں۔ معلوم ہوتا ہے میری بصارت نے مجھے دھوکا دیا۔ آپ ضرور سڑک پر ہوں گے لیکن مجھے نظر نہ آئے۔

بہرحال شملے کی داستان سن لیجئے۔ ڈائریکٹر صاحب سے ملا پھر میاں صاحب قبلہ سے ملا دونوں نے حامی بھر لی کہ تمہیں سلیکشن گریڈ دے دیا جائے گا اس مسئلے پر کہ میں پنجاب میں واپس آؤں یا نہ آؤں یا آؤں تو کب آؤں بحث ہی نہ ہوئی۔ بلکہ اس بات کا ذکر تک نہ آیا۔ میں نے بھی اسے چھیڑنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس وقت میں نے واپس آنے کا ارادہ ظاہر کیا تو میاں صاحب کو گوناگوں دقتیں پیش آئیں گی۔ اور میں نہیں چاہتا کہ انہیں اس وقت مشکلات میں مبتلا کیا جائے جب انہوں نے مجھے بغیر واپس جانے کے سلیکشن گریڈ دینے کا وعدہ کر لیا تو اسی پر اکتفا کرنا چاہئے۔ میاں صاحب کا رویہ ازحد مشفقانہ اور ان کا سلوک بہت ہی اچھا تھا۔ خدا ان کو خوش رکھے انہوں نے ہر طرح سے میری تسلی کر دی۔ وزیر اعظم صاحب سے بھی ملا انہوں نے بھی امداد کا وعدہ کیا۔

اب سوال یہ ہے کہ آپ کو شملہ جانے کی تکلیف دی جائے یا نہ۔ بظاہر تو اس کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن فی الحقیقت اس کی ضرورت ابھی تک موجود ہے۔ جانے سے فائدہ نہ ہو لیکن نہ جانے سے اغلباً نقصان ہوگا۔ اس لئے مجھ پر اتنا کرم کیجئے کہ ایک دن کے لئے شملہ چلے جایئے میاں

صاحب سے مل کر پوچھئے کہ سلکشن گریڈ کے متعلق انہوں نے کیا فیصلہ کیا اور میرے پنجاب واپس آنے تک تذکرہ ملتوی رہے۔ وہ بھی اگر ضرورت پڑے تو لیجئے۔ ورنہ خیر۔ میاں صاحب سے ملنے سے پہلے مومن صاحب سے ضرور مل لیجئے۔

اس کے علاوہ ایک اور کام ہے اور وہ شاید میرے کام سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بعض شرپسند لوگ اور بعض نیک مگر غلط فہمی میں مبتلا لوگ اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ مومن کو موجودہ عہدے سے ہٹا دیا جائے۔ ڈائرکٹر صاحب ان کے کام سے خوش ہیں میاں صاحب ہر طرح سے خوش اور مطمئن ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ خواہ مخواہ مومن صاحب پر کلنک کا ٹیکہ لگایا جائے؟ لیکن اہل غرض کا دباؤ دور تک پہنچ چکا ہے۔ جب میں شملے سے روانہ ہوا حالات تشویش ناک تھے آپ سے ملاقات ہو جاتی تو مشورہ دیتا۔ میں اسی بات پر صرف کرتا۔ اب حقیقت یہ ہے کہ حکومت خواہ مسلمانوں کی ہو خواہ ہندوؤں کی، ایسے افسروں کا وجود تو ضروری ہے اگر یہ سچ ہے تو کیا وجہ ہے کہ ایسے عہدہ دار کی صحت۔ کی جائے جو لائق، فہیم اور ہوشیار ہیں اور خدا گواہ ہے کہ مومن سے بہتر آدمی اس وقت کسی مذہب میں بھی نہیں مل سکتا۔ ان کا کردار خفیف سے خفیف شبہے سے بھی پاک ہے، اور ان کی دیانت اور صحت رائے مسلم ہے۔ اور پھر کوئی ایسا مسلمان افسر بھی موجود نہیں جو ان کی جگہ مقرر کیا جا سکے تو پھر کیا وجہ ہے کہ انہیں خواہ مخواہ پریشان کیا جائے۔ وہ اس قدر دلگیر ہیں کہ استعفیٰ تک دینے پر آمادہ ہیں۔ ذرا ان سے مل لیجئے اور اس کام کو میرے کام سے بھی ضروری سمجھ کر ان کی مدد کیجئے۔ میں آپ کی عنایتوں کا طالب۔ نہایت ممنون ہوں آپ نے میرے لئے بہت زحمت برداشت کی اور آپ کا احسان میں عمر بھر نہ بھولوں گا۔ آخر میں دو ضروری باتیں عرض کرتا ہوں ایک تو اس خط کی رسید ضرور بھیجئے دوسرا اسے پڑھ کر چاک کر دیجئے۔

خاکسار

بخاری

---

(۲)

۱۰، پرتھوی راج روڈ، نیو دہلی

۵ جون

محترم دوست۔ سلام مسنون۔ میں ایک معافی کی عرضی پہلے آپ کی خدمت میں بھیج چکا ہوں۔ اب گرامی نامہ ملنے پر دوبارہ لکھ رہا ہوں یقین مانئے میں از حد شرمندہ ہوں کہ آپ کو اس قدر زحمت ہوئی۔ واللہ اس میں میں بالکل بے قصور ہوں۔ دھرم پورہ میں آپ کو تلاش کیا۔ سنا ورک سڑک اور بڑی سڑک کے سنگم اتصال پر طویل انتظار کیا۔ کالج پہنچ کر دو تین مرتبہ آپ کے نام سے آپ کو پرنسپل ٹیلی فون کیا اور ایک تو نہ ملنے کا اور دوسرے آپ کو اس قدر تکلیف دینے کا، ان دونوں باتوں کا انتہائی افسوس دل میں لے کر گیا۔ للہ مجھے معاف کر دیجئے۔ میں از حد نادم ہوں کہ آپ جیسے مشفق کرم فرما کو اس قدر رنج پہنچایا اور وہ بھی اس حالت میں کہ آپ میرے کام کے لئے اس قدر تکلیف اٹھا رہے تھے۔ میں نے اپنی طرف سے ہر ممکن احتیاط برتی اور ہر پیش قدمی کی لیکن میری بدقسمتی اور انتہائی بدقسمتی کہ بجائے اس کے کہ آپ کا شکریہ خود اپنی زبان سے آپ کی خدمت میں ادا کر سکتا الٹا آپ کو پریشان کیا۔

میں کل ایک مفصل خط لکھ چکا ہوں اب اپنے کسی کام یا غرض کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے کس منہ سے آپ کو کہوں کہ آپ مجھے درخور اعتنا سمجھئے۔ بہرحال اگر آپ جو گستاخی یا غفلت میری طرف سے سرزد ہوئی ہے اس کے لئے مجھے معاف کر دیں تو میں اپنے آپ کو خوش قسمت

بھیجوں گا۔

دوبارہ عرض کرتا ہوں کہ میں انصرام اور معافی کا خواستگار ہوں۔ میرا قصور میری بدقسمتی کے سوا کچھ نہیں۔ اور آپ کی پریشانی کی کوئی قیمت میں ادا نہیں کر سکتا سوائے اپنے عجز و انکسار کے

گر قبول افتد زہے عز و شرف

خط حمید منزل کے پتہ پر لکھا کیجیے۔

خاکسار
بخاری

---

(۲)

۳۰ پرتھوی راج روڈ۔ نئی دہلی

برادر محترم۔ سلام مسنون۔ پے در پے آپ کو دق کر رہا ہوں۔ لیکن آج گرامی نامہ مورخہ ۵ جون ملا۔ اس میں ایک فقرہ ایسا ہے کہ

"بہرحال اس معاملے میں آپ کی طرف سے جواب کا انتظار ہوگا۔"

بتقاضا اس فقرے کے آج پھر آپ کی خدمت میں پیش ہو رہا ہوں۔ واپسی کا مسئلہ اس وقت چھیڑنا اس لیے مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ

(۱) گریڈ اور واپسی بیک وقت دونوں کے سامنے آ جانے سے صاحب موصوف کو پریشانی ہوگی اور ایک کے پیچھے دوسرا بھی معرض خطر میں پڑ جائے گا۔

(۲) اگر میں واپس نہ آؤں اور سینیئر گریڈ مل جائے تو اس گریڈ میں وہاں کوئی اور قائم مقام ہوگا چنانچہ ایک کی بجائے دو آدمیوں کا بھلا ہو جائے گا۔ اغلباً صاحب موصوف کو یہ شکل زیادہ مرغوب ہوگی۔

(۳) بعض کوائف یہاں ایسے ہیں کہ اگر میں فی الحال کچھ عرصے یہاں اور ٹھہر جاؤں تو غیر مناسب نہ ہوگا۔

(۴) واپسی کا مسئلہ ہر وقت چھیڑا جا سکتا ہے بلکہ واپسی کا حق میرے پاس ہے جب چاہوں واپس آ سکتا ہوں کوئی مجھے روک نہیں سکتا اور کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ جب واپسی کا موقع آئے گا تو اس وقت اس مسئلے کو بھی چھیڑا جا سکتا ہے کہ کس عہدے پر واپس آؤں۔

(۵) گریڈ کا مسئلہ جولائی کے شروع ہی میں ختم ہو جانا چاہیے اس کے بعد اگر اکتوبر تک بھی واپسی کا سامان ہو گیا تو جو مصالح آپ کے پیش نظر ہیں ان کو گزند پہنچے گا۔

(۶) فی الحال میری واپسی کی وجہ سے صاحب موصوف کو یقیناً بعض دقتیں پیش آئیں گی جن کی وجہ سے وہ پریشان ہوں گے اور ان کی قوت فیصلہ مذبذب ہو جائے گی کچھ عرصہ بعد حالات میں زیادہ سہولت کی گنجائش ہوگی۔

ان سب باتوں پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ فی الحال باقی سب باتوں سے قطع نظر کر کے گریڈ کے معاملے کو پختہ اور بہت پختہ کر لینا چاہیے اصل چیز یہی ہے واپسی کا مسئلہ ایسا ہے ——— کہ اسے ہر وقت اٹھایا جا سکتا ہے اور اسی زور سے اٹھایا جا سکتا ہے جتنا کہ آج۔ البتہ آج اٹھانے سے گریڈ کے معاملے میں کچھ رکاوٹیں حائل ہو جائیں گی اور ممکن ہے غلط بحث کی رو میں اصل مقصد ہی بہہ جائے

چنانچہ میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ اپنی جانب سے [illegible] [illegible] [illegible] واپسی سے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] میں مفصل بحث ہوگی یا ایسی چونکانے والی بات لکھ دیجئے تاکہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
جلسوں سے ہو جائے۔

جن مصائب کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ درست ہیں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کی حیثیت [illegible] [illegible] [illegible] میں نے [illegible] مشورہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] صاحب موصوف سے آپ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] ملاقات [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
آپ کی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
دماغ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] دیکھ سکے۔

زود رنجم [illegible]
[illegible] بر چشم عاشقاں را

بندہ خاکسار
بخاری

---

(۴)

۶ اشوکا روڈ، نیو دہلی
۱۳ نومبر

برادرم محترم، سلام مسنون و تہنیت عید

گرامی نامہ ملا جس نے مجھے مخمصے میں ڈال دیا۔ میں فیصلہ کا اعادہ آخر معمولی بات نہیں۔ جب خدمات مستعار لی جائیں تو طولانی ہو سکتی ہے لیکن سوچتا ہوں کہ یہ ہو لیا تو بہر حال مستقبل کیا ہے سب کچھ سوچنے کے بعد فیصلہ کیا تھا کہ واپسی پر کالج میں تقرر ہونا چاہئے اور پرنسپل کو سامنے رکھ کر کام کرنا چاہئے۔ لیکن جو پوزیشن اب آپ نے بیان کی ہے اس سے تو مستقبل کے سب دروازے اختیاراً بند ہو جائیں گے۔ نہ معلوم آپ نے اس پہلو پر غور کیا یا نہیں۔ اس لئے قدرے تامل ہے لیکن تامل کرتے ہوئے بھی متامل ہوتا ہوں کیونکہ آپ نے لکھا ہے کہ "تامل ارباب نظر کے لئے تکدر کا باعث ہوگا" اس فقرے نے کچھ خائف کر دیا اس کی تفصیل اگر

(۱) آپ کر سکیں تو سوچنے میں آسانی ہوگی اس لئے آپ کے مزید خط کا منتظر ہوں۔

(۲) کیا یہ صورت تو نہیں کہ واپسی پر میرا کہیں کھپانا مشکل نظر آ رہا ہے (بجز اس کے کہ اوروں کو معزول کیا جائے) اس لئے یہ تجویز پیش ہو رہی ہے؟

اور معاملہ یوں ہے کہ اب تک سلیکشن گریڈ کا فیصلہ نہیں ہوا۔ اس کا انتظار ہے۔ ملاقات اپریل کی مدت تک پہنچ جاتی ہے اس سے پہلے اور بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

ان مہینوں میں اگر آپ ڈلہوزی جائیں تو مجھے بھی وہیں ملیں اور فرصت ہو تو خود ہی آ جاؤں گر مہینہ اٹھارہ سے پہلے ۲۱ اپریل ہو گا
میں نے یہ پتہ صاف صاف لکھ دیا ہے اسی پتے سے خط بھیجئے تاکہ مجھے تاخیر نہ ہو۔ سلام شوق۔

خاکسار

بخاری

۵

تمہارے وعدے پر بیٹھے ہم
(۱) سالک صاحب بے مہر آتے دیکھے[2] میری بدقسمتی کہ آپ کا گھر رستے میں حائل تھا۔

بخاری

(۲) آپ ہمارا جواب ہمیشہ کسی ایسے کاغذ پر دیتے ہیں جو انگریز لوگ حوائج ضروریہ کے سلسلہ میں استعمال کرتے ہیں۔[3] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ قدیم دوستی کی وجہ سے بیت الخلا میں بھی خط لکھتے رہتے ہیں لہٰذا ایک سادہ کاغذ بھی ارسال خدمت ہے

---

[1] مراد یہ ہے کہ سالک اکیلے تھے۔ مہر ساتھ نہ تھا دوسرے معنی ظاہر ہیں۔

[2] بخاری صاحب اس زمانے میں بیڈن روڈ پر اس مکان میں رہتے تھے جو شاہ ابوالمعالی والے چوک اور فلیمنگ روڈ والے چوک کے تقریباً وسط میں تھا۔ میں اس کے قریب رمضان بلڈنگ میں موجودہ قومی دواخانے کی بالائی منزل میں تھا۔ سالک صاحب بل روڈ پر مقیم تھے۔ بخاری صاحب اپنے مکان کے برآمدے میں بیٹھے تھے انہوں نے دیکھا کہ سالک صاحب آ رہے ہیں لیکن وہ راستے میں میرے ہاں ٹھہر گئے۔

[3] جو کچھ لکھنا ہوتا تھا پنسل سے مضمون لکھنے کی سلیپوں پر لکھ دیتا تھا۔ بخاری صاحب کے نزدیک وہ کاغذ حوائج ضروریہ کے سلسلہ میں استعمال کا مستحق ٹھہرا۔

ہے تاکہ جواب اسی پر لکھوں

بنام عبدالرحمٰن چغتائی

①

مکرم بندہ جناب چغتائی صاحب۔ سلام مسنون

سر عبدالقادر (اور بعد میں [illegible]) سے [illegible] تاثیر [illegible] [illegible] سے درخواست کرتا ہوں۔ کیا آپ انھیں [illegible] کی ایک جلد بہت جلد بھجوا سکتے ہیں۔

تاثیر

بخاری

اور اگر [illegible] مرقع چغتائی کی ایک کاپی بھی جلد بھجوا [illegible] بے حد ممنون ہوں گے۔

---

②

۷۰ تغلق روڈ، نئی دہلی

۱۱ اکتوبر

شفیق و مکرم جناب چغتائی صاحب۔ سلام مسنون۔ افسوس کہ لاہور میں آپ کی ملاقات سے محروم رہا۔ معلوم ہوا آپ شکار کو تشریف لے گئے تھے۔

واپسی پر ایک خط لاہور بھیجنا ارسالِ خدمت ہے۔ خط کے دو صفحے ہیں ایک آپ کے نام، ایک میرے نام۔ ملفوف بھیج رہا ہوں۔ مطلب آپ پر خود ہی ان کے پڑھنے سے ظاہر ہو جائے گا۔ مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ خط لکھنے والے یعنی EVELY WOOD صاحب آج کل والٹر تھامسن کمپنی میں ملازم ہیں جو ADVERTISING کمپنی ہے اور آرٹ کے نقطۂ نظر سے اپنی پبلسٹی کو ہر وقت دل کش بنانے کے درپے رہتی ہے۔ WOOD صاحب بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں لٹریچر اور مصوری دونوں کے مشہور طالب علم اور نقاد ہیں۔ اور آپ کے معترف اور مداح معلوم ہوتے ہیں۔ آج کل کلکتے میں ہیں لیکن اس سے پہلے سالہا سال بمبئی میں رہے۔ یہیں ان کا روزگار تھا۔ علاوہ بریں بمبئی کے اہلِ فن میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے اور اکثر تصویروں کی نمائشوں میں کنڈال والا، مسز وادیا اور اس قسم کے لوگوں کے ساتھ شریک رہتے تھے۔ جو جواب آپ ان کو بھیجنا چاہیں وہ خواہ براہِ راست ان کو بھیجیں خواہ میری معرفت۔

بندۂ خاکسار

بخاری

③

۳ تغلق روڈ، نئی دہلی

۱۶ اکتوبر

سلام مسنون۔ گرامی نامے کا شکریہ۔ آپ کے خط آنے پر میں نے ڈاکٹر صاحب کو لکھ دیا ہے۔ مزید گفت و شنید وہ لاہور جا کر آپ سے کریں گے۔ کوئی خدمت میرے لائق ہوئی تو بہر حال دریغ نہ کروں گا۔ اسپیچ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ کے نقوش کے جو سب شمارے اب تک میرے مطالعہ بلکہ میری زندگی کی زینت ہیں اور میں ان کا ذکر ہمیشہ فخریہ کرتا ہوں۔ مکاتیب اور ادبیات و علم و دانش کا معاملہ میرے نزدیک نہایت پیچیدہ اور وقت طلب ہے۔ ملاقات ہوئی تو تفصیلاً عرض کروں گا۔

خاکسار

بخاری

---

④

۳۰ مین روڈ

۱۰ اگست (۱۹۵۳ء)

مشفق من جناب چغتائی صاحب سلام مسنون! بیگم سراج الدین صاحبہ کا جواب آگیا ہے۔ ان کے خط کا لفظی ترجمہ یہ ہے۔

> "آپ کے خط کا شکریہ۔ یہ آپ کی بڑی نوازش ہے کہ آپ مجھ پر اس قدر اعتماد رکھتے ہیں۔ چغتائی صاحب سے کہہ دیجئے کہ میں ان کی بہت ممنون ہوں کہ وہ باوجود اس امر کے کہ فن کے متعلق میرا علم بہت محدود ہے اپنی کتاب کی تمہید مجھ سے لکھوانا چاہتے ہیں۔ میں اسے آپ کی بہت عزت سمجھتی ہوں اور کوشش کروں گی کہ ان کے کمال کی کما حقہٗ داد تحسین دے سکوں۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ زیادہ سے زیادہ مجھے کتنے دن کی مہلت دی جائے گی علاوہ بریں مجھے "مرقع" کی ایک جلد بھجوا دیجئے کیونکہ میرا نسخہ میرے پاس موجود نہیں۔"

آپ ان کو مرقع کی نئی ایڈیشن (یعنی جس شکل میں اب آپ اسے شائع کرنا چاہتے ہیں) بھجوا دیجئے۔ عبدالرحیم صاحب وہ مجلد میرے پاس لائے تھے جس میں سولہ صفحے دیباچہ کے لئے خالی چھٹے ہوئے تھے وہ بیگم سراج الدین صاحب کو بھجوا دیجئے۔ اس کے علاوہ میرا مشورہ یہ ہے کہ پہلی ایڈیشن کے دیباچے (یعنی کزنز صاحب اور ڈاکٹر اقبال کے مقالے) بھی انہیں بھیج دیجئے تاکہ وہ ان کے پیش نظر رہیں کہ پہلے کیا کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اگر اس دوران میں آپ کے مرقع پر اخبارات یا رسائل میں کہیں کوئی ریویو چھپا ہو اور اس کی نقل آپ کے پاس موجود ہو تو وہ بھی بھیج دیجئے۔ ایسی چیزیں [illegible]

[illegible]

[illegible] آپ [illegible] دوست [illegible] شہر ہے۔
افسوس کہ آج شاید آپ [illegible] دوستوں کی [illegible] چغتائی
کے شائع ہونے پر مسرت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں [illegible] خیال تھا کہ آپ [illegible] ایک شکایت
آپ کے خلاف رہی [illegible] آپ [illegible]
[illegible] آپ [illegible] سب دوست [illegible] صاحب [illegible] صاحب [illegible] صاحب [illegible] صاحب
چودھری [illegible] صاحب [illegible] آپ سے [illegible]
نیاز مندانہ [illegible] کہیے

آپ کا [illegible] نگارستان آپ کو مبارک ہو [illegible]
چغتائی صاحب کی [illegible]

خاکسار

---

⑤

پاکستان ہاؤس
۴ ایسٹ ۶۵ سٹریٹ۔ نیویارک (یو ایس اے)
۲۵ اپریل ۱۹۵۳ء
شفیق جناب چغتائی صاحب سلام مسنون

گرامی نامہ ملا۔ بھائی آپ کو ایسی اجازت پوچھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ جب تک میں یہاں ہوں آپ سمجھئے کہ گویا آپ خود یہاں ہیں جو خدمت میرے لائق ہو بلا تامل فرما دیا کیجئے۔ مسودہ ضرور بھیجئے۔ کم از کم دیکھ تو لوں۔ اس ملک میں کسی بھی مسودے کو خواہ وہ کتاب کا ہو یا فلم کا یا ریڈیو یا ٹیلی ویژن کا۔ منزل مقصود تک پہنچانا شاذ و نادر ہی [illegible] کے انتظامات سے کم نہیں ہوتا ہر دور MIDDLE MEN شامل [illegible] رہتے ہیں جہاں کروڑوں کا ہیر پھیر ہو اور ہر منزل میں لاکھوں چھوٹے بڑے بیوپاری زور آزمائی کر رہے ہوں۔ وہاں علم و فن، علم و فن نہیں محض بزنس بن جاتا ہے اور بزنس ہی کے اصولوں پر چلتا ہے تاہم آپ کی تجویز سے دماغ کو گدگدی ہوئی۔ فلم کا مرکز نیویارک نہیں، کیلیفورنیا (ہالی وڈ) ہے لیکن آپ مسودہ تو بھیجئے، آنکھیں تو اس سے روشن ہوں۔ اس کے بعد کاری گر لوگوں سے مشورہ کروں گا اور نشیب و فراز سے آپ کو مطلع کرتا رہوں گا۔

لاہور کا قیام از حد مختصر تھا۔ جہاں برسوں تک شباب رنگین کیا ہو اور بڑھاپے کو بھی شباب بنایا ہو۔ وہاں دل کی لگی بجھتے عرصے میں کیا

مجھے اپنی قسمت پر نازاں ہوں کہ احباب کی صحبت میں مسرت بھرے نشے کی چند گھڑیاں گزار لیں۔ آپ سے سالہا سال [illegible] کا سودا رہا۔ آپ کی صحبت خلوص برسوں سے زندگی کا جزو رہتی رہی ہیں۔ علاوہ ازیں آپ سے ملا اور آپ کی محبت [illegible] صاحب سے اچھے دوبارہ فیض یاب ہوا۔ [illegible] امتیاز صاحب سے دو فلیٹ پیلیوں کا تبادلہ ہوا۔ ان کے بعد جواب ہی [illegible] دو ماہ سے تو سلسلہ قدرے رک گیا۔ میں تو انہیں یہ سلام کہیے گا۔ ہاشمی صاحب کا بھی نہایت محبت بھرا خط ملا۔ ابھی جواب نہیں دیا۔ انہیں بھی میرا سلام پہنچا دیجئے گا۔ اور کس کس کو گناؤں۔ بس یوں سمجھئے کہ لاہور اور دمشق کا پیغام پہنچانا ہو تو کہاں تک ایک ایک پھول کا نام لوں۔ جو ملے ان سے کہیے کہ [illegible] خاص سلام کہتا ہے۔

جو پتہ اس خط کی پیشانی پر لکھا ہے اسے لکھ لیجیے تاکہ میں آئندہ مکمل بھول جاؤں تو آپ کو تشویش نہ ہو۔

بندہ خاکسار

بخاری

---

⑥

[illegible]

۱۴ جنوری ۱۹۵۵ء

بھائی آپ کی شکایت بجا ہے۔ ہوئے سو مہینے میں نے مسودہ بھیجا تھا آپ کو رسید بھی نہ بھیجی۔ آپ کو یقیناً تشویش رہی ہو گی۔ آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ میں آخر اگست میں سخت بیمار پڑ گیا۔ دو ہفتہ مسلسل بے ہوشی اور نیم بے ہوشی کے عالم میں رہا۔ [illegible] ہفتے ہسپتال میں اور اس کے بعد [illegible] مہینے گھر پر صاحب فراش رہا۔ نقاہت کے عالم میں بھی کام سے قطعی نجات نہ ہوئی لیکن مصروفیت کو ضروریات تک محدود رکھا۔ اس عرصے میں آپ کا مسودہ پہنچا۔ معلوم نہیں کہ [illegible] کب نصیب ہو۔ کوشش کر رہا ہوں کہ [illegible] اور مارچ میں بھی پاکستان کا ایک چکر لگاؤں۔ اس شدید بیماری کے بعد اہل و عیال تو [illegible] اور میں ان سے ملنے کو بے قرار ہوں۔ مہلت زیست کا کسی کو علم نہیں۔ اگر آنا نصیب میں ہوا تو سب باتیں ہوں گی۔

آپ کے فسانے میں کئی جگہیں ہیں جنہیں پڑھ کر بہت لطف آیا اور ذہن کو گدگدی ہوئی لیکن اندیشہ ہے کہ کہیں یہ جگہیں ہی رکاوٹ نہ بن جائیں۔

میں نے ایک دو فلم باز دوستوں سے ذکر کیا اور اس کے چند حصے بھی ان کو سنائے وہ کہتے تھے کہ کوئی EXPERIMENTAL GROUP اسے فلمائے تو بہتر ہو۔ ورنہ تاجرانہ کمپنیوں کے بس کا تو یہ روگ معلوم نہیں ہوتا۔ آج کل فلم کمپنیاں عجب مشکل میں ہیں۔ آمدنی سر عشت سے کم ہو رہی ہے بری طرح ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ اکثر ایکٹر انہیں کو چھوڑ کر ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ملازم ہو رہے ہیں۔ مزید سعی کروں گا اور آپ کو اس سے آگاہ رکھوں گا۔ اس دوران میں کیا یہ بہتر نہ ہو کہ آپ سیناریو کو بعینہٖ اسی طرح کسی اردو ادبی رسالے میں چھپوا دیں؟ میں نے اکثر سیناریو انگریزی رسالوں میں چھپتے دیکھے ہیں اور لوگ انہیں شوق سے پڑھتے ہیں۔ اپنے ہم وطنوں کے لئے یہ ایک نئی چیز ہو گی۔ اور اس کا سہرا آپ کے سر رہے گا۔ علاوہ بریں کاپی رائٹ بھی محفوظ ہو جائے گا۔

کہئے کیا خیال ہے؟

خاکسار

[illegible]

(ـ)

۱۰ جون [illegible]

مشفق محبی [illegible] صاحب، سلام مسنون۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ہو کر پیچھے میں۔ خدا آپ سب کو خوش رکھے [illegible]

[illegible]

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے نام

①

نیویارک

عزیزی و محبی، سلام مسنون۔ ابھی ابھی الیس کا خط ملا جس سے آپ کی اہلیہ محترمہ کے انتقال کا علم ہوا۔ عین مصروفیت کا زمانہ ہے کبھی

کا اجلاس روزانہ ہوتا ہے۔ اجلاس گاہ ۲۵ میل دور ہے۔ صبح جاتے ہیں رات کے ساڑھے سات بجے لوٹتے ہیں۔ ایک مدت ارادہ کیا کہ آپ کو تار روانہ کروں لیکن تار کسی زمانے میں جو مستعدی اور جذبۂ دلی کی علامت تھا اب رسم کے سلسلے میں اتنے بھیجے ہیں کہ ان کی حقیقت کھل گئی ہے اور تار دہی اہتمام محبت کی ایک ترکیب معلوم ہونے لگا ہے اس لیے اتوار (یعنی آج) کا انتظار کیا تاکہ آپ کو خط لکھ سکوں۔ جو صدمہ آپ کو پہنچا ہے اس کے متعلق میں کیا بات ایسی کہہ سکتا ہوں جو پامال اور بے معنی نہ ہو گئی ہو لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ایک مرتبہ نہیں سو مرتبہ آپ کے گھر کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ آپ کی بے فکری، آپ کی ضیافتیں آپ کی مجلسیں انہیں کی ضمن تھیں۔ نہ معلوم اب آپ پر کیا گزرے گی یقیناً آپ کو بار بار ایسا خلا محسوس ہوتا ہوگا۔ جس کو اب آپ کسی طرح پر نہیں کر سکتے۔ میری ہمدردی بے کار ہے تاہم اگر اس سے آپ کا غم لمحہ بھر بھی کم ہو جائے تو مجھے اطمینان ہوگا۔ خدا ان کو جوار رحمت میں جگہ دے اور خدا آپ کی زندگی کا انتظام آپ پر آسان کر دے۔ مرنے والے مر جاتے ہیں زندوں کا خیال نہیں کرتے۔

مہینہ بھر ہوا میں نے مستعدی سے ایک نادر لمحے میں امتیاز کو ایک طویل خط لکھا تھا خیال تھا دوستوں کے دل کو اس سے رشک ہوگی امتیاز سے کہا بھی تھا کہ خط احباب میں نشر کر دینا اگر وہ آپ کی نظر سے گذرا ہے تو میری زندگی کا نقشہ آپ کو معلوم ہوگا۔ نئے ملک میں گھر بار کرنا خصوصاً اس عمر میں جب کہ عادتیں راسخ ہو چکی ہوں اور دل کا عمل علامت تنزل پر ہو ایک مہم ہے۔ بہرحال کچھ صحت سہولت سی پیدا ہو گئی ہے۔ صحت کے متعلق تشویش رہی اور تشویش سے زیادہ مصروفیت۔ یا انسان ڈاکٹروں کا ہو رہے یا ملازمت کی زحمت کرے۔ دونوں باتیں مشکل سے یکجا ہوتی ہیں۔ ڈاکٹروں کی نگاہ میں پیشہ ورانہ زندگی نہیں۔

حمید الدین سے ایک مفصل ملاقات ہوئی تھی۔ لیکن یہ اب دو مہینے پرانی بات ہے ذرا اسمبلی کا کام ختم ہولے تو پھر ان سے ان کے دل کا حال سنوں گا۔

آپ کو خلوص کی اتنی ضرورت نہ ہوگی جتنی مجھے ہے سالک کو میرا پیار اور سلام کہیے گا انہیں بھی خط لکھنا ہے ہو سکے تو مجھے کوائف سے آگاہ کیجیے۔ عابد، عاشق، تاثیر اور دیگر احباب آج کل کس بحر میں شعر کہتے ہیں؟

خاکسار بخاری

(یہ خط سالنامہ نقوش ۱۹۵۵ء میں شائع ہو چکا ہے)

۲

صوفی میرے بھائی۔ ایلس فیض کی معرفت آپ کو شاید میرا پیغام پہنچا ہو کہ مجھے یہاں اس سال کے دوران، ایک یونیورسٹی میں اردو زبان اور اردو ادب کی تاریخ و ارتقا پر چند لیکچر دینے ہیں چاہتا ہوں اس کے لیے مکمل تیاری کروں آپ کی خدمت میں بوسیلہ ایلس یہ درخواست کی تھی کہ فی الحال ایسی کتابوں کی فہرست (تیس یا چالیس) بھیج دیجیے جنہیں پڑھ لینا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ ان میں کلیات اساتذہ اور تنقید کی کتابیں (اردو اور انگریزی) سب شامل ہوں گی۔ چنانچہ آپ بھی فہرست مرتب کرتے وقت اس بات پر نگاہ رکھیے۔ جب یہ فہرست میرے پاس پہنچ جائے گی تو دیکھوں گا کہ اس میں سے کون کون سی کتابیں یہاں موجود ہیں۔ باقی پاکستان سے منگواؤں گا۔ فی الحال صرف فہرست کتب مطلوب ہے جو آپ کو

بہتر طور پر مرتب نہیں کر سکتا کیونکہ آپ اس مضمون کے ماہر ہیں اور اس کے لیے بہت سے مواد دست یاب ہیں۔ میں ایسے اہم حقائق آپ کے عمل پر غالب آئیں گی۔ آپ کے بجز میں بالکل بیان سے دست بردار ہوں۔

لہٰذا ملتجیانہ درخواست ہے کہ اس میں غفلت یا تاخیر نہ کیجیے۔ ممنون ہوں گا۔ مجھے چند عمدہ نام ایک ایسے خواب میں جو اس سے میں نہیں آتا۔ الحمد للہ کہ یہ ان نصیب ہوئے اور دوستوں کو واسطے بخشے گئے۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔

مدت گزری اعلام کے لیے آپ کا ریکارڈ تھا کہ اس نے چپ اور گرم دل خاکی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دوستوں نے مجھے اپنے خلوص سے نوازا۔

میرا پتہ یہ ہے، UNITED NATIONS, NEW YORK, U.S.A میرا نام

خاکسار

بخاری

۱۰ر اپریل ۱۹۵۸ء

---

③

برادر عزیز، قلم میں وہ اثر کہاں سے لاؤں جو آپ کے دل کو پگھلا دے۔ دو تین بار منت سماجت کی آپ نے خط سے محروم ہوں۔ معلوم آپ کو کیا ہو گیا ہے؟

سکسینہ کی تاریخ ادب اردو اور رام بابو سکسینہ کی کسی مضمون کی کتاب کی اشد، فوری ضرورت ہے یہاں کے طلبا سب سے زیادہ مجبور سا آپ پر تھا۔ لیکن آپ نے وہ چپ سادھی ہے کہ میں بے بس ہو گیا ہوں

نیویارک	خاکسار
۱۴ر اکتوبر ۱۹۵۸ء	بخاری

بنام سید ہاشم رضا

①

یونائیٹڈ نیشنز۔ لگزمبرگ (پیرس)

شفیق و مکرمی۔ سلام مسنون! روما سے نیس اور نیس سے پیرس پہنچ گیا۔ یہاں سے لندن جاؤں گا اور وہاں سے ہفتہ عشرہ کے

اندر انشاء اللہ نیویارک۔

وطن کا ہر لمحہ مبارک ہوتا ہے خواہ حالات تلخ یا باعثِ تشویش ہی کیوں نہ ہوں۔ پہلے بھی یہی عالم تھا جب سے مل کر گیا اطمینان ہو کہ بہلوٹ کی طرح اسے کہاں ایک برس دو برس اٹھائے پھروں گا اور تشنگی اس سے پردیس کے صحراؤں میں بجھاتا پھروں گا۔ اس مرتبہ آپ سے بھی ملاقات ہو گئی اپنی خوش قسمتی پر ناز تھا۔ بندے نے اپنی محرومی کا ماتم بھی کیا کہ اس سے پہلے آپ سے نیازکیوں حاصل نہ ہوا تھا آپ جس اخلاص اور محبت سے پیش آئے۔ اس کی دلکشی ذہن سے محو نہیں ہوتی۔ دو حرف شکریے کے لکھے، امید ہے قبول کیجیے۔

ـــ بیت آخر شد وقت خموشی کردی

مجھے اپنا خادم سمجھیے اور کوئی خدمت میرے لائق ہو تو بلا تامل ارشاد کیجیے۔ بیگم صاحبہ سے بھی میرا سلام کہیے گا۔

بندہ خاکسار

احمد شاہ بخاری

۲۳ نومبر ۱۹۵۴ء

بیگم آمنہ مجید ملک کے نام

۱

نیویارک

۱۵ ستمبر ۵۱ء

عزیز بہن۔ وہ جسے مراسلت کہتے تھے نہ معلوم وہ دنیا سے اٹھ گیا۔ یادوں پر زوال چھا گیا یا بڑھاپے نے سب کو آن لیا۔ بہرحال کچھ نہ کچھ انقلاب ضرور آ گیا ہے۔ دفتری خط اور تار دھڑا دھڑ آتے ہیں کسی دوست کا خط نہیں آتا۔ حال میں ریاض احمد صاحب (ریڈیو انجینئر) آئے تو ان کی زبانی معلوم ہوا کہ مجید صاحب بہت عرصہ صاحبِ فراش رہے۔ زمانے کا رنگ بدل نہ گیا ہوتا تو میں اتنا عرصہ ایک عزیز دوست کی علالت سے بے خبر رہتا؟ آپ ہی مجھے لکھ بھیجتیں کہ مجید صاحب بیمار ہیں دعا کیجیے۔ گنہگار کی دعا پر آپ کیا تکیہ کرتیں لیکن دوستوں بھائیوں اور عقیدت مندوں کو اپنے دکھ میں شریک کرنے کا ایک بہانہ ہوتا۔ کچھ عرصہ ہوا ایک شناسا سے سرسری سنا تھا کہ مجید صاحب کو دل کی تکلیف ہے میں نے سن کر حسبِ معمول ہنسی میں اڑا دیا۔ ان کا یہ وہم یارانِ سرپل کے حلقے میں مدت سے ایک لطیفہ بن چکا ہے۔ جنھوں نے خبر سنائی وہ کچھ تفصیل بھی نہ بتا سکے لیکن جب ریاض صاحب سے مفصل حال معلوم ہوا تو بہت تشویش ہوئی اور میں از حد اداس ہو گیا۔ مجید صاحب کے کئی نقشے ذہن میں آتے ہیں اور آ سکتے ہیں۔ ایک سے ایک بے ڈھنگا لیکن یہ نقشہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ بستر پر دراز ہوں۔ خدا ان کا حامی و ناصر ہو اور خدا انہیں اور آپ کو ہر پریشانی سے مامون و مصئون رکھے۔ انہیں میرا بہت بہت پیار دیجیے۔ اے کاش میں ان کے پاس ہوتا۔ اور ان کا دل بہلا سکتا۔ ہو سکے تو ان کی خیریت کے متعلق دو حرف لکھ بھیجیے تاکہ مجھ کو کم از کم اس قدر بُعد کا احساس نہ ہو اور میں آپ کی تشویش میں آپ کا ان کا شریک ہو سکوں۔

میں کام کرتے کرتے تھک گیا۔ خیال تھا کہ جس زمانے میں ڈاکٹر گراہم کشمیر کی الجھنوں میں مصروف ہوں گے میں چپکے سے ایک چھوٹی سی تعطیل

ہو سکیں گوشۂ عافیت میں گزار سکوں چھپا رہوں گا۔ اور صحت کچھ روز ان کا۔ لیکن کام کے پہنچتے ہی وہ ہنگامہ برپا ہوا کہ میں کام سے ہل نہ سکا۔ اب نومبر میں پھر پہنچتا ہے وہاں اسمبلی تین چار مہینے رہے گی درمیان میں کرسمس کا وقفہ بھی ہوگا۔ لیکن نہیں معلوم کتنا طویل یا کتنا مختصر۔ نہ معلوم پاکستان کب آنا نصیب ہو۔ دل سخت اداس ہے۔

احباب کی یاد کبھی دل سے محو نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی کوئی لطیفہ کان تک پہنچ جاتا ہے تو طبیعت دن بھر کو رنگین ہو جاتی ہے ورنہ اکثر یہ کیفیت رہتی ہے کہ ماں میرے بھیا کو بھیجو ری کہ ساون آیا۔

ہم نے دوست خدا کے فضل سے ایسے پائے ہیں کہ گنتے ہیں تو ان میں ہر ایک عالم اجل اور شاعر اعظم اور جانے کیا کیا ہے لیکن خط لکھنا کسی کو نہیں آتا۔ کسی زمانے میں ایسے ہی بے بس لوگوں کے لئے شاہ عالمی دروازے اور چاندنی چوک دہلی میں ایک کتاب "عاشقانہ خط و کتابت" کے نام سے بکا کرتی تھی۔ کئی عشق اس کتاب کی بدولت پنپے اور سرخرو ہوئے وہ کتاب بھی اب نایاب ہے

تمہیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیوں کر ہو

نہ معلوم خلیفہ حکیم صاحب کا کیا حال ہے اور وہ کہاں ہیں میں نے امریکہ میں کئی مرتبہ ان کا ذکر کیا یا اس کی گونج ان تک بھی پہنچی ہوگی لیکن ان کی جانب سے ابھی تک بھی نہ سنا۔ دی بیگم شاہد علی صاحبہ (کس قدر ادب سے ان کا نام لے رہا ہوں) کو میرا سلام پہنچے۔ خدا کرے میرے خط پہنچنے تک آپ کی تشویش مجید صاحب کے بارے میں دور ہو چکی ہو۔ اور آپ اطمینان سے مجھے ان کا اور اپنا، اور احباب و اقربا کا حال بتا سکیں۔

آپ کا خاکسار بھائی

بخاری

بیگم فیض کے نام

①

لندن

۱۰ر اپریل ۵۰ء

پیاری ایلس

سخت تعجب ہے کہ تم میرا القاب صرف "بخاری" لکھتی ہو، نہ مسٹر، نہ صاحب، نہ پروفیسر، تم عورتیں ہم مردوں کے بارے کب سے ہوتی ہیں جو یہ بے تکلفی برتنے لگیں۔ بچے بڑوں سے ہمسر کب سے ہو گئے، کب سے .... لیکن خیر اتنا ہی کافی ہے۔ میں ہمیشہ سے مختصر ڈانٹ کا قائل ہوں جو شفقت اور قرینے سے پلائی جائے اس کا اثر زیادہ دیر پا ہوتا ہے۔ مجھے ذرا بھی شبہ نہیں کہ تم ابھی سے اپنے کئے پر نادم ہو اور آئندہ کے لئے مؤدب اور متادب بننے کا عہد کر چکی ہو۔

تمہاری دعوت تمہارے خط سے بہت مسرت ہوئی۔ راشدؔ ([illegible]) سے جو خطوط آتے ہیں ان میں اکثر تمہاری ملاقات کا ذکر ہوتا ہے۔ تمہارے بچوں کی صحت پہلے تو بہیں بد نصیبی کی [illegible] (دا بیٹا) [illegible] اپنی تشویش کی جانب [illegible] اور مجھے امید ہے کہ تم اس کی پروا میں بہت وقت نہیں گنوا دیتی ہو۔ بہرصورت اپنی بہنوں کے لئے تمہاری محبت کا شکر گزار ہوں۔ تمہارے گھر کا اکثر احساس شدت سے یاد [illegible] کوشش سے رفیق گزر دی ہے۔

بہت اچھا ہوا کہ تم نے یاد کرایا میں چاہتا تھا کہ کہیں سے 'فیض' کی نظموں کی طرف اور میں جانتا تھا کہ وہ خود آ کبھی سکے گا نہیں۔ شاہد صاحب جو مشہور کہیں؟ کہیں سے سنا تھا کہ راستے میں بیچ سے ہیں جہاں سادہ پانی اور نانِ جویں ہے اس کی تلاش ابھی ہے پھر سنا کہ وہ اپنی بات سے پھر گئے ہیں اور میزبانی کی پیش کش واپس لے لی ہے۔ ٹھیک سے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کس بات پر زیادہ ہنسی آتی۔ اس پر کہ اسے بند کر رہے ہیں یا اس پر کہ نہیں کر رہے ہیں۔ دوسری بات پر ہی مجبور، گر پڑے تو شاید ماورٰی' میں عام آدمی یا وہ پسند کرتا لیکن میں اور تم (کہ جس رات کے ہو سے ہیں) غالباً یہی چاہیں گے کہ وہ ہمارے پاس ہی رہے اس کے بجائے کہ اسے دیکھنے کے لئے ہم قدم بڑھاتے پھریں۔ ویسے وہ تو تمہارے پاس ہے کہ ؟ میرا مطلب ہے پہلے سے زیادہ۔ اب میں جو وہاں نہیں ہوں۔ امید تو یہی ہے، اور یوں نہیں تو کیوں ؟

یہاں موسم مستقل خوشگوار ہے۔ کیو (KEW) باغ میں میگنولیا، میگنولیا اور چیری کے شگوفوں سے آگ سی لگ رہی ہے لیکن پیارے کے لئے تمہارا دل بہت ترستے تھے تو یہ کہہ سن لو کہ یہاں زندگی واقعی کٹھن ہے میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ گھر والے کل آئیں؟ آٹھ دس یا دس ہفتہ سے نانوں نہیں وہ بسر کیسے کرتے ہیں کھانے پینے کی چیزیں کمیاب ہیں، اور ہم ہیں انہیں پکانے میں فلاکت کر دیتے ہیں۔ لوگ لاپروا ہو گئے ہیں۔ بیرے آپ کے سامنے چیزیں یوں لا کے رکھتے ہیں کہ میاں لو جی چاہے تو کھاؤ ورنہ مت کھاؤ۔

آج کل لندن میں لنکاشائر (LANCASHIRE) والوں کا جو ہے بادشاہی جوڑے کی شادی کی نقرئی سالگرہ کے جلوس (تمہارے کیسی پیاری لگ رہی تھی) گذشتہ ہفتے گروزوینر سکوائر میں مسز روزویلٹ اور ان کے خاوند کے مجسمے کا افتتاح تھا (بہت اچھا ہے) تو یونہی چلتا ہے لندن شہر ——— آج کل تھیٹر کے دن نہیں لیکن پھر بھی جوں توں شیکسپیئر، برنارڈ شا، گورکی اور شان اوکیسی کے کچھ کھیل دیکھے اور کچھ نہایت ہی عمدہ اطالوی، جرمن اور فرانسیسی فلمیں کرزن میں دیکھیں کچھ اکادمی اور سٹوڈیو وغیرہ میں، تبھی تو معلوم ہے کہاں کہاں۔ اگلے دن میں آڈن ([illegible]) سے ان کی نظمیں سننے گیا تھا۔ روی میکنیس ([illegible]) نے اہتمام کیا تھا۔ فیض کو سلام پہنچے۔ کنگسلے مارٹن سے ابھی ملاقات نہیں ہوئی کل شام ایک تقریب میں ان کا انتظار رہا لیکن وہ دکھائی نہیں دیے۔ سہ ماہی کا کام ابھی شروع نہیں ہوا۔ ہندوستانی وفد ابھی نہیں پہنچا۔ تاخیر کی کوئی وجہ تو کسی نے بتائی نہیں۔ یہ باور کرنے کی توقع کی جاتی ہے کہ کسو پھنس پڑی ہو گی یا ایسی ہی معصوم اور قدرتی وجہ کوئی اور ہو گی چنانچہ میں اکمال منتظر، [illegible] کر رہا ہوں۔

کبھی (اچھا کبھی سہی) اگر یاد آئے تو انہیں میرا پیار پہنچا دینا، میرا مطلب ہے واقعی پہنچا دینا اور تمہارے روزے سے بچوں کو بھی یا شاید ایک ہی بچہ ہے یاد نہیں رہتا کبھی ——— بتاؤ کوئی چھوٹی موٹی چیز تمہیں چاہئے تو لیتا آؤں، کچھ ہو تو لکھ دینا

بہت سے

[illegible]

(انگریزی سے ترجمہ)

۱؎ ۱۲ اپریل گذشتہ [illegible] کی مراسلت، جہاں اس زمانے میں بخاری صاحب مقیم تھے۔

۲؎ بیگم بخاری

۳؎ بخاری صاحب انڈیا آفس لائبریری کی تقسیم کے سلسلے میں لندن گئے تھے۔

منیزہ فیض کے نام

۴۔ ریورویو ٹیرس نیویارک

۲۰ ؍ نومبر ۱۹۵۰ء

پیاری منیزہ۔ کافی عرصہ ہوا تمہارا ۲۶ ؍ اگست کا خط ملا تھا۔ تم نے یہی دل میں سوچا ہوگا کہ چچا بڑے سست ہیں۔ اگر یہی سوچتی ہو تو حق بجانب ہوگی بھی۔ بات یہ ہے کہ ان دنوں میری صحت اچھی نہیں رہی اس کے باوجود مجھے کام بھی کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے خط و کتابت کا سلسلہ بند رہا۔ اب میں تندرست ہوں اور تمہارا خط سامنے رکھ کر جواب لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔

میں تمہیں خط اپنے دفتر سے لکھ رہا ہوں جو اقوام متحدہ کے سیکرٹریٹ کی عمارت میں دوسری منزل پر واقع ہے۔ اس عمارت کی انتیس منزلیں ہیں ایک مستطیل سا مینار سی سمجھو۔ دور سے دیکھو تو یوں لگتی ہے جیسے ماچس کی ڈبیہ کنارے پر کھڑی ہو۔ مطلع آج اتفاقاً نہایت صاف ہے۔ سورج کی روشنی کھڑکیوں میں سے اندر آرہی ہے۔ یہ کھڑکیاں دریا کی جانب کھلتی ہیں جو اوپر سے نظر آتا ہے۔ یہ دریا ہڈسن کی ایک شاخ ہے جو یہاں سے کچھ فاصلے پر پھر اسی میں جا ملتا ہے۔ اسے یہاں دریائے ایسٹ کہتے ہیں۔ اس وقت جب میں لکھ رہا ہوں تو بڑی بڑی کشتیاں اور تیل کے بڑے جہاز اس میں تیرتے پھرتے ہیں۔ پانی دھوپ میں چمک رہا ہے۔ دور نیچے کی طرف مجھے ان پلوں میں سے ایک پل نظر آرہا ہے جو دریائے ایسٹ پر باندھے گئے ہیں۔ اس پل کا نام ولیمز برگ ہے۔ ویسے یہاں سب سے مشہور پل بروکلن کا ہے۔ یہ اتنا ہی مشہور ہے جتنا ہڈسن کی مغربی شاخ پر جارج واشنگٹن پل ہے جس کی تصویر تم نے ضرور دیکھی ہوگی۔

موسم سرما کی آمد آمد ہے۔ ابھی بھی سردی سخت سی ہے۔ نیویارک شہر میں ابھی برف نہیں پڑی۔ لیکن دسمبر کے آخر اور جنوری فروری میں پڑے گی۔

یہاں خزاں کا موسم سب سے دلکش ہوتا ہے۔ امریکی لوگ اسے "FALL" کہتے ہیں۔ یہ ستمبر میں ہوتا ہے۔ اس موسم میں درختوں کے پتے پہلے زرد اور پھر نارنجی کی طرح سرخ ہو جاتے ہیں۔ جنگلوں میں جیسے آگ سی لگ گئی ہو۔ جہاں کہیں درخت اُگے ہوتے ہیں وہ جگہ بس رنگریز کا کوچہ معلوم ہوتی ہے۔ جیسے اس نے پیارے پیارے دوپٹے رنگ کر سوکھنے کے لئے پھیلا دیے ہوں۔ بڑی سڑک کے دونوں طرف دور دور تک قدرتی مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ سڑک پر کار چلانے میں بڑا لطف آتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ گھنٹوں ان گھنے جنگلوں میں بیٹھ کر تالابوں اور جھیلوں میں پڑتے ہوئے آتشیں رنگ کے درختوں کے عکس کا نظارہ کیا جائے۔ اس سال بھی فصل خزاں خوب رہی۔ عام طور پر موسم خوشگوار رہا۔ کئی روز تک لگاتار جنگلوں میں گھوما جا سکتا تھا۔ اور سیر کی جا سکتی تھی۔

جب تم نے مجھے خط لکھا تو تمہاری امی ولایت سے واپس آچکی تھیں اور ابا ابھی وہیں تھے۔ اب تک تو وہ بھی لوٹ آئے ہوں گے۔ انہیں میرا سلام کہنا اور سلیمی کو پیار دینا۔ مجھے یہ بھی بتانا کہ تم نے اب تک تیرنا سیکھ لیا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو اس کی مشق کرتی رہو۔ یہ ایک ایسی تفریح ہے جو حاصل نہ کی جائے تو زندگی میں ایک خلا سا محسوس ہوتا ہے۔ تمہارا سنڈیکیٹ تو خوب ہی چلتا ہوگا۔

جب جی چاہے مجھے خط لکھنا مگر لکھنا ضرور۔

اور دیکھو سب کو میری جانب سے ایک بار پھر پیار دینا۔ بھولنا مت۔

تمہارا پیارا

اے ایس بخاری

---

[1] یہ خط فیض احمد فیض کی بچی کے نام ہے۔

پچھے چھپے میں نے اس خط کی پیشانی پر جو پتہ لکھا ہے مہربانی کر کے اسے نوٹ کر لینا اور آئندہ یہی لکھنا۔ اس سے مجھے جلد مل جایا کرے گا۔ یہ میرے گھر کا پتہ ہے۔ میں ایک آدھ ماہ میں یو۔این چھوڑ رہا ہوں اور یہاں کی ایک یونیورسٹی میں کام کروں گا۔ اس لئے تم میرے رہائشی پتہ پر ہی خط لکھنا۔

(انگریزی سے ترجمہ)

سید امتیاز علی تاج کے نام

①

ڈیر امتیاز۔ دسمبر کے آخر میں دو مہینے کی رخصت لوں گا جو بیشتر دلی میں اور باقی کسی پہاڑی مقام پر گزاروں گا۔ یکم مارچ کو پرنسپل گورنمنٹ کالج کا چارج لینا ہے۔

جوں جوں واپسی کے دن قریب آتے جاتے ہیں دل میں عجیب امنگیں پیدا ہوتی ہیں۔ یہاں کے اتنے سال تم سے وابستہ رہ کر گزرے ہیں۔ ہر امنگ کے ساتھ تم آپ ہی آپ دل میں چلے آتے ہو۔ کبھی کبھی ڈرتا ہوں کہ نہ معلوم اس درمیانی عرصہ میں طبیعتوں کی آب و ہوا ہی نہ بدل گئی ہو۔ لیکن یہ سوچتا ہوں کہ جوانی کے علاقے اور رشتے کبھی ڈھیلے پڑ جاتے ہیں کبھی تن جاتے ہیں لیکن موت سے پہلے ٹوٹتے نہیں۔ اور الحمد اللہ کہ تم اور میں دونوں ابھی موت سے بہت دور ہیں۔ اس امید کی بنا پر لاہور آنے کے خیال سے بجز مسرت کے اطمینان کے کوئی جذبہ دل میں نہیں اٹھتا۔ تابستان کی طویل دوپہریں اور برسات کی مرطوب راتیں اور احباب کی طویل ہرزہ گوئیاں پھر یاد آتی ہیں۔

بہت تھک گیا ہوں۔ گیارہ سال بجز بیماری کے ایک دن کی بھی رخصت نہیں لی۔ موسم گرما کی تین مہینے کی چھٹیاں اور دوستوں کی گرم صحبتیں پھر جاری ہے۔ زبیدہ واپس جانے پر اتنی خوش ہیں کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ حجاب کو ہم دونوں کا سلام تسلیم، مراد یاسین کو پیار۔ کل حمید صاحب اور تاثیر سے ملاقات ہوئی۔ خدا ثریا کی زندگی کو کامران بنائے۔ بہت سی باتیں کرنے کو دل چاہتا ہے لیکن اب ان کے لئے کئی موقعے نصیب ہوں گے۔ ۲۰ نومبر کو چند دن کے لئے شاید دورے پر بھی لاہور آجاؤں۔ کیا تم اس خط کے جواب میں خط لکھو گے؟

خاکسار

بخاری

۲۔ دسمبر

---

②

یکم جون

یادش بخیر۔ "دو حسینیا" ۳ جون سنیچر کو دلی سے ہو رہا ہے۔ رفیع پیر اور رشید خود پارٹ کر رہے ہیں۔ اس لئے عین آخری وقت میں انہوں نے پروڈکشن میرے حوالے کر دی ہے۔ وقت تھوڑا ہے۔ مصروفیت زیادہ۔ اس لئے داد فن کاری نہ دے سکوں گا۔ اس کا افسوس رہے گا۔ تاہم ایک آدھ بات آپ ایسی ضرور پائیں گے کہ دل پژمردہ نہ ہو گا۔ فرصت ہو تو سن لیجئے گا اور مجھے اپنی رائے سے مطلع کیجئے گا۔ فرصت نہ ہو یا RECEPTION برا ہو

...آپ محمد ریاض ڈار ہو رہیں۔ اور آپ کسی وقت لاہور اسٹوڈیو میں جا کر اسے سن لیں۔ مدت سے موقع ملنے کے سلسلے میں آپ سے کچھ تعلق قائم ہوا۔ اس کی [illegible] پیغام بھیجا ہے۔ تاہم پرانی یاد تازہ ہوئی اور دل لگ بھی گئی ہے [illegible] دلی آؤ گے [illegible] سالک [illegible] آنے کا پروگرام بنا [illegible] پہلے شاہی باغیچے کے نام کرو۔

بخاری

۳

گورنمنٹ کالج لاہور

برادر بلالی

ڈیئر استیاز نیویارک میں میں نے چار برس [illegible] خیال تھا کہ اس کے بعد جیسے تو جیسے کے لئے [illegible] لیکن مسلسل صرف [illegible] اس میں سے بھی پانچ چھ دل لگا کر ضائع ہوئے [illegible] بالآخر [illegible] ہو گئی۔ اب پرسوں کراچی واپس چلا جاؤں گا [illegible] وہاں سے انشاء اللہ نیویارک [illegible] نہ معلوم کب رخصت ہو گی [illegible] سب ٹھیک ہو جائے [illegible] وہاں [illegible] کا انتظام ضرور وہاں رہے گا۔ اور [illegible] باقی [illegible] رہ گئی [illegible] لاہور چلی واپس گئی

احباب سے فردا فردا رخصت ہو لیا۔ آپ سے تاثیر صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی [illegible] یہاں پہنچا [illegible] پہلے ملتان روانہ ہو گئے [illegible] ملنے کا بہت شوق [illegible] نہ معلوم کب ملاقات ہو [illegible] سلسلے [illegible] جاری ہیں۔ جانے سے پہلے آپ سے [illegible] گزاری [illegible] خیال ہے۔ [illegible] لاہور سے پھر [illegible] تین دن اور راتیں اس لیے [illegible] لاہور چھوڑنے کا کچھ قلق [illegible] سال کی [illegible] قیام ہو گا [illegible] پاسپورٹ، سوٹ کیس کا خیال آتے ہی [illegible] لاہور میں [illegible] زندہ ہو گا [illegible] گزر رہے ہیں کہ کچھ آپ کی [illegible] سمجھ سکتے ہیں [illegible] دنیائے عشق میں [illegible] کہاں تک [illegible] نہیں کوئی ہمراز [illegible] کون [illegible] کتاب زندگی [illegible] مضمون کا متن تھا رحمت علی خاں کا تذکرہ کیا [illegible] گزشتہ صحبت [illegible] کے ستارے مولانا عبد المجید خاں سالک [illegible] اثر پڑتا تھا [illegible] صاحب کون تھے [illegible] کے کیا معنی [illegible] ایک دور تھا جو گزر گیا۔ اس کے [illegible] سالک، سلمان، آپ [illegible] میں حکیم احمد شجاع [illegible] ہو گئے [illegible] ہو گئے۔ یوں بھی مدت سے ان کا دین اور [illegible] کی دنیا سے الگ [illegible] کا زمانہ یاد کیجئے اور پھر [illegible] ان کا شام بھر [illegible] نہیں پڑھا [illegible] اس کے [illegible] معلوم ہوتا ہے۔ باقی کون رہ گئے؟ آپ کے [illegible] آپ ہوتے تو اس میں [illegible] دخل دیتا [illegible] میرا پیشہ ہے آپ میرے پرانے [illegible] ہیں [illegible] یہ کاروبار عادت ہو گیا ہے اب [illegible] معلوم ہو گا۔ خلیفہ عبدالحکیم سے بھی خدا حافظ کہنے گیا معلوم ہوا وہ مری چلے گئے ہیں۔ ان کا پتہ مجھے معلوم نہیں ان کو میرا سلام اور پیار کہیے گا۔ بلکہ تکلیف کر کے [illegible] مل لیجئے گا۔ (تکلیف کی تکلیف میری [illegible]) بعض لوگوں نے یہاں میرے متعلق مجھ سے بدگمانی کا اظہار کیا [illegible] خلیفہ عبدالحکیم کا نام لیا [illegible] معلوم ہوا ہے۔ نہ معلوم خلیفہ صاحب نے کیا غیر [illegible] باتیں میرے متعلق کم فہم آدمیوں کے حلقے میں کی ہیں۔ خلیفہ صاحب کو ذرا متنبہ کر دیجئے۔ ان

کی دوست پیسے کی پرستش نہیں مردم شناسی پر مصر ہے۔ وہ خود بھی کچھ ہیں اور کچھ فطرت اُن کی بدولت خدا کی بخشش رہ چکے ہیں۔ میری طرف سے ان کے لئے دعا کیجئے کہاں سے لکھوں کہ بعد ازاں اب تم جلسے ہو گئے ہو اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گلبیز است۔ بہ بانگ چنگ مخور مے کہ محتسب تیز است۔ لوگ آج کل شعر کا رستہ ڈھونڈنے نکالنے میں بڑے طاق ہیں۔ بات پر یاں زبان کٹتی ہے۔

یونیورسٹی وغیرہ کے حالات جس قدر سنے تھے کم ہوئے۔ بہ حال اب امید ہے اصلاح ہو جائے۔ ستے لوگوں کو سمجھیں گے خط لکھنے کا شوق آپ کو مدت سے کم ہو رہا ہے مجھے ابھی باقی ہے لیکن تحریک ہونی چاہیئے۔ سالک اس معاملے میں دلکش ہیں خط لکھتے رہتے ہیں۔ جن سے یہاں کی محفلوں کا پورا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ انہیں جواب میں ہر مرتبہ خط لکھتا ہوں اگر آپ بھی کبھی کبھی کرم فرمائی کریں تو مجھے دور افتادگی کا احساس کم ہوگا۔ بہرحال آپ کی خیریت کی خبر ہمیشہ طمانیت کا باعث ہوگی۔ مجلس سے میرا سلام کہئے اور یاسمین کو میری جانب سے پیار۔ میرا پتہ نیویارک میں مختصراً یہ ہے ——— PAKISTAN HOUSE, NEWYARK, U.S.A.

ہوائی ڈاک سے خط بھیجنا مہنگا پڑتا ہے لیکن نہ اتنا کہ خط و کتابت کے مانع ہو۔ والسلام

آپ کا مری کا پتہ معلوم نہ ہو سکا۔ لاہور کے پتہ پر خط بھیج رہا ہوں۔ سنا ہے آپ عنقریب آنے والے ہیں۔

خاکسار

بخاری

۴

نیویارک ۲۵ اگست ۵۸ء

ڈیر امتیاز۔ تمہارا خط ملا۔ تمہاری پریشانیوں کا حال پڑھ کر دل کو بہت صدمہ ہوا۔ یہ قدرت کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ تم جیسا انسان جس نے عمر بھر زندگی کے لطیف اور مرغوب و رنگین پہلوؤں ہی سے سروکار رکھا اور خاندان میں اپنے فرائض کو تندہی سے سرانجام دیا زمانے کے ہاتھوں یوں تکلیف اٹھائے۔ مجھ جیسا آدمی تو معلوم ہوتا ہے اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وقتاً فوقتاً کسی کی مخاصمت یا ایذا رسانی کا ہدف بنے لیکن تمہارے حسنِ طبیعت اور حسنِ اخلاق کا صلہ یہ ہرگز نہیں کہ لوگ تمہاری مخالفت پر آمادہ ہوں یا تم سے انصاف کرنے میں متامل ہوں....

..... یہ دور ایسا ہے کہ اس میں دوستیوں اور رفاقتوں کے خون ہوتے ہی رہیں گے۔ شاید لوگ اس زمانے میں کسی ذہنی مرض میں مبتلا ہیں۔ جس کی وجہ سے حرص و آز اور بے مروتی سب باتوں پر غالب ہے۔ خدا تمہیں تقویت دے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اپنے علو طبیعت اور اپنی بیوی اور بچی کی محبت اور رفاقت کی بدولت اپنی پریشانیوں پر غلبہ پا لو گے۔ میں تمہارا ایک حقیر دوست ہوں اور بے بس اور دور افتادہ۔ لیکن اگر میری محبت تمہارے کسی کام آ سکتی ہے تو یقین جانو کہ وہ تم سے نہ کبھی دریغ رکھتی ہے نہ رکھ سکتا ہوں۔ میں ایسا شخص نہیں جسے بآسانی سلیم الطبع کہا جا سکے۔ میری لغزشیاں تم پر اور سب دوستوں پر واضح ہیں۔ کیونکہ تم سب کو ان سے پالا پڑ چکا ہے اور تم سب نے وقتاً فوقتاً بلکہ اکثر انہیں درگزر کیا ہے لیکن میرا عمر بھر کا تجربہ اور خود میرا رجحانِ طبیعت یہ کہتا ہے کہ دنیا میں دوستی سے بڑھ کر اور کوئی نعمت نہیں۔ اسی لئے کوئی دوست چھن جائے یا دور ہو جائے تو میں کئی راتیں اور کئی دن اس کا ماتم کرتا ہوں۔ افسوس کہ ہم کو دوست اب کم رہ گئے ہیں۔ تقریباً ہر ایک تفکرات یا ہوس کی گرداب میں اُلجھا ہے اور نکل نہیں سکتا تاہم سالک جیسے لوگ مغتنمات روزگار میں سے ہیں۔ وہ تمہارے پاس نہ آئیں تو تم ہی چلے جایا کرو۔ اس سے غم غلط ہوگا۔ اور جو مصائب پہاڑ سے نظر آتے ہیں وہ اتنے صبر شکن معلوم نہ ہوں گے۔ فیض اور ایلس بھی

مایوسی پہنچ چکی ہوں گے۔ ملنسار لوگ ہیں اور ان کی محبت بھی مرہم کا کام دے گی سب سے بڑھ کر خدا نے تمہیں نیک طینت اور فطانت فہم بیوی عطا کی ہے اور ایک بچی جو حقیقتاً تمہاری بہترین امیدوں کا محور ہو گی ان کی صحبت میں تفکرات کو بھول جاؤ۔ اگر ہمیشہ کے لئے نہیں تو کم از کم ہر روز چند گھنٹوں ہی کے لئے سہی۔ جو لوگ تمہیں اطمینان سے محروم کر رہے ہیں۔ غور سے دیکھیں تو ان کو خود تم سے آدھا اطمینان بھی نصیب نہیں۔

کتابیں میں نے کتب فروش کی دکان پر منتخب کی تھیں۔ اور ان سے کہا تھا کہ پارسل بنا کر تمہارے پتہ پر بھیج دیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ساتھ تمہیں کوئی خط یا پرزہ نہ ملا۔ طالبیوں کی کتاب میں نے اس خیال سے بھیجی تھی کہ شاید اس کا اردو میں ترجمہ ہو سکے۔ ان بیبیوں کے کلام نے تو جولانیاں پائی ہیں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ خود حجاب ہی سب سے پہلے اس کی قدرداں ہوں گی۔

اس سال کے آخر تک یو این او سے کنارہ کش ہونے کا ارادہ ہے۔ کولمبیا یونیورسٹی نے پروفیسری کا وعدہ کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک آدھ سبیل کچھ اور کرنی پڑے گی ورنہ آمدنی میں جو کمی واقع ہو گی اس کا سہارنا مشکل ہو گا۔ دو بچے ابھی پڑھتے ہیں۔ ایک یہاں ایک زبیدہ کے ساتھ کراچی میں۔ پھر کچھ فکر دل کی تدبیر بھی کرنا پڑتا ہے۔ اور یہاں کے ڈاکٹر قابل سہی لیکن دنیا بھر سے زیادہ مہنگے ہیں۔ سالک صاحب کا خط آیا۔ انہوں نے اطمینان قلب کے لئے ترجمے کی راہ نکالی ہے۔ وہ ادھر ادھر ترجمے کر رہے ہیں۔ اور بس غنیمت ہے۔ ترجموں کے علاوہ موت کا خوف ان پر ضرورت سے زیادہ طاری رہتا ہے۔ شاید انہیں یہ احساس ہے کہ زندگی سے جو کچھ حاصل ہو سکتا تھا وہ نہ ہوا۔ حالانکہ کم از کم ان کو یہ شکایت نہ ہونی چاہئے۔ آپ اور وہ دونوں ہمیشہ دوستوں اور سب لوگوں کے منظور نظر رہے ہیں۔ یہ بھی کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ خدا آپ کو ہمیشہ ہمیشہ عزت اور آبرو سے رکھے۔ کولمبیا میں مجھے اردو زبان پر بھی لیکچر دینے ہیں۔ اس کے لئے میرے پاس کوئی کتاب یہاں نہیں۔ ضرورت پیش آئی کہ کسی مخیر دوست کی معرفت ایسی کتابیں فی الفور جمع کر لوں۔ تاکہ دسمبر جنوری تک لیکچر تیار کر سکوں۔ صوفی تبسم ذہن میں آئے۔ انہوں نے فہرست مرتب کی لیکن کتابیں بھجوانے کا کام مستعدی سے سرانجام نہ دے سکے چنانچہ معاملہ کہیں ان کے اور پبلشر کے مابین لٹک رہا ہے۔ آپ مدد کر سکیں اور اس کے لئے فرصت نکال سکیں تو کیا کہنے۔ میں نے تو دانستہ آپ کو تکلیف نہ دی تھی کہ آپ اپنے مشغل میں گرفتار ہوں گے۔ اردو افسانوں کا ترجمہ میں پھر بھی کرنا چاہتا ہوں بلکہ یہ میری زندگی کی بہت بڑی آرزو ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم صاحب . . . . . سے امید نہیں کہ وہ میری مدد کریں گے۔ آپ اور فیض صاحب خود ہی افسانوں کا انتخاب کر لیجئے۔ حجاب کو میرا سلام اور یاسمین کو میرا پیار پہنچے۔ خط ضرور لکھتے رہیے۔

آپ کا خادم

بخاری

۲۵ اگست

۵

۱۱ مئی ۵۵ء نیو یارک

ڈیر امتیاز۔ واپس پہنچنے کے چند دن بعد آپ کو ایک خط لکھا تھا جو ہر چند کہ جواب طلب نہ تھا تاہم بتقاضائے عشق جواب کا منتظر رہا۔ لیکن اب تک آپ کے خط سے محروم ہوں۔ خیال تھا آپ اپنے ادبی عزائم کے متعلق مزید کچھ بتائیں گے۔ کیا ادھر کیا بنا۔ دو ایک کتابیں بھی آپ کو بھجوائی تھیں۔ بہت اچھی تھیں لیکن میری کفایت شعاری کا ثبوت مزید ان سے ملا ہو گا۔ افسوس کہ کتابیں بمجبوری سمندر کی ڈاک سے بھجوانی پڑتی ہیں۔ ہوائی ڈاک سے بھجوائیے تو پانچ ڈالر کی کتاب پر کم و بیش اتنا ہی خرچ آئے۔ جیب اجازت دے تو عقل اجازت نہیں دیتی۔ میتھ (MYTH) کے آغاز کے بارے میں میں نے اپنے ماہر دوستوں سے کہا کہ بھائی ڈھونڈ کے دو۔ وہ ضرورت سے زیادہ ماہر نکلے۔ سب کہتے ہیں کہ اس کے متعلق کئی نظریے ہیں۔ میں فلاں کا قائل ہوں۔ اور فلاں قیاس

بالکل بے حس و حرکت آدمی ہے وغیرہ وغیرہ۔ آخر فیصلہ کیا ہے کہ زانو سے پرے پیر باندھ کے میں خود ہی ٹرسٹ ڈالوں گا۔ مجھے علم ہے کہ آپ کو ایک کتاب ([illegible]) انشاء اللہ بھجواؤں گا۔ حال ہی میں نکلی ہے اس کا نام ہے "نظر بد" یعنی " EVIL EYE "۔ ایک ماہر چشم ڈاکٹر نے لکھی ہے جو اس میں آنکھ اور نظر کے متعلق جو جو توہمات لوگوں میں مروج ہیں انہیں یکجا کر دیا ہے۔ "نظر بد" بھی ان میں سے ایک ہے اور اس کی تاریخ بھی مختصر طور پر لکھ دی ہے لیکن باقی بھی نقد و نظر سے مفید اور دلچسپ ہیں مثلاً عام خیال ہے کہ رات کو پڑھنے سے یا ریل گاڑی میں پڑھنے سے نظر پر برا اثر ہوتا ہے اور عینکیں خراب ہو جاتی ہیں۔ مصنف نے صاف صاف بیان کیا ہے کہ یہ غلط ہے اور اس وہم کا ڈاکٹری میں کوئی جواز نہیں ملا۔ کتاب کا آخری عنوان ہے "STUDIES IN THE FOLK-LORE OF VISION." میرا خیال ہے اس کتاب کا اردو میں ترجمہ یا خلاصہ بے حد مفید ثابت ہوگا۔ باقی کتاب پہنچنے پر آپ خود اندازہ لگا لیجیے۔

مجھے اس سال موسم خزاں میں ایک یونیورسٹی میں ہند، پاکستان اور زبان و ادب کی تاریخ پڑھانی ہے۔ میں صوفی تبسم سے بوساطت ایلس فیض (کیونکہ صوفی صاحب آج کل مجموعہ کے انسان ہیں) مناسب مفید کتابوں کی (اردو اور انگریزی دونوں) فہرست منگوا بھیجی ہے وہ آنے پر دیکھوں گا کہ کون سی کتابیں یہاں موجود ہیں۔ جو نہ ہوں گی وہ پاکستان سے منگواؤں گا۔ اور غالباً اس میں آپ کی دستگیری کی ضرورت بھی ہوگی۔ امید ہے دریغ نہ کریں گے۔ مجھے وہ اقبال کے ترجموں کا منصوبہ جو آپ کے مکان پر بعد طعام باندھا گیا تھا اور جس میں مجلس اقبال کو عموماً اور آپ کو خصوصاً پہل کرنی تھی۔ اس کا کیا ہوا۔ لاہور سے چلا آیا تو اس کے متعلق سے برخاست کچھ اس پر بھی روشنی ڈالیے۔ میں بے چینی سے اس کا منتظر ہوں۔

چند ہفتوں کی بات ہے میں ایک لیکچر کے موقعے پر بر سر عام لیکچر دیتے بے ہوش ہو گیا۔ اس کے بعد ایک مرتبہ پھر یہی واقعہ پیش آیا۔ بیسیوں ڈاکٹروں کو دکھایا۔ فی الحال خواہ مخواہ علاج جاری ہے۔ لیکن کچھ ٹھیک تشخیص نہیں ہو سکی۔ کیونکہ دل وغیرہ بالکل درست ہیں۔ کام اور تعطلات کی کثرت کا جرم قبول کرنے میں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ہیملٹ کی بے ہوشی کے اسباب مستور ہیں ہمیں قیاس ہے کہ ہماری بے ہوشی بھی آنے والی نسلوں کے لیے مبہم رہے گی۔ لیکن حد ہو گئی۔ میں سمجھتا تھا کہ "غش کھانا" وغیرہ داستانوں کے ساتھ ختم ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ اس رسم کے زندہ رکھنے والے ابھی باقی ہیں۔

سالک، فیض، صوفی ان تینوں کو جب میں میرا سلام کہیے تو چغتائی صاحب کے ہم کلام ہونے کا موقع نکلے تو ان سے کہیے وہ مجھے ذرا خط لکھیں کہ ان کے یہاں آنے میں کیا رکاوٹ پیش آئی۔ خلیفہ صاحب میں تو ا۔ ن۔ گ۔ مل۔ ی کر دیجیے گا۔

اہل بھائی، آغا بشیر اور حفیظ پیر کو بھی میرا سلام کہیے گا۔

حجاب یاسمین کو میرا سلام و پیار۔

خاکسار

بخاری

---

⑥

پاکستان ہاؤس۔ نیویارک

۱۲؍ اگست

ڈیر امتیاز۔ تنہائیوں میں آپ اکثر یاد آئے اور اس ایک سال کے عرصے میں کئی تنہائیاں مجھ پر گزریں لیکن پے در پے مصروفیتوں اور بیماریوں نے کئی شکستہ ارادوں کو پژمردہ کر دیا۔ کبھی خط لکھنے کی نیت باندھی تو شروع کرنے کی نوبت نہ آئی۔ حال ہی میں سالک صاحب کے دو تین خط آئے۔ ن۔ م۔ راشد سے

سے کچھ ادبی حلقے لکھیے اور اردو نقادوں کا ایک طبقہ [illegible] دیانت سے طبیعت کو [illegible] شفقت سے یاد آتے۔ ایک کتاب [illegible] کے ہاں دل پشاوری ہو رہا تھا [illegible] آنندی [illegible] نصیحت [illegible] تار دہلوی کے سپرد ہے [illegible] سب مقدمے ہیں کہ [illegible] پڑھا کی جہل اور تعصب کا مغز ہے [illegible] ساقی [illegible] کہتے ہیں [illegible] غالب [illegible] خواجہ صاحب اور پڑھتے [illegible] کا نام [illegible] ہے [illegible] زندہ [illegible] یہ [illegible] کہ " hack writer called Agha Hashr a third rate poetaster " [illegible] اور حوالات [illegible] کہ انہیں [illegible] ستاروں میں لٹا دیا ہے [illegible] دل میں آگ لگ گئی [illegible] کاش آپ [illegible] پر بھی [illegible] کتاب لکھ [illegible] پاس ہے [illegible] آپ نے تقریر پر جو کی ہے وہ [illegible] کتاب [illegible] چاہیے [illegible] معلوم [illegible] گا۔ میں بھی اس کام میں شریک [illegible] جب [illegible] کوئی کام [illegible] حائل ہوئی تو اسے دور کر سکے گا لیکن اگر [illegible] کا کام مستقل معلوم ہوتا [illegible] کتاب [illegible] آپ کا [illegible] تجربہ اور علم تو آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ ہو جائے گا۔ [illegible] بعد [illegible] کی شکل میں دریافت ہو سکیں

لاہور کے حالات سے بے خبر ہوں البتہ سالک صاحب [illegible] معلوم ہوا [illegible] سالک صاحب ہجرت کے بعد [illegible] ہو گئے ہیں [illegible] رنگینی [illegible] بہرحال لاہور [illegible] دم تک عشق رہے گا ہماری جوانی اس سے تھی [illegible] شباب کے [illegible] یہ بھی گمان ہوتا تھا اس کی جوانی ہم سے ہے۔ دیار محبوب کی ہر خبر طبیعت میں ایک تلاطم پیدا کر دیتی ہے اور کوئی خبر آئے تو [illegible] معلوم ہوتی ہے۔ ہندوستان سے جو خبریں [illegible] اس کی اطلاع [illegible] پہنچتی ہے۔ تفصیلات کے لیے [illegible] معلوم [illegible] صاحب کے [illegible] شاید [illegible] الیکشن کی ہوس نے [illegible] اخبارات سے معلوم ہوتا ہے [illegible] نے ان کے [illegible] رکھا ہے۔ [illegible] کا حامی [illegible] یہاں کے [illegible] اور سیاست دان [illegible] پاکستان کی ہمت اور [illegible] کے معترف ہوتے جاتے ہیں [illegible] پاکستان کے لیڈروں کے تدبر [illegible] کے قائل۔ لیکن کوئی [illegible] بندہ ہندوستان کے کان نہیں [illegible] سب اپنا الو سیدھا کرتے ہیں۔

بڑے بڑے ظلم دیکھنے میں آئے [illegible] آپ کو تھیٹر اور سینما میں اپنے ساتھ لے گیا۔ اور آپ سے تبادلۂ خیالات کرتا رہا لیکن طبیعت کو اس سے کیا تسکین ہوتی۔ ہندوستان کے متعلق ایک بڑے تماشے کا فلم " THE RIVER " ستمبر میں یہاں آنے والا ہے۔ " JEAN RENOIR " نے ڈائرکٹ کیا ہے۔ ہندوستان کی سرزمین میں بنا ہے اور ایکٹر امریکن، انگریز اور ہندوستانی ہیں۔ زوروں کی پبلسٹی ہو رہی ہے پاکستان کے "دستاویزی" فلم بہت کھوٹے ہیں۔ اور اچھے نہیں۔ اس بارے میں بہت کچھ کہہ سکتا ہوں لیکن پھر کبھی لکھوں گا۔ قلم زنگ آلود ہے۔ آپ کی جانب سے کوئی خط آئے تو طبیعت پھر شگفتہ ہو جائے گی۔ حجاب کو میرا سلام شوق۔ یاسمین کو پیار۔

خیریت و بہبود کا طالب

خاکسار

بخاری

بنام ہاجرہ مسرور

گریٹ نیک نیویارک
۵ دسمبر ۱۹۵۵ء

محترمہ —

آپ کے خط سے طبیعت بھی بہلی لیکن تشنگی بھی رہی۔ رسالوں کا جو حال آپ نے بیان کیا ہے وہ کم و بیش وہی معلوم ہوتا ہے جو میری ادبی جوانی کے زمانے میں تھا لیکن ادب دوش کر خدا نے وہ نوخیز شاعر کہ بادِ صبا آٹھ سے شگوفے کے رگ رگ میں روشنی بھرنے سے باز نہیں آتا۔ آپ نے شام کا ذکر جس جگہ میں بھی پھول اُگتے ہیں جب شاعری زندگی کا دار و مدار ایک جاہل اور جابر سلطان پر تھا تب بھی اس نے ایسے جیالے تماش رکھے کہ اس کے علاوہ کسی راہ میں پرکھے نہیں۔ سب سے زیادہ دلکش کشش تو امریکہ جیسے ملکوں میں ہے جہاں منڈی کے بغیر کوئی چیز بک ہی نہیں سکتی۔ یہاں کوئی آپ سے پوچھے کہ آپ کامیاب شاعر یا افسانہ نگار ہیں یا ناکامیاب تو مطلب صرف یہی ہوتا ہے کہ آپ نے پیسے کمائے یا نہیں۔ نہ یہ کہ آپ کو حسنِ فروغِ شمعِ سخن نصیب ہوا یا نہیں۔

یہاں تک تو آپ کے ساتھ ہوں یعنی مضمون سے جو گریز آپ نے کیا ہے اس سے ساتھ پر بل نہیں آنے دیا لیکن میں سمجھتا تھا آپ کے خط سے احباب کا حال معلوم ہوگا۔ ندیم صاحب اور خدیجہ اور آپ کے شب و روز کا کوئی نقشہ آپ کے خط میں نظر آئے گا۔ جو ملاقات کا کام دے۔ کچھ آپ کے خط سے لاہور کی سیر ہو گی اور اس عزیز شہر کی خیریت معلوم ہو گی۔ کیا اس کے باغوں میں اب بھی سفیدے کے اونچے اونچے درخت خوشبو سے لدے کھڑے ہیں۔ کیا اب بھی راوی جنگلوں کی یاد میں سسکتا رہتا ہے یا امرلوں کی گہری اور تاریک سبزی اب بھی عنابی بادلوں کے ساتھ آتی ہے اور برسات میں ملاتی ہے؟ آنکھیں ان سوالوں کا جواب ڈھونڈھتی رہیں لیکن ناکام رہیں۔ یا شاید بے نظر ہو چکی ہیں اور ہمیں معلوم بھی نہیں۔ پھر خط لکھنے کا موقع ہو تو ان مجلسوں کا حال مزہ لے کر بیان کیجئے جن کی یاد دل سے کبھی محو نہیں ہوتی تو معلوم ہو مجھ غریب کا حشر کیا ہوگا۔ دنیا کے ہر کونے میں دل کا ایک پارہ کسی نہ کسی گلی میں مرغِ بسمل کی طرح تڑپ رہا ہے۔ یہ سب ٹکڑے کب یکجا ہوں گے۔

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیوں کر ہو ؟

میں چند دن کے لئے یہاں (جنیوا) کام کے سلسلے سے آگیا ہوں۔ مضافات میں تنگ پگڈنڈیاں ہیں۔ انگوروں کی بیلوں سے ڈھکی ہوئی۔ دن بھر کوہ بلانک کی برف پوش چوٹی چاندی کی سی دھوپ میں چمکتی رہتی ہے دن ڈھلتے ہی فضا میں اور جھیل پر ایک پُراسرار نیلاہٹ چھا جاتی ہے۔ یہاں روح کو وسعت نصیب ہوتی ہے اور کئی پیچ و تاب تحلیل ہو جاتے ہیں۔ اس لئے سال میں دو تین مرتبہ یہاں ضرور آ جاتا ہوں۔ ہفتے عشرے تک نیویارک واپس چلا جاؤں گا۔

خاکسار
بخاری

احمد ندیم قاسمی کے نام

ہوٹل ماریا کرسٹینا
میکسیکو۔ ۱۹ فروری ۱۹۴۹ء

مکرمی ندیم صاحب! آپ کو خط لکھے عرصہ ہوا اور آپ کو تو شاید یہ بھی یاد ہو کہ آپ نے اور ہاجرہ نے اور خدیجہ نے مشترکہ طور پر وعدہ کیا تھا کہ ادب کی دنیا سے

لگتا ہے کہ کوئی کتاب، کوئی رسالہ، کوئی نظم، کوئی افسانہ، کوئی خط وہ مجھ تک پہنچتا رہے گا۔ سبب یہ وعدہ لیل دنا ہوا کہ اردو تحریر دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں۔ کمیلو کو خلافِ توقع دل کش اور رنگین پایا اور کانفرنس کی وجہ سے مصروفیت اس قدر رہی کہ اپنی وہ افتادگی پر آہ بھرنے کی بھی مہلت نہ ملی۔ تاہم کسی گٹار بجانے والے کی تان کبھی رات کی خاموشی میں تیرتی ہوئی دل کے پاس سے گزر جاتی ہے یا ہسپانوی وضع کے مکانوں کی رومانی کھڑکیوں اور محرابوں اور سرو کے درختوں پر مور سے ظن کی سی شوخ دھوپ چمکتی ہے اور ٹھنڈے ٹھنڈے سائے گھاس پر لیٹ جاتے ہیں یا کونوں میں چھپ کر جا لیتے ہیں تو لاہور والوں کا رابطہ یاد آتا ہے۔ سالک صاحب کے انقلاب کا جوبلی نمبر دیکھا تو اس میں آپ کی نظم سے آنکھیں سیراب ہوئیں۔ اب معلوم ہوا کہ نقوش پھر آزاد ہو گیا ہے تو دل چاہا کہ آپ کو مبارک باد کا خط لکھوں۔ ہاجرہ کی کتاب غالباً چھپ گئی ہوگی۔ اگر یہ قیاس درست ہے تو انہیں بھی میری طرف سے مبارک ہو اور ہاجرہ، خدیجہ دونوں کو میرا سلام پہنچے۔ نہیں معلوم کہ کب واپس آؤں گا۔ دل چاہتا ہے جنوبی امریکہ میں کچھ ادھر اُدھر آوارہ گردی کروں۔ اور نیویارک، واشنگٹن وغیرہ کا علیحدہ تو بہرحال رہے گا۔ لیکن ابھی جنتری پر نگاہ ڈالنے کا موقع نہیں۔

خاکسار

بخاری

(نوٹ: یہ خط سالنامہ نقوش لاہور ۱۹۵۰ء میں شائع ہو چکا ہے)

بنام حکیم یوسف حسن

محترم بندہ جناب حکیم صاحب!

آپ کا خط ملا۔ گویا یاد آوری سلام روستائی کے سلسلے میں تھی لیکن پھر بھی ممنون ہوں۔ ڈاکٹر اقبال کی ذرہ افزائی سے میرا حوصلہ تو بہت بڑھا لیکن نہ اتنا کہ مضمون کا وعدہ کر سکوں۔ چونکہ میرا پہلا امتحان ہے اور موسم اس قدر خوش گوار ہو رہا ہے کہ دریا کے کنارے اس جھیل کے پاس جہاں بائرن کے تخیل کو پرواز نصیب ہوئی تھی یا کسی پھول سے لدے ہوئے سبزہ زار میں گھسنے اور بلند درختوں کے درمیان زندہ رہنے کو دل چاہتا ہے۔ اس دوگونہ عذاب کا نتیجہ یہ ہے کہ آستیانہ جیسے عزیز دوست کی فرمائشوں کی تعمیل سے بھی معذور ہوں اور سالک جیسے مقتدر شفیق کے خط کی رسید تک بھیجنے سے قاصر، سزا بھگت رہا ہوں۔ عرصہ ہوا، دوستوں سے خط لکھنا بند کر دیا۔

سوچتا ہوں تعطیلات شروع ہو لیں، وہ خط لکھوں گا کہ دوستوں میں کھلبلی مچ جائے۔ اس ہیجان کے دوران میں ہو سکا تو نیرنگِ خیال کی خدمت بھی کروں گا۔

رسالہ دیکھ کر آنکھیں روشن ہو گئیں پھر بھی میری کج بیں طبیعت کو اصلاح کی گنجائش نظر آئی لیکن اس کا الزام آپ کو نہیں دیتا۔ ہندوستان کی بدنصیبی ہے اور کیا کہوں۔ مجھے ذرا لاہور واپس آ لینے دیجیے۔

خاکسار

بخاری، عمانوئیل کالج کیمبرج

(نیرنگِ خیال ستمبر ۱۹۲۶ء)

بنام کلیم الرحمٰن

نیویارک، ۲۰ دسمبر ۱۹۵۵ء

عزیزی مشفق، سلام مسنون!

گرامی نامہ ملا۔ آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر۔ کام دل چسپ معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال ابھی فرصت نہیں۔ ذرا مجھے کاغذ پر ہاتھ دھرلوں۔ " [illegible] I BELIEVE" یا اسی قسم کے عنوان سے بہت سی کتابیں اور مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ معلوم نہیں آپ کے زیر نظر ان میں سی کتب اس امر کی ہیں۔ [illegible] لئے آپ کے نیویارک کے دفتر سے کتابیں پہنچیں گی تو پورا حال معلوم ہوگا۔

آپ کا نام جب زبان پر آتا ہے تو آپ کے والد مرحوم ڈاکٹر خلیل الرحمٰن کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ میں ان کا قائل اور معتقد تھا۔ اخلاق کے [illegible] علم و دانش کا خوشہ چیں تھا۔ آپ نے جس خاندان میں تربیت پائی ہے وہ آپ کے حسن اخلاق اور معلومات کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کفیل ہے اور رہے گا۔ [illegible] کے علاوہ آپ خود بھی ماشاء اللہ [illegible] کے مالک ہیں۔ اس لئے [illegible] صاحب [illegible] صاحب کے سامنے آپ سے ایسی ہی توقعات [illegible] ہے اور آپ کی زندگی ہر طرح کامران رہے۔

آپ کی بہبود کا طالب
احمد بخاری

بنام حامد علی خاں

①

مشفقی حامد علی خاں صاحب، سلام مسنون

مجھے معلوم ہوا کہ میں نے آپ کے خطوط اور مسودوں کی رسید آپ کو نہیں بھیجی۔ مسودے حسب مطابق فہرست مجھے مل چکے ہیں اور ان سب پر میں نے نظر ثانی کر لی ہے۔ کسی مضمون کو مختصر کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ کیونکہ گو ایک آدھ مضمون پیمانے سے ذرا طویل ہے لیکن نہ اتنا کہ قینچی استعمال کئے بغیر چارہ نہ ہو۔ البتہ ترجموں میں بہت سی جگہ تعقدات تھی جو اکثر ترجموں میں پائی جاتی ہے۔ اسے میں نے دور کرنے کی کوشش کی ہے ورنہ بعض اوقات تو مطلب ہی فوت ہوا جاتا تھا۔

تمہید تقریباً تیار ہے۔ محض انتظار اس بات کا ہے کہ آپ نے جو مزید مسالہ بھیجنے کا وعدہ کیا ہے اسے بھی دیکھ لوں۔ ترتیب کے بارے میں میرا مشورہ یہ ہے کہ پہلا حصہ پاکستانی دوسرا امریکن ہونا چاہیے۔ پاکستانی حصے میں پہلا مضمون قائد اعظم کا اور امریکن حصے میں پہلا مضمون آئزن ہاور کا۔ باقی مضامین کی ترتیب ابجد کے لحاظ سے۔ تاکہ کسی کو شکایت نہ ہو کہ شمع پہلے میرے سامنے کیوں آئی۔ کیا آپ کو اس سے اتفاق ہے؟

ایک بات اور ذہن میں آئی۔ وہ یہ کہ جہاں جہاں (خواہ امریکن حصے میں خواہ پاکستانی حصے میں) مضمون انگریزی سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ وہاں مضمون کے آخر میں قوسین کے اندر بخط خفی لکھ دیا جائے (انگریزی سے ترجمہ) تاکہ لوگ طرز تحریر کی اجنبیت کو خود صاحب مضمون کی اختراع نہ سمجھیں۔

مضامین نگاروں میں خود شامل ہونا میں مناسب نہیں سمجھتا۔ میرے لئے تمہید نگار رہنا ہی مناسب ہے اور بس۔ جواب کا منتظر، خاکسار بخاری

کہ ابتداءً مضامین ابھی بغیر مزید رسالے کے انتظار کے بھیج دوں تاکہ کتابت شروع ہو جائے۔

---

(۲)

مشفقی، سلام مسنون!

ابھی ابھی آپ کا رجسٹری خط مورخہ ۱ ستمبر مع بقیہ مسودات کے ملا۔

مضامین کی ترتیب کے متعلق میں حال ہی میں آپ کو ایک خط لکھ چکا ہوں لہٰذا اس کے متعلق جو میرا مشورہ ہے اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ امید ہے آپ اس سے متفق ہوں گے۔

اب اگلی ڈاک سے انشاءاللہ دیباچہ ارسال خدمت کروں گا اور مسودات بھی واپس بھیج دوں گا۔ خاکسار

نیویارک۔ ۹ ستمبر ۱۹۵۸ء بخاری

---

(۳)

مشفقی جناب حامد علی خاں صاحب، سلام مسنون!

آج ہی ایک علیحدہ پیکٹ بذریعہ رجسٹری آپ کے نام روانہ کر دیا ہے۔ جس میں ۲۹۔ پاکستانیوں کے مسودے اور ۳ غیر پاکستانیوں کے شامل ہیں نیز ۱ مضمون کی اصل انگریزی بھی اسی پیکٹ میں بھیج دی ہے۔ زحمت نہ ہو تو رسید سے ضرور مطلع فرمائیے۔ میں متشکر رہوں گا۔ دیباچے کا مسودہ منسلک ہذا ہے۔

ترجموں پر نیز دیگر مضامین پر میں نے حتی الامکان بڑے غور سے نظرِ ثانی کی ہے۔ مترجمین نے بعض حصے تو اپنی بساط سے بڑھ کر کیا ہے، بعض جگہ ذرا گھاس کاٹی۔ مضامین یوں بھی ABSTRACT ہیں۔ اگر ان میں روانی اور سلاست بھی نہ ہو تو ان کا پڑھنا اور ان سے لطف اندوز ہونا بالکل ہی مشکل ہو جاتا ہے۔ بہرحال اب جس حالت میں مسودات آپ تک پہنچ رہے ہیں امید ہے آپ انہیں خاطر خواہ پائیں گے۔

تاخیر کے لئے میں آپ سے نادم ہوں اول تو کاہلی کی وجہ سے اور کچھ بیماری کے بگاڑ کی وجہ سے فرصت کم رہی۔ پھر ایک طویل دیباچہ لکھا تھا، جسے حالات کے تغیر و تبدل نے بے کار بنا دیا۔ دوسری مرتبہ لکھا تو پھر وہی کیفیت ہوئی۔ آخر تنگ آ کر میں نے ایک مختصر سے دیباچے ہی پر اکتفا کی ہے۔ آپ پڑھیں گے تو یقیناً اندازہ ہو جائے گا کہ میرے دیباچے کس ڈھنگ کے اور کس موضوع پر تھے۔ اب ان کا موقع نہیں۔

مضامین کو ابجد کے لحاظ سے آپ خود ترتیب دے لیجئے۔ اور اپنے نظم و نسق کے مطابق کتابت موقع پر شروع کرا دیجئے۔ اب تو سب مرحلے طے ہو چکے اب زیادہ تاخیر کے لئے کوئی جواز باقی نہیں رہا۔

جب میں نے سنا کہ مکتبہ فرینکلن کے کرتا دھرتا آپ ہیں تو بے حد مسرت ہوئی۔ آپ یقیناً اس کام کے لئے بہت موزوں ہیں، میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ہرگز مجھ سے دریغ نہ رکھیں، بلکہ خادم دیرینہ سمجھیں۔ خاکسار بخاری

(نوٹ: یہ خط ۵ دسمبر ۱۹۵۸ء کو عین اس روز لاہور پہنچا جس شام پطرس کی وفات کی خبر ریڈیو پاکستان سے نشر ہوئی۔ یہ خط اسی کتاب سے متعلق ہے جس کا غیر مطبوعہ دیباچہ اس رسالہ میں درج ہے اور یہ کتاب مکتبہ جدید چھاپ رہا ہے۔)

بنام عبدالقدیر رشک

عزیزی رشک سلمہ اللہ تعالیٰ

سلام مسنون! آپ جانتے ہیں کہ اردو ادب سے مجھے گہرا لگاؤ رہا ہے۔ خیال تھا کہ اس دفعہ کی سیاحی میں کچھ لکھیں لیکن [illegible] آنکھیں اردو کتابیں دیکھنے کو ترس گئی ہیں۔ اول تو کتابیں ملتی ہی نہیں، مل جائیں تو فرصت کہاں!

ہم لوگ مشینوں کی طرح صبح سویرے اٹھتے ہیں، جلدی جلدی کھانا کھایا اور کسی دفتر چل گئے۔ شام کو واپس ہوٹل میں وارد ہوئے۔ شام کا وقت روح افزا وقت ہو یا نہ ہو [illegible] طبیعت بجھی ہوئی ہو یا افسردہ، ہم ہیں کہ دوسرے ذہن کی خاطر نہایت شگفتہ طبعی اور خندہ دلی سے باتیں کئے جا رہے ہیں۔ اس وقت اس شہر میں ہزاروں لوگ ہوں گے جو دنیا و مافیہا سے بے خبر نیند کے مزے اڑا رہے ہوں گے لیکن ہم کچھ ایسے بد طالع سعادت آثار واقع ہوئے ہیں کہ نہ نیند کی پروا، نہ طعام کا ہوش۔ عقلمندان سیاست کا حکم ہوتا ہے کہ بعض باتیں سمجھ جاؤ۔ ایسے حال میں بندہ کیا اردو ادب کے متعلق کیا لکھوں ؎

بات بگڑی ہے کچھ ایسی کہ بنائے نہ بنے

دو تین [illegible] اردو ادب کی جو کتابیں نظر سے گزری ہیں ان سے آپ یہی اندازہ ہوتا ہے کہ آج سے چند سال پہلے آپ کا اردو ادب فرسودہ اور تقلیدی عناصر سے بری طرح الجھا ہوا تھا۔ اس میں نہ زندگی کے خدوخال اور خیالات تھے نہ تازہ صلاحیتوں کی ترجمانی جو تخیل کی آغوش میں نہیں، واقعات کی دنیا میں پرورش پاتی ہیں۔ ان میں کئی اشعار نشتر پنہاں ہوں گے، اور کئی مصرعے دھڑکتے دل، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس میں حیات کے نشیب و فراز، زندگی کی شورش و استقامت اور انسانی مسائل کی امید افزا کرنیں نہیں پھوٹتیں۔

جوں جوں زندگی کے تقاضے بدلتے گئے، ہمارے یہاں کے اکثر ادیبوں نے راہ گریز چھوڑ کر زندگی کو اپنایا۔ انہوں نے نہایت نازک زبان کے ذریعے ملکی ادب کو آرٹ کی نئی وسعتوں سے دوچار کیا۔ علاوہ ازیں پاکستان میں جس زمانے کے سایہ میں اردو ادب کی نشو و نما ہوئی، تمدنی اور سیاسی اعتبار سے ایک ایسے ابتلا کا زمانہ ہے جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

رومانیت کا دور گزر چکا۔ اب اردو ادب زندگی کے تلخ حقائق اور شعوری محرکات کا ادراک رکھتا ہے۔ وہ انسانی عظمت اور انسانی کارناموں کے اظہار سے مملو ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں صحت مند ادب جب تک زندہ رہے گا اس کا اہم ترین موضوع انسان ہی ہو گا۔

سماجی زندگی میں ادیب کی حیثیت سنگ میل کی سی ہوتی ہے۔ معاشرہ کی سربلندی اور انسانی بہبود کے لیے فنکارانہ تاثرات کو دوسرے افراد کی نسبت انسانی خدمات میں زیادہ کارآمد ہونا چاہیئے۔ وہ عصر حاضر کے جن ادیبوں نے اردو ادب میں زندگی کو اپنایا ہے ملک کے دانشور اور عوام ان کی خدمات سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔

ہم دوسروں کے مقابلے ادب کی استوار کردہ عمارتوں کو شاداب بنانا چاہتے ہیں اور ایسے ادب کی پشت پناہی کر سکتے ہیں جو انسانی خدمات کے لئے زیادہ کارآمد ہو۔

کاش میرے پاس وقت ہوتا اور میں زیادہ کچھ آپ کو بتا سکتا لیکن عدیم الفرصتی کے ہاتھوں مجبور ہوں۔

بخاری

پطرس کے مضامین

یعنی مضامین

اے۔ ایس۔ بخاری

بی۔ اے (کینٹب) ایم۔ اے پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور
سابق ڈائرکٹر جنرل براڈکاسٹنگ

فہرست مضامین

اظہارِ عقیدت ۴۷۳
دیباچہ ۴۷۴
ہاسٹل میں پڑھنا ۴۷۵
سویرے جو کل آنکھ میری کھل ۴۸۴
کتے ۴۹۰
اُردو کی آخری کتاب ۴۹۳
میں ایک میاں ہوں ۴۹۵
مرید پور کا پیر ۵۰۱
انجام بخیر ۵۰۸
سینما کا عشق ۵۱۳
میبل اور میں ۵۱۷
مرحوم کی یاد میں ۵۲۰
لاہور کا جغرافیہ ۵۲۱

اظہارِ عقیدت

میں اپنے استادِ محترم پروفیسر مرزا محمد سعید صاحب دہلوی کا ممنون ہوں جنھوں نے اس کتاب پر نظر ثانی کی اور اسے بعض لغزشوں سے پاک کیا۔

میں اس بات پر فخر کرتا ہوں کہ مجھے اب بھی اُن سے فیضِ تلمذ حاصل ہے۔

پطرس

دیباچہ

اگر یہ کتاب آپ کو کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے۔ اگر آپ نے کہیں سے چرائی ہے۔ تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں۔ اپنے پیسوں سے خریدی ہے۔ تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ آپ اس کتاب کو اچھا سمجھ کر اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کریں۔

ان مضامین کے افراد سب خیالی ہیں۔ حتیٰ کہ جن کے لیے وقتاً فوقتاً واحد متکلم کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ وہ بھی ہر چند کہیں کہ ہیں نہیں ہیں۔ آپ تو اس نکتے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں لیکن کئی پڑھنے والے ایسے بھی ہیں۔ جنھوں نے اس سے پہلے کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ ان کی غلط فہمی اگر دور ہو جائے تو کیا ہرج ہے۔

جو صاحب اس کتاب کو کسی غیر ملکی زبان میں ترجمہ کرنا چاہیں۔ وہ پہلے اس ملک کے لوگوں سے اجازت حاصل کریں۔

"پطرس"

ہاسٹل میں پڑھنا

ہم نے کالج میں تعلیم تو ضرور پائی۔ رفتہ رفتہ بی۔ اے بھی پاس کر لیا۔ لیکن اس نصف صدی کے دوران میں جو کالج میں گزارنی پڑی ہاسٹل میں داخل ہونے کی اجازت ہمیں صرف ایک ہی دفعہ ملی۔

خدا کا یہ فضل ہم پر کب اور کس طرح ہوا۔ یہ سوال ایک داستان کا محتاج ہے۔

جب ہم نے انٹرنس پاس کیا تو مقامی سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب خاص طور پر مبارکباد دینے کے لئے آئے۔ قریبی رشتہ داروں نے دعوتیں دیں۔ محلے والوں میں مٹھائی بانٹی گئی اور ہمارے گھر والوں پر یک لخت اس بات کا انکشاف ہوا۔ کہ وہ لڑکا جسے آج تک اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے ایک بیکار اور نالائق فرزند سمجھتے رہے تھے، دراصل لامحدود قابلیتوں کا مالک ہے۔ جس کی نشوونما پر بے شمار آنے والی نسلوں کی بہبودی کا انحصار ہے۔ چنانچہ ہماری آئندہ زندگی کے متعلق طرح طرح کی تجویزوں پر غور کیا جانے لگا۔

تھرڈ ڈویژن میں پاس ہونے کی وجہ سے یونیورسٹی نے ہم کو وظیفہ دینا مناسب نہ سمجھا۔ چونکہ ہمارے خاندان نے خدا کے فضل سے آج تک کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ اس لئے وظیفے کا نہ ملنا خصوصاً اُن رشتہ داروں کے لئے جو رشتے کے لحاظ سے خاندان کے مضافات میں بستے تھے فخر و مباہات کا باعث بن گیا۔ اور "مرکزی رشتہ داروں" نے تو اس کو پاس وضع اور حفظ مراتب سمجھ کر ممتحنوں کی شرافت و نجابت کو بے حد سراہا۔ بہرحال ہمارے خاندان میں فالتو روپے کی بہتات تھی۔ اس لئے بلاتکلف یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ نہ صرف ہماری بلکہ ملک و قوم اور شاید بنی نوع انسان کی بہتری کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایسے ہونہار طالب علم کی تعلیم جاری رکھی جائے۔

اس بارے میں ہم سے بھی مشورہ لیا گیا۔ عمر بھر میں اس سے پہلے ہمارے کسی معاملے میں ہم سے رائے طلب نہ کی گئی تھی۔ لیکن اب تو حالات بہت مختلف تھے۔ اب تو ایک غیر جانبدار اور بے لاگ منصف یعنی یونیورسٹی ہماری بیدار مغزی کی تصدیق کر چکی تھی۔ اب بھلا ہمیں کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ ہمارا مشورہ یہ تھا کہ ہمیں فوراً ولایت بھیج دیا جائے۔ ہم نے مختلف لیڈروں کی تقریروں کے حوالے سے یہ ثابت کیا کہ ہندوستان کا طریقۂ تعلیم بہت ناقص ہے۔ اخبارات میں سے اشتہار دکھا دکھا کر یہ واضح کیا کہ ولایت میں کالج کی تعلیم کے ساتھ ساتھ فرصت کے اوقات میں بہت تھوڑی تھوڑی فیسیں دے کر بیک وقت جرنلزم، فوٹوگرافی، تصنیف و تالیف، دندان سازی، عینک سازی، ایجنٹوں کا کام، غرضیکہ بے شمار مفید اور کم خرچ بالانشیں پیشے سیکھے جا سکتے ہیں۔ اور تھوڑے سے عرصے کے اندر انسان ہر فن مولا ہو سکتا ہے۔

لیکن ہماری تجویز کو فوراً رد کر دیا گیا۔ کیونکہ ولایت بھیجنے کے لئے ہمارے شہر میں کوئی روایات موجود نہ تھیں۔ ہمارے گرد و نواح میں سے کسی کا لڑکا ابھی تک ولایت نہ گیا تھا۔ اس لئے ہمارے شہر کی پبلک وہاں کے حالات سے قطعاً ناواقف تھی۔

اس کے بعد پھر ہم سے رائے طلب نہ کی گئی اور ہمارے والد، ہیڈ ماسٹر صاحب اور تحصیلدار صاحب ان تینوں نے مل کر فیصلہ کیا کہ ہمیں لاہور بھیج دیا جائے۔ جب ہم نے یہ خبر سنی تو شروع شروع میں ہمیں سخت مایوسی ہوئی۔ لیکن جب ادھر ادھر کے لوگوں سے لاہور کے حالات سنے، تو معلوم ہوا کہ لندن اور لاہور میں چنداں فرق نہیں۔ بعض واقف کار دوستوں نے سینما کے حالات بیان کئے۔ بعض نے تھیٹروں کے مقاصد سے آگاہ کیا۔ بعض نے ٹھنڈی سڑک وغیرہ کے مشاغل کو سلجھا کر سمجھایا۔ بعض نے شاہدرے اور شالامار کی ارمان انگیز فضا کا نقشہ کھینچا۔ چنانچہ جب لاہور کا جغرافیہ پوری طرح ہمارے ذہن نشین ہو گیا تو ثابت ہوا کہ خوشگوار مقام ہے اور اعلیٰ درجے کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بے حد موزوں۔ اس پر ہم نے اپنی زندگی کا پروگرام وضع کرنا شروع کر دیا۔ جس میں لکھنے پڑھنے کو جگہ تو ضرور دی گئی۔ لیکن ایک مناسب حد تک۔ تاکہ طبیعت پر کوئی ناجائز بوجھ نہ پڑے اور فطرت اپنا کام حسن و خوبی کے ساتھ کر سکے۔

لیکن تحصیلدار صاحب اور ہیڈ ماسٹر صاحب کی نیک نیتی یہیں تک محدود نہ رہی۔ اگر وہ صرف ایک عام اور مجمل سا مشورہ دے دیتے کہ لڑکے کو لاہور بھیج دیا جائے تو بہت خوب تھا۔ لیکن انھوں نے تو تفصیلات میں دخل دینا شروع کر دیا۔ اور ہاسٹل کی زندگی اور گھر کی زندگی کا مقابلہ کر کے ہمارے والد پر یہ ثابت کر دیا کہ گھر پاکیزگی اور طہارت کا ایک کعبہ اور ہاسٹل گناہ و معصیت کا ایک دوزخ ہے۔ ایک تو تھے وہ چرب زبان۔ اس پر انھوں نے بے شمار غلط بیانیوں سے کام لیا۔ چنانچہ گھر والوں کو یقین سا ہو گیا کہ کالج کا ہاسٹل جرائم پیشہ اقوام کی ایک بستی ہے اور جو طلبا باہر کے شہروں سے لاہور جاتے ہیں اگر ان کی پوری نگہداشت نہ کی جائے تو وہ اکثر یا تو شراب کے نشے میں چور سڑک کے کنارے کسی نالی میں گرے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ یا کسی جوئے خانے میں ہزارہا روپے ہار کر خودکشی کر لیتے ہیں۔ یا فرسٹ ایر کا امتحان پاس کرنے سے پہلے دس بارہ شادیاں کر بیٹھتے ہیں۔

چنانچہ گھر والوں کو یہ سوچنے کی عادت پڑ گئی۔ کہ لڑکے کو کالج میں تو داخل کیا جائے لیکن ہاسٹل میں نہ رکھا جائے۔ کالج ضرور۔ مگر ہاسٹل ہرگز نہیں۔ کالج مفید مگر ہاسٹل مضر۔ وہ بہت ٹھیک۔ مگر یہ ناممکن۔ جب انھوں نے اپنی زندگی کا نصب العین ہی بنا لیا کہ کوئی ایسی ترکیب سوچی جائے جس سے لڑکا ہاسٹل کی زد سے محفوظ رہے۔ تو کسی ترکیب کا سوجھ جانا کیا مشکل تھا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ چنانچہ از حد غور و خوض کے بعد لاہور میں ہمارے ایک ماموں دریافت کئے گئے اور ان کو ہمارا سرپرست بنا دیا گیا۔ میرے دل میں ان کی عزت پیدا کرنے کے لئے بہت سے شجروں کی ورق گردانی سے مجھ پر یہ ثابت کیا گیا کہ وہ واقعی میرے ماموں ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ میں ایک شیر خوار بچہ تھا تو وہ مجھ سے بے انتہا محبت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ ہم پڑھیں کالج میں اور رہیں ماموں کے گھر۔

اس سے تحصیل علم کا جو ایک ولولہ سا ہمارے دل میں اٹھ رہا تھا۔ وہ کچھ بیٹھ سا گیا۔ ہم نے سوچا۔ یہ ماموں لوگ اپنی سرپرستی کے زعم میں والدین سے بھی زیادہ احتیاط برتیں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے دماغی اور روحانی قویٰ کو پھلنے پھولنے کا موقع نہ ملے گا اور تعلیم کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔ چنانچہ وہی ہوا۔ جس کا ہمیں خوف تھا۔ ہم روز بروز مرجھاتے چلے گئے۔ اور ہمارے دماغ پر پھپھوندی سی جمنے لگی۔ سینما جانے کی اجازت کبھی کبھار مل جاتی تھی۔ لیکن اس شرط پر کہ بچوں کو بھی ساتھ لیتا جاؤں۔ اس صحبت میں بھلا سینما سے کیا اخذ کر سکتا تھا۔ تھیٹر کے معاملے میں ہماری معلومات اندر سبھا سے آگے بڑھنے نہ پائیں۔ تیرنا ہمیں نہ آیا کیونکہ ہمارے

ماموں کا ایک مشہور قول ہے کہ ڈوبتا وہی ہے جو تیراک ہو۔ جسے تیرنا نہ آتا ہو وہ پانی میں گھستا ہی نہیں۔ گھر پر ملنے آنے والے دوستوں کا انتخاب ماموں کے ہاتھ میں تھا۔ کوٹ کتنا لمبا پہنا جائے اور بال کتنے لمبے رکھے جائیں اس کے متعلق ہدایات بہت کڑی تھیں۔ ہفتے میں دو بار گھر خط لکھنا ضروری تھا۔ سگرٹ غسل خانے میں چھپ کر پیتے تھے۔ گانے بجانے کی سخت ممانعت تھی۔

یہ سپاہیانہ زندگی ہمیں راس نہ آئی۔ یوں تو دوستوں سے ملاقات بھی ہو جاتی تھی، سیر کو بھی چلے جاتے تھے۔ ہنس بول بھی لیتے تھے۔ لیکن وہ جو زندگی میں ایک آزادی ایک فراخی ایک وارفتگی ہوتی ہے۔ وہ ہمیں نصیب نہ ہوئی۔ رفتہ رفتہ ہم نے اپنے ماحول پر غور کرنا شروع کیا۔ کہ ماموں جان عموماً کس وقت گھر میں ہوتے ہیں۔ کس وقت باہر جاتے ہیں۔ کس کمرے سے کس کمرے تک گانے کی آواز نہیں پہنچ سکتی۔ کس دروازے سے کمرے کے کس کونے میں جھانکنا ممکن ہے۔ گھر کا کون سا دروازہ رات کے وقت باہر سے کھولا جا سکتا ہے۔ کون سا ملازم موافق ہے۔ کون سا نمک حلال ہے۔ جب تجربے اور مطالعے سے ان باتوں کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا۔ تو ہم نے اس زندگی میں بھی نشوونما کے لئے چند گنجائشیں پیدا کر لیں۔ لیکن پھر بھی ہم روز دیکھتے تھے کہ ہاسٹل میں رہنے والے طلبا کس طرح اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر زندگی کی شاہراہ پر چل رہے ہیں۔ ہم ان کی زندگی پر رشک کرنے لگے۔ اپنی زندگی کو سدھارنے کی خواہش ہمارے دل میں روز بروز بڑھتی گئی۔ ہم نے دل سے کہا۔ والدین کی نافرمانی کسی مذہب میں جائز نہیں۔ لیکن ان کی خدمت میں درخواست کرنا۔ ان کے سامنے اپنی ناقص رائے کا اظہار کرنا۔ ان کو صحیح واقعات سے آگاہ کرنا میرا فرض ہے۔ اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے اپنے فرض کی ادائیگی سے باز نہیں رکھ سکتی۔

چنانچہ جب گرمیوں کی تعطیلات میں ہم دلی کو واپس گئے تو چند مختصر مگر جامع اور مؤثر تقریریں اپنے ذہن میں تیار کر رکھیں۔ گھر والوں کو ہاسٹل پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ وہاں کی آزادی نوجوانوں کے لئے ازحد مضر ہوتی ہے۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ہزارہا واقعات ایسے تصنیف کئے جن سے ہاسٹل کے قواعد کی سختی اچھی طرح روشن ہو جائے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے ظلم و تشدد کی چند مثالیں رقت انگیز اور ہیبت خیز پیرائے میں سنائیں۔ آنکھیں بند کر کے ایک آہ بھری اور بیچارے اشفاق کا واقعہ بیان کیا کہ ایک دن شام کے وقت بیچارا ہاسٹل سے واپس آ رہا تھا۔ چلتے چلتے پاؤں میں موچ آ گئی۔ دو منٹ دیر سے پہنچا۔ صرف دو منٹ۔ بس صاحب اس پر سپرنٹنڈنٹ صاحب نے فوراً تار دے کر اس کے والد کو بلوایا۔ پولیس سے تحقیقات کرنے کو کہا۔ اور مہینے بھر کے لئے اس کا جیب خرچ بند کروا دیا۔ توبہ ہے الٰہی!

لیکن یہ واقعہ سن کر گھر کے لوگ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے مخالف ہو گئے۔ ہاسٹل کی خوبی ان پر واضح نہ ہوئی۔ پھر ایک دن موقع پا کر بیچارے محمود کا واقعہ بیان کیا۔ کہ ایک دفعہ شامت اعمال بیچارا سینما دیکھنے چلا گیا۔ قصور اس سے یہ ہوا کہ ایک روپے والے درجے میں جانے کی بجائے وہ دو روپے والے درجے میں چلا گیا۔ بس اتنی سی فضول خرچی پر اسے عمر بھر سینما جانے کی ممانعت ہو گئی۔ لیکن اس سے بھی گھر والے متاثر نہ ہوئے۔ ان کے رویے سے مجھے فوراً احساس ہوا کہ ایک روپے اور دو روپے کی بجائے آٹھ آنے اور ایک روپیہ کہنا چاہئے تھا۔

انہی ناکام کوششوں میں تعطیلات گزر گئیں۔ اور ہم نے پھر ماموں کی چوکھٹ پر آ کر سجدہ کیا۔

اگلی گرمیوں کی چھٹیوں میں جب ہم پھر گھر گئے تو ہم نے ایک آدھ نیا ڈھنگ اختیار کیا۔ اور سال بھر تعلیم پانے کے بعد

ہمارے سیاہ عیب میں تخفیف سی آگئی تھی۔ پچھلے سال ہاسٹل کی حمایت میں جو دلائل ہم نے پیش کی تھیں۔ وہ اب ہمیں نہایت بودی معلوم ہونے لگی تھیں اب کے ہم نے اس موضوع پر ایک لیکچر دیا۔ کہ جو شخص ہاسٹل کی زندگی سے محروم ہو اس کی شخصیت نامکمل رہ جاتی ہے۔ ہاسٹل سے باہر شخصیت پنپنے نہیں پاتی چند دن تو ہم اس پر فلسفیانہ گفتگو کرتے رہے اور نفسیات کے نقطۂ نظر سے اس پر بہت کچھ روشنی ڈالی۔ لیکن ہمیں محسوس ہوا کہ بغیر مثالوں کے کام نہ چلے گا۔ اور جب مثالیں دینے کی نوبت آئی۔ تو ذرا دقت محسوس ہوئی۔ کالج کے جن طلباء کے متعلق میرا ایمان تھا کہ وہ زبردست شخصیتوں کے مالک ہیں۔ ان کی زندگی کچھ ایسی نہ تھی۔ کہ والدین کے سامنے بطور نمونے کے پیش کی جاسکے۔ ہر وہ شخص جسے کالج میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا ہے۔ جانتا ہے کہ "والدینی اغراض" کے لئے واقعات کو ایک نئے اور اچھوتے پیرائے میں بیان کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ لیکن اس پیرائے کا سوجھ جانا الہام اور اتفاق پر منحصر ہے۔ بعض روشن خیال بیٹے والدین کو کچھ اس طرح مطمئن کر دیتے ہیں کہ ہر مہینے ان کے نام منی آرڈر پہ منی آرڈر چلا آتا ہے ؎

بناداں آں چناں روزی رساند
کہ دانا اندراں حیراں بماند

جب ہم ڈیڑھ مہینے تک شخصیت اور ہاسٹل کی زندگی پر اس کا انحصار ان دو مضمونوں پر وقتاً فوقتاً اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے تو ایک دن والد نے پوچھا۔

"تمہارا شخصیت سے آخر مطلب کیا ہے؟"

میں تو خدا سے یہی چاہتا تھا کہ وہ مجھے عرض و معروض کا موقع دیں۔ میں نے کہا "دیکھئے نا! مثلاً ایک طالب علم ہے۔ وہ کالج میں پڑھتا ہے۔ اب ایک تو اس کا دماغ ہے۔ ایک اس کا جسم ہے۔ جسم کی صحت بھی ضروری ہے اور دماغ کی صحت تو ضروری ہے ہی۔ لیکن ان کے علاوہ ایک اور بات بھی ہوتی ہے۔ جس سے آدمی گویا پہچانا جاتا ہے۔ میں اس کو شخصیت کہتا ہوں۔ اس کا تعلق نہ جسم سے ہوتا ہے نہ دماغ سے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی کی جسمانی صحت بالکل خراب ہو اور اس کا دماغ بھی بالکل بیکار ہو۔ لیکن پھر بھی اس کی شخصیت ——— نہیں خیر دماغ تو بیکار نہیں ہونا چاہیئے۔ ورنہ انسان خبطی ہوتا ہے ——— لیکن پھر بھی اگر ہو بھی ——— گویا شخصیت ایک ایسی چیز ہے ——— ٹھہریئے میں ابھی ایک منٹ میں آپ کو بتاتا ہوں۔"

ایک منٹ کی بجائے والد نے مجھے آدھ گھنٹے کی مہلت دی۔ جس کے دوران میں وہ خاموشی کے ساتھ میرے جواب کا انتظار کرتے رہے۔ اس کے بعد میں وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔

تین چار دن کے بعد مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مجھے شخصیت نہیں کہنا چاہیئے۔ شخصیت ایک بے ڈھنگا سا لفظ ہے۔ سیرت کے لفظ سے نیکی ٹپکتی ہے۔ چنانچہ میں نے سیرت کو اپنا تکیہ کلام بنا لیا۔ لیکن یہ بھی مفید ثابت نہ ہوا۔ والد کہنے لگے۔ "کیا سیرت سے تمہارا مطلب چال چلن ہے یا کچھ اور؟"

میں نے کہا "چال چلن ہی کہہ لیجئے۔"

"تو گویا دماغی اور جسمانی صحت کے علاوہ چال چلن بھی اچھا ہونا چاہیئے۔"

میں نے کہا "بس یہی تو میرا مطلب ہے۔"

"اور یہ چال چلن ہاسٹل میں رہنے سے بہت اچھا ہو جاتا ہے؟
میں نے نسبتاً نحیف آواز سے کہا "جی ہاں"۔
"یعنی ہاسٹل میں رہنے والے طالب علم نماز روزے کے زیادہ پابند ہوتے ہیں۔ ملک کی زیادہ خدمت کرتے ہیں۔
لیتے ہیں۔ نیک زیادہ ہوتے ہیں!"
میں نے کہا "جی ہاں"۔
کہنے لگے "وہ کیوں؟"

اس سوال کا جواب ایک دفعہ پرنسپل صاحب نے تقسیم انعامات کے جلسے میں نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا تھا۔
ہنے اُس وقت توجہ سے سُنا ہوتا!

اس کے بعد پھر سال بھر میں ماموں کے گھر میں "زندگی ہے تو خزاں کے بھی گزر جائیں گے دن" گاتا رہا۔
ہر سال میری درخواست کا یہی حشر ہوتا رہا۔ لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ ہر سال ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ لیکن اگلے
لی چھٹیوں میں پہلے سے بھی زیادہ شدومد کے ساتھ تبلیغ کا کام جاری رکھتا۔ ہر دفعہ نئی نئی دلیلیں پیش کرتا۔ نئی نئی مثالیں
جب شخصیت اور سیرت والے مضمون سے کام نہ چلا تو اگلے سال ہاسٹل کی زندگی کے انضباط اور باقاعدگی پر تبصرہ کیا۔
ے سال یہ دلیل پیش کی کہ ہاسٹل میں رہنے سے پروفیسروں کے ساتھ ملنے جلنے کے موقعے زیادہ ملتے رہتے ہیں۔ اور ان
طرح ملاقاتوں سے انسان پارس ہو جاتا ہے۔ اس سے اگلے سال یہ مطلب یوں ادا کیا کہ ہاسٹل کی آب و ہوا بڑی اچھی
غذا کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔ مکھیاں اور مچھر مارنے کے لئے کئی کئی افسر مقرر ہیں۔ اس سے اگلے سال یوں
کہ جب بڑے بڑے حکام کالج کا معائنہ کرنے آتے ہیں۔ تو ہاسٹل میں رہنے والے طلبا سے فرداً فرداً ہاتھ ملاتے ہیں۔ اس
ہتا ہے۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا۔ میری تقریروں میں جوش بڑھتا گیا۔ معقولیت کم ہوتی گئی۔ شروع شروع میں ہاسٹل
سے باقاعدہ بحث کیا کرتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد انھوں نے یک لفظی انکار کا رویہ اختیار کیا۔ پھر ایک آدھ سال
ٹالتے رہے۔ اور آخر میں یہ نوبت آن پہنچی کہ وہ ہاسٹل کا نام سنتے ہی ایک طنز آمیز قہقہے کے ساتھ مجھے تشریف لے
م دے دیا کرتے تھے۔

ان کے اس سلوک سے آپ یہ اندازہ نہ لگائیے۔ کہ ان کی شفقت کچھ کم ہو گئی تھی۔ ہرگز نہیں حقیقت صرف اتنی ہے
حادثات کی وجہ سے گھر میں میرا اقتدار کچھ کم ہو گیا تھا۔

اتفاق یہ ہوا کہ میں نے جب پہلی مرتبہ بی۔ اے کا امتحان دیا۔ تو فیل ہو گیا۔ اگلے سال ایک مرتبہ پھر یہی واقعہ پیش آیا۔
بھی جب تین چار دفعہ یہی ہوا۔ تو گھر والوں نے میری امنگوں میں دلچسپی لینی چھوڑ دی۔ بی۔ اے میں پے در پے فیل
جہ سے میری گفتگو میں ایک سوز تو ضرور آ گیا تھا۔ لیکن کلام میں وہ پہلے جیسی شوکت اور میری رائے کی وہ پہلے جیسی
بتی تھی۔

میں زمانۂ طالب علمی کے اس دور کا حال ذرا تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اس سے ایک تو آپ

میری زندگی کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف ہو جائیں گے۔ اور اس کے علاوہ اس سے یونیورسٹی کی بعض بے قاعدگیوں کا راز بھی پرآشکار ہو جائے گا۔

میں پہلے سال بی۔ اے میں کیوں فیل ہوا۔ اس کا سمجھنا بہت آسان ہے۔ بات یہ ہوئی کہ جب ہم نے ایف۔ اے کا امتحان دیا تو چونکہ ہم نے کام خوب دل لگا کر کیا تھا۔ اس لئے ہم اس میں "کچھ" پاس ہی ہو گئے۔ بہرحال فیل نہ ہوئے۔ یونیورسٹی نے ہمارا ذکر بڑے اچھے الفاظ میں کیا۔ لیکن ریاضی کے متعلق یہ ارشاد ہوا کہ صرف اس مضمون کا امتحان ایک آدھ دفعہ پھر دے ڈالو (ایسے امتحان کو اصطلاحاً کمپارٹمنٹ کا امتحان کہا جاتا ہے۔ شاید اس لئے کہ بغیر رضامندی اپنے ہمراہی مسافروں کے اگر کوئی سفر کر رہے ہوں۔ نقل نویسی کی سخت ممانعت ہے)

اب جب ہم بی۔ اے میں داخل ہونے لگے تو ہم نے یہ سوچا کہ بی۔ اے میں ریاضی لیں گے۔ اس طرح سے ایف۔ اے کے امتحان کے لئے فالتو کام نہ کرنا پڑے گا۔ لیکن ہمیں سب لوگوں نے یہی مشورہ دیا کہ تم ریاضی مت لو۔ جب ہم نے اس کی وجہ پوچھی تو کسی نے ہمیں کوئی معقول جواب نہ دیا۔ لیکن جب پرنسپل صاحب نے بھی یہی مشورہ دیا تو ہم رضامند ہو گئے۔ چنانچہ بی۔ اے میں ہمارے مضمون انگریزی، تاریخ اور فارسی قرار پائے۔ ساتھ ساتھ ہم ریاضی کے امتحان کی بھی تیاری کرتے رہے۔ گویا ہم تین کی بجائے چار مضمون پڑھ رہے تھے۔ اس طرح سے جو صورت حالات پیدا ہوئی۔ اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنہیں یونیورسٹی کے امتحانات کا کافی تجربہ ہے۔ ہماری قوت مطالعہ منتشر ہو گئی اور خیالات میں پراگندگی پیدا ہوئی۔ اگر مجھے چار کی بجائے صرف تین مضامین پڑھنے ہوتے۔ تو جو وقت میں فی الحال چوتھے مضمون کو دے رہا تھا۔ وہ بانٹ کر ان تین مضامین کو دیتا۔ آپ یقین مانیے اس سے بڑا فرق پڑ جاتا۔ اور فرض کیا اگر میں وہ وقت تینوں کو بانٹ کر نہ دیتا۔ بلکہ سب کا سب ان تینوں میں سے کسی ایک مضمون کے لئے وقف کر دیتا تو کم از کم اس مضمون میں تو ضرور پاس ہو جاتا۔ لیکن موجودہ حالات میں تو وہی ہونا لازم تھا جو ہوا۔ یعنی یہ کہ میں کسی مضمون پر کماحقہ توجہ نہ کر سکا۔ کمپارٹمنٹ کے امتحان میں تو پاس ہو گیا۔ لیکن بی۔ اے میں ایک تو انگریزی میں فیل ہوا۔ وہ تو ہونا ہی تھا کیونکہ انگریزی ہماری مادری زبان نہیں۔ اس کے علاوہ تاریخ اور فارسی میں بھی فیل ہو گیا۔ اب آپ ہی سوچیئے نا کہ جو وقت مجھے کمپارٹمنٹ کے امتحان پر صرف کرنا پڑا۔ وہ اگر میں وہاں صرف نہ کرتا۔ بلکہ اس کی بجائے —— مگر خیر یہ بات میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔

فارسی میں کسی ایسے شخص کا فیل ہونا جو ایک علم دوست خاندان سے تعلق رکھتا ہو لوگوں کے لئے از حد حیرت کا موجب ہوا۔ اور سچ پوچھیے تو ہمیں بھی اس پر سخت ندامت ہوئی۔ لیکن خیر اگلے سال یہ ندامت دھل گئی۔ اور ہم فارسی میں پاس ہو گئے۔ اس سے اگلے سال تاریخ میں پاس ہو گئے۔ اور اس سے اگلے سال انگریزی میں۔

اب قاعدے کی رو سے ہمیں بی۔ اے کا سرٹیفکیٹ مل جانا چاہیے تھا۔ لیکن یونیورسٹی کی اس طفلانہ ضد کا کیا علاج کہ تینوں مضمونوں میں بیک وقت پاس ہونا ضروری ہے۔ بعض طبائع ایسی ہیں کہ جب تک یکسوئی نہ ہو۔ مطالعہ نہیں کر سکتیں۔ کیا ضروری ہے کہ ان کے دماغ کو زبردستی ایک کھچڑی سا بنا دیا جائے۔ ہم نے ہر سال صرف ایک مضمون پر اپنی تمام تر توجہ دی اور اس میں وہ کامیابی حاصل کی کہ باید و شاید۔ باقی دو مضمون ہم نے نہیں دیکھے۔ لیکن ہم نے یہ تو ثابت کر دیا کہ جس مضمون میں چاہیں پاس ہو سکتے ہیں۔

اب تک تو دو دو مضمونوں میں فیل ہوتے رہے تھے لیکن اس کے بعد ہم نے تہیہ کر لیا کہ جہاں تک ہو سکا اپنے مطالعہ کو وسیع کریں گے۔ یونیورسٹی کے بیہودہ اور بے معنی قواعد کو ہم اپنی مرضی سے مطابق نہیں بنا سکتے تو اپنی طبیعت پر ہی کچھ زور ڈالیں۔ لیکن جتنا غور کیا اسی نتیجے پر پہنچے کہ تین مضمونوں میں بیک وقت پاس ہونا فی الحال مشکل ہے۔ پہلے دو میں پاس ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ چنانچہ ہم پہلے سال انگریزی اور فارسی میں پاس ہو گئے اور دوسرے سال فارسی اور تاریخ میں۔

جن جن مضامین میں ہم جیسے جیسے فیل ہوئے وہ اس نقشے سے ظاہر ہے۔

(۱) انگریزی۔ تاریخ۔ فارسی۔
(۲) انگریزی۔ تاریخ۔
(۳) انگریزی۔ فارسی
(۴) تاریخ۔ فارسی۔

گویا جن جن طریقوں سے ہم دو دو مضامین میں فیل ہو سکتے تھے وہ ہم نے سب پورے کر دیئے۔ اس کے بعد ہمارے لیے دو مضامین میں فیل ہونا ناممکن ہو گیا۔ اور ایک ایک مضمون میں فیل ہونے کی باری آئی۔ چنانچہ اب ہم نے مندرجہ ذیل نقشے کے مطابق فیل ہونا شروع کر دیا۔

(۵) تاریخ میں فیل۔
(۶) انگریزی میں فیل۔

اس دفعہ امتحان دے چکنے کے بعد جب ہم نے اپنے نتیجوں کو اپنے سامنے رکھ کر غور کیا تو ثابت ہوا کہ غم کی رات ختم ہونے والی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ اب ہمارے فیل ہونے کا صرف ایک ہی طریقہ باقی رہ گیا ہے۔ وہ یہ کہ فارسی میں فیل ہو جائیں لیکن اس کے بعد تو پاس ہونا لازم ہے۔ ہر چند کہ یہ سانحہ ازحد جانکاہ ہوگا۔ لیکن اس میں یہ مصلحت تو ضرور مضمر ہے کہ اس سے ہمیں ایک قسم کا ٹیکا لگ جائیگا۔ بس یہی ایک کسر باقی رہ گئی ہے۔ اس سال فارسی میں فیل ہو لیں گے، پھر اگلے سال قطعی پاس ہو جائیں گے۔ چنانچہ ساتویں دفعہ امتحان دینے کے بعد ہم بے تابی سے فیل ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ یہ انتظار دراصل فیل ہونے کا انتظار نہ تھا۔ بلکہ اس بات کا انتظار تھا کہ اس فیل ہونے کے بعد ہم اگلے سال ہمیشہ کے لئے بی۔ اے ہو جائیں گے۔

ہر سال امتحان کے بعد جب گھر آتا۔ تو والدین کو نتیجے کے لئے پہلے ہی سے تیار کر دیتا۔ رفتہ رفتہ نہیں بلکہ یک لخت اور فوراً۔ رفتہ رفتہ تیار کرنے سے خواہ مخواہ وقت ضائع ہوتا ہے۔ اور پریشانی مفت میں طول کھینچتی ہے۔ ہمارا قاعدہ یہ تھا کہ جاتے ہی کہہ دیا کرتے تھے کہ اس سال تو کم از کم پاس نہیں ہو سکتے۔ والدین کو اکثر یقین نہ آتا۔ ایسے موقعوں پر طبیعت کو بڑی الجھن ہوتی ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ میں پرچوں پر کیا لکھ کر آیا ہوں۔ اچھی طرح جانتا ہوں کہ ممتحن لوگ اکثر نشے کی حالت میں پرچے نہ دیکھیں۔ تو میرا پاس ہونا قطعاً ناممکن ہے۔ چاہتا ہوں کہ میرے تمام بہی خواہوں کو بھی اس بات کا یقین ہو جائے تاکہ وقت پر انہیں صدمہ نہ ہو۔ لیکن بہی خواہ ہیں کہ میری تمام تشریحات کو محض کسر نفسی سمجھتے ہیں۔ آخری سالوں میں والد کو فوراً یقین آ جایا کرتا تھا۔ کیونکہ تجربے سے ان پر ثابت ہو چکا تھا کہ میرا اندازہ غلط نہیں ہوتا۔ لیکن اِدھر اُدھر کے لوگ "اجی نہیں صاحب!" "اجی کیا کہہ رہے ہو" "آپ یہ

بھی کوئی بات ہے کہ ایسے نمبروں سے ناک میں دم کر دیتے۔ بہرحال اب کے ہم گھر پہنچتے ہی ہم نے حسب دستور اپنے فیل ہونے کی پیشین گوئی کر دی۔ والد کو تسلی تھی کہ بس یہ آخری دفعہ ہے۔ اگلے سال ایسی پیشین گوئی کرنے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔

ساتھ ہی خیال آیا کہ وہ ہاسٹل کا تصفیہ شروع کرنا چاہئے۔ اب تو کالج میں صرف ایک ہی سال باقی رہ گیا ہے۔ اب بھی ہاسٹل میں رہنا نصیب نہ ہوا تو عمر بھر گویا آزادی سے محروم رہے۔ گھر سے نکلے تو ماموں کے ڈربے میں۔ اور جب ماموں کے ڈربے سے نکلے تو اپنا ایک ڈربہ بنانا پڑے گا۔ آزادی کا ایک سال۔ صرف ایک سال۔ اور یہ آخری موقع ہے۔

آخری درخواست کرنے سے پہلے میں نے تمام ضروری مصالحہ بڑی احتیاط سے جمع کیا۔ جن پروفیسروں سے مجھے اب برابری کا فخر حاصل تھا۔ ان کے سامنے نہایت بے تکلفی سے اپنی آرزوؤں کا اظہار کیا اور ان سے والد کو خطوط لکھوائے کہ اگلے سال لڑکے کو ضرور آپ ہاسٹل میں بھیج دیں۔ بعض کامیاب طلبا کے والدین سے بھی اسی مضمون کی عرضداشتیں بھجوائیں۔ خود اعداد و شمار سے ثابت کیا کہ یونیورسٹی سے جتنے لڑکے پاس ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر ہاسٹل میں رہتے ہیں۔ اور یونیورسٹی کا کوئی وظیفہ یا تمغہ یا انعام تو کبھی ہاسٹل سے باہر گیا ہی نہیں۔ میں حیران ہوں کہ یہ دلیل مجھے اس سے پیشتر کبھی کیوں نہ سوجھی تھی۔ کیونکہ یہ بہت ہی کارگر ثابت ہوئی۔ والد کا انکار نرم ہوتے ہوتے غور و خوض میں تبدیل ہو گیا۔ لیکن پھر بھی ان کے دل سے شک رفع نہ ہو سکا۔ کہنے لگے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جس لڑکے کو پڑھنے کا شوق ہو۔ وہ ہاسٹل کی بجائے گھر پر کیوں نہیں پڑھ سکتا۔

میں نے جواب دیا کہ ہاسٹل میں ایک علمی فضا ہوتی ہے۔ جو ارسطو اور افلاطون کے گھر کے سوا اور کسی گھر میں دستیاب نہیں ہو سکتی۔ ہاسٹل میں جسے دیکھو بحر علوم میں غوطہ زن نظر آتا ہے۔ باوجود اس کے کہ ہر ہاسٹل میں دو دو تین تین سو لڑکے رہتے ہیں۔ پھر بھی وہ خاموشی طاری ہوتی ہے کہ قبرستان معلوم ہوتا ہے۔ وجہ یہ کہ ہر ایک اپنے اپنے کام میں لگا رہتا ہے۔ شام کے وقت ہاسٹل کے صحن میں جا بجا طلبا علمی مباحثوں میں مشغول نظر آتے ہیں۔ علی الصباح ہر ایک طالب علم کتاب ہاتھ میں لئے ہاسٹل کے چمن میں ٹہلتا نظر آتا ہے۔ کھانے کے کمرے میں۔ کامن روم میں۔ غسل خانوں میں۔ برآمدوں میں۔ ہر جگہ لوگ فلسفے اور ریاضی اور تاریخ کی باتیں کرتے ہیں۔ جن کو ادب انگریزی کا شوق ہے۔ وہ دن رات آپس میں شیکسپیئر کی طرح گفتگو کرنے کی مشق کرتے ہیں۔ ریاضی کے طلبا اپنے ہر ایک خیال کو الجبرے میں ادا کرنے کی عادت ڈال لیتے ہیں۔ فارسی کے طلبا رباعیوں میں تبادلہ خیالات کرتے ہیں۔ تاریخ کے دلدادہ ....

والد نے اجازت دے دی۔

اب ہمیں یہ انتظار کہ کب فیل ہوں اور کب اگلے سال کے لئے عرضی بھیجیں۔ اس دوران میں ہم نے ان تمام دوستوں سے خط و کتابت کی۔ جن کے متعلق یقین تھا کہ اگلے سال پھر ان کی رفاقت نصیب ہوگی۔ اور انہیں یہ مژدہ سنایا کہ آئندہ سال ہمیشہ کے لئے کالج کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ کیونکہ ہم تعلیمی زندگی کا ایک وسیع تجربہ اپنے ساتھ لئے ہاسٹل میں آ رہے ہیں۔ جس سے ہم طلبا کی نئی پود کو مفت مستفید فرمائیں گے۔ اپنے ذہن میں ہم نے ہاسٹل میں اپنی حیثیت ایک مادر مہربان کی سی سوچ لی جس کے اردگرد ناتجربہ کار طلبا مرغی کے بچوں کی طرح بھاگتے پھریں گے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کو جو کسی زمانے میں ہمارے ہم جماعت رہ چکے تھے لکھ بھیجا کہ جب ہم ہاسٹل میں آئیں گے۔ تو فلاں فلاں مراعات کی توقع آپ سے رکھیں گے۔ اور فلاں فلاں

نواسے اپنے آپ کو سنبھال سکیں گے۔ اطلاعاً عرض ہے۔

اور یہ سب کچھ کر چکنے کے بعد ہماری بدنصیبی دیکھیے کہ جب نتیجہ نکلا تو ہم پاس ہو گئے۔

ہم پہ تو جو ظلم ہوا سو ہوا، یونیورسٹی والوں کی حماقت ملاحظہ فرمائیے کہ ہمیں پاس کر کے اپنی آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ ہاتھ سے گنوا بیٹھے۔

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی

گیدڑ کی موت آتی ہے تو شہر کی طرف دوڑتا ہے۔ ہماری جو شامت آئی تو ایک دن اپنے پڑوسی لالہ کرپا شنکر جی برہمچاری سے برسبیل تذکرہ کہہ بیٹھے کہ لالہ جی امتحان کے دن قریب آتے جاتے ہیں۔ آپ سحرخیز ہیں۔ ذرا ہمیں بھی صبح جگا دیا کیجیے۔"

وہ حضرت بھی معلوم ہوتا ہے۔ نفلوں کے بھوکے بیٹھے تھے۔ دوسرے دن اٹھتے ہی انہوں نے ایشور کا نام لے کر ہمارے دروازے پر مکا بازی شروع کر دی۔ کچھ دیر تک تو ہم سمجھے کہ عالم خواب ہے۔ ابھی سے کیا فکر۔ جاگیں گے تو لاحول پڑھ لیں گے۔ لیکن یہ گولہ باری لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی گئی۔ اور صاحب جب کمرے کی چوبی دیواریں لرزنے لگیں۔ صراحی پر رکھا ہوا گلاس جلترنگ کی طرح بجنے لگا۔ اور دیوار پر لٹکا ہوا کلنڈر پنڈولم کی طرح ہلنے لگا۔ تو بیداری کا قائل ہونا ہی پڑا۔ مگر اب دروازہ ہے کہ لگاتار کھٹکھٹایا جا رہا ہے۔ میں کیا میرے آباؤ اجداد کی روحیں اور میری قسمت خوابیدہ تک جاگ اٹھی ہوگی۔ بہتیرا آوازیں دیتا ہوں۔۔۔۔۔ "اچھا!۔۔۔۔۔ اچھا!۔۔۔۔۔ تھینک یو!۔۔۔۔۔ جاگ گیا ہوں۔۔۔۔۔ بہت اچھا! نوازش ہے!" آپ جناب ہیں کہ سنتے ہی نہیں۔ خدایا! کس آفت کا سامنا ہے؟ یہ سوتے کو جگا رہے ہیں یا مردے کو جلا رہے ہیں! اور حضرت عیسیٰ بھی تو بس واجبی طور پر ہلکی سی آواز میں "قم" کہہ دیا کرتے ہوں گے۔ زندہ ہوگیا تو ہوگیا۔ نہیں تو چھوڑ دیا۔ کوئی مردے کے پیچھے لٹھ لے کے پڑ جایا کرتے تھے؟ توپیں تھوڑی داغا کرتے تھے! یہ تو ہم سے بھلا کیسے ہو سکتا تھا کہ اٹھ کر دروازے کی چٹخنی کھول دیتے! پیشتر اس کے کہ بستر سے باہر نکلیں دل کو جس قدر سمجھانا بجھانا پڑتا ہے۔ اس کا اندازہ کچھ اہل ذوق ہی لگا سکتے ہیں۔ آخر کار جب لیمپ جلایا۔ اور ان کو باہر سے روشنی نظر آئی تو طوفان تھما۔

اب جو ہم کھڑکی میں سے آسمان کو دیکھتے ہیں تو جناب ستارے ہیں۔ کہ جگمگا رہے ہیں! سوچا آج پتہ چلائیں گے۔ یہ سورج آخر کس طرح سے نکلتا ہے۔ لیکن جب گھوم گھوم کر کھڑکی میں سے اور روشندان میں سے چاروں طرف دیکھا اور بزرگوں سے صبح کاذب کی جتنی نشانیاں سنی تھیں۔ ان میں سے ایک بھی کہیں نظر نہ آئی تو فکر سا لگ گیا۔ کہ آج کہیں سورج گرہن نہ ہو؟ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو پڑوسی کو آواز دی "لالہ جی!۔۔۔۔۔ لالہ جی!"

جواب آیا "ہوں۔"

میں نے کہا "آج یہ کیا بات ہے۔ کچھ اندھیرا اندھیرا سا ہے؟"

کہنے لگے: "تو اور کیا تین بجے ہی سورج نکل آئے؟"

تین بجے کا نام سن کر ہوش گم ہو گئے۔ چونک کر پوچھا۔ "کیا کہا تم نے؟ تین بجے ہیں!"

کہنے لگے: "تین ...... تو ...... نہیں ...... کچھ سات ...... ساڑھے سات ...... منٹ اوپر تین ہیں۔"

میں نے کہا: "ارے کم بخت، خدائی فوجدار، بدتمیز کہیں کے۔ میں نے تجھ سے یہ کہا تھا۔ کہ صبح جگا دینا۔ یا یہ کہا تھا۔ کہ سرے سے سونے ہی نہ دینا؟ تین بجے جاگنا بھی کوئی شرافت ہے؟ ہمیں تو نے کوئی ریلوے گارڈ سمجھ رکھا ہے؟ تین بجے ہم اٹھ سکا کرتے تو اس وقت دادا جان کے منظور نظر نہ ہوتے؟ ابے احمق کہیں کے تین بجے اٹھ کر ہم زندہ رہ سکتے ہیں؟ امیر زادے ہیں۔ کوئی مذاق ہے؟ لاحول ولا قوۃ۔"

دل تو چاہتا تھا کہ عدم تشدد کو خیرباد کہہ دوں۔ لیکن پھر خیال آیا۔ کہ بنی نوع انسان کی اصلاح کا ٹھیکہ کوئی ہمیں نے لے رکھا ہے؟ ہمیں اپنے کام سے غرض۔ لیمپ بجھایا اور بڑبڑاتے ہوئے ہی سو گئے۔

اور پھر حسب معمول نہایت اطمینان کے ساتھ بھلے آدمیوں کی طرح اپنے دس بجے اٹھے۔ بارہ بجے منہ ہاتھ دھویا اور چار بجے چائے پی کر ٹھنڈی سڑک کی سیر کو نکل گئے۔

شام کو واپس ہوسٹل میں وارد ہوئے۔ جوش شباب تو ہے ہی اس پر شام کا ارمان انگیز وقت۔ ہوا بھی نہایت لطیف تھی طبیعت بھی ذرا مچلی ہوئی تھی۔ ہم ذرا ترنگ میں گاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے کہ

بلائیں زلف جاناں کی اگر لیتے تو ہم لیتے

کہ اتنے میں پڑوسی کی آواز آئی۔ "مسٹر!"

ہم اس وقت ذرا چٹکی بجانے لگے تھے۔ بس انگلیاں وہیں پر رک گئیں اور کان آواز کی طرف لگ گئے۔ ارشاد ہوا۔ "یہ آپ گا رہے ہیں؟" (زور "آپ" پر)

میں نے کہا "اجی میں کس لائق ہوں۔ لیکن خیر فرمائیے؟"

بولے "ذرا ...... وہ میں ...... میں ڈسٹرب ہوتا ہوں۔"

بس صاحب۔ ہم میں جو موسیقیت کی روح پیدا ہوئی تھی فوراً مر گئی۔ دل نے کہا "او نابکار انسان دیکھ! پڑھنے والے یوں پڑھتے ہیں۔" صاحب۔ خدا کے حضور میں گڑگڑا کر دعا مانگی کہ "خدایا ہم بھی اب باقاعدہ مطالعہ شروع کرنے والے ہیں۔ ہماری مدد کر اور ہمیں ہمت دے۔"

آنسو پونچھ کر اور دل کو مضبوط کر کے میز کے سامنے آ بیٹھے۔ دانت بھینچ لئے۔ نکٹائی کھول دی۔ آستینیں چڑھا لیں۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کریں کیا؟ سامنے سرخ، سبز، زرد، سبھی قسم کی کتابوں کا انبار لگا تھا۔ اب ان میں سے کون سی پڑھیں؟ فیصلہ یہ ہوا کہ پہلے کتابوں کو ترتیب سے میز پر لگا دیں۔ کہ باقاعدہ مطالعہ کی پہلی منزل یہی ہے۔

بڑی تقطیع کی کتابوں کو علیحدہ رکھ دیا۔ چھوٹی تقطیع کی کتابوں کو سائز کے مطابق الگ قطار میں کھڑا کر دیا۔ ایک نوٹ پیپر پر ہر کتاب کے صفحوں کی تعداد لکھ کر سب کو جمع کیا۔ پھر ۱۵ اپریل تک کے دن گنے۔ صفحوں کی تعداد کو دنوں کی تعداد پر تقسیم کیا۔ ساڑھے پانسو

جواب آیا۔ لیکن انقلاب کی کیا مجال جو چہرے پر ظاہر ہونے پائے۔ دل میں کچھ تھوڑا سا پچھتائے کہ صبح ہی سے کیوں نہ اٹھ بیٹھے۔ لیکن کم خوابی کے طبی پہلو پر غور کیا تو فوراً اپنے آپ کو ملامت کی۔ آخر کار اس نتیجے پر پہنچے کہ دس بجے اٹھنا تو لغویات ہے۔ البتہ پانچ، چھ یا سات بجے کے قریب اٹھنا نہایت معقول ہو گا۔ صحت بھی برقرار رہے گی۔ اور امتحان کی تیاری بھی باقاعدہ ہو گی۔ ہم خرما و ہم ثواب۔

یہ تو ہم جانتے ہی ہیں کہ سویرے اٹھنا ہو تو جلدی ہی سو جانا چاہئے۔ کھانا باہر ہی سے کھا آئے تھے۔ بستر میں۔ ۹ بجے کے چلتے چلتے خیال آیا کہ لالہ جی سے جگانے کے لئے کہہ ہی نہ دیں؟ یوں ہماری اپنی قوت ارادی کوئی زبردست ہے۔ جب چاہیں اٹھ سکتے ہیں۔ لیکن پھر بھی کیا ہرج ہے؟ ڈرتے ڈرتے آواز دی "لالہ جی!"

انھوں نے پتھر کھینچ مارا: "ہیں؟"

ہم اور بھی سہم گئے کہ لالہ جی کچھ ناراض معلوم ہوتے ہیں۔ تتلا کے درخواست کی کہ "لالہ جی۔ صبح آپ کو بڑی تکلیف ہو گی میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ کل اگر ذرا مجھے چھ بجے یعنی جس وقت آپ اٹھیں ......؟"

جواب ندارد۔

میں نے پھر کہا: "جب آپ صبح جاگیں تو ...... سنا آپ نے؟" چُپ۔

"لالہ جی!"

کڑکتی ہوئی آواز نے جواب دیا: "سن لیا، سن لیا۔ چھ بجے جگا دوں گا۔ مقری کوماپس نورالیفاپس ......!"

ہم نے کہا: "ب۔ ب۔ ب۔ بہت اچھا۔ یہ بات ہے؟"

توبہ۔ خدا کسی کا محتاج نہ کرے۔

لالہ جی بہت شریف آدمی ہیں۔ اپنے وعدے کے مطابق دوسرے دن صبح چھ بجے انھوں نے دروازے پر گھونسوں کی بارش شروع کر دی۔ ان کا جگانا تو محض ایک سہارا تھا۔ ہم خود ہی انتظار میں تھے کہ یہ خواب ختم ہو لے تو بس جاگتے ہیں۔ وہ نہ جگاتے تو میں خود ایک منٹ کے بعد آنکھیں کھول دیتا۔ بہر صورت جیسا کہ میرا فرض تھا میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے اسے اسی شکل میں قبول کیا کہ گولہ باری بند کر دی۔

اس کے بعد کے واقعات ذرا بحث طلب سے ہیں۔ اور ان کے متعلق روایات میں کسی قدر اختلاف ہے۔ بہر حال اس بات کا تو مجھے یقین ہے اور میں قسم بھی کھا سکتا ہوں کہ آنکھیں میں نے کھول دی تھیں۔ پھر یہ بھی یاد ہے کہ ایک نیک اور سچے مسلمان کی طرح کلمہ شہادت بھی پڑھا۔ پھر یہ بھی یاد ہے کہ اٹھنے سے پیشتر دیباچے کے طور پر ایک آدھ کروٹ بھی لی۔ پھر کا پتہ نہیں۔ شاید لحاف اوپر سے اتار دیا۔ یا شاید سر اس میں لپیٹ دیا۔ یا شاید کھانسا کہ خدا جانے خراٹا لیا۔ خیر یہ تو یقینی امر ہے کہ دس بجے ہم بالکل جاگ رہے تھے۔ لیکن لالہ جی کے جگانے کے بعد اور دس بجے سے پیشتر خدا جانے ہم پڑھ رہے تھے یا شاید سو رہے تھے۔ نہیں ہمارا خیال ہے پڑھ رہے تھے یا شاید سو رہے ہوں۔ بہر صورت یہ نفسیات کا مسئلہ ہے جس میں نہ آپ ماہر ہیں نہ میں۔ کیا پتہ۔ لالہ جی نے جگایا ہی دس بجے ہو یا اس دن چھ دیر ہی میں بجے ہوں۔ خدا کے کاموں میں ہم آپ کیا دخل دے سکتے ہیں۔ لیکن ہمارے دل میں دن بھر یہ شبہ رہا کہ قصور کچھ اپنا ہی معلوم ہوتا ہے۔ جناب شرافت ملاحظہ ہو کہ محض اس شبہ کی بنا پر صبح سے شام تک ضمیر کی ملامت سنتا رہا۔ اور اپنے

بجے کو سوتا رہوں گا۔ لالہ جی سے ہنس ہنس کر باتیں کیں۔ ان کا شکریہ ادا کیا اور یہی خیال کہ ان کی دل شکنی نہ ہو بعد دوپہر کی ملاقات میں ظاہر کی کہ آپ کی نوازش سے میں نے صبح کا سہانا اور روح افزا وقت بہت اچھی طرح صرف کیا۔ ورنہ ہر روز کی طرح آج بھی دس بجے اٹھتا۔ "لالہ جی صبح کے وقت دماغ کیا صاف ہوتا ہے۔ جو پڑھو خدا کی قسم فوراً یاد ہو جاتا ہے۔ بھئی خدا نے صبح بھی کیا عجیب چیز پیدا کی ہے۔ یعنی اگر صبح کی بجائے صبح صبح شام ہوا کرتی تو دن کیا بری طرح کٹا کرتا۔"

لالہ جی نے ہماری اس جادو بیانی کی داد یوں دی کہ آپ پوچھنے لگے۔

"تو میں آپ کو چھ بجے جگا دیا کروں نا؟"

میں نے کہا "ہاں ہاں، واہ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے بے شک۔"

شام کے وقت آنے والی صبح کے مطالعہ کے لیے کتابیں چھانٹ کر میز پر علیحدہ جمع کیں۔ کرسی کو چارپائی کے قریب سرکا لیا۔ اوور کوٹ اور گلوبند کو کرسی کی پشت پر آویزاں کر دیا۔ کنٹوپ اور دستانے پاس ہی رکھ لیے۔ دیا سلائی کو تکیے کے نیچے ٹٹولا۔ تین دفعہ آیۃ الکرسی پڑھی۔ اور دل میں نہایت ہی نیک نیت سے ارادہ باندھ کر سو گیا۔

صبح لالہ جی کی پہلی دستک کے ساتھ ہی جھٹ آنکھ کھل گئی۔ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ لحاف کی ایک کھڑکی میں سے ان کو "گڈ مارننگ" کیا۔ اور نہایت بیدار لہجے میں کھانسا۔ لالہ جی مطمئن ہو کر واپس چلے گئے۔

ہم نے اپنی ہمت اور اولوالعزمی کو بہت سراہا۔ کہ آج ہم فوراً ہی جاگ اٹھے تھے۔ دل سے کہا "دل بھیا! صبح اٹھنا تو محض ذرا سی بات ہے۔ ہم یوں ہی اس سے ڈرا کرتے تھے۔" دل نے کہا "اور کیا! تمہارے تو یوں ہی اوسان خطا ہو جایا کرتے ہیں۔" ہم نے کہا "سچ کہتے ہو یار۔ یعنی اگر ہم سستی اور کسالت کو خود اپنے قریب نہ آنے دیں۔ تو ان کی کیا مجال ہے کہ ہماری باقاعدگی میں خلل انداز ہوں۔ اس وقت اس لاہور شہر میں ہزاروں ایسے کاہل لوگ ہوں گے جو دنیا و مافیہا سے بے خبر نیند کے مزے اڑاتے ہوں گے۔ اور ایک ہم ہیں کہ ادائے فرض کی خاطر نہایت شگفتہ طبعی اور خندہ جبینی سے جاگ اٹھے ہیں۔ بھئی کیا برخوردار سعادت آثار واقع ہوئے ہیں۔" ناک کو سردی سی محسوس ہونے لگی تو اسے ذرا یوں ہی سا لحاف کی اوٹ میں کر لیا اور پھر سوچنے لگے۔ "خوب! تو ہم آج کیا وقت پر جاگے ہیں۔ بس ذرا اس کی عادت ہو جائے تو باقاعدہ قرآن مجید کی تلاوت اور فجر کی نماز بھی شروع کر دیں گے۔ آخر مذہب سب سے مقدم ہے۔ ہم بھی کیا روز بروز الحاد کی طرف مائل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ نہ خدا کا ڈر نہ رسول کا خوف۔ سمجھتے ہیں کہ بس اپنی محنت سے امتحان پاس کر لیں گے۔ اکبر بیچارا یوں کہتا کہتا مر گیا۔ لیکن ہمارے کان پر جوں تک نہ رینگی .... "(لحاف کانوں پر سرک آیا) .... "تو گویا آج ہم لوگوں سے پہلے جاگے ہیں .... بہت ہی پہلے یعنی کالج شروع ہونے سے بھی چار گھنٹے .... کیا بات ہے۔ خداوندان کالج بھی کس قدر سست ہیں! ہر ایک مستعد انسان کو چھ بجے تک قطعی جاگ اٹھنا چاہیے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کالج سات بجے کیوں نہ شروع ہوا کرے .... "(لحاف سر پر) .... بات یہ ہے کہ تہذیب جدید ہماری تمام اعلیٰ قوتوں کی بیخ کنی کر رہی ہے۔ عیش پسندی روز بروز بڑھتی جاتی ہے .... "(آنکھیں بند)" .... تو اب چھ بجے ہیں۔ تو گویا تین گھنٹے تو متواتر مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ پہلے کون سی کتاب پڑھیں۔ شیکسپیئر یا ورڈزورتھ؟ میں جانوں

شیکسپیئر بہتر ہوگا۔ اس کی عظیم الشان تصانیف میں خدا کی عظمت کے آثار دکھائی دیتے ہیں اور صبح کے وقت اللہ میاں کی یاد سے بہتر چیز کیا ہو سکتی ہے؟ پھر خیال آیا کہ دن کو جذبات کے محشرستان سے شروع کرنا ٹھیک فلسفہ نہیں۔ ورڈزورتھ پڑھیں۔ اس کے اوراق میں فطرت کو سکون و اطمینان میسر ہوگا۔ اور دل اور دماغ نیچر کی خاموش دلآویزیوں سے ہلکے ہلکے لطف اندوز ہوں گے ...... لیکن شیکسپیئر

...... نہیں ورڈزورتھ ہی ٹھیک رہے گا ...... شیکسپیئر .... ہیملٹ .... لیکن ورڈزورتھ

.... لیڈی میکبتھ .... دیوانگی .... سبزہ زار .... سبز سبز .... بادِ بہاری ....

.. سفید پوش ...... کشمیر .... میں آفت کا پرکالہ ہوں ....

یہ معمہ اب مابعد الطبیعیات ہی سے تعلق رکھتا ہے کہ پھر جو میں نے لحاف سے سر باہر نکالا اور ورڈزورتھ پڑھنے کا ارادہ کیا۔ تو وہی دس بج رہے تھے۔ اس میں نامعلوم کیا بھید ہے!

کالج ہال میں لالہ جی ملے کہنے لگے "مسٹر! آج میں نے پھر آپ کو آواز دی تھی آپ نے جواب نہ دیا؟"

میں نے زور کا قہقہہ لگا کر کہا "او ہو! لالہ جی یاد نہیں۔ میں نے آپ کو گڈ مارننگ کہا تھا؟ میں تو پہلے ہی جاگ رہا تھا۔"

بولے "وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن بعد میں .... اس کے بعد .... کوئی سات بجے کے قریب میں نے آپ سے تاریخ پوچھی تھی۔ آپ بولے ہی نہیں؟"

ہم نے نہایت تعجب کی نظروں سے اُن کو دیکھا۔ گویا وہ پاگل ہو گئے ہیں۔ اور پھر ذرا متین چہرہ بنا کر ماتھے پر تیوری چڑھائے غور و فکر میں مصروف ہو گئے۔ ایک آدھ منٹ تک ہم اس تمکنت میں رہے۔ پھر یکایک ایک مجوبانہ اور معشوقانہ انداز سے مسکرا کر کہا "ہاں ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں اس وقت ..... اَے ..... اَے ..... نماز پڑھ رہا تھا۔"

لالہ جی مرعوب ہو کر چل دیئے۔ اور ہم اپنے زہد و اتقا کی تسکین میں سر نیچا کیے کمرے کی طرف چلے آئے۔

اب یہی ہمارا روزمرہ کا معمول ہو گیا ہے۔ جاگنا نمبر ایک چھ بجے۔ جاگنا نمبر دو دس بجے۔ اس دوران میں لالہ جی آواز دیں تو نماز۔

جب دلِ مرحوم ایک جہانِ آرزو تھا تو یوں جاگنے کی تمنا کیا کرتے تھے کہ "ہمارا فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب ہو۔ اور سورج کی پہلی کرنیں ہمارے سیاہ پُرپیچ بالوں پر پڑ رہی ہوں۔ کمرے میں پھولوں کی بوئے سحری روح افزائیاں کر رہی ہو۔ نازک اور حسین ہاتھ اپنی انگلیوں سے بربط کے تاروں کو ہلکے ہلکے چھیڑ رہے ہوں اور عشق میں ڈوبی ہوئی سُریلی اور نازک آواز مسکراتی ہوئی گا رہی ہو۔

"تم جاگو موہن پیارے"

خواب کی سنہری دھند آہستہ آہستہ موسیقی کی لہروں میں تحلیل ہو جائے اور بیداری ایک خوشگوار طلسم کی تاریکی کے باریک نقاب کو خاموشی سے پارہ پارہ کر دے۔ چہرہ کسی کی نگاہِ اشتیاق کی گرمی محسوس کر رہا ہو۔ آنکھیں مسحور ہو کر کھلیں اور چار

ہو جائیں۔ دل آویز تبسم صبح کو اور بھی درخشندہ کر دے اور گیت " سازوں کی صورت نوری بن جائیں تو ساتھ ہی شرم و حجاب میں ڈوب جائے

نتیجہ یہ ہے کہ پہلے [illegible] کی آواز اور دروازے کی دھڑدھڑ سامعہ نوازی کرتی ہے۔ اور پھر چار گھنٹے بعد کھانے کا گھڑیال دماغ کے ریشے ریشے میں دس بجانا شروع کر دیتا ہے۔ اور اس چار گھنٹے کے عرصہ میں گاڑیوں کے گڑبڑانے ——— بچھونوں کے الٹ جانے، دروازوں کے بند ہونے، قالینوں کے جھاڑنے، کرسیوں کے گھسیٹنے، کتابوں اور برتنوں کے گرنے، کھنکنے اور کھڑکھڑانے کی آوازیں تو گویا باقی الدہر معاف ہیں۔ اندازہ لگایئے کہ ان سازوں میں سُر تال کی کس قدر گنجائش ہے۔

موت مجھ کو دکھائی دیتی ہے!
جب طبیعت کو دیکھتا ہوں میں

کُتّے

علم الحیوانات کے پروفیسروں سے پوچھا، سلوتریوں سے دریافت کیا، خود سر کھپاتے رہے۔ لیکن کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر کتوں کا فائدہ کیا ہے؟ گائے کو لیجئے، دودھ دیتی ہے۔ بکری کو لیجئے، دودھ دیتی ہے اور مینگنیاں بھی۔ یہ کتے کیا کرتے ہیں؟ کہنے لگے کہ کتا وفادار جانور ہے۔ اب جناب وفاداری اگر اسی کا نام ہے کہ شام کے سات بجے سے جو بھونکنا شروع کیا تو لگاتار بغیر دم لئے صبح کے چھ بجے تک بھونکتے چلے گئے۔ تو ہم لنڈورے ہی بھلے۔ کل ہی کی بات ہے کہ رات کے کوئی گیارہ بجے ایک کتے کی طبیعت جو ذرا گدگدائی۔ تو انہوں نے باہر سڑک پر آ کر طرح کا ایک مصرع دے دیا۔ ایک آدھ منٹ کے بعد سامنے کے بنگلے میں سے ایک کتے نے مطلع عرض کر دیا۔ اب جناب ایک کہنہ مشق استاد کو جو غصہ آیا۔ ایک حلوائی کے چولہے میں سے باہر لپکے اور بھنا کے پوری غزل مقطع تک کہہ گئے۔ اس پر شمال مشرق کی طرف سے ایک قدرشناس کتے نے زوروں کی داد دی۔ اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہوا کہ کچھ نہ پوچھئے۔ کم بخت بعض تو دو غزلے سہ غزلے لکھ لائے تھے۔ کئی ایک نے فی البدیہہ قصیدے کے قصیدے پڑھ ڈالے۔ وہ ہنگامہ گرم ہوا کہ ٹھنڈا ہونے میں نہ آتا تھا۔ ہم نے کھڑکی میں سے ہزاروں دفعہ "آرڈر آرڈر" پکارا۔ لیکن ایسے موقعوں پر پردھان کی بھی کوئی نہیں سنتا۔ اب ان سے کوئی پوچھے کہ میاں تمہیں ایسا ہی ضروری مشاعرہ کرنا تھا تو دریا کے کنارے کھلی ہوا میں جا کر طبع آزمائی کرتے، یہ گھروں کے درمیان آ کر سوتوں کو ستانا کون سی شرافت ہے۔

اور پھر ہم دیسی لوگوں کے کتے بھی کچھ عجیب بدتمیز واقع ہوئے ہیں۔ اکثر تو ان میں ایسے قوم پرست ہیں کہ پتلون کوٹ کو دیکھ کر بھونکنے لگ جاتے ہیں۔ خیر یہ تو ایک حد تک قابل تعریف بھی ہے۔ اس کا ذکر ہی جانے دیجئے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات ہے یعنی ہمیں بارہا ڈالیاں لے کر صاحب لوگوں کے بنگلوں پر جانے کا اتفاق ہوا۔ خدا کی قسم ان کے کتوں میں وہ شائستگی دیکھی ہے کہ عش عش کرتے لوٹ آئے ہیں۔ جوں ہی ہم بنگلے کے دروازے میں داخل ہوئے کتے نے برآمدے ہی میں کھڑے کھڑے ایک ہلکی سی "بخ" کر دی۔ اور پھر منہ بند کر کے کھڑا ہو گیا۔ ہم آگے بڑھے تو اس نے بھی چار قدم آگے بڑھ کر ایک نازک اور پاکیزہ آواز میں پھر "بخ" کر دی۔ چوکیداری کی چوکیداری، موسیقی کی موسیقی۔ ہمارے کتے ہیں کہ نہ راگ نہ سُر، نہ سر نہ پیر۔ تان پہ تان لگائے جاتے ہیں۔ بے تالے کہیں کے۔ نہ موقع دیکھتے ہیں نہ وقت پہچانتے ہیں۔ گلے بازی کئے جاتے ہیں۔ گھمنڈ اس بات پر ہے کہ تان سین اسی ملک میں تو پیدا ہوا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے تعلقات کتوں سے ذرا کشیدہ ہی رہے ہیں۔ لیکن ہم سے قسم لے لیجئے۔ جو ایسے موقع پر

ہونے بھی نہیں [illegible] ہو۔ شاید آپ اس کو زیادتی سمجھیں لیکن [illegible] ہو جاتے ہیں۔ مثلاً اکثر دوستوں نے صلاح دی کہ رات کے وقت لاٹھی چھڑی ضرور ہاتھ میں رکھنی چاہیے کہ دافع بلیات ہے۔ لیکن ہم تو اس سے خوامخواہ عداوت پیدا کرنا نہیں چاہتے۔ کتے کے بھونکتے ہی ہماری طبعی شرافت ہم پر اس درجہ غلبہ پا جاتی ہے کہ آپ ہمیں اس وقت دیکھیں تو یقیناً یہی سمجھیں گے کہ ہم بزدل ہیں۔ شاید آپ اس وقت یہ بھی اندازہ لگا لیں کہ ہمارا گلا خشک ہوا جاتا ہے۔ یہ البتہ ٹھیک ہے۔ ایسے موقع پر کبھی میں گانے کی کوشش کروں تو کھرجوں کے سروں کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا۔ اگر آپ نے بھی ہماری طرح تعلیم پائی ہو تو آپ دیکھیں گے کہ ایسے موقع پر آیۃ الکرسی آپ کے ذہن سے اتر جائے گی۔ اس کی جگہ آپ شاید دعائے قنوت پڑھنے لگ جائیں۔

بعض اوقات ایسا اتفاق بھی ہوا ہے کہ رات کے دو بجے چھڑی گھماتے تھیٹر سے واپس آ رہے ہیں اور ناٹک کے کسی نہ کسی گیت کی طرز ذہن میں بٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں، چونکہ گیت کے الفاظ یاد نہیں اور نومشقی کا عالم بھی ہے۔ اس لیے سیٹی پر اکتفا کی ہے کہ بے سرے بھی ہو گئے تو کوئی یہی سمجھے گا کہ انگریزی موسیقی ہے۔ اتنے میں ایک موڑ پر سے جو مڑے تو سامنے ایک بکری بندھی تھی۔ ذرا تصور ملاحظہ ہو، آنکھوں نے اسے بھی کتا دیکھا۔ ایک تو کتا اور پھر بکری کی جسامت کا۔ گویا بہت ہی کتا۔ بس ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ چھڑی کی گردش دھیمی ہوتے ہوتے ایک نہایت ہی نامعقول زاویے پر ہوا میں کہیں ٹھہر گئی۔ سیٹی کی موسیقی بھی تھرتھرا کر خاموش ہو گئی لیکن کیا مجال جو ہماری تھوتھنی کی مخروطی شکل میں ذرا بھی فرق آیا ہو۔ گویا ایک بے آواز لے ابھی تک نکل رہی ہے۔ طب کا مسئلہ ہے کہ ایسے موقعوں پر اگر سردی کے موسم میں بھی پسینہ آ جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ بعد میں پھر سوکھ جاتا ہے۔

چونکہ ہم طبعاً ذرا محتاط ہیں۔ اس لیے آج تک کتے کے کاٹنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ یعنی کسی کتے نے آج تک ہم کو کبھی نہیں کاٹا۔ اگر ایسا سانحہ کبھی پیش آیا ہوتا تو اس سرگزشت کی بجائے آج ہمارا مرثیہ چھپ رہا ہوتا۔ تاریخی مصرع دعائیہ ہوتا کہ "اس کتے کی مٹی سے بھی کتا گھاس پیدا ہو" لیکن ؎

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے سگِ رہ بُری بلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

جب تک اس دنیا میں کتے موجود ہیں اور بھونکنے پر مُصر ہیں، سمجھ لیجیے کہ ہم قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ اور پھر ان کتوں کے بھونکنے کے اصول بھی تو کچھ نرالے ہیں۔ یعنی ایک تو متعدی مرض ہے اور پھر بچوں بوڑھوں سبھی کو لاحق ہے۔ اگر کوئی بھاری بھرکم اسفندیار کتا کبھی کبھی اپنے رعب اور دبدبے کو قائم رکھنے کے لیے بھونک لے، تو ہم بھی چار و ناچار کہہ دیں کہ بھئی بھونک۔ (اگرچہ ایسے وقت میں اس کو زنجیر سے بندھا ہوا ہونا چاہیے) لیکن یہ کم بخت دو روزہ، سہ روزہ، دو دو تین تین تولے کے پلے بھی تو بھونکنے سے باز نہیں آتے۔ باریک آواز، ذرا سا پھیپھڑا، اس پر بھی اتنا زور لگا کر بھونکتے ہیں کہ آواز کی لرزش دُم تک پہنچتی ہے اور پھر بھونکتے ہیں چلتی موٹر کے سامنے آ کر، گویا اسے روک ہی تو لیں گے۔ اب اگر یہ خاکسار موٹر چلا رہا ہو تو قطعاً ہاتھ کام کرنے سے انکار کر دیں۔ لیکن ہر کوئی یوں ان کی جان بخشی تھوڑا ہی کر دے گا۔

کتوں کے بھونکنے پر مجھے سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ ان کی آواز سوچنے کے تمام قویٰ کو معطل کر دیتی ہے خصوصاً جب کسی دکان کے تختے کے نیچے سے ان کا ایک پورا خفیہ جلسہ باہر سڑک پر آ کر تبلیغ کا کام شروع کر دے تو آپ ہی کہیے ہوش ٹھکانے رہ سکتے ہیں؟

ہر ایک کی طرف باری باری متوجہ ہونا پڑتا ہے۔ کچھ ان کا شور، کچھ ہماری صدائے احتجاج (زیرِ لب)، بے ڈھنگی حرکات و سکنات (حرکات ان کی، سکنات ہماری)، اس ہنگامے میں دماغ بھلا کیا کام کر سکتا ہے؟ اگرچہ یہ مجھے بھی نہیں معلوم کہ اگر ایسے موقع پر دماغ کام کرے بھی تو کیا تیر مار لے گا۔ بہرصورت کتوں کی یہ پرلے درجے کی ناانصافی میرے نزدیک ہمیشہ قابلِ نفریں رہی ہے۔ اگر ان کا ایک نمائندہ شرافت کے ساتھ ہم سے آ کر کہہ دے کہ عالی جناب، سڑک بند ہے۔ تو خدا کی قسم ہم بغیر چون و چرا کیے واپس لوٹ جائیں۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہم نے کتوں کی درخواست پر کئی راتیں سڑکیں ناپنے میں گزار دی ہیں۔ لیکن پوری مجلس کا یوں متفقہ و متحدہ طور پر سینہ زوری کرنا ایک کمینہ حرکت ہے۔ (قارئین کرام کی خدمت میں عرض ہے کہ اگر ان کا کوئی عزیز و محترم کتا کمرے میں موجود ہو تو یہ مضمون بلند آواز سے نہ پڑھا جائے۔ مجھے کسی کی دل شکنی مطلوب نہیں)

خدا نے ہر قوم میں نیک افراد بھی پیدا کیے ہیں۔ کتے اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں۔ آپ نے خدا ترس کتا بھی ضرور دیکھا ہوگا۔ عموماً اس کے جسم پر تپسیا کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ جب چلتا ہے تو اس مسکینی اور عجز سے گویا بارِ گناہ کا احساس آنکھ نہیں اٹھانے دیتا۔ دُم اکثر پیٹ کے ساتھ لگی ہوتی ہے۔ سڑک کے بیچوں بیچ غور و فکر کے لیے لیٹ جاتا ہے۔ اور آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ شکل بالکل فلاسفروں کی سی اور شجرہ دیو جانس کلبی سے ملتا ہے۔ کسی گاڑی والے نے متواتر بگل بجایا، گاڑی کے مختلف حصوں کو کھٹکھٹایا۔ لوگوں سے کہلوایا۔ خود دس بارہ دفعہ آوازیں دیں۔ تو آپ نے سر کو وہیں زمین پر رکھے سرخ مخمور آنکھوں کو کھولا۔ صورتِ حالات کو ایک نظر دیکھا۔ اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ کسی نے ایک چابک لگا دیا۔ تو آپ نہایت اطمینان کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر ایک گز پرے جا لیٹے۔ اور خیالات کے سلسلے کو جہاں سے وہ ٹوٹ گیا تھا۔ وہیں سے پھر شروع کر دیا۔ کسی بائیسکل والے نے گھنٹی بجائی۔ تو لیٹے لیٹے ہی سمجھ گئے کہ بائیسکل ہے۔ ایسی چھچھوری چیزوں کے لیے وہ رستہ چھوڑ دینا فقیری کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔

رات کے وقت یہی کتا اپنی خشک پتلی سی دُم کو تا بحدِ امکان سڑک پر پھیلا کر رکھتا ہے۔ اس سے محض خدا کے برگزیدہ بندوں کی آزمائش مقصود ہوتی ہے۔ جہاں آپ نے غلطی سے اس پر پاؤں رکھ دیا۔ انھوں نے غیظ و غضب کے لہجہ میں آپ سے پرسش شروع کر دی۔ "بچا فقیروں کو چھیڑتا ہے۔ نظر نہیں آتا۔ ہم سادھو لوگ یہاں بیٹھے ہیں۔" بس اس فقیر کی بد دعا سے اسی وقت رعشہ شروع ہو جاتا ہے۔ بعد میں کئی راتوں تک یہی خواب نظر آتے رہتے ہیں۔ کہ بے شمار کتے ٹانگوں سے لپٹے ہوئے ہیں اور جانے نہیں دیتے۔ آنکھ کھلتی ہے تو پاؤں چارپائی کی ادوان میں پھنسے ہوتے ہیں۔

اگر خدا مجھے کچھ عرصے کے لیے اعلیٰ قسم کے بھونکنے اور کاٹنے کی طاقت عطا فرمائے تو جنونِ انتقام میرے پاس کافی مقدار میں ہے۔ رفتہ رفتہ سب کتے علاج کے لیے کسولی پہنچ جائیں۔ ایک شعر ہے ؎

عرفی تو میندیش ز غوغائے رقیباں
آوازِ سگاں کم نہ کند رزقِ گدا را

یہی وہ خلافِ فطرت شاعری ہے جو ایشیا کے لیے باعثِ ننگ ہے۔ انگریزی میں ایک مثل ہے کہ "بھونکتے ہوئے کتے کاٹا نہیں کرتے۔" یہ بجا سہی۔ لیکن کون جانتا ہے کہ ایک بھونکتا ہوا کتا کب بھونکنا بند کر دے اور کاٹنا شروع کر دے۔

اردو کی آخری کتاب

ماں کی مصیبت

ماں بچے کو گود میں لیے بیٹھی ہے۔ باپ انگوٹھا چوس رہا ہے۔ اور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ بچہ حسبِ معمول آنکھیں کھولے پڑا ہے۔ ماں محبت بھری نگاہوں سے اس کے منہ کو تک رہی ہے۔ اور پیار سے حسبِ ذیل باتیں پوچھتی ہے۔

(۱) وہ دن کب آئے گا جب تو میٹھی میٹھی باتیں کرے گا؟
(۲) بڑا کب ہوگا؟ مفصل لکھو۔
(۳) دولہا کب بنے گا۔ اور دلہن کب بیاہ کر لائے گا؟ اس میں شرمانے کی ضرورت نہیں۔
(۴) ہم کب بڈھے ہوں گے؟
(۵) تو کب کمائے گا؟
(۶) آپ کب کھائے گا؟ اور ہمیں کب کھلائے گا؟ باقاعدہ ٹائم ٹیبل بنا کر واضح کرو۔

بچہ مسکراتا ہے۔ اور کیلنڈر کی مختلف تاریخوں کی طرف اشارہ کرتا ہے تو ماں کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ جب ننھا سا ہونٹ نکال کر باقی چہرے سے رونی صورت بناتا ہے۔ تو بے چین ہو جاتی ہے۔ سامنے پنگوڑا لٹک رہا ہے۔ سلانا ہو تو اسے جھلا کر اس میں لٹا دیتی ہے۔ رات کو اپنے ساتھ سلاتی ہے (باپ کے ساتھ دوسرا بچہ سوتا ہے) جاگ اٹھتا ہے تو جھٹ چونک پڑتی ہے۔ اور محلے والوں سے معافی مانگتی ہے۔ کبھی نیند میں رونے لگتا ہے تو بے چاری مامتا کی ماری آگ جلا کر دودھ کو ایک ابال دیتی ہے۔ صبح جب بچہ کی آنکھ کھلتی ہے تو آپ بھی اٹھ بیٹھتی ہے اس وقت نو بجے کا عمل ہوتا ہے۔ دن چڑھے منہ دھلاتی ہے۔ آنکھوں میں کاجل لگاتی ہے اور جی کڑا کر کے کہتی ہے۔ کیا چاند سا مکھڑا نکل آیا۔ واہ واہ۔

کھانا خود بخود پک رہا ہے

دیکھنا۔ بیوی آپ بیٹھی پکا رہی ہے۔ ورنہ دراصل یہ کام میاں کا ہے۔ ہر چیز کیا قرینے سے رکھی ہے۔ دھوئے دھائے

یہ تو صندوق پر چڑھے ہیں۔ نامراد روز نکلیں گے۔ بائیں طرف نیچے اوپر مٹی کے برتن دھرے ہیں۔ کسی میں دال ہے کسی میں آٹا، کسی میں گھی ہے۔ گھڑے کا پانی رکھا ہے۔ جب چاہے آگ جلائے، جب چاہے پانی ڈال کر بجھائے۔ آٹا گندھا رکھا ہے۔ چاول پک چکے ہیں۔ نیچے اتار کر رکھے ہیں۔ دال چولہے پر چڑھی ہے۔ مسالہ سب تیار ہو چکا ہے لیکن بچہ مچل رہی ہے۔ میاں جب آتا ہے تو جا کر سامنے رکھتی ہے۔ پیچھے کبھی نہیں رکھتی۔ کھا چکتا ہے تو کیا نکالتی ہے۔ روٹیاں بڑا سے تو میاں کے سامنے ہزاروں رکابیوں کا ڈھیر لگ جاتا۔ کھانے پینے سے فارغ ہوتی ہے تو کبھی سینا پرونا ہے۔ کبھی چرخہ کاتنے لگتی ہے۔ کیوں نہ ہو، لہانا گانا کی بدولت بیماری بھاگ گئی ہے۔ اب تو بلاؤ ہارے تو ڈاکٹر سے علاج کروانا پڑے۔

دھوبی آج کپڑے دھو رہا ہے!

بڑی محنت کرتا ہے۔ شام کو نشہ چڑھتا ہے۔ دوپہر بیکار بیٹھا رہتا ہے۔ کبھی کبھی جب پرواہ دی لاتا ہے اور گھاٹ کا رستہ لیتا ہے۔ کبھی سالے یہ دھوتا ہے کبھی دریا پر۔ تاکہ کپڑے دن دلے کبھی نہ سکیں۔ جاڑا ہو تو سردی ستاتی ہے۔ گرمی ہو تو دھوپ جلاتی ہے مگر بیچارے کو ہر موسم میں کام کرنا ہے۔ دوپہر ہوئے لوٹتی۔ اب تک پانی میں کھڑا ہے ایسے ضرور سرسام ہو جائے گا۔ درخت کے نیچے بیل بند حلیت کے پاس کر بیٹھا ہے۔ دریا کے کنارے ایک گدھی دوڑ رہی ہے۔ دھوبی انہیں سے اپنا جی بہلاتا ہے

دیکھو دھوبن روٹی لائی ہے۔ دھوبی کو بہانہ ہاتھ آیا ہے۔ کپڑا پتھر پر رکھ کر اس سے باتیں کرنے لگا۔ کتے نے بھی دیکھ کر کان کھڑے کئے۔ اب دھوبن کھانا لائے گی۔ دھوبی دریا سے نکلے گا۔ دریا کا پانی پھر نیچا ہو جائے گا

میاں دھوبی! یہ کتا کیوں پال رکھا ہے؟ صاحب کی عادت کی وجہ سے اور پھر یہ تو ہمارا چوکیدار ہے۔ دیکھئے! امیروں کے کپڑے میدان میں پھیلے پڑے ہیں۔ کیا مجال کوئی پاس تو آ جائے۔ جو لوگ ایک دفعہ کپڑے لے جائیں پھر واپس نہیں لے جا سکتے۔ میاں دھوبی! تمہارا کام بہت اچھا ہے۔ میل کچیل سے پاک صاف کرتے ہو۔ ننگا پھرتے ہو۔

میں ایک میاں ہوں

میں ایک میاں ہوں۔ مطیع و فرماں بردار۔ اپنی بیوی روشن آرا کو اپنی زندگی کی ہر ایک بات سے آگاہ رکھنا اصول زندگی سمجھتا ہوں اور ہمیشہ سے اس پر کاربند رہا ہوں۔ خدا میرا انجام بخیر کرے۔

چنانچہ میری اہلیہ میرے دوستوں کی تمام عادات و خصائل سے واقف ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے دوست جتنے مجھ کو عزیز ہیں اتنے ہی روشن آرا کو برے لگتے ہیں۔ میرے احباب کی جن اداؤں نے مجھے مسحور کر رکھا ہے۔ انہیں میری اہلیہ ایک شریف انسان کے لئے باعث ذلت سمجھتی ہے۔

آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ خدانخواستہ وہ کوئی ایسے آدمی ہیں جن کا ذکر کسی معزز مجمع میں نہ کیا جا سکے۔ کچھ اپنے ہنر کے طفیل اور کچھ خاکسار کی صحبت کی بدولت سب کے سب ہی سفید پوش ہیں۔ لیکن اس بات کو کیا کروں کہ ان کی دوستی میرے گھر کے امن میں اس قدر خلل انداز ہوتی ہے کہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔

مثلاً مرزا صاحب ہی کو لیجئے! اچھے خاصے بھلے آدمی ہیں۔ گو محکمۂ جنگلات میں ایک معقول عہدے پر ممتاز ہیں۔ لیکن شکل و صورت ایسی پاکیزہ پائی ہے کہ امام مسجد معلوم ہوتے ہیں۔ جوا وہ نہیں کھیلتے۔ گلی ڈنڈے کا ان کو شوق نہیں۔ جیب کترتے ہوئے کبھی وہ نہیں پکڑے گئے۔ البتہ کبوتر پال رکھے ہیں۔ انہی سے جی بہلاتے ہیں۔ ہماری اہلیہ کی یہ کیفیت ہے کہ محلے کا کوئی بدمعاش جوئے میں قید ہو جائے۔ تو اس کی ماں کے پاس ماتم پرسی تک کو چلی جاتی ہیں۔ گلی ڈنڈے میں کسی کی آنکھ پھوٹ جائے تو مرہم پٹی کرتی رہتی ہیں۔ کوئی جیب کترا پکڑا جائے تو گھنٹوں آنسو بہاتی رہتی ہیں۔ لیکن وہ بزرگ جن کو دنیا بھر کی زبان مرزا صاحب مرزا صاحب کہتے تھکتی ہے۔ ہمارے گھر میں ”موئے کبوتر باز“ کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ کبھی بھولے سے بھی میں آسمان کی طرف نظر اٹھا کر کسی چیل، کوے، گدھ، شکرے کو دیکھنے لگ جاؤں تو روشن آرا کو فوراً خیال ہو جاتا ہے کہ بس اب یہ بھی کبوتر باز بننے لگا۔

اس کے بعد مرزا صاحب کی شان میں ایک قصیدہ شروع ہو جاتا ہے۔ بیچ میں میری جانب گریز۔ کبھی لمبی بحر میں کبھی چھوٹی بحر میں۔

ایک دن جب یہ واقعہ پیش آیا تو میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اس مرزا کبوتر کو کبھی پاس نہ پھٹکنے دوں گا۔ آخر گھر سب سے مقدم ہے۔ میاں بیوی کے باہمی اخلاص کے مقابلے میں دوستوں کی خوشنودی کیا چیز ہے؟ چنانچہ ہم غصے میں بھرے ہوئے مرزا صاحب کے گھر گئے، دروازہ

گنگنا شاید کہنے لگے۔ "اندر آجاؤ۔" ہم نے کہا "نہیں تم ہی باہر آؤ۔" خیر آخر اندر گیا۔ بدن پر شال ڈال کر ایک لمبی کرسی پر کچھ منہ میں لئے دھوپ میں بیٹھے تھے۔ کہنے لگے "بیٹھو۔" ہم نے کہا "بیٹھیں گے نہیں۔" آخر بیٹھ گئے۔ معلوم ہوتا ہے ہمارے تیور کچھ بگڑے ہوئے تھے۔ مرزا بولے "کیوں بھئی خیر باشد؟" ہم نے کہا "کچھ نہیں۔" کہنے لگے۔ "اس وقت کیسے آنا ہوا؟"

اب میرے دل میں فقرے کھولنے شروع ہوئے۔ پہلے ارادہ کیا کہ ایک دم ہی سب کچھ کہہ ڈالو اور چل دو۔ پھر سوچا کہ مذاق سمجھے گا اس لئے کسی ڈھنگ سے بات شروع کرو۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ پہلے کیا کہیں۔ آخر ہم نے کہا۔

"مرزا صاحب! کبوتر بہت مہنگے ہوگئے ہیں؟"

یہ سنتے ہی مرزا صاحب نے چین سے لے کر امریکہ تک کے تمام کبوتروں کو ایک ایک کرکے گنوانا شروع کیا۔ اس کے بعد دانے کی مہنگائی کے متعلق کل بات چیت کرتے رہے۔ اور پھر محض دانکانی پر تقریر کرنے لگے۔ اس دن تو ہم یونہی چلے آئے۔ لیکن ابھی کھٹ پٹ کا ارادہ دل میں باقی تھا۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ شام کو گھر میں ہماری صلح ہو گئی۔ ہم نے کہا چلو اب مرزا کے ساتھ بگاڑنے سے کیا حاصل؟ چنانچہ دوسرے دن مرزا سے بھی صلح ہوگئی۔

لیکن میری زندگی تلخ کرنے کے لئے ایک نہ ایک دوست ساتھ کا آمد ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت نے میری طبیعت میں قبولیت اور صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ کیونکہ ہماری اہلیہ کو ہم پر ہر وقت کسی نہ کسی دوست کی عادات بد کی جھلک نظر آتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ میری اپنی ذاتی شخصی سیرت بالکل ہی نابود ہو چکی ہے۔

شادی سے پہلے ہم کبھی کبھی دس بجے اٹھا کرتے تھے ورنہ گیارہ بجے۔ اب کتنے بجے اٹھتے ہیں؟ اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جن کے گھر ناشتہ زبردستی صبح کے سات بجے کرا دیا جاتا ہے۔ اور اگر ہم کبھی بشری کمزوری کے تقاضے سے مرغوں کی طرح تڑکے اٹھنے میں کوتاہی کریں۔ تو فوراً کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ اس نکھٹو نسیم کی صحبت کا نتیجہ ہے۔ ایک دن صبح صبح ہم نہا رہے تھے سردی کا موسم۔ ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ صابن سر پر ملتے تھے تو ناک میں گھستا تھا۔ کہ اتنے میں ہم نے خدا جانے کس پُراسرار جذبے کے ماتحت غسل خانے میں الاپنا شروع کیا۔ اور پھر گانے لگے کہ "توری چھل بل ہے نیاری . . . ." . . . کہ اس کو ہماری انتہائی بدمذاقی سمجھا گیا اور اس بدمذاقی کا اصل منبع ہمارے دوست پنڈت جی کو ٹھہرایا گیا۔

لیکن حال ہی میں مجھ پر ایک ایسا سانحہ گزرا ہے کہ میں نے تمام دوستوں کو ترک کر دینے کی قسم کھالی ہے۔

تین چار دن کا ذکر ہے کہ صبح کے وقت روشن آرا نے مجھ سے میکے جانے کے لئے اجازت مانگی۔ جب سے ہماری شادی ہوئی ہے روشن آرا صرف دو دفعہ میکے گئی ہے۔ اور پھر اس نے کچھ اس سادگی اور عجز سے کہا کہ میں انکار نہ کر سکا۔ کہنے لگی۔ "تو پھر میں ڈیڑھ بجے کی گاڑی میں چلی جاؤں؟" میں نے کہا "اور کیا؟"

وہ جھٹ تیاری میں مشغول ہوگئی اور میرے دماغ میں آزادی کے خیالات نے چکر لگانے شروع کئے۔ یعنی اب بے شک دوست آئیں۔ بے شک اودھم مچائیں۔ میں بے شک گاؤں۔ بے شک جب چاہوں اٹھوں۔ بے شک تھیٹر جاؤں۔ میں نے کہا:۔

"روشن آرا جلدی کرو ورنہ تو گاڑی چھوٹ جائے گی۔"

ساتھ اسٹیشن پر گیا۔ جب گاڑی میں سوار کرا چکا تو کہنے لگی "خط ضرور لکھتے رہئے۔" میں نے کہا۔ "ہر روز اور تم بھی؟"

کھانا وقت پر کھا لیا کیجئے۔ اور ہاں دھلی ہوئی جرابیں اور رومال الماری کے نچلے خانے میں پڑے ہیں۔"

اس کے بعد ہم دونوں خاموش ہو گئے اور ایک دوسرے کے چہرے کو دیکھتے رہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے میرا دل بھی بیتاب ہونے لگا۔ اور جب گاڑی روانہ ہوئی۔ تو میں دیر تک مبہوت پلیٹ فارم پر کھڑا رہا۔

آخر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا کتابوں کی دکان تک آیا۔ اور رسالوں کے ورق پلٹ پلٹ کر تصویریں دیکھتا رہا۔ ایک اخبار خریدا۔ تہ کر کے جیب میں ڈالا۔ اور عادت کے مطابق گھر کا ارادہ کر لیا۔

پھر خیال آیا کہ اب گھر جانا ضروری نہیں رہا۔ اب جہاں چاہوں جاؤں۔ چاہوں تو گھنٹوں سٹیشن پر ہی ٹہلتا رہوں۔ دل چاہتا تھا قلابازیاں کھاؤں

کہتے ہیں جب افریقہ کے وحشیوں کو کسی تہذیب یافتہ ملک میں کچھ عرصہ رکھا جاتا ہے تو گو یا وہ وہاں کی شان و شوکت سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن جب واپس جنگلوں میں پہنچتے ہیں۔ تو خوشی کے مارے چیخیں مارتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت میرے دل کی بھی ہو رہی تھی۔ بھاگتا ہوا اسٹیشن سے آزادانہ باہر نکلا۔ آزادی کے لہجے میں تانگے والے کو بلایا اور کود کر تانگے میں سوار ہو گیا۔ سگریٹ سلگائی۔ ٹانگیں سیٹ پر پھیلا دیں۔ اور کلب کو روانہ ہو گیا۔

رستے میں ایک بہت ضروری کام یاد آیا۔ تانگہ موڑ کر گھر کی طرف چلا۔ باہر ہی سے نوکر کو آواز دی۔

"امجد!"

"حضور!"

"دیکھو حجام کو جا کے کہہ دو کہ کل گیارہ بجے آئے۔"

"بہت اچھا۔"

"گیارہ بجے سن لیا نا! کہیں روز کی طرح پھر چھ بجے وارد نہ ہو جائے۔"

"بہت اچھا حضور۔"

"اور اگر گیارہ بجے سے پہلے آئے تو دھکے دے کر باہر نکال دو۔"

یہاں سے کلب پہنچے۔ آج تک کبھی دن کے دو بجے کلب نہ گیا تھا۔ اندر داخل ہوا تو سنسان۔ آدمی کا نام نشان تک نہیں۔ سب کمرے دیکھ ڈالے۔ بلیرڈ کا کمرہ خالی۔ شطرنج کا کمرہ خالی۔ تاش کا کمرہ خالی۔ صرف کھانے کے کمرے میں ایک ملازم چھریاں تیز کر رہا تھا۔

اس سے پوچھا "کیوں بے آج کوئی نہیں آیا؟"

کہنے لگا "حضور آپ جانتے ہیں۔ اس وقت بھلا کون آتا ہے؟"

بہت مایوس ہوا۔ باہر نکل کر سوچنے لگا کہ اب کیا کروں؟ اور کچھ نہ سوجھا تو وہاں سے مرزا صاحب کے گھر پہنچا۔ معلوم ہوا ابھی دفتر سے واپس نہیں آئے۔ دفتر پہنچا۔ دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ میں نے سب حال بیان کیا۔ کہنے لگے۔

"تم باہر کے کمرے میں ٹھہرو۔ تھوڑا سا کام رہ گیا ہے۔ بس ابھی نمٹا کے تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ شام کا پروگرام کیا ہے؟"

میں نے کہا "تھیٹر!"

کہنے لگے "بس ٹھیک ہے۔ تم باہر بیٹھو۔ میں ابھی آیا!"

باہر کے کمرے میں ایک چھوٹی سی کرسی پڑی تھی۔ اس پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا اور جیب سے اخبار نکال کر پڑھنا شروع کر دیا۔ شروع سے آخر تک سب پڑھ ڈالا اور ابھی چار بجنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ پھر سے پڑھنا شروع کر دیا۔ سب اشتہار پڑھ ڈالے اور پھر سب اشتہاروں کو دوبارہ پڑھ ڈالا۔

آخر کار اخبار پھینک کر بغیر کسی تکلف یا لحاظ کے جمائیاں لینے لگا۔ جمائی پہ جمائی۔ جمائی پہ جمائی۔ حتیٰ کہ جبڑوں میں درد ہونے لگا۔

اس کے بعد ٹانگیں ہلانا شروع کیں۔ لیکن اس سے بھی تھک گیا۔

پھر میز پر طبلے کی گتیں بجاتا رہا۔

بہت تنگ آ گیا تو دروازہ کھول کر مرزا سے کہا "ارے یار اب چلتا بھی ہے کہ مجھے انتظار ہی میں مار ڈالے گا۔ مردود کہیں کے! سارا دن میرا ضائع کر دیا۔"

وہاں سے اٹھ کر مرزا کے گھر۔ گپ شپ رہی۔ بڑے لطف میں کٹی۔ کھانا کھایا اور وہاں سے دوستوں کو ساتھ لے تھیٹر گئے۔ رات کے ڈھائی بجے گھر لوٹے۔ تکیے پر سر رکھا ہی تھا کہ نیند نے بے ہوش کر دیا

صبح آنکھ کھلی تو کمرے میں دھوپ لہریں مار رہی تھی۔ گھڑی کو دیکھا تو پونے گیارہ بجے تھے۔ ہاتھ بڑھا کر میز پر سے ایک سگریٹ اٹھایا اور سلگا کر پلنگ ہی پر رکھ دیا اور پھر اونگھنے لگا

گیارہ بجے امجد کمرے میں داخل ہوا۔ کہنے لگا "حضور حجام آیا ہے۔"

ہم نے کہا "یہیں بلا لاؤ۔" یہ عیش مدت کے بعد نصیب ہوا کہ بستر میں لیٹے لیٹے حجامت بنوا لیں۔ اطمینان سے اٹھے اور نہا دھو کر باہر جانے کے لئے تیار ہوئے لیکن طبیعت میں وہ شگفتگی نہ تھی جس کی امید لگائے بیٹھے تھے۔ چلتے وقت الماری سے رومال نکالا۔ تو خدا جانے کیا خیال دل میں آیا۔ وہیں کرسی پر بیٹھ گیا اور سودائیوں کی طرح اس رومال کو تکتا رہا۔ الماری کا ایک اور خانہ کھولا تو سرمئی رنگ کا ایک ریشمی دوپٹہ نظر پڑا۔ باہر نکالا۔ ہلکی ہلکی عطر کی خوشبو آ رہی تھی۔ بہت دیر تک اس پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ دل بھر آیا۔ گھر سونا معلوم ہونے لگا۔ بہترا اپنے آپ کو سنبھالا لیکن آنسو ٹپک ہی پڑے۔ آنسوؤں کا گرنا تھا کہ بیتاب ہو گیا اور سچ مچ رونے لگا۔ سب جوڑے باری باری نکال کر دیکھے لیکن نا معلوم کیا کیا یاد آیا کہ اور بھی بے قرار ہوتا گیا۔

آخر نہ رہا گیا۔ باہر نکلا اور سیدھا تار گھر پہنچا۔ وہاں سے تار دیا کہ "میں بہت اداس ہوں تم فوراً آ جاؤ!"

تار دینے کے بعد دل کو کچھ اطمینان ہوا۔ یقین تھا کہ روشن آرا اب جس قدر جلد ہو سکے گا آ جائے گی۔ اس سے کچھ ڈھارس بندھ گئی اور دل پر سے جیسے ایک بوجھ ہٹ گیا۔

دوسرے دن دوپہر کو مرزا کے مکان پر تاش کا معرکہ گرم ہونا تھا۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ مرزا کے والد سے کچھ لوگ ملنے آئے ہیں۔ اس لئے تجویز ٹھہری کہ یہاں سے کسی اور جگہ سرک چلیں۔ ہمارا مکان تو خالی تھا ہی۔ سب یار لوگ وہیں جمع ہوئے۔ امجد سے

کہہ دیا گیا کہ حقے میں اگر ذرا بھی خلل واقع ہوا تو تمہاری خیر نہیں۔ اور یہاں اس طرح سے متواتر پہنچتے رہیں کہ بس تانتا لگ جائے۔

اب اس کے بعد کے واقعات کو کچھ مزے ہی سے مرتب کہہ سکتے ہیں۔ شروع شروع میں تو تاش باقاعدہ اور باضابطہ ہوتا رہا۔ جو کھیل بھی کھیلا گیا۔ بہت مہذب طریقے سے قواعد وضوابط کے مطابق اور متانت و سنجیدگی کے ساتھ۔ لیکن ایک دو گھنٹے کے بعد کچھ خوش طبعی شروع ہوئی۔ یار لوگوں نے ایک دوسرے کے پتے دیکھنے شروع کر دیے۔ حالت یہ کہ کھیل نہیں اور ایک آدھ کام کا پتہ اڑا لیتے ہیں اور ساتھ ہی قہقہے پر قہقہے اڑنے لگے۔ تین گھنٹے کے بعد حالت یہ کہ کوئی گھٹنا ہلا ہلا کر گا رہا ہے۔ کوئی فرش پر بازو ٹیکے سیٹی بجا رہا ہے۔ اور کوئی ضیغہ کا ایک آدھ مذاقیہ فقرہ لاکھوں دفعہ دہرا رہا ہے۔ لیکن تاش برابر ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد دھول دھپا شروع ہوا۔ ان خوش فعلیوں کے دوران میں ایک مسخرے نے ایک بساتی سی تجویز کر دی جس کے آخر میں ایک آدمی بادشاہ بن جاتا ہے۔ دوسرا وزیر، تیسرا کوتوال اور جو سب سے ہار جائے وہ چور۔ سب نے کہا "واہ واہ کیا بات کہی ہے"۔ ایک بولا "پھر آج جو چور بنا اس کی شامت آجائے گی"۔ دوسرے نے کہا "اور نہیں تو کیا۔ بھلا کوئی ہنسی کھیل ہے سلطنتوں کے معاملے ہیں سلطنتوں کے"۔

کھیل شروع ہوا۔ بدقسمتی سے ہم چور بن گئے۔ طرح طرح کی سزائیں تجویز ہونے لگیں۔ کوئی کہے "ننگے پاؤں بھاگتے ہوئے جائے اور حلوائی کی دکان سے مٹھائی خرید کے لائے"۔ کوئی کہے "نہ حضور سب کے پاؤں پڑے اور ہر ایک سے دو دو چپتیں کھائے"۔ دوسرے نے کہا "نہیں صاحب ایک پاؤں پر کھڑا ہو کر ہمارے سامنے ناچے"۔ آخر میں بادشاہ سلامت بولے "ہم حکم دیتے ہیں کہ چور کو کاغذ کی ایک لمبوتری نوک دار ٹوپی پہنائی جائے اور اس کے چہرے پر سیاہی مل دی جائے اور اسی حالت میں جا کر اندر سے حقے کی چلم بھر کر لائے"۔ سب نے کہا "کیا دماغ پایا ہے حضور نے۔ کیا سزا تجویز کی ہے۔ واہ واہ!"

ہم بھی مزے میں آئے ہوئے تھے۔ ہم نے کہا "تو ہوا کیا؟ آج ہم ہیں۔ کل کسی اور کی باری آجائے گی"۔ نہایت خندہ پیشانی سے اپنے چہرے کو پیش کیا۔ ہنس ہنس کر وہ بے ہودہ سی ٹوپی پہنی۔ ایک شانِ استغنا سے چلم اٹھائی اور زنانے کا دروازہ کھول کر باورچی خانے کو چل دیئے اور ہمارے پیچھے کمرہ قہقہوں سے گونج رہا تھا۔

صحن میں پہنچے ہی تھے کہ باہر کا دروازہ کھلا اور ایک برقعہ پوش خاتون اندر داخل ہوئی۔ منہ سے برقعہ الٹا۔ تو دوستو! آہا! دم خشک ہو گیا۔ بدن پر ایک لرزہ سا طاری ہو گیا۔ زبان بند ہو گئی۔ سامنے وہ روشن آرا تھی جس کو میں نے تار دے کر بلایا تھا کہ تم فوراً آجاؤ۔ میں بہت اداس ہوں۔ اور اپنی یہ حالت کہ منہ پر سیاہی ملی ہے۔ سر پر وہ لمبوتری سی کاغذ کی ٹوپی پہن رکھی ہے اور ہاتھ میں چلم اٹھائے کھڑے ہیں اور مردانے سے قہقہوں کا شور برابر آرہا ہے

روح منجمد ہو گئی۔ اور تمام حواس نے جواب دے دیا۔ روشن آرا کچھ دیر تو چپکی کھڑی دیکھتی رہی اور پھر کہنے لگی.... لیکن میں کیا بتاؤں کہ کیا کہنے لگی؟ اس کی آواز تو میرے کانوں تک جیسے بیہوشی کے عالم میں پہنچ رہی تھی۔

اب تک آپ اتنا تو جان گئے ہوں گے کہ میں بذاتِ خود ازحد شریف واقع ہوا ہوں۔ جہاں تک میں ہوں۔ مجھ سے بہتر میاں دنیا پیدا نہیں کر سکتی۔ میری سسرال میں سب کی یہی رائے ہے اور میرا اپنا ایمان بھی یہی ہے لیکن ان دوستوں نے مجھے رسوا کر دیا ہے اس لئے میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ اب یا گھر میں رہوں گا یا کام پر جایا کروں گا۔ نہ کسی سے ملوں گا اور نہ کسی کو اپنے گھر آنے دوں گا سوائے ڈاکئے یا حجام کے۔ اور ان سے بھی نہایت مختصر باتیں کیا کروں گا۔

"منظور ہے؟"

"جی ہاں۔"

"تم سے جاؤ، چلے جاؤ۔"

"ناخن تراشتے رہو۔"

"بھاگ جاؤ!"

میں اس سے زیادہ کام نہ کروں تو آپ دیکھئے تو سہی!

مریدپور کا پیر

اکثر لوگوں کو اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ میں اپنے وطن کا ذکر کبھی نہیں کرتا۔ بعض اس بات پر بھی حیران ہیں کہ میں اب کبھی اپنے وطن کو نہیں جاتا۔ جب کبھی لوگ مجھ سے اس کی وجہ پوچھتے ہیں تو میں ہمیشہ بات ٹال دیتا ہوں۔ اس سے لوگوں کو طرح طرح کے شبہات ہونے لگتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے وہاں اس پر ایک مقدمہ ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ سے روپوش ہے۔ کوئی کہتا ہے۔ وہاں کہیں ملازم تھا۔ غبن کا الزام لگا۔ ہجرت کرتے ہی بنی۔ کوئی کہتا ہے والد اس کی بدعنوانیوں کی وجہ سے گھر میں نہیں گھسنے دیتے۔ غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ آج میں ان سب غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے والا ہوں۔ خدا آپ پڑھنے والوں کو انصاف کی توفیق دے۔

قصہ میرے بھتیجے سے شروع ہوتا ہے۔ میرا بھتیجا دیکھنے میں عام بھتیجوں سے مختلف نہیں۔ میری تمام خوبیاں اس میں موجود ہیں اور اس کے علاوہ نئی پود سے تعلق رکھنے کے باعث اس میں بعض فالتو اوصاف نظر آتے ہیں۔ لیکن ایک صفت تو اس میں ایسی ہے کہ آج تک ہمارے خاندان میں اس شدت کے ساتھ کبھی رونما نہ ہوئی تھی۔ وہ یہ کہ بڑوں کی عزت کرتا ہے۔ اور میں تو اس کے نزدیک بس علم و فن کا ایک دیوتا ہوں۔ یہ خبط اس کے دماغ میں کیوں سمایا ہے؟ اس کی وجہ میں یہی بتا سکتا ہوں کہ نہایت اعلیٰ سے اعلیٰ خاندانوں میں بھی کبھی کبھی ایسا دیکھنے میں آجاتا ہے۔ میں نے شائستہ سے شائستہ والدین کے فرزندوں کو بعض وقت بزرگوں کا احترام کرتے دیکھا ہے کہ ان پر نیچ ذات کا دھوکا ہونے لگتا ہے۔

ایک سال میں کانگرس کے جلسے میں چلا گیا۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہو گا کہ کانگرس کا جلسہ میرے پاس چلا آیا۔ مطلب یہ کہ جس شہر میں میں موجود تھا وہیں کانگرس والوں نے بھی اپنا سالانہ اجلاس منعقد کرنے کی ٹھان لی۔ میں پہلے بھی اکثر جگہ یہ اعلان کر چکا ہوں اور اب بھی ببانگ دہل یہ کہنے کو تیار ہوں کہ اس میں میرا ذرا بھی قصور نہ تھا۔ بعض لوگوں کو یہ شک ہے کہ میں نے محض اپنی تسکین کی خاطر کانگرس کا جلسہ اپنے پاس ہی کرا لیا۔ لیکن یہ محض حاسدوں کی بدظنی ہے۔ بھانڈوں کو میں نے اکثر شہر میں بلوایا ہے۔ دو ایک مرتبہ بعض تھیٹروں کو بھی دعوت دی ہے۔ لیکن کانگرس کے مقابلے میں میرا رویہ ہمیشہ ایک گمنام شہری کا سا رہا ہے۔ میں اس سے زیادہ اس موضوع پر کچھ نہ لکھوں گا۔

جب کانگرس کا سالانہ جلسہ بغل میں ہو رہا ہو تو کون ایسا متقی ہو گا جو وہاں جانے سے گریز کرے۔ پھر زمانہ بھی تعطیلات اور فرصت کا تھا۔ چنانچہ میں نے شغلِ بیکاری کے طور پر اس جلسے کی ایک ایک تقریر سنی۔ دن بھر تو جلسے میں رہتا۔ رات کو گھر آ کر

اس دن کے بعد سے حالات اپنے بھتیجے کو لکھ بھیجتا تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے۔ بعد کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ بھتیجے صاحب میرے ہر خط کو بے حد ادب و احترام کے ساتھ کھولتے۔ بلکہ بعض بعض باتوں سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس افتتاحی تقریب سے پیشتر وہ باقاعدہ وضو بھی کر لیتے۔ خط کو خود پڑھتے۔ پھر دوستوں کو سناتے۔ پھر اخباروں کے ایجنٹوں کی دکان پر مقامی لال بجھکڑوں کے حلقے میں اس کو خوب بڑھا چڑھا کر دہراتے۔ پھر مقامی اخبار کے بے حد مقامی ایڈیٹر کے حوالے کر دیتے۔ جو اسے بڑے اہتمام کے ساتھ چھاپ دیتا۔ اس اخبار کا نام مرید پور گزٹ ہے۔ اس کا مکمل فائل کسی کے پاس موجود نہیں۔ دو مہینے تک جاری رہا۔ پھر بعض مالی مشکلات کی وجہ سے بند ہو گیا۔ ایڈیٹر صاحب کا حلیہ حسبِ ذیل ہے۔ رنگ گندمی۔ آنکھیں نیم باز۔ نسل سے جوڑ معلوم ہوتے ہیں۔ کسی صاحب کو ان کا پتہ معلوم ہو تو مرید پور کی خلافت کمیٹی کو اطلاع پہنچا دیں۔ اور عنداللہ ماجور ہوں۔ نیز کوئی صاحب ان کو ہرگز ہرگز کوئی چندہ نہ دیں ورنہ خلافت کمیٹی ذمہ دار نہ ہوگی۔

یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ اس اخبار نے میرے ان خطوط کے بل پر اپنا ایک کانگرس نمبر بھی نکال مارا۔ جو اتنی بڑی تعداد میں چھپا کہ اس کے اوراق اب تک بعض پنساریوں کی دکانوں پر نظر آتے ہیں۔ بہرحال مرید پور کے بچے بچے نے میری قابلیت، انشاپردازی، بیدار مغزی اور جوشِ قومی کی داد دی۔ میری اجازت اور میرے علم کے بغیر مجھے مرید پور کا قومی لیڈر قرار دیا گیا۔ ایک دو شاعروں نے مجھ پر نظمیں بھی لکھیں۔ جو وقتاً فوقتاً مرید پور گزٹ میں چھپتی رہیں۔

میں اپنی اس عزت افزائی سے محض بے خبر تھا۔ سچ ہے۔ خدا جس کو چاہتا ہے عزت بخشتا ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میں نے اپنے بھتیجے کو محض چند خطوط لکھ کر اپنے ہم وطنوں کے دل میں اس قدر گھر کر لیا ہے۔ اور کسی کو کیا معلوم تھا کہ یہ معمولی سا انسان جو ہر روز چپ چاپ سر نیچا کئے بازاروں سے گزر جاتا ہے مرید پور میں پوجا جاتا ہے۔ میں وہ خطوط لکھنے کے بعد کانگرس اور اس کے تمام متعلقات کو قطعاً فراموش کر چکا تھا۔ مرید پور گزٹ کا میں خریدار نہ تھا۔ بھتیجے نے میری بزرگی کے رعب کی وجہ سے کبھی یہ تفصیل تذکرۃً بھی نہ لکھ بھیجا کہ آپ لیڈر ہو گئے ہیں۔ میں جب تنہا ہوں کہ مجھ سے یوں کہتا تو برسوں تک اس کی بات میری سمجھ میں نہ آتی۔ لیکن بہرحال مجھے کچھ تو معلوم ہوتا کہ میں ترقی کر کے کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہوں۔

کچھ عرصے بعد خون کی خرابی کی وجہ سے ملک میں جا بجا جلسے نکل آئے جس کسی کو ایک میز ایک کرسی اور ایک گلدان میسر آیا اسی نے جلسے کا اعلان کر دیا۔ جلسوں کے اس موسم میں ایک دن مرید پور کی انجمن نوجوانانِ ہند کی طرف سے میرے نام اس مضمون کا ایک خط موصول ہوا۔ کہ آپ کے شہر کے لوگ آپ کے دیدار کے منتظر ہیں۔ ہر کہ و مہ آپ کے روئے انور کو دیکھنے اور آپ کے پاکیزہ خیالات سے مستفید ہونے کے لئے بیتاب ہے۔ سارا ملک بھر کو آپ کی ذاتِ بابرکات کی ازحد ضرورت ہے۔ لیکن وطن کا حق سب سے زیادہ ہے کیونکہ ؎

خارِ وطن از سنبل و ریحاں خوشتر

اسی طرح کی تین چار براہینِ قاطعہ کے بعد مجھ سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ آپ یہاں آکر لوگوں کو ہندو مسلم اتحاد کی تلقین کریں۔
خط پڑھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ لیکن جب ٹھنڈے دل سے اس پر غور کیا۔ تو رفتہ رفتہ باشندگانِ مرید پور کی مردم شناسی کا قائل ہو گیا۔

میں ایک گرم انسان ہوں اور یہ لیڈری کا فتنہ ایک لمحہ ہی میں چڑھ جاتا ہے۔ اس ایک لمحے کے اندر مجھے اپنا وطن بہت ہی پیارا معلوم ہونے لگا۔ اہلِ وطن کی بے حسی پر بڑا ترس آیا۔ ایک آواز نے کہا۔ کہ ان بچاروں کی بہبودی اور بھلائی کا ذمہ دار تو ہی ہے۔ تجھے خدا نے تدبر کی قوت بخشی ہے۔ ہزارہا انسان تیرے منتظر ہیں۔ اٹھ! سینکڑوں لوگ تیرے لئے ماحضر لئے بیٹھے ہوں گے۔ چنانچہ میں نے مرید پور کی دعوت قبول کر لی۔ اور لیڈرانہ انداز میں بذریعہ تار اطلاع دی کہ پندرہ دن کے بعد فلاں ٹرین سے مرید پور پہنچ جاؤں گا۔ سٹیشن پر کوئی شخص نہ آئے۔ ہر ایک شخص کو چاہئے کہ اپنے اپنے کام میں مصروف رہے۔ ہندوستان کو اس وقت عمل کی ضرورت ہے۔

اس کے بعد جلسے کے دن تک میں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنی ہونے والی تقریر کی تیاری میں صرف کر دیا۔ طرح طرح کے فقرے دماغ میں صبح و شام پھرتے رہتے۔

"ہندو اور مسلم بھائی بھائی ہیں۔"

"ہندو و مسلم شیر و شکر ہیں۔"

"ہندوستان کی گاڑی کے دو پہیے۔ اے میرے دوستو ہندو اور مسلمان ہی تو ہیں۔"

"جن قوموں نے اتفاق کی رسی کو مضبوط پکڑا۔ وہ اس وقت تہذیب کے نصف النہار پر ہیں۔ جنھوں نے نفاق اور پھوٹ کی طرف رجوع کیا۔ تاریخ نے ان کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں۔" وغیرہ وغیرہ۔

بچپن کے زمانے میں کسی درسی کتاب میں "سنا ہے کہ دو بیل رہتے تھے اک جا!" والا واقعہ پڑھا تھا۔ اُسے نکال کر نئے سرے سے پھر پڑھا اور اس کی تمام تفصیلات کو نوٹ کر لیا۔ پھر یاد آیا۔ کہ ایک اور کہانی بھی پڑھی تھی۔ جس میں ایک شخص مرتے وقت اپنے تمام لڑکوں کو بلا کر لکڑیوں کا ایک گٹھا ان کے سامنے رکھ دیتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ اس گٹھے کو توڑو۔ وہ توڑ نہیں سکتے۔ پھر اس گٹھے کو کھول کر ایک ایک لکڑی ان سب کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ جسے وہ آسانی سے توڑ لیتے ہیں۔ اس طرح وہ اتفاق کا سبق اپنی اولاد کے ذہن نشین کراتا ہے۔ اس کہانی کو بھی لکھ لیا۔ تقریر کا آغاز سوچا تو کچھ اس طرح کی تمہید مناسب معلوم ہوئی۔ کہ

"پیارے ہم وطنو!

گھٹا سر پہ ادبار کی چھا رہی ہے   فلاکت سماں اپنا دکھلا رہی ہے
نحوست پس و پیش منڈلا رہی ہے   یہ چاروں طرف سے ندا آ رہی ہے
کہ کل کون تھے آج کیا ہو گئے تم
ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے تم

ہندوستان کے جس مایۂ ناز شاعر یعنی مولانا الطاف حسین حالی پانی پتی نے آج سے کئی برس پیشتر یہ اشعار قلم بند کئے تھے۔ اس کو کیا معلوم تھا کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا اس کے یہ الم ناک الفاظ روز بروز صحیح تر ہوتے جائیں گے۔ آج ہندوستان کی یہ حالت ہے...... وغیرہ"

اس کے بعد سوچا کہ ہندوستان کی حالت کا ایک دردناک نقشہ کھینچوں گا۔ افلاس۔ غربت۔ بغض وغیرہ کی طرف اشارہ کروں گا۔ اور پھر پوچھوں گا کہ اس کی وجہ آخر کیا ہے؟ ان تمام وجوہ کو دہراؤں گا۔ جو لوگ اکثر بیان کرتے ہیں۔ مثلاً غیر ملکی حکومت۔

آب و ہوا، مغربی تہذیب۔ لیکن میں سب کو باری باری غلط قرار دوں گا۔ اور پھر اصل وجہ بتاؤں گا کہ اصل وجہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا نفاق ہے۔ آخر میں اتحاد کی نصیحت کروں گا اور تقریر کو اس شعر پر ختم کروں گا کہ:

اے عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

دس بارہ دن اچھی طرح غور کر لینے کے بعد میں نے اس تقریر کا ایک خاکہ سا بنا لیا۔ اور اس کو ایک کاغذ پر نوٹ کر لیا تاکہ جلسے میں اسے اپنے سامنے رکھ سکوں۔ وہ خاکہ کچھ اس طرح کا تھا۔

۱۔ تمہید۔ اشعار حالی (بلند اور دردناک آواز سے پڑھو)

۲۔ ہندوستان کی موجودہ حالت

(الف)۔ افلاس

(ب) جہل

(ج) قومی رہنماؤں کی خود غرضی۔

۳۔ اس کی وجہ۔

کیا غیر ملکی حکومت ہے؟ نہیں

کیا آب و ہوا ہے؟ نہیں

کیا مغربی تہذیب ہے؟ نہیں

تو پھر کیا ہے؟ (وقفہ جس کے دوران میں مسکراتے ہوئے تمام حاضرین جلسہ پر ایک نظر ڈالو) پھر بتاؤ۔ کہ وجہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا نفاق ہے (نعروں کے لئے وقفہ) اس کا نقشہ کھینچو۔ فسادات وغیرہ کا ذکر رقت انگیز آواز میں کرو۔

(اس کے بعد شاید چند نعرے بلند ہوں۔ ان کے لئے ذرا ٹھہر جاؤ)

(۵) خاتمہ۔ عام نصائح۔ خصوصاً اتحاد کی تلقین (شعر)

(اس کے بعد انکسار کے انداز میں جا کر اپنی کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ اور لوگوں کی داد کے جواب میں ایک ایک لمحے کے بعد حاضرین کو سلام کرتے رہو)

اس خاکے کو تیار کر چکنے کے بعد۔ جلسے کے دن تک ہر روز اس پر ایک نظر ڈالتا رہا۔ اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بعض معرکہ آرا فقروں کی مشق کرتا رہا۔ نعرے کے بعد کی مسکراہٹ کی خاص مشق بہم پہنچائی۔ کھڑے ہو کر دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں گھومنے کی عادت ڈالی تاکہ تقریر کے دوران میں آواز سب طرف پہنچ سکے۔ اور سب لوگ اطمینان کے ساتھ ایک ایک لفظ سن لیں۔

مرید پور کا سفر آٹھ گھنٹے کا تھا۔ رستے میں سانگلہ کے اسٹیشن پر گاڑی بدلنی پڑتی تھی۔ انجمن نوجوانان ہند کے بعض جوشیلے ارکان وہاں استقبال کو آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے ہار پہنائے۔ اور کچھ پھل وغیرہ کھانے کو دیئے۔ سانگلے سے مرید پور تک ان کے ساتھ ہم سیاسی

مسائل پر بحث کرتا رہا۔ جب گاڑی مرید پور پہنچی تو اسٹیشن کے باہر کم از کم تین ہزار آدمیوں کا ہجوم تھا جو متواتر نعرے لگا رہا تھا۔ میرے ساتھ جو والنٹیر تھے۔ انھوں نے کہا: "سر باہر نکالیے۔ لوگ دیکھنا چاہتے ہیں۔" میں نے حکم کی تعمیل کی۔ ہار میرے گلے میں تھے۔ ایک گلدستہ میرے ہاتھ میں تھا۔ مجھے دیکھا تو لوگ اور بھی جوش کے ساتھ نعرہ زن ہوئے۔ بمشکل تمام باہر نکلا۔ موٹر پر مجھے سوار کرایا گیا اور جلوس جلسہ گاہ کی طرف چلا۔

جلسہ گاہ میں داخل ہوئے تو ہجوم پانچ چھ ہزار تک پہنچ چکا تھا۔ جو یک آواز ہو کر میرا نام لے لے کر نعرے لگا رہا تھا۔ دائیں بائیں سرخ سرخ جھنڈوں پر کچھ خاکسار کی تعریف میں چند کلمات بھی درج تھے۔ مثلاً "ہندوستان کی نجات تمہیں سے ہے۔" "مرید پور کے فرزند خوش آمدید۔" "ہندوستان کو اس وقت عمل کی ضرورت ہے۔"

مجھ کو اسٹیج پر بٹھایا گیا۔ صدر جلسہ نے لوگوں کے سامنے مجھ سے دوبارہ مصافحہ کیا اور میرے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ اور پھر اپنی تعارفی تقریر یوں شروع کی:۔

"حضرات! ہندوستان کے جس نامی اور بلند پایہ لیڈر کو آج کے جلسے میں تقریر کرنے کے لیے بلایا گیا ہے......"

تقریر کا لفظ سن کر میں نے اپنی تقریر کے تمہیدی فقروں کو یاد کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس وقت ذہن اس قدر مختلف تاثرات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا کہ نوٹ دیکھنے کی ضرورت پڑی۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو نوٹ ندارد۔ ہاتھ پاؤں میں یکلخت ایک خفیف سی خنکی محسوس ہوئی۔ دل کو سنبھالا کہ ٹھہرو ابھی اور کئی جیبیں ہیں۔ گھبراؤ نہیں۔ رعشے کے عالم میں سب جیبیں دیکھ ڈالیں۔ لیکن وہ کاغذ کہیں نہ ملا۔ تمام ہال آنکھوں کے سامنے چکر کھانے لگا۔ دل نے زور زور سے دھڑکنا شروع کیا۔ ہونٹ خشک ہوتے محسوس ہوئے۔ دس بارہ دفعہ تمام جیبوں کو ٹٹولا۔ لیکن کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ جی چاہا کہ زور زور سے رونا شروع کر دوں۔ بے بسی کے عالم میں ہونٹ کاٹنے لگا۔ صدر جلسہ اپنی تقریر برابر کر رہے تھے۔

"مرید پور کا شہر اس پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ ہر صدی اور ہر ملک میں صرف چند ہی آدمی ایسے پیدا ہوتے ہیں جن کی ذات نوع انسان کے لیے......"

خدایا اب میں کیا کروں گا؟ ایک تو ہندوستان کی حالت کا نقشہ کھینچنا ہے۔ نہیں اس سے پہلے یہ بتانا ہے کہ ہم کتنے نالائق ہیں۔ نالائق کا لفظ تو غیر موزوں ہوگا۔ جاہل کہنا چاہیے۔ یہ بھی ٹھیک نہیں۔ غیر مہذب۔

"........ ان کی اعلیٰ سیاست دانی ان کا قومی جوش اور مخلصانہ ہمدردی سے کون واقف نہیں۔ یہ سب باتیں تو خیر آپ جانتے ہیں۔ لیکن تقریر کرنے میں جو ملکہ ان کو حاصل ہے ...."

ہاں وہ تقریر کہاں سے شروع ہوتی ہے؟ ہندو مسلم اتحاد پر تو چند نصیحتیں ضرور کرنی ہیں۔ لیکن وہ تو آخر میں ہیں۔ وہ بیچ میں مسکرانا کہاں تھا؟

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے دل ہلا دیں گے اور آپ کو خون کے آنسو رلائیں گے...."

صدر جلسہ کی آواز نعروں میں ڈوب گئی۔ دنیا میری آنکھوں کے سامنے تاریک ہو رہی تھی۔ اتنے میں صدر نے مجھ سے کہا۔

مجھے الفاظ بالکل سنائی نہ دیے۔ اتنا محسوس ہوا کہ تقریر کا وقت سر پر آن پہنچا ہے۔ اور مجھے اپنی نشست پہ سے اٹھنا ہے۔ چنانچہ ایک نامعلوم طاقت کے زیر اثر اٹھا۔ کچھ لڑکھڑایا۔ لیکن پھر سنبھل گیا۔ میرا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ دل میں ایک شور تھا۔ میں بیہوشی سے ذرا ہی ورے تھا۔ اور نعروں کی گونج ان لہروں کے شور کی طرح سنائی دے رہی تھی جو ڈوبتے ہوئے انسان کے سر پر سے گزر رہی ہوں تقریر شروع کہاں سے ہوتی ہے؟ لیڈروں کی خودغرضی بھی ضرور بیان کرنی ہے اور کیا کہنا ہے؟ ایک کہانی بھی تھی یہ بگلے اور لومڑی کی کہانی؟ نہیں ٹھیک ہے دو بیل . . . . "

سارے ہال میں سناٹا چھا گیا۔ لوگ سب میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور سہارے کے لیے میز کو پکڑ لیا۔ میرا دوسرا ہاتھ بھی کانپ رہا تھا۔ وہ بھی میں نے میز پر رکھ دیا۔ اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میز بھاگنے کو ہے اور میں اُسے روکے کھڑا ہوں۔ میں نے آنکھیں کھول لیں اور مسکرانے کی کوشش کی۔ گلا خشک تھا۔ بصد مشکل میں نے یہ کہا کہ : ۔

"پیارے ہم وطنو!

آواز خلافِ توقع بہت ہی باریک اور منحنی سی نکلی۔ ایک دو شخص ہنس دیئے۔ میں نے گلے کو صاف کیا۔ تو اور کچھ لوگ ہنس پڑے۔ میں نے جی کڑا کر کے زور سے بولنا شروع کیا۔ بھیمہ ڈول پر یک لخت جو یوں زور ڈالا تو آواز بہت ہی بلند نکل آئی۔ اس پر بہت سے لوگ کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ ہنسی تھمی تو میں نے کہا : ۔

"پیارے ہم وطنو!

اس کے بعد ذرا دم لیا اور پھر کہا : ۔

"پیارے ہم وطنو!

پھر یاد نہ آیا کہ اس کے بعد کیا کہنا ہے۔ بیسیوں باتیں دماغ میں چکر لگا رہی تھیں۔ لیکن زبان تک ایک نہ آتی تھی۔

"پیارے ہم وطنو!

اب کے لوگوں کی ہنسی سے میں جھینپ گیا۔ اپنی توہین پر بڑا غصہ آیا۔ ارادہ کیا کہ اس دفعہ جو منہ میں آیا کہہ دوں گا۔ ایک دفعہ تقریر شروع کر دوں تو پھر کوئی مشکل نہ رہے گی۔

"پیارے ہم وطنو! بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان کی آب و ہوا خراب یعنی ایسی ہے۔ کہ ہندوستان میں بہت سے نقص ہیں .... مجھے آپ! (وقفہ .....) نقص ہیں۔ لیکن یہ بات یعنی امر جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ گویا چنداں صحیح نہیں۔" (قہقہہ)

حواس معطل ہو رہے تھے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر تقریر کا سلسلہ کیا تھا۔ یک لخت بیلوں کی کہانی یاد آئی اور راستہ کچھ صاف ہوتا دکھائی دیا۔

"ہاں تو بات دراصل یہ ہے کہ ایک جگہ دو بیل اکٹھے رہتے تھے جو باوجود آب و ہوا اور غیر ملکی حکومت کے۔" (زور کا قہقہہ)

یہاں تک پہنچ کر محسوس کیا کہ کلام کچھ بے ربط سا ہو رہا ہے۔ میں نے کہا چلو وہ لکڑی کے گٹھے کی کہانی شروع کر دیں۔

مثلاً آپ ککڑیوں کے ایک گچھے کو لیجیے۔ ککڑیاں اکثر مہنگی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں افلاس بہت ہے۔ کیونکہ اکثر لوگ غریب ہیں۔ اس لیے گویا ککڑیوں کا گچھا یعنی آپ دیکھیے ناکہ اگر:

(بلند اور طویل نعرے

حضرات! اگر آپ نے عقل سے کام نہ لیا تو آپ کی قوم فنا ہو جائے گی۔ غیرت مند طلبا میں اشتعال اور شور ہوتا......

ایسے باہر نکالو۔ ہم نہیں سنتے)

شیخ سعدی نے کہا ہے کہ

چو از قومے یکے بے دانشی کرد

(آواز آئی کیا کہتا ہے) خیر اس بات کو جانے دیجیے۔ بہرحال اس بات میں تو کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا کہ: ؎

آمد نسیب بلبل کے لب پہ آہ و زاریاں   تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

اس شعر نے دورانِ خون کو تیز کر دیا۔ ساتھ ہی لوگوں کا شور بھی بہت زیادہ ہو گیا۔ چنانچہ میں بڑے جوش سے بولنے لگا۔

"جو قومیں اس وقت بیداری کے آسمان پر چڑھی ہوئی ہیں۔ ان کی زندگیاں لوگوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔ ان کی جڑوں میں جہاد و طلب علم کی بنیادیں پڑی ہیں (لوگوں کا شور اور ہنسی اور بھی بڑھتی گئی) آپ کے لیڈروں کے کانوں پر خود غرضی کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔ دنیا کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ زندگی کے وہ تمام تیسے . . . ."

لیکن لوگوں کا غوغا اور قہقہے اتنے بلند ہو گئے کہ میں اپنی آواز بھی نہ سن سکتا تھا۔ اکثر لوگ اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور گلا پھاڑ پھاڑ کر کچھ کہہ رہے تھے۔ میں سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ ہجوم میں سے کسی شخص نے بہت پیچھے قطارے کی طرف ہمت کر کے سگرٹ کی ایک خالی ڈبیا مجھ پر پھینک دی۔ اس کے بعد چار پانچ کاغذ کی گولیاں میرے ارد گرد سٹیج پر آ گریں۔ لیکن میں نے اپنی تقریر کا سلسلہ جاری رکھا۔

"حضرات! تم یاد رکھو۔ تم تباہ ہو جاؤ گے!

تم ذلیل ہو......"

لیکن جب یہ بوچھاڑ بڑھتی ہی گئی۔ تو میں نے اس نامعقول مجمع سے کنارہ کشی ہی مناسب سمجھی۔ اسٹیج سے پھلانگا اور زقند بھر کے دروازے میں سے باہر کا رخ کیا۔ ہجوم بھی میرے پیچھے لپکا۔ میں نے مڑ کر پیچھے نہ دیکھا بلکہ سیدھا بھاگتا گیا۔ وقتاً فوقتاً بعض نامناسب کلمے میرے کانوں تک پہنچ رہے تھے۔ اُن کو سن کر میں نے اپنی رفتار اور بھی تیز کر دی۔ اور سیدھا اسٹیشن کا رخ کیا۔ ایک ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ میں بے تحاشا اس میں گھس گیا۔ ایک لمحے کے بعد وہ ٹرین وہاں سے چل دی۔

اس دن کے بعد آج تک نہ مرید پور نے مجھے مدعو کیا ہے۔ نہ مجھے خود وہاں جانے کی کبھی خواہش پیدا ہوئی ہے۔

انجام بخیر

(منظر)

ایک تنگ و تاریک کمرہ جس میں بجز ایک پرانی سی میز اور ایک لرزہ براندام کرسی کے اور کوئی فرنیچر نہیں۔ زمین پر ایک طرف چٹائی بچھی ہے۔ جس پر بے شمار کتابوں کا انبار لگا ہے۔ اس انبار میں سے جہاں جہاں کتابوں کی پشتیں نظر آتی ہیں وہاں شیکسپیئر۔ ٹالسٹائی۔ ورڈزورتھ وغیرہ مشاہیر کے نام دکھائی دے جاتے ہیں۔

باہر کہیں پاس ہی گانے بج رہے ہیں۔ قریب ہی ایک برات اتری ہوئی ہے۔ اس کے بینڈ کی آواز سنائی دے رہی ہے جس کے بجانے والے دق۔ دمہ۔ کھانسی اور اسی قسم کے دیگر امراض میں مبتلا معلوم ہوتے ہیں۔ ڈھول بجانے والے کی صحت البتہ اچھی ہے۔

پطرس نامی ایک نادار معلم میز پر کام کر رہا ہے۔ نوجوان ہے لیکن چہرے پر گذشتہ تندرستی اور خوش باشی کے آثار صرف کہیں کہیں باقی ہیں۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے ہیں۔ چہرے سے ذہانت پسینہ بن کر ٹپک رہی ہے۔

سامنے لٹکی ہوئی ایک جنتری سے معلوم ہوتا ہے کہ مہینے کی آخری تاریخ ہے۔

باہر سے کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ پطرس اٹھ کر دروازہ کھول دیتا ہے۔ تین طالب علم نہایت اعلیٰ لباس زیب تن کئے اندر داخل ہوتے ہیں۔

پطرس: حضرات اندر تشریف لے آئیے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ میرے پاس صرف ایک کرسی ہے۔ لیکن جاہ و حشمت کا خیال بہت پوچ خیال ہے۔ علم بڑی نعمت ہے۔ لہٰذا اے میرے فرزندو۔ اس انبار سے چند ضخیم کتابیں انتخاب کر لو۔ اور ان کو ایک دوسرے کے اوپر چن کر ان پر بیٹھ جاؤ۔ علم ہی تم لوگوں کا اوڑھنا اور علم ہی تم لوگوں کا بچھونا ہونا چاہئے۔

(کمرے میں ایک پُر اسرار نور سا چھا جاتا ہے۔ فرشتوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے)

طالب علم: (تینوں مل کر) اے خدا کے برگزیدہ بندے۔ اے ہمارے محترم استاد! ہم تمہارا حکم ماننے کو تیار ہیں۔ علم ہی ہم لوگوں کا اوڑھنا اور علم ہی ہم لوگوں کا بچھونا ہونا چاہئے۔

(کتابوں کو جوڑ کر ان پر بیٹھ جاتے ہیں)

پطرس: ۔ کہو اے ہندوستان کے سپوتو! آج تم کو کون سے علم کی تشنگی میرے دروازے تک کشاں کشاں لے آئی؟

پہلا طالب علم: ۔ اے نیک انسان! ہم آج تیرے احسانوں کا بدلہ دینے آئے ہیں۔

دوسرا طالب علم: ۔ اے فرشتے! ہم تیری نوازشوں کا ہدیہ پیش کرنے آئے ہیں۔

تیسرا طالب علم: ۔ اے ہمارے مہربان! ہم تیری محنتوں کا پھل تیرے پاس لائے ہیں۔

پطرس: ۔ یہ نہ کہو، یہ نہ کہو! خود میری محنت ہی میری محنت کا پھل ہے۔ کالج کے مقررہ اوقات کے علاوہ جو کچھ میں نے تم کو پڑھایا، اس کا معاوضہ مجھے اس وقت وصول ہو گیا جب میں نے تمہاری آنکھوں میں ذکاوت چمکتی دیکھی۔ آہ تم کیا جانتے ہو کہ تعلیم و تدریس کیسا آسمانی پیشہ ہے۔ تاہم تمہارے الفاظ سے میرے دل میں ایک عجیب مسرت سی بھر گئی ہے۔ مجھ پر اعتماد کرو اور بالکل مت گھبراؤ۔ جو کچھ کہنا ہے تفصیل سے کہو۔

پہلا طالب علم: ۔ (سرو قد اور دست بستہ کھڑا ہو کر) اے محترم استاد! ہم علم کی بے بہا دولت سے محروم تھے۔ درس کے مقررہ اوقات سے ہماری پیاس نہ بجھ سکتی تھی۔ پرمیں اور سول سروس کے امتحانات کی آزمائش کڑی ہے۔ تو نے ہماری دستگیری کی اور ہمارے تاریک دماغوں میں اجالا ہو گیا۔ مقتدر معلم! تو جانتا ہے آج مہینے کی آخری تاریخ ہے۔ ہم تیری خدمتوں کا حقیر معاوضہ پیش کرنے آئے ہیں۔ تیرے عالمانہ تبحر اور تیری بزرگانہ شفقت کی قیمت کوئی ادا نہیں کر سکتا۔ ہم اظہارِ تشکر کے طور پر جو کم مایہ رقم ہم تیری خدمت میں پیش کریں، اسے قبول کر کہ ہماری احسان مندی اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔

پطرس: ۔ تمہارے الفاظ سے ایک عجیب بیقراری میرے جسم پر طاری ہو گئی ہے۔

(پہلے طالب علم کا اشارہ پا کر باقی دو طالب علم بھی کھڑے ہو جاتے ہیں۔ باجا یک لخت زور زور سے بجنے لگتا ہے)

پہلا طالب علم: ۔ (آگے بڑھ کر) اے ہمارے مہربان مجھ حقیر کی نذر قبول کر (بڑے ادب و احترام کے ساتھ اٹھنی پیش کرتا ہے)

دوسرا طالب علم: ۔ (آگے بڑھ کر) اے فرشتے میرے ہدیے کو شرفِ قبولیت بخش (اٹھنی پیش کرتا ہے)

تیسرا طالب علم: ۔ (آگے بڑھ کر) اے نیک انسان مجھ ناچیز انسان کو متشکر فرما (اٹھنی پیش کرتا ہے)

پطرس: ۔ (جذبات سے بے قابو ہو کر رقت انگیز آواز سے) اے میرے فرزندو خداوند کی رحمت تم پر نازل ہو۔ تمہاری سعادت مندی اور فرض شناسی سے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ تمہیں اس دنیا میں آرام اور آخرت میں نجات نصیب ہو اور خدا تمہارے سینوں کو علم کے نور سے منور رکھے (تینوں اٹھنیاں اٹھا کر میز پر رکھ لیتا ہے)

طالب علم: ۔ (تینوں مل کر) اللہ کے برگزیدہ بندے ہم فرض سے سبکدوش ہو گئے۔ اب ہم اجازت چاہتے ہیں کہ گھر پر ہمارے والدین ہمارے لئے بیتاب ہوں گے۔

پطرس: ۔ خدا تمہارا حامی و ناصر ہو اور تمہاری علم کی پیاس اور بھی بڑھتی رہے۔

(طالب علم چلے جاتے ہیں)

•

پطرس :- (نماز میں سر بسجود ہو کر) باری تعالیٰ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے مجھے اپنی ناچیز محنت کے ثمر کے لئے بہت دنوں انتظار نہ رکھا۔ تیری رحمت کی کوئی انتہا نہیں۔ لیکن ہماری نا شکری اس سے بھی کہیں بڑھ کر ہے۔ یہ تیرا ہی فضل و کرم ہے کہ تو میرے اپنے سے اوروں کو بھی رزق پہنچاتا ہے اور جو ملازم میری خدمت کرتا ہے اس کا بھی کفیل تو نے مجھ ہی کو بنا رکھا ہے۔ تیری رحمت کی کوئی انتہا نہیں اور تیری بخشش ہمیشہ ہمیشہ جاری رہنے والی ہے۔

(کمرے میں پھر ایک پراسرار سی روشنی چھا جاتی ہے۔ اور فرشتوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ کچھ دیر کے بعد پطرس سجدے سے اٹھتا ہے اور ملازم کو آواز دیتا ہے)

پطرس :- اے خدا کے دیانتدار اور محنتی بندے! ذرا یہاں تو آنا!

ملازم :- (باہر سے) اے میرے خوش خصال آقا! میں کھانا پکا کر آؤں گا۔ کہ تعجیل شیطان کا کام ہے۔

(ایک طویل وقفہ جس کے دوران میں درختوں کے سائے پہلے سے دگنے لمبے ہو گئے ہیں)

پطرس :- آہ انتظار کی گھڑیاں کس قدر شیریں ہیں۔ کتوں کے بھونکنے کی آواز کس خوش اسلوبی سے ہنڈیا کی آواز کے ساتھ مل رہی ہے۔

(سر بسجود گر پڑتا ہے)

(پھر اٹھ کر میز کے سامنے بیٹھ جاتا ہے۔ اشرفیوں پر نظر پڑتی ہے۔ ان کو فوراً ایک کتاب کے نیچے چھپا دیتا ہے)

پطرس :- آہ! مجھے زر و دولت سے نفرت ہے۔ خدایا میرے دل کو دنیا کے لالچ سے پاک رکھیو!

(ملازم اندر آتا ہے)

پطرس :- اے مزدور، [illegible] انسان! مجھے تجھ پر رحم آتا ہے کہ علم کی ایک کرن بھی کبھی تیرے سینے میں داخل نہ ہوئی۔ تم خداوند تعالیٰ کے دربار میں تم ہم سب برابر ہیں۔ تو جانتا ہے آج مہینے کی آخری تاریخ ہے۔ تیری تنخواہ کی ادائیگی کا وقت سر پر آ گیا۔ خوش ہو کہ آج تجھے اپنی مشقت کا معاوضہ مل جائے گا۔ یہ تین اٹھنیاں قبول کر۔ اور باقی ساڑھے اٹھارہ روپے کے لئے کسی لطیفۂ غیبی کا انتظار کر۔ دنیا امید پر قائم ہے۔ اور مایوسی کفر ہے۔

(ملازم اٹھنیاں زور زور سے زمین پر پھینک کر گھر سے باہر نکل جاتا ہے۔ ہنڈیا زور سے بج اٹھتی ہے)

پطرس :- خدایا تکبر کے گناہ سے ہم سب کو بچائے رکھ۔ اور اس نئے طبقے کے لوگوں کا سا غرور ہم سے دور رکھ۔

(پھر کام میں مشغول ہو جاتا ہے)

(باورچی خانے میں کھانا جلنے کی ہلکی ہلکی بو آ رہی ہے .... ایک طویل وقفہ جس کے دوران میں درختوں کے سائے پہلے سے چوگنے لمبے ہو گئے ہیں۔ ہنڈیا بدستور بج رہی ہے۔

یک لخت باہر سڑک پر موٹروں کے آ کر رک جانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔

(تھوڑی دیر بعد کوئی شخص دروازے پر دستک دیتا ہے)

پطرس :- (کام پر سے سر اٹھا کر) اے شخص تو کون ہے؟

ایک آواز: ۔ (باہر سے) حضور میں غلاموں کا غلام ہوں اور باادب دست بستہ کھڑا ہوں کہ اجازت ہو تو اندر آؤں۔ اور عرض حال کروں۔

پطرس: ۔ (دل میں) میں اس آواز سے ناآشنا ہوں۔ لیکن مجھے یہ پتا چلتا ہے کہ بولنے والا کوئی شائستہ شخص ہے۔ خدایا یہ کون ہے (بلند آواز سے) اندر آجائیے۔

(دروازہ کھلتا ہے۔ اور ایک شخص لباس فاخرہ پہنے اندر داخل ہوتا ہے۔ اس کے چہرے سے وقار ٹپک رہا ہے۔ لیکن نظریں زمین دوز ہیں اور ادب و احترام سے ہاتھ باندھے کھڑا ہے)

پطرس: ۔ آپ دیکھتے ہیں کہ میرے پاس صرف ایک ہی کرسی ہے۔ لیکن جاہ و حشمت کا خیال بہت ہی ہیچ خیال ہے۔ علم بڑی نعمت ہے۔ لہٰذا اے محترم اجنبی! اس انبار میں سے چند ضخیم کتابیں انتخاب کیجیے اور ان کو ایک دوسرے کے اوپر چن کر ان پہ بیٹھ جاؤ۔ علم ہی ہم لوگوں کا اوڑھنا اور علم ہی ہم لوگوں کا بچھونا ہونا چاہیے۔

اجنبی: ۔ اے برگزیدہ شخص، میں تیرے سامنے کھڑے رہنے ہی میں اپنی سعادت سمجھتا ہوں۔

پطرس: ۔ تمہیں کون سے علم کی تشنگی میرے دروازے تک کشاں کشاں لے آئی؟

اجنبی: ۔ اے ذی علم محترم! گو تم میری صورت سے واقف نہیں لیکن میں شعبۂ تعلیم کا افسر اعلیٰ ہوں اور شرمندہ ہوں کہ میں آج تک کبھی نیاز حاصل کرنے کے لئے حاضر نہ ہوا۔ میری اس کوتاہی اور غفلت کو اپنے علم و فضل کے صدقے معاف کر دو۔

(آبدیدہ ہو جاتا ہے)

پطرس: ۔ اے خدا! کیا یہ سب وہم ہے۔ کیا میری آنکھیں دھوکا کھا رہی ہیں؟

اجنبی: ۔ مجھے تعجب نہیں کہ تم میرے آنے کو وہم سمجھو۔ کیونکہ آج تک ہم نے تم جیسے نیک اور برگزیدہ انسان سے اس قدر غفلت برتی کہ مجھے خود اچنبھا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مجھ پر یقین کرو۔ میں فی الحقیقت یہاں تمہاری خدمت میں کھڑا ہوں۔ اور تمہاری آنکھیں تمہیں ہرگز دھوکا نہیں دے رہیں۔ اے شریف اور غم زدہ انسان یقین نہ ہو تو میرے چٹکی لے کر میرا امتحان کرو۔

(پطرس اجنبی کے چٹکی لیتا ہے۔ اجنبی زور سے چیختا ہے)

پطرس: ۔ ہاں! اب مجھے کچھ کچھ یقین آگیا۔ لیکن حضور والا۔ آپ کا یہاں قدم رنجہ فرمانا میرے لئے اس قدر باعث فخر ہے کہ مجھے ڈر ہے کہیں میں دیوانہ نہ ہو جاؤں۔

اجنبی: ۔ ایسے الفاظ کہہ کر مجھے کانٹوں میں نہ گھسیٹو اور یقین جانو کہ میں اپنی گزشتہ خطاؤں پر بہت نادم ہوں۔

پطرس: ۔ (مبہوت ہو کر) مجھے اب کیا حکم ہے؟

اجنبی: ۔ میری اتنی مجال کہاں کہ میں آپ کو حکم دوں۔ البتہ ایک عرض ہے۔ اگر آپ منظور کریں تو میں اپنے آپ کو دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان سمجھوں۔

پطرس :- آپ فرمائیے۔ میں سن رہا ہوں۔ مگر مجھے یقین نہیں کہ یہ عالم بیداری ہے۔

(اجنبی تالی بجاتا ہے۔ چھ خدام چھ بڑے بڑے صندوق اٹھا کر اندر داخل ہوتے ہیں اور زمین پر رکھ کر بڑے ادب سے کورنش بجا کر چلے جاتے ہیں)

اجنبی :- (صندوقوں کے ڈھکنے کھول کر) میں بادشاہ مصر، شہزادہ ویلز، وائسرائے ہند اور [illegible] ان چاروں کا ایلچی یہ تحائف آپ کی خدمت میں آپ کے علم و فضل کی قدردانی کے طور پر لے کر حاضر ہوا ہوں۔ (بھرائی ہوئی آواز سے) ان کو قبول کیجئے اور مجھے مایوس واپس نہ بھیجئے۔ ورنہ ان سب کا دل ٹوٹ جائے گا۔

پطرس :- (صندوقوں کو دیکھ کر) سونا! اشرفیاں! جواہرات! مجھے یقین نہیں آتا (آنکھیں ملنے لگتا ہے)

اجنبی :- ان کو قبول کیجئے۔ اور مجھے مایوس واپس نہ بھیجئے۔ (آنسو ٹپ ٹپ گرتے ہیں)

کھانا۔ آج موری الحمیاں نہ لائیں۔

پطرس :- اے اجنبی! تیرے آنسو کیوں گر رہے ہیں۔ اور تو کیوں کانپ رہا ہے؟ معلوم ہوتا ہے تجھے اپنے جذبات پر قابو نہیں۔ یہ تیری کمزوری کی نشانی ہے۔ خدا تجھے تقویت اور ہمت دے۔ میں خوش ہوں کہ تو اور تیرے آقا علم سے اس قدر محبت رکھتے ہیں۔ بس اب جا کر ہمارے مطالعہ کا وقت ہے۔ کل کالج میں اپنے لیکچروں سے ہمیں چار پانسو روحوں کو خواب جہالت سے جگانا ہے۔

اجنبی :- (سسکیاں بھرتے ہوئے) مجھے اجازت ہو تو میں بھی حاضر ہو کر آپ کے خیالات سے مستفید ہوں۔

پطرس :- خدا تمہارا حامی و ناصر ہو اور تمہارے علم کی پیاس اور بھی بڑھتی رہے۔

(اجنبی رخصت ہو جاتا ہے۔ پطرس صندوقوں کو کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہتا ہے اور پھر یک لخت مسرت کی ایک چیخ مار کر گر پڑتا ہے اور مر جاتا ہے۔ کمرے میں ایک پُر اسرار نور چھا جاتا ہے اور فرشتوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ باہر بینڈ بدستور بج رہا ہے)۔

سینما کا عشق

"سینما کا عشق" عنوان تو عجب ہوس خیز ہے۔ لیکن افسوس کہ اس مضمون سے آپ کی تمام توقعات مجروح ہوں گی۔ کیونکہ مجھے تو اس مضمون میں کچھ دل کے داغ دکھانے مقصود ہیں۔

اس سے آپ یہ نہ سمجھئے کہ مجھے فلموں سے دلچسپی نہیں۔ یا سینما کی موسیقی اور تاریکی میں جو ارمان انگیزی ہے۔ میں اس کا قائل نہیں۔ میں تو سینما کے معاملے میں اوائل عمر ہی سے بزرگوں کا مورد عتاب رہ چکا ہوں۔ لیکن آج کل ہمارے دوست مرزا صاحب کی مہربانیوں کی طفیل سینما گویا میری ایک دُکھتی ہوئی رگ بن کر رہ گیا ہے۔ جہاں اُس کا نام سُن پاتا ہوں۔ بعض درد انگیز واقعات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جس سے رفتہ رفتہ میری فطرت ہی کج بین بن گئی ہے۔

اول تو خدا کے فضل سے ہم سینما کبھی وقت پر نہیں پہنچ سکے۔ اس میں میری سستی کو ذرا دخل نہیں۔ یہ سب قصور ہمارے دوست مرزا صاحب کا ہے جو کہنے کو تو ہمارے دوست ہیں۔ لیکن خدا شاہد ہے۔ ان کی دوستی سے جو جو نقصان ہمیں پہنچے ہیں کسی دشمن کے قبضۂ قدرت سے بھی باہر ہوں گے۔

جب سینما کا ارادہ ہو۔ ہفتہ بھر پہلے سے انہیں کہہ رکھتا ہوں کہ کیوں بھئی مرزا اگلی جمعرات سینما چلو گے نا؟ میری مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ پہلے سے تیار رہیں۔ اور اپنی تمام مصروفیتیں کچھ اس ڈھب سے ترتیب دے لیں کہ جمعرات کے دن اُن کے کام میں ہرج واقع نہ ہو۔ لیکن وہ جواب میں عجب قدر ناشناسی سے فرماتے ہیں۔

"ارے بھئی چلیں گے کیوں نہیں؟ کیا ہم انسان نہیں؟ ہمیں تفریح کی ضرورت نہیں ہوتی؟ اور پھر کبھی ہم نے تم سے آج تک ایسی بے مروّتی بھی برتی ہے۔ کہ تم نے چلنے کو کہا ہو اور ہم نے تمہارا ساتھ نہ دیا ہو؟"

ان کی تقریر سُن کر میں کھسیانا سا ہو جاتا ہوں۔ کچھ دیر چپ رہتا ہوں۔ اور پھر دبی زبان سے کہتا ہوں۔

"بھئی اب کے ہو سکا تو وقت پر پہنچیں گے۔ ٹھیک ہے نا؟"

میری یہ بات عام طور پر ٹال دی جاتی ہے۔ کیونکہ اس سے ان کا ضمیر کچھ تھوڑا سا بیدار ہو جاتا ہے۔ خیر میں بھی بہت زور نہیں دیتا۔ صرف ان کو بات سمجھانے کے لئے اتنا کہہ دیتا ہوں۔

"کیوں بھئی سینما آج کل چھ بجے شروع ہوتا ہے نا؟"

مرزا صاحب عجب معصومیت کے انداز میں جواب دیتے ہیں: "جی! مجھے معلوم نہیں!"

"میرا خیال ہے چھ ہی بجے شروع ہوتا ہے!"

"اب تمہارے خیال کی کوئی سند نہیں"

"نہیں مجھے یقین ہے۔ چھ بجے شروع ہوتا ہے۔"

"تمہیں یقین ہے تو میرا دماغ کیوں مفت میں چاٹ رہے ہو؟"

اس کے بعد آپ ہی کہئے میں کیا بولوں؟

پھر جب جمعرات کے دن چار بجے ہی ان کے مکان کو روانہ ہو جاتا ہوں۔ اس خیال سے کہ جلدی جلدی انہیں تیار کرکے وقت پر پہنچ جائیں۔ دولت خانے پر پہنچتا ہوں تو آدم نہ آدم زاد۔ مردانے کے سب کمروں میں گھوم جاتا ہوں۔ ہر کمرے میں سے جھانکتا ہوں۔ ہر کھڑکی میں سے آوازیں دیتا ہوں۔ لیکن کہیں سے رسید نہیں ملتی۔ آخر تنگ آ کر ان کے کمرے میں بیٹھ جاتا ہوں۔ وہاں دس پندرہ منٹ سیٹیاں بجاتا رہتا ہوں۔ دس پندرہ منٹ پنسل سے بلاٹنگ پیپر پر تصویریں بناتا رہتا ہوں۔ پھر سگریٹ سلگا لیتا ہوں۔ اور باہر ڈیوڑھی میں نکل کر ادھر ادھر جھانکتا ہوں۔ وہاں بدستور ہُو کا عالم دیکھ کر کمرے میں واپس آ جاتا ہوں۔ اور اخبار پڑھنا شروع کر دیتا ہوں۔ ہر کالم کے بعد مرزا صاحب کو ایک آواز دے لیتا ہوں۔ اس امید پر کہ شاید ساتھ کے کمرے میں یا عین اوپر کے کمرے میں تشریف لے آئے ہوں۔ سو رہے تھے تو ممکن ہے جاگ اٹھے ہوں یا نہا رہے تھے۔ تو شاید غسل خانے سے باہر نکل آئے ہوں۔ لیکن میری آواز مکان کی وسعتوں میں سے گونج کر واپس آ جاتی ہے۔ آخر کار ساڑھے پانچ بجے کے قریب زنانے سے تشریف لاتے ہیں۔ میں اپنے کھولتے ہوئے خون کو قابو میں لا کر متانت اور اخلاق کو بڑی مشکل سے مدنظر رکھ کر پوچھتا ہوں:۔

"کیوں حضرت! آپ اندر ہی تھے؟"

"ہاں اندر ہی تھا۔"

"میری آواز آپ نے نہیں سنی؟"

"اچھا یہ تم تھے! میں سمجھا کوئی اور ہے۔"

آنکھیں بند کر کے سر کو پیچھے ڈال لیتا ہوں۔ اور دانت پیس کر غصے کو پی جاتا ہوں۔ اور پھر کانپتے ہوئے ہونٹوں سے پوچھتا ہوں:۔

"تو اچھا آپ چلیں گے یا نہیں؟"

"وہ کہاں؟"

"ارے بندۂ خدا آج سینما نہیں جانا؟"

"ہاں سینما، سینما! (یہ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں) ٹھیک ہے سینما۔ میں بھی سوچ رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ایسی ہے جو مجھے یاد نہیں آتی۔ اچھا ہوا تم نے یاد دلا دیا۔ ورنہ مجھے رات بھر الجھن رہتی۔

"تو چلو پھر اب چلیں"

"ہاں وہ تو چلیں ہی گے۔ میں سوچ رہا تھا۔ آج ذرا کپڑے بدل لیتے۔ خدا جانے دھوبی کمبخت کپڑے لایا ہے یا نہیں۔ یار اس دھوبیوں کا تو کوئی انتظام کرو۔"

اگر تیغِ اصفہانی ایک سنگین جرم نہ ہوتا تو ایسے موقع پر مجھ سے ضرور سرزد ہو جاتا۔ لیکن کیا کروں اپنی جوانی پر رحم کھاتا ہوں۔ بے بس ہوتا ہوں۔ صرف یہی کہہ سکتا ہوں۔ کہ

"مرزا جی للہ مجھ پر رحم کرو۔ میں سینما چلنے کو آیا ہوں۔ دھوبیوں کا انتظام کرنے نہیں آیا۔ یار بڑے بدتمیز ہو۔ پونے چھ بج چکے ہیں۔ اور تم جوں کے توں بیٹھے ہو۔"

مرزا صاحب عجب مربیانہ تبسم کے ساتھ کرسی پر سے اٹھتے ہیں۔ گویا یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اچھا بھئی تمہاری طفلانہ خواہشات آخر ہم پوری کر ہی دیں۔ چنانچہ پھر یہ کہہ کر اندر تشریف لے جاتے ہیں کہ اچھا کپڑے پہن آؤں۔

مرزا صاحب کے کپڑے پہننے کا عمل اس قدر طویل ہے کہ اگر میرا اختیار ہوتا تو قانون کی رو سے انہیں کبھی کپڑے اتارنے ہی نہ دیتا۔ آدھ گھنٹے کے بعد وہ کپڑے پہنے ہوئے تشریف لاتے ہیں۔ ایک پان منہ میں اور دوسرا ہاتھ میں۔ میں بھی اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ دروازے پر پہنچ کر مڑ کے جو دیکھتا ہوں تو مرزا صاحب غائب۔ پھر اندر آجاتا ہوں۔ مرزا صاحب کسی کونے میں کھڑے کچھ کرید کر رہے ہوتے ہیں۔

"ارے بھئی چلو!"

"چل تو رہا ہوں یار۔ آخر اتنی بھی کیا آفت ہے؟"

"اور یہ تم کر کیا رہے ہو؟"

"پان کے لئے ذرا تمباکو لے رہا تھا۔"

تمام رستے مرزا صاحب چہل قدمی فرماتے جاتے ہیں۔ میں ہر دو تین لمحے کے بعد اپنے آپ کو ان سے چار پانچ قدم آگے پاتا ہوں۔ کچھ دیر ٹھہر جاتا ہوں۔ وہ ساتھ آ ملتے ہیں تو پھر چلنا شروع کر دیتا ہوں۔ پھر آگے نکل جاتا ہوں۔ پھر ٹھہر جاتا ہوں۔ غرضیکہ گو چلتا دگنی تگنی رفتار سے ہوں۔ لیکن پہنچتا ان کے ساتھ ہی ہوں۔

ٹکٹ لے کر اندر داخل ہوتے ہیں تو اندھیرا گھپ۔ بہتیرا آنکھیں جھپکتا ہوں۔ کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ ادھر سے کوئی آواز دیتا ہے۔ "یہ دروازہ بند کر دو جی!" یا اللہ اب جاؤں کہاں۔ رستہ۔ کرسی۔ دیوار۔ آدمی۔ کچھ بھی تو نظر نہیں آتا۔ ایک قدم بڑھاتا ہوں۔ تو سر ان بالٹیوں سے جا ٹکراتا ہے جو آگ بجھانے کے لئے دیوار پر لٹکی رہتی ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد تاریکی میں کچھ دھندلے سے نقش دکھائی دینے لگتے ہیں۔ جہاں ذرا تاریک تر سا دھبہ دکھائی دے جائے۔ وہاں سمجھتا ہوں خالی کرسی ہوگی۔ خمیدہ پشت ہو کر اس کا رخ کرتا ہوں۔ اس کے پاؤں کو پھاندا اس کے ٹخنوں کو ٹھکرا! خواتین کے گھٹنوں سے دامن بچا۔ آخرکار کسی کی گود میں جا بیٹھتا ہوں۔ وہاں سے نکال دیا جاتا ہوں۔ اور لوگوں کے دھکوں کی مدد سے کسی خالی کرسی تک جا پہنچتا ہوں۔ مرزا صاحب سے کہتا ہوں "میں نہ کہتا تھا کہ جلدی چلو۔ خواہ مخواہ میں ہم کو رسوا کروا دیا نا! گدھا کہیں کا!" اس شگفتہ بیانی کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ساتھ کی کرسی پر جو حضرت بیٹھے ہیں۔ اور جن کو میں مخاطب کر رہا وہ مرزا صاحب نہیں کوئی اور بزرگ ہیں۔

اب قصے کی طرف متوجہ ہوتا اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ فلم کون سا ہے، اس کی کہانی کیا ہے اور کہاں تک پہنچ چکی ہے۔ سمجھ میں صرف اس قدر آتا ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت جو پردے پر بغل گیر نظر آتے ہیں، ایک دوسرے کو چاہتے ہوں گے۔ اس انتظار میں رہتا ہوں کہ کچھ لکھا ہوا سامنے آئے تو معاملہ کھلے کہ اتنے میں سامنے کی کرسی پر بیٹھے ہوئے حضرت ایک وسیع و فراخ انگڑائی لیتے ہیں، جس کے دوران میں کم از کم دو تین سو فٹ فلم گزر جاتا ہے۔ جب انگڑائی کو سمیٹ لیتے ہیں۔ تو پھر سر کھجانا شروع کرتے ہیں، اور اس عمل کے بعد ہاتھ کو سر سے نہیں ہٹاتے۔ بلکہ بازو کو ویسے ہی خمیدہ رکھتے ہیں۔ میں مجبوراً سر کو نیچا کر کے چائے دانی کے اس دستے کے بیچ میں سے اپنی نگاہ کے لیے راستہ نکال لیتا ہوں، اور اپنے بیٹھنے کے انداز سے بالکل ایسا معلوم ہوتا ہوں جیسے میں ٹکٹ خریدے بغیر اندر گھس آیا ہوں۔ اور چوروں کی طرح بیٹھا ہوا ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد انھیں کرسی کی نشست پر کوئی مچھر یا پسو محسوس ہوتا ہے چنانچہ وہ دائیں طرف ذرا اونچے ہو کر بائیں طرف کو جھک جاتے ہیں۔ میں مصیبت کا مارا دوسری طرف جھک جاتا ہوں۔ ایک لمحے کے بعد وہی مچھر دوسری طرف ہجرت کر جاتا ہے چنانچہ ہم دونوں پھر سے پینترا بدل لیتے ہیں۔ غرضیکہ یہ جنگ یونہی جاری رہتی ہے۔ وہ دائیں تو میں بائیں۔ وہ بائیں تو میں دائیں۔ اُن کو کیا معلوم کہ اندھیرے میں کیا کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ دل یہی چاہتا ہے کہ اگلے درجے کا ٹکٹ لے کر ان کے آگے جا بیٹھوں اور کہوں کہ لے بیٹا دیکھیں تو اب تو کیسے فلم دیکھتا ہے۔

پیچھے سے مرزا صاحب کی آواز آتی ہے یار تم سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا۔ اب جو ہمیں ساتھ لائے ہو تو فلم تو دیکھنے دو۔

اس کے بعد غصے میں آکر آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ اور قتل عمد، خودکشی، زہر خورانی وغیرہ معاملات پر غور کرنے لگتا ہوں۔ دل میں کہتا ہوں ایسی کی تیسی اس فلم کی۔ سو سو قسمیں کھاتا ہوں کہ پھر کبھی نہ آؤں۔ اگر آیا بھی تو اس کم بخت مرزا سے ذکر تک نہ کروں گا۔ پانچ چھ گھنٹے پہلے سے آجاؤں گا۔ اوپر کے درجے میں سب سے اگلی قطار میں بیٹھوں گا۔ تمام وقت اپنی نشست پر اچھلتا کودتا رہوں گا۔ بہت بڑے طرّے والی پگڑی پہن کر آؤں گا۔ اپنے اوورکوٹ کو دو چھڑیوں پر پھیلا کر لٹکا دوں گا۔ بہرحال مرزا کے پاس تک نہ پھٹکوں گا۔

لیکن اس کم بخت دل کو کیا کروں۔ اگلے ہفتے پھر کسی اچھے فلم کا اشتہار دیکھ پاتا ہوں تو سب سے پہلے مرزا کے ہاں جاتا ہوں اور گفتگو پھر یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ کہ کیوں بھئی مرزا، اگلی جمعرات سینما چلو گے نا؟

میبل اور میں

میبل لڑکیوں کے کالج میں تھی لیکن ہم دونوں کیمبرج یونیورسٹی میں ایک ہی مضمون پڑھتے تھے۔ اس لیے اکثر لیکچروں میں جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ہم دوست بھی تھے۔ کئی دلچسپیوں میں ایک دوسرے کے شریک ہوتے تھے۔ تصویروں اور موسیقی بھی تھا، میں بھی ہمہ دانی کا دعویدار، اکثر گیلریوں یا کنسرٹوں میں اکٹھے جایا کرتے تھے۔ دونوں انگریزی ادب کے طالب علم ں کے متعلق باہم بحث مباحثے رہتے۔ ہم میں سے اگر ایک کوئی نئی کتاب یا نیا مصنف دریافت کرتا تو دوسرے کو ضرور اہ کر دیتا اور پھر دونوں مل کر اس پر اچھے برے کا حکم صادر کرتے۔

لیکن اس تمام یک جہتی اور ہم آہنگی میں ایک خلش ضرور تھی۔ ہم دونوں نے بیسویں صدی میں پرورش پائی تھی۔ عورت اور ت کے قائل تو ضرور تھے تاہم اپنے خیالات میں اور بعض اوقات اپنے رویے میں ہم کبھی کبھی اس کی تکذیب ضرور کر دیتے حالات کے ماتحت میبل ایسی رعایات کو اپنا حق سمجھتی جو صرف صنفِ ضعیف ہی کے ایک فرد کو ملنی چاہئیں لیکن ساتھ ہی بعض کم اور رہنمائی کا رویہ اختیار کر لیتی جس کا مطلب یہ تھا کہ گویا ایک مرد ہونے کی حیثیت سے میرا فرض یہی ہے۔ خصوصاً مجھے ت زیادہ تکلیف دیتا تھا کہ میبل کا مطالعہ مجھ سے بہت وسیع ہے۔ اس سے میرے مردانہ وقار کو صدمہ پہنچتا تھا۔ کبھی کبھی مجھ میں میرے ایشیائی آباؤ اجداد کا خون جوش مارتا اور دل جدید تہذیب سے باغی ہو کر مجھ سے کہتا کہ مرد اشرف المخلوقات رف میبل عورت مرد کی مساوات کا اظہار مبالغہ کے ساتھ کرتی تھی۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ عورتوں کی رہبر اور مردوں کو حشرات الارض سمجھتی ہے۔

لیکن اس بات کو میں کیونکر نظر انداز کرتا کہ میبل ایک دن دس بارہ کتابیں خریدتی اور ہفتہ بھر کے بعد انھیں میرے کمرے چلی جاتی اور ساتھ ہی کہہ جاتی کہ میں انھیں پڑھ چکی ہوں، تم بھی پڑھ چکو گے تو ان کے متعلق باتیں کریں گے۔

اوّل تو میرے لیے ایک ہفتے میں دس بارہ کتابیں ختم کرنا محال تھا۔ لیکن فرض کیجیے مردوں کی لاج رکھنے کے لیے راتوں کی کے ان سب کا پڑھ ڈالنا ممکن بھی ہوتا تو بھی ان میں دو یا تین کتابیں فلسفے یا تنقید کی ضرور ایسی ہوتیں کہ ان کے سمجھنے کے انی عرصہ درکار ہوتا۔ چنانچہ ہفتہ بھر کی جانفشانی کے بعد مجھے ایک عورت کے سامنے اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا کہ میں اس رہ گیا ہوں۔ جب تک وہ میرے کمرے میں بیٹھی رہتی میں کچھ کھسیانا سا ہو کر اس کی باتیں سنتا رہتا اور وہ نہایت

حالانکہ اندر سے جوش اوپر کو چڑھا چڑھا کر باتیں کرتی۔ جب میں اس کے لئے دروازہ کھولتا یا اس کے سگرٹ کے لئے دیا سلائی جلاتا یا اپنی نشست سے اٹھ کر وہ کرسی اس کے لئے خالی کر دیتا۔ تو وہ میری خدمات کو حق نسوانیت نہیں بلکہ حق استادی سمجھ کر قبول کرتی۔

میبل کے چلے جانے کے بعد ندامت بتدریج غصے میں تبدیل ہو جاتی۔ جاہل یا جاہل کا بیٹا۔ سچ ہے لیکن [illegible] نیک سے نیک انسان بھی ایک نہ ایک دفعہ تو ضرور ناجائز ذرائع کے استعمال پر اتر آتا ہے۔ اسے میری اخلاقی پستی سمجھئے لیکن یہی حالت میری بھی ہو گئی۔ اگلی دفعہ جب میبل سے ملاقات ہوئی تو جو کتابیں میں نے نئی پڑھی تھیں۔ الٹ پلٹ کر میں نے رائے زنی شروع کر دی لیکن جو کچھ لکھا تھا سنبھل سنبھل کر کہتا تھا۔ تصنیف کے متعلق کوئی بات منہ سے نکالتا تھا۔ سرسری طور پر تنقید کرتا تھا اور بڑی ہوشیاری اور دانائی کے ساتھ اپنی رائے کو جدت کا رنگ دیتا تھا۔

کسی ناول کے متعلق میبل نے مجھ سے پوچھا تو جواب میں نہایت لاابالیانہ کہا:

"ہاں اچھی ہے لیکن کچھ ایسی اچھی بھی نہیں۔ مصنف سے دور جدید کا نقطۂ نظر کچھ نبھ نہ سکا۔ لیکن پھر بھی بعض نکتے نرالے ہیں۔ [illegible]۔"

کنکھیوں سے میبل کی طرف دیکھتا گیا لیکن اسے میری بات کا یہ پہلو بالکل معلوم نہ ہونے پائی۔ ڈرامے کے متعلق اکثر کہتا تھا:

"ہاں پڑھا تو ہے لیکن ابھی تک میں یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ جو کچھ پڑھنے والے کو محسوس ہوتا ہے وہ اسٹیج پر جا کر بھی باقی رہے گا یا نہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

اور اس طرح سے اپنی آن بھی قائم رہتی اور گفتگو کا بار بھی میبل کے کندھوں پر ڈال دیتا۔

تنقید کی کتابوں کے بارے میں فرماتا:

"اس نقاد پر اٹھارھویں صدی کے نقادوں کا کچھ کچھ اثر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یونہی نامعلوم سا کہیں کہیں۔ بالکل ہلکا سا اور شاعری کے متعلق اس کا رویہ دلچسپ ہے۔ بہت دلچسپ۔ بہت دلچسپ۔"

رفتہ رفتہ مجھے اس فن میں کمال حاصل ہو گیا جس روانی اور نفاست کے ساتھ میں ناخواندہ کتابوں پر گفتگو کر سکتا تھا اس پر میں خود حیران رہ جاتا تھا۔ اس سے جذبات کو ایک آسودگی نصیب ہوئی۔

اب میں میبل سے نہ دبتا تھا۔ اسے بھی میرے علم و فضل کا معترف ہونا پڑا۔ وہ اگر ہفتہ میں دس کتابیں پڑھتی تھی تو میں صرف دو دن کے بعد ان سب کتابوں پر رائے زنی کر سکتا تھا۔ اب اس کے سامنے ندامت کا کوئی موقع نہ تھا۔ میری مردانہ روح میں اس احساس فتح مندی سے بالیدگی سی آگئی تھی۔ اب میں اس کے لئے کرسی خالی کرتا یا دیا سلائی جلاتا تو عظمت و برتری کے احساس کے ساتھ جیسے ایک تجربہ کار تنومند نوجوان ایک نادان کمزور بچی کی حفاظت کر رہا ہو۔

صراط مستقیم پر چلنے والے انسان میرے اس فریب کو نہ سراہیں۔ تو نہ سراہیں۔ لیکن میں کم از کم مردوں کے طبقے سے اس کی داد ضرور چاہتا ہوں۔ خواتین میری اس حرکت کے لئے مجھ پر دوہری تہری لعنتیں بھیجیں گی۔ کہ ایک تو میں نے مکاری اور جھوٹ سے کام لیا اور دوسرے ایک عورت کو دھوکا دیا۔ ان کی تسلی کے لئے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ یقین مانیے کئی دفعہ تنہائی میں میں نے اپنے آپ کو برا بھلا کہا۔ بعض اوقات اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی۔ ساتھ ہی اس بات کا بھی

مشکل ہو گیا کہ میں بغیر پڑھے ہی کے طبیعت جتا رہا ہوں۔ میبل تو یہ سب کتابیں پڑھ چکنے کے بعد گفتگو کرتی ہے۔ تو بہر حال اس کو مجھ پر تفوق تو ضرور حاصل ہے۔ میں اپنی کم علمی ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ لیکن حقیقت تو یہی ہے نا کہ وہ کتابیں نہیں پڑھتا۔ میری جہالت اس کے نزدیک نہ سہی، میرے اپنے نزدیک تو مسلّم ہے۔ اس خیال سے اطمینانِ قلب پھر مفقود ہو جاتا اور میں آپ ایک عورت کے مقابلے میں پھر حقیر نظر آنے لگتا۔ پہلے تو میبل کو صرف ذی علم سمجھتا تھا اب وہ اپنے مقابلے میں پالیسی کی اور ریاست بازی کی دیوی بھی معلوم ہونے لگی۔

علالت کے دوران میں میرا دل زیادہ نرم ہو جاتا ہے۔ بخار کی حالت میں کوئی بازاری سا ناول پڑھتے وقت بھی بعض اوقات میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ صحت یاب ہو کر مجھے اپنی اس کمزوری پر ہنسی آتی ہے۔ لیکن اس وقت اپنی کمزوری کا احساس نہیں ہوتا۔ میری بدقسمتی کہ انہی دنوں مجھے خفیف سا انفلوئنزا ہوا۔ خطرناک نہ تھا۔ بہت تکلیف دہ بھی نہ تھا تاہم گزشتہ زندگی کے تمام چھوٹے چھوٹے گناہ، گناہ کبیرہ بن کر نظر آنے لگے۔ میبل کا خیال آیا تو ضمیر نے سخت ملامت کی اور میں بہت دیر تک بستر پر پیچ و تاب کھاتا رہا۔ شام کے وقت میبل کچھ پھول لے کر آئی۔ خیریت پوچھی۔ دوا پلائی۔ ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ میرے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ میں نے کہا (میری آواز بھرائی ہوئی تھی) "میبل مجھے خدا کے لیے معاف کر دو۔" اس کے بعد میں نے اپنے گناہ کا اعتراف کیا۔ اور اپنے آپ کو سزا دینے کے لیے میں نے اپنی مکاری کی ہر ایک تفصیل بیان کر دی۔ ہر اس کتاب کا نام لیا جس پر میں نے بغیر پڑھے لمبی لمبی فاضلانہ تقریریں کی تھیں۔ میں نے کہا "میبل پچھلے ہفتے جو تین کتابیں تم مجھے دے گئی تھیں۔ ان کے متعلق میں تم سے کتنی بحث کرتا رہا ہوں۔ لیکن میں نے ان کا ایک لفظ بھی نہیں پڑھا۔ میں نے کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور کہی ہو گی جس سے میرا پول تم پر کھل گیا ہو گا۔"

کہنے لگی: "نہیں تو۔"

میں نے کہا: "مثلاً ناول تو میں نے پڑھا ہی نہ تھا۔ کیرکٹروں کے متعلق میں جو کچھ بک رہا تھا۔ وہ سب من گھڑت تھا۔"

کہنے لگی: "کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔"

میں نے کہا: "پلاٹ کے متعلق میں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ذرا ڈھیلا ہے۔ یہ بھی ٹھیک تھا؟"

کہنے لگی: "ہاں، پلاٹ کہیں کہیں ڈھیلا ضرور ہے۔"

اس کے بعد میری گزشتہ فریب کاری پر وہ اور میں دونوں ہنستے رہے۔ میبل رخصت ہونے لگی تو بولی: "تو وہ کتابیں میں لیتی جاؤں؟"

میں نے کہا: "ایک تائب انسان کو اپنی اصلاح کا موقع تو دو۔ میں نے ان کتابوں کو اب تک نہیں پڑھا۔ لیکن اب میں انہیں پڑھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ انہیں یہیں رہنے دو۔ تم تو انہیں پڑھ چکی ہو۔"

کہنے لگی: "ہاں میں تو پڑھ چکی ہوں۔ اچھا میں یہیں چھوڑ جاتی ہوں۔"

اس کے چلے جانے کے بعد میں نے ان کتابوں کو پہلی دفعہ کھولا۔ تینوں میں سے کسی ایک کے ورق تک نہ کٹے تھے۔ میبل نے بھی انہیں ابھی تک نہ پڑھا تھا۔

مجھے مرد اور عورت دونوں کی برابری میں کوئی شک باقی نہ رہا۔

مرحوم کی یاد میں

ایک دن مرزا صاحب اور میں برآمدے میں ساتھ ساتھ کرسیاں ڈالے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ جب دوستی بہت پرانی ہو جائے۔ تو گفتگو کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی اور دوست ایک دوسرے کی خاموشی سے بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ یہی حالت ہماری تھی۔ ہم دونوں اپنے اپنے خیالات میں غرق تھے۔ مرزا صاحب تو خدا جانے کیا سوچ رہے تھے۔ لیکن میں زمانے کی ناسازگاری پر غور کر رہا تھا۔ دور سڑک پر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک موٹر کار گزر جاتی تھی۔ میری طبیعت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ میں جب کبھی کسی موٹر کار کو دیکھوں، مجھے زمانے کی ناسازگاری کا خیال ضرور ستانے لگتا ہے اور میں کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگتا ہوں جس سے دنیا کی تمام دولت سب انسانوں میں برابر تقسیم کی جا سکے۔ اگر میں سڑک پر پیدل جا رہا ہوں اور کوئی موٹر اس ادا سے گزر جائے کہ گرد و غبار میرے پھیپھڑوں، میرے دماغ، میرے معدے اور میری تلی تک پہنچ جائے تو اس دن میں گھر آ کر علم کیمیا کی وہ کتاب نکال لیتا ہوں جو میں نے ایف۔ اے میں پڑھی تھی، اور اس غرض سے اس کا مطالعہ کرنے لگتا ہوں کہ شاید بم بنانے کا کوئی نسخہ ہاتھ آ جائے۔

میں کچھ دیر تک آہیں بھرتا رہا۔ مرزا صاحب نے کچھ توجہ نہ کی۔ آخر میں نے خاموشی کو توڑا اور مرزا سے مخاطب ہو کر بولا۔

"مرزا، ہم میں اور حیوانوں میں کیا فرق ہے؟"

مرزا صاحب بولے: "بھئی کچھ ہوگا ہی نا آخر؟"

میں نے کہا: "میں بتاؤں تمہیں؟"

کہنے لگے: "بولو"

میں نے کہا: "کوئی فرق نہیں۔ سنتے ہو مرزا! کوئی فرق نہیں۔ ہم میں اور حیوانوں میں .... کم از کم مجھ میں اور حیوانوں میں کوئی فرق نہیں! ہاں ہاں میں جانتا ہوں۔ تم مین میخ نکالنے میں بڑے طاق ہو کہہ دو گے۔ حیوان جگالی کرتے ہیں تم جگالی نہیں کرتے۔ ان کی دم ہوتی ہے تمہاری دم نہیں۔ لیکن ان باتوں سے کیا ہوتا ہے؟ ان سے تو صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے افضل ہیں۔ لیکن ایک بات میں میں اور وہ بالکل برابر ہیں۔ وہ بھی پیدل چلتے ہیں۔ میں بھی پیدل چلتا ہوں۔ اس کا تمہارے پاس کیا جواب ہے؟ جواب نہیں۔ کچھ ہے تو کہو۔ بس چپ ہو جاؤ۔ تم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ جب سے میں پیدا ہوا ہوں اس دن سے پیدل چل رہا ہوں۔ پیدل! تم پیدل کے معنی نہیں جانتے۔ پیدل کے معنی ہیں سینۂ زمین پر اس طرح سے حرکت کرنا کہ دونوں پاؤں میں سے ایک ضرور زمین پر رہے۔

میں تمام عمر سے حرکت کرنے کا طریقہ یہی رہا ہے کہ ایک پاؤں زمین پر رکھتا ہوں اور دوسرا اٹھاتا ہوں، دوسرا رکھتا ہوں پہلا اٹھاتا ہوں۔ ایک آگے ایک پیچھے۔ ایک پیچھے ایک آگے۔ خدا کی قسم اس طرح کی بیہودگی سے دماغ سوچنے کے قابل نہیں رہتا۔ حواس بیکار ہو جاتے ہیں۔ تخیل مر جاتا ہے۔ آدمی گدھے سے بدتر ہو جاتا ہے۔"

مرزا صاحب میری اس تقریر کے دوران میں کچھ اس بے پروائی سے سگریٹ پیتے رہے کہ دوستوں کی اس بے پروائی پر رونے کو دل چاہتا تھا۔ میں نے ازحد حقارت اور نفرت کے ساتھ منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ مرزا کو میری باتوں پر یقین ہی نہیں آتا۔ گویا میں اپنی جو تکالیف بیان کر رہا ہوں وہ محض خیالی ہیں۔ یعنی میرا پیدل چلنے کے خلاف شکایت کرنا قابل توجہ ہی نہیں۔ یعنی میں کسی سواری کا مستحق ہی نہیں۔ میں نے دل میں کہا "اچھا مرزا یوں ہی سہی۔ دیکھو تو میں کیا کرتا ہوں۔"

میں نے اپنے دانت پیس لئے اور کرسی کے بازو پر سے جھک کر مرزا کے قریب پہنچ گیا۔ مرزا نے بھی سر میری طرف موڑا۔ میں مسکرا دیا۔ لیکن میرے تبسم میں زہر ملا ہوا تھا۔ جب مرزا سننے کے لئے بالکل تیار ہو گیا۔ تو میں نے چبا چبا کر کہا۔

"مرزا میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں بڑے استغنا کے ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگا

مرزا بولے "کیا کہا تم نے؟ کیا خریدنے لگے ہو؟"

میں نے کہا "سنا نہیں تم نے۔ میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں۔ موٹر کار ایک ایسی گاڑی ہے جس کو بعض لوگ موٹر کہتے ہیں بعض لوگ کار کہتے ہیں۔ لیکن چونکہ تم ذرا کند ذہن ہو اس لئے میں نے دونوں لفظ استعمال کر دیئے تاکہ تمہیں سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔"

مرزا بولے "ہوں۔"

اس کے بعد مرزا پھر اسی بے پروائی سے سگریٹ پینے لگا۔ بھویں میں نے اوپر کو چڑھا لیں۔ سگریٹ والا ہاتھ میں منہ تک اس انداز سے لاتا اور ہٹاتا تھا کہ بڑے بڑے ایکٹر اس پر رشک کریں۔

تھوڑی دیر کے بعد مرزا پھر بولے "ہوں۔"

میں نے سوچا اثر ہو رہا ہے۔ مرزا صاحب پر رعب پڑ رہا ہے۔ میں چاہتا تھا مرزا کچھ بولے تاکہ مجھے معلوم ہو کہاں تک مرعوب ہوا ہے۔ لیکن مرزا نے پھر کہا "ہوں۔"

میں نے کہا "مرزا جہاں تک مجھے معلوم ہے تم نے اسکول اور کالج اور گھر پر دو تین زبانیں سیکھی ہیں۔ اور اس کے علاوہ تمہیں کئی ایسے الفاظ بھی آتے ہیں جو کسی اسکول اور کالج یا شریف گھرانے میں نہیں بولے جاتے۔ پھر بھی اس وقت تمہارا کلام "ہوں" سے آگے نہیں بڑھتا۔ تم جلتے ہو مرزا۔ اس وقت تمہاری جو ذہنی کیفیت ہے اس کو عربی زبان میں حسد کہتے ہیں۔"

مرزا صاحب کہنے لگے "نہیں یہ بات تو نہیں۔ میں تو صرف خریدنے کے لفظ پر غور کر رہا تھا۔ تم نے کہا میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں۔ تو میاں صاحبزادے خریدنا تو ایک ایسا فعل ہے کہ اس کے لئے روپے وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ وغیرہ کا بندوبست تو بخوبی ہو جائے گا۔ لیکن روپے کا بندوبست کیسے کرو گے؟"

یہ نکتہ مجھے بھی نہ سوجھا تھا۔ لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ میں نے کہا "میں اپنی کئی قیمتی اشیاء بیچ سکتا ہوں۔"

مرزا بولے "کون کون سی مثلاً؟"

میں نے کہا "ایک تو میں اپنا سگرٹ کیس بیچ ڈالوں گا۔"

مرزا بولے کہ "چلو دس آنے تو یہ ہو گئے۔ باقی ڈھائی تین ہزار کا انتظام بھی اسی طرح ہو جائے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس کے بعد ضروری یہ معلوم ہوا کہ گفتگو کا سلسلہ کچھ دیر کے لئے روک دیا جائے۔ چنانچہ میں مرزا سے بیزار ہو کر خاموش ہو رہا۔ یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ لوگ روپیہ کہاں سے لاتے ہیں۔ بہت سوچا۔ آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ لوگ چوری کرتے ہیں۔ اس سے ایک گونہ اطمینان

مرزا بولے "میں تمہیں ایک ترکیب بتاؤں۔ ایک بائیسکل لے لو۔"

میں نے کہا "وہ روپیہ والا مسئلہ تو پھر جوں کا توں رہا۔"

کہنے لگے "مفت۔"

میں نے حیران ہو کر پوچھا "مفت؟ وہ کیسے؟"

کہنے لگے "مفت ہی سمجھو۔ آخر دوست سے قیمت لینا بھی کہاں کی شرافت ہے۔ البتہ تم احسان قبول کرنا گوارا نہ کرو تو اور بات ہے۔"

ایسے موقع پر جو ہنسی میں ہنستا ہوں اس میں معصوم بچے کی مسرت، جوانی کی خوش دلی، ابلتے ہوئے فواروں کی موسیقی اور بلبلوں کا نغمہ سب ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں یہ ہنسی ہنسا۔ اور اس طرح ہنسا کہ کھلی ہوئی باچھیں پھر گھنٹوں تک اپنی جگہ پر واپس نہ آئیں۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ یک لخت کوئی خوشخبری سننے سے دل کی حرکت بند ہو جانے کا جو خطرہ ہوتا ہے اس سے محفوظ ہوں تو میں نے پوچھا "یہ ہے کس کی؟"

مرزا بولے "میرے پاس ایک بائیسکل پڑی ہے۔ تم لے لو۔"

میں نے کہا "پھر کہنا۔ پھر کہنا!"

کہنے لگے "بھئی ایک بائیسکل میرے پاس ہے۔ جب میری ہے تو تمہاری ہے۔ تم لے لو۔"

یقین مانیے مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ شرم کے مارے میں پسینہ پسینہ ہو گیا۔ چودھویں صدی میں ایسی بے غرضی اور ایثار بھلا کہاں دیکھنے میں آتا ہے۔ میں نے کرسی سرکا کر مرزا کے پاس کر لی۔ مجھ میں نہ آیا کہ اپنی ندامت اور ممنونیت کا اظہار کن الفاظ میں کروں۔

میں نے کہا "مرزا سب سے پہلے میں اس گستاخی اور درشتی اور بے ادبی کے لئے معافی مانگتا ہوں جو ابھی ابھی میں نے تمہارے ساتھ گفتگو میں روا رکھی۔ دوسرے میں آج تمہارے سامنے ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ تم میری صاف گوئی کی داد دو گے اور مجھے اپنی رحم دلی کے صدقے معاف کر دو گے۔ میں ہمیشہ تم کو ازحد کمینہ، ممسک، خود غرض اور عیار انسان سمجھتا رہا ہوں۔ دیکھو ناراض مت ہو۔ انسان سے غلطی ہو ہی جاتی ہے لیکن آج تم نے اپنی شرافت اور دوست پروری کا ثبوت دیا ہے اور مجھ پر ثابت کر دیا ہے کہ میں کتنا قابل نفرت، تنگ خیال اور حقیر شخص ہوں مجھے معاف کر دو۔"

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ قریب تھا کہ میں مرزا کے ہاتھ کو بوسہ دیتا اور اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لئے اس کی گود میں سر رکھ دیتا۔ لیکن مرزا صاحب کہنے لگے۔

"واہ! اس میں میری فیاضی کیا ہوئی۔ میرے پاس ایک بائیسکل ہے۔ جیسے میں سوار ہوا ویسے تم سوار ہوئے۔"

میں نے کہا "مرزا مفت میں نہ لوں گا۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

مرزا کہنے لگے "بس یہی بات سے میں ڈرتا تھا۔ تم صاحب اپنے سوا کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کرتے حالانکہ خدا گواہ ہے احسان اس میں کوئی نہیں۔"

میں نے کہا "خیر کچھ ہی سہی تم مجھے اس کی قیمت بتا دو۔"

مرزا بولے "قیمت کا ذکر کر کے تم گویا مجھے کانٹوں میں گھسیٹتے ہو اور جس قیمت پر میں نے خریدی تھی وہ تو بہت زیادہ تھی اور اب تو وہ اتنے کی رہی بھی نہیں۔"

میں نے پوچھا "تم نے کتنے میں خریدی تھی؟"

کہنے لگے "میں نے پونے دو سو روپے میں لی تھی۔ لیکن اس زمانے میں بائیسکلوں کا رواج ذرا کم تھا۔ اس لیے قیمتیں ذرا زیادہ تھیں۔"

میں نے کہا "کیا بہت پرانی ہے؟"

بولے "نہیں ایسی پرانی بھی کیا ہوگی۔ میرا لڑکا اس پہ کالج آیا جایا کرتا تھا اور اسے کالج چھوڑے ابھی دو سال بھی نہیں ہوئے لیکن اتنا ضرور ہے کہ آج کل کی بائیسکلوں سے ذرا مختلف ہے۔ آج کل تو بائیسکلیں ٹین کی بنتی ہیں۔ جنہیں کالج کے سرپھرے لونڈے سستی سمجھ کر خرید لیتے ہیں۔ پرانی بائیسکلوں کے ڈھانچے مضبوط ہوا کرتے تھے۔"

"مگر مرزا پونے دو سو روپے تو میں ہرگز نہیں دے سکتا۔ اتنے روپے میرے پاس کہاں سے آئے۔ میں تو اس سے آدھی قیمت بھی نہیں دے سکتا۔"

مرزا کہنے لگے "تو میں تم سے پوری قیمت تھوڑی مانگتا ہوں۔ اوّل تو قیمت لینی ہی نہیں چاہتا لیکن ...."

میں نے کہا "نہیں مرزا قیمت تو تمہیں لینی پڑے گی۔ اچھا تم یوں کرو۔ میں تمہاری جیب میں کچھ روپے ڈال دیتا ہوں۔ تم گھر جا کے گن لینا۔ اگر تمہیں منظور ہوئے تو کل بائیسکل بھیج دینا۔ ورنہ روپے واپس کر دینا۔ اب یہاں بیٹھ کر میں تم سے سودا چکاؤں۔ یہ تو کچھ دوکانداروں کی سی بات معلوم ہوتی ہے۔"

مرزا بولے "بھئی جیسے تمہاری مرضی۔ میں تو اب بھی یہی کہتا ہوں کہ قیمت ویمت جانے دو۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ تم نہ مانو گے۔"

میں اٹھ کر اندر کمرے میں آیا۔ میں نے سوچا استعمال شدہ چیز کی لوگ عام طور پر آدھی قیمت دیتے ہیں۔ لیکن جب میں نے مرزا سے کہا تھا کہ مرزا میں تو آدھی قیمت بھی نہیں دے سکتا۔ تو مرزا اس پر معترض نہ ہوا تھا۔ وہ بیچارا تو بلکہ یہی کہتا تھا کہ تم مفت ہی لے لو۔ لیکن مفت میں کیسے لوں۔ آخر بائیسکل ہے۔ ایک سواری ہے۔ فٹنوں اور گھوڑوں اور موٹروں اور تانگوں کے زمرے میں شمار ہوتی ہے۔ بکس کو کھولا تو معلوم ہوا کہ ہست و بود کل چھیالیس روپے ہیں۔ چھیالیس روپے تو کچھ ٹھیک رقم نہیں۔ پینتالیس یا پچاس ہوں جب بھی بات ہے۔ پچاس تو ہو نہیں سکتے اور اگر پینتالیس ہی دینے ہیں تو چالیس ہی کیوں نہ دیے جائیں۔ جن رقموں کے آخر میں صفر آتا ہے وہ رقمیں کچھ زیادہ معقول معلوم ہوتی ہیں۔ بس ٹھیک ہے چالیس روپے دے دوں گا۔ خدا کرے مرزا قبول کر لے۔

باہر آیا۔ چالیس روپے مٹھی میں بند کر کے میں نے مرزا کی جیب میں ڈال دیے اور کہا "مرزا اس کو قیمت نہ سمجھنا لیکن اگر ایک

مطلب یہ ہے سیدھی سی بات منظور کرنا تمہیں اپنی تو یہ معلوم ہو تو کل بائیسکل بھجوا دینا۔‘‘

جب چلنے لگے تو میں نے پھر کہا کہ ’’مرزا کل ضرور صبح ہی صبح بھجوا دینا۔‘‘ رخصت ہونے سے پہلے میں نے پھر ایک دفعہ کہا ’’آٹھ بجے تک پہنچ جائے، دیر نہ کرنا .... خدا حافظ ...... اور دیکھو مرزا میرے خلوص سے جو پرانے کو بھی زیادہ سمجھنا .... خدا حافظ .... اور تمہارا بہت بہت شکریہ۔ میں بہت بہت شرمندہ ہوں۔ اور میری گستاخی کو معاف کر دینا۔ دیکھو کبھی کبھی یونہی بے تکلفی میں ...... کل صبح آٹھ بجے ...... ضرور ...... خدا حافظ!‘‘

مرزا کہنے لگے ’’ذرا اس کو جھاڑ پونچھ لینا۔ اور تیل وغیرہ ڈلوا لینا۔ میرے نوکر کو فرصت ہوئی تو میں خود ہی ڈلوا دوں گا۔ ورنہ تم خود ڈلوا لینا۔‘‘

میں نے کہا ’’ہاں ہاں، وہ سب کچھ ہو جائے گا، تم کل ضرور بھیج دو، اور دیکھو آٹھ بجے تک یا اس سے پہلے پہلے پہنچ جائے، اچھا ...... خدا حافظ!‘‘

رات کو بستر پر لیٹ کر بائیسکل پر سیر کرنے کے مختلف پروگرام تجویز کرتا رہا۔ یہ ارادہ تو پختہ کر لیا کہ دو تین دن کے اندر اندر ارد گرد کی تمام مشہور تاریخی عمارات اور کھنڈروں کو نئے سرے سے دیکھ ڈالوں گا۔ اس کے بعد اگلے گرمی کے موسم میں ہو سکا تو بائیسکل پر کشمیر وغیرہ کی سیر کروں گا۔ صبح صبح ہوا خوری کے لئے ہر روز نہر تک جایا کروں گا۔ شام کو ٹھنڈی سڑک پر جہاں اور لوگ سیر کو نکلے ہوں گے میں بھی سڑک کی صاف شفاف سطح پر ہلکے ہلکے خاموشی کے ساتھ ہاتھی دانت کی ایک گیند کی مانند گزر جاؤں گا۔ ڈوبتے ہوئے آفتاب کی روشنی بائیسکل کے چمکیلے حصوں پر پڑے گی تو بائیسکل جگمگا اٹھے گی اور ایسا معلوم ہوگا جیسے ایک راج ہنس زمین کے ساتھ ساتھ اڑ رہا ہے۔ وہ مسکراہٹ جس کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ ابھی تک میرے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔ بارہا دل چاہا کہ ابھی بھاگ کر جاؤں اور اسی وقت مرزا کو گلے لگا لوں۔

رات کو خواب میں دعائیں مانگتا رہا کہ خدایا مرزا بائیسکل دینے پر رضامند ہو جائے۔

صبح اٹھا تو اٹھنے کے ساتھ ہی نوکر نے یہ خوشخبری سنائی کہ حضور وہ بائیسکل آگئی ہے۔

میں نے کہا ’’اتنی سویرے؟‘‘

نوکر نے کہا ’’وہ تو رات ہی کو آگئی تھی۔ آپ سو گئے تھے۔ میں نے جگانا مناسب نہ سمجھا۔ اور ساتھ ہی مرزا صاحب کا آدمی ڈھبریاں کسنے کا ایک اوزار بھی دے گیا ہے۔‘‘

میں حیران تو ہوا کہ مرزا صاحب نے سائیکل بھجوا دینے میں اس قدر عجلت سے کیوں کام لیا۔ لیکن اس نتیجے پر پہنچا کہ آدمی نہایت شریف اور دیانت دار ہیں۔ روپے لے لئے تھے تو بائیسکل کیوں روک رکھتے۔

نوکر سے کہا ’’دیکھو یہ اوزار یہیں چھوڑ جاؤ۔ اور دیکھو۔ بائیسکل کو کسی کپڑے سے خوب اچھی طرح جھاڑو۔ اور یہ موڑ پر جو بائیسکلوں والا بیٹھتا ہے۔ اس سے جا کر بائیسکل میں ڈالنے کا تیل لے آؤ۔ اور دیکھو! ابے بھاگا کہاں جا رہا ہے۔ ہم ضروری بات تم سے کہہ رہے ہیں۔ بائیسکل والے سے تیل کی ایک کپی بھی لے آنا اور جہاں جہاں تیل دینے کی جگہ ہے وہاں تیل دے دینا۔ اور بائیسکلوں والے سے کہنا کہ کوئی گھٹیا سا تیل نہ دے دے جس سے تمام پرزے ہی خراب ہو جائیں۔ بائیسکل کے پرزے بڑے نازک ہوتے ہیں۔ اور بائیسکل باہر نکال کر رکھو۔ ہم ابھی کپڑے پہن کر آتے ہیں۔ ہم ذرا سیر کو جا رہے ہیں۔ اور ذرا اچھی طرح صاف کر دینا اور بہت زور سے کپڑا بھی مت رگڑنا۔ بائیسکل کا پالش گھس جاتا ہے۔‘‘

جلدی جلدی چائے پی۔ غسل خانے میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ "چل چل چنبیلی باغ میں" گاتا رہا۔ اس کے بعد کپڑے بدلے۔ اوزار کو جیب میں ڈالا اور کمرے سے باہر نکلا۔

برآمدے میں آیا تو برآمدے کے ساتھ ہی ایک عجیب و غریب مشین پر نظر پڑی۔ ٹھیک طرح پہچان نہ سکا کہ کیا چیز ہے۔ نوکر سے دریافت کیا "یہ کیوں بے یہ کیا چیز ہے؟"

نوکر بولا "حضور یہ بائیسکل ہے۔"

میں نے کہا "بائیسکل؟ کس کی بائیسکل؟"

کہنے لگا "مرزا صاحب نے بھجوائی ہے آپ کے لئے۔"

میں نے کہا "اور جو بائیسکل رات کو انہوں نے بھیجی تھی وہ کہاں گئی؟"

کہنے لگا "یہی تو ہے۔"

میں نے کہا "کیا بکتا ہے۔ جو بائیسکل مرزا صاحب نے کل رات کو بھیجی تھی۔ وہ بائیسکل یہی ہے؟"

کہنے لگا "جی ہاں۔"

میں نے کہا "اچھا" اور پھر اسے دیکھنے لگا۔

"اس کو صاف کیوں نہیں کیا؟"

"حضور دو تین دفعہ صاف کیا ہے۔"

"تو یہ میلی کیوں ہے؟"

نوکر نے اس کا جواب دینا شاید مناسب نہ سمجھا۔

"اور تیل دیا؟"

"ہاں حضور لایا ہوں۔"

"دیا؟"

"حضور وہ جو تیل دینے کے چھید ہوتے ہیں۔ وہ نہیں ملتے۔"

"کیا وجہ؟"

"حضور دھروں پر میل اور زنگ جما ہے۔ وہ سوراخ کہیں بیچ ہی میں دب دبا گئے ہیں۔"

رفتہ رفتہ میں اس چیز کے قریب آیا۔ جس کو میرا نوکر بائیسکل بتا رہا تھا۔ اس کے مختلف پرزوں پر غور کیا۔ تو اتنا ثابت ہو گیا کہ بائیسکل ہے۔ لیکن مجموعی ہیئت سے یہ صاف ظاہر تھا کہ ہل اور رہٹ اور چرخہ اور اسی طرح کی اور جدید ایجادات سے پہلے کی بنی ہوئی ہے۔ پہیے کو گھما گھما کر وہ سوراخ تلاش کیا۔ جہاں کسی زمانے میں تیل دیا جاتا تھا۔ لیکن اب اس سوراخ میں سے آمد و رفت کا سلسلہ بند تھا۔ چنانچہ نوکر بولا "حضور وہ تیل تو سب ادھر ادھر بہہ جاتا ہے۔ بیچ میں تو جاتا ہی نہیں۔"

میں نے کہا "اچھا اوپر اوپر ہی ڈال دو۔ یہ بھی مفید ہوتا ہے۔"

آخرکار بائیسکل پر سوار ہوا۔ پہلا ہی پاؤں چلایا تو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی مردہ اپنی ہڈیاں چٹخا چٹخا کر اپنی مرضی کے خلاف زندہ ہو رہا ہے۔ گھر سے نکلتے ہی کچھ تھوڑی سی اترائی تھی۔ اس پر بائیسکل خود بخود چلنے لگی۔ لیکن اس رفتار سے جیسے تارکول زمین پر بہتا ہے۔ اور ساتھ ہی مختلف حصوں سے طرح طرح کی آوازیں برآمد ہونی شروع ہوئیں۔ ان آوازوں کے مختلف گروہ تھے۔ چیں چاں چوں قسم کی آوازیں زیادہ تر گدی کے نیچے اور پچھلے پہیے سے نکلتی تھیں۔ کھٹ۔ کھڑ کھڑڑ کے قبیل کی آوازیں مڈگارڈوں سے آتی تھیں۔ چر چرخ چر چرخ کی قسم کے سُر زنجیر اور پیڈل سے نکلتے تھے۔ زنجیر ڈھیلی ڈھالی تھی۔ میں جب کبھی پیڈل پر زور ڈالتا تھا۔ زنجیر میں ایک انگڑائی سی پیدا ہوتی تھی جس سے وہ تن جاتی تھی اور چڑ چڑ بولنے لگتی تھی۔ اور پھر ڈھیلی ہو جاتی تھی۔ پچھلا پہیہ گھومنے کے علاوہ جھومتا بھی تھا۔ یعنی ایک تو آگے کو چلتا تھا اور اس کے علاوہ داہنے سے بائیں اور بائیں سے داہنے کو بھی حرکت کرتا تھا۔ چنانچہ سڑک پر جو نشان پڑ جاتا تھا اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مخمور سانپ لہرا کر نکل گیا ہے۔ مڈگارڈ تھے تو سہی لیکن پہیوں کے عین اوپر نہ تھے۔ ان کا فائدہ صرف یہ معلوم ہوتا تھا کہ انسان شمال کی سمت سیر کو نکلے اور آفتاب مغرب میں غروب ہو رہا ہو تو مڈگارڈوں کی بدولت ٹائر دھوپ سے بچے رہیں گے۔ اگلے پہیے کے ٹائر میں ایک بڑا سا پیوند لگا تھا جس کی وجہ سے پہیہ ہر چکر میں ایک دفعہ لمحہ بھر کو زور سے اوپر اٹھ جاتا تھا اور میرا سر پیچھے کو یوں جھٹکے کھا رہا تھا جیسے کوئی متواتر ٹھوڑی کے نیچے مکے مارے جا رہا ہو۔ پچھلے اور اگلے پہیے کو ملا کر چوں چوں پھٹ۔ چوں چوں پھٹ ...... کی صدا نکل رہی تھی۔ جب اتار پر بائیسکل ذرا زیادہ تیز ہوئی تو فضا میں ایک بھونچال سا آگیا۔ اور بائیسکل کے کئی اور پرزے جو اب تک سو رہے تھے بیدار ہو کر گویا ہوئے۔ ادھر ادھر کے لوگ چونکے۔ ماؤں نے اپنے بچوں کو سینوں سے لگا لیا۔ کھڑڑ کھڑڑ کے بیچ میں پہیوں کی آواز جدا سنائی دے رہی تھی۔ لیکن چونکہ بائیسکل اب پہلے سے تیز تھی اس لیے چوں چوں پھٹ کی آواز نے اب چچوں پھٹ۔ چچوں پھٹ چچوں پھٹ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ تمام بائیسکل کسی ادق افریقی زبان کی گردانیں دہرا رہی تھی۔

اس قدر تیز رفتاری بائیسکل کی طبع نازک پر گراں گزری۔ چنانچہ اس میں یک لخت دو تبدیلیاں واقع ہو گئیں۔ ایک تو ہینڈل ایک طرف کو مڑ گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں جا تو سامنے کو رہا تھا لیکن میرا تمام جسم دائیں طرف کو مڑا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بائیسکل کی گدی دفعتاً چھ انچ کے قریب نیچے بیٹھ گئی۔ چنانچہ جب پیڈل چلانے کے لیے میں ٹانگیں اوپر نیچے کر رہا تھا۔ تو میرے گھٹنے میری ٹھوڑی تک پہنچ جاتے تھے۔ کمر دوہری ہو کر باہر کو نکلی ہوئی تھی اور ساتھ ہی اگلے پہیے کی اٹھکیلیوں کی وجہ سے سر برابر جھٹکے کھا رہا تھا۔

گدی کا نیچا ہونا ازحد تکلیف دہ ثابت ہوا۔ اس لیے میں نے مناسب یہی سمجھا کہ اس کو ٹھیک کر لوں۔ چنانچہ میں نے بائیسکل کو ٹھہرا لیا اور نیچے اترا۔ بائیسکل کے ٹھہر جانے سے یک لخت جیسے دنیا میں ایک خاموشی سی چھا گئی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے میں کسی ریل کے اسٹیشن سے نکل کر باہر آگیا ہوں۔ جیب سے میں نے اوزار نکالا۔ گدی کو اونچا کیا۔ کچھ ہینڈل کو ٹھیک کیا۔ اور دوبارہ سوار ہو گیا۔

دس قدم بھی چلنے نہ پایا تھا کہ اب کے ہینڈل یک لخت نیچا ہو گیا۔ اتنا کہ گدی اب ہینڈل سے کوئی فٹ بھر اونچی تھی۔ میرا تمام جسم آگے کو جھکا ہوا تھا۔ تمام بوجھ دونوں ہاتھوں پر تھا۔ جو ہینڈل پر رکھے تھے۔ اور برابر جھٹکے کھا رہے تھے۔ آپ میری حالت کو تصور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ میں دور سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی عورت آٹا گوندھ رہی ہو۔ مجھے اس مشابہت کا احساس بہت تیز تھا جس کی وجہ سے میرے ماتھے پر پسینہ آگیا۔ میں دائیں بائیں لوگوں کو کنکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا۔ یوں تو ہر شخص میل بھر پہلے ہی سے مڑ مڑ کر دیکھنے لگتا تھا۔ لیکن ان میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کے لیے میری مصیبت ضیافت طبع کا باعث نہ ہو۔

ہینڈل تو نیچا ہو ہی گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد گدی بھی پھر نیچی ہو گئی۔ اور میں ہمہ تن زمین کے قریب پہنچ گیا۔ ایک لڑکے نے

کہنے لگا "دیکھیو وہ ہلایا کر رہا ہے۔" دیا اس پر بیٹھنے سے نزدیک ہی ہوتی ترتیب رکھا تھا۔ میں نے اتر کر پھر ہینڈل اور گدی کو از سر نو کیا۔

لیکن تھوڑی دیر کے بعد ان میں سے ایک نہ ایک پھر نیچا ہو جاتا۔ سفر کے دوران میں میرے ہاتھ اور میرا جسم برابر ایک ہی بلندی پر واقع ہوں۔ بہت ہی کم رہتے۔ اور راستہ میں بھی یہی سوچتا جاتا کہ اب کے گدی نیچے ہے یا ہینڈل۔ چنانچہ نڈر ہو کر بیٹھتے بلکہ جسم کو گدی سے قدرے اوپر ہی رکھتا۔ لیکن اس سے ہینڈل پر ہاتھوں کا بوجھ [illegible]

جب وہ سنبھل گئے اور بائیسکل کی آواز سے نجات [illegible] نے ایک منٹ [illegible] انتخاب کر لی تو بہتر ہے کسی مستری سے پیچ کسوا لینے چاہئیں۔ چنانچہ بائیسکل کو ایک دکان پر لے گیا۔

بائیسکل کی کھڑکھڑ سے جتنے لوگ کام کر رہے تھے۔ سب کے سب ہاتھ روک کر میری طرف دیکھنے لگے۔ لیکن میں نے جی کڑا کر کے کہا "اس کی مرمت کر دیجئے۔"

ایک مستری آگے بڑھا۔ لوہے کی ایک سلاخ اس کے ہاتھ میں تھی جس سے اس نے مختلف حصوں کو بڑی بے دردی کے ساتھ ٹٹول کر دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا اس نے بڑی تیزی سے سب حالات کا اندازہ لگا لیا ہے۔ لیکن پھر مجھ سے پوچھنے لگا "کس کس پرزے کی مرمت کرائیے گا؟"

میں نے کہا "بڑے گستاخ ہو تم۔ دیکھتے نہیں صرف ہینڈل اور گدی کو ذرا اونچا کر کے کس دینا ہے۔ بس اور کیا، اور کچھ ہلا کرے اسے فوراً ٹھیک کر دو اور بتاؤ کتنے پیسے ہوئے؟"

مستری کہنے لگا "مڈگارڈ بھی ٹھیک نہ کر دوں؟"

میں نے کہا "ہاں۔ وہ بھی ٹھیک کر دو۔"

کہنے لگا "اگر باقی چیزیں بھی کس دی جائیں تو اچھا ہو؟"

میں نے کہا "اچھا کر دو۔"

بولا "یوں تھوڑی ہو سکتا ہے۔ دس پندرہ دن کا کام ہے۔ آپ اسے ہمارے پاس چھوڑ جائیے۔"

"اور پیسے کتنے لو گے؟"

کہنے لگا "بس یہی تیس روپے لگیں گے۔"

ہم نے کہا "بس جی۔ جو کام تم سے کہا ہے کر دو اور باقی ہمارے معاملات میں دخل مت دو۔"

تھوڑی دیر میں ہینڈل اور گدی پھر اونچی کر کے کس دی گئی۔ میں چلنے لگا تو مستری نے کہا "میں نے کس تو دیا ہے لیکن پیچ سب گھسے ہوئے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں پھر ڈھیلے ہو جائیں گے۔"

میں نے کہا "بدتمیز کہیں کا تو دو آنے پیسے مفت میں لے لیے؟"

بولا "جناب آپ کو بائیسکل بھی تو مفت میں ملی ہو گی۔ یہ آپ کے دوست مرزا صاحب کی ہے نا؟ .... للو یہ وہی بائیسکل ہے جو پچھلے سال مرزا صاحب یہاں بیچنے کو لائے تھے۔ پہچانی تم نے؟ بھئی صدیاں ہی گزر گئیں۔ لیکن اس بائیسکل کی خطا معاف ہونے میں نہیں آتی۔"

میں نے کہا "واہ، مرزا صاحب کے لڑکے اس پر کالج آیا جایا کرتے تھے۔ اور ان کو ابھی کالج چھوڑے دو سال بھی نہیں ہوئے۔" مستری نے کہا "ہاں وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن مرزا صاحب خود جب کالج میں پڑھتے تھے۔ تو ان کے پاس بھی تو یہی سائیکل تھی۔"

میری طبیعت یہ سن کر کچھ مردہ سی ہو گئی۔ میں بائیسکل کو ساتھ لئے آہستہ آہستہ پیدل چل پڑا۔ لیکن پیدل چلنا بھی مشکل تھا۔ اصل میں بائیسکل کے چلانے میں ایسے ایسے پٹھوں پر زور پڑتا تھا جو عام بائیسکلوں کے چلانے میں استعمال نہیں ہوتے۔ اس لئے ٹانگوں اور کندھوں اور کمر اور بازوؤں میں جابجا درد ہو رہا تھا۔ مرزا کا خیال رہ رہ کر آتا تھا۔ لیکن میں ہر بار کوشش کر کے اسے دل سے ہٹا دیتا تھا۔ ورنہ میں پاگل ہو جاتا۔ اور جنوں کی حالت میں پہلی حرکت مجھ سے یہ سرزد ہوتی کہ مرزا کے مکان کے سامنے بازار میں ایک جلسہ منعقد کرتا جس میں مرزا کی مکاری۔ بے ایمانی اور دغابازی پر ایک طویل تقریر کرتا۔ کل بنی نوع انسان اور آئندہ آنے والی نسلوں کو مرزا کی ناپاک فطرت سے آگاہ کر دیتا۔ اور اس کے بعد ایک چتا جلا کر اس میں زندہ جل کر مر جاتا۔

میں نے بہتر یہی سمجھا کہ جس طرح ہو سکے اب اس بائیسکل کو اونے پونے داموں کو بیچ کر جو وصول ہو اسی پر صبر شکر کروں۔ بلا سے دس پندرہ روپے کا خسارہ سہی۔ چالیس کے چالیس روپے تو ضائع نہ ہوں گے۔ راستے میں بائیسکلوں کی ایک دکان آئی وہاں ٹھہر گیا۔

دکاندار بڑھ کر میرے پاس آیا۔ لیکن میری زبان کو جیسے قفل لگ گیا تھا۔ عمر بھر کبھی کسی چیز کے بیچنے کی نوبت نہ آئی تھی مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ ایسے موقع پر کیا کہتے ہیں۔ آخر بڑے سوچ بچار اور بڑے تامل کے بعد منہ سے صرف اتنا نکلا کہ "یہ بائیسکل ہے۔"

دکاندار کہنے لگا "پھر؟"

میں نے کہا "لوگے؟"

کہنے لگا "کیا مطلب؟"

میں نے کہا "بیچتے ہیں ہم۔"

دکاندار نے مجھے ایسی نظر سے دیکھا کہ مجھے محسوس ہوا مجھ پر چوری کا شبہ کر رہا ہے۔ پھر بائیسکل کو دیکھا۔ پھر مجھے دیکھا۔ پھر بائیسکل کو دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فیصلہ نہیں کر سکتا۔ آدمی کون سا ہے اور بائیسکل کون سی ہے۔ آخرکار بولا "کیا کریں گے آپ اس کو بیچ کر؟"

ایسے سوالوں کا خدا جانے کیا جواب ہوتا ہے۔ میں نے کہا "کیا تم یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ جو روپے مجھے وصول ہوں گے۔ ان کا مصرف کیا ہو گا؟"

کہنے لگا "وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر کوئی اس کو لے کر کرے گا کیا؟"

میں نے کہا "اس پر چڑھے گا اور کیا کرے گا؟"

کہنے لگا "اچھا! چڑھ گیا۔ پھر؟"

میں نے کہا "پھر کیا؟ پھر چلائے اور کیا؟"

دکاندار بولا "اچھا؟ ہوں۔ خدا بخش ذرا یہاں آنا۔ یہ بائیسکل بکنے آئی ہے۔"

جن حضرت کا اسم گرامی خدا بخش تھا۔ انھوں نے بائیسکل کو دور ہی سے یوں دیکھا جیسے بو سونگھ رہے ہیں۔

اس کے بعد دونوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ آخر میں وہ جن کا نام خدا بخش نہیں تھا۔ میرے پاس آئے اور کہنے لگے "تو آپ

یہ کیا پکا رہے ہیں؟

میں نے کہا: "تو اور کیا، محض آپ سے ہم کلام ہونے کا فخر حاصل کرنے کے لئے اس گھر سے باہر نکال کر لایا تھا؟"

کہنے لگا: "تو کیا لیں گے آپ؟"

میں نے کہا: "جو تمہیں بتاؤں؟"

کہنے لگا: "سچ سچ بتاؤں؟"

میں نے کہا: "ہاں۔"

پھر کہنے لگا: "سچ سچ بتاؤں؟"

میں نے کہا: "اب بتاؤ گے بھی یا یونہی ترساتے رہو گے؟"

کہنے لگا: "تین روپے دوں گا اس کے۔"

میرا خون کھول اٹھا اور میرے ہاتھ پاؤں اور ہونٹ غصے کے مارے کانپنے لگے۔ میں نے کہا:

"او صنعت و حرفت سے پیٹ پالنے والے نچلے طبقے کے انسان! مجھے اپنی توہین کی پروا نہیں۔ لیکن تو نے اپنی بیہودہ گفتاری سے اس بے زبان چیز کو جو صدمہ پہنچایا ہے، اس کے لئے میں تجھے قیامت تک معاف نہیں کر سکتا۔" یہ کہہ کر میں بائیسکل پر سوار ہو گیا۔ اور اندھا دھند پاؤں چلانے لگا۔

مشکل سے دس ہی قدم گیا ہوں گا کہ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے زمین یک لخت اچھل کے مجھ سے آ لگی ہے۔ آسمان میرے سر پر سے ہٹ کر میری ٹانگوں کے بیچ میں سے گزر گیا۔ اور ادھر ادھر کی عمارتوں نے ایک دوسرے سے اپنی اپنی جگہ بدل لی ہے۔ حواس بجا ہوئے تو معلوم ہوا کہ میں زمین پر اس بے تکلفی سے بیٹھا ہوں۔ گویا بڑی مدت سے مجھے اس بات کا شوق تھا جو آج پورا ہوا۔ ارد گرد کچھ لوگ جمع تھے جن میں سے اکثر ہنس رہے تھے۔ سامنے وہ دکان تھی جہاں ابھی ابھی میں نے اپنی ناکام گفت و شنید کا سلسلہ منقطع کیا تھا۔ میں نے اپنے گرد و پیش پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ میری بائیسکل کا اگلا پہیہ بالکل الگ ہو کر لڑھکتا ہوا سڑک کے اس پار جا پہنچا ہے۔ اور باقی بائیسکل میرے پاس پڑی ہے۔ میں نے فوراً اپنے آپ کو سنبھالا۔ جو پہیہ الگ ہو گیا تھا، اس کو ایک ہاتھ میں اٹھایا۔ دوسرے ہاتھ میں باقی ماندہ بائیسکل کو تھاما۔ اور چل کھڑا ہوا۔ یہ محض ایک اضطراری حرکت تھی۔ ورنہ حق تو یہ ہے کہ وہ بائیسکل مجھے ہرگز اتنی عزیز نہ تھی کہ میں اس کو اس حالت میں ساتھ لئے پھرتا۔

جب میں یہ سب کچھ اٹھا کر چل دیا تو میں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ یہ تم کیا کر رہے ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟ تمہارا ارادہ کیا ہے؟ یہ دو پہیے کا ہے کو لئے جا رہے ہو؟

سب سوالوں کا جواب یہی ملا کہ دیکھا جائے گا۔ فی الحال تم یہاں سے چل دو۔ سب لوگ تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ سر اونچا رکھو اور چلتے جاؤ۔ جو ہنس رہے ہیں، انہیں ہنسنے دو۔ اس قسم کے بیہودہ لوگ ہر قوم اور ہر ملک میں پائے جاتے ہیں۔ آخر ہوا کیا؟ محض ایک حادثہ۔ بس دائیں بائیں مت دیکھو۔ چلتے جاؤ۔

لوگوں کے ناشائستہ کلمات بھی سنائی دے رہے تھے۔ ایک آواز آئی: "بس حضرت! غصہ تھوک ڈالیے۔" ایک دوسرے صاحب بولے: "بے حیا بائیسکل! گھر پہنچ کے تجھے مزہ چکھاؤں گا۔" ایک والد اپنے لخت جگر کی انگلی پکڑے جا رہے تھے۔ میری طرف اشارہ کر کے کہنے لگے: "دیکھا بیٹا یہ

سرکس کی بائیسکل ہے۔ اس کے دونوں پہیے الگ الگ ہوتے ہیں۔"

لیکن مجھ سے رہا نہ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں آبادی سے دور نکل گیا۔ اب میری رفتار میں ایک عالمانہ سی چال باقی تھی۔ یہ وہی چال ہے جو کسی [illegible] ایک کشمکش میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔ اب سب ملال ہو گیا تھا۔ میں بائیسکل کو پیدل لیے چلا گیا۔ حتیٰ کہ دریا پر جا پہنچا۔ پل کے اوپر کھڑے ہو کر میں نے دونوں پہیوں کو الگ الگ کر کے اس بے ہودہ ملبے کے ساتھ دریا میں پھینک دیا۔ جیسے کوئی ابر کچھ برس کر ہلکا ہو جاتا ہے ویسے ہی میں پلٹ کر روانہ ہو گیا۔

سیدھا مرزا کے گھر گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ مرزا بولے "اندر آجاؤ۔"

میں نے کہا: "آپ ذرا باہر تشریف لائیے۔ میں آپ جیسے خدا رسیدہ بزرگ کے گھر میں وضو کیے بغیر داخل نہ ہو سکتا ہوں۔"

باہر تشریف لائے تو میں نے وہ اوزار ان کی خدمت میں پیش کیا جو انھوں نے بائیسکل کے ساتھ مفت ہی مجھ کو عنایت فرمایا تھا اور کہا:

"مرزا صاحب آپ ہی اس اوزار سے شوق فرمایا کیجیے۔ میں اب اس سے بے نیاز ہو چکا ہوں۔"

گھر پہنچ کر میں نے پھر علم کیمیا کی اس کتاب کا مطالعہ شروع کیا جو میں نے ایف اے میں پڑھی تھی۔

لاہور کا جغرافیہ

تمہید ۔ تمہید کے طور پر صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ لاہور کو دریافت ہوئے اب بہت عرصہ گزر چکا ہے۔ اس لیے دلائل و براہین سے اس کے وجود کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ کہنے کی بھی اب ضرورت نہیں کہ کرّے کو دائیں سے بائیں گھمائیے حتیٰ کہ ہندوستان کا ملک آپ کے سامنے آ کر ٹھہر جائے۔ پھر فلاں طول البلد اور فلاں عرض البلد کے مقام انقطاع پر لاہور کا نام تلاش کیجیے۔ جہاں نام کرّے پر مرقوم ہو وہی لاہور کا محل وقوع ہے۔ اس ساری تحقیقات کو مختصر مگر جامع الفاظ میں لوگ یوں بیان کرتے ہیں کہ لاہور لاہور ہی ہے۔ مگر اس پتے سے آپ کو لاہور نہیں مل سکتا، تو آپ کی تعلیم ناقص اور آپ کی ذہانت فاتر ہے۔

محل وقوع ۔ ایک دو غلط فہمیاں البتہ ضرور رفع کرنا چاہتا ہوں۔ لاہور پنجاب میں واقع ہے۔ لیکن پنجاب اب پنج آب نہیں رہا۔ اس پانچ دریاؤں کی سرزمین میں اب صرف ساڑھے چار دریا بہتے ہیں۔ اور جو نصف دریا ہے، وہ تو اب بہنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ اسی کو اصطلاح میں راوی ضعیف کہتے ہیں۔ ملنے کا پتہ یہ ہے کہ شہر کے قریب دو پل بنے ہیں۔ ان کے نیچے ریت میں یہ دریا لیٹا ہے۔ بہنے کا شغل عرصے سے بند ہے۔ اس لیے اب یہ بتانا بھی مشکل ہے کہ شہر دریا کے دائیں کنارے پر واقع ہے یا بائیں کنارے پر۔

لاہور تک پہنچنے کے کئی رستے ہیں۔ لیکن دو ان میں سے بہت مشہور ہیں۔ ایک پشاور سے آتا ہے اور دوسرا دلی سے۔ وسط ایشیا کے حملہ آور پشاور کے رستے اور یوپی کے حملہ آور دلی کے رستے وارد ہوتے ہیں۔ اوّل الذکر اہل سیف کہلاتے ہیں۔ اور غزنوی یا غوری تخلص کرتے ہیں۔ مؤخر الذکر اہل زبان کہلاتے ہیں۔ یہ بھی تخلص کرتے ہیں ——— اور اس میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔

حدود اربعہ ۔ کہتے ہیں کسی زمانے میں لاہور کا حدود اربعہ بھی ہوا کرتا تھا۔ لیکن طلبا کی سہولت کے لیے میونسپلٹی نے اسے منسوخ کر دیا ہے۔ اب لاہور کے چاروں طرف بھی لاہور ہی واقع ہے اور روز بروز واقع تر ہو رہا ہے۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ دس بیس سال کے اندر لاہور ایک صوبے کا نام ہوگا جس کا دارالخلافہ پنجاب ہوگا۔ یوں سمجھیے کہ لاہور ایک جسم ہے جس کے ہر حصے پر ورم نمودار ہو رہا ہے۔ لیکن ہر ورم مواد فاسد سے بھرا ہے۔ گویا یہ توسیع ایک عارضہ ہے جو اس کے جسم کو لاحق ہے۔

آب و ہوا ۔ لاہور کی آب و ہوا کے متعلق طرح طرح کی روایات مشہور ہیں۔ جو تقریباً سب کی سب غلط ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لاہور کے باشندوں نے حال ہی میں یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ اور شہروں کی طرح ہمیں بھی آب و ہوا دی جائے۔ میونسپلٹی بڑی بحث و تمحیص کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی کہ اس ترقی کے دور میں جبکہ دنیا میں کئی ممالک کو ہوم رول مل رہا ہے اور لوگوں میں بیداری کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ اہل لاہور کی یہ خواہش ناجائز نہیں بلکہ ہمدردانہ غور و خوض کی مستحق ہے۔

لیکن بدقسمتی سے کمیٹی کے پاس ہوا کی قلت تھی۔ اس لیے لوگوں کو ہدایت کی گئی کہ مفادِ عامہ کے پیشِ نظر اہلِ شہر ہوا استعمال نہ کریں۔ بلکہ جہاں تک ہو سکے کفایت شعاری سے کام لیں۔ چنانچہ اب لاہور میں عام ضروریات کے لیے ہوا کی بجائے گرد خاص خاص حالات میں دھواں استعمال کیا جاتا ہے۔ کمیٹی نے جا بجا دھوئیں اور گرد کے مہیا کرنے کے لیے مرکز کھول دیے ہیں مرکبات مفت تقسیم کیے جاتے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ اس سے نہایت تسلی بخش نتائج برآمد ہوں گے۔

بہم رسانیِ آب کے لیے ایک سکیم عرصے سے کمیٹی کے زیرِ غور ہے۔ یہ سکیم نظام سقے کے وقت سے چلی آ لیکن مصیبت یہ ہے کہ نظام سقے کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے اہم مسودات بعض تو تلف ہو چکے ہیں۔ اور جو باقی ہیں ان کے پڑھنے میں دقت پیش آ رہی ہے اس لیے ممکن ہے تحقیق و تدقیق میں چند سال اور لگ جائیں۔ عارضی طور پہ پانی کا یہ انتظام کیا گیا ہے کہ بارش کے پانی کو حتی الوسع شہر سے باہر نکلنے نہیں دیتے۔ اس میں کمیٹی کو بہت کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ عنقریب ہر محلے کا اپنا ایک دریا ہوگا جس میں رفتہ رفتہ مچھلیاں پیدا ہوں گی۔ اور ہر مچھلی کے پیٹ میں کمیٹی کی ایک انگوٹھی ہوگی جو کے موقع پر ہر رائے دہندہ پہن کر آئے گا۔

نظام سقے کے مسودات سے اس قدر ضرور ثابت ہوا ہے۔ کہ پانی پہنچانے کے لیے نل ضروری ہیں۔ چنانچہ کمیٹی نے روپیہ خرچ کر کے جا بجا نل لگوا دیے ہیں۔ فی الحال ان میں ہائیڈروجن اور آکسیجن بھری ہے۔ لیکن ماہرین کی رائے ہے کہ ایک دن یہ گیسیں ضرور مل کر پانی ہو جائیں گی۔ چنانچہ بعض بعض نلوں میں اب بھی چند قطرے روزانہ ٹپکتے ہیں۔ اہلِ شہر کو ہدایت کی گئی کہ اپنے اپنے لوٹے نلوں کے نیچے رکھ چھوڑیں۔ تاکہ عین وقت پہ تاخیر کی وجہ سے کسی کی دل شکنی نہ ہو۔ شہر کے لوگ اس پر مت مناسب ہیں۔

ذرائع آمد و رفت ۔ جو سیاح لاہور تشریف لانے کا ارادہ رکھتے ہوں ان کو یہاں کے ذرائع آمد و رفت کی چند ضروری باتیں ذہن نشین کر لینی چاہئیں۔ تاکہ وہ یہاں کی سیاحت سے کماحقہٗ اثر پذیر ہو سکیں۔ جو سڑک بل کھاتی ہوئی بازاروں میں سے گزرتی ہے۔ تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ یہ وہی سڑک ہے جسے شیر شاہ سوری نے بنایا تھا۔ یہ آثارِ قدیمہ میں ہوتی ہے۔ اور بے حد احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے۔ چنانچہ اس میں کسی قسم کا ردّ و بدل گوارا نہیں کیا جاتا۔ وہ قدیم تاریخی گ خندقیں جوں کی توں موجود ہیں۔ جنھوں نے کئی سلطنتوں کے تختے الٹ دیے تھے۔ آج کل بھی کئی لوگوں کے تختے یہاں الٹتے عظمتِ رفتہ کی یاد دلا کر انسان کو عبرت سکھاتے ہیں۔

بعض لوگ زیادہ عبرت پکڑنے کے لیے ان تختوں کے نیچے کہیں کہیں دو ایک پہیے لگا لیتے ہیں۔ اور سامنے دو لگا کر ان میں ایک گھوڑا ٹانک دیتے ہیں۔ اصطلاح میں اس کو تانگہ کہتے ہیں۔ شوقین لوگ اس تختہ پر موم جامہ منڈھ لیتے ہیں میں سہولت ہو۔ اور بہت زیادہ عبرت پکڑی جا سکے۔

اصلی اور خالص گھوڑے لاہور میں خوراک کے کام آتے ہیں۔ قصابوں کی دکانوں پر انھی کا گوشت بکتا ہے اور کھایا جاتا ہے۔ تانگوں میں ان کی بجائے بناسپتی گھوڑے استعمال کیے جاتے ہیں۔ بناسپتی گھوڑا شکل و صورت میں دُم دار تا ملتا ہے۔ کیونکہ اس گھوڑے کی ساخت میں دُم زیادہ اور گھوڑا کم پایا جاتا ہے۔ حرکت کرتے وقت اپنی دُم کو دبا لیتا ہے

اس ضبط نفس سے اپنی رفتار میں ایک بے جا اعتدال پیدا کرلیتے تاکہ سڑک کا ہر ایک گھوڑا اور تانگے کا ہر پہیہ اپنا نقش آپ پر ثبت کرتا جائے اور آپ کا ایک ایک بال لذت اندوز ہو چکے

قابلِ دید مقامات ۔ لاہور میں قابلِ دید مقامات مشکل سے ملتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لاہور میں ہر عمارت کی بیرونی دیواریں دوہری بنائی جاتی ہیں۔ پہلے اینٹوں اور چونے سے دیوار کھڑی کرتے ہیں۔ اور پھر اس پر اشتہاروں کو پلستر کر دیا جاتا ہے جو دبازت میں رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا ہے۔ شروع شروع میں چھوٹے سائز کے مبہم اور غیر معروف اشتہارات چپکائے جاتے ہیں۔ مثلاً "اہلِ لاہور کو مژدہ" یا "عمدہ اور سستا مال"۔ اس کے بعد ان اشتہاروں کی باری آتی ہے جن کے مخاطب اہلِ علم اور سخن فہم لوگ ہوتے ہیں۔ مثلاً "گریجویٹ درزی ہاؤس" یا "سٹوڈنٹوں کے لیے نادر موقع" یا "کہتی ہے ہم کو خلق خدا غائبانہ کیا"۔ رفتہ رفتہ گھر کی چار دیواری ایک مکمل ڈائرکٹری کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ دروازے کے اوپر بوٹ پالش کا اشتہار ہے۔ دائیں طرف تازہ مکھن ملنے کا پتہ مندرج ہے۔ بائیں طرف حافظے کی گولیوں کا بیان ہے۔ اس کھڑکی کے اوپر انجمن خدامِ ملت کے جلسے کا پروگرام چسپاں ہے۔ اس کھڑکی پر کسی مشہور لیڈر کے خانگی حالات بالوضاحت بیان کر دیے گئے ہیں۔ عقبی دیوار پر سرکس کے تمام جانوروں کی فہرست ہے اور اصطبل کے دروازے پر مس نغمہ جان کی تصویر اور ان کے فلم کے محاسن گنوا رکھے ہیں۔ یہ اشتہارات بڑی سرعت سے بدلتے رہتے ہیں اور ہر نیا مژدہ اور ہر نئی دریافت یا ایجاد یا انقلابِ عظیم کی ابتلا چشم زدن میں ہر ساکن چیز پر لیپ دی جاتی ہے۔ اس لیے عمارتوں کی ظاہری صورت ہر لمحہ بدلتی رہتی ہے۔ اور ان کے پہچاننے میں خود شہر کے لوگوں کو بہت دقت پیش آتی ہے۔

لیکن جب سے لاہور میں دستور رائج ہوا ہے کہ بعض بعض اشتہاری کلمات پختہ سیاہی سے خود دیوار پر نقش کر دیے جاتے ہیں۔ یہ دقت بہت حد تک رفع ہو گئی ہے۔ ان دائمی اشتہاروں کی بدولت اب یہ خدشہ نہیں کہ کوئی شخص اپنا یا اپنے کسی دوست کا مکان صرف اس لیے بھول جائے کہ پچھلی مرتبہ وہاں چار پائیوں کا اشتہار لگا تھا اور لوٹتے وقت وہاں اہالیانِ لاہور کو تازہ اور سستے جوتوں کا مژدہ سنایا جا رہا ہے۔ چنانچہ اب وثوق سے کہا جا سکتا ہے۔ کہ جہاں بحروفِ جلی "محمد علی دندان ساز" لکھا ہے۔ وہ اخبار انقلاب کا دفتر ہے۔ جہاں "بجلی پانی کا بڑا ہسپتال" لکھا ہے۔ وہاں ڈاکٹر اقبال رہتے ہیں۔ "خالص گھی کی مٹھائی" امتیاز علی صاحب تاج کا مکان ہے۔ "ڈکشن بوٹی کریم" شالامار باغ کو اور "کھانسی کا مجرب نسخہ" جہانگیر کے مقبرے کو جاتا ہے۔

صنعت و حرفت ۔ اشتہاروں کے علاوہ لاہور کی سب سے بڑی صنعت رسالہ بازی اور سب سے بڑی حرفت انجمن سازی ہے۔ ہر رسالے ہر نمبر عموماً خاص نمبر ہوتا ہے۔ اور عام نمبر صرف خاص خاص موقعوں پر شائع کیے جاتے ہیں۔ عام نمبر میں صرف ایڈیٹر کی تصویر اور خاص نمبروں میں مس سلوچنا اور مس کجن کی تصاویر بھی دی جاتی ہیں۔ اس سے ادب کو بہت فروغ نصیب ہوتا ہے۔ اور فنِ تنقید ترقی کرتا ہے۔

لاہور کے ہر مربع انچ میں ایک انجمن موجود ہے۔ پریزیڈنٹ البتہ تھوڑے ہیں۔ اس لیے فی الحال صرف دو تین اصحاب ہی یہ اہم فرض ادا کر رہے ہیں۔ چونکہ ان انجمنوں کے اغراض و مقاصد مختلف ہیں۔ اس لیے بسا اوقات ایک ہی صدر صبح کسی مذہبی کانفرنس کا افتتاح کرتا ہے۔ سہ پہر کو کسی سینما کی انجمن میں مس نغمہ جان کا تعارف کراتا ہے۔ اور شام کو کسی کرکٹ ٹیم کے ڈنر میں شامل ہوتا ہے۔ اس سے ان کا مطمحِ نظر وسیع رہتا ہے۔ تقریر عام طور پر ایسی ہوتی ہے۔ جو تینوں موقعوں پر کام آ سکتی ہے۔ چنانچہ سامعین کو بہت سہولت رہتی ہے۔

پیداوار ۔ لاہور کی سب سے مشہور پیداوار یہاں کے طلبا ہیں جو بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اور ہزاروں کی

تعداد میں دساور کو بھیجے جاتے ہیں۔ فصل شروع سرما میں بوئی جاتی ہے اور عموماً اواخر بہار میں پک کر تیار ہوتی ہے۔
طلبا کی کئی قسمیں ہیں جن میں سے چند مشہور ہیں۔ قسم اول جمالی کہلاتی ہے۔ یہ طلبا عام طور پر پہلے درزیوں کے ہاں تیار ہوتے ہیں ازاں دھوبی اور نائی کے پاس بھیجے جاتے ہیں۔ اس عمل کے بعد کسی ریستوران میں ان کی نمائش کی جاتی ہے۔ غروب آفتاب کے بعد کسی سینما کے گرد و نواح میں [illegible]

[illegible] کے لئے مستعمل رکھا [illegible] اور حیرت ہے کہ ہمیں یاد [illegible] جاتا ہے۔
قسمیں بھی ہوتی ہیں۔ لیکن سب کی تصویر ایک سنہرے فریم میں جڑ کر کے اپنے پاس رکھ چھوڑتے ہیں اور تعطیلات میں ایک ایک کو خط لکھتے رہتے ہیں۔ دوسری قسم جلالی طلبا کی ہے۔ ان کا شجرہ جلال الدین اکبر سے ملتا ہے۔ اس لئے ہندوستان کا تخت و تاج ان کی ملکیت سمجھا جاتا ہے۔ شام کے وقت چند مصاحبوں کو ساتھ لئے نکلتے ہیں اور جود و سخا کے خم لنڈھاتے پھرتے ہیں۔ کالج کی خوراک انہیں راس نہیں آتی۔ لئے ہوسٹل میں فروکش نہیں ہوتے۔ تیسری قسم خیالی طلبا کی ہے۔ یہ اکثر مذہب اور اخلاق اور آواگون اور جمہوریت پر باآواز بلند تبادلۂ خیال کرتے پائے جاتے ہیں۔ اور آفرینش اور نفسیات جنسی کے متعلق نئے نئے نظریے پیش کرتے رہتے ہیں۔ صحت جسمانی کو ارتقائے انسانی کے ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لئے علی الصباح پانچ چھ ڈنڑ پیلتے ہیں اور شام کو ہوسٹل کی چھت پر گہرے سانس لیتے ہیں۔ گاتے ضرور ہیں۔ لیکن بے سرے ہوتے ہیں۔ چوتھی قسم خاکی طلبا کی ہے۔ یہ طلبا کی خالص ترین قسم ہے۔ ان کا دامن کسی قسم کی آلائش سے تر ہونے نہیں پاتا۔ کتابیں، امتحان، مطالعہ اور اسی قسم کے خرخشے کبھی ان کی زندگی میں خلل انداز نہیں ہوتے۔ جس معصومیت کو ساتھ لے کر کالج میں پہنچے تھے، اسے آخر تک ملوث نہیں ہونے دیتے۔ اور تعلیم اور نصاب اور درس کے ہنگاموں میں اس طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ جس طرح بتیس دانتوں میں زبان رہتی ہے
پچھلے چند سالوں سے طلبا کی ایک اور قسم دکھائی دینے لگی ہے۔ لیکن ان کو اچھی طرح سے دیکھنے کے لئے محدب شیشے استعمال ضروری ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ریل کا ٹکٹ نصف قیمت پر ملتا ہے اور اگر چاہیں تو اپنی انا کے ساتھ زنانے ڈبے میں سفر کر سکتے ان کی وجہ سے اب یونیورسٹی نے کالجوں پر شرط عائد کر دی ہے کہ آئندہ صرف وہی لوگ پروفیسر مقرر کئے جائیں جو دودھ پلانے والے جا
میں سے ہوں۔

طبعی حالات: ۔ لاہور کے لوگ بہت خوش طبع ہیں۔

سوالات

۱۔ لاہور تمہیں کیوں پسند ہے؟ مفصل لکھو۔
۲۔ لاہور کس نے دریافت کیا اور کیوں؟ اس کے لئے سزا بھی تجویز کرو۔
۳۔ میونسپل کمیٹی کی شان میں ایک قصیدہ مدحیہ لکھو۔

یہ مضامین بروقت نہ ملنے کی وجہ سے ترتیب سے بچھڑ گئے ہیں۔ اس لیے بہ امر مجبوری یہاں درج کیے جاتے ہیں

"غنچۂ تبسم" کے دیباچوں پر ایک نظر

نیازمندانِ لاہور

حال ہی میں تمکین کاظمی صاحب کے مضامین کا مجموعہ موسوم بہ "غنچۂ تبسم" حیدرآباد دکن سے شائع ہوا ہے۔ کتاب کے شروع میں پانچ دیباچے ہیں۔ ایک دیباچہ کاظمی صاحب کا اپنا لکھا ہوا ہے۔ باقی چار دیباچے چار دیگر مشاہیر روزگار کے لکھے ہوئے ہیں۔

کچھ عرصے سے دیکھ رہے ہیں کہ دیباچوں کا مرض ہندوستان میں بڑھ رہا ہے۔ کوئی کتاب شائع کرتا ہے تو کسی سے دیباچہ لکھواتا ہے جو ادبی قسم [illegible] اس کا تعارف کراتا ہے۔ مطلب اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ [illegible] جگہیں [illegible] کہا جا سکتا ہے کہ ملک میں ابھی جہلا کی کثرت ہے اور ہمارے [illegible] اتنی دقیق [illegible] سمجھتے ہیں [illegible] ایک مصنف کے نکات [illegible] مصنف بجز اشاعت لوگوں کے سامنے لا کے [illegible] نوعِ انسان کی ایک بہت بڑی تعداد اس کے فیض سے محروم رہ جاتی۔ لیکن "غنچۂ تبسم" کے لکھنے کے [illegible] زبان کا [illegible] رسالہ [illegible] میں ادب کے [illegible] رہے ہے۔ تمکین کاظمی صاحب کے نام اور ان کے ادبی کارناموں سے ہندوستان کا پڑھا لکھا آدمی کم و بیش واقف ہے کیا ان کی اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ جب تک چار پانچ آدمی انہیں نہ کہیں وہ نقل و حرکت نہیں کر سکتے؟

اور پھر دیکھتے ہیں کہ اس سے نہ تو تمکین صاحب کی شان سخن طرازی میں کوئی اضافہ ہوتا ہے، دیباچہ نویسوں کی شان سخن فہمی کی داد [illegible] ہوتی ہے البتہ [illegible] اس [illegible] اصول پر روشنی ضرور پڑتی ہے کہ "تا مرد سخن نگفتہ باشد، عیب و ہنرش نہفتہ باشد۔" یہ شعر [illegible] شیخ سعدی کی [illegible] ہم بہرحال ناظرین و قارئین کے [illegible] کے چند غیر معروف [illegible] اردو دیباچہ نویس حضرات بہرحال اپنی قسم [illegible] کے بعض بزرگ [illegible] میں سے ہیں [illegible] اس شعر میں شیخ سعدی کہہ گئے ہیں ہم اپنے الفاظ میں زیادہ تحقیق، زیادہ زور اور زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کرنے والے ہیں

پہلا دیباچہ تمکین کاظمی صاحب نے بقلم خود لکھا ہے لیکن اسے دیباچہ نہیں کہا "سر آغاز" کا لقب عطا فرمایا ہے۔ دوسرے دیباچے کا نام "اعلام" تیسرے کا نام "تاثر" چوتھے کا نام "تعارف" اور پانچویں کا نام "تقریب" ہے۔ (ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ چھٹا دیباچہ نہ لکھوانے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے لئے اس طرح کا مقفیٰ نام نہ مل سکا ہوگا) یہ [illegible] الفاظ کتاب میں جا بجا پائی جاتی ہے۔ فہرست مضامین کو [illegible] لکھا گیا ہے کتاب کا تفسیری عنوان "مجموعہ نگارشات" [illegible] ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جدت کے پیچھے یوں ہی ہاتھ دھو کے پڑنا تھا تو صفحے کی بجائے "چہرۂ قرطاس" اور "سطر" کے بجائے [illegible] کی بجائے [illegible] اور قیمت کی بجائے "نذرانہ" یا "ہدیہ" کیوں نہ لکھ دیا۔ اگر محض الفاظ کی دہشت ناکی سے مرعوب کرنا مقصود ہو تو پھر قاموس کے بعد کسی اور کتاب کے لکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ البتہ اگر ان عنوانات میں یہ خوبی ہے کہ ہر ایک کے اعداد سے کتاب کی تاریخ نکلتی ہے

تو یہ بھی سہی

اب تو تمکین صاحب کے "سرآغاز" کا ذکر رہ گیا ہے۔ چار دیباچوں میں اپنی تعریف کروانے کے بعد بھی تمکین صاحب کی تسکین نہ ہوئی تو انہوں نے خود قلم اٹھایا۔ شروع میں آنکھ بچا کر "بنام خداوند بخشائش گر مہربان" لیکن اللہ کا نام لینے کے بعد سنبھالا لیا اور تین صفحوں تک انا ہی انا لکھتے چلے گئے۔ جابجا تاریخوں کا حوالہ ساتھ ساتھ دیا ہے تاکہ زمانہ آئندہ کے مورخ کو کوئی دقت پیش نہ آئے۔ ۱۹۲۶ء میں میں نے یہ کیا ۱۹۲۹ء میں میں نے یہ کیا۔ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۱ء میں مصروف زیادہ رہنا پڑا اور اولیٰ اللہ" مختلف رسائل نے مضامین لکھنے کے علاوہ تمام مضمونوں کے نام بھی درج کر دیئے گئے ہیں۔ فرماتے ہیں ـــ

"بعض مضامین کی زبان پر اکثر احباب کو اعتراض ہوگا کیونکہ اکثر جگہ میں نے عمداً دکنی زبان اور محاورہ استعمال کرنے کی کوشش کی ہے اور خصوصاً ان مضامین میں زیادہ کوشش کی گئی ہے، جو حیدرآباد کے رسائل میں طبع ہوئے ہیں یا جن مضامین میں حیدرآباد کی تمدن و معاشرت کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے۔"

یہ جو بجا "کوشش" کے الفاظ پر ہم نے خط خود اس لئے کھینچ دیئے ہیں کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ تمکین صاحب نے کتنی دفعہ اور کس خوب صورتی سے کوشش کی ہے۔ ہم سا بھی جملے غالباً اسی طرح لکھتے ہیں۔ اگر تمکین صاحب کسی طرح کی چٹپٹی اردو لکھنے پر مصر ہیں تو ہم ان کو یہی مشورہ دیں گے کہ "ترا ملک دکن تو دکھنی بول" لیکن تمکین صاحب کی انانیت اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ وہ اس طرح کی گل افشانی کے بعد بھی فرماتے ہیں۔

"میری مادری زبان اردو ہے اور میں نے اردو کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔"

نہ صرف یہ بلکہ لکھتے ہیں،

"میں چاہتا تو ٹھیٹھ یوپی کے محاورات استعمال کر سکتا تھا۔"

اس تبحر علمی اور اس قادر الکلامی کے باوجود صرف ایک فقرے میں اتنی کوششیں بلکہ کاوشیں کرنے کی ضرورت پھر آخر کیوں پیش آئی؟

تمکین صاحب نے اپنی کتاب میں جو دکنی الفاظ استعمال کئے ہیں ان کے متعلق دیباچے میں فرماتے ہیں،

"بعض احباب کا خیال تھا کہ آخر میں ایک فرہنگ لگا دی جائے مگر میں اس بدذوقی کا مخالف ہوں جنہیں ضرورت ہوگی وہ کسی حیدرآبادی سے پوچھ لیں گے یا مجھ سے دریافت کر لیں گے:"

الحمدللہ کہ آپ کو بھی خوش مذاقی کا خیال آیا۔ کیوں حضرت ایک کتاب کے چار چار دیباچے بدمذاقی نہیں؟ ہر دیباچہ میں اپنی تعریف بلکہ بعض اوقات اپنی ذات گرامی کا عکس چھپوا دینا بدمذاقی نہیں؟ ہر نوٹ میں بار بار اپنی طرف اشارہ کرنا بدمذاقی نہیں؟ لیکن جو الفاظ کسی لغت میں نہ پائے جاتے ہوں ان کے معنی بتا دینا بدمذاقی ہے۔ کیا آپ کو کوئی ایسا دوست نہ ملا جو یہ کام بھی کر دیتا۔ جہاں اتنے گوناگوں دلفریب عنوان قائم کئے گئے وہاں دکنیات کا ایک اور عنوان بھی بڑھا دیتے۔ باقی رہی آپ کی خوش مذاقی سو اس کا ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو۔ اپنے کاتب کے متعلق فرماتے ہیں کہ زود نویس ہیں مگر،

"حد درجہ غلط نویس اور بے انتہا غیر پابند نہایت کم سواد ہیں جنہوں نے املے کی غلطیوں کے علاوہ جملے کے جملے چھوڑ دیئے۔"

دل کی بھڑاس بھی نکالی تو بے چارے کاتب پر جسے عالم ہونے کا دعویٰ نہ فاضل ہونے کا اور فقرے کے واسطے یہ تو بتایئے کہ یہ "ہائے

کی تعیین" جو آپ نے لکھا ہے تو یہ کاتب نے غلط کتابت کی یا آپ نے دکنی سمجھ کے مسودے کے مطابق لکھا؛ اور کاتب صاحب کی کم سوادی کرا تو آپ کہاں کہاں پیش کرتے پھریں گے۔ کیا ارنسٹ کے ترجمے میں "ایعین" کو ہر جگہ "ایلزمان" لکھا بھی کسی نے مرتب کیے؟ کم سوادی کوئی ایسی خاص صفت نہیں کہ صرف کاتبوں ہی میں پائی جاتی ہو۔

مولانا نیاز فتحپوری کے "اعلام" سے متعلق ہم حیران ہیں کہ کیا کہیں اور کیا کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھیں۔ تین مختصر صفحوں کے اندر انہوں نے اپنی کم علمی، پریشان خیالی اور غلط نگاری کی اتنی مثالیں جمع کر دی ہیں کہ اس سے بہتر جامعیت کی مثال اردو میں مشکل سے ملتی ہے۔ دیباچے کا آغاز یوں ہوتا ہے،

> "نمونۂ تبسم" جناب تمکین کاظمی کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو ظرافت کے سلسلے میں انہوں نے لکھے ہیں۔ چونکہ میں طنزیات اور مزاحیات دونوں کو ظرافت میں شامل کرتا ہوں اس لئے میرا مقصود یہ ہے کہ دونوں رنگ کے مضامین اس مجموعے میں نظر آتے ہیں"

نیاز صاحب خود ہی بتائیں کہ "ان مضامین کا مجموعہ ہے جو ظرافت کے سلسلے میں انہوں نے لکھے ہیں" کتنا بھونڈا فقرہ ہے۔ "سلسلے" کا لفظ جس طرح سے انہوں نے استعمال کیا ہے انتہا درجے کی بے مزہ بیانی کی دلیل ہے۔ ہم اصلاح تو دے نہیں سکتے لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ پہلے فقرے کو یوں لکھنا چاہئے تھا

> "نمونۂ تبسم" جناب تمکین کاظمی کے ظرافتی مضامین کا مجموعہ ہے۔"

اور یہ جو طنزیات اور مزاحیات کو ظرافت میں شامل کرکے انہوں نے بڑے بڑے جودت سے ہم حیوانات کے سر جوڑنے کی کوشش فرمائی ہے۔ اس پر ہمیں ایک کہانی یاد آئی۔ علم ریاضی کے ایک پروفیسر اپنی ماں پر ناراض ہوئے۔ دل غصے سے بھرا ہوا تھا لیکن چونکہ کبھی گالی دینے کی عادت نہ تھی اس لئے اظہارِ ناراضگی کے لئے موزوں الفاظ نہ ملے لیکن ماں کو ڈانٹنا بھی لازم تھا چنانچہ بھنّا کر بولے "تم بڑی مثلث متساوی الاضلاع ہو"۔ بیچاری بک کر رہ گئی۔

یہی حال نیاز صاحب کے اس فقرے کا ہے۔ جب انہوں نے نہایت زور سے کہہ دیا کہ میں الف بے کو جیم میں شامل کرتا ہوں تو کسی کی اب کیا مجال کہ کچھ بولے۔ نیاز صاحب نے اپنے دماغ پر آنچ بھی نہ آنے دی، اور یہاں علم و فضل کا رعب بھی پڑ گیا۔ خود ہی اصطلاحات گھڑیں۔ ان کے مفہوم کو بھی اپنے بطن کے اندر ہی رہنے دیا اور جس میں جس کو جی چاہا شامل کرتے رہے۔ اگلا فقرہ ملاحظہ ہو۔

> "اس وقت یورپ کا کوئی شعبۂ علم ایسا نہیں جس میں یہ مخصوص طرزِ تحریر (یعنی ہیومر) مقبول نہ ہو، خصوصیت کے ساتھ تنقید، کہ اس کی تکمیل ہی نہیں ہو سکتی جب تک اس میں ظرافت کا گہرا رنگ شامل نہ ہو۔"

(کیوں حضرت یہ یورپ کا ذکر بھی اسی دل لبھانے کے سلسلے میں کر گئے؟) اگر علم کے لفظ کا استعمال نیاز صاحب نے غلط نہیں کیا تو یقیناً فلسفہ، ریاضی، علم حیوانات، علم نباتات، کیمیا، جغرافیہ، طبیعیات، سبھی چیزیں شامل ہیں۔ خدا جانے نیاز صاحب کو ان علوم کی کون سی ایسی کتابیں دستیاب ہوئی ہیں جو لطیفوں اور چٹکلوں سے بھری پڑی ہیں؟ باقی رہی تنقید۔ نیاز صاحب کا ارشاد ہے کہ ظرافت کے بغیر اس کی تکمیل ہی ناممکن ہے گویا اگر ایک بھی قابلِ قدر نقاد ہم انہیں ایسا بتا دیں جو ظرافت سے عاری ہو تو ان کا یہ دعوے پوچ ثابت ہو جائے گا۔ چونکہ نیاز صاحب کا فقرہ "اس وقت" سے شروع ہوتا ہے اس لئے ہم صرف دورِ حاضرہ اور اختصار کی غرض سے صرف انگریزی کے نقادوں کو پیشِ نظر رکھیں گے ان میں سے ٹی ایس ایلیٹ، ورجینیا وولف، کیتھرین منسفیلڈ، [illegible]

رے، پیفیر گرڈ، ولسن نائٹ، ولیم برک کی تصانیف خاص طور پر مستند مانی جاتی ہیں۔ اگر نیاز صاحب ان ناموں سے آشنا ہیں تو وہ فرمائیں کہ ان میں سے کون مزاحیہ نگار ہے؟ یہ تو ست ادبی نقادوں کی تھی لیکن نیاز صاحب کی مراد شاید سوشل نقادوں سے ہے۔ ایچ جی ویلز نے موجودہ سوسائٹی کی تنقید میں بیسیوں کتب لکھ ڈالیں۔ مسعود سے چند کو چھوڑ کر باقی کسی میں ظرافت کا ایسا جا سا رنگ بھی نہیں پایا جاتا۔ برٹرنڈ رسل جو دنیا کے عظیم ترین فلسفروں میں سے ہے اور جس نے موجودہ سوسائٹی کے کئی پہلوؤں سے نکتہ چینی کی ہے، بھولے سے بھی کبھی مزاحیات میں قدم نہیں رکھتا۔ نیاز صاحب نے جو اتنی بڑی بات منہ سے نکال دی اور یورپ اور امریکہ کے شعرا علما اور تنقید نگاروں کی ہر بات میں اپنی ٹانگ اڑا دی آدھ کوس جہالت کا اپنا مخاطب بنا رہے گئے؟ ایسی باتیں آدمی دوستوں کی صحبت میں کر لینی چاہییں۔ ان کو سپرد قلم کر کے تمام ہندوستان میں ان کی نشر و اشاعت کرنا دوسروں کے پیچھے میں ہاتھ ڈالنا ہے۔

یہ تو نیاز صاحب کے مطالعے کا حال تھا۔ اب ان کی انشا پردازی کا کمال ملاحظہ ہو سکتے ہیں:—

"جب تمکین کاظمی نے حال ہی میں اس رنگ کو اختیار کیا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ انکشاف بھی ہوا ہے کہ وہ اس صنف ادب (یعنی ظرافت نگاری) پر بھی لکھنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔"

یہ نیاز صاحب نے خوب لکھا۔ مراد یہ تھی کہ تمکین صاحب ہیومر لکھتے ہیں لیکن فقرے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تمکین صاحب ہیومر پر لکھتے ہیں (یعنی ہیومر پر تنقید و تبصرہ کرتے ہیں)۔ فقرہ بہرحال مہمل ہے لیکن اگر نیاز صاحب کے الفاظ میں کم سے کم تغیر و تبدل کر کے اصلاح دی جائے تو یوں ہونا چاہیے تھا:

"وہ اس صنف ادب میں بھی لکھنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔"

نہ یہ کہ وہ "اس صنف ادب پر بھی لکھنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔" اس صنف ادب "پر" لکھنے کی قابلیت تو خدا نے نیاز صاحب کو ہی عطا فرمائی ہے چنانچہ فرماتے ہیں:—

"فکاہی مضامین کی سب سے بڑی خوبی محاکات اور تجزیۂ جذبات کہلاتی ہے۔ سو ان دونوں کی اچھی اچھی مثالیں اس مجموعہ میں نظر آتی ہیں۔"

دوسرے فقرے میں "دونوں" کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور پہلے فقرے میں واحد کا صیغہ۔ بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست۔ نیاز صاحب کا قول ہے کہ: "جو محاورے یا اصطلاحات کہ ابتدا سے کانوں میں پڑے ہیں ان کے خلاف اگر کوئی آواز کان میں آ جاتی ہے تو تھوڑی دیر کے لیے سماعت مشوش ہو جاتی ہے۔" ہم نیاز صاحب کی خدمت میں درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنی شیر خوارگی کے زمانے کو یاد کریں۔ پھر اس فقرے کو پڑھیں اور پھر ہمیں بتائیں کہ ان کی سماعت کو تشویش محسوس ہوتی ہے یا ہر طرح سے خیریت معلوم ہوتی ہے۔ کیا یہاں "خوبی" کی بجائے "خوبیاں" اور "ہے" کی بجائے "ہیں" نہ ہونا چاہیے؟

لیکن اس بات کو جانے دیجیے۔ یہ زبان کا مسئلہ ہے۔ اس میں اُن اہلِ زبان ہی کو آپس میں نبٹنے دیجیے جو صبح و شام اپنی زبان دانی کا ڈھول بجاتے رہتے ہیں۔ فقرے کے مفہوم پر غور کیجیے۔ نیاز صاحب نفسیات کا ایک مسئلہ بیان کر گئے ہیں اور کمال یہ ہے کہ بغیر سوچے سمجھے بیان کر گئے ہیں۔ کس بھولے پن سے فرماتے ہیں کہ "فکاہی مضامین کی بڑی خوبی محاکات اور تجزیہ کہلاتی ہے۔" "کہلاتی ہے" کی بھی ایک ہی کہی۔ یہ نہ بتایا کہ کون کہتا ہے۔ بس کہہ دیا کہ کہلاتی ہے خود بھی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے اور اس اجمال سے اثر بھی پیدا کر لیا کہ گویا ہم نے بڑے بڑے اہل الرائے کے خیالات کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ اب ہم تم اَن پڑھ لوگوں کے سامنے کس کس فلاسفر کا نام لیں تمہارے لیے اتنا کافی ہے کہ کہلاتی ہے) افسوس نیاز صاحب نے یہ نہ بتایا کہ فکاہی مضامین کی بڑی بڑی خوبیوں کی تخصیص انہوں نے کیسے کر لی؟ نہ انہوں نے کوئی مثال پیش کی ہے نہ دلیل [illegible]

سے کیسے بھاگیا چلتے چلتے فنِ تنقید کی شاہراہ پر ایک سنگِ میل ہی تو نصب کر لئے ہیں۔ اس بے سود بات کی تردید کا کس طرح لے؟ البتہ اگر نیاز صاحب کبھی اس موضوع پر کوئی علیحدہ مضمون لکھیں اور اس میں اس دعوے کو ثابت کرنے کی کوشش کریں تو انشاء اللہ بشرطِ فرصت اس کا جواب عرض کیا جائے گا۔ تاہم ان سے کہہ دیتے ہیں کہ وہ اس قسم کا مضمون لکھنے سے پیشتر برگسوں کی کتاب "موسمِ بہار و خندہ" یا میرڈیتھ کا مضمون مزاح کسی سے پڑھوا لیں کہ ان سے بہتر اس موضوع پر کم لوگوں نے لکھا ہے۔ حیرت ہے کہ نیاز صاحب جو بہت سے مضامینِ علم کو جانتے ہوئے بھی ان کتابوں سے ابھی تک واقف نہیں۔ یہ ہم نے اس لئے فرض کر لیا کہ اگر انہوں نے ان دو مضمونوں کا مطالعہ کیا ہوتا تو کم از کم ایسی بہکی بہکی باتیں نہ کہتے۔ ہم اور ہم جیسے کئی (مشق ابھی مدرسوں کی ابتدائی جماعتوں میں تعلیم پا رہے تھے۔ نیاز صاحب کا آفتابِ شہرت نصف النہار پر تھا۔ لیکن افسوس کہ اس کہنہ مشقی کے مقابلے میں انہیں اپنی ذمہ داری کا احساس بہت کم ہے جس موضوع پر وہ قلم اٹھاتے ہیں ان کا دائرہ ماشاء اللہ روز بروز وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ کاش ان کے شوقِ افق پروازی کے ساتھ ساتھ ان کا علم بھی وسیع ہوتا رہتا۔ یا کم از کم وہ اپنے شوق کی جولانیوں کو اپنے دائرۂ علم تک ہی محدود رکھتے تو بہت بہتر ہوتا۔

"تاثرات" مولانا احسن مارہروی کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہے۔ اس دیباچے میں صرف ایک ہی خوبی ہے وہ یہ کہ مختصر ہے۔ رشحات میں علم الاصوات کے ایک نہایت ہی سہل اور پیش پا افتادہ مسئلے کو ذکر ہو جانے تو معنی کی بات بن جاتے ہیں، بڑے طمطراق کے ساتھ لکھی گئی پھیلا پھیلا کر ایک دو تین چار سطروں سے کر بیان کیا ہے اور سیدھی سادھی بات کو دو اخوبیاں ہے کر آشفتہ بیانی کا سینٹ کے لئے احسن مارہروی کا طرزِ ادائیگی بنا دیا ہے۔ اقتباس لکھنے سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ ہم انہیں کے الفاظ میں دہرائے دیتے ہیں (ناظرین سے درخواست ہے کہ مندرجہ ذیل فقرے کو ذرا غور سے پڑھیں)

> "غرض یہ ہے کہ ہر زبان اپنے مراتبِ تربیت میں مختلف نوعیتیں رکھتی ہے اور اس کی تدریجی عام ٹنگ
> عام تصنیف و تالیف، سیاسی لکچر، منبری مواعظ، روزمرہ بات چیت میں ایک دوسرے سے
> جداگانہ نظر آتی ہے۔ ان سب مراحل کے بعد تقریر و تحریر کی متانت و ظرافت ایک وسعت خاص
> ظاہر کرتی ہے جو ہماری زبان میں تفننِ طبع کے لئے مزدوری اور جزوِ لاینفک ہیں۔"

احسن صاحب علی گڑھ میں پروفیسر ادبیات ہیں۔ علی گڑھ میں نکتہ رس، قابل، ذہین اور زبان دان حضرات کی کمی نہیں۔ خدا کے لئے ان میں سے کوئی صاحب اس غالی زبان کا اردو میں ترجمہ کر کے ہمیں اس کا مطلب سمجھا دیں۔ ان دو فقروں میں صرف اور نحو کی کئی غلطیاں ہیں۔ کئی الفاظ کا استعمال معنوی اعتبار سے غلط ہے لیکن اس کو گنوانے سے کیا فائدہ؟ تمکین صاحب خود ہی فرمائیں کہ کیا وہ اس فقرے کا مفہوم سمجھتے ہیں۔ اور اگر سمجھتے ہیں تو کیا انہوں نے خود ہی سمجھ لیا تھا یا کسی جوتشی سے اس کے معنی پوچھے ہیں۔ کیا سلاست، شگفتگی اور روانی اسی کا نام ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ادبیات کے پروفیسر ایسی زبان لکھتے ہوں بہرحال احسن صاحب کی پروفیسریت کے سامنے ہم کو ہر فقرہ اس زور سے رانوئے ادب تہ کرتا ہے کہ مطلب تڑپ کر باہر نکل جاتا ہے اور مفعول میں گھٹے پڑ جاتے ہیں۔ اسی انداز کے ایک دو صفحے لکھ کر پروفیسر صاحب نے دیباچے کا خاتمہ ایک شعر پر کیا ہے۔

ہے غنچۂ تبسم تمکین کاظمی
ایسا مذاق جس میں منت نہ لازمی

جس طرح احسن صاحب پروفیسر ادبیات کے دیباچے میں صرف ایک ہی خوبی ہے کہ مختصر ہے اسی طرح احسن صاحب تلمیذ حضرت داغ کے شعر میں صرف ایک ہی خوبی ہے کہ تقطیع سے نہیں گرتا ورنہ کیا دیباچہ اور کیا شعر، کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست۔ احسن صاحب سے ہم اور کیا کہیں، صرف اتنا عرض کرتے ہیں کہ اگر لازمی کا لفظ آنا ایسا ہی لازمی تھا تو کاظمی کو کازمی تو لکھ لیا ہوتا کہ اس سے شعر کی حیثیت میں کوئی فرق نہ آتا۔

دیباچہ نمبر ۲ ملا رموزی صاحب کا لکھا ہوا ہے۔ ملا رموزی بھی تمکین صاحب کی طرح اپنے نام کے ساتھ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن) لکھتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ کوئی علمی سند نہیں محض چندہ دیتے رہنے کی علامت ہے جیسے کہ ہندوستان میں ولایت نہ جاتے ہوئے بھی۔ گو کہ سب ایم۔ آر۔ اے۔ ایس ہو سکتے ہیں۔ اہل دانش کے نزدیک اس کی وقعت آر۔ ایس۔ وی۔ پی سے بھی کم ہے اور بھی بہت لوگ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس کے مدخط و مدعانی نے اور لندن اس التزام سے لکھتے ہیں گویا کہ اس جارج پنجم کے دست مبارک سے سند پائی ہے ان سے ہماری درخواست ہے کہ ابوذری کا یہ شیوہ ترک کر دیں اور سنہ سال سے اپنے نام کے ساتھ یہ بے معنی حروف لکھنا چھوڑ دیں۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن) لکھنے کو تو مبارک (شکارپور) لکھنا زیادہ قدر افزائی کا موجب ہوگا۔

ملا رموزی صاحب کا دیباچہ بھی اسی بے ربطی کا آئینہ ہے جس کا اظہار انہوں نے اپنی لاہور والی تقریر میں کیا تھا نیاز صاحب کی طرح ملا رموزی صاحب نے بھی ظرافت نگاری پر افکار عالیہ کا اظہار کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

> ظریفانہ تحریر وہ جو پڑھنے والے کو اس موقع پر ہنسا دے جہاں ہنسنے کے لئے اس کا دل نہ چاہتا ہو۔
> اور ظریف وہ جو مدت سے ہنسی پیدا کرنے والی تحریر لکھتا چلا جائے اور یہ نہ سمجھے کہ میں ظریفانہ
> تحریر لکھ رہا ہوں۔"

ماشاءاللہ کیا حقائق بیان کئے جناب نے! ظریفانہ تحریر وہ جو پڑھنے والے کو ہنسا دے۔ (یہ نکتہ ابتدائے آفرینش سے آج تک کسی کے وہم میں نہ آیا تھا۔ کہ بیسویں صدی میں ایک ملا رموزی پیدا ہوں گے تو اسے معرض ظہور میں لائیں گے) ظریف وہ ہے جس کی تحریر پر ہنسی تو آئے لیکن وہ یہ نہ سمجھے کہ میں ہنسا رہا ہوں اگر یہ صحیح ہے تو ہر بچہ سے بڑا بے وقوف، ہر نادان بچہ، ہر غلط سلط اردو بولنے والا انگریز ظریف ہے کیونکہ ان لوگوں کو اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ ہم ہنسا رہے ہیں اور اگر ان کی باتیں بعینہ لکھ لی جائیں تو ہنسی کا سامان بھی فراہم ہو جاتا ہے۔ ملا رموزی دراصل کہنا کچھ چاہتے تھے منہ سے نکل کچھ گیا (دیباچہ نویسوں میں یہ نقص اکثر پایا جاتا ہے) مطلب ان کا یہ تھا کہ ظریف وہ ہے جس کی تحریر پر ہنسی تو آئے لیکن اس میں ہنسانے کی کوشش نمایاں طور پر ظاہر نہ ہو۔ یہ معیار ایک حد تک صحیح ہے لیکن افسوس کہ ملا رموزی خود اس معیار پر پورے نہیں اترتے۔ دیباچے کا پہلا ہی فقرہ پڑھئے

> "اگر کوئی سے کے بار بار گہری اور تہذیب کے بار بار چوڑی نظر سے دیکھا جائے تو . . . ."

اخلاق کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اس فقرے کو ظریفانہ فقرہ سمجھ کر ایک قہقہہ لگا دیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ہمارے اخلاق کی بہت بڑی آزمائش ہے ملا رموزی صاحب بہت لکھنے کو انشا پردازی کا سب سے بڑا کمال سمجھتے ہیں چنانچہ اسی لئے اپنے اور تمکین صاحب اور سالک صاحب کے مداح ہیں فرماتے ہیں :-

> "ہم تو مولوی تمکین کاظمی کی مضمون نگاری کے قائل ہوئے تو اسی لئے کہ انہیں جب دیکھا یہی
> کہ بس لکھ رہے ہیں اور چھپوا رہے ہیں۔"

ملا رموزی صاحب نے خود بھی مدت سے یہی شیوہ اختیار کر لیا ہے کہ بس لکھ رہے ہیں اور چھپوا رہے ہیں اس سے حضرت ضیاءالملک کی نظر انتخاب بہت کمزور ہو گئی ہے جب مضمون نگاری کا معراج یہی فرض کر لیا جائے کہ انسان روزانہ دو تین سو مضمون لکھ ڈالے تو وزن پورا کرنے کے لئے ادھر ادھر کی بے ربط باتیں کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

رموزی صاحب نے اس دیباچے میں کئی جگہ بدذوقی کا ثبوت دیا ہے لیکن چونکہ انہوں نے دیباچہ ظریفانہ رنگ میں لکھنے کی کوشش کی

ہے اس لئے ہم ایسی باتوں کو مذاق سمجھ کر ان سے درگذر کرتے ہیں۔ البتہ ایک بدذوقی ایسی ہے کہ خوش ظرافت بھی اسے اپنے دامن میں پناہ نہیں دے سکتا۔ انہوں نے سہا صاحب کا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے صد درجہ قابلِ نفریں ہے۔ کسی شخص کے جسمانی نقائص کی ہنسی اڑانا خواہ کسی ایک کتاب کے صفحے پر کسی مہذب طبقے میں جائز نہیں۔ یہی بات ہے تو کل کو آپ اندھوں اور کانوں اور لولوں اور لنگڑوں کی بھی ہنسی اڑائیں گے اور اپنی ظرافت نگاری پر فخر کریں گے۔ یہ ظرافت جہلا کی ظرافت ہے۔ شرفا کے لئے تو بے شمار باتیں ہنسنے اور طنز کرنے کو موجود ہیں۔ ان پر طبع آزمائی کیجئے۔ فاضل الہیات کو کم از کم اخلاقیات سے تو واقف ہونا چاہئے۔

چونکہ یہ دیباچہ رموزی صاحب نے ظرافت آمیز رنگ میں لکھا ہے اس لئے تمکین صاحب کو خیال ہوا کہ ہم بھلا کیوں پیچھے رہ جائیں۔ جہاں جہاں رموزی صاحب نے کوئی مذاق کی بات کی وہیں آپ بھی نیچے ایک نوٹ دے کر دنیا کو یاد دلاتے چلے گئے کہ "اس ہنسی مذاق میں کہیں آپ یہ نہ بھول جائیے۔ ملا صاحب ظرافت نگار سہی، لیکن کتاب تو بہرحال ہماری ہے۔" ملا رموزی نے کہا: "مجھے اس سے کوئی بحث نہیں کہ تمکین صاحب کے اندر مہمان نوازی کی صلاحیت ہے یا نہیں۔" آپ نے اس پر نوٹ چڑھایا کہ "قطعاً صلاحیت نہیں ورنہ حضرت آپ کو حیدرآباد بلاتا۔" (سخن سنج لوٹ لوٹ گئے۔ ہا ہا ہا) ملا صاحب نے کہا "آپ شیروانی کیوں پہنتے ہیں اور کوٹ سے کیوں نفرت ہے؟" آپ نے فوراً نوکِ قلم سے جواب دیا کہ "میں کبھی کوٹ پتلون بھی پہنتا ہوں۔" (ہا ہا ہا) ملا صاحب نے کہا "ان مضامین کو حاصل کر کے دوزخ کی آگ سے محفوظ ہو جائیے۔" آپ نے نوٹ ایزاد کیا کہ "مسلمانوں عزت حاصل کرو۔" (ہا ہا ہا) ملا صاحب نے کہا "اللہ انہیں منصب دار بنا دے۔" آپ نے جھٹ تصحیح کی کہ "آپ کی دعا سے منصب تو پہلا ہی بھی ہے۔" (دیگر مرتبہ کمال لوگ فوراً مرعوب ہو گئے۔) سبحان اللہ کیا ادبی پھلجھڑیاں ہیں۔

تقریب کے لکھنے والے مولوی عبدالمنعم صاحب سعیدی بھی تمکین صاحب اور ملا رموزی کی طرح بانگِ دہل ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن) ہیں۔ ان میں صراحتاً انانیت باقی دیباچہ نویسوں کے مقابلے میں کم ہے لیکن کنایتہً ادعائے علم میں یہ بھی ویسے ہی بلند آہنگ ہیں۔ زورِ قلم خودنمائی کی بہ نسبت دوست نوازی میں زیادہ صرف کیا ہے تاہم ایک تمکین صاحب کی عظمت ثابت کرنے کے لئے وکٹر ہیوگو، ہربرٹ سپنسر، میتھیو آرنلڈ، کارلائل، رسکن، لنکن اور ایمرسن کے اقوال نقل کر کے ان مشاہیر کو مفت میں رسوا کیا اور اپنے دوست کو بایں نیک نیتی کے ساتھ مضحکہ انگیز بنا دیا۔ اقتباسات کے نقل کرنے میں سعیدی صاحب کو خاص ملکہ حاصل ہے۔ میتھیو آرنلڈ کا قول نقل کیا تو وہ غلط (اور اس کے معنی بھی غلط سمجھے) اور لنکن کا قول نقل کیا تو وہ غلط۔

حسن مارہروی صاحب کی طرح سعیدی صاحب کا مذاقِ شعر بھی قابلِ ذکر ہے۔ غالب کا ایک مصرعہ نقل کیا کہ "ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی" تو "حسن پرستی" کو "عشق پرستی" بنا دیا۔ اس کے علاوہ تین شعروں کو زینتِ کلام بنایا ہے پہلا شعر یہ ہے:

بتو شاباش کیا کہنا ترقی اس کو کہتے ہیں
نہ ترشے تھے تو پتھر تھے جو ترشے تو خدا ٹھہرے

دوسرا مصرعہ آخر پھر بھی گنگنانے کے قابل ہے لیکن پہلے مصرعے میں جیسے بیلچوں سے بھرتی کی گئی ہے۔ دوسرا شعر ملاحظہ ہو:

زمانہ ایک طرح پر کبھی نہیں رہتا
اسی کو اہلِ جہاں انقلاب کہتے ہیں

اگر سعیدی صاحب کو اسی پائے کے اشعار یاد رکھنے اور دہرانے کا شوق ہے تو مندرجہ ذیل شعر بھی نوٹ کر لیں کسی اور دیباچے میں کام آئے گا۔

ابھی سفید تھے بال اور ابھی سیاہ ہوئے
اسی کو لوگ عموماً خضاب کہتے ہیں !

تیسرا شعر البتہ اچھا ہے۔ احساس کے اچھا ہونے کی وجہ سے سیدی صاحب کچھ ایسے تذبذب میں پڑ گئے کہ انہوں نے اس کے نیچے قوسین میں اقبال کا نام لکھ دیا تاکہ پڑھنے والے سیدی صاحب کو اس سے بری الذمہ سمجھیں۔

اس دیباچے کے پہلے حصّہ میں تمکین صاحب کے خاندانی حالات بالوضاحت بیان کئے گئے ہیں۔ ہم تمکین صاحب کے بزرگوں کو صد درجہ قابلِ احترام سمجھتے ہیں۔ اور ان کی شان میں گستاخی کا ایک لفظ بھی منہ سے زبان پر لانا سب سے بڑی شقاوت۔ لیکن انہی کے احترام کی وجہ سے یہ کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر یہ حصّہ حذف کر دیا جاتا تو بہتر تھا۔ آخر اولاد کے گناہوں کی سزا آباؤ اجداد کیوں بھگتیں اور پھر یہ بات بھی بے محل کی جائے تو بری معلوم ہوتی ہے۔ تمکین صاحب آخر کہاں کے اتنے بڑے مصنف ہیں اور ان کی تحریریں ایسی بھی کیا خیال انگیز ہیں کہ پڑھنے والے ان کے خاندانی حالات بالوضاحت معلوم کرنے کے لئے بے قرار ہو جائیں۔

دوسرے حصّے میں سیدی صاحب نے اردو کے مزاحیہ نگاروں پر طنزاً و تنقید کی ہے یا تنقید کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ سیدی صاحب کے پاس خیالات کی قلت ہے اسی لئے بے چارے کسی کی تعریف کرتے وقت بے دست و پا ہو جاتے ہیں۔ تنقید کے تین چار نمونے ملاحظہ ہوں:—

(۱) اس فن کو اردو میں مستقل طور پر سب سے پہلے منشی سجاد حسین نے اختیار کیا اور عمدگی سے لکھتے رہے۔

(۲) پطرس نے لائٹ ہیومر لکھا اور خوب لکھا۔

(۳) فرحت اللہ بیگ نے بھی لائٹ ہیومر لکھنا شروع کیا اور خوب لکھا۔

(۴) امتیاز علی تاج صاحب نے بھی "چچا چھکن" کا سلسلہ شروع کیا اور خوب لکھتے رہے۔

اس کے بعد ہم سوائے اس کے اور کیا کہیں کہ حضرت آپ نے بھی تنقید کا سلسلہ شروع کیا اور خوب لکھا لیکن باوجود اس کم مائیگی کے یا شاید اسی کم مائیگی کی وجہ سے معمولی سی بات کو بھی عالمانہ انداز میں بیان فرماتے ہیں مثلاً

"اردو ادبیات کا مطالعہ گہری نظر سے کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس فن کو اردو میں مستقل طور پر سب سے
پہلے منشی سجاد حسین نے اختیار کیا"

اتنی ذرا سی بات کے معلوم کرنے کے لئے جس سے ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا کچھ واقف ہے "اردو ادبیات کا گہری نظر سے مطالعہ کرنا" کوہ کندن و کاہ برآوردن کے مصداق ہے۔ یہ شغل سیدی صاحب ہی کو مبارک ہو۔ ایک اور جگہ حق دوستی یوں ادا کیا ہے:۔

"بہرحال میں خوش ہوں کہ آج وہ چیز پیش کر رہا ہوں جو ہر حیثیت سے کامل ہے۔"

ذکر تمکین صاحب کے مجموعۂ مضامین کا ہے لیکن فقرہ وہ استعمال کیا ہے جو اکثر پیغمبر بھی اپنے صحیفوں کے متعلق استعمال کرتے ہوئے متامل ہوں۔ سیدی صاحب شاید کامل کے معنی نہیں جانتے تھے انہوں نے اسے بھی "خوب" اور "عمدہ" کی قسم کا ایک معمولی لفظ سمجھ لیا ہے۔— آخر میں سیدی صاحب نے تمکین صاحب کے ساتھ حسد اور بغض رکھنے والوں کے خلاف جن کی تعداد بقول ان کے بہت کافی ہو گئی ہے، بہت کچھ زہر اگلا ہے چونکہ ہم ان حاسدوں کے نام تک سے واقف نہیں نہ ہماری سمجھ میں آتا ہے کہ کوئی تمکین صاحب کے ساتھ رشک اور حسد اور بغض رکھے۔ تو کیوں۔ اس لئے ہمیں سیدی صاحب کے زہردار فقروں میں بجز چونچلے پن اور سوئے ہضم کے اور کچھ نظر نہیں آتا مگر ہمیں سیدی صاحب سے پورا پورا اتفاق ہے کہ جو لوگ تمکین صاحب سے رشک

کرتے ہیں ان کی داخلی حالت واقعی قابلِ افسوس ہے۔

خاتمے پر ہم نہایت واضح طور پر قارئین کے ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ ہمیں ان پانچ حضرات سے معاذ اللہ کوئی ذاتی عناد نہیں۔ عناد کیا معنی ہمیں تو افسوس ہے کہ ہمیں ملاقات تک کا شرف حاصل نہیں۔ لیکن جب یہ پانچوں صاحب ایک ساتھ میدانِ ادب میں اترتے ہیں اور اوچھے پن کی زنگ خوردہ تلواروں اور ٹوٹے دستوں کے ساز و سامان کے ساتھ خراش نعروں کے ساتھ مدرج ادب اور مذاقِ سلیم کو دعوتِ مبارزت دیتے ہیں تو ہر عاقل و بالغ کا فرض ہے کہ اس دعوت کا جواب دے۔ ہماری اپنی رائے ان پانچ انشا پردازوں کی تصنیفات کے متعلق یہ ہے کہ ابھی سیکھتے ہیں، اچھا بھی لکھ سکتے ہیں۔ جب ہندوستان میں ادب و انشا کی یہ حالت ہے کہ ہر بھلے بُرے کی کھپت ہو سکتی ہے تو ہم ان پر کیوں معترض ہوں؟ لیکن جب یہ لوگ تنقید کرنے بیٹھتے ہیں تو ایسی اوٹ پٹانگ باتیں اس وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ ان کی نخوت کے مقابلے میں چپ رہ کر ان پر احسان اور بدخواہوں کے ساتھ نیکی کرنا ہے۔ تمکین صاحب نے ایک کتاب لکھی تھی تو خاموشی، متانت اور شرافت کے ساتھ اسے بازار میں بیچ دیتے، صحیح آرا سے مستفید ہوتے، غلط آرا کو نظر انداز کر دیتے۔ یہ ممکن نہ تھا کہ کم از کم اخلاقاً ہی اکثر پڑھے لکھے لوگ کتاب کی تعریف نہ کرتے لیکن انہوں نے کتاب کیا لکھی ہے کتاب کا جلوس نکالا ہے۔ ایک صاحبِ ذوق انشا پرداز کو اس قسم کی سوقیانہ حرکات سے گریز واجب ہے۔ دیباچہ نویسوں کی خدمت میں ہماری مؤدبانہ عرض ہے کہ شکم بقدرِ علم رکھیں۔ چلّو بھر پانی میں گر کر نہ اچھل پڑیں۔ عالم وہی ہے جس کا انداز عمر بھر طالب علمانہ ہے۔ بڑے بڑے دعوے کرنا اور ایک دو قلم سے جو نہال جلسے سے نظرثانی تک کا محتاج دکھنا جہالت کی نشانیاں ہیں۔ یہ لنکن کا قول ہے

"تم کچھ لوگوں کو ہمیشہ کے لئے اور سب لوگوں کو تھوڑے عرصے کے لئے دھوکا دے سکتے ہو، لیکن
سب لوگوں کو ہمیشہ کے لئے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔"

ہم جانتے ہیں کہ ہمارے اس مضمون سے مصنفینِ زیرِ بحث کو تکلیف بھی ہوگی اور شرم بھی آئے گی۔ اگر شرم تکلیف پر غالب آگئی تو ہم ان کے جواب سے محروم رہ جائیں گے۔ اگر تکلیف شرم پر غالب آئی تو حیدرآباد دکن، گلبرگہ، بھوپال، علی گڑھ اور لکھنؤ میں "لاؤ تو قلم دان" کی آوازیں بلند ہوں گی تو ہمارا مخلصانہ مشورہ یہی ہے کہ آئیں بائیں شائیں کرنے کی بجائے چپ رہنا بہتر ہے۔ آگے آپ خود سوچ لیجئے۔ ہماری طرف سے خواہ آپ سب حضرات کسی مرکزی مقام پر سر جوڑ کر کوئی جواب مرتب کر لیجئے خواہ الگ الگ زور آزمائی کیجئے۔ ہم ہر طرح سے تیار ہیں۔ ہم تو طالب آپ سے "جہانگیرِ ستم" کے متوقع ہیں۔

باقی رہا "غنچۂ تبسم" یہ کتاب ایک قابلِ احترام بزرگ کی تصویر سے شروع ہوتی ہے اور ایک ایسے مضمون پر ختم ہوتی ہے جو بلا مبالغہ فواحشات سے پُر ہے۔ اس مضمون میں تمکین صاحب نے جس کوک شاستری ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے اس کے آثار نہ صرف ان کے باقی مضامین میں بلکہ ہندوستان کے اکثر مزاحیہ نگاروں کی تحریرات میں پائے جاتے ہیں۔ ان پر تنقید لکھنا ان کے تعفن کو اور زیادہ پھیلانا ہے۔

انارکلی مخلص صاحب اور ہم نیازمند

نیازمندانِ لاہور

دسمبر ۱۹۳۰ء کے رسالہ ساقی میں "انارکلی پر ایک نوٹ" کے عنوان سے "ایک مخلص" کے قلم سے ایک مضمون چھپا ہے جو اپنی جگہ بے حد دلچسپ ہے۔ مضمون کا رقبہ ساڑھے آٹھ صفحے ہے لیکن فی مربع میل کے حساب سے خیالات کی مقدار بہرحال آبادی سے زیادہ نہیں۔ جہاں تک بدگوئی کا تعلق ہے مضمون نگار صاحب ہم سب میں اگر کچھ اچھے پڑتے ہیں لیکن جہاں تک تنقید کا تعلق ہے وسعت دانش چیونٹی کے بھرے سے بھی زیادہ نہیں، اور چونکہ یہی وہ جنس ہے جس میں وہ خود باوجود اپنی سبک خیالی کے ڈوب مرنے سے قاصر ہیں۔

تو پہلے بدگوئی لیجئے کیونکہ مخلص صاحب نے اپنا زورِ قلم زیادہ تر اسی صنفِ ادب یعنی بے ادبی پر صرف کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انارکلی پڑھنے کے ساتھ ہی مخلص صاحب کو بدہضمی کی شکایت لاحق ہو گئی۔ چنانچہ ان کی بے قرار روح سے حرارت وار کی زیرِ آوازیں نکلتی ہیں۔ لکھتے ہیں انارکلی پڑھ کر بڑی مایوسی ہوئی۔ انارکلی کی موت سے زیادہ خود تاج صاحب کی حالت پر رونا آتا ہے۔ وہ بجائے مبارکباد کے کسی اور بات کے مستحق ہیں۔ طلب چاہتے ہیں کہ تاج صاحب آئندہ اس سفاکی سے لٹریچر کا خون نہ بہائیں تو بڑا احسان ہوگا۔ بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ وہ تنقید زمرۂ ادب سے کوئی واسطہ نہ رکھیں۔ انارکلی کا فطرتاً تو ابھی بھاری بھرکم نہیں جو چل نہ سکے تو درکنار معمولی اہلیت کے آدمی کو بھی بھائے یا اس پر لب ڈال سکے اور تاج صاحب کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ فوراً اسے دریا برد کر دیں۔

جب ہم نے یہ الفاظ پڑھے تو خیال آیا کہ کسی دوست کو تار دیں کہ کسی حکیم سے مشورہ کر کے مخلص صاحب کو ایک جلاب دے دیں تاکہ یہ قے اور رفع ہو جائے، اور انہیں ہدایت کریں کہ آئندہ برس دو برس تک کے لئے اپنی ادبی غذا ذرا ہلکی رکھیں مثلاً مولانا اسمٰعیل میرٹھی مرحوم کی نظمیں یا مولانا حسن نظامی کا روزنامچہ بس ایسی ایسی چیزیں پڑھ لیا کریں کیونکہ ان کا معدہ اس سے زیادہ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ جب ذرا بڑے ہو جائیں گے کچھ تھوڑا بہت پڑھ لیں گے تو جو ٹریجڈی اور ٹریجڈی کی تنقید سے بھی شوق فرما لیں۔ فی الحال انہیں مولانا راشد الخیری کے ناول ہی پڑھتے رہنا چاہیے کیونکہ وہ ایسے ہی نحیف دماغ کے لئے لکھے گئے ہیں۔

لیکن پھر خیال آیا کہ اس سے ہونہار بچوں کی دل شکنی ہو گی اب تو ماشاءاللہ اہلِ زبان بھی سکولوں کالجوں میں داخل ہونے لگے ہیں، اور مذکر مونث کے جھگڑوں کو چھوڑ کر نقد و تبصرہ کے میدان میں زور آزمائی کرنے لگے ہیں۔ ذرا غور سے دیکھیں شاید کوئی کام کی بات کہنا سیکھ گئے ہوں۔ یوں تو "اہلِ زبان" کی پت جھڑ شروع ہو کر ختم بھی ہونے کو آئی اور زبان کو ہانکتے ہانکتے ادب کی دم میں نمدہ بھی باندھ گئے لیکن شاید پھر بھی کسی ہونہار مضمون نگار کی دم میں کہیں کوئی چھنا چھنات لگا ہو۔ اس خیال سے مضمون کو دوبارہ پڑھا تو معلوم ہوا کہ جہاں مخلص صاحب نے دس بارہ جگہ اپنی جہالت اور بداخلاقی کا ثبوت

دیباچے دونوں میں تین جگہ اپنی حیثیت بھی مرد خدائی ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کا اظہار علم ان کی بے ربط جہالت سے کہیں زیادہ دلچسپ ہے۔ لیکن مخلص صاحب کی اس خصوصیت کا احاطہ کرنا کچھ آسان کام نہیں ان کے مضمون میں خیالات کے موتی بکھرے پڑے ہیں۔ (زور "بکھرے" پر ہے موتی پر نہیں۔ دراصل موتی کی جگہ ایک اور لفظ سوجھا تھا لیکن استعمال اس لئے نہیں کیا کہ "اہل زبان" کہیں گے محاورہ غلط ہو گیا) ان موتیوں کو چن کر یکجا کرنے کے لئے اس مضمون کی بھول بھلیاں میں کئی دفعہ گھومنا پڑتا ہے کیونکہ ژولیدہ بیانی نئے نقادوں کی خاص صفت ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں۔

> "انارکلی . . . تین ایکٹ کا ایک موضوعی (سب جیکٹو) ڈراما ہے۔ جسے غیر اصطلاحی زبان میں یوں سمجھنا چاہئے کہ اس تصنیف میں تاج صاحب آنکھوں دیکھی نہیں بلکہ من مانی واردات سنا رہے ہیں۔"

اب اس فقرے کو کوئی کیا کرے۔ اتنی فرصت کہاں کہ دلی جا کر مخلص صاحب کے دارالمطالعہ کے دروازے پر دستک دیں اور وہ حوصلے سے [illegible] تو ہم اتنا پوچھیں کہ حضرت سب جیکٹو ڈراما دلی کا محاورہ ہے یا لکھنؤ کا؟ کیونکہ الفاظ گو انگریزی ہیں لیکن انگریزی فن تنقید اس اصطلاح سے محض ناواقف ہے۔ اس اصطلاح کی جو تشریح غیر اصطلاحی زبان میں مخلص صاحب نے ہم جاہلوں کے فائدے کے لیے کر رکھی ہے اس سے بھی نہ کھلا کہ یہ دریافت کیا ہے کب ہوئی اور اس کا کولمبس کون ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مخلص صاحب نے شکارپور کے سفر کے دوران میں دہلی کے بکسٹال سے ڈراما پر کوئی کتاب لے کر پڑھ لی تھی جس سے ان کی جہالت میں اس قدر خوش گوار اضافہ ہوا کہ وہ اسے علم سمجھنے لگ گئے۔

غالباً اسی کتاب مصنفہ لال بجھکڑ سے مخلص صاحب پر یہ بھی انکشاف ہوا کہ —

> "(انارکلی) ادب کی بنیادی تقسیم یعنی شاعری، نثر اور ڈرامے کی آخری صنف کی حیثیت سے پیش ہوئی ہے بلکہ یہ کہیے کہ اس صنف میں بھی کتاب نسبتاً ایک ایسی اہم شق یعنی ٹریجڈی کی حامل ہے جسے انسان کی دکھیاری زندگی کا نمونہ ثابت ہونا چاہیے۔"

مطلب صرف اتنا ہے کہ انارکلی ایک ٹریجڈی ہے لیکن یہ ظاہر کرنا بھی مقصود تھا کہ اس کے علاوہ بھی ہم بہت کچھ جانتے ہیں۔ اور اس اظہارِ علم کے شوق میں بات ایسی فرسودہ اور بے معنی کہی کہ معیار گوئی کی ضرورت ہی باقی نہ رہی۔ خود اسی مضمون میں مخلص صاحب نے بڑے مربیانہ انداز میں حضرت آزاد مرحوم کی ایک تحریر کا نمونہ پیش کیا ہے اور اسے خوب سراہا ہے ہم علامہ مخلص صاحب سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر ادب کی بنیادی تقسیم وہی ہے جیسے آپ نے مندرجہ بالا اقتباس میں یوں بگھار کر پیش کیا ہے تو وہ خود ہی بتائیں کہ آزاد کی یہ تحریر کس صنف میں شامل ہے۔ خواجہ حسن نظامی کا "سی پارہ دل" کس خانے میں ڈالئے گا۔ غالب کے "اردوئے معلیٰ" کو کیا قرار دیجئے گا۔ آپ کی پڑھی ہوئی کتابوں میں سے یہی مثالیں کافی ہیں۔

آگے چل کر اعتراف کرتے ہیں کہ انارکلی کا قصہ خود تاج صاحب کے قول کے مطابق ایک بے بنیاد چیز ہے لیکن اعتراض فرماتے ہیں کہ مصنف ڈراما نے سر فہرست ہی میں انارکلی کا یہ واقعہ ۱۵۹۹ء کا لکھا ہے جبکہ اکبر کی عمر چھپن سال تھی اور متحیر ہوتے ہیں کہ اکبر جس نے جوانی میں ہیمو بقال کو نہ مارا وہ چھپن برس کی عمر میں انارکلی کو کیونکر مروا سکتا ہے اس استدلال سے اگر کچھ ثابت ہوتا ہے تو یہی کہ قصہ بے بنیاد ہے پھر نہ معلوم مخلص صاحب تاج صاحب کی تائید کر رہے ہیں یا تردید؟

برسبیل تذکرہ۔ ہندوستان کے تمام ججوں کو یہ بات نوٹ کر لینی چاہیے کہ اگر ان کے سامنے کوئی چھپن برس کا شخص قتل کے الزام میں گرفتار ہو کر پیش ہو تو اس سے پہلی بات یہ پوچھیں کہ کیوں بے تو نے جوانی میں ہیموں بقال کو مارا تھا؟ اگر جواب نفی میں ہو تو اسے رہا کر دیں۔

ان مثالوں سے میں قارئین کو اس بات کا یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مخلص صاحب کے مضمون کو سمجھنے کے لئے باقاعدہ اغلاط نامہ مرتب کر کے

ساتھ لکھنا پڑتا تھا کئی فقروں کی نحوی ترکیب کرنی پڑی۔ کئی پیراگراف از سر نو ترتیب دینا پڑا۔ کئی فقروں کے معنے جو تشیش سے پہلے پڑھے تھے اس مقالہ میں جو چھپنے کے بعد مطلب یہ وصول ہوا کہ مخلص صاحب کو بقول ان کے "خلش" تین چیزوں سے ہوتی ہے

۱۔ فرماتے ہیں۔ "اکبر کے متعلق میں نے پہلے بھی کہا اور اب بھی کھلم کھلا کہتا ہوں (مضمون نگار قبل اسی قسم کی تنقید کا مضمون ارسال کر چکے ہیں) کہ انارکلی لکھ کر آپ نے اس کی با عظمت سیرت تباہ کی ہے"

ان سطور میں مخلص صاحب نے پھر اپنی پریشان خیالی کے کئی ثبوت دیے ہیں۔ ایک طرف یہ فرماتے ہیں کہ "اکبر بادشاہ کے نام کے ساتھ ہی جو تصور ہندوستان کے بچے بچے کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے وہ آپ کے اکبر ڈرامے سے بالکل نہیں ملتا" جس کا مطلب ہم یہ سمجھے کہ مخلص صاحب کے نزدیک ڈرامے کا اکبر تاریخ کے اکبر سے مختلف ہے۔ اس کا جواب مختصراً تو یہ ہو سکتا تھا کہ ڈرامہ نویس یا کوئی بھی انشا پرداز اس بات کا حق رکھتا ہے کہ کسی تاریخی شخصیت کو جس طرح چاہے پیش کرے اگر وہ تاریخ کے مطابق نہ ہو تو آپ اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ ایسے شخص کو مورخ کی حیثیت سے کوئی درجہ نہ ملنا چاہیے۔ اس کی انشا پردازی پر کوئی حرف نہیں آ سکتا۔ علم ادب کی تاریخ میں آپ کو کئی مثالیں اس بات کی ملیں گی کہ ایک ہی تاریخی شخص کو مختلف انشا پردازوں نے متباین اندازوں میں پیش کیا لیکن ان کی ادبی حیثیت کو اس تباین سے کوئی صدمہ نہ پہنچا لیکن یہ اصول ذرا مطالعے کے بعد سمجھ میں آتا ہے۔

پھر آپ فرماتے ہیں۔

"ڈرامہ نگار کی تو خوبی یہ ہے کہ وہ جیتی جاگتی ہستیاں پیدا کرے اور کبھی بھی کوئی بات ان میں خلاف فطرت نہ ہو"

مخلص صاحب یہ دوسری بات لکھنے کے ساتھ ہی بھول بھی گئے۔ بہر نقد جو کہیں سے ان کے ہاتھ آیا تھا جس کو آپ نے اپنے مضمون میں رکھ دیا لیکن اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اس معیار پر اکبر کے کیریکٹر کو پرکھ کر دکھاتے اور ثابت کرتے کہ فلاں بات جو اکبر نے کی یا کہی وہ انسانی فطرت کے منافی ہے۔ اور کیرکٹرجات کی اہمیت ان کے قلم میں نہیں آ سکتی۔ جب یہاں مخلص صاحب نے خود ہی ہتھیار ڈال دیے تو ہم بھی ان کی جاں بخشی کیے دیتے ہیں اور دنیا کو شاہد ٹھہراتے ہیں کہ ہم باوجود نوجوان ہونے کے نہتوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔

یہ خلاف فطرت والی بات مخلص صاحب نے محض رعب گانٹھنے کو لکھی تھی اصل مطلب ان کا یہی ہے کہ تاریخ کا اکبر بہت شاندار ہے اور ڈرامے کا اکبر ظالم اور سفاک سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ اس کے جواب میں ہم مخلص صاحب کی خدمت میں یہی مخلصانہ مشورہ پیش کرتے ہیں کہ وہ دس بارہ سال تک روزانہ انارکلی کی تلاوت فرماتے رہیں۔ ممکن ہے اس کے بعد ہونے والے نکات ان پر واضح ہو جائیں۔ اگر اسے پڑھ کر ان کی آنکھوں کے سامنے اکبر کی یہ تصویر نہیں کھنچتی کہ ایک عالی وقار، علم دوست، روشن دماغ شہنشاہ جو ہر وقت ہندوستان کی عظمت کے خواب دیکھتا رہتا ہے اور جو ان خوابوں کی تعبیر کے لیے ہر وقت کوشاں رہتا ہے۔ ایک نوجوان میں جو اس شان دار سلطنت کا ولی عہد ہے کمزوری یا بے راہروی کے ذرا سے آثار بھی پا کر اس قدر بیقرار و پریشان ہو جاتا ہے اور جہاں بانی کی اہم ذمہ داریوں کو اس درجہ محسوس کرتا ہے کہ اپنے پدرانہ جذبات کا خون کر لینے سے بھی نہیں جھجکتا۔ اگر مخلص صاحب کی آنکھوں کے سامنے یہ تصویر نہیں کھنچتی تو چشمۂ آفتاب را چہ گناہ۔ اگر اب بھی مخلص صاحب کو ڈرامے کا اکبر محض ایک ظالم اور سفاک بادشاہ معلوم ہوتا ہے تو سوائے اس کے ان کا کیا علاج ہے کہ کوئی نیک دل انسان اپنی زندگی ان کی اصلاح کے لیے وقف کر دے خواہ مرتے وقت صرف یہ تسکین اپنے ساتھ لے جائے کہ انما الاعمال بالنیات۔ اگر ادب کا ذوق نہ ہو، استفادے کی قوت نہ ہو، احساسات میں بیداری نہ ہو، دماغ میں روشنی نہ ہو تو مبادیات ڈرامہ کے متعلق کسی سڑی بسی کتاب میں چند فقرے پڑھ لینے سے تنقید کی قابلیت پیدا نہیں ہوتی۔

باقی اس قسم کے اعتراضات کہ فلاں باندی کی زبانی مغل اعظم کو صلواتیں سنوائی ہیں۔ فلاں کنیز کی زبانی سلیم کی مٹی پلید کرائی ہے۔ صرف

بکی لکھے ہوئے رسالے مہیا کرسکتے ہیں تنقید سے ان کو کوئی سروکار نہیں۔ ایسے اعتراضات صرف اسی درجے کی ادب ناشناسی بلکہ استعداد کی کم فہمی کی دلیل ہیں۔ اکبر اور سلیم تو نہایت معمولی انسان ہیں اگر آپ بلاتشبیہ کسی پیغمبر کا قصہ بھی لکھیں (ڈرامے) میں بھی یہ ذکر ضرور آئے گا کہ فلاں شخص نے ان کو پتھر مارے فلاں نے ان سے یہ بدسلوکی کی حتیٰ کہ بعض نے انہیں سولی پر لٹکا دیا اور پھر بھی ان کا مضحکہ اڑاتے رہے پھر اگر آپ پر کوئی اعتراض کرے کہ آپ نے معاذ اللہ فلاں پیغمبر کی توہین کرائی تو بتائیے کہ آپ اس شخص کی ذہانت کے متعلق ایک حقیر رسید کرنے کے سوا اور کیا کریں گے۔ مخلص صاحب کی خدمت میں صرف یہی عرض کیا جاسکتا ہے کہ حضرت آپ ایک آدھ کتاب ابھی اور پڑھ لیجئے پھر تنقید نگاری بھی کر لیجئے گا آپ کا ہاتھ کس نے روکا ہے؟ لیکن اس نقادی میں بھی آپ کو کیا مزہ آئے گا کہ ہر مضمون کے بعد آپ خود ہی موضوعِ تنقید بن جائیں۔

ایک بات پڑھ کر ہمیں ہنسی بھی آئی اور رونا بھی آیا۔ فرماتے ہیں۔

> "میں اپنی تو یہ کہتا ہوں کہ انارکلی کا ظاہری حسن دیکھ کر بڑی امیدیں بندھی تھیں۔ سوچتا تھا کہ واقعی یہ ڈراما مغلیہ شان و تجمل کا ایک سہانا خواب ہوگا جس میں شاہانِ سلف کے سحر طراز حسین مناظر اس طرح دکھائے گئے ہوں گے کہ بس مت ہے۔ اکبر بادشاہ سیر و شکار میں ہیں۔ سینکڑوں ہاتھی گھوڑے اور ہزاروں خلقِ خدا کا لاؤ لشکر رکاب میں ہے گویا جنگل میں منگل ہو رہا ہے ..... وہ آتشہ منزل (محل کہ) سے لگا لگا دیوان خانہ عام ہے جس کے صحن کے بیچوں بیچ (۴۰) گز طولانی ستون پر آکاش دیا رات میں دور دور روشنی پہنچاتا ہے . . . اچھا یہ چیز تاج صاحب کی سمجھ میں نہ آئی تھی یا اس کا موقع نہ تھا تو اکبری سلطنت کا حسین بازو ہی نورتن سے ایسا سج دیتے کہ سب دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے اگر اس کا اہتمام بھی تاج صاحب کے بس کا نہ تھا تو جشن نوروز کے بیان میں کم سے کم مینا بازار کی پیاری تصویر کھینچ کے یہ تک تو دکھا دیا ہوتا کہ ملک تدبر کے بادشاہ اکبر اعظم نے اپنی خدا داد طبیعت سے اس میں کیا ندرت پیدا کی .. یعنی یہ کہ بادشاہ امرا کو سلطنت کا رکن رکین جانتا تھا۔ اور انہیں اس طرح شیر و شکر رکھنا چاہتا تھا کہ ایک دوسرے کی سنگت سے مزہ بڑھے ..... بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ خوددار امرا باہم کھٹک بھی جاتے۔ جہاں یہ صورت پیش آئی اور بادشاہ نے رشتہ ناطہ کر کے دونوں گھرانوں کو ایک کیا۔"

اب قارئین پر واضح ہو گیا ہوگا کہ مخلص صاحب ڈرامے کو سمجھنے کے کس حد تک اہل ہیں۔ تاج صاحب تو ڈراما انارکلی کا لکھ رہے ہیں کہ اس کنیز کا حسرت ناک انجام کیونکر ہوا لیکن مخلص صاحب کو یہی افسوس رہا کہ تاج صاحب نے ان کو چالیس گز طولانی ستون کیوں نہیں دکھایا۔ مخلص صاحب کو خود بھی اس بات کی نامعقولیت سوجھ گئی چنانچہ دبی دبی زبان میں فرماتے ہیں۔

> "اچھا یہ چیز تاج صاحب کی سمجھ میں نہ آئی تھی یا اس کا موقع نہ تھا تو ....."

برخوردار بات یہی ہے کہ اس کا موقع نہ تھا۔ سمجھ میں تو آپ کی آگیا لیکن ہٹ آپ کی ویسی ہی قائم ہے پھر بھی کہے جاتے ہیں کہ اچھا یہ نہیں تو نورتن ہی دکھا دیا ہوتا۔ اچھا یہ نہیں تو مینا بازار ہی دکھا دیا ہوتا۔ اب اس بچپنے کا کیا علاج۔ مطلب مخلص صاحب کا یہ ہے کہ تاج صاحب انارکلی کا قصہ تھوڑی دیر کو بند کر دیتے اور مخلص صاحب کو ایک ایسا سین دکھا دیتے جس میں اکبر امرا کے لڑکے لڑکیوں کے رشتے کراتے نظر آتے۔ کوئی تاج صاحب سے پوچھتا کہ حضرت یہ کیا دخل در معقولات ہے تو تاج صاحب جواب میں کہتے کہ قصہ انارکلی کا سہی لیکن اکبر کی خوبیاں اس تفصیل سے دکھانا بہرحال ثواب کا کام ہے۔ اگر ڈراما اسی اصول پر لکھا جاتا ہے تو تاج صاحب کو چاہئے کہ اگلے ایڈیشن میں ایک آدھ سین غرناطہ کا بھی دکھا دیں کیونکہ اس کی داستان بھی تو آخر اسلامی کلچر کی علمبرد

ہے۔ اگر غرض حب وطن ہے تو کم از کم تزک بابری کا ذکر ضرور ہونا چاہیے۔ کیونکہ بابر بہرحال اکبر کا رشتہ دار تھا اور بقول مخلص صاحب وہ "بزرگ رنگیں" میں سے تھا۔ آخر میں ایک سین آل انڈیا مسلم کانفرنس کا بھی دکھا دیا جائے جو حال ہی میں قائم ہوئی ہے تو اور بھی چار چاند لگ جائیں گے۔ مخلص صاحب کو تاریخ کا ذوق تو بہت ہے لیکن ان کا مذاق ایک پکچر سے آگے بڑھنے نہیں پاتا۔

(۲) دوسرا اعتراض مخلص صاحب کا یہ ہے کہ تاج صاحب کی قوت مشاہدہ بہت کمزور ہے۔ علامت کے طور پر آپ نے تاج صاحب کا ایک فقرہ نقل کیا ہے۔

"موسم بہار کی ایک دوپہر ظہر کی نماز ادا ہوئے ڈیڑھ گھنٹے کے قریب وقت ہو چکا ہے۔"

اور اعتراض فرماتے ہیں: اس فقرے میں بے ضرورت لفاظی ہے فقرہ یوں ہونا چاہیے تھا۔

"بہار کا موسم سہ پہر کا وقت ہے۔"

دوپہر کے لفظ سے جو دھوپ کا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور ظہر کی نماز کے ذکر سے جو ایک مسلمان گھرانے کی مذہبی دنیا کی طرف ضمناً اشارہ ہے وہ آپ نے بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔ وہ چیز جسے انگریزی میں ATMOSPHERE کہتے ہیں (معنی کسی پڑھے لکھے سے پوچھئے۔ ڈکشنری میں دیکھئے تو شاید واضح طور پر سمجھ میں نہ آئیں) اس کی طرف سے تو مخلص صاحب آپ نے دماغ کے دروازے بالکل بند کر رکھے ہیں۔

مگر جس نقشے کو وہ بقول خود ابھار کے دکھانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے:

"ستونوں اور محرابوں کے سائے طویل ہونے شروع ہو گئے۔"

فرماتے ہیں: "یہ ایک کھلی بات ہے کہ زوال کے بعد سایہ ڈھلنے لگتا ہے اور ظہر کی نماز ایک حد تک سایہ طویل ہونے پر ہی ہوتی ہے لیکن آپ کا جدید مشاہدہ بتاتا ہے کہ نماز ظہر کے بعد ڈیڑھ گھنٹہ ہو جائے تو سائے طویل ہونے شروع ہوتے ہیں۔"

سایہ ڈھلنے اور سائے کے طویل ہونے میں جو فرق ہے وہ آپ کی سمجھ میں نہیں آیا۔ جس ستون پر دھوپ پڑ رہی ہے جب اس کا سایہ ستون کی مطابقت سے بھی بڑھ جائے تو اس کو سائے کا طویل ہونا کہتے ہیں۔ دھوپ کے متعلق جس قدر مشاہدہ آپ کا ثابت ہوتا ہے وہ تو بجز بال سفید کرنے کے اور کسی کام نہ آئے گا۔

(۳) تیسرا اعتراض زبان کے متعلق ہے۔ اعتراض اوّل تو ایسے فقروں پر ہے کہ "تم خلیل ہو شیخو؟" "تو معاملہ کیا ہے حضور؟" وغیرہ وغیرہ۔ جو شخص "اہل زبان" ہو کر بھی یہ نہ سمجھے کہ مخاطب کے نام کو فقرے کے آخر میں رکھ دینے سے فقرے کا تیور کس حد تک بدل جاتا ہے اس کو کوئی غیر اہل زبان بذریعہ تحریر تین سو میل کے فاصلے سے کیا سکھائے اور کس طرح سمجھائے اور اہل زبان کو یہ کس طرح بتائے کہ اہل زبان ہونا اور بات ہے زبان دان ہونا اور بات ہے۔ اے کاش کوئی قادر الکلام شخص بلند آواز سے ان فقروں کو مخلص صاحب کے سامنے پڑھے اور مخلص صاحب کے چہرے کا مطالعہ کرتا جائے اور جب آٹھ دس دفعہ پڑھنے کے بعد اسے مخلص صاحب کے چہرے پر انشراح کی کوئی جھلک نظر آئے تو ہمیں فوراً اطلاع دے تاکہ ہم شکرانے کے دو نفل پڑھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ پرانی وضع کے ہندوستانی کھیلوں کے عادی ہو چکے ہیں وہ ان کی مصنوعی زبان اور مصنوعی طرز تحریر سے اس قدر مانوس ہیں کہ اس قسم کی جیتی جاگتی زبان انہیں [illegible] طور پر ناگوار معلوم ہوتی ہے۔ شیکسپیئر نے بھی جب اس طرح کی جدت کی تھی تو لوگ اس پر یونہی معترض ہوئے تھے اور ایک بہت بڑے نقاد نے اس کے متعلق یہ کہا تھا کہ چھری اور کمبل جیسے الفاظ کو ڈرامے میں استعمال نہ کرنا چاہیے۔ اس لئے کہ لوگوں کو "خنجر اور ردا" اور اسی صنف کے بلند آہنگ الفاظ کا چسکا پڑ گیا تھا اور جو مصنف اس تصنع سے گریز کرتا تھا بہت بڑے گناہ کا مرتکب سمجھا جاتا تھا۔

مخلص صاحب تاریخ ادب سے واقف ہوتے تو عبرت پکڑتے لیکن دامن از کجا آرد کہ جامہ ندارد۔

"پختہ حسن" اور "پھیکا آسمان" وغیرہ کے متعلق مخلص صاحب نے صرف اتنا فرما دیا کہ نئی ترکیبیں ہیں لیکن یہ نہ فرمایا کہ ان میں نقص کیا ہے۔ کوئی اعتراض کرتے تو جواب کی تکلیف بھی گوارا کی جاتی۔ فی الحال تو اتنا ہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ کیا بے معنے یہ نئی ترکیبیں ہیں اور ان میں سے بعض مثلاً پختہ حسن صرف مبتدیوں کے لئے نئی ہیں

دو محاوروں کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ ان کا محل استعمال غلط ہے۔ آخر مخلص صاحب اپنی حرکتوں پر اتر آئے۔ ہم بھی متعجب تھے کہ "اہل زبان" کی لکھی ہوئی تنقید ہو اور اس جلدی کی گرہ یعنی "محاورے" کا تذکرہ نہ ہو جس کی بدولت یوپی کے کئی حضرات پنساری بن بیٹھے ہیں۔ تاج صاحب کا فقرہ ہے: "دنیا کی تو انارکلی انارکلی کہتے کہتے زبان خشک ہوئی جا رہی ہے۔ اور مجھے اتنی توفیق نہیں کہ جھوٹے منہ سے دو بول شکریے ہی کے کہہ دے۔"

مخلص صاحب کہتے ہیں "جھوٹے منہ" کا یہ محل استعمال نہیں یہاں "پھوٹے منہ" چاہئے۔

اگر جناب مخلص صاحب نور اللغات کی ورق گردانی کی زحمت گوارا فرمائیں تو انہیں معلوم ہو کہ جھوٹے منہ کے معنی ہیں "ظاہر داری سے اور نمائش سے"۔ ڈرامے کا جو فقرہ اوپر نقل کیا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ دنیا تو تیری تعریفیں کر رہی ہے اور مجھے اتنی بھی توفیق نہیں کہ ظاہر داری یا نمائش ہی کے طور پر دو بول شکریے کے کہہ سکے۔

"پھوٹے منہ" کے معنی نور اللغات میں یوں لکھے ہیں "(تحقیر سے) خراب منہ سے، برے منہ، بددلی کے ساتھ"۔ قوسین میں جو "تحقیر سے" لکھا ہے اس سے مراد ہے کہ یہ محاورہ جس کو مخاطب کر کے کہا جاتا ہے اس کی تحقیر بھی مراد ہوتی ہے گویا مخلص صاحب کا اعتراض یہ ہے کہ انارکلی کی ماں نے اس موقعہ پر ایسا فقرہ کیوں نہیں کہا جس سے انارکلی کی تحقیر کا پہلو بھی نکلے! یہ اعتراض محاورے کا اعتراض نہیں۔

دوسرا اعتراض "سیخوں دار روزن" پر ہے۔ "سیخچہ" کے معنی نور اللغات میں یہ لکھے ہیں "چھوٹی سیخ، لوہے کی چھوٹی سلاخ"۔ "سیخوں دار روزن" لکھنے سے مصنف کی مراد یہی ہے کہ ایسا روزن جس میں لوہے کی چھوٹی سلاخیں لگی ہیں۔ اس لفظ کے استعمال سے روزن کے متعلق بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس قدر بڑا تھا۔ اگر کسی بہت ہی چھوٹے روزن مثلاً کسی گڑیا کے گھر کے روزن کا ذکر ہوتا تو ممکن ہے وہاں سیخچہ کی بجائے سلائی کا لفظ استعمال کیا جائے۔ اس وقت مخلص صاحب فرمائیں گے کہ سلائی سے تو سرمہ لگایا جاتا ہے۔ خدا کے لئے مخلص صاحب کے کوئی دوست انہیں سمجھائیں

باقی الفاظ کے متعلق اطلاعاً عرض ہے کہ آپ کو شاید معلوم نہ ہو دہلی کے ایک مصنف منشی فیض الدین گزرے ہیں جو لال قلعے کی زبان لکھنے کے لئے مشہور تھے انہی کی ایک کتاب ہے "بزم آخر"۔ پچھلے دنوں تو نایاب تھی اب چاندنی چوک کی کسی دکان سے ضرور مل جائے گی۔ کبھی شام کو ایڈورڈ پارک سے فراغت پا کر ادھر سے گزریئے تو ایک نسخہ خریدتے جائیے اس میں آپ کو گنگا جلی کڑا اور گوش پیچ کی گوٹ اور اسی قسم کے کئی اور الفاظ مل جائیں گے جن پر آپ یوں جاہلانہ معترض ہوئے ہیں۔ جو الفاظ وہاں نہ ملیں ان کے متعلق ابو الفضل کے آئین اکبری کا مطالعہ فرمائیے وہاں مل جائیں گے جو مغلیہ ڈراما لکھنے بیٹھتا ہے وہ ایسی مستند کتابوں کو ضرور دیکھ لیتا ہے۔ اے کاش جو لوگ تنقید لکھنے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں وہ بھی اتنی تکلیف گوارا کر لیا کریں۔

اب آپ کے پاس صرف ایک ہی جواب رہ گیا ہے وہ یہ کہ ہم نور اللغات کو مستند مانتے ہیں نہ بزم آخر کو۔ اگر یہ واقعہ ہے تو مخلص صاحب کو چاہئے پہلے اہل زبان آپس میں نپٹ لیں جب خود ان کا ایمان درست ہو جائے تو پھر باقی صوبوں میں بھی تبلیغ شروع کریں۔

تو درونِ در چہ کردی کہ برونِ خانہ آئی

یہ تمام ست دلیل ہے اس تنقید کی۔ قارئین نے دیکھ لیا کہ اس تنقید کے مضمون میں انارکلی کے اصل موضوع پر مخلص صاحب نے کچھ بھی نہ کہا۔ محض صرفی اور نحوی باتوں ہی میں الجھے رہے۔ خود انارکلی کے کیریکٹر کے متعلق کچھ نہ فرمایا جو ڈرامے کا اصل بنیان ہے اور جس کے اردگرد تمام واقعات و کرداروں کی تنظیم کی گئی ہے۔ مناظر کی تقسیم کے متعلق کچھ نہ لکھا، واقعات کے تناسب کے متعلق کچھ نہ فرمایا، ٹریجڈی کی مختلف کیفیات کے زیروبم کے بارے میں خاموش رہے۔ اردو ڈرامہ کی تاریخ کو پیش نظر رکھ کر یہ نہ فرمایا کہ انارکلی کا ڈرامہ کہاں تک رسمی ڈراموں کا ممنون ہے اور کہاں پرانی قیود کو توڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس بات پر بحث نہ کی۔ اگر یہ ڈرامہ سٹیج پر دکھایا جائے تو کیا دقتیں پیش آئیں گی۔ پیشہ ور سٹیج اس کو کہاں تک قبول کر سکتی ہے اور کیوں۔ کسی اور ٹریجڈی سے مقابلہ نہ کیا۔ یہ نہ ارشاد کیا کہ اردو ڈرامے کی موجودہ حالت کیا ہے اور اس میں انارکلی کس حد تک ترقی یا تنزل کا موجب ہو گا۔ کیا تو یہ کہا کہ بہت اچھا آدمی تھا سایے دوپہر کے بعد ہی ڈھلنے لگ جاتے ہیں اور ہمارے ان سے نہیں نکلا ہوتا ہے اور اپنے زعم میں سمجھ بیٹھے ہوں گے کہ اس رسالے کے بعد اگر کسی نے ڈرامے کی تنقید لکھی ہے تو ہمیں نے لکھی ہے۔

اب صرف ایک بات کا ذکر باقی رہ گیا ہے اور چونکہ میں اس بات کو محض کنایۃً بیان کرنا چاہتا ہوں اس لیے ڈر ہے کہ مخلص صاحب کے پلے شاید نہ پڑے۔ تاج صاحب نے انارکلی کو مس حجاب اسمٰعیل کے نام ڈیڈیکیٹ کیا۔ چغتائی صاحب نے اپنی قلم کاری سے اس ڈرامے کی طباعت کو رونق بخشی۔ تاج صاحب اور مس حجاب اسمٰعیل یا تاج صاحب اور چغتائی صاحب کے باہمی مراسم مخلص صاحب کو موضوع بحث میں نہ لانے چاہیے تھے۔ مخلص صاحب اور مخلص صاحب کی قماش کے "نقادوں" کو ذہنی اعتبار سے کبھی ہجو نویسی کے درجے سے بالاتر ہونے کی توفیق نصیب نہ ہوئی اور ابھی انہیں یہ محسوس نہیں ہوا کہ اس طرح کا دل سوختانہ چڑچڑا پن خود نقاد کے سفلے پن کی دلیل ہوتا ہے۔ خصوصاً خواتین کا ذکر انہیں اس بے تکلفی سے نہ کرنا چاہیے جس سے شہدے پن کی بو آئے۔ یہ مس حجاب اسمٰعیل کی بدقسمتی ہے کہ وہ اپنی انشاپردازی کی وجہ سے اس زمرے میں شامل ہیں جس میں اصطلاحاً مخلص صاحب بھی قدم رکھتے ہیں لیکن مخلص صاحب کو اس پر فخر کرنا چاہیے۔ اسے اپنے عدم تربیت کے اظہار کا ایک بہانہ نہ بنا لینا چاہیے۔

مخلص صاحب کے مضمون کے ساتھ رسالہ ساقی کے ایڈیٹر نے ایک نوٹ لکھ کر چاردانگ عالم میں اس بات کا اعلان کر دیا ہے کہ "مضمون نگار کی رائے سے ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے" اور یوں سمجھ لیا ہے کہ وہ تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گئے لیکن شاہد جیسے تربیت یافتہ نوجوان کو اس امر کا احساس ہونا چاہیے کہ جس بداخلاقی کی طرف ہم نے آخری پیراگراف میں اشارہ کیا ہے اس کی اشاعت ایک خاندان عالیہ کے سپوت کو نہ کرنی چاہیے تھی۔ مخلص صاحب کی نقادانہ بدتمیزیوں سے ہم شاہد صاحب کو بری الذمہ سمجھنے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن مخلص صاحب کا ذاتی کیچڑ شاہد صاحب کے دامن پر چند ایسے بدنما دھبے چھوڑ گیا ہے جو بے تعلقی کا ایک نوٹ لکھ دینے سے نہیں دھل سکتے۔

ہم اس مضمون کے کسی کھسیانے سے جواب کے لیے چشم براہ ہیں خواہ وہ جواب مخلص صاحب لکھیں یا شاہد صاحب یا دونوں کے دونوں میں سے کسی ایک کے کوئی ایک یا ایک سے زیادہ گمنام یا نامدار استاد، شاگرد یا ہمنوا۔

یہ عصمت چغتائی کا وہ مضمون ہے جس کا بطرس نے انگریزی میں
ترجمہ کیا تھا۔ یہاں اصل اور ترجمہ دونوں پیش کیے جا رہے ہیں۔

ہیروئن

تالی ہمیشہ دو ہاتھ سے بجتی ہے۔ دونوں تالی بجانے کے لیے بھی۔ ہاتھوں کی ضرورت پڑتی ہے اور عرفِ عام میں ان دو ہاتھوں سے ہمارا مطلب ہے کہ ہیرو اور ہیروئن سے ہے۔ وہ ناول یا افسانہ ہی کیا ہے جس میں ہیرو اور ہیروئن نہیں۔ وہ ایسا ہی ہے جیسے کسی نے ایک ہاتھ اور پیر کے ٹھوسے کی مدد سے تالی بجا دی۔ ہو ایسی تالی بج تو گئی مگر کتابوں کی صفحات ہی میں گونج کر رہ گئی ہوتی۔ اس کی سنائی نہ ہو سکتی اور اگر سارے ادب میں ہیروئن اور ہیرو نہ ہوتے تو یقیناً یہ خشک ستون بن کر طاق میں پس جاتا

عوام کی توجہ حاصل کرنے کے لیے بندر بندریا کو ڈگڈگی بجا کر نچانا پڑتا ہے۔ دنیا کے دھندے لرنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ حالات زمانہ سازی سے نہ سب تو ورنہ کوئی بھی نہ سنے گا۔ دیکھیے: محکمۂ تعلیم اور مسجدوں سے لوگ کتنا اکتا گئے ہیں۔

مذاہب کسی کو کچھ کہنا ہوتا ہے تو بندر بندریا کے گلے میں ڈوری، بانسری اور ڈگڈگی بجانا شروع کر دی۔ ہیرو اور ہیروئن کے رسیلے کارناموں سے سیدھی رنگینیاں بھریں کہ لوگ ٹوٹ پڑے، کچھ احساسات کو پھسلایا، کچھ جذبات کو گدگدایا اور مطلب حاصل ہو گیا۔ شعبۂ تعلیم میں سب سے زیادہ اہمیت 'دلچسپ' اسباق کو حاصل ہے۔ ہر بات ایسی صورت میں پیش کرنی چاہیے کہ بچے اس میں گلی ڈنڈے اور کبڈی کی رنگینیاں پا کر متوجہ ہو جائیں۔ جب کبھی کچھ نہیں ہوتا تو کڑوی سے کڑوی خوراک شکر میں لپیٹ کر دے دیجیے۔ تو اس دوا کو نگل جائیں گے۔ ماں اور مولوی کی ہدایت کا زمانہ کب کا گیا۔ ابھی کل کی بات ہوا ہے عظیم بیگ چغتائی نے قرآن کی مدد سے پردے کو چک کرنا چاہا مگر سوائے مولویوں کی جوتیوں کے کچھ نہ ملا۔ لیکن شریر بیوی نے گل کھلا کر اور کو ستار نے عقلوں پر سیاہ پردہ ڈال کر حجاب کو مار بھگایا۔ علامہ راشد الخیری اور پریم چند جی اگر ہیرو ہیروئن کے لفظوں کا سہارا نہ لیتے تو آج بجائے لوگوں کے دل و دماغ کے مرنے بوسیدہ کتب خانوں میں پڑے زنگ کھا رہے ہوتے۔

"ادب اور زندگی' ادب اور سماج' ادب اور تاریخ میں چولی دامن کا ساتھ ہے اگر انہیں ایک دوسرے سے جدا کرنے کی کوشش کی جائے گی تو دونوں مٹ جائیں گے۔ دوسرے معنوں میں اگر ادب سے زندگی یعنی ہیرو اور ہیروئن کو الگ کر دیا جائے تو ایک خلا رہ جائے گی۔

میں سب سے زیادہ میں اس وقت ہیروئن کی حیثیت (جو ادب میں ہے) پر غور کرنا چاہتی ہوں۔ ہیروئن "جام جم" کی سی حیثیت رکھتی ہے اس پر ایک نگاہ ڈال کر ہی ہم اس کے زمانے کی اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی حالت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مثلاً "فسانۂ آزاد" کی عورت کو دیکھ کر جو اس زمانے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت جو قابلِ ذکر عورت تھی وہ نہایت مہذب، تعلیم یافتہ اور دل چسپ طوائف تھی۔ سرشار کو بھلا

شریف گھرانے کی عورت کہیں ملی ہوگی۔ اور وہ بھی مسلمان خاندان کی۔ اس وقت شریف بیویاں گھر میں بیٹھی ہنڈیا چولھے سے سر مارتی ہوں گی۔ سڑی بسی بیبیاں تھیں جن سے اکتا کر لوگ طوائفوں کی آغوش میں سکون دل و دماغ تلاش کرنے جاتے تھے۔ یہ طوائف تھی بازاری اور کسبی قسم کی نہ تھی وہ بالکل شریف زادیوں کی طرح رہتی تھی۔ شریف زادیوں سے زیادہ خوش مذاق اور لطیف تھی۔ ظاہر ہے کہ طوائف کی حیثیت بالکل ایک باغ عام کی سی تھی جو عوام کے چندے سے عوام کی خوشنودی کے لئے قائم کیا جائے۔ ہر مرد کی اتنی حیثیت کہاں کہ تعلیم یافتہ سلیقہ مند بیوی، شاندار مکان میں پھولوں سے لدی او طاقوں میں بسی ہوئی رکھ سکے۔ مگر اس مسئلہ کا نہایت آسان علاج نکالا گیا۔ گھر میں بیوی رکھی جو صرف نسل بڑھانے کے علاوہ عزت و آبرو کو بھی پروان چڑھاتی رہی اور بازار میں طوائف جو جذبات لطیفہ کی پالش کرتی رہی۔ یہ بڑا کارآمد انتظام ثابت ہوا۔ گھر بھی بنا رنگینیاں بھی۔

مگر طوائف کی سوتن گرہستن نے شرارتیں شروع کر دیں۔ اگر میاں سکون و چین کی خاطر طوائف کے یہاں گئے تو وہ بھی محلوں میں آنکھ لڑانے بیٹھی لگی۔ مجبوراً شوہر جنہیں باغ عام کی سیر ذرا مہنگی پڑتی تھی واپس گرہستن کی طرف لوٹ پڑے۔ سوچا جو مزہ بے کی ہانڈی سے ہوتا ہے وہ دال روٹی میں ہی بہتیرے۔ عورت کی کچھ شیر ہو گئی اس نے وہ سب کچھ سیکھنا شروع کیا جس کی تلاش میں شوہر طوائف کے پاس جاتا تھا۔ گو کہ بہت سے اس نے خود ہی پڑھا ہے۔ آٹھا کی پالیسی کے ماتحت طوائف نے دوسرے حیلے، عزت اور آبرو حاصل کرنا شروع کی۔ سرشار کی فتح مند طوائف کو شکست دے کر پریم چند کی گرہستن نے پکھ نکٹ وڑے، قدم قدم پہ پیر نوچتی سکتے تھی۔ وہ مصیبت میں بیٹھنے لگی۔ باغ عام کے پلینے اپنے ہی گملے میں چھوٹی موٹی کالا پھنٹے دیکھ کر کچھ تھوڑ کچھ سو ور س کی سینچائی کرنے لگے۔ رنڈی تو خیر تھی ہی گر یہ ننھی منھی معصوم سی بے مزہ چیز کچھ ایسی پیاری معلوم ہوئی کہ طوائف کا پلہ جھک گیا۔ اس کی خوبیاں عیب ہو گئیں۔ وہی تازہ ادائیں جن کی تلاش میں لوگ جانے جاتے تھے، رنڈی کے چیل بن گئے۔ جو اسے کھل کر گندہ کر کے لوگوں نے اپنے گھر میں کنوئیں کھودنا شروع کر دیئے۔ مگر یہ کنوئیں روز بروز گہرے ہوتے گئے یہاں تک کہ کنارے ہاتھ سے چھوٹ گئے اور ڈوبنا پڑا۔ طوائف بہت بھلائی کی بہت سخاوت کی گئی تاج سدا ایک کے سر نہیں رہتا۔ نا عاقبت اندیشوں نے پھل تیسیے پیٹے خوب۔ کھانے کو نہ یوں نہیں ملی اور ادھر معصوم گھونگھٹ والی نے نئی پود بھی لگائی اور پیالوں کو بھی سینچا۔ نتیجہ یہ کہ رنڈی کے کھنڈروں کو میٹ کر گرہستن نے دنیا بسانی شروع کر دی اور پھر اس کی کمان چڑھتی ہی گئی رہی اوپر تلے کچھلے مرد اس کی حمایت میں ایک دوسرے کو سخت ملامت کرنے لگے۔ ایک دوسرے کے عیب کھول کر شاہراہ پر پہنچ دیئے۔ وہ خود دیکھ جانتے رہی کسی سے لڑائی نہ کی۔ اپنا کی قائل کہ جیسے کا نہ ہی جی برت رکھ رکھو کر رنٹ کرو کھلائے۔ بتے ہیں بالکل اسی طرح جیتی جھپکی آنکھوں سے نقاب کے پیچھے سے تشریح کرنے لگی۔ لیکن اب بھی پوری فتح حاصل نہ ہوئی کیونکہ طوائف کے بعد فیشن ایبل میم۔ پر اس نے کچھ نہ کچھ حصہ میدان کا گھیرے رکھا ادب کی اس قسم کی ہیروئنوں نے کہانی اور ہر قصے میں گھسنا شروع کیا۔ مگر وہ جیسے طوائف کا بھی تیاں اس میم سے کیا دبتی۔ اس نے اتنا تو معلوم کر لیا کہ گھر میں بیٹھے سے کام نہیں چلے گا۔ مجبوراً اسے گھر میں بند کر کے اکیلا باہر جاتا ہے گھر وہاں وہ اکیلا۔ وہ نہیں سکتا۔ وہ سیدھے ہاتھ میں چھڑی اور الٹے ہاتھ میں عورت چاہتا ہے۔ تقویت دل و دماغ کے لئے گھر میں رکھی ہوئی معجون دفتر اور کاروبار میں بھلا کیا مدد پہنچا سکتی تھی۔ لہٰذا دقیق گو ادھر کے لئے اس نے دفتر میں رونق بیٹھی ہوئی ٹائپسٹ، کبھی کبھی نظر آ جانے والی غیر کی حسین لڑکی اور ایسی ہی کارآمد ہیروئن ڈھونڈ کر جسم ناپنا شروع کر دیا۔ اس کے جواب میں گھوڑا کا اصل ... روشنک بیگم نے زہرہ بیگم کی ہیروئن کو دیکھ کر یہیں ماننا پڑتا ہے کہ عورت کی جنگ برابر جاری رہی اور جیت آخر میں اسی کی ہوئی۔

مگر اسے پھر بھی قرار نہ آیا ـــــ اس نے تو بالکل ہی طرح گھنٹے کا فیصلہ کر لیا تھا وہ اور بڑھی۔ پہلے تو گھر کی چار دیواری میں رشتے کے بھائیوں ان کے دوستوں اور پاس پڑوس والوں سے آنکھ مچولی شروع کر دی۔ عظیم بیگ کی ہیروئن کے پردے اور برقعے کے تانے بانے کو اندر گھستیاں کچا پی شروع کر دیں۔ موقع بے موقع سر پر چڑھ بیٹھی۔ گردن میں جھول گئی۔ سینے سے آن لگی۔ یہ پیچھے ڈھکے چھپے اور بھی زیادہ گدگدانے لگے۔ طوائف سے نہ

پرانے دیو پری جیسی لمبی اپسرا کی قائل مغربی چڑیل بے رونق اور بزدل نظر آنے لگی اس لئے نیچے سے وہ ٹل گئی جتنا بھی رونق رنگ لائی گئی اس سے نفرت ہوتی گئی۔ یہاں تو اسے عورت وہ بہروپن پرچھائیں تھی جس کا انداز ایک لے [illegible] ناچتے منہ پر [illegible] مسلی لنگروں کے کونین میں سے ہوسکے تیر رل سے کام دو دن کی قائم رکے پڑھی لکھی چاہے خاک نہ ہو مگر زندہ تو تھا تھوڑا اور جانوں سے کالی سیل ہے۔ نخرا کو [illegible] مشکل لیکن اگر کسی شوخ شایستہ بیوی ہو جو سارے دکھ درد جھیلوں میں اڑا دے تو پھر کہ جنت کی آرزو میں مرے

مرد عورت کے ظلم سہنے کے لئے ہی پیدا ہوا ہے۔ اس کے بغیر تو جب یہی کچھ سے کوئی رہ ہو سکا۔ حضرت آدم نے بیٹھے بٹھائے پسلی چیر کر اس نقصے کو نکال ڈالا اور اپنے سر پر سوار کر لیا۔ خود بخود ہی ہر بار زندگی جو لگام بچائے سے چلے جائیں گے۔ جتنے ڈرے سے زیادہ ڈریں گے چال میں مستی اور روانی بڑھتی جائے گی۔ مگر ہر بات کی حد ہوتی ہے دل کے ساتھ تو دو قلم، عقل نہ ہی چوکنا رہی سمجھی اور دماغ کی پاسبانی شروع کر دی۔ سانپ کے منہ کی چھچھوندر بن گئی جو نگلی جائے نہ تھوکی جائے۔ چھتری، ٹوپی اور رسالے کوٹ کی طرف [illegible] بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ مرد جو تھا سب سے پہلے پطرس تھے اور ان کے بعد عظیم بیگ اور شوکت تھانوی بھی چیخ چیخ کر ہانپ بیٹھے [illegible] مرحوم [illegible] منشی [illegible] مرزا جی اور ملا جی بھی پکار اٹھے۔

"یہ زیادتی ہے بیگم! ہمیں منظور مگر اتنا پیٹ میں درد نہ تھے۔"

دہر سپر وومن ڈھیلی ڈوری کھینچتی گئی جس نے یہ راز بھی معلوم کر لیا کہ اگر وہ درا دلی ہوئی ہے تو سوائے اس کے اور کوئی بات نہیں کہ میاں پیسوں پر اکڑتے ہیں کیوں نہ یہ چار پیسوں کی کمان توڑ کر الگ کر دی جائے لہٰذا محدود کی سلائی سے شروع کر کے اقتصادی، نمارے مرکز لے لیں رینگتے تک اس نے روپے نے اس میں چار چاند لگا دئے۔ دبے کہ عورت کیسی بدل کر نئے رنگ اس کا مال اس پر غالب ہو جانے جب کھانے کی تو پل معلوم ہوا جیسے کوئی شاندار سرکس شہر میں آگیا ہے۔ عورت اسکولوں میں پڑھا رہی ہے۔ ملا جی ہکا بکا منہ دیکھتے رہ گئے۔ عورت ڈاکٹر بن گئی حکیم جی مارے حیرت کے پلکیں جھپکانے لگے۔ عدالت میں وکیل مجاہدت اور عدالت کے مارے [illegible] کا دم رہ گیا [illegible] کہ محنت آرہی ہے۔ وگ گھبرا کر الٹ گئی اور ادھر ادھر میدان مارنے لگے۔ اقتصادیات کے میدان کے ساتھ ساتھ بھلا دل کی دنیا کیوں نہ تاراج کرتی لہٰذا موٹر تماشے کی بچا دی

تو ـــــ یکا یک سپر وومن جسمانی اور دماغی اعتبار سے چاق و چوبند بالکل لیڈروں کی طرح چار اطراف ہاتھ مارنے لگی۔ اب تو مذاق کی حد ہوگئی جو رنگین کھلاتی تھی شہر لگاتی تھی تو کوئی مضائقہ نہ تھا یہ تو ایک عورت کے نخرے ہوئے۔ چوکیداری کرتی تھی۔ ذرا سی بات پر آنسوؤں سے بہلنے لگتی تھی۔ سر دبن کر وقت بے وقت سوار رہتی تھی تو کیا تھا ؟ تھی تو آپ کی دست نگر ! اپنی بی بی بھی تجربہ بار ملتی ہے مگر خود لے کے پھر اپنا نرم گرم جسم پیروں سے رگڑ کر بھی تو سیتی ہے جیتی بھی کرتی ہے۔ خرچ ہے تو کیا ہے تو آپ کی۔ آپ سے تو مانگ کر اترا لیتی ہے۔ ساری جیبوں سے تو کھلا کھلا کر پیسہ نکالتی ہے لیکن یہ بالکل مردانہ وار اقتصادی دنیا میں خم ٹھونک کر جو خود اپنی کمائی کھیر کھسوٹ سے جاتی ہے یہ تو سر سرڈا کرتی ہے ـــ صاف دھوکہ۔

نتیجہ یہ کہ بڑی جلدی یہ سپر وومن ڈائن بن گئی۔ بہت سمجھایا، صاف صاف دکھا دیا کہ ایسی خودسر اور خود مختار عورتوں کا بڑا بد انجام ہو کے حرام کے بچے پیدا ہو جاتے ہیں۔ عصمتیں خاک میں مل جاتی ہیں۔ ساری دنیا جہنم میں جھونکتی ہے۔ دفتر میں کلرک بہکائے جاتے ہیں۔ ہسپتالوں میں ڈاکٹر روگ لگاتے ہیں۔ اسکولوں میں ماسٹر عاشق ہو جاتے ہیں۔ ادھر والدین کو شمع ہدایت دکھائی: اسکول میں پڑھ کر کم از کم ایک بار ضرور ناجائز بچے کی ماں بننا پڑتا ہے پڑھنا لکھنا کچھ نہیں صرف عشق بازی سکھائی جاتی ہے۔ شرم دلائی: بیٹیوں اور بیویوں کی کمائی کھانے ہو۔ ڈوب نہیں مرتے۔ یہ ماسٹر دیکھنے میں کتنا ہی جیسے چرغ گرہ ایک اپنے وقت کا مجنوں اور فرہاد ہے۔ اس وقت کی جو کہانی اٹھا کر دیکھئے بس استاد اور طالبہ کے پرسوز عشق اور عبرت ناک انجام سے پُر نظر آئے گی۔

جتنا یہ ادب بھی اپنا اثر دکھاتا اور بیروں واپس بیچ کے جوڑوں میں سرنگوں ڈھکیل دی جاتی۔ بات یہ ہوئی کہ بازار میں جیسے کہیں زیادہ لڑکیوں کی مانگ ہوتی۔ اگر ایک گریجویٹ میں، روپیہ کماتا تو دولت ایک سو میں دیتی۔ جوں جوں تعلیم نسواں کا رواج ہوتی گئی تعلیم مردوں میں مفقود اور بے مانگ تھی۔ ہیروں نے پریمی سمجھا جائے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک عجیب و غریب کشمکش شروع ہو گئی تعلیم یافتہ لڑکیوں کی مانگ بڑھی، مگر اس تیزی سے نہیں جس تیزی سے تعداد بڑھی۔ جب ایک میٹرک پاس لڑکی لفٹ کی جاتی تھی اب کئی گریجویٹ آگئی ہیں۔ شادی کے بازار میں بڑی افراتفری مچ گئی۔ ایک پڑھی لکھی دولہن کے لئے کم از کم آئی سی ایس یا پی سی ایس ہو، تو ہو جاتی گزیٹڈ لڑکیوں کی تعداد دیکھ کر افسروں کا قحط پڑ گیا۔ تو یہ مصیبت کیوں نازل ہوئی۔ یہ گنے چنے افسر تو امراء کی ڈالیوں میں زیر دام رہ گئے۔ جس نے اونچی بولی لگائی۔ وہی لے اُڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گریجویٹ اور تعلیم یافتہ لڑکیوں کی کثیر تعداد اس انتظار میں کہ کب گزیٹڈ آفیسر برسیں، اور وہ بیٹھی ہیں مختلف محکموں میں نوکر ہو گئیں۔ اس سے یہ ہوا کہ جا بجا افسروں کی تعداد کم رہی تو کلرک، دستیاب اسکول ماسٹر تاکا اور اجڑے ہوئے، ڈر کر نہیں پیدا ہوئے رہ تو بہت ہی شدت سے پیدا ہوئے۔ اب ان بے چارے مالک کے پاس رہ رہتے رہ گئے، یا تو جاہل لڑکیوں سے بعید پھوڑیں یا امیر اور تعلیم یافتہ لڑکیوں سے تخیلی عشق کر کے زندگی ان کی یاد میں گزار دیں۔ تجھوں نے دل پر پتھر رکھ کر بھولے بھالے ان کی جیسی بھی جیون ساتھی کی تلاش میں بھٹکیں۔ زندگی بھر ہم حیات و ہم مذاق بیوی کا ارمان دل میں چھپ کے اتنا سہا اور جو زیادہ ہمت والے تھے وہ پڑوس کی بیوی کبھی کبھی مزا جانے والی اپروڈیٹ حسینہ کی آگ میں سلگتے رہے۔ غرض لڑکے تعداد میں زیادہ بڑھے اور نتیجہ یہ ہوا کہ عورتیں اور مرد پیدا ہوتے گئے اور دنیا میں رہتے رہے۔ ایک دوسرے کے لئے نہیں بلکہ موزوں رشتہ کے لئے، بالکل جیسے ایک دکان میں کپڑے کے تھان پڑے گل سڑ رہے ہوں۔ اور دوسری طرف سڑکوں پر ننگے گھوم رہے ہوں۔ ایک ہوٹل میں باسی مٹھائیوں اور کھانوں کے انبار موریوں میں لنڈھائے جاتے تھیں۔ اور دوسری طرف لوگ فاقوں سے مر رہے ہیں۔ جوں جوں دکانیں اور ہوٹل لوازمات سے بھر جاتے ہیں سڑکوں پر ننگے اور بھوکوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ اسی طرح ایک پنجرے میں لڑکے اور دوسرے میں لڑکیاں بند کر کے بیچ میں چال چلن کے پہرے دار بٹھا دیئے گئے۔ لڑکیاں کنواری بیٹھی سوکھ گئیں اور مرد لڑکے حیوان بنتے چلے گئے۔ نتیجہ یہ کہ انسانیت زیادہ بھوکی اور منحرف اور غیر انسانی بنتی گئی۔ اور پھر ایک ایسا طبقہ پیدا ہوا جو برسوں کی چھپی دبی خواہشوں کے مواد کی طرح پھوٹ پڑا۔ اس نے جو پہلا کام زیادہ تخریب تھا۔ بڑھتے گئے ہوئے پیڑ کا تنا اکھاڑ سے بغیر نیا پودا لگانا دشوار ہے پاس نے مکان کو ڈھا کر ہی نئی کوٹھیاں بنائی جا سکتی ہیں۔ سب سے پہلے تو عورت اور مرد کے بیچ میں جو پاسبان بیٹھا تھا اس سے مڈبھیڑ ہوئی۔ چونکہ بغیر عورت کے دنیا ادھوری تھی گھر میں اپنی کمائی سے عورت رکھنے کی نہ ہی اقتصادی حالت نے اجازت دی اور نہ پاسبانوں نے۔ لاچار ہو کر وہ واپس طوائف کی آغوش میں جا گرا۔ گرہست بیروں کے راج میں طوائف مٹ مٹا کر خاک ہو چکی تھی۔ ماقدری اور کھنکار نے اسے صورت سے بے صورت کر دیا تھا۔ کچھ دلیا بیسوا کر نکاح کر بیٹھی تھیں۔ کچھ لبی چوڑی دکانیں لٹوا کر گندی نالیوں کے پاس خوانچے لگا چکی تھیں۔ کچھ نے روپ بدل ڈالا تھا۔ اور جیسے طوائف بیروں سے مرد کو چھیننے کے لئے گرہستن نے گھونگھٹ اٹھایا تھا۔ آج اس نے اسی پھینکے ہوئے آنچل میں منہ چھپانے کی کوشش کی تھی کبھی گرہستن نے اس ہتھکنڈے اور ناز و سنگار چھینے تھے آج اس نے گرہستن کی بے چارگی اور بے کسی کی کڑی لی اور مواسے بالکل نچلے طبقے کے طوائف کو پہچاننا بھی دشوار ہو گیا تھا اور جب یہ باغی طبقہ طوائف کی تلاش میں نکلا تو اس کی حالت زار دیکھ کر اس کا جی دہل گیا۔ طوائف اب وہ سرشار کی چہکتی ہوئی بلبل نہیں رہی تھی بلکہ بھوکی کینی بلی بن گئی تھی۔ سوائے فقیروں اور یکہ تانگے والوں اور مزدوروں کے کسی کو اس کا نام و نشان بھی معلوم نہ رہا تھا۔ اپنا مطلب تھا تو اسی طوائف کو شعر میں پروکر قصیدوں میں گوندھ کر ناولوں میں سجا کر ادب کر اس کی لونڈی بنا دیا اور پھر جو بھولے تو ایسا بھولے کہ لوٹ کر خبر بھی نہ لی۔ گھر میں نل لگ گیا تو میٹھے پانی کی کنویا کو ایسا فراموش کیا کہ اندھی ہو کر سانپوں اور کنکھجوروں کا مسکن بن گئی۔ اور اب وقت پڑا تو اسی کے کنارے پیاسی زبانیں نکالے ہانپ رہے ہیں۔ یہی نہیں

بلکہ میونسپلٹی سے کہہ کر صفائی کرانے پر تلے ہوئے ہیں مگر یہ اندھا کنواں دوبارہ کارآمد ہونے سے پہلے بڑی سخت مدد کا طالب تھا جو کچھ باغی طبقہ اس کی حمایت میں چیخ چلا پکار پکار کر اس نے دنیا کے اس زخم کو دکھایا جو ناسور بن کر بجبجا رہا تھا۔ ادیب [illegible] اس طبقے کی حفاظت کرانے کو [illegible] جس کی تھی۔ اس کے کلام آ سکتی تھی۔ اسے سارا حسن اور تمام لطافتیں اس گھیالی اور دیہاتی میں نظر آتی جس نے دنیا بھر کی غلاظتیں جذب ہو چکی تھیں۔ مگر برا لگ سکتی تھی۔ ناقدری کی وجہ سے وہ گر گئی تھی اور اسی کے کرم کی محتاج تھی شریف عورت اس لوگوں کی زندگی سے دور تر ہوتی گئی اور اس کے بارے میں نہ کچھ جان سکا اور نہ اس نے جاننے کی کوشش کی۔ مرد کی نظروں میں وہ [illegible] محبوس [illegible] غیر مخلوق بن کر رہ گئی جو پیار بھری نظروں کو گناہ اور عشق کو گناہ سمجھتی ہے۔ جو محبت کرنا پاپ سمجھتی ہے، اور مرد کی حفاظت اپنی توہین۔ اس میں عام طوائف جیسی لذت کہاں کھانا کی جاذبیت کہاں۔ عام طوائف سے وہ طوائف مراد نہیں جو بڑے آدمیوں کی دنیا میں چمکا کرتی ہے بلکہ سڑک کی وہ ننگی بھوکی کتیا جو راہ چلنے کی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹتی ہے جو ہر قیمت پر ہر حیثیت کے انسان کو لنگر بانٹتی ہے اس کی گندگی وہ غلاظت محض لکھنے کی چیز نہیں بلکہ اصلاح کی محتاج ہے۔ اگر سامنے مکان میں نالی سڑ رہی ہے تو یہ اس بیچاری نالی کا قصور نہیں بلکہ مکان دار کا قصور ہے۔ اسے گندہ کہہ کر منہ موڑ لینے سے گندگی دور نہیں ہو جائے گی [illegible] گندی اور بیمار، [illegible] اور جعلساز ہے تو اس کا قصور نہیں بلکہ اس نظام کا قصور ہے جو انسانیت کی یوں بے قدری کرتا ہے۔ [illegible] سے طوائفوں کا علاج کرتے تک ایک متعفن پھوڑے کا منہ کھول دیا جس نے نازک مزاج لوگوں کی لطیف طبیعتوں پر بڑا اثر ڈالا مگر اس پھوڑے کا مواد نکل جانے سے دنیا کے [illegible] کچھ مٹ جانے کا امکان پیدا ہو گیا۔ طوائف کیسی ہی ذلیل ہو، ہماری دنیا کے جسم کا ایک حصہ ہے اسے بڑا کر نہیں پھینکا جا سکتا۔ لوگ اسے عورت نہیں مانتے۔ وہ جو دنیا کے ہر دکھیا سے کا سہارا، ہر بھوکے کا دستر خوان ہے۔ وہ بے شک عورت نہیں مگر اس سے بھی زیادہ کارآمد ہستی ہے یہی وجہ ہے کہ آج کل کا نوجوان گرہستی سے زیادہ بازاری مال کی بہتری کا خواہاں ہے۔ وہ اس کی زندگی سے زیادہ قریب ہے۔ [illegible] جو تعمیر نسواں نہیں ہوری یا بیوائیں بن بیاہی سوکھ رہی ہیں یا میاں بیویوں کی ناکیں کاٹ ڈال رہے ہیں اس کی بلا سے دنیا بھر بیوہ ہو جائے اور عورت بننے پاتی ہے۔ دیکھئے نا آپ کے محلے کی نالی خراب ہو جاتی ہے تو آپ غل مچا دیتے ہیں اور آپ پروا نہیں کرتے کہ اس سال نالی کی وجہ سے [illegible] عمدہ بیج نہ بوئے جا سکے اس لئے اس سال تختۂ گل کی بہار سے لوگ محروم رہ جائیں گے آپ کی بلا سے پھول کھلیں یا نہ کھلیں مگر نالی ضرور صاف ہونی چاہئے۔

اب خواہ دنیا موجودہ ادب کی ہیروئن کو ناپاک، عریاں اور مکروہ کہے زمانے نے ہیروئن کا رتبہ دے دیا۔ یہ زمانے کی نشیب و فراز کی ڈھالی ہوئی اینٹ ہے جو تعمیر میں اپنی جگہ پا گئی۔

یہ تو ہوئی ہیروئن سرشار کی ناز و ادا بھری نازنین، جسے دنیا میں سوائے کھانے پینے اور عشق کرنے کے کسی بات کی فکر نہیں ——— میں نے غلط لکھا ایک بات کی بے انتہا فکر ہے اور وہ عشق لڑانے کی۔ یہ زمانہ ہے فارغ البالی کا۔ پھر اس کے مقابلے میں پریم چند کی مظلوم عورت، اور راشد الخیری کی کچلی ہوئی بہو۔ یہ زمانہ ہے اقتصادی کش مکش کا اور سدھار کا، پھیکے مزاج نگاروں کو ——— یہ ہنس سکے اور نہ رو سکے۔ چڑی یا سگن، نہ آگے جانا نہ پیچھے ہٹنا۔ پھر ایم اسلم کی سادہ ہوئی لڑکی جسے سوائے ندی کے کنارے [illegible] جانے ناول سے پریم کی پینگیں بڑھانے اور بھونرے کے ساتھ گیت گانے کے اور کوئی کام نہیں مس حجاب کی بے وقت، کاہل اور بے مصرف دوشیزہ جسے سوائے چوہوں سے ڈر کر بے ہوش ہو جانے کے اور کچھ نہیں آتا ——— جہاں حسن و عشق کو بناوٹ نے [illegible] بنا رکھا ہے۔ یہ زمانہ ہے [illegible] کا۔ اور پھر کرشن کی زندہ عورت، بیدی کی کاروباری ہیروئن، منٹو کی جیتی جاگتی سب کی جانی پہچانی بے حیا رنڈی، عصمت کی بے چین منہ پھٹ اور بے شرم لڑکی، ستیارتھی کی خانہ بدوش، عسکری کی فلسفی میم صاحب ——— یہ زمانہ ہے زندہ رہنے کے لئے لڑ مرنے کا، کچھ تعمیر کرنے کے لئے جدوجہد کا، کچھ مٹانے کے لئے اور کچھ بنانے کے

لئے دین و دنیا کو تیٹ کرنے کا۔ جیسا کہ موجودہ فضا سے ظاہر ہو رہا ہے۔

اب دیکھنا ہے کہ ہماری آئندہ زندگی کی ہیروئن کس شان سے جلوہ افروز ہوتی ہے۔ خدا کے بعد عورت ہی کی پرستش ادب میں کی گئی ہے یا شاید اس کا نمبر پہلے آتا ہے۔ اور پھر دنیا کی دوسری طاقتوں کا۔ جہاں تک اندازہ لگایا جاسکتا ہے آنے والی ہیروئن نہ تو ظالم ہوگی نہ مظلوم بلکہ صرف ایک عورت ہوگی۔ اور ماہرین دیوتاؤں کے بجائے ادیب اسے عورت کا رتبہ ہی بخشیں گے اور پھر تعمیر شروع ہوگی۔

(ایک بنت)

---

custom to re-marry should live in misery, if jealous husbands should chop off their wives' noses. It would matter little to him if all respectable women were widowed or if the whole of their tribe was wiped out. It is the drain in his own neighbourhood that he wants cleaned up. Whether the flowers in other people's gardens bloom or not is a matter of complete indifference to him, for in any case he has no access to such well-kept places. The heroine of present-day fiction may be an unclean outcaste. Nonetheless she has been shaped and moulded by the vicissitudes of life itself and it is good that she has at last caught the artist's eye.

Faked Romance

Well, such is the story of our heroine. We have seen her as Sarshar's alluring courtesan, who ate and drank and was merry without a care in the world, except the worries of love-making. That was in the age of grace and good living. Next, we met her as "Prem Chand's" obedient housewife and Raashid-ul-Khairi's pathetic, downtrodden widow. That was in the age of economic stress and social reform. Next came the humorists, full of fun and laughter, complacent and static. And then the period of drowsiness, in which the sadhu's young daughter of M. M. Aslam's stories wandered dreamily on the banks of brooks, singing among the butterflies and dallying with the passers-by, and Hijab's stupid, indolent and futile maidens swooned away at the sight of a mouse and lived in a world of faked beauty and faked romance. And now, in our own day, we see our heroine as the living woman in Krishna Chandra's stories, as the business like woman in Bedi, as the lively, impudicious, common harlot in Manto, as the restless, outspoken unblushing girl in Ismet, as the nomad in Satyarthi and as the philosophising mem-sahib in Askari -- all pointing to the fact that ours is the age of conflict ; of the struggle to live; to shape and to build , to destroy, in order to create ; an age, in which everything between heaven and earth must be evaluated anew.

In fiction, woman is invested with a power greater than all other forces of nature, second only, if at all, to the Almighty. We must wait and see what role is assigned to her in the days to come. As far as one can peep into the future, the heroine of the coming age will be neither tyrant nor martyr, neither goddess nor hell-hag. She will be just a woman and writers will proclaim her as such. When that happens, the foundation of our fiction will have been well and truly laid.

had once borrowed her allurement and charm, she now adopted the submissive ways of the homely woman So much so that unless she was the lowest of the low, it was difficult to recognise her as the prostitute. When the rebels at last sought her out, they were shocked to find her sunk so low that only the beggars, the coolies and the tonga-drivers knew where she lived. She was no longer the sweet little songstress of Sarshar's novels, but only a mangy and mean-looking cat rummaging about in the refuse heap. In the days gone-by, when man depended on her for his moments of supreme joy, how he had extolled her in prose and poetry, how fiction had paid homage to her charm and beauty! And how man had cast her aside now! Having installed a water pump in his house, he had let the wells of sweet water fall into disuse, till they were infested with reptiles and vermin. Panting with thirst, with his tongue hanging out of his mouth, he now returned in his desperation to the same wells.

Young Crusaders

Not only did he return, but he demanded that the municipality should clean them up and keep them in good repair. For, such a lot had to be done before the prostitute could once more become useful to him. So the rebels vehemently took up her cause and exposed this festering sore to the gaze of the world. Impecunious but spirited young men crusaded for her, for she, whom no one else seemed to want, could be a great source of comfort to them. They discovered all the beauties of the world in this wretched, down-and-out, fly-blow street-walker who lived in such filth and squalor because she was about the only kind of woman they could consort with The respectable woman had so far receded from their life that they hardly knew anything about her and cared even less To them she was just a snooty, selfish sham of a woman who was outraged at every offer of love and indignant at the suggestion of male protection She lacked the squalid fascination of the harlot—not this time the demi-mondaine who scintillated in the highest social circles, but the hungry, street-bitch who tugged at every passer-by's leg and gave herself to every one for a handful of coppers. Her squalor, they argued, was not something to be shunned but a wrong to be redressed. If she had no morals or scruples, if she was filthy and disease-ridden, the fault was not hers but of the social system which permitted human beings to sink so low The new writers, by dwelling on this theme, did a great deal of muck-raking which offended the fastidious, but they helped, nevertheless, by their frankness to lighten the burden of human misery However disgusting the prostitute, she is after all part of our life and one cannot ignore her simply because she is unpleasant to contemplate. Because she is the common refuge of many frustrated and hungry men, because she is there for any one to have, the world denies her the status and dignity of woman. But she is even more useful than an ordinary woman. That is why the young crusader of to-day is more solicitous about her well-being than about the welfare of the woman-in-the-home whom he finds so aloof and remote. It is of no concern to him if women's education should not make much headway, if thousands of widows forbidden by

New Problem

In time, the supply outstripped the demand. There was a time when you had to go far to find a girl who had passed her school, now you found a whole crop of women graduates jostling with each other in the marriage market. This created a new problem. How could an educated woman marry any one who was not, at least, a civil servant? But Government unfortunately had forgotten to arrange that the number of its civil servants should keep pace with the number of educated women waiting to marry them. There was, therefore, a regular scramble for each eligible young man that appeared on the horizon and after he had been grabbed by the highest bidder, the rest of the crowd of women graduates returned to their perches and lay in wait for the next, taking up various jobs in the meantime

In the world of men, on the other hand although civil servants were few and far between, ill-paid school teachers and penniless doctors were rapidly growing in number. These unfortunate men had only two courses open to them to marry some uncouth simpleton and be miserable for ever, or pine away, dreaming of a life of eternal bliss with this or that woman of education, refinement and charm Some did both. They married as the fates ordained and at the same time continued to torture themselves with dreams of the ideal soul-mate. Most of them, of course, just fell in love with the chic young lady in the neighbourhood, who though utterly unapproachable was at least occasionally visible in the flesh.

So our world filled more and more with men and women whom nature had made for each other but whom the match-maker could not "suitably" pair off. It was a scene of poverty in plenty warehouses full of cloth and the streets full of naked people , food overflowing into the gutter and people starving by the thousand, all the men imprisoned in one cage, all the women in the other and Mrs-Grundy standing guard in the middle Young women languished and became faded old maids , young men became sex obsessed brutes, and the pangs of hunger dehumanized both and warped their souls.

At last the pent up forces found an outlet. These stresses and strains threw up a band of rebels, who set out to destroy, to uproot the old tree and plant a new one in its place, to demolish in order to build afresh. They first crossed swords with Mrs Grundy. She would not be easily bound and gagged. But what finally defeated their efforts was the impassable economic barrier that stood between them and the women of their choice. Thwarted and frustrated, man once more returned to the courtesan's bosom.

But the great courtesan of the early days was now just a common harlot. Gone was her glamour, for during the reign of the domestic heroine, she had been robbed of all her glory, and poverty and neglect had put their hideous stamp on her face. Some had sought refuge in marriage, some still plied their trade in the gutter, others camouflaged themselves as respectable women Years ago, the woman-in-the-home had thrown aside her veil to win back her man from the courtesan. The bankrupt courtesan now picked up this discarded symbol of modesty and tried to disguise herself in it. Just as the respectable woman

Unperturbed, the woman not only kept her hold, but set about tightening it, if she could. She discovered, for example, that her economic dependence on man was a bad chink in her armour which she must close up She started in a small way, by taking in the neighbours' needlework, but very soon was found crawling about in every corner of the career market. The novelty of this role added to her charms. Let woman but appear in a new guise and even the husband would fall in love with her. She became a school-teacher and the old mullas gaped at her in wonder. She became a doctor and ancient apothecaries could hardly believe their eyes. She pleaded in law courts and men in the profession stammered and spluttered in her presence. The advent of the career woman was like a grand circus come to town: every one leaned out to watch and stare. Men shouted: "Look out, for there comes the New Woman", and fled in confusion. She advanced steadily and conquered new fields The more she cut into men's wages, the more she captured their hearts.

This was too much of a good thing This wage-earning heroine, physically fit and mentally alert, waylaid man like a brigand, So long as she was just saucy and pert and boisterous, she was rather delightful. Even if she was spoiled and moddlesome and difficult to shake off and somewhat of a nuisance, as long as she depended on man for her bread and butter, she was quite acceptable. Now and then, perhaps, she put out her claws but in the end she always made up for it by rubbing her soft body against his legs and putting him into good humour again. Vain and extravagant, she was nevertheless man's property, proud to live on his charity and willing to pamper him to earn her keep. For her, now, to fight man as his equal in the economic field and to cheat him of his last superiority over her was sheer highway robbery !

In fact, she became quite a terror and writers felt called upon to point out the error of her ways. They told her that independent women always came to grief; they were ravished, had illegitimate children, were seduced by clerks and doctors and school-teachers with whom they came into contact, were shunned and despised by society. They put husbands and fathers to shame for living on the earnings of their wives and daughters. They warned parents that in the schools and colleges, their daughters would learn nothing but lovemaking and would end up as unmarried mothers, for these weedy-looking school-masters were all gay Lotharios in disguise Every other story written during this period is at pains to show how the school-girl and her teacher succumb to temptation, have a passionate affair and come to a pitiful end.

Deterred by this type of fiction, the heroine might have returned to her husband like a penitent who had learnt her lesson, but for some reason, just about this time women began to fetch higher salaries than men, which enabled our heroine to consolidate her newly acquired position. As education paid higher and higher dividends to women, it became less and less profitable to men., Her success at first was partial, for though the courtesan had retreated, the field was held for a while by the Occidental and the Parsee, both of whom were regarded as "fashionable" types and had worked their way into many of our stories. But she, who had vanquished the courtesan, was not likely to be daunted by these. She knew, of course that as long as she stayed at home, there were dangers abroad that she was unable to avert. Confined to the four walls of the house, how could she dispel the loneliness that man would feel away from home? For, when on his jaunts, he rather fancied a woman in one hand as much as he fancied a walking-stick in the other. She was the tonic for domestic use only; how could she sustain him during his business hours, for example? True enough, as a temporary expedient, man did cast hungry looks on the typist girl or the manager's beautiful daughter, or found others to warm his blood. But the domestic heroines of such novels of the period as *Godari ka Lall, Roushanak Begum* and *Zohra Begum* kept up the fight and very much held their own against such pirates.

The role of the docile, homely woman does not, however, seem to have satisfied her for long; for, in the next phase of her career, we find her very much bolder than she had ever been before, archly flirting with her cousins, with her cousins' friends and with the neighbours. She was now transformed into the saucy, boisterous, unabashed, self-assertive female that we find, for example, in Azim Beg's stories. The fact that she was still very much the woman-in-the home living in purdah, added piquancy to the situation and made her sportiveness even more devastating. Beside her fetching ways, the erstwhile charms of the courtesan appeared commonplace, and "Prem Chand's" submissive and goody-goody heroines, insipid and irritatingly inane and their humility almost contemptible. The docile heroine now gave place to a much more robust and hearty female. True, she was unlettered, with no claim to grace or refinement, but she was full of crude vitality and primitive fun. She slapped and kicked and punched and played practical jokes and was up to all sorts of pranks. To the man with the modest income, such a vivacious wife was a great source of joy, brightening up his little home and lending colour to his dreary existence. Life for him had, indeed, become heavenly.

Willing Victim

The male, it is true, is ever the willing victim of the female. After all it was he, who finding even Paradise desolate without her, made her out of his rib. How gladly he hands over the reins to her, be she courtesan or wife, and follows her around. The harder he is driven and the more he is pulled about and whipped, the happier he feels. But once in a while, the limit is reached and the woman turns. It was all very well for our domestic heroine to be the queen of his heart, but when she entwined herself round him and began to bully and dominate and tantalize him and stood guard over his every word and act, man was exasperated. The first groan was at last heard in "Patras," and, later, Azim Beg and Shaukat Thanvi and many others joined the chorus. Before long, our fiction was crowded with male characters like Chacha Chhakkan, Munshiji, Mirzaji, etc, all of whom raised their voice in protest against woman's tyranny.

in those days were household drudges They were the unappetising housewives and dowdy maids-of all-work, from whom men turned to courtesans for heartsease and pleasure. The courtesan of Sarshar's days was not just a vulgar mercenary. She lived as graciously as any blue-blooded lady, except that she was even more refined and possessed greater wit and charm and gaiety. She was the town-garden, maintained by public donations for the pleasure of the community. Not every one could afford a fine house, adorned by an accomplished and elegant wife, flower-decked and attar perfumed. So man adopted a convenient formula for smooth living--in the home, the wife to bear him children and to minister to his daily needs; in the street, the courtesan to appease the hunger of the soul A most useful compromise a world that could thus accommodate both the domestic ideal and the romantic urge.

Jealous of the courtesan, the woman-in-the home grew restive. When man was away from home seeking joy in the arms of the courtesan, she made eyes at the neighbours. Those husbands who had already found the public garden an expensive resort, promptly returned home, arguing that after all the little that belonged to you was better than the much that belonged to all. Having won the first round, the woman-in-the-home gained a new confidence and proceeded to fight the courtesan with her own weapons.

Woman Stoops to Conquer

She proceeded slowly and with caution. At first, she stooped to conquer and insinuated herself into man's affection by following the path of docility and self-abasement In time, Sarshar's imperious courtesan was vanquished by "Prem Chand's" homely woman, and henceforth this soft treading, feet-kissing, modestly-veiled, obeisant creature was found crawling shyly across the pages of fiction Those who used to feast their senses on the riot of colour in the public park, were suddenly attracted by the modest little violet growing in their back garden Surprised, and somewhat proud, to find it there, they began to tend it with gentle care and affection. The courtesan's sway was seriously challenged. Her blandishments were now found to be distasteful and her charms, which had once enslaved the hearts of men, were put down as mere tricks of the trade The water-pump in the public square was contaminated, declared the male--and began to dig a well in his own courtyard. But every day, the well became deeper and deeper, till at last man lost his foot-hold and began to drown.

This stung the courtesan to exasperated fury But her day of glory had passed While she had been resting on her laurels, the modest, ingenuous, homely female had stolen a march over her by using weapons both old and new. On the ruins of the courtesan's world, the woman-in-the-home built her tower of victory and reigned supreme. Men who used to crush her under foot, now took up cudgels on her behalf. Chivalrously, they pilloried themselves and railed against their own kind for their past neglect of her. She watched this tournament with quiet confidence and took no sides. The docile believer in ahimsa fought no one, but just as Gandhiji exasperated the rulers by his acts of renunciation, she, with her downcast eyes and submissive ways, confounded the enemy from behind the veil.

"You clap with two hands, not with one," says the proverb. In literature, the two "hands" are the hero and heroine of fiction. No doubt there is a type of literature which does without them. But that is like striking your hand against the sole of your foot—you make some noise which echoes within the pages of the book, but seldom travels beyond them to the common reader. Banish the hero and the heroine and most literature would be hard to swallow and would stick in the throat like dry bran.

Make a performing monkey and his mate dance to the rattle of a dugdugi and you collect a crowd. Preach and exhort and you lack an audience. People never take kindly to the mosque and the school. So when you have something to say, you lead forth the performing monkey and his mate on a string and rattle the dugdugi. You exhibit the tactics and exploits of the hero and the heroine and collect a crowd. You tickle the senses and seduce the emotions and thus achieve your end. In short, you employ the same stratagem as the wise instructor who wins over his pupil by pretending that what he is about to teach them is just another game, like kabaddi or tip-cat. Sugar-coat the bitterest pill and people will swallow it with delight.

Literature Wedded to Life

How else should the ancient *Mahabharata* and *Ramayana* be as fresh after all these centuries as though it all happened only the other day? Azim Beg Chughtai tried to abolish the purdah by quoting from the Quran and only drew the imprecations of the maulvis on his head. But in *Sharir Bivi* and *Coal-tar* how easily was the veil rent with the help of his lively heroines! Were it not for their heroes and heroines, Raashid-ul-Khairi and "Prem Chand" would now be rotting on the musty shelves of libraries instead of living in the hearts of men. Literature is wedded to society, to history; in other words, to life. Part them asunder and they both wilt and die. Banish the hero and the heroine from literature and you banish life, leaving a void behind.

Of the two, I wish to talk of the heroine and of the social level at which our fiction found her from time to time. For, she is like Jamshed's wine-bowl in which the whole universe and all eternity were reflected. Fix our gaze on her and the entire economic, social and political panorama of her age unfolds before our eyes.

Look, for instance, at the heroines in *Fasana-i-Azad*. They leave you in no doubt that the woman who really mattered in that age was that embodiment of refinement and charm, the courtesan. This is only to be expected, for where could Sarshar have come across a respectable woman in those days, above all a respectable Muslim woman? Respectable women

THE HEROINE IN URDU FICTION

By
ISMET CHUGHTAI
Translated by
A. S. BOKHARI

As a writer of short stories in Urdu, Ismet Chughtai is well known for her studies of middle class life, her intimate knowledge of woman's mind and her pungent prose. This is one of her critical articles appearing in her latest collection " Ek Bat ".

قدیم یونانی حکما اور اُن کے خیالات

(۱)

مصنفین فلسفہ کی تاریخ کو عام طور پر حکما کے اُس گروہ سے شروع کرتے ہیں جو چھٹی صدی قبل مسیح میں ایشیائے کوچک کے کنارے یونانیوں کے بسائے ہوئے شہر ملیطس میں آباد تھا۔ یہ حکما مسئلہ عنصر کے متعلق بہت کچھ سوچتے رہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ دنیا عالم کون و فساد ہے۔ اشیاء بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔ ترکیب کے ساتھ تخریب اور تخریب کے ساتھ ترکیب ہوتی رہتی ہے۔ مگر باوجود اس کے کوئی چیز بھی عدم مطلق سے وجود میں نہیں آتی۔ اور نہ وجود سے عدم مطلق ہی میں چلی جاتی ہے۔ دنیا کی کوئی چیز بالکل ازسرنو تعمیر نہیں ہوتی اور نہ کبھی وہ بھی اختتام ہی پہ پہنچتی ہے۔ ہر ایک چیز تغیر کے لامتناہی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ مگر اہم سوال یہ ہے کہ تغیر کس چیز کا ہے۔ وہ کونسی چیز ہے جو مختلف شکلوں میں آ کر مختلف اشیاء اور اجسام بن جاتی ہے۔ وہ کون سا ایک مادۂ بنیادی ہے جو تغیر پذیر ہو کر مختلف شکلیں اختیار کر لیتا ہے۔ یہ ایک معمہ تھا جس کو حل کرنے پر قدیم یونانی حکما نے اپنی کمر ہمت باندھی۔

سب سے پہلے تھالیس نے پانی کو کائنات کا مادۂ بنیادی قرار دیا۔ اس کے بعد اس کا ہم وطن انیکسی مینڈر آیا۔ اور اس نے کہا کہ یہ مادۂ بنیادی ایک غیر محدود مادہ ہے جس میں سے مختلف اجسام بنتے ہیں۔ اینکسی مینیز نے اس کو ہوا کہا جس کے اجزاء لطیف حالت میں حرارت پا کر آگ بن جاتے ہیں یا منجمد حالت میں ٹھنڈے ہو کر پانی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

مسیح سے ۴۹۴ سال پہلے ایرانیوں نے حملہ آور ہو کر ملیطس کو تاراج کر دیا اور حکما کے اس گروہ کا اپنے مرز بوم میں ہی خاتمہ ہو گیا۔ مگر انہی ایام میں ملیطس سے کچھ فاصلے پر شہر افسس میں ایک فلسفی ہرقلیطس نامی موجود تھا جو ملیطس کے فلسفیوں کا جانشین سمجھا جاتا تھا۔ ہرقلیطس کو دنیا کی سب باتیں قابل تاسف و افسوس معلوم ہوتی تھیں۔ اسی لئے بعد میں وہ "حکیم باکی" کے نام سے مشہور ہو گیا جس طرح سے کہ دیمقراطیس کو لوگ "حکیم ضاحک" کے نام سے پکارتے تھے۔ کیونکہ اُس کے لئے زندگی کی سب باتیں ذریعہ فرحت و انبساط تھیں۔

ہرقلیطس کے نزدیک کائنات کا مادۂ بنیادی آگ ہے۔ وہ تو یہ کہتا تھا کہ ہماری قوت فکر بھی اسی مادی آگ کا ایک حصہ ہے جس سے سرعت سے شعلہ متغیر ہوتا رہتا ہے۔ وہ کسی طرح بھی خیال کی سرعت سے کم نہیں۔ اور شعلے کا آخرالامر دھواں بن جانا خیال کی اس بے ترتیبی اور بے نظمی کو ظاہر کرتا ہے جو شراب کے نشے کی حالت میں واقع ہوتی ہے۔

مگر تاریخ فلسفہ میں ہرقلاطیس کی اہمیت اس وجہ سے نہیں کہ اُس نے بھی اوروں کی طرح کسی چیز کو کائنات کا مادۂ بنیادی قرار دیا۔ جس مسئلہ پر اُس نے بہت زور دیا ہے، وہ خود مسئلۂ تغیر ہے۔ تمام دنیا ایک بہتی ہوئی ندی کی طرح ہے جو ہر وقت اپنے آپ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتی رہتی ہے۔ وہ کہتا تھا کہ ہم ایک ہی دریا میں دو دفعہ داخل نہیں ہو سکتے کیونکہ جس پانی میں ہم نے ایک دفعہ پاؤں ڈالا، دوسری دفعہ پاؤں ڈالتے وقت وہ کہیں کا کہیں بہ جاتا ہے۔ اس مسئلے کو مان لینے کے بعد فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمارے تمام علوم بے سود ہیں؟ جب اشیا کی حالت ہر لحظہ بدلتی رہتی ہے، تو جو بات ہم کسی چیز کے متعلق اس وقت بیان کرتے ہیں، وہ ہمارے منہ سے نکلتے ہی غلط ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وہ چیز بذاتِ خود اس وقت تک بدل کر کچھ اور ہو جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہرقلاطیس کے بعض معتقدوں نے اسی لئے کلام کرنا ترک کر دیا تھا اس کے بجائے وہ اشاروں سے باتیں کرتے تھے۔ کیونکہ جتنے وقت میں ایک جملہ تکمیل کو پہنچتا ہے اتنے وقت میں اس جملے کا مقصود غلط ہو جاتا ہے۔ بعض معتقد تو یہاں تک کہتے تھے کہ ہرقلاطیس کا یہ کہنا کافی نہیں کہ ہم کسی دریا میں دو دفعہ پاؤں نہیں ڈال سکتے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ہم کسی دریا میں ایک دفعہ بھی داخل نہیں ہو سکتے ——————— کیونکہ ایک لمحے کے لئے بھی کوئی دریا ایک حالت میں نہیں ہوتا اور ہمارے پاؤں ڈالتے ڈالتے وہ پہلا ہر ایک دریا بہہ چکا، ایک نیا دریا ہے جو ہمارے سامنے سے گزر جاتا ہے۔

ہرقلاطیس کے مسئلۂ تغیر کے مندرجہ بالا نتائج کو قرطائیس نامی ایک فلسفی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ قرطائیس ہرقلاطیس سے سو سال بعد میں ہوا ہے۔ اور افلاطون اپنے بچپن کے زمانے میں اسی قرطائیس کا شاگرد رہا۔ افلاطون کی پیدائش مسیح سے ۴۲۷ سال پیشتر ہوئی۔ اُس نے اوائل عمر میں جو کچھ اپنے استاد سے اس ہمہ گیر تغیر کے متعلق سنا اُس نے اسے اس بات کی ترغیب دلائی کہ وہ ایسی چیز ڈھونڈے جو اس گردش سے بالاتر ہو۔ جو ازل میں جیسی تھی ابد تک ویسی ہی رہے اور جس کی نسبت اگر انسان کوئی واقفیت حاصل کرے تو وہ واقفیت اور وہ علم ہمیشہ کے لئے درست اور کارآمد ہو۔ یہاں ہم کو اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ ہرقلاطیس اور اُس کے پیرو مسئلۂ تغیر کا اطلاق محض محسوسات پر کرتے تھے کیونکہ محسوسات کے علاوہ وہ اور کسی قسم کی حقیقت یا وجود کے قائل ہی نہ تھے۔ اس لئے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ وہ ان معنوں میں قائلینِ مادیات تھے جن معنوں میں کہ آج کل مادیات کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ انھوں نے محسوسات اور غیر محسوسات کے درمیان خطِ تفریق کبھی کھینچا ہی نہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ قوتِ خیال بھی اسی طرح جگہ گھیر سکتی ہے جس طرح مادہ اور مادہ بھی اپنے اندر قوتِ خیال رکھتا ہے۔ افلاطون عرصے تک کسی غیر متغیر و غیر محسوس حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ اور آخر میں اُس نے منزل پر پہنچنے کے لئے وہ راہ اختیار کی جو ایتھنز کے نامور حکیم سقراط نے اُس کو بتائی۔

دنیا میں بہت سی شاندار ہستیاں ایسی ہوئی ہیں جنھوں نے اخلاف کے لئے ورثے میں اپنی کوئی تحریر یا مکتوب یا تصنیف نہیں چھوڑی۔ اُن کا حال اُن کے ہم عصروں کی روایتوں سے ہی معلوم ہوتا ہے۔ سقراط بھی انہی ہستیوں میں سے ایک تھا۔ اُس کے حالات زیادہ تر یا تو ارسطو فانیس نامی شاعر کے ایک ڈرامے سے ملتے ہیں جس میں سقراط کا مضحکہ اڑایا گیا ہے اور جب سقراط پچاس برس کی عمر کا تھا تو پہلی دفعہ یہ ڈراما اسٹیج پر کھیلا گیا۔ اور اس کے کچھ حالات نامور جرنیل زینوفون کی اُس تصنیف سے بھی کچھ ملتے ہیں جو سقراط کی موت کے بعد لکھی گئی اور یا افلاطون کے مشہور و معروف "مکالمات" سے کچھ پتہ چلتا ہے۔ ارسطو فانیس، زینوفون اور سقراط کی طرح افلاطون بھی ایتھنز کا باشندہ تھا۔ جوانی کی عمر ہی میں وہ سقراط کا شاگرد ہو گیا۔ بعد میں جب اُس نے وہ "مکالمات" لکھے جن کے اندر ڈرامے کی شکل میں اس کے اپنے اُستاد سقراط اور سقراط کے معترضین کے مباحثے مندرج ہیں تو اُس نے سقراط کے ذاتی خیالات کے علاوہ وہ نتائج بھی اُسی کے نام کے ساتھ منسوب کر دیئے جن پر وہ سقراط کے

بتلائے ہوئے راستوں پر چل کر خود پہنچا تھا۔

ارسطوفانیس نے اپنے ڈرامے میں قدامت پسند اہل ایتھنز کا ماننده بن کر سقراط کے نئے نئے عقیدوں کی ہنسی اڑائی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ نئے نئے خیالات اور یہ منطقی بحثیں مذہب اور اخلاق کے لئے از حد مضر ہیں۔ برخلاف اس کے زینوفن سقراط کو ایک کامل رہنما، روحانی مددگار، پرہیزگاری اور نفس کشی کا ایک چلتا پھرتا نمونہ اور ان تمام لغو اور بے ہودہ خیالات کا جو توہم کی اور گمراہیوں کی اصلاح کا باعث نہیں ہو سکتے دشمن بیان کرتا ہے۔ افلاطون نے اپنے استاد کی جو تصویر کھینچی ہے اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح مختلف زاویہ ہائے خیال سے ایک ہی شخصیت کو ان دو طریقوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس دماغی ترقی کے زمانے میں اس زبردست ہستی کے اندر ایک ایسی روحانی تڑپ تھی جو اس کے ہم صحبتوں کے دلوں میں بجلی کی طرح سرایت کر جاتی تھی۔ اس کی شکل و صورت اگرچہ حسین نہ تھی۔ لیکن اس میں وہ مقناطیسی کشش تھی جو شکل یا صورت کی محتاج نہیں۔ وہ ایتھنز کے نوجوانوں کے دلوں کو اس کی طرف کھینچ لے آتی تھی جن کو اس کی صحبت میں بیٹھنے کا موقع حاصل ہوا۔

وہ جانتے تھے کہ سقراط کی گفتگو محض منطقی ڈھکوسلے ہی نہ تھی۔ سقراط منطقی یاوہ گو نہ تھا۔ اس کے دل میں یہ خیال جاگزیں تھا کہ اس کو الہام ہوتا ہے۔ اور خدا نے اس کو ہدایت بنی نوع انسان کے اہم کام پر مقرر کیا ہے۔ یہ خیال اس کے دماغ کو ایک نئی قوت اور اس کی زبان کو ایک انوکھی طاقت بخشتا تھا۔ اس کی آزاد زندگی ان تمام بندشوں سے خالی تھی جن کی وجہ سے ایک دنیادار پابہ زنجیر ہوتا ہے۔ اس کی روش میں غضب کی سادگی اور اس کی عادات میں اعلیٰ درجے کا ضبط تھا۔ ارسطوفانیس جو سقراط اور اس کے معتقدوں کو ایتھنز کے نوجوانوں کے لئے مخرب اخلاق سمجھتا تھا۔ اپنے ڈرامے میں سقراط کی زندگی کا وہ درخشاں پہلوئے حیات ہرگز نہیں بتا سکتا تھا جس پہلوئے حیات نے افلاطون اور افلاطون کی طرح اور سینکڑوں کو سقراط کا گرویدہ کر رکھا تھا۔ ۳۹۹ قبل مسیح میں جب سقراط کی عمر ۷۰ سال سے کچھ زیادہ تھی۔ اہل حکومت نے اس پر دو الزام لگائے اول یہ کہ وہ نوجوانوں کے اخلاق کو خراب کر دینے کا باعث ہوا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس نے اپنے ملک کے دیوتاؤں کو ماننے سے انکار کیا ہے۔ حکم دیا گیا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے زہر کا پیالہ پی کر ہمیشہ کے لئے اپنی غیر مفید ہستی کو مٹا دے۔ سقراط اگرچہ چاہتا تو جیسا کہ قانون اس کو اجازت دیتا تھا۔ اپنے جرم کے کچھ حصے کا اعتراف کر کے اپنی سزا میں تخفیف کرا سکتا تھا۔ اگرچہ خود نادار تھا۔ مگر اس کے پیروؤں میں سے اکثر ایسے متمول تھے جو اس کے لئے بڑے سے بڑا جرمانہ ادا کر سکتے تھے اور صرف یہی نہیں۔ بلکہ اگر وہ چاہتا تو اس کی ایک جنبش ابرو کی تعمیل میں اس کے بے شمار دوست اس کو قید سے نکال لے جاتے اور وہ اپنی باقیماندہ عمر اپنے وطن سے باہر آرام و آسائش میں کاٹتا۔ مگر مرتے دم تک اس کو اپنی بے گناہی کا یقین رہا۔

قانون کی خلاف ورزی کو وہ گناہ سمجھتا تھا۔ اور قید سے بھاگ جانے کا اس کے دل میں کبھی خیال تک بھی نہ آیا۔ جو الزام اس پر لگائے گئے ان میں سچائی صرف اتنی ہے کہ سقراط کا بعض ایسے گروہوں سے میل جول تھا جنہوں نے مذہب میں نئی نئی رسمیں اور بدعتیں پیدا کیں۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اس نے بذات خود مذہب کی علانیہ مخالفت کی ہو۔ اگرچہ اس کا کبھی کبھی الہام وغیرہ کے متعلق ذکر کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے عقیدوں کا چنداں قائل نہ تھا۔ سقراط کی تعلیم کا نوجوانوں پر یہ اثر ہوا کہ ان میں راست روی اور ضبط نفس کا مادہ پیدا ہو گیا۔ مطلق العنان زندگی کی بداخلاقیوں اور بدعنوانیوں سے کنارہ کش ہو کر وہ اپنے استاد کے نقش قدم پر چلنے لگے اور پاکیزگی اور نیکوکاری کو اپنی زندگی کا مقصد اعظم سمجھ کر اسے ہمیشہ اپنے مد نظر رکھنے لگے۔ تخریب اخلاق کا شبہ محض اس وجہ سے پیدا ہوا کہ ایام جوانی میں سقراط کی دوستی چند ایسے اشخاص سے تھی۔ جو بعد میں اپنی باغیانہ حرکتوں کے لئے بدنام ہو گئے۔ سقراط اپنی حکومت کی کمزوریوں سے پوری طرح آگاہ تھا۔ پھر بھی مرتے دم تک قانون کا پابند رہا۔ اس کے مشہور جانبداروں میں سے افلاطون تو سپارٹا کی حکومت کو ایتھنز پر ترجیح دیتا تھا۔ اور زینوفن ایتھنز کو چھوڑ کر سپارٹا کی فوج میں شامل ہو گیا۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ

ہرقلیطس کے عقیدۂ تغیر کی وجہ سے افلاطون کا دل تذبذب کی حالت میں تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ اگر ہر ایک چیز ہر لحظہ بدلتی رہتی ہے تو علم کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ اشیائے تغیر کی وجہ سے اُن کا علم بھی ہر لحظہ متغیر ہونا چاہیئے اور متغیر علم کا حاصل کرنا بے سود ہے۔ ان خیالات سے اُس کے دل میں کسی ایسی چیز کی جستجو پیدا ہوئی جس کی حالت ابدی ہو اور جس کا علم آئندہ کے لئے درست ہو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کس طرح سے وہ سقراط کے بتائے ہوئے راستوں پر چل کر اس علم صحیح پر پہنچا۔

سقراط ایتھنز میں فرقہ سوفسطائی کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا۔ ان دنوں میں "سوفسطائی" محض دانا یا حکیم کے معنوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ دنیا سقراط کو "سوفسطائی" کہتی تھی۔ مگر سقراط کے پیرو اس کو ان لوگوں کا دشمن خیال کرتے تھے جن کو "سوفسطائی"[1] کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہ لوگ اپنی تعلیم سے اس بات کی اشاعت کرتے تھے کہ نیکی اور بدی میں تمیز قدرت کی مقرر کردہ اور ابدی نہیں ہے۔ اس تمیز کا انحصار محض رسم و رواج پر ہے۔ جس فعل کو ایک حالت میں "نیکی" کہا جاتا ہے، وہی فعل بعض اور حالات کے باعث "بدی" بن جاتا ہے۔ جس پر خطر زمانے میں ایسے بیہودہ خیالات سے وابستہ مرد زندگیوں کے عقیدے سے متزلزل ہونے کو تھے۔ اور اخلاق انسانی ایسی ہی بحثوں سے معرض خطر میں تھا۔ اس وقت سقراط آگے بڑھا اور اُس نے اپنی نیک نیتی اور صحیح العقائدی سے لوگوں کی رہنمائی کی۔ اس نے کہا "ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ایک کام جو ایک حالت میں ٹھیک ہوتا ہے، کسی اور حالت میں برا ہو۔ اور اس صورت میں ہم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ وہ فعل "نیک" یا "بد" ہے۔ مگر ہمارے ان فقروں سے کم از کم یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ نیک و بد کچھ معنی اور حقیقت ضرور رکھتے ہیں۔ مثلاً جب ہم کسی شخص کی دیانتداری جاننا چاہیں تو ممکن ہے کہ ہم کو اس کی نیت کا حال معلوم نہ ہو یا ہم حالات سے بے خبر ہوں۔ اس طرح وہ واقف نہ ہوں اور ہماری رائے اس کی دیانتداری کے متعلق غلط ہو۔ ہم کہیں گے: "میرا خیال تھا کہ وہ دیانتدار ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ میں غلطی پر ہوں۔" مگر ہم یہ کبھی نہ کہیں گے کہ "ہم جانتے ہی نہ تھے کہ دیانتداری کیا چیز ہے۔" کیونکہ ہم اگر دیانتداری ہی سے ناواقف ہوتے تو غلط یا صحیح رائے کس طرح قائم کر سکتے تھے۔ اس لئے سب سے مقدم یہ ہے کہ ان الفاظ سے جن کو منطق میں موضوعات کہا جاتا ہے، پوری طرح واقفیت ہو۔ مثلاً سچا، منصف، بہادر وغیرہ اور ہر ایک کی تعریف کر کے اس کے معنوں کی توضیح کریں۔"

سقراط کے ان خیالات نے کہ انصاف، بہادری وغیرہ وغیرہ حقائق ابدی ہیں اور ان کے معنوں کی تحلیل اُن کی تعریفوں سے ہو سکتی ہے، افلاطون کو اندھیرے میں ایک ہدایت دکھائی۔ ہرقلیطس کے عقیدوں نے علم صحیح کے رُخ تاباں کے آگے شک و گمان کی ایک دھندلی سی نقاب ڈال رکھی تھی۔ جس کو سقراط نے اپنے انوار ادراک سے تار تار کر دیا۔ یہ حقائق "محسوسات" کے نمونے سے باہر ہیں۔ اشیا کا احساس ہمیں اپنے حواس خمسہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک اُن موضوعات میں سے کسی نہ کسی کی محمول ہوتی ہے۔ مگر اس موضوع کو بذات خود ادراک سے تعلق ہے۔ نہ کہ حواس سے۔ سقراط ان باتوں سے اس نتیجے پر پہنچا کہ ماسوا محسوسات کے علاوہ جن میں اشیا ہمیشہ انتقال و تغیر کی حالت میں رہتی ہیں اور جہاں کسی چیز کا علم کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ ایک اور دنیا حقائق ابدی کی بھی ہے۔ اور ان حقائق کا علم بھی اُن ہی کی طرح ابدی ہے۔ عالم متغیر کی ہر ایک چیز کے ساتھ ایک حقیقت ابدی ملحق ہے۔ اور جو رائے ہم عالم متغیر کی کسی چیز کی نسبت دیتے ہیں۔ اس میں اس حقیقت ابدی کا علم بھی مضمر ہوتا ہے۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ "فلاں شخص دیانتدار ہے" تو اس فقرے میں اس بات کا اقرار ہوتا ہے کہ ہمیں دیانتداری کی حقیقت کا علم ہے۔

سقراط نے اس بارے میں اپنے خیالات اخلاقیات کے دائرے تک ہی محدود رکھے۔ مگر افلاطون بہ آسانی اس سے بہت آگے چلا گیا۔ اور اس نے ان متغیر اور ابدی حقائق کا اطلاق ہر ایک چیز پر کیا۔ مثلاً یہ کہنا کہ خط ا ب خط ج د کے مساوی ہے، مساوات کے علم کو تسلیم کرنا ہے۔ تو مساوات گویا ایک ایسی حقیقت ابدی ہے جس کا احساس حواس خمسہ سے نہیں بلکہ ادراک سے ہو سکتا ہے۔ "مساوات" بذات خود وجو

کی مجموعہ آج بھی ہے۔ اور کل بھی رہے گی۔ کیونکہ ہمیں معلوم ہو جانے [illegible] [illegible] درحقیقت اس میں پائی ہیں۔

یہ مسئلہ حقائق ابدی (افلاطون کی تعبیر میں) کا ہے جو بنیادی ہے۔ افلاطون ان حقائق کو اپنی زبان میں IDEAS کہا کرتا تھا یعنی [illegible] [illegible] ہر جگہ موجود ہے۔ [illegible] اس سے معنی اب ان معنوں سے [illegible] ہیں۔ جن معنوں میں افلاطون نے ان کو استعمال کیا۔

(۲)

کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ ابدی حقائق [illegible] ایک شخص کا نتیجہ ہے [illegible] [illegible] درحقیقت یہ کہنا غلط ہوگا کہ ہر فلاطینس اور [illegible] کے علاوہ اور بھی [illegible] نے اس [illegible] خرافات کو [illegible] اس نے [illegible] فیثا غورسیوں سے کیا [illegible] فیثا غورس [illegible] سے تقریباً ساٹھ سال پہلے جزیرہ ساموس [illegible] یہ جزیرہ استیلیے [illegible] کے ساحل کے ساتھ ہی واقع ہے۔ جہاں سب سے پہلے وہ یونانی علما قدر [illegible] کیا کرتے تھے جو بعد میں [illegible] یونانی آبادیوں میں [illegible] اور جن کی وجہ سے جنوبی اٹلی [illegible] کے نام سے مشہور ہے۔

فیثا غورس نے ایک مذہبی جماعت کی بنیاد ڈالی جس نے کچھ عرصے کے لئے کروٹونا کی حکومت پر غلبہ پایا۔ [illegible] زمانے سے ملنے کو [illegible] تعلق [illegible] خیال [illegible] ان کی [illegible] کوئی ذی شعور [illegible] عبادت [illegible] بلکہ اس نقطہ سے [illegible] کا مقصد محض نظام مادی کو ایک [illegible] تھا۔ [illegible] ایک طرف ان [illegible] توہمات اور [illegible] کو جن سے لوگوں کے اعمال اور خیالات کا [illegible] ہو چلے تھے [illegible] رسم و رواج [illegible] دوسری طرف اپنے [illegible] اور عقیدہ [illegible] روح سے عظمت فرد پر اور انسانی زندگی کی [illegible] کے احساس کو لوگوں کے دلوں میں بڑھا دیا۔ اس نے یہ بات دنیا کے دل نشین کر دی کہ [illegible] اور [illegible] حرمت [illegible] سمجھنا چاہئے۔ انسان ایک ایسی حقیقت [illegible] جس [illegible] آتش [illegible] تمثیل کسی طرح [illegible] کی طرح فیثا غورس علاوہ حکیم ہونے کے [illegible] سمجھا جاتا ہے [illegible] کو بتایا جاتا ہے۔ افلاطون کے زمانے میں فیثا غورسیوں کی شہرت نہ صرف بحیثیت عالی دماغ حکما کے بھی [illegible] کے انتقالات پر غور و خوض کیا کرتے تھے بلکہ ساتھ ہی وہ جید ریاضی دان اور موسیقی کے ماہر بھی شمار کئے جاتے تھے۔

ریاضی اور مذہب دونوں میں فیثا غورسی عقائد نے افلاطون پر بہت سا اثر ڈالا۔ افلاطون خود بھی بڑا ریاضی دان تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کی درس گاہ کے دروازے پر لکھا ہوا تھا کہ جو شخص ہندسہ نہ جانتا ہو اس کو اندر آنے کی اجازت نہیں۔ علاوہ ازیں مادی حقائق کے ابدی حقائق کے موجود ہونے کا [illegible] فیثا غورسی بھی اپنے عقیدے [illegible] ظاہر کر چکے تھے کہ کائنات کی اصلی بنیاد اعداد میں پائی جاتی ہے۔ پہلے پہل فیثا غورس کو اس بات کا خیال اس وقت آیا جب اس نے یہ دریافت کیا کہ موسیقی میں نغمے کا انحصار سُروں کے تناسب پر ہے [illegible] جب علم ہیئت کے دائرے کے وسیع ہو جانے سے [illegible] مظاہر قدرت کو ریاضی کی پیمائشوں اور عرض و طول کے مسائل سے تطبیق دیا گیا تو اس خیال کو اور بھی تقویت مل گئی۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ افلاطون کے دریافت کردہ حقائق ابدی میں علاوہ اعداد کے اور بھی کئی باتیں شامل ہیں۔ مگر افلاطون اور افلاطون سے بڑھ کر اس کے پیروؤں کی یہ عادت تھی کہ وہ ان حقائق کا ذکر جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا فیثا غورسیوں کی طرح ریاضی کی اصطلاحات

میں کیا کرتے تھے۔ جس طرح کا تعلق افلاطون کے عقیدۂ حقائق ابدی اور فیثا غورس کے عقیدہ اعداد میں پایا جاتا ہے۔ اسی طرح کا تعلق ان دونوں حکیموں کے عقائدِ روح میں بھی ہے۔ افلاطون کے مطابق روح ایک ایسا رشتہ ہے جو حقائق اعلیٰ کی غیر فانی دنیا (جس میں کہ روح اپنی عقل اور ادراک سے سب چیزوں کو سمجھتی جانچتی ہے) اور فانی۔ تغیر پذیر۔ مادی دنیا کے درمیان حائل ہے۔ علاوہ ازیں یعنی موخر الذکر دنیا کے متعلقات۔ حرکت اور انتقال سب روح کی بدولت ہیں۔ روح ہی تمام حرکت کا منبع ہے ——————— یہی ایک ایسی چیز ہے جو بذاتِ خود حرکت کر سکتی ہے۔ اجسام صرف اُسی حالت میں حرکت کر سکتے ہیں۔ جب یا تو ان کو کوئی دوسری چیز حرکت دے۔ یا (جیسا کہ تمام جانداروں کی کیفیت ہے) خود ان کے اندر روح موجود ہو۔ جب روح کی سب سے بڑی کارپردازی اس کی وہ کیفیت نفسی ہے۔ جس کی بدولت وہ ہر ایک حقیقت ابدی کو سمجھتا ہے تو افلاطون اس کے سوا اور کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ کہ روح بھی اُن حقائق کی طرح غیر فانی ہے۔ افراد کون و فساد کے دائرے سے باہر نہیں جا سکتے اور ان کے لئے غیر فانی ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ مگر زندگی اور موت کا یہ سلسلہ اور روح جو اس انتقال لامتناہی کا سبب ہے دونوں ابدی ہیں۔ اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ اس ابدی روح سے افلاطون کی مراد روحِ کائنات تھی نہ زید۔ عمر۔ بکر کی روح۔ کیونکہ کسی ایک فرد کی روح تو خود اس فرد کی طرح موت اور زندگی کے سلسلے میں بندھی ہوتی ہے۔ اور نہ صرف حقائق ابدی کی فہیم ہے۔ بلکہ اُن اوہام اور خواہشات کا مصدر بھی ہے۔ جو ہمارے مادی جسم کے ساتھ وابستہ ہیں۔ تو پھر کسی ایک فرد کی روح کہاں سے آتی ہے اور کہاں چلی جاتی ہے؟ افلاطون کے دفترِ خیالات میں سے اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کے لئے ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ افلاطون کے نزدیک فلسفہ صرف اُن نتائج کا نام ہے۔ جو غیر ہستیوں کے متعلق غور و فکر کرنے کے بعد مرتب ہوتے ہیں۔ اور اگر فلسفہ سے کسی سوال کا جواب طلب کیا جا سکتا ہے تو صرف ایسے سوال کا جس کا تعلق اُن غیر متغیر ہستیوں سے ہو اور بس۔ یوں تو تغیر پذیر حقائق کی نسبت کوئی سوال اگر کئے جائیں تو اُن کا جواب کہیں نہ کہیں سے ضرور مل سکتا ہے۔ مگر فلسفہ ان جوابات کے متعلق اپنے علم حقائق ابدی کے ساتھ مقابلہ کر کے صرف یہ بتا سکتا ہے کہ وہ ٹھیک ہیں۔ یا غلط۔ اس لئے جہاں پر ہمیں کوئی ایسا مورخ یا پیشین گو نہ مل سکے۔ جو ہمیں کسی چیز کے ماضی یا مستقبل کے حالات سے آگاہ کر سکے۔ تو ایسی حالت میں ہمیں اپنے فہم کے موافق ایک افسانہ گھڑ لینا چاہئے جس کی کوئی بات علم حقائق ابدی کی مخالفت نہ کرتی ہو اور اس افسانے پر ہی اکتفا کرنی چاہئے۔ افلاطون کے مکالمات میں کئی ایسے افسانے ہیں جن میں مختلف سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً دنیا کہاں سے پیدا ہوئی؟ تمدن کا آغاز کس طرح ہوا؟ افراد کی ارواح کیا ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ بات درجہ یقین تک پہنچ چکی ہے کہ افلاطون بحیثیت ایک معمولی انسان کے ایک فرد کی روح کو بھی کسی حد تک ابدی مانتا ہے۔

اگرچہ وہ اپنی اس قیاسی رائے کو فلسفے میں شامل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جب کسی ریاضی کے سوال کا صحیح حل کسی کے سامنے پہلی دفعہ پیش کیا جاتا ہے تو وہ اس حل کے صحیح ہونے کو فوراً پہچان لیتا ہے اور کہہ دیتا ہے کہ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ افلاطون کا خیال تھا کہ غالباً یہ بات اُس شخص کو کسی پہلے جنم میں معلوم تھی۔ مگر وہ اُسے بھولا ہوا تھا۔ جب اُس کے سامنے وہ حل لایا گیا تو اُس کی یاد تازہ ہو گئی اور اُس نے فوراً صحتِ حل کو پہچان لیا۔ اس بات کے ممکن اور اغلب ہونے میں افلاطون کو کوئی شک نہ تھا۔ کہ ہر ایک روح جون بدلتی رہتی ہے اور اس کے ہر ایک جنم کی نوعیت اُس کے پہلے جنم کے اعمال پر منحصر ہوتی ہے۔ اسی طرح کا ایک عقیدہ۔ بدھ مذہب کا بھی ایک رکن ہے۔ بدھ مذہب اپنے پیروؤں کو مختلف جنموں میں نیکیاں جمع کرنے کے بعد آواگون سے رہائی اور اس زندگی کے رنج و کرب سے نجات کی امید دلاتا ہے۔ مگر افلاطون چونکہ بدھ کی طرح اس زندگی کو سراسر عذاب نہیں سمجھتا تھا۔ اس لئے اُس نے کبھی ایسی نجات کا خیال نہیں کیا۔

فیثاغورثیوں کے علاوہ افلاطون اپنے خیالات کے لئے ایک اور فرقے کا بھی ممنون تھا۔ اس فرقے کو فرقۂ ایلیائی کہا جاتا ہے اس کا بانی فرمانیدیس نامی ایک حکیم اٹلی کے جنوب میں شہر ایلیا کا باشندہ تھا۔ افلاطون نے اس حکیم کا ذکر اپنے ایک مکالمے میں کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سقراط کی جوانی کی عمر میں اُسے ملنے کے لئے ایتھنز آیا تھا۔ ہرقلاطیس کے مسئلہ تغیر کے متعلق فرمانیدیس کے خیالات ہرقلیطس سے بالکل ہی متضاد جا پڑے ہیں۔ ہرقلاطیس کو اس دنیا میں ہر جگہ تغیر و حرکت کے آثار نظر آتے تھے اور فرمانیدیس اس کو محض نظر کا دھوکا سمجھتا تھا۔ وہ سرے سے حرکت و تغیر کے امکان کا قائل نہ تھا۔ وہ کہتا تھا اگر ہم ذرا غور کریں تو ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ جب بھی کوئی چیز حرکت کرے تو یہ ضروری ہے کہ وہ اس مقام سے جہاں وہ پہلے تھی کسی ایسے مقام میں جائے جہاں پر اس کے جانے سے پہلے کچھ نہ تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مقامِ ثانی پر اگر کوئی چیز پہلے موجود ہو تو وہ اس کو دھکیل کر وہاں سے باہر نکال دے اور خود اس کی جگہ لے لے۔ مگر جب سرے سے کوئی جگہ ناموجود شے ہی نہیں تو حرکت کا آغاز ہی ناممکن ہے۔ فرمانیدیس کا یہ خیال تھا کہ ہستی یعنی ناموجود شے میں ہستی کے محل وقوع کی ہستی کا ذکر کرنا یہ کہنا ہے کہ نیستی بھی ہستی میں شامل ہے جو نتیجے کے سراسر خلاف ہے۔ نیستی کا محل وقوع نظر میں آنے سے انکار کرنا ہے۔ وہ جس چیز کو تغیر سے گزرتا ہوا سا کی حقیقت فرمانیدیس تسلیم نہیں کرتا۔ ان خیالات نے اس کو یہ کہنے کی جرأت دلائی کہ کسی قسم کی حرکت، انتقال یا تغیر سب ہماری آنکھوں کا فریب ہے۔ دراصل جو کچھ اس دنیا میں ہے وہ ایک غیر متغیر، غیر متحرک، ناقابلِ انتقال حقیقت ہے جس کی وحدت ہر سمت اور ہر حصے میں یکساں ہے اور جس کے وجود کی سالم ناشکستہ وحدت میں کہیں تقسیم حصص یا تفریق و تمیز ممکن نہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ دنیا کا جو متلون نقشہ ہمارے حواس ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں وہ اس یکرنگ وتیرے سے بہت مختلف ہے۔ مگر ہمارے حواس جیسا کہ سب کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اکثر ہمیں دھوکا دیتے ہیں۔ جو علم ہمیں ان کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے اس کو ہمیشہ اپنے فہم و ادراک سے پرکھ لینا چاہئے۔ سارا فرمانیدیس کے ادراک کا یہی فیصلہ تھا کہ حواس غلطی پر ہیں اور ہم فریب خوردہ ہیں۔

افلاطون جس کی بلند پرواز طبیعت کی خواہشات کو یہ خیال کہ اس دنیا کو تغیر و گردش سے رہائی اور مکمل سکون و استقلال کبھی نصیب نہیں ہو سکتا۔ بے دردی سے پامال کر دیتا تھا۔ قدرتی طور پر فرمانیدیس کے ساتھ ہم خیالی پر رضامند تھا اور اس کے فلسفیانہ حقایق کی رو سے ہر ایک حقیقت ابدی کو ان بے شمار محسوسات سے جن میں وہ مخلوط ہے اور جن میں گویا اس کا تکرار پایا جاتا ہے۔ وہی نسبت ہے جو فرمانیدیس کی واحد الوجود اور سالم الوجود حقیقت کو اس متلون اور سراپا فریبِ نظر دنیا سے ہے جس کی حواس ہمیں تلقین کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ فرمانیدیس وحدتِ حقیقت کا مبلغ ہے اور افلاطون کثرتِ حقائق کا قائل۔ یعنی افلاطون کے خیال کے مطابق عالمِ حقائق ابدی اور عالمِ محسوسات ان دونوں میں سے ہر ایک میں کثرت و تفریق ضرور ہے۔ علاوہ بریں افلاطون عالمِ صوری کو بالکل ہی موہوم نہ سمجھتا تھا۔ اس کے نزدیک عالمِ صوری ہست و نیست کے درمیان ایک برزخ ہے کیونکہ اس کا وجود تو یقینی ہے۔ مگر اس کی شکل وہ نہیں جو ہمیں محسوس ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے فرمانیدیس اس کو بالکل تمامی از حقیقت، عاری از وجود اور نیستِ محض خیال کرتا تھا۔

فرمانیدیس کا حرکت جیسے امر واقعہ سے انکار اس کے ہم عصروں کو اس کی سمجھ کا پھیر معلوم ہوتا تھا۔ اور وہ عدمِ حرکت کو خلافِ قیاس سمجھتے تھے۔

فرمانیدیس کے ایک مشہور شاگرد زینو نے اپنے آقا کے اس بظاہر خلافِ قیاس نظریہ کی حمایت یوں کرنی چاہی کہ جب ہم اس (بقول معترضین، "ظہر من الشمس حقیقت الامر") یعنی حرکت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ بھی (اگر زیادہ نہیں تو کم از کم) فرمانیدیس کے عقیدے جتنی خلافِ قیاس معلوم ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر محاصرۂ ٹرائے کا نامور جانباز اخیلیس جو اپنی سرعتِ رفتار کے لئے مشہور تھا ایک کچھوے کے ساتھ دوڑے تو یہ کہہ دینا

بڑا ہی تماشا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھوے سے آگے بڑھ جائے گا۔ فرض کرو کہ اکلیس کی رفتار کچھوے سے دس گنا ہے اور کچھوے کو تھوڑی سی مسافت کی رعایت دی گئی ہے یعنی وہ پہلے ہی سے سو گز آگے کھڑا ہے۔ دونوں ایک ہی وقت دوڑنا شروع کرتے ہیں۔ جب اکلیس وہ سو گز کا فاصلہ جو اس کے اور کچھوے کے درمیان ہے طے کرچکے گا تو کچھوا اتنے وقت میں دس گز آگے بڑھ جائے گا۔ اب اکلیس اور کچھوے کے درمیان دس گز کا فاصلہ ہے۔ پھر جب اکلیس وہ دس گز طے کرے گا تو کچھوا اکلیس سے ایک گز آگے ہوگا۔ جب اکلیس وہ ایک گز طے کرے گا تو کچھوا ابھی ۳ انچ آگے ہوگا، علیٰ ہذا القیاس۔ بہرحال کچھوا اکلیس سے آگے ہی رہے گا۔ زینو کا ایک اور بھی اسی طرح کا معمہ ہے جس کو حلقۂ پرواز تیر کہتے ہیں۔ جدید متحرک تصاویر کے اصول سے آشنا حضرات اس کو اچھی طرح سمجھ لیں گے۔ تیر کا جب کہ وہ حالتِ پرواز میں ہو کسی خاص معین وقت پر فوٹو لیا جاسکتا ہے جس کا مطلب کہ وہ اس نقطۂ وقت پر جب کیمرے کے رو برو کو کھولا گیا ساکن تھا۔ اور چونکہ ہم جس وقت چاہیں اس کا فوٹو لے سکتے ہیں۔ اس لئے تیر ہر وقت ساکن ہوتا ہے۔ اور اگر وہ ہر وقت ساکن ہوتا ہے تو ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کس وقت کرتا ہے۔ اس قسم کے معموں سے ہمیں یہ ثابت کرانے میں بڑی مدد ملی ہے کہ مسافت اور وسعت اور زمان کو مسلسل اور ناقابلِ تجزیہ تصور کرنا چاہئے یعنی جس طرح ایک مسلسل لکیر نقطوں کا مجموعہ ہوتا ہے اس طرح یہ لمحوں کا مجموعہ نہیں ہوتے۔

بحث کا یہ طریقہ جس میں بحث کرنے والا یہ ثابت کرتا ہے کہ فریقِ مخالف کی بات کو مان لینے سے مہمل نتائج مرتب ہوتے ہیں وہ جسے دار عقل ہیں، یونانیوں میں ڈائے لک ٹک (... DIALECTIC) کے نام سے مشہور ہے۔ زینو اس کا موجد سمجھا جاتا تھا۔ سقراط بھی اس فن میں یدِ طولیٰ رکھتا تھا۔ اور افلاطون نے اس کو اس قدر صحیح اور موزوں طریقہ مدلل کیا تھا کہ وہ بعض اوقات وہ ڈائے لک ٹک کے لفظ کو فلسفے کے معنوں میں بھی استعمال کیا کرتا تھا۔

افلاطون کے قدما میں سے انکساغورث کا ذکر بھی یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ حکیم ملاطیسی حکما کی طرح ایشیائے کوچک کا باشندہ تھا مگر کچھ عرصے تک ایتھنز میں نامور سیاسی مدبر پرکلیس کے ساتھ مشیر و صلاح کار اور رفیق کے رہا۔ آخر کار جب وہ یہ کہنے کی جرأت کر بیٹھا کہ سورج اور چاند دیوتا نہیں بلکہ روحانیت سے بالکل مبرا اسی مادے کے بنے ہوئے معمولی اجسام ہیں جس کی کہ ہماری پامالی روندی ہوئی حقیر زمین تو (نازک مزاج شاہاں تابِ سخن ندارد) اس نے ایتھنز کی جمہوریت کا قہر و غضب نازل ہوتے ہوئے دیکھا اور وہ اس شہر کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس زمانے میں اور سقراط کے وقت میں بھی جمہوریت حکومت کے مذہبی معاملات میں آزادیٔ خیال کو گوارا نہ کرسکتی تھی خصوصاً جبکہ انکساغورث اور سقراط کی آزاد خیالی کا اثر اعلیٰ طبقوں پر پڑتا تھا۔ جہاں سے لوگوں کی حساس طبیعتوں کو ہر وقت سیاسی خرابی کا ڈر تھا۔

جیسا کہ ہم اس تحریر کے شروع میں بیان کرچکے ہیں۔ ابتدائی ملاطیسی حکما میں سے کئی ایک نے اپنے اپنے خیال کے مطابق کسی نہ کسی چیز کو کائنات کا مادۂ بنیادی قرار دیا۔ مگر ان کا یہ نظریہ اس عقدے کے حل کرنے میں ناکام رہا۔ کہ اشیاء کی کثرت اور ان کی خاصیات میں اس قدر تباین کیوں ہے۔

انکساغورث کا خیال تھا کہ پہلے پہل سب اقسام کی اشیاء ایک ہی غیر متفرق جمعیت کی حالت میں ہوتی ہیں۔ جہاں سے بعد میں ہر ایک کو ہمارا نفس علیحدہ کرکے سب کو نظم و ترتیب دیتا ہے اور ہر ایک کو اس کی مخصوص جگہ پر متعین کردیتا ہے۔ کہتے ہیں کہ انکساغورث کے اس طرح نفسِ انسانی کو مطلوب، ایک مرتب اور ناظم کی اہمیت دینے نے سقراط کے دل پر بڑا اثر کیا۔ ترتیب نظامِ قدرت کو سمجھنے کا یہ طریقہ اس کو اور سب حکما کے طریقوں سے زیادہ امید دلانے والا معلوم ہوا۔ اور اس کے متذبذب دل کو اس خیال سے بہت سا اطمینان مل گیا

اس کو اس بات کی شکایت رہی کہ انکسا غورث نے اتنا کچھ کر کے بھی یہ کیوں نہ بتایا کہ اس نظم و نسق کی تشریحات بحیثیت ہر ایک کے متعلقات کے کیونکر ستر و ہوتی ہیں۔ اس مسئلے پر اس نے خود اپنا دماغ لڑایا اور وہ ان پہلے شخصوں میں تھا جو جانداروں کے اجسام کی ترکیب اور ان کے اعضا اور توالد کی قابلیت کی ان کے ماحول کے ساتھ مطابقت کو اس بات کی دلیل سمجھتے تھے کہ یہ دنیا کسی بڑے عقلمند اور رحیم صانع کا کام ہے۔ اور یہ عالم عالم منظم ہے۔

(۳)

افلاطون کو اپنے آقا کے اس خیال کے ساتھ پورے طور پر اتفاق تھا کہ یہ دنیا باقاعدہ منظم ہے اور مختلف حقائق بطور ایک ہی نظام کے عناصر ہیں جس میں ہر ایک حقیقت کا قیام اس نوعیت پر منحصر ہے جو اس سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اسے مجسس ادراک کی منطقی درستی کا خیال ہے ہو سکتی تھی کہ تمام اشیا ایک آسمانی ترکیب اور روحانی نظام کے ماتحت اپنا اپنا کام کرتی ہیں۔

چونکہ کسی باقاعدہ سوسائٹی کے اعمال، افعال اور اس کے افراد کے فرائض کا مناسب حل جب ہی معلوم ہو سکتا ہے جبکہ ان کا مقرر کرنے والا اس نظام عالم سے پوری طرح واقف ہو۔ اس لئے افلاطون کے خیال میں کسی قوم یا جماعت کے حکام ہمیشہ فلاسفر ہونے چاہئیں۔ اپنی عظیم الشان تصنیف "جمہوریت" میں اس نے تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ سلطنت کے ان سربراہوں کو کس قسم کی تعلیم حاصل کرنی چاہئے۔

افلاطون اپنی موت (۳۴۷ قبل مسیح) کے بعد ایتھنز میں اپنا بنا کردہ ایک کالج چھوڑ گیا۔ جو بہت عرصے تک علوم اور فلسفے کا مرکز رہا۔ ۵۲۹ء میں جب شہنشاہ جسٹینین نے اس کا ذریعہ آمدنی ضبط کر لیا تو اس کالج کا خاتمہ ہو گیا۔ ان نوجوانوں میں سے جنھوں نے اس کالج میں خود اس کے بانی افلاطون سے تعلیم حاصل کی۔ ایک ارسطاطالیس بھی تھا جس نے بعد میں وہ شہرت حاصل کی جو افلاطون کی شہرت سے کسی طرح کم نہ تھی۔

اکثر کہا جاتا ہے کہ ہر شخص جبلی طور پر یا تو افلاطونی نقطۂ خیال کا ہوتا ہے یا ارسطاطالیسی۔ ان دو یونانی حکما کو بلحاظ ان کے اور ان کے رجحان اور طریقۂ فکر کی نوعیت کے قوت فکر کی دو متضاد اقسام کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ افلاطون کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے تخیل کی بلند پروازی کی وجہ سے حقائق حیات کو عظیم و گوناگوں معلومات سے بالاتر سمجھتا تھا۔ اس کا توسن عقل دفعۃً اس میدان میں جولانی کیا کرتا تھا جو تجربے، مشاہدے اور حواس کی حدود سے باہر ہے۔ ارسطو کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس کی طبیعت افلاطون کی طرح آزاد نہ تھی۔ وہ عرصۂ حکمت میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا تھا۔ اور منطق کی زبردست بندشوں اور حواس اور تجربے کی مدد سے ایسے نتائج پر پہنچا کرتا تھا جن کا اثبات مشاہدے کی بنا پر ممکن تھا۔ اگر بنظر غور دیکھا جائے تو دونوں فلسفیوں کی نسبت یہ رائے غلط ثابت ہوتی ہے۔ اکثر اوقات فلسفے کا طالب علم یہ محسوس کرتا ہے کہ افلاطون ایک منطقی تھا اور ارسطو اس قدر مقید اور محتاط نہ تھا جس قدر اس کو کہا جاتا تھا۔

ارسطو (پیدائش ۳۸۴ قبل مسیح۔ وفات ۳۲۲ برس قبل مسیح) افلاطون کے کالج کا ایک ممبر تھا مگر وہاں کا طرز خیال اور طرز تعلیم اس کو پسند نہ آیا اور اس نے اس کالج کو چھوڑ کر خود ایک نئے کالج کی بنیاد ڈالی۔ اگرچہ وہ اپنے ساتھیوں سے اس طرح کنارہ کش ہو گیا تھا مگر یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ وہ اپنی تصانیف میں فلسفیانہ بحث کو ہمیشہ ایک افلاطونی کی حیثیت سے شروع کرتا ہے اور آخر میں ان افلاطونی عقائد پر نکتہ چینی کرتا ہے جن سے اسے اتفاق نہ تھا۔ پڑھنے والے کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ارسطو افلاطونی خیال کی ہمیشہ مخالفت کرتا رہتا ہے

جس کی وجہ یہ ہے کہ ارسطو ان باتوں پر جس میں وہ اپنے استاد کا ہم خیال تھا۔ بہت کم زور دیتا ہے ۔

ارسطو افلاطون کی طرح اس بات کو تسلیم کرتا تھا کہ صحیح علم صرف حقائق ابدی کا علم ہے۔ جن کی ہستی کی آگاہی ہمیں اپنے ادراک سے حاصل ہوتی ہے۔ اور جن کو محسوس کرنے سے ہمارے حواس قاصر ہیں۔ مگر وہ افلاطونیوں کی طرح حقائق ابدی (اعراض) کو ان اشیاء (جواہر) سے جن میں وہ "منقسم" یا "منقول" ہوتے ہیں۔ علیحدہ نہیں سمجھتا۔ افلاطون کو بھی ایسا اچھا لفظ بیان نہ سوجھا جس سے وہ جواہر کی کسی ایک نوع کا تعلق اس عرض سے ظاہر کرے۔ جو اگرچہ اس نوع کی سب اشیاء میں پایا جاتا ہے۔ مگر پھر بھی بذاتِ خود اس نوع کے کسی ایک فرد سے علیحدہ سمجھا جا سکتا ہے۔ اس تعلق کو "شرکت" کا تعلق کہا جا سکتا ہے۔ مگر اس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ ایک حقیقت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کو مختلف اشیاء میں منقسم کیا گیا ہے۔ بڑی چیزوں کو بڑا حصہ ملا ہے اور چھوٹی چیزوں کو چھوٹا۔ جس طرح مختلف جسامت کے چند اشخاص ایک سائبان کے نیچے آ کھڑے ہوں۔ تو ہر ایک کی جسامت کے مطابق سائبان کا تھوڑا یا بہت حصہ اُس کے اوپر ہو گا۔ یا دوسرے پیرائے میں ہم اس تعلق کو "نقل" کہہ سکتے ہیں۔ مگر یہ فرض کرنا بھی مشکلات سے خالی نہیں۔ اگر ہم دو اشخاص کے ایک ہی نوع کے دو افراد ہونے کو اس طرح سے تعبیر کرتے ہیں کہ وہ ایک ہی نمونے کی دو نقلیں ہیں تو ان دو افراد میں سے ہر ایک کی اس مفروضہ نمونے سے ہم نوعی کی تعبیر کے لئے ایک دوسرا نمونہ فرض کرنا پڑے گا اور اس طرح یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہو گا۔ شاید یہ کہنا سب سے بہتر ہو گا کہ ہم اس تعلق سے اتنا ہی آگاہ ہیں جتنا کہ جزو و کل یا اصل و نقل کے تعلق سے۔ ہمارے اس تعلق کو بیان کرنے کی قابلیت یا ناقابلیت اس بات کی دلیل نہیں کہ ہم اس تعلق کو زیادہ یا کم سمجھتے ہیں۔

کئی لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ حقائق مشترکہ محض زائیدہ خیال اور ہمارے وہم و گمان کی پیدائش ہیں۔ مگر ارسطو کو اس بات سے انکار تھا۔ وہ ان کی ہستی کا بلا تعلق دماغ انسانی قائل تھا۔ ورنہ علم طبیعی جن میں اشیاء کے چند خواص مشترکہ پر بحث کی جاتی ہے۔ موہوم باتوں کے سوا کچھ نہیں رہتے۔ ارسطو نے مختصات کی دو قسمیں کی ہیں۔ مختصات ذاتی (مثلاً انسانیت وغیرہ) اور مختصات صفاتی (مثلاً عظمت سفیدی عقلمندی وغیرہ)۔ مختصات صفاتی مختصات ذاتی کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں۔ اور مختصات ذاتی صرف کلام میں افراد موضوع سے علیحدہ شمار کی جا سکتی ہیں۔ ہر ایک فرد کی ایک مخصوص "شکل" (FORM) ہوتی ہے۔ انسان کی شکل کو دوسرے الفاظ میں "روح" کہا جاتا ہے۔ اس کا جسم جو تمام حرکات و افعال کے لئے روح کا محتاج ہے۔ روح سے بالکل متضاد ہے۔ اس کو "مادہ" کہتے ہیں۔ جب بہت سی اشیاء ایک ہی نوع یا قسم کی ہوں تو کوئی قضیہ جو اس نوع کے ایک فرد کی نسبت قائم کیا جا سکتا ہے اور جو مستقل وقعت رکھتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا جو اس نوع کے کسی اور فرد پر بھی صادق نہ آئے۔ ایسے قضایا کو "کلیات" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

ارسطو کے مطابق صرف اس دنیا میں ہی بہت سی اشیاء ایک قسم کی ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کی اشیاء کی ترکیب عناصر اربعہ۔ خاک آب آتش باد سے ہے (ان چار چیزوں کو سب سے پہلے امفداقلیس نے جو چھٹی صدی میں سسلی کا ایک ذی اقتدار فلاسفر تھا۔ عناصر قرار دیا۔ روایات کی رو سے اس فلاسفر نے اپنے آپ کو آتش فشاں پہاڑ اٹنا کے دہانے میں پھینک دیا تھا تاکہ اُس کے اس طرح ایکدم غائب ہو جانے سے وہ لوگوں میں دیوتا شمار کیا جائے۔ یہ عناصر اربعہ جو چار خواص بنیادی۔ حرارت۔ برودت۔ رطوبت۔ یبوست سے پیدا ہوئے ہیں۔ مختلف تناسب میں ترکیب پا کر مختلف اجسام بن جاتے ہیں۔ اور عناصر کے باہمی تضاد کی وجہ سے وہ اجسام ہمیشہ بنتے بگڑتے رہتے ہیں۔ یہی افراد کی تکثیر کی وجہ ہے۔ اور تسلسل افراد سے ہی نوع (نہ کہ فرد) بقا حاصل کر سکتی ہے۔ کائنات کے بالائی طبقوں میں ہر ایک آسمانی جسم اس مرکب مادے کا نہیں۔ بلکہ ایک اعلیٰ عنصر خامس کا بنا ہوا ہے۔ اس لئے وہ کبھی فنا نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنی نوع کا ایک ہی فرد ہے۔ اس لئے اس کی بقا کے لئے اس کی

نوع جنس اور افراد کا تسلسل ضروری نہیں

اس مختصر بحث سے یہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ ارسطو نے اس بات کی وجہ کو زیادہ تر حیوانات اور نباتات تک ہی محدود رکھا اور اسی سے اس نے افلاک کی ابدی گردش کا سبب دریافت کرنے کی کوشش کی۔ عام اشیا کی حرکت کسی اور متحرک شے کے تصادم کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مگر ذی روح اجسام کی حرکت اس طرح کی نہیں۔ افلاطون نے ہمیشہ متحرک رہنے والی روح کو تمام حرکت کا منبع قرار دیا تھا۔ مگر ارسطو ذی روح، نباتی حرکت کو خود زمانی سمجھتا تھا۔ ذی روح [illegible] ہمیشہ [illegible] حرکت ہوتی ہے یہ علت تصادم سے تو نہیں مگر ان اجسام کی خواہشات کو اکسانے سے ان کی حرکت کا باعث ہوتی ہے۔ اور اس نے ضروری خیال کیا کہ وہ خود متحرک نہ ہو۔ کیونکہ خواہش ایسی چیز کی بھی ہو سکتی ہے جس میں خود کوئی خواہش نہ ہو یا جو اس خواہش سے محض بے خبر ہو۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ بالآخر تمام اشیاء کی حرکت کا منبع ایک ایسا غیر متغیر محرک ہے جو ذی روح اجسام کی خواہشات کو حرکت دے کر خود ان کی حرکت کا باعث ہوتا ہے۔ کائنات کا یہ غیر متغیر محرک خدا ہے۔ وہ بالفعل خدا دنیا کو اس طرح گردش میں رکھتا ہے۔ جس طرح کوئی محبوب اپنے عاشق کو۔ مگر جس طرح تمام اشیا اس کی طرف کھنچ کر رہ جاتی ہیں وہ کسی کی طرف کھنچ کر نہیں آتا۔ ایسی کامل اعلیٰ وہ [illegible] ہستی کے ساتھ اگر کوئی شغل منسوب کیا جا سکتا ہے تو وہ شغل علم ہے اور ایسی چیز جس کا علم اس کی شان کے شایاں ہو اس کی اپنی ذات ہے۔ ارسطو کے خیال میں خدا دنیا کا بنانے والا نہیں۔ دنیا ازلی [illegible] ہے۔ نہ ہی وہ دنیا کی روح ہے۔ وہ کامل ذات ہے جس کے ساتھ اپنے آپ کو مطابقت دینے کے لئے تمام دنیا کوشاں ہے۔

ان اشیا کی حالت میں جو غیر ابدی ہیں اور جو ایک غیر مکمل صورت ہے۔ ایک دوسری مکمل تر صورت میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ ارسطو ان کے ارتقا کے اولین مدارج کا پتہ اس ابتدائی صورت سے لگاتا ہے۔ جس کی طرف [illegible] ارتقا کا رخ ہوتا ہے۔ حیوانات اور نباتات کی علت غائی بلحاظ اپنی جنس کے تکمیل حاصل کرنا ہے۔ نہ یہ کہ وہ انسان کے لئے مفید ثابت ہوں۔ ارسطو نے علل کی چار قسمیں قرار دی ہیں علت مادی۔ علت صوری۔ علت فاعلی اور علت غائی۔ غیاث اللغات مصنفہ محمد غیاث الدین میں لکھا ہے "علت کہ آں را سبب نیز گویند بر چہار قسم است۔ سبب در مسبب داخل بود یا خارج۔ اگر داخل بود بالقوہ۔ آں را علت مادی گویند [illegible] چوں نسبت چوب با سریر۔ و اگر داخل بود بالفعل آں را علت صوری گویند۔ چوں صورت سریر کہ مربع باشد یا مسدس۔ و اگر خارج بود و اگر آں سبب موجد او ست۔ آں را علت فاعلی گویند چوں نجار۔ و اگر ایجاد برائے آں نسبت آں را علت غائی گویند۔ چوں جلوس بر سریر۔ پس علت غائی در ظہور موخر از ہمہ علت ہاست و در ذہن متعقل از ہمہ مقدم۔ ...... علت غائی غایت و منتہائے جمیع علتہائے اربعہ است ...... و بدانکہ اطلاق علت غائی در افعال حضرت حق سبحانہ تعالیٰ روا ندارند چرا کہ حق تعالیٰ در خلقت اشیا محتاج بغرضے نیست" اگر بنظر دقیق دیکھا جائے تو سوائے علت مادی کے باقی علل ثلاثہ قابل بہ انطباق معلوم ہوتی ہیں۔ کیونکہ نجار اسی حد تک علت سریر شمار کیا جا سکتا ہے جس حد تک کہ وہ تخت کو ایک مخصوص شکل دینے کا باعث ہو۔ اور اس کی صنعت کا استعمال (علت غائی) بھی وہی ہے جو اس شکل کی ایک لکڑی کی بنی ہوئی چیز کا ہو سکتا تھا۔ گویا علت فاعلی اور علت غائی علت صوری کے دو متشابہ پہلو ہیں۔

یہ نظام علل اربعہ پھر وہی بات ظاہر کرتا ہے کہ تمام غیر ابدی اشیا کے دو متباین پہلو ہیں۔ اول مادہ جو ایک مخصوص شکل پا کر ایک مخصوص چیز بن جاتا ہے۔ دوم صورت جس کی بدولت ہر ایک چیز اپنا جنسی یا نوعی نام پاتی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض اشیا جو خود ایک خاص شکل و صورت

بلکہ یہی درخت، سنگ مرمر کسی دوسری حالت میں کسی اور چیز کا "مادہ" بن جائیں (مثلاً سنگ مرمر کا بت)۔ مادہ بغیر شکل و صورت کے نہیں مل سکتا۔ اصلی حالت میں اس کی ہستی ہی نہیں ہو سکتی۔ برخلاف اس کے خدا ارسطو کے خیال کے مطابق شکل بغیر مادہ ہے جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ ارسطو اگر کسی شغل کو خدائی شان کے شایاں سمجھتا تھا تو وہ ایک فلسفہ محض ہے۔ اسی لئے وہ انسان کے لئے اس کو اعلیٰ ترین مشغلہ جانتا تھا۔ وہ یہی تصور ہے "اخلاقیات" میں کہتا ہے کہ محض علم سے ہی انسان اپنی سب سے اشرف قابلیت کا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اسی بات میں اس کو دوسرے باشندگان زمین پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ اور یہی بات اس کی سب سے بڑی مسرت کا باعث ہو سکتی ہے چونکہ انسان عقل محض نہیں بلکہ ادراک اور حیوانیت کا ایک مجموعہ مرکب ہے۔ اس لئے مسرت عملی مدنی اور معاشرتی فرض کی پابندی سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ انسان فطرتاً ایک حیوان متمدن ہے۔ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی طرح کی سوسائٹی میں پایا جاتا ہے۔ خواہ وہ سوسائٹی میاں بیوی اور بچوں کی ہی ہو۔ مگر ارسطو جس کو سب سے ارفع زندگی سمجھتا تھا وہ صرف آزاد شخصوں کے مہذب فرقوں میں ہی پائی جاتی ہے۔ اور اس کا اپنے علم اور تصور کی بنا پر خیال تھا کہ صرف یونانیوں کی نسل ہی ایک ایسی ریاست کے قابل ہوتی ہے۔

اپنی "سیاست" میں ارسطو نے اس قسم کی ریاست کے نقش کو کھینچا ہے۔ اگرچہ اس کے اپنے ہی ایک شاگرد سکندر اعظم کی بادشاہت میں یونانی مدنی حکومتوں کے اتحاد اور ایک وسیع سلطنت کے قیام سے یونانی دنیا کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ مگر ارسطو کو کبھی اس انقلاب کا خیال تک نہ آیا۔ اس کے دماغ میں ایک مہذب حکومت یہی ایک چھوٹی سی خود مختار دولت مشترکہ ہی ہو سکتی تھی جس کی حدود ایک شہر اور اس کے مضافات کی حدود سے تجاوز نہ کریں۔ اور جہاں تک ہو سکے چھوٹی ہو۔ جو کہ اس کے تمام باشندے معاملات حکومت میں ذاتی حصہ لے سکیں۔ باقی رہا یہ سوال کہ شہریوں کو اس بات کے لئے فرصت کہاں سے ملے۔ سو اس کے لئے ارسطو کہتا تھا کہ اپنا روزمرہ کا کام غلاموں کے سپرد کر کے حکومت کے لئے وقت نکالنا چاہئے۔ طریقہ غلامی کو ارسطو جائز اور قدرتی امر سمجھتا تھا کیونکہ بعض انسان قدرتی طور پر حکومت خود اختیاری کے ناقابل ہوتے ہیں۔ قوموں کی قومیں اپنی اس ناقابلیت کا اظہار بعض اوقات اس طرح سے کرتی ہیں کہ اگر ان کو اپنے آپ پر چھوڑ دیا جائے تو وہ اپنے لئے خود مختار حکمران انتخاب کر لیتی ہیں جس کی وہ غلاموں کی طرح خدمت کرتی ہیں۔ آزاد دولت مشترکہ میں سیاسی مساوات تمدنی مساوات کی بنا پر ہونی چاہئے۔ اگر سوسائٹی کا کوئی ممبر اپنی ذاتی برتری کی وجہ سے باقی سب پر ممتاز ہو تو سب کو چاہئے کہ اس کو اپنا قدرتی حاکم مان لیں۔ علاوہ بریں تمول اور اخلاص کی چیز کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

افلاطون کہتا تھا کہ ہر ایک چیز تمام افراد جمہور کی ملکیت مشترکہ ہے اور سلطنت کے ممبر — خواہ وہ مرد ہوں یا عورت — کسی چیز کو بھی اپنا نہیں کہہ سکتے حتیٰ کہ وہ کسی شخص کو اپنا خاوند، اپنی بیوی، اپنا بچہ، اپنی ماں، اپنا باپ تک نہیں کہہ سکتے۔ مگر ارسطو کو اس سے اتفاق نہ تھا۔ وہ مشترکہ جائیداد یا اشتراکیت کے اصول کو ممکن العمل نہ سمجھتا تھا۔ دو قریبی دوست ایک دوسرے کی چیز کو اپنی چیز سمجھ کر استعمال کر سکتے ہیں۔ مگر جہاں ہر ایک شخص اپنی چیز پر اپنا حق دوسروں کے برابر سمجھتا ہو وہاں بدنظمی اور بے ترتیبی کا پیدا ہونا لازمی امر ہے۔ اور نہ ہی اس طرح سب کو حقوق مساوی دینے سے اتحاد اور الفت کے بڑھنے کی کوئی امید ہو سکتی ہے۔ اس لئے ارسطو ایک شخص کے دوسرے شخص سے دولتمند ہونے کو اپنے آئین کے ماتحت ممکن و جائز سمجھتا تھا۔ روپیہ والوں کو اس حد تک حق مزید دلاتا ہے کہ اس کی بدولت وہ بھوکے ننگوں کی دستبرد سے بچے رہتے ہیں۔ مگر ان کو بالکل ہی لاچار اور بے بس نہیں بنا سکتے۔

"پطرس"
کہکشاں۔ مارچ ۱۹۱۹ء

سر محمد اقبال

وہ انسان جس نے اردو شاعری کو مردانہ پن بخشا

ان کی وفات سے ہندوستان ایک جلیل القدر شاعر سے کہیں زیادہ باعظمت ہستی سے محروم ہوگیا۔ وہ ایک عالم، مورخ، تاریخ، فلسفہ اور مذہب کے سرگرم طالب علم کے بھی ان اوصاف کے لئے جو اپنی محدود قابلیت کے سبب اس کی شاعری تک رسائی سے قاصر ہے [illegible] نہیں وجود تھا۔ بحیثیت شاعر اگرچہ اس کا مقام نہایت بلند تھا لیکن ادبی اور عوامی دنیا میں اثر و نفوذ کے لحاظ سے اس کا مقام اس سے بھی بلند تھا۔ اس کی ذات سے [illegible] سے ایک فصیح اللسان پیغمبر اور اس کی تہذیب کا ایک بہت بڑا شارح چھن گیا اور اردو شاعری سے خدا معلوم کتنی [illegible] کے ساتھ ہمیشہ [illegible] چھن گئی۔

کم و بیش چالیس سال گذرے جب اقبال کی شاعرانہ زندگی کا آغاز ہوا۔ اس وقت اردو شاعری [illegible] محسوس ہوتی [illegible] سے لطف اندوز ہونا تھا۔ اس کا مقصد خود زندگی نہیں بلکہ محض زندگی کے حاشیہ کی تزئین سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ مقولہ عام نہیں تھا کہ فن محض فن کی خاطر اختیار کیا جاتا تھا لیکن شاعری کیا تھی؟ محض حسن انگیز [illegible] نزاکت ادا [illegible] خوش کن [illegible] کھیل [illegible] لہذا [illegible] اس کے اختیار کرنے میں سنجیدگی اور متانت سے کام لینے کی ضرورت نہ سمجھی جاتی۔

لیکن مسلمانوں کے دلوں میں ایک نیا احساس کروٹیں لے رہا تھا اور لوگوں کی [illegible] یہ خیالات ملت [illegible] ترقی کے متعلق آنے شروع ہوگئے تھے۔ ان میں جو زیادہ ذکی الحس واقع ہوئے تھے انہوں نے آرٹ کو پھر سے جو تمام تر بھی انسان کے زیادہ اہم مشاغل میں سے ایک ہے اور اس کو اعلیٰ سنجیدگی اور مقصد و مدعا سے معمور کرنے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ حالی ایسا غزل گو عہد شباب کی ہوس کاریوں سے تائب ہو کر مشہور زمانہ مسدس کا مصنف بن گیا جس نے خواب غفلت کے متوالے ہندوستانی مسلمانوں کو اس طرح جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگایا کہ کوئی ایک نظم نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد ایسا کر سکی۔ انہی حالات میں اقبال جس نے اسی فرسودہ ڈگر پر اپنی شاعری شروع کی تھی محسوس کرنے لگا کہ اس کا دل مسلمانوں کے احیا اور ان کی نئی زندگی کے خواب سے مضطرب اور بے قرار ہے۔

ہندوستان ہمارا

اقبال کی ابتدائی نظموں سے ہی جو اس رجحان کے ماتحت لکھی گئیں اس کے دل و دماغ سے بے تاب دل اور اپنے وطن کے لئے جذبات محبت کا پتہ لگتا ہے۔ اس کی نظم

"سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے"

اب تک فرقہ وارانہ اتحاد کی سب سے زیادہ پُر اثر اپیل ہے۔ جو کسی محب وطن کے قلم سے نکلی ہو۔ اور اس کا مشہور آفاق گیت "ہندوستان ہمارا" تحریک

خیال میں بہترین قومی گیت ہے۔ جس پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اور جس سے بہتر گیت کی شاید مدت مدید تک بننے کی امید نہیں ہو سکتی۔ لیکن مذہب اسلام کے گہرے مطالعہ نے جو اقبال نے اپنی زندگی کے آخری ایام تک مسلسل جاری رکھا اس کے اس خیال کو وسعت بخشی۔ وطن اور ملک کی نسبت سے قوموں کا تصور اس کی فطرت کے خلاف تھا۔ اپنی شاعری اور نجی گفتگو میں وہ ہمیشہ یورپ کی مثال دے کر انسانوں کو ملکوں اور وطنوں کے تنگ دائروں میں تقسیم کرنے کی بیہودگی ثابت کیا کرتا تھا۔ وہ ایک ایسے ٹھوس نصب العین کا قائل تھا جو انسانوں کو وطنوں اور قوموں کے اختلافات کی سطح سے بلند کر دے اور جو زندگی کو ایک مقصود و مدعا سمجھے کیونکہ اس کے نزدیک آرٹ کا بامقصد ہونا محض زندگی کے اصول علت اعلیٰ کا جزو لاینفک تھا۔ اسی قسم کی ہمہ گیری اور بامقصدیت انہیں قرآن و اسلام میں یا چند جرمن فلسفیوں کی تعلیمات میں ملی جن سے وہ بے دریغ اپنی شاعری میں استفادہ کرتا رہا۔

حجازی خیالی دنیا

جس دور سے ہم ہندوستان میں گزر رہے ہیں۔ اگرچہ اس میں بڑے بڑے امکانات پوشیدہ ہیں تاہم اس میں ایک خاص غم ناک کیفیت موجود ہے۔ ہم میں شاید ہی کوئی فن کار ایسا ہو جس کے من میں گھر کے لئے اداسی سطح مرتفع کے موجود ہو۔ ہم دور دراز خیالی دنیاؤں کے آرزومند ہیں۔ اور خواہ وہ دنیائیں خیالی ہوں یا حقیقی۔ ان کی زمانی یا مکانی دوری ہی ان کے اندر ایک بے پناہ دلکشی پیدا کر دیتی ہے۔ اقبال نے اسلام کے ابتدائی زمانے پر پُرشوق نظر ڈالی۔ اس کی آرزو تھی کہ وہ اس عہد کے مسلمانوں کی سادگی، بلند ہمتی، ایمان اور عزم و استقلال کو دوبارہ پیدا کر سکے۔ ایک عالمگیر تمدن کے لئے اس کی دلی خواہش انسان کی تقدیر میں اس کا زبردست ایمان، انسان کے ارتقا میں اس کا پختہ یقین کہ وہ مقصد کی بلندیوں کو منزل بہ منزل طے کرتا ہوا کمال کی چوٹیوں پر پہنچ سکتا ہے ان شرائط کے مطابق جو مسلم گھرانے میں پیدائش کے سبب اور اسلامی تعلیمات اس کے ذہن نشین ہو چکی تھیں۔ ان سب باتوں نے اس کی شاعری کو اسلامی رنگ دے دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں اس کے بعض قدردان اس سے چھن گئے۔

کسی شاعر کے کلام کی قدر اور اس کے اعتقاد کے باہمی تعلق کی بحث پرانی چیز ہے۔ اور میں اس کے متعلق یہاں کچھ نہ کہوں گا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ کچھ نہ کچھ ایسے لوگ ضرور ہوتے ہیں جو صرف اس لئے ملٹن کی شاعری سے لطف اندوز نہ ہوں کہ وہ اس کے مذہبی عقائد سے متفق نہیں یا جو شیکسپیئر کا کلام محض اس لئے پڑھنا گوارا نہ کریں کہ وہ اس کے شاہ پرستانہ خیالات کو پسند نہیں کرتے لیکن دوسرے لوگوں کے لئے جو کولرج کے لفظوں میں کسی شاعر کے کلام کا مطالعہ کرتے وقت "انکار کو عمداً معطل کر دیتے ہیں" اقبال رہتی دنیا تک مشرق کا سب سے زیادہ ولولہ خیز شاعر رہے گا۔

فارسی اور اردو

اس کے بعض ہم وطنوں کی بدقسمتی ہے کہ اقبال کے بہترین کلام کا زیادہ حصہ فارسی میں ہے۔ اور اس کی صرف ایک طویل نظم اسرار خودی کا ترجمہ جو پروفیسر نکلسن نے کیا ہے، انگریزی زبان میں ملتا ہے۔ تاہم اس کا ابتدائی کلام جو اردو میں ہے وہی اس کو ہندوستانی شاعروں میں ایک بلند مقام دینے کے لئے کافی ہے۔ لیکن خواہ اس نے اپنی نظمیں اردو میں لکھیں خواہ فارسی میں، اس کا اردو شاعری پر گہرا اور مسلسل اثر پڑتا رہا۔ پیدائش کے لحاظ سے وہ پنجابی تھا (اصل میں اقبال کشمیری اور ذات کا سپرو تھا) اسی لئے اس کے یو۔ پی کے نکتہ چیں اس کو ہمیشہ یہ حقیقت ایسے لفظوں میں یاد دلاتے رہے جن میں انصاف کم اور تلخی زیادہ ہوتی تھی اور اس کی شاعری کی زبان کو ٹکسال باہر ہونے کا طعنہ دیتے رہے۔ اور یہ باوجود اس حقیقت کے کہ وہ داغ کا معنوی فرزند تھا۔ جو اردو زبان کا مسلمہ بادشاہ ہوا ہے۔ لیکن اس کی غیر معمولی قابلیت نے اس کے نکتہ چینوں کو جلدی خاموش کر دیا۔ اور اس کی طرز شاعری کے بے شمار پیرو ملک کے طول و عرض میں پیدا ہو گئے۔ اگر افراد کے وسیع اثرات کا تذکرہ کرنا اندیشناک نہ ہو تو اس ضمن میں تین ہستیوں کا نام لیا جا سکتا ہے۔ جنہوں نے اپنے اپنے رنگ میں اردو ادب کو نئی اور ممتاز صورت بخشی ہے۔ مولانا ظفر علی خاں نے زمیندار کے ابتدائی ایام میں اس میں مضمون لکھ لکھ کے اردو صحافت کو ایک ایسی زوردار اور لچکیلی زبان سے مالا مال کیا جس سے وہ پہلے قطعاً ناواقف

تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اردو نثر کو وہ شوکت، فراوانی اور تیزی بخشی جس کا راز انہوں نے عربی زبان کے مطالعہ کرتے وقت پالیا تھا لیکن چھپے ہوئے مضامین اور پُر اثر وعظوں کی نسبت شاعری لوگوں کے دلوں میں زیادہ دیرپا اثر رکھتی ہے اور شاعر زبان پر زیادہ گہرے نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ جدید اردو کے بولنے والوں میں اقبال (اور اسی طرح اس کا پیش رو غالب) ایک شخص سب سے نمایاں اور زبردست اثر ڈال رہا ہے۔ ہزاروں ترکیبیں اور الفاظ جو ان دونوں استادانِ فن نے گھڑے یا اپنے فارسی کے پیشرو استادوں سے مستعار لئے آج بھی اردو تحریر اور تقریر میں ان کی گونج سنائی دے رہی ہے۔

(پطرس کے انگریزی مضمون کا ترجمہ: صوفی، یاسمین حسین)

ولیٹن صاحب اور میں

[illegible] صوبے کا ایک [illegible] علاقہ ہے [illegible] سبز پہاڑیوں میں پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اونچی پہاڑیوں سے ایک نہایت معمولی سی بستی ہے۔ اور یہاں سے زیادہ کوئی رونق نہیں [illegible] ہوں۔ دیوداروں کے گھنے جنگل بہت حد تک تہذیب کی جدید تعمیر کی دست درازیوں سے محفوظ ہیں۔ تمدن کی شان و شوکت کے علم بردار آسمان بوس عظیم الشان درخت لاکھوں کی تعداد میں اپنی مہیب خاموشی میں کھڑے ہیں۔ ندی نالے [illegible] سے قدرتی آبشاروں پر اچھلتے کودتے بہتے رہتے ہیں۔ وہاں کی آبادی سو ڈیڑھ سو سے زیادہ نہیں۔ اس لیے کشمکش حیات اور نفسی کے وہ ہنگامے جو بڑے بڑے شہروں میں بہت عام ہوتے ہیں، وہاں بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ تمدنی زندگی کی متنوع شکلوں کی رنگ آمیزیوں نے میرے سادگی پسند دماغ کے لیے [illegible] اس [illegible] کو [illegible] بنا لیا ہے۔ [illegible] کے لحاظ سے وہ میری [illegible] تو ناقابل برداشت ہے۔ اس لیے مجھے وہاں جو لطف نہیں آتا [illegible] سے [illegible] وہاں [illegible] پہاڑیاں [illegible] تنہائی [illegible] میری تمدن پسند طبیعت کی خواہشات کے منافی ہے۔ لیکن گزشتہ برسوں کے موسم میں اس کے علاوہ ایک [illegible] وجہ تھی جس نے مجھے نتھیا گلی جانے پر مجبور کر دیا۔

میں نے مجبوراً لفظ استعمال کیا ہے۔ گو میں [illegible] سمجھتا ہوں کہ [illegible] جب مجھے کسی طرح ناگوار نہ تھا۔ ولیٹن صاحب جن کو [illegible] دولت کے [illegible] تھوڑی سی [illegible] کے علاوہ [illegible] سے [illegible] غلط [illegible] سمجھتا ہوں۔ گزشتہ موسم گرما میں باتھا گلی میں مقیم تھے اور انہی کے قرب کی خواہش مجھے کشاں کشاں نتھیا گلی لے گئی۔ باتھا گلی نتھیا گلی سے پانچ سات میل کے فاصلے پر ایک اور چھوٹا سا پہاڑی مقام ہے جس میں ایک ہوٹل، تحصیل، تھانہ، کچہری اور ڈاک بنگلے کی موجودگی نے اسے تھوڑی سی اہمیت دے دی ہے۔ ولیٹن صاحب اسی ہوٹل میں رہتے تھے اور میں نتھیا گلی میں خواجہ محمد حسین کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ نتھیا گلی کا بازار بمشکل پانچ چھ دکانوں پر مشتمل ہے جو ضروریات زندگی مہیا کر سکتی ہیں اور بس۔ یہ دکانیں ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی سڑک کے ایک موڑ پر [illegible] کی طرف واقع تھیں اور ان دکانوں سے شاید اس کی عمارت [illegible] تھوڑے فاصلے پر تھیں۔ سڑک کے دوسری طرف اسی موڑ پر ڈاکخانہ اور ان دکانوں کے مقابل بازار سے ایک چھوٹی سی پگڈنڈی پر دس بارہ قدم چلنے کے بعد خواجہ محمد حسین کی کوٹھی تھی۔ جس کی سرخ چھت اور برآمدے کے خوشنما پتھر کے ستون اپنی بلندی پر سے کم و بیش دکانوں اور [illegible] ڈاکخانے کو حقارت کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ ہفتے کے دن دوپہر کے قریب میں اس برآمدے میں بیٹھا خواجہ صاحب کے دفتر سے واپس آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ صبح سات بجے سے بارش بہت زور شور کی ہو

رہی تھی۔ اس دن ان کی روح اور کیفیت [illegible] تا دکھ دیا تھا۔ لطیف [illegible] اور بیچ والی [illegible] تک تو تاریخ معذرت لکھے [illegible] کے ٹیلوں میں سے میں سامنے کی [illegible] دیکھ رہا تھا [illegible] پہنچ گئے۔ بارش کے مسلسل ترنم سے میرے دماغ میں ایک عجیب [illegible] اور خواب [illegible] کرتا رہا۔ وہ [illegible] مسلمان، وہ انگریز، ہندوستانی [illegible] آزاد اور خود مختار [illegible] جانے والی دنیا جو ان کی تھی اور میں جو حیران تھا کہ باوجود اس قدر اختلافات کے [illegible] ہے۔ [illegible] تعالیٰ نے مجھے ایک دوسرے سے بہت مانوس کر دیا تھا۔ کچھ اپنی نسبت تو یقین سے کہ [illegible] مجھے [illegible] اثرات ان کے متعلق میرے جذبات میں [illegible] جاتی ہے [illegible] کر سکتا ہوں مجھے شرف بخشا میری کسی صفت کی بدولت [illegible] سامنے اس طرح سمجھ جاتا ہوں جیسے [illegible] استاد کے [illegible] تکلف ہو جاتا ہوں جیسے وہ اور میں بچپن میں [illegible] کھیلتے رہے ہوں۔

میرے خیالات یہاں تک پہنچے ہی تھے کہ [illegible] دیا اور ہم [illegible] شکریہ [illegible] مجھے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی [illegible] اور [illegible] تھوڑے [illegible] آنکھوں سے ماندہ گلی [illegible] ایک سوار [illegible] دربار [illegible] چپ [illegible] گلی کا [illegible] قوس کے سیاہ [illegible] مجھے رکابوں میں [illegible] معلوم ہوتا تھا [illegible] اتار کر ہاتھ میں ڈال لیا۔ اور ہماری [illegible] طرف [illegible] لگا میں پہلے سے [illegible] اس کی طرف [illegible] ہو گیا۔

قریب آ کر اس نے مجھے ایک [illegible] دیا [illegible] تھا [illegible] ولیش صاحب کا [illegible] کرتے تھے [illegible] باندہ گلی

پیارے انجم!

معمولی لباس پہن کر فوراً یہاں آ جاؤ [illegible] بیٹھیں۔

[illegible] کارتوس، میرے کمرے کی چابی اور پانچ چھ نوٹ ہمراہ لیتے آؤ۔

تمہارا مخلص

"ایچ۔ ڈبلیو۔ ولیش"

میں فوراً اندر گیا اور جلدی جلدی اپنا لباس تبدیل کیا۔ ٹرنک کھول کر اس میں سے [illegible] کارتوس نکالے۔ تکیے کے نیچے سے اپنا بھرا ہوا پستول اٹھا کر جیب میں ڈال لیا۔ نوٹ [illegible] سے [illegible] کمرے کی چابی اٹھائی (ولیش صاحب نے اپنے کمرے کی ایک چابی مجھے دے رکھی تھی کہ بعض اوقات جب پہاڑیوں میں پھرتے

پھرتے باندہ گلی کے قریب جا نکلتے اور شک کرتا پھر بھی ضرورت محسوس کرتا تو ان کی غیر حاضری میں ان کا کمرہ کھول کر وہاں بیٹھ جایا کرتا۔ سب چیزوں کو جیبوں میں ڈال کر احتیاطاً پھر پڑتال کی اور بارانی کوٹ پہنتے پہنتے باہر نکلا۔ نوکر کو خواجہ صاحب کے نام پر ایک رقعہ اس مضمون کا لکھ کر دیا کہ خدا جانے میں کس وقت واپس آؤں۔ آپ چائے اور کھانے پر میرا انتظار نہ کریں۔ یہ سب کچھ کر کے گھوڑے پر سوار ہو سرپٹ باندہ گلی کو روانہ ہو گیا۔

تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد، اس چھوٹی سی سطح مرتفع پر پہنچ گیا۔ جہاں باندہ گلی کا ایک روپیہ بازار، ہوٹل، ڈاک خانہ وغیرہ ایک مسلسل سا نصف دائرہ بنائے کھڑے ہیں۔ باندہ گلی کا بازار بالکل نتھیا گلی کا سا ہے۔ دائیں ہاتھ کو ایک حلوائی کی چھوٹی سی دکان، اس کے ساتھ میوہ فروشی و شراب۔ تمباکو، قلم، کاغذ، پنسل وغیرہ کا سٹور، پھر اس کے ساتھ ایک کنجڑے اور پھر شاید ایک بنئے کی دکان تھی۔ اسی قطار میں کچھ فاصلے پر تحصیل، تھانہ، کچہری اور سامنے ڈاک بنگلے کی چھوٹی سی چوکور عمارت تھی۔

بائیں ہاتھ کو باندہ گلی ہوٹل بھٹکے پیاسوں کے لئے اپنی آغوش شفقت کھولے بغیر کسی تکبر اور نخوت کے کھڑا تھا۔ باندہ گلی میں داخل ہوتے ہی میں نے ہوٹل کا رخ کیا۔ گھوڑے کو اصطبل میں سپرد کر کے سیدھا ۳۵ نمبر کمرے کی طرف گیا۔ دروازے کو دھکیلا مگر دروازے کا تالا بند تھا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ولیٹن صاحب نے کیوں مجھے چابی ساتھ لانے کو کہا تھا۔ خیر دروازہ کھول کر میں اندر گیا۔ سب سے پہلے جس چیز پر میری نظر پڑی وہ ایک سفید رنگ کا کارڈ تھا جو انگیٹھی کے اوپر طاق پر ایک پھولدان کے سہارے کھڑا تھا اور جس پر سرخ پنسل سے ولیٹن صاحب کے ہاتھ کے دو فقرے لکھے تھے:

"میرا پتہ منیجر سے پوچھ لو ـــــ یہ کارڈ جلا دو۔"

میں نے ان دو فقروں کو شاید چھ دفعہ پڑھا۔ جیب سے دیاسلائی کا بکس نکال کر کارڈ جلا دیا۔ اور دروازے کا تالا پھر بند کر کے منیجر کے کمرے کی طرف آیا۔

میں نے جلدی سے منیجر کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ لیکن جس تیزی سے میں نے اسے کھولا ہرگز اس تیزی سے اسے بند نہ کر سکا۔ جان ولیم باندہ گلی ہوٹل کا مالک اور منیجر اپنی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے دونوں بازو میز پر پڑے تھے اور اس کا چہرہ اس کے بازوؤں میں چھپا ہوا تھا۔ میں جان ولیم کو دو تین سال سے جانتا تھا۔ کسی نامعلوم وجہ سے ولیٹن صاحب کو اس سے خاص انس تھا۔ جس کی بدولت مجھے جان ولیم سے ہزار دفعہ ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ میں اس سے جب ملا اسے مسکراتا ہوا پایا۔ جب اس نے مجھ سے بات کی مجھے ہنسا کر ہی گیا۔ آج اس کو اس قدر مغموم دیکھ کر مجھے بہت ترس سا آیا۔ میں نہایت آہستہ سے دروازہ بند کر کے آگے بڑھا۔ کمرے کے بیچ میں ایک چھوٹی سی گول میز تھی۔ اس پر اپنی ٹوپی اور بارانی کوٹ کو پھینک دیا اور نہایت نرم آواز میں پکارا "ولیم!"

ولیم نے میز پر سے اپنا سر اٹھایا اور اگر مجھے اس کے غمزدہ ہونے میں کوئی شک تھا تو وہ سب رفع ہو گیا۔ اس کا چہرہ تبسم سے بالکل ناآشنا معلوم ہوتا تھا اور اس کے ہونٹ ایک رحم طلب انداز میں ذرا نیچے کو جھکے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا:ـــــ

"ولیٹن صاحب ۱۲ نمبر کمرے میں ہیں۔"

میں نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے اور پوچھا۔

"ڈیم! تم آج اس قدر غمگین کیوں ہو؟"

کچھ دیر تو وہ خاموش رہا۔ پھر ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔

"کچھ نہیں اپنے کاروبار کے متعلق بیٹھا سوچ رہا تھا۔"

اور سر جھکا لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس نے مجھے ٹال دیا ہے۔ میں نے اس سے کہا۔

"ڈیم! تمہیں غمزدہ دیکھ کر مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے۔ کیا تم مجھے اس قابل نہیں سمجھتے کہ اپنی تکلیف مجھ سے بیان کرو؟"

شاید میرے خلوص اور صداقت نے اس پر اثر کیا۔ ایک آدھ منٹ تک وہ کچھ نہ بولا۔ اور دائیں ہاتھ کے ساتھ اپنے کوٹ کے ایک بٹن سے غائبانہ کھیلتا رہا۔ پھر سر اٹھا کر کہا۔

"آپ کسی سے کہیئے نہیں؟"

"مجھ پر یقین رکھو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں کسی سے نہیں کہوں گا۔"

"ہوٹل میں ایک قتل ہوا ہے۔"

"قتل! کب! کس کا قتل؟"

میں حیران تھا کہ آج دو بجے سے جو بات ہو رہی ہے غیر معمولی، جو واقعہ پیش آتا ہے۔ فوق العادت۔ پہلے وہیٹن صاحب کا پراسرار خط پھر اس کارڈ پر وہ پراسرار تحریر اور اب یہ قتل کی خبر۔ میں نے میز پر سے اپنی ٹوپی اٹھا کر دونوں ہاتھوں میں پکڑ لی۔ میرے دل میں پریشانی میری انگلیوں کی مضطربانہ حرکات سے ظاہر تھی۔ ڈیم کی آواز نے آخرکار مجھے اس طرف متوجہ کیا۔

"البرٹ براؤن نامی ایک شخص دو مہینے سے یہاں رہتا تھا۔ کل شام کو چار بجے ہوٹل میں چائے پینے کے بعد وہ سیر کو نکلا اور کھانے کے وقت تک واپس نہ آیا۔ پھر بھی نہیں معلوم کہ وہ واپس کس وقت آیا۔ کیونکہ نہ تو اس نے آکر کھانا مانگا اور نہ رات کے دس بجے تک اس کے کمرے میں کسی نے لیمپ ہی جلتے دیکھا۔ جیسا کہ عام دستور ہے صبح سات بجے وہ چائے پیا کرتا تھا۔ آج صبح حسب معمول نوکر اس کے کمرے میں چائے لے کر گیا تو دیکھا کہ خواب گاہ از حد بدنظمی اور بے ترتیبی کی حالت میں ہے۔ تمام چیزیں الٹ پلٹ پڑی ہیں اور براؤن اپنے بستر پر بغیر کسی اوڑھنے کے ڈریسنگ گون پہنے بظاہر سویا پڑا ہے۔ وہ اسے جگانے کی غرض سے نزدیک گیا تو معلوم ہوا کہ اس کی دائیں کنپٹی پر ایک بڑا سا مہیب زخم ہے۔ اس کا رنگ بالکل زرد اور اس کی آنکھیں کھلی اور پتھرائی ہوئی ہیں۔ دفعتہً نوکر پر اس بات کا انکشاف ہوا کہ اس کے سامنے ایک سویا ہوا آدمی نہیں بلکہ ایک مرا ہوا آدمی پڑا ہے۔ نوکر بھاگا ہوا میرے پاس آیا۔ اور ٹوٹے پھوٹے فقروں میں براؤن کی موت کی خبر سنائی۔

میں اس کے ساتھ بارہ نمبر کمرے میں گیا اور حالات کو بعینہٖ ویسے پایا جیسے کہ اس نے مجھ سے بیان کیا تھا۔ مسٹر امجد! آپ خیال فرمائیے کہ اس ناگوار واقعہ سے میری اور میرے ہوٹل کی نیک نامی پر کس قدر برا اثر پڑے گا۔ اس وقت میرے ہوٹل میں سو کے قریب آدمی رہتے ہیں مگر اس واقعہ کے مشتہر ہو جانے کے بعد آپ یقین رکھئے کہ ایک شریف آدمی بھی یہاں قدم نہ رکھے گا۔ وہ کہاں رہیں؟ اس ہوٹل میں جہاں لوگ بلا وجہ قتل کر دیئے جاتے ہیں؟ جہاں مال کا نہیں جان کا خطرہ ہوتا ہے؟ میں کچھ عرصہ ہی بد قسمت اور مجھے نہیں معلوم میری بدقسمتی کا بازار کب تک گرم رہے گا۔ آپ کو علم ہوگا جب میں اور میرا بھائی ہندوستان آئے تو پہلے پہل ہم نے بریلی میں مشترکہ سرمایہ سے ایک ہوٹل کھولا لیکن تھوڑے

ویسے بعد میں اس بات پر مجبور ہو گیا تھا۔ میں کو سیدھا کر دوں۔ ان کی عادت مجھے پڑ رہی تھی۔ ان کی سرکشی [illegible] ہوٹل کے [illegible] حضرت رسالت [illegible] کر [illegible] کر دیا۔ مجھے صحت تو [illegible] تھا۔ اس کے جواب [illegible] تھا۔ ان کے ہوٹل کا کمرہ بہت زیادہ دور تھا اور میں اکیلا [illegible] متحمل نہ ہو سکا۔ ان سے پوچھ کر میں نے اس جگہ ہوٹل چھوڑا۔ اب [illegible] یہ ہوٹل بھی چھوڑ جانے کو [illegible] چھوڑ رہا ہوں۔

انگریزی دانی [illegible] سے میں [illegible] ان کے پاس سے بہت جلد [illegible] طرح کے سوالات پوچھے [illegible] میں نے سب [illegible] کر لیا۔

ہم [illegible] نے بہت جلد [illegible] کہ تم ذرا حوصلہ کرو۔ تم سے کیا کہ [illegible] صاحب [illegible] ہیں جی!

"ہاں [illegible] آپ [illegible] غسل خانے [illegible]؟"

"جی ہاں! لیکن [illegible] 'اچھا' کہہ کر [illegible] سے [illegible] کہیں سے نظر آ رہا تھا۔

غسل خانے کی طرف [illegible] میں داخل ہوا تو [illegible] کی لاش [illegible] پڑی تھی۔ یہاں سے [illegible] اس وقت داخل ہوا جس وقت [illegible] صاحب [illegible] ایک کرسی پر بیٹھے سگرٹ [illegible] نکال رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے سگرٹ [illegible] صاحب بولے:۔

"اچھا تو تم [illegible] سے آئے ہو؟"

"ہاں۔ مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

وہ سگرٹ جلا چکے تو دیا سلائی کو [illegible] پھینک کر کہا:۔

"جس وقت [illegible] سے چلے تو [illegible] ہو رہی تھی نا؟"

"ہو رہی تھی۔"

"تو تمہارا [illegible] کہاں ہے؟"

"وہ تو...... میں [illegible] کے کمرے میں بھول آیا ہوں۔"

"اور [illegible] سے [illegible] دیا ہے۔ اچھا یہ دیکھو [illegible] اپنے [illegible] نام [illegible] خوبصورت چھپوایا ہے۔"

یہ کہہ کر انہوں نے میرے ہاتھ میں [illegible] کا ایک بل دیا۔ [illegible] والوں کو دیتے ہیں [illegible] رسید [illegible] ہوتے ہیں۔ بل پر خریدار کا نام [illegible] اس قدر [illegible] ہوا تھا۔

ایک ڈبہ پانامہ سگار	۰	۰	۲۵
ایک چھوٹا وسکی	۰	۶	۰
	۰	۶	۲۵

فارم پر سیٹھ فیروز جی کا نام وغیرہ رنگ دار روشنائیوں میں واقعی بہت خوبصورت چھپا ہوا تھا۔

میں مسلمان ہوں شراب، شراب نوشی کی اصطلاحات سے ناواقف۔ میں نے پوچھا۔

”اس چھوٹا وسکی کا کیا مطلب ہے معمولی درجہ کی؟“

”نہیں۔ ایک چھوٹا وسکی کے معنی وسکی کا ایک چھوٹا پیگ ہے۔ اب دیکھو یہ سب ہوٹل کے فارم اگرچہ سادہ ہیں اس سے قطع نظر کر چھپائی میں کس قدر خراب ہیں۔“

اب کے بار انھوں نے ہوٹل کا بل فارم میرے ہاتھ میں دیا۔ میں حیران تھا کہ کیا ویلش صاحب نے مجھے محض کل سے اس لئے بلایا ہے کہ انھیں بل فارموں کی چھپائی کے سے اہم مسئلے پر میری رائے لینی تھی۔ خیر میں نے بل کو دیکھا چھپائی واقعی کچھ قابل تعریف نہ تھی۔ باقی تحریر عام بلوں کی سی تھی۔

بل بنام ٹی براؤن صاحب کمرہ نمبر ۲ بابت ماہ جولائی

	پائی	آنہ	روپیہ
خوراک وغیرہ			۱۱۰
کرایہ	۰	۰	۳۰
	۰	۰	۱۴۰

سیٹھ فیروز جی کا بل میرے داہنے ہاتھ میں تھا۔ اور ہوٹل کا بل بائیں ہاتھ میں۔ میں باری باری دونوں کو دیکھ رہا تھا کہ ویلش صاحب بولے۔

”یہ دونوں بل مجھے براؤن کے اس کوٹ کی جیب سے ملے ہیں جو وہ حادثہ کی شام کو پہن کر باہر گیا تھا۔ پہلا سوال جو ان بلوں کو دیکھ کر میرے دل میں اٹھا وہ یہ تھا کہ میری خوراک کا خرچ ایک سو پچاس روپے ماہوار ہوتا ہے۔ براؤن کا ایک سو دس روپے کیوں تھا۔ منیجر سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ براؤن شراب بالکل نہیں پیا کرتا تھا۔ نہ کھانے پر نہ کسی اور وقت۔ اس لئے وہ شراب کے چالیس روپے جو ہوٹل والے ہم سے چارج کرتے ہیں اس سے نہیں لئے جاتے تھے۔“

(میں نے دل میں براؤن صاحب مرحوم کو آفریں کہا کہ ایک نیکی کا کام تو کرتا تھا) ویلش صاحب نے سلسلہ کلام پھر شروع کیا:۔

”اگر وہ شراب نہیں پیا کرتا تھا جیسا کہ مصدقہ ہے تو دوسرا سوال یہ ہے کہ اس نے پھر کیوں سیٹھ فیروز جی کی دکان سے وسکی کا ایک پیگ پیا؟“

(افسوس براؤن مرتے مرتے یہ گناہ کر ہی بیٹھا)

”اب تم دیکھو۔ یہ طاق پر پانچ چھ سگاروں کے ڈبے پڑے ہیں۔ ایک میں تو کچھ سگار ہیں۔ باقی سب خالی ہیں۔ مگر سب ڈبوں پر سگاروں کا نام ”سلطانہ“ لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ براؤن کو ”سلطانہ“ سگار پینے کی عادت تھی۔ باوجود اس کے سیٹھ فیروز جی کا بل کہہ رہا ہے کہ اس نے ”پانامہ“ سگاروں کا ایک ڈبہ خریدا۔ یہ کیا تعجب کی بات نہیں کہ ایک شخص جس کی نسبت ہوٹل کے جو لوگ اسے جانتے ہیں، وہ گواہی دیتے ہیں کہ اس کی زندگی نہایت سنجیدہ و متین اور اس کی عادات نہایت سادہ اور باقاعدہ تھیں۔ اپنی موت کے دن

مقررہ معمول سے اس قدر انحراف کرے۔ کہ شراب نہ پیتا ہو تو اس دن شراب پی لے اور سگار جو وہ غالباً برسوں سے پی رہا ہے۔ چھوڑ کر ایک اور قسم کے نہایت قیمتی سگاروں کا ڈبہ خریدے۔ پھر وہ ڈبہ بھی تو اس کمرے میں کہیں نہیں ملتا۔ کیا اس نے وہ کسی دوسرے شخص کے لئے خریدا تھا، لیکن نہیں، انگیٹھی کے پاس سے مجھے یہ دو جلے ہوئے سگاروں کے باقیماندہ حصے ملے ہیں۔ جن کا تمباکو "سلطانہ" سگار کے تمباکو سے بہت مختلف اور اعلیٰ ہے۔ غالباً پانامہ سگار ہی ہو (چونکہ میں خود سگار نہیں پیتا۔ اس لئے میری واقفیت اس بارے میں محدود ہے)، تو گویا اس کمرے میں دو پانامہ سگار پئے گئے لیکن باقی کا ڈبہ غائب ہے — اب چلو غسلخانے کا معائنہ کریں۔"

یہ کہہ کر ہم دونوں غسلخانے میں گئے۔ ولیٹ صاحب نے براؤن کی لاش پر سے چادر اٹھائی۔ براؤن ستر پچھتر برس کی عمر کا ایک دبلا پتلا قریباً چھ فٹ دراز قد کا آدمی تھا۔ اس کے چہرے سے بے انتہا شرافت ٹپکتی تھی اور تعجب ہوتا تھا کہ ایسے آدمی کو کوئی کس طرح قتل کر سکتا ہے۔ اردگرد کی سب چیزیں درہم برہم تھیں جیسے کوئی دو شخص ایک دوسرے سے کشتی لڑتے رہے ہوں۔

"کنپٹی کے زخم کے علاوہ براؤن کا دایاں بازو بھی ٹوٹا ہوا ہے اور یہ دونوں ضربیں معلوم ہوتا ہے کسی کند وزنی چیز سے آئی ہیں۔ ایسی کند وزنی چیز دونوں کمروں میں کوئی نہیں۔ لیکن قابل غور ایک اور بات ہے۔ وہ سامنے کھونٹی پر براؤن کا وہ کوٹ ٹنگا ہوا ہے جسے وہ کل پہن کر سیر کرنے گیا تھا۔ یہ کوٹ ایک دو جگہ بالکل نیا پھٹا ہوا ہے۔ اب اگر یہ کوٹ اس کشمکش میں پھٹا ہے جس کشمکش کا نتیجہ براؤن کے لئے موت تھی تو کیا براؤن میں باوجود ایک مہلک زخم اور ایک ٹوٹے ہوئے بازو کے اس قدر ہمت تھی کہ وہ کوٹ اتار کر نہایت سلیقے سے کھونٹی پر لٹکاتا۔ پھر اس کی جگہ یہ ڈریسنگ گون پہنتا جس کی ڈوری کی گانٹھ تم غور کرو نہایت احتیاط سے دی ہوئی ہے۔ عقل کہتی ہے کہ یہ سب کچھ براؤن کا کام نہیں۔ اس کے علاوہ براؤن کے شام کے وقت پہننے کی ٹوپی جو کل شام ضرور اس کے سر پر تھی۔ یہاں کہیں نہیں ملتی۔"

یہ کہہ کر ولیٹ صاحب نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ میں بڑے انہماک سے ان کی باتیں سن رہا تھا اور ساتھ ہی بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا۔ فی الحقیقت اس قتل کے گرد ایک ایسی تاریکی محیط تھی جس میں میرے متجسس دماغ کو کوئی راہ دکھائی نہ دیتی تھی۔ جب میں ولیم کے قتل کا ماجرا سن رہا تھا تو میرا دل قتل اور قاتل کی نسبت ولیم کی مصیبت کی طرف زیادہ متوجہ تھا۔ اور اب قتل مجھے ایسا اہم واقعہ معلوم ہوتا تھا کہ میں ولیم کی تکلیف کو بالکل بھول گیا۔

ولیٹ صاحب مجھے ساتھ لے کر غسلخانے کے دروازے سے باہر نکلے۔ میں نے ان سے پوچھا۔

"یہ ہم چوروں کی طرح غسلخانے کے دروازے سے کیوں آتے جاتے ہیں؟"

وہ بولے۔

"ولیم نے جب تمہیں سارا حال سنایا تو اس نے تم سے یہ وعدہ نہیں لیا کہ تم کسی کو نہ کہو گے؟"

"لیا تھا!"

"ہوٹل میں تین چار آدمیوں کے سوا اور کسی کو اس واقعے کا علم نہیں۔ اور حتی الوسع کوشش کی جا رہی ہے کہ جب تک تفتیش کسی خاص نتیجے پر نہ پہنچے اس کا ذکر نہ کیا جائے۔ جو نوکر صبح براؤن کی چائے لے کر آیا تھا۔ اور جس نے سب سے پہلے اس ہوٹل میں براؤن کو مرا ہوا دیکھا اس کو ولیم نے شاید کچھ روپے دے کر چند دنوں تک اس معاملے پر زبان بند رکھنے کی ہدایت کی ہے۔ سب انسپکٹر صاحب بھی شریف آدمی تھے۔ انہوں نے بھی وعدہ کیا ہے کہ جب تک انہیں کسی خاص شخص کے مجرم ہونے کا پورا یقین نہ ہو جائے وہ کسی سے ذکر نہ کریں گے۔"

“اچھا تو پولیس کو اطلاع دی گئی ہے؟”

“اوہو۔ ولیم نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ہیڈ سب انسپکٹر صاحب خاکی کاغذوں کا ایک دستہ اور قلم دوات لے کر یہاں آئے تھے۔ منیجر کے کمرے میں گھنٹہ بھر بیٹھ کر بیانات قلمبند کرتے رہے پھر ایک نوکر کو گرفتار کر کے ساتھ لے گئے مگر وہ بالکل بے گناہ ہے۔”

“تو انھوں نے اسے کیوں گرفتار کیا؟”

“پولیس کی تفتیش کے ڈھنگ نرالے ہیں۔ سب انسپکٹر صاحب نے پہلے تو براؤن کے کمرے کا سرسری معائنہ کیا۔ اس قدر سرسری کہ ذرا ان سے جا کر پوچھو تو انھیں اس کمرے کی شاید ایک چیز بھی یاد نہ ہوگی۔ پھر ہم سے پوچھا کہ کل رات یہاں کون کون آدمی ملنے آئے تھے۔ وہ صرف ایک فیروز خاں بیرہ تھا جو کل مری سے ولیم کے بھائی چارلس کے ہمراہ یہاں آیا تھا۔ چارلس تو کل شام پانچ بجے ولیم کے کمرے میں ایک چٹ چھوڑ گیا کہ میں مری واپس جا رہا ہوں۔ میرا نوکر فیروز خاں رات یہیں رہے گا۔ فیروز خاں اپنے آقا کی مرضی کے مطابق رات باندہ گلی ہی میں رہا اور آج صبح گرفتار کر لیا گیا۔”

“چارلس یہاں کیا کرنے آیا تھا؟ اس کی بھائی کے ساتھ ناچاقی سی ہے۔”

“ناچاقی سی تھی۔ جان ولیم شریف خصلت انسان ہے۔ چارلس مغرور اور بدطینت ہے۔ مگر آخر جان کا بھائی ہے۔ جان کو اس پر ترس آیا۔ اور ان میں پھر رابطہ محبت قائم ہو گیا۔ چارلس نے مری میں ایک ہوٹل کھولا ہوا ہے۔ کل وہ یہاں اسی کے لئے آیا تھا۔”

یہاں میں یہ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مری باندہ گلی سے پندرہ میل کے فاصلے پر ہے اور گھوڑے پر تین گھنٹے کا راستہ ہے۔

یہ باتیں ہم ہوٹل کے ٹینس کے چمن میں کھڑے ہوئے کر رہے تھے۔ یہاں سے ہم منیجر کے کمرے کی طرف گئے۔ جان ولیم نے ولیمز صاحب سے بڑی ہمدردی کے لہجے میں پوچھا۔

“آپ کسی نتیجے پر پہنچے ہیں؟”

“ابھی تو نہیں۔ مگر بہت جلد پہنچنے والا ہوں ...... ہم چائے ڈاک بنگلے میں پئیں گے۔”

میں نے اپنا باراں کوٹ منیجر کے کمرے سے اٹھایا اور ہم نے ڈاک بنگلے کی پہاڑی پر چڑھنا شروع کر دیا۔ میں نے اپنی کلائی کی گھڑی کو دیکھا تو چار بجنے میں سات منٹ تھے۔

ولیمز صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ آج شام کو کھانا شاید نصیب نہ ہو۔ چائے کے ساتھ ہی جو کچھ کھانا ہو کھا لو۔ مجھے دوست لوگ دسترخوان کا غاصب سمجھتے ہیں اور رات کو کھانا نہ ملنے کے ڈر سے تو خدا جانے میں نے کس قدر کھایا۔ جب میں رات کی فاقہ کشی کا خاطر خواہ انتظام کر چکا تو میں نے ٹانگیں پھیلا کر سامنے کی خالی کرسی پر رکھ دیں۔ ولیمز صاحب میرے پاس برآمدے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہل رہے تھے۔ مجھے پیٹ کی فکر سے فراغت پاتے دیکھا تو میرے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

میں اکثر ان کے موزوں قد اور اعضا کے تناسب کو دیکھ کر رشک کے مارے جلا کرتا تھا لیکن اس وقت سواری کے لباس میں وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے برجس کی جیب میں سے پستول نکال کر اسے کھولا اور میری طرف ہاتھ بڑھا کر کارتوس مانگے۔ میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ میں کچھ فالتو کارتوس بھی ساتھ لایا ہوں۔ اب جو انھوں نے مجھ سے ان کا ذکر کیا تو مجھے نوٹ پیپر بھی یاد آئے۔

میں کہنے کو تھا کہ وہ نوٹ بُک میرے پاس ہی ہے مگر کسی خیال سے چپ رہا۔ اور جیب سے کارتوس نکال کر ان کے ہاتھ میں رکھ دیئے۔ انھوں نے ایک ایک کر کے سب کو پستول میں بھر لیا۔ پستول بند کر کے پھر جیب میں ڈال لیا۔ اور مسکرا کر کہنے لگے:۔

"میرے کارتوس ختم ہو گئے تھے۔ اس لیے میں نے تمہیں لانے کو کہا تھا۔ میں تمہارا چھ کارتوسوں کا قرضدار ہوں۔"

ان کا یہ انداز بر تکلفانہ لطیف میں بے تکلفی تھا۔ لیکن مجھے کچھ عجیب گھبراہٹ سی ہوئی۔ میں اس کے جواب میں خدا جانے کیا کہتا۔ لیکن انھوں نے مجھے اس کی زحمت نہ دی اور دفعتاً پوچھا:۔

"تو تمہاری براؤن کے متعلق کیا رائے ہے؟"

"میں تو سب سے پہلے سیٹھ فیروز جی کے بل کا معما حل کرنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے میں سیٹھ کے پاس جا کر کسی ڈھنگ سے پوچھ آؤں کہ یہ پانامہ کا ڈبہ اور ایک چھوٹا وسکی کس نے خریدا تھا؟"

"بہت خوب۔ بہت خوب۔ تم اب روز بروز عقلمند ہوتے جاتے ہو۔ اور چونکہ معلوم ہوتا ہے تمہیں تفتیش جرائم میں خاص ملکہ حاصل ہے۔ اس لیے ساتھ ہی تحصیل سے یہ بھی پوچھ آؤ کہ چارلس نے کل شام کے پانچ بجے مری جانے کے لیے گھوڑا کرایہ پر لیا تھا؟"

مجھے پھر کچھ گھبراہٹ سی ہوئی۔ لیکن پھر کچھ جواب بن نہ پڑا۔ کھسیانا ہو کر میں ڈاک بنگلہ سے باہر نکل آیا۔

پانچ منٹ کے بعد میں دور ہی سے مسکراتا ہوا ڈاک بنگلے کے برآمدے میں داخل ہوا۔ ولیٹن صاحب ٹہلتے ٹہلتے رک گئے اور ایک منتظرانہ انداز میں کھڑے ہو گئے۔

میں نے نہایت بے تکلفی سے کہا۔ "کل مورخہ ۴ اگست کو شام کے پانچ بجے چارلس ولیم صاحب مری ہوٹل کے مالک اور منیجر نے سیٹھ فیروز جی اینڈ برادرس کی دکان سے ایک ڈبہ پانامہ سگار کا خریدا اور ایک پیگ وسکی کا پیا۔ تحصیل سے کل صبح کے سات بجے سے لے کر شام کے آٹھ بجے تک انھوں نے کوئی گھوڑا کرائے پر نہیں لیا۔ پہلی بات مجھے سیٹھ فیروز جی کی زبانی اور دوسری بات گھوڑوں کے ٹھیکہ دار کی زبانی معلوم ہوئی۔ مگر اس ڈھنگ سے کہ انھیں شاید محسوس بھی نہیں ہوا کہ ان سے یہ باتیں کوئی پوچھ گیا ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے اپنے ہاتھ پہلوؤں پر رکھ لیے اور نہایت بے پروائی سے دو تین قدم برآمدے کے پتھر کے فرش پر ٹہلا۔ پھر مڑ کر میں نے ولیٹن صاحب سے کہا:۔

"وہ سگاروں کے جلے ہوئے ٹکڑے جو آپ نے براؤن کے کمرے میں سے اٹھائے تھے۔ وہ تو ذرا دکھائیے۔"

انھوں نے فوراً میرے "ارشاد" کی تعمیل کی۔ میں نے ان ٹکڑوں کو لے کر کھولا پھر ان چھ پانامہ سگاروں میں سے جو میں سیٹھ کی دکان پر سے خرید کر لایا تھا۔ ایک سگار لے کر اس کے تمباکو کے پتے کو کھولا اور دونوں کا مقابلہ کیا۔ مربیانہ لہجے میں ولیٹن صاحب سے کہا

"آپ کا قیاس صحیح تھا۔ یہ جلے ہوئے سگار سب کے سب پانامہ سگار ہیں۔"

انھوں نے جھک کر کہا "یہ آپ کی عین نوازش۔"

"تو اب ہم مری چلیں گے نا؟"

"جس طرح حضور حکم کریں۔"

میں بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ وہ بھی مسکرا دیئے۔ وہ پانامہ سگار سلگا کر ہم ڈاک بنگلہ سے تحصیل کی طرف آئے۔ وہ گھوڑے

لیے اپنے بارانی کوٹ وہاں باندھے جہاں سنگلیو نے ہرن کے بچے کو باندھا تھا۔ اور اپنے پستولوں کو جیبوں میں ٹٹول کر گھوڑوں پر سوار ہوم بی کی طرف روانہ ہو گئے۔

ماؤنٹ ہل سے آتے ہوئے میں نے گھوڑوں کو ڈھیل پر چھوڑ دیا۔ چپ چاپ جنگلوں میں عجب عظمت ہے۔ دور کھنڈ اور طوفان کے ادھیڑے لیٹے درخت ایک طرف پہاڑوں کی سپہر شکوہ بلندی، دوسری طرف کھڈ کی پُر اسرار گہرائیاں تنگ پیچیدہ سڑک۔ اس پر گھوڑوں کے ٹاپوں کی مسلسل آواز آبشاروں کا شور، کوہساروں کی دور دور تک گونج۔ میں تو بے خود ہو گیا۔ درختوں کے بیچ میں سے غروب آفتاب کے ہر لحظہ بدلتے ہوئے نظارے کبھی چھپ کر کبھی ظاہر ہو کر مجھے بے قرار کر رہے تھے۔ آبشاروں کا سفید پانی بڑے بڑے پتھروں پر گر کر تحت الثریٰ میں ہو کر غائب ہو رہا تھا۔ بار بار کھڈ میں کود پڑنے کو جی چاہا۔

میرے کانوں نے ایک غیر مانوس آواز سے رنجیدہ ہو کر مجھے چونکا دیا۔ ولسن جو مجھ سے دس گز آگے جا رہے تھے اپنا گھوڑا روک لیا اور گھوڑے کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ جب میں ان کے برابر آ کر ٹھہر گیا۔ تو وہ بولے۔

"مری بائسکوپ کا تماشا کس وقت شروع ہوتا ہے؟"

"شاید پونے آٹھ بجے۔"

"اور اب ... ... سوا چھ بجے ہیں اور مری یہاں سے پانچ میل ہے تو گویا ہم بائسکوپ کا تماشا دیکھ سکتے ہیں۔ اب ذرا سبک چلیے

سرپٹ چلیں!"

"میں خود یہی کہنے والا تھا۔"

ہم نے گھوڑوں کو قدم قدم لے جانا شروع کیا۔ کچھ دیر تو ہم خاموشی سے ایک دوسرے کے ساتھ چلتے رہے۔ پھر ایک دم ولسن صاحب نے قماربازی کی اقتصادی، روحانی و اخلاقی قباحتوں پر ایک پُر زور لیکچر دینا شروع کر دیا۔ اس شد و مد سے کہ میں سمجھا اس فعل مذموم کے اختراع کا مجرم وہ مجھے سمجھتے ہیں۔ دس منٹ تک لگاتار وہ اس موضوع پر ایک پُر مغز تقریر کرتے رہے۔ میں خاموشی سے سنتا رہا۔ پھر انھوں نے دفعتاً باگیں کھینچ کر گھوڑے کو ٹھہرا لیا اور میری طرف دیکھ کر کہنے لگے :۔

"اور مجھے شرم کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ قبیح عادت اہل فرنگ میں کثرت سے ہے۔ وہ لوگ جو مہذب گھرانوں کی اولاد اور سوسائٹی کے معزز افراد شمار ہوتے ہیں، بلا تکلف شام کو کھانے کے بعد اپنی بیٹیوں، بہنوں اور بھائیوں کے ساتھ جوا کھیلتے ہیں۔ شاید ہی کوئی ہم صحبت دوست ایسے ہوں جو شام کو کلب میں تاش کھیلے بغیر رہ سکیں اور سارے کلب میں تاش کی ایک بازی ایسی نہیں ہوتی جس کی ہار جیت کے ساتھ روپے کی ہار جیت وابستہ نہ ہو اور اسی کو یہ لوگ شغل سمجھتے ہیں اس کو روحانی انبساط کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ ساتھ ہی پھر یہ دعویٰ ہے کہ تہذیب جدید بنی نوع انسان کی ترقی کا باعث ہوئی ہے۔ غلط اور سراسر غلط کہتے ہیں۔ تہذیب جدید نے کئی نئی خرابیاں ایجاد کی ہیں۔ مردہ عیوب کو از سر نو زندہ کیا ہے اور کئی پرانی قباحتوں کو پہلے سے زیادہ ہر دلعزیز کر دیا ہے۔"

میں حیران تھا کہ اس شخص نے اپنا دماغ کس قدر قابو میں رکھا ہے۔ مجھے ہرگز اس بات کی توقع نہ ہو سکتی تھی کہ چار گھنٹے براؤن کی موت پر تحقیق و غور و خوض کرنے کے بعد وہ یکایک اس طرح لاتعلق باتیں کرنے لگ جائیں گے جیسے وہ اس سے محض بے خبر ہوں اور پھر اس وقت جب کہ کم از کم میرا دماغ خیالات کے عدم اظہار کی وجہ سے بیش از بیش اسی سوچ میں مصروف تھا۔ ولسن صاحب میں میں نے بڑی خاصیت دیکھی ہے

کر وہ یک لخت اپنے خیالات کو بغیر کسی تکلیف کے ایک طرف سے دوسری طرف منتقل کر سکتے ہیں۔ وزیر اعظم انگلستان کے کیرکٹر پر بحث کو ختم کئے ابھی دو منٹ نہیں گزرتے کہ وہ چین کی ریشم کی تجارت کے متعلق باتیں کرنے لگ جاتے ہیں۔ ہزارہا آدمیوں کے ساتھ نہایت انہماک سے متواتر تین گھنٹے تک وہ اصلاحات ہند پر ملک کے ایک مشہور اسپیکر کی دھواں دھار تقریر سنتے رہتے ہیں، اور پھر ہال سے باہر نکلتے ہی ہسپانیہ کی آب و ہوا کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

اردگرد عظیم الشان پہاڑ اور اونچے اونچے درخت اس شاندار انسان کو دیکھ کر خاموش تھے۔

ولیٹن صاحب ان سے بالکل غافل، چپ چاپ گھوڑے پر چلے جا رہے تھے۔

مری ٹیلسکوپ سے ہم دس بجے نکلے۔ ولیٹن صاحب برجس کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سگرٹ کے پیہم کش لگا رہے تھے۔ میں نے معمول کے مطابق اپنی گھڑی کو کوکنا شروع کیا۔ ولیٹن صاحب بولے:۔

"یہ بھی گھڑی کے کوکنے کا وقت ہے؟"

"میں سونے سے پہلے گھڑی کو کوک دیا کرتا ہوں۔ دن کے وقت اور کاموں کی وجہ سے یہ کام بھول جاتا ہوں۔ اب خدا کرے خواجہ محمد حسین وہاں میرے ٹائم پیس کو کوک رکھیں۔"

"تو تم ٹائم پیس اور کلائی کی گھڑی کو ایک ہی وقت کوک دیتے ہو؟"

"اس میں کیا حرج ہے! بلکہ یہ تو اچھی بات ہے۔"

"میرا بھی یہی قاعدہ ہے اور ——— شاید...... ہر ایک...... عقلمند......؟"

اگر میرے حواس نے مجھے دھوکا نہیں دیا تو میرا خیال ہے کہ ولیٹن صاحب نے اتنا کہہ کر اگلا قدم ذرا آہستہ اٹھایا اور ایک لمحے کے لئے ان کے رویے میں نمایاں تبدیلی ظاہر ہوئی۔ لیکن پھر وہ پہلے کی طرح لاابالیانہ طریقے میں چلنے لگے۔ آدھ منٹ کے بعد ایک معمولی فقرے کی صورت میں انہوں نے مجھ پر ایک بم گرا دیا:۔

"اگر تم ٹائم پیس اور کلائی کی گھڑی کو ایک ہی وقت کوک دیتے ہو، تو براؤن کل شام کے چار بج کر ۲۵ منٹ پر مرا ہے؟"

مجھے ہرگز یقین نہ آیا کہ میں نے ٹھیک سنا ہے۔ چونک کے میں نے پوچھا:۔

"کیا کہا آپ نے؟"

"میں نے کہا ہے کہ اگر تم دونوں گھڑیوں کو ایک ہی وقت کوک دیا کرتے ہو تو براؤن کل شام کے چار بجکر ۲۵ منٹ پر مرا ہے۔ اور چونکہ چار بجکر ۲۵ منٹ پر وہ یقیناً ہوٹل کے باہر تھا۔ اس لئے اس کی موت اس کے کمرے میں نہیں بلکہ باہر کہیں واقع ہوئی ہے۔ اس کے بعد اغلباً رات کے وقت اس کی لاش اٹھا کر اس کے کمرے میں لائی گئی۔ وہاں اس کا کوٹ اتار کر اسے ڈریسنگ گون پہنایا گیا اور بستر پہ لٹا دیا گیا۔ اور پھر اس کی خواب گاہ کی چیزوں کو درہم برہم کر دیا گیا۔"

میں تحیر، استعجاب، استفہام اور اسی طرح کی بیس تیس چیزوں کا معجون مرکب، ان کے چہرے کی طرف منہ کئے بادل گنے والی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور مجھے یقین تھا کہ ولیٹن صاحب بالکل پاگل ہو گئے ہیں۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائے، سگرٹ کو منہ سے نکال کر ہوا کی تاریکی میں

کندھا اچکا دیا اور بولے:۔

"جب میں نے براؤن کے کوٹ کی تلاشی لی تو اس میں سے سیٹھ فیروزجی کا بل ملا۔ بل کے علاوہ مجھے براؤن کی جیبی گھڑی بھی ملی تھی جو مجھے یاد ہے کہ چار بجکر دس منٹ پر ٹھہری ہوئی تھی۔ میں نے کوتاہ بینی سے یہ سمجھا کہ گھڑی اس لئے ٹھہر گئی کہ اسے کوکنے والا مر گیا ہے (مجھے اس وقت یہ نہ سوجھا کہ گھڑی کی چابی پھیر کر دیکھ لیں) براؤن کی نشست گاہ میں میز پر اس کا ٹائم پیس بھی ٹھہرا ہوا تھا۔ اور اس کے ٹھہر جانے کی وجہ بھی میں نے یہی خیال کی۔ لیکن اب مجھے یاد آیا ہے کہ ٹائم پیس کی سوئیاں دس بجے پر رکی ہوئی تھیں۔ ٹائم پیس کے ساتھ تو کسی غیر معمولی واقعہ کے پیش آنے کا گمان نہیں ہو سکتا۔ اس لئے وہ تو اسی وقت ٹھہرا ہے جب اس کی کوک ختم ہوئی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ براؤن نے ٹائم پیس کو ——— اور اگر دونوں گھڑیوں کو ایک ہی وقت کوک دیا جاتا ہے تو دونوں گھڑیوں کو ——— فرمایئے نو بجے (یا غالباً رات کے نو بجے) کوکا کرتا تھا جیبی گھڑی جو چار بجکر دس منٹ پر ٹھہری ہے تو اس کا ٹھہر جانا یقیناً اس کشمکش کا ایک نتیجہ ہے جو براؤن کو موت سے دفعتاً پیشتر قاتل کے ساتھ یقیناً کرنی پڑی۔ اگر تم اور میں جو تنہا بدمست و بے قاعدہ زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں کر سکتے ہیں کہ دونوں گھڑیوں کو ایک ہی وقت کوک دیتے ہیں تو براؤن جیسے کی زندگی کی ہر ایک حرکت بنی تلی اور ہر ایک عادت قاعدہ اور مقرر کردہ تھی۔ کیا یہ ممکن بلکہ یقینی نہیں کہ وہ بھی دونوں گھڑیوں کو ایک ہی وقت کوک دیا کرتا تھا؟"

جوں جوں وہ یہ کہتے گئے براؤن کی موت کی ہر ایک تفصیل مجھ پر آشکارا ہوتی گئی۔ ایک دو باتوں کے متعلق پھر بھی میرے دل میں الجھن باقی رہی۔ وہی بلبن صاحب کے دماغ میں بھی پھر رہی تھیں۔ وہ کہنے لگے:۔

"سیٹھ فیروزجی کا بل اور ہوانا مارکہ سگاروں کے جلے ہوئے باقیماندہ ٹکڑے صاف بتا رہے ہیں کہ چارلس ولیم نہ صرف براؤن کے کمرے میں داخل ہوا ہے بلکہ وہاں کم از کم تین چار گھنٹے ٹھہرا ہے (دو درجن سگاروں کے پینے کے لئے کچھ وقت چاہئے) سو تم بغیر خوف تردید فرض کر لو کہ براؤن کی نعش کو باہر سے اٹھا کر لانے والا چارلس ولیم ہی تھا۔ اور براؤن کی تبدیلیٔ لباس اور خوابگاہ کی بدنظمی کا ذمہ دار بھی وہی ہے۔ اب صرف دو چار حل طلب امر باقی ہیں:۔

اول:۔ یہ کہ کیا چارلس ولیم صرف براؤن کی نعش کو باہر سے اٹھا کر کمرے میں لایا۔ یا کہ قتل بھی اسی نے کیا ہے؟

دوم:۔ یہ کہ اگر اس نے قتل نہیں کیا، تو قاتل کون ہے؟

سوم:۔ یہ کہ اس نے دیکھنے والوں کے دلوں میں یہ غلط خیال ڈالنے کی کوشش کیوں کی کہ یہ قتل براؤن کے کمرے میں ہوا ہے؟

چہارم:۔ یہ کہ سیٹھ فیروزجی کی دکان کا بل براؤن کی جیب میں کیسے چلا آیا؟

براؤن مارا کہاں گیا ہوگا؟ اغلباً ادھر ادھر کہیں جنگلوں میں؟"

"شاید۔ لیکن جہاں کہیں بھی وہ مارا گیا ہو وہاں اس کی موت کی ایک یادگار باقی ہے۔ بشرطیکہ جنگلی جانوروں نے اسے وہاں رہنے دیا ہو۔"

"وہ کیا؟"

"اس کی شام کے وقت پہننے کی ٹوپی۔"

اس حیرت انگیز انکشاف نے مجھے اس قدر متحیر کر دیا کہ میں گرد و نواح کی سب چیزیں بھول گیا۔ ولٹن صاحب جب تک ہم ہوٹل نہ پہنچے میں بھی ان کے ساتھ ساتھ چلتا جاتا تھا، آخر کار وہ ایک ہوٹل کے دروازے پر ٹھہرے اور کہنے لگے۔

"یہ چارلس ولیم صاحب کا ہوٹل ہے میرے خیال میں ان کی ملاقات تمہارے لئے از حد مسرت کا باعث ہوگی۔"

اس وقت شاید رات کے دس بجے ہوں گے۔ سڑک کی بتیوں کی روشنی رات کی مہیب تاریکی کے ساتھ ایک ناکامیاب مگر موثر مقابلہ کر رہی تھی۔ ہوٹل کے گرد و پیش کہیں کہیں کوئی نوکر بیٹھا ہوا نظر آتا تھا۔ ہم ہوٹل کی سیڑھیوں پر چڑھنے کے بعد ہوٹل کی ڈیوڑھی میں داخل ہوئے۔ وہاں چار دروازے کھلے تھے اور میز کے سامنے دو نوکر بیٹھے تھے۔ [illegible] ہم نے ان سے منیجر کا پتہ پوچھا۔ تو معلوم ہوا منیجر صاحب ساتھ کے کمرے میں ہیں۔ منیجر کے کمرے کا دروازہ کھول کر ہم اندر گئے۔ چارلس ولیم ایک آرام کرسی پر بیٹھا نہایت اطمینان سے سگار پی رہا تھا۔ اور اس کے پاس ایک چھوٹی سی میز پر ایک [illegible] اور ایک گلاس [illegible] صاحب کی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے پڑے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی چارلس اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے اس کی شکل اچھی طرح یاد ہے۔ اس کے خط و خال صاف ظاہر کرتے تھے کہ وہ جان ولیم کا بھائی ہے لیکن اس کے تبسم اور جان ولیم کے تبسم میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ جان ولیم جب مسکراتا تھا اس کے چہرے سے صاف گوئی اور ایک قسم کی بشاشت ٹپکتی تھی۔ برخلاف اس کے چارلس کی مسکراہٹ میں انقباض اور چہرے کے [illegible] غالب تھے۔ جو اس کے تبسم کو مصنوعی اور ناقابل اعتبار بنا دیتے تھے۔

وہ ہمیں دیکھ کر کہنے لگا۔

"صاحبان! میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟"

ولٹن صاحب نے نہایت بے پروائی سے کہا۔

"ہم یہاں صرف رات گزارنا چاہتے ہیں۔ اگر تمہیں دو سونے کے کمرے دے سکو تو تمہاری بہت مہربانی ہوگی۔"

"بہت خوشی سے" یہ کہہ کر چارلس نے ایک نوکر کو بلا کر کہا "ان کو نمبر ۲۲ اور ۲۳ میں لے جاؤ" پھر ہم سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"آپ کو کچھ کھانا تو نہیں چاہئے؟"

ولٹن صاحب بولے۔

"نہیں صرف کافی کے دو پیالے بھیج دو۔"

ہم دونوں نمبر ۲۲ میں بیٹھے تھے کہ نوکر ایک طشت میں کافی کے دو پیالے لایا۔ ولٹن صاحب نے اس سے کہا۔

"منیجر کو یہاں بھیج دو۔" یہ کہہ کر ہم دونوں کافی پینے لگے۔ میں نے پوچھا۔

"آپ نے منیجر کو کیوں بلایا ہے؟"

خدا جانے مجھے خاطر خواہ جواب ملتا یا نہ کہ اتنے میں دروازہ کھلا۔ چارلس ولیم اندر داخل ہوا اور ہمارے سامنے آکر ایک خالی کرسی پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ولٹن صاحب نے مسکرا کر کہا۔

"مسٹر چارلس ولیم۔ میں تمہارے ہوٹل کی کافی کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کم از کم باندہ گلی ہوٹل میں اور بھی بہت سی باتیں ہیں۔ وہاں کا انتظام کئی پہلوؤں سے ناقص ہے۔ کل ہی وہاں ایک آدمی کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ لیکن میں تو ہوٹل کی بدانتظامی کی نسبت غافل

کی شرافت سے زیادہ متاثر ہوا ہوں کہ یک قلم قتل کرنے کی تکلیف اٹھائے۔ یہ نعش کو اپنے کندھے پر ڈال کر چھوٹے کمرے میں لے گئے۔ پھر اس خیال سے کہ نعش کو رات بھر سردی نہ لگے اسے ڈریسنگ گاؤن پہنا دیے اور ان سب سے نظر بچا کر سیٹھ دینو جی کی دولت مالک یا معمولی کی جیب میں کھو جائے۔ مالک کی کابینہ لانے میں کوئی دقت نہ ہو۔ مسٹر چارلس ولیم! مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کی ذات کے علاوہ آپ کی شرافت کی داد دوں؟

مسٹر وائن صاحب کی باتوں پر اور میری نگاہ چارلس کے چہرے پر تھی۔ چارلس کا چہرہ اس طرح آمیز اور حقارت تقریر سے متاثر تھا اس نے اپنے ماتھے پر ایک پیچ در پیچ سوال ڈال دی۔ پھر کو دوبارہ سیدھا کر کے کرسی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر وائن صاحب کی طرف دیکھنے لگا۔

میں نے ایک لمحے کے لئے بھی اپنی نگاہ چارلس کے چہرے سے نہ ہٹائی۔ غصے کے آثار دیکھ کر میں نے جلدی سے پستول نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔

وائن صاحب نہایت بے پروائی سے ہاتھ کے بیلے کی طرف بڑھا۔

دفعۃً چارلس نے کرسی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا۔ اگر میں موجود نہ ہوتا تو قریب تھا کہ زور سے وائن صاحب کے سر پر آ پڑتی۔

چارلس نے میرے پستول کی سیاہ نالی کو اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے دیکھا اور بہتر یہی سمجھا کہ اپنے ارادے کو کم از کم ملتوی کر دے۔

وائن صاحب کی آواز میرے کان میں پڑی۔

"امجد۔ چارلس صاحب کو اسی طرح رکھنا۔ میں ذرا کافی پی لوں۔" وائن صاحب کافی کی کرسی پر سے اٹھے اور دروازے کی طرف گئے۔ دروازے کے تالے میں چابی پڑی تھی۔ اسے پھرا کر تالا بند کر دیا۔ اور چابی نکال کر جیب میں ڈال لی۔

دروازہ بند کر کے وہ ہماری طرف واپس آئے اور میرے پستول کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے۔

"اسے جیب میں ڈال لو۔ چارلس صاحب کے لڑنے کا سبب نہیں آیا۔"

چارلس کی طرف مخاطب ہو کر بولے۔

"مسٹر چارلس ولیم! ہم نہ تو پولیس سے تعلق رکھنے والے آدمی ہیں نہ پولیس کو اطلاع دے کر یہاں آئے ہیں۔ نہ اب تک ہمارا ارادہ پولیس کو اطلاع دینے کا ہے (تم اس کرسی پر بیٹھ جاؤ) نہ ذاتی طور پر پوچھ سکتے کہ میرا اس قتل سے کیا تعلق ہے۔ میرا تعلق صرف اس قدر ہے کہ جہاں تم اور کل ہوٹل کے مالک تمہارا پرانا دوست ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اس کو اس سے پہلے زندگی میں کتنے صدمے اٹھانے پڑے ہیں۔ کس قدر مصیبتوں کا مقابلہ کرنا پڑا ہے۔ تمہاری طرف اور اپنے کاروبار کی طرف سے کس قدر تکلیف اور رنج برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ پہلے بریلی میں تم نے اپنی برائیوں کی وجہ سے اس کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ تمہیں علیحدہ کر دے۔ اکیلا رہ جانے کی وجہ سے وہ اپنے نوکروں کی بددیانتی کا تختۂ مشق بن گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ متواتر دو سال تک وہ ہوٹل سے نقصان اٹھاتا رہا اور اسی وجہ سے اس نے بریلی کا ہوٹل چھوڑا۔ بہ مشکل اپنے سرمائے سے یہ ہوٹل جاری کیا۔ پھر اس کو معلوم ہوا کہ تم لکھنؤ میں شرمناک طرح پر زندگی گزار رہے ہو۔ وہ تمہارا بڑا بھائی تھا۔ اسے رنج ہوا۔ اس کا دل تمہاری ذلیل زندگی کو دیکھ کر کڑھتا تھا۔ وہ لکھنؤ جا کر تمہیں وہاں سے لے آیا اور اپنے پاس سے روپیہ دے کر منتری میں تم سے یہ ہوٹل خرید لیا اور شکر کیا کہ بالآخر تم نے ازسرِ نو شریفانہ روش اختیار کر لیا ہے اور اب اس قتل کی وجہ سے اس کے ہوٹل کی جو بدنامی ہوگی۔ اس کے ذمہ دار بھی تم ہو۔ اس کے علاوہ تمہارا نوکر فیروز خاں

قتل کے الزام میں گرفتار ہے۔ لیکن تمہیں انصاف اور صداقت اس درجہ عزیز ہے کہ تم ایک بے گناہ کو اپنے سامنے پھانسی پر چڑھتے دیکھو گے

چارلس کا چہرہ اس تقریر کے زیر اثر بتدریج بدلتا گیا اور اس کے چہرے پر مختلف جذبات ظاہر ہونے لگے۔ اضطراب، غصہ، اس توجہ، نرم دلی، ندامت وافسوس سب باری باری اس کی آنکھوں میں سے جھانک جھانک کر چلے گئے، لیکن ولسن صاحب نے اپنی تقریر اسی وقت ختم کی جب بالآخر چارلس کے ماتھے پر اور اس کے کندھوں کے کچھ تننے میں ہمت اور مردانگی کے آثار نظر آئے۔

چارلس نے کھڑے ہو کر کہا۔

"میرے رحم دل بزرگ! مایوس نہ ہوئیے گا۔ آپ مطمئن رہیں، جو کچھ میں نے کیا بہت برا کیا اور میں انتہا درجہ شرم وندامت کے ساتھ اس اپنی ذلیل حرکت کا اعتراف کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے قتل نہیں کیا اور خدا نے چاہا تو میں کبھی قتل نہیں کر سکتا۔"

"تو تم نے اچھا کیا کہ میرے پاس آئے۔ اگر تم سارے واقعات بیان کرتے جاؤ تو میرے دوست ساتھ ساتھ لکھتے جائیں گے۔"

ولسن صاحب نے میری طرف دیکھا۔ میں نے جیب میں سے نوٹ بک (جو میں حسب معمول ساتھ لایا تھا) نکال کر پنسل اور ولسن صاحب سے ان کا اشارہ پاکر جو کچھ چارلس کہتا گیا لکھتا گیا۔

وہ تحریر تو اس وقت مجھے لفظ بلفظ یاد ہے، نہ اس کا بیان ہو بہو نقل کرنا ہی ضروری ہے۔ اس کا مطلب صرف اتنا تھا کہ وہ جمعہ کے دن باندہ گلی کی نوشہرہ کو چائے پینے کے بعد براؤن کی طرح وہ بھی سیر کرنے نکلا۔ پہاڑیوں میں وہ ایک چھوٹی پگڈنڈی پر جا رہا تھا کہ سامنے سے اس نے ایک انگریز کو آتے دیکھا۔ اس کے دیکھتے دیکھتے اس انگریز کا پاؤں پھسلا اور وہ لڑھکتا لڑھکتا پگڈنڈی سے صاف آ کر نیچے جا پڑا۔ چارلس بھاگا بھاگا اس کے پاس گیا اور اسے زمین پر سے اٹھایا۔ لیکن اس کا سر ایک بڑے پتھر کے ساتھ ٹکرانے کی وجہ سے اس کی کنپٹی کو ایک مہلک ضرب آئی تھی۔ اور وہ مر چکا تھا۔ چارلس کو معلوم نہ تھا کہ یہ کون ہے۔ اس کا نام و نشان معلوم کرنے کی غرض سے اس نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ ایک جیب میں سے باندہ گلی ہوٹل کا بل ملا جس سے چارلس کو معلوم ہوا کہ اس انگریز کا نام ٹی براؤن ہے اور یہ باندہ گلی کے ۱۲ نمبر کمرے میں رہتا ہے۔ پہلے تو اسے خیال ہوا کہ باندہ گلی میں جا کر اس کی موت کی اطلاع دے۔ لیکن کچھ دیر سوچنے کے بعد اس کے دل میں ایک ذلیل خیال آیا اور اس نے اپنا پہلا ارادہ ترک کر دیا۔ باندہ گلی آ کر اس نے پانامہ سگاروں کا ایک ڈبہ خریدا اور وسکی کا ایک پیگ پیا۔ اور پھر ہوٹل میں آ کر بھائی کے نام چٹ چھوڑ گیا کہ میں مری واپس جا رہا ہوں۔ لیکن خود ادھر ادھر پہاڑیوں میں رات کی تاریکی کا انتظار کرتا رہا۔ قریباً گیارہ بجے براؤن کی نعش کو اٹھا کر وہ ہوٹل کی طرف لایا۔ اور موقع پا کر نعش سمیت براؤن کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہاں براؤن کا کوٹ اتار کر اسے ڈریسنگ گون پہنایا اور خوابگاہ کی چیزیں الٹ پلٹ کر دیں۔ تاکہ معلوم ہو قتل اسی کمرے میں ہوا ہے۔ اور یہ سب باتیں اس نے بھائی کے حسد کے مارے کیں۔ اس کا مدعا باندہ گلی ہوٹل کو بدنام کرنے کا تھا۔ پھر وہ رات بھر براؤن کے کمرے میں رہا جہاں وہ سویا بالکل نہیں اور صبح پو پھٹتے ہی پیشتر اس کے کہ باندہ گلی کا کوئی آدمی جاگے وہ پیدل ہی مری کو چل دیا۔

میں ان کا سارا بیان لکھ چکا تو ولسن صاحب نے کاغذ مجھ سے لے کر چارلس کے آگے رکھ دیئے اور کہا "ان پر دستخط کر دو۔" کچھ دیر تو چارلس ساکن رہا۔ پھر قلم اٹھا کر دستخط کر دیئے۔ اس کے بعد ہوٹل کے دفتر کے ایک بابو کو بلا کر اسے تحریر کا مطلب بتائے بغیر اس کے دستخط بھی بطور گواہ کے کرا لئے گئے۔ پھر ولسن صاحب نے ان کاغذوں کو لفافے میں بند کر کے لفافے کے اوپر مجھ سے پتہ لکھوا لیا۔

سب انسپکٹر پولیس۔ باندہ گلی

معرفت سپرنٹنڈنٹ پولیس۔ ضلع ہزارہ۔ ایبٹ آباد۔

لفافے کو ہاتھ میں لے کر چارلس نے کہا۔

"اس لفافے کو میں ابھی ڈاک میں ڈال دوں گا۔ یہاں سے ایبٹ آباد اور ایبٹ آباد سے باندہ گلی یہ تین دن میں پہنچے گا۔ تب تک تم اگر چاہو تو کہیں کے کہیں پہنچ سکتے ہو۔ میں تمہیں پولیس کے حوالے نہیں کرنا چاہتا۔ [illegible] دنیا کے لئے کافی ہوگی۔"

دوسرے دن صبح ہم باندہ گلی پہنچے گیارہ بجے کے قریب ہوٹل کے ۲۴ نمبر کمرے میں میں اور ولش صاحب آرام کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ولش صاحب اخبار کا تازہ پرچہ دیکھ رہے تھے۔ میں سامنے بیٹھا ہوا سگریٹ پی رہا تھا اور کل کے واقعات کو ایک ایک کر کے دہرا رہا تھا۔

ولش صاحب نے اخبار کو سامنے سے ہٹایا۔ تو میں نے پوچھا۔

"وہ سیٹھ فیروز جی کا بل براؤن کی جیب میں کس طرح آگیا؟"

"سیٹھ فیروز جی کا بل؟ وہ تو معمولی بات ہے۔ جب چارلس نے براؤن کی جیب سے ہوٹل کا بل نکالا تو اسے پڑھ کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔ اس جیب میں جہاں بعد میں اس نے فیروز جی کا بل رکھا۔ مرتی جانے سے پہلے اس نے ہوٹل کا بل اپنی جیب سے نکال کر مسٹر براؤن کی جیب میں ڈال دیا اور غلطی کے ساتھ فیروز جی کا بل بھی چلا گیا۔"

"اور ہاں۔ آپ نے خاص مجھے نوٹ پیپر لانے کو کیوں کہا تھا؟"

"میرے اپنے پاس تو وہی نوٹ پیپر ہیں جن پر ہوٹل کا نام چھپا ہوا ہے۔ وہ میں نے اس لئے استعمال نہ کئے تھے کہ کوئی اگر چاہتا تو ان کے ذریعے سے میرا پتہ لگا سکتا تھا۔ اور میں نہیں چاہتا کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس صاحب میری اس حقیر سی خدمت کے لئے مجھ ناچیز کے شکرگزار ہوں۔ بازار سے نئے نوٹ پیپر خریدنا قرین مصلحت نہ تھا۔ اس لئے میں نے تمہیں تکلیف دی۔"

"مگر وہ چارلس کا بیان تو نہ صرف میرے نوٹ پیپروں پر بلکہ میرے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اگر سپرنٹنڈنٹ پولیس صاحب آپ کی بجائے میرے شکرگزار ہوں تو میں کیا کروں؟"

"جو جی میں آئے کرنا۔ لیکن خدا کے لئے میرا نام نہ لینا۔"

سپرنٹنڈنٹ صاحب پولیس یوں تو مجھے اچھی طرح جانتے ہیں لیکن مجھے یقین نہ تھا کہ وہ میرے ہاتھ کی تحریر پہچان لیں گے۔ ایک ہفتے کے بعد ان کا ایک نیم سرکاری خط میرے نام آیا۔

ڈیر مسٹر امجد!

میرے پاس اس بات کے یقین کرنے کے لئے زبردست وجوہات ہیں کہ مسٹر براؤن ساکن باندہ گلی ہوٹل کی موت کے متعلق پولیس کو ناانصافی اور گمراہی سے بچانے میں آپ نے بہت سا حصہ لیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا بجا

ہو گا کہ پولیس کو اس مقدمے میں جو کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ سب آپ ہی کی بدولت ہے۔ آپ مجھے اس بات کی اجازت دیں کہ میں تمام محکمہ کی طرف سے آپ کی بے غرضانہ مساعی کے لئے آپ کا شکریہ ادا کروں۔

مجھے یقین ہے کہ آپ کے طریقۂ تفتیش کی تفصیل خالی از دلچسپی نہ ہوگی۔ اگر آپ ہمیں اس سے آگاہی بخشیں تو سب حالات کو پولیس جرنل میں شائع کر دیا جائے۔ امید ہے آپ میری اس درخواست کو قبول فرما کر مجھے فخر بخشیں گے۔

آپ کا مخلص
....

میں نے اسی وقت اس کا جواب لکھ کر ڈاک میں ڈال دیا۔

جناب عالی۔

مسٹر براؤن کی موت کے متعلق میں نے سوائے جارج ولیم کا بیان لکھنے کے اور کچھ نہیں کیا۔ یہ سب انکشافات مجھ سے ایک بدرجہا اعلیٰ دماغ کے غور و خوض کا نتیجہ ہیں۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ کہنے کا حق حاصل نہیں۔"

شاید سپرنٹنڈنٹ صاحب نے کسر نفسی ہی سمجھی مگر میں اور کیا لکھتا۔

"پطرس"

(کہکشاں۔ اکتوبر۔ نومبر۔ دسمبر ۱۹۱۹ء)

کاغذی روپیہ

خواجہ علی احمد شہر کے بڑے سوداگر تھے۔ لاکھوں کا کاروبار چلتا تھا۔ لوگوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ بچہ بچہ ان کی دیانت داری سے واقف تھا اور ہر شخص جانتا تھا کہ خواجہ علی احمد قول کے پکے اور بات کے سچے ہیں۔

ایک دن انہوں نے اپنے ایک آدمی کو جوتے والے کی دکان سے جوتا خریدنے بھیجا۔ جوتے کی قیمت بیس روپے تھی لیکن بجائے اس کے کہ خواجہ علی احمد اپنے نوکر کو بیس روپے دے کر بھیجتے انہوں نے اس کے ہاتھ کریم خاں جوتے والے کے نام یہ رقعہ لکھ بھیجا۔

"میاں کریم خاں! مہربانی کر کے ہمارے آدمی کو بیس روپے کا ایک جوتا دے دو۔ ہمارا یہ رقعہ اپنے پاس سنبھال کے رکھ چھوڑو۔ جب تمہارا دل چاہے یہ رقعہ لے کر ہمارے منشی کو دکھا دینا اور بیس روپے لے جانا۔ یہ رقعہ اگر تم کسی اور شخص کو دینا چاہو تو بے شک دے دو۔ جو ہمارے پاس لائے گا ہم اس کو بیس روپے دے دیں گے۔ راقم خواجہ علی احمد۔"

دکان والے نے جب رقعے کے نیچے خواجہ علی احمد کا دستخط دیکھا تو اسے اطمینان ہو گیا تھا کہ خواجہ صاحب عزت والے آدمی ہیں اور پھر بات کے آدمی ہیں۔ روپے نہیں بھیجے تو نہ سہی۔ یہ رقعہ کیا روپوں سے کم ہے۔ جب چاہوں گا، رقعہ دکھا دوں گا اور روپے لے لوں گا۔ چنانچہ اس نے بغیر تامل کے جوتا بھیج دیا۔

تھوڑی دیر بعد کریم خاں دکان دار کے پاس عبداللہ حلوائی آیا اور کہنے لگا: "میاں کریم خاں! میرے تمہاری طرف پچیس روپے نکلتے ہیں۔ ادا کر دو تو تمہاری بہت مہربانی ہوگی۔"

کریم خاں نے کہا: "ابھی لو۔ یہ پانچ تو نقد لے لو۔ باقی بیس روپے مجھے خواجہ علی احمد سے لینے ہیں، یہ دیکھو ان کا رقعہ۔ ذرا ٹھہر جاؤ، تو میں جا کے ان سے بیس روپے لے آؤں۔"

عبداللہ بھی خواجہ علی احمد کو اچھی طرح جانتا تھا کیونکہ شہر بھر میں خواجہ صاحب کی ساکھ قائم تھی۔ کہنے لگا: "تم یہ رقعہ مجھے ہی کیوں نہ دے دو۔ میں ان سے بیس روپے لے آؤں گا کیونکہ اس میں لکھا ہے کہ جو شخص یہ رقعہ لائے گا اس کو بیس روپے دے دیے جائیں گے۔"

کریم خاں نے کہا: "یونہی سہی۔" چنانچہ عبداللہ حلوائی نے بیس روپے کے بدلے وہ رقعہ قبول کر لیا۔

کئی دنوں تک یہ رقعہ یونہی ایک سے دوسرے کے ہاتھ میں پہنچ کر شہر بھر میں گھومتا رہا۔ خواجہ علی احمد پر لوگوں کو اس قدر اعتبار تھا کہ ہر ایک اسی رقعے کو بیس روپے کی بجائے لے لینا قبول کر لیتا کیونکہ ہر ایک شخص جانتا تھا کہ جب چاہوں گا اسے خواجہ صاحب کے منشی کے پاس لے جاؤں گا اور ان سے

میں روپے وصول کروں گا۔

ہوتے ہوتے یہ رقعہ ایک ایسے شخص کے پاس پہنچ گیا جس کا بھائی کسی دوسرے شہر میں رہتا تھا۔ یہ شخص اپنے بھائی کو منی آرڈر کے ذریعے بیس روپے بھیجنا چاہتا تھا۔ ڈاک خانے والوں نے اس رقعہ کو بیس روپے کے عوض میں لینا قبول نہ کیا۔ چنانچہ وہ شخص سیدھا خواجہ علی احمد کی کوٹھی پر پہنچا۔ رقعہ منشی کو دیا۔ منشی نے بیس روپے گن گن دیئے۔ اس نے روپے جا کر ڈاک خانے والوں کو دے دیئے اور انہوں نے آگے اس کے بھائی کو بھیج دیئے۔

اس مثال سے یہ ظاہر ہوا کہ محض ایک کاغذ کا پرزہ کتنی مدت تک روپیہ کا کام دیتا رہا۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کاغذ کے نیچے ایک ایسے شخص کے دستخط تھے جس کی دیانت داری پر سب کو بھروسہ تھا۔ اور جس کی دولت کا سب کو علم تھا۔ سب جانتے تھے کہ یہ شخص جب چاہے بیس روپے ادا کر سکتا ہے اور قول کا اتنا پکا ہے کہ کبھی ادا کرنے سے انکار نہ کرے گا۔

اگر ایسے ہی ایک رقعے کے نیچے ہم یا تم دستخط کر دیتے تو کوئی بھی اسے روپے کے بدلے میں قبول نہ کرتا۔ اول تو ہمیں جانتا ہی کون ہے۔ اور جو جانتا بھی ہے وہ کہے گا کہ ان کا کیا پتہ۔ آدمی نیک اور شریف اور دیانت دار سہی لیکن خدا جانے ان کے پاس بیس روپے ہیں بھی یا نہیں؟ کیا معلوم ہم مانگنے جائیں اور وہاں کوڑی بھی نہ ہو۔

خواجہ علی احمد کا رقعہ گویا ایک قسم کا نوٹ تھا۔ سرکاری نوٹ بھی بالکل یہی چیز ہوتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ ان کے نیچے سرکار کی طرف سے سرکاری خزانے کے ایک افسر کے دستخط ہوتے ہیں۔ اگر تم دس روپے کے نوٹ کو لے کر دیکھو تو اس پر اوپر حکومت پاکستان اور اس کے نیچے لکھا ہوتا ہے کہ "میں اقرار کرتا ہوں کہ عند المطالبہ حامل ہٰذا کو دس روپیہ سرکاری خزانہ کراچی سے ادا کروں گا۔" اس عبارت کے نیچے سرکاری افسر کے دستخط ہوتے ہیں۔

خواجہ احمد علی کو تو صرف ایک شہر کے لوگ جانتے تھے۔ حکومت پاکستان کو ملک کا ہر آدمی جانتا ہے۔ بلکہ اور ملکوں میں بھی اس کی ساکھ قائم ہے اس لئے سرکاری نوٹ کو ہر شخص بلا تامل قبول کر لیتا ہے۔ اور کوئی قبول کیوں نہ کرے۔ لوگ جانتے ہیں کہ جب چاہیں خزانے میں جا کر اس کے روپے بنا سکتے ہیں

خواجہ علی احمد کے رقعے اور سرکاری نوٹ میں ایک فرق اور بھی ہے۔ خواجہ علی احمد کا رقعہ تو ڈاک خانے والوں نے قبول نہ کیا تھا لیکن سرکاری نوٹ انہیں ضرور ہی قبول کرنا پڑتا۔ سرکاری نوٹوں کو قانونی طور پر ملک کا سکہ قرار دیا گیا ہے اور کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ ان کو روپے کے بدلے لینے سے انکار کرے۔ اگر تمہیں کسی شخص نے دس چاندی کے روپے قرض دیئے تھے اور اب تم اس کو یہ قرضہ اتارنے کے لئے دس روپے کا نوٹ دیتے ہو تو وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں تو چاندی کے روپے ہی لوں گا۔ اسے دس کا نوٹ ضرور لینا پڑے گا۔

روپیہ ایسا ہونا چاہئے کہ آسانی سے پاس رکھا جا سکے۔ چاندی کے سکوں میں یہ خوبی ایک حد تک پائی جاتی ہے۔ تاہم چاندی کے سکے وزنی ہوتے ہیں۔ اسّی روپے کا وزن سیر بھر ہو جاتا ہے تو جہاں پانچ چھ سو روپے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا ہوں، وہاں اچھی خاصی دقت پیش آتی ہے۔ نوٹوں سے یہ دقت رفع ہو جاتی ہے۔ ہزاروں روپے کے نوٹ ایک جیب میں آسانی سے ڈالے جا سکتے ہیں۔ نوٹوں کے جاری کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔

باوجود ان سب باتوں کے جس شخص کے پاس بہت سا روپیہ ہو، اس کے لئے یہ مشکل ہے کہ بہت سے نوٹ، کچھ روپے، چونیاں، دونیاں یہ سب کچھ اپنے پاس سنبھال رکھے۔ ایک تو سنبھالنے کی تکلیف، دوسرے چوری کا خطرہ، اس لئے بہتر یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنا سب روپیہ بنک میں رکھوا دے۔

بنک میں روپیہ امانت کے طور پر رہتا ہے۔ روپے کا مالک جب چاہے اس کو نکلوا سکتا ہے یا جس کو چاہے اپنے حصے کا روپیہ دلوا سکتا ہے۔ کسی اور کو اپنے حصے کا روپیہ دلوانے کی ترکیب یہ ہے کہ اس کو چیک لکھ کر دے دیا جائے۔

ہم یہاں چیک کے معنوں کو واضح طور پر بیان کرنا چاہتے ہیں۔ فرض کرو عبداللہ نے بنک میں بہت سا روپیہ جمع کر رکھا ہے۔ کریم خاں اس سے دس روپے مانگنے آتا ہے۔ عبداللہ بجائے اس کے کہ کریم خاں کو دس روپے نقد دے۔ وہ اسے دس روپے کا چیک لکھ دیتا ہے۔ چیک گویا ایک قسم کا رقعہ ہے جو عبداللہ کریم خاں کی معرفت اپنے بنک کو بھیج رہا ہے۔ چیک پر مفصلہ ذیل الفاظ لکھے ہوتے ہیں۔

بنام فلاں بنک
کریم خاں کو دس روپے دے دو
راقم عبداللہ

کریم خاں کی بجائے عبداللہ اگر کسی اور کا نام لکھ دے تو جس کا نام لکھے گا اسی کو روپے ملیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ کریم خاں دس روپوں کی بجائے یہ دس روپے کا چیک کیوں قبول کر لیتا ہے؟ اس لئے کہ اسے عبداللہ پر اعتبار ہے۔ وہ جانتا ہے کہ بنک میں ضرور عبداللہ کا روپیہ جمع ہوگا۔ میں جب یہ چیک لے جاؤں گا مجھے روپیہ ضرور مل جائے گا۔

اب فرض کرو کہ کریم خاں وہ چیک لے کے عبداللہ کے بنک میں گیا۔ اور کہا کہ مجھے اس چیک کا روپیہ ادا کر دو۔ بنک والوں نے عبداللہ کا حساب دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہاں تو کل تین روپے ہیں۔ ایسی حالت میں وہ چیک ادا نہیں کر سکتے۔ چنانچہ وہ انکار کر دیں گے اور کریم خاں کا عبداللہ پر اعتبار باقی نہ رہے گا لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ بنک والے عبداللہ کو جانتے ہیں۔ مدت سے اس کا حساب کھلا ہوا ہے وہ کہتے ہیں بنک میں تو عبداللہ کے تین روپے ہیں۔ خیر فی الحال ہم باقی کے سات روپے اپنے پاس سے دے دیتے ہیں اور عبداللہ کی نام رکھ لیتے ہیں ہم یہ سات روپے پھر اس سے لے لیں گے۔ لیکن عام طور پر ایسا کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ لوگوں کا جتنا روپیہ بنک میں ہوتا ہے اس کے اندر اندر ہی چیک دیتے ہیں اور کم ہی ایسا موقع پیش آتا ہے کہ بنک چیک ادا کرنے سے انکار کر دے۔

اگر کریم خاں نے خود بھی کسی بنک میں حساب کھول رکھا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ عبداللہ کا چیک لے کر وہ خود عبداللہ کے بنک میں جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس طرح وہ اپنا روپیہ بنک میں جمع ہونے کے لئے بھجوا دیتا ہے اسی طرح یہ چیک بھی بھجوا دے۔ اس کے بنک والے خود ہی عبداللہ کے بنک سے اس چیک کا روپیہ وصول کر لیں گے۔ یہ دس روپے کی رقم کریم خاں کے حساب میں جمع کر دی جائے گی۔ اور عبداللہ کے حساب میں خرچ کی مد میں چڑھا دی جائے گی۔

اس طرح سے یہ سہولت ہوئی کہ عبداللہ اور کریم خاں دونوں کا روپیہ اپنے اپنے بنک میں محفوظ پڑا ہے نہ تو عبداللہ کو روپیہ ادا کرتے وقت نہ کریم خاں کو وصول کرتے وقت بنک جانا پڑا اور روپیہ ایک کے حساب میں سے نکل کر دوسرے کے حساب میں جمع بھی ہو گیا۔ یہ سب کچھ ایک چیک کی بدولت ظہور میں آیا۔

یہاں ہم نے صرف "کاغذی روپے" کی دو قسموں کا ذکر کیا ہے، ایک سرکاری نوٹ اور دوسرے چیک، ان کے علاوہ اور بھی کاغذات ایسے ہیں جن کے ذریعے سے بڑی بڑی رقمیں یہاں سے دور دراز ملکوں تک پہنچ جاتی ہیں۔

(بچوں کے لئے)　　　　(خیابان اردو)

رونا رلانا

ایک امریکی ادیب نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ مرد ایک منصوبہ ساز جانور ہے اور عورت ایک ایسا حیوان ہے جو اکثر رونی شکل بنائے رکھتا ہے۔ مصنف کی خوش طبعی نے اس فقرے میں مبالغہ اور تلخی کی آمیزش کر دی ہے اور چونکہ وہ خود مرد ہے اس لئے شاید عورتوں کو اس سے کچھ اتفاق بھی نہ ہو لیکن بہرحال موضوع ایسا ہے جس پر بحث کی جا سکتی ہے

میرے ایک دوست کا مشاہدہ ہے کہ عورتوں کی باہمی گفتگو یا خط و کتابت میں موت یا بیماری کی خبروں کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ایسے واقعات کے بیان کرنے میں عورتیں غیر معمولی تفصیل اور رقت انگیزی سے کام لیتی ہیں گویا ناگوار باتوں کو ناگوار ترین پیرائے میں بیان کرنا ان کا نہایت پسندیدہ شغل ہے۔ ان سے وہ کبھی سیر نہیں ہوتیں۔ کسی کی موت کی خبر سے لے کر اپنی شناساؤں میں سے زیادہ سے زیادہ سامعین کی تعداد ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتی ہیں اسی خبر جس جس سے سنانا شروع کرتی ہیں ایک نہ ایک تفصیل کا اضافہ کر دیتی ہیں اور ہر بار نئے سرے سے آنسو بہاتی ہیں اور پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ موت یا بیماری کسی قریبی عزیز کی ہو۔ کوئی پڑوسی ہو، ملازم ہو، ملازم کے ننھیال یا سہیلی کے سسرال کا واقعہ ہو، گلی میں روزمرہ آنے جانے والے کسی خوانچے والے کا بچہ بیمار ہو، کوئی اڑتی اڑائی خبر ہو، کوئی افواہ ہو غرضیکہ اس ہمدردی کا حلقہ بہت وسیع ہے ؎

"سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے"

نہ صرف یہ بلکہ رقت انگیز کہانیوں کے پڑھنے کا شوق عورتوں ہی کو بہت زیادہ ہوتا ہے اور اس بارے میں بھی اقوام کا ایک ہی سا حال ہے۔ غیر ممالک میں بھی رلانے والی کہانیاں ہمیشہ نچلے طبقہ کی عورتوں میں بہت مقبول ہوتی ہیں۔ گھٹیا درجے کے قلم کار مصنفین کو اپنی کتابوں کی قیمت اکثر عورتوں کی جیب سے وصول ہوتی ہے۔ وہ بھی عورتوں کی فطرت کو سمجھتے ہیں۔ کہانی کیسی ہی ہو اگر اس کا سرورق غم و الم کی ایک تصویر ہے تو اس کی اشاعت یقینی ہے اور عورتوں کی آنکھوں سے آنسو نکلوانے کے لئے ایسے مصنفین طرح طرح کی ترکیبیں کرتے ہیں۔ کبھی ایک پھول سے بچے کو سات آٹھ سال کی عمر میں ہی مار دیتے ہیں اور بستر مرگ پر توتلی باتیں کرواتے ہیں۔ کبھی کسی یتیم کو رات کے بارہ بجے سردی کے موسم میں کسی چوک میں بھوکا اور ننگا کھڑا کر دیتے ہیں اور کبھی رقت دلانی ہو تو اسے سید بنا دیتے ہیں۔ یہ بھی کافی نہ ہو تو اسے بھیک مانگنا سکھا دیتے ہیں کہ میری بوڑھی ماں مر رہی ہے دوا کے لئے پیسے نہیں خدا کے نام پر کچھ دیتے جاؤ۔ کبھی کسی ستمگر خوب صورت نیک طینت لڑکی کو چڑیل سی ساس کے حوالے کرا دیا۔ یا کسی بدمعاش خاوند کے سپرد کر دیا اور کچھ بس نہ چلا تو سوتیلی ماں کی گود میں ڈال دیا اور دل کی بھڑاس نکال لی۔ پڑھنے والیاں ہیں کہ زار و قطار روتی ہیں اور بار بار پڑھتی ہیں اور بار بار روتی ہیں۔

خود عورتوں کی تصنیفات اکثر ہچکیوں میں لپٹی ہوئی اور آنسوؤں میں لتھڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ پاکستان میں جو کتابیں عورتوں نے لکھیں، اکثر میں نزع،

. بالعموم دق، سل، خودکشی، زہر، ظلم و تشدد ایک نہ ایک چیز کا سوال بن جاتا ہے یا ذہن جانا، بیان کرنی کر دینا یا کمال اہل مصنف کی کتاب میں آمد بات ہے۔

غم و مصیبت کیا ہے؟ ہر بات بات پر رحمت ماتم بچھا دینا کیا معنی؟ بار بار سوچتی ہوں کہ آخر اس درد کی تقدیر نے کیا فیصلہ کیا؟ جل کے کیا ہیں؟ لیکن کوئی بات کیا تھی!

کسی گھر میں موت واقع ہونے پر زنانے اور مردانے کا مقابلہ کیجئے۔ مردوں کا ماتم تو صاف دکھائی دیتا ہے۔ بیچارے گھر کے باہر بیٹھے ہیں۔ سر نیچے کیے چپ چاپ۔ آنکھیں کچھ سرخ ہیں۔ کبھی کبھی آنسو بھی ٹپک پڑتے ہیں۔ کسی نہ کسی انتظام میں مصروف ہیں۔ چہرے پر غم [illegible] سی ہے۔ ہر قدم زرا آہستہ آہستہ اٹھتے ہیں۔ [illegible] زنانے کا ماتم دور دور سے موت کے گھر کا پتہ دیتا ہے۔ اور جب کوئی نئی عورت پہنچ کر [illegible] اندر جاتی ہے تو ماتم کی جھنجھناہٹ میں از سر نو ایک [illegible] اٹھتی ہے جیسے یک دم کوئی ہوائی [illegible]۔ پھر گو پہلے مرد تو دوسرے تیسرے دن کام میں مشغول ہو جاتے ہیں لیکن عورتوں کے ہاں مہینہ بھر کا ایک طلب قائم ہو جاتی ہے۔ گھڑیوں پر گھڑیاں کھائی جاتی ہیں اور چیخوں پر چیخیں ماری جاتی ہیں۔

کہیں بیمار پڑی ہوتی ہیں تو بیماریں وہ وہ بیماریاں بیان کے آتی ہیں کہ لڑکے دم بخود، گمان میں نہ تھیں جتنی دیر سرہانے بیٹھی رہیں بیماری کی ہر زرخیز بات کہتی ہیں۔ بیچاری کبھی گلا صاف کرنے کو بھی کھانسے تو یہ سورۂ یٰسین تک پڑھ جاتی ہیں۔ رنگت کی زردی، بدن کی کمزوری، سانس کی بے قاعدگی، ہونٹوں کی خشکی ہر بات کی طرف توجہ دلاتی ہیں۔ حتیٰ کہ بیمار کو بھی اپنی یہ خطرناک حالت دیکھ کر بار بار ناچار سخت آواز میں رونا پڑتا ہے جوں جوں بیمار پرسی عورتوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے موت قریب آتی جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ بعض عورتوں کو مریض کے بچ جانے پر صدمہ ہوتا ہوگا کہ اتنی تو بیمار پرسی کی اور نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔

عورتیں نہ صرف دوسروں کے غم میں مرے لیے کر روتی ہیں۔ بلکہ دوسروں کی اتنک باری کے لئے خود بھی سامان مہیا کرنے میں کوتاہی نہیں کرتیں ایک پرانے زمانے کے بزرگ اپنی اہلیہ کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ ساری عمر ان کی اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ کوئی پڑوسن آ کے کہہ دے کہ اے بوا! ماشاءاللہ آج تو تمہارے چہرے پر رونق برس رہی ہے تو جھنجھلا کر بول اٹھتی ہیں کہ ہے ہے دیدوں میں خاک میں آدھی جاتی ہوں اور میرا برا چاہنے والوں کو ابھی میں ہٹی کٹی نظر آتی ہوں۔ اور کوئی آ کے کہہ دے کہ اے ہے بی بی تجھے کیا ہو گیا۔ تو تو دن بدن گھلتی جاتی ہے۔ نہ جانے تجھے کیا غم کھا گیا؟ تو ایسی پڑوسن کو فوراً اخلاص کا لقب مل جاتا تھا۔ بڑی خاطر تواضع ہوتی تھی۔ گھر کا کام کاج چھوڑ کر شام تک ان کو اپنے دکھڑے سنائے جاتے تھے اور چلتے وقت وہ پانچ روپے قرض بھی لے جایا کرتی تھیں جن کی ادائیگی کے لئے کبھی تقاضا نہ کیا جاتا تھا۔

اپنے اوپر رحم دلانے کا مرض جس کسی میں بھی پایا جائے۔ بہت ذلیل مرض ہے لیکن عورتوں میں یہ اس قدر عام ہے کہ خوش حال گھرانے کی بہو بیٹیاں بھی گفتگو میں چاشنی پیدا کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی دکھ وضع کر لیتی ہیں اور موقع موقع پر سنا کر رلا دیتی ہیں۔

اس تحریر سے میرا مطلب ان بہنوں کا مذاق اڑانا ہرگز نہیں جو فی الواقع غمگین یا مصیبت زدہ ہیں۔ ان کی ہنسی اڑانا پرلے درجے کی شقاوت ہے۔ جو خدا مجھے نصیب نہ کرے کسی کا غم ایسی بات نہیں جو دوسرے کی خوش طبعی کا موضوع بنے۔ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ زندگی کا بہت سا دکھ، ضبط، تحمل اور ہمت چاہتا ہے اور ہو سکتا ہے کسی مصیبت زدہ شخص کے ساتھ سب سے بڑی ہمدردی یہ ہے کہ اس کا غم غلط کرایا جائے کسی بیمار کی سب سے بڑی تیمارداری یہ ہے کہ اس کی طبیعت کو شگفتہ کرنے کا سامان پیدا کیا جائے۔ غم کو برداشت کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کو ضبط کرنے کی کوشش کی جائے۔ مہذب شخص کی یہی پہچان ہے۔ اپنے دکھ کے قصے کو بار بار دہرا کر کسی دوسرے شخص کو متاثر کرنے کی کوشش کرنا گویا اپنے آپ کو ذلیل کرنا ہے خود بھی ہنسو اور اوروں کو بھی ہنساؤ۔ دنیا میں غم کافی سے زیادہ ہے اس کو کم کرنے کی کوشش کرو۔ ہنسنا اور خوش رہنا دماغ اور جسم کی صحت کی نشانی ہے۔ ظرافت نگار مصنفین کو میں صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ وہ شخص افضل ہے جو اپنی تحریر سے ہزاروں لوگوں کو خوش کر دیتا ہے اور وہ شخص خدا کے سامنے جواب دہ ہوگا جو اپنے زورِ قلم سے ہزارہا جوان، معصوم، خوش مزاج عورتوں اور مردوں کو رلاتا ہے۔ اور رلاتا بھی اس طرح ہے کہ نہ اس سے تزکیۂ نفس ہوتا ہے نہ کوئی دل میں امنگ پیدا ہوتی ہے اور بڑا قابلِ افسوس ہے وہ شخص جو یہ سب کچھ کر کے بھی اپنی انشا پردازی پر ناز کرتا ہے۔

(تہذیب نسواں)

مینہ برس رہا ہے

مینہ موسلا دھار برس رہا ہے۔ ندی نالے چڑھے ہوئے ہیں۔ ہر طرف شام کی سی تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ درخت، پودے ایک دھلی ہوئی تصویر کی طرح اپنی سبزی میں زیادہ سبز، اور اپنی پاکیزگی میں زیادہ صاف نظر آ رہے ہیں۔ پھول اور پرندے، نغمہ اور نکہت، رنگ اور بو سب شاداں معلوم ہوتے ہیں۔ اے میری آرزوؤں کی ملکہ میرا دل اداس ہے۔

بارش کی چلمن میں سے کائنات کی دنیائے موہوم دکھائی دیتی ہے جس کو دیکھ کر دل میں اُمنگیں اُٹھ سکتی ہیں۔ مگر جہاں خواہشوں کا پورا ہونا اسی دنیا کے باشندوں کے لئے مخصوص ہے۔ درخت جھومتے ہیں۔ میں ان کو دیکھتا ہوں۔ اُن کے پتے ہل ہل کے لپٹتے اور جھک جھک کے چومتے ہیں۔ ان کی لرزش میں مجھے تیرا تبسم نظر آتا ہے۔ سبزہ لہلہاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں تو اٹھکیلیاں کر رہی ہے۔ پرندے کھیتوں میں چھپ چھپ کے گاتے ہیں۔ میرے کانوں میں تیری آواز پڑتی ہے۔ میں یہ سب دیکھتا ہوں۔ سب کچھ سنتا ہوں اور ترستا ہوں۔ یہ تو بارش کے اس پار کی دنیا ہے۔

بجلی چمکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں۔ اس دنیا سے کوئی پیغام آیا۔ لیکن وہ تڑپ تڑپ کے ترساتی ہے اور میں ترس ترس کے تڑپتا ہوں۔ اس کو کہہ کر اپنا ایک نقرئی تیر میرے سینے تک پہنچا دے۔ اور اس کو میری حسرتوں میں بجھا کر تجھ تک لے جائے۔ لیکن اے میری حسرتوں کی امید! کیا تو اپنی دنیا میں جہاں ہوائیں چل رہی ہیں اور نالے بہہ رہے ہیں، میری ضعیف التجائے درد کو سن سکتی ہے!

پرندے چہچہاتے ہیں۔ میں چپ بیٹھا ہوا سنتا ہوں۔ میرے سینے میں بھی ایک نغمہ ہے۔ ان کو کہہ کر وہ مجھے بھی اپنے ساتھ گانے دیں کہ میرے نغمے کی موت تیرے بالوں کی طرح کائنات کے دل میں بکھر جائے۔ میں اکیلا اس کی مستی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک شراب ہے کہ جس میں ساقی قدرت نے ایک آبگینے کے ٹکڑے چھلک دیئے تھے۔ میرے دل میں خواہش ہوتی ہے۔ اس بلبل کو بھیج دے کہ آ کے ڈس جائے اور تیرے پاس روتی ہوئی جائے۔

اے میری مقصودِ انتظار! تو بارش کے اس پار آ جا۔ جہاں میرا دل اور میری آنکھیں تیرے لئے خواہشوں اور آرزوؤں کی پاکیزگیاں لئے تیری راہ تک رہی ہیں۔ اس پار آ جا۔ پیشتر اس کے کہ میں اپنے ساز کو توڑ دوں اور اپنی تمام آرزوؤں کو ایک درد انگیز چیخ کی صورت میں اپنے سینے سے نکال کر تیرے لئے ویسا ہی موہوم بن جاؤں جس طرح تو آج میرے لئے ہے۔

"پطرس"

(کہکشاں - اپریل سنہ ۱۹۲۰ء)

مسئلہ تونیسیہ

ذیل میں پاکستان کے مستقل نمائندہ پروفیسر احمد شاہ بخاری کی اس تقریر کا متن درج کیا جاتا ہے جو انہوں نے ۴ اپریل ۱۹۵۲ء کو حفاظتی کونسل میں تونس کے مسئلے پر کی۔ پروفیسر مرحوم اس اجلاس کے صدر بھی تھے۔

اس اجلاس کے مقررین کی فہرست میں اگلا نام پاکستانی وفد کا ہے اگر میرے رفقا کو اعتراض نہ ہو تو میں پاکستان کے نمائندے کی حیثیت میں تقریر شروع کروں۔

فرانس کے نمائندے نے اس معاملے کے متعلق جو خیالات ظاہر کئے ہیں میرے وفد نے انہیں اسی غور اور توجہ سے سنا جن کے وہ مستحق تھے۔ مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی تھی کہ فرانسیسی نمائندے نے ایجنڈا منظور کرنے کے ضمن میں طریق کار کی بحث کے متعلق سب سے پہلے تقریر کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی تاہم جب انہوں نے اس مسئلے کو ایجنڈے میں شامل کرنے کی مخالفت کی تو میری خوشی حیرت میں بدل گئی۔ حیرت اس لئے نہیں ہوئی تھی کہ فرانسیسی وفد کی طرف سے اس قسم کے رویہ کی توقع نہ تھی۔ اس لئے ہوئی کہ اصل مسئلے کو ایجنڈے میں شامل کرنے سے تو سخت اختلاف کیا اور تقریر ایسی کر ڈالی جو یہ سوال ایجنڈے پر آجانے کے بعد ہی کی جا سکتی تھی۔ ظاہر ہے کہ نمائندے نے یہ طرز عمل بظاہر اس لئے اختیار کیا کہ کم از کم اسے واقعی یہ حاصل بحث ضروری محسوس ہوئی۔ جب واقعہ یہ ہے تو اس کا یہ کہنا ہمارے لئے یقیناً حیرت کا موجب ہے کہ وہ ایجنڈے کی منظوری کے خلاف ووٹ دے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسے خود تقریر کے لئے موقع کی تلاش تھی اسے موقع مل بھی گیا اور اس سے فائدہ بھی اٹھا لیا گیا۔ گویا ایجنڈا منظور ہو چکا تھا۔ مگر وہ دوسروں کو اس موقع سے محروم رکھنا چاہتا ہے۔ بلاشبہ دوسرے جو لوگ اس میز کے گرد جمع ہیں انہیں اس موقع سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ انہیں بحث میں حصہ لینے کا ٹھیک ویسا ہی حق حاصل ہے جیسا فرانس کے نمائندے نے اپنے لئے حاصل کرنا مناسب جانا۔ لیکن یہ بات ایک حد تک ناواجب و غیر مناسب ہے کہ خود تو تقریر کر لی اور فرانس کا نقطۂ نگاہ پیش کر دیا ـــ میں کہہ سکتا ہوں کہ بڑی قابلیت سے پیش کیا ـــ گویا اس نمائندے کی حد تک ایجنڈا منظور ہو چکا تھا پھر ایجنڈے کی منظوری کی مخالفت کر کے دس دوسرے وفود کو اظہار رائے کا موقع دینے سے اختلاف کی کوشش ان کے حقوق پر چھاپہ مارنا ہے جو اس غرض سے حفاظتی کونسل کو تحریری درخواستیں بھیج چکے تھے۔

نمائندہ فرانس نے اپنی تقریر میں جس منطق کا سہارا لیا ہے اگر اس کی پیروی کی جائے تو نہ محض یہی ضروری نہیں کہ ایجنڈا منظور کر لیا جائے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ان دس وفود سے کہا جائے کہ وہ فوراً حفاظتی کونسل میں اپنی نشستیں سنبھال لیں۔ اور فرانس کے زاویۂ نگاہ کی مخالفت میں اپنا موقف پیش کریں ـــ واضح رہے کہ یہ وفود ان قوموں سے تعلق رکھتے ہیں جو جمعیت اقوام متحدہ کی رکن ہیں اور اس معاملے کے متعلق حفاظتی کونسل سے

درخواست کر چکے ہیں۔

فرانس کا نمائندہ تو ایک قدم اور آگے بڑھ گیا یعنی دس وفود نے حفاظتی کونسل کے نام اپنے مکاتیب کے ساتھ جو تشریحی نوٹ اور معروض گزار ریمارک ـــ نمائندہ فرانس کے نزدیک ناخوشگوار ـــ بھیجے تھے ان میں سے وہ تمام عبارتیں پڑھ دیں جن کا ترجمہ ان کے خیال کے مطابق درست نہ تھی۔ موصوف نے نہ صرف ان باتوں کا جواب دینے پر زور فصاحت صرف کیا بلکہ انہیں بہتان سے بھی تعبیر کیا۔ علاوہ بریں انہوں نے گیارہ ممالک پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے حکومت فرانس کے خلاف بہتان آمیز بیان دیا ہے۔ میں پاکستان کے نمائندے کی حیثیت سے اس الزام تراشی کے خلاف احتجاج کرتا ہوں اور مجھے یقین ہے، دوسرے دس وفود بھی ـــ اگر انہیں اظہار خیال کا موقع ملا تو ـــ اس کے خلاف احتجاج ہی کریں گے۔ نہ ہمارا یہ منصب ہے، نہ ارادہ اور نہ خواہش کہ ان کے عظیم ملک کو یا اس کی حکومت کو غیر ذمہ دارانہ طریقے سے بہتان طرازی کا نشانہ بنائیں۔

فرانس کے نمائندے نے اپنی تقریر میں متعدد واضح اشارے کئے ہیں اور رمز و کنایہ سے بھی کام لیا ہے۔ مثلاً انہوں نے کہا کہ ہم دس یا گیارہ سادہ لوح قوموں نے "پیلیس ڈی شیلو" کی رونقوں میں سوچے سمجھے بغیر بعض غیر ذمہ دار لوگوں کی باتیں سن لیں۔ پھر ہم نے وہ قدم اٹھایا جو ہرگز اٹھانا نہیں چاہیے تھا۔ مجھے اس بات پر خوشی ہے کہ موصوف نے ایسی بات کہہ کر مجھے یہ بیان کرنے کا موقع دیا کہ ہم نے کس درجہ صبر و تحمل سے کام لیا۔ ذمہ داری کے احساس کا کتنا اچھا ثبوت دیا اور کتنے تامل و تذبذب سے یہ معاملہ غور و خوض کی غرض حفاظتی کونسل کے سامنے رکھے ہیں۔

اب ساری دنیا کو معلوم ہو چکا ہے کہ حکومت تونس کے دو وزیر ـــ ایسے وزیر جنہیں اپنی وزارت کے زمانے میں حکومت فرانس کا اعتماد بھی حاصل تھا ـــ پیرس پہنچے۔ حفاظتی کونسل کے صدر کو ایک مکتوب بھیجا جس میں کونسل کی توجہ تونس کے بعض افسوسناک اور الم انگیز حالات کی طرف منعطف کرائی۔ اس خط کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ یہ مکتوب طویل عرصے تک اقوام متحدہ کے دفتر خانہ میں پڑا رہا۔ سورج کی کرنیں نہ اسے پیرس کے "پیلیس ڈی شیلو" میں چھو سکیں اور نہ نیویارک کے اس ایوان میں جس میں بے شمار کھڑکیاں موجود ہیں۔ اسے لوگوں کی نگاہوں تک پہنچنا اس دن نصیب ہوا جب میرے وفد نے درخواست کی کہ اس کی نقلیں تمام ارکان کے پاس بھیجی جائیں۔

اگرچہ ہمیں معلوم تھا کہ یہ مکتوب حفاظتی کونسل کے صدر کو پہنچایا گیا تھا اور ہم یہ بھی جانتے تھے کہ اسی دور میں تونس قتل عام، فسادات، گرفتاریوں اور فوجی کارروائیوں کی جولانگاہ بنا ہوا تھا ـــ میں صرف تشدد کے واقعات کا ذکر کر رہا ہوں اور اس مرحلے پر کسی کو ان کے لئے ذمہ دار نہیں ٹھہرانا چاہتا ـــ اس سارے علم کے باوجود ہم صرف اس امید پر بڑے صبر و تحمل سے انتظار کرتے رہے کہ حکومت فرانس خود دانش مندی سے کام لے گی موقع کی نزاکت کا احساس کرے گی۔ ان لوگوں کے ساتھ خوش گوار سمجھوتے کا بندوبست کرے گی جن کا شمار روئے زمین کے شریف ترین قوموں میں ہوتا ہے۔

ہمارا انتظار بہت دنوں تک جاری رہا۔ ہم نے آپس میں مشورے کئے۔ اس مسئلے پر بحث و تمحیص جاری رکھی۔ ہم نے مختلف ذرائع کو غیر رسمی طور پر اور دوستانہ انداز میں حکومت فرانس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ہمیں اس امر کا احساس تھا کہ یہ مسئلہ انتہا اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن ایسا نہیں کہ ناواجب عجلت بازی سے کام لیتے ہوئے حکومت فرانس کو پریشانی میں مبتلا کر دیا جائے بشرطیکہ اس کے ارادے نیک ہوتے، اور ہمیں یہی امید تھی کہ اس کے ارادے نیک ہیں۔

عام احساس یہ تھا کہ اس معاملے کو جنرل اسمبلی کے اجلاس پیرس کے آخری ہفتوں میں یا اس سے بھی پہلے پیش کر دیا جائے۔ لیکن زیادہ دور اندیش اصحاب کی رائے کو فوقیت حاصل ہوئی۔ ہم سے کہا گیا کہ تحمل سے کام لینا چاہیے۔ پندرہ ملکوں کے نمائندے ایک وفد کی شکل میں جنرل اسمبلی

سے صدر مسٹر پیڈیلا نرود کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے استدعا کی کہ وہ فرانس سے نیز ان کی وساطت سے حکومت فرانس سے کہا جائے کہ اہل تونیسیہ کو ایسی اس منزل پہ پہنچایا جائے جس کے بعد انسان تنگ آمد بجنگ آمد کا مصداق بن جاتا ہے۔ اس عالم کا تقاضا یہی ہے۔ مقاصد حفاظت کا تقاضا یہی ہے اور دونوں کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم رکھنے کا تقاضا بھی اس کے سوا کچھ نہیں

جنرل اسمبلی کے صدر نے ہمارا پیغام پہنچا دینے کا وعدہ کر لیا۔ اور اسے پورا کیا۔ ہم انتظار کرتے رہے۔ پلیس ڈی چیلو کے برآمدوں میں سراسیمہ نشست لگانے والے لوگ تیونس کے وزیر نہ تھے بلکہ ہم سے تھے جو بھاگ دوڑ کرتے رہے۔ ہم اس پیغام کے جواب یا اس سلسلے میں کسی اشارے کا انتظار کرتے رہے افسوس کہ نہ کوئی جواب ملا اور نہ کوئی اشارہ ہوا۔

مزید انتظار کے بعد ہم ایک مرتبہ پھر جنرل اسمبلی کے صدر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے کہا کہ ہمارے جذبات حکومت فرانس تک ایسے ذرائع سے پہنچا دیے جائیں جنہیں وہ بہتر خیال فرمائیں۔ یہ بھی بتا دیا کہ ہمارے لیے قدرتی اور معمول کے عین مطابق طریق کار یہ تھا کہ ہم اپنے جذبات کا اظہار جنرل اسمبلی کے اجلاس میں کرتے۔ لیکن اس اجلاس کے آخری ایام میں ہمیں اچھا معلوم نہ ہوا کہ اقوام متحدہ کے کام میں مشکلات اور پیچیدگی پیدا کر دیں۔ صدر نے ہم سے پھر یہ وعدہ کیا کہ یہ پیغام حکومت فرانس تک پہنچا دیا جائے گا۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ انہوں نے یہ وعدہ بھی پورا کر دیا لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

پھر ہمارے سامنے یہ سوال آیا کہ آیا ہمیں یہ معاملہ جنرل اسمبلی میں پیش کر دینا چاہیے، اس ضمن میں ہمیں ایک بڑی رکاوٹ پیش آگئی کیونکہ کچھ زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ انہی ممالک کو جن کے نام موجودہ شکایت نامے پر درج ہیں۔ انتہائی الم انگیز، افسوس ناک اور ناخوش گوار تجربے سے گزرنا پڑا۔ ہم میں سے بعض نے مراکش کا مسئلہ جنرل اسمبلی میں پیش کرنا چاہا تھا۔ عارضی ایجنڈے کی اس شق کو جنرل کمیٹی کے روبرو زیر بحث آنا تھا۔ اس کمیٹی میں ان ممالک کو اکثریت حاصل نہ تھی جن کے نام اس دستاویز پر ثبت ہیں۔ جنرل کمیٹی نے اس مسئلے پر بحث کی اجازت نہ دی یقیناً اس نے کہا کہ اس سوال پر بحث فی الحال ملتوی کر دی جائے۔ اس وقت ہمیں خوب معلوم تھا کہ "فی الحال" کا مطلب ایک غیر معین عرصے کے لیے مسئلے کو کھٹائی میں ڈال دینے کے سوا کچھ نہیں۔

پھر یہ معاملہ جنرل اسمبلی کے ابتدائی اجلاس میں زیر بحث آیا اور اس پر متعدد نمائندوں نے یکے بعد دیگرے اپنے شدید جذبات کا اظہار کیا۔ لیکن ہم اس سوال کو ایجنڈے پر لانے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکے ہم دل شکستہ ہو گئے پھر بھی مزید انتظار مناسب سمجھا۔ نیویارک پہنچے۔ آپس میں صلاح مشورہ کیا۔ ہم ہر روز اخباروں میں تشویش انگیز خبریں پڑھتے رہے ہر روز اصلاح احوال کی نئی امیدیں باندھتے رہے۔ ہر روز یہی توقع لگی رہی کہ فرانس اور اہل تونیسیہ کے درمیان بہتر مفاہمت ہو جانے کی علامات ظاہر ہوں گی۔ ہم اہل تونیسیہ اور جمہوریہ فرانس کی سلامتی کے لیے دعائیں کرتے رہے لیکن خبریں روز بروز بد سے بدتر ہوتی گئیں۔

اب ہم نے سوچا کہ ہمیں اخبارات کی خبروں پر ہی کاملاً انحصار نہ کر لینا چاہیے اور غالباً بہتر ہوگا کہ اہل تونیسیہ میں سے چند اصحاب کو نیویارک بلایا جائے تاکہ ہم ان پر جرح کر سکیں اور معاملے کو حفاظتی کونسل میں لے جانے سے قبل ذمہ دار وفد کی حیثیت میں یہ جان لیں کہ صحیح صورت حال کیا ہے ہمیں معلوم ہوا کہ اہل تونیسیہ کے نیویارک آنے کی راہ میں سخت اور ناقابل عبور مشکلات حائل ہیں۔ پتہ چلا کہ تونیسیہ کے ذمہ دار وزرا سے ان کے سفارتی پروانۂ راہداری واپس لے لیے گئے ہیں۔ اگر فرانس کا نمائندہ اس بیان کی تردید کر سکے تو مجھے بے حد خوشی ہوگی۔ بہرکیف یہ امر واقعہ ہے کہ وزرا پروانۂ راہداری کی مشکلات کے باعث نیویارک نہیں آسکے تھے۔ عالم اضطراب میں ہم نے کچھ اور لوگوں کو بلوانے کی بے انتہا سعی کی۔ لیکن ان کے راستے میں بھی ہر طرح کی مشکلات حائل تھیں

اس کے بعد جملہ اقوام کے عظیم دوستوں نے جن کے نام یہاں دیے گئے ہیں۔ ہمیں بتایا کہ حکومت فرانس کو پارلیمانی بحران سے سابقہ پڑا ہوا ہے۔ اس لیے جب تک یہ بحران دور نہیں ہو لیتا، حکومت مذکورہ سے اس معاملے میں کسی واضح اقدام کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ہم کچھ زیادہ پُر امید

نہ تھے۔ پھر بھی ہم نے سوچا دانش مندی نہ سہی جوانمردی کا تقاضا یہی ہے کہ فرانس میں حکومت کا استحکام ہونے کا انتظار کیا جائے۔ آخر یہ بھی ہو گیا اور حکومت کا استحکام ہو گیا۔ ہمیں فرانس کی خاطر اس سے بڑی خوشی ہوئی۔ اب ہم پرامید تھے کہ حکومت فرانس کوئی قدم اٹھائے گی۔

حکومت کے استحکام کے چند روز بعد ہم نے دیکھا کہ صرف یہی نہیں تونیسیہ میں صورت حال اصلاح پذیر نہیں ہوئی بلکہ ہمارے سامنے مایوسی وحشت اور حیرت کا ایک طوفان امنڈ آیا۔ جب ہم نے سنا کہ جمہوریہ فرانس نے تونیسیہ کی پوری کابینہ کو گرفتار کر لیا ہے۔ پوری کابینہ سے میری مراد وزارت کے تمام وہ افراد ہیں جو حکومت فرانس کے قابو میں آ سکے تھے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ حکومت فرانس کابینہ کے دو ممبروں کو پکڑ نہیں سکی۔ یہ وہ کابینہ تھی جسے ۱۹۵۰ء میں دونوں حکومتوں کے درمیان مصالحت ہو جانے پر ترتیب دیا گیا تھا۔ اور یہی کابینہ تھی جسے فرانس اور تونیسیہ کے درمیان بہتر مفاہمت کے لئے اصلاحات کے معاملے پر حکومت فرانس کے ساتھ بات چیت کرنا تھی۔ وہ سب اب جیل میں پہنچ گئی۔ تونیسیہ کے ممتاز افراد میں یہ آخری لوگ تھے جو قید ہوئے۔ [illegible] سے سب سے بڑی اور مقبول عام پارٹی یعنی حزب دستور کا کوئی حیثیت لیڈر رہا نہ تھا جو پہلے جیل میں نہ پہنچ چکا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہماری اطلاع کے مطابق ہزاروں تونسی نظر بندی کے کیمپوں میں پہنچا دیئے گئے تھے۔ سینکڑوں ہلاک کر دیئے گئے تھے۔ اگر اس اطلاع کی تردید کی جا سکے تو مجھے بے حد خوشی ہو گی۔ تونیسیہ کے بعض علاقوں سے اطلاعات حاصل کرنا ہی مشکل ہو رہا تھا

ہم نے پھر بھی انتظار کیا۔ اور سوچا کہ بہر حال ہم پوپ سے بڑھ کر کیتھولک ہونے کا دعوےٰ نہیں کر سکتے۔ اگر اہل تونیسیہ ایک اور حکومت کی تشکیل کریں اور وہ خوش اسلوبی سے کام کرنے لگے تو ہمارے لئے کوئی وجہ اضطراب نہ ہو گی۔

ہمیں اس انتظار میں بہت دن گزر گئے اور پھر ہمیں پتہ چلا کہ باکوش نامی ایک صاحب کو وزیر اعظم مقرر کر دیا گیا ہے۔ ہم نے ان کی سابقہ کیفیت معلوم کرنی چاہی اور ایسے لوگوں سے حالات دریافت کئے جو ان کے ماضی سے آگاہ تھے انہوں نے بتایا کہ یہ صاحب کسی وقت سول کے سرکاری ملازم تھے۔ دوران جنگ میں تھوڑی دیر کے لئے وزارت عظمیٰ کی گدی پر براجمان رہے تھے۔ تونیسیہ میں ان کی قیادت تسلیم کرنے والے افراد زیادہ نہ ہوں گے اور یہ تنہا بزرگوار ہیں جنہوں نے ہماری دانست میں فرانس کے [illegible] وزارت عظمیٰ کا عہدہ قبول کر کے اپنی جان خطرے میں ڈالنے پر آمادگی ظاہر کر دی ہے ہمیں بتایا گیا کہ وہ کابینہ وزارت تشکیل کریں گے۔ ہم نے انتظار کیا اور دن گزرتے گئے۔

یہ مسٹر باکوش وزیر اعظم ہیں۔ فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل کی ساری قوت اور ہمدردی ان کی پشت پناہ ہے اور حکومت فرانس ان کی امداد و اعانت کے لئے کمربستہ ہے لیکن یہ حضرت اب تک کوئی کابینہ نہیں بنا سکے "ہیرلڈ ٹریبیون" اور "نیویارک ٹائمز" میں یہ اطلاعات شائع ہوئی ہیں کہ تونیسیہ کے اس وزیر اعظم کے خلاف عوام کی ناراضگی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ جب وہ بےؔ حکمران تونیسیہ سے ملنے کے لئے محل میں تشریف لے جاتے ہیں۔ تو عقبی دروازے سے داخل ہوتے ہیں۔

وزیر اعظم یا فرانسیسیوں نے دباؤ ڈال کر ایک اور ایسے شخص اور صرف ایک شخص کو ڈھونڈ نکالا۔ جو وزیر بننے کے لئے تیار ہو گیا۔ ان صاحب نے عوام کے جبر و قہر کا نشانہ بنتے ہوئے وزارت کے سنگھاسن پر بیٹھنے کی ہامی تو بھر لی۔ لیکن جب عملاً وزارت سنبھالنے کا وقت آیا۔ تو اس نے دیکھا کہ عوام کی خفگی اور نفرت اس کے خلاف حد سے بڑھ رہی ہے۔ چنانچہ اس نے دانش مندی سے کام لیتے ہوئے وزارت کا یہ "تاج" سر پر رکھنے سے انکار کر دیا اس پر فرانسیسیوں نے اسے جیل میں ڈال دیا۔

مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تونیسیہ نے آج کل برائیوں اور خرابیوں کے اعتبار سے مثالی حیثیت اختیار کر رکھی ہے اور وہاں کا دستور یہ ہے کہ آپ وزیر بنئے اگر اس سے انکار ہے تو سیدھے جیل جائیے۔

اس کے بعد ہم نے سنا کہ فرانس کی جانب سے موسیو ہاٹکلوک نئی اصلاحات لے کر تونیسیہ پہنچے ہیں۔ ہم نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہ اہل تونیسیہ کے لئے امیدوں کا جو پشتارہ لے کر گئے تھے اس کا کیا حشر ہوا۔ اس اجلاس میں دوسرے ممالک کے جو نمائندے تشریف فرما ہیں ان کے سامنے میں فراہم کردہ اطلاعات میں سے چند فقرے پیش کرنا چاہتا ہوں جن سے تمام مندوبین کو پتہ چل جائے گا کہ موسیو ہاٹکلوک کے تونیسیہ پہنچنے کی کیا کیفیت تھی اور یہ اس لئے گئے تھے کہ تونیسیہ کو درست بنائیں۔ اور فرانس کے وعدے کے مطابق اسے آزادی اور اصلاحات کی دولت سے مالا مال کر دینے والے تھے۔

موسیو ہاٹکلوک ۱۳ جنوری کو تونیسیہ پہنچے۔ ان کے استقبال کو فرانس کی فوجی قوت کے مظاہرے کی سب سے بڑی تقریب بنایا گیا جو پہلے دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ آپ نے ایک بحری جنگی جہاز سے اتر کر ساحل پر قدم رکھا۔ شہر پر فرانسیسی فوجوں نے قبضہ جما رکھا تھا۔ وہ جدھر سے گذرے سڑکیں مسلح فوجیوں کی قطاروں سے اٹی پڑی تھیں۔ سارا رستہ جدید گاڑیوں، مسلح کاروں اور ٹینکوں سے بھرا ہوا تھا۔ گویا یہ عام استقبال نہ تھا بلکہ فرانسیسی نمائندے کی آمد کو فرانس کی فوجی قوت کے مظاہرے کے لئے موزوں ترین موقع بنا لیا گیا تھا۔

ریذیڈنٹ جنرل نے بے سے پہلی ہی ملاقات میں ان پر واضح کیا کہ وہ ان سے براہ راست رابطہ رکھنا پسند کریں گے۔ تاہم وزیراعظم نے ریذیڈنٹ جنرل کو بے کی جانب سے مطلع کر دینا ضروری سمجھا کہ تمام سرکاری روابط وزیراعظم کی وساطت سے ہونے چاہئیں۔

جب حکومت تونیسیہ نے ۱۴ جنوری ۱۹۵۲ء کو اپنی شکایت اقوام متحدہ میں پیش کی تو اس وقت ریذیڈنٹ جنرل نے بے سے علیحدگی اور تخلیہ میں گفتگو کرنے کا مطالبہ کیا۔ بے نے انکار کر دیا۔ اور انہیں وزیراعظم سے بات کرنے کی ہدایت کی۔ ۱۵ جنوری کو ریذیڈنٹ جنرل نے لکھا کہ وہ بے سے وزیراعظم کی موجودگی میں گفتگو کرنے کو تیار ہیں۔ اس ملاقات میں انہوں نے متعدد شرائط پیش کیں۔ ایک یہ کہ اقوام متحدہ سے شکایت واپس لے لی جائے۔ دوسری یہ کہ وزارت بدل دی جائے۔ تیسری یہ کہ بے دو فرمانوں پر دستخط کریں۔ ایک کے ذریعے فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل کو اپنا وزیر خارجہ مقرر کر دیں اور دوسرے کے ذریعے جنرل گاربے کو وزیر دفاع کا عہدہ سونپ دیں۔ یہ جنرل گاربے وہی ہیں کہ جن کے نامۂ اعمال میں مڈغاسکر میں سب سے بڑا فوجی اقدام شامل ہے۔ بے نے وزیراعظم کو ہدایت کی کہ ریذیڈنٹ جنرل کو ان شرائط کا جواب دے دیا جائے۔ وزیراعظم نے جو جواب دیا وہ ریکارڈ میں موجود ہے۔ اس نے بتایا کہ وزیراعظم کو بے نے تونیسیہ کے متعلق اقوام متحدہ میں شکایت پیش کرنے کا مجاز بنایا تھا۔ اس سے نمائندہ فرانس کے اس بیان کی قلعی کھل جاتی ہے کہ اقوام متحدہ میں یہ شکایت بے کی ہدایت پر پیش نہیں کی گئی تھی۔ ہمارے خیال میں اس کے لئے خود وزیراعظم کے اختیارات ہی کافی تھے۔ لیکن اگر یہ موقف پیش کیا جائے کہ بے کو ہی اجازت یا ہدایت دینا چاہیے تھی تو ہم کہتے ہیں کہ یہ اجازت یا ہدایت بے سے حاصل کر لی گئی تھی۔

اس کے بعد ریذیڈنٹ جنرل اور جنرل گاربے کو پیرس طلب کر لیا گیا۔ وہ ۲۲ مارچ کو تونیسیہ واپس پہنچے اور وہاں پہنچتے ہی ریذیڈنٹ جنرل نے بے سے بھی انٹرویو کے لئے وقت مانگا۔ چنانچہ ۲۴ مارچ کو بات چیت کے لئے انہیں طلب کیا گیا۔ لیکن اس موقع پر تونیسیہ کے وہ تمام وزراء بھی موجود تھے جو اس وقت شہر میں تھے۔ ریذیڈنٹ جنرل نے بے سے کہا۔ حکومت فرانس بات چیت کرنے کے لئے تیار ہے لیکن اس شرط پر کہ کابینہ کو موقوف کر دیا جائے اور اقوام متحدہ سے شکایت واپس لے لی جائے۔ بے نے یہ دونوں باتیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ریذیڈنٹ جنرل نے ایک دستاویز بے کو دکھائی جس پر فرانسیسی وزیر خارجہ کے دستخط تھے۔ اس میں لکھا تھا کہ ریذیڈنٹ جنرل امن و قانون بحال کرنے کے لئے ——— مجھے امید ہے کہ میں بعد میں کسی موقع پر یہ واضح کر سکوں گا کہ استعمار پیشہ حکومتوں کے نزدیک "امن و قانون" کی اصطلاح کن معنوں میں استعمال ہوتی ہے ——— اور فرانس کے مفاد کی حفاظت کے لئے جو کچھ بھی کارروائی کرنا مناسب سمجھیں اس کا انہیں مکمل اختیار حاصل ہے۔ بے نے جواب میں اس مسئلے پر سوچنے کے لئے مہلت مانگی۔ اور اس سوال پر اپنی پوزیشن محفوظ رکھی۔ ریذیڈنٹ جنرل نے انہیں صرف تین گھنٹے کا الٹی میٹم دے دیا۔ یہ سلوک

فرانس کی حکومت تونیسیہ کے حکمران سے کر رہی ہے جس کے بارے میں فرانسیسیوں کا دوستی کا اقرار رہا ہے۔ ریذیڈنٹ جنرل ہوتکلوک کی تازہ بیہودگی یہ ہے کہ اس نے اسلحہ کی قوت کا کھلا مظاہرہ کر کے اس عمر رسیدہ اور قابل احترام بادشاہ کو ایسا جواب دینے کے لئے مجبور کر رہا تھا۔ اس طریقے سے جو جواب حاصل ہوگا اس کے متعلق ہوتکلوک کے ضمیر کے سوا اور کسی ضمیر کی تسکین نہیں ہو سکتی۔

جب بے کے ساتھ یہ بدسلوکی کی گئی تو انہوں نے جمہوریہ فرانس کے صدر کو برقی تار بھیجا جس میں بتایا کہ فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل نے حکومت کے تمام ممبران پر کس طرح دباؤ ڈالا ہے۔ ساتھ ہی ریذیڈنٹ جنرل کو واپس بلانے کا مطالبہ کیا۔ اسی رات ریذیڈنٹ جنرل نے تونیسیہ کے وزیراعظم اور تین اور وزراء کو گرفتار کر لیا۔ ایک اور وزیر موجود تھا لیکن بڑھاپے اور بیماری کے باعث سے گرفتار نہ کیا گیا۔ یہ جناب سعد اللہ تھے۔ اس بڈھے اور بیمار وزیر نے ریذیڈنٹ جنرل کو لکھا کہ مجھے گرفتار کر لیجئے تاکہ میں قید و بند میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ رہ سکوں۔ ان سب کو تونیسیہ کے جنوبی علاقے میں بھیج دیا گیا سینکڑوں سیاسی کارکنوں، صحافیوں، مدرسوں، وکیلوں اور دوسرے معززین کو جن کی ہمدردیاں نیشنلسٹوں کے ساتھ تھیں، گرفتار کر لیا گیا۔ تمام نیشنلسٹ اخبارات کو بند کر دیا گیا۔ تمام وطنی اسکولوں کے دروازوں پر قفل چڑھا دئیے گئے۔ اور مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ ہمارے پاس ایسا ذریعہ نہیں جس سے معلوم ہو سکے کہ ملک بھر میں جس قدر گرفتاریاں ہوئیں ان کی صحیح تعداد کیا تھی تاہم یہ امر روز روشن کی طرح واضح ہے کہ نظر بندی کے جو بڑے بڑے کیمپ قائم کئے گئے تھے ان میں مقید نیشنلسٹوں کی تعداد ہزاروں سے کیا کم ہو گی!

اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ فرانسیسی فوجوں نے بے کے محل کا محاصرہ کر لیا۔ ریذیڈنٹ جنرل ۱۵ کی صبح کو بے سے ملنے کے لئے گیا مگر اس نزدیک میں کسی دوسرے کو موجود رہنے کی اجازت نہ دی گئی۔ اس کے بعد ریذیڈنٹ جنرل نے اعلان کیا کہ بے نے ایک فرمان جاری کرنے کی منظوری دے دی ہے جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس پر بے نے دستخط نہیں کئے تھے۔

ہماری اطلاع کے مطابق تونیسیہ کے حکمران اور ریذیڈنٹ جنرل کی اس خفیہ ملاقات میں جو کچھ ہوا وہ بے کے لئے ہرگز خوشگوار نہ تھا۔ لیکن جب ریذیڈنٹ جنرل ملاقات کر کے باہر آیا۔ تو اس نے موجود لوگوں سے ہنستے ہوئے اور قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "اندر تو بڑے پیار محبت کی باتیں ہوتی رہیں" یہ ہولناک اور کرب انگیز تمسخر اس بوڑھے شخص سے کیا گیا جس کے تمام ساتھی اس سے چھین لئے گئے تھے۔ اور جو تونیسیہ میں فرانسیسی حکام کے بھاری فوجی دباؤ کا مقدور بھر مقابلہ کرنے کے لئے بالکل تنہا رہ گیا تھا۔

موجودہ صورت حال کا یہ نقشہ ہے۔ فرانس نے اپنے ایک آلہ کار کو جس کا نام باکوش ہے وزیراعظم بنا دیا۔ ہم یہ تو نہیں جانتے کہ وہ کب تک وزیراعظم رہے گا۔ البتہ اگر مجھے پیش گوئی کرنے کی اجازت دی جائے تو کہوں گا کہ اسے اپنے ضمیر کی ملامت یا جیل میں اپنے مقید نیشنلسٹ بھائیوں کی ملامت کے زیر اثر یہ عہدہ جلد از جلد ترک کرنا پڑے گا۔ حالات یہ ہیں کہ وہ تاحال اپنی کابینہ میں ایک بھی وزیر نہیں لے سکا۔ اور ادھر ہمیں بتایا جا رہا ہے کہ فرانس کے حکام اصلاحات کی خوب صورت سکیموں اور تونیسیہ کو خود مختاری دینے کے منصوبوں کے ساتھ منتظر کھڑے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ ان سکیموں اور تجویزوں کے بارے میں گفتگو کس سے کریں گے؟ انہیں آخر بات چیت کس سے کرنا ہے؟ کیا خواہش یہ ہے کہ جس میز پر بیٹھ کر انہیں گفتگو کرنا ہے اس کے دونوں جانب صرف فرانسیسی ہی ہوں یا پھر ان کی کٹھ پتلیاں ہوں؟ اگر ان کا مقصد کچھ کام کرنا ہے اگر الفاظ بے معنی نہیں ہو گئے اور اگر وہ فی الواقعہ کوئی مفاہمت کرنا چاہتے ہیں تو نہ صرف انسانیت کے نام پر بلکہ عام عقل اور منطق کے نام پر بھی ازحد لازم ہے کہ وہ بات چیت ان لوگوں سے کریں جو فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں۔ ان لوگوں سے بات چیت کرنے کا کیا فائدہ جو خود فرانسیسیوں کے ہاتھ کٹھ پتلی کی طرح کام کر رہے ہیں؟

اس وقت صورت حال یہ ہے لیکن فرانس کے نمائندے نے کہا ہے کہ چند ہفتے قبل تو حالات ایسے تھے جن پر حفاظتی کونسل یا جنرل اسمبلی میں یہ شاید کوئی وجہ جواز ہوتی۔ آج یہ صورت ہرگز نہیں اور حالات کی ابتری ختم ہو چکی ہے اب تونیسیہ میں امن، خوش حالی، شادمانی اور دوستی کا دور ہے ۔۔۔ لیکن حالات وہی ہیں جو اوپر پیش کئے گئے ہیں۔ ہزاروں تونسی جیلوں میں بند ہیں۔ پوری کابینہ جیل میں ہے اور نیشنلسٹ تحریک کے تمام یل میں ہیں یہ وہی لوگ ہیں جن کی عزت و حرمت نہ صرف اپنے ملک میں ہے بلکہ باہر بھی ہر جگہ انہیں ویسی ہی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ کیا یہی وہ خوش حالی اور شادمانی کی صبح ہے جس کی نوید ہمیں فرانس کے نمائندے نے سنائی ہے، وہ کہتا ہے کہ ہمیں اس صورت حال پر بحث ہیے؟

اس مسئلہ میں یہ میری پہلی مداخلت ہے۔ میں اسے مختصر رکھوں گا۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے وقت کم ہے اور دوسرے مندوبین بھی کچھ کہنے کے خواہاں ہیں۔ مسئلے پر پھر اظہار خیال کرنے کا حق محفوظ رکھتا ہوں۔ مختصر طور پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سابق اطلاعات کے مطابق شاید ہم اس مسئلے کو ایجنڈے پر لانے ت مثبت ووٹ حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ اگر ہمارا یہ اندازہ غلط نکلے تو ہم سے زیادہ خوشی کسی کو نہ ہوگی۔ لیکن اب تک ہمارا خیال تنے ووٹ ہمیں نہیں مل سکیں گے۔ ہمارے رفقاء کو معلوم ہے کہ یہاں ووٹ نہ دینے کا مطلب بھی منفی ووٹ ہوتا ہے اگر یہ مطلب ہے ابھی وہی حشر ہوگا جو اس سے قبل پیرس کے اجلاس میں مسئلہ مراکش کا ہوا تھا۔ لیکن کونسل میں یہ سوال گیارہ ملکوں نے پیش کیا ہے یہ تمام ملک رکن ہیں۔ اور انہیں غیر ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جو اقوام متحدہ کے رستوں میں یونہی گھومتے پھرتے ہوں۔ وہ اقوام متحدہ میں اقوام متحدہ میں۔ انہیں اعتماد و یقین ہے کہ یہی ایک ادارہ ہے جس میں وہ دکھ درد کا مداوا تلاش کر سکتے ہیں۔ جن کے پاس اور کوئی راہ نجات نہ ہو۔

کیا فرانس کی حکومت اس بات پر خوش ہوگی کہ اہل تونیسیہ اپنی تکالیف کے ازالہ کے لئے تحریکات چلاتے رہیں؟ وہ اس مقصد کے حصول کے سے غیر ذمہ دارانہ طریقے اختیار کرنے لگیں؛ کیا کوئی اور تنظیم ایسی موجود ہے جو اقوام متحدہ سے بہتر کام انجام دے سکتی ہے؟ فرانس والے کیا چاہتے ہیں؟ میں یہ سوال تمام اہل فرانسیسیوں سے کر رہا ہوں جن تک میری تقریر کے الفاظ جلد یا بدیر پہنچیں گے اگر تونیسیہ جیسی صورت حال پر بحث نہیں ہو سکتی تو اقوام متحدہ کس مرض کی دوا ہے۔ اگر مظلوم و مقہور اقوام گیارہ ذمہ دار ممالک کی وساطت سے ۔۔۔ نمائندہ فرانس کے نمائندوں کو خوب علم ہے کہ یہ ممالک چند ملکوں کو چھوڑ کر سارے ایشیا سے عبارت ہیں ۔۔۔ اپنی آواز یہاں نہیں پہنچا سکتیں تو پھر تم لوگ جن سے مجمع ہیں: عملی طور پر سارا ایشیا اقوام متحدہ کے دروازے پر دستک دے رہا ہے اور یہ نہیں کہہ رہا کہ فرانس کو سزا دیجئے۔ یہ بھی نہیں کہتا کہ پروانۂ آزادی دے دیجئے، صرف یہ کہتا ہے کہ از راہ کرم اس سوال پر بحث کیجئے لیکن اگر سلامتی کونسل کے سات ارکان اس مسئلے کو زیر بحث لانے کے لئے نہیں مل سکتے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ گیارہ قوموں سے یہ کہا جا رہا ہے کہ تم جہنم کی راہ لو۔ ہم تمہارے سوال پر بحث نہیں کریں گے خواہ کتنے ہی شدید احساسات رکھتے ہو لیکن ہم اسے اپنے ایجنڈے پر بھی لانے کے لئے تیار نہیں۔ تاکہ سچائی بروئے کار آ جائے۔

ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے آگ لگی ہوئی دیکھی ہے۔ یہ آگ ہم نے خود نہیں لگائی۔ ہم نے شعلے بھڑکتے دیکھے ہیں اور ہم آگ بجھانے والے ادارے کے پاس یہ کہنے کے لئے آئے ہیں کہ ذرا اس آگ کو دیکھئے اور اسے بجھائیے۔ اب آگ بجھانے والے کہتے ہیں کہ ہم تو اس طرف نگاہ بھی نہیں کریں گے یہ صورت حال ہے۔ اس کے باوجود ہم اس سوال سے دلچسپی لیتے رہیں گے۔ کیونکہ یہ مسئلہ ان مظلوم انسانوں کا ہے جنہیں ہم اپنے بھائی سمجھتے ہیں۔ جن ممالک نے اس مکتوب پر دستخط کئے ہیں ان میں سے اکثر ماضی قریب تک خود اسی طرح محکوم و مجبور تھے۔ ابھی اتنا وقت نہیں گزرا کہ وہ بھی ان مصیبتوں کو بھول گئے ہوں جن کا تختۂ مشق وہ محکوم ہونے کے باعث بنے ہوئے تھے۔ بہرحال ہم اہل تونیسیہ کی حالت زار کو فراموش نہیں

کر سکتے۔ ہم یہاں سے کہہ دینا چاہتے ہیں کہ حفاظتی کونسل اپنے صوابدید کے مطابق جو کوئی فیصلہ صادر کرنا چاہے۔ (اس کونسل کے بیچ بعض ایسے آدمی بھی [illegible] ہوں گے جن کا ضمیر بلند پکار پکار کر کہہ رہا ہو گا کہ ہم اس معاملے کو [illegible] دیکھنے کے روادار نہیں) ہم اپنے دل میں چراغ روشن رکھیں گے۔ اور جو کچھ ہم سے ہو سکے گا اس کے کرنے میں تعاون دریغ نہ کریں گے۔

اس مقام پر میرا وفد فی الحال رک جانا چاہتا ہے۔ نمائندہ فرانس نے تاریخ ماضی کے بعض واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ میرا وفد ان کے متعلق بھی جواب کا حق محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ اس وقت تونسیہ کی صورت حال سے مزید دور ہٹ جائیں گے۔ اور وہ استعماری کیفیت سامنے آ جائیں گے جو وہاں موجود ہیں۔ وہ اس پہلو سے بھی ہمارا اضطراب کی بنیاد و اساس ہیں۔ فی الحال ہم صرف طریق کار کی بحث میں حصہ لے رہے ہیں۔ مجھے اعتراف کرنا چاہیے کہ میری تقریر میں مطلب کے بعض نکات بھی زیر غور آ گئے ہیں لیکن ان کا باعث نمائندہ فرانس کی تقریر تھی جس نے مطلب کے معاملات اپنی تقریر میں شامل کر لئے۔

جناب! میں نمائندہ پاکستان کی حیثیت میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں۔

(۲)

اقوام متحدہ کی حفاظتی کونسل میں تونسیہ کا مسئلہ ایجنڈے پر لانے کے سلسلے میں پروفیسر احمد شاہ بخاری ـــ پطرس ـــ
کی دوسری تقریر جو انہوں نے ۱۰ اپریل ۱۹۵۲ء کے اجلاس میں کی۔ بخاری اس وقت کونسل کے صدر بھی تھے۔

تقریر کرنے والوں کی جو فہرست میرے پاس موجود ہے اس میں اگلا نام پاکستان کے وفد کا ہے۔ اگر حفاظتی کونسل کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں نمائندہ پاکستان کی حیثیت میں کونسل سے خطاب کروں گا۔

اب تک حفاظتی کونسل کے تمام گیارہ ارکان اس مسئلے کو ایجنڈے میں شامل کرنے کے بارے میں اظہار رائے کر چکے ہیں۔ اب یہ حقیقت واضح ہو گئی ہے کہ چھ ملکوں کے وفد اسے ایجنڈے میں شامل کرنے کی حمایت نہیں کریں گے۔ ان میں مختلف ملکوں کے دو دوست اور رفیق بھی شامل ہیں جن کے لئے ہمارے دل میں انتہائی احترام ہے۔ ان میں سے تین ملک ایسے ہیں جو عام لوگوں کے نزدیک زبردست استعماری مفاد کے نمائندے ہیں۔ چوتھے ملک کی عظمت و شان میں بھی کلام نہیں۔ اسے استعماری مفاد سے بھی کوئی علاقہ نہیں۔ تاہم اس نے مذکورہ بالا ملکوں کا ساتھ دینا پسند کیا۔ اب یہ حقیقت بالکل واضح ہو چکی ہے کہ اگر اس بارے میں ووٹوں کی نوبت آئی اور جب کبھی بھی آئی، ہم ہار جائیں گے۔

آج کا دن ـــ ۱۰ اپریل ۱۹۵۲ء ـــ اقوام متحدہ کی سرگزشت میں ایسا دن مشہور ہوگا جب مختلف معاملات پر آزادانہ غور و بحث کو دبا دینے کی بنیاد رکھی گئی۔ میرے دور اندیش رفیق چین کے نمائندے ڈاکٹر سیانگ نے اقوام متحدہ میں وسیع تجربے کی بنا پر ہمیں بتایا ہے کہ یہ واقعہ اس انجمن کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا بالکل پہلا واقعہ ہوگا جب ایک معاملے کو محض ایجنڈے پر لانے کے سلسلے میں کونسل کے اندر اس درجہ شدت اختیار کی گئی کہ اسے ختم کئے بغیر چارہ نہ رہا۔ اقوام متحدہ کی تاریخ میں آج کا دن ایک اور لحاظ سے بھی یادگار رہے گا اس لئے کہ ایک پالیسی کو صد درجہ افسوسناک اور الم انگیز طریق پر الٹ دیا گیا۔

پچھلی مرتبہ میرے وفد نے حفاظتی کونسل سے خطاب کیا تو اس کی ضرورت میرے معزز دوست نمائندہ فرانس کے خطاب کی وجہ سے پیش آئی تھی۔ میرے لئے یہ امر صد درجہ غیر مناسب ہوگا کہ میں اس دوسرے موقع کو بھی ان کی تقریر پر نکتہ چینی کے لئے استعمال کروں۔ مجھے ایسے طرز عمل سے احتراز

ہے۔ میری آرزو یہ ہے کہ اس موقع پر اپنے رفیق کے سامنے خود حکومتِ فرانس کی رائے میں سے چند اقتباسات پیش کروں۔ یہ رائے اس مسئلے پر تھی کہ کسی مسئلے کو ایجنڈے میں شامل کیا جائے یا نہ کیا جائے اور یہ اس وقت دی گئی تھی جب تیونس کا مسئلہ قطعاً زیرِ بحث نہ تھا۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۴۶ء کو کونسل یونان کے خلاف یوکرین کی شکایات پر بحث کر رہی تھی۔ اس وقت نمائندہ فرانس نے جو تقریر کی تھی اس میں کا ایک حصہ یہاں پڑھوں گا۔ نمائندہ مسٹر پیروڈی (MR PARODI) نے اس موقعے پر کہا تھا:—

> "ایک معاملے کو ایجنڈے پر لانے سے انکار کا طریقہ سخت نقصان رساں اور خطرناک ہے۔ مزید برآں یہ فیصلہ کرنے کے کون سے وجوہ ہو سکتے ہیں کہ فلاں شکایت کے لیے مناسب معیار موجود نہیں؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ کونسل عام سیاسی صورتِ حال کے متعلق قیاسی طور کی بنیاد پر فیصلہ صادر کر دے گی ایسا کرنا ممکن ضرور ہے لیکن مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تمام اس قسم کی شہادت سے پیشِ نظر کونسل کے لیے اس قسم کا طریقہ اختیار کرنا ایک حد تک خطرناک ہے اس لیے کہ جب تک کونسل پورے مسئلے پر کھلے دل سے غور و خوض نہ کرے گی اسے شہادت کے بارے میں صحیح اندازے کا موقع کیونکر مل سکے گا) اندیشہ ہے کہ ایسے معاملات میں کونسل عام سیاسی مصلحتوں سے متاثر ہو جائے گی۔ اور ان مقاصد و انصاف کا پورا خیال نہ رکھ سکے گی۔ جو پیش کردہ مسئلے کے سلسلے میں ملحوظ رہنے چاہئیں"

فرانس بہت بڑا ملک ہے۔ وہ حفاظتی کونسل کے پانچ مستقل ارکان میں سے ہے۔ یعنی ان پانچ ارکان میں سے ایک ہے جنہوں نے اممِ متحدہ کے پورے نظام کے نشوونما اور تعارف میں حصہ لیا تاکہ انصاف، مساوات اور آزادانہ غور و بحث سے مسائل کا تصفیہ ہو سکے لیکن آج اسی فرانس (اسی ملک کے ایک سابق نمائندے کے الفاظ میں) تمام سیاسی مصلحتوں سے متاثر ہو گیا ہے اور اس نے انصاف کے وہ مقاصد پیشِ نظر نہیں رکھے خاص مسئلے میں پیشِ نظر رہنے چاہییں تھے۔

جس حد تک میرے معزز دوست نمائندۂ فرانس اور اس بحث میں اس کی حکومت کی مداخلت کا تعلق ہے۔ میں سمجھتا ہوں۔ مجھے اس سے زیادہ کہنا ہے:—

میں سلطنتِ متحدہ (برطانیہ) کے معزز نمائندے اور اپنے دوست سر گلیڈون جیب (SIR GLADWYN JEBB) [illegible] سے بطورِ خاص مایوس ہوا۔ معزز سر گلیڈون جیب کی تقریر میں متعدد خوش گوار باتیں تھیں۔ جن میں میں بھی ان کا شریک ہوں۔ ان میں انگریزی کے لیے محبت اور عزت بھی شامل ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ سلطنتِ متحدہ کے معزز نمائندے نے آج ہمارے اس مشترکہ محبوب کی بے حرمتی کر دی ہے نے یہاں اس خط میں سے کچھ اقتباسات سنائے جس کے مطابق گیارہ ملکوں نے یہ معاملہ حفاظتی کونسل کے سامنے پیش کیا تھا۔ اور جب وہ اس پر پہنچے جس میں حکومتوں نے کونسل سے درخواست کی تھی کہ موجودہ حالت کو ختم کرنے کی غرض سے وہ تمام ضروری تدبیریں منشور کے مطابق اختیار کرنے کے لیے اجلاس منعقد کیا جائے تو نمائندے نے فرمایا کہ یہ جملہ مبہم ہے دوسرے لفظوں میں ان کے نزدیک اس جملے کے متعدد مفہوم تھے۔ جن کی سے انہیں پریشانی لاحق ہوئی میں ان سے کہنا چاہتا ہوں کہ اس مفہوم کو بہترین طریق پر پیش کرنے کی شاید یہ صورت ہوگی کہ یہ گیارہ قومیں حفاظتی کونسل مدلل اور متوازن طریق پر درخواست کرتیں اور کونسل کو پورا موقع دیتیں کہ وہ اس مفہوم کے مطابق کم یا زیادہ جیسا مناسب سمجھے انتظام کرے۔ میں نمائندہ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس میں تو کوئی ابہام نہیں الا یہ کہ ہم انگریزی زبان کی بے حرمتی پر کمر باندھ لیں۔

سر گلیڈون یہ بات کہہ کر بے تعلقی سے آگے بڑھے ۔ اور فرمایا کہ کم از کم برطانوی وفد کا ماننا یہ نہیں کہ فرانس یا سوریہ پر کوئی حل ٹھونسا جا سکتا ہے میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ زیر بحث جملے میں ایک بھی ایسا لفظ موجود ہے جس سے آپ یا جبر کا مفہوم پیدا کیا جا سکے یا کہا جا سکے کہ کوئی چیز ٹھونسنا مقصود ہے۔ اگر سلطنت متحدہ کے نمائندے کو صرف اس بات پر اعتراض تھا تو وہ ایسی ترمیم یا سفارشیں پیش کر سکتا تھا جو فریقین پر کوئی حل ٹھونسنے سے بالکل پاک ہوتی۔ سلطنت متحدہ کا وفد کہہ سکتا تھا کہ ہم اس مسئلے پر بحث کریں ۔ ہمیں سوریہ یا فرانس پر کوئی حل ٹھونسنا نہ چاہئے ۔ محض یہ سفارش کر دینی چاہئے کہ وہ اکٹھے بیٹھ کر جھگڑے کا تصفیہ کر لیں ۔ کیا اسے فیصلہ ٹھونسنے سے تعبیر کیا جا سکتا تھا؟ لیکن میں کہتا ہوں کہ سلطنت متحدہ کے نمائندے نے اپنا نقطۂ نگاہ جس انداز سے پیش کیا اس سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ ہم نے حفاظتی کونسل میں جو شکایت پیش کی وہ مبہم اور لغو تھی ۔ ساتھ ساتھ ایک دھمکی بھی موجود تھی ۔ ہماری درخواست میں کوئی ایسی بات مضمر تھی جس کی بنا پر حفاظتی کونسل کے لئے لازم ہو جاتا کہ وہ اپنا حل سوریہ یا فرانس پر خواہ مخواہ ٹھونسے ۔ یہ امر حقیقت سے منزلوں دور ہے ۔

سلطنت متحدہ کے نمائندہ کا بیان ایک طرح پالیسی کا بھی اہم اور انقلاب انگیز تغیر ہے ۔ قبل ازیں انجمن اقوام متحدہ میں یہ مسئلہ پیش تھا کہ اس قسم کے مسائل ایجنڈے میں شامل کئے جائیں یا نہ کئے جائیں ؛ اس موقع پر سلطنت متحدہ کے وزیر خارجہ نے اپنے نظریات پیش کئے تھے ۔ میں حفاظتی کونسل میں سرکاری دستاویزوں سے اقتباسات پیش کروں گا ۔ جب روس کے خلاف ایران اور احوال یونان کے متعلق روس کی شکایتیں زیر بحث تھیں ـــ مسٹر بیون (Mr. BEVIN) نے ۲۵ جنوری ۱۹۴۶ء کو فرمایا تھا:ـــ

> "میں دل سے چاہتا ہوں کہ حفاظتی کونسل ان تمام معاملات کے متعلق شکایت کرنے والوں کی بات سنے خواہ وہ کوئی ہوں اگر کوئی حکومت محسوس کرتی ہے کہ کسی بیرونی یا بڑی طاقت کے خلاف شکایت کے بعد وہ اس کونسل میں نہیں آ سکتی اور اپنا نقطۂ نگاہ بیان نہیں کر سکتی تو میرے نزدیک یہ غلط ہے جس حکومت کا میں نمائندہ ہوں ۔ اسے بھی امن کو خطرے میں ڈالنے کا ملزم ٹھہرایا گیا ہے ۔ یونان کے معاملے میں جس حد تک میری یا کم از کم میری حکومت کی خاص ذمہ داری کا سوال ہے اس کی پوری تحقیقات کر لی جائے اور اس پر بحث بھی ضرور کی جائے ۔ میری طرف سے قطعاً کوئی اعتراض نہ ہوگا ۔ ۔ ۔ ۔ اگر حکومت ایران کو حکومت روس کے خلاف کوئی شکایت ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ حکومت ایران کو مزید موقع دیا جائے کہ وہ یہاں آئے اور اپنا معاملہ پیش کرے اس وقت ہم یہ اندازہ کر سکیں گے کہ شکایت درست تھی یا نہ تھی ۔ میں چاہتا ہوں کہ اس معاملے کو ایجنڈے پر رکھا جائے اور اس پر برسر عام بحث کی جائے اس لئے کہ مجھے یقین ہے حقائق کو دنیا کے سامنے لانے ہی پر امن کا انحصار ہے ۔ خواہ وہ حقائق صحیح ہوں یا غلط ۔" (سرکاری ریکارڈ سال اول سلسلہ اول صفحہ ۱۷)

آج یہ گراں بہا الفاظ بھلا دئے گئے ہیں ۔ آج ہم سے کہا جاتا ہے کہ اس مسئلے کو بروئے کار لانے سے انجمن اقوام متحدہ کے اصول کو تقویت نہیں پہنچے گی ۔ بلکہ ـــ مجھے افسوس ہے کہ یہ بیان سلطنت متحدہ کے نمائندے کی تقریر میں ہے ـــ اس مسئلے کو حفاظتی کونسل میں لانا اور اس پر آزادانہ اور عام بحث کا موقع بہم پہنچانا انجمن اقوام متحدہ پر بہت برا اثر ڈالے گا ۔

تونس معاملے کے متعلق آزادانہ بحث سے اقوامِ متحدہ پر بڑا اثر پڑتا ہے اور یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آج کی دنیا میں اقوامِ متحدہ کا ادارہ کونسا وظیفہ رہ جاتا ہے۔ سلطنتِ متحدہ کے نمائندے کے نزدیک اقوامِ متحدہ کو اختلافات سے بچنے اور گیا، قوموں کے جو بڑا اثر ڈالنا چاہتی ہیں ان سے بچاؤ کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تمام بحثیں ختم کر دی جائیں اور ہم سب امن و سکون کی زندگی بسر کریں۔ ساتھ ساتھ اس نئی عمارت کو تالا لگا دیں جس میں ہم جمع ہیں۔

سلطنتِ متحدہ کے نمائندے نے اور میں سمجھتا ہوں کہ نیدرلینڈز کے نمائندے نے ایک بات بڑے خلوص اور دیانت سے کہی اور وہ یہ کہ اگر ہم نے اب کوئی قدم اٹھایا یا اس مسئلے پر حفاظتی کونسل میں بحث کی تو تونیسیہ میں جو بات چیت ہو سکتی ہے وہ ناکام ہو جائے گی۔

سوال یہ ہے کہ یہ بات چیت کس سے ہو رہی ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ ایک فریق فرانس ہے۔ دوسرا فریق کون ہے جو بات چیت کر سکتا ہے؟ تمام [illegible] وزارت جیل میں ہے۔ اور یہ آخری عوامی وزارت تھی جو تونیسیہ کو ملی۔ تمام قومی لیڈروں اور کارکنوں کو اور ہر پڑھے لکھے آدمی کو جس نے قومی مقاصد سے کم یا زیادہ ہمدردی کا اظہار کیا یا تو پیٹا گیا یا کال کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ تونیسیہ میں اس وقت وسائل حمل و نقل پر شدید پابندیاں ہیں۔ پھر فرانسیسی حضرات کس کے ساتھ معاملات پر بحث و تمحیص کر رہے ہیں؟ کونسی گفت و شنید ہے جو حفاظتی کونسل میں بحث کی وجہ سے درہم برہم ہو جائے گی؟ ریذیڈنٹ جنرل تونیسیہ میں کون سا عمدہ اور نازک کام انجام دے رہا ہے جو یہاں ہماری بحث کی وجہ سے معرضِ خطر میں پڑ جائے گا؟ اگر اقوامِ متحدہ میں اس مسئلے پر بحث تونیسیہ کے اندر ریذیڈنٹ جنرل کے کام کو تباہ کر دے گی اور اگر اس بین الاقوامی عدالت میں آزادانہ بحث اس کے لئے رکاوٹ بن جائے گی تو ہم یہی سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کسی برے کام ہی کے درپے ہوگا، جس میں رکاوٹ پیدا ہو گی۔ کسی اچھے کام میں رکاوٹ کا امکان ہی نہیں۔ اور میں ہرگز نہیں سمجھ سکتا کہ اقوامِ متحدہ میں کوئی بحث بہبودِ انسانی پر ایسا مہلک اثر ڈالے گی۔

ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اگر ہم نے یہاں اس مسئلے پر بحث کی تو اس سے تونیسیہ میں بے چینی کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ یہ بات شروع ہی سے جاری ہے۔ یہ پہلو سب سے پہلے نمائندہ فرانس نے پیش کیا اور میں سمجھتا ہوں کہ بعض دوسرے نمائندوں نے بھی خلوص کے ساتھ خطرہ محسوس کیا کہ ہمارے الفاظ کسی نہ کسی طرح وہاں کے عوام کو مشتعل کر دیں گے۔

تونیسیہ میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ اول وہاں کے اصل باشندے، دوسرے فرانسیسی۔ فرانسیسیوں نے ہزاروں فوجیں وہاں اتار دی ہیں ان کے ساتھ ٹینک ہیں، توپیں ہیں، اور ہر قسم کے آلات و اسلحہ ہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے اہلِ تونیسیہ کے پاس نہ کوئی اسلحہ خانہ ہے اور نہ کوئی حربی کارگاہ۔ لہٰذا اگر ہمارے الفاظ کسی کو مشتعل کر سکتے ہیں تو وہ صرف فرانسیسی ہیں۔ وہی موثر طریق پر مشتعل ہوں گے۔ اہلِ تونیسیہ میں کیونکر اشتعال پیدا ہو سکتا ہے؟ وہ کبھی کبھار ایک بم پھینک سکتے ہیں، وقتاً فوقتاً شور مچا سکتے ہیں لیکن وہاں کی پوری فوجی قوت فرانسیسیوں کے قبضہ میں ہے۔ ہم انہیں اس وقت ان کارروائیوں سے باز رکھنا چاہتے ہیں تاکہ وہ ان افعال کے مرتکب نہ ہوں جنہیں "مظالم" سے تعبیر کیا جاتا ہے ـــــ یہ ایسا لفظ ہے جو نمائندہ فرانس کے کانوں پر یقیناً گراں گزرے گا۔ تونیسیہ میں [illegible] اور کچھ نہیں ہوا۔ البتہ ریذیڈنٹ جنرل یہ کوشش کر رہے ہیں کہ کچھ نہ کچھ ہو جائے تاکہ دنیا کو بتایا جا سکے کہ بات چیت از سر نو شروع ہو گئی ہے۔

سلطنتِ متحدہ کے وفد کی طرف سے یہ بات سن کر مجھے بے حد تعجب ہوا۔ اس لئے کہ سلطنتِ متحدہ کے سوا دنیا کا کوئی ملک نہیں جسے اس قسم کے حالات کا زیادہ سے زیادہ تجربہ ہو۔ اس وفد کو خوب معلوم ہے کہ پاک و ہند کی سرزمین میں برطانوی اقتدار کی دست کشی سے پیشتر قومی لیڈروں کو بار بار جیلوں میں ڈالا گیا تھا اور ان کی جگہ مقامی معززین نے حکومتیں بنا لی تھیں (یہ وہی اصطلاح ہے جو فرانس نے تونیسیہ میں اپنے پٹھوؤں کے لئے استعمال کی) زیادہ معتدل اور زیادہ معقول عناصر سے سمجھوتے ہوئے لیکن ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی سمجھوتہ کارآمد ثابت نہ ہوا۔ جب تک عوامی

خواہ سلطنت سے اصرار بھی [illegible] اصلاحات کی کوئی قسط عنان و صلاحیت سے کامیاب نہ ہو سکی ۔ بہرحال ایک فیصلہ طرز عمل کی بنا پر جو مصر نے تاریخ میں ہمیشہ شاندار رہے گا سلطنت متحدہ نے یہ مطالبہ کیا کہ ان لوگوں سے بات چیت کرے جنہیں ایک موقع پر جیلوں میں ڈالا گیا تھا اور کے بعد کیونکہ مصر اور سلطنت متحدہ کے درمیان پائیدار امن و دوستی کی بنیاد پڑی ۔ اس دوستی پر ہمیں فخر ہے ۔

تاہم یہ اس وقت تک ممکن نہ ہوا جب تک سلطنت متحدہ نے ایک جرأت مندانہ اور فراخ دلانہ قدم نہ اٹھایا ۔ روز بروز وقت گذارنا، زبانی سے کام لینے ، اور دنیا کو اپنے اور دوسروں کے متعلق دھوکا دینے کی کوشش کے بجائے سلطنت متحدہ جرأت مندانہ اقدام سے اصل کام پر متوجہ ہو گئی اور عوام کے حقیقی نمائندوں کے ساتھ بات چیت کی ۔ دراصل تیونس میں یہ طرز عمل اختیار کرنے پر آمادہ نہیں ہیں امید تھی کہ سلطنت متحدہ کے [illegible] حکومت فرانس کو یہی مشورہ دیں گے جو ماضی قریب کی تاریخ میں خود ان کے اپنے تجربے پر مبنی تھا ۔

اخبارات سے معلوم ہوا کہ کئی دن ہفتے پیشتر فرانس کے وزیر مستعمرات اور برطانیہ کے وزیر مستعمرات کے درمیان بات چیت ہوئی تھی ۔ اس کا موضوع گفتگو تونس تھا ۔ اگر سر گلیڈون کا بیان اسی مشورے پر مبنی ہے جو ملکہ معظمہ کی حکومت کو یہ معاملہ ایجنڈے میں شامل کرنے کے لئے دیا گیا ـــ تو مجھے افسوس ہے کہ ان دو معزز اصحاب کی یکجائی سے کوئی اچھا نتیجہ برآمد نہ ہوا ۔ سر گلیڈون جب نے انگریزی زبان پر قابل رشک دسترس کا مظاہرہ [illegible] مجھے اپنے آپ کو گھوڑے اور مجھے خرگوش سے تشبیہ دی ہے ۔ اس طرح مجھے علاوہ [illegible] کا احترام کرنا موصوف نے بتایا کہ برطانوی دولت مشترکہ میں جس کے ساتھ وابستگی کی عزت انہیں مجھے اور ہمارے ملکوں کو حاصل ہے بھانت بھانت کے سیاسی جانوروں کی گنجائش ہے یہ تو غالباً درست ہے لیکن اگر برطانوی دولت مشترکہ میں شتر مرغ بھی موجود ہیں تو وہ میرے ملک میں نہیں پائے جاتے

اب میں اس معاملے کی طرف متوجہ ہوتا ہوں ۔ جو میرے نزدیک صحیح ہے ۔ دروازہ کھلا ہے یعنی اس مسئلے کے متعلق ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا موقف جس حد تک آزادانہ بحث و تمحیص کا تعلق ہے ۔ میں نہیں سمجھتا کہ دنیا کا کوئی دوسرا ملک ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی زیادہ جرأت مندانہ رہنمائی پیش کر سکتا ہے ۔ اس وقت تک امریکہ کی پالیسی ہر ابہام سے پاک رہی اور وہ صاف اور بلند آہنگ تھی ۔ گذشتہ برسوں میں اس معاملے کے متعلق آزادی تقریر کے بارے میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے جو کچھ کہا ان میں سے بعض حصوں کو دہراتے ہوئے مجھے خوشی ہوتی ہے ـــ اور میں سمجھتا ہوں کہ ان سے بہتر اصحاب کے قلوب میں حرارت پیدا ہو جائے گی ۔ ان میں سے بعض حصے بڑے روح افروز ہیں ـــ میں ان حصوں کو اس غرض سے یہاں پیش کروں گا تاکہ اندازہ ہو سکے آج اقوام متحدہ کے بڑے ارکان کی روش میں کتنا نمایاں تغیر آچکا ہے

کیا مجھے ۱۹۴۶ء کی طرف توجہ کی اجازت دی جائے گی جب مسٹر سٹیٹنیس (MR. STETTINIUS) نے روس کے خلاف ایران کی شکایت پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا ۔

> "اگر ہم کونسل کے آئندہ اجلاس میں بحث کی غرض سے ایسے مسائل کو ایجنڈے میں لانے پر راضی ہو سکیں تو میں سمجھتا ہوں اس طرح صورت حال ہمارے سامنے واضح ہو جائے گی ۔ میں یہ حقیقت زیادہ سے زیادہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی حکومت کو یقین ہے اگر اقوام متحدہ کے ارکان میں سے کوئی ملک شکایت لے کر آتا ہے تو یہاں اسے اپنی بات سنانے کا حق حاصل ہے ۔"

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے اسی نمائندے نے فروری ۱۹۴۶ء میں یونان کے اندر برطانوی افواج کے مسئلے پر تقریر کرتے ہوئے کہا ۔

"جب مختلف ملکوں کے درمیان شدید غلط فہمیاں پیدا ہو جائیں تو بہتر یہی ہے وہ اپنے معاملات

کو اس کونسل میں لے آئیں۔"

امریکہ کے ایک اور معزز نمائندے مسٹر جانسن (MR. JOHNSON) نے ایران کے خلاف جمہوریہ سوویت یوکرین کی شکایت پر ۱۹۴۶ء میں بحث کرتے ہوئے کہا۔

> "اس نظام (حفاظتی کونسل) کی تاسیس کے وقت سے میری حکومت کا موقف یہ رہا ہے کہ اگر اقوام متحدہ کا کوئی رکن کہتا ہے ایسے حالات موجود ہیں جن سے بین الاقوامی امن و حفاظت کے لئے خطرہ درپیش ہے تو کونسل سے اپنا معاملہ پیش کرنے کا موقع دینے سے انکار نہیں ہو سکتا۔ میری حکومت اس اصل کو بہت اہم سمجھتی ہے۔"

امریکہ کے اسی نمائندے یعنی مسٹر جانسن نے ۱۹۴۷ء میں یہ کہا۔

> "یہ واقعہ بھی بڑا اہم ہے کہ دنیا کے اس خطے میں گولی چل رہی ہے اور آدمی مارے جا رہے ہیں۔ لہٰذا حفاظتی کونسل کو اس پر توجہ کا حق حاصل ہے خواہ سیادت کا تصور کچھ ہی ہو اور انجام کار اس بارے میں کچھ ہی فیصلہ کیا جائے۔"

روس نے چیکوسلواکیہ کی آزادی میں مداخلت کی تھی اور اس پر چلی کی طرف سے شکایت پیش کی گئی تھی۔ مسٹر وارن آسٹن ———— (MR. WARREN AUSTIN) نے اس سلسلے میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

> "جو مسئلہ سامنے ہے اس کے متعلق فیصلہ اصل معاملے کا فیصلہ نہ ہوگا۔ اسے معاملے کے مالہ و ما علیہ پر فیصلہ نہ سمجھا جائے گا۔ مگر جب ایک مسئلہ پیش ہو۔ جیسا کہ یہاں ہوا یعنی یہ کہ کوئی معاملہ بحث کے لئے ایجنڈے پر رکھا جائے یا نہ رکھا جائے تو اس معاملے کی نوعیت پر مزید غور کر لینا چاہیے، تاکہ معلوم ہو سکے حفاظتی کونسل کی دسترس میں وہ آتا ہے یا نہیں آتا۔"

مسٹر آسٹن نے مزید کہا۔

> "کیا حفاظتی کونسل اس ذمہ داری سے اعراض یا اغماض کر سکتی ہے جو اس کے کندھوں پر ڈال دی گئی ہے کہ ان تمام الزامات کی سماعت کرے؟ ان وجوہ سے ریاستہائے متحدہ امریکہ کی حکومت اس امر کو ایجنڈے پر لانے کے حق میں ووٹ دے گی۔"

میں وہ تمام اقتباسات پیش نہیں کروں گا۔ جو اس وقت میرے سامنے ہیں۔ میں اپنے رفیقوں کو تھکا دینے کا خواہاں نہیں۔ امریکہ کی حکومت زمانہ ماضی میں اس مسئلے کی حمایت میں بڑی جذبہ آہنگ اور محکم رہی ہے۔ میں مسٹر جیسپ (MR JESSUP) کے بیانات میں سے بعض اقتباسات چھوڑتا ہوں اور اس اقتباس پر آتا ہوں جو میرے ذخیرے کا آخری اقتباس ہے۔ یہ مسٹر وارن آسٹن کے بیان سے ماخوذ ہے جو اس شکایت کے سلسلے میں دیا گیا تھا کہ حکومت ایران عالمی بین الاقوامی عدالت کی مؤقت تجاویز پر عمل کرنے میں ناکام رہی۔ موصوف نے فرمایا۔

> "اقوام متحدہ اصولاً کسی ملک کے داخلی معاملات میں دخل دینے کا حق نہیں رکھتی تاہم دخل دینے سے انکار اس وقت پیش نظر آ سکتا ہے۔ جب ایجنڈا منظور کر لیا جائے اور اس پیش کردہ معاملے

پر فیصلہ صادر ہو جانے سے یہ معاملہ پیش نہیں ہو سکتا۔ الا یہ کہ اقدام کے متعلق وجوہ موجود ہوں۔

تاہم یہی دلائل جن سے متعدد وفود نے اختیار کی بحث اس موقع پر ہمارے نقطۂ نگاہ کو قبول کرنے کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اختیار کے معاملے کی طرف اشارہ کئے گئے ہیں۔ اگرچہ یہاں پر بحث نہیں کی گئی۔ بعض نمائندوں نے کہا اب تک اس مسئلے کو ایجنڈے پر لانے کی رضامندی نہ دی جائے گی وہ کونسل کے اختیار یا عدم اختیار کی بحث میں نہیں پڑیں گے۔

اس طرح امریکہ نے حالیہ سال تک واضح روش پر قائم رہنے کے بعد اپنی پالیسی بالکل بدل لی۔ مجھے اعتراف کرنا چاہئے کہ یہ طرز عمل ہمارے لئے سخت بڑی مایوسی کا باعث ہوا۔ اس تبدیلی کے ابتدائی آثار گزشتہ موسم خزاں میں جنرل اسمبلی کے اجلاس پیرس کے دوران نمایاں ہو چکے تھے۔ اس اجلاس میں مراکش کا مسئلہ پیش ہوا تو امریکہ نے جنرل اسمبلی کے ایجنڈے میں شامل کرنے سے اختلاف کا فیصلہ کیا۔ جب اس معاملے میں امریکہ کے انکار اور طرز عمل کی سرگزشت کا علم تھا ہم نے محسوس کیا کہ امریکہ کے اس ماننے سے ایک حقیقت کا اعتراف ہے جو اس نے اپنے لئے چن رکھا ہے۔ مسٹر پریذیڈنٹ ہم یہ سمجھتے ہوئے خوش تھے ۔۔۔ اور اس کے نتیجے امریکہ کے وفد کو انتہائی تحسین کا مستحق سمجھنا چاہئے ــــ کہ امریکہ نے کسی بھی معاملے کو ایجنڈے میں شامل کرنے کی کبھی مخالفت نہیں کی۔ اگرچہ اس میں خود امریکہ پر کوشش یا الزامات کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اسی سرگزشت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم نے یہ سمجھا کہ مسئلہ مراکش کے متعلق امریکہ کے ووٹ کو ایک منفرد مثال سمجھنا چاہئے۔ تاہم بہت سی مصلحتیں پیش نظر تھیں جو مسئلہ مراکش کے متعلق امریکہ کے ووٹ پر اثر انداز ہوئیں لیکن پیش نظر مسئلے کو کسی مصلحت سے کوئی تعلق نہیں۔ شاید ایک مصلحت یہ تھی کہ ہمارا اجلاس پیرس میں ہو رہا تھا جو نمائندے یہاں تشریف فرما ہیں انہیں یاد ہوگا کہ فرانس کے وزیر خارجہ نے جو تقریر کی تھی ویسی عجیب و غریب تقریر اقوام متحدہ میں کبھی نہیں سنی گئی۔ اس نے مقام تقریر پر پہنچ کر اسمبلی سے درخواست کی کہ مسئلہ مراکش کو ایجنڈے میں شامل کرنے سے متعلق ووٹ دینے سے احتراز کیا جائے اس لئے کہ دوسرے معاملات کے علاوہ اسمبلی اس وقت فرانس کی مہمان ہے۔ یہ امر مضحکہ خیز ہے کہ جو وفود اس موقع پر موجود تھے ان میں سے متعدد نے اس مروت اور خوش خلقی کو اپنے اوپر لازم کر لیا جس کے متعلق وزیر خارجہ فرانس نے یاد دہانی کی تھی۔ اس قسم کی مروت اور خوش خلقی پر کار جدید دنیا میں آج بھی مزید حوصلہ افزائی کی موجب ہوتی۔ اگر لاکھوں مراکشیوں کی زندگی اور آزادی معرض خطر میں نہ ہوتی۔ جس طرح آج لاکھوں تیونسیوں کی زندگی معرض خطر میں ہے۔

آج ہم کس کے مہمان ہیں کہ وہی روش اختیار کرنے پر مجبور ہوں جو پیرس میں اختیار کی گئی تھی؟ یہی وجہ ہے کہ آج امریکہ کا ووٹ سے احتراز پیرس میں ووٹ سے احتراز کے مقابلے میں زیادہ قابل توجہ ہے۔ ہم اس احتراز کا ماتم کرتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اپنے امریکی دوستوں اور امریکی وفد کے دوستوں کو یاد دلانا میرا کام نہیں۔ کہ ان کا فیصلہ دنیا بھر میں آزادی فکر و خیال کے حامی عناصر کی بہت بڑی تعداد کے لئے باعث شک ہوگا۔ ہم جانتے ہیں کہ حفاظتی کونسل کے گزشتہ اجلاس سے اب تک یہ مسئلہ بہت سے ملکوں کے باشندوں پر اثر انداز ہوتا رہا ہے۔ ہر جگہ دلوں کو ٹٹولنے کے بعد اس پر گہرا غور و خوض ہوا۔ میں کسی ملک کے کسی آزاد خیال اخبار سے آگاہ نہیں۔ جس نے یہ موقف اختیار کیا ہو کہ اس مسئلے پر بحث کا دروازہ بند کر دینا کوئی اچھی پالیسی ہوگی۔ اور امریکہ بھی ان ملکوں میں شامل ہے۔ مجھے یقین ہے کہ امریکہ کی حکومت نے خطرات کا پوری طرح محاسبہ و موازنہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہوگا۔ وہ اور یہ گروہ ممبر جو اس شکایت کو حفاظتی کونسل میں لائے ــــ محض ہمیں نہیں بلکہ آج کی تمام آزادی پسند قومیں ــ کشیدگی اور تناؤ کے اس دور میں زیادہ سے زیادہ اور وسیع سے وسیع اتحاد پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں۔ دنیا کو مصائب سے بچانے کا یہی ایک طریقہ ہے میں امید کرتا ہوں کہ امریکہ کی خاطر، ہماری اپنی خاطر اور امن و آزادی سے محبت رکھنے والے تمام ملکوں اور جماعتوں کی خاطر اس امر کا پورا خیال رکھا جائے گا کہ امریکہ کا یہ فعل اصل مقصد کی تلاش میں کوئی مزید رکاوٹ ثابت نہ ہو۔

میں صرف یہ اندازہ لگا سکتا ہوں کہ اس وقت تک ایک [illegible] عمل اختیار کر چکنے کے بعد وہ ایک [illegible] کے برعکس ہو۔ بہرحال ایک اس معاملے میں کہ [illegible] معمول تاریخ امریکہ کے بہترین دوست بھی دنیا کے سامنے پیش نہ کر سکیں گے۔ یہ تو تقریباً ایسا ہی معاملہ ہے کہ [illegible] ایک مرتبہ پر [illegible] رکھ لے اور پھر چلتے چلتے اچانک اپنے رخ کا مرکز [illegible] فیصلہ دیا۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اس طرز عمل کے نتائج کیا ہوں گے [illegible] تاہم میں [illegible] انہوں نے اپنے بیان میں بہت سے حوالے [illegible] انہوں نے طاقت و صداقت کے استعمال کی مذمت کی [illegible] آئینی [illegible] محدود [illegible] میں فرانسیسیوں کو شامل کر لیا گیا۔ امریکی وفد کے اصحاب خوب جانتے ہیں کہ طاقت و صداقت کے [illegible] تیونسیوں کے [illegible] حالت [illegible] سے زیادہ کیا جا سکتا ہے تیونسیوں کا [illegible] ان کے لئے [illegible] مطلب سمجھتا ہوں [illegible] طاقت استعمال کرنے سے متعلق فرانس [illegible] مستقل [illegible] قائم رکھنے کا [illegible] صورت حال کے خلاف بیدار نہ کیا جائے گا فرانسیسی [illegible] سکتے ہیں [illegible] استعمال نہیں [illegible] جب حالت یہ ہے تو [illegible] کوئی شخص [illegible] اس میں بھی پھر نہیں سکتا؟

لہٰذا میں جو [illegible] ان الفاظ کا خیر مقدم کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ [illegible] ان کا خیر مقدم کریں گے [illegible] جب پہلی دفعہ امریکہ سے امداد کی اپیل کی گئی تو [illegible] لوگ یہ حقیقت فراموش کر چکے ہیں [illegible] انقلاب برپا ہو گئے ہوتے [illegible] لوگ بھول رہے ہیں [illegible] اس معاملے پر کل آج اور کل [illegible] جب یہ [illegible] مجھے یقین ہے ان کی [illegible] نہ کھیں گے۔

امریکی مندوب نے آخری جملے سے بھی اس [illegible] تسلیم [illegible] کرنے کی کوشش کی ہے [illegible] ممکن ہو گا [illegible] امریکہ [illegible] دینے سے احتراز کر رہا ہے جب پیرس کے اجلاس میں [illegible] اس وقت بھی یہی جملہ استعمال کیا تھا اس وقت کہا گیا تھا [illegible] دینے سے احتراز کرتے ہیں۔ آج امریکہ نے اس مرتبہ یہ جملہ استعمال کیا ہے

یہ [illegible] معلوم ہے کہ [illegible] الفاظ محض لیپ پوت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ اس جملے کو کسی قدر [illegible] ایسی جگہ رکھا جہاں [illegible] زیادہ زور کے ساتھ کہے کہ [illegible] مقصود ہوں [illegible] پیدا کر آتا ہے [illegible] کے دل میں ابھی قلبی تحفظات باقی ہیں۔

[illegible] اس جملے کے استعمال کو [illegible] بڑے معنی نہ پہنا دیں گے میں کہتا ہوں کہ اس جملے کی تعبیر کا بہترین طریقہ یہ ہو گا کہ امریکی ضمیر کی ایک چھوٹی سی کرن وقتاً فوقتاً [illegible] پالیسی کے دھندلکے سے پھوٹ کر [illegible] رہی ہے۔ اس فائدے سے ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ وہ وقت نہ آئے گا جب انہیں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی پابندیٔ قول و عہد نہ کرنے کا طعنہ دینا پڑے گا۔ مجھے یہ بھی امید ہے کہ ساری ناکامی اہل تیونس کی ناکامی نہ ہو گی۔

مجھے ایک چھوٹی سی بات اور کہنا ہے جس پر میری تقریر کا یہ حصہ ختم ہو جائے گا۔

ہم اس معاملے میں فرانس کے مفاد کی مخالفت نہیں کر رہے ہیں ہم ہمدردی کے ان زبردست روابط سے بے خبر ہیں جو جھگڑے کے دوسری جانب بیٹھے ہوئے مختلف ملکوں کے درمیان قائم ہیں۔ ہم فرانس کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم نے [illegible] کی شمالی تجاویز کا ہمیشہ احترام کیا۔ [illegible] آلام کے دور میں ہمیں اس کے ساتھ گہری ہمدردی رہی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ وہ ہمدردی ابھی تک ختم نہیں ہوئی اور ہم مستقبل میں [illegible] کے لئے امن و خوشحالی کے آرزومند ہیں۔

تاہم، ہم نے یہ مسئلہ اس لئے اٹھایا کہ ہم بصمیم قلب یقین رکھتے ہیں فرانس کے مفاد کا تقاضا اہل تیونس کے حقیقی نمائندوں سے پرامن مفاہمت میں ہے ان پہلوؤں [illegible] مفاہمت نہیں جنہیں خود فرانس [illegible] مسٹر ڈی ہاٹ کلاک (MR. DE HAUTECLOCQUE)

(ریذیڈنٹ جنرل) اس وقت انتہائی سرگرمی سے تاش کے پتے پھینٹنے میں مشغول ہیں۔ انہیں امید ہے کہ چاروں یکے کسی وقت بھی ان کے (ہاتھ) آ جائیں گے۔ لیکن افسوس کہ جن چاروں یکوں کی وہ امید لگائے بیٹھے ہیں انہیں مسٹر ڈی ہاٹ کلوک نے نیچے ڈال دیا ہے۔

فرانس کے ارباب بست وکشاد غالباً یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ انہوں نے ہمارے ساتھ —— ان گیارہ قوموں کے ساتھ جو اس مسئلہ کو حفاظتی کونسل میں لائیں —— شطرنج کی بازی لگا رکھی ہے اور انہیں جلد سے جلد چال چل جانی چاہیے ورنہ کوئی خوفناک واقعہ رونما ہو جائے گا۔ یہاں ہم شطرنج نہیں کھیل رہے اگر ایسا ہوتا تو ہم یہ شکایات رسمی مستعدی سے بہت پہلے پیش کر دیتے اور فرانس کو یہ پیش کرنے کا موقع نہ دیتا کہ پہلے اہل تونس کے ساتھ بات چیت جاری کر رکھی ہے یہ معاملہ آج یا کل شکایات پیش کرنے کا نہیں۔ اگر مسٹر ڈی ہاٹ کلوک اپنی آستین سے کابینہ وزارت نکال کر پیش کر دیں تو وہ اپنے سوا شاید کسی آدمی کو مطمئن نہ کر سکیں گے۔ وہ ہمیں مات دینے کی کوشش نہیں کر رہے۔ اگر ایسا ہے تو انہیں اس سے کوئی فائدہ نہ پہنچے گا۔ وہ ہم سے جنگ نہیں کر رہے۔ اور ہماری ان سے کوئی لڑائی نہیں۔ وہ تاریخ سے جنگ کر رہے ہیں اور اگر وہ واقعات کی رفتار سے مرتب نتیجہ لینا پسند کریں گے ورنہ برابر ناکام رہیں گے۔

لہٰذا میں تونس کے فرانسیسی ارباب بست وکشاد سے التجا کرتا ہوں کہ وہ جان لیں یہ ہمارے ساتھ شطرنج کھیلنے اور تیز تیز چالیں چل کر ہمیں مات دینے کی کوشش کا موقع نہیں۔ یہ ایسا معاملہ نہیں کہ امریکہ کے جریدے نیشن کے الفاظ میں: حیرتناک تیز رفتاری سے وزارتیں بنا دینے سے حل ہو جائے گا۔ یہ معاملہ ٹھنڈی مفاہمت کا متقاضی ہے اس کا تجزیہ ٹھنڈے دل سے کرنا چاہیے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ انجام کار میرے دوست نمائندہ امریکہ کے الفاظ میں عوام کا ارادہ اور عزم ہی کارگر رہے گا۔

ہم فرانس کے مفاد کی مخالفت نہیں کر رہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خود فرانس کے ارباب بست وکشاد اپنے وطن کے مفاد کی مخالفت میں سرگرم عمل ہیں۔ وہ ان مٹھی بھر فرانسیسی آباد کاروں کے مفاد کی حفاظت میں مصروف ہیں۔ جنہوں نے تونس میں صد درجہ وسیع مراعات حاصل کر رکھی ہیں اور پیرس کے سیاسی حلقے ان کی حمایت میں صد درجہ پرزور اور گرم جوش ہیں۔ فرانس میں بھی آزاد خیال لوگوں کا خاصا بڑا گروہ ہے جس نے تونس کی موجودہ صورت حال کو ذلت خیز قرار دیا۔ فرانس آزادی کی عظیم الشان روایات کا حامل ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ تونس کے ڈیڑھ لاکھ فرانسیسی آباد کار ان روایات کی درخشانی کو مدھم کر سکیں گے۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے ان روایات کو پس پشت ڈالنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں لیکن ہمیشہ کے لیے ایسا نہیں کر سکتے۔

لہٰذا اگرچہ ہم پندرہ قومیں —— پانچ جو حفاظتی کونسل کی رکن ہیں اور جنہیں اس معاملے میں ووٹ دینے کا حق ہے اور دس ہم جو حفاظتی کونسل سے باہر ہیں اور ووٹ کی مجاز نہیں —— ہم اس کام میں ناکام ہو چکے ہیں جسے اپنا فرض سمجھ کر اٹھایا تھا۔ تو آئیں ہمیں شکست دے رہی ہیں۔ دنیا خود بخود ان واقعات سے صحیح نتائج اخذ کرے گی۔

سوال یہ ہے کہ اس غم ناک صورت حال کے مداوا کی موجودہ مرحلے پر کیا صورت ہے؟ کیا کوئی ایسی چیز باقی ہے جس پر عمل پیرا ہو کر ہم بحیثیت اقوام متحدہ اپنی عزت ایک حد تک بچا سکتے ہیں؟ اگر حفاظتی کونسل اس مسئلے کو مسترد کر دینے پر تلی بیٹھی ہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ پیش نظر خطوط کے مطابق کوئی چارہ کار باقی نہیں رہا۔ صرف ایک چھوٹا سا کام شاید باقی ہے، جس پر حفاظتی کونسل مناسب سمجھے تو راضی ہو سکتی ہے۔

جن گیارہ قوموں نے یہ مسئلہ اٹھایا تھا انہوں نے دفعہ ۳۵ کے ماتحت درخواست کی تھی کہ حفاظتی کونسل اس معاملے کو پیش کرنے کی اجازت دے۔ وہ موقع جس کے بھروسے پر ابتدائی درخواست پیش کی گئی تھی اس وقت تک نہیں آ سکتا۔ جب تک یہ معاملہ ایجنڈے پر نہ آ جائے ہماری درخواست اس وقت رد ہو جائے گی جب ووٹ لے جائیں گے۔

اندریں اثنا طریقِ کار کی بحث کے دوران میں ہماری ہتک کی گئی۔ دس قومیں جو حفاظتی کونسل سے باہر ہیں۔ اور ایک قوم جو کونسل کی ممبر ہے ان گیارہ قوموں نے بین الاقوامی امن کی خاطر یہ مسئلہ اٹھایا تھا۔ یہ سب فرانسیسی رفیق نے بڑی شستگی سے۔ اس نے ہم پر الزام لگایا کہ ہم باتیں بنانے سے ان کو مدد پہنچانا چاہتے تھے جن کا مقصد حاصل کرنا ہم میں سے بعض پر دنیا اعتماد نہیں رکھتا جیسا وہ سرحد پر رکھتا ہے لیکن یہ زیادہ سے زیادہ وہ ایک آزاد ملک کا معاملہ سامنے لا رہے ہیں کہ تیونس کے دل میں پروپیگنڈے کی کوئی غرض ہو سکتی تھی جب وہ اس مسئلے کو حفاظتی کونسل میں لانے پر آمادہ ہوا تو نمائندہ فرانس نے ان دنوں ان کی مؤثر طور پر حفاظتی کونسل میں تصویر کھینچی جب طریقِ کار پر بحث ہو رہی تھی اور اس مسئلے کو ایجنڈے پر لانے کے بارے میں غور و خوض کیا جا رہا تھا۔ یہ مقابلین تھی فیصلہ کن رہ گیا تھا۔ اس کے بعد دس قوموں اور ان کے نمائندوں نے درخواست پیش کی کہ انہیں تمام کارروائی جاری رکھنے کے لئے مقدر ہو چکی ہے تو کم از کم ہمیں اتنا موقع دیا جائے کہ اخلاقی حق سے محروم نہ کیا جائے ہم پر الزامات لگائے گئے ان کے جوابات کا ہمارے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں۔ ہم اقوام متحدہ کے تمام مباحث کے دوران میں اصولوں کے علاوہ جواب کا حق اس طرح تسلیم کر چکے ہیں جسے قطعاً نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ شاید حفاظتی کونسل مسئلہ تیونس پر بحث سے محروم رہ گیا دس قوموں کی درخواست کو مسترد کر کے کم از کم تلافی کا ایک حد مزید پیدا کر سکے اور دس قوموں کو کونسل کی میز پر بلائے تاکہ وہ دفاع کر سکیں۔ یہ کہنا ہے اور ان ممالک ہی تاکہ ان کے سنگین الزامات کا مفصل جواب دے سکیں جو فرانسیسی نمائندے نے گزشتہ جمعہ کے اجلاس میں ہم سے خلاف عائد کئے۔ اس وجہ سے نتیجہ میری تجویز یہ ہے کہ زیرِ غور مسئلے کے بارے میں فیصلے سے پیشتر آپ حفاظتی کونسل کی حیثیت میں ان دس ملکوں کو دعوت دینی چاہئے جنہوں نے آج کونسل کی خدمت میں تحریر پیش کی ہے۔ اور جن کے خطوط میں بحث کے آغاز میں پڑھ کر سنا چکا ہوں دعوت یہ ہو کہ وہ حفاظتی کونسل میں آئیں اور ان الزامات کے جواب کا اخلاقی حق استعمال کریں جو نمائندہ فرانس نے ان کے خلاف استعمال کئے۔

پاکستان کے نمائندے کی حیثیت میں میرا بیان یہاں ختم ہوتا ہے۔

---

③

اس بیان کا متن جو پروفیسر احمد شاہ بخاری نے حفاظتی کونسل میں ۱۴ اپریل ۱۹۵۲ء کو دیا

مسئلہ تیونس کو ایجنڈے پر لانے کے حق میں پاکستان نے جو ووٹ دیا ہے اس کے ضمن میں ضروری تشریحات کی غرض سے میں مندرجہ ذیل بیان دینے کا خواہاں ہوں۔

سال رواں کے قریباً آغاز ہی سے تیونس میں شدید بے چینی جاری ہے۔ قتل، تشدد، آتش باری، اور وسیع پیمانے پر گرفتاریوں کی خبریں دنیا بھر کے اخباروں میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ میری حکومت نیز اقوام متحدہ کے رکن ملکوں میں سے دس اور حکومتوں کے نزدیک یہ صورت حال بے حد تشویش ناک ہے۔ ہمارا قطعی یقین ہے کہ گزشتہ تین ماہ یا اس سے کسی قدر زیادہ مدت کے اندر تیونس میں جو دردناک حالات پیش آئے انہیں محض مقامی ہنگامے قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ شہریوں میں کچھ فساد ہوا یا معمولی امن شکنی کے واقعات پیش آئے جسے روکنے کے لئے نظم و قانون کے محکمے کو عام اقدامات کرنے پڑے جن لوگوں کے ہاتھوں یہ واقعات رونما ہوئے ان کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ فریقین کے احمق یا بدکردار لوگ تھے۔ اس صورت حال کی جڑیں ماضی میں چلی گئی ہیں۔ فی الحال توازن بڑی ہی نازک حالت میں ہے اور مستقبل کے دامن میں ناخوشگوار واقعات ہی نظر آ رہے ہیں۔ اس لئے ہمارے نقطۂ نگاہ سے یہ صورت حال بین الاقوامی امن و سلامتی کے لئے ایک شدید خطرہ بنی ہوئی ہے۔ میں اجازت چاہتا ہوں کہ اپنے نقطۂ

اور منظور نظر کی توضیح و جواز کے لئے اس کے متعلق مزید کچھ عرض کروں۔

فرانسیسی حکام اور اہل تونیسیہ کی حکومت کے درمیان جس کشمکش نے حال میں ساری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے یہ اس کشمکش کا محض تازہ ترین منظر ہے جو ستر سال سے جاری ہے۔

فرانس نے ۱۸۸۱ء میں تونیسیہ پر قبضہ جمایا تھا۔ جب کہ ایک فرانسیسی فوج (مورخ کے بیان کے مطابق) الجزائر سے اس بہانے تونیسیہ میں داخل ہوئی تھی کہ ایک قبیلے کو سزا دینی منظور تھی۔ داخل ہوتے ہی اس فوج نے نہایت تیزی سے دارالحکومت کی طرف پیش قدمی شروع کر دی اور حاکم تونیسیہ کو فرانس کی اطاعت قبول کر لینے پر مجبور کر دیا۔

اسی سال معاہدۂ باردو طے پایا۔ یہ معاہدہ اپنی عمومی وضع میں ان معاہدوں کے عین مطابق تھا جو استعمار کے دور عروج میں طاقت ور اور ناتوانوں کے درمیان ہوتے رہے۔ معاہدہ کی تمہید میں مرقوم ہے کہ فریقین دوستی اور حسن ہمسائیگی کے روابط کو مستحکم بنانے کے آرزومند ہیں جو ان دو حکومتوں کے درمیان عرصے سے چلے آتے ہیں۔ اس معاہدے کی دفعہ ۲ میں بتایا گیا ہے کہ فرانس کا فوجی قبضہ اسی وقت ختم ہو جائے گا جب فرانس اور تونیسیہ کے حکمران اس امر پر متفق ہو جائیں گے کہ مقامی انتظامیہ قیام امن بحال رکھنے کے قابل ہے۔

یہ دوستی معاہدہ جس کا مدعا یہ تھا کہ نظم و قانون بحال رہے بدستور اب تک قائم ہے اور اس کی کڑیوں میں ڈھیل کا کوئی نشان نظر نہیں آتا۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ تونیسیہ پر فرانس کی گرفت بار بار سخت سے سخت تر ہوتی گئی۔

فرانس کو تونیسیہ میں قدم جمائے دو سال ہو چکے تھے جب ۱۸۸۳ء میں ایک کنونشن پر دستخط ہوئے جو لامارسا (LA MARSA) کی کنونشن کہلاتی ہے۔ اس میں پہلی مرتبہ تونیسیہ کے لئے "زیر حمایت علاقہ" کا جملہ استعمال ہوا تاہم اس سے اس ابتدائی معاہدے کی بنیادی حیثیت میں کوئی تبدیلی ہوئی اور نہ اسے بدلا گیا جو دو حکومتوں کے درمیان ہو چکی تھی۔ اس کا مفاد یہی تھا کہ دو حکومتوں کے درمیان تعاون رہے گا۔ یہ نہ تھا کہ فرانس انتظامیہ کا براہ راست ذمہ دار ہوگا۔ تاہم عملاً یہ تونیسیہ کی محکومی کا آغاز تھا کیونکہ اس کے بعد صدر جمہوریہ فرانس نے یک طرفہ حکم جاری کر کے پہلے حکمران تونیسیہ سے اس کے تمام اختیارات اپنے قبضے میں لے لئے پھر بہت جلد بعد یک طرفہ حکمناموں کے ذریعے تونیسیہ میں فرانسیسی ریذیڈنٹ کے اختیارات اور بھی مستحکم کر دیے اور یہ نمائندہ بطور خود تونیسیہ میں فرانسیسی جمہوریت کے اختیارات کا تحویل دار بن گیا۔

کسی علاقے کو زیر حمایت لے لینے کی وجہ جواز یہ پیش کی جاتی ہے کہ پس ماندہ اقوام کو خود اختیاری حکومت کے راستے پر چلایا جائے لیکن تونیسیہ کے متعلق میں اس کے برعکس عمل ہوا یعنی اس آزاد ملک کو آہستہ آہستہ آزادی سے محروم کر دیا گیا۔ اس کی سیادت اور برتری کا خاتمہ کر دی گئی۔ اور جو خود مختاری اسے ایک صدی بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت سے حاصل تھی وہ غیر ملکی اقتدار میں بدل دی گئی۔

پھر تونیسیہ میں فرانسیسیوں کو آباد کرنے کا مسلک اختیار کیا گیا۔ ان آبادکاروں کو زمینیں بھی دی گئیں۔ اور مالی امداد سے بھی نوازا گیا۔ تونیسیہ کے نظم و نسق میں فرانسیسی کارندوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ بہترین زمینیں ان آبادکاروں کے ہاتھوں میں جا چکی ہیں جو براہ راست فرانس سے آئے تھے یا ماضی قریب میں انہیں تونیسیہ میں قومی حقوق مل گئے۔ ہزاروں ایکڑ زمین کو خواہ مخواہ جنگلات قرار دے کر حکومت قابض ہو گئی۔ ایک اور قانون کے ذریعے ان تمام جنگلات کی حد بندی کر کے خاص آبادکاروں کے فائدے کے لئے از سر نو تقسیم کر دیا گیا۔ تونیسیہ کی آبادی پینتیس لاکھ کے قریب ہے ان کے مقابلے میں فرانسیسی صرف ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہیں۔ تیس ہزار چھوٹے بڑے افسر ملک کا نظم و نسق سنبھالے بیٹھے ہیں گویا ایک سو باشندوں کی ہر جماعت کے لئے ایک افسر مقرر ہے ان افسروں میں سے تین چوتھائی فرانسیسی ہیں تعلیم پر نظر ڈالی جائے تو مدرسوں میں جانے والے تونیسی طلبہ کا تناسب ۱۱ فیصد ہے اس کے مقابلے میں فرانسیسی

شہر کا نام ۔۔ تونیسیہ

سب پر مستزاد یہ کہ فرانس کی طرف سے جو ریذیڈنٹ تونیسیہ میں مقرر ہے اس نے حکمراں کے تمام اختیارات غصب کر لئے ہیں اور اس غریب کی حکمرانی کا احساس قائم رکھنے کے لئے محض اس کی مہر استعمال کی جاتی ہے۔ تونیسیہ کے باشندوں کی کوئی قانون ساز مجلس یا پارلیمنٹ نہیں جس کے ممبر رائے عامہ سے منتخب ہوئے ہوں اور جسے کم از کم داخلی معاملات کے متعلق ہی قانون بنانے کا اختیار ہو اگرچہ چار وزیر مقرر کر دیے گئے ہیں تاہم احکام نافذ کرنے کا کل اختیار فرانسیسی افسروں کے ہاتھ میں ہے۔ اہلِ تونیسیہ نے فرانسیسی استبداد کو کبھی بطیبِ خاطر قبول نہیں کیا۔

موجودہ صدی کے آغاز سے تونیسیہ کی قومی تحریک میں زیادہ سے زیادہ قوت و حرکت پیدا ہو گئی اور اس نے وہی شکل اختیار کر لی جو دنیا کے دوسرے حصوں کی محکوم اقوام نے دورِ حاضر کی سیاسی فضا میں اختیار کر رکھی ہے۔ یعنی وہ بیدار ہوئے تو آزادی کے لئے جدوجہد شروع کر دی اور بعض حالتوں میں اب تک اجنبی اقتدار اور لوٹ مار کے خلاف سعی و کاوش میں لگے ہوئے ہیں

اہلِ تونیسیہ کو بھی وہی مشکلات پیش آئیں جو دوسرے لوگوں کو پیش آ چکی ہیں۔ یعنی جن اجنبیوں نے وسیع وسائلِ ملک پر قبضہ کر رکھا ہے ان کی طرف سے مخالفت اور استعماری طاقت کی طرف سے قوت کا کڑا و اندھا دھند استعمال قوم پرست لیڈر پے در پے یا تو جیلوں میں ٹھونس دیے گئے یا جلاوطنی پر مجبور ہو گئے۔ اور یہ تمام لوگ بصیرت اور دانش و ہمت کے مالک تھے۔ ان میں سے بعض جلاوطنی ہی میں وفات پا چکے ہیں تاہم عارضی پسپائیوں کے باوجود تحریک برابر ترقی کرتی گئی۔ پہلی جنگِ عظیم اور پریذیڈنٹ ولسن کے چودہ نکات کے بعد اہلِ تونیسیہ کے دل نئی امیدوں کی روشنی سے چمک اٹھے۔ جریدہ اکانومسٹ (ECONOMIST) کے بیان کے مطابق عین اسی وقت فرانسیسی حکومت نے اپنے شہروں اور چھوٹے چھوٹے آبادکاروں کی تعداد بڑھانے کا منصوبہ شروع کر دیا اور فرانس کے سیاسی گروہ مختلف فریقوں کی حمایت میں لگ گئے۔ بعض سیاست دان بائیں بازو کی ترقی پسند جماعت "نو دستور" کے ساتھ ہو لئے۔ بعض نے آبادکاروں کی پشتی بانی اختیار کر لی۔

پیرس میں حکومتیں بدلتی رہیں۔ ہر حکومت کی ظاہری حیثیت کے ساتھ اہلِ تونیسیہ کی امیدوں اور آرزوؤں میں بھی نشیب و فراز کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۳۸ء میں ایک طرف نو دستور پارٹی صد درجہ مایوس ہو گئی۔ اور اس نے آخری فیصلے کا ارادہ کر لیا۔ دوسری طرف آبادکاروں کے حامی فرانسیسی حکام کارروائی کرنے کو تیار ہو گئے۔ اس طرح وسیع پیمانے پر کشمکش کا اکھاڑہ قائم ہو گیا۔ تقریباً ایک ہزار قوم پرور جیلوں میں ڈال دیے گئے۔ فرانسیسی حکام نے اعلان کر دیا کہ تونیسیہ میں محاصرے کی صورت پیدا ہو چکی ہے۔ ہماری اطلاعات کے مطابق یہ صورتِ حال ابھی تک ختم نہیں ہوئی اگرچہ چودہ سال کے طویل و دشوار گذر چکے ہیں۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ تونیسیہ میں فرانس کا نظم و نسق نظرِ ثانی کا محتاج ہے۔ حق یہ ہے کہ یہ نظم و نسق نہ تو دو حکومتوں کے درمیان معاہدوں کی بنا پر جائز تھا نہ اسے انصاف و آزادی کے اصول کی بنا پر حق بجانب ثابت کیا جا سکتا تھا۔ میں یہاں پھر جریدہ اکانومسٹ سے اقتباس پیش کرتا ہوں۔ جریدۂ مذکور رقمطراز ہے:۔

> "جس حکومت کو بدلنے پر وہ (تونیسی اور فرانسیسی) اصرار کر رہے تھے اس کے اجزائے ترکیبی اس وقت یہ تھے۔ بے (حکمران) ایک کابینہ کے ذریعے سے حکومت کا کاروبار چلاتا تھا جس میں سات فرانسیسی اور چھ تونیسی شامل تھے۔ لیکن اس کابینہ کے فیصلوں کو اوپر بھیجنے سے پیشتر ایک فرانسیسی کی توثیق لازم تھی۔ کابینہ کو معاشی اور مالی معاملات میں مشورے دینے کے لئے دو بڑی منتخب کونسلیں مقرر

کردی گئی تھیں، جن کے ارکان کی تعداد یکساں تھی۔ ایک تونیسیوں پر مشتمل تھی اور دوسری فرانسیسیوں پر لیکن ان کونسلوں کی حیثیت محض مشیروں کی سی تھی۔ اصل گورنمنٹ بنانے میں تونیسیوں کے ۱۲ سے کردی گئی تھی۔ عملاً پورا اقتدار فرانسیسیوں کے ہاتھ میں تھا۔ اس لئے کہ ایک فرانسیسی افسر تمام اجلاسوں کی صدارت کرتا تھا حکمران تونیسیہ کے ہر حکم پر کسی فرانسیسی کے دستخط بھی ضروری تھے۔ سب سے آخر میں اس لئے کہ جن فرانسیسیوں کے ہاتھ میں عام ملی اختیارات تھے وہ بلدی اور دیہاتی اداروں کے بھی نگران مطلق تھے۔

۱۹۵۰ء کے موسم گرما میں، ۱۹۴۹ء کے واقعات نے اہم نتیجے پیدا کئے۔ فرانسیسی آبادکاروں کے سخت [illegible] کی مخالفت کے باوجود نئے فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل کو ہدایت کی گئی کہ تین بڑی اصلاحات جاری کردی جائیں اور اگر ممکن ہو تو اس بارے میں اہل تونیسیہ کی حمایت حاصل کی جائے۔ اوّل فوراً وزارت از سر نو ترتیب دی جائے۔ دوم سول سروس میں داخلے کی شرطیں تبدیل کردی جائیں تاکہ اہل تونیسیہ بھی مقررہ تعداد میں لئے جاسکیں اور مقابلے کا امتحان ضروری نہ ہو جسے فرانسیسی آبادکار ترجیح دے رہے تھے۔ سوم بلدیاتی خود مختاری جاری کردی جائے۔ اگست ۱۹۵۰ء میں ریذیڈنٹ جنرل نے حکمران کے مشورے کے بعد ایک ایسا قدم اٹھایا جس کی کوئی مثال پہلے موجود نہ تھی۔ اس نے نئی وزارت کی ترکیب کا اعلان کیا جس میں پہلی مرتبہ تونیسیوں اور فرانسیسیوں کی تعداد مساوی رکھی گئی۔ اور اس کی صدارت تونیسی وزیراعظم ایم شینک (M. CHENIK) کے حوالے کی گئی۔ سات تونیسی ارکان مختلف پارٹیوں کے نمائندے تھے۔ صرف کمیونسٹوں اور قدیم دستور پارٹی میں سے کوئی نمائندہ نہ لیا گیا۔ اس لئے کہ آخر الذکر بھی مشرق کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بہرحال نو دستور پارٹی اس کابینہ میں خدمت گزاری پر راضی ہو گئی۔

فروری ۱۹۵۱ء میں تونیسیوں اور فرانسیسیوں نے باہمی رضامندی سے کئی تبدیلیاں کرلیں۔ ایک تبدیلی یہ بھی تھی کہ وزارت جو فیصلے کرے گی انہیں حکمران تک پہنچانے سے پیشتر کسی فرانسیسی کی نفرت انگیز توثیق ضروری نہ ہوگی۔ اب فرانسیسی آبادکاروں کے سامنے اس صورت حال پر غور کے پھر سوال یہ ہے کہ ۱۹۵۱ء میں خرابی کہاں پیدا ہوئی؟ اس کا جواب مختصراً یہ ہے: ماضی قریب میں جو مشکلات پیدا ہوئیں۔ ان کی اصل وجہ یہ ہے کہ نو دستور پارٹی نیز تونیسیوں کی بہت بڑی تعداد ان اصلاحات کو جلد سے جلد کامل خود مختاری حاصل کرنے کی تمہید سمجھتی ہے اس کے برعکس فرانسیسی آبادکاروں کی رائے یہ ہے کہ ان حدود سے آگے پیرس کو ایک قدم بھی نہ بڑھانا چاہیے۔

وزیراعظم تونیسیہ نے ۳۰ مارچ ۱۹۵۱ء کو فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل کے نام ایک خط بھیجا: "موجودہ وزارت اس وجہ سے بہت بے بس ہے کہ جو نیا قدم یہ اٹھانا چاہتی ہے اس میں مسلسل مخالفت ہوتی ہے .... مذاکراتی وزارت کا قیام اس قسم کے دباؤ کا زیادہ دیر تک متحمل نہیں ہو سکتا۔ خاص طور پر اس لئے کہ مہینوں سے یہ وزارت تونیسیہ اور پیرس دونوں مقامات پر فرانسیسیوں کی تحقیر آمیز اور معاندانہ سرگرمیوں کا ہدف بنی ہوئی ہے تونیسیہ اور پیرس میں فرانسیسی نمائندوں کی اکثریت نیز فرانسیسی حکام کی روش اور ان سب کی کوششیں کہ گفت و شنید ناکام ہو جائے ایک کھلے ہوئے راز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ تمام ذرائع استعمال کئے گئے جن کی بنا پر حکومت تونیسیہ اور اسمبلی کے تعاون کو ناممکن بنا دینا منظور تھا۔ مثلاً اجتماعی طور پر استعفے دے دیئے گئے خاص سیاسی نقطہ نگاہ سے قراردادیں پیش کی گئیں۔ وزیراعظم نے قرضوں کے سلسلے میں جو مطالبہ کیا تھا اسے مخلوط مندوبین کے سامنے پیش کر دیا گیا۔"
۲۲ اپریل ۱۹۵۱ء کو وزیراعظم نے پھر ایک تحریر ریذیڈنٹ جنرل کے نام بھیجی جس میں ان تمام کارروائیوں کی تفصیل کھولی گئی جو وزارت سے پہلے اور اس کے بعد اختیار کی گئیں۔ اس میں بڑی مجلس کے فرانسیسی حصے کے استعفے بھی شامل تھے جو فرانسیسی حکومت اور پارلیمنٹ کے بھیجے ہوئے وفدوں کے روبرو پیش کئے

گئے۔ دباؤ کی کارروائیوں کا بھی ذکر تھا۔ علاوہ بریں تار بھیجے گئے، مختلف انتظامی محکموں میں جو فرانسیسی کام کرتے تھے ان کو حاکمانہ شان سے بھی مقرر کر لیا تھا۔ میں ان نازیبا اشاروں کا ذکر نہ کروں گا جن کا مجھے ذاتی طور پر تجربہ ہوا۔ ان گماشتوں کو یا وہاں کے ان حاکموں کو جنہیں میں سراسر بے اعتمادی کہنے کیلئے گیا ہوں ——— البتہ میں آپ کی توجہ ان چند نمایاں واقعات کی طرف مزید منعطف کرانا چاہتا ہوں جن سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ اہل تونیسیہ کی طرف بعض لوگوں کی غلط اندیشی، عداوت اور تونیسیہ میں فرانسیسی مفاد کے عجیب و غریب تصورات کس حد تک وسعت اختیار کر سکتے ہیں، تاہم اب بھی ہر چیز کا مداوا ہو سکتا ہے۔ سمجھوتے کے امکانات موجود ہیں دیانت دارانہ اور خیرخواہانہ گفت و شنید کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ تیونیسیا کے لوگ جن پر عبارت مشتمل ہے پالیسیوں اور دونوں باشندوں کے باوجود گفت و شنید جاری رکھنے کے لیے تیار ہیں اگرچہ بار بار اس میں مداخلت ہوتی رہی۔ اس مداخلت کے ذمہ دار وہ چند لوگ تھے جنہیں سیاسی و انتظامی تعطل ہی میں فائدہ نظر آتا ہے۔“

”دوسرے لفظوں میں ۱۹۵۰ء کی روح ان فرانسیسیوں نے کالعدم کر دی جن کی حیثیتیں تونیسیہ سے وابستہ تھیں۔ تونیسیہ کی وزارت جو اس غرض سے بنائی گئی تھی کہ حکمران اور اہل تونیسیہ کی خود مختاری بحال کرنے کے لیے حکومت فرانس سے گفت و شنید کرے اسے غلط طریق پر محروم اختیارات کیا گیا۔ فرانسیسی آبادکاروں کی سازشوں اور جا بجا مداخلتوں نے وزارت کو بے عمل بنا دیا۔ تونیسی وزیروں کو مسلسل وقت کا نشانہ بننا پڑا۔

یاس و ناامیدی کی یہ فضا تھی جس میں تونیسی وزیر ۱۹۵۱ء کے آخر ہی میں عازم پیرس ہوئے تاکہ حکومت فرانس کو اس کے عہد و پیمان کی یاد دلائیں۔ فرانس کے وزیر خارجہ نے ۱۵ دسمبر ۱۹۵۱ء کو جو جواب دیا اس نے امیدوں کا آئینہ ریزہ ریزہ کر ڈالا۔ اس جواب میں جدید اصلاحات کی مذمت کے سوا اور کوئی چیز تسلیم نہ کی گئی۔ باقی جو کچھ تھا صرف یہ تھا کہ فرانس نے تونیسیہ میں تہذیب کے لیے جو کام کیا اس کی خوب قصیدہ خوانی کی گئی اور بتایا گیا کہ تونیسیہ میں فرانس نے کتنا اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس جواب نے اہل تونیسیہ کو صد درجہ مایوس کر دیا اور دنیا کے مختلف حصوں میں جو لوگ بس رہے تھے ان کے دلوں میں بھی شدید خطرات پیدا ہو گئے۔

۱۹۵۱ء میں ایم رابرٹ شومان (M. ROBERT SCHUMAN) نے کہا کہ ”فرانسیسی یونین کے تمام علاقوں سے ہمارا نصب العین آزادی ہے۔“ اس سے اہل تونیسیہ کے دل مسرور ہو گئے۔ تاہم ۱۵ دسمبر ۱۹۵۱ء کے مکتوب میں یہ اعلان کر کے تاریخ کا رخ بدلنے کی کوشش کی گئی کہ حکومت فرانس موجودہ ادارے (گرانڈ کونسل) میں ترمیم پر بخوشی غور سے تعرض نہیں لیکن اس کے نزدیک ہر ایسی حکومت میں فرانسیسی نمائندگی کے اجزا کی حفاظت سراسر ناگزیر ہے۔“

اس سخت شکنی اور مایوسی سے اہل تونیسیہ کو جو صدمہ پہنچا اسے اس خط سے بہتر الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا جو تونیسی وزیر اعظم نے حالات کی اس اچانک تبدیلی پر حیرت زدہ ہو کر صدر فرانس کو لکھا۔

> ”تونیسیہ میں فرانس کے مفادات کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حکومت تونیسیہ نہ صرف ان مفادات کو تسلیم کرتی ہے بلکہ ان کی حفاظت کی ضمانت دینے کے لیے بھی تیار ہے۔ اور ایسا کرتے ہوئے وہ اہل تونیسیہ کے خیالات کی صحیح ترجمانی کر رہی ہے۔ لیکن ان مفادات کو خواہ وہ کتنے ہی اہم کیوں نہ ہوں، سیاسی حقوق کی صورت اختیار کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی جن کے تحت اہل فرانس کو تونیسیہ کے انتظامی اور نمائندہ اداروں میں دخل دینے کا حق مل جائے ..... جہاں تک فرانس کی طرف سے مالی امداد کا تعلق ہے اس امر کی پوری وضاحت

دونا مزید یہ ہے کہ اس کی حیثیت قرضے کی ہے جس کا اصل اور سود دونوں واجب الادا ہیں، اور جس کے اضافہ جات سالانہ بجٹ میں بسلسلہ قرضہ زیر عنوان "قرضہ تونسیہ" کیے جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس قرضے سے ملک اور عوام کو بحیثیت مجموعی فائدہ پہنچ رہا ہے لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اس امداد سے جو مفادات سب سے زیادہ نفع حاصل کر رہے ہیں وہ قدرتی ذخائر، نقل و حمل کے وسائل، اور بجلی وغیرہ کی تیاری کے سرمایہ دارانہ مراعات ہیں۔ ایسے مفادات میں تونسیوں کا حصہ کم طور پر ہوسکے برائے نام۔ جناب صدر! انصاف گوئی سے یہ کہتے ہوئے بڑا دکھ ہوتا ہے کہ اول تونسیہ پر فرانس کے احسانات کا آج بے انتہا چرچا کیا جاتا ہے لیکن تونسیہ نے آڑے وقت میں فرانس کی جو مدد کی، اسے آنکھیں بند کر کے خاموشی سے ٹال دیا جاتا ہے . . . . . کیا یہ سب کچھ بھلا دیا گیا ہے؟ کیا تونسیہ کو وقتی فرانس کا ہمیشہ کے لیے دست نگر تصور کر لیا گیا ہے؟

اس کے بعد جو کچھ ہوا، اس کا آپ کو علم ہے؟ تونسیہ کے ہر دل عزیز محب وطن رہنما حبیب بورقیبہ (HABIB BOURGUIBA) اور دوسرے قومی لیڈر جنہیں تونسیہ کے عوام عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، ۱۸ جنوری کو گرفتار کر لیے گئے۔ مظاہرات رونما ہوئے، گولیاں برسائی گئیں، جان و مال کا نقصان ہوا، ہزاروں تونسیوں کو اور انجام کار تمام تونسی وزیروں کو جیلوں میں بند کر دیا گیا۔ یہ سب حال ہی کی باتیں ہیں۔

ماضی کے حالات کا مختصر سا جائزہ پیش کرنے سے میری غرض محض یہ ہے کہ کشمکش کے گذشتہ تین مہینوں میں درون حالات جو واقعات رونما ہوئے ہیں ان پر روشنی ڈالی جا سکے۔

میں نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کو سامنے رکھ کر فرانس کے اس دعوے کو کہ وہ امن و قانون بحال کرنا چاہتا ہے اس افسانوی کردار کے شکنجے میں جانچئے جس نے ایک مظلوم کا گلا صرف اس جرم کی پاداش میں شدت کے ساتھ دبایا۔ بار بار دم گھٹنے کے باعث اس کی آنکھیں باہر نکل آئی تھیں۔

یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر میری حکومت تونسیہ کی صورت حال کو محض ایک معمولی مقامی یا داخلی مسئلہ نہیں سمجھتی۔ حکومت فرانس کا یہ کہنا کہ وہ اصلاحات کا نیا منصوبہ رائج کرنا چاہتی ہے ہمارے دلوں میں اطمینان یا اعتماد کس طرح پیدا کر سکتا ہے جب کہ اس نے تونسیہ کے ان تمام قومی لیڈروں کو جیل میں ڈال رکھا ہے جن سے اس قسم کے منصوبوں کے بارے میں بات چیت ہو سکتی ہے؟

تونسیہ سے حال ہی میں جو اطلاعات موصول ہوئی ہیں وہ بہت اضطراب انگیز ہیں۔ نیویارک ہیرلڈ ٹریبیون "تونسیہ کی کابینہ" کے زیر عنوان ایسوسی ایٹڈ پریس کی یہ اطلاع شائع کرتے ہوئے کہ "۱۲ اپریل کو تونسیہ میں نئی کابینہ قائم ہوگئی" لکھتا ہے:۔

> "اس کابینہ کو کوئی قابل ذکر اختیار حاصل نہیں۔ فرانس کی طرف سے اعلان اصلاحات کی جو تقریب قریب ہی قرطاجنہ میں منائی گئی اس میں شریک ہونے والوں نے بیان کیا کہ شمالی افریقہ کے [illegible] علاقے تونسیہ کے برائے نام حکمران بے کے چہرے پر اس وقت تبسم کے کوئی آثار موجود نہ تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے مجبور کر کے یہ کردار ادا کرایا جا رہا ہے۔ فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل ژین ڈی ہاٹی کلاک (JEAN DE HAUTECLOQUE) نے وزارت خارجہ کا عہدہ سنبھال لیا ہے۔ تونسیوں کو اپنے ملک کے دفاع سے بھی سروکار نہ ہوگا۔ بیس ہزار سے زیادہ فرانسیسی

> فرانسیسی حکومت کرتی ہے جن خطوں میں فی الحقیقت عرب باشندے ہیں وہ صرف دست مزدوری کی حالت
> کے میں۔ چنانچہ سال گزشتہ تیونس کے الامین [illegible] اشارہ دیا گیا کہ وہ [illegible] (Mr.
> Baccouche) [illegible] وزیر اعظم قبول کریں۔ [illegible]
> تیونس کو تونسیوں کی نسبت [illegible] خود [illegible] ہو گئے ہیں
> پیرس کے مشیر اعلیٰ [illegible] موجودہ حکومت کو تونسیوں کا [illegible] میں [illegible]
> گیا اور فرانس نے تیونس کی مدد [illegible] میں [illegible]
> [illegible] رہے ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حکومت فرانس پھر ایک بار [illegible] استعمار کی صورت حال کو برقرار رکھنا چاہتی ہے جس میں قوم کے جذبات [illegible] چاہتی ہے تاکہ یہ استعماری طاقت کی [illegible] کے لئے سازگار بنا لئے۔ استعماری طاقت کے لیے [illegible] ان [illegible] سے [illegible] مقامات پر [illegible] دلوں [illegible] کبھی [illegible] دے گا۔

ایک مشہور امریکی رسالے میں ایک مقالہ نگار نے لکھا ہے: "یہ بڑی عجیب بات ہے کہ افریقہ [illegible] ان کے سامنے پیش ہو رہے ہیں جو دنیا کی طاقتوں میں سب سے زیادہ [illegible] اپنی [illegible] سلطنت [illegible] مقالہ نگار کے قول کے مطابق فرانس اس وقت دنیا کی سب سے بڑی استعماری طاقت بنا ہوا ہے [illegible] اور [illegible] میں آباد ہیں جو رقبے میں ریاست ہائے متحدہ سے ڈیڑھ گنا ہے۔ فرانس کے لئے اب بھی [illegible] پالیسی اختیار کرے۔ استعماری نظام کی جگہ تعاون کا نظام رائج کر دے اور مقصد یہ ہو کہ [illegible] اس طرح فرانس تمام دنیا کی [illegible] کے لیے [illegible] کی حیثیت میں [illegible] ہوگا۔"

یہ دست کشی نہ تو موجب شرم ہے اور نہ اسے شکست قرار دینا چاہیے۔ اس لئے کہ اگر اقوام متحدہ کے منشور کے کوئی معنی ہیں تو استعماری طاقتوں کے لیے انجام کار اس سے زیادہ تر روش اور کوئی نہ ہوگی کہ اپنی نوآبادیوں کو چھوڑ جائیں۔ تمام امن دوست قوموں کی دلی خواہش یہی ہے کہ یہ دست کشی امن و نظم کے ساتھ پوری ہوگی۔ اس میں کم سے کم اخلاقی یا جسمانی بربادی کا موقع آئے گا۔ اور یقین ہے ایسی خوشگوار [illegible] باقی رہ جائیں گی جن سے جانب امن کو تقویت پہنچے گی۔

اس مسئلے کو ایجنڈے پر لانے کے سلسلے میں میرے وفد کے مقاصد یہ تھے:۔

۱۔ حفاظتی کونسل کے اثر و رسوخ کو وسیلہ بنا کر تونسیوں کو بے عزتیوں اور پریشانیوں سے بچایا جائے ان کے اموال و نفوس کو تباہی سے محفوظ رکھا جائے ان کے شہری حقوق کو ضائع نہ ہونے دیا جائے اور یہ سب مصیبتیں ان پر اس قصور کی پاداش میں نازل کی جا رہی ہیں کہ انہیں اپنے ملک اور اپنی قومی آزادی سے محبت ہے۔ اس مقصد کو ہمارے نزدیک سب پر تقدم حاصل ہے۔

۲۔ حفاظتی کونسل کے اثر و رسوخ کو وسیلہ بنا کر اس تعطل کو ختم کیا جائے جو فرانسیسیوں اور تونسیوں کے درمیان دوستانہ تعلقات کو تیزی سے برباد کر رہا ہے۔ حالانکہ یہ دوستانہ تعلقات قائم رہنے چاہئیں۔

۳۔ افریقہ اور ایشیا میں عوام کے جذبات بری طرح برانگیختہ ہیں جب یہ دیکھتے ہیں کہ ایک کمزور نہتے یا بے سہارا اور شریف قوم اور ایک بہت بڑی قوی یورپی طاقت کے درمیان خونریز جد و جہد جاری ہے وہ یورپی طاقت در حقیقت آ گئی ہے اور دوسری قوم کے علاقہ پر قبضہ و تصرف رکھنے کے لئے جو کارروائی اختیار کی جا رہی ہے اس کا جواز پیش نہیں کیا جا سکتا۔ باشندگان افریقہ و ایشیا کے جذبات کی برانگیختگی کو جلد سے جلد روکنا ضروری ہے۔

آخر میں اتنا اور کہنا چاہتا ہوں کہ میری حکومت اور میرے ملک کو فرانس کے ساتھ انتہائی محبت ہے اور وہ فرانس کی عظیم الشان آزادی پسندانہ روایات کو عقیدت و احترام کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ پاکستان کے ایک ممتاز روزنامے "ڈان" نے لکھا ہے: "بعض سیاسی مسائل میں ہمیں فرانس کے ساتھ کتنے ہی اختلافات ہوں لیکن ہم فرانس کی انتہائی عزت کرتے ہیں اس لئے کہ وہیں سے حریت، اخوت اور مساوات کے بلند پایہ نعرے اٹھے تھے۔ ہم فرانس کو آزاد دنیا میں اپنا دوست دیکھنے کے آرزومند ہیں۔ اور فرانس و پاکستان کے درمیان تعلقات کو مستحکم کرنے کی ہر ممکن سعی اٹھا نہ رکھیں گے۔"

اگر ان اعلیٰ اصولوں کا علم بلند رکھنے کی کوشش میں جس کا سہرا تاریخ نے فرانس کے سر باندھا ہے میں نے اپنے رفیقوں اور ممتاز نمائندوں کے صبر و تحمل پر زیادہ بوجھ ڈالا ہے تو میں صمیم قلب سے معذرت خواہ ہوں۔

ماڈل جنرل اسمبلی

ذیل میں پاکستان کے مستقل نمائندہ و سفیر [illegible] کی [illegible] تقریر کا متن دیا جاتا ہے جو

انھوں نے برناڈ کالج نیویارک کی ماڈل جنرل اسمبلی کے پہلے اجلاس میں ۷ اپریل ۵۲ء کو فرمائی۔

جناب صدر! سب سے پہلے میں آپ کی اجازت سے رئیس تدریسیات [illegible] پروفیسر میکنٹوش[1] [illegible] پیرسن[2] مسٹر ولیم ہینڈرسن[3] اور مس روتھ شاکٹر[4] کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جن کے حسن اخلاق اور مہمان نوازی کے طفیل مجھے آج شام یہ اعزاز حاصل ہو رہا ہے۔ جب مجھ سے کہا گیا کہ مجھے اقوام متحدہ کی اس ماڈل اسمبلی سے مقرر خصوصی کے طور پر خطاب کرنا ہے تو ایک لمحے کے لئے مجھ پر صورت حال کے ابہام نے تحیر کی کیفیت طاری کر دی۔ مجھے طلبہ و طالبات کا یہ اجتماع جس نے اپنے لئے ماڈل اسمبلی کا نام تجویز کیا ہے، یہ عالم اقوام متحدہ کی اسمبلی کے نمونے پر تیار کرے گی جو دنیا نے [illegible] ۔ سچ ہے یا اقوام متحدہ کی اسمبلی کے متعلق یہ توقع قائم کی گئی ہے کہ وہ [illegible] طرز عمل کو آپ کے نمونے کے مطابق بنائے گی۔ تب یقین ہے [illegible] جو اقوام متحدہ میں ہیں اور یقیناً وہ مقرر بھی جو آج شام آپ سے مخاطب ہے۔ چپ طرز عمل اور طریق کار آپ کے طرز عمل کے نمونے پر ڈھالنا پسند کرے گا۔ مجھے یقین کیجئے کہ اگر ایسا کرنے سے وہ دنیا میں بھی اپنی زندگی سدھار لے گا اور آخرت میں بھی۔

میں یہ پیش گوئی تو نہیں کر سکتا کہ آپ لوگ اس اسمبلی میں جو مسائل طے کریں گے ان کا مداوا کیا ہوگا لیکن؟ [illegible] اسی مثال پر قائم رہے جو اقوام متحدہ میں پیش ہوتی ہے تو میں ایک پیش گوئی کر سکتا ہوں اور وہ یہ کہ آپ کو آپس میں اختلاف رکھنے کی سابقہ پڑے گا اور میں یہ پیش گوئی بھی کر سکتا ہوں کہ ان اختلافات کی بنا پر آپ کبھی کبھار اور شاید بیشتر اوقات اپنے آپ کو شکست سے [illegible] لڑکھڑاتا ہوا بھی پائیں گے پھر آپ کے سامنے بار بار سوال آئے گا کہ آیا یہ تنظیم چل سکتی ہے:

اختلافات کی کئی صورتیں ہوتی ہیں لیکن میں ایک خطے کے لئے فقط دو ہی صورتوں پر زیادہ توجہ کروں گا۔ ان سب سے پہلے اختلاف کی توضیح حاصل سہل ہے اور مجھے اس پر زیادہ وقت صرف کرنا نہیں پڑے گا۔ یہ اختلاف بنیادی حیثیت کا ہے جس کی مثالیں اقوام متحدہ کے ایوانوں میں بار بار ملتی ہیں۔ اور جس کے نعرے اس مجلس میں بار بار بلند ہوئے [illegible] سے مشرق و مغرب کی آویزش کہا جاتا ہے۔

---

[1] MACINTOSH [2] PEARDON [3] MR WILLIAM HENDERSON, [4] MISS RUTH SCHACTER

مرے خیال [illegible] تعلیم سے [illegible] وقت میں [illegible] کوشش کیا ہے [illegible] ڈگری [illegible] نوجوان مرد و عورت [illegible] کے [illegible] ثابت [illegible] توقع رکھی جا سکتی ہے؟

اس میں [illegible] صرف [illegible] حقیقت [illegible] احکام کا موجب ہے [illegible] ابتدائی ممالک [illegible] کے مفہوم میں کوئی خاص [illegible] نسبت نہیں [illegible] کسی خاص قسم کا [illegible] مفادات کا ایک عام [illegible] جن کی تاریخ [illegible] ایک انسانی [illegible] شاید آپ [illegible] کہ یہ اختلافات کیا ہیں، کہاں پیدا ہوتے ہیں؟ [illegible]

یہ اختلافات [illegible] میں ہیں۔ [illegible] مغربی اقوام میں [illegible] نعرہ [illegible] آسان [illegible] استعمال کر کے [illegible] استعمال کیا جا رہا ہے۔ مغربی یورپی قوموں [illegible] اختلافات [illegible] میں [illegible] کا لفظ [illegible] استعمال نہیں [illegible]۔

ان میں [illegible] اقوام عالم میں شدید [illegible] کا شکار ہیں [illegible] نسلی [illegible] کا عقیدہ رکھنے والوں [illegible] نسلی امتیاز کے [illegible] جہاں کہیں بھی دیکھیں گی [illegible] غلط [illegible] حادثات [illegible] ملک میں [illegible] وہ وقت ابھی بہت دور ہے جب کوئی ملک [illegible] نسلی امتیاز کا ذکر [illegible] بین الاقوامی [illegible] آپ نے اخباروں میں کئی ملکوں کی خبریں پڑھی ہوں گی جہاں نسلی امتیازات کے واقعات ظہور میں آتے ہیں۔ ایسے واقعات [illegible] میں بھی رونما ہوتے ہیں اور چند دوسرے ملکوں میں بھی۔ مجھے مغربی یورپ یا [illegible] ممالک کا کوئی ایسا [illegible] نہیں [illegible] خیالات [illegible] فرق سے [illegible] صورت حال کے جذباتی ردعمل کا ہے۔

دوسرا مسئلہ جس [illegible] سامنے [illegible] جا سکتا ہے میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ [illegible] اقوام دنیا کی نصف سے [illegible] آبادی کی نمائندگی کرتا ہے۔ ایک وقت تھا جب مجھے یہ بات یاد دلانا [illegible] تھی [illegible] اس سادہ سی حقیقت کو تسلیم [illegible] وقت تک [illegible] میرا خیال ہے کہ آج دنیا

[illegible] حقیقت کا [illegible] حیثیت [illegible] حقیقت [illegible]

[illegible]

نامساوات دور کی جائے۔

ایک وقت تھا [illegible] اور تاریخ کا کوئی طالب علم [illegible] لوگ سمجھ سکتے تھے کہ مفلس اور بے روزگار لوگوں کی امداد کے لئے زیادہ [illegible] یہ ایک بڑی [illegible] کی مخالفت اسی طرح کرتے تھے جس طرح وہ غریبوں اور بے روزگاروں کو [illegible] دینے کے مخالف تھے۔ اس دور میں اسی قسم کے مسائل حقیقی اور واقعی طور پر پیش تھے اور اصلاح کے علمبرداروں [illegible] اقتصادی نقصانات کے اصول کا [illegible] عوام کو رعب دکھایا جاتا تھا۔

کو وصول کرنا ان میں سے کسی میں اس شخص کو نا پڑتا۔ اب کسی بھی متمدن ملک میں یہ تبلیغ کرنے کی ضرورت نہیں کہ امیر لوگوں سے غریبوں کی نسبت زیادہ ٹیکس کیوں وصول کرنا چاہئے؟ گویا یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ ہر معاشرے کا ہر فرد یہ ذمہ داری محسوس کرتا ہے۔ تاہم یہ صورت ابھی بین الاقوامی معاشرے میں پیدا نہیں ہوتی۔ آج اگر جمہوری کانگرس میں یہ مانا جائے تو نمونہ ہے، بیماریوں کا مداوا ہے، افلاس اور قحط میں گھرا ہے اور مدد کے لئے پکارتا ہے تو کم و بیش یہی تصور کیا جاتا تھا کہ یہ امداد خیرات کے طور پر دی جاتی ہے یہ ایک جذبہ ہے جو سب سے الگ یا دوسری پہلے ٹیکس دینے والے دولت مندوں ہی کا تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ وہ قوم کے باقی افراد کو بھی دولت کی زکوٰۃ دے رہے ہیں۔

تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ ہم اس امداد کو خیرات تصور نہیں کرتے۔ ہم سے بین الاقوامی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ اس عام مسلمہ اصول کی تکمیل ہے کہ ہر شخص سے اس کے مقدور کے مطابق لیا جائے اور ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق دیا جائے۔ لیکن جب زیادہ ترقی یافتہ ممالک سے یہ امداد ان ملکوں کو حق اور احسان مندی کے ساتھ قبول کی جاتی ہے، تو کئی دوسرے سوال اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ کیا اس قسم کی امداد سیاسی مصالح کی حامل تو نہیں؟ کیا اس کے ساتھ شرائط اور قیود کی پابندیاں تو نہیں؟ آخر اس امداد کا مقصد کیا ہے؟

یہ آخری سوال بہت اہم ہے۔ اجازت دیجئے کہ میں نفس مضمون سے ذرا ہٹ کر اس حقیقت کی یاد دہانی کراؤں کہ ان میں سے اکثر ممالک جب استعماری اقتدار اور غیر ملکی سامراج کے محکوم تھے۔ تو طویل عرصے تک خام مال مہیا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ رہے تھے اب دو صدی سے یہ کیفیت چلی آتی ہے کہ تمام صنعتیں اور ہر قسم کی مشینیں دنیا کے ان ملکوں میں مرتکز ہو گئی ہیں جنہیں ترقی یافتہ کہا جاتا ہے۔ ہم نے تجربے سے معلوم کر لیا ہے کہ جب تک کوئی ملک خام مال مہیا کرتا رہتا ہے اس وقت تک وہ خود کفیل ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اگر ہمارے ملک میں کوئی ایسی ترقیاتی سکیم پیش ہوتی ہے جس کا انحصار خام اشیا کی زیادہ سے زیادہ پیداوار پر ہو تو اس کے متعلق شک و شبہات پیدا ہو جاتے ہیں۔ آج ہمیں اس امر کی ضرورت ہے کہ ملک کے خام مال سے فائدہ اٹھانے کے لئے خود اس ملک میں صنعت رائج کی جائے۔ دوسری طرف ہمیں جو امداد مل رہی ہے ـــــ مثال کے طور پر اقوام متحدہ کی کہہ لیجئے ـــــ ملتی ہے اس سے سارے دلوں میں یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہم اس امداد کو خام مال مہیا کرنے کی صلاحیت بڑھانے کے بجائے اپنی صنعتی ترقی میں صرف کریں گے تو دنیا ہمیں احمق سمجھے گی۔

لہٰذا جب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ دنیا کی اقتصادی ناہمواری دور کرنے کا بہترین حل کیا ہے؟ تو میں نہایت ادب سے یاد دلاؤں گا کہ سب سے پہلے بین الاقوامی معاشرے کو ان ممالک کی امداد ان وجوہ کی بنا پر کرنی چاہئے۔ جو میں واضح کر چکا ہوں۔ اس کے بعد ان ممالک کو ایک دور سے نکال کر دوسرے دور میں داخل کرنا لازم ہے جو ملک صدیوں سے زرعی دور کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان میں اور ایسے ملکوں میں جو بھاپ کی دریافت کے بعد صنعتی ترقی کے میدان میں سبقت لے جا چکے ہیں اتنا ہی وسیع اور بنیادی تفاوت ہے جتنا پتھر کے زمانے اور زراعت کاری کے زمانے میں تھا۔ سوال یہ نہیں کہ یہ ممالک جس کیفیت سے گذر رہے ہیں اسی میں ان کو ترقی دی جائے۔ سوال یہ ہے کہ آج کی دنیا نے صنعتی ترقی اور مشینی پیداوار کے لحاظ سے جو شکل اختیار کر رکھی ہے۔ اس کی طرف صحیح رہنمائی کی جائے۔

ان تین چار معاملوں کے بارے میں اختلافات ہمیشہ رہیں گے یہ اختلافات کبھی شدید اور کبھی کم تر ہوں گے۔ یہ ان ممالک میں بھی رہیں گے جن کے درمیان بنیادی اصول پر مکمل اتفاق رائے موجود ہے۔

میں کسی ایسے آزادی فکر، حسن ظن پر مبنی کسی ایسے عقیدے اور آزادی کے لئے کسی ایسے تصور سے واقف نہیں جس کے لئے امریکہ کی بہت سی ممتاز اور قابل قدر ہستیوں نے جدوجہد نہ کی ہو یا اس کے لئے انہوں نے اپنی زندگیاں ختم نہ کر دی ہوں۔ ہم اپنی امیدوں کے محل اسی بنیاد

[illegible] ہے کہ ہیں۔ آپ کا ملک تو ابھی بچہ ہے آپ پسند کریں یا نہ کریں [illegible] مستقبل آپ [illegible] میں [illegible] تہذیب [illegible] کے مستقبل کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ آپ اس ذمہ داری کو کس طرح خوش اسلوبی سے قبول کرتے ہیں۔

اب مجھے اپنی بات ختم کر دینی چاہئے کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ [illegible] کی مدت [illegible] آپ کے لئے ناصح مشفق بنے [illegible] میں ہرگز نہیں چاہتا کہ میں نے کہا میں آپ [illegible] وقت [illegible] آپ کی [illegible] لوگ [illegible] ہوں گے میں صرف ایک وفد کو نصیحت کرنے کی جرات کر سکتا ہوں اور وہ پاکستان کا وفد ہے میں اس وفد کو [illegible] حضرات [illegible] کہ [illegible] ملک ہے جسے آزادی کی دولت حاصل کئے ابھی صرف ڈھائی سال گزرے ہیں [illegible] ایسا نہیں ہے البتہ ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ عالمی مشکلات کے بہتر حل میں ہمارا [illegible] ادا کرے [illegible] بین الاقوامی معاشرے کے مفاد کو اپنے ملک کے مفاد [illegible] کرنے کی ترغیب [illegible] سامنے آ جائے۔ ایسے موقع کے لئے یہ مشورہ [illegible] اس قسم کی ذہنی کشمکش جیسی حیثیت رکھتی ہیں [illegible] امید ہے کہ [illegible] بین الاقوامی معاشرے کی بہبود [illegible] رہیں گے۔

پاکستان کے وفد کے لئے میری ایک چھوٹی سی اور آخری نصیحت یہ ہے کہ جب آپ کے پاس کہنے کے لئے کچھ ہو تو ضرور کہیے لیکن جب کہنے کو کچھ نہ ہو تو براہ کرم خاموش رہیے۔

تقریروں کے اردو ترجمے کے لئے ادارہ
مولانا غلام رسول مہر کا شکر گزار ہے

پیغامات

خلیفہ عبدالحکیم

[illegible] سے آپ کے [illegible] یہ شعر زبان پر جاری ہو گیا

[illegible]

[illegible]

ایسے باکمال [illegible] کی موت ایک قومی حادثہ ہوتی ہے [illegible] اس کا صدمہ [illegible] ہوتا ہے۔

[illegible] ان کی [illegible] شخصیت دوسروں پر اثر انداز ہوتی تھی [illegible] درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے [illegible] سے اپنی زندگی کو وقف [illegible] محسوس [illegible]

مرزا غالب کی نسبت حالی نے لکھا ہے [illegible] ایک انوکھا شخص تھا [illegible] اسی خصوصیت نے ان کو [illegible] بنا دیا تھا۔ [illegible] ذہین اور [illegible] صلاحیتوں والے انسان قدرت کبھی کبھی پیدا کرتی ہے [illegible] زندہ دل بھی تھا اور روشن دماغ بھی۔ جیسے چراغ جب بجھ جاتا ہے تو [illegible] ظلمت [illegible] ہو جاتی ہے

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا   شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا

حفیظ جالندھری

احمد شاہ بخاری کا انتقال ہو گیا ہے۔ بخاری سے میری بھی یاد اللہ تھی۔ میں جب بیس برس کا تھا جب ۱۹۱۹ء میں لاہور آیا تو میری شناسائی پطرس بخاری سے ہوئی۔ پہلی ہی ملاقات "من تن شدم تو جاں شدی" بن گئی۔ عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت، شیخ عبداللطیف تپش، سید امتیاز علی تاج تقریباً سب روز تاج صاحب کی بیٹھک میں بیٹھتے۔ کبھی کبھی ایک ہوٹل میں حسرت کیپ سے شاد بھی جاتے۔ مشاعروں اور ادبی جلسوں میں بھی شریک ہوتے۔ پھر بخاری کو ولایت جانا پڑا۔ محفلیں سونی پڑ گئیں۔ بخاری ہوتی شگفتگی کا گلدستہ بن گئی۔ اب تاثیر اور محمد یوسف اور پنڈت ہری چند اختر بھی اس بزم ادب میں شامل ہو گئے اور سب نیا مضمون باندھ کر لاتے۔ لیکن اس انجمن کی شمع پطرس بخاری کی ذات تھی۔

شعر و سخن، ادب و فن اور نقد و نظر سے، بذلہ نکات اور لطائف و ظرائف بخاری کی زبان سے ظہور میں آتے جو ہم سب کے لیے بصیرت تھے۔

پھر وہ ریڈیو کا مہتمم اعلیٰ ہو کر دلی چلا گیا —— حکومت جدید میں مجھے بھی تبدیل ... ہری چند اختر، فیض اور حسرت بھی دلی میں جمع ہو گئے —— جو بخاری کے ہاں کبھی کبھی میرے ہاں میلہ سجتا۔ سالک صاحب لاہور سے آ جاتے۔ صاحب چغتائی اور صوفی تبسم بھی قدم رنجہ فرماتے اور پرانی بیٹھک —— پاکستان بننے کے بعد بخاری برائے کار و بار دنیا کی سب سے بڑی انجمن میں شامل ہو گیا۔ دوستی کی محفل بے چراغ ہو گئی۔ امید تھی وہ آ جائے گا اس نے وعدہ بھی کیا تھا کہ آ جاؤں گا اور سب کے سب دوست اس پر جمع ہو جائیں گے لیکن اس کی ... یہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے ؎

دوستی اب گلے کا ہار نہیں
تار ٹوٹا بکھر گئے دانے

لیکن اس سے میرا رشتہ آسمانی ہے ساتھ ٹوٹنے والا نہیں۔ جہاں تپش، حسرت، تاثیر، ہری چند اختر ہیں بخاری وہاں پہنچ گیا ہے —— اور میں بھی جلد اسے وہیں پا لوں گا۔

خواجہ منظور حسین، پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور

پروفیسر احمد شاہ بخاری کی وفات پر ان کے پرانے کالج کے سوا کسی ادارے کو بھی، جس سے ان کا تعلق رہا، سوگوار ہونے کی اتنی وجہ نہیں کیونکہ ہمارے رفقائے کار میں سے کسی نے ان سے زیادہ نہ اس کالج سے کچھ حاصل کیا نہ زیادہ فراخ دلی کے ساتھ فائدہ پہنچایا۔ انہوں نے اس جگہ اور کیمبرج میں اپنی زندگی کے سب سے زیادہ مسرت بخش اور فیض رساں سال بسر کئے۔ یہی وہ درس گاہ ہے جہاں ان کی شخصیت نے پہلے پہل چکا چوند کر دینے والے اوصاف حاصل کئے اور ان عملیات کو استعمال میں لانے پر خوشی کے شادیانے بجائے۔ یہیں سے ان کی اثر آفرینیوں نے دور و نزدیک کئی نسلوں میں ادب اور تہذیب و شائستگی پھیلانے کی سر توڑ کوششیں کیں۔ وہ ایک ممتاز اور متبحر عالم تھے جو مشرق و مغرب کی حیات پرور ادب کے نشوں سے سرشار تھے۔ ایک جوش آفرین استاد کی حیثیت سے ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ وہ تراشیدہ لطائف اور درخشاں فصاحت رکھنے والے ادیب اور مقرر تھے۔ بات بات میں نکتے پیدا کرنے اور تلوار کی طرح تیز کاٹ رکھنے والی ظرافت کے مالک تھے۔ انہوں نے جس چیز کو چھوا اس کی ہیئت بدل دی اور جس سے ملے اس کی رفتار تیز تر کر دی تحقیق و تجسس کا شوق

باتیں ہنسی مذاق کی گفتگو میں کہہ گیا۔ تازہ ترین واقعات حاصل کرنے کے لئے انہوں نے کئی بار [illegible] [illegible] کا سیر طلب کیا۔ میانوالی میں [illegible] بیان ختم کر دہ کتابوں سے اچھل پڑے۔ بزم احباب نشستوں کی مجالس میں [illegible] ذوق رکھنے والے بہت ہی حضرات کو انگریزی ادب [illegible] [illegible] آخر ہی تھے۔ ان کے معاشرتی ترقی پسندی، روشن خیالی، ذہنی متانت سب پیدا ہوئی قوت کے لئے بخاری کا سلسلہ [illegible] ہیں۔ (ترجمہ)

سید عابد علی عابد

پروفیسر احمد شاہ بخاری کے رخصت ہو جانے سے بہت سی چیزیں ان کے ساتھ رخصت ہو گئیں۔ ظرافت، شگفتگی اور مروت کی وہ اعلیٰ اقدار رخصت ہو گئیں جو مشرقی اور مغربی وضعداری کے نہایت بانکے امتزاج سے پیدا ہوئی تھیں۔ وہ اسلوب تحریر رخصت ہو گیا جس میں مختلف زبانوں کی بہتری صلاحیتیں اس طرح جھلکتی تھیں جیسے شفق سے رنگ کی رو میں۔ ان کے ساتھ وہ یگانہ خطابت، خطیبانہ ادبیت، تبسم ظرافت اور ذاتی شائستگی بھی رخصت ہو گئی ہیں اور یہ شعور ہوتا ہے جیسے اب کبھی لوٹ کے نہ آئیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ادیبوں، انشاپردازوں اور سخن فہموں کی ایک مخصوص جماعت کے سب سے بڑے ترجمان تھے۔ ان کے جانے کے بعد اگرچہ اس جماعت کے گنتی کے کچھ افراد باقی ہیں۔ لیکن اس جماعت کی وہ تابندہ مشعل روح رخصت ہو گئی۔ جس کی جوت سے اس جماعت کے سارے افراد جیسے بڑے جگمگ جگمگ کرتے تھے۔

شائستگی اور بخاری ایک دوسرے کے اس طرح لازم ہو گئے تھے کہ میں تو جب شائستگی کے متعلق کچھ سوچتا تھا تو بخاری کو اس کا مظہر تمثیلی بنا کر سوچتا تھا۔ انہیں فطرت نے گونا گوں صلاحیتوں سے مالا مال کیا تھا کہ سائنس میں بصیرت رکھتے تھے۔ آرٹ کے رموز پر حاوی تھے۔ ادبیات کے دلدادہ تھے اور حسن انتظام کی ہستی بولتی چلتی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ الحمد للہ کہ ان کی یہ تمام صلاحیتیں پاکستان کے کام آئیں۔ کبھی یوں بھی ہوا ہے کہ کسی مسئلے کے سلسلے میں ایسی گرہ پیدا ہو گئی ہے جو سلجھائے نہیں سلجھتی اور بخاری سے جو رجوع کیا گیا ہے تو انہوں نے پہلے منٹ کی چٹکیوں میں سلجھا دی ہے اور پھر اپنی مخصوص بذلہ سنجی سے کام لے کر بات کو بھی چٹکیوں میں اڑا دیا ہے۔

اردو ادبیات کے سلسلے میں ان کی تحقیقات گنتی کے چند مضامین اور منظومات پر مشتمل ہیں۔ لیکن ہر تحقیق ایک کارنامہ ہے اور ہر مضمون پڑھ کر یہ گمان گزرتا ہے کہ بخاری اس سے بہتر مضمون نہ لکھ سکیں گے۔ ہر بار یہ گمان غلط ثابت ہوتا ہے ہر دوسرا مضمون پہلے سے بلند تر صورت رکھتا ہے۔

علمی اور ادبی اوصاف سے قطع نظر ان کے بانکپن کی یہ ادا کون فراموش کر سکتا ہے کہ مرتے ہوئے ہنس رہے ہیں اور ہنستے ہوئے مر رہے ہیں۔ شاید لوگوں کی بہت بڑی اکثریت کو ان کی موت کے بعد معلوم ہوا ہو گا کہ ان کی بیماری کتنی خوفناک شدید اور طویل تھی اور اپنے فرائض منصبی کا کتنا گہرا شعور رکھتے تھے۔ آج تاثیر مرحوم کی موت کا داغ تازہ ہوا۔

ہم زباں چپ ہو گئے ہم داستاں چپ ہو گئے
کیسے محفل آرا ناگہاں چپ ہو گئے

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

ہماری کتابیں

(تصانیف شوکت تھانوی)

نیلوفر۔ شوکت صاحب کا تازہ ترین ناول ہے جو بے حد مقبول ہو رہا ہے۔ یہ ناول ہے ہی ان کے پچھلے ناولوں سے زیادہ [illegible] اگر آپ نے اسے اب تک نہیں پڑھا تو آپ شوکت صاحب کی ایک نادر تحریر کے مطالعے سے محروم ہیں۔

قیمت ۶/-

ہماری دوسری کتابیں

مولانا	شوکت تھانوی	۳/۸
[illegible]	″	۶/-
خدانخواستہ	″	۳/
سودیشی ریل	″	۳/-
کتیا	″	۳/۸
سانچ کو آنچ	″	۴/۰
سسرال	″	۲/۴
کارٹون	″	۳/۸
ما بدولت	″	۳/۸
[illegible]	″	۲/۸
جوڑ توڑ	″	۴/-
مضامین شوکت ۲/۸	″	قاضی جی (دو حصے) ۱/۸
غالب کے ڈرامے ۲/۸	″	وغیرہ وغیرہ ۲/-

ادارۂ فروغِ اُردو لاہور

ہماری بلند پایہ کتابیں

روزن :- اس دور میں بہت کم شاعروں کو بھرپور کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ ان میں قتیل شفائی کا نام قابلِ رشک حیثیت کا مالک ہے معلوم ہوتا ہے مترنم اور موثر نغموں کے زیروبم قتیل شفائی کے قلم کے ساتھ گردش کرتے ہیں۔

قیمت ۲/-

نبیٔ امی	محمد ابوالنعم	۵/-
خلفائے محمد	"	۱۰/-
شعلۂ طور	جگر مراد آبادی	-/۸
امراؤ جانِ ادا	رُسوا	۴/-
منٹو	ابوسعید قریشی	۴/۴
قول و قرار	عدم	۲/۸
پیچ و خم	"	۲/-
سرکنڈوں کے پیچھے	منٹو	۳/-
آنچل	احمد ندیم قاسمی	۳/-
بازارِ حیات	"	۳/-
عزیزوں کے نام	ڈاکٹر تاثیر	۲/۸
یدِ بیضا	عابد علی عابد	۵/-
سیاستِ الٰہیہ	امام ابن تیمیہ	۲/۸
نقوشِ لطائف	مرتبہ احمد ندیم قاسمی	۲/-
مضامین جمال الدین افغانی		۴/-
پندرہ اگست	رشید اختر ندوی	۲/۴

صاحب! اسکیچ نگاری پر بے مثال کتاب مدیر نقوش کے اسکیچوں کا مجموعہ۔ جس کی بڑی دھوم ہے۔ اس لیے کہ مدیر نقوش نے ابتک یہ نہیں سیکھا کہ وہ کسی کی خواہ مخواہ تعریف کریں یا بلاوجہ سودا بن جائیں یہ جو کچھ دیکھتے اور سمجھتے ہیں وہی لکھتے ہیں۔ قیمت ۳/-

ادارہ فروغ اردو — لاہور

ہماری تنقیدی کتابیں

اچھی تنقیدی تصنیفات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا ادبی شاہکار ادب میں کیا مقام
ہے اور یہ بھی کہ ہمارا ادب ترقی کر رہا ہے یا نہیں اپنے ذہنی تسکین کے لئے یہ کتابیں پڑھیے

اندازے

فراق گورکھپوری جتنا بڑا شاعر ہے اتنا ہی بڑا نقاد ہے۔ "اندازے" ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اردو تنقید میں اس سے بہتر کتاب آج تک نہیں لکھی گئی ———

قیمت ۵/-

اردو غزل گوئی

فراق غزل گو بہت بڑا شاعر ہے ساتھ ہی نقاد بھی۔ ان کی تمام ترکیب تو مشکل کا مجموعہ ہیں جن میں مشرقی اور مشرقی تنقید کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔ قرآن کو پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے قائل دور کے تمام لٹریچر کا مطالعہ کر لیا۔

قیمت ۲/-

ہماری داستانیں

اگر آپ کو داستانوں سے دلچسپی ہے تو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کریں۔ اس لئے کہ سید وقار عظیم نے ان کا ادبی مرتبہ متعین کرنے میں بڑی جانفشانی سے کام لیا ہے اور ہمیں بتایا ہے ہزاروں، لاکھوں صفحات پر بکھری ہوئی داستانوں میں کیا کچھ ہے۔

قیمت ۵/-

انتقاد

سید عابد علی عابد ہندوستان کے بہترین افسانہ نگار اور بلند پایہ نقاد ہیں۔ ان کی تنقید میں روایتی نقادوں کی طرح ثقالت اور یاوہ گوئی نہیں ہوتی۔ یہ جو بات بھی کہتے ہیں اس کے لئے مناسب الفاظ ڈھونڈنے میں یہی وجہ ہے کہ ان کے تنقیدی مضامین کی یہ کتاب مقبول ہو رہی ہے

قیمت ۳/-

ادارۂ فروغِ اردو لاہور

(ایبک روڈ انارکلی)

نقل ـــــ ۲۷۸ ـــــ پرچہ نمبر

ہفت روزہ — نصرت — لاہور

یکے از مطبوعات مکتبہ جدید

بہت سے لوگوں اور اداروں نے نصرت کو اپنی اپنی رائے کے لائق سمجھا ہے۔ امید ہے آپ بھی اس کا باقاعدہ مطالعہ کرنا اپنے لیے کئی لحاظ سے پسند کریں گے۔

ایک شاعر

نصرت واقعی پیارا ہے۔ نصرت نے جن امور کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ آج کل ہمیں ان کی ضرورت تھی۔ مسلمانوں کے دلوں میں بہتر زندگی کے لئے آرزو پیدا کرنا اور اپنے ملک و ملت کے مسائل میں تعمیری جذبات کے ساتھ خود حصہ لینا اور دوسروں کو مائل کرنا نصرت کا مطمح نظر ہے۔

ابو الاثر حفیظ جالندھری

ایک مصور

روحانی نشوونما اور صلاحیتوں کی تکمیل کے لیے مکتبہ جدید نے بے مثل خدمت کی ہے اور اب ہفت روزہ نصرت بھی ان خدمات کی ایک کڑی ہے جسے فراموش نہ کیا جا سکے گا۔ نصرت نے اتنے تھوڑے عرصے میں جتنی ترقی کی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے پیچھے ایک پیغام ہے اور اس میں بصیرت کی چمک ہے۔

مصور مشرق، عبد الرحمٰن چغتائی

ایک روزنامہ

نصرت میں باقاعدہ یہ کوشش نظر آتی ہے کہ ہماری زندگی کے جو مختلف اور متنوع پہلو ہیں ان کو سامنے لایا جائے اور یوں لوگوں میں اردگرد کی زندگی میں اور خود اپنی زندگی میں دلچسپی لینے کا مذاق پیدا کیا جائے ـــ اور یہی ایک ہفتہ وار کا صحیح تصور ہے۔

روزنامہ 'آفاق' لاہور

بدل اشتراک

فی شمارہ چھ آنے ـــــ ایک سال کے لئے پندرہ روپے ـــــ چھ ماہ کے لئے آٹھ روپے

ناظم: ہفت روزہ **نصرت** ـــــ ۶ ـــ فتح محمد روڈ ـــــ لاہور

اپنے وطن کے دفاع میں
برابر کے شریک

[illegible]

Bata باٹا
دُنیا بھر کے
جفت ساز

دوچار باتیں

۱۔ نقوش کا آئندہ شمارہ عام نمبر ہوگا۔ جو دیگر رسائل کے سالناموں سے زیادہ بہتر ہوگا۔ انشاءاللہ!

۲۔ عام نمبر کے بعد نقوش اپنے دس سالہ کارناموں کا انتخاب پیش کریگا جو بلاشبہ ایک کارنامہ ہوگا۔

۳۔ نقوش کا غزل نمبر کئی اہم اضافوں کے ساتھ جلد ہی مارکیٹ میں آجائیگا شاید نومبر تک۔

۴۔ افسانہ نمبر، مکاتیب نمبر، شخصیات نمبر (دوم) منٹو نمبر اور طنز و مزاح نمبر مل سکتے ہیں مگر صرف لائبریریوں کو

۵۔ نقوش کے پرانے نمبروں میں یہ شمارے بھی مل سکتے ہیں مثلاً نمبر ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴۔

۶۔ بعض دیگر نمبروں کے لئے ہماری ایجنسی طاہر نیوز ایجنسی نعل روڈ کراچی کو لکھیں شاید چند ایک شمارے مل جائیں۔

۷۔ ادارہ نقوش ڈرامہ نمبر کے لئے بھی پر تول رہا ہے۔ کچھ مشورے دیجئے، کچھ مواد کی فراہمی میں مدد دیجئے۔

۸۔ نقوش کے سابقہ کارناموں پر رائے اور آئندہ کے لئے آپ کے مشورے ہماری رہنمائی کا موجب ہوں گے۔ کچھ لکھئے تو۔

(ادارہ)

~~۱۹۰۲۴~~ ن ۷ پ ا۶۸ں
۲۹۰۰۲

یہ کتاب اس تاریخ کو جو سب سے آخر میں
ثبت ہے کتب خانہ سے مستعار لی گئی تھی اگر
اس کتاب کو میعاد مقررہ پر واپس نہیں کیا گیا تو
دو پیسے روز کے حساب سے جرمانہ وصول کیا جائیگا۔

6 DEC 1971